

دِلّی کا پُراسرار سادھو



اے حمید



پاکستانی جنگی قیدیوں کی ٹرین انڈیا میں داخل ہو گئی تھی۔
یہ سپیشل ٹرین تھی۔ بنگلہ دیش کے کرمی ٹولہ ریلوے سٹیشن سے چلی تھی اور راستے میں تمام سٹیشن چھوڑتی چلی آئی تھی۔ ڈبے میں پاک فوج کے جوان ایسی حالت میں بیٹھے تھے جیسے شیروں کو زنجیروں سے جکڑ دیا گیا ہو۔ ان میں سے کسی نے بھی ہتھیار نہیں ڈالے تھے ان سے زبردستی ہتھیار ڈلوائے گئے تھے۔
ایسا کیوں ہوا؟ اس شکست کا حقیقی ذمہ دار کون تھا؟ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آج ملک کا بچہ بچہ جان گیا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہمارے لیڈروں اور سیاست دانوں نے کیسا خونیں ڈرامہ کھیلا تھا۔ دوسرے یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ میں آپ کو پاک فوج کے شیر دل جوانوں کی آپ بیتی پھر کبھی سناؤں گا کہ وہ مشرقی پاکستان کے دور دراز دلدلی علاقوں میں انہیں ہتھیاروں' سپلائی اور بدلی کے بغیر کیسے ہمت شکن حالات میں لڑایا گیا۔ وہ آخری دم تک آخری گولی تک راشن پانی' گولہ بارود کے بغیر دشمن سے لڑتے رہے۔ شہید ہوتے رہے اور ان کی ہڈیاں مشرقی پاکستان کی مٹی میں مٹی ہو گئیں۔ یہ پاکستان کی تاریخ کی شاید سب سے الم انگیز داستان ہے۔ لیکن اس وقت یہ میرا موضع نہیں ہے۔ اس وقت میں آپ کو صرف اپنی آپ بیتی' اپنی داستان سنانے چلا ہوں جو حیرت انگیز بھی ہے' المناک بھی ہے اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی بھی ہے۔
اس وقت جبکہ میں اپنی اس داستان عبرت کو قلمبند کرنے لگا ہوں تو تمام واقعات میری

آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح ناچنے لگے ہیں اور مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ گزرا تھا اور میں ان حالات میں سے گزر چکا ہوں۔ آپ جب میری داستان سنیں گے یا پڑھیں گے تو آپ کو بھی یقین نہیں آئے گا۔ میں پاکستانی جنگی قیدیوں کے ساتھ ضرور سفر کر رہا تھا لیکن میں پاک فوج کی کسی رجمنٹ کا حاضر سروس عہدیدار نہیں تھا۔ میرا تعلق چند سال پہلے پاک آرمی سے ضرور تھا لیکن اب میں فوج سے ریلیز ہو چکا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں آپ کو اپنا مختصر سا تعارف کرا دوں تاکہ آپ کو یہ سمجھنے میں آسانی ہو جائے کہ میں جنگی قیدیوں کی ٹرین میں کیوں سفر کر رہا تھا۔ میں بھارت کا قیدی ضرور تھا مگر میں ریگولر پاک آرمی کا جوان نہیں تھا۔

میرا نام کرم داد ہے۔ میں پاک آرمی کی کمانڈو فورس میں تھا۔ ہماری رجمنٹ مشرقی پاکستان میں تھی۔ میں بھی اپنی رجمنٹ کے ساتھ ڈھاکہ چھاؤنی کی بارکوں میں رہتا تھا۔ تین برس پہلے میں نے پنجاب میں اپنے شہر میں آکر شادی کر لی اور پھر میں فوجی کوارٹر میں رہنے لگا۔ دو برس کی بات ہے کہ فوجی مشقوں کے دوران میں ایک اونچی جگہ سے گر پڑا اور میری کمر میں چوٹ لگ گئی۔ فوجی ڈاکٹروں نے بہت علاج کیا مگر کمر کی درد سے نجات نہ ملی۔ چنانچہ مجھے فوج سے ریلیز کر دیا گیا۔

میں ڈھاکہ میں تین برس سے رہ رہا تھا۔ وہاں مسلمان بنگالیوں سے بڑے اچھے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ فوج سے سبکدوش ہونے کے بعد مجھے گریجویٹی کی رقم ملی تو میں نے ڈھاکہ میں ہی فرنیچر کی دکان کھول لی۔ ڈھاکہ شہر میری بیوی اور میری بچی کو بھی بہت پسند تھا۔ چنانچہ ہم نے اسی شہر میں کاروبار کا فیصلہ کر لیا۔ میری بیوی دس جماعتیں پاس تھی اور پنجاب کے ایک شہر کی رہنے والی خوش شکل خاتون تھی۔ ہمیں ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی۔ میرے ایک گہرے بنگالی دوست حاجی شمس الدین نے ایک بنگالی حکیم سے میرا علاج شروع کرا دیا۔ جس کے علاج سے مجھے کمر کی درد سے نجات مل گئی۔ ہم نے محمد پور میں ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ مکان کے قریب ہی میری فرنیچر کی دکان تھی۔ حاجی شمس الدین کی کپڑے کی دکان میری دکان کے پاس ہی تھی۔ حاجی صاحب کی فیملی کو

خواتین کا ہمارے گھر میں آنا جانا تھا۔ میری بیوی حاجی صاحب کی بیوی کی بڑی پکی سہیلی تھی۔ ان کا مکان ہمارے مکان کے ساتھ ہی تھا۔

میرا کاروبار ترقی کرنے لگا تھا۔ وقت بڑی خوش حالی اور سکون کے ساتھ گزر رہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں سیاسی ہنگامے شروع ہو گئے۔ میں فوجی کمانڈو تھا' مجھے سیاست سے نہ تو کوئی دلچسپی تھی اور نہ سیاست سے میرا کوئی سروکار تھا۔ مشرقی پاکستان کے اس زمانے کے سیاسی حالات سے آپ لوگ اچھی طرح واقف ہوں گے۔ روز جلوس نکلتے۔ الیکشن شروع ہو گئے۔ مجیب کی پارٹی عوامی لیگ انتخابات بھاری اکثریت سے جیت گئی۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانے کے پاکستان کے صدر یحییٰ خان نے اسمبلی کا اجلاس بلانے کا اعلان کر دیا۔ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ انہیں علم تھا کہ اسمبلی کا اجلاس بلایا گیا تو مجیب الرحمٰن وزیراعظم بن جائے گا۔ پھر اچانک یحییٰ خان نے دوسرا اعلان کر دیا کہ اسمبلی کا اجلاس نہیں بلایا جائے گا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان خاص طور پر ... شہر میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ غیر بنگالیوں کے مکانوں کو آگ لگائی جانے لگی۔ ان کا قتل عام شروع ہو گیا۔ ... رحمان کی پارٹی عوامی لیگ نے علیحدہ ملک بنگلہ دیش کا اعلان کر دیا۔ میری اور میر... کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ لیڈر لوگ عوام کو کس طرف لیے جا رہے ہیں ... ٹ مار اور آتش ... لگے۔

مجیب الرحمان نے ... ن کر دیا کہ کوئی سرکاری [redacted] ئے گا۔ مگر سب گھر بیٹھے تنخواہ ... ہے گی ... غیر بنگالیوں کے اکاؤنٹ [redacted] نہیں ... طرف ... نی رعایت ... گئی کہ ... میں پانچ سو روپے تک کی ر ... [redacted] سکتے ہیں۔ ہر طرف ... یت تھی ... ایئرپورٹ کا نظم و نسق سنبھال ... تھا۔ غیر بنگا[redacted] ... ان کی ... یوں کو اغوا کیا جا رہا ... لوگ مشر... ستان سے نکلنے کے لیے ... پور ... طرف ... رہے تھے ... تک کوئی جوابی کاروائی شروع نہیں کی ... میری بیوی جمیلہ سخت خو... دہ ... ن تھا۔ مگر محمد پور اور ... پور ... میں چونکہ غیر بنگالیوں کی اکثریت تھی ان ... حالات پرامن تھے۔

اس کے باوجود میری بیوی کو حاجی شمس الدین کی فیملی نے اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔ اس لوٹ مار اور قتل عام میں محب وطن مسلمان بنگالی شریک نہیں تھے۔ بھارت سے آئے ہوئے مکتی باہنی کے لوگ تھے جن کے ساتھ مشرقی پاکستان کے کچھ بنگالی طلباء بھی مل گئے تھے۔ مکتی باہنی والے بھارتی فوج کے ٹرینڈ گوریلے تھے جو سویلین لباس میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کر رہے تھے۔

حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ غیر بنگالی جو جانیں بچا کر ائرپورٹ کی طرف بھاگ رہے تھے انہیں راستے میں ہی پکڑ کر قتل کر دیا جاتا اور ان کی بہو بیٹیوں کو اغوا کر لیا جاتا۔ جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تو فوج نے کاروائی شروع کر دی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' وہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی تاریخ تھی۔ رات کا ایک بجا تھا کہ بڑے زور کا دھماکہ ہوا۔ ڈھاکہ شہر لرز اٹھا۔ جب پاکستانی آرمی میدان میں آگئی تو شرپسند دہشت گرد مکتی باہنی والے بھارت کی طرف بھاگ گئے۔ شہر میں امن و امان بحال ہونے لگا۔ میں نے دوبارہ اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ لیکن یہ امن عارضی ثابت ہوا۔ بھارت نے پوری جنگی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ اس بار مکتی باہنی والے مشرقی پاکستان میں داخل ہوئے تو ان میں بھارتی کمانڈو فورس بھی بنگالی شہریوں کے لباس میں تھی۔ انہیں انڈین آرمی کی مدد حاصل تھی جو سرحدوں پر گولہ باری کر رہی تھی۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ اس تباہی اور عبرت انگیز شکست کا ذمے دار کون تھا؟ یہ وہ سوال ہیں جو ہر محب وطن پاکستانی کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں' لیکن کسی کو ان کا جواب نہیں ملتا۔ مجھے خود معلوم نہیں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ آپ پڑھے لکھے ہیں' شاید آپ کو معلوم ہو۔ بہرحال مشرقی پاکستان پر بھارت نے باقاعدہ حملہ کر دیا۔ مغربی پاکستان میں بھی جنگ چھڑ گئی۔ ہم لوگ محمد پور میں محبوس ہو کر رہ گئے۔ روز بڑی بڑی خبریں آنے لگیں۔

پھر وہ منحوس دن بھی آگیا جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ فوج سے زبردستی ہتھیار ڈلوا دیے گئے اور ہماری بہادر فوج کے خود دار جوان بھارت کے جنگی قیدی بنا دیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش میں بڑے پیمانے پر غیر بنگالیوں کا قتل عام

آبرو ریزی اور لوٹ مار شروع ہو گئی۔ مکتی باہنی والے محمد پور میں بھی داخل ہو گئے۔ اس روز میں محمد پور میں ہی اپنے ایک مسلمان محب وطن بنگالی دوست کے گھر حالات کے بارے میں معلوم کرنے گیا ہوا تھا کہ محمد پور کے بازاروں میں فائرنگ کے دھماکے ہونے لگے اور چیخ و پکار مچ گئی۔ میرے مسلمان بنگالی دوست نے کہا کہ میں وہیں رہوں اور باہر نہ جاؤں لیکن مجھے اپنی بیوی جمیلہ کا خیال آ رہا تھا۔ خدا جانے وہ کس حالت میں ہو گی۔ میں اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر بنگالی دوست کے مکان سے نکل کر گلیوں' بازاروں میں چھپتا چھپاتا اپنے محلے میں پہنچ گیا۔ راستے میں میں نے جگہ جگہ ایسے لرزہ خیز منظر دیکھے کہ جن کو یاد کر کے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مکتی باہنی والے باقاعدہ فوجی وردیوں میں تھے۔ وہ بہاریوں' پنجابیوں اور پٹھانوں کو گھر سے گھسیٹ کر بازار میں لاتے۔ چاقو سے پہلے ان کی آنکھیں نکالتے' پھر چھروں کے وار کر کے بیدردی سے قتل کر دیتے۔

میں نے اپنی آنکھوں سے غیر بنگالی عورتوں کو دیکھا کہ انہیں مکتی باہنی والے اور ہندو بنگالی اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ وہ رو رو کر ان سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھیں۔ میں سخت گھبرایا ہوا تھا۔ مجھے اپنی بیوی کا خیال آ رہا تھا۔ میں بد حواسی کے عالم میں اپنے مکان کے پاس آیا تو دیکھا کہ میرے مکان کو آگ لگی ہوئی تھی۔ میں گھبرا کر اپنے دوست حاجی شمس الدین کے مکان کی طرف دوڑا۔ ان کا مکان بند پڑا تھا۔ گلی میں میرے جاننے والی کئی پنجابیوں اور پٹھانوں کی لاشیں خون میں لت پت پڑی تھیں۔ مکانوں کا ٹوٹا پھوٹا سامان ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ میں نے حاجی شمس الدین کے دروازے پر زور سے دستک دی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ باہر تالہ نہیں لگا ہوا تھا۔ حاجی صاحب نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھا تو گلے لگا کر بچوں کی طرح پھوٹ پڑے۔ میں نے اپنی بیوی کے بارے میں پوچھا تو وہ مجھے کھینچ کر کمرے میں لے گئے۔ دروازے کو انہوں نے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ ان کی بیوی بچے وہاں پر نہیں تھے۔ حاجی صاحب پہلے تو یہی کہتے رہے کہ میری بیوی زندہ و سلامت ہے اور اسے انہوں نے اپنی فیملی کے ساتھ میرپور پہنچا

دیا ہے لیکن ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ بات کچھ اور ہی ہے۔

میں نے حاجی صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"حاجی صاحب! آپ کو خدا پاک کی قسم ہے' مجھے صاف صاف بتایئے کہ میری بیوی کہاں ہے؟"

حاجی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ مکتی باہنی والے میرے مکان میں داخل ہو گئے تھے۔ انہوں نے میرے مکان کو لوٹ کر آگ لگا دی اور میری بیوی جمیلہ کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ مجھ پر جیسے آسمان پھٹ پڑا۔ میری آنکھوں کے آگے ایک پل کے لیے بالکل اندھیرا چھا گیا۔ حاجی صاحب مجھے حوصلہ دینے لگے۔

"کرم داد! گھبراؤ نہیں۔ میں تمہاری بیوی کو ضرور واپس لے آؤں گا۔ مکتی باہنی والوں میں دو آدمیوں کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بھابھی کو جہاں بھی لے گئے ہوں گے میں وہاں سے اسے لے آؤں گا۔ تم مجھے تھوڑا وقت دے دو فکر نہ کرو۔"

اس وقت شام ہونے والی تھی۔ وہ میری زندگی کی سب سے اذیت ناک شام تھی۔ جب یہ خیال آتا کہ مکتی باہنی والے ہندو میری بیوی کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے تو میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ کبھی دیواروں پر مکے مارتا' کبھی اپنے سر کو پکڑ لیتا۔ میرا مسلمان بنگالی دوست حاجی شمس مجھے بار بار تسلی دیتا کہ وہ میری بیوی کو واپس لے آئے گا۔ لیکن میری دنیا اجڑ گئی تھی۔ اگر وہ مجھے یہ خبر سناتا کہ مکتی باہنی والے میری بیوی کو قتل کر گئے ہیں تو مجھے صبر آ جاتا۔ میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے وہ رات کس اذیت کے ساتھ جاگ جاگ کر گزاری۔ صبح ہو گئی۔ شہر میں غدر مچا تھا۔ کسی پنجابی' پٹھان یا بہاری کا گھر سے باہر نکلنا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ محمد پور میں بھی قیامت برپا تھی۔ مکتی باہنی نے میرپور اور محمد پور کی دونوں غیر بنگالی بستیوں کے مکان لوٹ کر وہاں کے سینکڑوں مسلمان بہاریوں' پنجابیوں اور پٹھانوں کو قتل کر دیا تھا اور ان کی بہو بیٹیوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔

میں نے حاجی شمس سے کہا۔

"دوست! اگر تم ان لوگوں کو جانتے ہو جو میری بیوی کو اغوا کر کے لے گئے ہیں تو مجھے ان کا کچھ اتہ پتہ بتا دو۔ میں خود اپنی بیوی کو تلاش کر لوں گا۔"

پہلے وہ میرے اکیلا باہر جانے پر تیار نہ ہوا۔ جب میں نے اسے کہا کہ اگر اسی نے مجھے ان لوگوں کا پتہ نہ بتایا تو میں خود ہی ان کی تلاش میں نکل جاؤں گا تو اس نے مجھے ان دونوں ہندو بنگالیوں کا پتہ بتا دیا جو مکتی باہنی والوں کے ساتھ میرے گھر میں آئے تھے اور میری بیوی کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ میں بنگلہ زبان بول اور سمجھ لیتا تھا۔ اگرچہ میرا لہجہ پنجابی تھا۔ میرا لباس بنگالی ہی ہوتا تھا۔ جب میں جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کے مکان سے نکلنے لگا تو حاجی شمس الدین نے مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور بڑی درد مندی سے کہنے لگا۔

"کرم داد! تم میرے دوست ہی نہیں بھائی بھی ہو۔ تمہاری بیوی جمیلہ میری بھابھی ہی نہیں میری بہن بھی ہے۔ یقین کرو تم محمد پور سے نکلنے کے بعد زندہ نہ بچ سکو گے۔ میرا تمہیں یہی مشورہ ہے کہ مجھے ایک دن کا موقع دو کہ میں جمیلہ بہن کا اپنے طور پر کھوج لگا سکوں۔ اس کے بعد تم بے شک چلے جانا۔"

میرے ہوش و حواس کسی حد تک واپس آ چکے تھے۔ سوچنے لگا حاجی صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ میں بنگالی نہیں ہوں اور میں نے ان لوگوں کو دیکھا تک بھی نہیں' بہتر ہے کہ میں حاجی صاحب کی بات مان لوں' چنانچہ میں رک گیا۔ لیکن حاجی شمس سے کہا۔

"حاجی بھائی! مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ تم جو کچھ بھی معلوم کرو گے مجھے صاف صاف بیان کر دو گے۔ میرے آگے جھوٹ نہیں بولو گے۔"

حاجی شمس کہنے لگا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

حاجی شمس الدین ایک تو بنگالی تھا اور مشرقی پاکستان کا ہی رہنے والا تھا۔ اس کے ہندو بنگالیوں سے بھی دیرینہ مراسم تھے اور بہت لوگ اسے جانتے اور اس کا احترام کرتے تھے۔ حاجی شمس نے مجھے اپنے مکان میں ہی چھپے رہنے کی ہدایت کی اور خود دوپہر کے بعد نکل

گیا۔ گھر میں اس کا ایک ہی مسلمان بنگالی ملازم شرفو تھا۔ اس کے اپنے بیوی بچوں کو اس نے کاکز میں اپنی بڑی بہن کے ہاں بھجوایا ہوا تھا۔ میں اس کے مکان کے ایک کمرے میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ بنگالی ملازم شرفو نے شام کو چائے بنا کر دی اور بتایا کہ محمد پور میں بھی بھارتی فوجی آ گئے ہیں اور گھروں کی تلاش لے رہے ہیں۔ میں نے اسی سے پوچھا کہ وہ گھروں کی تلاشی کیوں لے رہے ہیں۔ شرفو کہنے لگا۔

"ان کا خیال ہے کہ پاکستانی فوج کے کچھ سپاہی یہاں فرار ہو کر چھپے ہوئے ہیں۔ وہ ان کو تلاش کر رہے ہیں۔"

اس نے یہ بھی بتایا کہ شہر میں ہر طرف انڈین آرمی نظر آ رہی ہے اور پاک فوج کی پلٹنوں سے ہتھیار واپس لے کر انہیں قیدی بنا کر انڈیا لے جایا جا رہا ہے۔ یہ ایک الگ جان لیوا صدمہ تھا میرے لیے۔ شرفو نے یہ بھی بتایا کہ پاک فوج ابھی تک کچھ محاذوں پر لڑ رہی ہے اور ان جوانوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔

مسلمان بنگالی ملازم شرفو بھی حیران اور غم زدہ تھا۔ بار بار کہتا۔

"بابو جی! ہمارے لیڈروں نے ہمیں مروا دیا ہے۔ پاک فوج کے خلاف۔ پاکستان کے خلاف بڑی گھناؤنی سازش ہوئی ہے۔ میں خود بھارتی فوجیوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پاکستان آرمی ہتھیار ڈال دے گی۔ ہمیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔"

میں نے شرفو سے پوچھا۔

"شرفو بابا! جب مکتی باہنی والے میری بیوی کو اغوا کر کے لے گئے تو کیا تم نے انہیں دیکھا تھا؟"

شرفو بولا۔

"بابو جی! میں وہاں نہیں تھا۔ ہمارے حاجی صاحب اس وقت وہاں تھے۔ جب مکتی باہنی والوں نے آپ کے مکان کو آگ لگائی تو حاجی صاحب اس طرف دوڑے تھے کہ بھابھی صاحبہ کو وہاں سے نکال کر لے آئیں۔ مگر اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ بی بی جی تو

ہمارے والے مکان میں آ گئی تھیں مگر بدقسمتی سے اس وقت کچھ ضروری سامان وہاں سے نکالنے اپنے مکان میں چلی گئی تھیں۔"

میرا دل غم سے بوجھل ہو رہا تھا۔ جمیلہ کے تصور ہی سے دل ڈوبنے لگتا تھا۔ کبھی ایک دم خون کھول اٹھتا اور جی چاہتا کہ ابھی یہاں سے نکل کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑوں اور جنہوں نے میری بیوی کو اغوا کیا ہے ان میں سے کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑوں۔ مگر میرے ہاتھ پیر باندھ دیئے گئے تھے۔ میں مجبور ہو چکا تھا۔ میں نے بوڑھے بنگالی سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں یہ لوگ میری بیوی کو کہاں لے گئے ہوں گے؟"

شرفو نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"بابو میاں جی! مشرقی پاکستان پر تو قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ ایک نہیں ہزاروں بہو بیٹیاں اغوا ہو گئی ہیں۔ میرپور اور محمد پور کا تو شاید ہی کوئی غیر بنگالی مسلمان گھر ہو گا جہاں سے کوئی عورت اغوا نہ ہوئی ہو۔ بازار میں ایک آدمی کہہ رہا تھا کہ مکتی باہنی والے ان عورتوں کو اغوا کر کے بھارت کے شہر کلکتہ میں لے گئے ہیں جہاں انہیں فروخت کر دیں گے۔"

میرے دل پر جیسے کسی نے زور سے مکا مار دیا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے اپنے دل کو سمیٹ کر وہیں بیٹھا رہا' کیا میری بیوی جمیلہ کو بھی کلکتے کی ہیرا منڈی میں فروخت کر دیا جائے گا؟ میرے اللہ' میرے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ شرفو مجھے حوصلہ دینے لگا۔

"بابو میاں! حاجی صاحب بھابھی کا سراغ لگا لیں گے۔ تم دیکھ لینا۔ جمیلہ بھابھی ضرور واپس آ جائے گی۔"

میں دیر تک چارپائی پر بیٹھا روتا رہا۔ رونے سے دل کا غبار کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ میں نے شرفو سے کہا۔

"اللہ کرے' اللہ کرے۔"

اس رات حاجی شمس الدین واپس نہ آیا۔ دوسرے دن کوئی گیارہ بجے وہ جب واپس آ گیا میں دیوانوں کی طرح اسے تکنے لگا۔ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کرم داد! تم نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جو کچھ مجھے معلوم ہو گا وہ اسی طرح تمہیں بیان کر دوں گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جمیلہ بھابھی کو مکتی باہنی کے لوگ دوسری اغوا کی ہوئی لڑکیوں کے ساتھ کلکتے لے گئے ہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان بدقسمت غیر بنگالی عورتوں کو ان لوگوں نے کلکتے میں کس جگہ رکھا ہوا ہے اور اگر انہیں بیچ دیا ہے تو کہاں کہاں بیچا ہے۔ اس کا کھوج تمہیں ان دو بنگالیوں سے لگ سکتا ہے جن کو میں جانتا ہوں۔ ان میں سے ایک کا نام دھرمو ہے' دوسرے کا نام مکھیا ہے۔ یہ دونوں ہندو بنگالی ہیں۔ ان میں سے مکھیا کے کلکتے والے ٹھکانے کا مجھے پتہ ہے۔ اگر تم گوارا کرو تو کسی طرح مکھیا کے ٹھکانے پر پہنچ کر تمہیں جمیلہ بھابھی کا سراغ مل سکتا ہے۔"

میں بے جان پتھر کے بت کی طرح حاجی شمس الدین کے سامنے بیٹھا تھا۔ میرے بدن کے اندر جیسے جوالا مکھی پھٹ رہے تھے۔ مگر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں پتھر ہو گیا تھا۔ میں نے حاجی صاحب سے کہا۔

"مجھے ہندو بنگالی مکھیا کا کلکتے کا ایڈریس دے دیں۔"

حاجی صاحب نے مجھے ایک کاغذ پر مکھیا کا ایڈریس لکھ کر دے دیا۔ کہنے لگے۔

"کرم داد! میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکا۔"

میں نے کہا۔

"حاجی صاحب! آپ نے میرے لیے جو کچھ بھی کیا ہے اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں آج شام اندھیرا ہوتے ہی چلا جاؤں گا جمیلہ کو ہندو بنگالی درندوں سے نجات دلانے کے لیے مجھ سے جو ہو سکا کروں گا۔"

حاجی صاحب نے کہا۔

"تم کہاں سے باڈر کراس کرو گے؟ تمہارا قد کاٹھ اور رنگ روپ ایسا ہے کہ فوراً پہچانے جاؤ گے کہ پنجابی ہو۔ ڈھاکہ سے لے کر کلکتے تک مکتی باہنی والے غیر بنگالیوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میں موت سے نہیں ڈرتا' صرف خدا سے ڈرتا ہوں۔ اگر اپنی بیوی کی تلاش میں مجھے موت بھی آ گئی تو وہ غیرت اور عزت کی موت ہو گی۔ میں یہاں بے غیرت بن کر بیٹھا نہیں رہوں گا۔"

حاجی صاحب نے مشورہ دیا کہ مجھے ڈھاکہ سے بوگرا کی طرف جانا چاہیے۔ وہاں ہلی کے مقام سے میں بھارت میں داخل ہو سکتا ہوں۔

"چونکہ ابھی بھارت کی فوجیں آ جا رہی تھیں اور لوگ بھی آتے جاتے رہتے ہیں اس لیے بارڈر پر کوئی چیکنگ پوسٹ نہیں ہے۔"

ریل گاڑی کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی مگر ان میں کوئی پنجابی' پٹھان سفر نہیں کرتا تھا۔ ہندو اور بھارتی مکتی باہنی والے راستے میں انہیں قتل کر دیتے تھے۔ لیکن مجھے اپنی جان کی پروا نہیں تھی' صرف مجھے سوچ سمجھ سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے جذبات پر بہت حد تک قابو پا لیا تھا اور ایک تربیت یافتہ کمانڈو بن کر ڈھاکہ سے کلکتے کی طرف فرار کا منصوبہ بنایا تھا۔ حاجی شمس الدین نے مجھے بھارتی کرنسی دے دی۔ یہ کوئی چھ سات ہزار روپے ہوں گے۔ میں نے اپنا حلیہ ہندو بنگالیوں والا بنایا اور رات کے نو بجے محمد پور سے نکل کر ایک رکشا لیا اور ڈھاکہ ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں تھا۔ ڈھاکہ کے بازار رات کے وقت تقریباً خالی پڑے تھے۔ پنجابیوں کی دکانیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی دکانیں کھلی تھیں۔ بھارتی فوجی گھوم پھر رہے تھے۔ میرا رکشا ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔

سٹیشن پر کافی رش تھا۔ سب بنگالی تھے۔ کسی پنجابی' پٹھان کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ سٹیشن پر جگہ جگہ بنگلہ دیش کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ میں نے بہادر گھاٹ نام کے سٹیشن کا ٹکٹ لے لیا۔ بہادر گھاٹ سے مجھے دریا پار کر کے بوگرا جانا تھا اور وہاں سے ہلی زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں سے آگے انڈیا کا باڈر شروع ہو جاتا تھا۔ میرا قد کاٹھ ضرور پنجابیوں والا تھا مگر رنگ زیادہ گورا نہیں تھا جس کی وجہ سے کسی نے میری طرف توجہ نہ

دی۔ ٹرین سوا دس بجے چلی۔ بڑا لمبا سفر تھا۔ ساری رات ٹرین چلتی رہی۔ اگلے روز دوپہر کے وقت بہادر گھاٹ آ گیا۔ یہاں سے میں نے ایک بڑی کشتی پر دوسرے بنگالی مسافروں کے ساتھ دریا عبور کیا اور بہادر گھاٹ کے دریا پار والے سٹیشن سے ٹرین میں بیٹھ کر بوگرا پہنچ گیا۔ ہلی میں بنگالی اور بھارتی فوجی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ بن وان نام کے ریلوے سٹیشن سے ٹرین آگے انڈیا کے بارڈر تک جاتی تھی۔ ابھی تک میرے ساتھ کسی قسم کا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ ہلی سے میں پیدل ہی بن وان سٹیشن کی طرف چل دیا۔ یہ میدانی علاقہ تھا۔ کئی جگہوں پر میں نے جلے ہوئے ٹینک اور ٹوٹی ہوئی توپیں الٹی پڑی دیکھیں۔ یہاں پاک فوج کے جوانوں نے بڑی بہادری سے انڈین فوج کی بھاری نفری اور توپ خانے کا مقابلہ کیا تھا اور مٹھی بھر جوانوں نے بھارتی فوج کی پوری بریگیڈوں کو تباہ کر دیا تھا۔ یہ توپیں اور جلے ہوئے ٹینک بھارتی فوج کی شکست کی تصدیق کر رہے تھے۔

ہلی اور بن وان سٹیشن کے درمیان کھیتوں میں سفر کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں انڈین ملٹری انٹیلی جینس کی نظروں میں آ گیا ہوں اور ایک آدمی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ پہلے تو میں نے کوئی خیال نہ کیا لیکن جب دو تین کھیتوں میں سے گزرنے کے بعد میں نے اسے اپنے پیچھے آتے دیکھا تو مجھے شک پڑ گیا۔ میں فوج کا سابق کمانڈو تھا اور اس قسم کی نقل و حرکت کو فوراً پہچان لیتا تھا۔ چنانچہ میں محتاط ہو گیا۔ محتاط ہو کر بھی میں یہی کر سکتا تھا کہ کسی طرح اس آدمی کو دھوکہ دے کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں مگر وہاں کوئی جنگل وغیرہ نہیں تھا۔ میدانی علاقہ تھا۔ کھیت ہی تھے جو اجڑے پڑے تھے۔ کہیں کہیں کوئی بنگالی کسان نظر آ جاتا تھا۔ جو آدمی میرا پیچھا کر رہا تھا وہ بھی بنگالی لباس میں تھا۔ اس نے میرے اور اپنے درمیان اتنا فاصلہ رکھا ہوا تھا کہ میں اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پاؤں۔ ایک جگہ درختوں کا ذخیرہ آ گیا۔ میں اس میں گھس گیا اور تیز تیز چلتا دوسری طرف نکل گیا۔ سامنے بن وان سٹیشن کے سگنل نظر آ رہے تھے۔ میں جلدی جلدی ان کی طرف چلنے لگا۔ یہاں جگہ جگہ بنگالی لوگ بنگلہ دیش کے جھنڈے لیے چل پھر رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ بھارتی فوجی بھی تھے۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

مجھے اپنے تعاقب میں لگا ہوا آدمی نظر نہ آیا۔ مگر میں محتاط ہی رہا۔ مجھے معلوم تھا انٹیلی جینس والا ایک بار شک کی بنا پر پیچھے لگ جائے تو پھر وہ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑا کرتا۔ میں سٹیشن کے آس پاس موجود لوگوں میں گھل مل گیا۔ مجھے یہاں سے ہلی کو جانے والی ٹرین پکڑنی تھی۔ میری جیب میں کافی روپے تھے مگر ٹکٹ کہاں سے ملتا ہے یہ معلوم نہیں تھا۔ میں نے ایک بنگالی سے بنگلہ میں پوچھا کہ ٹکٹ گھر کہاں ہے۔ اس نے ذرا چونک کر مجھے دیکھا۔ میرا بنگلہ زبان بولنے کا لہجہ بھی بنگالی نہیں تھا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں اس طرف چل دیا۔ ٹکٹ گھر کے آگے کافی لوگ تھے۔ قطار لگی ہوئی تھی۔ میں بھی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں کسی نے اردو میں مجھے پیچھے سے آواز دی۔

"کہاں جا رہے ہو تم؟"

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہی آدمی جو میرے پیچھے لگا ہوا تھا' تین مسلح بھارتی فوجیوں کو لیے میرے پیچھے کھڑا مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے بنگالی اردو میں جواب دیا کہ ہلی جا رہا ہوں۔ کیوں کیا بات ہے؟ اس آدمی نے بھارتی فوجیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اب آپ جانیں آپ کا کام۔ میری ڈیوٹی یہاں ختم ہوتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ایک طرف چلا گیا۔ تین بھارتی فوجیوں میں سے ایک صوبیدار میجر تھا۔ میں نے اس کے کاندھے کے نشان سے اس کا رینک پہچانا تھا۔ وہ کالے رنگ کا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ جاٹ رجمنٹ کا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑ کر قطار میں سے باہر نکال لیا اور ایک طرف لے جا کر پوچھا۔

"کیا تم پنجابی ہو؟"

میں نے سوچا کہ ان کے آگے جھوٹ بولنا بے کار ہے۔ میں نے کہا۔

"سر! میں پنجابی ہی ہوں۔ ڈھاکہ میں میری دکان اور مکان جلا دیا گیا ہے۔ جان بچا کر انڈیا کی طرف جا رہا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"میرے پاس چار ہزار روپے ہیں۔ وہ آپ لے لیں اور مجھے انڈیا کا باڈر کراس کرنے دیں۔"

بھارتی صوبیدار میجر مجھے گھور کر گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا شاید اس نے مجھے میرے قد کاٹ اور بولنے کے انداز سے پہچان لیا تھا کہ میں کوئی کاروباری پنجابی نہیں ہوں۔

"تم مجھے پاکستانی آرمی کے جوان لگتے ہو۔ تمہاری رجمنٹ کون سی تھی۔ تمہارا رینک کیا ہے۔"

میں نے اس کو ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی کہ میرا پاکستان آرمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے اس کی منت سماجت بھی کی۔ مگر وہ یہی کہتا رہا کہ میں پاک آرمی کا جوان ہوں اور وہ مجھے جنگی قیدی بنا کر ساتھ لے جائے گا۔ اس نے مجھ سے میری ساری بھارتی کرنسی بھی چھین لی اور اپنے فوجیوں کو آڈر دیا کہ میرے ہاتھ باندھ دیے جائیں۔ اگر ہم کسی جنگل میں ہوتے تو میں ان تینوں مسلح بھارتی فوجیوں کا صرف مقابلہ ہی نہیں کر سکتا تھا بلکہ ایک کمانڈو کی حیثیت سے ان تینوں کو ہلاک بھی کر سکتا تھا لیکن وہاں آس پاس بھارتی فوجی موجود تھے۔ میں بے بس تھا۔ میں نے بہت شور مچایا کہ میں پاکستانی فوجی نہیں ہوں، پنجابی دکاندار ہوں۔ مگر میرے ہاتھ پیچھے باندھ دیے گئے اور بھارتی فوجی مجھے لے کر سٹیشن پر بھارتی کمپنی کے ہیڈ کواٹر میں لے آئے۔ یہاں ایک سکھ کیپٹن تھا۔ وہ سر جھکائے ایک فائل پر کچھ لکھ رہا تھا۔ بھارتی صوبیدار میجر نے سلوٹ مار کر مجھے پیش کر دیا۔

"سر! یہ پاکستانی فوج کا جوان ہے۔ سویلین کپڑوں میں فرار ہو رہا تھا۔"

سکھ کیپٹن نے چہرہ اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور صوبیدار میجر سے کہا۔

"تم اس کو میرے پاس کیوں لے آیا ہے۔ اس کو کواٹر گارڈ میں بند کرو، جنگی قیدیوں کی گاڑی آئے تو اس میں بٹھا کر روانہ کر دو۔"

میں نے وہاں کافی شور مچایا اور سکھ کیپٹن کو پنجابی میں سمجھانے کی کوشش کی کہ میرا

پاک آرمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ڈھاکے میں فرنیچر کا کاروبار کرتا تھا۔ میری دکان جلا دی گئی ہے۔ میں مکتی باہنی والوں کے خوف سے جان بچا کر انڈیا جا رہا ہوں۔ مگر سکھ کیپٹن نے میری ایک نہ سنی اور بھارتی صوبیدار کو اشارہ کیا جو مجھے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ سٹیشن پر ہی ایک طرف عارضی فوجی کواٹر گارڈ بنی ہوئی تھی۔ مجھے اسی کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔

حالات نے یک لخت پلٹا کھا لیا تھا اور میرے راستے میں جیسے آہنی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ میں کسی حالت میں بھی جنگی قیدی بن کر بھارت کی قید میں نہیں جانا چاہتا تھا" لیکن مجھے جنگی قیدی بنا کر کواٹر گارڈ میں بند کر دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب مجھے سب سے پہلے بھارت کے جنگی کیمپ سے فرار ہونا تھا جو سخت مشکل اور دیر لگانے والا کام تھا اور اس کے بعد اپنی بیوی کی تلاش میں کلکتے واپس آنا تھا۔

میرا دماغ ایک لمحہ کے لیے سن ہو کر رہ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ فوجی کواٹر گارڈ سے فرار ہونا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہاں سے جنگی قیدیوں کی گاڑی میں بٹھا کر مجھے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھارت کے کون سے شہر کے قیدی کیمپ میں لے جایا جائے گا۔ ظاہر ہے قیدی کیمپ میں سیکورٹی کا بے حد سخت انتظام ہوگا۔ کہاں میں ہلی سے آگے بنگلہ دیش کا باڈر کراس کر کے آسانی سے بھارت میں داخل ہو کر کلکتے پہنچ سکتا تھا اور کہاں اب میرے سامنے ایک پہاڑ آ کر کھڑا ہو گیا تھا جس کو عبور کرنا میرے لیے تقریباً" ناممکن تھا۔ عام حالات میں اگر مجھے بھارت کے کسی جنگی کیمپ میں قید کر دیا جاتا تو میں وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر سکتا تھا اور ایک کمانڈو ہونے کی وجہ سے میں اس کوشش میں کامیاب بھی ہو سکتا تھا مگر اس آپریشن میں کافی وقت لگتا تھا اور میرے پاس وقت نہیں تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس دوران میری بدنصیب بیوی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا جائے اور وہ میری پہنچ سے دور ہو جائے۔ انڈیا بڑا وسیع ملک تھا۔ ایک خاص مدت گزر جانے کے بعد میرے لیے جمیلہ کو تلاش کرنا ناممکن ہو سکتا تھا۔

شام کے وقت مجھے فوجی کوارٹر گارڈ سے نکال کر تین مسلح بھارتی سپاہی میرے ہاتھ پیچھے باندھے ساتھ لے کر سٹیشن پر گئے۔ تھوڑی دیر میں وہاں پاکستانی جنگی قیدیوں کی ایک ٹرین آ کر کھڑی ہو گئی۔ ٹرین کے ڈبوں کی کھڑکیاں بند تھیں۔ اندر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دروازوں پر بھارتی فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ میرے ہاتھ کھول کر مجھے ایک ڈبے میں دھکیل دیا گیا اور بھارتی گارڈ سے کہہ دیا گیا کہ میں پاک فوج کی کسی رجمنٹ کا جوان ہوں اور سویلین کپڑوں میں فرار ہو رہا تھا۔ میں نے ڈبے میں دیکھا' ڈبہ پاکستانی فوجی جوانوں سے بھرا ہوا تھا۔ جوانوں کے چہروں پر ایک باوقار سکوت طاری تھا۔ ان کی آنکھوں میں بجلیاں سی چمک رہی تھیں۔ لگتا تھا شیروں کو زنجیروں میں جکڑ کر ڈبے میں بند کر دیا گیا ہے۔ سب فوجی وردیوں میں تھے۔ عہدے کی پٹی کسی جوان کے کاندھے پر نہیں تھی۔ وہاں صرف میں سویلین کپڑوں میں تھا۔ ٹرین ایک دو منٹ کے لیے رکی تھی۔ اس کے بعد وہاں سے چل پڑی۔ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ جب ٹرین کافی آگے نکل گئی تو پاکستانی فوج کے ایک قیدی جوان نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہارا تعلق کس رجمنٹ سے ہے؟ تمہارا رینک کیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"بھائی سچی بات یہ ہے کہ میں پاکستانی آرمی کا سابق حوالدار ہوں۔ فوج سے ریلیز لے کر ڈھاکے میں فرنیچر کا کاروبار کرتا تھا۔ مکتی باہنی والوں نے میرے مکان اور دکان کو آگ لگا دی۔ میں جان بچا کر ہلی کی طرف بھاگ نکلا کہ باڈر کراس کر کے انڈیا پہنچ جاؤں گا۔ مگر بھارتی فوجیوں نے مجھے پاک آرمی کا جوان سمجھ کر پکڑ لیا اور اب جنگی قیدی بنا دیا ہے۔"

کسی نے میری طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ سب غم زدہ خاموش چہرے لیے سر جھکائے بیٹھے رہے۔ جس جوان نے مجھ سے سوال پوچھا تھا وہ بھی میرا جواب سن کر خاموش رہا۔ ٹرین کافی رفتار سے دوڑی جا رہی تھی۔ یہ جنگی قیدیوں کی سپیشل ٹرین تھی۔ بن وان کے سٹیشن پر کسی خاص وجہ سے ٹرین تھوڑی دیر کے لیے رک گئی تھی۔ اس کے بعد وہ رن تھرو چلتی چلی گئی۔

اب میں اپنی لرزہ خیز داستان کو اس مقام پر واپس لاتا ہوں جہاں سے میں نے سفر شروع کیا تھا۔ یعنی میں پاکستانی جنگی قیدیوں کی ٹرین میں قیدی بن کر بیٹھا تھا اور ٹرین بنگلہ دیش کا باڈر کراس کر کے انڈیا کی سرزمین میں داخل ہوگئی تھی۔ اس دوران ایک دن اور ایک رات سفر کرتے گزر گئی۔ پاک فوج کے جوان میرے آس پاس اور سامنے بیٹھے تھے۔ ان سے تھوڑی بے تکلفی سی ہوگئی تھی۔ مگر اس دوران میں نے کسی جوان کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی۔ ان کے چہروں پر غیض و غضب کے اثرات تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ ان کے ہاتھوں سے زبردستی ہتھیار چھین کر انہیں بے بسی اور سخت مجبوری کی حالت میں بھارت کی قید میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ آپس میں زیادہ بات چیت بھی نہیں کر رہے تھے۔ میرے ساتھ دو تین جوانوں کی جو بے تکلفی ہوگئی تھی کہ وہ میری بات کا ہاں یا نہ میں جواب دے رہے تھے۔ جب میں نے انہیں اپنی اصل روداد الم سنائی تو ان پر بڑا شدید اثر ہوا۔ ایک جوان نے گالی دے کر کہا۔

"ان لوگوں نے ہم سب کو مروا دیا ہے۔"

خدا جانے اس جوان نے کس کو گالی دی تھی۔ میں خاموش رہا تھا کیونکہ مجھے سیاست کی کچھ سمجھ نہیں تھی۔ جس طرح پاک فوج کے دوسرے جوان سیاسی لیڈروں کی سازشوں اور جوڑ توڑ سے بے خبر تھے۔ مجھے اپنی مصیبت پڑی ہوئی تھی۔ میں ٹرین سے چھلانگ لگا کر بھاگ جانا چاہتا تھا اور ٹرین کلکتے سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے کلکتہ جانا تھا۔ میں نے اپنے ساتھ والے جوان پر جب اپنے دل کا حال ظاہر کیا تو وہ آہستہ سے کہنے لگا۔

"ٹرین کی کھڑکیوں پر تختے ٹھونک دیے گئے ہیں۔ ڈبے کا ایک دروازہ بھی بند ہے۔ دوسرے دروازے پر بھارتی گارڈ موجود ہے۔ نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ۔ آگے کچھ پتہ نہیں ہمیں کس شہر کے جنگی کیمپ میں لے جایا جائے۔"

ٹرین کی ہر بوگی کی دونوں جانب بھارتی فوجیوں کے ڈبے لگے ہوئے تھے۔ دن کا وقت تھا۔ راستے میں ایک جگہ ٹرین کسی چھوٹے سے سٹیشن پر کھڑی ہوئی تو باہر فوجیوں کے

بوٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ یہاں قیدیوں کو دال روٹی دی گئی۔ کسی کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ جو ایک دروازہ کھلا تھا وہاں مسلح بھارتی فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ یہاں ڈبے میں دو اور بھارتی فوجی داخل ہوگئے۔ ٹرین چل پڑی۔ میں نے باتھ روم جانے کا اشارہ کیا۔ ایک بھارتی فوجی مجھے لے کر باتھ روم تک گیا۔ وہ دروازے کے باہر کھڑا ہوگیا۔ اس نے مجھے آڈر دینے کے انداز میں کہا۔

"دو منٹ سے زیادہ دیر نہیں کرنی۔"

ٹرین کی لیٹرین کی کھڑکی پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ اتنی ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھیں کہ میں بمشکل ہاتھ باہر نکال سکتا تھا۔ باہر کھیت پیچھے کو جاتے نظر آرہے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں نے لوہے کی سلاخوں کو دو تین جھٹکے دیے۔ سلاخیں بڑی مضبوطی سے لگی ہوئی تھیں۔ باہر سے بھارتی فوجی نے دروازے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"باہر نکلو اندر کیا کر رہا ہے؟"

میں مایوس چہرہ لیے باہر نکل آیا اور اپنی جگہ پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ مجھے ہر حالت میں اس ٹرین سے فرار ہونا تھا۔ میرے حالات ہی کچھ اور تھے۔ میں بھارت کے کسی بھی جنگی کیمپ میں قید ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک بار میں قیدی کیمپ میں داخل ہوگیا تو پھر وہاں سے فرار ہونا میرے لیے مشکل ہو جائے گا۔ میرے ساتھ جو پاک آرمی کا جوان بیٹھا ہوا تھا میں نے اس کو آہستہ سے کہا۔

"میں آج رات اندھیرا ہوتے ہی فرار ہو جاؤں گا۔"

میں نے اسے یہ بالکل نہیں بتایا تھا کہ میں پاکستان آرمی کا سابق عہدے دار ہوں اور میرا تعلق کمانڈو فورس سے تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"دروازے میں اب ایک کی بجائے دو انڈین سپاہی کھڑے ہیں تم سویلین ہو۔ کوئی فوجی کمانڈو نہیں ہو کیسے چھلانگ لگا کر بھاگو گے؟"

میں نے کہا۔

"جو ہوگا دیکھا جائے گا میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا ہے آج رات کو کر گزرنا ہوگا۔"

پاک فوج کے جوان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنا سر بند کھڑکی کے تختے کے ساتھ لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے ڈبے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک بھارتی فوجی کھلے دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دوسرا سنتری بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں کے پاس سٹین گنیں تھیں۔ میرا ذہن تیزی سے منصوبہ تیار کرنے لگ گیا کہ مجھے کس طرح دروازے میں سے باہر کودنا ہوگا۔ ٹرین کافی تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی تھی۔ دروازے میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔

دن غروب ہونے لگا تو دروازے میں سے آتی روشنی ماند پڑنے لگی۔ پھر بہت جلد یہ روشنی بھی غائب ہوگئی۔ ڈبے کے بلب جلنے لگے۔ میں صرف ایک صورت میں ڈبے سے باہر کود سکتا تھا کہ دروازے میں کھڑا سنتری اونگھنے لگے یا بیٹھ جائے۔ ایسا رات کے وقت ہی ہو سکتا تھا۔ میں انتظار کرتا رہا اور ٹرین بھارت کی سرزمین پر کلکتے سے مزید آگے نکلتی چلی گئی۔ میں ٹرین کو نہ تو روک سکتا تھا' نہ اسے پیچھے کی طرف جانے پر مجبور کر سکتا تھا۔ میرے پاس صرف ایک ہی موقع رہ گیا تھا کہ جیسے ہی دروازے میں کھڑا بھارتی سنتری غافل ہو میں دوڑ کر دروازے میں سے باہر کود جاؤں۔ باہر خواہ پتھروں پر گروں' چاہے دریا میں گروں یہ میری قسمت تھی۔ ہمیں فوج میں کمانڈو ٹریننگ کے دوران ہوائی جہازوں سے پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگانے کی مشق کرائی جاتی تھی یا کسی بلند جگہ سے کودنا ہوتا تھا تو ہمیں ہدایت کی جاتی تھی کہ نیچے اپنے پنجوں کے بل زمین پر گریں اور اپنے سر اور اپنے وجود کو جتنا پیچھے کی طرف رکھ سکتے ہیں' رکھیں۔ مجھے بلندی سے کودنے کی کافی مشق تھی۔ اگرچہ اس بات کو تین سال گزر گئے تھے لیکن یاد رکھیں کمانڈو کی ٹریننگ اتنی سخت اور پکی ہوتی ہے کہ وہ مرتے دم تک کمانڈو ہی رہتا ہے۔

رات ہوگئی' کھلے دروازے کے باہر اندھیرا چھا گیا۔ میری نظریں تھوڑی دیر

بعد دروازے میں کھڑے انڈین سنتری کو دیکھ لیتی تھیں۔ شام کے بعد پہلے والے کی جگہ پر دوسرا سنتری کھڑا ہو کر پہرہ دینے لگا تھا۔ وہ تازہ دم تھا۔ اس لیے بڑا چاق و چوبند ہو کر کھڑا تھا لیکن آخر اس پر بھی نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا۔ گاڑی کی رفتار ابھی تک ہلکی تھی۔ وہ چند لمحے پہلے کسی شہر کے ریلوے سٹیشن کو چھوڑتی ہوئی گزری تھی۔ کھلے دروازے میں سے شہر کی اور ریلوے سٹیشن کی روشنیاں کچھ دیر تک اندر آتی رہی تھیں۔ میں کوئی اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ ٹرین کھیتوں میں سے گزر رہی ہے یا کسی سنگلاخ میدان میں سے گزر رہی ہے۔ صرف دریا کے پل پر سے گزرتے وقت مجھے ٹرین کے پہیوں کی آواز سے پتہ چل جاتا تھا کہ ٹرین دریا کے پل پر سے گزر رہی ہے۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا کم بخت انڈین سپاہی اسی طرح کھڑا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ دروازے سے ٹیک لگا کر اونگھنے لگا۔ اس کا ساتھی سنتری پہلے ہی دروازے سے ذرا پیچھے ہو کر ڈبے کی دیوار سے لگ کر گردن ایک طرف ڈھلکائے گہری نیند سو رہا تھا۔ میں ڈبے سے کودنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔ کمانڈو فوج سے سبک دوش ہونے کے بعد بھی اپنی ٹریننگ کو نہیں بھولتا۔ لیکن وقت گزرنے اور سویلین کی زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے بدن کی وہ پھرتی اور سختی کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ تین سال میں میرے جسم میں وہ سختی اور پھرتی نہیں رہی تھی۔ لیکن یہ میری زندگی اور موت کا' میری عزت اور غیرت کا معاملہ تھا۔ قدرتی طور پر میرے بدن میں ایک زبردست توانائی پیدا ہو گئی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ میں چٹان سے ٹکرا کر اسے بھی ریزہ ریزہ کر سکتا ہوں۔ میرے ساتھ جو پاک فوج کا جوان بیٹھا وہ اونگھ رہا تھا۔ میں نے اسی سے بات کرنے کی بالکل کوشش نہ کی اور دروازے میں کھڑے بلکہ جھک کر اونگھتے ہوئے بھارتی سنتری کو مسلسل تکنے لگا۔ وہ اونگھتے اونگھتے ذرا نیچے کو جھکتا اور پھر جلدی سے سیدھا ہو جاتا تھا۔ لیکن اس پر نیند کا بھرپور غلبہ تھا۔

قدرت نے میرے لیے راستہ صاف کر دیا۔ سنتری ایک بار اونگھتے ہوئے نیچے کو جھکا تو اس نے سٹین گن کندھے سے اتار کر گود میں رکھی اور وہیں دروازے میں بیٹھ گیا۔ چند

لمحوں کے بعد وہ بھی اپنے دوسرے ساتھی کی طرح سر دیوار سے لگائے سو رہا تھا۔ مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا۔ میں نے ایک نگاہ ڈبے میں ڈالی' تقریبا" سبھی جوان سو رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ میرا ساتھی بھی سر کھڑکی کے تختے کے ساتھ لگائے سو رہا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اپنے جسم کو سمیٹ کر آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا اور دبے دبے پاؤں اٹھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہی کوئی چار پانچ قدموں کے فاصلے پر تھا۔ ڈبے کی روشنی دونوں فوجیوں کے چہروں پر پڑ رہی تھی جو غافل ہو کر سو رہے تھے۔ ڈبے کی آخری سیٹ پر بیٹھے ہوئے پاک فوج کے ایک جوان نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پاک فوج کے جوان نے انگلی سے مجھے ایسے اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ چھلانگ لگا دو' اس وقت موقع ہے۔

میں نے کھلے دروازے میں سے باہر کی جانب دیکھا۔

باہر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ گاڑی کا بڑا شور بلند ہو رہا تھا۔ اچانک ٹرین کے انجن نے سیٹی بجائی میں وہیں بیٹھ گیا۔ اس خیال سے کہ سیٹی کی آواز پر کہیں انڈین فوجی جاگ نہ پڑے۔ مگر وہ دونوں سنتری گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ انجن کی سیٹی کی آواز سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ یا تو کوئی سٹیشن قریب آ رہا ہے یا دور سے انجن ڈرائیور نے انجن کی روشنی میں لائن پر کوئی چیز گزرتی دیکھی ہے۔ ٹرین اسی رفتار سے فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ باہر سے چھلانگ لگانے سے یہ خطرہ بھی تھا کہ میں کسی ریلوے پھاٹک یا کسی ندی نالے کے پل یا پتھروں کے اوپر گرا تو زندہ نہیں بچوں گا۔ لیکن اس وقت مجھے موت کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں فورا" اس ٹرین سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے میری بیوی جمیلہ کی شکل بار بار آ رہی تھی کہ اسے گھسیٹ کر ایک مکان کے اندر لے جایا جا رہا ہے اور وہ رو رہی ہے۔

میں نے اپنے پورے جسم کو جیسے پاؤں کے پنجوں پر اٹھا لیا اور دو تین قدم تیزی سے اٹھائے اور پھر اللہ کا نام لے کر اپنے آپ کو ڈبے سے باہر گرا دیا۔ باہر گرتے ہی تیز ہوا

کے تھپیڑوں نے مجھے ذرا سا اوپر اچھال کر آگے کی طرف اوپر اٹھایا اور پھر زمین پر گرا دیا۔ میں نے اپنے جسم کو اس چھلانگ کے لیے پوری طرح تیار کر رکھا تھا اور جسم کو گیند کی طرح اکٹھا کر لیا ہوا تھا۔ میں دھپ سے زمین پر گرا اور بجائے آگے کی طرف لڑھکنے کے زمین کے اندر دھنس گیا۔ یہ میری بے حد خوش قسمتی تھی کہ میں ایک ایسے کھیت میں گرا تھا جس میں چھوٹی چھوٹی فصل اگی ہوئی تھی اور شاید دن کے وقت پانی دیا ہوا تھا جو اب کیچڑ کی طرح بن چکا تھا۔ میں کیچڑ میں گرا تھا۔ کھیت کا کیچڑ بالکل دلدل کی طرح ہوتا ہے۔ میں کھیت کی دلدل پر گرا تھا اور چونکہ میری رفتار بھی ٹرین کی رفتار کے برابر تھی اس لیے گرتے ہی وہیں آگے کی جانب چھ سات قدم تک رول ہوتا چلا گیا اور جب رکا تو میں کیچڑ میں لت پت ہو چکا تھا۔ یہ فروری کا مہینہ تھا۔ رات کو سردی ہو جاتی تھی مگر بھارت کے مشرقی علاقوں میں اتنی زیادہ سردی نہیں پڑتی اور کلکتے اور بہار کے علاقے میں دسمبر جنوری میں بھی پنجاب کے علاقوں والی سردی نہیں ہوتی۔ میں جلدی سے اٹھا اور محسوس کیا کہ مجھے کہیں بھی کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ میں نے ریلوے لائن کی طرف دیکھا جس ٹرین سے میں نے چھلانگ لگائی تھی اس کے آخری ڈبے کی سرخ بتی دور ہوتی جا رہی تھی اور اب انگارے کی طرح لگ رہی تھی۔

میں کھیت سے باہر نکل آیا۔ میرے سارے کپڑے بلکہ سارا جسم کھیت کے کیچڑ میں لت پت ہو گیا تھا۔ میں نے ریلوے لائن کراس کی اور دوسری طرف جو کھیت تھے ان کی اونچی فصل میں گھس گیا اور پیچھے کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔ اس بات کا امکان کم تھا کہ میرے فرار کا علم میرے ڈبے کے بھارتی سنتریوں کو ہو۔ لیکن خدشہ ضرور تھا کہ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ میں ڈبے سے فرار ہو گیا ہوں تو شاید ٹرین میری تلاش میں واپس آ جائے۔ لیکن اس بات کا امکان بھی بہت کم تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اگلے سٹیشن پر اگر گاڑی رکے اور میرے فرار کا پتہ چل جائے تو ٹرین کی بھارتی فوجی گارڈ وائرلیس پر پیچھے کی چھاؤنی میں یا آگے کے کسی فوجی ہیڈ کوارٹر کو اطلاع کر دے اور اس سارے علاقے میں میری تلاش شروع ہو جائے۔ لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں تھی کہ ساری کی ساری ٹرین

واپس آ جائے اور اسی وقت علاقے میں میری تلاش شروع ہو جائے۔ چنانچہ میں کسی حد تک بے فکر سا ہو گیا تھا۔ میں پیچھے کی جانب اس طرح کھیتوں میں چل رہا تھا کہ ہر قدم پر ریلوے لائن سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

رات کا اندھیرا گہرا تھا اردگرد کہیں کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ آگے کافی فاصلے پر ایک ریلوے سگنل کی سبز بتی سبز نقطے کی طرح ٹمٹما رہی تھی۔ شاید اس سگنل کی بتی سُرخ تھی اور سگنل ڈاؤن نہیں ہوا تھا جس کو دیکھ کر انجن نے وسل دیا تھا۔ آسمان پر بے شمار ستارے چمک رہے تھے۔ ان کی دھندلی دھندلی چمک میں مجھے اردگرد کے کھیت نظر آنے لگے تھے۔ کیچڑ میں لت پت ہونے کی وجہ سے مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ بنگال بہار کے علاقے میں میں دو ایک بار پہلے بھی آ چکا تھا۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ فروری کے مہینے میں بنگال میں رات کو اتنی ٹھنڈ نہیں ہوتی جتنی مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ میں بنگال سے آگے صوبہ بہار میں داخل ہو چکا تھا۔ کیونکہ بہار میں آتے آتے سردی شروع ہو جاتی تھی۔ پاکستان کی نئی نسل کو انڈیا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ نہ اس کی تاریخ کا علم ہے' نہ اس کے جغرافیے کا کچھ پتہ ہے۔ نئی نسل کو یہ بھی پوری طرح سے معلوم نہیں کہ حضرت علامہ اقبال نے برصغیر میں مسلمان کے لیے ایک علیحدہ مملکت کا تصور کیوں پیش کیا تھا اور قوم نے قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں پاکستان کیوں بنایا تھا۔ نئی نسل صرف انڈیا کے گانے سننا اور ڈش انٹینا پر اس کی فلموں کے ڈانس ناچ دیکھنا ہی جانتی ہے۔ اسے یہ تک نہیں معلوم کہ بھارت میں ہندو قوم کا راج ہے جو ازل سے اسلام کی دشمن ہے اور جس نے پاکستان کے وجود کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا اور جس کی حکومت نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ پاکستان کو کبھی خوشحالی اور ترقی کی منزل کی طرف گامزن نہیں ہونے دیں گے اور جس نے ہندوستان میں آباد کروڑوں مسلمانوں کو باقاعدہ اپنا غلام بنا رکھا ہے اور جس نے حال ہی میں مسلمانوں کی تاریخی بابری مسجد کو شہید کروا دیا تھا۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کو ساری دنیا جانتی ہے' نہیں جانتی تو ہماری نئی نسل کے نوجوان نہیں جانتے اور جن کو ان حقائق سے روشناس کرانے کی اشد ضرورت ہے اور

میں انہیں ان حقائق سے روشناس کراتا رہتا ہوں۔ ہندو سکھوں میں بھی اچھے لوگ ہیں' لیکن یہاں انفرادیت کی بات نہیں ہو رہی۔ یہاں پوری ہندو قوم کی بات ہو رہی ہے۔ ہندو حکومت کی' ہندو راج کی بات ہو رہی ہے جس کو پاکستان کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے اور جو اسے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ بھارت میں ہمیشہ ہندو کی حکومت رہی ہے اور ہر حکومت ہندو قوم کو یہ نعرہ دے کر اقتدار سنبھالتی ہے کہ وہ نہ صرف بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کی شدھی کر کے انہیں ایک دن ہندو بنا دے گی بلکہ پاکستان کو بھی ختم کر کے اسے دوبارہ بھارت میں شامل کر دے گی۔ یہ میں کوئی سنی سنائی بات نہیں کر رہا۔ اس حقیقت سے ہر کوئی واقف ہے بلکہ اب تو ہندو سیاسی جماعتوں کے لیڈر سٹیج پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ بھارت کے مسلمانو! یا ہندو بن کر بھارت میں رہو اور اگر ہندو بن کر نہیں رہنا تو بھارت سے نکل جاؤ۔ یہ ہے اس ہندو قوم کی اصلیت۔ جو دوسرے ملکوں کے سامنے جمہوریت کی رٹ لگاتے ہوئے نہیں تھکتی۔ آپ تو پاکستان میں رہتے ہیں۔ ہماری نئی نسل میں سے نناوے فی صد نوجوانوں نے ہندو کو نہیں دیکھا وہ اس کی ذہنیت کو کیا سمجھیں گے۔ ہماری نئی نسل تو ہندو کو ڈش انٹینا کے چینل پر فحش ڈانس کرتے' فحش گانے گاتے دیکھتی ہے۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ متعصب کٹر ہندو قوم ہے جس نے بابری مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اسے شہید کر دیا تھا اور جس کی حکومت آج کشمیریوں پر اپنی فوج مسلط کر کے ہر قسم کے انسانیت سوز مظالم ڈھا رہی ہے۔

بہرحال ایک ادیب اور محب وطن ادیب ہونے کے ناطے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں وہ اپنی نئی پاکستانی نسل کے نوجوانوں کو بھی دکھا دوں تاکہ وہ صرف عبرت ہی نہ پکڑیں بلکہ اپنے دشمن سے ہوشیار رہیں۔ میری پوری داستان سے بھی جو میں آپ کو سنا رہا ہوں اور جو میری آپ بیتی ہے یہی مطلب نکلتا ہے کہ اپنے دشمن سے ہوشیار رہیں۔ اپنے ملک پاکستان کی سرحدوں کو پہچانیں اور اپنے فرض کو ادا کریں جو اسلام کی طرف سے اور پاکستان کی عظمت اور حرمت کی طرف سے آپ پر عائد ہوتا

ہے۔ کیونکہ اسی راہ پر چل کر قومیں ترقی کرتی ہیں اور عزت و وقار کی زندگی بسر کرتی ہیں اور تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف میں لکھا جاتا ہے۔

اب میں واپس اپنی داستان کی طرف آتا ہوں۔

اگر آپ بھارت کے صوبہ بنگال سے مشرقی پنجاب کی طرف آئیں تو بنگال کے آگے بہار کا صوبہ آتا ہے۔ بنگال میں سردیوں میں بھی موسم خوشگوار رہتا ہے۔ صوبہ بہار میں جیسے جیسے آپ آگے اتر پردیش کی طرف آتے جائیں گے سردی بڑھتی جائے گی۔ رات کی خنکی مجھے بتا رہی تھی کہ میں صوبہ بنگال سے نکل آیا ہوں اور صوبہ بہار کے علاقے میں ہوں کیونکہ رات سرد تھی۔ چلنے سے اور ہوا لگنے سے میرے کپڑوں اور جسم کے ساتھ چپکا ہوا کیچڑ خشک ہوتا جا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر راستے میں کوئی تالاب آگیا تو میں اس میں نہا کر اور کپڑے دھو کر اپنے آپ کو صاف کر لوں گا۔ بنگال کے اکثر دیہات میں اور صوبہ بہار میں کہیں کہیں دیہات میں یا دیہات سے باہر تالاب مل جاتے ہیں جہاں عورتیں پانی بھی بھرتی ہیں، کپڑے بھی دھوتی ہیں اور تنگ ساڑھیاں باندھ کر نہاتی بھی ہیں۔ ستاروں کی روشنی اگرچہ دھندلی تھی مگر مجھے ہر شے نظر آنے لگی تھی۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں میں ٹرین سے چھلانگ لگانے کے بعد آگے کی طرف جانے کی بجائے پیچھے کی طرف جا رہا تھا۔ کیونکہ مجھے کلکتے پہنچنا تھا۔ ٹرین کا سفر مجھے بتا رہا تھا کہ میں کلکتے سے کافی دور آگے کی طرف نکل آیا ہوں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میں کسی سٹیشن پر پہنچ گیا تو کسی ٹرین میں بیٹھ کر کلکتے کی طرف نکلنے کی کوشش کروں گا۔ میرے ڈھاکہ کے دوست حاجی شمس الدین نے مجھے انڈین کرنسی میں جو چھ سات ہزار روپے دیئے تھے وہ سارے ہلی سٹیشن کے علاقے میں بھارتی فوجیوں نے مجھ سے چھین لیے تھے۔ لیکن میں نے ہزار ہزار روپے کے دو نوٹ اور ایک نوٹ سو روپے کا رومال میں لپیٹ کر اپنی ٹانگ کے ساتھ پاجامے کے اندر چلتے وقت باندھ لیے تھے۔ وہ رقم میرے پاس محفوظ تھی۔ رومال میں بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے یہ بھارتی نوٹ کیچڑ میں لت پت ہونے اور بھیگنے سے بچ گئے تھے۔ میں نے ایک جگہ بیٹھ کر رومال میں سے سو روپے

کا نوٹ نکال کر اپنے کرتے کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ باقی ہزار ہزار روپے کے دونوں نوٹ اسی طرح رومال میں لپیٹ کر ٹانگ کے ساتھ اوپر کر کے باندھ لیے تھے۔

میرے اردگرد کافی فاصلے پر کہیں کہیں پہاڑیوں کے خاکے نظر آرہے تھے۔ زمین کہیں میدانی تھی، کہیں اونچی نیچی ہو جاتی تھی۔ کہیں کھیت آ جاتے تھے اور کہیں بنجر قسم کا میدان آجاتا تھا۔ میں ایک گاؤں کے قریب سے گزرا۔ ایک دو جگہوں پر مٹی کے تیل کی لالٹین جل رہی تھی۔ میری بو پا کر دور کوئی کتا تھوڑی دیر بھونک کر چپ ہوگیا۔

میں ایک کچے راستے پر جا رہا تھا۔ گاؤں سے آگے جا کر ایک تالاب آگیا۔ تالاب کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں سیڑھیوں میں بیٹھ گیا اگرچہ مجھے سردی لگ رہی تھی لیکن اپنے آپ کو اور کپڑوں کو کیچڑ سے صاف کرنا بھی ضروری تھا۔ میں نے کپڑے اتار کر انہیں تالاب کے ٹھنڈے پانی سے اچھی طرح دھویا۔ پھر نچوڑ کر ایک جھاڑی پر ڈال دیا۔ اسکے بعد اپنے جسم پر پانی ڈال کر جسم کو اور سر میں لگے ہوئے کیچڑ کو صاف کیا۔ جلدی سے گیلے کپڑے ہی پہن لیے کیونکہ ننگے بدن سردی محسوس ہو رہی تھی۔ گیلے کپڑے پہلے تو بڑے ٹھنڈے لگے لیکن ذرا دیر بعد ہی جسم کی گرمی سے ان کی ٹھنڈک بہت حد تک دور ہوگئی۔ میں نے بھی اس خیال سے تیز تیز چلنا شروع کردیا کہ تیز چلنے سے جسم گرم ہو گا اور سردی کا احساس بھی کم ہو جائے گا اور کرتا پاجامہ بھی سوکھ جائیں گے۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ میرا خیال ہے رات کے نو بجے کا وقت ہو گا۔ کیونکہ میں نے شروع رات میں ہی ٹرین سے چھلانگ لگائی تھی۔ میں کچے راستے پر چلتا رہا۔ اندھیری رات میں کسی گاؤں کی جھونپڑیاں سی نظر آئیں اور میں ان سے دور دور رہ کر آگے نکل جاتا۔ میری نگاہ دور آسمان پر لگی تھی کہ شاید کہیں ریلوے کا کوئی سگنل نظر آ جائے۔

آخر مجھے دور سے ایک سرخ بتی ٹمٹماتی نظر پڑی۔

میں اس کی طرف بڑھنے لگا۔ تھوڑی دور گیا ہوں گا کہ سرخ بتی ایک دم سبز ہو گئی۔ یہ ریلوے سگنل ہی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پیچھے بہار کے کسی شہر کی جانب سے کوئی گاڑی آ رہی تھی۔ یہ گاڑی کلکتے کی طرف ہی جا رہی ہوگی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ لیکن

میں سٹیشن سے کافی پیچھے تھا اسی دوران مجھے انجن کے وسل کی دور سے آتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا دور کافی فاصلے پر مجھے اندھیرے میں ایک ریل گاڑی کے ڈبوں کی جھلملاتی ہوئی روشنیاں دکھائی دیں۔ پھر ٹرین کی ہلکی ہلکی آواز آنے لگی۔ ٹرین آگے کی طرف چلی جا رہی تھی۔ میں چلتا بھی رہا اور ٹرین کو دور سے دیکھتا بھی رہا۔ جب ٹرین ریلوے سگنل کے نیچے سے گزر گئی تو تو اس کی سبز بتی پھر سے سرخ ہو گئی۔ میں اس ٹرین کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ لیکن یہ جان کر مجھے حوصلہ ہو گیا تھا کہ میں کسی ریلوے سٹیشن پر پہنچ گیا ہوں' جہاں سے مجھے کلکتے کی طرف جانے والی گاڑی ضرور مل جائے گی۔ یہ احساس ضرور تھا کہ اس ٹرین میں سے کچھ بھارتی فوجی میری تلاش میں وہاں نہ آ گئے ہوں' لیکن اس کا امکان بہت کم تھا۔ ویسے بھی ان لوگوں کو میرا حلیہ معلوم نہیں تھا۔ میرا لباس بھی بنگالی تھا اور میں بنگلہ زبان بھی بول لیتا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد میں ایک ریلوے سٹیشن پر آ گیا۔

یہ بے رونق سادہ سا دیہاتی سٹیشن تھا۔ جس ٹرین کو میں نے دیکھا تھا وہ جا چکی تھی۔ پلیٹ فارم سرد رات میں سنسان پڑا تھا۔ سٹیشن کی ڈیوڑھی میں کچھ مسافر ضرور بیٹھے اونگھ رہے تھے بلکہ سو رہے تھے۔ کھدر کے بنگالی ٹائپ کے کرتے پاجامے میں مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن میں تو اپنی طرف سے کلکتے جانے کے لیے نکلا تھا جہاں اس موسم میں کوٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ ٹکٹ گھر کھلا تھا' اندر ایک بوڑھا بہاری بابو بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں سے کلکتے کو اگلی گاڑی کب جائے گی۔ اس نے نیند بھری آواز میں کہا۔

"رات کو ایک بجے جائے گی۔"

میرے لیے وہاں رات کے ایک بجانے قیامت بن گئے۔ خالی بنچ پر بیٹھا تو سردی نے بیٹھنے نہ دیا' لیٹ گیا تو زیادہ سردی لگنے لگی۔ بس کبھی چل کر کبھی بیٹھ کر آدھی رات گزار دی۔ آدھی رات کے بعد ٹی سٹال کھل گیا۔ میں نے چائے بھی پی اور اس کے ساتھ دو بند مکھن بھی کھائے۔ بڑی بھوک لگی تھی۔ چائے کے دو گلاس پیئے تو جسم میں گرمائش آ

گئی۔ کلکتے کا ٹکٹ میں نے پہلے ہی خرید رکھا تھا۔ گاڑی آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ معلوم ہوا ٹرین لیٹ ہے۔ رات کے اڑھائی بجے پیچھے سے ایک ٹرین آ کر رکی۔ ڈبوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ تقریباً سبھی مسافر سو رہے تھے۔ میں ایک کمپارٹمنٹ میں داخل ہو کر سامان کے پاس فرش پر ہی بیٹھ گیا۔

یہ گاڑی اگلے روز دن کے گیارہ بجے کلکتے پہنچی۔

میرے ڈھاکہ کے بنگالی دوست حاجی شمس الدین نے مجھے کلکتے میں اپنے ایک مسلمان بنگالی دوست کا ایڈریس بھی دیا تھا اور کہا تھا کہ میں انہی کے پاس جا کر ٹھہروں۔ اس کا نام حاجی فرید احمد تھا اور وہ بہو بازار میں گھڑیوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ وہاں اس کی اپنی دکان تھی۔ کلکتے میں موسم خوشگوار تھا۔ سردی بالکل نہیں تھی بلکہ دھوپ میں گرمی لگتی تھی۔ اس شہر میں میں ایک دو بار ویزے پر پہلے بھی آ چکا تھا۔ رکشا لے کر میں بہو بازار آ گیا۔ وہاں ایک جگہ سے حاجی فرید احمد گھڑی ساز کا پوچھا اور اس کی دکان پر پہنچ گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کا سانولے رنگ کا دبلا پتلا آدمی سر پر حاجیوں والی سفید ٹوپی پہنے آنکھوں پر محدب شیشے کی عینک لگائے ایک گھڑی کی مرمت کر رہا تھا۔ چھوٹی سی دکان تھی جس میں اندر جانے کا راستہ بھی تھا۔ شوکیس میں گھڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر اس آدمی نے عینک اتار کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے سلام کیا اور کہا کہ میں ڈھاکہ سے آ رہا ہوں اور مجھے حاجی شمس الدین نے حاجی فرید احمد کے پاس بھیجا ہے۔

اس نے کہا۔

"میں ہی حاجی فرید احمد ہوں۔ تشریف رکھیں۔"

میں دیوار کے ساتھ لگے بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے مختصر کر کے اسے اپنی ساری بپتا سنائی تو وہ بڑا متاثر ہوا۔ کہنے لگا۔

"مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں آپ کے لیے کروں گا۔"

اس نے میرے لیے چائے منگوائی۔ پھر دکان کے باہر کھڑے ہو کر کسی کو آواز دی ایک لڑکا ساتھ والی دکان سے نکل کر آ گیا۔

حاجی صاحب نے اسے بنگلہ میں کہا۔

"یہاں دکان پر بیٹھو' میرے مہمان آئے ہیں۔"

حاجی صاحب مجھے لے کر اپنے فلیٹ پر آگئے جو دکان کے پہلو میں ایک گلی میں واقع تھا۔ انہوں نے مجھے کھانا کھلایا۔ اس کے بعد چائے منگوائی اور کہنے لگے۔

"تم نے دھرمو اور مکھیا جن دو ہندو بنگالیوں کے نام بتائے ہیں اور جو ایڈریس تمہیں شمس الدین نے لکھ کر دیا ہے' یہ جگہ جرائم پیشہ لوگوں کا گڑھ ہے۔ میں تمہیں اکیلے وہاں جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ اس وقت کلکتے میں مکتی باہنی والے بے شمار پنجابی اور بہاری مسلمان لڑکیاں بنگلہ دیش سے اغوا کر کے لائے ہیں اور انہیں ادھر ادھر بیچ رہے ہیں۔ مجھے ایک دن کی مہلت دو۔ میں اپنے اثر رسوخ سے تمہاری بیوی کا کھوج لگانے کی پوری کوشش کروں گا۔"

حاجی فرید احمد کا مشورہ مجھے ہر حالت میں قبول کرنا پڑا۔ کیونکہ میں اکیلا ایک اجنبی شہر میں' اجنبی لوگوں سے وہ سب کچھ معلوم نہیں کر سکتا تھا جو حاجی فرید معلوم کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ دوپہر کے بعد حاجی فرید احمد مجھے اپنے فلیٹ میں چھوڑ کر اپنی مہم پر نکل گیا۔ شام ہو رہی تھی جب وہ واپس آیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

"کچھ پتہ چلا۔"

وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ حالات غیر موافق ہیں۔ کہنے لگا۔

"میں نے اپنے خاص ذریعے سے معلوم کیا ہے کہ تم نے اپنی بیوی کا جو حلیہ اور نام بتایا ہے اس حلیے اور اس نام کی عورت اس وقت کلکتے میں نہیں ہے۔"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر وہ کہاں ہے؟"

حاجی فرید احمد سب کچھ معلوم کر کے آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"میرے آدمی کو خود مکھیا نے بتایا ہے کہ اس حلیے اور اس نام کی پنجابی عورت کو انہوں نے محمد پور کے ایک مکان سے اغوا کیا تھا اور اسے کملا وتی نام کی ایک عورت خرید کر

اپنے ساتھ بردوان لے گئی ہے۔"

"یہ عورت کون تھی؟" میں نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔ حاجی فرید احمد نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"میں تو اسے نہیں جانتا لیکن کھیا نے میرے آدمی کو یہی بتایا ہے کہ کملا وتی بردوان سے آئی تھی۔ اس نے مکتی باہنی کے ایجنٹ سے تمہاری بیوی جمیلہ کا سودا چکایا اور اسے ساتھ لے کر واپس بردوان چلی گئی۔"

میں نے حاجی صاحب سے پوچھا۔

"کیا اسے یقین ہے کہ جس عورت کو کملا وتی نے خریدا ہے وہ میری بیوی جمیلہ ہی تھی۔"

حاجی صاحب بولے۔

"میرے آدمی نے خاص طور پر یہ سوال کھیا سے پوچھا تھا۔ جس کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ اس پنجابی عورت نے اپنا یہی نام بتایا تھا۔"

میں سرد آہ کھینچ کر رہ گیا۔ دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ خون کھول رہا تھا۔ کبھی میں شدت جذبات سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیتا' کبھی میرا جسم بالکل سن ہو جاتا۔ میں نے حاجی صاحب سے کہا۔

"میں کھیا نام کے آدمی سے خود ملنا چاہتا ہوں تاکہ میری تسلی ہو جائے کہ جس عورت کو انہوں نے کملا وتی کے ہاتھ فروخت کیا ہے وہ میری بیوی جمیلہ ہی تھی۔"

حاجی صاحب نے کہا۔

"میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ لیکن تم اپنی تسلی ضرور کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں کھیا کا اڈہ بتا دیتا ہوں۔ وہاں جا کر تم اسے مل لو۔ لیکن تم شریف آدمی ہو اور وہاں سبھی جرائم پیشہ لوگ ہوتے ہیں۔ وہاں شراب بھی بکتی ہے اور برے کردار کی عورتیں بھی آتی جاتی ہیں۔"

میں نے کہا۔

"آپ مجھے مکھیا کے اڈے کا پتہ بتا دیں میں ایک بار اس شخص سے ضرور ملنا چاہتا ہوں۔"

حاجی فرید احمد میری طرف دیکھنے لگے۔ بولے۔

"وہاں طیش میں آ کر کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا' یہ تمہارے دشمنوں کا ملک ہے اور ان جرائم پیشہ لوگوں کو علاقے کی پولیس کی پوری حمایت حاصل ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کروں گا' آپ مطمئن رہیں۔"

حاجی فرید احمد نے مجھے مکھیا کے اڈے کا پورا ایڈریس بتا دیا اور میں شام کا اندھیرا پھیلتے ہی ٹرام میں بیٹھ کر اس طرف روانہ ہو گیا۔





کھیا کا اڈہ کلکتے کے ایک گنجان آبادی والے محلے کی بوسیدہ سی تنگ گلی میں تھا۔ مجھے حاجی فرید احمد نے کھیا کا حلیہ بتا دیا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی نیم روشن دکان تھی جس کے اندر لکڑی کے بنچوں پر مزدور قسم کے خستہ حال بنگالی بیٹھے دیسی شراب اور تاڑی وغیرہ پی رہے تھے اور تیز تیز باتیں کر رہے تھے۔ میں بھی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ ایک بنگالی لڑکا میرے پاس آکر بولا۔

"کیا پیو گے بابو؟"

یہ اس نے بنگلہ زبان میں پوچھا تھا۔ میں نے بنگلہ میں کہا۔

"مجھے اڈے کے مالک کھیا دادا سے ملنا ہے۔ کیا وہ اس وقت یہاں ہے۔"

لڑکے نے کہا۔ "میرے ساتھ آجاؤ۔"

لڑکے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی لوگوں کو کھیا دادا کے پاس لے جاتا رہا ہے۔ میں ذہن میں ایک منصوبہ بنا کر آیا تھا۔ لڑکا مجھے ایک کوٹھڑی میں لے گیا جہاں پنکھا چل رہا تھا۔ ایک باڈی بلڈر ٹائپ کا بنگالی بنیان اور نیکر پہنے کھاٹ پر ایک عورت کو لیے بیٹھا تھا۔ سامنے لوہے کی تپائی پر شراب کی بوتل اور گلاس پڑا تھا۔ لڑکے نے بنگلہ میں کہا۔

"دادا یہ تمہیں ملنے آیا ہے۔ نیا گاہک معلوم ہوتا ہے۔"

کھاٹ پر بیٹھے ہوئے کھیا دادا نے مجھے گھور کر دیکھا اور عورت کو پیچھے ہٹاتے ہوئے

بولا۔

"کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟"

میں لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا میں نے بنگلہ میں کہا۔

"دادا! میرا نام مدن لعل ہے۔ میں جمشید پور سے مال خریدنے تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"تم جمشید پور میں کیا کرتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"اپنا اڈہ چلاتا ہوں۔ سنا ہے باڈر پار سے کچھ مال آیا ہے۔ اگر دکھا دو تو ابھی سودا چکا دوں گا؟"

اس کے ساتھ ہی میں نے کرتے کی جیب میں سے سو سو کے چار نوٹ نکال کر کھیا دادا کی طرف بڑھا دیے اور بنگلہ میں ہی کہا۔

"یہ میری طرف سے نذرانہ سوئیکار کریں۔ مال پسند آگیا تو باقی رقم اسی وقت چکا دوں گا۔"

سو سو کے نوٹ دیکھ کر کھیا کا چہرہ کھل گیا۔ اس نے جلدی سے نوٹ اٹھا کر سرہانے کے نیچے رکھے اور بولا۔

"مدن لعل جی آپ نے دیر کر دی۔ باڈر پار سے بڑا اچھا مال لائے تھے۔ بہت سا بک گیا ہے۔ چند ایک نگینے رہ گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"کھیا دادا! اگر محمد پور کا کوئی مال ہو تو میں اسے پسند کروں گا۔ کیونکہ وہاں بڑے کھاتے پیتے غیر بنگالی رہتے تھے۔"

کھیا کھاٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے عورت کو باہر بھجوا دیا تھا۔ کہنے لگا۔

"محمد پور سے دس بارہ لڑکیاں اٹھائی تھیں۔ یہ سالے مکتی باہنی والے بڑا تنگ کرتے تھے۔ انہیں بھی کافی رقم دینی پڑتی تھی۔ اس وقت جو مال باقی بچا ہے وہ میرے اڈے پر

نہیں ہے۔ ان عورتوں کی تصویریں ہم نے لے کر کاپی میں لگائی ہوئی ہیں تاکہ ایجنٹوں کو دکھا سکیں۔ آپ تصویریں دیکھ کر پسند کر لیں۔"

اس نے دیوار میں بنی ہوئی الماری کھول کر ایک پرانی کاپی نکالی اور اسے کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ کاپی میں مختلف عورتوں کی پاسپورٹ سائز کی بلیک اینڈ وائٹ تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ان تصویروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ عورتوں کو زبردستی کرسی پر بٹھا کر تصویریں اتاری گئی ہیں۔ ایک فوٹو میں تو اس آدمی کا بازو بھی نظر آ رہا تھا جس نے بدنصیب عورت کو پکڑ رکھا تھا۔ میں بے تاب نظروں سے تصویروں کو دیکھنے لگا۔ ایک تصویر پر نظر پڑتے ہی میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دوبارہ آنکھیں کھول کر فوٹو کو دیکھا۔ یہ میری بیوی جمیلہ کی فوٹو تھی۔ اس کے سر پر دوپٹہ نہیں تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی آواز کو اپنے قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ عورت اچھی لگتی ہے۔"

مکھیا نے آگے جھک کر میری بیوی جمیلہ کی فوٹو دیکھی اور ہنس کر بولا۔

"بابو! تم نے دیر کر دی۔ یہ مال تو بردوان کی ایک عورت کل ہی خرید کر لے گئی ہے۔ یہ عورت ہم نے محمد پور ہی سے اٹھائی تھی اور فوٹو دیکھو۔"

اس نے ایک عورت کی فوٹو پر انگلی رکھ کر کہا۔

"اسے ہم نے گلستان کے علاقے کی ایک کوٹھی سے اٹھایا تھا۔ کسی افسر کی بیوی ہے۔ یہ مال ابھی تک میرے پاس ہے۔ کہو تو ابھی چل کر دکھا دوں۔"

میں نے کاپی بند کرتے ہوئے کہا۔

"مکھیا جی! میں کل اسی وقت آؤں گا اور جو مال بچ گیا ہے اسے دیکھ لوں گا۔ لیکن مجھے یہ عورت پسند آ گئی ہے تم اگر مجھے بردوان والی عورت کا نام پتہ بتا دو تو میں اس کو زیادہ پیسے دے کر اس عورت کو خریدنے کی کوشش کروں گا۔"

مکھیا کہنے لگا۔

"وہ عورت بڑی تجربہ کار پرانی نائیکہ ہے۔ وہ اسے آگے کبھی نہیں بیچے گی۔ اس کو تو سونے کا انڈہ دینے والی مرغی مل گئی ہے۔"

میں نے کہا۔

"دادا! تم اس عورت کا نام پتہ بتا دو۔ میں ایک کوشش ضرور کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ کاپی کو بند کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس عورت کا نام کملا وتی ہے۔ بردوان کبھی پہلے گئے ہو؟"

"نہیں میں وہاں پہلے کبھی نہیں گیا۔"

"تو پھر ایسا کرو۔" کھیا کان کھجاتے ہوئے بولا۔ "بردوان کے سٹیشن کے پیچھے کسٹم گھاٹ نام کی بستی ہے۔ اس بستی میں کسی پان سگریٹ والے کی دکان سے کمو بائی کا پوچھ لینا۔ وہ تمہیں اس کا گھر بتا دے گا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"کھیا دادا! تمہارا دھنواد۔"

کھیا مجھے باہر تک چھوڑنے آیا۔ کہنے لگا۔

"بردوان سے واپس آکر مجھے ضرور ملنا۔ میں تمہیں اور بھی بڑا اچھا مال دکھاؤں گا۔ ابھی تو ادھر سے تازہ مال آنے والا ہے۔"

میں نے شراب کے اڈے کے باہر آکر کھیا سے ہاتھ ملایا اور گلی میں واپس چل پڑا۔ وہاں سے میں رکشا میں بیٹھ کر بہو بازار حاجی فرید احمد کے مکان پر آگیا۔ وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر سکون سا آگیا۔ کہنے لگے۔

"خدا کا شکر ہے تم خیریت سے واپس آگئے۔ تمہیں بھیج کر میں پچھتا رہا تھا کہ غنڈوں کے اڈے پر بھیج دیا ہے خدا خیر کرے۔"

میں نے انہیں سارا واقعہ سنایا تو میری جرات پر حیران رہ گئے۔ کہنے لگے۔

"تم نے تو کمال کر دکھایا۔ تو کیا اب بردوان جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "ضرور جاؤں گا۔ دعا کریں مجھے میری بیوی مل جائے۔"

حاجی صاحب نے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔"

رات میں نے بے چینی سے گزاری۔ صبح سات بجے کی گاڑی میں بیٹھ کر میں کلکتے کے ہاوڑا سٹیشن سے بردوان کی طرف روانہ ہوگیا۔ مغربی بنگال سے جب آپ صوبہ بہار کی طرف جاتے ہیں تو دھنباد اور آسنول سے پہلے بردوان کا شہر آتا ہے۔ بردوان کلکتے سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ڈیڑھ پونے دو گھنٹوں میں گاڑی نے مجھے بردوان پہنچا دیا۔ سٹیشن سے باہر آ کر میں نے کشم گھاٹ بستی کا پوچھا اور سٹیشن کے عقب میں ایک بستی دیکھی جو پرانے بوسیدہ مکانوں پر مشتمل تھی۔ جگہ جگہ مکانوں کے بیچ میں سے ناریل کے درختوں کے جھنڈ اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ کھیا نے بتایا تھا کہ یہاں پہنچ کر کمو بائی کا کسی سگریٹ پان والے سے پوچھ لینا۔ سگریٹ پان کا ایک کھوکھا بستی کے شروع میں ہی تھا۔ کھوکھے والا بنگالی گردن ایک طرف کیے پان لگا رہا تھا۔ میں نے کمو بائی کا پوچھا تو اس نے ایک نظر مجھ پر اوپر سے نیچے تک ڈالی اور بنگالی میں کہا۔

"صبح صبح کس کا نام پوچھنے آ گئے ہو بابو۔ ادھر آگے چلے جاؤ۔ کونے والا مکان ہے اس کا۔"

میں خاموشی سے جس طرف اس نے بتایا تھا اسی طرف چل پڑا۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک تھی۔ مکانوں کی دیواریں دھوپ اور بارش سے خراب ہو رہی تھیں۔ ڈھلانی چھتوں پر کائی جمی ہوئی تھی۔ گندے مندے نیم عریاں کالے کالے بچے کھیل رہے تھے۔ میں کونے والے مکان کے سامنے جا کر رک گیا۔ مکان کے صحن کی دیوار شکستہ ہو رہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ وہاں کوئی بھی انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو تین منٹ بعد کسی نے اندر سے بنگالی میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

میں نے بنگالی میں کہا۔

"کمو بائی سے کہو جمشید پور سے ایک مہمان آیا ہے۔"

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر اندر سے کنڈی اتارنے کی آواز کے ساتھ دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ ایک سانولی سی تیکھے ابروں والی لڑکی نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"اندر آجاؤ۔"

میں صحن میں داخل ہوگیا۔ لڑکی نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی اور میرے آگے آگے چلتے ہوئے بنگالی زبان میں کہنے لگی۔

"میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔"

صحن میں ایک طرف گائے بندھی ہوئی تھی۔ لڑکی نے مجھے ایک کمرہ کھول کر اندر بٹھا دیا اور یہ کہہ کر چلی گئی کہ بائی جی ابھی آتی ہیں۔ کمرے میں پرانے زمانے کا صوفہ پڑا تھا۔ دیوار پر کسی فلم ایکٹریس کی ڈانس کے پوز کی بڑی رنگین تصویر لگی ہوئی تھی۔ لڑکی نے چھت کا پنکھا چلا دیا تھا۔ اتنے میں ایک موٹے بدن کی سانولی عورت اندر آئی۔ اس نے بادامی رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ ساڑھی میں سے اس کا بھدا جسم جگہ جگہ سے نظر آ رہا تھا۔ وہ پان کھا رہی تھی۔ چہرے سے بڑی تجربہ کار اور عیار عورت لگتی تھی۔ میں نے اٹھ کر نمسکار کیا اور کہا۔

"آپ ہی کملا وتی جی ہیں؟"

"ہاں۔" اس نے صوفے کے پاس کھڑے کھڑے میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم کون ہو؟ کیا کام ہے؟"

وہ بنگلہ زبان بول رہی تھی۔ میں بھی بنگلہ بول رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"بائی جی! میں جمشید پور سے آیا ہوں میرا نام مدن لعل ہے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو روپے کے دو نوٹ نکال کر اس کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"جلدی میں آپ کے لیے مٹھائی وغیرہ نہیں خرید سکا یہ میری طرف سے قبول کریں۔"

کمو بائی نے فوراً نوٹ پکڑ لیے اور انہیں اپنے بلاؤز کے اندر ڈالتے ہوئے مسکرائی اور میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اب اس کا لہجہ بڑا شیریں ہو گیا تھا۔ کہنے لگی۔

"تم بنگالی نہیں لگتے ہو۔"

میں نے کہا۔

"جی ہاں بائی جی! میں بہاری ہوں مگر بنگال میں بھی بڑی دیر رہ چکا ہوں۔"

کمو بائی نے بڑے زور سے کسی کا نام لے کر آواز دی۔ وہی سانولی لڑکی آ گئی۔ بائی نے کہا۔

"کوئی جل پان لے آ۔"

پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

"آپ دن کے وقت آئے ہیں اس وقت میں آپ کی زیادہ خدمت نہیں کر سکتی۔ اکثر لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں جا چکی ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میں تو صرف ایک لڑکی سے ملاقات کرنے کا خواہشمند ہوں۔"

ساتھ ہی میں نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کو پیش کر دیا۔ کملا بائی نے جلدی سے نوٹ لے کر بلاؤز کے اندر ڈال لیا اور پوچھا۔ "کون سی لڑکی؟"

میں نے کہا۔

"بات یہ ہے کملا بائی کہ کلکتے میں مکھیا دادا میرا پرانا دوست ہے۔ جمشید پور سے میں اکثر اس کے پاس آتا جاتا رہتا ہوں۔ پچھلے دنوں میں نے اس کے پاس ایک لڑکی دیکھی جو مجھے پسند آ گئی۔ میں نے مکھیا سے کہا کہ یہ لڑکی میں اس سے خریدنا چاہتا ہوں۔ وہ بولا مدن بابو۔ یہ ابھی نئی نئی آئی ہے۔ بہت نسری ہوئی ہے۔ دو ایک روز انتظار کر لو۔ کل میں اس کے پاس گیا تو اس نے بتایا کہ لڑکی تو میں نے بردوان کی کملا بائی کے ہاتھ بیچ دی ہے۔ لڑکی کا نام اس نے جمیلہ بتایا تھا اور مکھیا اور دھرمو اسے بنگلہ دیش سے اٹھا کر لائے تھے۔ بس میں اس لڑکی کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ تم جو کہو گی میں پیش کر دوں گا۔"

کملا بائی عیار عورتوں کی طرح مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"بابو! تم جس لڑکی کی بات کر رہے ہو' میں سمجھ گئی ہوں۔ وہ پنجابی لڑکی تھی۔ جمیلہ اپنا نام بتاتی تھی۔ اس کو مکتی باہنی والوں کے ساتھ مل کر دھرمو اور مکھیا محمد پور کی بستی سے اٹھا کر لائے تھے۔ وہ اپنا نام کرمو دادا یا شاید کرم داد بتاتی تھی۔"

میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔

"ہاں کرم دادا! یہی اس کے خاوند کا نام تھا۔"

"تمہیں کیسے پتہ ہے؟" کملا وتی نے حیرانی سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "مجھے مکھیا نے بتایا تھا۔ وہ لڑکی کہاں ہے کملا بائی؟ مجھے اس کی ایک جھلک دکھا دو میں تمہیں ایک ہزار روپیہ دوں گا۔"

ہزار روپے کا نام سن کر کملا وتی نائیکہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کہنے لگی۔

"اس وقت تو وہ لڑکی یہاں نہیں ہے۔ میرا ایک آدمی اسے لے کر دھنباد کے ٹھاکر کے پاس گیا ہوا ہے۔ دو ایک دن میں آ جائے گی۔ تم میرے مکان پر ہی ٹھہرو میرے پاس لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔"

یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میرا جی چاہا کہ اس عورت کی ایک ہی جھٹکے سے گردن توڑ دوں۔ مگر میں بے بسی کی حالت میں تھا۔ میں نے پوچھا۔

"مجھے دھنباد کے ٹھاکر کا پتہ بتا دو۔ میں خود وہاں چلا ؤں گا۔"

کملا وتی نے تعجب کے ساتھ کہا۔

"ارے دادا! تمہیں وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہاں جاؤ گے تو ٹھاکر کے آدمی تمہاری تکا بوٹی کر دیں گے۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میرا آدمی جمیلہ کو لے کر کل نہیں تو پرسوں آ جائے گا۔ پھر تم اس کے ساتھ رات بسر کر لینا۔"

سانولی لڑکی چائے اور کچھ مٹھائی لے آئی۔ میں عجیب تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ دل میں بار بار ایک ابال سا اٹھتا تھا کہ ابھی گاڑی میں بیٹھ کر دھنباد جاؤں اور ٹھاکر کو قتل کر کے جمیلہ کو واپس لے آؤں مگر کملا بائی نے مجھے ٹھاکر کا ایڈریس بتانے سے صاف انکار کر دیا

تھا، کہنے لگی۔
"یہ ہمارا اصول نہیں ہے کہ ایک عورت کو کسی کے پاس بھیجیں اور پھر اس کے پیچھے کسی دوسرے آدمی کو رقم لے کر بھیج دیں۔"
چائے کا ہر گھونٹ مجھے زہر لگ رہا تھا۔ دماغ میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا' کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟ آخر چار و ناچار مجھے یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ پردوان میں کملا وتی کے گھر پر ہی ٹھہر جاؤں اور جمیلہ کی واپسی کا انتظار کروں۔ کملا بائی نے میرے پاس دولت دیکھ لی تھی۔ اس نے میری آؤ بھگت شروع کر دی۔ دوپہر کو خوب ترکاریاں اور مچھلی وغیرہ بنوائی۔ شراب بھی لا کر رکھ دی۔ میں نے کہا۔ "میں شراب نہیں پیتا۔"
حیران ہو کر بولی۔
"تم کیسے تماش بین ہو۔"
کملا بائی عرف کمو بائی کے اڈے پر مجرا وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ عورتوں کو شہر کے ان شریف بدمعاشوں کے ہاں سپلائی کرتی تھی جو اس کے اڈے پر نہیں آسکتے تھے اور جنہیں عیاشی کے ساتھ ساتھ اپنی عزت' ناموس کا بھی بہت خیال تھا۔ وہ پولیس کو ماہانہ ادا کرتی تھی۔ اس لیے بے فکر ہو کر یہ دھندا کر رہی تھی۔
شام کے وقت باہر دو تین رکشا باری باری آکر رکے۔ ان میں سے میں نے کچھ ساڑھی والی لڑکیاں اتر کر تیزی سے کملا وتی کے مکان کی طرف آتی دیکھیں۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میرا دل اپنی بیوی جمیلہ کے خیال سے بوجھل ہو رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک کیسا انقلاب آگیا کہ کہاں میں اپنی بیوی کے ساتھ امن اور عزت کی زندگی بسر کر رہا تھا اور کہاں اس وقت میں ایک نائیکہ کے مکان پر بیٹھا ہوں اور میری بیوی..... اس سے آگے میں نہ سوچ سکا۔ اس سے آگے میں کوئی تصور اپنے ذہن میں نہ لا سکا۔ میں اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کملا بائی اچانک اندر آگئی کہنے لگی۔
"مدن بابو! کھانا نہیں کھاؤ گے؟ آؤ میرے ساتھ۔"

اور اس نے بڑی ادائے خاص کے ساتھ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور میرے ساتھ لگ کر مجھے کمرے سے نکال کر دوسرے کمرے میں لے گئی جہاں زمین پر دری بچھی ہوئی تھی اور دستر خوان پر کھانا لگا تھا۔ دو لڑکیاں پہلے سے وہاں ریشمی ساڑھیوں میں ملبوس بیٹھی تھیں۔ انہوں نے ایک ساتھ مجھے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے نمسکار کیا اور دستر خوان پر بیٹھ گیا۔

ہم کھانا کھانے لگے۔ کھانے پر بنگلہ اور اردو دونوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ ایک لڑکی رنگ ذرا کھلتا ہوا تھا۔ وہ بنگالی نہیں لگی تھی۔ وہ اردو بھی صاف بول رہی تھی۔ کملا بائی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میری طرف جھک کر کہا۔

"یہ لڑکی تمہارے دیش کی ہے۔ بہارن ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔ انگریزی بھی بول لیتی ہے۔ میں اسے تمہارے پاس بھیجوں گی۔"

اور پھر بے شرمی سے مسکراتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھ کر بولی۔

"اری پرامیلا! تمہیں مدن بابو کیسے لگتے ہیں؟"

پرامیلا نے شرماتے ہوئے کہا۔

"اچھے لگتے ہیں۔"

مجھے یہ سب کچھ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ میرا ذہن بار بار اپنی بیوی جمیلہ کی طرف جاتا تھا کہ وہ دھنباد میں کس کے پاس ہوگی۔ اس کے ساتھ کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ کیا سوچ رہی ہوگی۔ کہیں وہ خودکشی نہ کر لے۔ ذہن میں طرح طرح کے پریشان کر دینے والے خیال آ رہے تھے۔ میں کھانا زہر مار کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ دماغ آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح دہک رہا تھا۔ کبھی چارپائی پر بیٹھ جاتا۔ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ اتنے میں دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔

میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

دوسری طرف سے کسی عورت نے اردو میں کہا۔

"میں ہوں پرامیلا۔ دروازہ کھولیں مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

یہ وہی لڑکی تھی جس کا تعارف دستر خوان پر کملا بائی نے مجھ سے کرایا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ جلدی سے اندر آ کر میری چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"دروازہ بند کر دیں۔"

میں نے دروازہ بند کر دیا اور کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "کیا بات کرنی ہے تمہیں؟"

لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے مدن بابو۔"

میں نے کہا۔ "مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔ جلدی بتاؤ تم مجھ سے کیا بات کرنے آئی ہو؟"

لڑکی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"تم نے صبح کملا بائی کے ساتھ جمیلہ نام کی پنجابی لڑکی کے بارے میں جو باتیں کی تھیں وہ ساری میں نے سن لی تھیں۔ مجھے بتاؤ کیا سچ مچ تم اس لڑکی سے محبت کرنے لگے ہو؟"

میں محتاط ہو گیا۔ میں نے سنبھل کر کہا۔

"تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "اس لیے کہ ایک تو تم ہندو ہو۔ میرے وطن کے ہو۔ دوسرے لڑکی پنجابی ہے اور مسلمان ہے۔ تمہیں اس کا اتنا خیال کیوں ہے کہ تم اس کی خاطر کلکتے سے یہاں آ گئے ہو اور اس کے ساتھ ایک رات بسر کرنے کے ایک ہزار روپے تک دینے کو تیار ہو۔"

"میں نے یونہی کہہ دیا کہ مجھے وہ لڑکی پسند آ گئی تھی۔"

پرامیلا نے کہا۔

"صرف پسند آ جانے سے کوئی مرد کسی لڑکی کی خاطر شہر چھوڑ کر دوسرے شہر نہیں پہنچ

جاتا۔"

"میرے دل میں اچانک خیال آیا کہ اس لڑکی سے جمیلہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے اسے دھنباد شہر کے اس ٹھاکر کا پتہ بھی معلوم ہو جس کے پاس کملا بائی نے جمیلا کو بھیجا ہوا ہے۔ میں نے کہا۔

"تو پھر یوں ہی سمجھ لو کہ میں اس پنجابی مسلمان لڑکی سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میں اس کی ایک جھلک دیکھنے کو بے چین ہوں۔ کیا تم مجھے دھنباد کے ٹھاکر کا مکان بتا سکتی ہو کہ کہاں ہے۔ میں دھنباد جا کر اس مسلمان لڑکی کی صرف ایک جھلک دیکھ کر واپس آ جاؤں گا۔"

پرامیلا میری طرف دیکھتے ہوئے شرارتی انداز میں مسکرا رہی تھی۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو کہنے لگی۔

"کیا سچ مچ تم اس مسلمان لڑکی سے اتنا پیار کرتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں اس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ پیار کرتا ہوں۔"

پرامیلا کہنے لگی۔

"اگر تم واقعی اس لڑکی سے اتنا پیار کرتے ہو تو تمہیں یہ بتانا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ وہ پنجابن لڑکی جس کا نام جمیلہ ہے اور جسے کملا بائی نے کلکتے کے کھیا سے خریدا تھا اور کھیا جسے بنگلہ دیش کی محمد پور کی بستی سے اٹھا کر لایا تھا۔ دھنباد کسی ٹھاکر کے ہاں نہیں گئی۔"

میں حیران ہو کر پرامیلا کا منہ دیکھنے لگا۔

"تو پھر---- تو پھر وہ کہاں ہے؟"

پرامیلا جلدی سے اٹھ کر بند دروازے کے پاس گئی۔ اس نے کان لگا کر باہر کچھ سننے کی کوشش کی۔ پھر ایک دم سے کنڈی اتار کر دروازہ کھول دیا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی اور چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"جمیلہ کو کملا بائی نے شری راج کے آدمیوں کے ہاتھ دس ہزار روپے میں بیچ دیا ہے اور شری راج کے آدمی جمیلہ کو لے کر دلی چلے گئے ہیں۔"

یہ ایک اور دھماکہ تھا جو ایٹم بم کی طرح میرے دماغ میں ہوا۔ میں بت بن کر بیٹھا تھا اور پرامیلا جو کچھ کہہ رہی تھی اسے سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"شری راج دلی کا ایک اونچے درجے کا ماڈرن بدمعاش ہے۔ اس کے پاس کرائے کے قاتل بھی ہیں اور نہایت اونچے درجے کی حسین و جمیل ماڈرن تعلیم یافتہ طوائف لڑکیاں بھی ہیں۔ ان لڑکیوں کو وہ بھارتی سرکار کے بڑے بڑے افسروں کے ہاں بھاری معاوضے پر سپلائی کرتا ہے اور اپنی پسند کے ٹھیکے اور ٹینڈر منظور کرواتا ہے۔ بھارت کے سیاستدان اور بڑے بڑے کاروباری اداروں کے مالک اپنے کاروبار اور سیاسی حریفوں کو قتل کروانے یا ہمیشہ کے لیے غائب کروانے میں شری راج کی خفیہ مدد حاصل کرتے ہیں۔ شری راج اس کے عوض لاکھوں روپے کا معاوضہ وصول کرتا ہے۔ پولیس کو سب کچھ معلوم ہے مگر وہ اس کو ہاتھ نہیں ڈال سکتی کیونکہ شری راج کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ دلی کے پولیس کمشنر سے لے کر بڑے بڑے سیاسی لیڈر اس کے دوست ہیں اور اس سے خوف کھاتے ہیں۔ اب بتاؤ کیا تم اس پنجابن لڑکی جمیلہ کو شری راج کے خطرناک چنگل سے نکال سکو گے؟ کبھی نہیں۔ اس کا کبھی بھول کر بھی دل میں خیال نہ لانا۔ شری راج کے آدمی انسان کو یوں قتل کر دیتے ہیں جیسے انسان مکھی اور چیونٹی سے بھی حقیر ہو۔"

پرامیلا نے آگے بڑھ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور پیار سے کہا۔

"میں بھی خوبصورت ہوں۔ جمیلہ تو نئی نئی اس دھندے میں آئی ہے۔ جتنی محبت میں تمہیں دوں گی وہ لڑکی نہیں دے سکتی تھی۔"

میرے جسم میں ایک طوفان سا مچا ہوا تھا۔ خون میں ہیجانی کیفیت تھی۔ اگر یہ لڑکی سچ کہہ رہی تھی تو پھر جمیلہ ایک ایسے مافیا کے جال میں پھنس گئی تھی یا پھنسنے والی تھی جہاں سے اسے نکالنا جان جوکھوں کا کام تھا اور جہاں سے اسے نکالنے کے لیے مجھے سر دھڑ کی بازی لگانی تھی۔ میں نے پرامیلا سے پوچھا۔

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ یہ سارا سودا میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ بے چاری لڑکی جمیلہ رو رہی تھی۔ مگر اس کی کسے پروا تھی وہاں شری راج کے آدمیوں نے اسے پسند کر لیا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ یہاں کی لڑکیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی اور اس کا جسم بھی بڑا سڈول تھا۔"

میں نے پرامیلا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔

"پرامیلا! اگر مجھے یقین ہو جائے گا کہ جمیلہ نام کی لڑکی کو واقعی کملا بائی نے شری راج کے آدمیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے تو میں اس کی یاد کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل سے نکال دوں گا اور تمہیں اپنی محبوبہ بنا لوں گا۔"

پرامیلا نے میرے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"اب میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ جس لڑکی کو شری راج کے ایجنٹ خرید کر لے گئے ہیں وہ تمہارے مکھیا دادا کی جمیلہ ہی تھی۔"

میں کچھ کہنے لگا تھا کہ پرامیلا ایک دم اچھل سی پڑی۔ کہنے لگی۔

"اگر میں تمہیں جمیلہ کی تصویر دکھا دوں تو کیا پھر تمہیں یقین آ جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "کیا تمہارے پاس اس کی تصویر ہے؟"

وہ چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"کملا بائی کی عادت ہے کہ اس کے اڈے پر جو نئی لڑکی آتی ہے وہ اس کی ایک تصویر اتروا کر ضرور اپنے البم میں لگا کر رکھ لیتی ہے۔ میں ابھی تمہیں اس کی تصویر لا کر دکھاتی ہوں۔"

وہ جلدی سے چپل پہن کر کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یا اللہ! یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ کیا یہ عذاب بھی میری قسمت میں لکھا تھا۔ اے خدا! تو غفور الرحیم ہے۔ میرے گناہ معاف کر دے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں رونے لگا۔ بڑی مشکل سے میں نے ضبط کیا۔

کرتے کے دامن سے آنسو پونچھے اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں پرامیلا واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے سائز کی ایک فوٹو تھی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور تصویر میرے سامنے کر کے بولی۔

"مدن لعل بابو! یہی ہے ناں تمہاری پیاری جمیلہ؟"

فوٹو رنگین فلم سے اتاری گئی تھی۔ اس میں میری بیوی جمیلہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ایک جانب خود کملا بائی بیٹھی تھی۔ دوسری طرف کوئی اور لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں نے جمیلہ کو جیسے درمیان میں جکڑ رکھا تھا۔ دونوں عورتیں مسکرا رہی تھیں جبکہ میری بیوی جمیلہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑ گئے ہوئے تھے۔ وہ اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے خلاؤں میں اپنی زندگی کے گزرے ہوئے باعزت باوقار ایام کو تلاش کرنے کی بے سود کوشش کر رہی ہو۔ میرے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے کچھ بولنا چاہا مگر آواز میرے گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ پرامیلا نے میری بدلی ہوئی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ کہنے لگی۔

"مدن بابو! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

میں نے تصویر اسے واپس کر دی اور کہا۔

"اب مجھے یقین آ گیا ہے۔"

پرامیلا مجھے بازو سے پکڑ کر چارپائی پر لے آئی۔ مجھے اپنے آپ پر قابو حاصل کرنے میں کچھ وقت ضرور لگا لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ کیونکہ مجھے پرامیلا سے ابھی کچھ مزید معلومات حاصل کرنی تھیں۔ میں نے اس سے کہا۔

"یہ شری راج تو بڑا بدمعاش آدمی ہے۔ یہ بھارت کی راج دھانی میں رہ کر یہ سب کچھ کر رہا ہے اور کوئی اسے پوچھنے والا نہیں۔"

وہ کہنے لگی۔

"تم بھارت کے لیڈروں اور بڑے بڑے افسروں کو کیا سمجھتے ہو۔ سب کرپٹ ہیں اور

عیاش ہیں۔ جو دو ایک ان میں دیانت دار ہیں وہ بوڑھے ہو چکے ہیں' ان کی کوئی نہیں سنتا۔"

مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے شری راج کے بارے میں براہ راست کوئی سوال کیا تو پرامیلا کو خواہ مخواہ شک پڑے گا کہ میں اب بھی جمیلہ کو نہیں بھولا اور اس کی تلاش میں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ویسے ہی بے نیازی کے انداز میں پوچھا۔

یہ شری راج تو کسی بہت بڑے محل میں رہتا ہو گا۔"

پرامیلا اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ وہ مجھے پیار کیے جا رہی تھی جبکہ میں اس کے پیار سے بالکل بے تعلق ہو کر بیٹھا تھا۔ کہنے لگی۔

"دلی میں سنا ہے اس کے چار بنگلے ہیں۔ کبھی کسی بنگلے میں ہوتا ہے کبھی کسی بنگلے میں۔ کتنی ہی کاریں ہیں اس کی۔ ویسے گیتا بھون نام کا اس کا بنگلہ بڑا مشہور ہے۔ میں نے تو نہیں دیکھا مگر سنا ہے کہ نئی دلی میں کسی جگہ پر ہے۔ مگر تم کیوں اس کا پوچھ رہے ہو؟ میری طرف دیکھو۔ کیا میں جمیلہ سے کم خوبصورت ہوں؟"

اور پرامیلا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ مجھے اس کی ہنسی زہر لگی۔ میں جتنی جلدی ہو سکے دلی پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اس سے پہلے کہ میری بیوی وہاں سے بھی غائب کر دی جائے میں وہاں پہنچ جاؤں۔ میں نے سوچا کہ پرامیلا سے جمیلہ کی فوٹو حاصل کر لی جائے تو اسے تلاش کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ جمیلہ کی فوٹو ابھی تک پرامیلا کے پاس ہی تھی۔ اس نے تصویر سرہانے کے نیچے رکھ دی تھی۔

میں پرامیلا کے ساتھ دل پر پتھر رکھ کر دل لگی کی باتیں کرنے لگا۔ رات کے کسی لمحے جب میں نے پرامیلا کو غافل پایا تو سرہانے کے نیچے سے جمیلہ کی فوٹو نکال کر اپنے قبضے میں کر لی۔ اب میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ پرامیلا چارپائی پر بے سدھ ہو کر گہری نیند سو رہی تھی۔ بتی جل رہی تھی۔ میں دن نکلنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا لباس درست کیا اور دروازہ کھول کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

بردوان شہر کی اس بستی پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بازار میں کوئی دکان نہیں

کھلی ہوئی تھی۔ بستی کے دوسرے کونے کی جانب سے چوکیدار کے لٹھ کی آواز کسی وقت آ جاتی تھی۔ میں ریلوے سٹیشن کی طرف چلنے لگا۔ وہاں کوئی رکشا وغیرہ بھی نہیں تھا۔ سٹیشن زیادہ دور نہیں تھا۔ سٹیشن پر چند ایک مسافر نظر آئے۔ ایک قلی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ کلکتے جانے والی گاڑی صبح چار بجے آئے گی۔ میں کلکتے میں حاجی فرید احمد صاحب سے مل کر اور انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد دلی جانا چاہتا تھا۔ سٹیشن پر کسی نہ کسی طرح میں نے وقت گزار دیا۔ گاڑی آئی اور میں اس میں بیٹھ گیا۔ ٹرین نے مجھے دن نکلتے ہی کلکتے پہنچا دیا۔ وہاں سے سیدھا حاجی صاحب کے فلیٹ پر آ گیا۔ حاجی صاحب جاگ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔

"کرم داد! کیا ہوا؟"

میں نے انہیں ساری بات بیان کر دی اور جمیلہ کی فوٹو بھی دکھائی۔ اس پاسپورٹ سائز کی رنگین فوٹو میں جمیلہ کے ساتھ نائیکہ کملا بائی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ جمیلہ کا پریشان اور بیماروں والا چہرہ دیکھ کر حاجی صاحب نے انتہائی افسوس کے ساتھ کہا۔

"خدا ان لوگوں کو غارت کرے۔ ایک شریف گھرانے کی خاتون کو کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔"

انہوں نے میرے لیے ناشتہ منگوایا۔ کہنے لگے۔

"اب تم نے کیا سوچا ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں اپنی بیوی کی تلاش میں دلی جاؤں گا اور اسے شری راج کے پھندے سے نکال کر جیسے بھی ہو سکا آپ کے پاس آؤں گا۔"

حاجی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے۔

"دلی بھارت کی راج دھانی ہے۔ بڑا شہر ہے کیا تم وہاں کسی کو جانتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں ڈھاکے سے صرف ایک بار ویزا لے کر دلی گیا تھا۔ اس بات کو بھی دو برس گزر گئے ہیں۔"

حاجی صاحب کہنے لگے۔

"شری راج جیسا کہ تم نے بتایا ہے ایک بہت بڑے اور اونچے درجے کے جرائم پیشہ گروہ کا لیڈر ہے تم اکیلے ان قاتل لوگوں کا کیسے مقابلہ کرو گے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اپنی جان کی پروا نہیں ہے حاجی صاحب۔ میں اپنی عزت' اپنی غیرت کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

حاجی صاحب بولے۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اس کے لیے بھی عقل کی اور کسی منصوبہ بندی کی ضرورت ہوگی۔ ایسا تو ہوگا نہیں کہ تم شری راج کے بنگلے میں جاؤ۔ وہاں سامنے جمیلہ بی بی بیٹھی ہوئی ہو اور تم اسے ساتھ لے کر واپس آجاؤ۔ وہ لوگ اگر جمیلہ بی بی کو یہاں سے خرید کر لے گئے ہیں تو کسی مقصد کے لیے لے گئے ہیں اور اس کی حفاظت بھی کر رہے ہوں گے۔"

میں نے مایوسی کے لہجے میں کہا۔

"تو پھر آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں؟"

حاجی صاحب نے چائے کا خالی گلاس میز پر رکھ دیا اور بولے۔

"مجھے سوچنے کی مہلت دو۔"

میں نے کہا۔ "حاجی صاحب! میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر دیر ہوگئی تو میری بیوی وہاں سے بھی کہیں غائب نہ کر دی جائے۔"

حاجی صاحب نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گہری سوچ میں تھے اور آرام کرسی پر بیٹھے کھڑکی کے باہر بجلی کے تاروں پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے ذہن میں کوئی خیال آیا' وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔

"ایک بات ہو سکتی ہے۔ دلی میں میرے ایک دوست مشتاق علی کا ہوٹل ہے۔ میں اسے ٹیلی فون پر تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔ وہ میرا بڑا قابل اعتماد دوست ہے۔ تم ٹھہرنا بھی اسی کے ہوٹل میں۔ اس کے ہوٹل میں ہر قسم کے لوگ آتے جاتے

ہیں۔ وہ اس پوزیشن میں ہے کہ تمہاری کوئی مدد کر سکے۔"

میری راہ تھوڑی سی آسان ہوگئی تھی۔ حاجی فرید احمد نے مشتاق علی کو دلی ٹیلی فون کر کے ساری باتیں کھل کر بیان کر دیں۔ میں رات کی گاڑی میں بیٹھ کر دلی روانہ ہوگیا۔ حاجی صاحب نے مشتاق علی کے ہوٹل کا پتہ مجھے لکھ کر دے دیا تھا۔ اس کے ہوٹل کا نام مغل ہوٹل تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ شہر کی گنجان آبادی میں کوئی پرانے ٹائپ کا ہوٹل ہوگا۔ لیکن مغل ہوٹل شہر کی ایک ماڈرن آبادی میں واقع تھا۔ دو منزلہ ہوٹل تھا اور اس کے شیشے کے دروازے بھی تھے۔

میں رکشے سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ ہوٹل کی چھوٹی سی لابی تھی۔ بائیں جانب چھ سات صوفے لگے تھے جن پر کچھ عورتیں اور مرد بیٹھے تھے۔ سامنے ایک چھوٹا سا ہال تھا جہاں گاہک چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ میزوں پر تانبے کے چھوٹے چھوٹے گلدستے بھی رکھے ہوئے تھے۔ یہ کوئی فائیو سٹار ہوٹل نہیں تھا لیکن کم تر درجے کا ہوٹل بھی نہیں تھا۔ دیوار کے ساتھ کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ جہاں ایک لڑکی ٹیلی فون پر باتیں کر رہی تھی۔ میں کاؤنٹر پر گیا تو لڑکی نے ٹیلی فون رکھ دیا اور مجھ سے بڑی عمدہ قسم کی اردو میں پوچھا۔

"میں کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

میں نے کہا۔ "مجھے ہوٹل کے مالک مشتاق علی صاحب سے ملنا ہے۔"

اس نے فوراً" دوسرے ٹیلی فون کا رسیور اٹھا کر کوئی نمبر گھمایا اور مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے اسے اپنا نام بتا دیا۔ لڑکی نے فون پر کسی سے کہا۔

"سر ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ کرم دادا اپنا نام بتاتے ہیں۔"

پھر اس نے فوراً" رسیور رکھ دیا اور بڑی خوش اخلاقی سے بولی۔

"آپ بائیں جانب تشریف لے جائیں۔ پہلا کمرہ خان صاحب کا ہے۔"

بائیں جانب ایک مختصر سی راہ داری تھی۔ ایک کمرے کے دروازے کے باہر مشتاق علی صاحب کے نام کی تختی لگی تھی۔ میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر

سے آواز آئی۔
"آ جائیں۔"
کمرے میں داخل ہو کر میں نے ایک ادھیڑ عمر خوش لباس شخص کو دیکھا جو گرم شیروانی اور سفید پاجامہ پہنے صوفے پر بیٹھا کوئی فائل دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں پر سنہری فریم والا نظر کا چشمہ لگا تھا' چشمہ اتار کر اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سلام کیا تو اس نے اٹھ کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ میں نے اپنا نام بتایا۔ کہنے لگا۔
"تشریف رکھیں۔ حاجی فرید نے مجھے ٹیلی فون پر آپ کی ساری درد بھری داستان سنا دی تھی۔ مجھے سن کر بہت دکھ ہوا۔ یہ مشرقی پاکستان کا اجتماعی المیہ ہے۔ ہم بھارت کے مسلمانوں کو دہرا صدمہ ہوا ہے۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا آپ کے لیے ضرور کروں گا۔ آپ فی الحال اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں۔ شام کو تفصیل کے ساتھ آپ سے باتیں ہوں گی۔"
مشتاق علی بڑی اچھی اردو بول رہا تھا۔ وہ خاص دلی شہر کا رہنے والا تھا۔ مجھے اس کی باتوں سے کافی حوصلہ ہوا۔ بیرے نے مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ وہاں میری ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔ میں نے گرم پانی سے غسل کیا دو جوڑے کھدر کے میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں نے نئی کھدر کی بنگلہ ٹائپ کی قمیض اور پاجامہ پہن لیا مگر مجھے ایک کوٹ یا صدری کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ دلی میں ابھی سردی پڑ رہی تھی۔ میں نے بیرے سے پوچھا کہ سلے سلائے گرم کپڑے مجھے کہاں سے مل سکتے ہیں۔ اس نے ایک مارکیٹ کا ایڈریس بتایا میں رکشا لے کر مارکیٹ میں گیا۔ پیسے میرے پاس موجود تھے۔ میں نے ایک جرسی اور ایک گرم کوٹ خریدا اور واپس ہوٹل میں آ گیا۔ شام کے وقت مشتاق علی خود میرے کمرے میں آ گئے۔ کہنے لگے۔
"آپ بازار کچھ چیزیں خریدنے گئے تھے؟"
میں نے کہا۔ "جی ہاں ایک کوٹ اور جرسی خریدنی تھی۔"
وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”میاں! آپ پاکستانی ہیں۔ آپ کے پاس یہاں کا کوئی ویزا بھی نہیں ہے۔ آپ کو زیادہ باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ آج کل پولیس اور ملٹری کی انٹیلی جینس والے مشرقی پاکستان سے فرار ہونے والے آرمی جوانوں اور سویلین کی تلاش میں پھر رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کسی دوسری مصیبت میں پھنس جائیں۔“

مشتاق علی صاحب نے بڑا صحیح مشورہ دیا تھا۔ میں اپنی بیوی کی پریشانیوں میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ میں پاکستانی ہوں اور جنگی قیدیوں کی ٹرین سے فرار ہوا ہوں۔ میں نے کہا۔

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔ میں آئندہ اس بات کا خیال رکھوں گا۔“

وہ رومال سے عینک کا شیشہ صاف کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”ہمارا شری راج کے گینگ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن میں ایک دو ایسے آدمیوں کو جانتا ہوں جن کا اسی جرائم پیشہ گروہ کے لوگوں سے ملنا جلنا ہے۔ ان میں سے ایک آدمی کو میں نے فون کیا تھا مگر وہ گھر پر نہیں تھا۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ آئے تو اسے میرے پاس بھیج دیں۔ یہ آدمی مسلمان ہے لیکن شری راج کی سی آئی ڈی کا خاص آدمی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کہیں وہ شری راج کو خبر تو نہیں کر دے گا؟“

مشتاق علی بولے۔

”ایسی بات نہیں ہے وہ میری وجہ سے ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ ویسے بھی وہ کلمہ گو ہے اور پاکستان سے محبت کرتا ہے۔ اچھا یہ بتائیں کہ بھاوجہ صاحبہ یعنی آپ کی بیوی کا حلیہ کیسا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میرے پاس اس کی فوٹو ہے۔“

”یہ تو بہت اچھا ہے۔ مجھے دکھائیں گے؟“

میں نے بریف کیس میں سے جمیلہ کی فوٹو نکال کر دے دی۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگے۔ میں نے انگلی رکھ کر بتایا کہ یہ میری بدنصیب بیگم جمیلہ ہے۔ مشتاق علی بڑی درد مندی سے بولے۔

"خدا کرے کہ یہ مسلمان خاتون آپ کے پاس واپس آ جائے۔ مشرقی پاکستان میں غیر بنگالیوں کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔"

انہوں نے جمیلہ کی فوٹو مجھے واپس کر دی اور کہا۔

"اسے آپ اپنے پاس سنبھال کر رکھیں۔ ضرورت پڑنے پر میں آپ سے لے لوں گا۔ دوسری بات مجھے تمہیں یہ کہنی تھی کہ تم اپنا لباس تبدیل کر لو تو زیادہ بہتر ہے۔ بنگالیوں والا لباس تمہیں کسی نئی مصیبت میں نہ پھنسا دے۔"

مشتاق علی نے مجھے اپنے ایک خاص ملازم کے ساتھ دلی کے ایک نئے شاپنگ سنٹر بھیج دیا جہاں سے میں نے اپنے لیے دو پتلونیں' دو کالر والی قمیض اور نئے جوگنگ شوز خرید لیے۔ دوسرے روز میں ان کپڑوں میں اپنے کمرے سے نکل کر مشتاق صاحب کے پاس آیا تو وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ کہنے لگے۔

"یہ لباس بالکل ٹھیک ہے۔"

انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور کہنے لگے۔

"اگر کسی نے تم سے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو اور کہاں رہتے ہو تو کہہ دینا کہ میں کلکتے میں پرانے کپڑوں کا کاروبار کرتا ہوں اور دلی کاروبار سلسلے میں آیا ہوا ہوں اور مغل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اس سے زیادہ کسی کو کچھ نہ بتانا۔ باقی میں نے ابھی ابھی اپنے آدمی کو فون کیا ہے' وہ تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائے گا۔ تم اپنے کمرے میں ہی رہنا۔ بہتر ہو گا کہ تم یہاں مجھ سے بھی زیادہ نہ ملو۔ یہ میں تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ کل میں نے سی آئی ڈی کے ایک آدمی کو ہوٹل میں چائے پیتے دیکھا تھا۔"

میں نے کہا۔ "میں ایسا ہی کروں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔"

"تم اپنے کمرے میں جا کر بیٹھو۔ میرا آدمی آیا تو میں اسے لے کر خود تمہارے پاس آ جاؤں گا۔"

میں کمرے میں آ کر پلنگ پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا میں اب جمیلہ سے کبھی مل سکوں گا یا نہیں؟ کیونکہ حالات مجھے جمیلہ سے روز بروز دور کر رہے تھے اور اس کا ملنا

مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک بات کا فیصلہ میں نے کلکتے میں ہی کر لیا تھا کہ جن لوگوں نے محمد پور سے میری بیوی اور دوسری غیر بنگالی عورتوں کو اغوا کر کے انہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہے ان میں سے اگر کسی کا کھوج مل گیا تو میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ابھی تک مجھے ان آدمیوں میں سے صرف کلکتے والا کھیا دادا ہی ملا تھا جس نے مکتی باہنی والوں کے ساتھ مل کر محمد پور سے میری بیوی کو اغوا کیا تھا۔ اس کے ساتھی دھرمو کو میں ابھی تک نہیں مل اتھا۔ لیکن میں جمیلہ کو حاصل کرنے کے بعد ہی ان لوگوں سے اپنی بے حرمتی کا انتقام لے سکتا تھا۔ یہ میں نے طے کر رکھا تھا کہ کھیا اور دھرمو دونوں مکتی باہنیوں کو میں کسی حالت میں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

میں نے کھانا بھی کمرے میں ہی منگوا کر کھایا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے کہ مشتاق علی صاحب ایک آدمی کو لے کر میرے کمرے میں آ گئے۔ تیس پینتیس سال کے اس سانولے آدمی نے سویٹر اور پتلون پہنی ہوئی تھی۔ بال خضاب سے کالے کیے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں بڑی چمک تھی، سگریٹ پی رہا تھا۔ مشتاق صاحب نے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ ہیں احمد صاحب۔ میرے پرانے دوست ہیں۔"

پھر انہوں نے احمد صاحب سے کہا۔

"اور یہ میرے دوست کرم داد ہیں۔"

احمد صاحب نے بڑے غور سے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اردو میں کہا۔

"آپ ڈھاکے میں کیا کاروبار کرتے تھے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرا فرنیچر کا کاروبار تھا۔ کچھ دیر مشرقی پاکستان کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ڈھاکہ فال پر بھارت کے دوسرے مسلمانوں کی طرح انہیں بھی بڑا صدمہ پہنچا تھا۔ احمد صاحب نے براہ راست مجھ سے سوال کیا۔

"جس وقت مکتی باہنی والے آپ کے مکان میں داخل ہوئے تو آپ کہاں تھے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں گھر سے باہر تھا۔ جب محمد پور میں آیا تو وہاں ہر طرف واویلا مچا ہوا تھا۔ مکتی باہنی والے غیر بنگالیوں کا قتل عام کر رہے تھے۔ سارے واقعات سننے کے بعد احمد صاحب کہنے لگے۔

"مجھے یاد ہے ہمارے باس شری راج کے کچھ آدمی بنگلہ دیش سے اغوا کر کے لائی ہوئی لڑکیاں دیکھنے کلکتے ضرور گئے تھے اور دو تین لڑکیاں خرید کر بھی لائے تھے مگر میں نے ان لڑکیوں کو صرف ایک بار ہی دیکھا ہے۔ اس کے بعد وہ ہمارے کمپلیکس میں کہیں نظر نہیں آئیں۔ میرا خیال ہے کہ باس شری راج نے انہیں سپیشل ٹریننگ کے لیے انڈر گراؤنڈ کیمپ میں بھجوا دیا ہے۔"

میں نے احمد سے پوچھا۔

"کیا آپ کو کلکتے سے خرید کر لائی گئی لڑکیوں کی شکل و صورت یاد ہے؟"

"بڑی اچھی طرح سے یاد ہے۔ ان میں سے ایک کا رنگ گورا تھا۔ دبلی مگر صحت مند تھی۔"

میں نے جمیلہ کی فوٹو بریف کیس سے نکال کر اس کے آگے رکھ دی۔

"کیا وہ لڑکی یہ تو نہیں تھی۔"

احمد صاحب جمیلہ کی فوٹو دیکھتے ہی بول اٹھے۔

"بالکل یہی لڑکی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہی آپ کی بیگم صاحبہ ہیں۔ کوئی بات نہیں میں کل ہی آپ کو یہ معلوم کر کے بتا دوں گا کہ اسے باس نے سپیشل ٹریننگ کے لیے انڈر گراؤنڈ کیمپ میں بھیجا ہے یا نہیں۔ جو بھی صورت حال ہوئی میں آپ کو کل پورا کھوج لگا کر بتاؤں گا۔"

وہ رات اور اس سے اگلا دن سخت بے چینی اور کش مکش میں گزرا۔ اپنے کمرے میں ہی پڑا رہا۔ تیسرے پہر مشتاق صاحب آ گئے۔ ان کے ساتھ شری راج کا آدمی احمد بھی تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"کرم داد صاحب! آپ کی بیوی جمیلہ بیگم کو باس نے خاص ٹریننگ کے واسطے انڈر

گراؤنڈ ٹریننگ کیمپ میں نہیں بھیجا۔"

"تو کیا وہ دلی میں اس بدمعاش کے بنگلے پر ہی ہے؟"

میرے اس سوال کے جواب میں مسٹر احمد نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کرم داد صاحب! آپ کی بیگم صاحب شری راج کے بنگلے پر بھی نہیں ہیں۔"

"تو پھر وہ کہاں ہے؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

احمد صاحب نے کہا۔

"شری راج سخت توہم پرست آدمی ہے اور ناگ دیوی کا اندھا عقیدت مند ہے۔ ناگ دیوی کے بڑے مندر کے پجاری دیوگری کو وہ اپنا دیوتا اور گورو مانتا ہے۔ دو روز پہلے ناگ دیوی کے بڑے مندر کے پجاری اور شری راج کے گورودیو پجاری دیوگری اس کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے آپ کی بیوی جمیلہ کو وہاں دیکھ لیا اور شری راج سے کہا کہ یہ لڑکی تو آکاش کی اپسرا ہے۔ اسے ہمارے حوالے کر دو۔ ہم اسے ناگ مندر کی دیوداسی بنائیں گے اور شری راج نے آپ کی بیوی جمیلہ کو گورو دیو کے حوالے کر دیا جو اسے لے کر اپنے چیلے چانٹوں کے ساتھ ناگ دیوی کے مندر جا چکا ہے۔"

میرے سامنے ایک اور جوالہ مکھی کا دہانہ کھل گیا تھا۔ مشتاق علی نے احمد صاحب سے پوچھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ جو لڑکی شری راج نے اپنے گورو دیو کے حوالے کی ہے وہ کرم داد کی بیگم جمیلہ ہی تھی؟"

احمد صاحب بولے نے کہا۔

"جس عورت کی تصویر کرم داد صاحب نے مجھے دکھائی ہے اگر وہ کرم داد صاحب کی بیگم ہے تو پھر یقین کریں کہ یہی عورت شری راج نے اپنے گورو دیو کے حوالے کی ہے۔"

میں نے گہرا سانس بھر کر پوچھا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ بدمعاش گورو پجاری کہاں گیا ہوگا؟"

احمد صاحب نے کہا۔

"یہاں سے جنوب کی جانب مدھیہ پردیش میں ایک جگہ آتی ہے سنبھل پور، اس کے پہلو میں بالکل متوازی ایک دوسری جگہ ہے جس کا نام دیوگڑھ ہے۔ ان دونوں قصبوں اور دیوگڑھ سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر دریائے کاویری کے کنارے ناگ دیوی کا ہزاروں سال پرانا مندر ہے۔ پجاری دیوگری اس مندر کا منہت ہے۔ لیکن وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ تم بالکل اجنبی ہو اور ناگ دیوی کے مندر میں سانپوں کا راج ہے۔ وہاں ایسے ایسے زہریلے سانپ ہیں جن کی پھنکار اگر چہرے پر پڑ جائے تو آدمی مرجاتا ہے۔ یہ سارے سانپ پجاری دیوگری کے غلام ہیں اور اس کا حکم مانتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"احمد صاحب! میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار پھر تصدیق کرلیں کہ جس عورت کو شری راج نے اپنے گورو کو سونپا ہے وہ میری بیوی جمیلہ ہی تھی۔"

وہ کہنے لگے۔

"اول تو مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ عورت جمیلہ بی بی ہی تھی۔ لیکن اگر اس کے باوجود تم مزید تسلی کرنا چاہتے ہو تو مجھے جمیلہ بی بی کی فوٹو دے دو۔ میں اس کی مزید تصدیق کرلوں گا۔"

میں نے جمیلہ کی فوٹو احمد صاحب کے حوالے کردی وہ کہنے لگے۔

"میں کل کسی وقت آکر بتاؤں گا۔"

ان کے جانے کے بعد مشتاق علی کہنے لگے۔

"کرم داد بھائی! کیا تم ان سانپ کی پوجا کرنے والے شیطانوں کے مندر میں جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"اگر میری بیوی جمیلہ کو یہ لوگ جہنم میں بھی لے گئے ہوں گے تو میں اپنی بیوی کو

نکالنے وہاں بھی پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت میری زندگی کا یہی ایک مقصد اور یہی ایک مطلب ہے۔ اگر میری بیوی محمد پور میں دوسرے لوگوں کے ساتھ شہید ہو جاتی تو مجھے آج صبر آگیا ہوتا۔ لیکن وہ زندہ ہے اور کافروں کے قبضے میں ہے۔ میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک میں ان کافروں کو تہہ تیغ کر کے اپنی بیوی کو ان سے نجات نہیں دلا دوں گا۔"

اس کے بعد مشتاق علی صاحب خاموش ہو گئے۔

وہ رات بھی میرے لیے قیامت کی رات تھی۔ کسی وقت نیند کا غلبہ ہو جاتا اور کسی وقت میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا۔ مجھے جمیلہ کی چیخیں سنائی دیتیں۔ رات اسی عذاب اور کرب کے عالم میں گزر گئی۔ اگلے روز دن کے دس بجے احمد صاحب آ گئے۔ مشتاق علی کو ساتھ لے کر وہ میرے کمرے میں آئے اور جمیلہ کی فوٹو والا لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"کرم داد اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ جس عورت کو شری راج نے اپنے گوبند دیو کے حوالے کیا ہے وہ آپ کی بیوی جمیلہ بی بی ہی تھی جس کی یہ فوٹو ہے اور جس کو شری راج کے آدمی کلکتے میں مکھیا دادا سے خرید کر لائے تھے۔"

احمد صاحب کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے مشتاق علی صاحب سے کہا۔

"مشتاق صاحب! کیا آپ پتہ کر کے مجھے بتا سکتے ہیں کہ یہ سنبھل پور اور دیو گڑھ کے علاقے جہاں ناگ دیوی کا مندر ہے کہاں پر ہیں اور وہاں جانے کے لیے مجھے کہاں سے گاڑی پکڑنی ہو گی؟"

مشتاق صاحب کو یقین ہو چکا تھا کہ اب میں وہاں نہیں رکوں گا۔ کہنے لگے۔

"میں نے اس طرف کبھی سفر نہیں کیا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ یہ علاقے جیسا کہ احمد صاحب نے بتایا آندھرا پردیش میں نہیں ہیں بلکہ مدھیہ پردیش میں واقع ہیں۔ میں پوری انکوائری کر کے تمہیں بتا سکتا ہوں تم یہاں کمرے میں ہی ٹھہرو۔"

وہ نیچے ہوٹل کی لابی میں چلے گئے۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد آئے اور کہنے لگے۔

"میاں! یہ دونوں علاقے واقعی مدھیہ پردیش میں ہیں۔ ناگ دیوی کا مندر دیو گڑھ کے قریب دریائے کاویری کے کنارے ایک جنگل میں واقع ہے۔ تمہیں دلی سے رانچی جانے والی گاڑی پکڑنی ہوگی۔ رانچی سے تم دوسری ٹرین پکڑو گے جو اڑیسہ پرانت کے بڑے شہر بھوبنیشور کو جاتی ہے۔ سنبھل پور راستے میں ہی آتا ہے۔ تم سنبھل پور اتر جاؤ گے اور وہاں سے کسی لاری میں بیٹھ کر دیو گڑھ کی طرف جاؤ گے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ تم اکیلے یہ خطرناک مہم کیسے سرانجام دو گے؟ تمہارے پاس اپنی حفاظت کے لیے کوئی اسلحہ بھی نہیں ہے۔ تم ان سارے علاقوں سے ناواقف ہو۔"

میں نے کہا۔

"خدا کی مدد میرے ساتھ ہوگی۔ مشتاق صاحب! آپ نے میری خاطر جو کچھ کیا اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اللہ آپ کو اس کی جزا دے گا۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، جنہیں میں نے بڑی مشکل سے روک لیا۔ کیونکہ کسی کے سامنے آنسو بہانا مجھے گوارا نہیں تھا۔ مشتاق صاحب بولے۔

"کرم داد بھائی! تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں نے جو کچھ کیا ایک مسلمان کی حیثیت سے اور ایک انسان کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ جمیلہ تمہاری بیوی ہی نہیں ہماری بہن کی طرح بھی ہے۔ خدا کرے کہ وہ تمہیں مل جائے اور تم دونوں خیر و عافیت سے پاکستان واپس پہنچ جاؤ۔"

میں نے ان سے کہا کہ وہ کلکتے میں حاجی فرید احمد صاحب کو تمام حالات سے باخبر کر دیں اور انہیں کہہ دیں کہ اگر میں جمیلہ کو واپس لانے میں کامیاب ہوگیا تو ان کا شکریہ ادا کرنے ان کے پاس ضرور آؤں گا۔ مشتاق صاحب بولے۔

"میں آج ہی انہیں فون کر کے سارے حالات بتا دوں گا۔ تم کب روانہ ہونا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں تو اسی وقت نکل جانا چاہتا ہوں۔ مجھے صرف اتنا معلوم کروا دیں کہ دلی سے رانچی شہر کو ٹرین کس وقت جاتی ہے۔"

"یہ میں ابھی فون پر معلوم کیے دیتا ہوں۔"

مشتاق صاحب نے نیچے جا کر ریلوے انکوائری آفس سے جو کچھ معلوم کیا مجھے اوپر آکر بتا دیا۔ کہنے لگے۔

"ایک ایکسپریس ٹرین رات کے سوا نو بجے دلی سٹیشن سے چلتی ہے۔ اس کے بعد رات گیارہ بجے ایک مسافر ٹرین پھر چھوٹتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں سوا نو بجے والی گاڑی پکڑنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں تمہارا ٹکٹ منگوائے لیتا ہوں۔ اگر پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دو۔ جتنے پیسے چاہیں میں پیش کر دیتا ہوں؟"

میں نے کہا۔

"میرے پاس اس وقت چھ سات سو روپے موجود ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ کافی ہوں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔"

مشتاق علی صاحب مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں موت کی مہم پر جا رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک شبہ بھی نہیں تھا کہ میں موت کی مہم پر ہی جا رہا تھا۔ اگر جسمانی طور پر کوئی چیز میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی تو وہ میری فوج میں حاصل کی ہوئی کمانڈو ٹریننگ تھی۔ مجھے اپنے اوپر پورا اعتماد تھا اور مجھے معلوم تھا کہ میں اتنی آسانی سے دشمن کے قابو میں آنے والا نہیں ہوں۔ صرف مجھے ایک پستول یا ایک بڑے کمانڈو چاقو کی شدید ضرورت تھی۔ پستول کا ذکر میں نے مشتاق صاحب کے آگے اس لیے نہیں کیا تھا کہ دو چار دنوں میں میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ مشتاق صاحب اس قسم کے آدمی نہیں ہیں کہ میرے لیے کہیں سے بلا لائسنس پستول وغیرہ کا کوئی بندوبست کر سکیں۔ اگر میں انہیں کمانڈو چاقو

لانے کے لیے کہتا تو وہ یہ چاقو بھی نہیں لا سکتے تھے۔ کیونکہ انہیں اس خاص قسم کے چاقو کی سمجھ نہیں تھی۔ میں نے خود ہی بازار سے چاقو خریدنے کا فیصلہ کیا اور مشتاق صاحب کو بتائے بغیر ہوٹل کے پچھلے دروازے سے نکل کر دلی کے اس ماڈرن علاقے کی ایک مارکیٹ میں آ گیا۔ وہاں چاقو چھریوں کی ایک دکان تھی۔ وہاں سے مجھے ایک کمانڈو چاقو مل گیا۔ اس چاقو کو بھارت کے جنگلوں میں شکار کھیلنے والے شکاری لوگ استعمال کرتے تھے۔ چاقو پر چمڑے کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ میں اسے لے کر ہوٹل میں آ گیا۔

شام کا کھانا میں نے اور مشتاق علی صاحب نے مل کر کھایا۔ کہنے لگے۔

"کرم داد بھائی! مجھ سے کوئی کوتاہی ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہاری اچھی طرح سے خدمت نہیں کر سکا۔"

مشتاق علی صاحب بڑے درد مند مسلمان تھے۔ میں نے کہا۔

"آپ نے میرے ساتھ بھائیوں سے بڑھ کر سلوک کیا ہے۔ میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔"

میں نے جمیلہ کی فوٹو والا لفافہ اپنے کوٹ کی جیب میں سنبھال کر رکھ لیا۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے مشتاق صاحب نے میرے لیے ٹیکسی منگوا لی۔ وہ اپنی گاڑی میں مجھے نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ یہ بھارتی مسلمان ہونے کے ناطے ان کی مجبوری تھی۔ میں مشتاق صاحب کے گلے لگ کر ملا۔ ہوٹل کی لابی سے نکل کر تیز تیز قدم چلتا ٹیکسی میں سوار ہوا اور ٹیکسی دلی ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑی۔





دلی سے رانچی تک کا سفر کافی طویل تھا۔

پورے بھارت کے وسط میں سے گزرنا پڑا۔ راستے میں کئی بڑے شہر آئے۔ دلی سے علی گڑھ، علی گڑھ سے آگرہ، وہاں سے کانپور، کانپور سے الہ آباد، آگے بنارس سے آگے صوبہ بہار کا مشہور تاریخی شہر گیا آیا جہاں مہاتما بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ پورا ایک دن اور ایک رات سفر میں گزر گئی۔ دوسرے دن شام کے وقت گاڑی رانچی پہنچی۔ رانچی سے مجھے سنبھل پور جانا تھا۔ معلوم ہوا کہ آگے بھی ایک رات کا سفر ہے اور سنبھل پور والی گاڑی دس بجے رات کو چلے گی۔ میں نے رانچی کے سٹیشن پر ہی رکنے کا فیصلہ کیا۔ میں شہر میں ادھر ادھر پھرنے سے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں پاکستانی تھا اور میرے پاس بھارت کا کوئی ویزا وغیرہ نہیں تھا۔ دلی میں میں بنگال سے کافی دور تھا مگر اب مغربی بنگال کے قریب آ گیا تھا اور میں اسی علاقے سے فرار ہوا تھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ میں سی آئی ڈی والوں کی نگاہوں میں آجاؤں۔ سٹیشن کے مسافر خانے میں بہت سے مسافر موجود تھے۔ میں بھی وہاں پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ وہیں میں نے ریلوے کی کنٹین پر کھانا وغیرہ کھایا۔ چائے پی اور رات کے دس بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں پوری طرح خبردار تھا۔ ابھی تک مجھے وہاں کوئی مشکوک آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ ٹکٹ میں نے لے رکھا تھا۔ رات کو ساڑھے دس بجے سنبھل پور سے ہوتی ہوئی آگے ناگ پوری کو جانے والی گاڑی آئی۔

ساری رات سفر میں گزر گئی۔ یہاں موسم گرم ہو گیا ہوا تھا۔ مجھے کوٹ میں گرمی لگ رہی تھی۔ کوٹ کے اندر میں نے کارڈ رائے کی پرانی جرسی پہن رکھی تھی۔ میں نے کوٹ اتار کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ صبح منہ اندھیرے ٹرین سنبھل پور کے سٹیشن پر رکی۔ میں اتر گیا۔ کوٹ میں نے اپنے کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ کیونکہ یہاں سردی بالکل نہیں تھی۔ اپنی کارڈرائے کی جرسی کے بھی بٹن میں نے کھول رکھے تھے۔ کمانڈو چاقو جرسی کے اندر والی جیب میں تھا۔ بھارتی کرنسی کے کچھ نوٹ جو بچ گئے تھے وہ میری پتلون کی پچھلی جیب میں تھے۔ میری بیوی جمیلہ کی فوٹو والا لفافہ بھی پتلون کی پچھلی جیب میں ہی تھا۔ میری بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ شانے چوڑے چکلے تھے اور جسم مضبوط تھا جس کو آرمی کی کمانڈو ٹریننگ نے بے حد پھرتیلا اور چٹان ایسا بنا دیا ہوا تھا۔

مشتاق علی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ سنبھل پور سے دیو گڑھ جانے کے لیے مجھے کوئی نہ کوئی لاری مل جائے گی۔ مجھے لاری میں سفر کرتے ہوئے دیو گڑھ سے ایک میل پیچھے زیا کے قریب اتر جانا تھا کیونکہ ناگ دیوی کا مندر وہیں جنگل میں کسی جگہ پر تھا۔ سنبھل پور کا قصبہ کافی بڑا تھا۔ ابھی دن نہیں نکلا تھا۔ ایک دو مندروں میں پوجا پاٹھ ہو رہی تھی اور گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ سارا علاقہ ہندوؤں کا گڑھ تھا۔ میں سٹیشن کے باہر چائے کی ایک دکان پر آ کر بیٹھ گیا۔ چائے پی۔ تھوڑا سا ناشتہ کیا اور ایک آدمی سے پوچھا کہ دیوگڑھ کو لاری یا بس کہاں سے چلتی ہے۔ اس نے بتایا کہ سٹیشن کی دوسری طرف لاری اڈہ ہے۔ وہاں سے مجھے بس مل جائے گی۔ میں اٹھ کر لاری اڈے پر آ گیا۔ مجھے دیو گڑھ جانے والی لاری مل گئی۔ اس میں سبھی ہندو سوار تھے۔ کچھ سادھو قسم کے لوگ بھی تھے جو ناگ دیوی کی پوجا کو جا رہے تھے۔ لاری دیوگڑھ کی طرف چلی جا رہی تھی۔ یہ سارا علاقہ جنگل کا علاقہ تھا۔ اونچے اونچے گنجان درختوں کے درمیان ایک کچی سڑک بنی تھی جس پر لاری ہچکولے کھاتی جا رہی تھی۔ میرے ساتھ ہی جو ہندو بیٹھا تھا اور جس کے ماتھے پر لال تلک لگا ہوا تھا اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں دیو گڑھ جا رہا ہوں یا ناگ دیوی مندر کی یاترا کو جا رہا ہوں۔ میں نے کہا۔

"مہاراج! میں ناگ دیوی کی پوجا کرنے جا رہا ہوں۔"

وہ بولا۔

"رکھشنا کے لیے کیا لے جا رہے ہو؟ میں تو سوا پندرہ روپے رکھشنا ڈالوں گا۔ تم بھی اس سے زیادہ پیسے پجاری کو مت دینا۔ یہ پجاری لوگ بڑے لالچی ہوتے جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میں بھی سوا پندرہ روپے ہی دوں گا۔"

اس سے مجھے پتہ چلا کہ ناگ دیوی کے مندر میں رکھشنا ضرور ڈالی جاتی ہے۔ میں نے مزید معلومات حاصل کرنے کے خیال سے اس سے کہا۔

"مہاراج! میں پنجاب سے آ رہا ہوں۔ میرا نام مدن لال ہے۔ پہلی بار ناگ دیوی کے درشن کرنے آیا ہوں۔ سنا ہے وہاں بڑے زہرلے سانپ ہوتے ہیں۔ وہ یاتریوں پر حملہ تو نہیں کرتے۔؟"

وہ ہندو بولا۔

"جو یاتری ان سے ڈر جاتا ہے اس پر حملہ ضرور کرتے ہیں۔ تم بالکل نہ ڈرنا۔ جو ڈرتا نہیں سانپ اسے کچھ نہیں کہتے۔ ویسے آج تک کسی سانپ نے کسی یاتری کو نہیں کاٹا۔ یہ ناگ دیوی کا خاص وردھان ہے۔"

میں نے دل میں کہا کہ مجھ پر اگر کسی سانپ نے حملہ کیا تو اسے وہیں کچل دوں گا۔ سوچ رہا تھا کہ میری بیوی جمیلہ یہاں کس طرح زندہ ہوگی۔ خدا کرے کہ وہ مجھے یہاں مل جائے میں نے ہندو سے پوچھا۔

"ناگ مندر کے بڑے پجاری کا نام کیا ہے؟"

وہ بولا۔

"اسے گورو دیو گری کہتے ہیں۔ بڑا لالچی پجاری ہے۔ سنا ہے شہر میں اس کا غنڈوں بدمعاشوں سے بھی تعلق ہے۔ مگر یہاں کسی کے آگے ایسی بات نہ کرنا۔ دیو گری کے چیلوں کو پتہ چل گیا تو وہ تم پر رات کو سانپ چھوڑ دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "میں کسی سے ایسی بات نہیں کروں گا۔"

دیو گڑھ ابھی کچھ دور ہی تھا کہ لاری ایک گاؤں کے باہر رک گئی۔ میرے ہندو ساتھی نے کہا۔

"آ جاؤ یہاں سے ناگ مندر قریب ہی ہے۔"

میں بھی دوسرے یاتریوں کے ساتھ لاری سے اتر پڑا۔ سادھو لوگ آگے آگے تھے۔ پیچھے پیچھے شہری یاتری تھے۔ سب ناگ دیوی کے بھجن گاتے جنگل کی ایک پگڈنڈی پر چل پڑے۔ تین چار میل گھنے جنگل میں سفر کرنے کے بعد سامنے دریا آ گیا۔ دریا زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ بڑی نہر جتنا چوڑا تھا۔ مگر اس کا پانی بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ دریا کے کنارے ایک مخروطی مینار والا مندر بنا ہوا تھا۔ مندر کے اوپر زرد رنگ کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ مندر کے بڑے دروازے کی سیڑھیاں نیچے دریا کے کنارے تک چلی گئی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر میں نے دیکھا کہ ہندو مرد اور عورتیں دریا کے پانی سے اشنان کر رہی تھیں۔ دو تین ہندو عورتیں تو بالکل عریاں تھیں۔ باقی عورتوں نے ململ کی ساڑھیاں لپیٹ رکھی تھیں۔

مندر کی بڑی ڈیوڑھی میں بڑا سا ٹل لٹک رہا تھا۔ جو یاتری اندر جاتا تھا ہاتھ مار کر ٹل کو ضرور بجاتا تھا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ میں اپنے ہندو ساتھی کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ جو کچھ وہ کرتا تھا میں بھی کیے جاتا تھا۔ آگے مندر کا ایک کمرہ بنا ہوا تھا جہاں استھان پر ایک کالے رنگ کی عورت کی مورتی کھڑی تھی۔ مورتی کے سارے جسم پر سیندھور اور تیل ملا ہوا تھا۔ مورتی بڑی ڈراؤنی تھی۔ اس کی گردن میں زندہ سانپ جھول رہے تھے۔ کمرے کے فرش اور دیواروں پر بھی سانپ رینگ رہے تھے۔ میں بڑی احتیاط سے ہندو ساتھی کے ساتھ لگ کر چل رہا تھا۔ اس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

"مدن لال! ڈرنا بالکل نہیں۔ ڈرو گے تو کوئی نہ کوئی سانپ آ کر تمہیں ڈس لے گا۔"

ایک موٹی گردن والا بڑا صحت مند منت گلے میں جینو ڈالے گیروی دھوتی باندھے آلتی پالتی مارے ناگ دیوی کی مورتی کے آگے بیٹھا یاتریوں سے رکھشا وصول کر کے ان کو چھوٹے چھوٹے ایک دو بتاشے دے دیتا تھا۔ میں نے بھی سوا پندرہ روپے رکھشا دی اور

منت سے تین بتاشے لے لیے۔ میرے ہندو ساتھی نے کہا۔

"یہی دیوگری منت ہے۔ یہ مندر کا بڑا پجاری ہے اور بڑا دولت مند آدمی بن گیا ہے۔"

دیوگری کے گلے میں بھی کالے رنگ کا ایک سانپ لٹک رہا تھا۔ ہندو ساتھی نے کہا۔

"یہ کالا سانپ پجاری دیوگری کا باڈی گارڈ ہے۔ یہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔"

میں بڑے پجاری دیوگری کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ یہی شخص دلی کے شری راج سے میری بیوی کو لے آیا تھا۔ میں اپنے ہندو ساتھی کے ہمراہ یاتریوں کے دھکے کھاتا آگے نکل گیا۔ دوسرے دروازے پر آ کر میں نے ہندو ساتھی سے پوچھا۔

"یہ پجاری یہیں مندر میں ہی رہتا ہے کیا؟"

وہ بولا۔ "اور کہاں جائے گا۔ بڑا عیاش آدمی ہے۔ سب لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ روز رات کو دارو پیتا ہے اور اس نے اپنی عیاشی کے لیے کچھ عورتیں بھی مندر میں پال رکھی ہیں۔ یہ انہیں ناگ دیوی کی داسیاں کہتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا یہ ناگ داسیاں بھی مندر میں ہی رہتی ہیں۔"

وہ ہندو یاتری کہنے لگا۔

"مندر کے ایک تہہ خانے میں رہتی ہیں۔ بڑے زہریلے سے سانپ ان پر پہرہ دیتے ہیں۔ اگر کوئی ناگ داسی باہر نکلنے کی کوشش کرے تو سانپ انہیں وہیں ڈس کر ہلاک کر دیتے ہیں۔"

"تو کیا یہ ناگ داسیاں کبھی تہہ خانے سے باہر نہیں نکلتیں؟"

ہندو یاتری وہاں کا بھیدی معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا۔

"کہتے ہیں مہینے میں ایک بار پجاری دیوگری خود انہیں تہہ خانے سے نکال کر جنگل میں پھرانے لے جاتا ہے۔ اس وقت دونوں جانب اور آگے پیچھے پجاری کے پالتو زہریلے سانپ باڈی گارڈ بن کر چل رہے ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ ”پھر بھی کوئی نہ کوئی ناگ داسی کبھی نہ کبھی تو فرار ہو ہی جاتی ہوگی۔ انسان اس قید سے تنگ بھی آ جاتا ہے۔“

ہندو یاتری کہنے لگا۔

”پجاری دیوگری نے ان ناگ داسیوں کے جسموں کی بو اپنے تمام باڈی گارڈ سانپوں کو سنگھا رکھی ہے۔ کہتے ہیں جب پہلے پہل کوئی عورت ناگ داسی بن کر مندر میں لائی جاتی ہے تو اسے تہہ خانے کے ایک کمرے میں ننگی کر کے چارپائی کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور پجاری دیوگری اس عورت پر اپنے باڈی گارڈ سانپ چھوڑ دیتا ہے۔ یہ سانپ نئی ناگ داسی کے عریاں بدن پر ساری رات رینگتے رہتے ہیں۔ عورت چیخیں مارتی ہے اور پھر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ صبح سانپوں کو کمرے سے نکال کر پٹاریوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ بدنصیب عورت ناگ مندر کی داسی بنا لی جاتی ہے۔ اگر وہ کسی طرح فرار ہو جائے تو پجاری دیوگری اس سانپ کو پٹاری میں سے نکال کر چھوڑ دیتا ہے جس نے ناگ داسی کے عریاں بدن پر رینگ رینگ کر اس کے بدن کی بو سونگھ لی ہوتی ہے۔ وہ عورت جہاں کہیں ہوتی ہے وہاں جا کر اسے ڈس کر ہلاک کر آتا ہے۔ اس قسم کی دو تین وارداتیں دیوگڑھ اور سنبھل پور میں ہو چکی ہیں کہ ناگ مندر کی کوئی ناگ داسی فرار ہو کر وہاں پہنچی تو اسے کسی سانپ نے ڈس لیا اور اس کی لاش اس حالت میں شہر کے کسی مکان یا جنگل میں کسی پگڈنڈی کے پاس ملی کہ لاش کا جسم سیاہ پڑ چکا تھا۔ یہ ناگ مندر کے سانپ کے زہر کا اثر تھا۔“

یہ تمام حالات معلوم کرنے کے بعد میں سمجھ گیا کہ مجھے کس طریقے سے جنگ لڑنی ہوگی اور اپنی بیوی جمیلہ کو کہاں تلاش کرنا ہوگا۔ یقینی طور پر وہ بڑے پجاری دیوگری کے خفیہ والے تہہ خانے میں ہی دوسری ناگ داسیوں کے ساتھ قید میں پڑی تھی۔ میں نے اپنے ہندو ساتھی سے پوچھا۔

”یہ پجاری دیوگری کا تہہ خانہ کہاں پر ہے؟“

”تمہیں بتایا تو ہے کہ اسی مندر میں کسی جگہ پر ہے۔ سوائے دیوگری اور اس کے دو

چار بدمعاش چیلوں کے اور کسی کو اس تہہ خانے کا راستہ معلوم نہیں ہے۔"

اس ہندو یاتری نے جو لاری میں میرا دوست بن گیا تھا پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

"تم ان باتوں کو کرید کرید کر کیوں پوچھ رہے ہو' تمہیں شاید معلوم نہیں کہ پجاری دیوگری کے سانپوں کو ان باتوں کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ فضا کو سونگھ لیتے ہیں۔ اگر دیوگری کو معلوم ہو گیا کہ تم اس کے خفیہ تہہ خانے کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہے ہو تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ تمہارے ساتھ میری جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اب مجھ سے کچھ نہ پوچھنا۔ ہمیں ابھی تین دن تک یہاں رہنا ہے۔"

میں نے اس کے بعد ہندو یاتری سے پجاری کے سانپوں اور اس کے تہہ خانے کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا لیکن دل میں تہیہ کر لیا کہ اس بدمعاش پجاری دیوگری کے تہہ خانے کا کھوج لگا کر رہوں گا۔ کیونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میری بیوی کو پجاری نے اسی تہہ خانے میں بند کر رکھا ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ خفیہ تہہ خانے کا کھوج کس طرح لگایا جائے۔ سوائے اس ہندو یاتری کے میرا وہاں کوئی جاننے والا نہیں تھا اور اس ہندو یاتری نے اپنا منہ بند کر لیا تھا۔ ناگ دیوی کے مندر کے اردگرد کافی کھلی جگہ تھی جہاں یاتریوں کے لیے چھوٹی چھوٹی بوسیدہ کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک ایک کوٹھڑی میں دو دو تین تین یاتری گھس گئے تھے۔ باہر بھی کچھ یاتریوں نے پھولداریاں لگا لی تھیں اور بانس کی چارپائیاں ڈال دی تھیں۔ چولہے جلا کر کھانا وغیرہ بھی پکایا جاتا تھا۔ دیوگڑھ اور سنبھل پور سے آ کر لوگوں نے کھانے پینے کی دکانیں بھی کھول رکھی تھیں۔ میں نے دوپہر کو ایک دکان پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور اپنی تنگ سی کوٹھڑی میں آ کر لیٹ گیا۔ میرے ساتھ اس کوٹھڑی میں میرا ہندو یاتری ساتھی بھی تھا۔ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ کچھ دیر لیٹ کر میں سوچتا رہا کہ مجھے اپنی مہم کا آغاز کس طرح سے اور کہاں سے شروع کرنا چاہیے۔

ایک بات میرے ذہن میں آ گئی۔ چنانچہ میں اٹھا اور کوٹھڑی سے نکل کر ٹہلتا ہوا مندر کے عقب میں آ گیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا تالاب بنا ہوا تھا۔ تالاب میں دو تین بوڑھی

عورتیں بیٹھی برتن مانجھ رہی تھیں۔ میں ان کے پیچھے سے ہوتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس جانب مندر کی دیوار دو تین مرد اونچی تھی۔ ایک جگہ مجھے دیوار میں چھوٹا سا دروازہ دکھائی دیا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا دروازے کے پاس آگیا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اندر سے بین بجنے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ یہ سپیروں والی بین کی آواز تھی جس کو بجا کر سپیرے سانپ کو نچاتے ہیں۔ میں نے آگے ہو کر دروازے میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا دالان تھا۔ وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں دبے پاؤں دالان میں داخل ہوگیا۔ دن کا وقت تھا لیکن دالان کی چھت نیچی تھی جس کی وجہ سے وہاں ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اچانک مجھے سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ میں جلدی سے ایک طرف ہوگیا۔

میں نے دیکھا کہ دالان کی دیوار سے ایک سوراخ میں تین سانپ آگے پیچھے باہر نکلنے اور فرش پر رینگتے ہوئے میری طرف بڑھے۔ مجھے ہندو یاتری کی بات یاد آگئی کہ یہاں کے سانپوں کو دیکھ کر اگر تم ڈر گئے تو یہ تم پر حملہ کر دیں گے۔ ان سے ہرگز ہرگز مت ڈرنا۔ میں ڈر تو بہت رہا تھا مگر میں نے ظاہر یہ کیا کہ میں بالکل خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں اپنی جگہ پر بظاہر بڑے سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔ تینوں سانپ رینگتے ہوئے میرے پاؤں کے قریب سے ہو کر گزر گئے۔ وہ دروازے سے باہر چلے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔ میں پیچھے مڑنے ہی لگا تھا کہ بین کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ یہ آواز دالان کی ایک چھوٹی سی بند کھڑکی میں سے آ رہی تھی۔ میں دبے دبے قدم اٹھاتا کھڑکی کے پاس گیا اور اسے ذرا سا دھکیلا۔ کھڑکی ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گئی۔ میں اس کے صرف ایک پٹ کو تھوڑا سا کھول کر دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف پہلے تو اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ پھر آہستہ آہستہ نظر آنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ یہ ایک تنگ سی کوٹھڑی ہے۔ جس کے کونے میں ایک لبوترا پرانے طرز کا دروازہ بنا ہوا ہے۔ بین کی آواز اسی طرف سے آ رہی تھی۔ مجھے تہہ خانے کے خفیہ راستے کی تلاش تھی۔ میں کھڑکی سے کوٹھڑی میں اتر گیا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیے۔ اندھیرے میں میں

لمبوترے دروازے کے قریب آیا۔ دروازے کے ایک پٹ میں دو تین سوراخ تھے۔ ان سوراخوں میں سے دھیمی روشنی باہر نکل رہی تھی۔

بین کی آواز یہاں زیادہ قریب سے سنائی دینے لگی۔ میں نے ایک سوارخ میں سے جھانکا۔ دوسری جانب بھی ایک تنگ اور بوسیدہ کوٹھڑی تھی جس کے فرش پر الٹے رکھے ہوئے مٹکے پر ایک دیا روشن تھا۔ ایک مریل سا عجیب شکل و صورت کا سیاہ فام آدمی بیٹھا بین بجا رہا تھا۔ اس کے سامنے فرش پر ایک سانپ پھن اٹھائے جھوم رہا تھا۔ مریل آدمی کی کھوپڑی کسی مردے کی کھوپڑی لگ رہی تھی۔ دیئے کی روشنی میں اس کی کھوپڑی چمک رہی تھی۔ شاید اس نے کھوپڑی پر تیل ملا ہوا تھا۔ کوٹھڑی کے سامنے والی دیوار میں ایک تنگ راستہ نظر آ رہا تھا۔ اچانک وہاں دو آدمی نمودار ہوئے جنہوں نے سادھوؤں والے گیروے کرتے پہن رکھے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی مریل آدمی نے بین بجانی بند کر دی اور سانپ کو اٹھالیا۔ آنے والوں میں سے ایک نے اسے کہا۔

"سنکھو! نیچے جا۔ مہاراج گپھاہ میں آ گئے ہیں اور تمہیں بلا رہے ہیں۔ چل نیچے۔"

وہ مریل آدمی جس کا نام سنکھو تھا جلدی سے اٹھا اور جس راستے سے دونوں سادھو اوپر آئے تھے اس طرف جا کر غائب سا ہو گیا۔ دونوں سادھو کوٹھڑی کے فرش پر بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا۔

"مہاراج! آج یگیتہ کریں گے۔ ہم آج جنگل میں نہیں جائیں گے۔"

دوسرے نے کہا۔ "نہیں جائیں گے یہاں بیٹھے ہیں۔ یہیں بیٹھے رہیں گے۔"

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے اور آلتی پالتی مار کر ایسے بیٹھ گئے جیسے سمادھی لگالی ہو۔ مجھے پیچھے دالان مین سے کسی کے گزرنے کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سوچا کہ اس وقت یہاں سے چلے جانا چاہیے اور رات کو یہاں آ کر معلوم کرنا چاہیے کہ نیچے گپھاہ میں یگیتہ کیا ہونے والا ہے۔ اتنا مجھے احساس ہو گیا تھا کہ تہہ خانے میں اسی کوٹھڑی سے راستہ جاتا ہے۔ میں دبے پاؤں چل کر کھڑکی میں سے نکلا اور دوسری کوٹھڑی میں سے گزرتا ہوا دروازہ ذرا سا کھول کر دالان میں جھانک کر دیکھا۔ دالان خالی تھا۔

میں دالان میں سے تیز تیز قدموں سے گزر گیا اور مندر کی دیوار والے دروازے سے نکل کر عقبی تالاب کے پاس آ کر سامنے کی طرف چلنے لگا۔ عورتیں ابھی تک تالاب پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ میں اوپر سے ہو کر ناگ دیوی کے مندر میں اپنی کوٹھڑی میں آ گیا۔ میرا ساتھی ہندو یاتری چارپائی پر بیٹھا کوئی پوتھی کھولے بھجن گنگنا رہا تھا اور آگے پیچھے ہل رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"مدن لال! تم کہاں گئے تھے؟"

میں نے کہا۔ "یونہی جنگل میں سیر کرنے نکل گیا تھا۔"

بولا۔ "اکیلے اس طرح جنگل میں نہ جایا کرو۔ تمہیں پتہ نہیں اس جنگل میں ناگن بدروحیں رہتی ہیں اور وہ دن کے وقت بھی اپنے شکار کی تلاش میں پھرتی رہتی ہیں۔"

"اچھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا۔ اب نہیں جاؤں گا۔"

لیکن رات کو میں نے مندر کے خفیہ تہہ خانے میں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سارا دن میں نے مندر کی کوٹھڑی میں گزار دیا۔ جب رات ہوئی تو ہندو یاتری میرے اور اپنے لیے کھانا لے کر آ گیا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ اس نے کہا۔

"چلو ناگ دیوی کی پوجا کرنے چلتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میرے سر میں درد ہے، تم جاؤ۔ میں بعد میں آ جاؤں گا۔"

وہ بولا۔ "ارے بھیا تم کیسے ہندو ہو۔ ناگ دیوی کی پوجا کرنے نہیں جاتے؟"

میں نے کہا۔ "بھیا! میں تھوڑی دیر بعد آ جاؤں گا۔ تم جاؤ۔"

وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد میں بھی کوٹھڑی سے نکل کر مندر کے پیچھے تالاب پر آ گیا۔ یہاں خاموشی تھی۔ اندھیرا بھی تھا۔ مندر کی عقبی دیوار اندھیرے میں سیاہ پہاڑی ڈھلان کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ رات ہو گئی ہے۔ انتظار کرنا بیکار ہے۔ جو کچھ کرنا ہے ابھی کر گزرنا چاہیے۔ شاید میری بیوی کا کوئی سراغ مل جائے۔ میں تالاب کے کنارے کنارے چلتا مندر کی عقبی دیوار والے دروازے میں سے گزر کر دالان میں آ گیا۔ یہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے فرش کو دیکھا کہ کہیں

کوئی سانپ تو نہیں ۔ینگ رہا۔ وہاں مجھے کوئی سانپ نظر نہ آیا۔

میں نے دل میں کلمہ شریف پڑھا اور بائیں جانب والی کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ کوٹھڑی خالی پڑی تھی۔ یہاں سامنے والی دیوار میں بھی دروازہ تھا جس کے سوراخ میں سے میں نے دوسری طرف تنگ کوٹھڑی میں مریل سپیرے کو سانپ سے کھیلتے اور بین بجاتے دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید دروازہ بند ہوگا۔ مگر دروازہ کھلا تھا۔ میں نے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ کوٹھڑی میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ یہ وہی کوٹھڑی تھی جہاں دن کے وقت سپیرا سانپ سے کھیل رہا تھا اور دو سادھو آکر وہاں بیٹھ گئے تھے۔ دونوں سادھو اس وقت وہاں نہیں تھے۔ میں دبے پاؤں چلتا کونے والے دروازے تک آیا۔ یہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ ایک کھلا دہانہ تھا۔ جہاں سے نیچے سیڑھیاں جاتی تھیں۔ مریل سپیرا یہیں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے گیا تھا۔ میں نے وہاں رک کر کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ نیچے اندھیرا تھا اور کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ سادھو نے مریل سپیرے سے کہا تھا کہ نیچے گپھاہ میں مہاراج نے یکتہ کرنا ہے۔ یکتہ کسی تقریب کی رسم ہوتی ہے۔ مہاراج سے اس کی مراد مندر کا بڑا پجاری دیوگری ہی ہو سکتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اندھیرے میں سیڑھیاں اترنے لگا۔

گھپ اندھیرا تھا۔ میں دیوار کو پکڑ کر اتر رہا تھا۔ پندرہ بیس سیڑھیاں اترنے کے بعد مجھے آدمیوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوزیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح کی آوازیں تھیں۔ دو چار سیڑھیاں اترنے کے بعد میں ایک سرنگ نما راہ داری میں آگیا۔ سرنگ نما راہ داری مجھے اس لیے نظر آگئی تھی کہ اس کے آخری سرے پر جہاں راہ داری گھوم جاتی تھی شاید کوئی بجلی کا کمزور سا بلب روشن تھا یا کوئی مشعل جل رہی تھی۔ اس کی روشنی سرنگ میں پڑ رہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ آدمیوں کی ملی جلی آواز سرنگ کے دوسرے سرے سے آرہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ آگے چلنے لگا۔ جب میں سرنگ کا موڑ مڑا تو سامنے دیوار کے ساتھ بجلی کا ایک دھیمی روشنی والا بلب جل ، رہا تھا۔ یہاں سرنگ بند ہوجاتی تھی اور تین چار

سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں۔ ان سیڑھیوں کے اوپر ایک چبوترا بنا ہوا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر آگیا۔ اب آوازیں زیادہ صاف سنائی دینے لگی تھیں۔ چبوترے کے آگے دیوار میں گول شگاف سا تھا۔ شگاف میں سے ایسی روشنی آ رہی تھی جیسے دوسری طرف کہیں آگ کا الاؤ روشن ہو۔

میں جھک کر چلتا ہوا شگاف کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور دوسری طرف دیکھا۔ تب معلوم ہوا کہ میں زمین سے کوئی دس فٹ کی بلندی پر ہوں۔ نیچے ایک بہت بڑا ہال کمرہ تھا یہ زمین دوز ہال کمرہ تھا۔ ایک طرف بڑا سا تخت بچھا تھا۔ تخت پر ایک موٹی توند والا سیاہ فام پجاری گلے میں پھولوں اور ہڈیوں کی مالائیں ڈالے آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر تاج تھا جس میں سے ایک سانپ نے اپنا پھن اٹھا رکھا تھا۔ میں نے اس پجاری کو پہچان لیا۔ یہ وہی ناگ مندر کا بڑا پجاری دیوگری تھا جو میری بیوی کو دلی کے شری راج سے لے کر یہاں آیا تھا۔ اس کے اردگرد دونوں جانب چوکیوں پر گیروے کپڑوں والے دس پندرہ سادھو ترشول ہاتھوں میں لیے بیٹھے تھے۔ درمیان میں الاؤ روشن تھا۔ دو آدمی الاؤ کے گرد ڈھول کی تھاپ پر آہستہ آہستہ چکر کاٹ رہے تھے اور کوئی اشلوک پڑھ رہے تھے۔ شاید یہی یکشا تھا۔

اچانک بڑے پجاری دیوگری نے ہاتھ بلند کر کے کسی عجیب زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ ناچنے والے آدمی رک گئے۔ چوکیوں پر سے چار سادھو اٹھے۔ انہوں نے قریب ہی پڑی ہوئی پانی کی گاگریں اٹھا کر پانی الاؤ میں انڈیل دیا۔ الاؤ کی آگ بجھ گئی۔ دوسرے آدمیوں نے بجھے ہوئے الاؤ کے اوپر ایک تخت لا کر بچھا دیا۔ سب چپ ہو کر بیٹھ گئے۔ پجاری دیوگری تخت سے اٹھا اور اونچی آواز میں اشلوک پڑھتے ہوئے اس نے تخت کے دو چکر لگائے اور بلند آواز اور اپنی زبان میں پھر کوئی بات کہی۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی حکم صادر کر رہا ہے۔

اس کا حکم پاتے ہی دو سادھو تیز تیز قدم اٹھاتے کونے والی دیوار کی طرف گئے۔ وہاں پردہ گرا ہوا تھا۔ انہوں نے پردہ ہٹایا اور دوسری طرف غائب ہو گئے۔ ہال کمرے میں سناٹا

چھپایا ہوا تھا۔ پجاری دیوگری بجھے ہوئے الاؤ کے اوپر رکھے ہوئے تخت کی ایک طرف ترشول اٹھائے بت کی طرح کھڑا تھا۔ سب دم بخود بیٹھے تھے۔ دونوں سادھو پردہ ہٹا کر دوبارہ نمودار ہوئے۔ اس بار وہ اکیلے نہیں تھے۔ انہوں نے دو جوان لڑکیوں کو بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا اور لڑکیاں ایسے سر ادھر ادھر مارتی ہوئی چل کر آ رہی تھیں جیسے ان پر کوئی جادو کیا ہوا ہو یا ان کو کوئی نشہ پلا دیا گیا ہو۔ دونوں لڑکیاں سرخ ساڑھیوں میں تھیں اور ان کے اوپر والے دھڑ عریاں تھے۔ ساڑھیاں دھوتی کی طرح کمر کے گرد بندھی ہوئی تھیں۔ دونوں لڑکیوں کو تخت پر ایک دوسری کے ساتھ لٹا دیا گیا۔ دونوں میں سے کسی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ پجاری دیوگری نے ترشول والا ہاتھ اوپر اٹھا کر بلند آواز میں کچھ کہا۔ دونوں سادھو جو لڑکیوں کو وہاں لائے تھے دوڑ کر اپنی اپنی چوکی پر بیٹھ گئے۔

ایک بار پھر فضا میں سناٹا طاری ہو گیا۔

میں یہ سب کچھ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں لڑکیوں کو میں نے غور سے دیکھا ان میں میری بیوی جمیلہ نہیں تھی۔ پجاری دیوگری نے ترشول والا ہاتھ بلند کیا اور جس تخت پر لڑکیاں لیٹی ہوئی تھیں اس کے گرد چکر لگانے شروع کر دیے۔ وہ کچھ پڑھتا بھی جا رہا تھا۔ خدا جانے اس نے کتنے چکر لگائے ہوں گے۔ اس دوران دونوں لڑکیاں چپ چاپ لیٹی رہیں۔ کسی نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آخر پجاری دیوگری رک گیا۔ تخت کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے اونچی آواز میں کوئی اشلوک پڑھا اور ایک طرف اشارہ کیا۔ جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا اس طرف سے ایک سادھو پٹاری لے کر اٹھا اور پجاری دیوگری کے پاس آ کر بڑے ادب سے بیٹھ گیا۔ پجاری دیوگری نے پٹاری کا ڈھکن اٹھا دیا۔ ڈھکن کے اٹھتے ہی ایک سانپ نے پھنکار مار کر اپنا سر باہر نکالا اور پھن کھول کر لہرانے لگا۔ پجاری دیوگری نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ سانپ اس کی ہتھیلی پر آ کر بیٹھ گیا۔ پجاری دیوگری اونچی آواز میں اشلوک پڑھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے سانپ کو ایک لڑکی کے سینے پر بٹھا دیا۔

سانپ نے لڑکی کے سینے پر بیٹھتے ہی پھنکار مار کر پورے غصے اور غیض و غضب کے

ساتھ لڑکی کے سینے پر تین بار ڈس لیا۔ لڑکی کے حلق سے بھیانک چیخ نکلی اور اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔ پجاری دیوگری نے سانپ کو لڑکی کے سینے سے اٹھا کر دوسری لڑکی کے عریاں سینے پر رکھ دیا۔ سانپ نے پھنکار مار کر دوسری لڑکی کے سینے پر بھی تین بار ڈس لیا۔ دوسری لڑکی کے حلق سے بھی ایک دردانگیز چیخ نکلی اور اس کا سر بھی سانپ کے زہر کے زیر اثر ایک طرف ڈھلک گیا۔

اس کے ساتھ ہی سارے سادھو اپنی اپنی چوکیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور جس تختے پر دونوں لڑکیاں بے ہوش یا مردہ پڑی تھیں اس کے گرد ڈھول تاشوں کی تھاپ پر جھوم جھوم کر رقص کرنے لگے۔ پجاری دیوگری دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے زور زور سے اشلوک پڑھ رہا تھا۔ کافی دیر تک یہ وحشیانہ رقص جاری رہا۔ پھر آہستہ آہستہ سارے سادھو رقص کرتے جھومتے جھامتے واپس اپنی اپنی چوکیوں پر جا کر مورتیوں کی طرح بیٹھ گئے۔ دونوں بدنصیب لڑکیاں تختے پر بے سدھ ہو کر پڑی تھیں۔ ان کے جسم بالکل حرکت نہیں کر رہے تھے۔ پجاری دیوگری بھی اپنے شاہی تخت پر جا کر بیٹھ گیا۔

ہال میں ایک بار پھر گہری خاموشی ہو گئی۔

پجاری دیوگری آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا اور منہ میں کچھ گنگنا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کوئی منتر پڑھ رہا ہے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی زبان میں کوئی حکم صادر کیا۔ اس کا حکم پاتے ہی دو ہٹے کٹے سادھو اٹھ کر اس تختے کے پاس آئے جس پر دونوں لڑکیاں بے ہوش پڑی تھیں۔ ایک سادھو نے ایک لڑکی کو اور دوسرے سادھو نے دوسری لڑکی کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا اور ایک سادھو سامنے کی جانب اور دوسرا سادھو اس طرف آنے لگا جہاں فرش پر ذرا بلندی پر میں چبوترے پر چھپ کر بیٹھا یہ سارا پر اسرار خونیں منظر دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دوسری طرف مڑ جائے گا لیکن میں یہ دیکھ کر گھبرا گیا کہ وہ چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

میں جلدی سے اٹھ کر پیچھے ہو گیا اور سیڑھیاں اتر کر سرنگ میں آ کر ایک طرف اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ سادھو لڑکی کو کاندھے پر ڈالے شگاف میں سے نکلا۔

سیڑھیاں اتر کر سرنگ میں آیا اور اسی طرف چلنے لگا جس طرف سے میں آیا تھا۔ سرنگ میں واپس جانے کا یہی ایک راستہ تھا۔ میں پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ جس طرف سے مجھے وہاں سے بھاگ کر نکلنا تھا اس طرف سادھو لڑکی کو لے کر جا رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ضرور یہ سادھو لڑکی کو جنگل میں پھینکنے جا رہا ہو گا۔ میں بھی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے سرنگ میں واپس چلنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ سادھو سرنگ کا موڑ گھوم گیا۔ میں اس سے پندرہ بیس قدم پیچھے تھا اور میں نے جیب سے اپنا کمانڈو چاقو نکال لیا تھا کہ اگر سادھو نے مجھے دیکھ لیا اور مجھ پر حملہ کیا تو میں اسے ٹھکانے لگا دوں گا۔

سادھو سرنگ میں چلتا گیا۔ آگے پھر سیڑھیاں آ جاتی ہیں جو اوپر اس کوٹھڑی میں جاتی ہیں جہاں میں نے مرلی سپیرے سنکھو کو سانپ سے کھیلتے اور بین بجاتے دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سادھو لڑکی کو جنگل میں پھینکنے جا رہا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے لڑکی کو اس قدر زہریلے سانپ نے تین بار کاٹا تھا وہ کیسے زندہ بچ سکتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ سادھو لڑکی کو اٹھائے تین چار سیڑھیاں چڑھ کر کوٹھڑی میں چلا گیا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اس کوٹھڑی کو سرنگ کی جانب کوئی دروازہ نہیں تھا۔ میں سرنگ کی دیوار کے ساتھ اندھیرے میں رک کر انتظار کرنے لگا کہ سادھو کوٹھڑی سے نکل کر مندر کے عقبی دروازے سے باہر نکل جائے تو میں وہاں سے نکلوں۔ مجھے وہاں کھڑے بمشکل دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وہی سادھو کوٹھڑی کی دیوار کے شگاف میں دوبارہ نمودار ہوا۔ لڑکی اس کے کاندھے پر نہیں تھی۔ اتنی جلدی وہ لڑکی کی لاش کو جنگل میں پھینک کر واپس نہیں آ سکتا تھا۔

سادھو سیڑھیاں اتر کر سرنگ میں واپس میری طرف ہی آ رہا تھا۔ میں اندھیرے میں تھا۔ سوچا یہیں کھڑا رہتا ہوں۔ آگے آگے بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ آگے کی طرف بھاگا تو ہال کمرے میں دوسرے سادھو لوگ موجود ہیں۔ سارا کام خراب ہو جائے گا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ سرنگ کی آخری دیوار کے پاس دبے پاؤں تیز تیز قدموں سے گیا اور جہاں چبوترے کی سیڑھیاں شروع ہوتی تھیں۔ ان سیڑھیوں کی اوٹ میں اندھیرا تھا۔ میں وہاں

سمٹ کر بیٹھ گیا۔ سادھو چلا آ رہا تھا اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر گیا اور ہال کمرے میں دوسری طرف اتر گیا۔ ہال کمرے سے آدمیوں کے باتیں کرنے کی بھنبھناہٹ نما آوازیں کچھ دیر آتی رہیں پھر خاموشی چھا گئی۔

میں بڑی احتیاط سے سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر گیا۔ ہال کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نیچے اتر کر سرنگ میں سے گزرتا ہوا اس کوٹھڑی میں آگیا جہاں میرے خیال میں سادھو سانپ سے ڈسوائی جانے والی نیم عریاں لڑکی کو چھوڑ گیا تھا۔ کوٹھڑی میں آکر میں نے دیکھا کہ لڑکی فرش پر بالکل سیدھی پڑی تھی۔ اس کے سرہانے کی جانب اوندھے رکھے ہوئے مٹکے پر دیا جل رہا تھا۔ لڑکی بے ہوش تھی اور جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں کمر سے اوپر اس کا جسم عریاں تھا۔ میں آہستہ آہستہ چل کر لڑکی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں اس کے سینے پر نگاہ ڈالی۔ سینے پر سانپ کے تین بار ڈسنے کے تین نشان صاف نظر آرہے تھے۔ ان نشانوں پر خون کی بوندیں نکل کر جم گئی تھیں۔

لڑکی آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی۔ وہ زندہ تھی۔ میں حیران ہوا کہ اس کو سانپ نے تین بار کاٹا ہے پھر بھی یہ زندہ ہے۔ مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے سانپ اتنا زہریلا نہ ہو۔ میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ جمیلہ کو کہاں تلاش کرنا چاہیے۔ یہی فیصلہ کیا کہ واپس ہال کمرے میں جاؤں اور وہاں سے جو راستہ دوسری طرف کسی تہہ خانے کو جاتا ہے وہاں جا کر جمیلہ کا کھوج لگانے کی کوشش کروں۔ اس طرف سادھو دوسری لڑکی کو لے گیا تھا۔ مجھے اپنے پیچھے سانپ کی پھنکار کی آواز آئی۔ میں گھبرا کر اٹھا اور دوڑ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ جس طرف سے میں کوٹھڑی میں آیا تھا اس طرف سے میں نے ایک سانپ کو آتے دیکھا۔ سانپ کالے رنگ کا تھا اور کچھ نہیں تو چار پانچ فٹ لمبا تھا۔ میں نے پہلے تو سوچا کہ وہاں سے نکل جاؤں لیکن جب دیکھا کہ سانپ فرش پر رینگتا ہوا سیدھا لڑکی کی طرف جا رہا ہے تو وہیں رک گیا۔

کوٹھڑی میں دیے کی روشنی صرف لڑکی کے اردگرد ہی پڑ رہی تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا اس جگہ اندھیرا تھا۔ سیاہ سانپ فرش پر بے ہوش پڑی لڑکی کے اردگرد چکر لگانے لگا۔

کوئی دس بارہ چکر لگانے کے بعد وہ لڑکی کے جسم پر چڑھ گیا۔ اس نے اپنا پھن اٹھا رکھا تھا۔ وہ لڑکی کے جسم پر رینگ رہا تھا۔ رینگتا ہوا کبھی اس کی گردن سے لپٹ جاتا۔ وہاں سے اس کے سینے پر آجاتا۔ پھر لڑکی کی کمر کے پیچھے چلا جاتا۔ لڑکی نے کمر کے نیچے ساڑھی باندھی ہوئی تھی۔ سانپ ساڑھی کے اندر چلا گیا اور پھر اس کے پاؤں کی طرف سے باہر نکل آیا۔ مجھے اپنے ہندو یاتری دوست کی بات یاد آگئی۔ اس نے بتایا تھا کہ یہاں جو نئی لڑکی لائی جاتی ہے اسے رات کو ایک جگہ ڈال دیا جاتا ہے اور اس پر سانپ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ سانپ اس کے سارے جسم پر رینگتا رہتا ہے اور یوں اس لڑکی کے جسم کی بو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اگر لڑکی وہاں سے فرار ہو کر چاہے کسی جگہ پہنچ جائے سانپ اس کی بو کی مدد سے وہاں پہنچ جاتا ہے اور مفرور لڑکی کو ڈس کر ہلاک کر دیتا ہے۔

اس بے ہوش لڑکی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ اس قسم کا رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر تک سانپ بے ہوش لڑکی کے جسم سے چمٹ کر رینگتا رہا۔ پھر وہ لڑکی کے سینے پر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ جھوم رہا تھا۔ اس نے اچانک اپنا پھن لڑکی کے چہرے پر جھکایا اور لڑکی کے ہونٹوں پر منہ رکھ دیا۔ خدا جانے وہ لڑکی کو ڈس رہا تھا یا کیا کر رہا تھا۔ کوئی دس پندرہ سیکنڈ تک سانپ اسی حالت میں رہا۔ پھر اس نے پھن اٹھایا۔ زور سے پھنکارا اور لڑکی کے جسم سے اتر کر رینگتا ہوا جدھر سے آیا تھا ادھر کو چلا گیا۔ میں آہستہ سے چل کر لڑکی کے پاس آیا۔ لڑکی اسی طرح بے ہوش پڑی تھی۔ لڑکی کے ہونٹوں پر ایک جگہ سرخ خون کا نقطہ سا بن گیا تھا۔ شاید سانپ نے اسے وہاں کاٹا تھا۔ سانپوں کا یہ پر اسرار کھیل میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہی سلوک میری بیوی جمیلہ کے ساتھ بھی ان لوگوں نے کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر کہ وہ زندہ نہیں رہی ہوگی میرا خون کھول اٹھا۔ دل نے کہا چاقو کھول کر ہال کمرے کے دوسرے تہہ خانے میں جاؤ اور ان سب شیطان صفت آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دو۔ مگر اس طرح بہت ممکن تھا کہ جمیلہ مجھ سے اور دور کر دی جاتی۔ ابھی تک مجھے

بھی پتہ نہیں چل سکا تھا کہ میری بیوی اس جہنمی مندر میں موجود بھی ہے یا نہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہال کمرے کی دوسری جانب جو کوٹھڑیاں یا تہہ خانہ ہے وہاں جا کر دیکھو۔ میں اٹھ کر ہال کمرے کی طرف چلنے ہی لگا تھا کہ ایک نحیف سی آواز سن کر میرے قدم وہیں رک گئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا اوندھے گھڑے پر جلتے ہوئے دیے کی دھیمی روشنی میں بے ہوش لڑکی کو ہوش آچکا تھا۔ اسکی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ اسی طرح بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی مگر اپنے ہوش میں تھی۔ اس نے کمزور آواز میں کہا۔

"ادھر مت جاؤ۔"

میں نے جھک کر لڑکی کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی تھیں اور وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا تم زندہ ہو؟"

اس نے کہا۔ "میں زندہ ہوں۔ تم جان بچا کر یہاں سے چلے جاؤ۔ تم یہاں کیسے آ گئے ہو۔"

میں نے کہا۔ "پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں تہہ خانے میں اور کون کون سی لڑکیاں ہیں؟"

اس لڑکی پر نقاہت طاری تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس سے زیادہ بولا نہیں جا رہا۔ جمیلہ کی فوٹو میری پتلون کی جیب میں ہی تھی۔ میں یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جیب سے فوٹو نکال کر لڑکی کی آنکھوں کے سامنے کر دی اور کہا۔

"درمیان میں جو لڑکی بیٹھی ہے کیا یہ لڑکی یہاں پر موجود ہے؟ یہ پنجابی بولتی ہے اور میری بیوی ہے۔ میں اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میری مدد کرو۔ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

لڑکی کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ بڑے غور سے فوٹو دیکھ رہی تھی۔ فوٹو پر دیے کی پوری روشنی پڑ رہی تھی۔ میں نے فوٹو پر جمیلہ کے چہرے پر انگلی رکھ دی۔

"یہ میری بیوی ہے۔ اس کا نام جمیلہ ہے۔ اسے پجاری دیوگری دلی سے لایا ہے۔"

لڑکی نے آنکھیں بند کر لیں اور گہرے سانس لینے لگی۔ میں نے جمیلہ کی فوٹو اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا لی۔ لڑکی نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ پھر اس نے کمزور آواز میں کہا۔

"کل آدھی رات کے بعد مندر کے پیچھے تالاب پر آ جانا۔ اب چلے جاؤ' چلے جاؤ۔"

اور لڑکی نے کرب آمیز انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے امید کی ایک کرن نظر آ گئی تھی۔ میں نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا۔

"تمہارا شکریہ! میں کل آدھی رات کے بعد تالاب پر آ جاؤں گا۔"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور کوٹھڑی کی کھڑکی میں سے دوسری طرف نکل کر دالان میں آ گیا۔ دالان اندھیرے میں خالی پڑا تھا۔ مندر کا عقبی دروازہ اندر سے کنڈی لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ میں آہستہ سے کنڈی کھول کر باہر نکل گیا۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ ناگ دیوی کے مندر کی طرف سے بھجن گانے اور گھنٹیوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہندو یاتری کوٹھڑی میں نہیں تھا۔ میں اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ اس پر اسرار لڑکی نے مجھے کل رات کس لیے بلایا ہے؟ ضرور وہ مجھے میری بیوی جمیلہ کے بارے میں ہی کچھ بتانے والی ہے۔ خدا کرے کہ وہ کوئی اچھی بات بتائے۔ خدا کرے کہ جمیلہ زندہ ہو۔ اگر خدانخواستہ وہ زندہ نہیں ہوگی تو میں اس شیطانی ناگ مندر کے کسی سادھو کو پجاری دیو گری سمیت کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا اور میں سو گیا۔

دوسرا دن میں نے مندر کے احاطے میں ہی گزارا۔

مجھے مشتاق علی صاحب نے دلی میں ہدایت کی تھی کہ میں مندر کے آس پاس کے علاقے میں زیادہ نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ کیونکہ اس قسم کے مندروں میں پولیس انٹیلی جینس کے ایک دو آدمی ضرور موجود ہوتے ہیں۔ دن گزر گیا' رات آ گئی۔ مندر کے بھنڈار پر ہی میں نے تھوڑا بہت کھانا کھا لیا۔ ہندو یاتری شام کے وقت کوٹھڑی میں آیا اور

یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ رات ناگ مندر میں پوجا کر کے گزارے گا۔ مجھے پر اسرار لڑکی نے آدھی رات کے بعد تالاب پر آنے کو کہا تھا۔ میرے پاس کوئی گھڑی نہیں تھی۔ مندر کے چھوٹے ہال کمرے میں ایک کلاک لگا تھا۔ میں نے کلاک پر رات کے بارہ بجے کا وقت دیکھا اور خاموشی سے مندر کی عقبی دیوار والے چھوٹے دروازے کی طرف چل پڑا۔ اس طرف اندھیرا بھی تھا اور کوئی بندہ بھی نہیں تھا۔ میں چھوٹے سے دروازے سے نکل کر نشیب میں تھوڑا اترنے کے بعد تالاب کے پاس آ گیا۔ تالاب چوکور تھا۔ اس کی ایک جانب مندر کی پرانی دیوار تھی اور دوسری جانب بلکہ تین جانب جنگل تھا۔ جہاں درختوں کے جھنڈ شروع ہو جاتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ پر اسرار لڑکی مندر کے چھوٹے دروازے والے دالان میں سے نکل کر ہی آئے گی۔ چنانچہ میں وہیں ایک طرف ہٹ کر تالاب کے کنارے سیڑھیوں کے پتھر پر بیٹھ گیا۔

اس طرف روشنی بالکل نہیں تھی۔ اندھیرا گھپ تھا۔ مندر کی طرف گھنٹیاں کبھی کبھی بج اٹھتی تھیں۔ اس کے بعد پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ درختوں کے درمیان میں سے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے نظر آ رہے تھے۔ تالاب کا پانی بالکل ساکن تھا۔ اندھیری رات میں اس کی سطح دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ تالاب کی دوسری طرف جنگل میں سے کسی وقت ہوا کا جھونکا آتا تو اپنے ساتھ دیودار' ناریل اور مہاگنی کے درختوں کی خوشبو بھی لاتا۔ کسی جگہ جھاڑیوں میں ایک جھینگر مسلسل بول رہا تھا۔ جھینگر کی آواز مجھے پریشان کر رہی تھی۔ اچانک جھینگر خاموش ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اندھیری رات میں ایک انسانی سایہ مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ پر اسرار لڑکی ہی ہو سکتی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سایہ قریب آ کر مجھ سے تین چار قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ میں نے پر اسرار لڑکی کو فرش پر بے ہوشی کی حالت میں لیٹے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ اس وقت وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اندھیرا بھی تھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے دقت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا تم مندر والی لڑکی ہو؟"

لڑکی نے جواب دیا۔

"ہاں۔ میں وہی ہوں۔"

اور وہ میرے قریب آ گئی۔ کہنے لگی۔"

"میرے ساتھ آؤ۔"

وہ اندھیرے میں جنگل کی طرف ہو گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ رات کی تاریکی میں گنجان درختوں کے خاکے ہی نظر آ رہے تھے۔ وہ درختوں کے درمیان چلتی جنگل میں بائیں طرف مڑ گئی۔ ذرا آگے جا کر درختوں کے نیچے ایک کوٹھڑی سی اندھیرے میں دکھائی دی۔ لڑکی نے میری طرف مڑ کر کہا۔

"ڈرو نہیں۔ میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔"

کوٹھڑی کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ مجھے لڑکی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ صرف اس کے سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔ اندھیری میں ماچس کی تیلی جلی اور روشنی ہوئی' لڑکی دیوار کے ایک طاق میں رکھی ہوئی موم بتی روشن کر رہی تھی۔ موم بتی روشن کر کے اس نے طاق میں سے اٹھا کر اسے فرش پر ایک طرف لگا دیا اور وہیں بیٹھتے ہوئے بولی۔ "یہاں بیٹھ جاؤ۔"

میں اس کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا۔ پر اسرار لڑکی وہی تھی جس کو کل رات میں نے اس حالت میں دیکھا تھا کہ وہ فرش پر نیم بے ہوشی کی حالت میں نیم عریاں پڑی تھی اور سیاہ ناگ اس کے جسم پر رینگ رہا تھا۔ لڑکی کے نقش تیکھے تھے۔ رنگ سانولا تھا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ درمیان سے مانگ نکال کر اس نے بال شانوں پر ڈال رکھے تھے اور ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کہنے لگی۔

"کیا تم واقعی اسی لڑکی کے پتی دیو ہو جس کی فوٹو تم نے مجھے دکھائی تھی؟"

میں نے کہا۔ "ہاں میں ہی اس کا خاوند ہوں۔ میں مسلمان ہوں اور میری بیوی کا نام جمیلہ ہے۔"

میں اسے جمیلہ کے اغوا کے واقعات بتانے لگا تو پر اسرار لڑکی نے ہاتھ تھوڑا سا اوپر اٹھا

کر کہا۔

"مجھے یقین آگیا ہے کہ اب جو کچھ میں تمہیں بتانے والی ہوں وہ بالکل سچ ہے۔ اسے غور سے سنو۔ تمہاری بیوی جمیلہ ----"

میں نے اس کی بات کاٹ دی اور بے تابی سے پوچھا۔

"وہ زندہ ہے ناں؟"

پر اسرار لڑکی نے میری طرف گھور کر دیکھا اور بولی۔

"بیچ میں نہ بولو۔ تمہاری بیوی زندہ ہے۔ جب اسے ناگ دیوی کے مندر کے تہہ خانے میں لایا گیا تھا تو وہ مجھے ملی تھی۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا تھا۔ لیکن خود میں بھی اسی حالت میں تھی۔ میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے مجھے اپنا نام جمیلہ ہی بتایا تھا۔ وہ بہت غم زدہ تھی' پریشان تھی۔ پجاری دیو گری نے تمہاری بیوی کو شتابلی اشنان کے لیے پسند کر لیا اور ناگ یگیہ کے بعد اسے سنتھا ولی کے خونی ناگ مٹھ میں بھجوا دیا ہے۔ تمہاری بیوی جملہ یہاں مندر میں نہیں ہے۔ وہ اس وقت سنتھا ولی کے ناگ مٹھ میں ہے۔ وہاں ایک ماہ تک اس پر خاص منتر پڑھ کر پھونکے جائیں گے۔ اس سے زبردستی تپسیا کروائی جائے گی تاکہ وہ پوری طرح شدھ ہو کر ہندو عورت بن جائے۔"

میں پریشانی کے عالم میں پر اسرار لڑکی کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میری بیوی کے ساتھ ایسا سلوک بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

"خدا کے لیے اگر تم سچے دل سے میری مدد کرنا چاہتی ہو تو مجھے بتاؤ کہ یہ سنتھا ولی مٹھ کس جگہ پر ہے۔ میں جان کی بازی لگا کر وہاں سے اپنی بیوی کو نکال لے جاؤں گا۔"

پر اسرار لڑکی نے گہرا سانس بھر کر کہا۔

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ پجاری دیو گری نے تمہاری بیوی کو ناگ یگیہ کی رسم ادا کرنے کے بعد سنتھا ولی کے مٹھ میں بھیجا ہے۔"

"اس کا کیا مطلب ہے؟" میں نے پوچھا۔

پر اسرار لڑکی بولی۔ "اس کا مطلب ہے کہ تمہاری بیوی کے جسم پر بھی پوری رات

سیاہ سانپ کو پھرانے کے بعد وہاں بھیجا گیا ہے۔ تم اپنی بیوی کو نکال کر جہاں بھی لے جاؤ گے ناگ دیوی کے سانپ اس کا پیچھا کریں گے اور اس کے ساتھ تمہیں بھی موقع ملتے ہی ڈس کر ہلاک کر ڈالیں گے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن میری بیوی کے جسم پر تو تمہارے کہنے کے مطابق صرف ایک سانپ کو پھرایا گیا ہے۔ میری بیوی کے جسم کی بو کا تو صرف ایک سانپ کو احساس ہے۔ میں اس سانپ کو ہلاک کر سکتا ہوں۔"

پر اسرار لڑکی کہنے لگی۔

"ناگ یگیہ میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک رات کالا سانپ نئی آنے والی لڑکی کے جسم پر پھرایا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ سانپ ناگ دیوی کے باقی سارے زہریلے سانپوں کو اپنی پھنکار سے لڑکی کے جسم کی بو سے روشناس کرا دیتا ہے۔ اس وقت ناگ دیوی کے مندر کے تہہ خانے میں سینکڑوں زہریلے سانپ پٹاریوں میں بند ہیں۔ یہ سارے سانپ جس طرح میرے بدن کی بو سے واقف ہو چکے ہیں اسی طرح تمہاری بیوی کے جسم کی بو سے بھی واقف ہو گئے ہیں۔ یہ بو ان سانپوں کو سینکڑوں میل کے فاصلے سے آ جاتی ہے تم ایک سانپ کو ہلاک کرو گے تو اس کی جگہ دوسرا سانپ تمہاری بیوی کی بو پر چل پڑے گا اور وہ جہاں بھی ہو گی وہاں کسی نہ کسی طرح پہنچ کر اسے مار ڈالے گا۔"

میں نے اس سے سوال کیا۔

"تم اس وقت ناگ دیوی کے مندر سے کافی دور جنگل میں آ گئی ہو۔ مگر تمہیں تو کسی سانپ نے نہیں ڈسا۔ کوئی سانپ تمہارے جسم کی بو پا کر تمہارے پیچھے پیچھے نہیں آیا۔"

پر اسرار لڑکی بولی۔

"ناگ مندر کی حد اس پرانی سمادھ کی کوٹھڑی تک ہے۔ اگر میں اس سے آگے گئی تو کوئی نہ کوئی سانپ تہہ خانے کی پٹاری سے نکل کر میرا پیچھا کرنا شروع کر دے گا اور مجھے ڈس کر ہلاک کر دے گا۔"

میں عجیب صورت حال میں پھنس گیا تھا۔ میں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ ڈھاکے

میں اپنی بیوی کے ساتھ سکون سے زندگی بسر کرتے کرتے میری زندگی میں یہ انقلاب بھی آ جائے گا اور سانپوں کی پوجا کرنے والوں کے چنگل میں پھنس جائیں گے۔ میں اور میری بیوی بھیانک قسم کے حالات کا شکار ہو چکے تھے لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ مجھے اپنے خدا پر بھروسہ تھا۔ میرے دل کو یقین تھا کہ ان پجاریوں کے سانپ مجھے اور میری بیوی کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اس کے باوجود کسی وقت یہ خیال ضرور آتا تھا کہ اگر خدانخواستہ کسی سانپ نے دشمن بن کر انجانے میں حملہ کر دیا تو میرے پاس سانپ کے زہر کا کوئی توڑ نہیں تھا۔ لیکن اس وقت سب سے اہم سوال اپنی بیوی جمیلہ کو ان شیطانی پجاریوں کے چنگل سے چھڑانا تھا۔

میں نے پر اسرار لڑکی سے کہا۔

"تم مجھے سنتھا ولی مٹھ کا راستہ بتا دو۔ میں وہاں جا کر اپنی بیوی کو نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

پر اسرار لڑکی نے جواب دیا۔

"سنتھا ولی مٹھ میں کسی مسلمان کو داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسلمان مسافر ادھر آ نکلے تو مٹھ کے سانپ اسے ڈس کر مار ڈالتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"سانپوں کو کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ مسافر مسلمان ہے؟"

لڑکی نے کہا۔

"مسلمان بتوں کی پوجا نہیں کرتے۔ وہ صرف ایک خدا کو مانتے ہیں۔ اس لیے ان کے جسم سے ہر وقت ایک خاص قسم کی خوشبو نکلتی رہتی ہے۔ دیو گری نے ناگ مندر کے اور سنتھا ولی مٹھ کے تمام سانپوں کو مسلمانوں کے جسم سے نکلنے والی اس خاص خوشبو سے واقف کرا رکھا ہے۔ جیسے ہی سنتھا ولی مٹھ کے علاقے میں کوئی مسلمان داخل ہوتا ہے تو وہاں کے سانپوں کو اس کے بدن سے نکلنے والی خاص خوشبو محسوس ہو جاتی ہے وہ اس خوشبو کا پیچھا کرتے مسلمان مسافر تک آتے ہیں اور اسے ڈس لیتے ہیں۔"

اس پر اسرار لڑکی نے مجھے یہ بتایا کہ سنتھا ولی مٹھ یہاں سے سینکڑوں میل دور ایک

ایسے خطرناک جنگل میں واقع ہے۔ جس کے چاروں طرف ویران پہاڑیاں ہیں اور جنگل میں دلدلیں ہیں اور ایسے آدم خور درخت ہیں کہ اگر کوئی آدمی ان کے قریب سے گزرے تو درخت کی شاخیں نیچے جھک کر اس آدمی کو اوپر اٹھا لیتی ہیں اور پھر اس کے جسم کا سارا خون چوس کر اس کو ہڑپ کر جاتی ہیں۔ میں نے کہا۔

"چاہے کچھ ہو جائے میں اپنی بیوی کو بچانے سنتھا ولی مٹھ میں ضرور جاؤں گا۔ تم مجھے اس جنگل کا راستہ بتاؤ۔"

پراسرار لڑکی ایک لمحے کے لیے چپ ہو گئی وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

"میں مسلمان نہیں ہوں۔ ہندو عورت ہوں۔ میں دیوی دیوتاؤں کی بدعاؤں کو مانتی ہوں۔ تم مسلمان ہو۔ تم دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتے۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ میں تمہارے دیوی دیوتاؤں کو بالکل نہیں مانتا۔"

پراسرار لڑکی بولی۔

"اسی لیے میں نے کہا تھا کہ سنتھا ولی مٹھ کے سانپ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن میری بیوی جمیلہ بھی مسلمان ہے۔ اس کے بدن سے بھی مسلمانوں والی خوشبو آتی ہوگی۔ پھر سانپوں نے اسے کیوں نہیں ڈسا؟"

لڑکی بولی۔ "تمہاری بیوی کے جسم پر ساری رات سانپ کے پھرتے رہنے کے بعد اس کے جسم کی مسلمان والی خوشبو دب گئی ہے اور سانپ کی بو زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ اسی لیے سنتھا ولی مٹھ میں جب تمہاری بیوی کو لے جایا گیا تو سانپوں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ انہیں تمہاری بیوی کے جسم سے نکلنے والی مسلمانوں والی خوشبو محسوس نہیں ہوئی تھی۔"

جب میں نے پراسرار لڑکی سے دوبارہ اصرار کیا کہ وہ مجھے سنتھا ولی مٹھ کا پتہ بتائے تو وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی۔ ٹھنڈا سانس بھر کر بولی۔

"عورت ہونے کے ناطے میں تمہاری بیوی کے دکھ درد کو اچھی طرح محسوس کرتی

ہوں۔ میں تمہاری بیوی کو سانپوں کے جہنم سے نکالنا چاہتی ہوں۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ جیسے ہی میں تمہارے ساتھ یہاں سے دس قدم آگے گئی ناگ مندر کے تین چار زہریلے سانپ اپنی اپنی پٹاریوں سے نکل کر میرا پیچھا کرنا شروع کر دیں گے اور میرے ساتھ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

میں نے اس سے کہا۔

"تم ہمارے لیے اپنی زندگی خطرے میں نہ ڈالو۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ سنتھا ولی مٹھ جس جنگل میں واقع ہے وہ یہاں سے کس طرف ہے۔ باقی میں جانوں میرا کام۔"

وہ کہنے لگی۔

"میں تمہیں اس لیے سنتھا ولی مٹھ کا پتہ نہیں بتا رہی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم وہاں پہنچ کر زندہ نہیں رہو گے۔ وہاں کے سانپ جو سنتھا ولی مٹھ کے پہرے دار ہیں جنگل میں داخل ہوتے ہی تمہیں ڈس کر مار ڈالیں گے۔ تم اپنے آپ کو ان سانپوں سے نہیں بچا سکو گے۔ وہ سانپ زمین پر بھی رینگتے ہیں اور ہوا میں اڑ کر بھی حملہ کرتے ہیں۔"

میں نے اسے کہا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں ہر حالت میں اپنی بیوی کی مدد کو وہاں جاؤں گا۔

"اگر تم نے مجھے سنتھا ولی مٹھ کا پتہ نہ بتایا تو میں کسی اور جگہ سے معلوم کر کے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنی بیوی کو ان شیطانوں کے نرغے سے نکال لانے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔"

جنگل میں تاریک رات گہری خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کے فرش پر لگائی ہوئی موم بتی کافی پگھل چکی تھی۔ پر اسرار لڑکی سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ پھر اچانک اس نے سر اٹھایا اور کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ میں جمیلہ کو بچانے' اسے ناگ مندر کے راکھشسوں کی قید سے نکالنے کے لیے خود تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

میں تحسین آمیز نگاہوں سے پر اسرار ہندو لڑکی کا منہ تکنے لگا۔ میں نے کہا۔ "تم ہماری خاطر اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو۔ میں اکیلا ہی اس مہم پر جاؤں گا۔"

لڑکی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"میں خود بھی اس جہنم سے نکلنا چاہتی ہوں۔ ہو سکتا ہے تمہارا خدا میری بھی مدد کرے اور مجھے بھی ان خونی پجاریوں اور سانپوں کی موت سے بد تر زندگی سے نجات مل جائے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن سانپ تمہارا پیچھا کریں گے۔"

وہ بولی۔ "یہ خطرہ تو مجھے مول لینا ہی پڑے گا۔"

میں نے کہا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟ تم نے ابھی تک مجھے اپنا نام نہیں بتایا۔"

وہ بولی۔ "میرا نام کاویری ہے۔ اس سے زیادہ مجھ سے کچھ نہ پوچھنا۔ اس سے زیادہ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "کاویری! ایک بار پھر سوچ لو۔"

وہ فیصلہ کن انداز میں کہنے لگی۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں تمہاری بیوی کو سنتھاولی مٹھ سے فرار کرانے خود بھی یہاں سے فرار ہو کر تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

میں بڑا متاثر ہوا۔ یہ سانولی لڑکی بڑی بہادر تھی اور اس کا دل انسانی ہمدردی کے جذبے سے لبریز تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں اور میری بیوی مسلمان ہیں لیکن اس کے باوجود وہ میری بیوی کو ناگ دیوی کے شیطان صفت پجاریوں کے عذاب سے نجات دلانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہی تھی۔ جس طرح رات کو میں نے اس نیم عریاں بدن پر سانپ کو رینگتے اور اس کے ہونٹوں پر ڈستے دیکھا تھا اس سے میں اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ زہریلے سانپ اس لڑکی کا اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ دوسری مشکل یہ آن پڑی تھی کہ بقول پر اسرار لڑکی کاویری کے میری بیوی جمیلہ کے جسم پر بھی سانپ کو پھرایا جا چکا تھا اور اب اس کی زندگی بھی ان زہریلے سانپوں کے رحم و کرم پر تھی۔ مجھے اپنی بیوی کو بھارت سے نکال کر واپس پاکستان بھی لے جانا تھا اور ان زہریلے سانپوں کے حملے سے بھی بچانا تھا۔ اس کا میں نے سوچ لیا تھا کہ میں پوری طرح چاق و

چوبند اور ہوشیار رہوں گا اور بھارت سے پاکستان کی طرف فرار ہوتے وقت جمیلہ کی پوری نگرانی کروں گا۔ بلکہ رات کو بھی اس کے گرد چل پھر کر پہرہ دوں گا۔ اگر کوئی دشمن سانپ نظر آگیا تو میں اسے وہیں کچل ڈالوں گا۔ جس طرح پر اسرار لڑکی توہم پرست تھی اور سانپوں کو دیوی دیوتا سمجھتی تھی میں ویسا نہیں تھا۔ میں سانپ کو محض ایک موزی کیڑا ہی سمجھتا تھا جو بہرحال انسانوں سے ڈرتا ہے اور ہم اسے ہلاک کر سکتے ہیں۔

جب کاویری نے میری بیوی جمیلہ کو بچانے کی خاطر میرے ساتھ ناگ دیوی کے مندر سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی فرش پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کاویری نے میری طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا اور بولی۔

"باہر آجاؤ۔"

میں کوٹھڑی سے باہر آگیا تو اس نے موم بتی پھونک مار کر بجھا دی اور خود بھی کھنڈر نما کوٹھڑی سے باہر نکل آئی۔ باہر رات تاریک تھی۔ ہم جنگل کے مشرقی کنارے پر تھے۔ گھنا اور خطرناک جنگل آگے جا کر شروع ہوتا تھا مگر جنگل یہاں بھی ہیبت ناک تھا اور لگتا تھا کہ ابھی کسی طرف سے کوئی شیر نکل کر ہم پر حملہ کر دے گا۔ میں نے احتیاط کے طور پر جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنے کمانڈو چاقو پر گرفت مضبوط کر رکھی تھی۔

کاویری میرے آگے آگے اندھیرے میں چل رہی تھی۔ جب ہم تالاب کے پاس پہنچے تو وہ رک گئی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"تم کل آدھی رات کے بعد اسی جگہ آجانا۔ میں بھی آجاؤں گی۔ پھر ہم یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔"

میں نے پوچھا۔

"سنتھاولی کا مٹھ یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

وہ بولی۔ "کل بتاؤں گی۔"

اتنا کہہ کر وہ مندر کی عقبی دیوار والے دروازے کی طرف چلی گئی۔



میں واپس مندر کی کوٹھڑی میں آ کر لیٹ گیا۔

مجھے اس بات کا احساس تھا کہ یہ پر اسرار مگر بہادر لڑکی کاویری اس حالت میں یہاں سے فرار ہو رہی ہے کہ قدم قدم پر انتہائی زہریلے سانپ اس کا پیچھا کر رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ پجاری دیوگری کے بدمعاش پجاری بھی اس کو قتل کرنے کے لیے اس کے پیچھے لگ جائیں۔ یہ بات بھی تھی کہ وہ میرے ساتھ فرار ہو کر سنتھا ولی مٹھ جا رہی تھی۔ یعنی دشمنوں کی قید سے فرار ہو کر دشمنوں کے پاس ہی جا رہی تھی۔ سنتھا ولی مٹھ میں بھی زہریلے سانپ اور خونخوار قسم کے شیطانی پجاری موجود تھے۔ میں تو اپنی بیوی' اپنی عزت کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہا تھا' لیکن کاویری صرف میری بیوی جمیلہ کو بچانے اور اسے خطرناک درندہ صفت پجاریوں کی قید سے نجات دلانے کے لیے سنتھا ولی مٹھ جا رہی تھی۔ ورنہ وہ فرار ہونے کے بعد بھارت کے کسی دوسرے بڑے شہر کلکتہ' بمبئی یا مدراس یا دلی کی طرف بھی نکل سکتی تھی۔ اگر وہ ایک خطرے سے نکل کر دوسرے خطرے کی طرف جا رہی تھی تو صرف میری بیوی جمیلہ کو بچانے کے لیے۔ ورنہ وہاں جانے کی اسے کوئی ضرورت نہیں تھی۔

میں اس سانولی لڑکی کاویری کے اس جذبے سے بڑا متاثر ہوا۔

پاکستان کی نئی نسل بھارت کے اس علاقے کے بارے میں بہت کم جانتی ہے' جن علاقوں کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ پرانی نسل کے جو لوگ ان علاقوں سے واقف ہیں انہیں

معلوم ہوگا کہ سنبھل پور اور دیوگڑھ کا علاقہ بھارت کے صوبہ مدھیہ پردیش اور صوبہ اوڑیسہ کے درمیان واقع ہے۔ اس کے جنوب میں آندھرا پردیش شروع ہو جاتا ہے۔ اس علاقے میں بھارت کے انتہائی گنجان دشوار گزار اور خطرناک پہاڑی جنگلات کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ جہاں ہر قسم کے درندے اور حشرات الارض پائے جاتے ہیں بلکہ میری معلومات کے مطابق ان جنگلات میں بعض ایسے گوشے بھی ہیں جہاں آج تک کوئی شکاری بھی نہیں جا سکا۔ یہ جنگل دیوگڑھ اور سنبھل پور سے جنوب کی طرف شروع ہو جاتے تھے اور میں اس وقت دیوگڑھ اور سنبھل پور کے درمیان ناگ دیوی کے مندر میں ہی تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ پر اسرار لڑکی کاویری جس سنتھا ولی مٹھ کی طرف مجھے لے جانے والی ہے وہ جنوب کے جنگلوں میں ہی کسی پہاڑی جنگل میں واقع ہوگا۔ سنبھل پور اور دیوگڑھ کے جنوب مغرب میں بڑا شہر رائے پور اور شمال کی جانب بلاس پور ہی آتا تھا جو وہاں سے کافی فاصلے پر تھے۔

انہی خیالات میں الجھا میں کافی دیر تک جاگتا رہا۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔ صبح کافی دن نکل آیا تھا جب میں جاگا۔ میرا ہندو یاتری ساتھی رات کے پچھلے پہر ناگ دیوی کے مندر میں پوجا کر کے آیا تھا اور ابھی تک سو رہا تھا۔ وہ دن بھی میں نے مندر کی چار دیواری میں ہی رہ کر گزار دیا۔ رات ہو گئی تو میں نے فرار کی تیاری شروع کر دی۔ صرف ذہنی طور پر مجھے تیار ہونا تھا ورنہ میرے پاس سامان وغیرہ تو کچھ تھا نہیں۔ کئی روز سے میں نے شیو نہیں بنائی تھی۔ میں نے مندر کے احاطے کے باہر ایک حجام کے کھوکھے میں گیس کی روشنی میں بیٹھ کر شیو بنوائی۔ واپس تالاب میں جا کر غسل کیا۔ پرانی قمیض اتار کر وہیں پھینک دی اور نئی دھلی ہوئی قمیض پہن لی۔ کوٹ میں نے پہلے ہی کہیں پھینک دیا تھا۔ ٹھنڈے نیلے رنگ کے کپڑے کی معمولی سی جرسی تھی جو میں نے پہن لی۔ کیونکہ یہاں پر سردی بالکل نہیں تھی۔ جرسی اس لیے پہنتا تھا کہ اس میں چار پانچ چیزیں تھیں جن میں میں کچھ ضروری چیزیں رکھ سکتا تھا۔ جمیلہ کی فوٹو والا لفافہ میں نے اپنی پرانی پتلون کی عقبی جیب میں ڈال رکھا تھا۔ کچھ بھارتی کرنسی نوٹ جو بچ رہے تھے وہ میں نے جرسی کی اندر

والی جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ بڑا کمانڈو چاقو میری پتلون کی دائیں طرف والی جیب میں تھا۔

میں کوٹھڑی میں واپس آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ نیند آجانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی پوری طرح بیدار تھا۔ وقت میں نے دیکھ لیا تھا۔ اسی اندازے سے میں آنکھیں بند کر کے چارپائی پر دیر تک لیٹا رہا۔ جب لیٹے لیٹے کافی دیر ہوگئی تو اٹھ کر باہر مندر کے کمرے میں گیا۔ وہاں دیوار کے ساتھ ایک کلاک لگا تھا۔ وقت رات کے دس بجے کا تھا۔ ابھی مجھے مزید گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزارنا تھا۔ کاویری کے بارے میں مجھے کل رات کا تجربہ ہوچکا تھا۔ وہ ٹھیک آدھی رات کے فوراً بعد تالاب پر آگئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب کوٹھڑی میں جا کر لیٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ میں مندر کے اس کمرے میں ہی بیٹھ گیا۔ یہ کوئی کمرہ نہیں تھا۔ ایک قدرے کشادہ کوٹھڑی تھی۔ کچھ یاتری عورتیں اور مرد ادھر ادھر چٹائیاں بچھا کر بیٹھے تھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سب لوگ عام ہندو یاتریوں والے لباس یعنی لمبے لمبے کرتے اور دھوتیاں پہنے ہوئے تھے۔ عورتوں نے بھی دھوتی نما ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان میں صرف میں ایک ایسا یاتری تھا جس نے پتلون قمیض اور جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔

دیوار پر جہاں کلاک لگا ہوا تھا اس کے نیچے ایک آدمی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اسی نے مجھے دو تین بار گھور کر دیکھا ہے۔ بھارتی انٹیلی جینس کا مجھے شروع ہی سے خطرہ لگا ہوا تھا۔ میں انڈین نیشنل نہیں تھا' پاکستانی تھا۔ میرے پاس بھارت میں داخل ہونے کے لیے جس ویزے کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی نہیں تھا اور میں جنگی قیدیوں کی گاڑی سے چھلانگ لگا کر فرار بھی ہوچکا تھا۔ اگرچہ میں جس مصیبت میں گرفتار تھا وہ بھارت میں غیر قانونی طور پر رہنے کی مصیبت سے زیادہ بڑی اور گھمبیر تھی یعنی مجھے اپنی بیوی کی تلاش تھی۔ اس کے باوجود میں بھارت میں غیر قانونی طور پر اور ایک مفرور پاکستانی جنگی قیدی کی حیثیت سے موجود ہونے کی حقیقت کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس آدمی کو اپنی طرف گھورتے دیکھا تو قدرتی طور پر محتاط ہوگیا۔ لیکن میں وہاں سے

اٹھا نہیں۔ اسی جگہ اسی حالت میں بیٹھا جائزہ لیتا رہا کہ کیا واقعی یہ شخص کوئی مشتبہ شخص ہے یا مجھے ویسے ہی شک پڑا ہے۔

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میں اس آدمی پر نظر ڈالتا تو وہ آدمی پہلے ہی سے مجھے دیکھ رہا ہوتا تھا۔ جب نگاہیں چار ہوتیں تو وہ جلدی سے نظریں دوسری طرف کر لیتا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ آدمی میری نگرانی کر رہا ہے تو میں وہاں سے اٹھ کر اپنی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔ میرا ساتھی ہندو یاتری آج بھی ناگ دیوی کی پوجا کرنے گیا ہوا تھا۔ میں کوٹھڑی میں آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لیکن میں کچھ بے چین ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے کاویری کے ساتھ ایک انتہائی اہم مہم پر روانہ ہونا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس مہم میں انڈین انٹیلی جینس والا بھی میرے پیچھے لگ جائے۔ ظاہر ہے وہ یہاں اکیلا نہیں ہوگا اس کا کوئی نہ کوئی ساتھی ضرور اس کے ہمراہ وہاں آیا ہوگا اور ان لوگوں کے پاس اسلحہ وغیرہ بھی ہوگا۔ میں اس خطرے کو اپنے ساتھ لے کر اپنی بیوی کی تلاش کی مہم پر روانہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس شخص سے نجات حاصل کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس سے نجات کیسے حاصل کی جائے۔ یہی ایک راستہ تھا کہ میں اسے جل دے کر کسی طرح مندر کے پیچھے جنگل والے تالاب اور کوٹھڑی کی طرف نکل جاؤں۔ اگر میں اسے کسی طریقے سے ہلاک کر دیتا تو کسی نئی مصیبت کے کھڑے ہو جانے کا ڈر تھا۔ میں خواہ مخواہ خود کو اور کاویری کو کسی نئی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی وقت چھپ کر جنگل کی طرف نکل جانے کا فیصلہ کیا اور کوٹھڑی سے نکل کر اندھیرے میں مندر کے عقبی دروازے کی طرف چل پڑا۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ مندر کا یہ علاقہ دن کے وقت بھی خالی خالی رہتا تھا' رات کے وقت تو یہاں سناٹا طاری تھا۔ میں بھی مندر کے عقبی چھوٹے دروازے سے چھ سات قدموں کے فاصلے پر ہی تھا کہ پیچھے سے مجھے آواز آئی۔

"بھیا جی! ذرا ٹھہرنا۔"

میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔ مجھے اندھیرے میں ایک آدمی اپنی طرف آتا نظر آیا۔ یہ

آدمی مندر والے مشکوک شخص کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی مندر والا مشتبہ آدمی تھا۔ اچھے قد کاٹھ کا آدمی تھا اور ادھیڑ عمر بھی زیادہ نہیں تھا۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ اپنی کھدر کی واسکٹ میں ڈال رکھا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے بھیا؟"

یہاں اندھیرا ضرور تھا مگر کچھ فاصلے پر ایک کوٹھڑی کے باہر بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی میں ہم دونوں کی شکل و صورت نظر آ رہی تھی۔ وہ میرے اور قریب ہو گیا۔ اپنا دایاں ہاتھ اس نے ابھی تک صدری کی جیب میں ہی ڈالا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس جیب میں بھرا ہوا پستول یا ریوالور ہے۔ میری کمانڈو کی ٹریننگ کی حس پوری طرح بیدار ہو گئی۔ میں نے یہ بھی سوچ لیا کہ اگر اس شخص نے مجھے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا تو مجھے کیا کرنا ہو گا۔ وہ میرے اور قریب آگیا اور خاص انٹیلی جینس کے آدمیوں کے انداز میں میری طرف مسکرا کر دیکھنے لگا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے بڑے اعتماد اور کسی قدر بے نیازی سے کہا۔

"امرتسر سے ناگ دیوی کے درشنوں کو آیا ہوں۔ کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا جیسے اس کو میرے بیان پر یقین نہ آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"امرتسر میں کیا کرتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "کیا بات ہے؟ تم کون ہو؟"

اس آدمی کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ کہنے لگا۔

"ذرا میرے ساتھ مندر کے باہر تک آؤ۔"

میں نے کہا۔

"کیوں آؤں؟ تم مجھے اس طرح حکم دینے والے کون ہو؟"

اسی وقت اس آدمی نے صدری کی جیب سے ہاتھ باہر نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ کہنے لگا۔

"ہمیں معلوم ہے کہ تم پاکستان کے جنگی قیدی ہو۔ تمہیں ہمارے ساتھ پولیس چوکی تک چلنا ہوگا۔"

اس نے ہمیں کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی اس کی ہمراہ ہیں اور وہ یہیں کہیں ادھر ادھر چھپے ہوئے ہوں گے۔ میں نے فوراً حکمت عملی تبدیل کرلی۔ کیونکہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"بھیا! تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے۔ میں پاکستانی جنگی قیدی نہیں ہوں۔ میرا نام مدن لال ہے اور امرتسر میں میری نیاری کی دکان ہے بازار مائی سیواں میں۔"

اس آدمی نے میری طرف مسلسل گھورتے ہوئے اپنے ساتھی کو آواز دی۔

"دھرم چند! آ جاؤ تم بھی۔"

دائیں جانب دیوار کے پیچھے سے ایک آدمی نکل کر ہمارے سامنے آگیا۔ آتے ہی بولا۔

"کیا کہتا ہے یہ گنگا دین؟"

پہلے والے سی آئی ڈی آفیسر کا نام گنگا دین تھا۔ کہنے لگا۔

کہتا ہے میرا نام مدن لال ہے میں پاکستانی جنگی قیدی نہیں ہوں۔"

گنگا دین نے ہنس کر کہا۔

"دھرم چند جی اس کی پتلون اتروا لیتے ہیں۔ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ ہندو ہے یا مسلمان۔"

میں خطرے کی آخری سرحد پر آگیا تھا۔ یہاں سے فرار کا ایک ہی راستہ تھا جو میں نے سوچ لیا۔ اگر یہ لوگ میری پتلون اتروا لیتے تو ایک لمحے میں صورت حال بالکل بدل جاتی اور یہ بات ثابت ہو جاتی کہ میں وہی جنگی قیدی ہوں جو ٹرین سے چھلانگ لگا کر مفرور ہوا تھا۔ گنگا دین کہنے لگا۔

"یہ تو مجھے پاکستانی جاسوس لگتا ہے دھرمو۔"

"دھرم چند نے کہا۔ "اس کی پتلون اترواؤ۔"

گنگادین بھی جوان آدمی تھا۔ مگر جسمانی طاقت میں دونوں مجھ سے کمزور تھے۔ گنگادین بولا۔

"پتلون یہ خود اتارے گا۔"

پھر اس نے مجھے حکم دیا۔

"چلو بھیا! ذرا اپنی پتلون تو اتارو۔"

اس دوران میں ان کی طرف دیکھ بھی رہا تھا اور میں نے یہ سوچ بھی لیا تھا کہ ان سے کس طرح نجات حاصل کرنی ہوگی۔ یہ بھارتی پولیس انٹیلی جینس کے لوگ تھے۔ صرف پستول دکھا کر دوسرے کو قابو میں کر سکتے تھے۔ انہیں علم ہی نہیں تھا کہ ان کے سامنے جو جوان آدمی کھڑا ہے اور جسے وہ پتلون اتارنے کے لیے کہہ رہے ہیں وہ پاک آرمی کا ایک سابق عہدے دار ہے اور تربیت یافتہ کمانڈو بھی ہے۔ میں نے انہیں کہا۔

"میں نہ تو پاکستانی مفرور جنگی قیدی ہوں اور نہ پاکستانی جاسوس ہوں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں پتلون اتار دیتا ہوں۔

اور میں نے پتلون کی پیٹی کھولنی شروع کر دی۔ اصل میں میں پتلون کی پیٹی نہیں کھول رہا تھا بلکہ اپنے آپ کو ایک خاص زاویے پر لا رہا تھا جہاں سے مجھے دھرم چند پر اٹیک کرنا تھا۔ کیونکہ ریوالور اسی کے ہاتھ میں تھا۔ اگر میرے سامنے بھارتی فوج کے جوان ہوتے تو مجھے مشکل پیش آ سکتی تھی۔ کیونکہ آرمی کے جوان کمانڈو نہ بھی ہوں تو بھی انہوں نے آرمی ٹریننگ سنٹر کی مار کھائی ہوتی ہے۔ ان پر قابو پانے کے لیے مجھے کوئی دوسری حکمت عملی سوچنی پڑتی۔ لیکن یہ انڈین انٹیلی جینس والے میرے ایسے ٹرینڈ آرمی کمانڈو کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ کہیں گھبراہٹ میں ریوالور کا فائر میری طرف نہ آجائے۔

جب میں نے انہیں کہا تھا کہ میں خود ہی پتلون اتارے دیتا ہوں اور پتلون کی پیٹی کو کھولنا شروع کیا تھا تو صرف چھ یا زیادہ سے زیادہ سات سیکنڈ کا وقفہ میں نے دیا اور سیدھا ٹھڈا ریوالور والے آدمی کے بازو پر مارا۔ اس کا ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور

جا گرا۔ وہ لوگ اناڑی تھے ۔ انہوں نے یہ حماقت کی کہ وہ دونوں مجھ سے گتھم گتھا ہوگئے۔ انہوں نے کسی کو آواز نہیں دی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ان کے ساتھ کوئی تیسرا آدمی نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ مجھ سے گتھم گتھا ہوئے میں نے دونوں کی گردنیں اپنے بازوؤں کے آہنی شکنجے میں جکڑلیں اور ایک خاص زاویے پر صرف تین جھٹکے دیے۔ میرا خیال ہے کہ میرے پہلے ہی جھٹکے میں ان کی گردنوں کے منکے ٹوٹ گئے تھے۔ ان کے جسم میری گرفت میں ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ وہ ریت کی بوریوں کی طرح نیچے گر پڑے۔ یہ حقیقت ہے کہ کمانڈو اپنے دشمن کو بھی یونہی نہیں مارتا۔ یہاں معاملہ ایسا تھا کہ اگر میں انہیں نہ مارتا تو انہوں نے مجھے ماردینا تھا۔ میں نے اپنے پیچھے دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ دونوں دشمن بڑی آسانی سے موت کی آغوش میں چلے گئے تھے۔ میں اس طرف گیا جدھر ریوالور گرا تھا۔ میں نے جھک کر ریوالور اٹھا لیا۔ ریوالور کے آگے سیلنسر کی نالی لگی ہوئی تھی۔ میں نے میگزین کھول کر دیکھا۔ ریوالور بھرا ہوا تھا اور اس کا سیفٹی کیچ بھی کھلا ہوا تھا۔ یعنی صرف ذرا سا دبانے سے فائر ہوسکتا تھا۔ میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ آگے کر دیا اور ریوالور جیکٹ کی جیب میں رکھ کر باری باری دونوں لاشوں کو گھسیٹ کر مندر کی دیوار کے پاس اندھیرے میں ڈال دیا۔ مجھے اس کی فکر نہیں تھی کہ صبح جب دونوں کی لاشیں ملیں تو لوگ مجھے پکڑ لیں گے کیونکہ مجھے راتوں رات پر اسرار لڑکی کاویری کے ساتھ اس علاقے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور نکل جانا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں جلدی سے مندر کی دیوار والے دروازے سے باہر نکل گیا۔ مجھے احساس تھا کہ ابھی آدھی رات نہیں ہوئی تھی لیکن دو آدمیوں کی لاشیں ڈھیر کرنے کے بعد میرا مندر میں رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ تالاب کے آس پاس رات کی تاریکی تھی۔ مجھے راستے کا علم تھا۔ میں چلتے چلتے جنگل کے شروع کے درختوں میں پہنچ گیا۔ کچھ فاصلے پر وہ پرانی کھنڈر نما کوٹھڑی تھی جہاں کاویری نے مجھے آنے کے لیے کہا تھا۔ کوٹھڑی کے اندر گرمی اور حبس تھا۔ میں باہر چبوترے پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ جنگل پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تالاب کی طرف سے جھینگروں کے بولنے کی آواز وقفے وقفے سے آ رہی

تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ جنگل کی طرف سے دیودار اور مہاگنی کے درختوں اور دلدلوں میں اگی ہوئی گھاس کی مرطوب بو کسی وقت آجاتی تھی۔ میرا رخ تالاب کی طرف تھا۔ کیونکہ اسی طرف سے کادیری کو آنا تھا۔ اس طرف اونچے اونچے درخت تھے جن کے نیچے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہاں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی تھی جو اندھیرے میں گم تھی۔ میں اپنے طور پر حساب لگا رہا تھا کہ میں رات کے دس بجے مندر سے نکلا تھا۔ سی آئی ڈی والوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مجھے پندرہ بیس منٹ لگے ہوں گے۔ اس وقت ساڑھے دس یا پونے گیارہ کا ٹائم ہوگا۔

میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مچھر ضرور تنگ کر رہے تھے۔ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد دوبارہ چبوترے پر بیٹھ گیا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ رات آدھی گزر چکی ہے۔ پراسرار لڑکی کادیری ابھی تک نہیں آئی تھی۔ کہیں وہ کسی مشکل میں تو نہیں پھنس گئی۔ مجھے احساس تھا کہ وہ انتہائی مخدوش حالات میں سے نکل کر آنے والی ہے۔ ہو سکتا ہے عین وقت پر بدمعاش پجاری دیوگری نے اسے اپنے پاس بلالیا ہو۔ وہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں کچھ بے چین سا ہوگیا۔ میں اٹھ کر ایک بار پھر ٹہلنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد درختوں کے نیچے جو پگڈنڈی یا ویران راستہ مندر کے تالاب کی طرف سے آتا تھا اس کو دیکھ لیتا تھا۔ وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ایک بار میری نظریں اس طرف گئیں تو مجھے کوئی چیز وہاں ہلتی ہوئی نظر نہیں آئی۔ میں رک کر غور سے دیکھنے لگا۔

ایک سایہ میری طرف آ رہا تھا۔

سایہ تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ پھر اندھیرے میں مجھے کادیری آتی نظر آگئی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ اس نے ہاتھوں میں کپڑے میں لپیٹی ہوئی کوئی چیز سنبھال رکھی تھی۔ کہنے لگی۔

"ان شیطانوں سے نکل کر آنا بڑا مشکل تھا۔ چلو آگے نکل چلو۔"

وہ ڈھلان اتر کر کوٹھڑی کے کھنڈر کے پیچھے آ گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہوگیا۔ وہ چند قدم چلنے کے بعد رک گئی۔ اس نے کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک

بوتل نکالی' اس کا ڈھکن کھولا اور اس میں سے پانی کی طرح کی کوئی شے زمین پر اور اپنے اوپر چھڑکنے لگی۔ میں نے پوچھا۔

"یہ کیا کر رہی ہو کاویری؟"

وہ بولی۔ "جتنی احتیاط کر سکتی ہوں اتنی احتیاط کر رہی ہوں۔ اس میں ایک خاص جڑی بوٹی کا عرق ہے اس کی بو میرے جسم کی بو کو کسی حد تک ختم کر دے گی اور میرے پیچھے آنے والا سانپ بھٹک سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اس کی بو کتنی دیر تک رہے گی؟"

وہ بولی۔ "زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے تک میرے تعاقب میں آنے والے سانپ کو میری بو نہیں آئے گی۔ اتنی دیر میں ہم کوشش کریں گے کہ جتنی دور نکل سکتے ہیں نکل جائیں۔"

اس نے جڑی بوٹی کے عرق کی آدھی بوتل وہاں چھڑک دی۔ کہنے لگی۔

"یہاں ناگ مندر کی سرحد ختم ہوتی ہے۔ میں نے یہ حد پار کر لی ہے اور اس وقت اس تہہ خانے کی پٹاری میں بند کالے سانپ کو میرے فرار کا علم ہو گیا ہو گا اور وہ اپنے آپ پٹاری سے نکل کر میرے تعاقب میں چل پڑا ہو گا' اب ہمیں بہت تیز تیز چلنا ہو گا۔ کیونکہ سانپ کو یہاں آ کر میری بو آنا بند ہو جائے گی۔ وہ دوسری طرف کو نکل کر میری بو پانے کی کوشش کرے گا۔ اس طرف بو نہیں آئے گی تو وہ دوسری طرف نکل جائے گا۔ ہمارے پاس صرف ایک گھنٹہ ہی ہے۔ اس کے بعد میری بو جنگل میں پھیل جائے گی اور ناگ مندر کا کوئی دوسرا سانپ پٹاری سے نکل کر میری تلاش میں چل پڑے گا۔ جلدی سے نکل چلو۔"

پر اسرار لڑکی کاویری لگتا تھا کہ جنگل سے پوری واقف تھی۔ وہ اندھیرے میں بھی جنگل میں بڑی آسانی سے راستہ دیکھ کر چلتی چلی جا رہی تھی۔ ہم جنگل کے اندھیرے میں جتنی تیز چل سکتے تھے چل رہے تھے۔ میں نے کاویری کو بالکل نہیں بتایا تھا کہ مندر میں دیوار کے ساتھ دو بھارتی انٹیلی جینس والوں کی لاشیں پڑی ہیں جن کی گردنیں میں نے

توڑی تھیں۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ دوسرے کمانڈو کبھی اپنے کارناموں کا ذکر بڑھ چڑھ کر نہیں کرتے۔ کمانڈو بہت سے راز اپنے سینوں میں دفن کر لیتے ہیں۔ جنگل ایک تو گھنا تھا' دوسرے اندھیری رات تھی۔ مگر کاویری مجھے جس راستے سے لے جا رہی تھی اس طرف اتنا جھاڑ جھنکاڑ نہیں تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم جنگل کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایک جگہ کاویری سانس لینے کے لیے رک گئی۔ وہ جہاں زمین کے نیچے سے چھوٹے بڑے پتھر اور چٹانیں نکلی ہوئی تھیں وہاں بیٹھ گئیں۔ یہاں اس نے بوتل میں بچا ہوا جڑی بوٹی کا خاص پانی نکال کر زمین پر ایک طرف سے لے کر دوسری طرف چھڑکا دیا۔ کہنے لگی۔

"اگر میرا دشمن سانپ میرا تعاقب کرتا یہاں تک آگیا تو یہاں ایک بار اسے میرے جسم کی بو نہیں ملے گی اور وہ رک جائے گا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"ابھی ہمیں کتنی دور تک چلنا ہو گا؟ کیا سنتھا ولی مٹھ اسی جنگل میں ہے؟"

کاویری نے کہا۔ "سنتھا ولی مٹھ کا جنگل یہاں سے کافی دور ہے۔ ابھی اس جنگل کے بعد ایک او جنگل آئے گا۔ ہم کل سورج ڈوبنے کے بعد کسی وقت وہاں پہنچیں گے۔"

میں نے کاویری یعنی اس پر اسرار لڑکی سے بالکل نہ پوچھا کہ کیا وہ اتنی دور تک پیدل چل سکے گی۔ کیونکہ ابھی تک وہ جس انداز میں میرے ساتھ جنگل میں چل رہی تھی اس سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ دبلی پتلی سی لڑکی بڑی سخت جان ہے اور یقیناً" جنگلوں میں پیدل سفر کرنے اور مشکلیں برداشت کرنے کی عادی ہے۔ وہاں دس پندرہ منٹ بیٹھنے کے بعد ہم پھر سفر پر چل پڑے۔ عجیب اتفاق ہے کہ راستے میں ہمیں کوئی جنگلی درندہ نہ ملا۔ ایک مقام پر سے گزرتے ہوئے دور سے کسی شیر کی دو ایک بار دہاڑ ضرور سنائی دی تھی۔ اس وقت کاویری نے کہا تھا۔

"شیر نے کوئی شکار مارا ہے۔ مگر تم فکر نہ کرنا' شیر اس طرف نہیں آئے گا۔ اب وہ شکار کو کھانے میں مصروف ہو گا اور پیٹ بھرنے کے بعد باقی شکار کو گھسیٹ کسی محفوظ جگہ

لے جائے گا اور پھر خود سو جائے گا۔"

شیروں کے بارے میں میں نے رسالوں میں ہی کہانیاں پڑھی تھیں مگر لگتا تھا کہ اس پر اسرار لڑکی کو جنگلی درندوں کی عادات و خصائل کے بارے میں بھی کافی معلومات تھیں۔ ں نے اس سے پوچھا۔

"کاویری! تمہارا گھر کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے کہ دیوگری پجاری کے آدمی تمہیں کہاں سے پکڑ کر لائے تھے؟"

پر اسرار لڑکی کاویری نے چلتے چلتے کہا۔

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ پھر کبھی موقع ملا تو سناؤں گی۔ بس تم کو اتنا ہی بتائے دیتی ہوں کہ میرے ماتا پتا بچپن میں ہی سورگباش ہو گئے تھے۔ مجھے ایک ناگ مندر کے پجاری نے الا تھا۔ یہ مندر مدھیہ پردیش کے سچال گڑھ کے جنگل میں تھا۔"

اتنا بتانے کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس وجہ سے وہ جنگل میں ایسی انی سے چل رہی ہے جس آسانی سے ہم لوگ شہر کی سڑکوں پر چلتے ہیں۔ بلکہ بعد میں ے جنگلوں کا جو تجربہ ہوا اس نے یہ ثابت کر دیا کہ شہر کی ٹریفک والی سڑکوں پر چلنا جتنا طرناک اور جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے جنگلوں میں سفر کرنا اتنا خطرناک نہیں ہے۔ جنگلوں ں تو جنگلی جانور اکثر اوقات انسان کو آتا دیکھ کر ایک طرف ہٹ جاتے ہیں جبکہ شہر کی ڑک پر اگر ٹرک سامنے سے آ جائے تو آپ کے اوپر چڑھ جائے گا۔ ہم کافی دیر تک چلتے ہے۔

جہاں درختوں کا گھنا پن ذرا کم ہوتا تھا تو آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے نظر آ جاتے ے۔ ستاروں کی چک سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ رات کا پچھلا پہر شروع ہو گیا ہے۔ اک جگہ ہمیں ایک چشمہ ملا یہاں ہم نے پانی پیا۔ پانچ چھ منٹ بیٹھ کر آرام کیا اور دوبارہ م شروع کر دیا۔ اگرچہ میں کبھی سخت جان کمانڈو رہ چکا تھا اور اسی کمانڈو ٹریننگ کی سخت ال اب بھی میرے اندر موجود تھی لیکن جنگل میں پیدل چلتے چلتے میں بھی تھک گیا تھا مگر لا پتلی کاویری بالکل نہیں تھکی تھی۔ وہ اسی طرح گردن اٹھا کر چل رہی تھی اگرچہ ہماری

رفتار اب ذرا سست ہوگئی تھی۔ راستے میں جہاں کہیں جنگل میں ہم کوئی موڑ گھومنے لگتے تو کاویری رک جاتی۔ پیچھے مڑ کر ہوا میں لمبے سانس کھینچ کر کچھ سونگھنے کی کوشش کرتی۔ جب پہلی بار اس نے ایسا کیا تو میں نے پوچھا کہ وہ کیا سونگھ رہی ہے۔ وہ بولی۔

"میرا دشمن سانپ میری بو سونگھتا میرے پیچھے آ رہا ہے اور میں اس کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا اتنی دور سے اسے سانپ کی بو آ جاتی ہے؟"

اس نے کہا۔

"میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میرا باپ اور میری ماتا دونوں سپیرا سپیرن تھے۔ اگر میرا دشمن سانپ جو ساری رات میرے جسم پر رینگتا رہا تھا سینکڑوں میل سے میرے جسم کی بو سونگھ لیتا ہے تو میں دو تین میل سے اس کی بو ضرور سونگھ سکتی ہوں۔"

وہ چلتی جا رہی تھی اور باتیں کرتی جا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"سپیرے اور سپیرن میں ایسی ایسی شکتی یا جیسے تم لوگ اردو زبان میں طاقت کہتے ہو پیدا ہو جاتی ہے کہ عام لوگوں کو بالکل معلوم نہیں ہے۔ بھارت کے سپیرے اور سپرینیاں بڑی پر اسرار شکتیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن یہ طاقت یا شکتی ہر سپیرے کے پاس نہیں ہوتی۔ اس کے لیے بڑے چلے کاٹنے پڑتے ہیں۔ سانپوں کے غاروں میں گھس کر ساری ساری رات تپسیا کرنی پڑتی ہے۔"

کاویری نے سامنے کی طرف سے آنے والی ہوا کو سونگھتے ہوئے کہا۔

"دریا قریب آ گیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے دریا کے پانی کی خوشبو آ گئی ہے۔ یہ تو ایک عام آدمی بھی اگر اس علاقے میں آتا جاتا رہا ہو تو بتا دے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا ہمیں دریا پار کرنا ہو گا؟"

"ہاں مگر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ اصل دریا نہیں ہے بلکہ دریا کی شاخ ہے جو

دریا سے نکل کر جنگل میں سے گزرتی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ہم دریا کی شاخ پر پہنچ گئے۔ یہ ایک بڑی نہر جتنی چوڑی تھی۔ یہاں آسمان کھلا ہونے کی وجہ سے ستاروں کی دھندلی روشنی میں دریا کا دوسرا کنارہ اور اس کے درخت بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے کاویری سے کہا۔

"مجھے تیرنا آتا ہے۔ کیا تم تیر سکتی ہو؟"

کاویری مسکرائی۔ کہنے لگی۔

"تیرنا تو مجھے بھی آتا ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ میری ساڑھی بھیگ جائے۔"

"تو پھر دریا کیسے پار کریں گے۔ یہاں تو کوئی کشتی وغیرہ بھی نظر نہیں آ رہی۔"

وہ بولی۔

"ہم ناؤ تیار کریں گے۔ جہاں جہاں سے درختوں کی کٹی ہوئی شاخیں ملیں انہیں یہاں لے آؤ۔"

وہ خود بھی درختوں کے نیچے جا کر شاخیں وغیرہ اٹھانے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہاں کافی کٹی ہوئی شاخیں ہم نے جمع کر لیں۔ کچھ ٹہنیاں میں نے درختوں سے توڑ لی تھیں۔ انہیں گٹھے کی شکل میں باندھا تو وہ ایک ناؤ سی بن گئی۔ ہم نے اسے دریا میں ڈال دیا اور خود اسی پر سوار ہو گئے۔ یوں ہم نے بڑے آرام سے دریا کی شاخ کا نسبتاً کم چوڑا پاٹ عبور کر لیا۔ ابھی رات کا پچھلا پہر شروع ہوا تھا اور کافی اندھیرا تھا۔ دریا کی شاخ کے دوسرے کنارے پر آ کر کاویری نے اپنی ساڑھی کو ٹھیک طرح سے باندھا اور دریا کے جس کنارے کی جانب سے ہم آئے تھے اس طرف منہ کر کے دو تین لمبے لمبے سانس لیے پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔

"ابھی تک مجھے دشمن سانپ کی بو نہیں آ رہی۔ معلوم ہوتا ہے اس نے میرے جسم کی بو کھو دی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی ہے۔"

وہ بولی۔ "لیکن تم سانپوں سے اور خاص طور پر ناگ دیوی کے مندر کے سانپوں سے

واقف نہیں ہو۔ میرا دشمن سانپ ضرور میرا پیچھا کر رہا ہو گا۔ اگر اس نے میری بو کھو بھی دی ہے تب بھی وہ میری بو کی تلاش میں ہو گا اور ہرگز واپس نہیں جائے گا۔"

وہ جنگل میں داخل ہونے سے پہلے درختوں کی طرف نظریں دوڑا رہی تھیں۔ میں خاموش اس کے پاس کھڑا تھا۔ کہنے لگی۔

"ہمیں اسی طرف چلنا ہو گا۔ میں اس جنگل میں دو بار پہلے بھی آ چکی ہوں۔ آ جاؤ میرے ساتھ۔"

جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا ہم اس طرف چل پڑے۔ میں تھک ضرور گیا تھا مگر راستے میں جو ہم کسی نہ کسی جگہ تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ کر آرام کر لیتے تھے اس سے کافی فرق پڑ جاتا تھا۔ ایک بار پھر ہم تاریک جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔ اندھیرے میں ہمیں اتنا ضرور نظر آ جاتا تھا کہ ہم راستہ تلاش کر سکیں۔ راستے میں جھاڑیاں بہت زیادہ تھیں۔ ایک جگہ پہنچ کر کاویری رک گئی۔ وہ فضا میں کچھ سونگھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا دشمن سانپ کی بو آ رہی ہے؟"

وہ بولی۔ "نہیں۔ مجھے انسانوں کا خون پینے اور انسانوں کا گوشت کھانے والے آدم خور درختوں کی بو آ رہی ہے۔ ہمیں ادھر سے ہٹ کر دوسرے راستے سے چلنا ہو گا۔"

وہاں سے ہم نے راستہ تبدیل کر لیا۔ اس دبلی پتلی پر اسرار لڑکی کا دم بڑا غنیمت تھا ورنہ اگر میں اکیلا ہوتا تو آدم خور درختوں کی خوراک بن جاتا۔ کاویری نے مجھے پہلے بھی ان درختوں کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ پھر بتانے لگی۔

"ہم سنتھاولی کی پہاڑیوں میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہاں جنگل میں آدم خور درختوں کی بہتات ہے۔"

میں نے کہا۔ "جب آدم خور درخت کی شاخیں انسان کو پکڑ کر اٹھاتی ہیں تو کیا آدمی اپنے آپ کو چھڑا نہیں لیتا؟ آدمی میں تو بڑی طاقت ہوتی ہے درخت کی شاخیں اس کے سامنے کیا چیز ہیں۔"

کاویری کہنے لگی۔

"بھگوان نے ان درختوں کو اپنی خوراک حاصل کرنے کے واسطے عجیب و غریب شکل دے رکھی ہے۔ ان کی شاخوں پر چھوٹے چھوٹے بے شمار کانٹے ہوتے ہیں۔ جب یہ شاخیں نیچے سے گزرنے والے کسی انسان کو اٹھاتی ہیں تو یہ کانٹے فوراً انسان کے بدن میں چبھ جاتے ہیں اور ان کانٹوں سے ایسا زہر نکل کر انسان کے خون میں شامل ہو جاتا ہے جس سے انسان نیم بے ہوش ہو جاتا ہے اور اس کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "پھر بھی ایک طاقتور جوان آدمی ان شاخوں کو توڑ پھوڑ کر اپنا آپ چھڑوا سکتا ہے۔"

کاویری بولی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو لیکن حیرانی کی بات ہے کہ آج تک کوئی طاقتور سے طاقتور آدمی بھی ان درختوں کی شاخوں میں پھنسنے کے بعد زندہ نہیں بچ سکا۔ میں تمہیں ان درختوں کی نشانیاں بتا دوں گی تاکہ اگر تمہیں ان جنگلوں میں سے اکیلا گزرنا پڑے تو تم ان کا شکار نہ بن سکو۔"

ہمارے راستے میں بقول کاویری کے کوئی آدم خور درخت نہیں آیا تھا۔ ایک چھوتی سی ندی ضرور آئی جس کے کنارے پر ذرا اونچائی پر کسی عمارت کا دھندلا سا خاکہ اندھیرے میں نظر آ رہا تھا۔ کاویری نے اس طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ہم یہاں باقی کی رات آرام کریں گے۔ دن نکلنے کے بعد آگے روانہ ہوں گے۔"

میں نے اس سے کہا کہ اس کا دشمن سانپ اس کے تعاقب میں ہوگا۔ اس لیے تمہیں یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ وہ اونچے ٹیلے کی طرف بڑھتے ہوئی بولی۔

"مجھے تین میل سے دشمن سانپ کی بو آ جائے گی اور میں اگر سو رہی ہوں گی تو یہ بو مجھے اٹھا دے گی۔ تم فکر نہ کرو۔"

ٹیلے پر اوپر جانے کے لیے ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ بولی۔

"یہ کسی زمانے میں اس علاقے کے راجہ کی آدھی باسی رانی کی مڑھی ہوا کرتی تھی۔ اب تو یہ ویران ہو گئی ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "آدھی باسی رانی سے کیا مطلب ہوا؟"
اس نے کہا۔ بھات کے ان جنگلوں میں سے جو جنگلی لوگ آباد ہیں ان کو آدھی باسی کہتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک روز راجہ شکار کھیلنے جنگل میں گیا تو اسے ایک آدھی باسی لڑکی ملی جو بے حد خوبصورت تھی۔ راجہ نے اس سے شادی کر لی اور اپنے محل میں لے گیا۔ جب یہ رانی مر گئی تو راجہ نے جنگل میں اس ندی کے کنارے ٹیلے پر اس کی مڑھی بنا دی۔ رانی کو اسی جگہ جلایا گیا تھا اور اس کی ہڈیاں بھی اس مڑھی کے اندر دفن ہیں۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ نہ راجہ رہا' نہ اس کی آدھی باسی رانی کی مڑھی رہی۔ اب یہاں صرف اس کا نشان ہی باقی ہے۔ جنگلی لوگ بھی ادھر آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہاں رات کو رانی کی بدروح پھرتی ہے۔"

یہ سن کر مجھے بھی تھوڑا سا ڈر لگا۔ آخر میں بھی انسان تھا اور بد روحوں بھوتوں سے ڈرنا انسانوں کی خصلت میں ہے۔ کاویری ٹبے کے اوپر مڑھی کے کھنڈر کے قریب آکر رک گئی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟ فکر نہ کرو۔ جب تک تم میرے ساتھ ہو کوئی بد روح تمہیں کچھ نہیں کہے گی۔"

سامنے رات کی تاریکی میں ایک چاردیواری سی نظر آئی جس کی ایک دیوار ڈھے گئی تھی۔ ہم اس دیوار میں سے گزر کر صحن میں آ گئے۔ صحن چھوٹا تھا اور اس کے درمیان ایک چبوترے پر چھتری سے بنی ہوئی تھی۔ کاویری نے اس طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ آدھی باسی رانی کی مڑھی ہے۔ یہاں اسے چتا میں لٹا کر جلایا گیا تھا اور اسی جگہ اس کی مڑھی بنا دی گئی تھی۔"

سامنے ایک چوبارہ تھا۔ زینہ اوپر جاتا تھا۔ کاویری آگے آگے چل رہی تھی۔ دس بارہ سیڑھیاں چڑھ کر ہم ایک گیلری نما شہ نشین میں آ گئے۔ جس کے نیچے ہال کمرے کا فرش تھا۔ کاویری کہنے لگی۔

"ہم اس شہ نشین میں آرام کریں گے۔ میں اس طرف پڑ کر سو جاتی ہوں۔ تم

دوسری طرف لیٹ جاؤ۔ ہم ساری رات چلتے رہیں ہیں۔ ہمیں آرام کی سخت ضرورت ہے ورنہ کل کا دن ہم سفر نہ کر سکیں گے۔"

میں ذرا اوپر پرے ہٹ کر شہ نشین کے سخت فرش پر لیٹ گیا۔ کاویری بھی شہ نشین کی سنگی جالیوں کی طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔ مجھے تھکاوٹ کافی ہو رہی تھی مگر نیند کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ رانی کی بد روح کا خیال میرے دماغ میں گھس گیا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اگر میری آنکھ لگ گئی تو آدھی باسی رانی کی بدروح آکر میری گردن دبادے گی۔ ٹھیک ہے میں کمانڈو تھا' دلیر تھا' بے خوف تھا مگر یقین کریں کہ اس قسم کی آسیبی باتوں سے مجھے بچپن میں بھی بڑا ڈر لگا کرتا تھا۔ شاید کاویری بھی جاگ رہی تھی۔ مجھے اس کے دو ایک بار گہرے سانس بھرنے کی آواز آئی تھی۔ مگر میں نے اسے بلانا مناسب خیال نہ کیا۔ باہر جنگل میں چاروں طرف سناٹا طاری تھا۔ میرا خیال ہے کہ رت کے تین بجے کا ٹائم ہو گا۔ مجھے یہ خیال بھی پریشان کر رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کاویری سو جائے اور سوتے میں اسے دشمن سانپ کی بو نہ آئے اور سانپ یہاں آکر اس کے ساتھ مجھے بھی ڈس لے۔

میں چاہتا تھا کہ جاگتا رہوں اور اگر سانپ وہاں آئے تو اسے فوراً ہلاک کر ڈالوں۔ میں نے لیٹے لیٹے جرسی کی جیب میں سے ریوالور نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ دیوار کے پرانے طرز کے روشندان کے شگافوں میں سے رات کے پچھلے پہر کے نیلے اجالے کا ہلکا ہلکا نور جھلکنے لگا تھا۔ میں نے کاویری کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ میرے پاس ریوالور بھی ہے۔ اس کے ساتھ پھر مجھے اسے یہ بھی بتانا پڑتا کہ میں نے انٹیلی جینس کے دو آدمیوں کی گردنیں توڑی تھیں۔ جب تک اسے خود معلوم نہیں ہو جاتا کہ میرے پاس ریوالور ہے' میں یہ بات اس سے پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے ہمیں لیٹے مشکل سے دس پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اچانک جنگل کی رات کی خاموش فضا گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اٹھی۔ میں ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ ایسے لگا جیسے چھ سات گھوڑے نیچے کھنڈر کے بڑے کمرے میں کسی طرف سے آن داخل ہوئے ہیں۔

کاویری بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"یہ آواز کیسی تھی؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"نیچے ہال کمرے میں کچھ گھڑسوار آئے ہیں۔

ہم نے پتھر کی جالیوں میں سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ اب نیچے سے آدمیوں کے اونچی اونچی بولنے اور قہقہے لگانے اور گھوڑوں کے بدکنے کی آوازیں آنے لگی تھی۔ اندھیرے میں ہمیں آدمیوں اور گھوڑوں کے خاکے دکھائی دیئے۔ کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"ابے او' ہری داس! لالٹین روشن کر اور دارو کی بوتلیں کھول دے۔"

باری باری تین لالٹینیں روشن ہوگئیں۔ ان کی روشنی میں ہم نے رنگ برنگی پگڑیوں اور تنگ پاجاموں والے چھ سات آدمیوں کو دیکھا جو گھوڑوں کو ایک طرف باندھ رہے تھے۔ درمیان میں ایک جگہ چارپائی ڈال دی گئی تھی جس پر ایک پھولی ہوئی مونچھوں والا کالا بھجنگ آدمی ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر نیم دراز تھا اور ایک ملازم اس کے کاندھے دبا رہا تھا۔ باقی کے آدمی بھی اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گئے۔ شراب کی بوتلیں کھل گئیں۔ ان کے پاس لمبی لمبی بندوقیں تھیں۔ ہم یہ سارا منظر گیلری میں پتھر کی جالیوں کے ساتھ لگے دیکھ رہے تھے۔ کاویری نے سرگوشی میں کہا۔

"یہ لوگ ڈاکو ہیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا تو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

ہم پیچھے کو کھسکے تو میرا پاؤں ایک پتھر پر آگیا۔ پتھر لڑھکا تو آواز پیدا ہوئی۔ نیچے سے کسی نے کرخت آواز میں کہا۔

"کیوں بے؟ اوپر کون ہے؟ ارے ہریا' جا کر پتہ کر بے۔ اوپر رانی کی بدروح ہو تو اسے پکڑ کر نیچے لے آ۔ آج اس کے ہاتھ سے دارو پئیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی مجھے تین چار آدمیوں کے دوڑ کر گیلری والی سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ کاویری نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پیچھے کر دیا اور سرگوشی میں کہا۔

"خبردار! یہاں سے نہ ہلنا۔ چھپ کر بیٹھے رہو۔ آواز تک نہ نکالنا۔ میں ان کو سنبھال لوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ خود ہی سیڑھیوں کی طرف گئی۔ ڈاکو ابھی آدھی سیڑھیوں میں تھے کاویری نے ان کے سامنے جا کر کہا۔

"تم اوپر آنے کا کشٹ کیوں اٹھاتے ہو۔ میں خود تمہارے پاس آ گئی ہوں۔ چلو مجھے سردار کے پاس لے چلو۔"

میں گیلری میں ہی ایک طرف چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ مجھے نیچے سیڑھیوں میں ڈاکوؤں کے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ ان میں سے کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"ارے دھنیا! ارے رانی کی بد روح ایسی ہوتی ہے رے۔ ارے اسے لے چلو سردار کے پاس۔"

میں نے بیٹھے بیٹھے پتھر کی جالی میں سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ لالٹینوں کی روشنی میں تین ڈاکو کاویری کو پکڑے اندر داخل ہوئے۔ سردار اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک ڈاکو بولا۔

"سردار! رانی کی بد روح جون بدل کر آ گئی ہے۔"

ڈاکوؤں کے سردار نے کاویری کو دیکھ کر کہا۔

"ارے واہ واہ رے دھنیا! ارے واہ رے پریا! ارے اس رانی کو ہمارے پاس لاؤ۔"

ڈاکوؤں نے کاویری کو دھکا دے کر سردار کی آغوش میں گرا دیا۔ سردار نے کاویری کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"رانی بائی! آج تو دھن راج ڈاکو کے دربار میں آئی ہے۔ پہلے ہمیں دارو پلا۔ ارے ہریا! اسے بوتل دے دے۔"

میں نے ریوالور پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں اوپر گیلری کے مورچے میں سے کتنے ڈاکوؤں کو مار سکتا تھا اور پھر کاویری ان کے قبضے میں تھی۔ وہ آسانی سے اسے ہلاک کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان سارے ڈاکوؤں کے پاس بندوقیں تھیں۔ وہ مجھے گھیرے میں لے کر بے بس کر سکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ

کاویری نے ہاتھ اونچا کر کے سردار سے کہا۔

"سردار! کیا تو دھن راج ڈاکو ہے؟"

سردار نے ہنس کر کہا۔

"ارے تو میں تمہیں کیا آدمی باسی لگتا ہوں۔ یہ بتا کہ تو رانی کی بد روح ہے یا کوئی اور ہے؟"

کاویری نے کہا۔ "سردار! میں رانی کی بد روح نہیں ہوں۔ آدمی باسی مچھیرے کی بیٹی ہوں۔ جنگل میں لکڑیاں چننے آئی تھی۔ راستے میں رات ہو گئی شیر باگھ کے ڈر سے اس مڑھی میں لیٹ گئی کہ رات گزر جائے تو گھر واپس جاؤں گی۔"

سب ڈاکو قہقہے لگا کر ہنس پڑے۔ سردار نے کہا۔

"اری آج تو ہماری رانی ہے۔ چل پہلے شراب پلا۔ اس کے بعد تجھ سے دو دو باتیں ہوں گی۔"

کاویری کمال جرأت اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"سردار! میری بڑی خواہش تھی کہ کبھی دھن راج ڈاکو کے درشن ہوں۔ میرے دھن بھاگ ہیں کہ تمہارے درشن ہو گئے۔ میں خود تمہیں اپنے ہاتھ سے شراب پلاؤں گی۔"

کاویری نے ایک ڈاکو کے ہاتھ سے بوتل لے لی۔ پھر ایک گلاس میں شراب ڈال کر سردار کو دی۔ سردار نے مسکراتے ہوئے گلاس لے لیا اور بولا۔

"اری واہ ری رانی! تو نے تو کمال کر دیا ہے۔"

سب ڈاکو بولے۔

"ہمیں بھی اپنے ہاتھ سے شراب دو۔ ہم بھی رانی کے ہاتھ سے شراب پئیں گے۔"

اور کاویری سب کے گلاسوں میں شراب ڈالنے لگی۔ کاویری سب ڈاکوؤں کو گلاسوں میں شراب ڈال ڈال کر پلا رہی تھی۔ ڈاکو جھوم رہے تھے' قہقہے لگا رہے تھے۔ سردار نے کاویری کو بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا اور بولا۔

"اری رانی! تو بھی پی۔ یہ لے۔"

کاویری نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"سردار میں دارو نہیں پیتی۔"

سردار نے غصے کے ساتھ کہا۔

"نہیں پیتی تو دھن راج کے ساتھ آج تو بھی پیئے گی۔ دیکھتا ہوں کیسے نہیں پیتی؟"

کاویری فوراً راضی ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"اچھا سردار! میں بھی دارو پیتی ہوں مگر تمہاری خاطر صرف ایک گھونٹ پیئوں گی۔"

سردار نے بلند قہقہہ لگایا۔

"اری ایک گھونٹ ہی سہی۔ یہ لے۔ پی جا۔"

میں کاویری کو مسلسل دیکھ رہا تھا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ وہاں ابھی ایسی صورت حال پیدا نہیں ہوئی تھی کہ فائر کرنے کی نوبت آتی۔ سردار نے اپنا گلاس کاویری کی طرف بڑھایا۔ کاویری نے شراب کا گلاس اپنے ہونٹوں کے ساتھ ایک دو سیکنڈ تک لگائے رکھا پھر گلاس سردار کو واپس کر دیا۔ تمام ڈاکو خوشی سے اچھل پڑے اور ایک ساتھ نعرہ لگا کر بولے۔

"رانی ہمیں بھی اپنی جوٹھی شراب پلائے گی۔؟"

میں بڑا حیران ہوا کاویری نے کوئی اعتراض نہ کیا اور بولی۔

"میں تم سب کو اپنی جوٹھی شراب پلاؤں گی۔"

ڈاکوؤں نے اپنے اپنے گلاس بلند کر دیے۔ کاویری بوتل لے کر ہر ایک ڈاکو کے پاس جاتی۔ گلاس میں شراب ڈالتی۔ گلاس کو اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگا کر اوپر کو اٹھاتی۔ جیسے شراب کا گھونٹ بھر رہی ہو اور گلاس ڈاکو کو واپس کر دیتی۔ ڈاکو فوراً شراب پی جاتا۔ سردار کو اس نے دوسری بار بھی اپنی جوٹھی شراب پلائی۔ سردار نے نعرہ لگایا۔۔

"رانی! ہمیں ڈانس کر کے دکھاؤ۔"

میں نے دیکھا کہ کاویری نے فوراً سردار کا حکم مان لیا اور آہستہ آہستہ رقص کرنے

لگی۔ وہ سانپ کا رقص کر رہی تھی۔ جس طرح بین کی آواز پر سانپ جھومتا ہے کاویری اسی طرح اپنے جسم کو لہرا رہی تھی۔ سردار اور ڈاکو تو خوشی سے اچھل اچھل کر داد دینے لگے۔

اب اچانک ایسا ہوا کہ پہلے ایک ڈاکو مدہوش ہو کر جہاں بیٹھا تھا وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اس کے بعد دوسرا پھر تیسرا اور پھر چوتھا ڈاکو ڈھیر ہوگیا۔ سردار نے چیخ کر کہا۔

"ارے تم لوگ اتنی جلدی کیسے دھت ہوگئے؟"

سردار اپنے ساتھیوں کو گالیاں دینے لگا۔ کاویری نے رقص کرنا بند کر دیا تھا۔ وہ سردار کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ سردار نے گلاس بلند کرتے ہوئے کہا۔

"اری میری طرف کیا دیکھ رہی ہے۔ لا۔ اس میں اور شراب ڈال۔"

اس کے ساتھ ہی سردار کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر گر پڑا اور وہ بھی چارپائی پر ڈھیر ہوگیا۔ میں یہی سمجھا کہ ان لوگوں کو شراب کا نشہ چڑھ گیا ہے۔ جب سارے ڈاکو سردار سمیت نشے میں بے سدھ ہوگئے تو کاویری دوڑ کر ہال کمرے سے نکل گئی اور سیڑھیاں چڑھ کر میرے پاس آ کر بولی۔

"کرم داد! ہمیں اب یہاں سے نکل چلنا چاہیے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ اتنی جلدی کیسے نشے میں دھت ہوگئے؟"

وہ بولی۔

"انہیں میں نے بے ہوش کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے بعد انہیں ہوش آجائے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "تم نے بے ہوش کیا ہے؟"

"ہاں۔ کاویری سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔"

اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ آسمان پر صبح کاذب کا نیلا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ باہر آ کر وہ مڑھی کے صحن کی طرف مڑ گئی۔ کہنے لگی۔

"ہم آگے گھوڑوں پر سفر کریں گے۔"

صحن میں ڈاکوؤں کے چھ سات گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ کاویری نے دو گھوڑے بندھے رہنے دیے' باقی سارے گھوڑے کھول کر انہیں مڑھی کے صحن سے باہر بھگا دیا۔ گھوڑے صحن سے نکلتے ہی جنگل میں ایک طرف دوڑ پڑے۔ کاویری ایک گھوڑے پر اور میں دوسرے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ راستے میں میں نے کاویری سے پوچھا۔

"تم نے ان ڈاکوؤں کو بے ہوش کیسے کیا تھا؟"

کہنے لگی۔ "اس جنگل سے نکلنے کے بعد بتاؤں گی۔"

ہمارے گھوڑے قدم قدم نہیں بلکہ دلکی چال چل رہے تھے جس کی وجہ سے راستہ جلدی طے ہو رہا تھا۔ جنگل میں صبح کی سفیدی پھیل رہی تھی۔ ہم جنگل کے جس علاقے سے گزر رہے تھے وہاں اتنے گنجان درخت نہیں تھے۔ آگے جا کر کاویری نے اپنے گھوڑے کو ایک ٹیلے کی طرف موڑ لیا۔ میرا گھوڑا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ ہم اسی طرح گھوڑوں پر سفر کرتے چھوٹے چھوٹے کئی ٹیلوں میں سے گزرے۔ ایک جگہ کھلی وادی آ گئی۔ یہ سارا علاقہ جنگل کا تھا اور کہیں کوئی آبادی نہیں تھی۔ کہیں کہیں جنگلی لوگوں کی دو چار جھونپڑیاں دور سے نظر آ جاتی تھیں۔ سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ ہمیں سفر کرتے کافی وقت گزر گیا تھا۔

راستے میں دو تین ندیاں بھی ہم نے گھوڑوں پر بیٹھے بیٹھے عبور کی تھیں۔ ایک ندی آئی تو کاویری نے اس کے کنارے کے ساتھ گھوڑا ڈال دیا۔ ندی کوئی چھ سات میل آگے جا کر دائیں جانب جنگل میں مڑ گئی۔ کاویری نے گھوڑا روک لیا۔ میں نے بھی گھوڑے کی باگ کھینچ لی۔ وہ کہنے لگی۔

"یہاں سے سنتھاولی کا جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ اگر ہم پیدل سفر کرتے تو ہم شام کو سنتھاولی مٹھ پہنچتے۔ لیکن گھوڑوں پر سفر کرنے کی وجہ سے اب ہم شام ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ لیکن ہمیں آگے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہو گی۔ کیونکہ سنتھا

ولی مٹھ کے پہرے دار سانپ آس پاس کے جنگل میں پھر رہے ہوں گے۔"

اس کے بعد کاویری نے منہ پیچھے کی طرف کر کے دو تین گہرے سانس لیے اور مسکرا کر کہنے لگی۔"

"جڑی بوٹیوں کے خاص عرق کی وجہ سے میرا دشمن سانپ لگتا ہے بھٹک گیا ہے۔ اسے ابھی تک میرا سراغ نہیں مل سکا۔ مجھے اس کی بو نہیں آ رہی۔ کم از کم تین چار میل پیچھے وہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"سنتھا ولی مٹھ کے پہرے دار سانپوں سے کس طرح بچیں گے؟ وہ تو ہمارے گھوڑوں پر بھی حملہ کر دیں گے؟"

کاویری کہنے لگی۔

"ہم پہرے داروں کی سرحد شروع ہونے سے پہلے گھوڑے چھوڑ دیں گے اور وہاں سے ایک خفیہ راستے سے سنتھا ولی مٹھ کی طرف جائیں گے۔"

ہم ندی کے ساتھ ہی گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔

اب ہمارے گھوڑے قدم قدم چل رہے تھے۔ درختوں کی شاخیں جہاں نیچے تک جھکی ہوئی ہوتیں وہاں ہمیں جھک کر نکلنا پڑتا تھا۔ یہ کافی گھنا جنگل تھا۔ مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی اور بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کاویری سے کہا۔

"کاویری! کیا تمہیں بھوک پیاس نہیں لگتی؟"

وہ بولی۔ "کیوں نہیں لگتی فکر نہ کرو۔ آگے جنگلی پھلوں کا ایک ذخیرہ آتا ہے۔ ہم وہاں کچھ کھا پی بھی لیں گے اور آرام بھی کریں گے۔"

جنگلی پھلوں کا یہ ذخیرہ ایک گھنٹہ جنگل میں سفر کرنے کے بعد آیا۔ ہم گھوڑوں سے اتر گئے۔ یہاں کیلوں اور جنگلی بیروں کے بے شمار درخت تھے۔ کاویری ندی سے ذرا ہٹ کر گھاس پر بیٹھ گئی۔ گھوڑوں کو ہم نے کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ بھی گھاس اور ندی کے پانی سے پیٹ بھر لیں۔ میں کچھ بیر اور جنگلی کیلوں کا ایک گچھا توڑ کر لے آیا۔ ہم دونوں کیلے

اور بیر کھانے لگے۔ میں نے کاویری سے پوچھا۔
"اب مجھے بتاؤ کاویری کہ تم نے ڈاکوؤں کو بے ہوش کیسے کیا تھا؟"
وہ کہنے لگی۔
"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرا جنم سپیروں کے گھر میں ہوا تھا۔ میرے ماتا پتا سپیرے اور سپیرن تھے۔ وہ جب سورگباش ہو گئے تو مجھے ایک ناگ مندر کے پجاری نے پال پوس کر بڑا کیا۔ شروع سے ہی سانپوں کے ساتھ میری بڑی دوستی رہی ہے۔ کئی بار سانپوں نے مجھے کاٹا مگر پجاری جی نے دوائی پلا کر مجھے اچھا کر دیا۔ میں جوان ہوئی تو ایک ناگ مندر کی ناگ داسی بنا دی گئی۔ وہاں مہینے میں ایک بار ناگ اتسو یعنی ناگ میلا لگتا تھا جس میں ہر ناگ داسی کو سانپ سے ڈسوایا جاتا تھا مگر ڈسوانے سے پہلے ہمیں ایک خاص قسم کی دوائی پلا دی جاتی تھی جس سے ہم پر زہر کا پورا اثر نہیں ہوتا تھا۔ ہر ماہ سانپ سے ڈسوانے کے بعد میرے جسم میں سانپ کے زہر کا تھوڑا بہت اثر آ گیا ہے۔ اب ایسا ہوتا ہے کہ جب میں چاہوں اپنے جسم کے زہر کو اپنی زبان پر لے آتی ہوں۔ تب اگر میں کسی کو اپنا جھوٹا پانی پلا دوں تو اس کے جسم میں زہر کا اثر داخل ہو جاتا ہے اور وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ وہ مرے گا نہیں لیکن کچھ دیر کے لیے بے ہوش ضرور رہے گا۔ میں نے ان ڈاکوؤں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا۔ جب انہوں نے مجھے کہا کہ میں انہیں اپنی جھوٹی شراب پلاؤں تو اچانک مجھے خیال آ گیا کہ کیوں نہ میں انہیں اپنے زہر سے بے ہوش کر دوں۔ چنانچہ میں نے جب شراب کے گلاس کو اپنے منہ سے لگایا تو ظاہر یہ کیا جیسے میں شراب پی رہی ہوں۔

مگر میں نے شراب کا ایک قطرہ بھی نہیں پیا۔ بلکہ اپنی زبان پر لایا ہوا زہر شراب میں داخل کر دیا۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے سارے ڈاکو بے ہوش ہو گئے۔"
میں بڑی حیرانی اور تعجب کے ساتھ کاویری کی باتیں سن رہا تھا۔ اس قسم کی باتیں میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ اس قسم کی عورت بھی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کسی وقت مجھے محسوس ہوتا کہ میں الف لیلیٰ کی دنیا میں نکل آیا ہوں اور میرے ساتھ وہی

کچھ ہو رہا ہے جو پرانی داستانوں میں سفر پر نکلے ہوئے مسافروں اور شہزادوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

ہم نے سیر ہو کر جنگلی پھل کھایا۔ ندی پر جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا۔ اس دوران ہمارے گھوڑے بھی گھاس وغیرہ کھا کر اور پانی پی کر تازہ دم ہو چکے تھے۔ کاویری نے اپنے سر کے بال بھی ندی میں دھوئے۔ انہیں اسی طرح نچوڑ کر اس نے سر کے پیچھے جوڑا بنا لیا۔ کہنے لگی۔

"میری ساڑھی میلی ہو گئی ہے مگر میرے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہیں ہے۔"

اچانک وہ باتیں کرتی کرتی رک گئی۔

اس نے اپنا چہرہ اس طرف پھیر لیا جس طرف سے ہم چل کر آئے تھے۔ ایک دو لمبے لمبے سانس لینے کے بعد وہ پریشان سی ہو کر بولی۔

"مجھے میرے دشمن سانپ کی بو آ رہی ہے۔"

وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لگتا ہے اس نے میری بو کا سراغ لگا لیا ہے۔ مگر ابھی وہ مجھ سے کافی دور ہے۔ ہمیں اتنی دیر میں یہاں سے جتنی دور نکل سکتے ہیں نکل جانا چاہیے۔"

ہم گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور گھوڑوں کو ندی کے ساتھ ساتھ جنگل کے راستے پر ڈال دیا۔

کاویری کے اس انکشاف سے کہ اس کے دشمن سانپ نے اسی کے جسم کی بو پا لی ہے اور وہ اس کے تعاقب میں چلا آ رہا ہے۔) مجھے بھی پریشان کر دیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں میں بھی کاویری کے ساتھ ہی نہ مارا جاؤں۔ مجھے ابھی مرنا نہیں تھا۔ زندہ رہنا تھا اور اپنی بیوی جمیلہ کو اس جھنجھٹ سے نکال کر پاکستان لے جانا تھا۔

ندی کے کنارے پر درخت نہیں تھے۔ کاویری گھوڑے کو تیز دوڑا رہی تھی۔ میرا گھوڑا بھی اس کے پیچھے پیچھے تیز دوڑنے لگا تھا۔ کاویری واقعی دشمن سانپ کی بو سونگھ کر گھبرا گئی تھی۔ جتنا تیز وہ گھوڑے کو دوڑا رہی تھی اتنا تیز اس نے سارا رستہ گھوڑے کو

نہیں دوڑایا تھا۔ کافی آگے جا کر ندی جنگل میں بائیں طرف گھوم گئی۔ یہاں کاویری نے ندی کا کنارہ چھوڑ دیا اور ایک پہاڑی کی طرف روانہ ہو گئی۔ گنجان درخت دور دور ہو گئے تھے۔ زمین ایسی تھی کہ کہیں اونچی ہو جاتی اور کہیں نشیب آ جاتا۔ ساری زمین جنگلی جھاڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس وقت آسمان پر بادل آنا شروع ہو گئے تھے۔ سورج کے آگے بادلوں کا کوئی ٹکڑا آ جاتا تو دھوپ غائب ہو جاتی اور ہر طرف سایہ سا چھا جاتا۔ ہم پہاڑی کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ کاویری نے گھوڑے کو پہاڑی پر ڈال دیا۔ پہاڑی کی ڈھلان پر گھوڑے قدم قدم چلنے لگے۔ میں نے کاویری کو آواز دے کر کہا۔

"اس پہاڑی کی دوسری طرف کیا ہے۔"

اس نے بلند آوز میں جواب دیا۔

"تم خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

میں نے اس کے بعد کوئی بات نہ کی۔ پہاڑی کی چڑھائی پر جگہ جگہ پتھر اور جھاڑیاں تھیں۔ گھوڑے ان کے درمیان بڑے سنبھل سنبھل کر چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ ہم پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ کاویری نے اپنے گھوڑے کو پہاڑی کی دوسری طرف نشیب میں ڈال دیا۔

پہاڑی کی اترائی اترنا زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ اترائی اتنی سیدھی نہیں تھی مگر اتنی آسان بھی نہیں تھی۔ ہم پہاڑی پر سے اتر آئے۔ آگے ایک کھائی تھی۔ کاویری نے کھائی میں گھوڑے کو ڈال دیا اور میری طرف گھوم کر کہا۔

"ہوشیار رہنا تھوڑی دیر میں سنتھا ولی مٹھ کے جنگل کی سرحد شروع ہونے والی ہے۔"

میں صرف اس طرح ہوشیار رہ سکتا تھا کہ سنتھا ولی مٹھ کے جنگل کی سرحد میں داخل ہوتے ہی اپنی ٹانگیں اوپر کر لوں تاکہ مٹھ کے زہریلے پہرے دار سانپوں سے محفوظ رہ سکوں۔ لیکن سانپ گھوڑوں کو بھی ڈس سکتے تھے۔ میں نے پاؤں اوپر تو نہیں کیے تھے لیکن گھوڑے پر بیٹھا جھاڑیوں میں دونوں جانب نظر رکھے ہوئے تھا۔ لیکن سانپ آخر سانپ

ہوتا ہے اور پھر کاویری نے بتایا تھا کہ سنتھا ولی مٹھ کے محافظ سانپ زمین سے اوپر کو اڑ کر حملہ کرتے ہیں اور درختوں پر سے بھی حملہ آور ہوتے ہیں۔ میری قسمت نے مجھے ایسے حالات میں پھنسا دیا تھا جن کا مجھے پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا اور دھوپ کے غائب ہونے سے دن کی روشنی کم ہو گئی تھی۔ کاویری کو دہرا خطرہ تھا۔ ایک تو اس کے پیچھے اس کا دشمن سانپ لگا ہوا تھا دوسرے سنتھا ولی مٹھ کے محافظ سانپوں کا خطرہ تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ واقعی بڑی دلیر لڑکی تھی۔ گھوڑے پر بیٹھی اس کی باگیں تھامے ایک مہارانی کی طرح لگ رہی تھی۔

ہم پہاڑی کے دامن میں آگئے۔ یہاں ایک جگہ سیاہ رنگ کا کھیت تھا۔ کاویری نے گھوڑے کو روک لیا اور بولی۔

"یہ بڑی خطرناک دلدل ہے گھوڑے کو میرے پیچھے رکھنا۔"

دلدلیں میں نے مشرقی پاکستان کی جنگل میں بھی دیکھی تھیں مگر اتنی سیاہ دلدل میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ دلدل میں سے بخارات اٹھ رہے تھے اور وہ غیر محسوس طور پر اوپر نیچے رہی تھی۔ میرے خدا! قدرت کے راز قدرت کو ہی معلوم ہیں۔ ان بھیانک دلدلوں کا کیا مصرف ہے؟ کیا فائدہ ہے؟ یہ صرف قدرت ہی جانتی تھی۔ دلدل سے آگے بانس کے جھنڈ شروع ہو گئے۔ اس کے بعد ایک ندی آگئی۔ ہم نے گھوڑے ندی میں ڈال دیے۔ ندی کے دوسرے کنارے پر لے جا کر کاویری نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پھر دو تین لمبے لمبے سانس لیے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ دشمن سانپ کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"دشمن سانپ کی بو غائب ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا۔

"چلو ایک دشمن سے تو جان چھوٹی۔"

وہ کہنے لگی۔ "یہ دشمن سانپ میرا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہے۔ وہ یا مجھے مارے گا یا خود مر جائے گا۔ یہ اس کی ایک چال ہے۔ قدرت نے ان سانپوں کو بڑی عقل دی ہے۔

وہ مجھے دھوکے میں ڈال کر جنگل میں تین چار میل دوسری جانب ہٹ گیا ہے اور ممکن ہے آگے سے آکر حملہ کر دے۔ اگر وہ آگے سے آگیا تو مجھے اس کی بو نہیں آسکے گی۔ کیونکہ جنگل میں ہوا پیچھے سے آگے کی طرف چل رہی ہے۔'

میں خود بھی اس بک بک سے تنگ آگیا تھا۔ مگر مجبور تھا۔ میں نے کسی قدر بیزاری سے کہا۔

"تو پھر میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔"

کاویری نے میری طرف گھور کر دیکھا۔

"کیا تم مذاق اڑا رہے ہو؟ ہم بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ کیا تم اپنی بیوی کو لیے بغیر یہاں سے بھاگنا چاہتے ہو؟ میں عورت ہو کر نہیں گھبرا رہی اور تم مرد ہو کر ڈر رہے ہو۔"

میں نے فوراً" معذرت کا لہجہ اختیار کر لیا۔

"نہیں نہیں کاویری میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہم یہاں سے کسی دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔"

کاویری نے کوئی جواب نہ دیا اور گھوڑا آگے کی طرف چلا دیا۔ مجھے اپنے رویے پر بڑی ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ دن ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ بانس کا جنگل ختم ہوا تو کاویری رک گئی۔ سامنے کچھ فاصلے پر اونچے اونچے ناریل تاڑ اور دیودار کے درختوں کے جھنڈ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ کاویری ان درختوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"وہاں سے سنتھا ولی مٹھ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔"

میں نے ان درختوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا سنتھا ولی مٹھ ان درختوں کے اندر ہے؟"

وہ بولی۔ "ہاں۔"

وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بالکل ساکت ہو کر بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں سنتھا ولی مٹھ کے درختوں کے جھنڈوں پر لگی ہوئی تھیں۔ جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ کہنے لگی۔

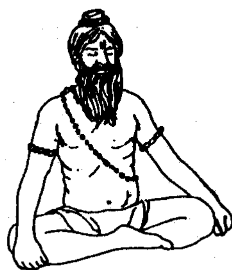
"ہم ایک خفیہ راستے سے سنتاولی مٹھ میں داخل ہوں گے۔"

"کیا یہ خفیہ راستہ پہرے دار سانپوں سے محفوظ ہوگا۔"

"کسی حد تک محفوظ ہوگا۔ لیکن ہمیں چوکس رہنا پڑے گا۔ چلے آؤ۔"

اور ہم نے گھوڑوں کو دور نظر آنے والے درختوں کے جھنڈوں کی طرف بڑھا دیا۔





آپ ضرور سوچتے ہوں گے کہ میں کیسی ناقابل یقین قسم کی داستان سنا رہا ہوں۔ مگر یقین کریں انڈیا کے جنگلوں میں اس سے بھی زیادہ ناقابل یقین واقعات ان ناگ مندروں میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ بعد میں تجربات نے ثابت کر دیا کہ جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا وہ آنے والے حیران کن واقعات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں کسی طلسمی ہیرے یا کسی خفیہ خزانے کی تلاش میں یہ مصیبتیں نہیں اٹھا رہا تھا۔ میں تو صرف اپنی بیوی کو واپس لانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا کر اس موت کے سفر پر نکلا ہوا تھا۔

سنتھا ولی مٹھ کے سرحدی درختوں کے جھنڈ قریب آ گئے تھے۔ یہاں جنگلی لوگوں کی بھی آبادی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ ہم ایک پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے۔ بادل گھرے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی وقت بھی بارش شروع ہو جائے گی۔ یہ پگڈنڈی درختوں کے جھنڈوں میں داخل ہوئی تو اچانک ایک زبردست پھنکار کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ سانپ آ گئے ہیں۔ پھنکار کی آواز پر گھوڑے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ کاویری میرے قریب آ گئی تھی۔ اس نے گھوڑے کی باگ کو کھینچ لیا۔ میرا گھوڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سامنے پگڈنڈی کے عین درمیان ایک سرخ اور سبز رنگ کا بہت بڑا سانپ زمین سے پانچ فٹ اوپر اٹھ کر پھن پھیلائے کھڑا تھا۔ کاویری اسے گھور کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر گھوڑا ڈر کر بار بار پاؤں اوپر اٹھا رہا تھا۔ میں نے جیب سے ریوالور نکال کر سانپ کے سر کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ چونکہ ریوالور کے آگے شائی سلینسر چڑھا ہوا تھا اس لیے دھماکے کی

آواز نہ آئی۔ مگر فائر کی آواز ضرور آئی۔ میرا نشانہ کمانڈو ٹریننگ کے دوران میں سب سے اچھا ہوا کرتا تھا۔ ریوالور سے نکلی ہوئی گولی نے سانپ کے سر کے پرخچے اڑا دیے۔
کاویری نے چونک کر میری طرف دیکھا۔
"یہ پستول تمہارے پاس کہاں سے آگیا؟"
میں نے کہا۔ "میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔ رانی کی مڑھی میں ایک بے ہوش ڈاکو کے پاس پڑا تھا۔ میں نے اٹھالیا۔ اس وقت یہ ریوالور بڑے کام آیا ہے۔"
کاویری بولی۔ "ہاں واقعی تم ٹھیک کہتے ہو۔ ورنہ یہ بڑا سانپ ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑتا۔"
میں نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ وہی دشمن سانپ تھا جو اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔
"نہیں جو سانپ میرا تعاقب کر رہا ہے اس کا رنگ سیاہ ہے اور اس کی گردن پر سرخ دھاریاں ہیں۔ تم بھی یاد رکھنا اگر تمہیں ایسا سانپ نظر پڑے تو اسے اسی طرح فوراً ہلاک کر دینا جس طرح تم نے اس سانپ کو مارا ہے۔ یہ سنتھا ولی مٹھ کا بڑا محافظ سانپ تھا۔
وہ درختوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔
"ہمیں دوسری طرف سے اس جنگل میں داخل ہونا چاہیے تھا۔ اس طرف آجاؤ۔"
ہم گھوڑوں پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے گھوڑے دوسری طرف بڑھا دیے۔ اب ہم جنگل کے اندر جانے کی بجائے جنگل کے کنارے کنارے جو درخت تھے' ان کے قریب سے ہو کر جنوب کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے کاویری سے پوچھا کہ جس خفیہ راستے کا اس نے ذکر کیا تھا' وہ کہاں ہے؟ کہنے لگی۔
"مشکل یہ ہے کہ وہ جنگل کے اندر جا کر ہے۔"
"اور سنتھا ولی کا مٹھ کہاں ہے؟ مجھے تو یہاں سوائے درختوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"
اس نے کہا۔ "اس جنگل کے وسط میں ایک پتھر کی چار دیواری ہے۔ سنتھا ولی مٹھ

اس چار دیواری کے اندر بنایا گیا ہے۔"
میں نے سوال کیا۔ "اس مٹھ میں کیا ہوتا ہے؟"
وہ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولی۔
"وہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ وہاں ایسی ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ تم سنو گے تو تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ اس پوتھی کو بند ہی رہنے دو۔"

میں نے فکر مند لہجے میں پوچھا۔ "میری بیوی کے ساتھ تو کوئی برا سلوک نہیں ہو رہا یہاں؟"

کاویری نے کہا۔ "وہ اس لیے بچی ہوئی ہے کہ اسے پجاری دیوگری نے اپنے لیے پسند کرلیا ہوا ہے اور یہاں اسے ناگ اتسو سے پہلے خاص رسم ادا کرنے کے لیے بھیجا ہے۔"
"وہ خاص رسم کیا ہو سکتی ہے؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
کاویری کہنے لگی۔
"میں یہ تمہیں نہیں بتاؤں گی۔ تم اتنا سمجھ لو کہ تمہاری بیوی جمیلہ یہاں زندہ حالت میں ہے اور ہم پوری کوشش کریں گے کہ اسے یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائیں۔"

میں دل میں خدا سے دعا مانگنے لگا کہ وہ نارمل حالت میں ہو۔ اتنا مجھے کاویری نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ناگ دیوی کے مندر میں جب پجاری دیوگری اسے لایا تھا تو اس کے جسم پر سانپ کو پھرا دیا جاتا تھا تاکہ سانپ اس کے جسم کی بو اپنے اندر جذب کرلے اور اگر جمیلہ فرار ہو جائے تو سانپ اس کی بو لیتا ہوا اس کے پیچھے نکل پڑے اور موقع پا کر اسے ڈس کر ہلاک کردے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں جمیلہ کو لے کر جیسے بھی ہوگا سرحد پار کر کے پاکستان چلا جاؤں گا۔ وہاں اول تو بھارت کا سانپ نہیں آسکے گا اگر آ بھی گیا تو میں اسے مار ڈالوں گا اور یوں قصہ ختم ہو جائے گا لیکن جمیلہ کو ناگ اتسو کے واسطے جس کسی خاص تپسیا اور رسومات میں سے گزارا جا رہا تھا اس کے بارے میں' میں اندر ہی اندر پریشان

تھا۔ کاویری کی مثال میرے سامنے تھی۔ اس لڑکی کے اندر سانپوں کے ماحول میں رہنے اور سانپ کے جسم پر ساری رات رینگنے کی وجہ سے زہر پیدا ہوگیا تھا اور وہ اپنی مرضی سے یہ زہر اپنی زبان کی نوک پر لا کر دوسرے کو ہلاک کر سکتی تھی۔ یہ سانپ ہی کی ایک صفت تھی جو اس میں پیدا ہوگئی تھی۔ اگر ایسی ہی کوئی چیز میری بیوی جمیلہ میں بھی پیدا ہوگئی تو یہ آگے چل کر میرے لیے مزید پریشانیاں پیدا کر سکتی تھی۔ عجیب عجیب قسم کے خیالات اور خدشے میرے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ ان میں کچھ توہمات بھی تھے اور کچھ حقیقتیں بھی تھیں جن کا مظاہرہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ چکا تھا۔

ایک جگہ تنگ سی گھاٹی جنگل کے اندر کو جاتی تھی۔

کاویری رک گئی۔ اس نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے باری باری اپنے چاروں طرف منہ کر کے گہرے سانس لیے۔ وہ اپنے دشمن سانپ کی بو کا سراغ لگا رہی تھی۔ میں نے بھی گھوڑا روک لیا تھا۔ کہنے لگی۔

"دشمن سانپ کو جتنا میں چالاک سمجھ رہی تھی وہ اس سے زیادہ چالاک ہے۔ کسی وقت اس کی ہلکی سی بو آتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا۔" میں نے پوچھا۔

کاویری نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ دشمن سانپ نے مجھے تلاش کر لیا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ مجھے بھی اس کی بو آ جائے گی۔ چنانچہ وہ مجھے دھوکہ میں مارنا چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے کسی تالاب یا ندی کے جوہڑ میں اس طرح اپنے آپ کو چھپا لیا ہے کہ صرف اس کی گردن پانی کی سطح سے باہر ہے۔ جس کی وجہ سے سانپ کی پوری بو مجھے نہیں آ رہی۔ لیکن میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔"

"تو پھر تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیونکہ اگر دشمن سانپ نے ہمیں غافل پا کر حملہ کر دیا تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔"

کاویری نے کہا۔

"ایک ہی ترکیب میرے ذہن میں آتی ہے اور وہ ترکیب یہ ہے کہ میں اپنا گھوڑا یہاں کسی درخت سے باندھ دیتی ہوں اور تمہارے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ کر آگے چلی جاتی ہوں۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا۔"

میرے اس سوال پر کاویری نے کہا۔

"جس گھوڑے پر میں سواری کرتی آ رہی ہوں' جس کی پیٹھ پر میں اتنی دیر سے بیٹھی رہی ہوں' اس گھوڑے کے بدن میں میرے جسم کی بو رچ بس گئی ہے۔ یہ بو اس گھوڑے کے بدن سے کم از کم آدھ گھنٹے تک نکلتی رہے گی۔ اس طرح دشمن سانپ اگر یہاں آ بھی گیا تو اسے گھوڑا ہی ملے گا میں نہیں ملوں گی۔"

جتنی دیر میں دشمن سانپ کو یہاں آ کر میری بو کا سراغ ملے گا اتنی دیر میں ہم سنتھا دلی مٹھ والی خفیہ غار میں داخل ہو چکے ہوں گے اور غار کے اندر سے میرے جسم کی بو بہت ہلکی ہو کر باہر نکلے گی۔ سانپ اتنی آسانی سے مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

اس کے ساتھ ہی کاویری گھوڑے پر سے اتر پڑی۔

اس نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا اور میرے گھوڑے پر میرے آگے بیٹھ گئی۔ اس نے گھوڑے کی باگیں تھام لیں۔ اسے آہستہ سے ایڑھ لگائی اور گھوڑا گھاٹی میں اتر گیا۔

گھاٹی میں جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ اس کے دونوں کنارے اونچے تھے۔ ہمارا گھوڑا جھاڑیوں میں چلتا جا رہا تھا۔ کافی آگے جا کر گھاٹی ختم ہو گئی اور ہم ہموار زمین پر آ گئے جہاں درخت ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہاں گھوڑا بالکل نہیں گزر سکتا تھا۔ کاویری نے کہا۔ "ہمیں یہ گھوڑا بھی یہاں چھوڑنا ہو گا۔"

ہم گھوڑے سے اتر پڑے۔ کاویری نے گھوڑے کو باندھنے کی بجائے کھلا چھوڑ دیا اور ہم درختوں کے درمیان اگی ہوئی جھاڑیوں اور اونچی گھاس میں ہاتھوں سے راستہ بناتے آگے چلنے لگے۔ کاویری کہنے لگی۔

"یہ علاقہ سنتھاولی مٹھ کی چار دیواری سے دور ہے اس طرف مٹھ کے محافظ سانپ نہیں آتے۔ اس لیے ہم بے فکر ہو کر چل سکتے ہیں۔"

جھاڑیوں میں راستہ بناتے اور رک رک کر چلتے آخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں درختوں کا گھنا پن کسی حد تک چھٹ گیا تھا اور کالے سیاہ رنگ کی ہیبت ناک چٹانیں زمین سے نکل کر ایک دوسری کے اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ کاویری یہاں دو قدم آگے جا کر ذرا جھک کر چٹانوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ میں تھک کر وہیں بیٹھ گیا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی مگر خاموش تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہاں پانی کہیں بھی نہیں ہے۔ کاویری ایک سیاہ چٹان کے پیچھے چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ پھر واپس نکل کر آئی اور مجھے اشارے سے بلایا۔ میں اٹھ کر اس کے پاس گیا تو وہ بولی۔

"مجھے خفیہ غار مل گیا ہے۔ یہ غار کافی لمبا ہے تم اس میں سے گزرتے ہوئے گھبراؤ گے تو نہیں؟ کیونکہ غار میں جالے بھی لٹک رہے ہوں گے کیڑے مکوڑے بھی ہوں گے اور اندھیرا بھی ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "کاویری! اگر تم عورت ہو کر اس اندھیرے غار میں سے گزر سکتی ہو تو میں کیوں نہیں جا سکتا؟"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

"آ جاؤ۔"

غار کا دہانہ چٹان کی دوسری طرف تھا جس کو جنگلی جھاڑیوں کی بڑے بڑے پتوں والی شاخوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ کاویری نے جھاڑیوں کو پرے ہٹایا تو مجھے ایک اندھیرا شگاف نظر آیا۔ کاویری اس اندھیرے شگاف میں داخل ہوگئی۔ میں بھی اللہ کا نام لے کر اس کے پیچھے شگاف میں داخل ہوگیا۔ غار میں گھپ اندھیرا تھا اور عجیب ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ کاویری اس غار میں پہلے بھی آ چکی ہے۔ وہ میرے آگے تھے۔ کہنے لگی۔

"ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

میں نے کہا۔ "بالکل نہیں۔"

غار کی چھت اونچی ہی ہوگی کیونکہ ہمارے سر اس کے ساتھ نہیں لگ رہے تھے۔ جالے ضرور منہ کے آگے آتے جن کو میں ہاتھوں سے پرے ہٹا دیتا۔ زمین پر بجری سی بچھی ہوئی تھی۔ میں نے دونوں بازو پھیلائے تو ایک طرف میرا ہاتھ دیوار سے لگ گیا۔ دوسری طرف ہاتھ دیوار سے نہ لگا۔ میں دیوار پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ ایک دو بار میں کاویری سے ٹکرا گیا تو اس نے کہا کہ اتنی جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غار میں کوئی گڑھا وغیرہ نہیں ہے۔ میں یہاں سے دو تین بار گزر چکی ہوں۔ میں نے جوگر بوٹ پہن رکھے تھے۔ مجھے کیڑے مکوڑوں کا زیادہ ڈر نہیں تھا۔ خطرہ تھا تو صرف یہ کہ کسی طرف سے کوئی سانپ نہ نکل آئے۔ جب میں نے کاویری سے اس خطرے کا ذکر کیا تو وہ بولی۔

"اس غار میں سانپ نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہاں سے نکلنے والی زمین کی کڑوی بو ہے۔ سانپ اس بو سے گھبراتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "پھر تو تمہارا دشمن کالا سانپ بھی اس غار میں نہیں آئے گا۔"

وہ بولی۔ "تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ اس لیے میں نے سوچ رکھا ہے کہ ہم اس غار کے دوسرے منہ کے پاس جا کر اپنا ٹھکانہ بنائیں گے۔"

"کیا مطلب تمہارا یعنی اس غار میں رہنا پڑے گا؟"

میں نے مایوسی کے انداز میں پوچھا۔

کاویری نے کہا۔

"تو اور کیا' تمہارا خیال ہے کہ ہم سیدھے سنتھا ولی مٹھ میں جائیں گے اور تمہاری بیوی بالکل تنہا بیٹھی ہوگی اور ہم اسے لے کر واپس چلے جائیں گے؟ تمہاری بیوی نہ صرف محافظ سانپوں بلکہ مٹھ کے ہٹے کٹے پجاریوں کے پہرے میں ہوگی۔ اسے یہاں سے نکالنے کے لیے مجھے بڑی عقل اور کسی ترکیب سے کام لینا پڑے گا۔"

میں نے یہی سوچ لیا تھا کہ ریوالور میرے پاس ہے۔ اس میں ابھی گیارہ بارہ گولیاں تو

ضرور بھری ہوئی ہوں گی۔ کوئی صورت نظر نہ آئی تو میں فائرنگ کر کے چھ سات پجاریوں کو ڈھیر کر دوں گا اور جمیلہ کو نکال کر لے جاؤں گا۔ چھ سات پجاریوں کی لاشیں گریں تو باقی سب بھاگ جائیں گے۔ ڈر صرف ان زہریلے سانپوں کا تھا جو بقول کاویری کے میری بیوی کی نگرانی کر رہے تھے۔ کیونکہ اس جگہ میری بیوی ناگ پوجا کرنے والوں کی خاص رسم کے مرحلے میں سے گزر رہی تھی۔ لیکن میری بیوی کی محبت اور اسے ان شیطانوں کے جہنم سے نکال لے جانے کا جذبہ اس قدر طاقتور تھا کہ مجھے سانپوں کی بھی زیادہ پروا نہیں تھی۔ یہ خیال ضرور تھا کہ کہیں کوئی سانپ جمیلہ کو نہ ڈس لے۔

ہم غار کے اندر گھپ اندھیرے میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ایک دوسرے کے پیچھے باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ اندھیرا اتنا سیاہ تھا کہ نہ کاویری مجھے نظر آ رہی تھی اور نہ میں اسے نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد کاویری نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے کندھے پر رکھ لیا اور کہا۔

"اس طرح تمہیں چلنے میں آسانی رہے گی۔"

غار شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ مجھے سانس لینے میں بھی اس طرح دشواری پیش آ رہی تھی کہ کھینچ کھینچ کر سانس لینا پڑتا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ غار کی فضا انتہائی بوجھل اور مرطوب تھی۔ آخر خدا خدا کر کے مجھے دور روشنی کا ایک نقطہ دکھائی دیا۔ میں نے کاویری سے کہا۔

"شاید غار کا دوسرا سرا آ گیا ہے۔"

روشنی کا نقطہ اس نے بھی دیکھ لیا تھا۔

"ہاں ہم غار کے دوسرے سرے پر پہنچنے والے ہیں۔"

روشنی کا نقطہ آہستہ آہستہ پھیلتا چلا گیا۔ پھر مجھے کاویری کا سر اور اس کے بدن کا خاکہ اندھیرے میں ابھرتا دکھائی دیا۔ فضا میں بھی تازہ ہوا شامل ہونے لگی تھی۔ ہم غار کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ کاویری کے کندھے سے میں نے ہاتھ اٹھا لیا۔ غار کا دہانہ زیادہ فراخ نہیں تھا۔ یہاں بھی غار کے منہ کو آدھے کے قریب جنگلی جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا

تھا۔ دن کافی ڈھل چکا تھا اور بادلوں کی وجہ سے باہر زیادہ روشنی تھی۔ کاویری غار کے دہانے کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ میں بھی بیٹھ گیا' وہ باہر دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"ہمیں جنگل میں شام کا اندھیرا پھیل جانے کا انتظار کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا۔

"کیا تم اکیلی جاؤ گی؟"

وہ بولی۔

"تو کیا تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی۔ تم تو بڑی آسانی سے کسی سانپ کا شکار بن جاؤ گے۔ مجھے تو محافظ سانپوں کی بُو خبردار کر دے گی۔"

مَیں مزید سوال کرنے لگا تو کاویری نے کہا۔

"تمہیں کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب میں جاؤں تو تم خاموشی سے یہاں بیٹھے رہنا۔ اِس طرف کوئی محافظ سانپ نہیں آئے گا۔ ہاں غار سے باہر نکلے تو ضرور کوئی نہ کوئی سانپ تمہیں ڈس لے گا۔"

مَیں نے کہا۔

"مَیں تمہارے کہنے پر پورا عمل کروں گا لیکن یہ تو بتاؤ کہ سنتھاولی کا مٹھ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"زیادہ دور نہیں ہے۔ بیچ میں راون کا مرگھٹ آتا ہے۔ اس کے آگے سنتھاولی مٹھ کی چار دیواری شروع ہو جاتی ہے۔"

"میری بیوی یہیں ہوگی ناں؟"

میں نے بڑے جذباتی لہجے میں پوچھا۔ وہ بولی۔

"تم فکر کیوں کرتے ہو؟ تمہاری بیوی یہیں ہے۔ میں اس کا پورا پتہ لگا کر آؤں گی کہ ناگ اتسو کے لیے اسے ناگ کے پجاریوں نے کہاں رکھا ہُوا ہے۔"

میں نے اس سے راون کے مرگھٹ کے بارے میں پوچھا کہ کیا راون راجہ کو اسی

مرگھٹ میں جلایا گیا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"نہیں۔ راون تو لنکا کا راجہ تھا۔ وہ سیتا میّا کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ رام چندر جی نے لنکا پر چڑھائی کر کے راون کو مار دیا تھا اور سیتا میا کو چھڑا کر لے آئے تھے۔ اس جگہ کسی زمانے میں لوگ راون کا پتلا بنا کر جلایا کرتے تھے۔ اس وجہ سے اس کا نام راون کا مرگھٹ پڑ گیا۔ راون کے پتلے کو چبوترے پر لٹا کر اس کی چتا بنائی جاتی تھی۔"

اسی طرح باتیں کرتے کرتے باہر اندھیرا ہونے لگا۔

کاویری اٹھتے ہوئے بولی۔

"اب میں چلتی ہوں' تم غار کے اندر ہی بیٹھے رہنا۔ غار کے اندر اس کی خاص بو کی وجہ سے کوئی سانپ وغیرہ اس طرف کا رخ نہیں کرتا۔ یاد رکھنا باہر سنتھا ولی کے محافظ سانپ موجود ہیں۔ اگر تم باہر نکلے انہیں تمہارے جسم کی اجنبی بو فورا" آ جائے گی اور وہ تمہیں اسی وقت ڈس کر ہلاک کر دیں گے۔ اس لیے جب تک میں نہ آؤں تم غار سے باہر مت نکلنا۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو بڑی پیاس لگ رہی ہے۔"

وہ کہنے لگی۔ "پیاس تو مجھے بھی لگی ہے۔"

وہ سوچنے لگی۔ پھر کہا۔

"تم ٹھہرو مجھے یاد ہے یہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر شریفے کے جنگلی درخت ہیں اور پانی کا ایک جھرنا بھی ہے۔ میں وہاں سے پانی پی کر تمہارے لیے بھی لاتی ہوں۔ تم باہر مت نکلنا۔"

وہ چلی گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ غار کے دہانے سے نکل کر فورا" ایک طرف مڑ گئی تھی۔ میں غار کے منہ سے کوئی دو قدم پیچھے ہٹ کر بیٹھا تھا۔ باہر شام کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ باہر جنگل کے درخت ایک دوسرے کے اوپر چڑھتے ہوئے لگتے تھے اور رات کے بڑھتے پھیلتے اندھیرے بھی تاریک ہوتے جا رہے تھے۔ تعجب کی بات ہے کہ ان درختوں

پر سے کسی پرندے کے بولنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ عجیب طرح کے آسیبی درخت تھے۔ جنگل پر قبرستانوں والا آسیبی سکوت طاری تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میری بیوی جمیلہ کو تو یہاں بڑا ڈر لگ رہا ہوگا۔ اس کو اس قسم کے آسیبی ماحول میں رہنے کی بھلا کہاں عادت تھی۔ اپنی بیوی جمیلہ کے خیال سے میرا دل بھر آیا۔

اولاد کی محبت' بیوی کی محبت' بہن بھائیوں اور ماں باپ کی محبت یہ انسان کی بڑی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ لاکھ اختلاف ہوں آپس میں لاکھ لڑائی جھگڑے ہوں لیکن یہ محبتیں کبھی کم نہیں ہوتیں اور مصیبت کا وقت پڑنے پر یہی یاد آتے ہیں۔ میں فوجی آدمی ہوں اور فوج میں بھی کمانڈو فورس میں رہ چکا تھا۔ پکا کمانڈو تھا' سخت جان تھا' جسم بھی مضبوط تھا۔ روح بھی مضبوط تھی لیکن جمیلہ کو یاد کر کے میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔ میں نے اتنا ضرور کیا کہ فوراً اپنے جذبات پر قابو پالیا اور آنسوؤں کو آنکھوں سے باہر نہیں آنے دیا۔

کاویری واپس آگئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کچھ پکڑ رکھا تھا۔ اندھیرے میں دور سے کچھ پتہ نہ چلا۔ قریب آئی تو معلوم ہوا کہ اس نے کیلے کے ایک بڑے پتے کا کٹورا سا بنا کر اس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"تم پانی پیئو' میں تمہارے لیے جنگلی شریفے اور کیلے لاتی ہوں۔"

پتے کا کٹورا میرے ہاتھ میں دے کر وہ دوبارہ واپس چلی گئی۔ میں نے پانی پیا تو مجھے ہوش سا آگیا۔ حلق واقعی خشک ہو رہا تھا۔ اس بار کاویری واپس آئی تو اپنی ساڑھی کی جھولی میں جنگلی شریفے ڈال رکھے تھے زرد جنگلی کیلوں کا ایک گچھا اس کے ہاتھ میں تھا۔ کہنے لگی۔

"تم اپنی بھوک مٹاؤ میں نے وہیں تھوڑا بہت کھا کر پانی پی لیا تھا۔ باقی جو کچھ بچے رکھ لینا۔ ہو سکتا ہے ہمیں دو ایک روز اسی غار میں رہنا پڑے۔ میں جاتی ہوں میری نصیحت یاد رکھنا۔ غار سے باہر قدم مت نکالنا۔"

یہ کہہ کر وہ غار سے نکل کر رات کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

میں شریفے اور کیلے کھانے لگا۔ کیلے چھوٹے چھوٹے تھے۔ ان میں ہری چھیل کے

کیلوں والی خوشبوں نہیں تھی میٹھے ضرور تھے۔ شریفے بھی تھوڑے کھٹ مٹھے تھے مگر اس وقت یہ بڑی نعمت معلوم ہو رہے تھے۔ میں غار کے دہانے سے تھوڑا پیچھے ہو کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کاویری واپس آ جائے گی؟ اگر وہ کسی مصیبت میں پھنس گئی تو میرے لیے مشکل پیدا ہو جائے گی۔ جمیلہ مجھ سے اور دور ہو جائے گی۔ میں ریوالور سے مٹھ کے پجاریوں کو تو ختم کر لوں گا لیکن یہاں جو زہریلے سانپ انہوں نے چھوڑ رکھے ہیں ان کا مقابلہ کیسے کر سکوں گا۔

رات کا اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا۔ جنگل کی خاموشی اور زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ اس بات کا مجھے اطمینان تھا کہ غار میں کوئی سانپ باہر سے نہیں آئے گا۔ لیکن مچھر اور چیونٹیاں مجھے تنگ کرنے لگی تھیں۔ میں بار بار جگہ بدلتا اور مچھروں کو ہاتھوں سے ادھر ادھر ہٹا دیتا۔ آسمان پر بادل ضرور تھے مگر نہ ہوا چل رہی تھی' نہ ابھی بارش ہی شروع ہوئی تھی۔ وقت کا کچھ اندازہ نہیں رہا تھا۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ بس جاگتا رہا۔ مچھروں کو مارتا رہا۔ چیونٹیوں کو مسلتا رہا اور رات گزرتی چلی گئی۔ کاویری کو گئے میرے اندازے کے مطابق دو ڈھائی گھنٹے ہو گئے تھے۔ غار کے دہانے کی تاریکی جنگل کی تاریکی میں گھل مل گئی تھی۔ کچھ معلوم نہیں ہو تا تھا کہ غار کا دہانہ کہاں ختم ہوتا ہے اور جنگل کا اندھیرا کہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ ایک دو بار مچھروں نے زیادہ تنگ کیا تو بے اختیار جی چاہا کہ غار سے باہر نکل جاؤں۔ کم از کم باہر کھلی فضا تو ہو گی۔ پھر خیال آتا کہ کاویری نے منع کیا ہوا ہے۔ کہیں سچ مچ کسی طرف سے کوئی سانپ نکل کر حملہ نہ کر دے۔

رات یقیناً" آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی کہ مجھے باہر پتوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سانس روک کر غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں کوئی شے حرکت کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کون ہو؟"

ریوالور میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دوسری طرف سے کاویری کی آواز آئی۔

"میں ہوں۔ کاویری۔"

میں نے ریوالور جیب میں رکھ لیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ جلدی سے پوچھا۔ "میری بیوی کا کچھ پتہ چلا؟ تم اس سے ملی ہو؟"

کاویری میرے قریب بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"ذرا سانس لینے دو۔ سب کچھ بتاتی ہوں۔"

لگتا تھا کہ وہ بہت سی معلومات حاصل کر کے آئی ہے۔ دل میں دعا مانگنے لگا کہ یا خدا یہ کوئی خیر کی خبر لائی ہو۔ کاویری کہنے لگی۔

"تمہاری بیوی زندہ ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"وہ کہاں ہے؟ مجھے بتاؤ وہ جہاں بھی ہو گی میں اسے وہاں سے نکال کر لے آؤں گا۔"

کاویری کے چہرے پر کچھ فکر و پریشانی کے اثرات تھے۔ کہنے لگی۔

"وہ جہاں پر ہے تم آسانی سے وہاں نہیں پہنچ سکو گے؟"

"کیوں نہیں پہنچ سکوں گا۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے بتاؤ تو سہی میں اسے تلواروں کی چھاؤں سے نکال کر لے آؤں گا۔"

کاویری میرے پاس بیٹھ گئی تھی۔ غار کے باہر جنگل میں ابھی تک تاریکی تھی۔ مجھے اس کے جسم کا دھندلا خاکہ ہی نظر آ رہا تھا۔ گہری سانس لے کر کہنے لگی۔

"سنتھا ولی مٹھ کے پجاری سپیروں نے تمہاری بیوی پر باگ استو کا چلہ پورا کر دیا ہے۔"

"پورا کر دیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ میری بیوی زندہ تو ہے میں دن نکلنے سے پہلے اسے وہاں سے نکال لاؤں گا۔ میرے پاس بھرا ہوا ریوالور ہے۔ یہ پجاری سپیرے میرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ میں پہرہ دینے والے سانپوں سے بھی نمٹ لوں گا۔"

کاویری اندھیرے میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ چپ تھی۔ مجھے کاویری کے اس انداز کو دیکھ کر بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"کاویری تم مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں کہ اصل بات کیا ہے؟"

تب مجھے کاویری نے اصل مصیبت بتاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بیوی زندہ ضرور ہے مگر اس کے اندر ناگ اتسو کی رسمیں پوری کرنے کے بعد ناگن کی ساری خصلتیں پیدا ہو گئی ہیں۔"

میرا جسم خوف اور تشویش سے جیسے سرد پڑنے لگا۔ میں اندھیرے میں کاویری کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ میری بیوی میں ناگن کی خصلتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ میں نے پوچھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ بولی۔

"کرم داد! تمہیں یہ بتاتے ہوئے مجھے بڑا دکھ محسوس ہو رہا ہے کہ تمہاری بیوی آدھی ناگن بن چکی ہے۔ ابھی اس میں یہ قابلیت پیدا نہیں ہوئی کہ عورت سے ناگن بن جائے لیکن جو پر اسرار منتر اس پر پھونکے گئے ہیں اور پجاری سپیروں نے اس پر جو ناگ جادو کیا ہے اس کے اثر سے شاید کچھ وقت گزرنے پر تمہاری بیوی میں عورت سے ناگن سانپ بن جانے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔"

میں رات کے اندھیرے میں بت بنا کاویری کی حیرت انگیز اور یقین میں نہ آنے والی باتیں سن رہا تھا۔ کسی وقت لگتا کہ یہ سچ کہہ رہی ہے۔ کسی وقت محسوس ہوتا کہ یہ فضول باتیں ہیں۔ جمیلہ مسلمان ہے اور ایک مسلمان پر ان توہمات اور جادوگریوں کا کبھی اثر نہیں ہو سکتا۔ میں نے کاویری کے بیان کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کاویری! میں مسلمان ہوں اور مسلمان اس قسم کے توہمات پر کبھی یقین نہیں کر سکتا۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ میری بیوی سنتھا ولی مٹھ میں کس جگہ پر ہے باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گا۔"

کاویری بولی۔

"میں نے تمہیں بتا بھی دیا تو تم کیسے وہاں پہنچو گے؟ راستے میں قدم قدم پر بے حد

زہریلے سانپ پہرہ دے رہے ہیں۔ وہ تمہیں راستے میں ہی ڈس کر ہلاک کر دیں گے۔"
میں نے کاویری کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور منت سماجت کے لہجے میں کہا۔

"کاویری! تمہیں اپنے بھگوان کی قسم ہے۔ مجھے میری بیوی کے بارے میں بتادو کہ وہ مٹھ میں کس جگہ پر ہے۔ یقین کرو سانپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ میں جمیلہ کو نکال کر زندہ سلامت واپس آجاؤں گا۔"
کاویری سوچ میں پڑ گئی۔ کہنے لگی۔
"کرم داد! تم اپنی بیوی کو واپس لاکر ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ اس پر جو پر اسرار اور خونی منتر پھونکے گئے ہیں اور شیش ناگ کے جس چلے میں سے اسے گزارا گیا ہے اس کے بعد تمہاری بیوی ناگ دیوتا کی خاص ناگ داسی بن چکی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی یادداشت بھی غائب ہو گئی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں بالکل نہ پہچانے۔ اس کے باوجود اگر تم اسے کسی طرح نکال کر اپنے ساتھ لے بھی گئے تو سنتھاولی مٹھ کا بڑا پجاری سپیرا خود اس کی کھوج میں نکل پڑے گا کیونکہ مٹھ کی خاص ناگ داسی کا فرار ہو جانا ناگ دیوتا کی بہت بڑی توہین ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اپنی بیوی کو نکال کر لے جاؤ تو تمہاری بیوی موقع پا کر خود ہی سنتھاولی مٹھ میں واپس آجائے۔ اگر وہ خود واپس نہ آئی تو پجاری سپیرا سیاہ ناگ کے ساتھ خود اس کی تلاش میں نکل پڑے گا۔ پجاری سپیرے کو اور اس کے سیاہ ناگ کو تمہاری بیوی کی بو آجائے گی۔ تمہاری بیوی جہاں کہیں بھی ہو گی پجاری سپیرا وہاں پہنچ جائے گا اور تمہاری بیوی کو قابو کر کے واپس لے آئے گا۔ اگر تم نے مزاحمت کی تو وہ اپنے سیاہ ناگ سے ڈسوا کر تمہیں بھی ہلاک کر دے گا۔"
یہ باتیں مجھے ہزاروں برس پہلے کے جنگلی انسانوں کی باتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ کاویری جو کچھ بیان کر رہی تھی مجھے اس پر ذرا سا بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ میرے سامنے صرف ایک ہی خیال تھا میری بیوی زندہ ہے۔ وہ شیطان اور بدمعاش لوگوں کے قبضے میں ہے اور مجھے ہر حالت میں اسے ان بدمعاش لوگوں کے چنگل سے چھڑانا ہے۔ کاویری جب

اپنی رام کتھا سنا چکی تو میں نے بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"کاویری! اگر تمہیں مجھ سے اور میری بیوی سے تھوڑی بہت بھی ہمدردی ہے اور تم واقعی میری مدد کرنا چاہتی ہو تو اپنے بھگوان کے لیے مجھے صرف اتنا بتا دو کہ میری بیوی جمیلہ کو سنتھا ولی مٹھ کے بدمعاشوں نے کہاں قید میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ پھر میں جانوں اور میرا کام۔"

کاویری نے اب میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بڑی دردمندی کے ساتھ بولی۔

"یہ تمہاری ہمدردی اور تمہیں تمہاری بیوی کے ساتھ ملانے کا خیال ہی تھا جو مجھے یہاں کھینچ کر لے آیا ہے۔ ورنہ میں دیوگری کے مندر سے فرار ہو کر جھانسی بھوپال کی طرف بھی جا سکتی تھی۔ میں جو کچھ تمہیں کہہ رہی ہوں اس پر یقین کرو۔ اگر تمہاری بیوی کو وہاں سے نکالنا آسان ہوتا تو میں اسے اپنے ساتھ ہی لے کر آتی۔"

یہ بات بھی میرے پیش نظر تھی کہ کاویری کو اپنی جان کا خطرہ بھی لگا ہوا ہے۔ ناگ دیوی کے مندر کا ایک موذی سانپ اس کو ہلاک کرنے کے لیے برابر اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس طرح کاویری کی توجہ دو طرف بٹ چکی تھی۔ ایک تو وہ میری بیوی کو مشکل سے نکالنا چاہتی تھی' دوسرے اسے اپنی جان کی بھی فکر تھی۔ اس کے پیچھے لگا ہوا سانپ کسی بھی وقت جنگل میں اسے ڈس کر ہلاک کر سکتا تھا۔ وہ مجھے بتا چکی تھی کہ اس کا دشمن سانپ اس کے قریب قریب پہنچ گیا ہے۔ اس نے سانپ کی بو محسوس کر لی تھی۔ اس کے باوجود یہ دلیر عورت میرے لیے وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ ورنہ وہ بڑی آسانی سے بھارت کے کسی بھی شہر' کسی بھی صوبے کی طرف فرار ہو سکتی تھی۔

کاویری نے مجھے اتنا بتا دیا تھا کہ میری بیوی سنتھا ولی مٹھ کے تہہ خانے میں بند ہے اور مٹھ کے پجاری سپیرے اور ان کے سانپ اس پر پہرہ دے رہے ہیں۔ میں ان سپیروں سے تو نمٹ سکتا تھا مگر سانپوں کا مقابلہ کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ ایک دو سانپ ہوتے تو میں انہیں ختم کر دیتا مگر یہاں تو بقول کاویری کے زہریلے سانپ کیڑے مکوڑوں کی طرح چل پھر رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان سانپوں سے بچ کر میں اپنی بیوی

کے تہہ خانے تک کیسے پہنچوں گا اور پھر وہاں سے اپنی بیوی کو نکال کر سانپوں سے بچاتے ہوئے کیسے واپس آؤں گا۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے مجھے کاویری کی راہنمائی کی سخت ضرورت تھی۔ میں نے بے بسی کے ساتھ کہا۔

"تو پھر تم مجھے کیا مشورہ دیتی ہو؟ کیا تم اسے کسی طرح نکال کر یہاں تک نہیں سکتیں؟"

اس نے کہا۔

"میں خود اسی سوچ میں ہوں۔ آج کا دن گزر جائے۔ رات کا اندھیرا ہوتے ہی میں دوبارہ سنتھا ولی مٹھ کی طرف جاؤں گی اور اس بات کا جائزہ لوں گی کہ میں تمہاری بیوی کو وہاں سے کس طرف سے اور کس طریقے سے نکال سکتی ہوں؟"

وہ دن ہم نے غار میں بیٹھ کر ہی گزار دیا۔ آسمان اسی طرح ابر آلود تھا مگر بارش نہیں ہوئی تھی۔ اس دوران کاویری فضا کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد سونگھ لیتی تھی۔ کہنے لگی۔

"کسی وقت مجھے اپنے دشمن سانپ کی بو آتی ہے اور کسی وقت دور ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دشمن سانپ یہاں سنتھا ولی مٹھ کے سانپوں کی وجہ سے جنگل میں آگے بڑھتے ہوئے گھبرا رہا ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

کاویری نے جواب میں کہا۔

"سنتھا ولی مٹھ کے سانپ بڑے زہریلے اور غصیلے سانپ ہیں۔ باہر سے کوئی بھی سانپ آ جائے وہ اس پر ضرور حملہ کر دیتے ہیں۔ شاید اسی خیال سے میرا دشمن سانپ یہاں تک آتے ہوئے ہچکچا رہا ہے۔ مگر اتنا مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ اسی جنگل میں ہے اور اس انتظار میں ہے کہ میں اسے کہیں نظر آ جاؤں اور وہ وہیں مجھے ڈس کر ہلاک کر دے۔"

جب شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا اور جنگل میں بادلوں اور درختوں کے گنجان ہونے کی وجہ سے رات ہونے سے پہلے ہی رات کی تاریکی چھا گئی تو کاویری میری بیوی کے فرار کا جائزہ

لینے کے لیے سنتھا ولی مٹھ کی طرف چل دی۔ جانے سے پہلے میں نے اسے کہا۔

"کاویری! دشمن سانپ سے ہوشیار رہ کر جانا اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ اگر میرے دشمن سانپ کو میری بو آ جاتی ہے تو مجھے بھی اس کی بو آ جاتی ہے وہ اتنی آسانی سے مجھے اپنا شکار نہیں بنا سکے گا۔"

کاویری چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد مجھے بار بار یہی خیال آنے لگا کہ دشمن سانپ جنگل میں موجود ہے کہیں وہ کاویری کو غافل پا کر ڈس نہ لے۔ اگر ایسا ہوگیا تو مجھے تو کچھ پتہ نہیں ہے کہ سنتھا ولی مٹھ کس جگہ پر ہے اور شیطان صفت پجاری سپیروں نے میری بیوی کو جس جگہ قید کر رکھا ہے میں وہاں تک کس طرح پہنچوں گا۔

میں خود اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اس کے پیچھے جا سکتا۔ جس غار میں ہم نے پناہ لے رکھی تھی وہاں سے لے کر سنتھا ولی کے مٹھ تک زہریلے سانپوں کی حکومت تھی۔ کاویری تو پھر سانپوں کی بو پا کر ان سے بچاؤ کا کوئی طریقہ اختیار کر سکتی تھی۔ لیکن میرے لیے ان سے بچنا مشکل تھا۔ اس کے باوجود یہ اس بہادر عورت کی ہمت تھی کہ وہ محض میرے اور میری بیوی کے ساتھ انسانی ہمدردی کی وجہ سے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے ہوئے تھی۔

میں انہی خیالات میں الجھا رہا اور گزری ہوئی رات کی طرح وہ رات بھی آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ وقت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ مچھر اور چیونٹیاں حملہ آور ہو رہی تھیں اور میں ان کا مقابلہ بھی کر رہا تھا اور جنگل کی خاموشی پر کان بھی لگا رکھے تھے کہ کب کاویری کے آنے کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ کافی وقت گزر گیا۔ کاویری نہ آئی۔ میں غار میں اٹھ کر کبھی اس طرف ہو جاتا کبھی دوسری طرف ہو کر بیٹھ جاتا۔ آگ جلا کر دھواں بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مچھروں سے جان چھوٹے' کاویری نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا ہوا تھا۔

دھوئیں کی بو پجاری سپیروں تک جا سکتی تھی اور وہ یہ معلوم کرنے وہاں آسکتے تھے کہ علاقے میں آگ کس نے جلائی ہے اور ہمارا بھید کھل سکتا تھا۔ جنگل پر ایک بار پھر رات کی گہری خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ اس خاموشی میں کسی کسی وقت سیٹی کی باریک سی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ کاویری نے مجھے بتایا تھا کہ یہ جنگل میں پہرہ دینے والے محافظ سانپوں کی آواز ہے۔ اس آواز کو سن کر میرے جسم میں خوف کی سرد لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ سانپ انسان کا ایسا دشمن ہے کہ جس کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب کس طرف سے آکر اچانک حملہ کر دے اور اس جنگل کے سانپ ایسے زہریلے تھے کہ بقول کاویری کے جس کو ڈس لیں اس کی اسی وقت موت واقع ہو جاتی ہے۔

آخر مجھے جنگل کی خاموشی میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں آنکھیں پھاڑ کر جنگل کے اندھیرے میں دیکھنے لگا۔ تاریکی میں سے ایک سایہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سایہ قریب آیا تو میں نے کاویری کو پہچان لیا۔ اس کا سانس کچھ پھولا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"ایک سانپ نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔"

"کیا وہ تمہارا دشمن سانپ تھا؟"

"نہیں۔" کاویری نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی بو میرے دشمن سانپ کی نہیں تھی۔ وہ سنتھا ولی کا محافظ سانپ ہی تھا۔ عین وقت پر مجھے اس کی بو آگئی اور میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔"

جب اس کا سانس ٹھیک ہو گیا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ سنتھا ولی مٹھ کا پورا جائزہ لے آئی ہے۔

"جمیلہ ابھی تک اسی تہہ خانے میں قید ہے۔ قید نہیں کہنا چاہیے کیونکہ ناگ یگیہ کی رسمیں ادا ہو چکنے کے بعد اس کی اپنی آدھی شخصیت ختم ہو گئی ہوگی اور اب اس کے دل میں وہاں سے فرار ہو جانے کا خیال نہیں آتا ہوگا۔ کچھ ناگ دیوی کے پجاریوں نے جمیلہ کو سانپ سے ساری رات ڈسوا ڈسوا کر اس کے خون میں سانپ کی خصوصیات پیدا کر دی

تھیں' باقی کی کسر سنتھا ولی مٹھ کے پجاری سپیروں نے اس بے چاری پر سانپوں کے خفیہ منتر پھونک کر اس کو سانپوں کے چلے کے مراحل سے گزار کر پوری کر دی۔ بہرحال چونکہ تم ہر حالت میں اپنی بیوی کو یہاں سے نکال کر ساتھ لے جانا چاہتے ہو اس لیے ہم اسے نکالنے کی پوری کوشش کریں گے۔"

میں نے پوچھا۔

"تم نے وہاں سے جمیلہ کو نکال لانے کی کوئی ترکیب بھی سوچی ہے؟ تم تو ساری جگہ خود دیکھ کر آئی ہو۔"

وہ کہنے لگی۔

"سنتھا ولی مٹھ کے پیچھے ایک گہری کھائی ہے۔ میں نے اس کھائی میں اتر کر دیکھا ہے' یہ زیادہ گہری نہیں ہے۔ یہ کھائی آگے جا کر ایک نہر کے کنارے پر نکل آتی ہے۔ نہر وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ جمیلہ کو تہہ خانے سے نکالنے کی صورت میں ہمیں اسی کھائی سے گزر کر نہر پر آنا ہو گا۔ یہی راستہ مجھے سب سے زیادہ محفوظ لگتا ہے۔ کیونکہ کھائی میں سے گزرتے ہوئے مجھے کسی سانپ کی بو نہیں آئی۔ نہر زیادہ بڑی نہیں ہے۔ پچھم کی طرف نہر کے پار جٹا دھاریوں کا چھ کوس کا جنگل ہے۔ اس جنگل کے آگے ڈھایا گڑھ کا ریلوے سٹیشن آتا ہے۔ ایک بار ہم وہاں تک پہنچ گئے تو سنتھا ولی مٹھ کے سانپوں اور پجاری سپیروں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ ہاں تمہاری بیوی کے فرار کا جب ان لوگوں کو پتہ چلے گا تو پجاری سپیرا اس کی تلاش میں نکل پڑے گا۔ پھر صرف اسی ایک سپیرے اور اس کے سانپوں کا خطرہ ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"ہم جمیلہ کو مٹھ کے تہہ خانے سے نکالیں گے کیسے؟"

کاویری نے کہا۔

"اس کی صرف ایک ہی صورت ہے تم میرے ساتھ چلو گے اور جہاں میں تمہیں چھپنے کو کہوں تم وہاں چھپ کر میری واپسی کا انتظار کرو گے۔ بھگوان نے چاہا تو میں تمہاری

بیوی کو ساتھ ہی لے کر آؤں گی۔"

میں نے کہا۔

"کیا ہم ابھی نہ مہم پر نکل چلیں؟"

کاویری بولی۔

"یہ کام ہمیں آج رات ہی کرنا ہو گا مگر ابھی نہیں۔ میں ادھر دیکھ کر آئی ہوں۔ ابھی وہاں پجاری سپیرے بھجن کیرتن کر رہے ہیں۔ ان کا بھجن کیرتن جو وہ سانپوں کے آگے کرتے ہیں آدھی رات تک جاری رہے گا۔ ہم رات کے پچھلے پہر یہاں سے نکلیں گے۔"

کاویری کو وقت کا اندازہ تھا۔ وہ سنتھا ولی مٹھ میں پجاری سپیروں کو سانپوں کے آگے بھجن کیرتن کرتے دیکھ آئی تھی۔ کم از کم اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ ان کا بھجن کیرتن کس وقت ختم ہو گا۔ سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم غار کے دہانے کے قریب اندر کی طرف بیٹھے رہے۔ کسی وقت مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ کاویری مٹھ کے تہہ خانے میں سے میری بیوی کو نکال لائے گی۔ وہاں کے جو حالات اس نے بتائے تھے وہ بڑے خطرناک تھے۔ جب میں نے کاویری کے آگے اس بارے میں شک شبہے کا اظہار کیا تو اس نے فوراً کوئی جواب نہ دیا۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"بھگوان نے چاہا تو میں تمہاری بیوی کو وہاں سے نکال لاؤں گی۔ اگر میں واپس نہ آئی تو تم سمجھ لینا کہ میں زندہ نہیں ہوں۔ پھر تم ایک منٹ بھی ضائع نہ کرنا اور وہاں سے ڈھایاگڑھ کے سٹیشن کی طرف بھاگ جانا کیونکہ میرے مر جانے کی صورت میں تمہاری زندگی بھی خطرے میں ہو گی۔"

میں نے کہا۔

"کاویری! ایک بات میں تمہیں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں میں اب اس منحوس جنگل سے اپنی بیوی کو ساتھ لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

کاویری چپ ہو گئی۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ ایک غیرت مند اور محبت کرنے والے

خاوند کی حیثیت سے مجھے یہی کرنا چاہیے۔ ہم کافی دیر تک دھیمی آواز میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس کچھ رقم بچی ہوئی ہے۔ ہم ڈھایا گڑھ سے ریل گاڑی کے ٹکٹ خرید سکیں گے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"جمیلہ بہن کے واپس مل جانے کے بعد تم یہاں سے کس طرف جاؤ گے؟ میں تو راجستھان کی طرف چلی جاؤں گی۔ وہاں ہمارے رشتے داروں کا گھر ہے۔"

میں نے کہا۔

"مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ ڈھایا گڑھ سے ریل گاڑیاں کس کس طرف کو جاتی ہیں۔ میرا ارادہ جمیلہ کو اپنے ساتھ لے کر دلی جانے کا ہے۔ وہاں میرا ایک ہمدرد دوست رہتا ہے۔ دلی سے ہم پنجاب کی طرف جائیں گے اور وہاں سے بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچنے کی کوشش کریں گے۔"

اسی طرح باتیں کرتے کرتے کافی رات گزر گئی۔

تب کاویری بولی۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں اپنی مہم پر نکل پڑنا چاہیے۔"

غار کے باہر آکر اس نے فضا کو تین جانب سے سونگھا۔ وہ اپنے دشمن سانپ کی بو لے رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"دشمن سانپ کی بو کسی وقت آتی ہے کسی وقت غائب ہو جاتی ہے۔ وہ برابر میری تلاش میں ہے لیکن میں پوری طرح سے ہوشیار ہوں۔"

اس کے بعد ہم جنگل میں چل پڑے۔

رات کی تاریکی نے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جنگل میں چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے وہاں بانس کے گھنے جھنڈوں نے چھت ڈال رکھی تھی اور اندھیرا اتنا گہرا ہوگیا تھا کہ کاویری مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ اس کے گزرنے سے جھاڑیوں کی ٹہنیوں کی جو آواز آتی تھی میں اس آواز کے اندازے سے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ میں بزدل نہیں تھا

اور پھر وہ میری بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ اس کے باوجود مجھے سانپوں کا ڈر لگا ہوا تھا۔ ایک دو بار میں نے اس خیال سے زمین پر زور سے پاؤں مارا کہ اگر ادھر ادھر کوئی سانپ ہو تو وہ ڈر کر بھاگ جائے۔ اس پر کاویری رک گئی۔ اندھیرے میں مجھے بالکل پتہ نہ چلا کہ وہ چلتے چلتے رک گئی ہے۔ میں اس سے ٹکرا گیا۔ اس نے دبی آواز میں مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم زمین پر زور سے پاؤں کیوں مارتے ہو؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"اس لیے کہ اگر راستے میں کوئی سانپ ہو تو وہ بھاگ جائے۔"

کاویری نے سرگوشی میں کہا۔

"سانپ تمہارے پاؤں کی ڈھمک سے بھاگے گا نہیں بلکہ تم پر ضرور حملہ کر دے گا۔ یہ مٹھ کے محافظ سانپ ہیں۔ پاؤں دبا کر چلو۔"

اور وہ چل پڑی۔ اس وقت کاویری میرے بالکل قریب تھی۔ اس کا چہرہ مجھے دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ جب وہ آگے چلی تو دوبارہ اندھیرے میں غائب ہوگئی۔ میں اس کے کوئی ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔

بانسوں کا جھنڈ ختم ہوگیا۔ ذرا کھلی جگہ آ گئی۔ یہاں اندھیرے میں کاویری اکا سایہ مجھے دکھائی دینے لگا۔ وہ ایک طرف مڑ گئی۔ یہ جگہ نشیب میں تھی۔ آگے پھر تھوڑی سی چڑھائی آ گئی اور زمین دوبارہ ہموار ہوگئی۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گئی۔ چونکہ اندھیرے میں مجھے اس کے جسم کا ہیولا نظر آ رہا تھا اس لیے میں بھی رک گیا۔ اس بار میں اس کے اوپر نہیں گرا۔ اپنا چہرہ میرے قریب لا کر اس نے سرگوشی میں کہا۔

"آگے پتھر کی چھ سات سیڑھیاں ہیں۔ دھیان سے اترنا۔ یہ ایک خشک تالاب ہے۔"

چند قدم چلنے کے بعد وہ نیچے اتر گئی۔ میں بھی سنبھل سنبھل کر نیچے اترنے لگا۔ یہ پتھریلی سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد ہم خشک تالاب میں جگہ جگہ اگی ہوئی گھاس کی جھاڑیوں میں چلنے لگے۔ گھاس رات بھر شبنم کے گرنے سے گیلی ہو رہی تھی۔

یہ کوئی پچاس ساٹھ فٹ چوڑا خشک تالاب تھا۔ آگے پھر پتھر کی سیڑھیاں آگئیں جن پر سے گزر کر ہم تالاب کے دوسرے کنارے پر آ گئے۔

یہاں کاویری نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سامنے کی جانب کچھ دکھاتے ہوئے کہا۔

"وہ روشنی دیکھ رہے ہو؟"

سامنے دور تک تاریکی ہی تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں کسی وقت روشنی کی دھیمی سی لو ابھر کر غائب ہو جاتی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہ سنتھا ولی مٹھ کے دروازے پر جلنے والی مشعال ہے۔ ہم بڑے خطرناک علاقے میں داخل ہوگئے ہیں۔ میری بائیں جانب ہو کر میرے ساتھ ساتھ چلو۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ مجھے سنتھا ولی مٹھ کے دروازے کی سمت سے دائیں جانب ہو کر لے جا رہی تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد مشال کی روشنی نظر آنا بند ہو گئی۔ یہاں بڑے بڑے چٹانوں کے سائز کے پتھر زمین پر جگہ جگہ ابھرے ہوئے تھے۔ ہم ان پتھروں کے درمیان سے ہو کر گزر رہے تھے۔ اچانک کاویری نے مجھے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا' میں بالکل اس کے ساتھ لگ گیا بلکہ خود اس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ پھر کندھے سے دبا کر مجھے نیچے بٹھا دیا۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ میں گھبرا گیا کہ خدا جانے کیا ہوگیا ہے۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"خاموش رہنا۔"

جنگل کی رات بڑی ڈراؤنی اور چڑیلوں کے قبرستان کی طرح خاموش تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے کاویری کے سانس کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کے دل کے دھڑکنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ بھی چپ تھی۔ اچانک مجھے ایک لمبی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں اس آواز کو پہچانتا تھا۔ یہ سانپ کی سیٹی کی آوز تھی۔ جن لوگوں کو کبھی وسطی ہند کے جنگلوں میں رات کو گزرنے کا اتفاق ہوا ہے' صرف وہی ان جنگلوں کی راتوں کی ہیبت ناک آسیبی خاموشی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ سانپ کی سیٹی کی آواز تھوڑی دیر بعد بلند ہوتی اور

پھر سناٹا چھا جاتا۔ کاویری نے اپنے منہ سے سیٹی کی بڑی باریک اور تیز آواز نکالی۔ وہ وقفے وقفے سے یہ آواز نکالتی رہی۔ اس کے بعد جنگل میں سے جو سیٹی کی آواز سنائی دی تھی' خاموش ہو گئی۔ جب دو تین منٹ تک سانپ کی سیٹی کی آواز نہ آئی تو کاویری نے اٹھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ مٹھ کے محافظ سانپ کی آواز تھی۔ آ جاؤ' آگے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

ہم ایک پتھریلی ڈھلان اترنے لگے۔ ڈھلان ختم ہوئی تو سامنے ایک سیاہ دیوار آ گئی۔ کاویری میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوسری طرف لے گئی۔ یہ سیاہ دیوار اصل میں ایک بہت بڑی چٹان تھی۔ یہاں ایسی آواز آنے لگی جیسے پانی نیچے گر رہا ہو۔ کاویری نے میرے کان کے پاس منہ لا کر کہا۔

"یہاں سے ایک جھرنا بہتا ہے۔ ہم اسی طرف جائیں گے۔"

جھرنے کے پانی کے قریب آ گئی۔ اندھیرے میں مجھے جھرنا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کاویری تھوڑی تھوڑی دیر بعد رک جاتی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کر لیتی۔ اسے ڈر تھا کہ جنگل کی اتھاہ تاریکی میں کہیں بھٹک نہ جاؤں۔ جھرنے کی آواز جب تھوڑی پیچھے رہ گئی تو مجھے اندھیرے میں درختوں کے درمیان ذرا اونچی جگہ پر کسی جھونپڑی کا دھندلا سا خاکہ دکھائی دیا۔ کاویری چبوترے کی چڑھائی چڑھ کر اوپر آ گئی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ چبوترے پر ایک جھونپڑا سا بنا ہوا تھا۔ کاویری جھونپڑ کے باہر بیٹھ گئی۔ میں بھی اندھیرے میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"تمہیں یہاں ٹھہر کر میری واپسی کا انتظار کرنا ہو گا۔ اپنے خدا سے پرارتھنا کرنا کہ میں تمہاری بیوی کو زندہ سلامت لے کر واپس آ جاؤں۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"زیادہ دیر نہ لگانا کاویری! جس طرح بھی ہو سکے میری بیوی کو لے کر واپس آنا۔"

وہ بولی۔

"بھگوان نے چاہا تو میں جمیلہ کو ساتھ ہی لے کر آؤں گی۔ لیکن اگر دن کا اجالا ہونے

لگے اور میں واپس نہ آئی تو سمجھ لینا کہ میں زندہ نہیں ہوں۔ پھر تم ویسے ہی کرنا جیسے میں نے تمہیں کہا ہے۔ اب میں جاتی ہوں۔ یہاں سے ہرگز ہرگز ادھر ادھر مت ہونا۔"

وہ چبوترے کی ڈھلان اتر گئی۔ میں نے تاریکی میں اس کو سائے کی طرح چبوترے سے اتر کر سامنے والے درختوں کے اندھیرے میں گم ہوتے دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں جھونپڑے کے باہر ہی بیٹھا تھا۔ جھونپڑے کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ جھونپڑے کے اندر اندھیرا تھا۔ میں باہر بیٹھا ہوا تھا اور چاروں طرف گہری خاموشی تھی۔ جس طرف پانی کا جھرنا تھا اسی طرف سے تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک جھینگر کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ میں ایک عجیب کش مکش کی حالت میں تھا۔ کبھی لگتا کہ کاویری جمیلہ کو لے کر آ جائے گی۔ کبھی لگتا کہ نہ وہ آئے گی، نہ جمیلہ ہی آئے گی۔ اس خیال سے دل اتھاہ غم میں ڈوب سا جاتا اور میں بے اختیار ٹھنڈا سانس بھر کر رہ جاتا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں یہ دن بھی دیکھنے پڑیں گے اور میری تقدیر میں یہ ہولناک واقعات بھی لکھے ہوئے ہیں۔

رات گزر رہی تھی۔ آسمان پر بادل ہی بادل تھے۔ جو نظر نہیں آ رہے تھے۔ اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ میری نظریں بار بار اسی طرف اٹھ جاتیں جدھر کاویری درختوں کے اندھیرے میں غائب ہو گئی تھی۔ اسے اسی جگہ سے میری بیوی کو لے کر واپس آنا تھا۔ مگر ابھی تک اس کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ کافی وقت گزر گیا۔ میں بے چین ہو کر کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا، کبھی بیٹھ جاتا۔ ایک دفعہ جو میری نگاہ درختوں کی طرف گئی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے اندھیرے میں سایہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ میں آنکھیں پھاڑے اس طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ سایہ اندھیرے میں میری طرف آ رہا تھا۔ پھر مجھے ایسے لگا جیسے یہ دو سائے ہیں جو ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ کیا کاویری میری بیوی کو ساتھ لے آئی ہے؟ دونوں سائے چبوترے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب دونوں سائے چبوترے کے پاس آئے تو میں نے اپنی بیوی جمیلہ کو پہچان لیا۔ اس کی شکل اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر میں نے اس کی چال سے اسے

پہچان لیا۔

میں بے تاب ہو کر چبوترے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ کاویری اس کے ساتھ تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"اوپر ہی رہو۔"

میں وہیں رک گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری بیوی کی چال میں ایک قسم کی نقاہت سی ہے۔ اس نے کاویری کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ میرے سامنے آتے ہی میری بیوی روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا بدن تیز ہوا میں لرزنے والی ٹہنی کی طرح کانپ رہا تھا۔ مجھے اس کے جسم سے عجیب نامانوس کی بو آئی۔ اس وقت میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ وہ پنجابی میں کہنے لگی۔

"اس سے تو میں مر جاتی تو اچھا تھا۔ مر جاتی تو اچھا تھا۔"

میں اس کو پیار سے تسلیاں دینے لگا۔"

"جو ہونا تھا ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے ہم ایک بار پھر مل گئے۔ اب کچھ نہیں ہو گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

کاویری ہمارے پاس کھڑی بار بار جنگل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔ اب نکل چلو۔" جمیلہ نے مجھ سے کہا "مجھ سے چلا نہیں جاتا۔

میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"میں تمہیں سہارا دوں گا۔ ذرا ہمت سے کام لو۔ بس ایک جنگل عبور کرنا ہے پھر ہم ریل گاڑی میں بیٹھ کر دلی پہنچ جائیں گے۔"

جمیلہ نے سرد سانس بھر کر کہا۔

"اب کیا فائدہ ہے' اب کیا فائدہ ہے۔"

میری سمجھ میں یہی آیا کہ وہ جن حالت میں گزر کر آئی ہے۔ یہ انہی سنگین حالات کا اثر ہے اور یہ حقیقت بھی تھی۔ میں اسے سہارا دے کر چبوترے کی سیڑھیوں پر سے نیچے لے آیا۔ کاویری ہماری آگے آگے تھی۔ نیچے آتے ہی کاویری ایک طرف کو مڑ گئی۔ جمیلہ

پہلے سے کچھ دبلی ہوگئی تھی۔ وہ میری آغوش میں سے نکل آئی۔ کہنے۔

"میں خود چلوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔"

تاریک جنگل کی رات میں ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہوگیا۔ لیکن یہ سفر کامیابی کی منزل کی طرف تھا۔ میں اپنی بیوی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ جمیلہ کو میں اپنے ساتھ لے کر چل رہا تھا۔ اس مختصر سے لمحے میں ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ جمیلہ میں کچھ تبدیلی ضرور واقع ہوئی ہے۔ کسی کسی وقت چلتے چلتے وہ گردن موڑ کر پیچھے دیکھ لیتی تھی۔ ایک بار اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میں نے اسے کہا۔

"جمیلہ! فکر نہ کرو۔ ہم خطرے سے باہر ہو چکے ہیں۔ ہمارے پیچھے کوئی نہیں آ رہا۔"

کاویری ہم سے صرف ایک قدم آگے چل رہی تھی۔ اس نے میرا جملہ سنا تو پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا۔ اس نے کوئی بات نہ کی اور چلتی چلی گئی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ کاویری جانتی تھی کہ جمیلہ بار بار پیچھے مڑ کر سنتھا ولی کے مٹھ کی طرف کیوں دیکھتی ہے۔ عجیب پر اسرار سا ماحول بن گیا تھا۔ میں اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھا کہ سنتھا ولی کے مٹھ میں میری بیوی پر پجاری سپیروں نے بڑے منتر پھونکے ہیں۔ اس کے جسم پر نہ جانے کتنی راتوں کو کیسے کیسے زہریلے سانپ چلائے ہیں۔ کاویری نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ ان ساری رسومات کے بعد تمہاری بیوی آدھی ناگن بن چکی ہے۔ اس میں سانپوں والی خصلت پیدا ہوگئی ہے۔ اگرچہ اس کا انسانی پہلو اس کی ناگنوں والی خصلت پر ابھی تک غالب ہے۔ لیکن آگے چل کر ناگ منتروں کا طلسم اپنا اثر دکھا سکتا ہے۔ اس وجہ سے بھی میں پریشان تھا لیکن میرا خدا پر کامل یقین تھا اور میں نے عہد کر رکھا تھا کہ جمیلہ پر اگر کسی منتر کا طلسمی اثر ہو بھی گیا ہے تو میں اسے اپنی قوت ارادی سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گا۔

ہم ایک کھائی میں اتر گئے۔

کاویری نے کہا۔

"اس کھائی کے آگے چھوٹی نہر ہے جس کے پار جنگلی دھاریوں کا جنگل ہے۔ اس جنگل میں سے گزر گئے تو پھر ہمیں اپنے دشمنوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

مجھے ایسے لگا جیسے جمیلہ چلتے چلتے تھک گئی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تھک گئی ہو تو ہم یہاں رک جاتے ہیں۔"

جمیلہ ذرا جھک کر چل رہی تھی۔ وہ یک دم سیدھی ہو گئی کہنے لگی۔

"نہیں میں بالکل نہیں تھکی۔"

جب ہم کھائی سے نکل کر چھوٹی نہر پر آئے تو جمیلہ نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے گھنا جنگل تھا۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔

"پیچھے کیا دیکھ رہی ہو؟"

جمیلہ کا چہرہ اندھیری رات میں اس وقت مجھے عجیب اجنبی سا لگا۔ اس نے سانس بھر کر کہا۔

"کچھ نہیں۔ تم کیوں پوچھتے ہو؟"

اس طرح کا جواب مجھے جمیلہ نے کبھی نہیں دیا تھا۔ میں شرمندہ سا ہو گیا۔ میں نے کھسیانا سا ہو کر کہا۔"

"ویسے ہی خیال آیا کہ تم پیچھے مڑ مڑ کر کیوں دیکھتی ہو۔ خیر کوئی بات نہیں اب ہم سٹیشن سے زیادہ دور نہیں ہیں۔"

کاویری نہر کے کنارے چلتے چلتے رک کر بولی۔

"آگے چھوٹا سا پل ہے۔ ہم وہاں سے نہر پار کریں گے۔"





پل پر سے نہر پار کر کے ہم جٹا دھاریوں کے جنگل میں داخل ہو گئے۔

ہمارے فرار کا یہ آخری خطرناک مرحلہ تھا۔ کاویری نے خبردار کیا تھا کہ یہ جنگل پجاری سپریوں کی آخری سرحد ہے اور یہاں انہوں نے ہر قسم کے زہریلے سانپ چھوڑ رکھے ہیں۔ ان کے ڈر سے یہاں دن کے وقت بھی کوئی آدمی داخل نہیں ہوتا۔ جنگل میں داخل ہونے سے پہلے میں نے کاویری سے پوچھا کہ کیا کوئی راستہ نہیں ہے جہاں سے گزر کر ہم ڈھایا گڑھ کے ریلوے سٹیشن پر پہنچ جائیں۔ اس نے کہا یہ خطرناک جنگل مشرق اور مغرب کی طرف دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم جس طرف سے بھی جائیں گے ہمیں اس جنگل میں سے ضرور گزرنا پڑے گا۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

جمیلہ چپ چپ سی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چلنے کے انداز سے لگتا تھا کہ اس کے دل میں جنگلوں اور ان میں چھوڑے ہوئے زہریلے سانپوں کا کوئی خوف نہیں ہے۔ یہ بہت بڑی تبدیلی تھی جو میری بیوی میں پیدا ہو گئی تھی وگرنہ پہلے وہ سانپ کا نام سن کر ہی کانپ جاتی تھی اور گھر کے اندھیرے کمرے میں بھی جاتے ڈرا کرتی تھی۔ کاویری آگے آگے تھی۔ وہ تھوڑی دور چلنے کے بعد رک کر فضا کو سونگھ لیتی تھی۔ ایک دو بار اس نے منہ سے سانپ کی سیٹی کی آواز بھی نکالی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس سیٹی کی آواز سے سانپ دور دور ہٹ جاتے ہیں۔ شاید یہ سانپوں کے کسی دیوتا سانپ کی آواز

تھی۔

جٹا دھاریوں کے جنگل کا پھیلاؤ شمال جنوب کی طرف چھ کوس سے زیادہ نہیں تھا۔ کاویری ہمیں ایک آسان اور مختصر راستے سے لے جا رہی تھی جو گھاٹیوں اور کھڈوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ جمیلہ نے اس علاقے کا پہناوا ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ وہاں کی عورتوں کے انداز میں اس نے بالوں کا جوڑا پیچھے باندھ رکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ شروع شروع میں جب وہ میرے پاس آئی تھی تو اس پر ہلکی سی نقاہت طاری تھی مگر اب وہ بالکل چاق و چوبند نظر آ رہی تھی۔ یہ بات بھی میرے لیے بڑی حیران کن تھی۔ وہ وقت ان باتوں کی طرف دھیان دینے کا نہیں تھا۔ اس وقت مجھے صرف ایک ہی تشویش تھی کہ جس طرح بھی ہو اس خطرناک جنگل میں سے نکل جائیں۔ جنگل میں کہیں درخت ہی درخت آ جاتے، کہیں صرف اونچی اونچی جھاڑیاں آ جاتیں اور درخت ایک طرف ہٹ جاتے۔ کاویری ہماری راہنمائی کر رہی تھی۔

ایک جگہ کاویری یک دم رک گئی۔ ہم بھی رک گئے۔ جنگل کے اندھیرے میں کاویری کی چمکیلی آنکھیں بڑے تجسس سے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے کاویری؟"

اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ جنگل کی خاموشی میں کسی آواز کو سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بار بار سانس اوپر کھینچ کر فضا بھی سونگھ رہی تھی۔ اس نے ہمیں جھاڑیوں کی اوٹ میں بٹھا دیا اور جھک کر آہستہ سے کہا۔

"لگتا ہے میرا دشمن سانپ ہمارے بہت قریب آ گیا ہے۔ اگر میں تمہارے ساتھ ساتھ چلتی رہی تو وہ میرے ساتھ تم دونوں کو بھی ہلاک کر دے گا۔"

"ہم راستہ بدل لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ سرگوشی میں بولی۔

"اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ صرف ایک ہی صورت ہے میں پیچھے جاتی ہوں اور دشمن

سانپ کو یہاں سے دوسری طرف لے جاتی ہوں۔ جس طرف میں جاؤں گی وہ میری بو پر اسی طرف آئے گا۔ میں اسے جنگل کے دلدلی علاقے کی طرف لے جاؤں گی۔ دلدل کی بو رات کے وقت بڑی تیز ہو جاتی ہے یہ بو میرے جسم کی بو کو فضا میں زائل کر دے گی۔ یوں دشمن سانپ بھٹک جائے گا۔ تم دونوں اسی جگہ بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔ میں سانپ کو غلط راستے پر ڈال کر اوپر سے ہو کر تمہارے پاس آ جاؤں گی۔ اگر ایک آدھ گھنٹے تک میں نہ آئی تو تم دونوں یہاں سے نکل جانا۔ ڈھایا گڑھ کا سٹیشن جنگل سے نکلتے ہی تھوڑے فاصلے پر ہے۔ تم میرا انتظار نہ کرنا۔"

اس سے پہلے کہ میں کاویری سے مزید کوئی بات کرتا وہ تیزی سے جنگل میں ایک طرف اندھیرے میں گم ہو گئی۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"کاویری بڑی بہادر اور ہماری بڑی ہمدرد لڑکی ہے۔ اگر مجھے یہ نہ ملتی تو میں تمہیں دوبارا حاصل نہیں کر سکتا تھا۔"

جمیلہ نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے ڈر ہے کاویری واپس نہ آ سکے گی۔ ناگ دیوی کا سانپ جو اس کے پیچھے لگا ہے اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے جمیلہ سے کہا۔

"کاویری نے مجھے بتایا تھا کہ سنتھا ولی مٹھ سے اگر کوئی ناگ داسی فرار ہو جائے تو سانپ اس کا پیچھا کرتے ہیں کیا کوئی سانپ تمہارا بھی پیچھا کر رہا ہو گا؟"

کاویری نے تو مجھے بڑے اعتماد سے بتایا تھا کہ اگر جمیلہ مٹھ سے فرار ہو گئی تو نہ صرف مٹھ کا سانپ اس کا تعاقب شروع کر دے گا بلکہ مٹھ کا پجاری سپیرا بھی اس کے پیچھے لگ جائے گا لیکن میں جمیلہ کی زبان سے اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اس نے میری بات سن کر پہلے تو کوئی جواب نہ دیا اور چپ بیٹھی جنگل کے اندھیرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ جب میں نے اپنے سوال کو دہرایا تو وہ خشک سی آواز میں بولی۔

"کاویری نے ٹھیک کہا تھا۔"

میں نے کہا۔

"پھر تو ہم بھی یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ ہمیں یہاں نہیں رکنا چاہیے تھا۔"

جمیلہ نے اسی پراسرار اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ہمیں ہر حالت میں کاویری کا انتظار کرنا ہو گا۔"

جمیلہ آخر میری بیوی تھی۔ کوئی غیر یا اجنبی عورت نہیں تھی۔ مجھے اس کے بارے میں تشویش تھی۔ کاویری نے اس پر پھونکے گئے سانپ کے منتروں کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا تھا اس کی وجہ سے میری تشویش میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ جمیلہ آگے چل کر کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ اس وقت ہم دونوں اکیلے تھے۔ میں نے جمیلہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

"تم تو جانتی ہی ہو مجھے تم سے کتنا پیار ہے اور مجھے تمہاری زندگی کس قدر عزیز ہے۔ یہ تمہارا پیار ہی تھا جو مجھے چلتی تلواروں میں ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرواتا تمہارے پاس لے آیا ہے۔"

جمیلہ نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے میں بھی تم سے اتنا ہی پیار کرتی ہوں۔"

میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ جمیلہ اس وقت مجھے بالکل نارمل حالت میں لگ رہی
نے کہا۔

"کاویری کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان لوگوں نے تم پر کچھ منتر بھی پھونکے ہیں اور پجاری دیوگری کے مندر میں رات بھر تمہارے ننگے بدن پر سانپ کو بھی پھرایا گیا ہے۔"

جمیلہ نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ان منتروں کا اور سانپ کے تمہارے جسم پر پھرنے کا تم پر کوئی اثر تو نہیں ہوگیا؟"

جمیلہ چپ رہی۔ میں نے جمیلہ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"میری جان! میں یہ صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔"

میں نے جمیلہ کو اپنے ساتھ ضرور لگا لیا تھا مگر میں نے محسوس کرلیا کہ اس میں وہ پہلے والی گرم جوشی نہیں تھی بلکہ وہ مجھ سے اپنا جسم بے معلوم انداز میں چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب میں نے اپنے سوال کو دہرایا تو اس نے کہا۔

"نہیں۔ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔"

کیا تم میرے ساتھ جانے پر خوش ہو ناں؟"

اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ خوش ہوں۔"

پھر اس نے اپنا چہرہ اونچا کرلیا اور بولی۔

"ہمارے آس پاس کوئی سانپ ہے۔"

میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ جیسے اسے سانپ کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں جمیلہ' آؤ کوئی دوسری جگہ ڈھونڈتے ہیں۔ یہاں کے سانپ بڑے زہریلے ہیں۔"

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ کہنے لگی۔

"کاویری نے ہمیں یہاں بیٹھنے کو کہا ہے۔ ہمیں یہیں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن تم نے خود بتایا ہے کہ یہاں کوئی سانپ موجود ہے۔"

وہ بولی۔

"فکر نہ کرو۔ سانپ ہمیں کچھ نہیں کہے گا۔"

وہ اندھیرے میں جیسے بیٹھی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ میری مردانہ غیرت نے گوارا نہ کیا کہ بیوی وہیں بیٹھی ہو اور میں سانپ کے ڈر سے بھاگ جاؤں۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہاں کوئی سانپ ہے؟"

مجھے معلوم تھا کہ اس نے فضا میں سانپ کی بو سونگھی تھی۔ مگر میں یہ بات جمیلہ کی زبانی کہلوانا چاہتا تھا۔ کہنے لگی۔

"اس قسم کے سوال نہ ہی پوچھو تو بہتر ہے۔"

"کیوں نہ پوچھوں؟" میں نے کسی قدر خفگی سے کہا۔ "کیا میں تمہارا جیون ساتھی نہیں ہوں؟ کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں ہے؟"

جمیلہ نے سر جھکایا ہوا تھا۔ میری بات سن کر اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر مجھے گھور کر دیکھا۔ وہ چند لمحے بالکل ساکت ہو کر مجھے دیکھتی رہی۔ اندھیرے میں مجھے اس کی آنکھیں اس طرح چمکتی دکھائی دے رہی تھیں جیسے اس کی آنکھوں میں ہیرے موتی جڑے ہوئے ہوں۔ آہستہ سے کہنے لگی۔

"سانپوں میں رہ کر مجھے سانپوں کی بو آ جاتی ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے دوسرا سوال کر دیا۔

میں نے سنا ہے کہ سنتھا ولی مٹھ سے جو عورت فرار ہوتی ہے ایک سانپ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے اور موقع پا کر اسے ڈس لیتا ہے۔ مجھے تمہاری زندگی کی فکر ہے جمیلہ۔ کیا یہ سچ ہے؟"

جمیلہ نے جنگل کی تاریکی میں اس طرف دیکھا جس طرف کاویری گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ سانپ ہمیں کچھ نہیں کہے گا۔ اس کی تم فکر مت کرو۔"

اچانک اس نے موضوع بدلتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"ہم پاکستان کا بارڈر کس طرح کراس کریں گے؟ پاکستان باؤڈر فورس کے آدمی ہم پر فائرنگ نہیں کریں گے؟"

میں نے کہا۔ "بارڈر کراس کرانا میرا کام ہے تم بے فکر رہو۔"

وہ بڑبڑائی۔

"بارڈر پر تو اس وقت دونوں طرف فوجیں بیٹھی ہیں۔ فوج کے مورچوں سے بچ کر نکل جانا ناممکن ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ آخر ہمیں اپنے ملک پاکستان بھی تو جانا ہے۔"

وہ بڑے سکون سے کہنے لگی۔

"ایک بار پھر سوچ لو۔ سانپوں سے تو ہم شاید بچ جائیں مگر فوج کی فائرنگ سے بچنا مشکل ہے۔"

اس کی باتوں سے مجھے ہلکا سا شبہ ہوا کہ وہ انڈیا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔ جب میں نے اس سے اس بارے میں سوال کیا تو وہ کہنے لگی۔

"انڈیا ہمارا ملک نہیں ہے۔ بھلا میں یہاں کیوں رہنے لگی؟"

ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کاویری ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا کہ وہ کسی حادثہ کا شکار نہ ہو گئی ہو۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"کاویری نے اتنی دیر کہاں لگا دی ہے۔"

وہ کہنے لگی۔

"میرا نہیں خیال کہ اب وہ واپس آئے۔ وہ جس سانپ کی بو سونگھ کر اس سے پیچھا چھڑانے گئی تھی وہ کاویری سے ہزار گنا زیادہ چالاک سانپ ہے۔ اس نے کاویری کو مار دیا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"ہم تھوڑی دیر اور انتظار کر لیتے ہیں۔"

کہنے لگی۔

"میں اسے تلاش کرنے جاتی ہوں۔"

اس نے جس اشتیاق سے یہ بات کہی تھی اس سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ واپس سنتھا ولی جنگل میں جانے کو بے تاب ہے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ اسے سنتھا ولی مٹھ کے سانپ واپس بلا رہے تھے۔ اب تک اس کے پیچھے کوئی سانپ یا پجاری سپیرا نہیں لگا تھا۔ اس لیے کہ ابھی وہ سنتھا ولی مٹھ کے حدود کے اندر تھی۔ کاویری کے کہنے کے مطابق جٹا دھاریوں کے جنگل کے بعد سنتھا ولی مٹھ کی سرحد ختم ہو جاتی تھی۔ جیسے ہی ہم جٹا دھاریوں کے جنگل سے باہر آئیں گے مٹھ کے پجاری اور سانپ سو بھی رہے ہوں گے تو انہیں کوئی غیبی طاقت جگا کر خبردار کر دے گی کہ مٹھ کی کوئی ناگ داسی فرار ہو گئی ہے۔ میں نے جمیلہ کو بڑے پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟ تمہارے دشمن سارے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ چلو ہم یہاں سے آگے چلتے ہیں۔ کاویری نے خود کہا تھا کہ اگر مجھے زیادہ دیر ہو گئی تو تم دونوں نکل جانا۔ میرا انتظار نہ کرنا۔ آؤ آگے روانہ ہوتے ہیں۔ صبح ہونے والی ہے۔"

جمیلہ میرے اصرار پر اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے ساتھ چلنے لگی۔ مجھے کاویری نے بتایا تھا کہ جٹا دھاری جنگل آگے ختم ہونے والا ہے۔ اس کے بعد ایک ریلوے لائین ملے گی جو سیدھی ڈھایا گڑھ کے ریلوے سٹیشن کو جاتی ہو گی۔ اب ہم تیز تیز چل رہے تھے، جنگل بھی ختم ہونے کو تھا۔ درختوں کے جھنڈ چھٹنے لگے تھے۔ آخر ہم جنگل سے باہر آ گئے۔ جنگل سے باہر نکلتے ہی مجھے خوشی بھی ہوئی اور فکر بھی لگ گئی۔ خوشی اس لیے ہوئی کہ خطرناک جنگل کی مصیبت سے نجات مل گئی ہے۔ فکر یہ لگی کہ ہم سنتھا ولی مٹھ کے جنگل کی سرحد پار کر آئے ہیں اور اگر کاویری کا کہنا صحیح ہے تو پیچھے سنتھا ولی کے سانپوں اور پجاری سپیروں کو جمیلہ کے فرار کا علم ہو گیا ہو گا اور کوئی نہ کوئی سانپ یا سپیرا جمیلہ کی بو پر اس کے پیچھے چل پڑا ہو گا۔

جنگل کے ختم ہوتے ہی ایک میدان پھیلا ہوا تھا۔ آگے ایک اونچی جگہ تھی۔ ہم اس پر چڑھ گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ یہ وہاں ریل کی پٹڑی بچھی ہوئی تھی۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"یہی ریل کی پٹڑی ڈھایا گڑھ سٹیشن کو جاتی ہے۔"

ہم ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ رات کی تاریکی میں چھائے ہوئے بادلوں کے پیچھے صبح کاذب کی ہلکی ہلکی روشنی جھلکنا شروع ہو گئی تھی۔ مجھے کاویری ایسی بہادر اور ہمدرد لڑکی سے بچھڑ جانے کا افسوس تھا لیکن اس نے خود کہا تھا کہ ایک خاص وقت گزر جانے کے بعد میرا انتظار نہ کرنا اور جمیلہ کو لے کر وہاں سے نکل جانا۔ اس لیے مجبوراً مجھے جمیلہ کو لے کر وہاں سے نکلنا پڑا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو کاویری کے کہنے کے باوجود جنگل میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا اور بہت ممکن تھا کہ خود اس کی تلاش میں نکل پڑتا۔ لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ کاویری کو اس کے دشمن سانپ نے ہلاک نہیں کیا ہوگا۔ سنتھا ولی جنگل کی سرحد پار کر آنے کے بعد خود مجھے جمیلہ کی فکر پڑ گئی تھی۔ کیونکہ ایک دشمن سانپ یا دشمن پجاری سپیرا اسے پکڑنے یا مار ڈالنے کے لیے اس کے بھی پیچھے لگ گیا تھا۔ تاہم ریل کی پٹڑی اور دور سے ریلوے سگنل کی روشنی کو دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں مہذب دنیا میں آگیا ہوں اور اب اس قسم کے توہمات فضول ہیں۔

میں نے جمیلہ کو بتایا کہ میرے پاس ایک کمانڈو چاقو اور ایک بھرا ہوا ریوالور بھی ہے۔ وہ کہنے لگی۔

"ان چیزوں کو پھینک دو۔ پولیس کو معلوم ہوگیا تو وہ ہمیں پکڑ لے گی۔ ہم پہلے ہی انڈیا میں بغیر پاسپورٹ کے داخل ہوئے ہیں اور تمہیں تو انڈیا کی ملٹری پولیس بھی تلاس کر رہی ہوگی کیونکہ وہ تمہیں پاکستانی فوج کا مفرور قیدی سمجھتی ہے۔"

میں نے جمیلہ کو ساری داستان سنادی تھی کہ کس طرح مجھے محمد پور واپس آکر معلوم ہوا کہ ہمارے مکان اور دکان کو بنگالیوں نے نذر آتش کر دیا ہے اور مکتی باہنی والے

تمہیں اٹھا کر لے گئے ہیں۔ پھر میں کس طرح بنگلہ دیش کے بارڈر پر پکڑا گیا اور بھارتی فوجیوں نے مجھے پاک آرمی کا فوجی سمجھ کر جنگی قیدیوں کی گاڑی میں بند کر دیا اور پھر کس طرح جب ٹرین انڈیا میں پہنچی تو میں نے رات کے اندھیرے میں ٹرین کی کھڑکی میں سے چھلانگ لگا دی تھی۔

میں نے جمیلہ سے کہا۔

"میں ابھی ریوالور اور چاقو اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہوگئی تو میں ریوالور کہیں پھینک دوں گا لیکن چاقو اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ یہ شکاری چاقو ہے۔ اس پر پولیس کو کوئی شک نہیں پڑے گا۔"

چاروں طرف پو پھٹنے کی ہلکی نیلی روشنی پھیل رہی تھی۔

ڈھایا گڑھ کے سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے صبح ہوگئی۔ سورج کی روشنی نے جنگل کے توہمات میرے ذہن سے جالوں کی طرح صاف کر دیئے۔ میں نے اپنی بیوی کو حاصل کر لیا تھا۔ اب مجھے ناگ دیوی کے مندر اور اس کے سانپ اور پجاری سپیرے اور ان کی جاہلانہ رسومات بے حقیقت لگنے لگی تھیں۔ ڈھایا گڑھ کا سٹیشن تقریباً خالی پڑا تھا۔ معمولی سا دیہاتی سٹیشن تھا جہاں ایک بھی مسافر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں کوئی میل ٹرین نہیں ٹھہرتی۔ برانچ لائن کا سٹیشن ہے۔ صرف دو پسنجر ٹرینیں آتی ہیں۔ ایک دن کے سوا دس بجے اور دوسری رات کو آتی ہے۔ میں جمیلہ کو لیے پلیٹ فارم پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

جب دن کافی چڑھ آیا تو پلیٹ فارم پر کچھ دیہاتی قسم کے مسافر نظر آنے لگے۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔ شاید کچھ کھانے پینے کو مل جائے۔ تم یہاں سے مت ہلنا۔"

سٹیشن سے باہر ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ یہاں سے میں نے دو بند مکھن اور چائے کے مٹی کے گلاس لیے اور جمیلہ کے پاس آگیا۔ ہم نے زمین پر بیٹھے بیٹھے ناشتہ کیا۔ دن کی روشنی میں مجھے جمیلہ کا چہرہ پہلے سے اترا ہوا نظر آیا۔ اس کا رنگ بھی سانولا پڑ گیا تھا۔

میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ وہ اتنی کمزور کیوں ہوگئی ہے۔ یہ پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ قریبی نلکے پر ہم نے منہ ہاتھ دھویا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ جب ٹرین آنے میں آدھا گھنٹہ رہ گیا تو میں ٹکٹ لینے پلیٹ فارم سے باہر آگیا۔ بکنگ کلرک نے بتایا کہ وہاں سے کوئی گاڑی سیدھی دلی نہیں جاتی۔ معلوم ہوا کہ یہ گاڑی مجھے بلاس پور تک لے جائے گی۔ بلاس پور سے مجھے جبل پور والی گاڑی پکڑنی ہوگی۔ جبل پور سے دلی جانے والی گاڑی مل جائے گی میں نے دو ٹکٹ دلی کے لے لیے۔

ٹرین لیٹ تھی۔ جب آئی تو مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ اس میں کوئی زنانہ ڈبہ نہیں تھا۔ میرے پاس تھرڈ کلاس کے ٹکٹ تھے۔ تھرڈ کلاس کے ٹکٹ میں نے اس لیے خریدے تھے کہ یہ کلاس ایک مفرور قیدی کے لیے نسبتاً" محفوظ ہوتی ہے۔ ہم بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گئے۔ یہ سفر بھی کافی لمبا سفر تھا۔ بہرحال پہلے ہم بلاس پور پہنچے وہاں سے جبل پور جانے والی گاڑی پکڑی' جبل پور بڑا شہر تھا۔ ہم رات کے وقت جبل پور پہنچے تھے۔ پلیٹ فارم پر پولیس کے سپاہی چل پھر رہے تھے۔ ایک جگہ میں نے انڈین ملٹری پولیس کے جوان بھی دیکھے۔ میں محتاط ہوگیا۔ ریوالور ابھی تک میری پتلون کی جیب میں تھا۔ اسے پھینکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اپنے بچاؤ کے لیے یہی ایک کارگر ہتھیار تھا۔ جب تک دلی جانے والی گاڑی نہیں آئی میں اور جمیلہ پلیٹ فارم پر ہی دوسرے مسافروں کے درمیان چھپ کر بیٹھے رہے۔ اس طرح کسی پولیس کے سپاہی کو ہم پر شک نہیں پڑ سکتا تھا۔ دلی جانے والی گاڑی رات کے دو بجے آئی۔ ہم دونوں اس میں سوار ہو کر دلی کی طرف روانہ ہوگئے۔

ساری رات اور اگلا دن سفر میں گزر گیا۔ راستے میں بھارت کے جبل پور' کان پور اور الہ آباد ایسے کئی بڑے شہر آئے۔ ریوالور ابھی تک میری جیب میں تھا۔ میں نے احتیاطاً" اسے پتلون کی جیب سے نکال کر جیکٹ کی اندر والی جیب میں رکھ لیا تھا۔ راستے میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آیا جس سے مجھے احساس ہوتا کہ میں انٹیلی جینس والوں کی نظروں میں آگیا ہوں۔ ڈھاکہ فال کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور مشرقی پاکستان سے فرار

ہو کر بہاری اور دوسرے غیر بنگالی بھارت میں داخل ہو رہے تھے اور سی آئی ڈی ان کی تلاش میں رہتی تھی۔ الہ آباد کے سٹیشن پر میں پلیٹ فارم پر تھوڑی دیر کے لیے اترا تو میں نے ایک سویلین کپڑوں والے آدمی کو دیکھا۔ میری تجربہ کار نظروں نے اسے فوراً پہچان لیا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے مگر اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ میں دوسری طرف سے ہو کر ڈبے میں چڑھ گیا تھا۔

ٹرین دلی سٹیشن میں داخل ہوئی تو میں نے جمیلہ سے کہا۔

"یہاں ہم زیادہ دن نہیں ٹھہریں گے۔ مشتاق علی صاحب ہمیں کسی نہ کسی طرح پاکستان بھجوانے کا ضرور انتظام کر دیں گے۔"

جمیلہ خاموش رہی۔ کسی وقت اس کو چپ سی لگ جاتی تھی۔ میں اسے بلاتا تو وہ اس طرح چونک پڑتی جیسے کسی گہرے خیال میں گم ہو۔ اس میں یہ بھی ایک نمایاں تبدیلی آ گئی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ پاکستان پہنچنے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہاں وہ اپنے لوگوں سے ملے گی تو بھارت میں گزارے ہوئے ڈراؤنے دنوں کی یاد اس کے دل سے محو ہو جائے گی۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ رات کے آٹھ سوا آٹھ بج رہے تھے۔ جب ٹرین دلی پہنچی۔ پہلے میں نے سوچا کہ جمیلہ کو ساتھ لے کر سیدھا مشتاق صاحب کے ہوٹل چلا جاتا ہوں۔ پھر اچانک خیال آ گیا کہ مشتاق صاحب کے ہوٹل میں ممکن ہے دلی کے سب سے بڑے جرائم پیشہ بدمعاش شری راج کے جاسوس موجود ہوں اور وہ اسے جا کر خبر کر دیں کہ جس عورت کو آپ نے اپنے گورو دیو گری کے حوالے کیا تھا وہ مشتاق صاحب کے ہوٹل میں واپس آ گئی ہے۔ میں نے جمیلہ کو عورتوں کے سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں بٹھایا اور خود پلیٹ فارم پر آ کر مشتاق صاحب کو فون کیا۔ وہ ہوٹل میں موجود تھے۔ میری آواز پہچان گئے۔ کہنے لگے۔

"کب آئے ہو؟"

جب میں نے اسے بتایا کہ ابھی ابھی دلی پہنچا ہوں اور ریلوے سٹیشن پر ہی ہوں اور

میری بیوی جمیلہ بھی میرے ساتھ ہے تو انہوں نے پہلا سوال یہی کیا کہ تمہارے آس پاس تو کوئی موجود نہیں ہے؟ میں نے کہا کہ میں ٹیلی فون بوتھ میں ہوں اور اکیلا ہوں۔ وہ بولے۔

"تم نے بڑی عقلمندی کی کہ سیدھا ہوٹل نہیں آ گئے۔ اب تم ایسا کرو کہ پلیٹ فارم پر ٹیلی فون بوتھ کے پاس ہی رہو۔ میں آ رہا ہوں۔"

انہوں نے مجھ سے پلیٹ فارم کا نمبر پوچھا اور فون بند کر دیا۔ میں نے ویٹنگ روم میں جا کر جمیلہ کو بتایا کہ میرے دوست مشتاق صاحب ہمیں لینے آ رہے ہیں۔ جمیلہ نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ میں نے کہا۔

"وہ پلیٹ فارم پر آئیں گے۔ میں باہر جاتا ہوں۔ تم آرام سے بیٹھی رہو۔"

آدھے گھنٹے کے بعد مشتاق صاحب آ گئے۔ آتے ہی بولے۔

"تمہاری بیگم کہاں ہیں؟"

میں نے کہا۔ "ویٹنگ روم میں ہے۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"سٹیشن کے سامنے بائیں جانب ہارڈنگ لائبریری ہے۔ تم نے دیکھی ہے؟"

"جی ہاں، مجھے معلوم ہے۔"

"بس میں گاڑی لے کر لائبریری کے گیٹ کے پاس ہوں گا۔ تم جمیلہ بھابھی کو لے کر وہاں آ جاؤ۔"

اتنا کہہ کر مشتاق صاحب پلیٹ فارم کے گیٹ کی طرف چل دیے۔ میں نے ویٹنگ روم میں آ کر جمیلہ کو ساتھ لیا اور گیٹ کی طرف بڑھا۔ چلنے سے پہلے میں نے ماحول کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔ وہاں ریلوے سٹیشن کے سنتری ضرور ادھر ادھر کھڑے تھے مگر ملٹری پولیس کا کوئی جوان نہیں تھا۔ جمیلہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ وہ ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ ہندو عورت لگتی تھی۔ پلیٹ فارم کے گیٹ پر ٹکٹ چیکر کو میں نے دونوں ٹکٹ دیے تو قریب ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے سگریٹ پیتے ہوئے ہمیں غور

سے دیکھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ یہ انٹیلی جینس کا آدمی ہے۔ میں نے ذرا سی بھی گھبراہٹ کا اظہار نہ کیا۔ ٹکٹ چیکر سکھ تھا۔ وہ ہمارے ٹکٹ لینے کے بعد ہمارے پیچھے آنے والے مسافروں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

میں جمیلہ کے ساتھ بڑے سکون سے چلتا سٹیشن کی ڈیوڑھی میں آ گیا جہاں بہت مسافر تھے اور شور سا مچا ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ انٹیلی جینس والے کی نظریں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافہ نیچے گرا دیا۔ جمیلہ رک گئی۔ میں نے لفافہ اٹھانے کے بہانے پیچھے گیٹ پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ وہ آدمی کرسی پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں مطمئن ہو گیا کہ اس شخص کی نگاہوں میں نہیں آیا۔ سٹیشن سے باہر آ کر میں بائیں جانب ہو گیا۔ ہر طرف روشنیاں تھیں۔ سڑک پر بہت ٹریفک تھی۔ لیڈی ہارڈنگ لائبریری سٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ہم فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لائبریری کے قریب آ گئے۔ لائبریری کے بڑے گیٹ کی ایک جانب پرانے ماڈل کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ گاڑی کے باہر کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں جمیلہ کے ساتھ گاڑی کی طرف بڑھا۔ قریب جا کر دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر مشتاق صاحب بیٹھے تھے۔ کھڑکی کا شیشہ نیچے اتار کر بولے۔

"دونوں پیچھے بیٹھ جاؤ۔"

انہوں نے شیشہ اوپر کر دیا۔ کیونکہ دلی میں کافی سردی تھی۔ ہم گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مشتاق صاحب نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ گاڑی سٹیشن سے نکل کر دلی کی سڑکوں پر آئی تو مشتاق صاحب نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھابھی جان آداب۔"

میں نے جمیلہ کو کہنی ماری۔ جمیلہ ایک بار پھر کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ چونک پڑی۔ میں نے کہا۔

"مشتاق صاحب نے سلام کیا ہے۔"

جمیلہ نے آہستہ سے وعلیکم السلام کہا اور خاموش ہو گئی۔ مشتاق صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

"تم نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا ہے کرم داد! تمہاری داستان آرام سے بیٹھ کر سنوں گا۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا ہم ہوٹل جا رہے ہیں؟"

"نہیں" انہوں نے کہا۔ "جمیلہ بھابھی کو ساتھ لے کر تمہارا ہوٹل میں ٹھہرنا خطرناک بات ہوگی۔ ہوٹل شری راج کے آدمی آتے جاتے رہتے ہیں۔"

جمیلہ میرے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ شری راج کا نام سن کر اس نے ایک جھرجھری سی لی تھی۔ وہ سچی تھی۔ شری راج ہی وہ بدمعاش تھا جس کے آدمی جمیلہ کو کلکتے سے خرید کر دلی لے گئے تھے اور شری راج ہی نے جمیلہ کو پجاری دیوگری کے حوالے کیا تھا۔

گاڑی دلی کی روشن روشن سڑکوں پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ میں اس شہر کی سڑکوں سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ گاڑی شہر کی زیادہ ٹریفک والی سڑکوں سے نکل کر ایک نسبتاً کم ٹریفک والی سڑک پر آ گئی تھی۔ میں نے مشتاق صاحب سے بالکل نہ پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ظاہر تھا کہ وہ ہمیں کسی ایسی جگہ لے جا رہے ہیں جہاں ہم شری راج اور انٹیلی جینس والوں کی نگاہوں سے محفوظ ہوں گے۔ گاڑی ایسے علاقے سے گزر رہی تھی جہاں دور دور کوٹھیوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ سڑک پر ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ کافی دیر کے بعد گاڑی بڑی سڑک کو چھوڑ کر ایک چھوٹی سڑک پر آ گئی۔ یہاں فاصلے فاصلے پر مکانوں کی روشنیاں تھیں۔ اونچے اونچے درخت بھی تھے۔ گاڑی ایک مکان کے آگے رک گئی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ ایک منزلہ مکان تھا۔ آگے دیوار تھی' دیوار میں دروازہ تھا جو بند تھا۔ مکان پر اندھیرا چھایا تھا۔ صرف ایک جانب شاید کچن یا غسل خانے کی بتی جل رہی تھی۔

ہم گاڑی سے باہر آ گئے۔ مشتاق صاحب نے کہا۔

"یہ میرا اپنا مکان ہے' ہوٹل کھولنے سے پہلے میں یہیں رہا کرتا تھا۔ یہاں تم لوگ

بالکل محفوظ ہو گئے۔"

مشتاق صاحب نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دوسری بار بٹن دبانے سے اندر برآمدے کی بتی روشن ہو گئی۔ کسی مرد کی آواز آئی۔ "میاں کون ہو؟"

مشتاق صاحب نے کہا۔

"چچا دروازہ کھولو۔"

"آگیا حضور۔"

اور فوراً دروازہ کھل گیا۔ ایک بوڑھے آدمی نے بڑے ادب سے ہمیں سلام کیا اور مشتاق صاحب سے پوچھا۔

"حضور! مہمانوں کا سامان گاڑی میں ہی ہے۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"نہیں چچا خیر دین' سامان نہیں ہے۔ تم جا کر بیڈ روم کھول دو۔"

مختصر سا آرام دہ اور الگ تھلگ مکان تھا۔ بیڈ روم میں دو پلنگ ساتھ ساتھ لگے تھے۔ بچھونا بچھا ہوا تھا۔ ملازم خیر دین نے بجلی کا ہیٹر اون کر دیا۔ مشتاق صاحب بولے۔

"چچا! مہمانوں کے کھانے کا انتظام کرو۔"

"جی حضور۔"

ملازم چلا گیا۔ جمیلہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس نے صرف ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے شانوں پر کمبل ڈال دیا۔ مشتاق صاحب کہنے لگے۔

"بھابھی کے لیے گرم کپڑوں کا بندوبست ہو جائے گا۔ باتھ روم ساتھ ہی ہے۔ وہاں گرم پانی بھی ہے۔ تم لوگ منہ ہاتھ دھو لو۔ میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔"

مشتاق صاحب کے جانے کے بعد میں نے جمیلہ سے کہا۔

"تم اندر جا کر نہالو۔ میں تمہارے بعد نہاؤں گا۔"

جمیلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے اٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی۔ میں بجلی کا

ہیٹر قریب کر کے پلنگ پر بیٹھا رہا۔ وہ نہانے کے بعد باہر آئی تو بالوں کو تولیے سے خشک کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم بھی نہالو۔"

میں نے بھی غسل کیا۔ گرم پانی نے جسم کو پھر سے تروتازہ کر دیا۔ غسل خانے میں ٹوتھ برش کنگھی تولیہ وغیرہ سب کچھ موجود تھا۔ اتنے میں مشتاق صاحب آ گئے۔ کہنے لگے۔

"تم لوگوں کے لیے نئے کپڑے اب صبح ہی آئیں گے۔ کھانا تیار ہو گیا ہے۔ آؤ کھانا کھالو۔"

ساتھ والے چھوٹے سے کمرے میں زمین پر قالین بچھا ہوا تھا۔ قالین پر دسترخوان بچھا تھا اور کھانا ملازم نے لگا دیا تھا۔ ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں نے مشتاق صاحب کو اپنی ساری رام کہانی سنا دی لیکن جمیلہ کے جسم پر سانپوں کے چلانے اور سانپوں کے منتر پھونکنے کا بالکل ذکر نہ کیا۔ یہی کہا کہ ناگ دیوی کے مندر میں جمیلہ کو پجاری دیوگری نے جمیلہ کو دوسری دیوداسیوں کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ گیا اور جمیلہ کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

مشتاق صاحب میری داستان سن کر بولے۔

"بڑی ہمت کی تم نے کرم داد۔ خدا کا شکر ہے کہ بھابھی کو ان کافروں کی قید سے نجات ملی۔ بس اب تم لوگوں کو صرف اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ بلا ضرورت اس مکان سے باہر نہ جانا۔ بھابھی کے فرار کا شری راج کو ضرور پتہ چل جائے گا۔ دیوگری پجاری چونکہ بدمعاش شری راج کا گرو ہے اس لیے اس کے آدمی بھابھی کی تلاش میں چاروں طرف نکل پڑیں گے۔ شری راج کے بعض آدمیوں نے بھابھی کو دیکھ رکھا ہے۔ اس لیے میں بھابھی کو بھی ہدایت کروں گا کہ بھابھی تم اس مکان کے اندر ہی رہنا۔"

میں نے مشتاق صاحب سے کہا۔

"مشتاق صاحب! آپ کے ہم پر پہلے ہی بڑے احسان ہیں۔ ایک احسان اور کر دیجئے

اور ہمیں کسی طرح پاکستان پہنچا دیں۔"

کھانا ہم کھا چکے تھے۔ مشتاق صاحب بولے۔

"میاں ہاتھ دھولو' بیٹھ کر بات کریں گے۔"

اس وقت بوڑھا ملازم خیر دین سلفچی رکھ کر ہمارے ہاتھ دھلا رہا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو ہم دیوار کے ساتھ لگے پرانے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ مشتاق صاحب نے جمیلہ سے کہا۔

"بھابھی! آپ اندر جا کر آرام کریں۔ آپ بہت تھکی ہوئی ہیں۔"

میں نے بھی جمیلہ سے کہا کہ وہ بیڈروم میں جا کر سو جائے۔ جمیلہ اٹھ کر چلی گئی۔ مشتاق صاحب میرے پاس ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ اس کمرے میں بھی بجلی کا ہیٹر چل رہا تھا جس کی وجہ سے کمرے کی فضا سرد نہیں رہی تھی۔ مشتاق صاحب بولے۔

"کرم داد بھائی! تم لوگوں کے پاکستان پہنچانے کا کام اتنا آسان نہیں ہے بلکہ اگر سوچا جائے تو جو حالات اس وقت ہیں ان حالات میں تمہارا بارڈر کراس کرنا ناممکن ہے۔ بھارت اور پاکستان کی جنگ اگرچہ ختم ہو چکی ہے مگر دونوں ملکوں کی فوجیں سرحدوں پر مورچہ بند ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہم پاکستانی سفارت خانے چلے جائیں تو ہماری مشکل حل ہو سکتی ہے۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں حالات کی سنگینی کا بالکل علم نہیں ہے۔ میاں کرم داد! دونوں ملکوں کے سفارت خانے ابھی تک بند ہیں۔ پاکستانی سفارت خانہ کھلا ہوتا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔"

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم بارڈر کراس کرنے کی بجائے یہاں سے برما یا دوبئی کی طرف نکل جائیں۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"ہوائی اڈوں اور بندرگاہوں پر بھی چیکنگ بڑی سخت ہوگی۔ وہاں تو تم لوگ فوراً پکڑے جاؤ گے۔ جہاں تک تمہارے انڈیا سے برما کی طرف نکلنے کا سوال ہے تو اس سلسلے میں حاجی فرید احمد صاحب ہی کچھ بتا سکیں گے۔ کیونکہ وہ کلکتے میں رہتے ہیں اور برما کی طرف بحری جہاز کلکتے کی بندرگاہ سے ہی چلتے ہیں۔ میں ان سے فون پر بات کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اس پوزیشن میں ہوئے تو تمہاری ضرور مدد کریں گے۔ تب تک تم اسی مکان میں رہو۔"

رات دس بجے کے قریب مشتاق صاحب چلے گئے۔ میں بیڈ روم میں گیا تو جمیلہ لحاف اوڑھے گہری نیند سو رہی تھی۔ سونے سے پہلے اس نے بجلی کا ہیٹر بند کر دیا تھا۔ میں دوسرے پلنگ پر لیٹ گیا۔ ذہن میں طرح طرح کی ترکیبیں آ رہی تھیں مگر انڈیا سے کوئی راہ فرار دکھائی نہیں دیتی تھی۔ دوسرے روز میری جلدی آنکھ کھل گئی۔ دن نکلا ہی تھا۔ جمیلہ ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہ خیال کیا۔ نہ جانے وہ کب سے جاگ رہی تھی۔ ملازم چچا خیر دین کچن میں چائے تیار کر رہا تھا۔ سردی اپنے جوبن پر تھی۔ خیر دین نے ناشتے کا پوچھا تو میں نے کہا کہ بیگم سو رہی ہیں۔ اٹھیں گی تو ناشتہ کریں گے۔ میں نے صرف چائے کی ایک پیالی پی اور واپس بیڈ روم میں آ گیا۔ جمیلہ نے پہلو بدلا۔ میں نے اسے نہ بلایا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے لحاف ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ پھر خود ہی اٹھ بیٹھی۔

میں نے پوچھا۔ "اب طبیعت کیسی ہے جمیلہ؟"

وہ اپنے بالوں کو پیچھے باندھتے ہوئے بولی۔

"بڑی مدت بعد گہری نیند سوئی ہوں۔ تم کب آئے؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔"

ہم نے بیڈ روم میں ہی ناشتہ کیا۔ میں نے وہ ساری باتیں جمیلہ کو بتا دیں جو میرے اور مشتاق صاحب کے درمیان بارڈر کراس کرنے کے سلسلے میں ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ کہنے لگی۔

"کیوں نہ ہم واپس بنگلہ دیش چلے جائیں۔ وہاں کے حالات اب ٹھیک ہو گئے ہوں گے۔ وہاں ہمارا مکان بھی ہے' دکان بھی ہے۔"

میں نے کہا۔

"بنگلہ دیش گئے تو مجھے فوراً گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس طرف واپس جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں ایک امید ہے کہ شاید کلکتے والے فرید احمد صاحب ہمارے رنگون کی طرف نکل جانے کا کوئی بندوبست کرا دیں۔ بحری جہاز میں نہ سہی ہم برما کی سرحد بھی کراس کر سکتے ہیں۔ اس طرف تو باڈر سیکورٹی اتنی سخت نہیں ہو گی۔"

جمیلہ نے کوئی جواب نہ دیا' اپنی کوئی رائے ظاہر نہ کی۔ گیارہ بجے مشتاق صاحب گاڑی میں آ گئے۔ وہ جمیلہ کے لیے اور میرے لیے نئے کپڑے لائے تھے۔ کہنے لگے۔

"بھابھی کے لیے میں دو ساڑھیاں ہی لایا ہوں۔ یہاں یہی پہناوا ٹھیک رہے گا۔ ایک گرم اونی جرسی اور لیڈیز کوٹ بھی لایا ہوں۔"

جمیلہ نے مشتاق صاحب کا شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے۔

"بھئی آپ ہماری بھابھی بھی ہیں اور ہمارے بچوں کی طرح بھی ہیں۔ میاں کرم داد! تمہارے لیے یہ گرم پتلون اور قمیضوں کا جوڑا ہے۔ جیکٹ تمہارے پاس پہلے ہی سے ہے۔ اگر کہو گے تو نئی گرم جیکٹ بھی آ جائے گی۔"

میں نے کہا۔

"مشتاق صاحب میری یہ پرانی جیکٹ کافی گرم اور ٹھیک ٹھاک ہے۔ نئی کی ضرورت نہیں ہے۔"

کہنے لگے۔

"میں نے کلکتے حاجی فرید صاحب کو فون کیا تھا وہ دکان پر نہیں تھے۔ نوکر نے کہا زکیٹ گئے ہیں۔ دوپہر کے بعد پھر فون کروں گا جو بات ہوئی تمہیں رات کو آ کر بتاؤں گا۔"

کچھ دیر بیٹھ کر مشتاق صاحب چلے گئے۔

جب شام کا اندھیرا ہو گیا تو جمیلہ نے مجھ سے کہا۔

"کیوں نہ تھوڑی دیر باہر چل پھر لیں۔ میں تو یہاں بیٹھی بیٹھی بور ہو گئی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "مشتاق صاحب نے باہر نکلنے سے منع کر رکھا ہے۔"

وہ بولی۔

"شام ہو گئی ہے یہاں اندھیرے میں ہمیں کون دیکھے گا۔ آؤ تھوڑی دیر باہر ٹہلتے ہیں۔ میرا تازہ ہوا میں جانے کو دل چاہتا ہے۔ ہم مکان کے قریب ہی رہیں گے۔"

میں نے سوچا ہم مکان کے پیچھے جو ویران جگہ ہے وہاں تھوڑی دیر ٹہل لیتے ہیں۔ اس طرح جمیلہ کی طبیعت بہل جائے گی۔ میں اسے لے کر مکان کے پیچھے آ گیا۔ یہ ایک غیر آباد کھلا میدان تھا جہاں کسی تاریخی عمارت کا شکستہ کھنڈر تھا۔ میں نے اس کھنڈر کو دن کے وقت دیکھا تھا۔ جمٹ پٹے کی فضا تھی۔ شام کافی گہری ہو گئی تھی۔ سخت سردی کی وجہ سے کہرا پھیلا ہوا تھا۔ جمیلہ نے گرم لیڈی کوٹ پہن رکھا تھا۔ میں نے بھی جیکٹ کے بٹن اوپر تک بند کیے ہوئے تھے۔ ہم مکان کے قریب ہی ٹہلنے لگے۔ میں اسے کہنے لگا خدا نے چاہا تو ہم بہت جلد پاکستان پہنچ جائیں گے۔ بڑی مصیبت کٹ گئی ہے۔ یہ دن بھی گزر جائیں گے۔

اندھیرے میں کافی دور دور مکانوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے بوسیدہ کھنڈر تک چلے گئے۔ وہاں سے واپس آنے لگا تو جمیلہ بولی۔

"یہ کوئی تاریخی جگہ معلوم ہوتی ہے۔"

رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں کھنڈر کی بارہ دری ایک بھوت کی طرح لگ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"دلی شہر اس قسم کے کھنڈرات سے بھرا پڑا ہے۔ چلو واپس چلتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "اس کھنڈر کے اندر جا کر دیکھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "پاگل ہو گئی ہو۔ وہاں سوائے مٹی اور پتھروں کے اور کیا ہو گا۔"

وہ ضد کرنے لگی تو میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ وہ آزردہ سی ہو گئی۔ میں نے اسے آہستہ

سے اپنے ساتھ لگایا اور کہا۔

"جمیلہ رات کے وقت ایسی جگہوں پر نہیں جایا کرتے۔ کیا خبر وہاں کوئی جن بھوت ہو۔ ایسی جگہیں آسیبی ہوا کرتی ہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور میرے ساتھ واپس مڑ گئی۔ میں ٹہلتے ٹہلتے دوبارہ کھنڈر کی طرف نہ گیا بلکہ دوسری طرف نکل گیا۔ ہم کوئی پچاس قدموں کے اندر اندر ٹہل رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ جمیلہ بار بار نگاہیں اٹھا کر کھنڈر کی طرف دیکھ لیتی تھی جو اب رات کی تاریکی میں کسی سیاہ فام چڑیل کا سر معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"سردی زیادہ ہو گئی ہے۔ واپس آ جاؤ۔"

مکان میں آ کر وہ بستر میں لیٹ گئی اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں کچن میں چلا گیا جہاں ملازم بوڑھا کھانا تیار کر رہا تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے مکان کے پچھواڑے والے کھنڈر کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا۔

"اس کھنڈر کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہاں بادشاہ اکبر کا ہاتھی دفن ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ مرہٹہ سردار ہولکر کی سپیرن بیوی کی مڑھی ہے۔ ہم نے تو اپنے بچپن کے زمانے سے اسی طرح دیکھا ہے۔"

سپیرن کے نام سے میں چونکا۔ میں نے مزید کریدتے ہوئے پوچھا۔

"مرہٹہ سردار کی سپیرن بیوی کون تھی؟"

چچا خیر دین بولا۔

"میاں! کہتے ہیں کہ جب مرہٹے دلی پر ہلے بول رہے تھے اور ان کا یہاں آنا جانا لگا رہتا تھا تو ایک بار مرہٹہ سردار ہولکر نے یہاں پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ یہاں سپیروں کی بستی تھی۔ اس نے ایک سپیرن کو دیکھا جو بہت خوبصورت تھی۔ سردار ہولکر نے اس سے شادی کر لی۔ کہتے ہیں شادی کی پہلی رات سپیرن کو کسی ناگ نے ڈس لیا اور وہ مر گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ناگ اسی سپیرن سے محبت کرتا تھا جو خود بھی ایک ناگن تھی۔ سردار ہولکر نے اسی جگہ سپیرن کو چتا میں نذر آتش کیا اور اس کی یاد میں ایک مڑھی بنا دی۔

چنانچہ اس کھنڈر کو لوگ ناگن کی مڑھی کہہ کر بھی پکارتے ہیں۔"

میرے دل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ جمیلہ پر سانپوں کے جو منتر پھونکے گئے ہیں کہیں انہوں نے اپنا اثر دکھانا شروع تو نہیں کر دیا۔ میں پریشان سا ہو کر واپس کمرے میں آیا تو جمیلہ سو رہی تھی۔ رات بھر میں پوری طرح سے نیند نہ لے سکا۔ مشتاق صاحب نے رات کو آنے کا کہا تھا مگر وہ دوسرے دن دوپہر کے وقت آئے۔ کہنے لگے۔

"کلکتے میں حاجی فرید احمد سے میری بات ہو گئی ہے۔ میں نے انہیں ساری بات سمجھا دی تھی۔ انہوں نے کہا ہے کہ کرم داد اور بھابھی کو ابھی دلی میں ہی کچھ روز رکھو۔ اتنی دیر میں یہاں معلوم کرتا ہوں کہ انہیں برما کی طرف بھجوانے کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

کچھ امید بندھ گئی تھی۔

مشتاق صاحب نے مزید کہا۔ "حاجی صاحب کو بھابھی کے واپس مل جانے کی بڑی خوشی ہوئی ہے۔ وہ تمہیں مبارک باد دے رہے تھے۔"

میں نے باتوں باتوں میں مشتاق صاحب سے بھی سپیرن کی مڑھی کے کھنڈر کے بارے میں پوچھا تو وہ بولے۔

"ارے میاں یہاں مغلوں سے پہلے کے کسی ہندو راجہ کی پالتو بلی سفر کے دوران مر گئی تھی۔ راجہ نے اس جگہ اس کی چتا بنا کر اسے باقاعدہ ہندوؤں کی رسم کے مطابق جلایا تھا۔ پھر اس نے بلی کی مڑھی بنا دی۔"

میں نے کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ یہ کسی سپیرن کی مڑھی ہے جو اصل میں ناگن تھی۔"

مشتاق صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ بولے۔

"بھائی کرم داد! دلی میں تمہیں بڑے داستان گو ملیں گے۔ ہر ایک کے پاس نئی کہانی ہو گی۔ اس کھنڈر میں دن کے وقت ایک کمہار اپنے گدھے باندھتا ہے۔ بے شک جا کر دیکھ لو۔"

مشتاق صاحب پر مجھے اعتماد تھا۔ ان کی باتوں نے میرے توہمات کو میرے ذہن سے نکال دیا۔ میرا یہ شک بھی ختم ہو گیا کہ جمیلہ پر سانپ منتروں کا اثر نمودار ہونا شروع ہو گیا ہے۔ دراصل میں جن حالات سے گزر کر آیا تھا اور جن حالات میں پھنسا ہوا تھا یہ ان کا تقاضا تھا کہ میرے دل میں اس قسم کے شک پیدا ہوں۔

مشتاق صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ان کا وہ آدمی جو دلی کے سب سے بڑے بدمعاش شری راج کا دست راست ہے اور ان کا واقف کار ہے ہوٹل میں آیا ہے۔

میں نے کہا۔ "کیا کہہ رہا تھا؟"

مشتاق صاحب نے کہا۔

"اس نے تو کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ چونکہ وہ میرا پرانا واقف کار ہے اور مسلمان ہے۔ میں نے خود ہی باتوں باتوں میں اس سے تمہاری بیوی کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگا مشتاق بھائی وہ عورت تو شری راج کے گورو دیو گری کے مندر سے بھی فرار ہو گئی ہے۔ شری راج کو بڑا دکھ ہوا ہے جس عورت کو انہوں نے اپنے گورو کی داسی بنایا تھا وہ انہیں دھوکہ دے گئی۔"

میں نے پوچھا۔

"آپ نے اور کیا کچھ معلوم کیا؟"

"اس نے یہ بھی بتایا کہ شری راج نے اپنے خاص جاسوسوں کو سنبھل پور اور دیو گڑھ کی جانب روانہ کر دیا ہے تاکہ وہ جمیلہ کو جہاں کہیں بھی ہو پکڑ کر واپس گورو دیو گری کے پاس پہنچا دیں یہ تو اس کے گمان میں نہیں ہے کہ تم لوگ دلی آ گئے ہو گے۔"

یہ بھی ایک دھڑکا مجھے لگ گیا۔ میں نے مشتاق صاحب سے کہا۔

"مشتاق صاحب! میرا تو خیال ہے کہ ہمیں جتنی جلدی ہو سکے کلکتے چلے جانا چاہیے۔ یہاں شرج راج کو ہماری بو مل گئی تو مجھے خطرہ ہے کہ کہیں جمیلہ پھر اغوا نہ ہو جائے۔ میں یہاں اجنبی ہوں۔ سوائے آپ کے مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا اور اس بدمعاش شری راج کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"ارے میاں تم جہاں بیٹھے ہو یہاں تمہاری ہوا کو بھی کوئی نہیں چھو سکتا۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تو آج ہی تمہیں کلکتے روانہ کر دوں مگر میں حاجی فرید صاحب کو وقت دینا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا ہے تو انہیں تم لوگوں کے بھارت سے نکالنے کا کوئی بندوبست کر لینے دو۔ میں انشاء اللہ پرسوں دوبارہ حاجی فرید صاحب کو فون کروں گا۔ اگر انہوں نے اشارہ دیا تو تم فوراً" کلکتے روانہ ہو جانا۔"

میری حالت یہ ہو گئی تھی کہ ایک مصیبت دور ہوتی تھی تو دوسری مصیبت سر اٹھا لیتی تھی۔ ایک پریشانی سے نجات ملتی تھی تو دوسری پریشانی شروع ہو جاتی تھی۔ مشتاق علی صاحب کی مرضی کے خلاف میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ میں از خود کوئی قدم اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں بنگلہ دیش سے بھاگ کر آیا تھا۔ مجھ پر مفرور جنگی قیدی کا الزام بھی تھا۔ میری بیوی کے پیچھے بقول کاویری کے کوئی نہ کوئی زہریلا سانپ بھی لگا ہوا تھا۔ اس اعتبار سے میں مجبور تھا کہ وہیں چھپ کر بیٹھا رہوں۔

مشتاق صاحب نے دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا۔ پھر وہ چلے گئے۔ رات کو سونے سے پہلے جمیلہ افسردہ سی ہو کر کہنے لگی۔

"مجھے نہیں لگتا کہ ہم پاکستان جا سکیں گے۔"

"تم خواہ مخواہ مایوس ہو رہی ہو۔ ادھر مشتاق صاحب ادھر کلکتے میں حاجی فرید صاحب ہمارے لیے کوششیں کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ ہم اپنے وطن پاکستان ضرور پہنچ جائیں گے۔"

رات گیارہ بجے تک میں اور جمیلہ باتیں کرتے رہے۔ وہ بڑی اداس اداس تھی۔ میرے بہلانے پر بھی اس کی اداسی دور نہ ہوئی۔ بار بار گہرے سانس لیتی اور بند دروازے کی طرف یوں دیکھتی جیسے کسی نے باہر سے اسے آواز دی ہو۔ میں اندر ہی اندر اس کی اس کیفیت کو دیکھ کر کافی پریشان تھا مگر میں سوائے اس کا دل بہلانے اور صبر کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے موم بتی بجھا دی اور ہم اپنے اپنے پلنگ

پر لحاف اوڑھ کر لیٹ گئے۔

مجھے جمیلہ کے کبھی کبھی زور سے سانس لینے کی آواز آتی تو میں لحاف کے اندر آنکھیں کھول کر کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا۔ کسی وقت اس کے سانس کی آواز مجھے ایسے لگتی جیسے کسی سانپ کی پھنکار ہو۔ میں آنکھیں بند کر لیتا اور خدا کے حضور دعا کرتا کہ اے پاک پروردگار تو میری بیوی کو اپنی حفاظت میں رکھنا۔ تو بخشنہار ہے۔ ہمارے گناہ معاف کر دینا۔ مجھے نیند آگئی۔ میں سو گیا۔ رات کو کسی وقت مجھے پیاس محسوس ہوئی۔ میں لحاف ہٹا کر اٹھا۔ کمرے میں بتی نہیں جل رہی تھی۔ میں نے ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔ جمیلہ اپنے پلنگ پر نہیں تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ غسل خانے کا بھی دروازہ بند تھا۔ میں نے خیال کیا کہ وہ غسل خانے میں گئی ہوگی۔ پلنگ کے پاس ہی تپائی پر پانی کی بوتل اور گلاس پڑا تھا۔ میں نے اس میں سے پانی نکال کر پیا اور بوتل بند کرتے ہوئے غسل خانے کی طرف دیکھنے لگا۔ غسل خانے میں خاموشی تھی۔ میں اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور جمیلہ کو آواز دی۔ اندر سے کسی نے جواب نہ دیا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ غسل خانہ خالی تھا۔

میں نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ کمرے کی چٹخنی کھلی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ جمیلہ کمرے سے باہر کہیں گئی تھی۔ مگر وہ اتنی سردی میں رات گئے باہر کیا کرنے جا سکتی ہے۔ میں کمرے سے باہر چلا آیا۔ کمرے کا دروازہ مکان کے پہلو والے چھوٹے سے برآمدے میں کھلتا تھا۔ برآمدے میں بلب روشن تھا۔ برآمدہ بھی خالی پڑا تھا۔ اب تو میں بہت پریشان ہوگیا۔ یا اللہ خیر۔ یہ عورت کہاں چلی گئی ہے۔ میں برآمدے سے نکل کر چھوٹے سے صحن میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر مکان کے صدر دروازے کی کنڈی کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر سردی میں ہو کا عالم تھا۔ میں مکان سے باہر نکل کر ادھر ادھر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اتنے میں ایک طرف سے ایک انسانی سایہ مجھے اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ میں وہیں بت بن کر کھڑا رہا۔ یہ جمیلہ ہی تھی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جمیلہ! تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"کمرے میں دل بہت گھبرانے لگا تھا۔ بس باہر تازہ ہوا میں ٹہلنے کے لیے نکل آئی تھی۔ تمہیں اس لیے نہ جگایا کہ تمہاری نیند خراب ہوگی۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ خدا کے لیے آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ اگر باہر ٹہلنے کو دل کرے تو مجھے جگا لینا۔ آؤ۔"

جمیلہ کے شانے گرم تھے۔ حالانکہ باہر بڑی سردی تھی اور اوس بھی گر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے میرے ساتھ چلتی مکان کے اندر آگئی۔ مجھے سخت سردی لگ رہی تھی مگر جمیلہ بغیر سویٹر کوٹ کے باہر نکل گئی تھی اور اسے بالکل سردی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"باہر نکلتے وقت کوٹ پہن لینا تھا۔ باہر کتنی سردی ہے۔"

"ہوں"۔

جمیلہ نے آہستہ سے ہوں کہا اور بیڈ روم میں آکر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ میں نے لحاف اس کے اوپر کر دیا۔ اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے تم بھی سو جاؤ۔"

مگر میری نیند اڑ چکی تھی۔ باقی کی ساری رات میں نے لحاف کے اندر لیٹے جاگ کر گزار دی۔ بار بار یہی خیال آتا رہا کہ جمیلہ کہاں گئی تھی؟ دل یہی کہتا کہ وہ ضرور ناگن کی مڑھی والے کھنڈر میں گئی ہوگی۔ اس کے بعد جمیلہ کے زور زور سے سانس لینے کی آواز بالکل نہیں آئی تھی۔ میں نے لحاف سے منہ نکال کر اس کے پلنگ کی طرف دیکھا۔ میں نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا ہوا تھا۔ کمرے کے روشندان میں سے پچھلے پہر پو پھٹنے کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ جمیلہ لحاف اوڑھے گہری نیند سو رہی تھی۔ ایک بار مجھے اس کے ہلکے ہلکے خراٹے لینے کی آواز بھی آئی۔ جب وہ گہری نیند میں ہوتی تھی تو ہلکے ہلکے

خراٹے لیتی تھی۔ اس نے کبھی دوسروں کو جگا دینے والے خراٹے نہیں لیے تھی۔ میرا دل اس کی محبت سے لبریز ہو گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ میری وجہ سے یہ اتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ نہ میں اسے بیاہ کر ڈھاکے لاتا' نہ اسے یہ مصیبت کے دن دیکھنے پڑتے۔

روشندان میں سپیدہ صبح نمودار ہونے لگا تو میں بستر چھوڑ کر اٹھ بیٹھا۔ دل میں کلمہ شریف پڑھ کر چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے۔ کرسی پر پڑی ہوئی گرم چادر جسم کے گرد لپیٹی۔ دبے پاؤں چلتا دروازے کے پاس آیا۔ کنڈی کھولی اور باہر نکل گیا۔ مکان سے باہر آ کر میں پچھواڑے والے میدان میں آ گیا اور دور سے اس منحوس کھنڈر کو دیکھنے لگا جس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں اور جس کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ جمیلہ رات کو اسی کھنڈر میں گئی تھی۔ وہ وہاں کیا کرنے گئی تھی؟ یہ مجھے معلوم نہیں تھا لیکن اتنا مجھے یقین تھا کہ وہ اسی کھنڈر میں رات کو گئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ سیر کرنے کے انداز میں منحوس کھنڈر کی طرف چل پڑا۔ میں اس کھنڈر کو دیکھنا چاہتا تھا کہ اس میں کون سی پراسرار بات ہے۔ سورج طلوع ہو چکا تھا اور کھنڈر کے گنبد پر سورج کی اولیں سنہری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ ایک گدھ گنبد کے اوپر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں کھنڈر کے قریب گیا تو وہ گدھ پھڑپھڑاتا ہوا اڑ گیا۔

کھنڈر کا گنبد ہندوؤں کے مندروں کے انداز کا تھا اور ایک طرف سے منہدم ہو چکا تھا۔ دیواروں کا بھی گارا چونا جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ فرش پر مٹی ہی مٹی تھی۔ میں ایک شکستہ دیوار کے پاس کھڑے ہو کر جائزہ لینے لگا۔ مجھے وہاں کوئی پراسرار یا خاص بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نیچے اتر کر کھنڈر کی دوسری طرف آ گیا۔ یہاں دیوار کے ساتھ سرکنڈے اگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ مجھے دیوار میں شگاف سا دکھائی دیا۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو شگاف کی دوسری طرف گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے پتھر اٹھا کر اندر پھینکا تو وہ ایک سیکنڈ کا وقفہ ڈال کر نیچے پکے فرش پر گرا۔ پکے فرش پر گرنے کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہاں مرہٹہ سردار نے کوئی تہہ خانہ بنایا ہو گا۔ میں نے شگاف میں سے جھانک کر

دیکھا۔ مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ نیچے تاریکی ہی تاریکی تھی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے ہی میں چند قدم پیچھے ہٹا میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ رنگ کا دو تین فٹ لمبا سانپ شگاف سے نکل کر سرکنڈوں کی جھاڑیوں کے درمیان سے ہوتا ہوا میدان کی طرف رینگنے لگا۔

میں سانپ کو دیکھنے لگا۔ سانپ میدان میں تیزی سے رینگتا ہوا اس طرف جا رہا تھا جس طرف وہ مکان تھا جہاں میں اور میری بیوی جمیلہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ سانپ کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ وہی دشمن سانپ نہ ہو جو جمیلہ کو ہلاک کرنے کے لیے اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اتنی دیر میں سانپ کافی آگے جا چکا تھا۔ میں اس کی طرف دوڑا۔ میں نے زمین پر سے پتھر اٹھا کر پوری طاقت سے سانپ پر دے مارا۔ ایک تو سانپ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا دوسرے وہ لہرا لہرا کر خاصی تیز رفتاری کے ساتھ جا رہا تھا اس لیے میرا وار خالی گیا۔ سانپ کا رخ ہمارے مکان کی طرف ہی تھا۔ میں یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ سانپ میری بیوی کو ڈس کر ہلاک کر دے جبکہ مجھے معلوم تھا کہ جمیلہ کمرے میں سو رہی ہے اور وہ سانپ سے اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکے گی۔ جو میرے ہاتھ میں آیا میں نے زمین پر سے اٹھا اٹھا کر سانپ پر پھینکنا شروع کر دیا۔ ایک لکڑی میرے ہاتھ آ گئی۔ میں نے زور سے سانپ پر پھینکی۔ لکڑی چھوٹی تھی مگر سانپ کی دم پر لگی اور سانپ نے پھنکار مار کر اپنا رخ بدل لیا۔ وہ مکان کی طرف جانے کی بجائے چھوٹی سڑک کی طرف تیزی سے بھاگ گیا اور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ میں نے زمین پر سے ایک اینٹ اٹھائی اور بڑی احتیاط کے ساتھ چل کر جھاڑیوں کے پاس آ گیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے کچھ روڑے اٹھا کر جھاڑیوں پر پھینکے۔ سانپ اندر سے نہ نکلا۔ اس وقت میرے پاس ریوالور نہیں تھا۔ ریوالور میرے پلنگ پر سرہانے کے نیچے تھا۔ میں نے ایک چھڑی سے جھاڑیوں کو ادھر ادھر ہلایا مگر سانپ تو جیسے غائب ہو گیا تھا۔ دیر تک میں جھاڑیوں کو ادھر ادھر ہلاتا رہا مگر سانپ دوبارہ نظر نہ آیا۔

میں نے اینٹ وہیں پھینکی اور دوڑ کر مکان کے اندر آ گیا۔ دروازہ بند کر دیا اور بیڈ روم میں گھس کر اس کا بھی دروازہ بند کر دیا۔ جمیلہ ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے اپنے

سرہانے کے نیچے سے ریوالور نکال کر اسے چیک کیا اور بیڈ روم سے نکل کر برآمدے میں آگیا۔ میری نگاہیں ادھر ادھر سانپ کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر سانپ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ریوالور میں نے جیب میں رکھ لیا۔ کچن میں سے بوڑھا خیرو نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا تسلا تھا۔ پانی ایک طرف پھینک کر اس نے مجھ سے پوچھا۔

"حضور چائے لے آؤں۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر ٹھہرو چچا۔"

واپس بیڈ روم میں آکر میں نے جمیلہ کو جگا دیا۔ میں اسے خبردار کرنا چاہتا تھا جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے دو فٹ لمبے کالے سانپ کو دیکھا ہے جو مکان کی طرف آ رہا تھا تو جمیلہ نے بغیر کسی تشویش کا اظہار کیے کہا۔

"ضرور وہ سنتھا ولی مٹھ کا سانپ ہو گا۔"

میں نے کہا۔

ہمیں اس مکان کو بدلنا ہو گا۔ میں نے سانپ کو مارنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کہیں غائب ہو گیا۔"

جمیلہ نے بالوں کو پیچھے باندھتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

"مکان کو بدلنے سے کیا ہو گا۔ میں جس مکان میں جاؤں گی سانپ میری بو سونگھتا ہوا اسی مکان میں آ جائے گا۔ وہ اتنی دور سے میری تلاش کرتا ہوا دلی پہنچ گیا ہے تو کیا یہاں سے دوسرے مکان میں نہیں آ سکے گا۔"

مجھے جمیلہ پر غصہ آگیا۔ وہ اس طرح باتیں کر رہی تھی جیسے سانپ کی حمایت کر رہی ہو۔ میں نے کہا۔

"تو کیا تم چاہتی ہو کہ سانپ آکر تمہیں اور مجھے ڈس کر مار ڈالے؟ یعنی ہم اسی جگہ بیٹھے رہیں؟ ہم اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہ کریں؟"

جمیلہ نے بھی مجھے غصے کی نگاہوں سے دیکھا۔ کہنے لگی۔

"یہ میں نے کب کہا ہے؟ ٹھیک ہے ہم یہ مکان بدل لیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ ہم آج ہی دلی شہر کو چھوڑ کر کلکتے چلے جائیں گے۔ حاجی صاحب وہاں سے ہمیں برما رنگون کی طرف نکالنے کا ضرور انتظام کر دیں گے۔"

اب مجھے ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا۔ مجھے یہی فکر لگ گیا کہ کہیں جمیلہ کا دشمن سانپ کسی طرف سے مکان کے اندر نہ گھس آئے۔ کسی وقت یہ سوچ کر کچھ تسلی سی بھی ہوتی کہ ہو سکتا ہے وہ جمیلہ کا دشمن سانپ نہ ہو۔ کوئی عام سانپ ہو اور ہمارے مکان میں جانے کی بجائے وہ کسی دوسری طرف جا رہا ہو۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ کالا سانپ جمیلہ کو ڈسنے جا رہا تھا' سوائے اس کے کہ سانپ کا رخ ہماری مکان کی طرف تھا۔ لیکن یہ اتفاق کی بات بھی ہو سکتی تھی کہ سانپ میدان عبور کر رہا تھا۔ اس کا رخ ہمارے مکان کی طرف بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن کاویری نے اور خود جمیلہ نے اپنی باتوں اور رویے سے میرے نفسیات کو اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ مجھے خوامخواہ یقین ہو رہا تھا کہ کالا سانپ سنتھا دلی مٹھ کے پجاری سپیروں کا چھوڑا ہوا سانپ ہے جو میری بیوی کو ہلاک کرنے آیا ہے۔

شام کو مشتاق صاحب آئے تو میں نے انہیں کہا کہ یہاں میں نے ایک سی آئی ڈی والے کو مکان کے گرد منڈلاتے دیکھا ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ مجھے یہاں سے کلکتے کی طرف نکل جانا چاہیے۔ مشتاق صاحب سی آئی ڈی کا سن کر فکر مند سے ہو گئے کہنے لگے۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ انٹیلی جنس کا آدمی تھا؟"

میں نے کہا۔

"میں سی آئی ڈی کے آدمیوں کو ان کے چہروں اور ان کی چال سے پہچان لیتا ہوں۔ مشتاق صاحب اور پھر وہ آدمی بار بار ہمارے مکان کی طرف دیکھتا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ آپ بھی کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔ اس لیے ہمیں اسی وقت ریلوے سٹیشن پہنچا دیں وہاں سے ہمیں کلکتے جانے والی کوئی نہ کوئی گاڑی مل جائے گی۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"میاں! کل دس گیارہ بجے کلکتے سے حاجی فرید صاحب نے ٹیلی فون کرنا ہے اور تمہیں برما پہنچانے کے بارے میں بتانا ہے۔ کم از کم کل کا دن تو ٹھہر جاؤ۔ یہ تو پتہ لگ جانے دو کہ حاجی فرید صاحب نے تمہارے بارے میں کچھ بندوبست کیا بھی ہے یا نہیں؟"

مشتاق صاحب کی دلیل معقول تھی۔ اب میں انہیں مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا کہ ہمیں کسی دوسرے مکان میں لے جائیں کیونکہ یہاں ہمیں ایک سانپ سے ڈر لگتا ہے۔ میں تذبذب میں پڑ گیا۔ آخر میں نے یہی کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ کل کا دن دیکھ لیتے ہیں۔ اگر حاجی فرید صاحب نے کلکتے سے فون پر یہ بھی بتایا کہ وہ ہمارے لئے کچھ نہیں کر سکتے تب بھی میں یہاں ٹھہرنا مناسب خیال نہیں کرتا کیونکہ انٹیلی جینس والوں کو مجھ پر شک پڑ گیا ہے کہ میں مفرور جنگی قیدی ہوں۔ اب کسی بھی وقت پولیس یہاں چھاپہ مار کر مجھے اور جمیلہ کو اور اس کے ساتھ آپ کو بھی گرفتار کر سکتی ہے۔"

مشتاق صاحب نے آہستہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے ایسی صورت میں میں تم دونوں کو اپنے رائے سینا کے علاقے والے کوارٹر میں لے چلوں گا۔ صرف آج کی رات تم یہاں رکے رہو۔"

اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔





مشتاق صاحب چلے گئے۔

اس وقت ابھی دوپہر ہی تھی۔ مشتاق صاحب سے میں نے جو باتیں کی تھیں ان کے بارے میں جمیلہ کو میں نے کچھ نہ بتایا۔ میں اس خیال سے پریشان تھا کہ سانپ کسی طرف سے مکان میں داخل ہو کر جمیلہ پر حملہ نہ کر دے مگر میں نے محسوس کیا کہ جمیلہ کو اس کی ذرا سی بھی فکر یا تشویش نہیں تھی۔ ایک بار جب میں نے اس سے سانپ کے سلسلے میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو اس نے بڑے آرام سے کہا۔

"سانپ آتا ہے تو اسے آنے دو۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

میں نے کہا۔ "لیکن مجھے تمہاری بھی تو فکر ہے۔"

وہ بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تمہیں کہہ دیا نا' سانپ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کچھ نہیں کہے گا اور وہ مجھے بھی کچھ نہیں کہے گا۔ اس کے بعد سانپ کا ذکر مت کرنا۔"

چونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس خطرے میں گھرے ہوئے مکان میں ہمیں صرف ایک ہی رات بسر کرنی ہے۔ کل یہاں سے نکل کر یا تو کلکتے کی طرف چل دیں گے یا مشتاق صاحب ہمیں اپنے دوسرے مکان میں لے جائیں گے اس لیے میں نے جمیلہ سے زیادہ بحث نہ کی اور خاموش رہا۔ مجھے اس مکان میں صرف ایک رات کسی نہ کسی طرح گزارنی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں یہ رات جاگ کر گزاروں گا۔

وہ رات میں نے سوتے جاگتے گزار دی۔ بیڈ روم کے دروازے کو میں نے اچھی طرح سے بند کر دیا تھا۔ غسل خانے میں ایک نالی تھی۔ نالی میں میں نے کپڑا ٹھونس دیا تھا تاکہ سانپ اس میں سے اندر نہ آ جائے۔ رات گزر گئی۔ جمیلہ ساری رات سکون کے ساتھ سوئی رہی۔ سانپ کی طرف سے اسے ذرا بھی پریشانی نہیں تھی۔ اس کے اس رویے سے مجھے تشویش بھی ہوتی اور حیرانی بھی۔ یہ وہ عورت تھی کہ سانپ کے نام سے ڈر جایا کرتی تھی اور اب جبکہ ایک سانپ اس کے پیچھے لگا ہوا تھا وہ بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ دن نکل آیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ باہر آ کر دیکھا سانپ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ مجھے اب یقین سا ہو گیا تھا کہ جس سانپ کو میں نے کل ناگن والی مڑھی کی جھاڑیوں سے نکلتے دیکھا تھا وہ کوئی عام سانپ تھا۔ جمیلہ کے پیچھے لگا ہوا سانپ نہیں تھا۔ شام سے پہلے پہلے میں دلی سے نکل جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن مشتاق صاحب نے آ کر بتایا کہ حاجی فرید صاحب کے چھوٹے بھائی کا کلکتے سے فون آیا ہے کہ حاجی صاحب بازار گئے ہوئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ جب تک میں نہ کہوں کرم داد کو کلکتے نہ بھیجا جائے۔ میں مایوس سا ہو گیا۔ مشتاق صاحب نے کہا۔

"بھائی! حاجی صاحب تمہارے لیے ہی تگ و دو کر رہے ہیں۔ جب وہ تمہارے کام میں لگے ہوئے ہیں تو بہتر یہی ہے کہ تم ابھی یہیں ٹھہرے رہو۔ اگر تمہیں انٹیلی جینس والوں کا خطرہ ہے تو میں کل صبح صبح تمہیں اپنے رائے سینا والے کوارٹر میں لے چلوں گا۔ لیکن میں تمہیں ان حالات میں کلکتے جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ جبکہ حاجی فرید صاحب بھی وہاں نہیں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں آپ کے مشورے پر ہی عمل کروں گا لیکن اس مکان سے میں آج سے چلے جانا چاہتا ہوں۔"

مشتاق صاحب نے بتایا کہ رائے سینا والے کوارٹر میں ان کا ایک باہر سے آیا ہوا مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ کل صبح کی گاڑی سے جبل پور جا رہا ہے۔ اس لیے ہمیں کل دوپہر کے وقت ہی کوارٹر خالی مل سکے گا۔ میں مجبور ہو گیا۔ ایک اور رات مجھے اسی مکان

میں ٹھہرنا تھا۔ جمیلہ کو ان حالات کا علم ہوا تو کہنے لگی۔

"تم یہاں سے دوسرے مکان میں کیوں جا رہے ہو؟ یہاں کیا وقت ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے تمہارے دشمن سانپ کا ڈر ہے میں یہ تمہاری خاطر کر رہا ہوں۔"

وہ بولی۔ "جیسے تمہاری مرضی۔"

جمیلہ نے حالات کو ہر کیفیت میں قبول کر لیا ہوا تھا۔ یہ بات بھی بڑی عجیب تھی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں دھوپ میں مکان کے پچھواڑے ٹہل رہا تھا کہ میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو تھوڑے فاصلے پر کیکر کے درخت کے نیچے کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ اس طرف دیکھا تو وہ آدمی وہاں نہیں تھا۔ میں واپس مکان کی طرف آیا تو اسی آدمی کو میں نے ایک بار پھر دیکھا۔ وہ کچی سڑک کے کونے والے درختوں کے پاس کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بھارتی انٹیلی جینس کا آدمی ہے اور اس کو کہیں سے میرا سراغ مل گیا ہے۔ میں مکان کے دروازے کے باہر پرانی کرسی پر دھوپ میں بیٹھ گیا۔ دراصل میں اس آدمی کی نقل و حرکت نوٹ کرنا چاہتا تھا۔ وہ مشکوک آدمی درختوں میں کہیں گم ہو گیا۔

میں کمرے میں آ کر سوچنے لگا کہ اگر یہ واقعی انٹیلی جینس والوں کا آدمی ہے تو ہمارا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لیکن میں جمیلہ کو لے کر خود کسی طرف نہیں جا سکتا تھا۔ مشتاق صاحب نے مجھے سخت سے ادھر ادھر جانے سے منع کر رکھا تھا۔ جمیلہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی بال ٹھیک کر رہی تھی۔ میں نے اس سے سی آئی ڈی والے آدمی کی کوئی بات نہ کی۔ مشتاق صاحب بھی آ گئے۔ میں نے ان سے ذکر کیا تو وہ کہنے لگے۔

"میاں! کسی طرح آج کی رات گزار لو۔ کل میں تم لوگوں کو یہاں سے لے جاؤں گا۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ وہ انٹیلی جینس کا آدمی نہ ہو۔"

مشتاق صاحب چلے گئے۔ ابھی دن پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا۔ جمیلہ پلنگ پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ میں لاہور، جہلم اور راولپنڈی کی باتیں کرنے لگا۔ ان شہروں میں ہی ہمارے عزیز رشتے دار رہتے تھے۔ وہ خاموشی سے چائے بھی پیتی رہی اور میری باتیں بھی

سنتی رہی۔ پھر سرد آہ بھر کر پیالی تپائی پر رکھتے ہوئے بولی۔

"خدا جانے ہمیں پاکستان جانا نصیب بھی ہو گا یا نہیں۔"

میں نے اس کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔

"انشاء اللہ! ہم بہت جلد پاکستان پہنچ جائیں گے۔ اتنی بھاری مصیبت سے نکل آئے ہیں تو یہ مصیبت بھی کٹ جائے گی اور ہم پاکستان پہنچ کر نئی زندگی شروع کریں گے۔"

اس روز بڑی سردی تھی۔ آسمان پر بادل تھے اور کہر سا چھایا ہوا تھا۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی۔ میں اور جمیلہ چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ بجلی کا ہیٹر لگا ہوا تھا۔ میری عادت تھی کہ رات کو ریوالور میں سرہانے کے نیچے رکھ کر سوتا تھا اور دن کے وقت اسے اپنی گرم جیکٹ کی جیب میں رکھ لیتا تھا۔ جمیلہ کو میرے ریوالور کا علم تھا۔ مشتاق صاحب کو میں نے ریوالور کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ مجھ سے لے لیں گے کیونکہ وہ بغیر لائسنس کے تھا۔ ملازم چچا خیر دین کچن میں رات کے لیے کھانا تیار کرنے میں لگا ہوا تھا۔ سردی اور کہر کی وجہ سے باہر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی کسی وقت دور سڑک پر سے کسی لاری یا سکوٹر کے گزرنے کی آواز آ جاتی تھی۔ میں پاکستان کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا کہ اتنے میں دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں نے جمیلہ کی طرف اور اس نے میری طرف دیکھا۔ یہ کوئی اجنبی ہی ہو سکتا تھا جس کو پتہ نہیں تھا کہ مکان کے باہر والے دروازے پر گھنٹی کا بٹن بھی لگا ہوا ہے۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"تم بیڈ روم میں چلی جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں کون ہے؟"

وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ میں دروازہ کھول کر باہر آیا تو دیکھا کہ ایک لمبے قد کا بھاری بھرکم آدمی کھڑا ہے۔ کہنے لگا۔

"مجھے مشتاق صاحب نے بھیجا ہے۔ آپ کے لیے ایک ضروری پیغام ہے۔ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"

مشتاق صاحب کا نام سن کر میں نے اسے اندر بلا لیا۔ اندر آ کر اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور بولا۔

"آپ نے کمرہ خوب گرم کر رکھا ہے کیا آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟"

میرا ماتھا ٹھنکا مشتاق صاحب کا بھیجا ہوا آدمی اس قسم کے سوال نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔ آپ بتائیں مشتاق صاحب نے کیا پیغام بھجوایا ہے؟"

وہ آدمی ابھی تک بند دروازے کے آگے ہی کھڑا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"بات یہ ہے کہ ہمیں تمہارے بارے میں ایک ایک بات کا علم ہو چکا ہے۔ تم پاک فوج کے افسر ہو اور جنگی قیدیوں کی ٹرین سے فرار ہوئے ہو۔ میں ملٹری انٹیلی جینس کا آدمی ہوں اور تمہیں گرفتار کرنے آیا ہوں۔"

ایک بار تو مجھے کمرہ گھومتا ہوا نظر آیا۔ مگر فوراً ہی میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں پاکستان آرمی کا آفیسر نہیں ہوں اور نہ ہی میں کوئی مفرور جنگی قیدی ہوں۔ مسلمان ضرور ہوں۔ بھوپال میں میری منیاری کی دکان ہے۔ دلی مال خریدنے آیا ہوں اور مشتاق صاحب کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ میرا کسی پاکستانی آرمی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

اس آدمی نے بڑے آرام سے کوٹ میں سے ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں مجھے پستول نظر آیا۔ کہنے لگا۔

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ ہماری انٹیلی جینس نے ہمیں تمہاری فل رپورٹ دی ہے۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ چپ چاپ میرے آگے لگ کر باہر آ جاؤ۔ اگر تم نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے تو فوجی کوارٹر گارڈ میں ہمارے افسروں کے آگے کہنا۔ چلو' باہر نکلو۔"

جمیلہ نے یہ بے وقوفی کی کہ جیسے ہی اس نے کمرے میں باتوں کی آواز سنی تو دروازہ

کھول کر کمرے میں آ گئی۔ اٹھیلی جینس کے آدمی نے جمیلہ کی طرف دیکھا اور بولا۔

"بہت خوب تمہارے ساتھ ایک عورت بھی ہے؟ یہ بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔"

اس نے پستول کی نالی کا رخ جمیلہ کی طرف کر کے کہا۔

"تم بھی آ جاؤ۔"

یہ بڑی نازک گھڑی تھی۔ زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا ایک دو سیکنڈ کے اندر ہی کرنا تھا۔ اگر ہم دونوں اس آدمی کے ساتھ چلے جاتے ہیں تو یہ نہ صرف میری اور جمیلہ کی اذیت ناک موت تھی بلکہ ہمارے محسن مشتاق صاحب کا بھی مستقبل تباہ ہو سکتا تھا۔ بھرا ہوا ریوالور میری جیکٹ کی جیب میں تھا۔ میں اس کا سیفٹی کیچ ہر وقت کھول کر رکھتا تھا۔ میں کوئی اناڑی سویلین نہیں تھا۔ پاک فوج کا تربیت یافتہ فوجی اور کمانڈو تھا۔ جمیلہ کا رنگ زرد ہو چکا تھا۔ فیصلہ میں نے کر لیا تھا لیکن اپنے فیصلے پر عمل کرنے کے لیے مجھے دو تین سیکنڈ کی ضرورت تھی۔ آپ کے لیے دو تین سیکنڈ کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہوں گے لیکن ایک کمانڈو ایکشن میں آنے کے لیے اتنا وقت بہت ہوتا ہے۔ میں ایک دو سیکنڈ اس آدمی سے بات کرنے میں گزارنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ پہلے ہی اس طرح جیکٹ کے اندر بغلوں میں دے لیے تھے جیسے مجھے سردی لگ رہی ہو۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ آہستہ سے اٹھ کھڑا۔ وہ آدمی پستول تانے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"خبردار! کوئی بے وقوفی مت کرنا۔ مجھے تمہیں گولی مارنے کا بھی آرڈر ہے۔"

میں نے کہا۔

"مہاراج! میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ میں وہ آدمی نہیں ہوں جس کی آپ کو تلاش ہے۔"

"بکواس بند کرو۔۔۔"

وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جو تین لفظ وہ بول چکا تھا وہ اس کی زندگی کے آخری الفاظ تھے۔ میں نے بغلوں میں ہاتھ دے رکھے تھے اور اسی دوران اپنا سیدھا ہاتھ جیکٹ کی اندر والی جیب میں ڈال کر ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ جس طرح بجلی چمک

کر غائب ہو جاتی ہے، میرا خیال ہے اس سے بھی کم وقت لگا ہو گا۔ میں نے ریوالور باہر نکالا' اس آدمی پر فائر کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے آپ کو دائیں جانب صوفے پر گرا دیا۔ اس خیال سے کہ اس آدمی کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ گھبرا کر فائر کر سکتا تھا۔ لیکن میرے ریوالور کے سلینسر سے جو گولی نکلی وہ سیدھی اس کے دل میں پیوست ہو چکی تھی۔ پستول اس کے ہاتھ میں ہی رہ گیا اور وہ پیچھے کو دھڑام سے گر پڑا۔

جمیلہ کے حلق سے خشک سی چیخ نکل گئی۔ میں نے اسے کہا۔

"اب آواز نہ نکالنا۔"

میں نے جھک کر اس آدمی کی طرف دیکھا۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ اس کا منہ ذرا سا کھلا تھا اور آنکھیں مردہ ہو چکی تھیں۔ میں نے اس کی گردن کی ایک جانب ہاتھ رکھ دیا۔ گردن کی وہ رگ جو تھوڑی دیر پہلے ضرور دھڑک رہی ہو گی اب ساکت ہو چکی تھی۔ وہ مر چکا تھا' جمیلہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اب کیا ہو گا؟" وہ فکر مند ہو کر بولی۔

میں نے کہا۔ "اب کچھ نہیں ہو گا۔ اگر یہ شخص زندہ رہتا تو بہت کچھ ہو جانا تھا۔"

میں نے جمیلہ کو بتایا کہ یہ انٹیلی جنیس کا آدمی تھا اور مجھے اپنے ساتھ ملٹری پولیس کے ہیڈ کوارٹر لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب میں اس کا شناختی کارڈ نکال کر دیکھا۔ اس کا نام ہریش چندر تھا اور ملٹری انٹیلی جنیس کا وی سی او تھا۔ میں نے دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ چونکہ میرے ریوالور کے آگے سلینسر لگا ہوا تھا اس لیے فائر کا دھماکہ نہیں ہوا تھا۔ باہر شام کا اندھیرا کہرے میں گھل مل گیا تھا۔ میں نے کچن کی طرف نگاہ ڈالی۔ کچن کی بتی جل رہی تھی اور پانی گرانے کی آواز آئی۔ چچا خیر دین کھانا پکانے میں مصروف تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ مکان میں ایک آدمی کا خون ہو گیا ہے۔ جمیلہ گھبرائی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

"اس لاش کو کہاں چھپاؤ گے۔ ہم ضرور کسی مصیبت میں پھنسنے والے ہیں۔"

میں نے اسے آہستہ سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم بیڈ روم میں کمرہ بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ میں سب کچھ کر لوں گا۔ جاؤ۔"

وہ اٹھ کر بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ میں نے دروازہ کھول کر ایک بار پھر کچن کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہاں خاموشی تھی۔ سردی اور کہرے کی وجہ سے کچن کا دروازہ بند تھا۔ مکان کی دائیں جانب اندھیرا تھا۔ میں لاش کو کسی ایسی جگہ پھینکنا چاہتا تھا جہاں کسی کو پتہ نہ چل سکے اور لاش بھی غائب ہو جائے۔ اچانک مجھے ناگن کی مڑھی والے شگاف کا خیال آگیا۔ شگاف کے اندر یقیناً کوئی اندھا کنواں تھا۔ میں نے شگاف میں پتھر پھینک کر دیکھا تھا۔ پتھر کافی نیچے جا کر زمین سے ٹکرایا تھا۔ میں لاش کو اگر شگاف کے اندر پھینک دوں تو قیامت تک کسی کو پتہ نہیں چل سکے گا۔ میں تیزی سے بیڈ روم میں جمیلہ کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ میں لاش کو ناگن کی مڑھی کی طرف لے جا رہا ہوں۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں جمیلہ پلنگ پر لحاف گھٹنوں تک لیے سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ یقیناً وہ بھی سوچ رہی ہوگی کہ ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ آرام چین سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنا بڑا خونی انقلاب آ جائے گا اور ہم دربدر ہو جائیں گے۔ اس نے صرف نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ میں بیڈ روم کا دروازہ بند کر کے لاش والے کمرے میں آگیا۔ انٹیلی جینس والے کی لاش اسی طرح پڑی تھی۔ میں نے اسے اپنے کندھے پر ڈالا اور بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر رات کے سرد اندھیرے میں نکل آیا۔ لاش کا اتنا وزن نہیں تھا۔ میں نے اسے اس طرح کندھے پر ڈالا تھا کہ اس کا سر کی طرف سے آدھا دھڑ پیچھے لٹک رہا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لے رکھا تھا۔

مکان کے پچھواڑے میدان اندھیرے اور کہرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے سمت کا علم تھا۔ میں چل پڑا۔ جب میدان ختم ہوا تو کہرے اور اندھیرے کی چادر میں سے ناگن والی مڑھی کے کھنڈر کا خاکہ ابھرا۔ میں لاش کو لے کر اس کے پیچھے کی طرف آگیا۔ یہاں وہ سرکنڈے تھے جن کے پیچھے دیوار میں شگاف تھا۔ میں نے شگاف کے پاس آ کر لاش کو زمین پر رکھ دیا اور سانس درست کرنے کے بعد شگاف میں ایک بار پھر پتھر پھینکا۔ پتھر کافی

نیچے جا کر زمین سے ٹکرایا۔ ٹکرانے کی آواز ایسی تھی جیسے وہ اینٹوں اور پتھروں پر گرا ہو۔ میں نے لاش کو شگاف میں دھکیل دیا۔ کوئی تین سیکنڈ کے بعد لاش کے زمین کی تہہ میں گرنے کی آواز آئی۔ یہ مجھے بڑی اچھی جگہ مل گئی تھی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں تیز تیز چلتا ہوا واپس آیا اور جمیلہ کو بتایا کہ سب ٹھیک ہوگیا ہے۔ اب فکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک بار پھر پر اسرار ہوگئی تھی۔ ایک بات مجھے ضرور پریشان کر رہی تھی۔ وہ بات یہ تھی کہ انٹیلی جینس والے جب کسی مشتبہ کی جاسوسی کرنے نکلتے ہیں تو وہ اپنے تھانے یا ہیڈ کوارٹر میں عام طور پر بتا کر آتے ہیں کہ وہ کس طرف اور کہاں جا رہے ہیں بلکہ یہ وہ رجسٹر میں اپنے ہاتھ سے درج کر کے نکلتے ہیں۔ اگر اس آدمی نے بھی لکھ دیا ہوگا کہ وہ کہاں جا رہا ہے تو جب وہ رات کو واپس اپنے ہیڈ کوارٹر یا اپنے گھر نہیں پہنچے گا تو پولیس اس کی تلاش میں ہمارے علاقے میں آ سکتی تھی۔

بہرحال مجھے جو کچھ کرنا تھا میں نے کر دیا تھا۔ ایک اطمینان ضرور تھا کہ ہم دوسرے روز مکان بدل کر رائے سینا والے کوارٹر میں جا رہے تھے اور وہاں ہمیں اس وقت تک رہنا تھا جب تک کلکتے سے حاجی فرید صاحب کا یہ پیغام نہیں آتا کہ کرم داد کو کلکتے روانہ کر دو۔ رات گزر گئی دوسرے دن مشتاق صاحب گاڑی لے کر آئے اور ہمیں اپنے ساتھ دلی کے رائے سینا والے علاقے میں واقع کوارٹر میں لے گئے۔ یہ کوارٹر مٹی کے چھوٹے ٹیلے کے عقب میں تھا۔ اکیلا کوارٹر تھا۔ ٹیلے کو کیکر کے درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہاں کوئی ملازم بھی نہیں تھا۔ مشتاق صاحب کہنے لگے۔

"میں راشن وغیرہ خود لے آؤں گا۔ بھابھی کھانا وغیرہ بنا دیا کرے تو تمہارے حق میں بڑا اچھا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں میرا کوئی نوکر وغیرہ دیکھے۔"

وہ چلے گئے اور کچھ دیر بعد ہمارے لیے آٹے، چاول کے تھیلے اور گھی، چائے اور اسی قسم کی ضروری چیزیں لے کر آگئے۔ خشک دودھ کا ایک ڈبہ بھی لائے تھے۔ میں نے کہا۔

"مشتاق صاحب ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہرنا۔ آپ تو بہت سامان لے آئے

ہیں۔"

کہنے لگے۔ "میاں کرم داد! حاجی فرید صاحب تمہیں برما پہنچانے کا جب تک پکا انتظام نہیں کر لیتے تمہیں اسی جگہ رہنا ہو گا۔ حاجی صاحب پریکٹیکل آدمی ہیں۔ ہو سکتا ہے انہیں ایک مہینہ لگ جائے۔"

میں نے فوراً کہا۔ "نہیں نہیں مشتاق صاحب اتنی دیر نہیں لگنی چاہیے۔"

مشتاق صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی شفقت سے کہا۔

"یہاں ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں' شام کو آؤں گا۔ تم لوگ کوشش کرنا کہ کوارٹر میں ہی رہو۔ مجھے صرف دلی کی خفیہ پولیس کا ڈر ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔"

دلی کی خفیہ پولیس کا مجھے مشتاق صاحب سے زیادہ ڈر تھا۔ اب تو میں نے ان کے ایک عہدے دار کو قتل بھی کر ڈالا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ پولیس جہاں ہم پہلے رہ رہے تھے اور جہاں میں نے خفیہ پولیس والے کو ٹھکانے لگایا تھا وہاں جا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ جو لوگ یہاں رہ رہے تھے وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ اگرچہ مشتاق صاحب نے اپنے بوڑھے ملازم خیر دین کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ ہمارے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے۔ اگر کوئی آ کر پوچھے بھی تو یہی کہا جائے کہ یہ مکان عرصے سے خالی پڑا ہے۔ لیکن پولیس کو اب صرف میری تلاش ہی نہیں تھی بلکہ اپنے عہدہ دار کے قاتل کی تلاش بھی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ بوڑھے ملازم کو پکڑ کر تھانے لے جائے۔ بوڑھا ملازم پولیس کا تشدد زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس نے بتا دیا کہ ہم رائے سینا والے کوارٹر میں آ گئے ہیں تو مجھ پر بہت بڑی مصیبت نازل ہو سکتی تھی۔

ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اگر دو ایک دن تک کلکتے سے حاجی صاحب کا کوئی پیغام نہیں آتا تو نہ آئے۔ میں جمیلہ کو لے کر خود ہی کلکتے کی طرف فرار ہو جاؤں گا۔ دلی میں میرے لیے ہر طرف اب خطرہ ہی خطرہ تھا۔ ہم صبح کے وقت رائے سینا والے کوارٹر میں منتقل ہوئے تھے۔ دوپہر کو جمیلہ نے خود ہی چاول

وغیرہ پکائے۔ کوارٹر پرانے ٹائپ کا تھا۔ صرف دو کمرے تھے۔ معمولی سا گرد آلود فرنیچر تھا۔ سردی سے بچاؤ کے لیے مشتاق صاحب نے بجلی کا ایک ہیٹر لا کر رکھ دیا تھا۔ ایک کمرے میں دو چار پائیوں پر بستر لگے تھے۔ لحاف پڑے تھے۔ ہم کھڑکیاں وغیرہ بند رکھتے تھے۔ علاقہ دور دور تک غیر آباد تھا۔ سامنے درختوں کے درمیان ایک خشک نالہ تھا جس میں کوڑا کرکٹ پڑا تھا۔ میں نے اردگرد کے ماحول کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔ نالے کے پار چند ایک کچے مکان تھے جہاں کسی وقت بچے کھیلتے یا کوئی مرد یا عورت ادھر ادھر آتی جاتی نظر آ جاتی تھی۔ خشک نالے پر لکڑی کا پرانا پل بنا ہوا تھا۔ پل کے ہماری طرف والے سرے پر ایک بھٹیارن کا تندور تھا۔ دوپہر کے وقت کچے مکانوں کی عورتیں روٹیاں لگوانے آ جاتی تھیں۔ مگر یہ سب کچھ ہمارے کوارٹر سے کافی فاصلے پر تھا۔ یہ سارا سکرین پلے اور علاقہ دیکھنا میرے لیے بہت ضروری تھا تاکہ اگر کوئی ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے تو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے کس طرف سے نکلنا ہو گا۔

شام ابھی نہیں ہوئی تھی۔ میں کوارٹر کے تنگ صحن میں ادھ کھلے دروازے کے پاس جیکٹ کے کالر اوپر اٹھائے' جیبوں میں ہاتھ دیے لوہے کی کرسی پر بیٹھا تھا کہ مجھے بین کی آواز سنائی دی۔ کوئی سپیرا اس طرف آ رہا تھا۔ مجھے ایک دم سے سنتھا ولی کے مٹھ کے پجاری سپیرے کا خیال آ گیا۔ کادیری نے کہا تھا بلکہ بعد میں مجھے جمیلہ نے بھی بتایا تھا کہ سنتھا ولی مٹھ سے فرار ہونے کے بعد کوئی نہ کوئی پجاری سپیرا یا سانپ اس کا پیچھا کرے گا۔ میں جلدی سے اٹھ کر دروازے میں آیا اور جس طرف سے بین کی آواز آ رہی تھی اس طرف دیکھا۔ ایک سپیرا بین بجاتا چلا آ رہا تھا۔ کوارٹر کے دروازے پر اس نے مجھے دیکھا تو بین منہ سے ہٹا کر مجھے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور کہا۔

"گھر گرہستیاں پھلیں۔ پھولیں ناگ ناگن کا جوڑا دکھاتا ہوں۔ کیلاش پربت سے پکڑ کر لایا ہوں----"

وہ بولے جا رہا تھا اور وہیں بیٹھ کر جھولے سے پٹاری نکال کر اس کے گرد لپٹی ہوئی رسی کھول رہا تھا۔ کالے رنگ کا بوڑھا سپیرا تھا۔ سر پر اس نے گیروے رنگ کا کپڑا لپیٹ

رکھا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے سانپ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے بابا۔ تم کسی بستی میں جا کر بچوں کو اپنا تماشہ دکھاؤ۔ مگر اس دوران وہ سانپوں کا ایک جوڑا باہر نکال چکا تھا۔ رومال سے اس نے سانپوں کو چھوا تو دونوں سانپوں نے پھن اٹھا دیے۔ ساتھ ساتھ سانپوں سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ جب میں نے اسے سختی سے کہا کہ وہ چلا جائے تو وہ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج! آپ ایسے دھن والوں کے بھروسے ہم اپنی روزی روٹی کماتے ہیں۔ کچھ مل جائے اور کچھ نہیں تو گھر میں باسی روٹی پڑی ہو تو وہ ہی دے دیں۔ بڑی بھوک لگی ہے۔۔۔۔"

لیکن میں نے اسے ڈانٹ دیا اور کہا۔

"سانپوں کو پٹاری میں ڈالو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

سپیرے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"ناراض نہ ہو باباجی چلے جاتے ہیں۔"

پھر اس نے سانپوں کو پٹاری میں ڈال کر جھولے میں ڈالا۔ جھولا کندھے پر لٹکایا اور بین بجاتا وہاں سے آگے چل دیا۔ میں اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ میں نے کوارٹر کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی اور کمرے میں آ گیا۔ دونوں چارپائیاں خالی تھیں۔ جمیلہ وہاں نہیں تھی۔ میں پریشان ہو گیا۔ باتھ روم کمرے کے باہر ایک جانب تھا۔ میں نے جمیلہ کو آواز دی تو باتھ روم کے اندر سے اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"سپیرا چلا گیا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں چلا گیا۔ باہر آ جاؤ۔"

وہ باہر آئی تو میں نے دیکھا کہ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور خوف کے مارے اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور پیار کرتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں اتنا خوف کھاتی ہو۔ کوئی سپیرا اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور پھر میں جو

تمہارے پاس ہوں۔"

وہ خشک پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ میں اسے کمرے میں لے آیا۔ اسے چارپائی پر لٹا کر لحاف اوپر کر دیا اور کہا۔

"میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں۔"

اس کا جسم سرد ہو رہا تھا۔ کہنے لگی۔

"نہیں نہیں تم میرے پاس ہی رہو۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور اسے تسلی دینے لگا۔ وہ سخت خوف زدہ ہو رہی تھی۔ اگر مجھے انڈیا میں صرف سی آئی ڈی کی پریشانی ہوتی تو میں اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ میں آرمی کا سابق کمانڈو تھا اور اس قسم کے حالات سے نبرد آزما ہونا جانتا تھا۔ لیکن سانپوں اور سپیروں کی جس مصیبت میں ہم پھنس گئے تھے اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ میں جمیلہ کو لے کر کسی دور دراز علاقے کی طرف نکل جاؤں یا جتنی جلدی ہو سکے بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچ جاؤں۔ دور دراز علاقوں میں نکل جانے سے بھی سپیروں اور سانپوں سے پیچھا چھڑانا مشکل نظر آتا تھا۔ حل ایک ہی تھا کہ میں جمیلہ کو لے کر پاکستان میں داخل ہو جاؤں۔ پاکستان ہمارے لیے سب سے بڑی پناہ گاہ تھی لیکن پاکستان پہنچنا میرے اختیار میں نہ تھا۔ اگر عام حالات ہوتے تو میں اپنی کمانڈو ٹریننگ کو استعمال میں لاتے ہوئے کسی نہ کسی جگہ سے از خود بارڈر کراس کرنے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن وہ عام حالات نہیں تھے۔ پاکستان اور بھارت ابھی تک جنگ کی حالت میں تھے اور دونوں طرف فوجیں بارڈر پر مورچہ بند تھیں۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو اور بات تھی' میرے ساتھ میری بیوی بھی تھی۔ اس کو ساتھ لے کر میں بھارتی فوج کے مورچوں کے نزدیک بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔

ابھی سوج غروب ہوا ہی تھا اور دن کی کچھ کچھ روشنی باقی تھی کہ مشتاق صاحب اپنی گاڑی پر آ گئے۔ کہنے لگے۔

"میرے میرے ساتھ آؤ۔ حاجی فرید صاحب کا کلکتے سے ایک گھنٹے بعد فون آنے والا

ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم خود ان سے بات کرلو میرے بات کرنے سے تمہاری تسلی نہیں ہوگی۔"

مشتاق صاحب نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ میں نے طے کرلیا کہ چاہے حاجی فرید کچھ کہیں میں انہیں بتا دوں گا کہ میں ان کے پاس کلکتے پہنچ رہا ہوں۔ اب کسی حالت میں بھی میرا جمیلہ کے ساتھ دلی میں رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ سپیرا کوئی عام سپیرا نہیں تھا بلکہ سنتھا ولی مٹھ کا پجاری سپیرا ہی تھا جو جمیلہ کی بو سونگھتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا تھا اور اب جمیلہ کی زندگی خطرے میں تھی۔ ہو سکتا تھا کہ حاجی فرید صاحب نے یہ پیغام دیتا ہو کہ کرم داد سے کہو کہ فوراً کلکتے چلا آئے۔ میں اسی وقت مشتاق صاحب کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ جانے لگا تو جمیلہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگی۔

"مجھے یہاں اکیلی چھوڑ کر نہ جاؤ۔"

اس کے لہجے میں عجیب قسم کی عاجزی تھی مگر حاجی صاحب سے خود بات کرنی بہت ضروری تھی۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"کلکتے سے حاجی صاحب کا فون آنے والا ہے انہوں نے ضرور ہمیں بلایا ہوگا۔ میں خود ان سے ساری باتیں طے کرلوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ دروازے کو اندر سے بند کرلینا۔ یہاں کوئی نہیں آتا اور پھر میں بڑی جلدی مشتاق صاحب کی گاڑی پر ہی واپس آ جاؤں گا۔"

اور میں مشتاق صاحب کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑا۔

مشتاق صاحب مجھے دلی کے ایک گنجان محلے میں لے آئے۔ یہاں ان کے کسی دوست کا مکان تھا۔ مشتاق صاحب مجھے اپنے ہوٹل میں نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ وہ خود یہاں آ کر کلکتے حاجی فرید کو فون کیا کرتے تھے۔ ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ گئے۔ ٹیلی فون سامنے تپائی پر پڑا تھا۔ مشتاق صاحب بولے۔

"حاجی فرید نے ضرور تم لوگوں کے بارڈر کراس کرانے کا انتظام کر دیا ہوگا۔ تھوڑی دیر پہلے ان کا کلکتے سے فون آیا تھا۔ میرے دوست نے مجھے ہوٹل میں فون پر پیغام دیا کہ

حاجی صاحب ایک گھنٹے بعد فون کریں گے۔"

میں گومگو کی کیفیت میں تھا۔ لیکن دل میں عہد کر رکھا تھا کہ اگر کلکتے سے بلاوا نہ بھی آیا تب بھی میں آج رات کو نہیں تو کل دن کے وقت کلکتے جانے والی گاڑی میں سوار ہو جاؤں گا۔ میں کسی حالت میں بھی اب جمیلہ کو دلی میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ خود مجھ پر قتل کے جرم میں پکڑے جانے کی تلوار لٹک رہی تھی۔ مشتاق صاحب مجھ سے باتیں کرتے رہے اور میں بے توجہی سے ان کی باتیں سنتا تھا۔ ذہن طرح طرح کے خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ جب ایک گھنٹہ گزر گیا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ مشتاق صاحب نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ پھر دس بارہ سیکنڈ تک کچھ سنتے رہے۔ آنکھوں کے اشارے پر انہوں نے مجھے بتا دیا کہ کلکتے سے حاجی صاحب کا ہی فون ہے۔ پھر انہوں نے فون پر قدرے اونچی آواز میں کہا۔

"حاجی صاحب! بہتر ہے کہ آپ خود کرم داد سے بات کر لیں۔ وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔"

اور انہوں نے ریسیور مجھے دے دیا۔ میں نے ہیلو کہہ کر حاجی فرید کو اسلام علیکم کہا تو وہ بولے۔

"میاں کرم داد! برما کے بارڈر پر بڑی سختی ہے۔ ابھی حالات ایسے نہیں ہیں کہ تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔ تمہیں کچھ روز اور انتظار کرنا پڑے گا۔ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"میں آپ کی مہربانیوں کا بدلہ نہیں چکا سکتا حاجی صاحب! لیکن حالات کچھ ایسی شکل اختیار کر گئے ہیں کہ میں دلی میں مزید ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتا۔"

دوسری طرف سے حاجی صاحب کچھ کہنے لگے تو میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

"میں کلکتے آ رہا ہوں۔ میں آپ کے پاس نہیں ٹھہروں گا۔ کسی دوسری جگہ ٹھہروں گا۔ جب حالات موافق ہو جائیں گے تو اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔"

ٹیلی فون پر میں کھل کر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حاجی صاحب نے اصرار کرتے ہوئے

کہا کہ میں ابھی کلکتے نہ آؤں لیکن میں نے یہ کہہ کر کہ میں کل دلی سے روانہ ہو جاؤں گا' رسیور مشتاق صاحب کے حوالے کر دیا۔ لگتا تھا کہ حاجی فرید مشتاق صاحب کو کچھ سمجھا رہے ہیں کہ کرم داد کو ابھی دلی میں اپنے پاس ہی رکھو۔ مشتاق صاحب بار بار کہہ رہے تھے۔ میں کوشش کروں گا۔ میں کوشش کروں گا۔ فون بند ہو گیا۔ مشتاق صاحب نے رسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میاں! حاجی صاحب تمہارے اور اپنے بھلے کی ہی بات کر رہے تھے۔ بنگال میں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ حاجی صاحب نے مجھے بتا دیا ہے کہ ان کے پاس سی آئی ڈی کا آدمی آیا تھا۔ شاید کسی نے مخبری کر دی ہو گی کہ تم ان کے پاس ٹھہرے تھے۔ بہرحال سارے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ حاجی فرید صاحب پر بھی کوئی ناگہانی آفت آ جائے۔"

میں نے کہا۔

"مشتاق صاحب! میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ حاجی فرید صاحب کی پوزیشن کا مجھے اپنے سے بڑھ کر خیال ہے۔ میں ان کے پاس نہیں ٹھہروں گا۔ میرے پاس کافی پیسے ہیں۔ ہم کسی چھوٹے سے ہوٹل میں کمرہ لے لیں گے۔"

"تو پھر تمہارا کیا پروگرام ہے؟" مشتاق صاحب نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "اگر آج رات کو کوئی گاڑی جاتی ہے تو ہم اس میں بیٹھ جائیں گے ورنہ دن کے وقت تو کوئی نہ کوئی گاڑی کلکتے ضرور جائے گی۔"

مشتاق صاحب نے سر کو نفی میں ہلایا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جیسے تمہاری مرضی میاں اب میں تمہیں زبردستی تو روک نہیں سکتا۔ کل سوا نو بجے ہوڑہ میل جاتی ہے۔ اس میں چلے جانا۔ میں گاڑی لے کر آ جاؤں گا۔"

میں نے مشتاق صاحب کے آگے زیادہ اصرار کرنا مناسب خیال نہ کیا اور پھر ایک رات کی بات تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ رات بھی گزر جائے گی۔ یہ سوچ کر میں نے انہیں کہا۔

"بہت بہتر ہے ہم کل سوا نو بجے والی گاڑی میں چلے جائیں گے۔"

میں مشتاق صاحب کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر ان کے رائے سینا والے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں ان کے ساتھ رہا۔ شام کی سیاہی دلی شہر کے آسمان پر بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ سڑکوں مکانوں اور دور و نزدیک کی پرانی اور نئی آبادیوں میں روشنیاں جھلملانے لگی تھیں۔ میں نے مشتاق صاحب سے پوچھا۔

"بدنام سمگلر اور غنڈوں کے سرغنہ شری راج کا کوئی آدمی میری جاسوسی کرنے تو آپ کے ہوٹل میں پھر نہیں آیا؟"

مشتاق صاحب گاڑی چلا رہے تھے۔ میں ان کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ کار کے اندر کی فضا گرم تھی۔ باہر لحہ بہ لحہ بڑھتی ہوئی رات سرد ہوتی جا رہی تھی۔ کہنے لگے۔

"شری راج کا کوئی خاص آدمی تو نہیں آیا اس کے ہاں جو میرا مسلمان واقف کار کام کرتا ہے اس کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ شری راج کو جمیلہ کے گورو دیو گری کے مندر سے فرار ہو جانے کا سخت صدمہ ہے اور اس کے خاص غنڈے تمہاری بیوی کی تلاش میں مدراس تک کی خاک چھان آئے ہیں۔"

اس طرح باتیں کرتے ہم لوگ رائے سینا کی بستی میں پہنچ گئے۔ میں نے دور سے اپنے کوارٹر کی طرف دیکھا۔ وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ جمیلہ نے اچھا کیا جو کوارٹر کے باہر کی بتی روشن نہیں کی۔ بتی جلتی دیکھ کر شبہ ہو سکتا ہے کہ یہاں ضرور کوئی رہتا ہوگا۔ مشتاق صاحب کو سی آئی ڈی کے آدمی کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مشتاق صاحب نے کوارٹر کے سامنے ایک طرف کر کے گاڑی روک لی۔

میں نے انہیں کہا کہ وہ کوارٹر میں چل کر ہمارے ساتھ چائے کی ایک پیالی پی لیں۔

انہوں نے بڑی خوش اخلاقی سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"میاں ہماری چائے تم پر ادھار رہی۔ صبح جلدی آ جاؤں گا۔ تمہارے اور بھابھی کے ساتھ چائے کی ایک پیالی پی کر تمہیں سٹیشن لے کر چلوں گا۔ اس وقت مجھے اجازت دو۔

پیچھے ہوٹل میں بڑے کام ہیں۔"

انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور گاڑی موڑ کر اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئے۔ میں کوارٹر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جمیلہ نے اندر سے کنڈی لگائی ہوگی۔ میں نے بند دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دو تین بار دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں انگلی سے دستک دے رہا تھا۔ چوتھی بار ہاتھ دروازے پر مار کر دستک دی تو دروازے کا ایک پٹ اندر چلا گیا۔ اندر سے دروازے کو کنڈی نہیں لگائی گئی تھی۔ مجھے جمیلہ کی لاپرواہی پر سخت غصہ آیا اور کمرے کی بتی روشن کر دی۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ جمیلہ شاید دوسرے کمرے میں چارپائی پر سو رہی تھی۔ یہ سوچ کر میں دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ دونوں چارپائیاں خالی پڑی تھیں۔ میرے بستر کا لحاف تہہ کیا ہوا تھا۔ جمیلہ کا لحاف اس طرح کھلا تھا جیسے وہ بستر سے نکل کر کہیں گئی ہو۔ مجھے خیال آیا کہ وہ باتھ روم میں ہوگی۔ میں باتھ روم کی طرف گیا۔ باتھ روم کا دروازہ بند تھا۔ میں نے جمیلہ کو آواز دی۔ اندر سے کسی نے جواب نہ دیا۔ میں نے دو تین آوازیں دیں۔ جب کوئی جواب نہ آیا تو میں نے دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے بتی جلا دی۔ باتھ روم خالی پڑا تھا۔ اب تو میں پریشان ہوگیا۔ میں نے کچن میں دیکھا جمیلہ وہاں بھی نہیں تھی۔ میں گھبرایا ہوا کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ کوارٹر کے پیچھے آکر دیکھا۔ وہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ جمیلہ کا کہیں نام نشان تک نہیں تھا۔ دوڑ کر واپس اندر آگیا۔ جمیلہ کی دو جوتیاں تھیں۔ ایک چپل تھی اور ایک گرگابی تھی۔ گرگابی غائب تھی۔ چپل پلنگ کے پاس ہی پڑی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی مرضی سے گرگابی پہن کر کہیں گئی ہے۔ مگر وہ کہاں جا سکتی تھی۔ اردگرد کوئی مارکیٹ یا سٹور بھی نہیں تھا جہاں وہ کچھ خریدنے نکل گئی ہو۔ نالے کے پل پر بھٹیارن کا تندور ہی تھا۔ کہیں یہ بیوقوف عورت تندور پر روٹیاں لگوانے کو نہیں چلی گئی؟ اس نے سوچا ہو کہ آج تندور کی لگی ہوئی روٹیاں کھائی جائیں۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مگر جمیلہ اکثر اس قسم کی غیر ذمے داری کی حرکتیں کیا کرتی تھی۔ میں نے

کوارٹر کے دروازے میں آکر دور بھٹیارن کے تندور کی طرف نگاہ ڈالی۔ تندور کی لالٹین جل رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بھٹیارن روٹیاں لگا رہی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے اس طرف چلنے لگا۔ دل میں خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ یا اللہ پاک میری جمیلہ تندور پر ہی ہو۔ جیسے جیسے تندور قریب ہو رہا تھا وہاں کا دھندلا منظر صاف ہوتا جا رہا تھا۔ تندور پر بھٹیارن روٹیاں لگا رہی تھی اور اس کے سامنے دو کم عمر لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ تندور میں آگ روشن تھی جس کی چمک ادھیڑ عمر بھٹیارن کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ جمیلہ وہاں نہیں تھی۔ میں نے سوچا شاید وہ روٹیاں لگوا کر لے گئی ہو اور یونہی سیر کرنے کی خاطر دوسری طرف سے کوارٹر کی طرف گئی ہو۔ میرا دل یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ جمیلہ کہیں غائب ہوگئی ہے یا مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اس کی گرم چادر بھی اس کی چارپائی پر نہیں تھی۔ بھٹیارن نے میری طرف سر اٹھا کر دیکھا اور پوچھا۔

"بابو' روٹیاں لینی ہیں؟"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں بہن جی۔ دو روٹیاں دے دیں۔"

بھٹیارن نے چھابے میں سے دو روٹیاں نکال کر کاغذ میں لپیٹیں اور مجھے پکڑا دیں۔

میں نے اسے پیسے دیئے اور یونہی بظاہر بے نیازی سے پوچھا۔

"بہن جی! ادھر کوئی بڑی عورت تو روٹیاں لینے نہیں آئی تھی؟"

بھٹیارن بولی۔

"بھائی یہاں تو چھوٹے بچے ہی روٹیاں لگوانے آتے ہیں۔ کیا تم نے اپنی کسی نوکرانی کو بھیجا تھا؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"ہاں' نوکرانی کو بھیجا تھا۔"

پھر میں نے اسے جمیلہ کا حلیہ اور لباس اور خاص طور پر اس کی چادر کا رنگ اور گرگابی کا بتایا تو وہ بولی۔

"بھائی یہ لباس کسی نوکرانی کا تو نہیں ہو سکتا ایسی کوئی عورت یہاں نہیں آئی۔"

میں بوجھل دل اور پریشان دماغ کے ساتھ وہاں سے واپس ہو گیا۔ دماغ سنسنا رہا تھا۔ آخر جمیلہ کہاں چلی گئی؟ کیا اسے کوئی ورغلا کر لے گیا ہو گا؟ مگر وہ ایسی عورت نہیں ہے۔ کہیں اسے پولیس پکڑ کر نہ لے گئی ہو۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ جس سی آئی ڈی والے کو میں نے قتل کیا تھا پولیس اس کی تلاش میں وہاں آ گئی ہو اور جمیلہ کو پکڑ کر تھانے لے گئی ہو۔ اس خیال سے میرا جسم ایک دم سرد پڑ گیا۔ اگر ایسی بات ہو گئی تو پھر جمیلہ کو میں پولیس کی حراست سے کیسے واپس لا سکوں گا۔ اگر میں خود تھانے گیا تو پولیس مجھے بھی وہیں بٹھا لے گی اور عین ممکن ہے کہ ان پر میرے مفرور جنگی قیدی ہونے کا راز بھی کھل جائے اور میرے اور جمیلہ کے لیے پاکستان جانے والے راستے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں۔ اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں کسی جگہ سے مشتاق علی صاحب کو ان کے ہوٹل فون کر کے بلاؤں اور ان سے کہوں کہ وہ اپنے طور پر علاقے کے تھانے سے معلوم کریں کہ جمیلہ پولیس کی حراست میں تو نہیں ہے۔

میں نے کاغذ میں لپٹی ہوئی روٹیاں کوارٹر میں رکھیں اور دروازے پر تالا لگا کر مشتاق صاحب کو فون کرنے کے لیے نکل پڑا۔ کوارٹر کے آگے ایک کچا راستہ تھا۔ جو کچھ دور جا کر پکی سڑک کی طرف مڑ جاتا تھا۔ پکی سڑک پر کچھ فاصلے پر کچھ دکانیں تھیں۔ جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ وہاں اگر فون ہوا تو میں وہاں سے مشتاق صاحب کو فون کر سکتا تھا۔ میں جلدی جلدی کچے راستے پر چل رہا تھا۔ کوئی پچیس تیس قدم چلنے کے بعد نیم اندھیرے میں مجھے ایک درخت کے نیچے لحاف اوڑھ کر بیٹھا ہوا ایک فقیر دکھائی دیا۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو اس نے مجھے آواز دی۔

"بابو! تم اس خالی کوارٹر میں رہتے ہو؟ میں رک گیا۔ فقیر کے پاس آ کر دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

"ہاں بابا! میں وہیں رہتا ہوں۔ کیوں کیا بات ہے؟"

وہ بولا۔ "تمہارے ساتھ ایک عورت بھی رہتی ہے؟"

"ہاں وہ میری بیوی ہے۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی تھی۔ فقیر بولا۔

"کیا تم اس کو تلاش کرتے پھرتے ہو؟"

"ہاں۔"

میرے منہ سے اپنے آپ یہ لفظ نکل گیا۔ فقیر بولا۔

"جب تم کسی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر گئے تھے تو تمہارے جانے کے بعد ایک سپیرا آیا تھا۔ وہ تمہارے مکان کے آگے بیٹھ کر بین بجانے لگا۔ اندر سے تمہاری عورت نکل کر آئی۔ سپیرے نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔"

میں یہ سن کر کھڑے کھڑے جیسے پتھر ہو گیا۔ میرا حلق سوکھ گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے پوچھا۔

"وہ کدھر گئے تھے؟"

فقیر بولا۔

"نالے والے پل کی طرف گئے تھے۔ آگے اللہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔"

مجھے اس وقت اور کچھ نہ سوجھا۔ سوکھے نالے کے پل کی طرف دوڑ پڑا۔ مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ ان لوگوں کو گئے دو ڈھائی گھنٹے گزر گئے ہیں۔ اب تک خدا جانے وہ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہوں گے۔ سب سے زیادہ دکھ اور تشویش مجھے اس بات کی تھی کہ میری بیوی اپنی مرضی سے سپیرے کے ساتھ چلی گئی۔ یہ وہی سپیرا ہو سکتا تھا جو تیسرے پہر میرے مکان پر آیا تھا اور جس کی بین کی آواز پر جمیلہ باتھ روم میں چھپ گئی تھی۔ میں نالے کے پل کی طرف بھاگا جا رہا تھا اور یہ سوچ سوچ کر میرا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ جمیلہ کو سپیرا زبردستی اٹھا کر نہیں لے گیا بلکہ وہ خود اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی ہے۔ اس فرار میں اس کی اپنی مرضی بھی شامل تھی۔ ان حالات میں میری کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ جب لوٹا ہوا مال اپنے آپ کو چھپانے میں خود چور کی مدد کر رہا ہو تو اس کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود میں جمیلہ سے مایوس نہیں ہوا

تھا۔ مجھے اس حقیقت کا احساس تھا کہ جمیلہ ان پجاری سپیروں کے طلسمی منتروں کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس پر ان طلسمی منتروں کا اثر ہے اور وہ ان منتروں کے اثر کی وجہ سے ہی سپیرے کے ساتھ چل پڑی تھی۔ اس میں اس کی اپنی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ یہ سارا اثر سپیروں کے منتروں کا تھا۔ اگر وہ ان شیطانوں کے زیر اثر نہ ہوتی تو سپیرے کے ساتھ کبھی نہ جاتی۔ یہی حقیقت میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی اور میں جمیلہ کی تلاش میں دیوانہ وار دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ رات کا اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا۔

خشک نالے کا پل رات کی تاریکی اور کہرے میں دھندلا ہو رہا تھا۔ میں پل پر سے گزر گیا۔ ایک کچا راستہ تھا جس پر میں دوڑتا جا رہا تھا۔ سامنے دور کسی بستی کی روشنیاں کہرے اور اندھیرے میں جھلملا رہی تھیں۔ میرا رخ اس بستی کی طرف تھا۔ بستی کی روشنیوں کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ میں بری طرح سے ہانپ رہا تھا۔ کمانڈو ٹریننگ اور فوجی سروس کے زمانے میں میں بہت دوڑا کرتا تھا۔ مگر اب میں حاضر سروس میں نہیں رہا تھا اور اس بات کو کافی زمانہ گزر گیا تھا۔ زیادہ دوڑنے سے مجھے سانس چڑھ گیا تھا۔ میں نے رک کر لمبے لمبے سانس لیے۔ جب میرا سانس درست ہوا تو میں بستی کی طرف بڑھا۔ یہ دلی کی کوئی نئی بستی نہیں تھی۔ پرانے پرانے ایک منزلہ دو منزلہ مکان تھے جو رات کی تاریکی اور کہرے میں ساکت کھڑے تھے۔ گلیوں پر خاموشی طاری تھی۔ سردی کی وجہ سے کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ بستی کے شروع میں ایک گلی کی نکڑ پر درزی کی دکان تھی۔ ایک آدمی کمبل اوڑھے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ سامنے تختے پر سنگر کی دو تین مشینیں پڑی تھیں۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا اور پوچھا۔

"بھائی صاحب! آپ نے اس طرف ایک مرد اور عورت کو جاتے تو نہیں دیکھا۔"

اس آدمی نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"میاں! ادھر سے کوئی مرد اور عورت نہیں گزری۔ ایک گھنٹے سے تو میں اسی جگہ بیٹھا ہوں۔ بات کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "کچھ نہیں۔"

اور آگے بڑھ گیا۔ بستی کی دکانیں بند تھیں۔ کوئی آدمی بھی چل پھر نہیں رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سپیرا میری بیوی کو لے کر کس طرف گیا ہو گا۔ چاروں طرف کھلا علاقہ تھا۔ رات کا اندھیرا تھا۔ عجیب کش مکش کے عالم میں تھا کہ کس طرف جاؤں، کس طرف نہ جاؤں۔ میں پرانی بستی سے باہر نکلا تو اس کی دوسری جانب پکی سڑک تھی۔ سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ایک جگہ کافی روشنی ہو رہی تھی۔ جلدی جلدی وہاں پہنچا۔ یہ ایک سٹور تھا۔ یہاں ٹیلی فون بھی پڑا تھا۔ میں نے سٹور کے مالک کی اجازت سے مشتاق علی صاحب کے ہوٹل کا خاص نمبر گھمایا۔ تھوڑی دیر تک گھنٹی بجتی رہی۔ پھر مشتاق صاحب کی آواز آئی۔

میں نے کہا۔

"میں کرم داد بول رہا ہوں۔ ایک عجیب مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ آپ سے فوری طور پر ملاقات بے حد ضروری ہے۔"

وہ بولے۔

"تم کہاں پر ہو؟"

میں نے انہیں بتایا کہ میں اپنے کوارٹر کے قریب ہی ایک جگہ سے فون کر رہا ہوں۔

انہوں نے کہا۔

"تم کوارٹر میں چلو۔ میں آ رہا ہوں۔"

میں وہاں سے واپس اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مشتاق صاحب بھی اپنی گاڑی پر آ گئے۔ میں نے انہیں سارا واقعہ سنایا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے۔

"یہ کیسے ہو گیا؟ تمہاری بیوی نے کوئی شور نہیں مچایا؟"

میں نے کہا۔

"اس نے ضرور شور مچایا ہو گا مگر لگتا ہے وہ دو تین آدمی تھے۔ انہوں نے جمیلہ کو قابو کر لیا ہو گیا اور پھر اس ویران علاقے میں وہ شور بھی مچاتی تو کون سنتا تھا؟"

میں نے مشتاق صاحب کو بالکل نہیں بتایا تھا کہ جمیلہ کو اغوا کرنے والا ایک سپیرا تھا اور

یہ کہ وہ از خود اس کے ساتھ گئی ہے۔ یہ بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور میں بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس میں میری بے عزتی تھی۔ میں نے یہی کہا کہ دو تین آدمی میری عدم موجودگی میں آئے اور میری بیوی کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتہ چل گیا کہ جمیلہ بھابھی کو اغوا کیا گیا ہے؟"

مشتاق صاحب کے اس سوال پر میں نے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے فقیر کا حوالہ بھی نہ دیا۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے وہ خود فقیر کے پاس جا کر پوچھ گچھ نہ شروع کر دیں۔ میں نے صرف اتنا بتایا کہ جب میں اپنی بیوی کی تلاش میں بستی کی طرف جا رہا تھا تو ایک آدمی نے مجھے روک کر بتایا کہ تمہاری بیوی کو دو آدمی کوارٹر میں سے نکال کر زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ ویگن لے کر آئے تھے۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"عجیب حالات بن گئے ہیں۔ ہم پولیس میں رپورٹ درج بھی نہیں کرا سکتے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ اسی بدمعاش شری راج کے آدمی ہی ہو سکتے ہیں۔ بہرحال تم فکر نہ کرو۔ خاموشی سے اسی کوارٹر میں ہی بیٹھے رہو۔ میں سب معلوم کرتا ہوں۔"

اس بات کا امکان تھا کہ جمیلہ کو دلی کے مافیا چیف اور جرائم پیشوں کے سرغنہ شری راج نے ہی اغوا کرایا ہو۔ کیونکہ شری راج کو اس بات کا سخت دکھ تھا کہ اس نے جمیلہ کو اپنے گورودیو گری کو تحفے کے طور پر دیا تھا اور وہ ان کے آشرم سے فرار ہو گئی تھی۔ اس کے آدمی پہلے ہی سے جمیلہ کی تلاش میں تھے۔ یہ سپیرا شری راج کا آدمی بھی ہو سکتا تھا۔ مشتاق صاحب کا ایک پرانا واقف کار جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں شری راج کے گروہ میں کام کرتا تھا۔ صرف اس کے ذریعے ہی پتہ چل سکتا تھا کہ میری بیوی کو شری راج نے ہی دوبارہ اغوا کرایا ہے یا نہیں۔

مشتاق صاحب کے جانے کے بعد میں نے وہ رات بڑے عذاب کی رات گزاری۔ بیڈ روم میں جملہ کے کچھ کپڑے کھونٹی پر لٹک رہے تھے۔ میری نگاہ ان کی طرف جاتی تو میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں میں کب سویا کب جاگا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ میں نے کچن میں جا کر چائے بنائی اور وہیں پرانی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چائے جیسے زہر بن کر حلق میں اتر رہی تھی۔ خیال بار بار جمیلہ کی طرف جاتا تھا کہ وہ کہاں ہوگی؟ کس حال میں ہوگی؟ وہ اپنی مرضی سے نہیں گئی۔ اسے شیطانی منتروں کے زیر اثر اغوا کیا گیا ہے۔ خدا جانے سپیرا اسے لے کر کہاں چلا گیا ہوگا۔ اگر وہ شری راج کا سپیرا تھا تو جمیلہ کو یقیناً واپس گورو دیوگری کے آشرم میں پہنچا دیا ہوگا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس بار دیوگری کے آشرم میں جا کر جمیلہ کو بھی واپس لاؤں گا اور اس شیطان صفت پجاری دیوگری کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مشتاق صاحب نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ میں کوارٹر والے مکان میں ہی رہوں۔ میں کمرے میں ہی رہا۔ دوپہر کے وقت مشتاق صاحب آئے۔ کہنے لگے۔

"میاں! میں نے اپنے آدمی سے سارا پتہ کروا لیا ہے۔ تمہاری بیوی شری راج نے اغوا نہیں کروائی۔ شری راج کے جاسوس تو ابھی تک جمیلہ بھابھی کی تلاش میں پھر رہے ہیں۔"

میں چپ رہا۔ کیونکہ اب اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ جمیلہ کو ناگ منتروں کے زیر اثر اغوا کر کے لے جانے والا سپیرا سنتھا ولی مٹھ کا پجاری سپیرا ہی تھا اور یہ بات میں مشتاق صاحب کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ مجھے سر جھکائے خاموش بیٹھا دیکھ کر مشتاق صاحب بولے۔

"میاں! تم فکر نہ کرو میرا بھی یہاں کافی اثر رسوخ ہے۔ میں تمہاری بیوی کی تلاش میں چاروں طرف اپنے آدمی دوڑا دیتا ہوں۔ کہیں نہ کہیں سے اس کا ضرور سراغ مل جائے گا۔"

"لیکن مجھے اب دوبارہ وسطی ہند کے خطرناک جنگلوں میں واقع سنتھا ولی مٹ کی طرف جانا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جمیلہ کو پجاری سپیرا وہیں لے گیا ہے۔ اس وقت مجھے اپنی ہمدرد اور مہربان دوست کاویری بہت یاد آئی۔ مجھے سنتھا ولی مٹھ کے جنگل کا راستہ پوری طرح یاد نہیں رہا تھا۔ اگر کاویری میرے ساتھ ہوتی تو وہ میری راہنمائی کر سکتی تھی۔ خدا

جانے وہ کہاں غائب ہوگئی تھی۔ زندہ بھی ہوگی یا نہیں۔ میں نے اسی رات سنبھل پور اور دیو گڑھ کے درمیانی جنگل میں واقع سنھتا ولی مٹھ کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا۔

مشتاق صاحب مجھے تسلیاں دے رہے تھے کہ میں فکر نہ کرو۔ وہ بہت جلد جمیلہ کو ڈھونڈھ نکالیں گے اور میں سوچ رہا تھا کہ جلدی سے دن گزرے اور میں رات کے اندھیرے میں دلی ریلوے سٹیشن پر جا کر سنبھل پور کی طرف روانہ ہو جاؤں۔ مشتاق صاحب اگلے روز آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ باقی کا سارا دن میں نے کوارٹر کے بند کمروں میں ایک قیدی کی طرح بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے گزارا۔ جب شام کا جھٹ پٹا پھیلنے لگا تو میں نے تیاری شروع کر دی۔ میرے پاس ڈیڑھ دو ہزار روپے کی رقم ابھی تک موجود تھی۔ کمانڈو چاقو اور ریوالور بھی تھا جس میں کچھ گولیاں ابھی بھری ہوئی تھیں۔ کچن میں جا کر جو تھوڑا بہت کھانا پڑا تھا کھایا۔ جیکٹ پہنی' ریوالور اور چاقو جیکٹ کی اندر والی جیبوں میں سنبھال کر رکھ لیا۔ ہر طرح سے تیار ہو کر میں بیٹھک والے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ رات کا اندھیرا چھا جائے تو سٹیشن کی طرف نکل چلوں۔

اچانک باہر کسی موٹر گاڑی کی آواز آئی۔ کوئی موٹر کوارٹر کے سامنے آ کر رک گئی۔ میں یہی سمجھا کہ مشتاق صاحب کو جمیلہ کا کوئی سراغ مل گیا ہے اور وہ مجھے خوش خبری سنانے آئے ہیں۔ میری قسمت اچھی تھی کہ میں نے دروازہ نہیں کھولا تھا بلکہ دروازے کی درز میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ ابھی شام کا جھٹپٹا ہی تھا۔ زیادہ اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک جیپ کو دیکھا جس میں سے چار پولیس کے سپاہی اترے اور کوارٹر کی طرف بڑھے۔

ایک بار تو میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ مگر میں نے اپنے ہوش و حواس سنبھال رکھے۔ تیزی سے دروازے سے ہٹ کر کوارٹر کی عقبی احاطے کی طرف دوڑا۔ وہاں پانچ چھ فٹ اونچی دیوار تھی۔ دوڑ کر دیوار پر چڑھ گیا۔ اوپر چڑھتے ہی دوسری طرف جھاڑیوں میں چھلانگ لگائی اور ویران میدان میں جتنی تیز دوڑ سکتا تھا دوڑنے لگا۔ شام کے دھندلکے نے مجھے اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ یہ علاقہ تو پہلے مکان والا تھا اس مکان والا نہیں۔

میں دوڑتے دوڑتے کافی دور نکل گیا۔ میدان ختم ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ

دلی کا کون سا علاقہ ہے اور آگے کون سا علاقہ آئے گا۔ اب میں دوڑ نہیں رہا تھا مگر تیز تیز ضرور چل رہا تھا۔ یہی ڈر لگا تھا کہ پولیس ضرور میرا پیچھا کر رہی ہوگی۔ میرے چاروں طرف دلی شہر کی نئی پرانی آبادیوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ مگر یہ روشنیاں مجھ سے بہت فاصلے پر تھیں اور میں شام کے بڑھتے پھیلتے اندھیرے میں ایک ایسے علاقے سے گزر رہا تھا جہاں کبھی جھاڑیاں آ جاتی تھیں اور کبھی پتھریلی زمین شروع ہو جاتی تھی۔ آخر میں ایک پکی سڑک پر نکل آیا۔ یہ سڑک چھوٹی تھی اور ویران علاقے میں سے گزرتی تھی۔ اس کی ایک جانب کسی ٹیلے کی دیوار تھی۔ میں نے دور نظر آتی روشنیوں کو نگاہ میں رکھا اور سڑک پر چلنے لگا۔ اس وقت اچانک مجھے پیچھے سے کسی موٹر گاڑی کی آواز سنائی دی۔ میں یہی سمجھا کہ یہ پولیس کی گاڑی ہے اور میرے پیچھے لگی ہے۔ میں نے گھبرا کر بھاگنا شروع کر دیا۔ سڑک ٹیلے کے ساتھ ہی ایک طرف کو مڑ گئی تھی۔ جب میں سڑک مڑنے لگا تو میرے پیچھے موٹر گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑی۔ میں نے اور تیز بھاگنا شروع کر دیا۔

ٹیلہ ختم ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب میرا بچنا مشکل ہے۔ پولیس کی گاڑی میرے سر پر آ گئی تھی اور سامنے سڑک خالی پڑی تھی۔ میں گاڑی کی روشنی میں پولیس کو صاف نظر آ جاؤں گا اور عین ممکن ہے مجھے بھاگتا دیکھ کر پولیس مجھ پر فائرنگ شروع کر دے۔ میں نے گھبراہٹ میں دائیں بائیں دیکھا۔ بائیں جانب مجھے ایک کوٹھڑی سی اندھرے میں دکھائی دی۔ میں اپنے آپ کو بچانے کے لیے اس کوٹھڑی کی طرف دوڑا۔ کوٹھڑی میں مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر لالٹین جل رہی تھی اور ایک جوگی ٹائپ کا آدمی بھورا کمبل اوڑھے ایک مورتی کے آگے بیٹھا پوجا کر رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی کہا۔

”مہاراج مجھے بچالیں۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہے۔ میں بے قصور ہوں۔“

جوگی کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔ اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور کوٹھری کی دیوار کے ساتھ جو چارپائی بچھی تھی اس طرف اشارہ کر کے بولا۔

”مورکھ! جا اس کھاٹ کے نیچے جا کر چھپ جا۔“

چارپائی پر کمبل بچھا ہوا تھا جو چارپائی کے اوپر سے زمین تک لٹک رہا تھا۔ میں جلدی سے چارپائی کے نیچے گھس گیا۔ مجھے دروازہ بند کرنے کی آوز آئی۔ جوگی نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ جوگی مورتی کی پوجا کرتے وقت کچھ گنگنا بھی رہا تھا۔ اس نے دوبارہ گنگنانا شروع کر دیا۔ خدا جانے وہ کیا پڑھ رہا تھا۔

میرے کان باہر کی خاموشی پر لگے ہوئے تھے۔ جب میں نے باہر کسی موٹر گاڑی کے رکنے کی آواز سنی تو میرا دل خوف کے مارے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں کوئی بزدل آدمی نہیں تھا۔ میرے پاس ریوالور بھی تھا مگر میں ایسے حالات میں پھنس گیا تھا کہ میری بہادری بھی وہاں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ پولیس کی رائفلوں کے سامنے میرے ریوالور کی چھ سات گولیاں میرے کسی کام نہ آسکتی تھیں۔ باہر سے آدمیوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ آوازیں کوٹھڑی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ جوگی نے آہستہ سے کہا۔

"مورکھ! چپ رہنا۔ بولنا مت۔"

کسی نے دروازے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

"جو کوئی اندر ہے باہر آجائے۔ ہم پولیس کے سپاہی ہیں۔"

میرا خدشہ بالکل درست تھا۔ بے چارے جوگی نے مجھے ایک مصیبت کا مارا انسان سمجھ کر پناہ ضرور دی تھی مگر وہ پولیس سے مجھے بچا نہیں سکتا تھا۔ پولیس اگر اس کوٹھڑی کی طرف آئی تھی تو اس نے ضرور مجھے اس طرف جاتے جیپ یا ویگن کی روشنی میں دیکھ لیا ہوگا۔ جوگی نے بڑی جلالی آواز میں پوچھا۔

"کون مورکھ ہماری پوجا بھنگ کرنے اس سمے آیا ہے؟" باہر سے آواز آئی۔

"دروازہ کھولو۔ پولیس پاکستانی جاسوس کی تلاش میں آئی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی دروازہ دھڑاک سے کھلنے کی آواز آئی۔ میری آنکھوں کے آگے کوٹھڑی کے فرش تک بوسیدہ کمبل لٹک رہا تھا۔ ایک طرف سے کمبل ذرا سا پیچھے ہٹا ہوا تھا اور وہاں ایک دراز سی بن گئی تھی۔ میں نے اس درز میں سے لیٹے لیٹے دیکھا۔ تین پولیس کے سپاہی جن کے پاس رائفلیں تھیں کوٹھڑی میں گھس کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں

سے ایک شاید تھانیدار تھا۔ اس کی مونچھیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ تینوں ہندو ہی تھے۔ تھانیدار ذرا آگے ہو کر کھڑا تھا۔ جوگی اپنی جگہ پر بڑے اطمینان سے آلتی پالتی مارے بیٹھا مورتی کی پوجا کر رہا تھا۔ تھانیدار نے کہا۔

"مہاراج! ایک پاکستانی جاسوس بھاگ کر اس طرف آیا ہے۔ ہم اس کو پکڑنے آئے ہیں۔"

جوگی نے بلند اور رعب والی آواز میں کہا۔ "تمہارا کیا نام ہے مورکھ؟"

"میرا نام جگن ناتھ ہے اور میں ہیڈ کانسٹیبل ہوں۔" تھانیدار نے کہا۔

جوگی نے کہا۔ "نام تم نے جگن ناتھ پوری کے دیوتا کا رکھا ہے اور اس کے چیلے کی پوجا بھنگ کر رہے ہو؟ مورکھ میں تمہیں ایسا شراپ دوں گا کہ تیری سات سنتانیں نشٹ ہو جائیں گی۔ ان مورکھوں کو لے کر یہاں سے بھاگ جا۔ ہماری پوجا بھنگ نہ کر۔"

ہندو ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"مگر مہاراج! ہم نے پاکستانی جاسوس کو اسی طرف آتے دیکھا تھا۔"

اس دفعہ جوگی بہت جلال میں آگیا۔ اس نے کڑک کر کہا۔

"جے جگن پوری جگت ناتھری! جگن ناتھ تو پاپی ہے' ہماری کٹیا سے نکل جا۔ یہاں کوئی جاسوس واسوس نہیں آیا۔ نکل جا مورکھ۔ جے جگن پوری جے جگت ناتھری۔"

"ناراض نہ ہوں مہاراج! ہم جاتے ہیں۔"

ہندو ہیڈ کانسٹیبل نے ہاتھ باندھ کر یہ جملہ ادا کیا اور پولیس کے سپاہیوں کو لے کر کوٹھڑی سے نکل گیا۔ جوگی نے کڑک کر کہا۔

"مورکھ! کٹیا کا دروازہ بند کرنا مت بھولنا۔"

ہندو ہیڈ کانسٹیبل نے کٹیا سے نکلتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ جوگی نے دوبارہ پوجا پاٹھ شروع کر دی۔ باہر سے پولیس کی گاڑی کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ جب گاڑی کی آواز دور جا کر غائب ہو گئی تو جوگی نے کہا۔ "مورکھ! کھاٹ کے نیچے سے باہر نکل آ۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آئی ہوئی بلا ٹل گئی تھی۔ میں اس بات پر بڑا حیران ہوا کہ

جوگی نے جو خود ہندو تھا یہ سن کر بھی کہ میں پاکستانی جاسوس ہوں اور مسلمان ہوں' مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ میں چارپائی کے نیچے سے نکل آیا۔ اب میں نے لالٹین کی روشنی میں جوگی کو غور سے دیکھا۔ اس کے عمر تیس پینتیس سال کی ہوگی۔ سانولی رنگت تھی۔ سر کے بال جوگیوں کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ ماتھے پر تلک کی تین سرخ لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ لباس گیروا تھا' کندھے پر بھورا کمبل تھا۔ ناک تیکھی اور آنکھیں بڑی چمکیلی تھیں۔ اس جوگی کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ جو مسکراہٹ بھی نہیں تھی بلکہ مسکراہٹ اور سنجیدگی کے درمیان کوئی کیفیت تھی۔ لگتا کہ وہ بے معلوم انداز میں مسکرا رہا تھا۔ دوسرے لمحے لگتا کہ نہیں وہ بالکل نہیں مسکرا رہا۔ اس کے سامنے کسی دیوتا کی پتیل کی چھوٹی سی مورتی تھی جو ایک چوکی پر رکھی ہوئی تھی اور مورتی کے آگے گیندے اور رتن جو کے تین چار پھول پڑے تھے۔ جوگی نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بڑے ادب سے اس کے سامنے بچھے ہوئے بوریئے پر بیٹھ گیا۔ وہ میرا محسن تھا۔ اس نے ایک طرح سے میری جان بچائی تھی۔ مجھ پر اس کا ادب کرنا فرض تھا۔ وہ اگر چاہتا تو مجھے پولیس کے حوالے کر سکتا تھا اور پولیس نے مجھے زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔ پولیس کو میرے بارے میں سب کچھ پتہ چل چکا تھا کہ میں جنگی قیدیوں کی ٹرین سے بھاگا ہوا پاکستانی ہوں اور ان کے انٹیلی جینس کے افسر کو میں نے ہی ہلاک کیا ہے۔ ظاہر تھا کہ اگر ہیڈ کانسٹیبل نے یہ کہا تھا کہ میں پاکستانی جاسوس ہوں

بھجن کیرتن کی کتاب ابھی تک جوگی کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ اپنے بوریئے کے نیچے سے ایک سگریٹ نکال کر میری طرف بڑھایا اور کہا۔

"مورکھ! سگریٹ پیئے گا؟"

میں نے کہا۔ "مہاراج! میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

جوگی نے کہا۔ "مورکھ! یہ چرس والا سگریٹ ہے۔ پی لے۔ سارے جنم روشن ہو جائیں گے۔"





میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں مہاراج! میں نشہ نہیں کیا کرتا۔"

جوگی نے ماچس کی تیلی جلا کر نشے والا سگریٹ سلگایا۔ اس کا ایک لمبا کش لگا کر کافی دیر تک دھواں اپنے اندر رکھا۔ پھر آہستہ آہستہ دھواں منہ اور ناک سے باہر نکالتے ہوئے مسکرایا۔ یہ جوگی مجھے عام ہندو جوگیوں سے مختلف تھا۔ ویسے بھی اس نے مجھے پولیس سے بچایا تھا۔ وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ جوگی کی کٹیا سے نکل کر مجھے کسی ایسے ویران علاقے میں سے ہو کر سٹیشن پر جانا چاہیے جہاں پولیس کا خطرہ نہ ہو۔ پھر خیال آیا کہ پولیس نے تو ریلوے سٹیشن پر بھی ناکہ بندی کر رکھی ہوگی۔ میں ان خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ جوگی بولا۔

"یہ تو مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تو مسلمان ہے۔ پولیس نے تجھے میری کٹیا کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ یونہی یہاں نہیں آئی تھی۔ اب یہ بتا کہ سچ مچ تو پاکستان کا جاسوس ہے؟"

میں نے کہا۔

"مہاراج میں پاکستانی ضرور ہوں مگر جاسوس وغیرہ کچھ بھی نہیں ہوں۔ جب بنگلہ دیش بنا تو میں ڈھاکے میں اپنی بیوی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ مکتی باہنی والوں نے لوٹ مار اور قتل عام شروع کیا تو میرے گھر کو بھی لوٹ لیا اور میری بیوی کو اٹھا کر لے گئے۔ میں جان بچا کر

بارڈر کراس کر کے کلکتے پہنچ گیا۔ اب اپنی بیوی کی تلاش میں در بدر مارا مارا پھر رہا ہوں۔ پولیس نے ایک بار مجھے پاکستانی جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا' میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ بس یہ ہے میری رام کہانی۔ میں تو مصیبت کا مارا ہوا ہوں۔"

جب میں جوگی کو اپنی داستان غم سناتا رہا جوگی نے چرس والا سگریٹ پورے کا پورا پی لیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میری داستان وہ بڑی توجہ سے سنتا رہا تھا۔ کسی وقت یوں سر ہلا دیتا جیسے کہہ رہا ہو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں چپ ہو گیا تو جوگی نے مجھ سے پوچھا۔

"جو لوگ تمہاری پتنی کو اٹھا کر لے گئے تھے کیا ان کی شکل صورت تم کو یاد ہے؟"

میں نے کہا۔

"میں اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ اپنی دکان پر تھا۔ محلے والوں نے بتایا کہ میری بیوی کو مکتی باہنی والے اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

جوگی افسوس کے ساتھ بولا۔

"بہت برا کیا ان لوگوں نے---- مورکھ تھے۔ اب تم کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے جوگی کو پجاری کی دیو گری اور سانپوں سپیروں والا قصہ بالکل نہیں سنایا تھا۔ اس کو سنانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے جواب دیا۔

"مجھے کسی نے بتایا تھا کہ میری بیوی کو وہ لوگ دیو گڑھ اور سنبھل پور کی طرف لے گئے ہیں۔ اپنے ایک مہربان کے کوارٹر سے نکل کر ریلوے سٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ پولیس کی جیپ اپنی طرف آتی دیکھ کر دوڑ پڑا۔"

جوگی آنکھیں بند کیے جیسے مراقبے میں جا چکا تھا۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تو اس کی آنکھیں لالٹین کی روشنی میں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مورکھ ہو۔ میرے آگے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم انتریامی کے داسی ہیں، سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ تمہاری پتنی کو ایک دھشٹ سپیرا اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ تمہاری پتنی اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی ہے۔"

جب میں نے دیکھا کہ اس شخص کو سب کچھ معلوم ہوگیا ہے اور یہ میرا ہمدرد بھی ہے تو میں نے اسے ساری کہانی کھول کر بیان کر دی۔ جب تک میں اپنی بپتا سناتا رہا وہ مسکراتا رہا۔ کہنے لگا۔

"تمہاری پتنی پر ناگ دیوتا کے منتر پھونکے گئے ہیں۔ وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔"

میں نے عرض کی۔

"مہاراج! میری بیوی پر منتروں کا اثر کیسے اترے گا؟ میری مدد کریں۔ میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔"

وہ بولا۔ "مورکھ ہو۔ پرنتو مسلمان ہو تو کیا ہوا۔ تم پر مصیبت آن پڑی ہے۔ ہمیں گیان دھیان سے معلوم ہوگیا ہے کہ بے قصور ہو۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو سچ ہے۔ ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے۔"

میں نے کہا۔

"مہاراج میں آپ کا احسان ساری زندگی نہیں بھلاؤں گا۔"

جوگی کے چہرے پر وہی بے معلوم سی مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا۔

"مورکھ! ہم کسی پر احسان نہیں کرتے۔ احسان تو سنسار میں رہنے والے لوگ کرتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"مہاراج اپنے گیان سے معلوم کیجئے کہ میری پتنی کہاں ہے۔ اگر وہ پاتال میں بھی ہوئی تو میں اسے وہاں سے نکال لاؤں گا۔"

جوگی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مورکھ ہو۔ تم اپنی پتنی کو پاتال سے نکال کر لا سکتے ہو مگر تمہاری پتنی پاتال میں نہیں

ہے۔"

"پھر کہاں ہے مہاراج؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

جوگی ایک بار پھر گیان دھیان کی حالت میں چلا گیا۔ کافی دیر وہ اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ پھر آنکھیں کھولیں اور کہنے لگا۔

"مورکھ! تمہاری پتنی کو سپیرا آلوپ نگر میں لے گیا ہے۔"

جوگی اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ میں اس کا منہ تکنے لگا۔

"مہاراج! یہ آلوپ نگر کہاں ہے کیا دیو گڑھ اور سنبھل پور کے قریب ہی ہے؟"

جوگی بولا۔

"مورکھ! جہاں آلوپ نگر ہے وہاں نہ دیو گڑھ ہے، نہ سنبھل پور ہے۔ نہ کاشی ہے، نہ ہردوار ہے۔ نہ متھرا ہے نہ برندا بن ہے۔ وہ تو آلوپ نگر ہے۔ سنسار والوں کی نظروں سے چھپا ہوا شہر ہے۔ اسی واسطے میں نے اسے آلوپ نگر کہا ہے۔ آلوپ کا مطلب ہے جو غائب ہو۔ جو کسی کو دکھائی نہ دے۔ یہ شہر کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ شہر موجود ہے۔ مگر وہاں آج تک سنسار کا کوئی آدمی نہیں جا سکا۔ تمہاری پتنی کو دہشت سپیرا وہیں لے گیا ہے۔"

میرا ذہن ایک نئی پریشانی میں الجھتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"مہاراج! آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں آلوپ نگر کو کون سا راستہ جاتا ہے۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

جوگی بولا۔ "مورکھ ہو۔ وہاں کوئی راستہ نہیں جاتا۔ اس کے چاروں طرف آدم خور درختوں کا جنگل ہے۔ مگرمچھوں سے بھرے ہوئے جوہڑ ہیں۔ ہاتھی چھواں گھاس کی جھاڑیوں کے اندر دلدلیں ہیں۔ درخت آدم خور جھاڑیوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ ان جھاڑیوں اور درختوں سے کوئی چیونٹی بھی زندہ نہیں گزر سکتی۔"

مجھ پر انتہائی مایوسی کا عالم طاری ہو چکا تھا۔ کسی وقت خیال آتا کہ یہ جوگی جھوٹ بول رہا ہے۔ مجھے ڈرا رہا ہے۔ اس کا گیان دھیان جھوٹا ہے۔ جب یہ خیال آتا کہ جوگی میرا

ہمدرد ہے' خیر خواہ ہے اس نے پولیس سے میری جان بچائی ہے۔ وہ میرا دشمن نہیں ہے۔ وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا۔ میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"مہاراج! اب جبکہ آپ نے میری جان بچائی ہے تو مجھے کوئی ایسا طریقہ بھی بتا دیجئے کہ جس کی مدد سے میں اپنی پتنی کے پاس پہنچ سکوں۔ اسے ظالموں کی قید سے آزاد کرا سکوں۔"

جوگی ہنس پڑا۔ بولا۔

"تم موہ مایا کے جال میں پھنسے ہوئے لوگ بڑے مورکھ ہو۔ پرنتو میں تمہارے واسطے جو کچھ کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔"

وہ اٹھ کر کونے میں گیا اور وہاں سے ایک تھیلا اٹھا کر لے آیا اور میرے سامنے اسی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے تھیلی کھول کر اس میں سے ایک چھوٹی تھیلی نکالی۔ اسے کھولا اور اس میں سے سیاہ رنگ کی ایک شیشی نکال کر اپنے سامنے رکھ لی۔ شیشی پر بھدا سا کاک لگا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"سن مورکھ! آلوپ نگر کے چاروں طرف جو جنگل ہے اسے لوگ یم دوت بن کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے موت کا جنگل--- اس بن میں جیسے ہی کوئی منش' کوئی بھولا بھٹکا آدمی داخل ہوتا ہے تو اس کی بو پا کر جنگل کے آدم خور درخت' آدم خور جھاڑیاں' زہریلے سانپ اور مگرمچھ چوکنے ہو جاتے ہیں۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی یا تو اسے کوئی زہریلا ناگ ڈس لیتا ہے یا کوئی آدم خور درخت اسے اپنی طرف کھینچ کر چٹ کر جاتا ہے اور یا کوئی نہ کوئی مگرمچھ اس کو منہ میں دبا کر تالاب کے گہرے پانیوں میں گھسیٹ کر لے جاتا ہے۔ تم جاؤ گے تو تمہارا بھی یہی حال ہو گا۔"

میں نے کوئی سوال نہ پوچھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ جوگی نے تھیلی میں سے جو شیشی نکالی ہے تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی پر اسرار بات ہوگی۔ جوگی نے شیشی کو اپنے ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اس شیشی میں گنگا جل ہے۔ اس گنگا جل پر اگنی منتر پھونکا گیا ہے۔ یہ صرف ہم جوگی

سنیاسی لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اس گنگا جل میں تیرے لیے مکتی ہے۔ تو گرہستی ہے۔ جوگی سنیاسی گرہستیوں سے دور رہتے ہیں۔ مگر تو اپنی پتنی سے پریم کرتا ہے۔ اپنی پتنی کے لیے پریشان ہے اس کے لیے جان کی بازی لگانے کو تیار ہے۔ اس واسطے میں تمہاری ضرور مدد کروں گا۔"

اس نے میری موجودگی میں مورتی کے سامنے چوکی پر رکھی چھوٹی سی خالی پیالی اٹھائی۔ شیشی کا کاک کھول کر اس میں سے گنگا جل یا جو کچھ بھی اس میں تھا' اس کے چند قطرے پیالی میں ڈالے۔ پھر لوٹیا میں سے تھوڑا سا پانی ڈال کر پیالی میری طرف بڑھائی۔

"لے مورکھ! اس کو پی جا۔"

میں کچھ جھجکا۔ خدا جانے اس میں کیا چیز ڈالی گئی ہو۔ مجھے ہچکچاتے دیکھ کر جوگی نے پیالی والا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

"دل نہیں مانتا تو مت پی۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں مہاراج! ایسی بات نہیں ہے۔ میں ضرور پیوں گا۔"

میں نے پیالی جوگی کے ہاتھ سے لی اور شیشی کے قطروں والا گنگا جل پی گیا۔ اس کا ذائقہ کسیلا تھا۔ میں نے پیالی چوکی پر رکھ دی اور جوگی کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"جانتے ہو تیرے شریر میں کیسی شکتی آ گئی ہے؟ تو نہیں جانتا مورکھ ہے۔ سن! اب تجھ پر سانپ کے کاٹے کا اثر نہیں ہو گا۔ چاہے ناگ دیوتا کا سانپ تجھے ڈس لے۔ تجھ پر اس کا زہر اثر نہیں کرے گا۔ اور سن! اس خاص جڑی بوٹی والے جل کے اثر سے تیرے بدن سے ایسی خوشبو نکلنا شروع ہو گئی ہے کہ جنگل کے کیڑے مکوڑے' جوہڑوں کے مگرمچھ تجھ سے دور بھاگ جائیں گے۔ آدم خور درختوں کی شاخیں اور خون چوسنے والی خونی جھاڑیاں تیری بو پا کر سمٹ جائیں گی۔ وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ اب تو بے خوف ہو کر آلوپ نگر کے خونی جنگل میں چل پھر سکے گا۔"

مجھے جوگی کی باتوں پر کچھ اعتبار آ رہا تھا۔ کچھ اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ اتنا میں نے ضرور سن رکھا تھا کہ جنگل کی بعض جڑی بوٹیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے اثر سے حیرت انگیز کارنامے ظاہر ہوتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

"مہاراج! اس جڑی بوٹی کا اثر کتنے دنوں تک رہے گا۔"

جوگی بولا۔

"جب تک تجھے موت نہیں آتی۔ اس کا اثر بدن میں موجود رہے گا۔"

سرد رات گزرتی جا رہی تھی۔ اب میرا ٹارگٹ آلوپ نگر کا خونی جنگل تھا جہاں دہشت سپیرا میری بیوی کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔ میں راتوں رات دلی شہر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ دن کے وقت خطرہ تھا کہ میں پولیس کے قابو میں نہ آ جاؤں۔ میں نے جوگی سے کہا۔

"مہاراج! اب جبکہ آپ نے میرے اندر خطرناک مگرمچھوں اور آدم خور درختوں جھاڑیوں سے بچنے کی طاقت پیدا کر دی ہے تو مجھے یہ بھی بتا دیں کہ آلوپ نگر کا جنگل کس طرف ہے تاکہ میں اپنی بیوی کو وہاں سے نکال سکوں۔"

جوگی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں سر کو دو تین بار ہلکا سا جھٹکا دیا۔ آنکھیں کھولیں اور کہنے لگا۔

"یہ درست ہے کہ تم پر سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہو گا۔ آدم خور جھاڑیاں تمہاری بو پا کر سمٹ جائیں گی۔ مگرمچھ تمہاری بو سے ڈر کر بھاگ جائیں گے لیکن کوئی نہ کوئی اژدہا تمہیں ضرور نگل سکے گا۔ اژدہوں اور بندروں پر تمہاری بو کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ تمہیں اژدہوں اور بندروں سے خبردار رہنا ہو گا۔ مجھے خود آلوپ نگر کے جنگل کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ میں تمہیں جوگن مایا دیوی کے پاس بھیج رہا ہوں۔ صرف وہی تمہیں آلوپ نگر کے خونی جنگ کا راستہ بتا سکتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"جوگن مایا دیوی مجھے کہاں ملے گی؟"

جوگی بولا۔

"تم دلی سے جھانسی جاؤ گے۔ جھانسی سے تمہیں راج گڑھ پہنچنا ہوگا۔ راج گڈھ سے پچھم کی طرف چوکھبا گاؤں تک بیل گاڑیاں جاتی ہیں۔ تم بیل گاڑی میں بیٹھ کر چوکھبا گاؤں جاؤ گے۔ چوکھبا گاؤں سے پچھم کی طرف ایک کوس کے فاصلے پر آلوپ نگر کے جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔ جہاں سے جنگل کے سیاہ کالے درختوں کی دیوار شروع ہوتی ہے۔ وہاں تمہیں ایک مڑھی ملے گی۔ وہاں جوگن مایا دیوی ایک کٹیا میں رہتی ہے۔ تم اس کو جا کر کہنا کہ تمہیں بن واسی جوگی نے بھیجا ہے۔ تم اس کو ساری رام کہانی سنا دینا۔ جوگن مایا دیوی تمہیں آلوپ نگر کے خونی جنگل کا راستہ بتا دے گی۔"

جوگی نے جو سفر بتایا تھا وہ کافی لمبا تھا اور ٹرین میں ہی سارا سفر طے کرنا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میری جیب میں دو سو کے قریب روپے موجود تھے۔ پھر بھی میں نے جیب سے نوٹ نکال کر گنے، پورے دو سو تیس روپے تھے۔ جوگی مسکراتے ہوئے بولا۔

"اگر تم جوگی کے بھیس میں جاؤ تو تمہیں ریل کا کرایہ نہیں دینا پڑے گا۔ بھارت میں جوگی سنیاسی ریل میں مفت سفر کرتے ہیں۔ سرکار کی طرف سے انہیں اس کی اجازت ملی ہوئی ہے۔"

مگر میں جوگی کا بھیس نہیں بدلنا چاہتا۔ میں نے کہا۔

"نہیں مہاراج! میں ان کپڑوں میں ہی سفر کروں گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی اب تم یہاں سے سٹیشن کی طرف چل پڑو۔ تمہیں رات کے اندھیرے میں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ پولیس تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اگر پولیس نے تمہیں پکڑ لیا تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ جاؤ۔"

میں نے جوگی کا شکریہ ادا کیا اور کٹیا سے نکل کر سامنے سے جو چھوٹی سڑک گزرتی تھی اس پر آگیا۔ سرد رات خاموش اور ویران ویران تھی۔ دور دور تک ہلکی ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اندازے سے دلی ریلوے سٹیشن کا رخ کیا اور چل پڑا۔

چلنے سے سردی کا احساس کم ہو گیا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں رک کر پیچھے دیکھ لیتا تھا کہ کوئی انٹیلی جنیس کا آدمی میرا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ ابھی تک مجھے ایسا کوئی انسان دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں ایک بڑی سڑک پر آ گیا۔ سڑک کی دونوں جانب بجلی کے کھمبوں پر مرکری لائٹس روشن تھیں۔ سڑک خالی تھی۔ کسی کسی وقت کوئی بھاری ٹرک یا ٹرالر گزر جاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ رات آدھی گزر چکی ہے۔ میں کافی دور تک چلتا گیا۔

ایک جگہ چوراہا آ گیا۔ یہاں اردگرد کافی فاصلے پر عمارتوں میں روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ میں نے اپنا رخ نہیں بدلا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جس طرف میں جا رہا ہوں دلی کا سٹیشن اسی طرف ہے۔ میں چوراہے سے آگے نکل گیا۔ دو تین گاڑیاں سڑک پر آگے نکل گئیں۔ میں سڑک کے کنارے چل رہا تھا۔ ایک گاڑی کی روشنیاں دکھائی دیں تو میں نے یونہی اسے ہاتھ دے دیا۔ گاڑی میرے قریب سے گزر گئی آگے جا کر رک گئی۔ میں دوڑ کر آگے گیا۔ یہ ایک جیپ تھی۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ کہیں یہ پولیس یا فوج کی جیپ نہ ہو۔ لیکن وہ سویلین جیپ تھی۔ ایک سکھ اسے چلا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

"کہاں جاؤ گے اوئے؟"

میں نے کہا۔

"سردار جی ریلوے سٹیشن جانا ہے۔"

اس نے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

میں ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سکھ ڈرائیور نے پوچھا۔

"کون ہو بھئی تم؟ آدھی رات کو اس طرف کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں نے یونہی ایک فرضی کہانی گھڑ کر سنا دی۔ ریلوے سٹیشن وہاں سے کافی دور تھا۔ سکھ ڈرائیور بڑا خوش مزاج تھا۔ اس نے تھوڑی پی بھی رکھی تھی۔ کہنے لگا۔

"میں بارہ کھمبا جا رہا ہوں۔ مگر تمہیں سٹیشن پر چھوڑ کر جاؤں گا۔"

وہ مجھے دلی کے ریلوے سٹیشن پر چھوڑ گیا۔

اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ سٹیشن پر کافی رونق تھی۔ میں نے ایک طرف کھڑے ہو کر ماحول کا جائزہ لیا۔ مجھے کوئی پولیس والا دکھائی نہ دیا۔ ایک قلی سے پوچھا۔ جھانسی جانے والی گاڑی کب چھوٹے گی؟ معلوم ہوا الہ آباد سے آنے والی گاڑی جھانسی تک جاتی ہے وہ ساڑھے تین بجے پچھلے پہر جائے گی۔ میں نے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خرید لیا اور پلیٹ فارم پر آ گیا۔ پلیٹ فارم پر مجھے پولیس کا سپاہی نظر آیا تو میں سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں گھس گیا۔ ویٹنگ روم میں کچھ مسافر سو رہے تھے۔ ایک بوڑھا سکھ آرام کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ایک بلی خدا جانے کہاں سے آ گئی۔ وہ شاید پہلے ہی سے ویٹنگ روم میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ کرسیوں کے پیچھے سے ہوتی ہوئی میرے قریب آئی تو اچانک اس کے بال کھڑے ہو گئے۔ زور سے چلائی اور مجھ سے ڈر کر بھاگ گئی۔ جوگی نے مجھے جو جڑی بوٹی گنگا جل میں گھول کر پلائی تھی اس کی تاثیر کا مجھے ثبوت مل گیا۔ یہ بلی میرے جسم سے خارج ہونے والی خاص اور بے معلوم بو سے ڈر کر بھاگی تھی۔ میں اٹھ کر باتھ روم میں پانی پینے آ گیا۔ فرش پر تین چار کاکروچ رینگ رہے تھے۔ جیسے ہی میں داخل ہوا انہوں نے دوڑ لگا دی اور کونوں کھدروں میں گھس گئے۔ ثابت ہو گیا تھا کہ میرے جسم سے نکلنے والی بو پا کر حشرات ارض اور بلی وغیرہ بھاگ جاتی ہے۔ بندر اور اژدھوں پر میری بو کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ مگر وہاں کوئی بندر اور اژدہا نہیں تھا۔

میں اس وقت تک ویٹنگ روم میں ہی رہا جب تک کہ جھانسی جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر نہیں آ گئی۔ گاڑی میں کافی رش تھا۔ میں پلیٹ فارم پر موجود پولیس والوں کی آنکھ بچا کر ایک ڈبے میں گھس گیا۔ ٹرین چل پڑی۔ جب تک دلی شہر کی روشنیاں نظر آتی رہیں میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر نہ دیکھا۔ ٹرین نے رفتار پکڑ لی تھی۔ میں اونگھنے لگا۔ پھر وہیں سر لگا کر سو گیا۔ تقریباً ساری رات کا جاگا ہوا تھا۔ آنکھ کھلی تو دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ٹرین کسی بڑے شہر میں داخل ہو رہی تھی۔ میں اس شہر کا نام بھول گیا ہوں۔ تیسرے پہر جھانسی کا سٹیشن آیا تو میں اتر گیا۔ وہاں سے راج گڑھ جانے والی برانچ لائن کی گاڑی مجھے ایک گھنٹے کے بعد ملی یہ ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ راج گڑھ وسطی بھارت کے جنوب میں ایک

معمولی سا سٹیشن تھا۔ یہاں سے مجھے بیل گاڑی میں سوار ہو کر چوکھمبا گاؤں جانا تھا۔ جہاں سے آگے ایک کوس کے فاصلے پر اس مڑھی تک جانا تھا جہاں سے آلوپ نگر یعنی گم شدہ شہر کا خونی جنگل شروع ہوتا تھا۔ اس جگہ مجھے جوگن مایا دیوی سے ملنا تھا۔

ابھی دن کی روشنی کافی تھی۔ راج گڑھ سو پچاس کھپریل کی ڈھلواں چھتوں والے پرانے ٹائپ کے کوارٹروں والا گاؤں تھا۔ گاؤں سے باہر ایک جگہ تین چار بیل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک بیل گاڑی پر کچھ دیہاتی عورتیں اور مرد سوار تھے۔ یہ چوکھمبا گاؤں جا رہی تھی۔ میں بھی اس میں سوار ہوگیا۔ بیل گاڑی چل پڑی۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں اور کھیتوں کے درمیان ایک غیر ہموار کچا راستہ تھا جس پر گاڑی ہچکولے کھاتے جا رہی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد چوکھمبا گاؤں آگیا۔ یہاں سوائے چند ایک جھونپڑیوں اور ایک پرانے تالاب کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہاں سے مجھے جنوب کی طرف ایک کوس کے فاصلے پر واقع آلوپ نگر کے جنگل کی سرحد تک پیدل جانا تھا۔ میں اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ اس وقت سورج مغرب کی جانب اونچے پہاڑوں کے پیچھے چھپ گیا تھا اور دن کی روشنی دھندلی ہوگئی تھی۔ میں نے ایک دیہاتی سے آلوپ نگر کے جنگل کا راستہ پوچھا تو' اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ مجھے آلوپ نگر کے خونی جنگل میں نہیں جانا بلکہ جنگل کی سرحد پر ایک جگہ بانس کے ذخیرے میں میرے چچا ٹھیکیداری کا کام کرتا ہے۔ میں اس سے ملنے جا رہا ہوں۔

ایک کوس کا راستہ کھیتوں اور اونچی گھاس کے میدان میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ میں اونچی اونچی ہاتھی چھپواں گھاس کے میدان میں سے باہر نکلا تو مجھے دور ایک سیاہ دیوار نظر آئی۔ یہ سیاہ دیوار درحقیقت آلوپ نگر یعنی گمشدہ شہر کی خونی جنگل کی سرحد کے درخت تھے۔ یہیں کسی جگہ ایک مڑھی تھی۔ مڑھی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ہندو لوگ اپنے مردے جلانے کے بعد ان کی ہڈیاں دبا دیتے ہیں۔ شام کے سائے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ یہاں کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا۔ جنگلی جھاڑیوں اور خشک گھاس والی زمین تھی۔ کوئی

پگڈنڈی بھی نہیں تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس طرف کوئی دیہاتی آتا جاتا نہیں ہے۔ میں نے گمشدہ شہر کے خونی جنگل کے سیاہ کالے درختوں کی دیوار کو نظر میں رکھا ہوا تھا اور اسی طرف چل رہا تھا۔ ایک جگہ مجھے درختوں کے نیچے دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔ میں اس طرف بڑھا۔ درختوں کے نیچے ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا۔ چبوترے پر ایک چھوٹی سی بانس کی کٹیا تھی۔ کٹیا کے آگے درخت کا ایک ٹُدھ سلگ رہا تھا۔ یہ جوگن مایا دیوی کی کٹیا ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا' وہاں کوئی نہیں تھا۔ کٹیا کا بانس کا دروازہ بند تھا۔ میں نے آہستہ سے آواز دی۔

"دیوی جی! مجھے بن واسی جوگی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

دو تین بار آواز دینے پر بھی کٹیا سے کوئی عورت باہر نہ نکلی۔ میں چبوترے کی ایک جانب ہو کر بیٹھ گیا۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ اندھیرا پورے ماحول کو اپنی آغوش میں لے رہا تھا۔ فضا پر بڑی پُر اسرار سی خاموشی چھائی تھی۔ کسی کسی وقت ایک درخت پر کوئی پرندہ دو ایک بار بول کر چپ ہو جاتا تھا۔ میں نے جائزہ لیا۔ کٹیا کے دروازے کے پاس مٹی کا ایک چھوٹے منہ والا گھڑا رکھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر مٹی کا پیالہ پڑا تھا۔ قریب ہی ایک دیگچی پڑی تھی۔ ایک طرف ایک ترشول زمین میں گڑا ہوا تھا۔ یہ کٹیا جوگن مایا دیوی کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جنگل میں گئی ہو گی۔ میں سوچنے لگا کہ ایک عورت اکیلی ویرانے میں کیسے رہ رہی ہے۔

مجھے خشک پتوں پر کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو شام کے دھندلکے میں مجھے ایک بہت بڑا بن مانس ٹائپ کا بندر نظر آیا جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے پاس ریوالور نہیں تھا۔ صرف کمانڈو چاقو ہی تھا۔ اس کے باوجود میں اتنے بڑے بندر کو دیکھ کر ایک بار تو ڈر گیا۔ مجھے جوگی کی بات یاد آ گئی کہ تمہارے جسم کی بو سے تمام کیڑے۔مکوڑے اور جانور چوپائے ڈر کر دور بھاگ جائیں گے مگر بندر اور اژدہا پر تیرے جسم سے نکلنے والی جڑی بوٹی کی بو کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ سرخ خونیں آنکھوں والا بن مانس برابر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ میں

نے چاقو نکال لیا تھا اور چبوترے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ بن مانس چبوترے کے پاس آکر رک گیا اور دانت نکال نکال کر حلق سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکالنے لگا۔ قریب تھا کہ وہ مجھ پر حملہ کر دیتا کہ اچانک ایک جانب سے کسی عورت کی آواز آئی۔

"پوتن پترا بھاگ جا' بھاگ جا۔"

درختوں میں سے ایک عورت نکل کر سامنے آگئی۔ اس نے جسم پر صرف گیروے رنگ کی ایک دھوتی لپیٹ رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کسی درخت کی ٹہنیاں تھیں۔ عورت کی آواز پر بن مانس واپس چلا گیا۔ میں نے چاقو بند کر کے جیب میں رکھا اور بڑے ادب سے اس عورت سے کہا۔

"دیوی جی! کیا آپ ہی کا شبھ نام مایا دیوی ہے؟"

اس دوران وہ عورت چبوترے پر چڑھ آئی تھی۔ اس نے درخت کی ٹہنیاں سلگتے ہوئے مڈ کے اوپر ڈال دیں۔ ٹہنیوں نے فوراً آگ پکڑ لی۔ خدا جانے یہ کس درخت کی ٹہنیاں تھیں۔ آگ کے شعلے کی روشنی میں اس عورت نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"کیا تمہیں گورو دیو جی نے بھیجا ہے؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں دیوی! مجھے بن واسی جوگی نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

"بیٹھ جاؤ۔"

میں آگ کے چھوٹے سے الاؤ کی ایک جانب ہو کر بیٹھ گیا۔ جوگن کٹیا کے اندر چلی گئی۔ باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی جو روشن تھی۔ وہ اندر سے لالٹین جلا کر لائی تھی۔ لالٹین کو اس نے کٹیا کے باہر دروازے کے پاس لٹکا دیا۔ لالٹین اور الاؤ کے شعلے کی وجہ سے وہاں اتنی روشنی ہو گئی کہ میں جوگن کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ وہ میرے سامنے ایک چوکی پر بیٹھ گئی۔

وہ جوان اور صحت مند عورت تھی۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ سیاہ بالوں کا اس نے پیچھے جوڑا بنایا ہوا تھا۔ گلے میں جوگیوں والی مالا تھی۔ جسم پر صرف گیروے رنگ کی ایک دھوتی

ہی تھی جس کے ایک پلو سے اس نے جسم کا اوپر والا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے دکھائی دے رہا تھا۔ کہنے لگی۔

"میں نے رات کو ہی گیان دھیان سے معلوم کر لیا تھا کہ تم میرے گوردیو کے حکم سے یہاں آ رہے ہو۔ تمہارا نام کیا ہے؟ تمہارا دھرم کیا ہے؟"

میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ میں مسلمان ہوں اور میرا نام کرم داد ہے اور پھر مختصر کر کے اپنی پوری کہانی بھی اسے سنا دی۔ وہ بڑے غور سے سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور ایک عجیب قسم کی کشش تھی جو جنگل میں اکیلا رہنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں سب سمجھ گئی ہوں۔ تم پہلے بھوجن کر لو۔ پھر تم سے بات کروں گی۔"

اس نے کٹیا میں سے ایک تھالی میں شکر قندی اور کچھ کیلے لا کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ گھڑے میں سے پانی کا پیالہ بھر کر لے آئی۔

"ہم سادھو سنیاسی لوگ ہیں پھل پھول پر گزر بسر کرتے ہیں۔"

مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے شکر قندی اور کیلے کھائے' پانی پیا اور جوگن کا شکریہ ادا کیا۔ الاؤ کی آگ مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ اس نے درخت کی کچھ شاخیں الاؤ میں ڈال دیں اور بولی۔

"میں چلم بھر کر لے آؤں۔"

وہ کٹیا میں چلی گئی اور ایک چھوٹی سی مٹی کی چلم لے آئی جس کے نیچے کپڑے کی دھجی سی لپٹی ہوئی تھی۔ وہ الاؤ کے پاس میرے سامنے بیٹھ گئی۔ چلم بھری ہوئی تھی۔ اس نے الاؤ میں سے ایک جلتی ہوئی ٹہنی سے ایک نگارہ نکال کر چلم کے اوپر رکھا۔ کپڑے کی دھجی والا چلم کا حصہ دونوں ہاتھوں میں لے کر منہ کے ساتھ لگایا اور زور زور سے کش لگانے لگی۔ میرا خیال تھا کہ چلم میں تمباکو ہو گا مگر جب دھواں نکلا تو اس کی بو سے معلوم ہوا کہ چلم میں چرس بھری ہوئی تھی۔ چھ سات لمبے لمبے کش لگانے کے بعد جب چلم میں سے ایک لاٹ نکلی تو جوگن نے منہ سے دھواں نکالتے ہوئے چلم اپنے پاس ہی اینٹ کے

ساتھ لگا کر رکھ دی اور بولی۔

"تم چلم پیو گے؟"

میں نے کہا۔

"نہیں دیوی جی! میں چلم نہیں پیتا۔"

وہ بولی۔

"میرا خاوند تو خوب چرس پیتا ہے۔"

میں نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

"دیوی جی! آپ کا خاوند کہاں ہے؟"

وہ بولی۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں آیا تھا۔ تم نے بھی اسے دیکھا تھا۔ وہ تم پر حملہ کرنے والا تھا۔"

میں حیرت میں ڈوب سا گیا۔ میں کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ جوگن بولی۔

"ہاں ہاں--- حیران کیوں ہوتے ہو۔ وہ بن مانس جو آیا تھا وہی میرا خاوند ہے۔ مگر اب میں اس سے تنگ آ گئی ہو۔ جی چاہتا ہے کہ کسی آدمی کو اپنا خاوند بناؤں۔ یہاں میری پسند کا کوئی آدمی نہیں ہے۔"

پھر اس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چرس کی سرخی جھلک رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم بڑے خوبصورت اور جوان ہو۔ ادھر کے آدمی بالکل بونے بونے سے ہوتے ہیں۔ مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔ کیا تم میرے خاوند بنو گے۔"

میں تو ڈر گیا کہ یہ کس قسم کی عورت ہے۔ میں اسے ناراض بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی مدد سے مجھے اپنی گمشدہ بیوی کا سراغ لگانا تھا۔ میں اس کا خاوند بھی نہیں بن سکتا تھا۔ میں نے ہاتھ باندھ کر عاجزی سے کہا۔

"دیوی جی! آپ تو میرے لیے آکاش دیوی ہیں اور پھر میں گھر گرہستی ہوں۔ میری

پہلے سے بیوی ہے۔"

وہ بولی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا بھی ایک آدمی خاوند تھا۔ وہ شہر میں رہتا ہے۔ میں نے اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے۔ اس میں مردوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ تم پورے مرد ہو۔ تم مجھے اچھے لگے ہو اور پھر تم میرے جیون بھر کے خاوند تھوڑے ہوگے۔ جب تک میرے پاس ہو میرے خاوند بن کر رہو۔ جب اپنی پتنی کو لے آؤ گے تو بے شک چلے جانا۔ ہم جوگی سنیاسی لوگ ہیں۔ کبھی کسی کے ساتھ من نہیں لگاتے۔"

میں عجیب الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس قسم کی حرکت میں نے زندگی میں کبھی نہیں کی تھی۔ میری ساری جوانی پاک بازی میں گزری تھی۔ میری زندگی کی پہلی اور آخری عورت میری بیوی جمیلہ ہی تھی۔ اس جوگن کے آگے صاف صاف انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ بات کا رخ کسی دوسری طرف پلٹ دیا جائے۔ میں نے کہا۔

"دیوی جی! کیا یہ سچ ہے کہ آلوپ نگر میں آج تک کوئی انسان نہیں گیا؟"

میری چال کامیاب رہی۔ میں موضوع بدلنے میں کامیاب ہو گیا۔ جوگن نے بڑے جلالی انداز میں کہا۔

"آلوپ نگر میں کس کی ہمت ہے کہ جائے۔ ایک بار انگریز لوگوں کی ایک شکار پارٹی کھوج لگانے وہاں گئی تھی۔ ان میں سے کوئی واپس نہیں آسکا۔ کچھ کو مگرمچھ ہڑپ کر گئے، کچھ سانپوں کے ڈسنے سے مار گئے۔ جو ایک آدھ سانپوں، مگرمچھوں سے بچا ہو گا اسے آدم خور جنگلی بیلوں نے دبوچ کر ہڑپ کر لیا ہو گا۔ وہ تو خونی جنگل میں ہی مرکھپ گئے۔ آلوپ نگر تک کہاں پہنچے تھے۔ آلوپ نگر جنگل کے دیوتاؤں کا نگر ہے۔ وہاں کوئی منش نہیں جا سکتا۔"

میں نے پوچھا۔

"دیوی جی! آپ کو تو میری ساری کہانی کا پتہ چل چکا ہے۔ اگر وہاں کوئی باہر کا آدمی

نہیں جا سکتا تو میری بیوی کو لے کر دہشت سپیرا وہاں کیسے چلا گیا؟"

جوگن مسکرائی۔ کہنے لگی۔

"یہ ایک راز ہے۔ تمہیں صرف اتنا ہی بتائے دیتی ہوں کہ ضرور آلوپ نگر کے مہادیو کو تمہاری بیوی پسند آ گئی ہوگی۔ دہشت سپیرا مہادیو کا خاص آدمی ہے۔ جب مہادیو جی کو باہر کی کوئی عورت پسند آ جاتی ہے یا اس کے کوئی گن پسند آ جاتے ہیں تو وہ دہشت سپیرے کو حکم دیتے ہیں کہ فلاں عورت کو اٹھا کر لے آؤ۔ اور دہشت سپیرا اس عورت کو چاہے وہ کہیں بھی ہو اٹھا کر لے آتا ہے۔ کبھی زبردستی بے ہوش کر کے اور کبھی ناگ دیوتا کا منتر پھونک کر۔ تمہاری بیوی پر سپیرے نے ناگ دیوتا کا خاص منتر پھونکا تھا۔ اسی کے اثر سے وہ اپنے آپ دہشت سپیرے کے ساتھ چل پڑی تھی۔"

میں نے عاجزی سے کہا۔

"دیوی جی! کسی طرح میری بیوی کو وہاں سے نکال دیجئے میں آپ کا ساری زندگی داسی بن کر رہوں گا۔ آپ کا ہر حکم مانوں گا۔"

جوگن نے نتھنے پھلا کر گہرا سانس لیا۔ اس وقت وہ مجھے واقعی بن مانس کی بیوی معلوم ہوئی۔ کہنے لگی۔

"مجھے وچن دو کہ تم میرا ہر حکم مانو گے پھر میں تمہاری پتنی تمہارے حوالے کر دوں گی۔"

میں نے کہا۔

"میں وچن دیتا ہوں۔"

وہ بولی۔

"یاد رکھو اگر تم اپنے وچن سے پھر گئے تو تم اور تمہاری بیوی جہاں بھی ہو گے میں وہاں پہنچ کر تم دونوں کو اپنے ترشول سے ہلاک کر دوں گی۔"

میں نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"دیوی جی! میں وچن دیتا ہوں اور میں اپنے وچن پر قائم رہوں گا۔"

جوگن مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ میں عجیب قسم کی پر اسرار دعوت تھی۔ یہ عورت جوان، خوش شکل اور صحت مند تھی مگر میرے لیے حرام تھی۔ میں سخت آزمائش میں پڑ چکا تھا۔ میں نے دل میں خدا کے حضور دعا مانگی کہ اے خدا! مجھے اس آزمائش میں پورا اترنے کی توفیق عطا فرما۔ الاؤ میں اس نے اور جھاڑیاں اور درختوں کی سوکھی شاخیں ڈال دیں۔ الاؤ میں ایک بار پھر چھوٹے چھوٹے شعلے بلند ہونے لگے۔ جوگن نے چرس والی چلم اٹھائی۔ اس پر آگ کا انگارہ رکھا اور لمبے لمبے کش لگانے لگی۔ جب چلم میں سے سلفے کی لاٹ بار بار بلند ہونے لگی تو اس نے چلم منہ سے ہٹالی اور ہونٹوں میں سے دھواں خارج کرتے ہوئے چلم واپس اینٹ پر رکھ دی اور اپنے جسم پر دھوتی کے ناکافی پلو کو ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

"سن مورکھ! یہ کام بڑا خطرناک ہے۔ مہادیو جی کی خاص پسند کی عورت کو ان کے بھون سے فرار کرانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مگر میں تمہاری خاطر یہ کام ضرور کروں گی اس لیے کہ مجھے تم پسند آ گئے ہو۔ جب مجھے کوئی مرد پسند آ جاتا ہے تو پھر میں ہر کام کر جاتی ہوں۔ پھر میں مہادیو جی کی بھی پروا نہیں کرتی۔ میں کام دیو کی چیلی ہوں۔ کام شاستر میں لکھا ہے کہ اے استری! اے عورت! اگر تجھے کوئی جوان منش پسند آ جائے تو اس سے وشو بھوگ کر۔ اس سے پورا لابھ اٹھا اور سوائے کام دیوتا کے اور کسی دیوتا کی پروا مت کر۔ کام دیوتا تمہاری خود حفاظت کرے گا۔ تم مجھے پسند آ گئے ہو میں تم سے وشو بھوگ کروں گی اور کام دیوتا خود مجھے مہادیو جی کے انتقام سے بچالیں گے۔"

وشو بھوگ کا مطلب اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں اس کو سمجھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے تو صرف ایک ہی فکر لگا ہوا تھا کہ چاہے میری جان چلی جائے مگر کسی طرح اپنی بیوی کو ان وحشی قسم کے لوگوں کے چنگل سے نکال کر اسے پاکستان پہنچا دوں۔ جب اس جوگن نے مجھ سے بچن لے لیا کہ میں اس کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا تو وہ اٹھ کر کٹیا میں گئی اور میرے لیے تھوڑی سی شکر قندی اور کیلے لے آئی۔ کہنے لگی۔

"تھوڑا اور کھالو تمہیں بھوک لگی ہوگی۔"

مجھے بھوک بالکل نہیں تھی لیکن جوگن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میں نے آدھی شکر قندی اٹھا کر کھالی۔ جوگن نے میرے سامنے کافی چرس پی تھی مگر اس پر جیسے اتنی چرس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ بالکل صحیح حالت میں تھی۔ گفتگو بھی ٹھیک کر رہی تھی۔ صرف کسی کسی وقت میری طرف گھور کر دیکھتی اور نتھنے پھلا کر بن مانس کی طرح گہرا سانس لے لیتی تھی۔ اس وقت مجھے اس سے ویسا ہی خوف محسوس ہوتا تھا جیسا خوف مجھے بن مانس کو دیکھ کر ہوا تھا جس کو جوگن مایا دیوی نے اپنا خاوند کہا تھا۔ میں اب زیادہ سے زیادہ تفصیلات معلوم کرنا چاہتا تھا تاکہ مجھے علم ہو سکے کہ یہ عورت میری بیوی کو آلوپ نگر کے خونی جنگل اور مہادیو کے چنگل سے کیسے نکال سکے گی۔ میں نے پوچھا۔

''دیوی جی! کیا تم مجھے ساتھ لے کر آلوپ نگر کی طرف جاؤ گی؟ میں چاہتا ہوں کہ اپنی بیوی کی تلاش میں میں تمہارے ساتھ ہی جاؤں۔''

وہ بولی۔

''میرے گورو دیو نے تمہیں گنگا جل میں جڑی بوٹی گھول کر پلائی ہے اس کی وجہ سے تمہارے جسم سے ایک خاص قسم کی بو خارج ہو رہی ہے۔ اس بو کو کوئی انسان محسوس نہیں کر سکتا۔ صرف میں اسے سونگھ رہی ہوں۔ اس بو کی وجہ سے تمہیں خونی جنگل کے آدم خور درخت' جھاڑیاں' سانپ سپولیئے اور بچھو' مگرمچھ کچھ نہیں کہیں گے بلکہ تمہاری بو پا کر بھاگ جائیں گے۔ میں نے بھی یہی جڑی بوٹی پی رکھی ہے۔ میں ہر سال اسے پیتی ہوں۔ ہم دونوں اکٹھے خونی جنگل میں جائیں گے۔ مگر آلوپ نگر کی سرحد پر پہنچ کر میں رک جاؤں گی' میں آگے نہیں جاؤں گی' آگے صرف تم جاؤ گے۔''

میں نے پوچھا۔ ''مجھے وہاں جا کر کیا کرنا ہوگا؟ مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ میری بیوی کس جگہ پر ہے؟''

وہ بولی۔

''یہ ساری باتیں میں تمہیں سمجھا دوں گی۔ پہلے میں دھوتی اچھی طرح باندھ لوں۔ ڈھیلی ہو گئی ہے۔ خبردار دوسری طرف منہ مت کرنا۔ یہ میرا حکم ہے۔''

میں نے کہا۔

"جو حکم دیوی جی۔"

اس نے کھڑے ہو کر دھوتی اتاری اور اسے دونوں ہاتھوں سے جھٹکنے لگی۔ مجھے شرم آ گئی کیونکہ وہ میرے سامنے لالٹین اور الاؤ کی روشنی میں بالکل مادر زاد ننگی کھڑی تھی۔ میں اپنا چہرہ دوسری طرف نہیں کر سکتا تھا۔ میں مجبور تھا۔ اس عیاش قسم کی جوگن کے حکم کا پابند تھا۔ میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف کیے رکھا۔ لیکن شرم و حیا کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ جوگن نے کڑک دار آواز میں کہا۔

"مورکھ! آنکھیں کھلی رکھو۔ یہ میرا حکم ہے۔"

اور میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔

یقین کریں میری حالت اس آدمی کی طرح تھی جس کو تیرنا نہ آتا ہو اور جسے زبردستی دریا میں دھکا دے دیا ہو۔ وہ عیاش قسم کی جوگن مایا دیوی میرے سامنے عریاں تھی۔ اس کا بدن ان مورتیوں کی طرح کا تھا جیسی مورتیاں میں نے جنوبی ہند کے ایک مندر میں دیکھی تھیں اور جنہوں نے نہایت فحش اور ہیجان خیز پوز بنا رکھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا بدن ایسا تھا کہ جس کو دیکھ کر آدمی تو کیا جانور بھی ایک بار بدک جاتے ہوں گے۔ الاؤ اور لالٹین کی روشنی میں اس کے جسم کے ابھار اور نشیب و فراز نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور اپنے بدن کو پیار بھی کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"مورکھ! تو میرا مراد ہے۔ میرا پتی ہے۔ میں نے تجھے تھوڑے وقت کے لیے اپنا خاوند بنا لیا ہے۔ پھر مجھ سے کیوں شرماتا ہے۔ اٹھ اور اٹھ کر میری دھوتی باندھ۔"

میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ میں نے آج تک سوائے اپنی بیوی کے اور کسی عورت کا بدن نہیں دیکھا تھا۔ دل میں خدا سے معافیاں مانگ رہا تھا۔ توبہ استغفار کر رہا تھا۔ مجبور تھا۔ بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں اٹھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ جوگن نے کڑک کر کہا۔

"اپنے بچن کو بھول گیا؟ میرا حکم نہیں مانے گا تو یاد رکھ اپنی بیوی سے کبھی نہیں مل سکے گا۔"

میں دل میں دلی کے جوگی کو کوس رہا تھا کہ اس نے مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اصل مصیبت ابھی آنے والی تھی یہ تو نمونہ تھا۔ اصل ڈرامہ بعد میں شروع ہونے والا تھا۔ میں جلدی سے اٹھا اور دھوتی پکڑ کر جوگن کو باندھنی شروع کر دی۔ کمر کے گرد ایک بل لپیٹا تو جوگن نے مجھے پکڑ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ بولی۔

"مورکھ! تیرا سریر کیوں کانپ رہا ہے؟ کیا اپنی بیوی کے پاس جا کر بھی تو کانپتا ہے؟"

میں نے گھبراہٹ میں جلدی جلدی اس کے جسم پر دھوتی لپیٹی اور واپس الاؤ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت میرے اندر بھی ایک الاؤ روشن تھا۔ میرے اندر بھی ایک آگ سی لگ گئی تھی۔ شاید یہ نیچر کا تقاضا تھا۔ میں بار بار خدا سے معافیاں مانگ رہا تھا۔ جوگن دھوتی سے اپنے جسم کو ڈھانپ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"تم آج رات میری کٹیا میں آرام کرو گے۔ ہم کل کسی وقت خونی جنگل کی طرف جائیں گے۔"

میں نے اپنے جذباتی ہیجان پر کافی حد تک قابو پا لیا تھا۔ میں نے کہا۔

"دیوی جی! میرے پاس ایک لمبا چاقو ہے۔ شاید راستے میں اس کی ضرورت پڑ جائے۔"

وہ بولی۔

"وہاں چاقو، چھریاں، اور بندوقیں کام نہیں آئیں گی۔ آلوپ نگر دیوتاؤں کی نگری ہے۔ وہاں کی دنیا کچھ اور ہی ہے۔ میرے ساتھ جاؤ گے تو سب معلوم ہو جائے گا۔ اکیلے جاتے تو راستے میں ہی ختم ہو جاتے۔"

میں نے کہا۔

"ہم آج رات کو ہی نہ اس مہم پر نکل چلیں؟"

دراصل میں رات اس وحشی جوگن کی کٹیا میں گزارتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ وہ جلالی انداز میں بولی۔

"نہیں مورکھ! ہم کل ہی جائیں گے۔ آج رات میں کام دیوتا کی پوجا کروں گی۔ کام دیوتا کو رجھاؤں گی تاکہ آلوپ نگر کے دیوتا مہادیو کے خلاف وہ میری مدد کرنے پر راضی ہو جائے اور مجھے مہادیو کے انتقام سے بچالے۔ میں مہادیوتا سے اس کی چہیتی اپسرا اور شاہی نرتکی یعنی تمہاری بیوی اس سے چھیننے جا رہی ہوں۔ اگر کام دیوتا کی مدد میرے ساتھ شامل نہیں ہوگی تو مہادیو ہم دونوں کو جلا کر بھسم کر ڈالے گا۔"

میں چپ ہو کر بیٹھا رہا۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ جوگن نے چرس کی ایک اور چلم پی لی۔ اس دوران وہی بن مانس خر خر کرتا ایک بار پھر جنگل کی تاریکی سے نکل کر چبوترے کے پاس آگیا جس کو جوگن نے اپنا خاوند ظاہر کیا تھا۔ وہ جوگن کی طرف دیکھ کر گردن ہلا رہا تھا اور اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے پیٹ رہا تھا۔ جوگن نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مرا کیوں جاتا ہے' تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جا' بیٹھ جا۔"

بن مانس جیسے اس کی زبان سمجھ رہا تھا۔ وہ فوراً وہیں بیٹھ گیا۔ جوگن نے چلم نیچے رکھ دی۔ اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کا خمار تھا۔ کہنے لگی۔

"بندر اور بن مانس ہمارے دھرم میں دیوتا کا درجہ رکھتے ہیں۔ ھنومان جی بندروں کے سردار تھے۔ انہوں نے ہمارے بھگوان رام چندر کی مدد کی تھی اور اپنی فوج کے ساتھ رام چندر جی کے ساتھ مل کر لنکا پر چڑھائی کی تھی اور لنکا کو آگ لگا دی تھی۔ تب سے بندروں کے اندر ایک نئی شکتی پیدا ہوگئی ہے۔ ان کے پاس ایسی ایسی خفیہ طاقتیں ہیں کہ اگر عورت کسی بن مانس یا بڑے بندر سے شادی کر لے تو وہ کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ اس کے بال کبھی سفید نہیں ہوتے' نہ ہی اس کے جسم پر جھریاں پڑتی ہیں۔ تم نے میرا جسم دیکھا ہے۔ تمہیں ایک بھی جھری نظر نہیں آئی ہوگی۔ پانچ برس سے یہ بن مانس میرا خاوند ہے۔ تب سے لے کر آج تک میرے اندر جوانی کی نئی طاقت پیدا ہوگئی ہے۔ میری عمر

خواہ ستر سال کی بھی ہو جائے مگر میرا جسم اسی طرح جوان رہے گا۔ یہ ایک راز ہے جو کام دیوتا جی نے صرف مجھ پر ظاہر کیا تھا۔ کام دیوتا ہمارے دھرم میں جنسی محبت اور دو جسموں کے ملاپ کا دیوتا ہے۔ ہمارے ہندو دھرم کی کتاب کام سوتر میں دو جسموں کے ملاپ کے ایک ہزار طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ سارے طریقے دیوتا کام دیو نے خود لکھوائے تھے۔ جب وہ آدمی کا روپ دھار کر دنیا میں آئے تھے۔"

جوگن چرس کے نشے میں بولے جا رہی تھی اور اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک جانور قسم کی عورت ہے اور جانوروں کی طرح جنسی رجحان کی مالک ہے ورنہ ایک عام عورت ایک شریف اور نارمل عورت کبھی اس قسم کی واہیات باتیں نہیں کرتی۔ بن مانس اسی طرح چبوترے کے پاس نیچے بیٹھا عجیب لالچی نظروں سے جوگن کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ زور سے اپنا سینہ پیٹ لیتا تھا۔ جوگن کہہ رہی تھی۔

"میں اس بن مانس سے روز رات کو مالش کرواتی ہوں۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ یا خدایا! یہ تو نے مجھے کس آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ مجھے اس عورت سے بچا لینا۔ کہنے لگی۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ بن مانس میری مالش کیسے کرتا ہوگا؟"

میں چپ رہا۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"پوچھو کہ بن مانس میری مالش کیسے کرتا ہے؟ یہ میرا حکم ہے۔"

میں نے بادل نخواستہ پوچھا۔

"دیوی جی! بن مانس تمہاری مالش کیسے کرتا ہے؟"

وہ اب جھومنے لگی۔ یہ چرس کے نشے کا اثر تھا۔ کہنے لگی۔

"بن مانس کی زبان بڑی لمبی ہوتی ہے۔ جب وہ کسی عورت کے بدن کو دیکھتا ہے تو اس کی زبان سے ایک خاص قسم کا تیل نکلنے لگتا ہے۔ اس تیل میں بڑی شکتی ہوتی ہے۔ یہ تیل عورت کے جسم کو پھر سے جوان کر دیتا ہے۔ بن مانس جو میرا خاوند بھی ہے۔ اپنی

زبان سے میری مالش کرتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور بن مانس کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"میرے پتی دیو! آجا' آجا۔"

وہ اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی بن مانس بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اچھل کر چبوترے پر آگیا۔ جوگن نے بن مانس کی انگلی پکڑی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔

"میں ابھی مالش کروا کر آتی ہوں۔ تم بھاگ مت جانا۔ یاد رکھو اگر بھاگ گئے تو میں تمہارا پیچھا نہیں کروں گی لیکن پھر تم اپنی بیوی کا منہ کبھی نہ دیکھ سکو گے۔"

وہ بن مانس کو لے کر کٹیا کے اندر چلی گئی۔

میں الاؤ کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ میں خوف زدہ ہو گیا تھا۔ خدا جانے یہ وحشی عورت میرے ساتھ کس قسم کا وحشیانہ سلوک کرنے والی تھی۔ کسی وقت خیال آتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس بھاگ جاؤں' پھر خیال آتا کہ اگر بھاگ گیا تو جمیلہ کو کبھی نہ پا سکوں گا۔ پھر خیال آتا کہ جہنم میں جائے یہ جوگن وو گن میں اکیلا ہی جنگل میں اپنی بیوی کی تلاش میں نکل پڑتا ہوں۔ جنگل کی طرف نگاہ ڈالی تو کچھ فاصلے پر خونی جنگل کے درخت تاریکی میں جن بھوتوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے محسوس ہوئے۔ خیال آیا کہ خالی جنگل ہوتا تو میں بے دھڑک نکل پڑتا مگر یہ خونی جنگل ہے جس کے بارے میں دیہاتی نے بھی مجھے بتایا تھا کہ اس طرف جو کوئی گیا واپس نہیں آیا۔ وہاں مگرمچھوں سے بھرے ہوئے جوہڑ ہیں' ہاتھیوں کو ثابت نگل جانے والی دلدلیں ہیں۔ آدمیوں سے چمٹ کر ان کا خون پی جانے والی بیلیں ہیں۔ آدمیوں کا گوشت کھا جانے والے درخت ہیں۔ زہریلے سانپ ہیں۔ اگرچہ میرے جسم کی بو مجھے ان مگرمچھوں' آدم خور درختوں اور زہریلے سانپوں سے بچا سکتی تھی مگر بندروں اور اژدہوں کا میں مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ خونی جنگل میں گمشدہ شہر کس طرف کو ہے اور وہاں کونسا راستہ جاتا ہے۔ دیہاتی آدمی نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ خونی جنگل میں ایسے خونخوار بن مانس رہتے ہیں جو آدمی کو دیکھ کر اس پر ٹوٹ پڑتے

ہیں اور اس کی تکا بوٹی کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیہاتی آدمی نے دلی والے جوگی کی اس بات کی بھی تصدیق کی تھی کہ آلوپ نگر کے محل کے کھنڈر پر ایک اژدہا اپنے سانس سے آدمی کو کھینچ کر ثابت نگل لیتا ہے۔"

یہ سب کچھ سوچ کر میں وہیں الاؤ کے پاس بیٹھا رہا۔ سچ پوچھیں تو خونی جنگل میں اکیلا جانے کو میرا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ آخر یہی سوچ کر بیٹھا رہا کہ اس وحشی جوگن کا عذاب جھیلنا ہوگا اور اسی کے ساتھ آلوپ نگر جا کر اپنی بیوی کو واپس لانے کی کوشش کروں گا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔

میں نے کٹیا کی طرف دیکھا۔ اس کا بانس کا دروازہ ایک طرف کو ہٹا ہوا تھا۔ جوگن لالٹین اپنے ساتھ اندر نہیں لے گئی تھی۔ لالٹین کٹیا کے باہر ہی جل رہی تھی اندر سے کسی کسی وقت بن مانس کے غرانے اور خرخرانے کی آواز آ جاتی تھی۔ اس کے بعد خاموشی چھا جاتی تھی۔ میں اپنی بیوی جمیلہ کے خیال میں غرق تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہم دونوں کس ناگہانی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ یا اللہ پاک تو ہی ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتا ہے۔ کافی دیر کے بعد کٹیا کے اندر سے پہلے بن مانس نکلا۔ وہ اچھلتا کودتا سینے پر زور زور سے دونوں ہاتھ مارتا' حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا باہر آیا اور چبوترے پر سے قلابازی لگا کر نیچے کودا اور دوڑتا ہوا جنگل کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد جوگن مایا دیوی اپنے بالوں کا جوڑا بناتی کٹیا سے باہر آئی۔ اس کے بدن کا جو حصہ ننگا تھا وہ اس طرح چمک رہا تھا جیسے اس پر تیل کی مالش کی گئی ہو۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے الاؤ میں خشک جھاڑیاں ڈال کر آگ کو دوبارہ روشن کر دیا۔ رات کو ہلکی ہلکی خنکی ہو گئی تھی۔ میں الاؤ کے پاس بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ چاہتا تھا کہ کسی جگہ لیٹ جاؤں۔ مگر میں کٹیا کے اندر جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں کٹیا کے اندر گیا تو وحشی عورت میرے ساتھ وہی سلوک کرے گی جو بن مانس نے اس کے ساتھ کیا تھا۔

وہ کہنے لگی۔ "مورکھ مرد! تجھے نیند تو نہیں آ رہی؟"

میں نے کہا۔ "نہیں دیوی جی!"

وہ ہنس پڑی۔

"ابھی تو ساری رات پڑی ہے۔ ابھی مجھے تمہارے ساتھ مل کر کام دیوتا کی پوجا پاٹھ کرنی ہے۔"

میرا جسم لرز کر رہ گیا۔ خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ میرے ساتھ یہ عورت کیا سلوک کرنے والی تھی۔ وہ بولی۔

"میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کو لاتی ہوں۔"

وہ واپس کٹیا میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بانس کی بڑی چنگیر تھی جس میں کیلے شریفے اور شکرقندی تھی۔ چنگیر اس نے میرے آگے رکھ دی اور کہا۔

"لو مزے سے کھاؤ۔ اس کے ساتھ تم پانی نہیں پیؤ گے۔ سوم رس پیؤ گے۔"

سوم رس کا میں نے سنا ضرور تھا مگر کبھی پیا نہیں تھا۔ ڈھاکے میں ایک ہندو پجاری ہوا کرتا تھا۔ اس کی زبانی سن رکھا تھا کہ سوم رس ہندوؤں کے دیوتا پیا کرتے ہیں۔ یہ ان کا پسندیدہ مشروب ہے۔ میں یہی سمجھا کہ یہ بھی گنگا جل کی طرح کا کوئی پانی ہو گا۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کر کٹیا میں گئی اور سلور کا ایک جگ اور مٹی کا پیالہ لے کر آ گئی۔ کہنے لگی۔

"تم نے کبھی سوم رس پیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"نہیں دیوی جی! کیا گنگا جل کی طرح کسی دریا کا پانی ہوتا ہے؟"

وہ بولی۔

"سوم رس صرف دیوتا لوگ پیتے ہیں۔ میں چونکہ کام دیوتا کی بھگتنی ہوں اس لیے کام دیوتا خود آ کر مجھے سوم رس دے جاتے ہیں۔ تم پیؤ گے تو تمہارا دماغ روشن ہو جائے گا۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"دیوی جی! مجھے سوم رس نہ ہی پلائیں تو آپ کی مہربانی ہو گی۔"

وہ غصے میں بولی۔

"کیا اپنا بچن بھول گئے ہو؟ یہ میرا حکم ہے تمہیں ماننا ہی پڑے گا۔ تم نے اگر سوم رس نہ پیا تو کام دیوتا کی پوجا ادھوری رہ جائے گی۔ کام دیوتا کی پوجا ادھوری رہ گئی تو وہ تمہاری بیوی کو مہادیو کی قید سے نکالنے میں میری مدد نہیں کریں گے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری بیوی تمہیں نہ ملے؟"

میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں دیوی! میں یہ ہرگز نہیں چاہتا۔ میں سوم رس ضرور پیوں گا۔"

وہ خوش ہو گئی۔ اس نے سلور کے جگ میں سے سوم رس نکال کر مٹی کے پیالے میں ڈالا اور پیالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لو۔ اسے پی جاؤ۔ آہستہ آہستہ پینا۔"

میں نے بڑی بے دلی سے پیالہ ہونٹوں کے ساتھ لگایا تو مجھے ایسی تیز بو آئی جیسے میرے سامنے کسی نے سپرٹ کا ڈرم کھول دیا ہو۔ میں نے بے اختیار ہو کر پیالہ پیچھے کر دیا۔

"کیوں؟" جوگن نے ڈانٹ کر کہا۔ "کیا ہوا ہے؟ سوم رس کے پیالے کی بے عزتی کی تو کام دیوتا ناراض ہو جائے گا۔ اسے پی جاؤ۔"

میں نے ناک بند کر کے پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لگانے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے حلق میں آگ اتر رہی ہے۔ تیزی سے میں نے پیالہ ختم کر کے نیچے رکھ دیا۔ میرے حلق سے جیسے گرم گرم بھاپ نکل کر ہوا میں تحلیل ہو گئی اور حلق انتہائی کڑوا ہو گیا تھا۔ جوگن نے مجھے کیلا چھیل کر دیا۔

"اسے کھا جاؤ۔ گنیش جی مہاراج کیلے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ یہ بھی دیوتاؤں کا پھل ہے۔"

میں جلدی جلدی سارا کیلا کھا گیا۔ کیلا میٹھا تھا۔ اس سے میرے حلق کی کڑواہٹ کسی حد تک دور ہو گئی۔ مگر جگر میں جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔ آنکھوں سے سینک نکلنے لگا تھا۔

سر بھاری ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ شراب ہے جس کو جوگن سوم رس کہہ رہی ہے۔ میں نے اس سے وچھا۔

"یہ شراب تو نہیں تھی دیوی؟"

وہ اس وقت اپنا پیالہ پی رہی تھی۔ پیالہ چڑھانے کے بعد اس نے نتھنے پھلا کر عجیب سی آواز نکالی اور بولی۔

"کون دھشٹ اسے شراب کہتا ہے۔ یہ دیوتاؤں کا سوم ریں ہے اور کام دیوتا آکاش سے مجھے خود لا کر دیتے ہیں۔ یہ لو اور پیئو۔"

اس نے زبردستی مجھے دوسرا پیالہ بھی بھر کر پلا دیا۔ دوسرا پیالہ پینے کے بعد میرا حلق پہلے کی طرح کڑوا نہیں رہا تھا۔ مجھے اپنا سر بھی ہلکا ہلکا لگنے لگا تھا۔ جسم میں ہلکی ہلکی گرمائش توانائی بن کر پھیلنے لگی تھی۔ جوگن مایا دیوی پر بھی ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔ کہنے لگی۔

"اندر چلو کام دیوتا کی پوجا کا وقت ہو گیا ہے۔"

وہ اٹھی اور لالٹین کٹیا کے اندر لے گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ایک دست بستہ غلام کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے کٹیا کا دروازہ بند کر دیا۔ کٹیا کے اندر ہرن کی چھال بچھی ہوئی تھی۔ کونے میں کسی دیوتا کی مورتی چوکی پر رکھی ہوئی تھی۔ جوگن نے مورتی کے آگے دیا روشن کر کے لوبان سلگا دیا۔ کٹیا میں بہت جلد لوبان کی تیز بو پھیل گئی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ جوگن مورتی کے آگے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور ہاتھ باندھ کر کسی عجیب زبان میں اشلوک گنگنانے لگی۔ دیر تک وہ اشلوک گنگناتی رہی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ لوبان میں سے اٹھتا ہوا دھواں ہاتھ سے اپنے چہرے پر ملتی۔ اشلوک ختم کرنے کے بعد اس نے دھوتی نما ساڑھی اتار کر ایک طرف رکھ دی اور میری طرف لال لال آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کام دیوتا حاضر ہو گئے ہیں۔ پوجا کا آخری ورتن ہو گا۔"

میں جیسے اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ وہ جو حکم دیتی تھی میں بندہ بے دام کی طرح اسے بجا لاتا۔ کام دیوتا کی پوجا شروع ہو گئی۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو

رہا ہے۔ دل میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ اس عورت کی مدد کے بغیر میں اپنی بیوی کو حاصل نہیں کر سکتا۔ ساری رات کام دیوتا کی پوجا جاری رہی۔ نہ جانے کس وقت میں نیم جان سا ہو کر ہرن کی چھال پر سو گیا۔

آنکھ کھلی تو کٹیا کے اندر دھوپ آ رہی تھی۔

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ میرا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ جوگن مایا کٹیا میں نہیں تھی۔ میں اٹھ کر باہر آیا۔ الاؤ بجھ چکا تھا۔ دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چبوترے کے سامنے کی جانب دور تک گھاس اور جھاڑیوں کا میدان تھا۔ جس کے سرے پر خونی جنگل کے درخت نظر آ رہے تھے۔ اتنے میں جوگن بھی آ گئی۔ اس کے بال گیلے تھے۔ وہ نہا کر آ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"کام دیوتا نے میری پوجا سوئیکار کر لی ہے۔ وہ تم سے بھی بہت خوش ہیں۔ اب تمہارا کام ہو جائے گا۔ کام دیوتا اس مہم میں ہماری حفاظت کریں گے۔ جاؤ تم بھی اشنان کر آؤ۔ سامنے والی جھاڑیوں کے پیچھے تالاب ہے۔"

میں تالاب کی طرف چل پڑا۔ مجھے دیکھ کر یا میرے جسم کی بو پا کر جھاڑیوں میں سے دو خرگوش گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں نے تالاب میں غسل کیا واپس آیا تو جوگن چاول ابال رہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"یہاں تمہیں پھل اور چاول وغیرہ کون لا کر دیتا ہے؟"

وہ بولی۔

"پھل فروٹ میرا بن مانس خاوند میرے لیے لے آتا ہے۔ چاول اور چائے میں خود گاؤں میں جا کر لاتی ہوں۔"

ہم نے وہیں چولہے کے پاس بیٹھ کر چاول کھائے' چائے پی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ہم آلوپ نگر کی جانب کس وقت روانہ ہوں گے۔ وہ بولی۔

"دن کے تیسرے پہر یہاں سے نکلیں گے۔ لیکن تم اس حلیے میں میرے ساتھ نہیں

جاؤ گے۔ تمہیں جوگی سادھوؤں والا حلیہ بنانا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔

"میرے پاس تو سادھوؤں کا لباس نہیں ہے۔"

وہ بولی۔

"سادھوؤں کو لباس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے پاس ایک گیروی دھوتی ہے تم وہی اپنے جسم پر لپیٹ لینا۔ پاؤں میں جوتی بے شک یہی پہن لینا۔"

جوگن نے تیسرے پہر میرے کپڑے اتروا کر میرے سارے بدن پر چولہے کی راکھ مل دی۔ سر میں بھی راکھ ڈال کر میرے بالوں کی مروڑیاں سی بنا دیں۔ پھر مجھے سادھوؤں والی زعفرانی رنگ کی دھوتی پہنائی جس کا ایک پلو میں نے کندھے پر ڈال لیا۔ کہنے لگی۔

"اب تم میرے ساتھ آلوپ نگر میں داخل ہو سکو گے۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا ہم آلوپ نگر میں داخل ہو سکیں گے؟"

وہ بولی۔

"تم دیکھتے جاؤ کہ میں تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کرتی۔ رات تم نے کام دیوتا کو خوش کر دیا ہے۔ میری پوجا سوئیکار ہو گئی ہے۔ کام دیوتا ہماری مدد کرے گا۔ جب ہم آلوپ نگر میں داخل ہوں گے تو تم گونگے بہرے بن جاؤ گے۔ پھر تمہارا نام ہری بھگت ہو گا۔ کوئی تم سے بات کرے گا تو تم یہ ظاہر کرو گے تم کچھ نہیں سن رہے۔ تم کچھ بولو گے بھی نہیں۔ باقی میں سنبھال لوں گی۔"

میں نے جوگن کی نظریں چھپا کر کمانڈو چاقو اپنی دھوتی میں چھپا کر رکھ لیا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ آگے چل کر حالات کیا شکل اختیار کر لیں۔ جوگن نے بھی جوگنوں والا حلیہ بنا لیا۔ ماتھے پر تلک کی تین سرخ لکیریں ڈالیں۔ بالوں کو شانوں پر کھلا چھوڑ دیا۔ ہاتھ میں ترشول پکڑ لیا۔ ہم تیسرے پہر کٹیا سے نکل کر اپنی مہم پر روانہ ہو گئے۔

جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈوں والا میدان عبور کرتے ہمیں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔

خونی جنگل کی سرحد پر پہنچ کر جوگن نے رک کر اونچے سیاہ تنوں والے درختوں کو دیکھا اور دھیمی آواز میں کوئی اشلوک پڑھا اور کہنے لگی۔

"ڈرنا بالکل نہیں۔ کوئی مگرمچھ، کوئی سانپ، کوئی آدم خور درخت اور جھاڑیاں ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گی۔"

ہم خونی جنگل میں داخل ہوگئے۔

یہ وقعی بڑا ہیبت ناک جنگل تھا۔ ایسا جنگل میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ درختوں کے تنے بالکل سیاہ کالے تھے۔ ان پر کانٹے دار بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ کچھ دور تک جنگل میں ہمیں اتنا راستہ ملتا گیا کہ ہم آسانی سے چلتے رہے۔ اس کے بعد جھاڑیاں ایک دوسرے میں الجھ گئیں۔ ہمیں ان کی شاخوں کو ہٹا کر راستہ بنانا پڑتا تھا۔ جوگن ترشول سے جھاڑیوں کو ہٹاتی جاتی تھی۔ جھاڑیاں ختم ہوئیں تو ایک تالاب دکھائی دیا۔ تالاب کی سطح پر سبز کائی جمی ہوئی تھی۔ تالاب کے کنارے چھ سات مگرمچھ لیٹے ہوئے تھے۔ ہمارے قدموں کی آواز آہٹ پر مگرمچھوں نے سر اٹھائے اور نوکیلے دانتوں والے جبڑے کھول کر ڈراؤنی آوازیں نکالیں۔ میں ڈر کر رک گیا۔

جوگن نے کہا۔

"چلتے چلو۔ یہ ابھی بھاگ جائیں گے۔"

جیسے ہی مگرمچھوں نے ہمارے جسموں سے خارج ہونے والی جڑی بوٹیوں کی بو سونگھی وہ تڑپ کر تالاب کی طرف دوڑے اور پانی میں اتر کر غائب ہوگئے۔ اس کے بعد ایک کالا سیاہ تختہ دیکھا جس پر درختوں کے پتے گرے ہوئے تھے۔ جوگن نے مجھے بازو سے پکڑا اور دوسری طرف لے گئی۔ کہنے لگی۔

"یہ دلدل ہے۔ یہ اتنی گہری ہے کہ اس میں اگر ہاتھی گر پڑے تو یہ اسے ایک سیکنڈ میں نگل لے گی۔"

میں نے غور سے دیکھا۔ سیاہ دلدل میں سے بخارات اٹھ رہے تھے جیسے دلدل سانس لے رہی ہو۔ اس خونی جنگل میں گھنے درختوں کی وجہ سے دھوپ بالکل غائب تھی۔ دن

کی روشنی بھی پھیکی اور دھندلی تھی۔ ایک جگہ جھاڑیوں میں سے سانپ کی پھنکاریں بلند ہوئیں۔ میں ڈر کر جوگن کے ساتھ لگ گیا۔ اتنے میں تین سبز اور سرخ رنگ کے سانپ جھاڑیوں میں سے نکل کر ہم سے دور بھاگ گئے۔ جوگن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں گھبراتے ہو؟ میرے گورو دیو نے تمہیں گنگا جل میں جو بوٹی گھول کر پلا دی ہے اس کی خوشبو تمہارے جسم سے برابر نکل رہی ہے۔ یہ خوشبو کسی سانپ، بچھو، مگرمچھ، شیر، چیتے کو تمہارے قریب نہیں آنے دے گی۔ صرف بندروں اور بن مانسوں پر اور اژدہا سانپوں پر اس بو کا اثر نہیں ہوگا۔ آجاؤ۔"

ہم پھر چل پڑے۔





جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے خونی جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔
ایک مقام ایسا آگیا کہ درختوں کے تنے بالکل ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے تھے۔ ہمیں ان تنوں کے ساتھ رگڑ کھا کر گزرنا پڑتا تھا۔ ایک جگہ درختوں کی شاخیں ہمیں قریب آتا دیکھ کر ایک دم اوپر کو چلی گئیں۔ بالکل ایسے جیسے کسی نے انہیں اوپر کھینچ لیا ہو۔ جوگن نے کہا۔
"یہ آدم خور درخت کی شاخیں تھیں۔ ہماری بو پا کر شاخیں اوپر چلی گئی ہیں۔ ہماری جگہ کوئی دوسرا آدمی یا جانور ہوتا تو یہ شاخیں اس کے جسم کے گرد لپٹ کر اسے اوپر اٹھا لے جاتیں اور پھر اس کا خون چوس کر اس کا گوشت بھی کھا جاتیں۔"
دن کی روشنی بھی کافی کم ہونے لگی تھی کہ ایک جگہ ٹیلے کی چڑھائی آگئی۔ چڑھائی زیادہ سیدھی نہیں تھی۔ ہم ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ ٹیلے پر گنجان درختوں کے جھنڈ ہی جھنڈ تھے۔ ٹیلہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ اوپر پہنچنے کے بعد جوگن نے ایک جگہ جھاڑیوں کو ادھر ادھر ہٹا کر نیچے نگاہ ڈالی۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا۔
"نیچے دیکھو۔"
میں نے آگے بڑھ کر نیچے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ نیچے بلند سیاہ درختوں میں گھری ہوئی ایک پیالہ نما چھوٹی سی وادی تھی۔ جہاں پرانے مندروں کی طرز کے چھ سات گنبد اور مینار ابھرے ہوئے تھے۔ جوگن نے کہا۔

"یہ آلوپ نگر ہے۔ اب ہمیں ہوشیار ہو کر چلنا ہوگا۔ اب تم گونگے بہرے بن جاؤ گے۔ آلوپ نگر میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں بن مانس ملیں گے۔ وہ ایسی حرکتیں کریں گے جیسے ہم پر حملہ کرنے والے ہوں۔ تم گھبرانا نہیں۔ بن مانس ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔ میں انہیں سنبھال لوں گی۔"

اس کے بعد ہم ٹیلے کی ڈھلان اترنے لگے۔

جیسے ہی ہم آلوپ نگر کی وادی کے پہلے درختوں کے قریب پہنچے چاروں طرف سے بندروں کی تیز غصیلی آوازیں آنے لگیں۔ جوگن رک گئی۔ میں بھی رک گیا۔ جوگن نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تم بالکل کوئی آواز نہ نکالنا۔"

تھوڑی ہی دیر بعد دس بارہ بندر سامنے کی جانب سے نمودار ہوئے اور ہم سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر آ کر بیٹھ گئے اور ہماری طرف دیکھ کر دانت نکالنے اور غصیلی آوازیں نکالنے لگے۔ جوگن مایا دیوی ترشول ہاتھ میں لیے بت بن کر کھڑی بندروں کو دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں ایک بہت بڑا بن مانس پیچھے سے آ کر بندروں میں شامل ہوگیا۔ بندر ادھر ادھر ہٹ گئے۔ اتنا بڑا سیاہ فام بن مانس میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بن مانس نے ہمیں دیکھا تو اپنے سینے پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے ڈراؤنی آوازیں نکالنے لگا۔

جوگن مایا نے ترشول والا ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنے حلق سے بندروں والی آواز تین بار نکالی اور کہا۔

"میں بھورے بن مانس کی پتنی ہوں۔"

سیاہ بن مانس ایک دم چپ ہوگیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ ہماری طرف آنے لگا۔ جوگن نے آہستہ سے کہا۔

"اپنی جگہ پر خاموش کھڑے رہنا۔ کوئی حرکت نہ کرنا۔"

سیاہ بن مانس چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتا جوگن کے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور اپنی زرد اور

سرخ آنکھوں سے اسے تکنے لگا۔ جوگن بالکل پتھر کی مورتی بن کر ساکت کھڑی تھی۔ سیاہ بن مانس کچھ دیر بیٹھا جوگن کو گھورتا رہا۔ پھر وہ چند قدم چل کر جوگن کے بالکل پاس آ گیا۔ اتنا بڑا اور بھیانک بن مانس اپنے اتنا قریب دیکھ کر میں سہم سا گیا۔ سیاہ بن مانس نے اپنے بد دفع چوڑے نتھنے پھلا پھلا کر جوگن کے جسم کو سونگھنا شروع کر دیا۔ شاید اسے جوگن کے بدن سے اس کے خاوند بن مانس کی بو آنے لگی تھی۔ سیاہ بن مانس ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے حلق سے خاص قسم کی آواز نکالی۔ اس آواز کو سن کر سارے بندر کیچ کیچ کرتے بھاگ گئے۔ ان کے بعد سیاہ بن مانس بھی اچھل اچھل کر چلتا ہوا درختوں میں گم ہو گیا۔

جوگن نے گہرا سانس بھرا اور دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

"میرے جسم سے میرے خاوند بن مانس کی بو بھی نکلتی رہتی ہے۔ اس بو کو سونگھنے کے بعد یہ خونی بن مانس واپس پلٹ گیا ہے۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو اس نے دوسرے بندروں کے ساتھ مل کر ہماری ابھی تکا بوٹی کر دینی تھی۔"

یہاں درخت زیادہ اونچے نہیں تھے۔ ان کی گھنی شاخیں ایک دوسرے سے الجھی ہوئی تھیں اور جنگل میں ایک چھت سی پڑی ہوئی تھی۔ یہاں دن کی روشنی اور کم ہو گئی تھی۔ خاموشی ایسی تھی کہ کسی پتے کے درخت سے گرنے کی بھی آواز نہیں آتی تھی۔ ہر تیسرے قدم پر کسی نہ کسی سانپ کی پھنکار کی آوز آتی اور پھر کوئی نہ کوئی سانپ گھاس میں سے نکل کر ہم سے ڈر کر دوسری طرف بھاگ جاتا۔ ہمارے جسموں کی بو وجہ سے مجھے ابھی تک کسی مکھی، مچھر اور چیونٹی تک نے نہیں کاٹا تھا۔ جوگن بڑی احتیاط سے قدم اٹھا رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے کر لیا تھا۔ درختوں کا گھنا پن ختم ہو گیا۔ آگے پتھروں سے بنائی گئی سیڑھیاں آ گئیں جو نیچے آلوپ نگر کے کشادہ صحن میں اترتی تھیں۔ سیڑھیاں دائیں بائیں کافی دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ پتھر ٹوٹے پھوٹے تھے اور ان کے درمیان گھاس اگ آئی تھی۔

"جوگن نے آہستہ سے کہا۔

"ہم آلوپ نگر میں داخل ہو رہے ہیں۔ اب تم میرے اشارے کے بغیر منہ سے کچھ نہ بولو گے۔"

دس بارہ سیڑھیاں تھیں۔ ہم اتر کر کشادہ صحن میں آ گئے۔ یہ ویران اور اجڑی ہوئی جگہ تھی۔ ہر طرف گھاس پر خشک پتے بکھرے ہوئے تھے۔ خاموشی ایسی تھی جیسے ساری فضا کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ سامنے دائیں بائیں آلوپ نگر کی ہندووانہ میناروں اور ترچھے ڈھلواں گنبدوں والی اونچی اونچی عمارتیں کھڑی تھیں۔ یہ پرانی کھنڈر بنی ہوئی عمارتیں تھیں۔ ان پر جیسے آسیب چھایا ہوا تھا۔ گنبدوں اور میناروں میں بڑی بڑی دراڑیں پڑ گئی تھیں جن میں سے لمبی لمبی گھاس کی شاخیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ کوئی انسان تو کیا جانور یا پرندہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا یہ مردہ روحوں کا شہر ہے۔ ہم جس کچے راستے پر جا رہے تھے اس پر خشک جھاڑیوں اور پتوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ جوگن چاروں طرف دیکھتی ہوئی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی چل رہی تھی۔ ایک عمارت کے باہر دونوں جانب چبوتروں پر ہنومان کے بڑے بڑے بت بنے ہوئے تھے۔ جوگن نے دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ ہنومان جی کا آشرم ہے۔ یہاں ان کی آتما بسرام کرتی ہے۔ سامنے والے آشرم میں مہا دیوی جی کی نرتکیاں اور داسیاں رہتی ہیں۔"

میں بالکل گم سم سا ہو کر جوگن کے ساتھ ساتھ ذرا پیچھے رہ کر چل رہا تھا اور حیرت زدہ آنکھوں سے اس گمشدہ آسیبی شہر کے کھنڈروں کو دیکھ رہا تھا۔ ہم ان ویران کھنڈروں سے نکل کر دوسرے تختے میں آ گئے۔ یہاں کھلی جگہ پر عجیب و غریب قسم کے درخت دیکھے جن کی شاخیں جھک کر زمین کو چھو رہی تھیں۔ ان درختوں کے نیچے سے گزرنے لگے تو درختوں کی شاخیں ایک دم اوپر کو اٹھ کر سمٹ گئیں۔ جوگن نے دھیمی آواز میں بتایا کہ یہ سارے آدم خور درخت ہیں۔

"یہاں جتنی دیوداسیاں نرتکیاں اور مہادیو جی کی اسپرائیں رہتی ہیں۔ ان کے جسموں سے ہمارے جسموں والی بو ہر وقت خارج ہوتی رہتی ہے۔ یہ درخت انہیں کچھ نہیں کہتے۔ اگر باہر کا کوئی آدمی راستہ بھول کر ادھر آ نکلے تو یہ درخت اسے چٹ کر جاتے ہیں

یہ ایسے خونی درخت ہیں کہ بدنصیب آدمی کی ہڈیاں تک کھا جاتے ہیں۔"

سامنے سیاہ کالے درختوں کے درمیان کچھ اور میناروں والی عمارتوں کے کھنڈرات دکھائی دیئے۔ جوگن نے مجھے بازو سے پکڑ کر وہیں زمین پر بٹھا لیا۔ وہ گھور کر ان عمارتوں کو دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہ مہادیو جی کا آشرم ہے۔ تمہاری بیوی مجھے یقین ہے اسی آشرم میں ہوگی۔"

میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اپنی بیوی جمیلہ کو یاد کر کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے جنہیں میں نے آنکھوں میں ہی پی لیا اور باہر نہ آنے دیا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"دیوی! میری بیوی ٹھیک حالت میں ہوگی نا؟"

اس جگہ کا ماحول دیکھ کر میں ڈر رہا تھا کہ جمیلہ پر ضرور کسی نہ کسی آسیب کا سایہ ہوگا یا اس پر نہ جانے کیسے کیسے منتر پھونک کر اسے بے حال کر رکھا ہوگا۔ جوگن دور سامنے نظر آنے والی پر اسرار کھنڈر نما عمارتوں کو دیکھ رہی تھی۔ میری بات اس نے سن لی تھی۔ سامنے نظریں جمائے اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا یہ مہادیو جی کا آشرم ہے۔ یہاں راتوں کو دیوتا لوگ اتر کر نرتکیوں کا ناچ دیکھتے ہیں۔ سوم رس پیتے ہیں اور دیوداسیوں سے من لبھاتے ہیں۔ یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے اور تمہاری پتنی تو مہادیو جی کی خاص دیوداسی ہے-----"

اس سے آگے پوچھنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی کہ نہ جانے جوگن آگے سے کیا کہہ دے۔ وہ اٹھی اور بولی۔

"مجھے ھنومان کنڈ کے پیچھے سے ہو کر جانا ہوگا۔"

وہ مجھے لے کر دائیں جانب جھاڑیوں کی اوٹ میں چلنے لگی۔ لگ رہا تھا کہ وہ مہادیو کے آشرم والی عمارت سے بچ کر جا رہی ہے۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ ٹھہر گئی اور جھاڑیوں کو ترشول سے ایک طرف ہٹا کر دیکھنے لگی۔ میں اس کے پہلو میں ہی تھا۔ جھاڑیوں سے کوئی ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر پتھر کی ایک کوٹھڑی نظر آ رہی تھی۔ شام کے بڑھتے پھیلتے دھندلکے میں پتھر کی کوٹھڑی ایک بہت بڑے ہاتھی کی طرح لگ رہی تھی۔ جو

زمین پر بیٹھ کر ساکت ہو گیا ہو۔ جوگن جیسے اپنے آپ سے کہنے لگی۔

"سیندھیا کٹیا میں ہی ہو گی۔ کہیں مہادیو کے آشرم میں نہ چلی گئی ہو۔ تب وہ صبح سے پہلے نہیں آسکے گی۔ چل کر دیکھتے ہیں۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ مجھے لے کر کٹیا کی طرف بڑھی۔ یہ ایک پرانی وضع کی کوٹھڑی کا کھنڈر تھا۔ دروازہ غائب تھا۔ اس کے آگے موٹے ٹاٹ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ کٹیا ایک کشادہ چبوترے پر بنی ہوئی تھی۔ چبوترے پر جگہ جگہ چھوٹی جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ جوگن نے ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر سیندھیا کو آواز دی جو اس کی پرانی سہیلی تھی اور آلوپ نگر میں مہادیو کی خدمت پر مامور تھی اور بقول جوگن کے آشرم کی دوسری عورتوں کی طرح وہیں مقیم تھی اور وہاں سے کبھی باہر نہیں آئی تھی۔

سیندھیا کٹیا میں نہیں تھی۔ اندر اندھیرا اور ایسی نم آلود بو آ رہی تھی جیسے پرانے قلعوں کے تہہ خانوں سے آیا کرتی ہے۔ جوگن نے اندھیرے میں ایک طاق میں سے بجھے ہوئے دیے کو تلاش کر لیا۔ وہیں ماچس بھی پڑی تھی۔ اس نے دیا سلائی جلا کر دیا روشن کر دیا۔ دیا پیتل کا تھا۔ اس کی لو اوپر اٹھی تو اس کی نرم اور دھندلی روشنی میں کٹیا کے فرش پر بچھی ہوئی ہرن کی کھال نظر آئی۔ کونے میں پیتل کی گاگر اور پیتل کا کرمنڈل اور ہنومان کی ایک مورتی رکھی تھی۔ مورتی کے آگے پیتل کی تھالی میں تین چار باسی پھول اور لوبان پڑا تھا۔ جوگن نے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔ سیندھیا مہادیو کے آشرم میں ہی ہو گی۔ اب ہمیں رات اس کٹیا میں ہی گزارنی ہو گی۔ صبح سے پہلے مہادیو اسے نہیں چھوڑیں گے۔ وہاں ساری رات کام دیوتا کی پوجا ہو گی۔"

کام دیوتا کی پوجا کے خیال سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ پچھلی رات میں کام دیوتا کی پوجا کا تختہ مشق بن چکا تھا۔ کٹیا میں داخل ہوتے وقت مجھے مچھروں کی آوازیں آئی تھیں لیکن اس کے بعد سارے کے سارے مچھر ہمارے جسم کی بو پا کر غائب ہو گئے۔ کٹیا میں گرمی تھی۔ میں نے جوگن سے کہا۔

"یہاں حبس ہے۔ باہر نکل کر بیٹھتے ہیں۔"

وہ بولی۔

"باہر خطرہ ہے۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں' آلوپ نگر میں باہر کی دنیا کا کوئی مہاتما جوگی جوگن اور دھرماتما ستی سنیاسی بھی مہا دیو کی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا۔ اول تو ہزار میں سے کسی ایک جوگی جوگن کو اسی جڑی بوٹی کا علم ہوتا ہے۔ جسے میں نے گنگا جل میں گھول کر پی رکھا ہے اور جسے تمہیں بھی میرے گورو دیو نے دلی والی کٹیا میں تمہیں پلایا تھا اور جس کی بو کے اثر سے کوئی سانپ' بچھو' مگرمچھ ہمارے نزدیک نہیں پھٹکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ جوگی جن کے جسم سے ایسی بو نہیں نکل رہی ہوتی اگر وہ اپنی ہتسیا کے زور پر بھروسہ کر کے محض آلوپ نگر کی دیوداسیوں سے عیاشی کرنے کے خیال سے آلوپ نگر کا رخ کرتے ہیں انہیں خونی جنگل کے مگرمچھ' سانپ اور آدم خور درخت راستے میں ہی ختم کر دیتے ہیں۔ میں نے صرف تمہاری خاطر یہ خطرہ مول لیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"تمہیں چاہیے تھا کہ کسی طرح مہا دیو سے یہاں آنے کی اجازت لے لیتیں۔"

وہ بولی۔

"میں مہا دیو کے آشرم میں پانچ سال گزار چکی ہوں۔ تب میں سولہ برس کی نوجوان کنیا تھی۔ مہادیو جی نے میرے ساتھ خوب عیاشی کی اور جب جی بھر گیا تو مجھے ھنومان جی کے ایک بن مانس کے حوالے کر کے آلوپ نگر سے نکال دیا۔ اس بن مانس نے مجھے اپنی بیوی بنا لیا۔ تم اس بن مانس کو دیکھ چکے ہو۔ جس عورت کو مہا دیو جی اپنے آشرم سے نکال دیتے ہیں اسے نہ تو واپس آلوپ نگر میں گھسنے کی اجازت ہوتی ہے اور نہ وہ بھارت کے کسی شہر یا دیہات میں جا کر رہ سکتی ہے۔ اس کو اجازت نہیں ہوتی کہ وہ آلوپ نگر کے بارے میں کسی کو کوئی راز بتائے۔ اگر وہ شہر یا کسی گاؤں میں جا کر آباد ہونے کی کوشش کرتی ہے تو آلوپ نگر کے دہشت جوگی لوگ اسے رات کی تاریکی میں آ کر ہلاک کر دیتے ہیں۔ سیندھیا میری سہیلی ہے۔ وہ مجھ سے دس سال چھوٹی ہے۔ اس میں ایک خاص بات

یہ ہے کہ اسے مہا دیو جی کو رجھانے کے طریقے آتے ہیں۔ وہ اس وقت مہا دیو جی کی چہیتی داسی ہے۔ وہ نرتکی بھی ہے۔ یہاں جتنی داسیاں ہیں وہ سب نرتکیاں بھی ہیں اور مہا دیو جی کے آشرم میں ان کے سامنے رات کو نیم عریاں ہو کر ناچتی ہیں۔"

میں نے اسے کہا کہ باہر تو چاروں طرف سناٹا اور اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ دور دور تک کسی انسان کی آواز تک سنائی نہیں دیتی۔ پھر باہر کھلی ہوا میں بیٹھنے میں کیا حرج ہے۔ جوگن مایا دیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو مورکھ ہے۔ تو آلوپ نگر کے بھید نہیں جانتا۔ یہاں آدھی رات کے بعد کالے بن مانس گشت پر نکلتے ہیں۔ اگر وہ کسی کو باہر بیٹھا یا چلتا پھرتا دیکھ لیں تو اس پر حملہ کر دیتے ہیں اور چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔ مہا دیو جی کے حکم سے رات کے وقت آشرموں کا کوئی جوگی، کوئی نرتکی، کوئی دیوداسی اپنی اپنی کٹیا سے باہر نہیں نکل سکتی۔"

میں سمجھ گیا کہ رات اسی کٹیا کے اندر جس میں اس جوگن کے ساتھ گزارنی پڑے گی۔ میں نے احتیاطاً پوچھ لیا۔

"تمہاری سہیلی سیندھیا دن نکلنے پر تو آ جائے گی نا؟"

جوگن نے ترشول ایک طرف رکھ دیا تھا اور اپنی دھوتی نما ساڑھی کے پلو سے اپنے جسم کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ اس کی رہی سہی شرم کو حیا بھی میرے سامنے نہیں رہی تھی۔ وہ ایسے اپنے جسم کو ساڑھی کے پلو سے پونچھ رہی تھی جیسے وہاں اسے دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ کہنے لگی۔

"دن نکلنے پر ہی آئے گی۔ مہا دیو جی اسے رات کو کہاں چھوڑیں گے۔"

میرے سر کے راکھ آلود بال اکڑ سے گئے تھے۔ مجھے اس کی عادت نہیں تھی۔ کبھی سر میں راکھ نہیں ڈالی تھی۔ میں نے کہا۔

"میں اپنے بالوں میں سے راکھ جھاڑ لوں؟"

وہ بولی۔

"خبردار! ایسا ہرگز نہ کرنا--- اور سنو! تمہیں سیندھیا کے سامنے گونگا بہرہ بننے کی

ضرورت نہیں ہے۔ وہ میری ہم راز ہے۔ مجھے اس کو تمہاری بیوی کے بارے میں سب کچھ بتانا پڑے گا۔ وہی ہماری مدد کر سکتی ہے۔"

میں خاموش ہو کر بیٹھا رہا۔ جوگن ساڑھی جسم سے الگ کر کے جھاڑنے لگی۔ وہ بالکل عریاں تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہہ ہی دیا کہ وہ مرد کے سامنے ذرا بھی شرم نہیں کرتی۔ وہ کہنے لگی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ تم میرے مرد بن چکے ہو۔ تم سے میرا کوئی پردہ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندو دھرم میں ہم استریوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے ننگے جسم پر جسقدر آدمیوں کی نظر پڑے گی ہمارے اتنے ہی گناہ جھڑ جائیں گے۔"

اس نے دوبارہ ساڑھی پہن لی۔ پیتل کی گاگر میں سے پانی نکال کر مجھے بھی پلایا اور خود بھی پیا۔ کہنے لگی۔

"تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ مجھے بھی بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ ابھی رات پوری طرح سے نہیں چھائی، میں باہر جا کر کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔"

میں نے اسے خبردار کیا کہ باہر کالے بن مانس گشت پر ہوں گے۔ وہ بولی۔

"وہ آدھی رات کے بعد نکلتے ہیں اور پھر کالے بن مانس سارے میرے رشتے دار ہیں۔ انہیں میرے جسم کی بو سے پتہ چل جاتا ہے کہ میں بن مانس کی بیوی ہوں۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ ہاں تم ہرگز ہرگز یہاں سے باہر مت نکلنا۔ وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ چلی گئی۔ میں اپنے پریشان کن خیالات میں کھو گیا۔ جن حالات میں قسمت نے مجھے پھنسا دیا تھا اس کے بارے میں میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو اس نے ساڑھی کی جھولی میں پھل ڈال رکھے تھے۔ کہنے لگی۔

"آلوپ نگر میں بڑے پھل دار درخت ہیں۔ یہ دیکھو میں کیلے اور شریفے لائی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"کیا یہاں صرف یہی دو پھل ہوتے ہیں؟"

وہ بولی۔

"یہ دونوں پھل ہندو دھرم میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیلا گنیش جی دیوتا کا پسندیدہ پھل ہے اور شریفہ وہ پھل ہے کہ جب سیتا میا رام چندر جی کے ساتھ بن باس میں تھیں تو جنگلی شریفے کا پھل بڑے شوق سے کھایا کرتی تھیں۔ اس کو ہم لوگ سیتا پھل بھی کہتے ہیں۔"

میں نے اور جوگن نے سیر ہو کر پھل کھائے اور کٹیا میں ہی بیٹھے رہے۔ مجھے جوگن کچھ بے چین سی نظر آنے لگی۔ وہ ادھر ادھر کٹیا میں کوئی چیز تلاش کرنے لگی۔ میرے پوچھنے پر بولی۔

"یہاں کہیں گانجا اور چلم ضرور ہوگی۔"

"دیوی! خدا کے لیے گانجا مت پینا۔ اس کے دھوئیں سے میرا دم گھٹتا ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔ بولی۔

"تم مورکھ ہو۔ گانجا پینے والوں کے لیے اس کا دھوں امرت ہے۔ تم بھی گانجا پیو گے تو تمہیں اس کا دھواں امرت لگے گا۔"

معلوم ہوا کہ سیندھیا بھی گانجا پیتی تھی اور اس نے گانجا اور چلم وہیں کسی جگہ رکھی ہوئی تھی۔ آخر جوگن نے اسے تلاش کر لیا۔ اس نے میرے سامنے بیٹھ کر چلم میں گانجا بھرا اور دیا سلائی جلا کر چلم کے دو تین کش لگائے۔ کٹیا میں گانجے کا دھواں پھر گیا۔ نتھنے کھول کر اس نے اپنی عادت کے مطابق تین چار لمبے لمبے سانس لیے اور بولی۔

"گانجا دیوتاؤں کا امرت ہے۔ اس کو پی کر جوگی جوگن آکاش کی سیر کرتے ہیں۔ لو تم بھی پی کر دیکھو۔"

میں نے کہا۔

"دیوی جی! میں گانجا نہیں پی سکتا۔"

"سوم رس پیو گے؟ سیندھیا آئے گی تو اس سے سوم رس بھی مل جائے گا۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"دیوی! مجھے معاف کر دو۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ اب جتنی جلدی ہوسکے مجھے میری بیوی سے ملا دو تاکہ میں اسے لے کر یہاں سے نکل جاؤں۔"

اس نے سخت آواز میں کہا۔

"تم اسے اتنا آسان کام سمجھتے ہو؟ یہ کام اتنی جلدی نہیں ہونے والا۔ ابھی سیندھیا کو ساری رام کہانی سنانی ہے۔ پھر اس کے ساتھ مشورہ کرنا ہے کہ ہمیں تمہاری پتنی کو مہادیو جی کے آشرم سے کیسے نکالا جائے۔ مہادیو جی کے آشرم سے ان کی پسندیدہ نرتکی کو نکال کر لے جانا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ اگر راز کھل گیا تو جانتے ہو تمہارا میرا اور سیندھیا کا کیا حشر ہوگا؟ ہمیں کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں ڈال دیا جائے گا۔ ہاں۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ جوگن نے سارا گانجا پی لیا۔ چلم کونے میں رکھ دی اور اپنے چوڑے نتھنوں کو پھلا کر زور زور سے سانس لینے لگی۔ یہ عادت اس نے شاید اپنے بن مانس خاوند سے سیکھی تھی۔ اس وقت جوگن مایا دیوی بھی مجھے بن مانس ہی لگ رہی تھی۔ اس کے سینے پر تھوڑے تھوڑے بال بھی تھے۔ بہت ممکن ہے کہ آگے چل کر وہ بن مانس کا روپ اختیار کر لیتی۔ گانجا یعنی چرس سے گھٹ ہو کر وہ خر خر کرنے لگی اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور میرے شانوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں خوف کے مارے کانپ گیا۔ سمجھ گیا کہ ایک بار مجھ پر قیامت کی رات آنے والی ہے لیکن قدرت نے مجھے بچا لیا۔ عین اس وقت باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

جوگن کے کان کھڑے ہوگئے۔ کہنے لگی۔

"شاید میری سکھی سہیلی سیندھیا آگئی ہے۔"

قدموں کی آہٹ کٹیا کے پاس آ کر رک گئی۔ پھر کسی نے ایک دم ٹاٹ اوپر کر دیا۔

"کون ہو تم؟"

جوگن اپنی بانہیں پھیلا کر دروازے کی طرف بڑھی جہاں ایک جوان عورت نیم عریاں لباس میں کھڑی تھی۔ جوگن کو دیکھ کر اس کا چہرہ بھی کھل اٹھا۔ دونوں گلے لگ کر ملیں۔

یہ سیندھیا ہی تھی۔ سیندھیا نے میری طرف غور سے دیکھا کر جوگن سے پوچھا۔
"مایا! یہ کون ہے؟ بڑا گورا چٹا مرد ہے۔ اسے کہاں سے پھانس کر لے آئی ہو؟"
جوگن نے اس سے میرا مختصر تعارف کرایا اور بولی۔
"سیندھیا تم بیٹھ جاؤ۔ ساری رام کہانی سناتی ہوں۔"
سیندھیا نے پوچھا۔
"تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی بن مانس نے تو نہیں دیکھا؟"
جوگن بولی۔
"بن مانس میرے رشتے دار ہیں۔ دیکھ بھی لیتے تو کیا فرق پڑتا؟"
سیندھیا نے کہا۔
وہ میں جانتی ہوں کہ بن مانس تمہارا پتی دیو ہے مگر یہاں کے بن مانس جاسوس بن مانس ہیں۔ تم تو جانتی ہی ہو۔ وہ تمہیں تو کچھ نہ کہتے مگر اپنی اشاروں کی زبان میں دھشٹ سپیرے کو ضرور بتا دیتے کہ آلوپ نگر میں ایک اجنبی مرد اور عورت داخل ہو چکے ہیں۔"
دھشٹ سپیرے کا سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ دلی کے جوگی نے مجھے ٹھیک جگہ ہی بھیجا تھا۔ دھشٹ سپیرا ہی میری بیوی جمیلہ کو اپنے منتروں کے طلسم میں اسیر کر کے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ جمیلہ اسی آلوپ نگر میں موجود ہے۔ اب مجھے اس کو وہاں سے نکال لے جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ کمانڈو چاقو میرے پاس موجود تھا اور میرے ایسے تجربہ کار کمانڈو کے سامنے ان عورتوں اور دھشٹ سپیرے کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میں نے سیندھیا سے سوال کر دیا۔
"کیا دھشٹ سپیرا یہاں موجود ہے؟ وہی میری بیوی کو اٹھا کر لے گیا تھا۔"
سیندھیا نے حیرانی سے جوگن کی طرف دیکھا۔
"یہ تمہارا مرد کیا کہہ رہا ہے؟"
جوگن نے سیندھیا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس اور میرے قریب ہی بٹھا لیا اور کہا۔
"یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ میں تمہیں ساری سناؤں گی۔ اسی واسطے میں اس مرد کو لے

کر یہاں آئی ہوں۔"

میں نے محسوس کیا کہ سیندھیا میری طرف بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں بڑے خوفناک خفیہ اشارے تھے اور میں اپنی جگہ پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا اس بن مانس عورت کے ساتھ بھی مجھے کام دیوتا کی پوجا کرنی پڑے گی؟"

سیندھیا نے جوگن مایا کا منہ چوم کر کہا۔

"تم نے لگتا ہے میرا سارا گانجا پی لیا ہے۔"

جوگن بار بار سیندھیا سے اس طرح لپٹ رہی تھی جیسے وہ کوئی مرد ہو۔ کہنے لگی۔

"یہاں گانجا ہی تھا اگر سوم رس ہوتا تو وہ بھی پی جاتی۔"

سیندھیا نے جوگن کے جسم کی چٹکی بھر کر کہا۔

"وہ بھی تمہیں ضرور پلاؤں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہ سندر مرد کون ہے؟ اسے کہاں سے پکڑ کر لائی ہو؟"

جوگن نے شروع سے لے کر آخر تک میری ساری داستان غم اس کے آگے بیان کر دی۔ میری مصیبت کی کہانی سیندھیا نے بڑے غور سے سنی۔ جب جوگن نے پوچھا کہ کیا میری بیوی مہا دیو کے آشرم میں ہی ہے۔ تو وہ کہنے لگی۔

"اس مرد نے اپنی بیوی کا جو حلیہ بتایا ہے اس حلیے کی عورت مہا دیو جی کے خاص آشرم میں رہتی ہے اور مہا دیو کی خاص پسندیدہ نرتکی اور داسی ہے۔ اسے آشرم سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ تم لوگ اسے آلوپ نگر سے کیسے نکال کر لے جاؤ گے؟"

میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

"وہ میری بیوی ہے۔ تمہارے مہا دیو نے اسے غیر قانونی طور پر اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ میں جان کی بازی لگا کر بھی اسے نکال کر لے جاؤں گا۔ تم مجھے اتنا بتا دو کہ تمہارے مہا دیو کا آشرم یہاں سے کس طرف ہیں؟"

سیندھیا ایسے مسکرا رہی تھی جیسے میں احمقوں والی باتیں کر رہا ہوں۔ جوگن مایا دیوی کو بھی حالات کی سنگینی کا احساس تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کرم داد! صبر سے کام لو۔ تم نہیں جانتے یہاں کس قدر سخت پہرے لگے ہوئے ہیں۔ دن کو سانپ، مگرمچھ اور رات کو بن مانس اور اژدہا مہا دیو کے آشرم کی حفاظت کرتے ہیں۔ تم سانپوں، مگرمچھوں سے تو بچ کر نکل جاؤ گے مگر اژدہوں اور خونخوار بن مانسوں کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔"

سیندھیا مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

"اور پھر یہ بات بھی ہے کہ تمہاری بیوی مہا دیو کے آشرم میں بڑی خوش رہ رہی ہے۔ شاید وہ تمہارے ساتھ جانے سے انکار کر دے۔"

میں نے کہا۔

"اس پر جادو ٹونہ کیا گیا ہے۔ تمہارے جادوگر پجاریوں اور وحشت سپیرے نے اس پر منتر پھونک کر اس کا ذہن بدل دیا ہے، ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری بیوی جو پکی مسلمان ہے ایک ہندو پجاری کے پاس خوش ہو کر رہے۔"

جوگن نے سیندھیا سے کہا۔

"سیندھیا! تم ان باتوں کو چھوڑو۔ میں نے اس شخص کرم داد کو کام دیوتا کے سامنے بچن دیا ہے کہ میں اس کی بیوی اس کو ضرور واپس دلاؤں گی۔ مجھے ہر حالت میں اپنا بچن پورا کرنا ہے۔ اگر میں نے اپنا بچن پورا نہ کیا تو مجھ پر کام دیوتا کا وبال نازل ہو گا۔ مجھے بتاؤ کہ تم میری کیا مدد کر سکتی ہو۔ میں اسی لیے اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں آئی ہوں۔"

سیندھیا خاموش ہو کر جیسے گہری سوچ میں ڈوب گئی ہو پھر اس نے جوگن سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مایا دیوی! تم یہاں کے سارے حالات سے واقف ہو۔ نہ صرف یہ کہ اس آدمی کی زندگی یہاں خطرے میں ہے تم بھی یہاں محفوظ نہیں ہو۔ اگر تمہیں آشرم کے آس پاس کسی پجاری یا نرتکی نے دیکھ لیا تو فوراً مہا دیو جی کو خبر ہو جائے گی اور پھر تمہارے ساتھ اس مرد کو بھی کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں ڈال دیا جائے گا۔"

جوگن نے کہا۔

"سیندھیا! میں یہ ساری باتیں جانتی ہوں۔ تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ میں اس مرد کی بیوی کو یہاں سے کیسے نکال سکتی ہوں۔ باقی میں سب سنبھال لوں گی۔"

سیندھیا اس دوران گہری سوچ میں تھی۔ جوگن نے اپنی بات ختم کی تو وہ بولی۔

"کرم داد کی بیوی ساری رات مہا دیو جی کے آشرم میں ان کے خاص کمرے میں رہتی ہے۔ دن کے وقت وہ پوتر تالاب پر خاص سکھیوں کے ہمراہ اشنان کرنے جاتی ہے۔ اس کے بعد اسے مندر کے ایک کمرے میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں وہ آرام کرتی ہے اور سارا دن وہیں آرام سے گزارتی ہے۔ اسے مندر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے اور جہاں تک میں نے دیکھا ہے اس کی بیوی خود بھی مندر سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتی۔"

جوگن مایا دیوی نے سوال کیا۔

"اس وقت مندر کے باہر کون پہرہ دے رہا ہوتا ہے؟ جب میں وہاں تھی تو دو سیاہ فام بن مانس پہرہ دیا کرتے تھے۔"

سیندھیا نے کہا۔

"مندر کے آس پاس بن مانسوں کو جانے کی اب اجازت نہیں ہے۔ آج کل رات کو مندر کے باہر دھشٹ سپیرے کے خاص آدمی پہرہ دیتے ہیں اور ان کے پاس رائفلیں اور سٹین گنیں ہوتی ہیں۔ اپنی داسیوں اور نرتکیوں کی حفاظت کے واسطے اب مہا دیو جی نے شہر سے رائفلیں اور سٹین گنیں منگوا کر اپنے خاص دھشٹ سپیرے کو دے رکھی ہیں، جس نے تربیت یافتہ سپیروں کو یہ اسلحہ دے کر گارڈ ڈیوٹی پر لگایا ہوا ہے۔ یہ پہرہ دار سپیرے فوجی وردیوں میں ہوتے ہیں اور انہیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شہر کا مرد مندر میں داخل ہونے یا کوئی نرتکی مندر سے فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں۔"

مجھے یہ سن کر ایک اطمینان ضرور ہو گیا کہ جہاں میری بیوی دن کے وقت ہوتی ہے اس کے گرد جادوگروں یا سپیروں کا پہرہ نہیں ہوتا بلکہ نیم فوجی سپیرے تعینات ہوتے ہیں جن کا مقابلہ میں کر سکتا تھا۔ میں پاک آرمی کا تربیت یافتہ سابق کمانڈو تھا۔ یہ رائفل بردار

سپیرے میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے خیال آگیا کہ اس نرتکی سیندھیا نے بتایا تھا کہ میری بیوی صبح صبح شیطان صفت مہادیو کے آشرم سے نکل کر تالاب پر اشنان کرنے جاتی ہے۔ اس وقت بھی جمیلہ کو وہاں سے نکالا جا سکتا تھا۔ میں نے سیندھیا سے پوچھا۔

"صبح صبح جب میری بیوی تالاب پر نہانے جاتی ہے تو اس کے ساتھ صرف عورتیں ہی ہوتی ہیں؟"

اس نے کہا۔

"آشرم کی چھ نرتکیاں تمہاری بیوی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ لیکن دو سپیرے رائفلیں لیے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر تمہاری بیوی پر منتروں کا اثر کم پڑ گیا اور اسے اپنا ماضی یاد آگیا تو وہ فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکے۔"

میں نے دل میں مہادیو کو گالی دی اور طے کر لیا کہ میں اس شیطان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ جو دوسروں کی بہو بیٹیوں کی عزتوں سے کھیلتا ہے، چاہے وہ عورتیں کسی دوسرے مذہب ہی کی کیوں نہ ہوں۔ دھشٹ سپیرا بھی میرا ٹارگٹ تھا۔ میں اسے بھی یہاں مار کر نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے سیندھیا سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ دن کے وقت مندر پر حملہ کر کے جمیلہ کو نکالنے سے منہ اندھیرے جب وہ تالاب پر اشنان کرنے جائے تو اس وقت اسے نکالنے کی کوشش کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

جوگن مایا دیوی نے میری تجویز کی حمایت کی۔ مگر سیندھیا کہنے لگی۔

"اگرچہ منہ اندھیرے کے سمے تمہاری بیوی کی حفاظت پر صرف دو رائفلوں والے سپیرے ہی ہوتے ہیں لیکن ان کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کونسی جھاڑی میں چھپے ہوئے ہیں۔ رات کے پچھلے پہر کے اندھیرے میں تم انہیں تلاش نہیں کر سکو گے۔ اگر انہوں نے تمہیں تالاب کی طرف بڑھتے دیکھ لیا تو وہ تم پر گولیاں چلانی شروع کر دیں گے اور تمہارا زندہ بچنا مشکل ہو جائے گا۔"

سیندھیا اور جوگن ان دونوں میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں پاک آرمی کا ٹرینڈ

سابق کمانڈو ہوں اور میرے لیے ان سپیروں کو تلاش کرنا مشکل بات نہیں ہے بلکہ میں سب سے پہلے انہی کو تلاش کر کے ٹھکانے لگاؤں گا۔ میں نے کہا۔

"سیندھیا جی! تم یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ منہ اندھیرے اپنی بیوی کو اٹھا کر لے جانا زیادہ بہتر ہوگا۔ دن کی روشنی میں ہم مہا دیو کے مندر سے اسے نہیں نکال سکیں گے جبکہ مندر کے گرد رائفل بردار سپیروں کی پوری پلٹن پہرہ دے رہی ہوگی۔"

جوگن کہنے لگی۔

"کرم داد ٹھیک کہتا ہے ہم منہ اندھیرے اپنا کام شروع کریں گے۔ تم ہمیں صرف یہ پتہ کر کے بتا دو کہ منہ اندھیرے اشنان کرنے کرم داد کی بیوی آشرم سے ٹھیک کس وقت نکلتی ہے۔ ہمارے زمانے میں تو ہم پو پھٹے آشرم سے اشنان کرنے نکل جاتی تھیں۔"

سندھیا کہنے لگی۔

"میرا خیال ہے کہ مہا دیو جی کے خاص آشرم سے ان کی پسندیدہ نرتکی رات بسر کرنے کے بعد پو پھٹنے سے کچھ دیر پہلے نکلتی ہے۔ کیونکہ اشنان کے بعد اسے سورج نکلنے سے پہلے پہلے مندر میں جا کر ھنومان جی کی آرتی بھی اتارنی ہوتی ہے۔ ویسے میں کل سارا پتہ کر کے تمہیں بتا دوں گی۔"

سیندھیا ہمارے ساتھ بے حد تعاون کر رہی تھی۔ حالانکہ اس کام میں اس کی جان کو بھی خطرہ تھا۔ وہ جوگن مایا دیوی کی بڑی وفادار سہیلی تھی۔ اس کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو شاید یہ خطرہ مول لینے پر تیار نہ ہوتی۔ بلکہ ممکن تھا کہ مہا دیو کو جا کر بتا دیتی کہ شہر سے اس کی پسندیدہ نرتکی کا آدمی مایا دیوی کے ساتھ اپنی بیوی کو اٹھا لے جانے کے واسطے آیا ہوا ہے۔

جب ساری بات طے ہو گئی تو جوگن نے سیندھیا سے کہا۔

"اب ہمیں سوم رس پلاؤ۔"

سیندھیا مسکراتی ہوئی اٹھی اور یہ کہہ کر کٹیا سے باہر نکل گئی کہ ابھی لاتی ہوں۔ سوم رس کے نام سے میں کانپ گیا تھا۔ میں نے جوگن سے کہا۔

"دیوی! کل سوم رس پی کر میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں۔ اس لیے آج میں سوم رس نہیں پیئوں گا۔"

وہ ہنس پڑی بولی۔

"مورکھ ہو جو دیوتاؤں کے سوم رس کو ٹھکرا رہے ہو۔"

میں نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"دیوی! یہ میری مجبوری ہے۔ اگر میری طبیعت سوم رس پی کر زیادہ خراب ہوگئی تو میں جس مہم پر آیا ہوا ہوں اسے پورا نہ کرسکوں گا۔"

جوگن مایا دیوی میری طرف دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اس پر گانجے کا نشہ بھی چڑھا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔ اچھا آج تم سوم رس نہیں پیئو گے۔"

سیندھا سوم رس کی مٹکی لے کر کٹیا میں آگئی۔ کہنے لگی۔

"میں سوم رس کی مٹکی رات کے وقت سیتا پھل کے درخت کے نیچے رکھ جاتی ہوں۔"

وہ کونے میں سے مٹی کے تین چھوٹے پیالے اٹھا کر لے آئی اور ہمارے سامنے رکھنے لگی۔ جوگن مایا دیوی نے کہا۔

"میرا مرد کرم داد آج رات سوم رس نہیں پیئے گا۔ آج رات صرف ہم دونوں سوم رس پی کر کام دیوتا کی پوجا کریں گی۔"

سیندھیا نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور پھر میرا پیالہ اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ میں نے دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس مشروب سے میری جان بچ گئی تھی۔ کٹیا میں پیتل کا دیا جل رہا تھا۔ اس کی مدھم روشنی میں ہمارے چہرے اور کٹیا کے در و دیوار دھندلے دھندلے لگ رہے تھے۔ ہم ہرن کی چھال پر بیٹھے تھے۔ کونے میں سیندھیا کا بستر لگا ہوا تھا۔ بستر کیا تھا ایک دری بچھی تھی۔ ایک میلا سرہانہ پڑا تھا۔ میں ذرا پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں سوم رس پینے لگیں۔ سیندھیا جوگن سے کہنے لگی۔

”آج میں کتنی سوبھاگیہ محسوس کر رہی ہوں کہ میری پیاری اور میری پرانی سکھی سہیلی مایا دیوی اتنی مدت کے بعد میری کٹیا میں موجود ہے۔ یاد ہے جب تم آشرم میں ہوتی تھیں تو ہم کسی کسی رات کو اس کٹیا میں آکر کتنے مزے کرتے تھے۔“

میرے کان کھڑے ہوگئے۔ میں نے ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں عیاش قسم کے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ بعض عورتیں بھی ایک دوسری سے مزے کرتی ہیں۔ یہ عورتیں نارمل اور شریف عورتیں نہیں ہوتیں بلکہ جنسی طور پر بگڑی ہوئی اور بے راہ عورتیں ہوتی ہیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اگر سیندھیا کا مطلب اسی قسم کے مزے سے ہے تو وہ کیا کرتی ہیں۔ میں یہاں زیادہ تفصیل سے ان کے مزے کی حرکتیں بیان نہیں کروں گا لیکن ان کی کچھ ایسی حرکتیں ضرور بیان کروں گا جو خدا کے عذاب کو دعوت دیتی ہیں۔ جن شہروں اور بستیوں میں عورتیں عورتوں سے اور مرد مردوں سے ایسی گھناؤنی اور گناہ آلود حرکتیں کرنے کے عادی تھے۔ ان بستیوں پر اللہ تعالیٰ کا ایسا عذاب نازل ہوا کہ ان بستیوں کے نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ جو لوگ میری داستان سن رہے ہیں یا پڑھ رہے ہیں ان کو بھی نصیحت کروں گا کہ وہ عبرت حاصل کریں اور صرف اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں تاکہ وہ فلاح پائیں اور دین و دنیا اور آخرت میں بھی سرخرو ہوں۔ مجھے خیال آیا کہ میں کٹیا سے باہر چلا جاتا ہوں۔ جب میں اٹھ کر باہر جانے لگا تو جوگن نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

”کرم داد! تم باہر نہیں جاؤ گے‘ یہ میرا حکم ہے۔ تم نے سوم رس نہیں پیا‘ میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا۔ مگر اب کٹیا میں ہی رہو گے اور یہ دیکھو گے کہ دو عورتیں کام دیوتا کی کس طرح پوجا کرتی ہیں۔“

میں بے بس سا ہو کر وہیں بیٹھا رہا۔

وہ دونوں سوم رس پی رہی تھیں اور باتیں کیے جا رہی تھیں۔ وہ اپنے دھرم کے مطابق آکاش کی ان اپسراؤں کی باتیں کرنے لگیں جو ایک دوسری سے مزے کرتی ہیں۔ جب انہوں نے کافی سوم رس پی لیا اور انہیں خوب نشہ ہوگیا تو وہ ایک دوسرے کو پیار

کرنے لگیں۔ میں کونے میں دبک کر بیٹھا یہ گناہ آلود منظر اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کسی وقت میں آنکھیں بند کر لیتا۔ خدا جانے جوگن کو اس نشے کی حالت میں بھی کیسے پتہ چل جاتا کہ میں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اس نے کڑک کر کہا۔

"مورکھ! آنکھیں بند نہ کرو' یہ میرا حکم ہے۔ کام دیوتا حاضر ہوگئے ہیں۔ انہوں نے تمہیں آنکھیں بند کیے ہوئے دیکھ لیا تو تم کو یہیں بھسم کر دیں گے۔"

"مجھے اس کے کام دیوتا کی کوئی پروا نہیں تھی لیکن اس کے حکم کے آگے میں مجبور تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

اس وقت دونوں عورتیں بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں اور جھوم رہی تھیں۔ پھر دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں اور انہوں نے اپنے آپ کو لباس سے آزاد کر دیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خدا جانے کس زبان میں اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔ وہ ایک دائرے میں اشلوک پڑھتے ہوئے گھومنے لگیں۔ پھر بیٹھ گئیں اور ایک دوسری کے سر سے سر جوڑ کر دائیں بائیں جھولنے لگیں۔ اشلوک وہ برابر پڑھتی جا رہی تھیں۔ اب اشلوکوں میں کام دیوتا کا نام بار بار آتا تھا۔ کچھ دیر وہ اسی طرح بیٹھی جھولتی رہیں۔ پھر سب سے پہلے سیندھیا اٹھی جوگن بال پھیلائے بیٹھی جھومتی رہی۔ سیندھیا نے اپنا ہاتھ جوگن کے سر پر رکھ کر بلند آواز میں کہا۔

"کام دیوتا! کام دیوتا! ہماری شردھا نجلی سوئیکار کر۔ ہماری شردھا نجلی سوئیکار کر۔ کام دیوتا! اے کام دیوتا!"

جوگن بھی جے ہو کام دیوتا کی کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر ناچنے لگیں۔ اس قسم کا ناچ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کبھی وہ ناچتے ناچتے بیٹھ جاتیں۔ پھر اٹھ کر چھوٹے سے دائرے میں گھوم جاتیں۔ اس کے بعد ایک دوسرے کی پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر گھومنے لگ جاتیں۔ گھومتے گھومتے بانہوں میں بانہیں ڈال کر سر پیچھے کو ڈھلکا لیتیں اور جے ہو کام دیوتا کی کا نعرہ لگاتیں۔ میں چشم حیرت سے یہ واہیات منظر دیکھ رہا تھا۔ واہیات اس لیے کہ دونوں کے جسم پر کوئی لباس نہیں

تھا۔

جب دونوں ناچتے ناچتے تھک گئیں تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر بستر پر گر پڑیں۔ اس کے بعد جو حرکتیں انہوں نے کیں انہیں بیان کرنے کو میری زبان زیب نہیں دیتی اور میں بیان بھی نہیں کروں گا۔ یہ وہ حرکتیں تھیں جو خدا کے عذاب کو دعوت دیتی ہیں۔ میرے دل نے کہا کہ کرم داد ایک نہ ایک دن اس آلوپ نگر پر ضرور خدا کا عذاب نازل ہو گا اور یہ ساری کھنڈر عمارتیں اور گناہ کے آشرم تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں گے۔

میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ لیکن وہ دونوں عورتیں گہری نیند سو چکی تھیں اور خراٹے لے رہی تھیں۔ میں اٹھ کر کٹیا سے باہر آگیا۔ باہر درختوں کے درمیان اوپر آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ اس کھنڈروں کے شہر پر موت کا سکوت طاری تھا۔ اس وقت مجھے اپنی بیوی کا خیال آگیا کہ وہ اس بدمعاش شیطان مہا دیو کے آشرم میں ہو گی۔ خدا جانے اس کے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہو گا۔ سب سے بڑی پریشانی مجھے اس بات کی تھی کہ جمیلہ پر سپیروں کے منتروں کے جادو ٹونے کا اثر ہو چکا تھا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ جب میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو کہیں وہ شور نہ مچا دے اور مندر میں موجود دوسرے رائفل بردار سپیروں کو اس طرف متوجہ نہ کر دے۔ میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ صرف کمانڈو چاقو تھا یا میرا تجربہ تھا اور میری تربیت کی صلاحیتیں میرے ساتھ تھیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے پہچاننے ہی سے انکار کر دے۔ ظاہر تھا کہ اگر وہ منتروں کے زیر اثر ہے تو مجھے کہاں پہچانے گی۔ ایک ہلکی سی امید ضروری تھی کہ شاید وہ مجھے پہچان لے۔

میں کٹیا کے باہر سنسان رات کے سناٹے اور تاریکی میں سیندھیا کی کٹیا کے باہر ایک طرف ہو کر بیٹھا ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ مجھے سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ جبلی طور پر میں ڈر کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ سانپ میرے قریب نہیں آئے گا۔ اس کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ تاروں کی روشنی بڑی مدھم تھی۔ میں نے ایک سانپ کو دیکھا جو مجھ سے چھ سات قدم دور پھن پھیلائے بیٹھا میری طرف گھور رہا تھا۔ میں پیچھے ہٹنے کی بجائے

اس کی طرف بڑھا تو وہ پھن سکیڑ کر تیزی سے درختوں کی طرف گم ہو گیا۔ تازہ کھلی ہوا میں مجھے بڑا سکون ملا تھا۔ میں بیٹھنے ہی لگا تھا کہ ایک خوفناک آواز نے مجھے وہیں ساکت کر دیا۔ یہ آواز کسی خونخوار جانور کی معلوم ہوتی تھی۔ شیر یا چیتے کی دھاڑ نہیں تھی۔ میں اس طرف دیکھنے لگا جس طرف سے آواز آئی تھی۔ دھندلے اندھیرے میں مجھے درختوں کی طرف سے ایک اونچا لمبا بن مانس اپنی طرف دوڑتا ہوا آتا نظر آیا۔ میں جلدی سے کٹیا میں گھس گیا اور میں نے اپنا کمانڈو چاقو نکال لیا۔ میں جانتا تھا کہ اگر یہ بن مانس اندر آ گیا تو مجھ اکیلے کو ہی اس کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ دونوں عورتیں بے سدھ ہو کر پڑی تھیں۔

کٹیا کے باہر بن مانس کی خوفناک آوازیں آنے لگیں۔ خدا جانے کیوں وہ کٹیا کے اندر آتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے تھوڑا سا ٹاٹ ہٹا کر دیکھا' تاروں کی روشنی میں بن مانس کٹیا سے چند قدم کے فاصلے پر حلق سے عجیب ڈراؤنی آوازیں نکالتے ہوئے زور زور سے اپنا سینہ ڈھول کی طرح پیٹ رہا تھا۔ میں خوف زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کچھ دیر تک بن مانس اچھلتا کودتا رہا پھر اپنے آپ واپس مڑ کر چبوترے سے چھلانگ لگا کر اترا اور درختوں کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ محض جوگن مایا دیوی کی وجہ سے اندر نہیں آ رہا تھا۔ رات گزر گئی۔

میں کٹیا میں ایک طرف پڑ کر سو گیا تھا۔ آنکھ کھلی تو جوگن مایا دیوی ہنومان کی مورتی کے آگے بیٹھی بھجن کیرتن کر رہی تھی۔ کٹیا کا پردہ اٹھا ہوا تھا۔ اندر دھوپ آ رہی تھی۔ جوگن کے بال گیلے تھے۔ اس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ کسی تالاب سے اشنان کر کے آئی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سیندھیا وہاں پر نہیں تھی۔ جوگن بھجن کیرتن میں مگن رہی۔ جب اس نے بھجن کیرتن ختم کیا تو پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

''مورکھ! میں ابھی تمہیں کچھ کھلاتی پلاتی ہوں۔''

میں نے پوچھا۔

''تمہاری سکھی سہیلی سیندھیا کہاں ہے؟''

جوگن نے آرتی والی تھالی مورتی کے آگے رکھ کر ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ اٹھ کر

ساڑھی درست کرتے ہوئے بولی۔

"وہ مہادیو جی کے آشرم کی طرف چلی گئی تھی۔ شام کو آئے گی اور یہ بتائے گی کہ تمہاری پتنی منہ اندھیرے کس وقت تالاب پر اشنان کرنے جاتی ہے اور اس کے ساتھ کون کون ہوتا ہے۔ تم بیٹھو میں کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔ تم باہر مت نکلنا۔"

وہ کٹیا سے باہر نکل گئی۔ واپس آئی تو اس کی جھولی میں وہی کیلے اور شریفے تھے جو ہم نے پہلے کھانے تھے۔ اس نے بھی میرے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ کہنے لگی۔

"رات کو ہم دونوں نے کام دیوتا کی جو پوجا کی تھی اس سے کام دیوتا بڑے خوش ہوئے ہیں۔ اب وہ ہماری بڑھ چڑھ کر مدد کریں گے۔"

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہا۔

"دیوی! ابھی تک تو تمہارے کام دیوتا نے ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ تمہاری سہیلی سیندھیا ہی ہماری مدد کر رہی ہے۔"

جوگن بولی۔

"تم مورکھ ہو۔ نہیں جانتے' کچھ نہیں جانتے۔ دیوتا لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں مدد نہیں کیا کرتے۔ وہ ہماری اس وقت مدد کریں گے جب ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے اور سیندھیا بھی ہماری مدد نہیں کر سکے گی۔"

اس کے بعد وہ کام دیوتا اور دوسرے دیوتاؤں کی غیبی طاقت کی باتیں کرنے لگی۔ میرے لیے یہ بیکار باتیں تھیں۔ میں اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتا جا رہا تھا۔ مجھے اس کی باتوں' اس کے دیوتاؤں کے کارناموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں اپنی بیوی جمیلہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے مجھے بالکل نہ پہچانا اور میرے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور شور مچا دیا تو مجھے کیا کرنا ہوگا۔ سارا دن ہم نے کٹیا کے اندر ہی گزار دیا۔ صرف ایک بار جوگن کٹیا سے باہر گئی تھی اور جلدی سے واپس آ گئی۔ جب دن غروب ہوگیا اور کٹیا کے باہر درختوں کے نیچے شام کا اندھیرا اترنے لگا تو جوگن نے کٹیا کا پردہ اٹھا دیا۔ کہنے لگی۔

"سیندھیا نے کہا تھا کہ وہ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد آئے گی۔ راستے میں اگر کسی سپیرے فوجی نے اسے پکڑ نہ لیا تو وہ یہاں ضرور پہنچ جائے گی۔"

میں نے کہا۔

"اور اگر اسے تمہارے سپیروں نے پکڑ لیا تو ہمیں کیا کرنا ہو گا؟ میرا خیال ہے پھر ہم اکیلے ہی منہ اندھیرے تالاب پر پہنچ جائیں گے۔"

جوگن نے کہا۔

"سیندھیا بڑی ہوشیار نرتکی ہے۔ وہ پہرے دار سپیروں کو جل دے کر یہاں پہنچ جائے گی۔ اسے جوان سپیروں کو رجھانا بھی آتا ہے۔"

اور جوگن مسکراتی رہی۔

جب شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تو وہ کٹیا سے باہر چلی گئی۔ میں اندر ہی بیٹھا رہا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ گزر جانے کے بعد وہ اندر آئی اور کہنے لگی۔

"شاید سیندھیا آ گئی ہے۔ میں نے اس کے قدموں کی آواز سنی ہے۔"

چند سیکنڈ کے بعد سیندھیا آ گئی۔ وہ میرے اور جوگن کے گلے لگ کر ملی۔ اس کے جسم میں سے ایسی بو آ رہی تھی جیسے وہ گیدڑوں کے بھٹ سے نکل کر آ رہی ہو۔ کہنے لگی۔

"میں سارا کچھ معلوم کر کے آئی ہوں۔"

پھر اس نے بتایا کہ میری بیوی رات کے پچھلے پہر مہادیو کے آشرم سے سات نرتکیوں کے ساتھ پوتر تالاب پر اشنان کرنے نکلے گی اور دو رائفلوں والے سپیرے اس سے پچاس قدموں کے فاصلے پر تالاب کے قریب کسی جھاڑی میں مورچہ بنا کر بیٹھے ہوں گے۔ اس نے جوگن مایا کو ان سپیروں کے نام بھی بتائے۔ جوگن نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"کرم داد! تیار ہو جاؤ۔ تمہاری مردانہ دلیری آزمانے کا وقت آن پہنچا ہے۔ میں تمہارے ساتھ صرف پوتر تالاب تک ہی جاؤں گی اور تمہیں وہاں پہنچا کر فوراً واپس اسی کٹیا میں آ جاؤں گی۔ باقی سارا کام تمہیں خود ہی کرنا ہو گا۔ اگر تم اپنی بیوی کو وہاں سے

نکالنے میں کامیاب ہوگئے تو سیدھے کٹیا میں آنا میں اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

مجھے اندیشہ تھا کہ مسلح سپیروں کو قابو کرتے وقت اگر ان میں سے کسی کی رائفل چل گئی تو فائر کا دھماکہ ہوگا۔ یا اگر میری بیوی یا اس کے ساتھ آئی ہوئی عورتوں نے مجھے دیکھ کر شور مچا دیا تو وہاں ہنگامہ مچ جائے گا اور مندر کے اردگرد پہرے پر موجودہ دوسرے مسلح سپیرے بھی وہاں آ جائیں گے۔ جب میں نے اس خدشے کا اظہار کیا تو جوگن مایا دیوی سوچ میں پڑ گئی۔ سیندھیا بھی غور کرنے لگی۔ جوگن نے کہا۔

"اگر وہاں شور مچ گیا تو پھر تمہارا وہاں سے نکلنا اور میرا اس کٹیا میں ٹھہرنا ناممکن ہو جائے گا۔"

سیندھیا کہنے لگی۔

"اس کا ایک ہی علاج ہے۔"

"وہ کیا؟" جوگن مایا دیوی نے پوچھا۔

سیندھیا نے کہا۔

"وہ یہ ہے کہ رات کے پچھلے پہر میں بھی سات سکھیوں کے ساتھ جاؤں۔ جب کرم داد کی بیوی اشنان کرنے لگے تو میں عورتوں کو باتوں میں لگا کر دوسری طرف لے جاؤں لیکن جھاڑیوں میں مورچہ لگا کر بیٹھے ہوئے سپیروں سے کرم داد کو ہی نمٹنا ہوگا۔ کیونکہ اگر اس کی بیوی نے اس کو پہچاننے اور اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تو وہ ضرور شور مچا دے گی اور اس کے شور کی آواز سن کر سپیرے ہوا میں فائرنگ شروع کر دیں گے اور فائر کی آوازیں سن کر مندر کے سپیرے بھی اس طرف دوڑ پڑیں گے۔

میں نے کہا۔

"میں انہیں سنبھال لوں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ تم صرف اتنا کرو کہ میری بیوی کے ساتھ جو عورتیں جائیں گی کسی طرح انہیں تالاب سے کچھ فاصلے پر لے جاؤ جہاں سے وہ مجھے تالاب پر آتے نہ دیکھ سکیں۔"

سیندھیا نے کہا۔

"یہ میں کرلوں گی۔"

جوگن مایا دیوی نے میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کرم دادا! تم نہتے ہوگے تمہارے پاس کوئی بندوق وغیرہ نہیں ہوگی۔ تم رائفلوں والے دو آدمیوں کو کیسے قابو کرسکو گے؟"

میں نے کہا۔

"دیوی! میں کوشش کروں گا۔ مجھے یہ کوشش کرنی ہی ہوگی اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" جوگن نے آہستہ سے کہا۔

پھر سیندھیا سے مخاطب ہو کر بولی۔

"تم نرتکیوں کو باتوں میں لگا کر تالاب سے دور کیسے لے جاؤ گی؟"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چاہے کچھ ہو جائے تمہاری خاطر مجھے یہ کام تو کرنا ہی ہوگا۔ ہاں اگر وہاں کوئی گڑبڑ ہوگئی تو میں وہاں سے غائب ہو جاؤں گی۔

باتیں کرتے کرتے شام جب زیادہ گہری ہوگئی اور رات کی تاریک پھیلنے لگی تو سیندھیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی۔

"اب میں جاتی ہوں۔"

پھر اس نے جوگن مایا دیوی سے کہا۔

"مایا! تم کرم داد کو تالاب کا خفیہ راستہ بتا دینا۔"

وہ بولی۔

"میں اسے تالاب تک چھوڑنے اس کے ساتھ جاؤں گی۔ میں اسے وہاں چھوڑنے کے بعد واپس آجاؤں گی۔"

"ہاں۔" سیندھیا نے کہا۔ "تمہارا وہاں زیادہ دیر رہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ کسی نرتکی کی

تم پر نگاہ پڑ گئی تو مہادیو جی تمہاری تلاش میں تمام آدمی دوڑا دیں گے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔"

وہ چلی گئی تو جوگن میرے پاس ہی چوکی پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"اگر بھگوان نہ کرے وہاں تالاب پر ہاہا کار مچ گئی تو مجھے اس کی آوازیں آجائیں گی۔ پھر میں اس کٹیا میں نہیں ٹھہر سکوں گی۔"

میں نے پوچھا۔

"تو پھر تم کہاں ملو گی؟ میرا مطلب ہے اگر میں گڑبڑ کے بعد بھی اپنی بیوی کو نکال لانے میں کامیاب ہو گیا تو تم مجھے کہاں ملو گی؟ کیونکہ تمہاری مدد کے بغیر میں اس خونی جنگل سے شاید باہر نہ نکل سکوں۔"

وہ کہنے لگی۔

"یہاں سامنے والے درختوں کے پیچھے ایک کنڈ ہے۔ تمہیں یاد ہے آتی دفعہ ہم نے وہاں پانی پیا تھا۔"

مجھے یاد آ گیا یہ ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں پانی تھا۔ آتی دفعہ ہم نے وہاں پانی پیا تھا۔ اس کی نشانی بھی مجھے یاد آ گئی۔ وہاں دو درخت ایک دوسرے کے ساتھ مل کر تال کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

"ہاں مجھے وہ کنڈ یاد ہے۔"

وہ بولی۔

"اگر وہاں شور مچ گیا اور تم بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو میں تمہیں اسی کنڈ کے پاس ملوں گی۔ میں وہاں جھاڑیوں میں چھپی ہوئی ہوں گی مگر تمہیں دیکھ کر باہر نکل آؤں گی۔"

ہم باتیں کرتے رہے۔ میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ کر شروع کیے جانے والے کمانڈو ایکشن کے بارے میں غور کرتا رہا۔ یہ بالکل ایک طرح سے کمانڈو آپریشن ہی تھا۔ مجھے کمانڈو بن کر دونوں مسلح سپیروں کو اس طرح قابو کرنا تھا کہ کسی ایک کو دوسرے کے انجام

کی خبر نہ ہو۔ مجھے اس کام کی تربیت ملی ہوئی تھی اور یہ کام مجھے کوئی مشکل نظر نہیں آرہا تھا۔ مشکل مرحلہ صرف وہ تھا جب مجھے اپنی بیوی جمیلہ کے سامنے جا کر اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہنا تھا۔ دل کہتا تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان جائے گی اور فورا" میرے ساتھ بھاگ کھڑی ہوگی۔

جب رات گہری ہونے لگی تو جوگن مایا دیوی انگڑائی لیتی ہوئی اٹھی اور سیندھیا کے بستر کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"ابھی رات کے پچھلے پہر میں تین گھنٹے باقی ہیں۔ آجاؤ۔ میرے ساتھ لیٹ کر تم بھی کچھ دیر آرام کرو۔"

میں ڈر گیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"دیوی! مجھے بالکل نیند نہیں آرہی۔"

اس نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ میرا حکم ہے۔"

میرا جی چاہا کہ اس عورت کا سر پھوڑ دوں مگر میں بے بس تھا۔ بیوی کی تلاش کی مہم اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس وقت مجھے اس جوگن کی اشد ضرورت تھی۔ میں اس کے آگے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی اس نے یہ شرط عائد کر رکھی تھی کہ اگر میں اس کا کوئی ایک بھی حکم نہ مانا تو وہ میری مدد نہیں کرے گی۔ میری راہنمائی نہیں کرے گی اور جہاں جیسی حالت میں ہوگی وہاں سے واپس چلی جائے گی۔ عجیب وحشی اور خوفناک قسم کی عورت تھی یہ جوگن---- آج آپ کو اپنی داستان سناتے ہوئے جب اس عورت کا تصور کرتا ہوں تو یقین کریں میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں اسی طرح بیٹھا رہا۔ جوگن بستر پر لیٹ چکی تھی۔ میری طرف سر اٹھا کر دیکھا اور غصیلی آواز میں بولی۔

"میرے پاس آؤ۔"

میں جیسے کسی جادو کے اثر سے اٹھا اور اس بھیانک عورت کے پاس چلا گیا۔





مجھے واقعی نیند نہیں آ رہی تھی۔

مگر جوگن میرے گلے میں بانہیں ڈال کر چند لمحوں کے بعد ہی گہری نیند سوگئی اور بن مانس کی طرح خراٹے لینے شروع کر دیئے۔ میں نے پہلے تو اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ لیکن اس طرح بہت جلد میری گردن تھک گئی۔ پھر میں نے انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو جوگن کی بانہوں کے شکنجے سے نکالا اور ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا میں اس کمانڈو ایکشن میں کامیاب ہوسکوں گا؟ میں نے خدا سے بڑی دعائیں مانگیں۔ دعائیں مانگنے سے میرے اندر اعتماد پیدا ہوگیا۔ وقت کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کتنی رات گزر گئی ہے اور رات کا پچھلا پہر کس وقت ہو گا۔ جوگن کو مجھے ہی اٹھانا تھا۔ وہ تو گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی اور کٹیا اس کے بن مانس والے خراٹوں سے گونج رہی تھی۔ میں آہستہ سے اٹھ کر کٹیا سے باہر آگیا۔ آسمان پر تارے کھلے ہوئے تھے اور بھڑک بھڑک کر چمک رہے تھے۔ کھیتیاں یعنی سات ستاروں کی ٹولی ابھی آسمان کے وسط میں تھی۔ اتنا مجھے بچپن ہی سے معلوم تھا کہ جب رات کا پچھلا پہر ہوتا ہے تو یہ سات ستاروں کی ٹولی آسمان پر مغربی افق کی طرف جھک جاتی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی رات کے پچھلے پہر میں دو ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ میں کٹیا میں آ کر بیٹھ گیا۔

طاق میں پیتل کا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ اس کی لو مدہم ہونے لگی تھی۔ وہیں بیٹھا خیالات میں الجھا رہا۔ مجھے پاک آرمی سے ریلیز ہوئے پانچ ساڑھے پانچ سال گزر گئے تھے۔ اتنے

عرصے کے بعد میں ایک بار پھر کمانڈو مہم پر روانہ ہونے والا تھا۔ میں ایک ایک کر کے کمانڈو ٹریننگ کے سارے سبق یاد کر رہا تھا۔ فوج میں کمانڈو ٹریننگ ایسی ہوتی ہے کہ اسے ایک کمانڈو ساری زندگی نہیں بھول سکتا' وہ آدمی کے جسم کا حصہ بن جاتی ہے۔ میں نے کمانڈو چاقو ہرن کی چھال کے نیچے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ میں نے چاقو نکال لیا۔ دیے کی دھیمی روشنی میں اسے کھول کر اس کے پھل کی دھار کو غور سے دیکھا۔ اس پر انگلی پھیری' دھار کافی تیز تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ چاقو مجھے دھوکا نہیں دے گا۔ میں نے جوگیوں والی دھوتی باندھ رکھی تھی۔ سر کے بالوں میں بھی جوگن نے راکھ مل دی تھی جو اب تک کافی جھڑ چکی تھی۔ میں کٹیا میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں اٹھ کر باہر جاتا اور آسمان پر سات ستاروں کی ٹولی کو دیکھ آتا۔ یہ سات ستارے جنہیں ہم پنجاب میں کھیتیاں کہتے ہیں آہستہ آہستہ آسمان کے مغربی افق کی طرف جا رہی تھیں۔ جب آخری بار میں اٹھ کر باہر گیا تو کھیتیاں کافی نیچے جا چکی تھیں۔ میں نے کٹیا میں آ کر جوگن کو جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اس طرح اٹھی جس طرح کوئی بن مانس ہڑبڑا کر اٹھتا ہے۔

"ٹائم ہو گیا کیا؟"

اس نے بالوں کا جوڑا باندھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے رات کا پچھلا پہر ہو گیا ہے۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر کٹیا کے باہر نکل گئی۔ میں ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر اسے دیکھنے لگا۔ جوگن آسمان کی طرف منہ کر کے ستاروں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ جلدی سے واپس آ گئی اور بولی۔

"وقت ہو گیا ہے۔ جلدی سے نکل چلو۔"

جوگن نے اپنی ساڑھی خوب اچھی طرح سے کس کر جسم کے گرد باندھی۔ اس کا پلو بنے جسم پر اچھی طرح سے لپیٹ لیا۔ میں نے بھی دھوتی کو اچھی طرح سے اوپر کر کے کس کر باندھا۔ اس کے ڈھب میں کمانڈو چاقو چھپا کر رکھ لیا۔ جوگن نے پھونک مار کر دیا

بجھا دیا۔ ترشول اس نے پہلے ہی تھام لیا تھا۔ ہم کٹیا سے باہر نکل آئے۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی کٹیا کے چبوترے سے نیچے اتر گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ چبوترے سے اتر کر اس نے سامنے کی طرف دیکھا۔ ستاروں سے روشن آسمان کے پس منظر میں کچھ فاصلے پر مہا دیو کے آشرم کے میناروں کے خاکے نظر آ رہے تھے۔ وہ میری طرف جھک کر بولی۔

"ہم بائیں جانب والے درختوں کے پیچھے سے ہو کر جائیں گے۔ خبردار اب کوئی آواز نہ نکالنا۔ کھانسی چھینک آئے تو روک لینا۔ میرے پیچھے پیچھے چلنا۔"

مجھے کمانڈو ٹریننگ کے دوران اپنے استاد کے سبق یاد آ گئے۔ اس کے علاوہ مجھے وہ کمانڈو آپریشن بھی یاد آ گئے جب ہماری کمانڈو پارٹی ٹارگٹ مارنے کے لیے رات کے اندھیرے میں دشمن کے مورچوں کے عقب میں جاتی تھی اور ہمارا پارٹی لیڈر ٹارگٹ کے قریب پہنچ کر کہا کرتا تھا۔

"خبردار! ہم ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں۔ کھانسی بند۔ چھینک بند۔ باتیں بند۔ سگریٹ بند۔ گھس مس بند-----"

میں اس وقت پورا کمانڈو بن گیا۔ میرے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں ٹارگٹ مار لوں گا اور اپنی بیوی کو ہر حالت میں شیطانوں' سانپوں اور مگرمچھوں اور بن مانسوں کی بستی سے نکال کر لے جاؤں گا۔

ہم پچھلی رات کی تاریکی میں بائیں جانب والے درختوں کی طرف چل پڑے۔ جوگن مایا دیوی یہاں زندگی کے کئی برس گزار چکی تھی۔ اسے اندھیرے میں بھی راستے کا پتہ چل رہا تھا۔ وہ بڑی محتاط ہو کر ایک ایک قدم آہستہ آہستہ اٹھا کر چل رہی تھی۔ درختوں کے نیچے زیادہ اندھیرا تھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر شیطان مہا دیو کے آشرم کے ہندووانہ طرز کے نوکیلے مینار ستاروں کی روشنی میں نظر آ رہے تھے مگر ان میں کسی جگہ روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ جوگن نے مجھے بتایا تھا کہ گمشدہ شہر کی کسی عمارت میں بجلی نہیں ہے۔ آشرم اور مندر میں پیتل کے چھوٹے بڑے چراغ جلائے جاتے ہیں۔ ہم درختوں کے درمیان جھک کر چل رہے تھے۔ ایک جگہ ہمارے سامنے گھنی جھاڑیوں کی دیوار آ گئی۔ جوگن رک

گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بھی وہیں روک لیا۔ جھاڑیوں کی شاخیں ہٹا کر دوسری طرف دیکھا۔ پھر میرے کان کے پاس منہ لا کر بولی۔

"ہم تالاب پر پہنچ گئے ہیں۔ آؤ دیکھو۔"

اس نے جھاڑیوں کی شاخیں ہٹا کر مجھے تالاب دکھایا۔ ستاروں کی روشنی میں تالاب کا پانی مدھم دکھائی دے رہا تھا۔ چھوٹا سا تالاب تھا۔ سامنے کی جانب پتھر کی سیڑھیاں تالاب میں اتری ہوئی تھیں۔ پیچھے اونچے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ میں نے سر پیچھے کر لیا۔ میں کچھ کہنے لگا تو جوگن نے میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا اور کان کے پاس منہ لا کر سرگوشی کی۔

"بولو مت۔ کچھ دیر کے بعد اسی تالاب پر تمہاری بیوی سات عورتوں کے ساتھ اشنان کرنے آئے گی۔ سیندھیا ان عورتوں کو کسی بہانے باتوں میں لگا کر دوسری طرف لے جائے گی۔ تمہاری بیوی تالاب پر اکیلی ہوگی۔ اسے اپنے ساتھ لانا اب تمہارا کام ہے۔ میں جاتی ہوں اگر ہاہا کار مچ گئی تو میں تمہیں پرانے کنڈ پر ہی ملوں گی۔ سیندھیا کی کٹیا میں نہیں ہوں گی۔ بھگوان تمہاری سہائیت کرے۔"

اور جوگن مایا دیوی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ مسلح سپیرے کہاں اور کس طرف جھاڑیوں میں ہو سکتے ہیں۔ جس طرف سے میں اور جوگن آئے تھے اس طرف وہ لوگ نہیں تھے۔ سامنے والے درختوں کے نیچے جو جھاڑیاں تھیں وہاں ان کی موجودگی کا امکان ہو سکتا تھا۔ میں نے دھوتی کے ڈھب میں سے کمانڈو چاقو نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ اگرچہ اس وقت میرا حلیہ سادھوؤں والا تھا۔ لیکن میں ایک دلیر اور جانباز کمانڈو بن چکا تھا۔ میں نے ہمہ تن گوش ہو کر فضا میں کچھ سننے کی کوشش کی۔ وہاں کوئی ایسی سرسراہٹ یا آہٹ سنائی نہ دی جس سے میں کچھ اندازہ لگا سکتا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ کچھ دیر میں میری بیوی تالاب پر نہانے آ رہی تھی۔ اس کے آنے سے پہلے مجھے جھاڑیوں میں مورچہ بند مسلح سپیروں کو ختم کرنا تھا۔ ان کو ختم کیے بغیر اپنے مشن میں میری کامیابی مشکوک تھی۔

میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جھاڑیوں کے پیچھے جھک جھک کر دبے پاؤں چلتا تالاب کے دوسرے کنارے پر آگیا جہاں پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں اندھیرا تھا۔ آسمان پر پچھلی رات کا نور پھیلنے لگا تھا۔ میں جھک کر چھپ چھپ کر چلتا تالاب سے کوئی پچاس گز دور گنجان جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ مجھے یقین تھا کہ مسلح سپیرے ان جھاڑیوں میں ہی مورچہ بند ہوں گے۔ میں بڑے تجربہ کار کمانڈو کی طرح چیتے کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے پاؤں کی آہٹ تک پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ میں جھاڑیوں کے پہلو سے دور رہ کر آگے نکل گیا۔ آگے جا کر میں پیچھے سے جھاڑیوں کی طرف چلنے لگا۔ میں جھک کر چل رہا تھا۔ پانچ سات قدم چلا ہوں گا کہ مجھے فضا میں چرس کی بو محسوس ہوئی۔ میں فوراً زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔ مسلح سپیرے بہت قریب ہی تھے۔ وہ چرس پی رہے تھے۔ چرس کی بو ان کی جانب سے ہی آ رہی تھی۔ میں کہنیوں کے بل سامنے والی جھاڑیوں کی طرف رینگنے لگا۔ میں بڑا چوکس اور چوکنا ہو رہا تھا۔ رک رک کر آگے کی طرف رینگ رہا تھا۔ میں چرس کی بو کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ بو تیز ہوتی جا رہی تھی۔ یہ بو سامنے والی جھاڑیوں میں سے آ رہی تھی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ مسلح سپیروں کا مورچہ ان جھاڑیوں میں ہی ہے تو میں نے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے کسی آڑ کی تلاش تھی۔ وہاں درخت دور دور تھے۔ مجھے اپنے بائیں جانب ایک چھوٹی جھاڑی دکھائی دی جو بڑی جھاڑیوں کے پاس ہی تھی۔ یہ میرے لیے بہترین آڑ ثابت ہو سکتی تھی۔ میں شبنم سے بھیگی ہوئی گھاس پر کہنیوں کے بل رینگتا تیزی سے اس اکیلی جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔

مجھے ان دونوں سپیروں میں سے ایک کو اس جھاڑی کی طرف بلانا تھا۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ اس وقت تیز ایکشن کی ضرورت تھی۔ میں نے جھاڑی کے نیچے ہاتھ پھیرا۔ وہاں مجھے کوئی پتھر یا روڑا نہ ملا تو میں نے جھاڑی کی ایک شاخ توڑ دی اور اسے سامنے والی جھاڑیوں کے اوپر زور سے پھینک دیا۔ اس سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کوئی سپیرا اس آواز پر جائزہ لینے مورچے سے باہر نہ آیا۔ میں نے دوسری موٹی سی شاخ توڑ کر پھینکی۔ اس کی آواز زیادہ تھی۔ مجھے جھاڑیوں میں دو آدمیوں کے

باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے کمانڈو چاقو کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اس چیتے کی طرح بیٹھ گیا جو اپنے شکار پر جھپٹنے ہی والا ہو۔ ایک دو سیکنڈ کے بعد ایک انسانی سایہ جھاڑیوں میں سے باہر نکلا۔ میں پچھلے پہر کے دھندلکے میں اس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ عجیب بات تھی اور یہ میری خوش قسمتی بھی تھی کہ یہ آدمی غیر مسلح تھا۔ اس کے ہاتھ میں یا کندھے پر کوئی رائفل وغیرہ نہیں تھی۔ یہ بے احتیاطی صرف چرس کے نشے کی وجہ سے ہی ہو سکتی تھی یا یہ بات تھی کہ انہیں پورا اعتماد تھا کہ اس جگہ کوئی غیر آدمی داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ انسان یقیناً" گارڈ سپیرا ہی تھا۔ وہ جھاڑیوں پر جھک کر غور سے دیکھ رہا تھا کہ ابھی ابھی جو آواز آئی تھی وہ کسی بندر کی تھی یا کوئی اور آواز تھی۔

میں پوری گھات لگا کر ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ آدمی جھاڑیوں پر ہاتھ مارتا اس اکیلی جھاڑی کی طرف آ رہا تھا جس کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا بجلی کی چمک ایسی تیزی سے کرنا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔ جیسے ہی وہ میری جھاڑی کے قریب سے گزر کر ایک قدم آگے بڑھا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ میرا سیدھا ہاتھ چھلانگ لگاتے ہی اس کی گردن کی پشت پر پڑا۔ یہ اس قدر زور دار ہاتھ تھا کہ وہ آدمی یا سپیرا کوئی آواز نکالے بغیر آگے کو گرا۔ آگے میرا چاقو تھا جسے میں نے اس کے حلق پر پوری طاقت اور پوری برق رفتاری سے پھیرا اور خود پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب اس کی شہ رگ سے خون کا فوارہ چھوٹے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ خون تو مجھے نظر نہیں آیا لیکن اس کے نرخرے کی خرڑ خرڑ کی آواز آنے لگی۔ میں نے اس کی آدھی کٹی ہوئی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ اتنے میں جھاڑیوں کے اندر سے دوسرے مسلح سپیرے نے اپنے ساتھی کو آواز دے کر بلایا۔ جب اسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ خود جھاڑیوں سے باہر نکل آیا۔ اس دوران میں جھاڑیوں کی اوٹ میں پوزیشن بنا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

میں نے غور سے دیکھا۔ دوسرے سپیرے کے کندھے سے رائفل نہیں بلکہ سٹین گن سلنگ کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ اگر سٹین گن اس کے ہاتھ میں ہوتی تو مجھے دوسری

حکمت عملی اختیار کرنی پڑتی۔ کیونکہ سٹین گن ہاتھ میں ہونے کی صورت میں اس کی انگلی ٹریگر پر ہوتی اور میرے حملہ کرنے کے ساتھ ہی فائر کے دھماکے ہو سکتے تھے۔ دوسرا سپیرا اپنے ساتھی کو آوازیں دیتا آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ میں جھاڑیوں کی شاخوں میں چھپا ہوا تھا اور اسے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ میری طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ میری عقابی نظریں اس سپیرے کے سینے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس نے بھی پہلے والے سپیرے کی طرح فوجی سپاہیوں والی وردی پہن رکھی تھی۔ جیسے ہی وہ جھاڑیوں کی ان ٹہنیوں کے قریب سے گزرنے لگا جن کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا میں اچانک اس کے سامنے آگیا اور سامنے آتے ہی میرا کمانڈو چاقو پوری شدت اور طاقت کے ساتھ اس کے سینے میں اتر چکا تھا۔ کمانڈو ٹریننگ کے دوران ہم بھوسے کی ڈمیوں پر مشق کیا کرتے تھے اور جیسے ہی ڈمی ہمارے سامنے سے لٹکتی ہوئی گزرتی تھی ہم آڑ سے نکل کر چاقو ڈمی کے دل میں گھونپ دیتے تھے۔ یہ بڑی سخت ٹریننگ ہوتی تھی۔ اگر ہمارا چاقو ڈمی کے دل پر لگے ہوئے نشان پر نہیں پڑتا تھا تو پیچھے سے انسٹرکٹر کی چھڑی ہمارے سر پر پڑتی تھی۔

میرا چاقو سپیرے کے عین دل میں دستے تک اتر گیا تھا۔ وہ میرے اوپر گرنے لگا۔ میں چاقو کھینچ کر پرے ہٹ گیا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گرا اور بے حس و حرکت وہیں پڑا رہا۔ میں نے اس کی سٹین گن اٹھالی۔ یہ میرے کام آ سکتی تھی۔ جھاڑیوں کے اندر گیا تو وہاں کوئی اور آدمی نہیں تھا۔ میں یہی تسلی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد میں تیزی سے تالاب کی طرف آیا اور جہاں تالاب کی سیڑھیاں تھیں۔ اس سے کچھ فاصلے پر درخت کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر پو پھٹنے کا نور بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی بیوی کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ مجھے عورتوں کی باتیں کرنے اور دھیمی ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میری نظریں تالاب کے پہلے جو درخت تھے اس طرف لگی تھیں۔ آوازیں بھی اسی طرف سے آ رہی تھیں۔ پھر کچھ عورتیں اندھیرے میں نمودار ہوئیں۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ ان میں یقیناً" میری بیوی بھی تھی۔ سحر کی سپیدی ابھی نہیں ہوئی تھی اس لیے عورتوں کے دھندلے خاکے سے ہی نظر آ رہے تھے۔ مجھے اس خیال سے بے چینی ہونے لگی کہ یہ

ساری عورتیں میری بیوی کو لے کر تالاب کی طرف آ رہی ہیں۔ سیندھیا نے تو کہا تھا کہ میں عورتوں کو باتوں میں لگا کر دور ہی رکھوں گی اور تالاب پر صرف میری بیوی ہی آئے گی۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے ایسا ہوا کہ ساتوں عورتیں جو میری بیوی کے ساتھ آئی تھیں ایک طرف چلی گئیں۔ ضرور ان میں سیندھیا بھی تھی جو ان عورتوں کو کسی بہانے دوسری طرف لے گئی تھی۔

تب میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ایک انسانی سائے کو دیکھا جو اکیلا رہ گیا تھا اور تالاب کی سیڑھیوں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے اندھیرے اور دھندلکے میں بھی پہچان لیا۔ یہ میری بیوی جمیلہ تھی۔ میں نے اس کو اس کے چلنے کے انداز سے پہچانا تھا۔ اس کا چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سٹین گن کندھے سے لٹکائی۔ چاقو میں نے پہلے ہی صاف کر کے اپنی جوگیوں والی دھوتی کے ڈھب میں چھپا لیا تھا۔ وقت بہت کم تھا میرے پاس---- میں جھاڑیوں سے نکل کر سیدھا تالاب کی طرف دوڑ کر گیا۔ اس وقت میری بیوی تالاب کی سیڑھیاں اترنے ہی والی تھی۔ قریب جاتے ہی میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ میری بیوی جمیلہ ہی تھی۔ اس کے کھلے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ پر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی اس کی سکھیوں میں سے کوئی سکھی ہے۔ میں نے قریب جا کر اسے بے اختیار آواز دی۔

"جمیلہ۔"

جمیلہ ایک دم رک گئی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں لے لیا۔

"جمیلہ! خدا کا شکر ہے تمہاری شکل دیکھنی نصیب ہوئی۔ اب تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں اس دوزخ سے نکال کر لے جاؤں گا۔ جلدی سے میرے ساتھ آ جاؤ۔"

جتنی دیر میں یہ جملے بولتا رہا جمیلہ حیرت اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ

میری طرف دیکھتی رہی۔ میں سمجھ گیا کہ اس پر منتروں کا اثر ہے اور وہ پوری طرح سے مجھے پہچان نہیں رہی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کھینچا تو جمیلہ نے چیخ ماری۔ پہلے تو میں گھبرا کر رک گیا مگر میں تو اسے ہر حالت میں وہاں سے لے جانے کے لیے آیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالنے کی کوشش کی تو جمیلہ نے اونچی آواز میں چیخنا شروع کر دیا۔ اس کی چیخوں کو سن کر ساری عورتیں درختوں میں سے نکل کر وہاں آ گئیں۔ انہوں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ جمیلہ کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو انہوں نے بھی شور مچا دیا۔ پھر خدا جانے ان کے شور کی آواز سن کر کس طرف سے سٹین گن کی فائرنگ کے دھماکے ہوئے۔ میں نے جمیلہ کو چھوڑ کر اپنی سٹین گن سے ہوا میں ایک برسٹ فائر کیا اور جمیلہ کو بازو سے پکڑنے لگا تو وہ چیختی چلاتی شور مچاتی عورتوں کے ساتھ درختوں کی طرف بھاگ گئی۔

میں کیا کر سکتا تھا۔ ان پر فائرنگ نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے پیچھے دوڑا کہ کسی طرح جمیلہ کو قابو کر کے وہاں سے لے جاؤں۔ دو قدم ہی دوڑا تھا کہ بائیں جانب والے درختوں سے چار پانچ فوجی وردیوں والے آدمی نمودار ہوئے۔ انہوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ تالاب خالی تھا۔ گولیاں درختوں کی شاخوں کو توڑتی ہوئی نکلنے لگیں۔ شاید وہ ابھی درختوں کو نشانہ بنا کر برسٹ فائر کر رہے تھے۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں وہاں سے چپکے سے سحر کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر نکل جاتا۔ ان لوگوں کو میں نظر نہیں آیا تھا ورنہ وہ مجھ پر برسٹ فائر کرتے۔ میں نے یہ غلطی کی کہ جو دو آدمی مجھے صبح کاذب کی مدھم روشنی میں تالاب کے پاس فائرنگ کرتے نظر آ رہے تھے ان پر فائرنگ کی ایک بوچھاڑ مار دی۔ دونوں آگے کو گر پڑے۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر فائر آنے لگا۔ شاید دوسرے آدمیوں کو میں نظر آ گیا تھا۔ جمیلہ کو وہاں سے نکال کر لے جانا تقریباً" ناممکن ہو گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس وقت وہاں سے نکل جاؤں اور دوسری دفعہ جمیلہ کو جوگن کے مشورے کے بعد نکالنے کی کوشش کروں۔ میں فائرنگ کرتا پیچھے ہٹنے لگا۔ یہ مجھے خیال ہی نہ رہا کہ میری سٹین گن کے میگزین کی گولیاں ختم ہو گئیں تو مجھے مزید ایمونیشن کہیں سے نہیں مل سکے گا۔ میرا

خیال تھا کہ میں فائرنگ کرتا وہاں سے نکل جاؤں گا۔ آخر وہی ہوا۔ گولیاں ختم ہو گئیں۔ میں نے سٹین گن وہیں پھینکی اور سیندھیا کی کٹیا کی طرف دوڑ لگا دی۔ لیکن میں گھیرے میں آ چکا تھا۔ گولیاں میرے سر کے اوپر سے نکل رہی تھیں۔ میں جھک کر بھاگ رہا تھا۔ اب دن کا اجالا چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ میں جیسے ہی آشرم کے تالاب والے درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلا سامنے دس بارہ مسلح آدمی جنہوں نے فوجی وردیاں پہن رکھی تھیں، سٹین گنوں کا رخ میری طرف کیے کھڑے تھے۔ میں بغیر اسلحے کے تھا۔ صرف ایک چاقو ہی میرے پاس تھا جو اس وقت میرے کام نہیں آ سکتا تھا۔ ان لوگوں نے مجھ پر ایک بھی گولی نہ چلائی۔ شاید انہیں یہ حکم ملا تھا کہ مجھے زندہ گرفتار کیا جائے۔ انہوں نے مجھے فوراً قابو میں کر لیا۔ یہ معمولی قد و قامت کے آدمی تھے۔ رنگ گہرے سانولے تھے۔ ابھی انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں ان کے دو آدمیوں کا خون کر چکا ہوں۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے مندر کی طرف لے گئے۔ ایک اونچے چبوترے پر بنا ہوا یہ مندر ایک کھنڈر لگ رہا تھا۔ وہ آپس میں اس علاقے کی زبان میں باتیں کر رہے تھے جو کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھیں۔

میرا حلیہ جوگیوں والا تھا۔ وہ حیران تھے کہ میرے پاس سٹین گن کہاں سے آ گئی تھی۔ انہوں نے مجھے مندر کے ایک تنگ و تاریک تہہ خانے میں پھینک کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے دھوتی کے ڈھب میں سے چاقو نکال کر کونے میں پتھروں کے نیچے چھپا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی دو مسلح آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے دو اور آدمی آ گئے۔ انہوں نے میرے ہاتھ رسی سے پیچھے باندھے اور کھینچتے ہوئے تہہ خانے سے نکال کر ایک نیم روشن راہداری میں سے گزرنے لگے۔ اس راہداری کی پتھر کی دیواروں پر بڑی فحش پوز والی مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں انہوں نے مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کر کے باہر تالا لگا دیا۔ میں ننگے فرش پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ جب ان لوگوں کو پتہ چلا کہ میں ان کے دو آدمی مار چکا ہوں تو یہ مجھے کسی صورت میں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ موت میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں صرف خدا کو یاد کر رہا تھا۔ بہت دیر گزر گئی۔ پھر باہر قدموں کی آہٹ

سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور تین باوردی مسلح سپیرے آئے اور مجھے پکڑ کر ایک اور تنگ سے کمرے میں لے گئے۔ جہاں چھ سات مسلح سپیرے پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے ایک ان کا افسر معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور اس علاقے کی ہندوستانی زبان میں مجھے گالی دی اور پھر اتنی زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا کہ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔

"تم نے ہمارے دو آدمیوں کو قتل کیا ہے۔ ہم تمہیں ابھی گولی مار دیتے اگر مہادیو جی کا حکم نہ ہوتا کہ تمہیں ان کے سامنے زندہ پیش کیا جائے۔"

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت تو جان بچ گئی۔ آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ وہ مجھے وہاں سے مندر کی مختلف گھٹی گھٹی فضا والی تنگ و تاریک راہ داریوں میں سے گزارتے ہوئے ایک ایسی جگہ لے آئے جہاں ایک دروازے کے باہر دو مسلح سپیرے پہرہ دے رہے تھے۔ افسر سپیرے نے کہا۔

"مہاراج سے عرض کرو کہ ان کا آدمی ہم پکڑ کر لے آئے ہیں۔"

ایک آدمی اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو بولا۔

"اندر لے جاؤ۔ اس راکھشش کو۔"

مجھے ایک چھوٹے ہال کمرے میں لایا گیا جس کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ جگہ جگہ چوکور ستون چھت تک چلے گئے۔ ان ستونوں پر ننگی عورتوں کی مورتیں کندہ کی گئی تھیں۔ چھت کے ساتھ پیتل کے روشن دیئے لٹک رہے تھے۔ اس ہال میں سے گزار کر وہ لوگ مجھے آگے ایک اور ہال کمرے میں لے آئے۔ یہ چھوٹا ہال کمرہ تھا۔ فرش پر قالین بچھے تھے۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایک بڑا تخت بچھا تھا۔ اس پر ایک سرخ رنگ کا ٹاوَچ رکھا ہوا تھا جو خالی تھا۔ اس کی دونوں جانب دو جوان اور نیم عریاں لڑکیاں مور چھل تھامے ساکت کھڑی تھیں۔ مجھے ایک ستون کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ میرے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے۔

کوئی پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ سنکھ بجانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میرے

ساتھ جو مسلح فوجی سپیرے آئے تھے وہ گھٹنوں کے بل ہو گئے۔ انہوں نے مجھے بھی گھٹنوں کے بل بٹھا دیا۔ جس طرف سے سنکھ بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں اس طرف سرخ پردے گرے ہوئے تھے۔ دو زعفرانی کپڑوں اور لمبے بالوں والے آدمی پردے کے پیچھے سے نمودار ہوئے۔ انہوں نے پردے ایک طرف ہٹا دیے۔ ایک پالکی آئی جس کو چار آدمیوں نے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ آگے آگے چار پجاری سنکھ بجا رہے تھے۔ پالکی پر ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے گیروے رنگ کی دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ توند پھولی ہوئی تھی۔ گلے میں اور بازوؤں پر ہیرے موتیوں کے ہار لٹک رہے تھے۔ سر پر ایک تاج تھا جس پر نیلے رنگ کا اژدہا کا سر بنا ہوا تھا۔ پالکی کے پیچھے بھی چار آدمی تھے جو اشلوک پڑھتے ہوئے قدم قدم چل رہے تھے۔ پالکی تخت کے پاس لا کر رکھ دی گئی۔ موٹی توند والا آدمی دو پجاریوں کے سہارے سے پالکی میں سے نکلا اور تخت پر بیٹھ گیا۔ پیچھے دو نیم عریاں جوان لڑکیاں کھڑی تھیں۔ وہ مورچھل ہلانے لگیں۔ تخت کے چاروں کونوں پر چاندی کے دیے روشن کر دیے گئے۔

"میں سمجھ گیا کہ یہی شیطانی مہا دیو ہے۔ جو اس پر اسرار آشرم میں دور دراز سے حسین عورتوں کو منگوا کر ان کی عزتوں سے کھیلتا ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کا عصا تھا جس کی موٹھ پر بھی اژدہا کا سر بنا ہوا تھا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی عصا کو آہستہ سے بلند کیا اور خرخراتی بھاری آواز میں کہا۔

"دشمن کو میرے قریب لاؤ۔"

دو آدمی مجھے گھسیٹتے ہوئے تخت کے پاس لے گئے اور گھٹنوں کے بل بٹھا دیا۔ ایک فوجی وردی والے نے کہا۔

"دیوتاؤں کے دیوتا مہاراج مہا دیو گورو! یہی ہمارا دشمن ہے جو باہر سے آیا ہے اور جس نے ہمارے دو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔"

شیطان مہا دیو نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔

"تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟ تم یہاں کس کی مدد سے آئے ہو؟ اگر تم سچ سچ بتا دو

گے تو میں تمہاری جان نہیں لوں گا۔"

میں نے فوراً اداکاری کرتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! میں بے قصور ہوں۔ میں نے آپ کے دو آدمیوں کا خون نہیں کیا۔ مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔ میں آلوپ نگر کو دیکھنے کے شوق میں یہاں آ گیا تھا۔ تالاب کے پاس رات کو سو گیا۔ صبح صبح عورتوں کو اشنان کرتے دیکھ رہا تھا کہ آپ کے آدمیوں نے مجھ پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔"

شیطان مہادیو نے کہا۔

"تم نے بھی جواب میں فائرنگ کی تھی۔ تمہارے پاس سٹین گن کہاں سے آ گئی تھی؟"

اس آدمی کے جملوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ اردو جانتا ہے اور ماڈرن زمانے کے اسلحہ وغیرہ سے خوب واقف ہے۔ میں نے کہا۔

"مہاراج! میں نے گولی نہیں چلائی۔ مہاراج میں تو معمولی سا جوگی ہوں۔ مجھے کیا پتہ گولی کیسے چلائی جاتی ہے۔"

فوجی وردی والا سپیرا جو افسر تھا' بولا۔

"مہاراج! یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس نے ہم پر جوابی فائرنگ کی تھی۔ ہم نے اسے خود سٹین گن سے فائرنگ کرتے دیکھا تھا۔ مہاراج! یہ کوئی جاسوس ہے جسے ہمارے دشمنوں نے یہاں کے حالات معلوم کرنے بھیجا ہے۔"

شیطانی مہادیو نے غصے میں آ کر کہا۔

"اگر اسے ہمارے دشمنوں نے بھیجا ہے تو یہ ہمارے سانپوں اور مگرمچھوں سے بچ کر آلوپ نگر اور ہمارے آشرم تک کیسے پہنچ گیا؟"

تخت کے پاس ایک بوڑھا پجاری کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! اس نے ضرور اپنے اوپر کوئی منتر پھونک رکھا ہے۔ یہ کوئی بڑا خطرناک جوگی معلوم ہوتا ہے۔"

شیطانی مہادیو نے چاندی کا عصا اوپر اٹھا کر حکم دیا۔
"گنگولی کو بلاؤ۔"

ایک پجاری فوراً چلا گیا۔ مہادیو! مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے حلق سے سانس لیتے ہوئے خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ کہنے لگا۔
"تم جوگی سنیاسی نہیں ہو۔ یہ مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ ابھی وقت ہے بتا دو کہ تم اصل میں کون ہو اور تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

میں نے وہی الفاظ دہرا دیے کہ مہاراج مجھے کسی نے نہیں بھیجا۔ میں بے قصور ہوں۔ میں الہ آباد کا ہوں۔ جوگی بننے کا شوق تھا۔ گنگا کے کنارے ایک سادھو مہاراج نے مجھے جوگی بنا دیا۔ میں نے وید شاستر نہیں پڑے۔ میں شہر کا رہنے والا ہوں۔ آلوپ نگر دیکھنے کا شوق مجھے یہاں کھینچ لایا۔ مجھے شما کر دیں مہاراج---- مہادیو اس دوران قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھ کر گردن دائیں بائیں ہلاتا رہا۔ گنگولی آ گیا۔ اس کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی دہشت سپیرا تھا جس کو میں نے دلی والے کوارٹر میں شام کے وقت منڈلاتے دیکھا اور دوسرے دن یہی سپیرا میری بیوی کو ورغلا کر لے گیا تھا۔ اس سپیرے نے مجھے نہیں دیکھا کیونکہ اس کا میرا آمنا سامنا کبھی نہیں ہوا تھا۔ دہشت سپیرے نے میری طرف دیکھا۔ پھر مہادیو کے آگے ہاتھ باندھ کر جھک گیا۔ مہادیو نے کہا۔
"گنگولی! یہ باہر کا جاسوس ہے۔ یہ معلوم کرو کہ اس نے اپنے بدن پر کون سا منتر پھونک رکھا ہے۔ جس کے اثر سے یہ ہمارے زہریلے سانپوں' مگرمچھوں اور خونی درختوں سے زندہ سلامت بچ کر یہاں تک آ گیا۔"

"گنگولی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا میرے پاس آ گیا۔ اس نے منہ ہی منہ میں کوئی اشلوک پڑھ کر مجھ پر پھونکا۔ پھر خود بخود چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ دوبارہ میرے قریب آیا اور میرے جسم کو سونگھنے لگا۔ پھر مہادیو کے تخت کے پاس جا کر بولا۔
"مہا دیوتا! اس شخص کے جسم سے ایسی بو آ رہی ہے جس کو سونگھ کر زہریلے سانپ اور مگرمچھ بھاگ جاتے ہیں۔ آدم خور درختوں کی ٹہنیاں سمٹ جاتی ہیں۔ مہاراج! یہ کوئی

بڑا خطرناک جوگی ہے۔"

مہا دیو غصے سے کانپتا ہوا تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ کڑک کر بولا۔

"اس دھشٹ کو شیش ناگ والی کوٹھڑی میں بند کر دو۔ اماوس کی رات ہم خود اس کو اپنے سامنے کھولتے ہوئے تیل کے کڑاؤ میں ڈالیں گے۔ لے جاؤ اسے۔"

سپیرے فوجی مجھے گھسیٹتے ہوئے وہاں سے نکال کر لے گئے۔

میرا خیال تھا کہ مجھے جس کوٹھڑی میں بند کیا جائے گا' اس میں کوئی بہت بڑا سانپ بھی ہوگا۔ چونکہ مہا دیو اماوس کی رات تک مجھے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ اس کوٹھڑی میں شیش ناگ نہیں ہوگا۔ اگر ہوا بھی تو وہ سانپ ہی ہوگا اور میرے جسم سے نکلنے والی بو اسے میرے قریب نہیں آنے دے گی۔ وہ لوگ مجھے آشرم کی عمارت سے باہر لے آئے۔ آمنے سامنے تنگ کوٹھڑیوں والے کھنڈر نما مندر تھے جن کے باہر ہنومان کی اور اژدہوں کے بت جگہ جگہ نصب تھے۔ دن کا وقت تھا مگر وہاں کوئی آدمی کوئی پجاری نظر نہیں آرہا تھا۔ میرے ہاتھ پیچھے باندھ دیے گئے تھے۔ یہ لوگ مجھے مندروں کے درمیان ویران اجاڑ راستے میں سے گزارتے ہوئے ایک ٹیلے کے پاس لے آئے۔ یہاں پتھر کی دیواروں اور پتھر کی چھت والی ایک کوٹھڑی تھی جس کے لکڑی کے پرانے دروازے کے آگے لوہے کا بڑا مضبوط جنگلہ لگا ہوا تھا۔ یہ بالکل حوالات کے دروازے کی طرح تھا۔ ایک سپیرے فوجی نے آگے بڑھ کر لوہے کے جنگلے والے دروازے کا تالا کھولا۔ پھر لکڑی کے پرانے دروازے کا تالا کھولا اور مجھے پکڑ کر اندر دھکیل کر دونوں دروازے بند کر کے تالے لگا دیے گئے۔

اس کوٹھڑی کو مہا دیو شیطان نے شیش ناگ والی کوٹھڑی کہا تھا۔ اندر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ پھر دیوار کے اوپر چھت کے قریب بنے ہوئے چھوٹے سے روشندان میں سے جو دن کی روشنی اندر آ رہی تھی' اس کی وجہ سے کچھ کچھ نظر آنا شروع ہوا۔ کوٹھڑی کے فرش پر سوکھا گھاس پھونس بچھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں

تھا۔ کوٹھڑی میں حبس اور گرمی تھی۔ مچھر بھی تھے۔ مچھروں نے فوراً مجھ پر حملہ کیا لیکن میرے جسم سے نکلنے والی بو پا کر جدھر سے آئے تھے ادھر کو بھاگ گئے۔ اس اعتبار سے میں بڑے سکون میں تھا کہ کم از کم مجھے مچھر اب تنگ نہیں کریں گے۔ میں سوکھی گھاس پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ جمیلہ نے مجھے نہیں پہچانا۔ اس پر کیے گئے منتروں کا اثر کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔ کیا میں اس سے دوبارہ مل سکوں گا؟ خدا جانے ان کی اماوس کی رات کب آئے گی۔ اس رات یہ لوگ مجھے کھولتے ہوئے تیل کے کڑاؤ میں ڈال دیں گے۔ ہو سکتا ہے اماوس کی رات کل کی رات ہو۔ میں خدا کے حضور سر جھکا کر دعائیں مانگنے لگا۔

رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں اونگھتے اونگھتے وہیں گھاس پر پڑ کر سو گیا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب کوئی میرے پاؤں پر زور سے ٹھوکریں مار رہا تھا۔

"اٹھو دھشٹ! میرے ساتھ آؤ۔"

لکڑی اور لوہے کے دونوں دروازوں کے تالے کھلے تھے مگر باہر دو سپیرے فوجی سٹین گنیں لیے دائیں بائیں پوزیشن لے کر کھڑے تھے۔ جب فوجی سپیرے نے مجھے جگایا تھا وہ مجھے چند قدموں کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کے پاس لے گیا اور بولا۔

"جاؤ اندر جا کر اشنان وغیرہ کر لو۔"

یہ ایک تنگ سا غسل خانہ تھا۔ جہاں پانی سے بھری ہوئی بالٹی اور مٹی کا پیالہ رکھا ہوا تھا۔ نلکہ وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ میں نے اچھی طرح سے غسل کیا۔ سر میں جمی ہوئی راکھ مل مل کر نکال دی۔ وہی دھوتی پہنی اور غسل خانے سے باہر آ گیا۔ باہر مسلح فوجی سپیرا موجود تھا۔ وہ مجھے سٹین گن کی نوک پر واپس لوہے کے جنگلے والی کوٹھڑی میں لے آیا اور اندر دھکیل کر اس نے دونوں دروازوں پر تالے لگا دیے۔ باہر نکلی ہوئی دھوپ سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ دوپہر کا وقت ہو گیا ہوا ہے۔ مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔

میں گھاس پھوس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ سارا دن گزر گیا۔ بھوک اور پیاس سے میں نڈھال ہو رہا۔ روشندان میں سے آتی دن کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ پھر یہ دھندلی

روشنی بھی غائب ہوگئی۔ باہر رات پڑ گئی تھی۔ باہر سے کسی کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ کسی کسی وقت سپیرے فوجیوں کی ایک دوسرے سے ایک آدھ جملہ بولنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ اس کے بعد پھر وہی موت کی خاموشی طاری ہو جاتی۔ اس کوٹھڑی میں ناگوار بو رچی ہوئی تھی۔ شاید اس میں کبھی کوئی بڑا اژدہا رہتا ہوگا۔ جب رات ہوگئی تو دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر آئی۔ اس نے جوگنوں والی زرد دھوتی باندھ رکھی تھی۔ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ اس عورت کے ہاتھوں میں ایک تھال تھا جس میں پیتل کا دیا روشن تھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ جوگن مایا دیوی کی سہیلی اور ہم دونوں کی دوست سیندھیا تھی۔ اس نے طشت میرے آگے رکھ دیا اور سرگوشی میں کہا۔

"خاموش رہنا۔"

وہ میرے لیے کھانے کو روٹیاں سبزی کا سالن اور کچھ کیلے لائی تھی۔ پیتل کا دیا اس نے طاق میں رکھ دیا۔ پھر اونچی آواز میں کہا۔

"مہا دیو جی نے تم پر مہربانی کر کے تمہارے لئے بھوجن بھیجا ہے۔ پر تو اماوس کی رات تک جو کچھ بھی کھا سکتا ہے کھا لے۔ پھر تیرے جیون کا سفر ختم ہو جائے گا۔"

شاید یہ الفاظ وہ کوٹھڑی کے باہر پہرے پر موجود مسلح سپیرے فوجیوں کو سنانا چاہتی تھی۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ دھیمی آواز میں بولی۔

"میں نے گنگولی سپیرے سے کہہ کر تمہیں روزانہ شام کو بھوجن کرانے کی ڈیوٹی لگوائی ہے۔ وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے' کیونکہ میں اسے بہت خوش کرتی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"سیندھیا! یہ سب کچھ کیا ہوگیا ہے۔ میری بیوی اگر چیخ نہ مارتی تو میں اسے نکال کر لے گیا تھا مگر اس نے مجھے بالکل نہیں پہچانا۔"

ہم بڑی دھیمی آواز میں بلکہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"اب تمہاری بیوی نے تھوڑا تھوڑا تمہیں پہچان لیا ہے۔ وہ مجھ سے تمہاری باتیں

کرتی رہی تھی۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"ہاں" سیندھیا نے آہستہ سے کہا۔ "دو ایک دن میں اس پر منتروں کا اثر شاید ختم ہو جائے۔"

میں نے آہ بھر کر کہا۔

"اب کیا فائدہ---- یہ لوگ تو مجھے ختم کر دیں گے۔ شاید اب کبھی جمیلہ سے ملاقات نہ ہو۔"

سیندھیا نے کہا۔ "فکر کیوں کرتے ہو۔ تمہیں اماوس کی رات کو کھولتے تیل میں ڈالا جائے گا اور اماوس کی رات میں ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔"

یہ سن کر میرا کچھ حوصلہ بڑھا۔ میں روٹی بھی کھا رہا تھا اور سیندھیا سے آہستہ آہستہ باتیں بھی کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"سیندھیا! کیا تم مجھے اور میری بیوی کو یہاں سے نکال سکتی ہو؟"

اس نے کہا۔

"میں اسی لیے تمہارے پاس آئی ہوں۔ میں کوشش کروں گی کہ تم اپنی بیوی کو لے کر یہاں سے فرار ہو جاؤ۔ لیکن ابھی مجھے کوئی راستہ تلاش کر لینے دو۔ میں کل آؤں گی تو تم سے بات کروں گی۔"

میں نے جلدی جلدی کھانا کھا لیا۔ پانی پیا۔ سیندھیا طشت اٹھا کر کوٹھڑی سے نکل گئی۔ باہر کھڑے فوجی سپیرے نے پہلے لکڑی کے دروازے پر اور پھر لوہے کے جنگلے پر تالا لگا دیا۔

سیندھیا کے آنے سے میرے دل میں امید کی ایک کرن روشن ہو گئی تھی۔ یہ عورت میری مدد کر سکتی تھی۔ وہ سمجھدار تھی اور بہادر بھی تھی۔ دوسرا دن میں نے سخت بیزاری کے عالم میں گزار دیا۔ شام کے وقت سیندھیا میرے لیے کھانا لے کر آگئی۔ مجھے

دن میں صرف ایک بار کھانے کو ملتا تھا۔ مگر مجھے بڑا اچھا کھانا دیا جا رہا تھا۔ شاید مہا دیو چاہتا تھا کہ میں موت کے وقت تک پوری طرح صحت مند رہوں تا کہ مجھے کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں گرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچے۔ سیندھیا میرے سامنے بیٹھ گئی۔ میں کھانا کھانے لگا۔ اس نے اونچی آواز میں باہر پہرے داروں کو سنانے کے لیے مجھے برا بھلا کہا۔ مہادیو کی تھوڑی سی تعریف کی اور خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد دھیمی آواز میں کہنے لگی۔

"تمہاری بیوی پر کیے گئے منتروں کا اثر کافی ختم ہو گیا ہے۔ رات کو جب وہ مہا دیو کے آشرم میں جانے لگی تو مجھ سے بولی۔ سیندھیا مجھے اس دوزخ سے نکالو۔ میں اپنے خاوند کرم داد کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ اگر وہ مر گیا تو میں زندہ نہیں رہوں گی۔"

میری جان میں جان آ گئی۔ اگرچہ مجھے اپنی زندگی کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ میں ہفتے کے بعد زندہ بھی ہوں گا یا نہیں، اس کے باوجود جمیلہ کی یاد داشت کے واپس آ جانے کی مجھے بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ میں نے سیندھیا سے کہا۔

"سیندھیا! یقین کرو اگر تمہارے مہا دیو نے مجھے مروا دیا تو میری بیوی واقعی زندہ نہیں رہے گی وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی ہے۔"

سیندھیا نے دروازے کی طرف ایک نظر ڈالی۔ پھر میری طرف جھک کر کہا۔

"میں نے تم دونوں کے فرار کا سوچ لیا ہے۔"

میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"ہاں ہاں آہستہ بات کرو۔" اس نے مجھے دبی آواز میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "کل شام کو آؤں گی۔ تم تیار رہنا۔"

اس کے بعد سیندھیا جلدی سے اٹھ کر لکڑی کے دروازے کے بند کیواڑوں کے پاس گئی اور کان لگا کر دوسری طرف سے کچھ سننے لگی۔ پھر اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر دیکھا۔ اس کے بعد جلدی سے دروازہ بند کر کے میرے سامنے بیٹھ گئی اور سرگوشی میں

بولی۔

"تم کل رات تیار رہنا۔"

"کیا جمیلہ کو تم ساتھ لاؤ گی؟"

"شی! خاموش رہو! یہ میں تمہیں کل بتاؤں گی۔"

وہ چلی گئی۔ میرے لیے دوسرے دن کی شام کرنا پہاڑ کاٹنے کے برابر ہو گیا۔ سارا دن سوچتا رہا کہ سیندھیا نے کیا انتظام کیا ہو گا۔ کہیں ہمارے ساتھ وہ بھی موت کے منہ میں نہ چلی جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس شیطان نگری سے ہمارا نکلنا ناممکن نظر آتا تھا مگر سیندھیا وہاں کے تمام خفیہ راستوں کی بھیدی تھی۔ ضرور وہ ہمیں کسی خفیہ سرنگ سے فرار کروانے والی تھی۔ بڑی مشکل سے دن کا تیسرا پہر ہوا۔ پھر شام کا اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرا ذرا گہرا ہوا تو تالا کھلنے کی آواز آئی۔ سیندھیا میرے لیے بھوجن لے کر آ گئی تھی۔ آج وہ پیتل کا نیال دیا لائی تھی جو روشن تھا۔ اس نے نیا دیا طاق میں رکھ کر پرانا دیا اٹھا لیا جس کی لو تیل کم ہو جانے کی وجہ سے مدھم ہو رہی تھی۔ میں پر امید نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ معمول کے مطابق اس نے باہر سپیرے فوجیوں کو سنانے کی خاطر مجھے بلند آواز میں برا بھلا کہا۔ اپنے شیطانی مہا دیو کی تعریف کی اور سرگوشی میں کہنے لگی۔

"تمہیں آج آدھی رات کے بعد یہاں سے فرار ہو جانا ہے۔ میں نے تمہاری بیوی کو تیار کر لیا ہے۔ میں اسے لے کر اپنی کٹیا میں موجود ہوں گی لیکن اس کوٹھڑی سے نکلنے کا کوئی طریقہ تمہیں خود سوچنا ہو گا۔ باہر دو سپیرے پہرہ دے رہے ہیں۔ ان کے پاس سٹین گنیں بھی ہیں۔ میں انہیں یہاں سے نہیں ہٹا سکتی۔ یہ کام تمہیں خود کرنا ہو گا۔"

میں ایک بار تو پریشان ہو گیا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی دو فوجی سپیرے ہر وقت باہر پہرے پر موجود ہوتے تھے۔ وہ انہیں نہ تو ہلاک کر سکتی تھی اور نہ کسی طریقے سے انہیں وہاں سے ادھر ادھر کر سکتی تھی۔ اس طرح سے اس پر بعد میں شک کیا جا سکتا تھا۔ اس نے مجھے ایک ایسا کام سونپ دیا تھا جو اس وقت مجھے بہت مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ مگر میری کمانڈو

ٹریننگ وہاں بھی میرے کام آئی۔ میں نے ایک طریقہ سوچ لیا۔ میں نے سیندھیا سے کہا۔

"میرے پاس ایک ترکیب ہے لیکن ہو سکتا ہے وہ کامیاب نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو تم کیا کرو گی؟"

وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"پھر یہی ہو گا کہ تم اپنی بیوی کو حاصل کیے بغیر ہی موت کے منہ میں جھونک دیے جاؤ گے۔ یہ اچھی طرح سے سمجھ لو کہ یہ تمہاری زندگی کا آخری موقع ہے۔ تمہیں ہر حالت میں آج آدھی رات کے بعد اس کوٹھڑی سے نکلنا ہو گا۔"

میں کھانا بھی کھا رہا تھا اور میرا ذہن تیزی سے کام بھی کر رہا تھا۔ میرے پاس صرف ایک ہی طریقہ تھا' میں اسی کو آزما سکتا تھا۔ مجھے ننانوے فیصد یقین تھا کہ میری ترکیب کامیاب رہے گی۔ میں نے سیندھیا کو بڑے اعتماد سے کہا۔

"میں آدھی رات کے بعد تمہاری کٹیا میں ضرور پہنچوں گا۔ اگر نہ پہنچ سکا تو سمجھ لینا کہ میں زندہ نہیں ہوں پھر تم اگر کر سکو تو صرف اتنا کر دینا کہ میری جمیلہ کو یہاں سے نکال کر دلی میرے دوست کے گھر پہنچا دینا۔"

میں نے سیندھیا کو اپنے دوست اور محسن مشتاق صاحب کا نام پتہ بتا دیا۔ وہ بولی۔

"یہ کام میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر تم آج رات میری کٹیا میں نہ پہنچے اور زندہ بھی رہ گئے تو یہ لوگ تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے اور سمجھ لینا کہ تمہاری بیوی مہادیو کے آشرم میں ہی بوڑھی ہو کر مرے گی۔ اب میں جاتی ہوں۔ آدھی رات ہونے میں تین گھنٹے باقی ہیں۔ میں تین گھنٹوں کے بعد جس طرح بھی ہو سکا تمہاری بیوی کو لے کر اپنی کٹیا میں پہنچ جاؤں گی۔ اگر تم نہ آئے تو میں تمہاری بیوی کو لے کر واپس آشرم میں آ جاؤں گی۔"

اس کے بعد وہ طشت اٹھا کر چلی گئی۔

میرے پاس تین گھنٹے تھے۔ بلکہ میرے حساب سے دو گھنٹے ہی تھے۔ اس عرصے میں مجھے صرف ایک کمانڈو ایکشن کرنا تھا۔ یہ کمانڈو ایکشن مجھے اور میری بیوی کو نئی زندگی بھی

عطا کر سکتا تھا اور یہی کمانڈو ایکشن میری زندگی کا آخری ایکشن بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اس قسم کا ایکشن اپنی کمانڈو سروس میں کئی بار کر چکا تھا۔ کبھی اس میں کامیاب رہا تھا اور کبھی کامیاب نہیں ہوا تھا لیکن یہاں میرے پاس کوئی چوائس نہیں تھی۔ مجھے اپنے ایکشن میں ہر حالت میں کامیاب ہونا تھا۔ ناکامی کی صورت میں میری موت تھی اور میری بیوی جمیلہ کی زندگی کی بربادی اور تباہی تھی۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ کمانڈو چاقو بھی نہیں تھا۔ اس کی مجھے زیادہ پرواہ نہیں تھی کیونکہ کمانڈو نہتا بھی ہو تو دشمن کو قابو کرنا جانتا ہے لیکن یہاں ٹارگٹ میرے سامنے نہیں تھا۔ مجھے ٹارگٹ کو کوٹھڑی کے اندر مہیا کرنا تھا۔ آگے چل کر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں کس قسم کا کمانڈو ایکشن کرنے والا تھا۔ یہ کوئی پر اسرار یا انوکھا ایکشن نہیں تھا۔ لیکن اس کا کامیاب ہونا لازمی تھا۔ دوسری صورت میں میری موت اور میری بیوی کی تباہی تھی۔

میں دروازے کے پاس آ گیا۔ کان لگا کر باہر کی آواز سننے کی کوشش کی۔ باہر کوئی آواز نہیں تھی۔ خاموشی ہی خاموشی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ باہر دو سپیرے فوجی سٹین گنیں لیے پھر رہے ہیں۔ خدا جانے وہ خاموش کیوں تھے۔ اچانک مجھے دروازے کی درز میں سے چرس کی بو آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ دونوں سپیرے چرس پی رہے تھے۔ اس لیے ان پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ شراب پی کر آدمی بہت زیادہ باتیں کرتا ہے مگر چرس پی کر آدمی چپ ہو جاتا ہے۔ بات کرنے کو اس کا جی نہیں چاہتا۔ مجھے اطمینان سا ہوا۔ چرس کے نشے کی حالت میں میں ان دونوں کو آسانی سے قابو کر سکتا تھا۔ شرط صرف یہ تھی کہ وہ اندر آ جائیں۔ میں کوٹھڑی میں ٹہل کر وقت گزارنے لگا۔ کچھ دیر تک تو مجھے وقت کا احساس رہا۔ پھر میں بھول گیا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ ایک اندازہ سا تھا اسی کے حساب سے جب مجھے احساس ہوا کہ آدھی رات ہونے والی ہے تو میں نے بسم اللہ پڑھ کر اللہ میاں سے کامیابی کی دعا مانگی اور کوٹھڑی کے بند دروازے کے پاس جا کر اس طرح اونچی آواز میں چیخنے لگا جیسے میں شدید تکلیف میں ہوں۔ میں ساتھ ساتھ زور سے دروازے پر ہاتھ بھی مار رہا تھا اور وقفے وقفے سے بلند آواز میں کہتا جاتا تھا۔

”بھگوان کے لیے میری مدد کرو۔ میرا پیٹ درد سے پھٹا جاتا ہے۔ کسی وید کو بلاؤ۔ میں مرجاؤں گا۔ مجھے بچالو۔ مجھے بچالو۔ ہے بھگوان----‘ ہے بھگوان-----“

میں نے اس قدر اودھم مچایا۔ اتنی چیخ و پکار کی کہ مجھے باہر والے لوہے کے جنگلے کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ یہ میری پہلی کامیابی تھی۔ میں اسی طرح درد سے تڑپنے اور شور مچانے کی اداکاری کر رہا تھا۔ دوسرے دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی تو میں درد سے بلبلانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اپنی خاص پوزیشن میں ہوگیا۔ سپیرا فوجی مجھے گالیاں دیتا کوٹھڑی میں آگیا۔ وہ اکیلا تھا۔ دوسرا فوجی باہر ہی تھا۔ لکڑی کا دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ میں دیوار کی آڑ لے کر بالکل اٹیک کی پوزیشن میں کھڑا تھا اور ہائے ہائے بھی کر رہا تھا جیسے ہی سپیرا فوجی اندر داخل ہوا میں نے اٹیک کر دیا۔ یہ کوئی تربیت یافتہ فوجی تو تھے نہیں' سپیرے تھے۔ نوجوان ضرور تھے۔ فوجی وردی بھی انہوں نے پہن رکھی تھی مگر صرف سٹین گن اور رائفلیں چلانا ہی جانتے تھے۔ میرے لیے یہ بڑا آسان شکار تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ درد سے بلبلانے کی آوازیں نکالتے ہوئے پلک جھپکنے میں اپنا بازو اس کی گردن میں آگے کی طرف سے ڈال کر گردن کو پوری طاقت سے ایک جھٹکا دیا۔ مجھے ہڈی کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور سپیرے فوجی کا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے ہائے ہائے کرتے ہوئے اس کے مردہ جسم کو گھسیٹ کر دیوار کی طرف کر دیا اور مزید زور زور سے آواز نکالنے لگا۔ باہر جو سپیرا فوجی کھڑا تھا اس نے اپنے ساتھی کو چلا کر کہا کہ اس دھشٹ کو گولی مار دو۔ تم اندر کیا کر رہے ہو؟ جب اسے اپنے ساتھی کی کوئی آواز نہ آئی تو وہ دوڑ کر اندر آگیا۔ اس نے سٹین گن سیدھی کی ہوئی تھی۔ میں محتاط ہوگیا۔

جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا میں نے اسے دبوچ کر سب سے پہلے ہاتھ مار کر اس کی سٹین گن نیچے گرا دی۔ وہ مجھ سے گتھم گتھا ہوگیا۔ مگر وہ مجھ سے ویسے بھی کمزور اور دبلا تھا۔ ایک کمانڈو کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے چیخ مار کر شاید باہر سے کسی کو بلایا۔ میں نے اسی وقت اس کی گردن میں بازو ڈال کر تین چار زبردست جھٹکے دیے۔ یہ خاص زاویے کے جھٹکے تھے جو صرف ایک کمانڈو ہی دے سکتا تھا۔ دوسرا دبلا پتلا سپیرا فوجی بھی اگلے

جہان میں پہنچ گیا۔ میں نے ان میں سے ایک کی سٹین گن اٹھالی اور دبے پاؤں دروازے کے پاس آکر گردن باہر نکال کر دیکھا۔ دوسرے سپیرے نے کسی کو آواز دی تھی۔ خطرہ تھا کہ باہر کوئی تیسرا سپیرا موجود نہ ہو لیکن باہر کوئی نہیں تھا۔

سٹین گن کو میں نے اپنے ہاتھ میں ہی رکھا اور کوٹھڑی کے بڑے چبوترے سے دوسری طرف چھلانگ لگا کر درختوں میں گھس گیا۔ رات کی تاریکی میں مجھے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن مجھے سیندھیا کی کٹیا تک کے راستے کا اندازہ تھا۔ میں جھاڑیوں کو پھلانگتا جتنی تیز چل سکتا تھا چل رہا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ سامنے آشرم کی عمارتوں کا سب سے کشادہ پلاٹ تھا۔ جو رات کی تاریکی میں ویران پڑا تھا۔ یہاں سے سیندھیا کی کٹیا زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے دوڑ کر ویران صحن کو پار کیا اور ایک چھوٹے ٹیلے کے پیچھے سے گزر کر اس مقام پر آگیا جہاں چبوترے پر سیندھیا کی کوٹھری نظر آگئی۔

میں جلدی جلدی چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ کر کٹیا کے اندر چلا گیا۔ کٹیا میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سیندھیا میری بیوی کو لے کر ابھی نہیں پہنچی تھی۔ میں سٹین گن لیے کٹیا کے باہر ایک طرف اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ گیا اور سیندھیا اور اپنی بیوی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ جیسے جیسے رات گزر رہی تھی میری بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں بار بار آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ جہاں سات ستاروں کی ٹولی یعنی کھیتیاں ابھی آسمان کے وسط میں ہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی آدھی رات ہی ہوئی تھی۔ میرے جسم سے نکلنے والی جڑی بوٹیوں کی خاص بو کی وجہ سے ایک بھی مچھر میرے قریب نہیں آ رہا تھا۔ مجھے سانپوں کا بھی ڈر نہیں تھا۔ صرف بن مانس اور کسی طرف سے اچانک نکل آنے والے اژدہا کا ہی ڈر تھا۔ میں دائیں بائیں اندھیرے میں دیکھ لیتا تھا۔ یہ وقت گزارنا میرے لیے قیامت بن گیا تھا۔ میری آنکھیں اس طرف درختوں کی تاریکی میں دیکھتے دیکھتے تھک گئی تھیں جدھر سے میرا خیال تھا کہ سیندھیا میری بیوی کو لے کر آنے والی تھی۔

رات گزرتی گئی۔

آسمان پر سات ستاروں کا جھومر آہستہ آہستہ مغربی افق کی جانب جھکتا چلا گیا۔ میری بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب آسمان پر پچھلے پہر کا نور جھلکنے لگا تو میں مایوس ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ضرور کوئی مشکل پڑ گئی ہوگی سیندھیا کو۔ میں نے سوچا۔ ورنہ وہ جمیلہ کو لے کر اب تک پہنچ گئی ہوتی۔ میں تھوڑی دیر کٹیا میں آکر بیٹھا رہا۔ پھر بے چین ہو کر باہر آکر چبوترے پر ٹہلنے لگا۔ صبح کا اجالا نمودار ہونا شروع ہوگیا۔ مہادیو کے آشرم کی عمارتوں کے کھنڈر گھنے درختوں کے پیچھے پچھلے پہر کے دھندلکوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مجھے صرف سامنے والی عمارتوں کے کھنڈر کچھ فاصلے پر نظر آرہے تھے۔ جیسے جیسے صبح کی سپیدی پھیل رہی تھی میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ صبح ہوتے ہی ان لوگوں کو میرے فرار اور مزید دو سپیروں کے قتل کا علم ہو جانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مہادیو کے سپیروں کے فوجی دستے مجھے ہلاک کرنے کے لیے نکلنے والے تھے۔ میرے لیے اس علاقے میں زیادہ دیر رکنا کسی صورت میں بھی مناسب نہیں تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہاں سے نکلنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں جمیلہ کو ہر حالت میں ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا اور وہاں ٹھہر بھی نہیں سکتا تھا۔ جب دن کی روشنی ذرا زیادہ ہوئی تو اچانک شیطان مہادیو کے آشرم کی طرف سے فائرنگ کے دھماکے ہوئے۔ یہ سٹین گنوں کے برسٹ تھے جو ایک ساتھ فائر ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی آدمیوں کے ایک دوسرے کو آوازیں دینے اور ہر ہر مہادیو کے نعرے گونجنے لگے۔

مہادیو کو میرے فرار اور اپنے دو آدمیوں کی ہلاکت کا پتہ چل گیا تھا اور اس کی فوج کے آدمی میری تلاش میں نکل پڑے تھے۔ میں نے چبوترے پر سے چھلانگ لگائی اور مشرق کی طرف خونی جنگل کے درختوں کی طرف دوڑنے لگا۔ میں دوڑتے دوڑتے پلٹ کر پیچھے بھی دیکھ لیتا تھا۔ خدا جانے ان لوگوں کو کیسے پتہ چل گیا کہ میں اس طرف ہوں کیونکہ ہر ہر مہادیو کے نعروں اور کسی کسی وقت سٹین گن کی فائرنگ کی آوازیں میرے قریب آتی جا رہی تھیں۔ میدان سے نکل کر میں گھنے خونی جنگل میں داخل ہوا ہی تھا کہ

اچانک چیختا چلاتا سینہ پیٹتا ایک بن مانس میرے سامنے آگیا اور دانت نکال کر اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے سٹین گن سیدھی کی اور یکے بعد دیگرے دو برسٹ فائر کر کے اسے چھلنی کر دیا۔ بن مانس خوفناک آوازیں نکالتا نیچے گر پڑا۔ میں فائر کے دھماکے نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن بن مانس سے جان بچانے کے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا۔ فائرنگ کے دھماکوں نے میری نشان دہی کر دی تھی۔ اس کے بعد مہا دیو کے آدمیوں کے نعروں کی آوازیں زیادہ جوش سے بلند ہونے لگیں۔ یہاں جنگل جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں بہت گھنا شروع ہوگیا تھا۔ درخت بالکل ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ان پر جھاڑیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ ان میں آدم خور جھاڑیاں اور درخت بھی تھے لیکن میرے جسم کی بو کی وجہ سے یہ خونی جھاڑیاں جہاں جہاں میرے راستے میں آتی تھیں فوراً" سمٹ جاتی تھیں یا درخت اپنی خونی شاخوں کو اوپر کھینچ لیتے تھے۔

میرے پیچھے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔

پھر گولیاں میرے سر کے اوپر سے اور دائیں بائیں درختوں کی شاخوں کو کاٹتی ہوئی سیٹیاں بجاتی گزرنے لگیں۔ وہاں درختوں کے تنے اتنے قریب قریب کھڑے تھے کہ مجھے کوئی گولی نہیں لگ رہی تھی۔ میں درختوں کے تنوں کے بیچ میں سے تیزی سے گزر رہا تھا۔ یہاں میں دوڑ نہیں سکتا تھا۔ دوڑنے کی جگہ ہی نہیں تھی۔ دن کی روشنی درختوں کے اوپر سے جھانک رہی تھی۔ درختوں کے درمیان ہلکا اندھیرا تھا۔ میں بن مانس کی طرح اچھلتا اور چھلانگیں لگاتا چلا جا رہا تھا۔ میں پانی کے کنڈ کے قریب سے بھی گزر گیا۔ یہ وہ کنڈ تھا جہاں پچھلی رات سحر کے وقت جوگن مایا دیوی نے ضرور میرا انتظار کیا ہو گا۔ وہ یقیناً" خونی جنگل اور شیطان مہا دیو کی آلوپ نگری کی حدود سے نکل کر اپنے چوکھمبا گاؤں والی کٹیا میں پہنچ چکی ہوگی۔ مجھے اسی کے پاس جانا تھا۔ اگر میں اپنے پیچھے لگی ہوئی سپیروں کی فوج کی اندھا دھند فائرنگ سے بچ گیا تو۔ یہ لوگ جنگل میں چاروں طرف سٹین گن کے برسٹ بارش کی طرح فائر کر رہے تھے۔ کئی سانپ مجھے دیکھ کر پھنکاریں مارتے بھاگتے نظر آئے۔ میں مگرمچھوں کے تالاب پر آگیا۔ تالاب کے کنارے چھ سات مگرمچھ لیٹے

ہوئے تھے۔ میری بو پا کر وہ ہڑبڑا کر تالاب میں چھلانگیں لگا گئے۔

جنگل اب زیادہ گھنا نہیں رہا تھا۔ میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ یہاں آکر میں نے بھی پلٹ کر دو تین بار سٹین گن کے برسٹ فائر کیے۔ مگر ان کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہاں مجھے کوئی دشمن کا آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ایک دلدل میں گرتے گرتے بچا۔ اگر مجھے جوگن مایا دیوی نے دلدلوں کی شناخت نہ کرا دی ہوتی تو میں دلدل میں گر چکا تھا اور دلدل نے مجھے فوراً نگل لینا تھا۔ آخر مجھے دور درختوں کے تنوں میں سے دن کی روشنی دکھائی دینے لگی۔ یہ آلوپ نگر کے خونی جنگل کی سرحد کے آخری درخت تھی۔ یہ مہادیو کی شیطانی سلطنت کی سرحد تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ مہادیو کے فوجی سپیرے اس سرحد سے آگے نہیں آئیں گے۔ میں نے دوڑنے کی رفتار تیز کر دی۔ میرے پیچھے فائرنگ کے دھماکے بھی شدت اختیار کر گئے تھے۔ خدا جانے ان لوگوں کے پاس اس ویران جگہ پر اتنا اسلحہ کہاں سے آگیا تھا۔ وہ بے دریغ سٹین گن کا اسلحہ پھونک رہے تھے۔

"اپنی فوجی تربیت کی وجہ سے مجھے معلوم تھا کہ دشمن کی فائرنگ سے کس طرح اپنے آپ کو بچایا جاتا ہے۔ میں بالکل سیدھ میں نہیں دوڑ رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے کبھی دائیں ہو جاتا کبھی بائیں ہو جاتا اور کبھی جھک جاتا۔ میں ہر تیسرے قدم پر کسی نہ کسی درخت کی اوٹ لے کر چند گز بالکل درخت کی سیدھ میں دوڑتا چلا جاتا تھا۔ جب احساس ہوتا کہ درخت مجھے کور نہیں دے رہا تو پھر فوراً جھک کر کسی دوسرے درخت کی طرف دوڑنا شروع کر دیتا۔ اسی طرح دوڑتے دوڑتے میں ان درختوں کے درمیان سے نکل گیا جو مہادیو کی سلطنت آلوپ نگر کی سرحد کے آخری درخت تھے۔ میرے سامنے اب گھاس کا کھلا میدان تھا۔ جہاں دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور روشنی ہی روشنی تھی۔ اس میدان میں آتے ہی میں نے اپنی رفتار مزید تیز کر دی۔ میرے پیچھے جو فائرنگ ہو رہی تھی۔ اب وہ مجھ سے کافی دور رہ گئی تھی۔ ایک جگہ گھاس کافی اونچی تھی۔ میں اس میں گھس گیا۔ جب گھاس کے اندر ہی اندر تیز تیز چلتے ہوئے وہاں سے باہر نکلا تو میرے سامنے ہرے ہرے کھیت ہی کھیت تھے۔ میں چوکھمبا گاؤں کے گرد و نواح کے کھیتوں میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے

رک کر پیچھے خونی جنگل کے درختوں کو دیکھا۔ فائرنگ کے دھماکے بالکل سنائی نہیں دے رہے تھے۔ مہا دیو کے سپیروں کو معلوم ہوگیا تھا کہ میں فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہوں اور ان کی سرحد سے نکل چکا ہوں۔ یہاں وہ اس لیے بھی میرے پیچھے آکر فائر نہیں کھول سکتے تھے کہ جہاں میں تھا وہاں بھارتی پولیس کی عمل داری تھی اور یہاں آکر فائرنگ کرنے سے پولیس خبردار ہو کر ان کے تعاقب میں آلوپ نگر تک پہنچ سکتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے بقول جوگن مایا دیوی انہیں مہا دیو کا حکم تھا کہ خونی جنگل کی سرحد کے پار چوکھمبا گاؤں کی طرف ہرگز فائر نہیں کرنا۔ میں نے گاؤں کے مکانوں کو غور سے دیکھا۔

ایک دو کھیتوں میں کسان ہل چلا رہے تھے۔ مجھے جوگن مایا دیوی کی کٹیا کی تلاش تھی۔ مجھے پورا اندازہ نہیں تھا کہ میں خونی جنگل کے کس جانب سے باہر نکلا ہوں۔ میں ایک کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ گیا۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ میں سانس درست کرتے ہوئے گاؤں کے مکانوں کا جائزہ لینے لگا۔ گاؤں کا یہ وہ پہلو نہیں تھا جدھر سے میں جھانسی سے روانہ ہونے کے بعد آیا تھا۔ جب میرا سانس معمول کے مطابق ہوگیا تو میں اٹھا اور کھیتوں میں سے ہو کر گاؤں کی دوسری جانب چلنے لگا۔ دوسری جانب سے ہو کر میں نے گاؤں کا چکر پورا کیا تو میں نے سامنے پھیلے ہوئے سوکھی جھاڑیوں والے میدان کو پہچان لیا۔ اسی میدان میں سے گزر کر میں پہلی بار جوگن مایا دیوی کی کٹیا میں آیا تھا جو ایک مڑھی میں واقع تھی اور جس طرف گاؤں کے لوگ ڈر کے مارے نہیں آتے تھے اور کھیتی باڑی بھی نہیں کرتے تھے۔ اسی وجہ سے یہ میدان ویران پڑا تھا۔

دور سے مجھے وہ چبوترا نظر پڑا جس پر جوگن کی کٹیا تھی۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ یہ آسیبی مڑھی تھی اور اس کے بارے میں بڑی ڈراؤنی کہانیاں مشہور تھیں۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ کٹیا کے باہر چبوترہ ویران پڑا تھا۔ باہر جو چولہا بنا ہوا تھا وہ بھی ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ کٹیا بھی خالی تھی۔ مٹی کی مٹکی کٹیا کے باہر اسی طرح رکھی ہوئی تھی۔ کٹیا بانس کی تھی جس کے باہر بانس کے ساتھ بجھی ہوئی لالٹین لٹکی تھی۔ جوگن کا بستر ویسے ہی لگا ہوا تھا۔ ہرن کی چھال بھی بچھی ہوئی تھی۔ پیتل کی دو کٹوریاں رکھی تھیں۔ مگر جوگن مایا دیوی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے اس کی مدد کی اشد ضرورت تھی۔ میں اپنی بیوی کو خونی جنگل

والی آلوپ نگر کی شیطانی بستی میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے اپنی بیوی کو واپس لانے کے لیے مہا دیو کے شیطانی آشرم پر ایک بار پھر حملہ کرنا تھا اور یہ کام میں جوگن مایا دیوی کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔ میں کٹیا کے بانس کے دروازے کے پاس بیٹھ گیا۔ مٹکی میں سے پانی نکال کر پیا اور جوگن کا انتظار کرنے لگا۔ میرے جسم پر جوگیوں والی صرف ایک ہی دھوتی تھی جس کا ایک پلو میں نے اپنے جسم کے اوپر ڈال رکھا تھا۔ سارا رستہ کھیتوں میں سے گزرتے وقت میں نے سٹین گن کو دھوتی کے پلو میں چھپائے رکھا تھا۔

میں نے سٹین گن کے میگزین کو چیک کیا۔ اس میں صرف ایک راؤنڈ ہی باقی رہا گیا تھا۔ یہ مہا دیو کے آشرم پر دوسری بار شب خون مارتے وقت میرے کام آ سکتا تھا۔ مگر ایک راؤنڈ ناکافی تھا۔ میں جان چکا تھا کہ مہا دیو کے آشرم کے سپیروں کی فوج کے پاس کافی اسلحہ موجود ہے۔ اب میں وہاں ہر قسم کے اسلحے سے لیس ہو کر جانا چاہتا تھا۔ لیکن ہر قسم کا اسلحہ مجھے وہاں کون لا کر دے سکتا تھا۔ جوگن مایا دیوی یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ بہرحال ایک بات طے شدہ تھی کہ مجھے دوبارہ خونی جنگل میں داخل ہو کر مہا دیو کے شیطانی آشرم پر بھرپور کمانڈو اٹیک کرنا ہے اور وہاں سے اپنی بیوی کو نکال کر لانا ہے اور ان لوگوں سے اپنی بیوی کی بے عزتی کا انتقام بھی لینا ہے۔ میرے انتقام کی فہرست میں دهشٹ سپیرا جو میری بیوی کو دلی والے کوارٹر سے اغوا کر کے لے گیا تھا اور شیطان صفت مہا دیو سر فہرست تھے۔ مجھے صرف ایک بات کا خدشہ تھا کہ اس دوران کہیں وہ لوگ میری بیوی پر دوبارہ منتر پھونک کر اس کی یاد داشت گم نہ کر دیں۔

مجھے بھوک لگ رہی تھی جوگن مایا دیوی کا انتظار کرتے کرتے کافی دن نکل آیا تھا۔ میں نے اپنی سٹین گن کٹیا کے اندر کونے میں چھپا دی۔ ایک مٹی کے مٹکے میں سے مجھے چاولوں اور دال کی پوٹلیاں مل گئیں۔ میں نے باہر آ کر چولہے میں ادھر ادھر سے درختوں کی شاخیں اکٹھی کر کے آگ جلائی۔ چاولوں اور دال کو دھو کر پتیلی میں ڈال کر اسے چولہے پر چڑھا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھیکی کھچڑی تیار ہو گئی۔ نمک مجھے وہاں کہیں نہیں ملا تھا۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھچڑی کھائی اور کٹیا کے اندر جا کر جوگن کے بستر پر لیٹ گیا۔ ساری رات کا جاگا تھا اور دوڑ دوڑ کر تھک چکا تھا۔ ایسی گہری نیند سویا کہ جب آنکھ کھلی تو

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ کٹیا سے باہر آکر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ دور چوکھبا گاؤں کے مکانوں میں روشنیاں ٹمٹمانے لگی تھیں۔ خونی جنگل کی طرف نگاہ اٹھائی خونی جنگل کی سرحد کے اونچے اونچے سیاہ درخت شام کے اندھیرے میں تارکول کے ستونوں کی طرح سیاہ اور ڈراؤنے لگ رہے تھے۔ اپنی بیوی جمیلہ کا خیال کر کے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر غصے میں دانت پیستے ہوئے میں کٹیا کے باہر چولہے کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی سی کھچڑی پتیلی میں سے نکال کر کھائی پانی پیا اور وہیں کھلی ہوا میں بیٹھ کر جوگن کا انتظار کرنے لگا۔ خدا جانے وہ کہاں غائب ہوگئی تھی۔

کسی وقت خیال آتا کہ شاید وہ ابھی تک خونی جنگل میں ہی میرا انتظار کر رہی ہو۔ کسی وقت خیال آتا کہ کہیں اسے مہادیو کے فوجی سپیروں نے نہ پکڑ لیا ہو۔ میں نے کٹیا کے باہر لٹکی ہوئی لالٹین کو بھی نہیں جلایا تھا۔ میں گاؤں میں بھی جوگن کو دیکھنے نہیں گیا تھا۔ میں اس خطرے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا کہ بھارت کی پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس میری تلاش میں ہے۔ اگر میں ان کے ہتھے چڑھ گیا تو میری بیوی کی تلاش کا سارا معاملہ بیچ میں ہی رہ جائے گا اور کوئی پتہ نہیں انڈین ملٹری یا سول پولیس والے مجھے یہاں سے اٹھا کر کسی شہر کی طرف لے جاتے ہیں اور میرا کیا حشر کرتے ہیں۔ بھارتی پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس کو یقین تھا کہ میں پاکستانی فوج کا مفرور جنگی قیدی ہوں اور وہ ہر حالت میں مجھے پکڑنا چاہتے تھے۔ مچھر میرے جسم کی بو کی وجہ سے مجھے کٹیا کے اندر یا باہر بالکل تنگ نہیں کرتے تھے۔ رات بھیگتی چلی گئی گہری ہوتی چلی گئی۔ چارن طرف موت ایسی خاموشی چھا گئی۔ گاؤں کی طرف سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ ویسے بھی گاؤں جوگن کی کٹیا سے کافی دور تھا۔ شاید کتے بھی آسیبی مڑھی سے ڈر کر اس طرف کا رخ نہیں کرتے تھے۔ جوگن نے مجھے وہاں ایک مڑھی دکھائی تھی جو اس کی کٹیا سے چند قدم کے فاصلے پر ایک لمبے چبوترے کی شکل میں تھی۔ اس کے درمیان اینٹوں کا ایک پرانا طاق سا بنا ہوا تھا۔ جوگن نے کہا تھا کہ لوگ کہتے ہیں یہاں آدھی رات کو کبھی کبھی گناہ گار عورتوں کی عذاب میں مبتلا بد روحیں آتی ہیں۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔

جب کٹیا کے باہر بیٹھے بیٹھے تھک گیا اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ جوگن مایا دیوی

رات کو نہیں آئے گی۔ اگر اسے آنا ہوتا تو دن کی روشنی میں آجاتی۔ ممکن تھا کہ وہ خونی جنگل میں ہی کسی جگہ چھپ کر میرے انتظار میں ہو یا میرا کھوج لگانے کے لیے اپنی سہیلی سیندھیا سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر کٹیا کے اندر آگیا۔ چونکہ مجھے مچھروں اور دوسرے حشرات الارض کی کوئی فکر نہیں تھی' اس لیے میں اندھیرے میں ہی جوگن مایا دیوی کے بستر پر جھونپڑی کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور جمیلہ کے بارے میں سوچنے لگا کہ نہ جانے وہ کس حالت میں ہوگی۔ اب تو اس کی یاد داشت بھی واپس آگئی تھی۔ اسے احساس ہوگیا ہے کہ وہ میری بیوی ہے اور اسے سپیرا اغوا کر کے لے گیا تھا۔ اسی سوچ نے جمیلہ کی ذہنی اذیت میں اضافہ کر دیا ہوگا۔ جب تک اس کی یاد داشت منتروں کے اثر کی وجہ سے غائب تھی وہ شاید اطمینان کی حالت میں تھی اور اپنے آپ کو آشرم کی ایک نرتکی ہی سمجھ رہی تھی لیکن اب یہ سوچ کر اس پر قیامت گزر رہی ہوگی کہ وہ ان عورتوں میں سے نہیں ہے اور اسے اغوا کر کے وہاں لایا گیا ہے اور یہ بھی کہ اس کا خاوند یعنی میں اس کی تلاش میں وہاں تک پہنچ چکا ہوں۔ وہ میرے بارے میں بھی شدید پریشان ہوگی۔ سیندھیا نے اسے بتا دیا تھا کہ میں اس کو وہاں سے نکالنے پہنچ گیا ہوں اور مجھے پکڑ لیا گیا ہے اور اماوس کی رات کو مجھے موت کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اگرچہ انہیں بھی میرے فرار کا علم ہوگیا ہوگا لیکن جمیلہ اس لیے بھی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہوگی کہ میں فرار ہو کر کہاں گیا ہوں۔ سپیرے فوجی میرے پیچھے لگے ہیں۔ کہیں انہوں نے مجھے مار نہ ڈالا ہو۔ یہ بات مجھے بھی پریشان کر رہی تھی کہ آخر کل رات کو سیندھیا میری بیوی کو لے کر اپنی کٹیا میں کیوں نہیں پہنچی تھی۔

یہی کچھ سوچتے سوچتے مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ کٹیا میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر کٹیا کے باہر والی لالٹین روشن نہیں کی تھی۔ سٹین گن میں نے کونے سے اٹھا کر اپنے پاس ہی رکھ لی تھی۔ اس خیال سے کہ اگر شیطانی مہادیو کے آشرم کا کوئی سپیرا فوجی رات کو جاسوسی کرتا میری تلاش میں وہاں نکل آیا تو میں اس کو ٹھکانے لگا سکوں گا۔ میں اونگھنے لگا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میں گہری نیند میں کھو چکا تھا۔ ایک عجیب سا خواب دیکھنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر میری بیوی جمیلہ میری طرف

دونوں بانہیں پھیلا کر کھڑی ہے' چاند نکلا ہوا ہے۔ میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں۔ جمیلہ میری طرف سے منہ موڑ کر دوسری طرف دیکھتی ہے اور پھر ایک دم پہاڑ کی چوٹی سے دوسری طرف کود جاتی ہے۔ میں چیخ مار کر اس کے پیچھے کود جاتا ہوں۔ میں روئی کے گالے کی طرح نیچے گرتا جا رہا ہوں۔ مجھے کوئی خبر نہیں کہ جمیلہ کہاں گری ہے۔ اچانک میں ایک بہت بڑے اژدہا کے منہ پر گرتا ہوں۔ اژدہا کے منہ سے خوفناک پھنکار کے ساتھ آگ کے شعلے نکل کر میرے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ میں چیخیں مارنے لگتا ہوں۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اپنی چیخوں کی آواز سنی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور آیت الکرسی پڑھنے لگا۔ اس سے میرے دل کو سکون مل گیا۔ بڑا ڈراؤنا خواب تھا۔ ذرا میرا دل ٹھیک ہوا تو میں دوبارہ لیٹ گیا۔ ابھی مجھے لیٹے پانچ چھ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ مجھے ایک عجیب سی المناک آواز سنائی دی۔ میں نے کان کھڑے کر لیے۔ باہر تاریک رات پر قبرستانوں کی خاموشی طاری تھی۔ آواز میں نے ضرور سنی تھی۔ میں نے کان لگائے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہی آواز پھر آئی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی جو بڑے ڈراؤنے اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز میں جیسے بین کر رہی تھی۔ میں نے سٹین گن اٹھا لی۔ آواز آنی بند ہو گئی۔ میں دبے پاؤں سٹین گن لیے کٹیا سے باہر آ گیا۔ باہر اندھیرا' تاریکی' سناٹے اور دہشت کا ماحول تھا۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اچانک میری دائیں جانب سے وہی ڈراؤنی آواز دوبارہ سنائی دی۔ میں اس طرف جھک کر چلتا ہوا بڑھا۔ دوسری طرف آسیبی مڑھی تھی۔ وہاں میں نے جو ہیبت ناک ڈراؤنا منظر دیکھا اسے میں ساری زندگی نہیں بھول سکوں گا۔





لکشمن پور کی ناگن درگا

اے۔ حمید



آسیبی مڑھی کے طاق میں دیا جل رہا تھا۔

دِیے کی دھندلی روشنی میں ایک سانپ پھن کھولے بیٹھا تھا۔ سانپ کے آگے ایک عورت سر سے پاؤں تک عریاں حالت میں ہاتھ جوڑے بیٹھی درد ناک آواز میں جیسے بین کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ آگے پیچھے جھول بھی رہی تھی۔ میں وہیں چھپ کر یہ دیکھنے کے لیے بیٹھ گیا کہ یہ عورت کیا کر رہی ہے۔ بین کرتے کرتے عورت رک جاتی۔ اپنے منہ کے آگے کھلے بال ڈال کر سانپ کے پھن کے قریب لے جاتی۔ حلق سے عجیب قسم کی ڈراؤنی آوازیں نکالتی۔ چہرہ پیچھے کرتی' بالوں کو پیچھے جھٹکتی اور ہاتھ جوڑ کر سانپ سے مدھم آواز میں جیسے باتیں کرنے لگتی۔ سانپ نے میرے جسم کی بُو محسوس کر لی تھی اگرچہ وہ مجھ سے فاصلے پر تھا لیکن مجھے محسوس ہُوا کہ اُس نے میرے جسم سے خارج ہونے والی دلی والے سادھو کی جڑی بوٹیوں کی بُو محسوس کر لی ہے۔ وہ کچھ بے چین سا ہو کر پھن کو دائیں بائیں گھمانے لگا تھا۔ پھر اُس نے اپنا پھن سکیڑ لیا۔ عورت نے سانپ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھا لیا اور اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ وہ سانپ اپنے سینے سے لگائے اس طرح بیٹھی آہستہ ہل رہی تھی جیسے بچے کو دودھ پلا رہی ہو۔ وہ کچھ بولے بھی جا رہی تھی جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے اُٹھ کھڑی ہوئی اور طاق میں جلتے دیے کے گرد چکر کاٹنے لگی۔ پہلا چکر کاٹتے ہوئے جب اس کا عریاں بدن دیے کی روشنی میں میرے سامنے آیا تو

میں یہ دیکھ کر دہشت زدہ ہوگیا کہ وہ سانپ کو اپنا دودھ پلا رہی تھی۔ سانپ اس کے سینے سے چمٹا ہُوا تھا۔ مَیں نے دل میں سوچا کہ یہ ہندو دھرم کس قسم کا مذہب ہے کہ جس میں عورتیں اس قسم کی فحش رسومات بھی ادا کرتی ہیں۔ یہ عورت ضرور کوئی چلہ کاٹ رہی تھی۔ اس کی ساڑھی طاق کے قریب ہی پڑی تھی۔ تین چکر لگانے کے بعد عورت کھڑی ہوگئی۔ اس کا رخ میری طرف تھا۔ مَیں اس کے گہرے سانولے عریاں جسم کو صاف دیکھ رہا تھا۔ یہ کوئی جوان عورت تھی۔ اس نے سانپ کے منہ کو بڑی مشکل سے کھینچ کر اپنے سینے سے الگ کیا اور سینے کے دوسرے حصے کے ساتھ چمٹا لیا۔ سانپ نے اس طرف کا دودھ پینا شروع کر دیا۔

عورت دوبارہ چکر لگانے لگی۔ دس گیارہ چکر لگانے کے بعد وہ دیے کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ سانپ اس کے سینے کے ساتھ ہی چمٹا ہُوا تھا۔ وہ جھوم جھوم کر دَرد ناک آواز میں اشلوک پڑھتی جا رہی تھی۔ کسی وقت وہ بین کرنے شروع کر دیتی۔ یہ عورت میرے لیے ایک معمّہ تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہے، کس لیے کر رہی ہے۔ اس دوران سانپ نے خوب دودھ پی لیا۔ جیسے ہی سانپ نے اپنا منہ عورت کے سینے سے الگ کیا اسے میری بُو محسوس ہوئی اور عورت کے ہاتھ سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ بات عورت کے لیے حیران کن تھی۔ وہ سانپ کو اپنے جسم کے ساتھ لپٹانے کی کوشش کر رہی تھی مگر سانپ میرے جسم سے نکلنے والی جڑی بوٹیوں کی بُو کی وجہ سے وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ جیسا کہ آپ پہلے حصے میں پڑھ چکے ہیں اور مَیں آپ کو بیان کر چکا ہوں، دِلی کے پُر اسرار سادھو نے مجھے خونی جنگل کی طرف روانہ ہونے سے پہلے خاص جڑی بوٹیوں کا عرق پانی میں ڈال کر پلا دیا تھا اور کہا تھا کہ اب مجھ پر کوئی سانپ، کوئی مگرمچھ حملہ نہیں کر سکے گا۔ تمام کیڑے مکوڑے اور سانپ بچھو میرے جسم سے نکلنے والی جڑی بوٹیوں کی بُو پا کر مجھ سے بھاگ جائیں گے۔ یہ بُو مجھے اور کسی دوسرے عام انسان کو محسوس نہیں ہوتی تھی مگر سانپ، بچھو اور مگرمچھ اور دوسرے حشرات الارض اسے محسوس کر لیتے تھے اور فوراً بھاگ

جاتے تھے۔

آخر سانپ عورت کے ہاتھ سے نکل کر بھاگ گیا۔

عورت نے حیران ہو کر اپنے اِردگرد دیکھا۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ وہاں کوئی سپیرا آگیا ہے جس کی موجودگی کا سانپ کو احساس ہوگیا ہے اور وہ اس کے ہاتھ سے اپنا آپ چھڑا کر بھاگ گیا ہے۔ میں اینٹوں کی ڈھیری کی اوٹ میں چھپا ہُوا تھا اور اندھیرے میں تھا۔ عورت مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جب اس عورت کو وہاں کوئی انسان بظاہر دکھائی نہ دیا تو اس نے لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ خدا جانے اسے کیسے میری بُو آ گئی۔ وہ اس طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی جس طرف میں اینٹوں کی ڈھیری کے پیچھے چھپا ہُوا تھا۔ اس نے میری طرف چلنا شروع کر دیا۔ مَیں نے سٹین گن کا رخ اُس کی طرف کر لیا کہ کیا معلوم یہ کوئی بَد روح یا چڑیل ہو۔ مَیں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اس نے مجھ پر حملہ کیا تو مَیں اس پر سٹین گن کا فائر کھول دوں گا۔ مَیں وہاں سے بھاگا اس لیے نہیں تھا کہ مَیں خود بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ عورت ساڑھی اتار کر بال کھولے یہاں رات کے وقت سانپ کی پوجا کس وجہ سے کر رہی تھی۔ یہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے؟

ایک خیال میرے ذہن کے تحت الشعور میں یہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے اس کا کچھ تعلق جوگن ملیا دیوی سے ہو۔ عورت میری طرف چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چلی رہی تھی۔ مڑھی کا فاصلہ وہاں سے چند قدم ہی تھا۔ وہ سیدھی اینٹوں کی ڈھیری کے پاس آکر رک گئی۔ رات کی تاریکی اور ستاروں کی دھندلی روشنی میں عریاں حالت میں کھڑی وہ عورت واقعی مجھے کوئی چڑیل لگ رہی تھی۔ مَیں نے سٹین گن کی نالی اس کی طرف کی ہوئی تھی اور میری انگلی ٹریگر پر تھی۔ وہ بڑی بے شرمی سے عریاں جسم کے ساتھ میری طرف چلی آرہی تھی۔ اسے اپنے ننگے جسم کا ذرا سا بھی احساس نہ تھا۔ شاید اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ سیدھی چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ کر میرے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ میری نظر اس کے پاؤں پر پڑی۔ اس کے پاؤں سیدھے تھے۔ وہ چڑیل

نہیں تھی۔ اگر چڑیل ہوتی تو اس کے پیر الٹے ہوتے۔ مَیں اینٹوں کے پیچھے سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ستاروں کی ہلکی نیلی روشنی میں اس کا عریاں گہرا سانولا بلکہ سیاہ جسم کسی وحشی جنگلی عورت کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ بے دھڑک میرے بالکل قریب آ گئی۔ مرد کو سامنے دیکھ کر بھی اس نے کوئی شرم و حیا محسوس نہ کی۔ میری سٹین گن کا رخ ابھی تک اس کی طرف تھا۔

اس کا اور میرا فاصلہ اتنا کم تھا کہ مجھے اس کے سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی آنکھیں تھیں جن میں ایک پُر اسرار طلسمی چمک تھی۔ اس کی آنکھوں کی طلسمی چمک کا اثر مجھے اپنے جسم پر محسوس ہونے لگا تھا۔ مَیں نے اپنے ہوش و حواس برقرار رکھتے ہوئے بڑے رعب سے پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

اس پُر اسرار عورت نے اپنا بازو اوپر اٹھایا اور آہستہ سے اپنا ہاتھ میری گردن پر رکھتے ہوئے خشک سی آواز میں کہا۔

"میں وہی ہوں جس کی تمہیں تلاش ہے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ یہ کوئی نیم دیوانی جنگلی عورت مجھے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور سٹین گن کی نالی اس کے سینے کے قریب لا کر کہا۔

"تم کوئی ناگن ہو یا کوئی بدروح ہو۔ مَیں نے تمہیں سانپ کو اپنا دودھ پلاتے دیکھ لیا ہے۔"

پُر اسرار عورت نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ کھردرا تھا۔ خشک مگر گرم آواز میں بولی۔

"میں ناگن ہوں اور تم ضرور کوئی ناگ ہو۔ تمہارے جسم سے آتی بُو میں سونگھ رہی ہوں۔ تم کوئی بڑے گُن والے نوجوان سپیرے ہو۔ تمہارے جسم کی بو پا کر میرا سانپ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم کون ہو۔ مَیں کون ہوں آؤ۔ میرے ساتھ آؤ۔"

میں نے کہا۔ "تم کہاں رہتی ہو؟"

وہ مجھے بازو سے تھام کر چبوترے سے نیچے اتر کر مڑھی والے چھوٹے چبوترے کی طرف چلنے لگی۔ مَیں اپنی مرضی کے بغیر اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ ایک موہوم سا خیال ضرور تھا کہ شاید یہ جوگن مایا دیوی کے بارے میں مجھے کوئی مفید معلومات دے سکے۔ اس کے جسم سے گنجان پہاڑی جنگلوں میں پائی جانے والی جڑی بوٹیوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں زندگی میں پہلی بار کسی مادر زاد برہنہ عورت کے ساتھ چل رہا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس عورت نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے جسم کو شرم سے نہیں سمیٹا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اسی حالت میں زندگی بسر کرتی آ رہی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"تمہاری ساڑھی وہاں پڑی ہے۔ اسے پہن لو۔"

اس نے ہنس کر کہا۔

"کیا مَیں اس طرح تمہیں اچھی نہیں لگتی؟"

مَیں نے کہا۔

"عورت کو کپڑے پہن کر مرد کے سامنے جانا چاہیے۔"

وہ کہنے لگی۔

"اپنے مرد کے سامنے کپڑے پہننے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن تم کہتے ہو تو میں ساڑھی باندھ لیتی ہوں۔"

وہ طاق میں روشن دیے کے قریب گئی۔ وہاں فرش پر اس کی ساڑھی پڑی تھی۔ نے یونہی ساڑھی اپنے جسم کے گرد لپیٹی اور دیے کو پھونک مار کر بجھا دیا۔ میرے آکر کہنے لگی۔

"تم مجھے دیکھ کر ڈرے نہیں۔ تمہاری یہ بات بتاتی ہے کہ تم انسان نہیں ہو۔ تم اک ہو جس نے انسان کا روپ بدل رکھا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں نہ کوئی ناگ ہوں اور نہ سانپ ہوں۔"

وہ بولی۔

"پھر آدھی رات کے وقت تم آسیبی مڑھی میں کیا کر رہے تھے؟"

مَیں اسے ابھی کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ مَیں پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس عورت کا حدود اَربعہ کیا ہے۔ یہ کون ہے۔ یہاں کس قسم کا چلہ کاٹ رہی تھی۔ مَیں نے کہا۔

"مَیں شکاری ہوں۔ جنگل میں شکار کھیلنے آیا تھا۔ رات ہوگئی اس خالی کٹیا کو دیکھا تو سوچا کہ یہاں رات بسر کر لوں۔ تمہاری ڈراوٴنی آوازیں مجھے تمہاری طرف کھینچ لائیں۔ دیکھا کہ تم سانپ کی پوجا کر رہی تھیں۔ کیا تمہارا تعلق ناگ دیوتا کے قبیلے سے ہے؟"

اس نے گہرا سانس بھرا۔ کہنے لگی۔

"میرے ساتھ تالاب والی جھونپڑی میں چلو' مَیں تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں۔ کیونکہ تم ایک بہادر مرد ہو اور تمہارے جسم سے نکلنے والی بُو سے میرا سانپ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ تم اگر کوئی سپیرے ہو تو عام سپیروں سے مختلف ہو۔"

وہ ایسی اردو زبان نہیں بول رہی تھی جیسی مَیں لکھ رہا ہوں۔ اس کی اپنی ملی جلی ہندوستانی زبان اور لہجہ تھا۔ میں یہاں اس کی باتوں کو اپنی اردو زبان میں بیان کر رہا ہوں۔ میں صرف اس امید پر چل رہا تھا کہ شاید مجھے جوگن مایا دیوی کا کوئی سراغ مل جائے کیونکہ اس وقت صرف جوگن مایا دیوی ہی میری مدد کر سکتی تھی اور مجھے میری بیوی جمیلہ کے بارے میں کچھ بتا سکتی تھی کہ وہ آدھی رات کو سیندھیا کے ساتھ میرے پاس کیوں نہیں آئی تھی۔

تالاب والا جھونپڑا وہاں سے تھوڑی دور درختوں کی تاریکی میں گِھرا ہُوا تھا۔ ایک جانب چھوٹا سا جوہڑ تھا جس پر اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔ جھونپڑے کے پاس جا کر اُس نے مجھے باہر کھڑا رہنے کو کہا اور خود جھونپڑے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پٹاری تھی۔ کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

وہ بولی۔

"مجھ سے ڈرو نہیں۔ میرے ساتھ آنے میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔"

میرے پاس بھری ہوئی سٹین گن تھی۔ ویسے بھی وہ ایک عورت تھی۔ زیادہ سے زیادہ وہ مجھ پر کوئی طلسمی منتر ہی پھونک سکتی تھی اور مجھے اس کے منتر کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس خیال کے ساتھ میں اس کے ساتھ چل پڑا کہ ہو سکتا ہے میری بیوی جمیلہ کا کچھ سراغ مل جائے۔ جھونپڑی کے پیچھے رات کی تاریکی میں ہم درختوں کے نیچے چلے جا رہے تھے۔ آگے ایک چھوٹا ٹیلہ تھا۔ ٹیلے کی ڈھلان پر جھاڑیاں اور چھوٹے چھوٹے درخت اندھیرے میں بھوتوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ وہاں ایک جانب ٹیلے کی دیوار میں ایک قدرتی شگاف سا بنا ہُوا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"اس کے اندر میرا گھر ہے۔ تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔"

ہم شگاف میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک غار تھا جس میں سے ہم گزر رہے تھے۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ غار میں تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ بائیں جانب ایک اور شگاف کے پاس جا کر رک گئی۔ اُس نے کہا۔

"تم یہیں ٹھہرو۔ میں دیا روشن کرتی ہوں۔"

وہاں اس قدر گہرا اندھیرا تھا کہ مجھے اس عورت کی صرف آواز ہی سنائی دے رہی تھی، شکل بالکل نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ پھر ماچس کی تیلی بھڑک اٹھی اور دیا روشن ہو گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ غار کی دیوار میں سے نیچے سیڑھیاں اترتی تھیں۔ یہ تین چار سیڑھیاں تھیں۔ نیچے ایک قدرتی کوٹھڑی سی بنی ہوئی تھی۔ عورت کی آواز آئی۔

"نیچے آ جاؤ۔"

میں سیڑھیاں اتر کر کوٹھڑی میں آ گیا۔ دیا دیوار کے ایک طاق میں روشن تھا۔ دیواروں کے نوکیلے اور گول گول پتھر کہیں کہیں سے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ فرش پر خشک گھاس پھوس بچھا ہُوا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک بڑی چوکی پر چھوٹی کچھ بڑی پیتل کی مورتیاں پڑی تھیں۔ ان میں سب سے بڑی مورتی ایک سانپ کی تھی جس کا پھن پھیلا ہُوا تھا۔ پاس ہی لکڑی کا ایک صندوق' پانی کا مٹکا' مٹی کا پیالہ اور ایک دیگچی پڑی تھی۔ وہ عورت مورتیوں والی چوکی کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ یہاں فضا میں گرمی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہاں میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔"

میں سٹین گن گود میں لے کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ چھوٹی پٹاری اس نے اپنے سامنے رکھ لی تھی۔ مَیں نے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟ تم مجھے یہاں کس لیے لائی ہو؟"

اُس نے کہا۔

"شانت رہو، پہلے مجھے ایک کام کر لینے دو۔"

وہ اُٹھ کر لکڑی کے صندوق کے پاس گئی۔ اسے کھولا اس میں سے ایک پوٹلی نکالی۔ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ پوٹلی کھول کر اس میں سے سیاہ رنگ کی کانچ کی گولی نکالی اور اسے پٹاری کا ڈھکن کھول کر اس کے اندر ڈال کر پٹاری بند کر دی۔ اس وقت پٹاری کے اندر سے پھنکار کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے اندر سانپ ہے۔ میں تو خاموش بیٹھا ساری کاروائی دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی۔

"میں نے بھگوان شیوا کے استھان کا پتھر پٹاری میں ڈالا ہے۔ اس کے اثر سے میرا سانپ تمہارے جسم سے نکلنے والی بُو نہیں سونگھ سکے گا اور تم سے ڈر کر بھاگے گا نہیں۔ جانتے ہو یہ سانپ کون ہے؟ یہ میرا خاوند ہے۔ میں نے اپنے منتر کے زور سے اسے آدمی سے سانپ بنا کر پٹاری میں بند کر دیا ہے۔"

یہ عورت اب مجھے کچھ پاگل سی لگنے لگی تھی۔ وہ ایسی باتیں کر رہی تھی جن کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں اس کے پاس اس امید پر بیٹھا رہا کہ شاید وہ جوگن مایا دیوی کے بارے میں خود ہی کوئی بات کرے۔ کیونکہ شروع میں اُس نے مجھے کہا تھا کہ مَیں جانتی ہوں تم کس کی تلاش میں یہاں آئے ہو۔ جب اس نے از خود اس بارے میں کوئی بات نہ کی تو مَیں نے خود پیش رفت کرتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

وہ بولی۔

"میرے کئی نام ہیں۔ ہر جنم میں میرا ایک الگ نام ہوتا تھا۔ اس جنم میں میرا نام گندھرنی ہے۔"

مَیں نے دوسرا سوال کیا۔

"تم نے کہا تھا کہ تم جانتی ہو مَیں یہاں کس کی تلاش میں آیا ہوں۔ اس کا کیا مطلب تھا؟"

مَیں چاہتا تھا کہ اگر اس نے جوگن مایا دیوی کی بات کرنی ہے تو از خود ہی کرے۔ مَیں اپنی طرف سے جوگن کا ذکر نہیں چھیڑنا چاہتا تھا۔ وہ مسکرائی کہنے لگی۔

"مَیں زیادہ نہیں جانتی جتنا میں اپنی تپسیا اور گیان دھیان سے جو جان سکی ہوں وہ یہ ہے کہ تم کو اپنے جیون ساتھی کی تلاش یہاں کھینچ لائی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

میرے لیے یہ زیادہ حیران کرنے والی بات نہیں تھی۔ ان جوگی سادھوؤں اور جوگنوں کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی وجہ سے مجھے اتنا معلوم ہوچکا تھا کہ یہ لوگ اپنی ریاضت اور گیان دھیان سے دوسرے آدمی کے دل کا تھوڑا بہت حال معلوم کر لیتے ہیں۔ مَیں نے اس خیال سے کہ شاید یہ آگے بھی کچھ بتائے کہہ دیا۔

"یہ سچ ہے کہ مجھے اپنی پتنی کی تلاش ہے جو اس علاقے میں میرے ساتھ شکار کھیلنے آئی تھی اور جنگل میں کہیں کھوگئی ہے۔"

وہ بولی۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہاری پتنی شکار کھیلنے تمہارے ساتھ یہاں نہیں آئی تھی۔ مجھے کچھ اور ہی بات لگتی ہے۔"

مَیں خاموش رہا۔ مَیں اسے اصل بات نہیں بتانا چاہتا تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس عورت کا آلوپ نگر کے مہاویو شیطان سے کوئی خفیہ تعلق ہو اور یہ اسے خبردار کر دے اور میں مزید کسی مصیبت میں پھنس جاؤں۔ کیونکہ ابھی تک جمیلہ میری پہنچ سے دور مہادیو کے پجاریوں اور سپیروں کی قید میں تھی۔ مجھے چپ دیکھ کر گندھرنی نے پٹاری کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔

"اس پٹاری میں میرا خاوند سانپ ہے۔ آدمی سے سانپ کی جون میں آنے کے بعد اس پر بہت سی چھپی ہوئی باتیں ظاہر ہو گئی ہیں۔ میں اس سے پوچھتی ہوں۔ وہ مجھے بتا دے گا کہ تمہاری پتنی کہاں ہے، کس حال میں ہے۔"

مَیں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ ہو سکتا تھا جمیلہ کے بارے میں مجھے کچھ مفید معلومات مل جائیں۔ اس امید پر مَیں نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش رہا۔ گندھرنی نے پٹاری میں ہاتھ ڈال کر سانپ باہر نکالا۔ یہ سیاہ رنگ کا سانپ تھا جس کے جسم پر سفید لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ دو فٹ لمبا سانپ تھا۔ اس نے باہر نکلتے ہی پھنکارتے ہوئے اپنا پھن کھول لیا۔ گندھرنی اس سے باتیں کرنے لگی۔

"پتی دیو! مَیں تمہارا چلہ کاٹ رہی ہوں۔ بہت جلد چلہ پورا ہو جائے گا۔ پھر میں تمہیں آدمی کے روپ میں واپس لے آؤں گی۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ پہلے تم تھوڑا دودھ پی لو۔ پھر مَیں تم سے باتیں کروں گی۔"

گندھرنی نے سانپ کو اپنے سینے کے ساتھ لگا کر اوپر ساڑھی کا پلو ڈال لیا۔ مَیں سمجھ گیا کہ سانپ اس کا دودھ پی رہا ہے۔ جتنی دیر تک سانپ دودھ پیتا رہا گندھرنی دائیں بائیں جھومتی رہی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ جب سانپ نے جی بھر کر دودھ پی لیا اور اپنی گردن ساڑھی کے پلو میں سے باہر نکالی تو گندھرنی نے بڑی محبت سے سانپ کو اپنی گردن میں ڈالا اور اس کے منہ کو اپنے ہونٹوں کے قریب لے آئی۔

سانپ اپنی زبان بار بار نکال کر گندھرنی کے ہونٹوں کو چومنے لگا۔ دیے کی روشنی میں یہ منظر مجھے بڑا دہشت خیز معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن اب میں اس قسم کے مناظر کا کچھ عادی بھی ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر تک سانپ گندھرنی کے ہونٹوں کو چومتا رہا۔ اس کے بعد گندھرنی نے سانپ کو سامنے کی طرف لا کر پوچھا۔

"پتی دیو! اس آدمی کی پتنی گم ہوگئی ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ اس وقت کہاں ہے' کس حال میں ہے؟"

سانپ کے منہ سے ہلکی ہلکی سِسکاریاں سی نکلنے لگیں۔ جیسے وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہو۔ گندھرنی ان سِسکاریوں کو بڑے غور سے سن رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"کیا اس آدمی کی پتنی واپس آ جائے گی؟"

سانپ نے ہلکی سی پھنکار ماری۔ گندھرنی اسی طرح ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھی رہی۔ سانپ کبھی پھنکارتا' کبھی سسکاریوں میں کچھ کہتا جسے صرف گندھرنی ہی سمجھ سکتی تھی۔ ابھی تک مجھے اس ڈرامے پر کوئی یقین نہیں تھا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ گندھرنی محض مجھ پر اپنا اثر ڈالنے کے لیے ایسا کر رہی ہے۔ یہ سانپ اس کا خاوند بھی نہیں ہے' یہ محض سانپ ہے۔ کچھ دیر اسی طرح سانپ سے باتیں کرنے کے بعد گندھرنی نے سانپ کو پٹاری میں بند کر دیا اور میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"میرے پتی نے بتایا ہے کہ تمہاری پتنی آلوپ نگر کے بڑے پجاری مہا دیو کے پاس اس کی نرتکی بن کر رہ رہی ہے۔"

اس پر میَں چونک پڑا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک سانپ اس عورت کو یہ معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔

"مہا دیو نے اسے کس جگہ رکھا ہُوا ہے؟"

وہ بولی۔

"یہ مجھے میری پتی دیو نے نہیں بتایا۔ اس نے صرف اتنا بتایا ہے کہ تمہاری پتنی

وہاں خوش نہیں ہے۔ مہادیو اسے ایک کال کوٹھڑی میں سارا دن بند رکھتا ہے۔ صرف رات کو اپنے پاس بلاتا ہے اور دن نکلنے پر واپس کال کوٹھڑی میں بند کروا دیتا ہے۔"

"تمہارے خاوند سانپ نے اور کیا کچھ بتایا تھا؟"

میں نے اشتیاق بھرے لہجے میں بے تابی سے پوچھا۔ گندھرنی نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔

"اس کے سوا میرے ناگ پتی نے اور کچھ نہیں بتایا' اس کو اس سے زیادہ کچھ معلوم بھی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ معاملہ آلوپ نگر کے سب سے بڑے پجاری مہادیو کا ہے۔ اس کے معاملے میں کوئی سانپ دخل نہیں دے سکتا' نہ ہی اسے زیادہ باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔"

مَیں چپ بیٹھا تھا۔ گندھرنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نے یہ سب کچھ مجھے پہلے کیوں نہیں بتا دیا؟"

میں نے کہا۔

"مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تمہیں یہ سانپ ساری باتیں بتا دے گا تو میں تم سے کچھ نہ چھپاتا۔"

اب اس عورت گندھرنی سے زیادہ باتیں چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ مَیں اسے کچھ ضروری کوائف بھی بیان کر دوں۔ چنانچہ میں نے اسے جوگن مایا دیوی کے بارے میں بھی بتا دیا کہ اس نے میری اس سلسلے میں بڑی مدد کی تھی اور اب میں اس کی تلاش میں یہاں اس کی کٹیا میں آیا تھا۔ جوگن مایا دیوی کا نام سن کر گندھرنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مایا دیوی! میری سکھی سہیلی ہے۔ وہ میرے سانپ پتی دیو کی بیوی رہ چکی تھی۔ لیکن میرا گیان مجھے بتا رہا ہے کہ جوگن مایا دیوی اس جنگل میں کہیں نہیں ہے۔"

میں نے یہی قیاس کیا کہ جوگن ابھی تک آلوپ نگر کے جنگل سے واپس نہیں آئی اور وہ اس جنگل میں کسی جگہ یا تو میرا انتظار کر رہی ہوگی یا اپنی سہیلی سیندھیا سے

رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہوگی تاکہ جمیلہ کے بارے میں تازہ صورتِ حال معلوم کر سکے۔ مَیں نے گندھرنی سے کہا۔

"کیا تم میری مدد کرو گی؟ مجھ پر اور میری بیوی پر بڑی کٹھن مصیبت آن پڑی ہے۔"

گندھرنی کہنے لگی۔

"تم مسلمان ہو' ہندو نہیں ہو۔ یہ بھی مجھے میرے سانپ پتی نے بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن آلوپ نگری کے بڑے پجاری مہا دیو کے آگے میرا کوئی منتر کام نہیں دے گا۔ مجھ میں اتنی شکتی نہیں ہے کہ مَیں مہا دیو کا مقابلہ کر سکوں۔ مایا دیوی نے بڑی بہادری سے کام لیا کہ وہ تمہارے ساتھ مہا دیو جی کے آشرم تک چلی گئی۔"

مَیں نے مایوس ہو کر سر نیچے کر لیا۔ گندھرنی نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھ کر میرا سر اونچا کیا۔ اس کی آنکھوں میں اچانک ایک مقناطیسی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے مسلسل میری آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔

"پتی سے اس کی پتنی اور پتنی سے اس کا پتی بچھڑ جائے اور دونوں ایک دوسرے کے پریمی ہوں تو مجھ سے ان کی جدائی نہیں دیکھی جاتی۔ مَیں تمہاری ضرور مدد کروں گی لیکن اس کے لیے مجھے اپنے پتی دیو سانپ کا وشوگھات کرنا پڑے گا' یعنی اس سے بے وفائی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ اس کے بغیر مَیں تمہاری مدد نہ کر سکوں گی۔"

مَیں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ بس اس کی طرف دیکھتا رہا کہ یہ آگے کیا کہتی ہے۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ میری مدد کرنے کے لیے اپنے سانپ سے جس کو وہ اپنا خاوند ظاہر کر رہی تھی کیسے بے وفائی کی مرتکب ہوگی۔ اس کی آواز آہستہ آہستہ دھیمی اور خشک ہونے لگی تھی۔ یہ وہی آواز تھی جس آواز میں اس نے مڑھی کے چبوترے پر عریاں حالت میں مجھ سے کلام کیا تھا۔ کہنے لگی۔

"مجھے ایک رات کے لیے تم سے بیاہ کرنا ہوگا۔ تمہاری پتنی بننا ہوگا اور تمہارے

ساتھ وہی کچھ کرنا ہوگا جو ایک پتنی شادی کی رات کو اپنے پتی کے ساتھ کرتی ہے۔"

مَیں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ یہ عورت بھی مجھ پر وہی ستم ڈھانے والی تھی اور اس گناہ کی دلدل میں لے جانے والی تھی جو اس سے پہلے جوگن مایا دیوی میرے ساتھ کر چکی تھی۔ بعد میں جب مجھے ہندو دیو مالا کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوئیں تو مجھ پر یہ شرمناک انکشاف ہُوا کہ اس دھرم میں جنسی تعلقات اور اس قسم کی فحاشی کو بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کے بعض علاقوں کی کٹر ہندو عورتیں دریاؤں اور تالابوں میں مردوں کے سامنے ننگی ہو کر نہاتی ہیں۔ ان کے دھرم میں ہے کہ ہندو عورت کے بدن پر نہاتے وقت جتنے غیر مردوں کی نگاہ پڑے گی اس کے اتنے ہی گناہ جھڑ جائیں گے لیکن مَیں یہ گناہ اپنے سر لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مَیں نے انجان بن کر گندھرنی سے کہا۔

"ہم بیاہ کر لیتے ہیں لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم اپنے پتی دیو کے اعتماد کو دھوکہ دو۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ بولی۔

"اس کے بغیر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔"

میں نے اس سے براہِ راست پوچھ لیا کہ وہ میری کِس قسم کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں وہ یہی کر سکتی تھی کہ مجھے مہا دیو کے آشرم تک جانے کا اور اپنی بیوی تک پہنچنے کا کوئی خفیہ راستہ بتا دے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ جس کے لیے میں اتنا بڑا گناہ اپنے سر لیتا۔ گندھرنی میرے یہ سوال پوچھنے پر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"مورکھ! تُو نہیں جانتا کہ مَیں تمہاری کیسی مدد کرنے والی ہوں۔ تم کو کتنی بڑی طاقت، کتنی بڑی شکتی دینے والی ہوں۔ جو کچھ میں تمہارے لیے کروں گی اس کا تمہیں وہم و گمان بھی نہیں ہوگا اور یہ کام تمہاری مایا دیوی بھی تمہارے لیے نہیں کر سکتی۔"

مَیں سوچ میں پڑ گیا۔ مَیں نے کہا۔

"مجھے تھوڑا سا اشارہ ہی دو کہ تم مجھے کس قسم کی طاقت دو گی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

جب تک تم میرے ساتھ ایک رات کے لیے بیاہ نہیں کرتے' میرے ساتھ پتی دیو والا سلوک نہیں کرتے' تب تک میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی۔ اگر بتا دیا تو دیوتا میری ساری تپسیا' میری ساری ریاضت بھنگ کر دیں گے۔ مجھ سے میری شکتی چھین لیں گے۔ دیوتا مجھے اور تمہیں بیاہ کے بعد پتی پتنی کی حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب ہم دونوں ایک دوسرے سے ملیں گے تو آکاش کے دیوتا خوش ہوں گے اور خوش ہو کر وہ مجھے اس بات کی اجازت دے دیں گے کہ میں تمہاری مدد کروں اور تمہیں وہ طاقت دے دوں جو سارے بھارت ورش میں دو تین جوگی جوگنوں کے پاس ہی ہوگی۔ میں صرف تمہاری اور تمہاری بچھڑی ہوئی پتنی کی خاطر' تم دونوں پریمیوں کو ایک دوسرے سے ملانے کی خاطر یہ پاپ کر رہی ہوں۔ اپنے پتی سانپ کو دھوکا دینا پاپ ہی ہوگا۔ بولو کیا تم میرے ساتھ ایک رات کے لیے بیاہ کرنے پر تیار ہو؟"

میں عجیب کش مکش میں پڑ گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں؟ کون سا راستہ اختیار کروں؟ جمیلہ کو ہر حالت میں حاصل کرنا تھا۔ یہ عورت گندھرنی مجھے کوئی ایسی طاقت دینے والی تھی جو جمیلہ کے حصول میں میری مدد کر سکتی تھی۔ اس عورت کی باتوں پر مجھے اس لیے بھی اعتبار تھا کہ میں دیکھ چکا تھا کہ اس نے میرے اور میری بیوی کے بارے میں اب تک جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا۔ اس کے باوجود میں اس گناہ کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں پا رہا تھا۔ مجھے تذبذب کی حالت میں دیکھ کر گندھرنی نے کہا۔

"اگر تم راضی نہیں ہو تو کوئی بات نہیں۔ بے شک میرے ساتھ بیاہ نہ کرو اور خود ہی جا کر اپنی پتنی کو تلاش کرو۔"

نہ جانے کس جذبے کے تحت میرے منہ سے نکل گیا۔

"میں تیار ہوں۔"

گندھرنی خاموشی سے اٹھی۔ بولی۔

"میں سورگ میں جا رہی ہوں۔ جب آواز دوں تو میرے پاس آ جانا۔"

وہ سیڑھیاں چڑھ کر غار میں آگے کی طرف چل دی۔

سورگ کے معنی بہشت کے تھے۔ میں سوچنے لگا یہاں کون سا بہشت ہے جہاں یہ جا رہی ہے۔ ضرور یہ دیوانی عورت ہے یا پھر زیادہ تپسیا کرنے سے اس پر دیوانگی کے دورے پڑتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آ رہی تھی کہ اب جبکہ میں نے اس کے ساتھ بیاہ رچانے کی حامی بھر لی ہے تو یہ مجھے کس قسم کی شکتی دینے والی ہے۔ کبھی خیال آتا کہ ہندو مذہب میں بیاہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور ایک بار ایک آدمی کی جس عورت سے شادی ہو جائے تو پھر ساری عمر اسے اسی عورت کے ساتھ اور عورت کو اسی مرد کے ساتھ زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ کہیں اس ایک رات کے بیاہ کے بعد سچ مچ ہی یہ عورت میرے گلے نہ پڑ جائے لیکن دوسری طرف میں اپنی بیوی جمیلہ کو بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں اسے مہا دیو کی قید سے ہر حالت میں نکالنا چاہتا تھا۔

مَیں وہیں پتھر کی دیواروں کے درمیان بیٹھا سوچتا رہا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد مجھے گندھرنی کی آواز آئی۔

"میرے ناتھ آ جاؤ۔"

آواز کچھ فاصلے پر سے آ رہی تھی۔ مَیں کوٹھڑی سے نکل کر غار میں آ گیا۔

گندھرنی کی دوسری آواز آئی۔

"سیدھے چلے آؤ۔ بائیں ہاتھ کو سیڑھیاں ہیں' سیڑھیاں اتر جانا۔"

مَیں غار کے اندھیرے میں دیوار کا سہارا لے کر چل پڑا۔ آگے دیوار میں سے ایک جگہ روشنی کا دھیما دھیما غبار سا باہر آ رہا تھا۔ یہ سیڑھیاں تھیں۔ میں نے دیکھا کہ سیڑھیاں نیچے تک گئی ہوئی تھیں اور وہاں بڑی پُر اسرار روشنی ہو رہی تھی اور عجیب قسم کی بھاری بھاری خوشبو آ رہی تھی۔ مَیں سیڑھیاں اترنے لگا۔ خدا جانے اس پہاڑی کے اندر یہ قدرتی غار اور گپھائیں بنی ہوئی تھیں یا کسی راجہ کے زمانے میں سادھو

سنیاسیوں نے خود بنالی تھیں۔ جیسے جیسے مَیں نیچے جا رہا تھا خوشبو تیز ہوتی جا رہی تھی۔ سیڑھیاں دس بارہ تھیں۔ جب آخری سیڑھی پر پہنچا تو دیکھا کہ سامنے دیوار میں ایک تنگ دروازہ ہے۔ دروازے کی پیشانی پر گیندے کے پھولوں کے ہار لٹک رہے ہیں۔ ان ہاروں کی لڑیوں کا پردہ سا گرا ہُوا تھا۔ اندر سے دھیمی دھیمی روشنی باہر نکل رہی تھی۔ میں وہاں رک گیا۔ اتنے میں گندھرنی کی آواز آئی۔

"میرے ناتھ! اندر آ جاؤ۔"

مَیں چند قدم چل کر دروازے کے پاس آیا۔ دوسری طرف سے خوشبو کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ مَیں گیندے کے ہاروں کو ایک طرف ہٹا کر جیسے ہی دوسری طرف داخل ہُوا' ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی اور ہی دنیا میں' خواب کی دنیا میں آ گیا ہوں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے ایک پُر فضا باغ کا صحن ہے۔ دیواروں پر سرخ پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ چھت کو بھی سرخ پھولوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ زمین پر چھوٹی چھوٹی چار روشیں ہیں جن کے اِردگِرد کنول کے پھول پانی کی سطح سے باہر اُبھرے ہوئے ہیں۔ درمیان میں ایک عالی شان تخت بچھا ہے۔ تخت پر پھولوں کی سیج بچھی ہوئی ہے۔ پھولوں کی سیج پر گندھرنی اپنے جسم پر صرف پھولوں کے گہنے پہنے کہنی کے سہارے نیم دراز ہے۔ ہاتھ میں پھولوں کا ہار ہے جس سے وہ کھیل رہی ہے۔ کمرہ خوشبوؤں سے بھرا ہُوا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ اُٹھ بیٹھی اور دونوں بازو پھیلا کر بولی۔

"میرے ناتھ میرے پاس آ جاؤ۔"

مَیں کسی مشینی آدمی کی طرح مبہوت سا ہو کر اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے مجھے پکڑ کر سیج پر اپنے پاس بٹھا لیا اور بولی۔

"دیوتاؤں نے ہمارا بیاہ کر دیا ہے۔ اب تم میرے پتی ہو اور مَیں تمہاری پتنی ہو گئی ہوں۔ میرے گلے لگ جاؤ۔"

مَیں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"یہ بیاہ صرف ایک دن کے لیے ہے ناں؟"

وہ مسکرائی۔ کہنے لگی۔

"یہ مَیں تمہیں کل بتاؤں گی۔ اس وقت جدائی کی باتیں نہ کرو۔"

اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر پھولوں کی سیج پر گرا لیا۔

اس کے بعد کیا ہُوا یقین کریں مجھے کچھ یاد نہیں۔ یہ لمحات میری زندگی کا ایک ایسا خواب تھا جو دن نکلنے کے بعد پورا یاد نہیں رہتا۔ آدمی یاد کرتا ہے تو اس کی کہیں کہیں سے جھلکیاں ہی یاد آتی ہیں۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں ایک رات گزری دو راتیں گزریں یا کتنا وقت گزر گیا۔ وہاں نہ دن تھا نہ رات تھی' نہ سورج تھا' نہ رات کے ستارے تھے۔ چاروں طرف اوپر نیچے پھول ہی پھول تھے۔ تخت پر بھی پھول تھے اور ہم پھولوں میں' خوشبوؤں میں جیسے گم ہو گئے تھے۔ اتنی بات ضرور ہے' آج بھی جب مجھے اس خواب کی جھلکیاں یاد آتی ہیں تو میرے ذہن پر ایک عجیب سی پُر سکون کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ مَیں سو گیا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو مَیں اسی پہلے والی کوٹھڑی میں لیٹا ہُوا تھا اور گندھرنی میرے پاس اپنے جسم پر صرف پھولوں کے گہنے پہنے بیٹھی مجھے جگا رہی تھی۔ مَیں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

"کیا وقت ہو گا؟ مَیں کہاں ہوں؟"

وہ ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔

"میرے ناتھ! تم میرے پاس ہی ہو۔ صرف ایک رات گزری ہے وہ ہمارے بیاہ کی رات تھی۔"

مجھ سے رہا نہ گیا۔ مَیں نے جلدی سے کہا۔

"اب مَیں آزاد ہوں ناں۔ تمہارا خاوند نہیں ہوں نا؟"

وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ بولی۔

"ہاں تم آزاد ہو تم نے میری شرط پوری کر دی ہے۔ اب میں تمہاری شرط پوری کروں گی۔"

مَیں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ عورت زندگی بھر کے لیے میرے گلے نہیں پڑی۔
مَیں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ گندھرنی نے مجھے ایک تھالی میں کھانے کو میٹھے چاول اور پانی کا گلاس دیا۔ مَیں نے جلدی جلدی سارے چاول کھائے' مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔
پانی پی کر مَیں نے گلاس رکھ دیا اور اس سے کہا۔

"مَیں نے تمہاری شرط پوری کر دی ہے گندھرنی! اب تم اپنا بچن نبھاؤ اور مجھے وہ شکتی دو جس کی مدد سے مَیں اپنی بیوی تک پہنچ کر اسے مہا دیو کی قید سے نکال سکوں۔"
وہ خاموش نگاہوں سے مجھے تک رہی تھی۔ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔
"مَیں اپنا بچن ضرور نبھاؤں گی' بلکہ یہ تو میری خواہش تھی کہ تمہاری مدد کروں اور تمہیں ایسی شکتی دوں کہ تم اپنی بیوی کو واپس لا سکو۔ ٹھہرو' مَیں ساڑھی پہن لوں۔"

وہ اُٹھ کر دیوار کے پاس جہاں لکڑی کا صندوق تھا وہاں گئی۔ اپنے جسم پر سے پھولوں کے گہنے اتار کر ایک طرف رکھے اور وہیں پڑی ہوئی ساڑھی اٹھا کر پہنی۔ صندوق کو کھول کر اس سے لکڑی کی ایک چھوٹی سی صندوقچی نکال کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"مَیں اپنا بچن پورا کر رہی ہوں۔ مَیں تمہیں ایک نئی شکتی دے رہی ہوں۔ اس شکتی کے ساتھ تم ایک نیا روپ' نئی شکل اختیار کر لو گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم گھبراؤ گے نہیں۔ اگر تم گھبرا گئے تو اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکو گے۔ تم اپنے اصلی روپ سے کچھ وقت کے لیے جدا ہو جاؤ گے۔ لیکن یہ دوسرے لوگوں کے لیے ہو گا۔ تمہاری اور دوسرے لوگوں کی نظروں کا دھوکا ہو گا۔ تم حقیقت میں اپنے اصلی انسانی روپ میں ہی ہو گے لیکن لوگ تمہیں کسی دوسرے روپ میں دیکھیں گے۔ تم خود اپنے آپ کو اس دوسرے روپ میں دیکھو گے۔"
میں اس کی باتیں سن کر ہی گھبرا سا گیا۔ میں نے پوچھا۔
"کیا تم مجھے انسان سے کوئی جانور بنا دو گی؟"

وہ بولی۔

"ظاہر میں ایسا ہی ہوگا لیکن اصل میں ایسا نہیں ہوگا۔ بھگوان نے تمہیں انسان کے روپ میں پیدا کیا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں کسی جانور کے روپ میں تبدیل نہیں کر سکتی۔ میری شکتی صرف تمہاری نظروں کو اور دوسرے لوگوں کی نظروں کو فریب دے گی' ان کی نظروں کو دھوکا دے گا۔ تمہیں گھبرانے یا خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر گھبرا گئے اور خوف کھا گئے تو یاد رکھو تم اپنی پتنی' یعنی اپنی بیوی تک کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔ وہ ایک ایسی کال کوٹھڑی میں بند ہے جہاں دنیا کا کوئی انسان نہیں پہنچ سکتا۔ پہلے اس بات کا مجھے یقین دلاؤ کہ تم شکتی ملنے کے بعد گھبراؤ گے نہیں۔ جب تک تم مجھے دل سے یقین نہیں دلاؤ گے میں تمہیں یہ شکتی نہیں دے سکتی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ دل میں گھبرا بھی رہا تھا کہ خدا جانے یہ عورت مجھے انسان سے کیا بنانے والی ہے اور یہ خیال بھی تھا کہ اگر میں نے یہ موقع ہاتھ سے کھو دیا تو واقعی میں جمیلہ کو اس شیطانی آشرم سے شاید کبھی نکال کر نہ لاسکوں گا۔ میں نے کوشش کر کے دیکھ لیا تھا۔ آخریں نے دل کو مضبوط کیا اور گندھرنی سے کہا۔

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں نہیں گھبراؤں گا۔ لیکن مجھے اتنا ضرور بتا دو کہ تم مجھے کس روپ میں ظاہر کرنے والی ہو؟"

وہ بولی۔

"میں ایک بار پھر اپنی بات کو دہراؤں گی کہ میں تمہیں کوئی نیا روپ نہیں دے رہی ۔ تم انسان ہی رہو گے لیکن دیکھنے والوں کو تم کسی اور شکل میں نظر آؤ گے۔ یہاں تک کہ جب تم بھی اپنے آپ کو دیکھو گے تو تمہاری نظریں بھی دھوکہ کھا جائیں گی۔"

میں نے تنگ آ کر کہا۔

"گندھرنی! خدا کے لیے معاملے کو زیادہ لمبا نہ کھینچو مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ تم مجھے

کس روپ میں ظاہر کرو گی؟"

وہ بولی۔

"میں تمہیں ایک خاص راکھ کی ایک چٹکی پانی میں گھول کر پلاؤں گی۔ یہ راکھ کیا ہے اور میں اسے کہاں سے لائی ہوں؟ تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ جب تم اس کراماتی راکھ کو پانی کے گھونٹ کے ساتھ پی جاؤ گے تو اس کے ایک منٹ کے بعد تم لوگوں کو اور خود اپنی نظروں میں سانپ نظر آنے لگو گے۔"

یہ سن کر میں دہشت زدہ ہو گیا۔ میں نے فوراً" انکار کر دیا۔

"نہیں نہیں گندھرنی! مجھے یہ شکتی نہیں چاہیے۔ میں انسان سے سانپ نہیں بن سکتا۔ کبھی نہیں۔۔۔۔۔"

اس نے صندوقچی جو اپنی گود میں لے رکھی تھی ایک طرف رکھ دی اور بڑے اطمینان سے بولی۔

"تمہاری مرضی ہے۔ اب تم مجھ پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے۔ میں اپنا بچن پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم نہیں مانتے' تم کو قبول نہیں ہے تو میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتی۔ میں دیوتاؤں کے آگے بھی بے گناہ ہوں۔ اس وقت غار کے باہر دن چڑھ چکا ہے۔ میں تو اپنی اس گپھاہ میں ہی رہوں گی۔ تم آزاد ہو' باہر جا سکتے ہو کیونکہ اب یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔"

ایک طرح سے وہ مجھے وہاں سے چلے جانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ میں ایک بار پھر کش مکش میں پڑ گیا۔ کیا کروں' کیا نہ کروں۔ اکیلا جمیلہ کی تلاش میں نہیں جا سکتا تھا۔ جوگن مایا دیوی بھی وہاں نہیں تھی' سیندھیا بھی مجھ سے بچھڑ چکی تھی۔ اب مہادیو کے آشرم کی طرف گیا تو قدم قدم پر مجھ پر فائرنگ شروع ہو جائے گی۔ مہادیو کے مسلح سپیرے مجھے کبھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ جمیلہ کو ان شیطانوں کے پاس چھوڑ کر وہاں سے چلے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جمیلہ کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ بے بسی کے عالم میں میری طرف دیکھ کر کہہ

رہی تھی۔

"کرم داد! کیا تم میری مدد کو نہیں پہنچو گے؟"

گندھرنی صندوقچی کو صندوق میں رکھنے جا رہی تھی کہ مَیں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا لیا اور کہا۔

"گندھرنی! مَیں تیار ہوں۔ مجھے جس روپ میں چاہو بدل دو۔ مَیں ہر روپ میں' ہر حالت میں اپنی بیوی کی مدد کو پہنچنا چاہتا ہوں۔"

گندھرنی وہیں بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"میں یہ سب کچھ صرف تمہارے لیے اور تمہاری پتنی کے لیے کر رہی ہوں۔ مجھے اس میں کوئی لابھ نہیں ہے۔ میں نے صرف تم دونوں کو آپس میں ملانے کی خاطر تمہارے ساتھ ایک دن کے لیے بیاہ رچا کر دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کی اور اپنے سانپ پتی سے ایک رات کے لیے ہی سہی' لیکن بے وفائی ضرور کی۔ اب تم اپنی پتنی' کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہو تو مجھے خوشی ہے۔ میرے سامنے آ کر بیٹھ جاؤ۔"

میں اس کے پہلو سے اُٹھ کر سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے کہا۔

"آلتی پالتی مار کر جوگیوں کی طرح بیٹھ جاؤ۔"

مَیں اسی طرح بیٹھ گیا۔ گندھرنی نے صندوقچی کھولی۔ اس میں سے سیاہ رنگ کی ایک چوکور ڈبیا نکالی۔ اُٹھ کر مٹی کے پیالے میں تھوڑا پانی بھر کر لے آئی۔ ڈبیا میں سے چٹکی بھر سفوف نکال کر مجھے کہا۔

"منہ کھولو۔"

مَیں نے ڈرتے ڈرتے منہ کھول دیا۔ اس وقت میرے اعصاب شدید تناؤ کی حالت میں تھے۔ ذہن میں جیسے شبِ برات کی ہوائیاں چل رہی تھیں۔ کان سنسنا رہے تھے' نہ جانے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ گندھرنی نے اونچی آواز میں اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔ اشلوک پڑھتے پڑھتے اس نے سفوف میری زبان پر رکھ دیا اور بولی۔

"یہ پانی پی جاؤ۔"

سفوف بے ذائقہ تھا۔ بالکل پھیکا تھا۔ مَیں پانی کے تین چار گھونٹ پی گیا۔ گندھرنی نے کہا۔

"اب آنکھیں بند کر لو اور جب میں نہ کہوں آنکھیں مت کھولنا۔"

مَیں نے ایسا ہی کیا۔ آنکھیں بند کرتے ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اس اندھیرے میں مجھے عجیب عجیب جانوروں' پرندوں اور درندوں کی شکلیں دکھائی دینے لگیں۔ شاید یہ نفسیاتی اثر تھا کیونکہ گندھرنی نے کہا تھا کہ میں کسی سانپ کی شکل میں ظاہر ہوں گا۔ چنانچہ درندوں کے بعد میری آنکھوں کے اندھیرے میں قسم قسم کے چھوٹے بڑے سانپ اور اژدہا پھرنے لگے۔ وہ پھنکاریں مار رہے تھے۔ میرے جسم کو اچانک ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ عین اس وقت گندھرنی کی آواز آئی۔

"خبردار! ابھی آنکھیں مت کھولنا۔"

وہ اونچی آواز میں بڑی تیز تیز اشلوک بولے جا رہی تھی۔ میرے جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے شروع ہو گئے تھے۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں ابھی گر کر مر جاؤں گا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے اپنی مٹھیاں زور سے بھینچ لی تھیں۔ میرا جسم ایک ایسے تجربے سے گزر رہا تھا جس کا میں نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ محض نفسیاتی دباؤ کا اثر تھا۔ ورنہ میرے جسم کو کچھ نہیں ہو رہا تھا اور میرے جسم میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اچانک میرے جسم کو جھٹکے لگنے بند ہو گئے۔ دل کی دھڑکن بھی معمول پر آ گئی۔ گندھرنی کی آواز آئی۔

"آنکھیں کھول دو۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں ۔ میں نے سب سے پہلے اپنے جسم کو دیکھا میرے جسم میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ بالکل پہلے کی طرح انسانی جسم تھا۔ وہی پاؤں تھے' وہی ٹانگیں اور ہاتھ تھے۔ میں نے گندھرنی سے کہا۔

"میں تو بالکل ویسے کا ویسا ہوں۔"

گندھرنی نے کچھ سیکنڈ توقف کیا۔ پھر بولی۔

"اب اپنے آپ پر نظر ڈالو۔"

مَیں نے نظریں نیچے کر کے اپنے جسم کو دیکھا تو میرا جسم غائب تھا اس کی جگہ ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ میرے حلق سے چیخ نکلتی نکلتی رہ گئی۔ مَیں نے خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت گندھرنی نے مجھے سنبھال لیا۔ فوراً" کہنے لگی۔

"ایک بار پھر اپنے جسم پر نگاہ ڈالو۔"

اب میں نے آنکھیں کھول کر اپنے جسم کو دیکھا تو سانپ غائب تھا اور میرا بدن ویسے کا ویسا ہی تھا۔ وہ بولی۔

"تمہیں اپنا جسم انسان کا جسم لگ رہا ہے لیکن اصل مین اس وقت بھی تم دوسروں کو سانپ ہی دکھائی دے رہے ہو۔ مَیں تمہیں سانپ کی شکل میں ہی دیکھ رہی ہوں۔"

مَیں حیران پریشان ساکت بیٹھا تھا۔ گندھرنی نے کہا۔

"اس آکاش بوٹی کی سب سے بڑی یہی کرامت ہے کہ تمہیں کِسی کِسی وقت اپنا جسم انسانی روپ میں بھی دکھائی دے گا۔ لیکن دوسروں کو تم سانپ ہی نظر آؤ گے اور وہ تم سے دور بھاگیں گے۔"

مَیں نے پوچھا۔

"کیا میری ہر وقت یہی حالت رہے گی؟"

اس نے کہا۔

"اس آکاش بوٹی کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کا اثر وقفے وقفے سے ہو گا اور وقفے وقفے سے اثر غائب ہو جائے گا۔ تم سانپ سے اچانک انسانی شکل میں تبدیل ہو جاؤ گے۔ یہ انسانی حالت تم پر کچھ دیر طاری رہے گی پھر اچانک یہ حالت بھی ختم ہو جائے گی اور تم انسان سے دوبارہ سانپ کا روپ اختیار کر لو گے۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ وقفہ کتنی مدت کا ہوگا؟"

وہ بولی۔

"اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے اس کا تجربہ نہیں ہے۔ تمہیں کوشش کرنی ہوگی کہ جب تم یہاں سے سانپ کے روپ میں اپنی بیوی کی مدد کرنے خونی جنگل کی طرف نکلو تو جتنی جلدی ہو سکے مہادیو کے آشرم میں پہنچ جاؤ اور اگر وہاں پہنچ کر تم پر دوبارہ انسانی حالت طاری ہونی شروع ہونے لگے تو فوراً کسی جگہ اپنے آپ کو چھپا لو۔ یاد رکھو سانپ سے واپس انسانی حالت میں آتے ہوئے تمہارا سر چکرانا شروع کر دے گا۔"

میں نے کہا۔

"مہا دیو کے آشرم کو تو میں نے دیکھا ہے مگر مجھے یہ کیسے پتہ چلے گا کہ میری بیوی جس کال کوٹھری میں بند ہے وہ کس جگہ پر ہے کیونکہ میں اپنی بیوی کو مہادیو کے آشرم سے رات کے وقت نہیں نکال سکتا۔ وہاں بڑا سخت پہرہ لگا ہوتا ہے اور پہرے دار اور پجاری بھی جاگ رہے ہوتے ہیں۔ میں اس وقت اس کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں جب وہ کال کوٹھڑی میں بند ہو۔ کیونکہ وہاں زیادہ سے زیادہ دو پہرے دار ہو سکتے ہیں۔ میں سانپ کی شکل میں ان کو آسانی سے ختم کر سکتا ہوں۔ یہ بتاؤ کیا میرے ڈسنے کا دوسروں پر اثر ہوگا؟"

گندھرنی کہنے لگی۔

"تمہارے اندر ایسا تیز زہر آچکا ہے کہ جب تم دشمن کو ڈسو گے تو اس کا بدن پھٹ جائے گا۔"

اچانک میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے گندھرنی سے کہا۔

"مجھے ہلکے ہلکے چکر آ رہے ہیں۔"

وہ بولی۔

"تم سانپ کی شکل اختیار کرنے والے ہو۔ گھبراؤ نہیں۔ تمہیں یہی لگے گا کہ تم

انسان ہو۔ تم سانپ بن کر تیزی سے رینگنے لگو گے تو تمہیں یہی محسوس ہوگا کہ تم انسانی شکل میں تیز تیز دوڑ رہے ہو۔ تمہارا ذہن انسان کا ذہن ہی رہے گا۔ تمہاری آواز انسان کی آواز ہی رہے گی۔ تم انسان کی طرح بولو گے' انسان کی طرح سنو گے۔ انسان کی طرح سوچو گے' صرف تمہارا جسم تمہیں اور دوسروں کو سانپ کی شکل میں نظر آئے گا۔"

میں اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا جو مجھ پر اس وقت طاری تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے اپنے جسم کو دیکھ رہا تھا۔ میرے سر کے چکر ٹھیک ہوگئے۔ اچانک مجھے اپنا جسم سانپ کی شکل میں نظر آیا۔ یہ میرا جسم نہیں تھا۔ مجھے اپنا جسم نظر نہیں آرہا تھا۔ میرے جسم کی جگہ ایک چھوٹا سا سانپ کنڈلی مارے پھن کھولے بیٹھا تھا۔ یہ ایک عجیب و غریب اور حیرت ناک منظر تھا۔ میں نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے دماغ پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ میں انسانوں کی طرح سن رہا تھا' بول سکتا تھا۔ انسانوں کی طرح سوچ سکتا تھا انسانوں کی طرح محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ ہلایا تو مجھے اپنا ہاتھ ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں اپنے ہاتھ کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ گندھرنی میری طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم اس وقت مجھے سانپ کی شکل میں نظر آ رہے ہو۔ مگر اصل میں تم اپنی جگہ پر انسان کی شکل میں ہی ہو۔ یہ ایک چمتکار ہے۔ جو کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اب تم مہا دیو کے آشرم کا رخ کرو اور اپنی بیوی کو وہاں سے نکال لانے کی کوشش کرو۔ اس دوران تم پر ایسے لمحے بھی آئیں گے کہ جب تمہارا سانپ کا روپ ختم ہو جائے گا اور تم خود بھی اپنے آپ کو انسان کی شکل میں اور دوسروں کو بھی انسان کی شکل میں نظر آنے لگو گے۔ یہ وقت بڑا خطرناک وقت ہوگا۔ اس وقت تم پر حملہ ہو سکے گا۔ تمہیں اس وقت کے لیے ہوشیار رہنا ہوگا۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ وقت کتنی دیر بعد آسکتا ہے؟"

اس نے کہا۔

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہ لمحہ ایک گھنٹے کے بعد بھی آ سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ سارا دن ساری رات گزر جائے اور تم سانپ کی شکل میں ہی رہو۔ یہ تمہاری قسمت ہے۔ اب تم وقت ضائع نہ کرو اور مہا دیو جی کے آشرم کی طرف نکل جاؤ۔ جس کال کوٹھڑی میں تمہاری بیوی کو دن کے وقت قید کر دیا جاتا ہے میری معلومات کے مطابق وہ مہادیو کے خاص آشرم کے پیچھے ایک ٹیلہ ہے' اس ٹیلے کی پچھلی دیوار کے پاس ہے۔ یہ تمہیں وہاں جا کر پتہ چل جائے گا کیونکہ سانپ کی شکل میں آنے کی وجہ سے تمہیں اپنی بیوی کے جسم کی خوشبو آ جائے گی۔"

یہ بات میرے حق میں جاتی تھی۔ میں نے گندھرنی سے کہا۔

"میں جاتا ہوں۔ اگر میں اپنی بیوی کو نکالنے میں کامیاب ہو گیا اور ایسا موقع مل گیا تو میں سیدھا یہاں اسے لے کر تمہارے پاس آؤں گا اگر نہ آ سکا تو سمجھ جانا کہ میں اس علاقے سے نکل چکا ہوں۔ مجھے آخری ایک بات بتا دو۔"

"پوچھو۔" گندھرنی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

میں نے کہا۔

"تم نے مجھے جو خاص سفوف پلایا ہے اور جس کے اثر سے میں انسان سے سانپ کی شکل اختیار کر گیا ہوں اس کا اثر مجھ پر کتنے عرصے تک رہے گا؟"

وہ کہنے لگی۔

"اسی بارے میں شاستروں میں لکھا ہے کہ ان جڑی بوٹیوں کے رس کو پینے والے پر اس کا اثر ایک برس تک بھی قائم رہ سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے ایک مہینے تک بھی قائم رہ سکے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا اثر کئی برس تک باقی رہے۔ لیکن ایک برس کے بعد اس کا اثر بہت کم ہو جائے گا جو نہ ہونے کے برابر ہو گا۔ اب تم وقت ضائع نہ کرو۔ دن کافی نکل آیا ہے۔ اگر شام ہو گئی تو تمہاری بیوی کو کال کوٹھڑی سے نکال کر مہا دیو کے آشرم میں پہنچا دیں گے جہاں تمہارے لیے داخل ہونا مشکل ہو جائے گا۔

کیونکہ وہاں گنگولی ایسے سپیرے بھی موجود ہیں جو دور سے اجنبی سانپ کی بو سونگھ لیتے ہیں۔ وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔"

اور میں باہر گندھرنی کی گپھاہ سے نکل کر غار میں سے گزرتا ہوا دن کی روشنی میں باہر آ گیا۔ درختوں' جھاڑیوں اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے باہر روشنی میں آتے ہی اپنے جسم پر نظر ڈالی۔ یہ بڑی ڈرا دینے والی بات تھی کہ میرا جسم غائب تھا مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی جگہ ایک چھوٹا سا سانپ گھاس اور جھاڑیوں میں تیزی سے رینگتا چلا جا رہا تھا۔ میں بالکل غائب تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ سانپ میں نہیں ہوں۔ میں غائب ہوں اور یہ کوئی اور ہی سانپ ہے جو میرے غیبی جسم کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا ہے۔ میری ذہنی حالت بالکل صحیح تھی۔ جسم کو ذرا سی بھی بھوک اور پیاس محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایک عجیب تبدیلی میرے اندر یہ آ گئی تھی کہ مجھے فضا میں اپنی بیوی کے جسم کی بہت ہی ہلکی ہلکی خوشبو محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اپنی بیوی کے جسم کی اس خوشبو سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ خوشبو ہوا میں کسی کسی وقت آتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ ایسا میرے سانپ کی شکل میں ظاہر ہو جانے کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ سانپ کئی کئی کلومیٹر سے آنے والی بو سونگھ لیتا تھا۔ جمیلہ کے جسم کی مدھم خوشبو اس طرف سے آ رہی تھی جس طرف دور خونی جنگل کے سیاہ درختوں کی قطار کھڑی تھی۔ اس جنگل کے پیچھے آلوپ نگر کی کھنڈر عمارتیں اور مہا دیو کا آشرم تھا۔

میرا رخ بھی خونی جنگل کی طرف تھا۔ مجھے ایک خطرہ ضرور تھا کہ خونی جنگل میں داخل ہونے کے بعد کہیں وہاں کے زہریلے سانپ ایک اجنبی سانپ کو دیکھ کر مجھ پر حملہ نہ کر دیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ایک بھورے رنگ کا چھوٹا سانپ بڑی تیزی سے خونی جنگل کے درختوں کی طرف دوڑتا چلا جا رہا ہے۔ سانپ بڑی برق رفتاری سے

رینگ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں اس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہوں۔ حیرانی کی بات تھی کہ مجھے دوڑنے سے ذرا سی بھی تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ گویا میں سانپ سے الگ ہو کر اسے رینگتے دیکھ رہا تھا۔ عجیب معمہ تھا جو اس حالت میں میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ آج بھی جب میں آپ کو اپنی کہانی سنا رہا ہوں اور ان لمحات کو تصور میں لاتا ہوں تو بالکل نہیں سمجھ رہا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا اور کیسے ہو رہا تھا۔

میں اب یہ نہیں کہوں گا کہ سانپ رینگتے رینگتے خونی جنگل کے درختوں کے قریب ہو رہا تھا بلکہ یہ کہوں گا کہ میں رینگتے خونی جنگل کے درختوں کے قریب ہو رہا تھا۔ کیونکہ حقیقت میں یہ سانپ نہیں تھا بلکہ شواہد بتا رہے تھے کہ یہ میں ہی تھا۔

بہرحال میں اب آگے پہلے کی طرح اپنے طور پر ہی کہانی بیان کروں گا۔ خونی جنگل کے درختوں کی قطار دن کی روشنی اور دھوپ میں بالکل سامنے دکھائی دینے لگی تھی۔ میری بیوی کے جسم کی خوشبو ان درختوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ یہ بڑی اچھی بات تھی۔ یہ خوشبو مجھے میری بیوی کا سراغ لگانے میں میری مدد کر رہی تھی۔ میں خونی جنگل میں داخل ہوگیا۔ میں سانپ کی شکل میں چاروں طرف غور سے دیکھتا ہوا بے حد چوکنا رہ کر آگے کو رینگنے لگا تھا کیونکہ یہاں بے حد زہریلے سانپ' مگرمچھ اور دلدلیں اور آگے جا کر خونخوا بن مانس بھی تھے جو کسی بھی اجنبی انسان یا سانپ وغیرہ کو ایک سیکنڈ میں ہلاک کر دیتے تھے۔ میں اس بات سے پوری طرح باخبر تھا۔ میں جھاڑیوں کے اندر سے ہو کر رینگ رہا تھا۔

مجھے جنگل کے درختوں' جڑی بوٹیوں اور دلدلوں اور مگرمچھوں کی خاص بو محسوس ہونے لگی تھی۔ میرے اندر سانپ کی تمام حسیات بیدار ہو چکی تھیں۔ ایک جگہ مجھے دلدل کی تیز بو آئی۔ میں جھاڑی سے باہر نکلا تو دیکھا کہ سامنے سیاہ رنگ کی سطح والی دلدل تھی جو اس طرح اوپر نیچے ہو رہی تھی جیسے سانس لے رہی ہو۔ میں اس سے بچ کر نکل گیا۔ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ چاروں طرف سے سانپوں کے پھنکارنے کی

آوازیں آنے لگیں۔ میں وہیں رک گیا۔ میں نے پھن اٹھا لیا اردگرد دیکھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں سے نکل کر دس بارہ سرخ' سیاہ اور زرد رنگ کے چھوٹے چھوٹے سانپ میری طرف دیکھ کر پھن کھولے غصے سے پھنکار رہے تھے مگر میرے قریب کوئی نہیں آ رہا تھا میں سمجھ گیا کہ یہ دلی والے پر اسرار سادھو کی جڑی بوٹی کا اثر ہے جس کی وجہ سے میرے جسم سے ایسی بو خارج ہو رہی ہے جو ان سانپوں کو میری طرف آنے سے روک رہی ہے۔ میں نے زور سے پھنکاریں ماریں۔ سارے سانپ ڈر کر بھاگ گئے۔ مجھے اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ کم از کم خونی جنگل کا کوئی سانپ مگرمچھ وغیرہ مجھ پر حملہ نہیں کرے گا۔ صرف بن مانس کا ڈر تھا کیونکہ دلی والے سادھو نے مجھے بتا دیا تھا کہ بن مانس جسم سے خارج ہونے والی جڑی بوٹی کی بو کو محسوس نہیں کرے گا چنانچہ مجھے اس سے ہوشیار رہنا ہو گا۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں کوئی بن مانس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں تیزی سے اس جانب رینگنے لگا جس طرف سے میری بیوی کے جسم کی خوشبو مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ میری بیوی کے جسم کی خوشبو میری راہنمائی کر رہی تھی۔ خونی جنگل سے میں پہلے بھی گزر چکا تھا۔ میں جنگل کے درختوں اور جھاڑیوں کو پہچانتا بھی تھا۔ میری بیوی کے جسم کی خوشبو میری صحیح راہ نمائی کر رہی تھی۔ مجھے صرف اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں اچانک مجھ پر گندھرنی کے پلائے ہوئے سفوف کا اثر غائب نہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو میں اچانک انسانی شکل میں واپس آ جاؤں گا اور دوسروں کو دکھائی دینے لگوں گا۔ یہ بات میرے حق میں سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی اور میری ہلاکت کا باعث بھی ہو سکتی تھی لیکن ابھی تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس اچانک رونما ہونے والی تبدیلی سے بچنے کے لیے جتنی تیز رینگ سکتا تھا' درختوں' جھاڑیوں اور جھاڑ جھنکاڑ میں سے رینگتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ یہ خونی جنگل کافی رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ میں رینگتے ہوئے آدم خور جھاڑیوں کے درمیں سے بھی گزرا۔ کسی جھاڑی نے مجھے کچھ نہ کہا۔ بلکہ ایک مقام پر آدم خور جھاریوں کی شاخیں میرے

جسم کی بو پا کر تیزی سے سمٹ گئیں۔

میں جنگل کے اس گنجان حصے میں داخل ہو چکا تھا جہاں جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں درخت بالکل ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ یہ اتنے بڑے بڑے درخت تھے کہ اوپر جا کر ان کی گھنی شاخوں نے ایک دوسری میں الجھ کر چھت ڈال رکھی تھی۔ اس کی وجہ سے یہاں دن کے وقت بھی شام کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ مگر مجھے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سانپ رات کی تاریکی میں بھی سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ میرے اندر یہ خصلت بھی پیدا ہو گئی تھی اور جنگل کا ہلکا ہلکا اندھیرا میرے راستے میں رکاوٹ نہیں بن رہا تھا۔ انسان کی حیثیت سے مجھے درختوں کے درمیان شام کا اندھیرا بھی محسوس ہو رہا تھا اور سانپ کے روپ میں ہونے کی وجہ سے یہ اندھیرا مجھے دن کی روشنی کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ عجیب انقلاب تھا یہ جو میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں اپنے دل میں خدا سے معافیاں بھی مانگ رہا تھا کہ وہ میرے گناہ معاف کر دے اور میری بیوی جمیلہ کو اس جہنم سے نکالنے میں میری مدد فرمائے۔ میرا خدا جانتا تھا کہ میں نے اپنے اوپر جو سانپ کا روپ طاری کیا تھا تو یہ کسی دنیاوی لالچ کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ صرف اپنی منکوحہ بیوی کو وحشی پجاریوں کے پنجے سے چھڑانا چاہتا تھا۔ تاکہ اسے یہاں سے نکال کر پاکستان چلا جاؤں اور پھر کبھی بھارت کے اس جہنم کا رخ نہ کروں۔

میری رفتاری کافی تیز تھی۔ میں انسانی شکل میں ہوتا تو اتنی تیز اس قسم کے گنجان جنگل میں نہیں چل سکتا تھا مگر میں سانپ کی شکل میں تھا اور بڑی آسانی کے ساتھ جھاڑیوں میں سے راستہ بناتا لہراتا' رینگتا اپنی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اچانک ایک جگہ رک کر میں نے پھن اوپر اٹھا کر فضا کو سونگھا۔ مجھے اپنی بیوی کے جسم کی خوشبو اپنے دائیں جانب سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس طرف کا رخ پکڑ لیا۔ گنجان جنگل ختم ہو گیا۔ جنگلی جھاڑیوں اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہاں آگے چھوٹا ٹیلہ آئے گا جس کی دوسری جانب نشیب میں ایک چھوٹی سی وادی کی شکل میں آلوپ نگری کی شیطانی عمارتوں کے کھنڈر ہیں۔

میں اسی ٹیلے کی طرف جا رہا تھا۔ میری بیوی کے جسم کی خوشبو بھی اسی ٹیلے کی طرف سے آ رہی تھی۔ بہت جلد میں ٹیلے کے قریب آ گیا۔ میں نے رک کر ٹیلے کو غور سے دیکھا۔ یہ وہی ٹیلہ تھا۔ میں اس کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ میں ابھی آدھی چڑھائی پر تھا کہ ایک طرف سے کالے رنگ کا بن مانس چیخیں مارتا سینے پر زور زور سے ہاتھ مارتا' نمودار ہوا اور جہاں میں رینگ رہا تھا وہاں آ کر جھک کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور نوکیلے دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ بن مانس نے اپنا لمبا بازو آگے کر کے مجھ پر زور سے ہاتھ مارا۔ اگر میں تیزی سے ایک طرف نہ کھسک جاتا تو اس نے میرے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ میں گندھرنی سے یہ نہیں پوچھ سکا تھا کہ اگر مجھ پر کوئی گولی کا فائر ہو گیا یا کسی بن مانس نے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تو کیا میں سچ مچ مر جاؤں گا۔

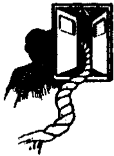
اس خیال ہی سے میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اب میں اپنی جان بچانے کے سلسلے میں زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ میں جھاڑیوں میں گھس کر بن مانس کی نظروں سے غائب ہو گیا اور دوسری طرف جا کر ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ اب مجھے اپنی جان کی زیادہ فکر ہو گئی تھی۔ میں ٹیلے کی چوٹی پر آ گیا۔ میں نے دوسری طرف دیکھا۔ میں اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا۔ نیچے نشیب میں آلوپ نگر کی شیطانی بستی دن کی دھوپ میں صاف نظر آ رہی تھی۔ کھنڈر نما عمارتوں پر وہی پہلے روز والی ویرانی اور آسیب زدہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی چرند پرند اور انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ڈھلان پر رینگنے لگا۔ اس وقت آسمان پر ایک جانب سے کالے کالے بادلوں کے ٹکڑے نمودار ہونے لگے تھے۔ اس علاقے کے موسم سے میں اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ یہاں جب آسمان پر بادل آتے تھے تو وہ برس کر ہی جاتے تھے۔ پھر بارش ضروری ہوتی تھی۔ مجھے بارش کا خیال آیا تو یہ سوچ کر مجھے تسلی ہو گئی کہ میں سانپ کے روپ میں ہوں اور میرے کپڑے بارش میں نہیں بھیگیں گے۔ میں نشیب میں ہموار زمین پر آ گیا۔ یہاں سے مجھے آگے مہا دیو کے آشرم کے عقب میں جانا تھا جہاں گندھرنی کی اطلاع کے مطابق

ایک ٹیلہ تھا جس کے پیچھے وہ کال کوٹھڑی تھی جہاں دن کے وقت میری بیوی کو بند کر دیا جاتا تھا۔

میں نے رک کر فضا کو سونگھا۔ جس طرف مہا دیو کا آشرم تھا اور جہاں درختوں کے پیچھے پیچھے سے ہو کر جوگن ملایا دیوی پہلی بار مجھے مہا دیو کے آشرم کی طرف لے گئی تھی اس جانب سے میری بیوی کے جسم کی خوشبو آ رہی تھی۔ یہ خوشبو پہلے سے زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میری بیوی اس وقت کال کوٹھڑی میں موجود تھی اور میں اس کے قریب سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے دل میں دعا مانگی۔ یا اللہ پاک! مجھے اتنی طاقت عطا کرنا کہ میں اپنی بیوی کو یہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ ایک بات میرے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور اس کا مجھے برابر دھڑکا لگا ہوا تھا کہ میری بیوی کو جب پتہ چلا کہ میں سانپ کے روپ میں ہوں اور اس سے اپنی انسانی آواز میں باتیں کر رہا ہوں تو اس پر کیا اثر ہو گا۔ کہیں وہ ڈر کر بے ہوش تو نہیں ہو جائے گی؟ دوسری پریشانی مجھے یہ تھی کہ میں سانپ کی شکل میں اسے یہاں سے نکالوں گا کیسے؟ پہرے دار اور پجاری سپیرے مجھے تو نہیں دیکھ سکیں گے۔ میں سانپ کی شکل میں ان کی نظروں سے ادھر ادھر چھپ سکوں گا مگر میری بیوی تو انہیں صاف نظر آ جائے گی۔ وہ تو اسے فوراً پکڑ لیں گے۔ اس کا میرے پاس ایک ہی علاج تھا کہ میں پہرے داروں اور پجاریوں میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑوں۔ مگر سوال یہ تھا کہ وہاں تو سپیرے فوجیوں کی پوری پلٹن تھی میں کس کس کو ڈس سکوں گا۔ اتنی دیر میں تو کسی نہ کسی سپیرے کی سٹین گن کا فائر مجھے موت کی نیند سلا دے گا یا کوئی نہ کوئی مجھے پتھر سے یا گن کے بٹ سے یا اپنے جوتوں سے کچل ڈالے گا۔ عجیب پریشان کر دینے والی الجھن میں مبتلا تھا اور اپنی بیوی کی خوشبو کے پیچھے پیچھے چلا بھی جا رہا تھا۔

میں انہی درختوں کی آڑ میں رینگ رہا تھا جہاں سے مجھے جوگن ملایا دیوی مہا دیو کے آشرم کے عقبی تالاب پر لے کر گئی تھی۔ میں درختوں سے نکل آیا۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ ابھی تک کسی انسان کو نہ میں نے دیکھا تھا' نہ کسی کی مجھ پر نگاہ پڑی تھی۔

کوئی بندر یا بن مانس بھی یہاں نہیں ملا تھا۔ میرے سامنے مہا دیو آشرم کا پوتر تلاب تھا۔ تلاب پر بھی کوئی داسی نرتکی یا پجاری نہیں تھا۔ مَیں نے سامنے والے درختوں کی طرف پھن اُٹھا کر دیکھا۔ ان درختوں کے پیچھے چھوٹے ٹیلے کی جھاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں اور آسمان پر جو بادل تھے وہ ایک دوسرے میں مکمل مل کر گھٹا کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ ہوا بھی تھوڑی تیز چلنے لگی تھی۔ تیز ہوا کی وجہ سے کسی وقت مجھے اپنی بیوی کے جسم کی خوشبو آتی اور کسی وقت بالکل غائب ہو جاتی تھی۔ مجھے تھوڑی تھوڑی دُور جا کر بیوی کی خوشبو کو فضا میں سونگھنا پڑتا تھا۔ آسمان پر بادلوں کی گھٹا زیادہ گہری اور کالی ہونے لگی تھی۔ میں نے انسانی آنکھوں سے دیکھا تو دھوپ غائب ہو گئی تھی اور دن کی روشنی دھندلی اور نیم تاریک ہونا شروع ہو گئی تھی۔ سانپ کی آنکھ سے دیکھا تو مجھے اس دھندلکے میں بھی دن کی روشنی صاف نظر آ رہی تھی۔ مَیں تلاب کے قریب سے ہو کر گزر گیا۔ تلاب کی ایک جانب سنگ مرمر کی روش سی بنی ہوئی تھی۔ مَیں فرش پر رینگنے لگا۔ سنگ مرمر کی روش پر رینگتے ہوئے مجھے سخت دقت پیش آ رہی تھی۔ میں جلدی سے دائیں جانب گھاس میں چلا گیا۔ سنگ مَرمَر پر میرا سانپ کا لچکدار جسم پھِسل جاتا تھا۔ گھاس میں آتے ہی مَیں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔





مجھے سنگ مرمر کی روش پر تین چار دیوداسیاں نظر آئیں۔
انہوں نے پیتل کی گاگریں اپنے کولہوں میں دبا رکھی تھیں اور ہنس ہنس کر ایک دوسری سے باتیں کرتی چلی آ رہی تھیں۔ میں سنگ مرمر کی روش سے ہٹ کر پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑیوں میں رینگ رہا تھا۔ وہ میرے قریب سے گزر گئیں۔ ان میں سے کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑی۔ ویسے بھی میں جھاڑیوں کی اوٹ میں تھا اور سانپ بھی چھوٹا سا تھا۔ میں آگے کو رینگنے لگا۔ اچانک مجھے روش پر ایک اور دیوداسی آتی دکھائی دی۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ جوگن ملایا دیوی کی سہیلی اور ہماری خاص دوست اور ہمدرد سیندھیا تھی۔ میں جذبات سے مغلوب ہو کر انسانی احساسات کے زیر اثر جھاڑیوں میں سے نکل کر اس کے سامنے سنگ مرمر کی روش پر آ گیا۔ ایک سانپ کو اپنے سامنے دیکھ کر سیندھیا چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی چیخ کی آواز سن کر دوسری عورتیں اس کی طرف آ گئیں۔ وہ اس سے پوچھنے لگیں کہ کیا ہو گیا ہے۔ سیندھیا نے کہا۔

"یہاں ایک سانپ ہے۔"

"اس دوران میں جھاڑیوں میں چھپ گیا تھا۔ لڑکیاں حیران ہو کر اور کچھ ڈر کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ ایک نے کہا۔

"یہاں تو مجھے کوئی سانپ نظر نہیں آ رہا۔"

سیندھیا نے کہا۔

"میں نے اپنی آنکھوں سے ایک چھوٹے بھورے سانپ کو دیکھا ہے۔"

دوسری دیوداسی یا پجارن بولی۔

"دیوانی ہوگئی ہے تو سیندھیا! تجھے معلوم نہیں کہ مہا دیو جی کے حکم سے یہاں کسی سانپ کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔"

سیندھیا خوف زدہ نظروں سے دائیں طرف والی جھاڑیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"وہ اس طرف جھاریوں میں گیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سانپ کو جاتے دیکھا ہے۔"

دوسری عورتیں سیندھیا کا مذاق اڑانے لگیں کہ اس نے رات کو جو سوم رس پیا تھا یہ اس کا اثر ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ لے کر تالاب کی طرف چل دیں۔ میں سیندھیا کو جاتے دیکھتا رہا۔ جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی تو میں ٹیلے کی طرف رینگنے لگا۔ میری بیوی جمیلہ کے جسم کی خوشبو یہاں بہت تیز ہوگئی تھی اور سیدھی ٹیلے کی طرف سے آ رہی تھی۔ آسمان پر کالی گھٹا اور گہری ہوگئی تھی اور اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ میں ٹیلے کے قریب جا کر اس کے پہلو کے ساتھ ساتھ اونچی گھاس اور جھاڑیوں میں سے رینگتا ٹیلے کے پیچھے آ گیا۔ یہاں ایک جانب سے جمیلہ کی خوشبو بہت تیزی سے آ رہی تھی۔ میں اس طرف تھوڑی دور رینگتا چلا گیا۔

میں بڑی احتیاط سے چاروں طرف سے باخبر ہو کر رینگ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں سخت پہرہ ہوگا اور مسلح سپیرے سٹین گن لیے موجود ہوں گے۔ میں اونچے اونچے پھولوں والے پودوں میں آ کر سمٹ گیا۔ مجھے کچھ آدمیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں نے آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے پودوں میں سے اپنی سانپ والی سری باہر نکال کر دیکھا۔ ٹیلے کے پہلو میں میرے بالکل سامنے پتھر کی ایک کوٹھڑی تھی جس پر سبز بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ کوٹھڑی کے بند دروازے کے آگے پتھر کے ستونوں پر بالکل آمنے

سامنے دو سپیرے فوجی بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ گھٹا جھکی ہوئی تھی۔ ہوا بھی تیز ہوگئی تھی۔ تیز ہوا کا جھونکا آتا تو میری بیوی کے جسم کی خوشبو غائب ہو جاتی۔ ہوا کا دوسرا جھونکا سامنے کی طرف سے آتا تو جمیلہ کے جسم کی خوشبو دوبارہ محسوس ہونے لگتی۔ یہ بات طے تھی کہ جمیلہ سامنے والی کال کوٹھڑی میں بند ہے اور باہر پہرہ لگا ہوا ہے۔ مجھے اپنی بیوی کو اس کال کوٹھڑی سے نکالنا تھا۔ ان دونوں پہرے داروں سے نجات بھی حاصل کرنی تھی۔ یہ رات کا وقت نہیں تھا' دن کا وقت تھا۔ اگرچہ دن کی روشنی بہت کم ہوگئی تھی پھر بھی یہ دن تھا۔ اگر میں ان پہرے داروں کے پاس جاتا ہوں تو مجھے دیکھا جا سکتا تھا۔ میرا انسانی ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ میں نے سوچنا شروع کر دیا۔ مجھے خیال آیا کہ دن کے وقت پہرے داروں کو ہلاک کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ اگر مسلح پہرے داروں کو میں مار بھی دیتا ہوں تو کال کوٹھڑی کو تالا لگا ہوا ہوگا اور چونکہ انسانی شکل میں نہیں ہوں' سانپ کی شکل میں ہوں اس لیے تالا نہیں کھول سکوں گا اور اگر تالا نہیں کھول سکوں گا تو جمیلہ کو کیسے باہر نکالوں گا۔ بہتر یہی ہے کہ میں رات ہونے کا انتظار کروں۔ کیونکہ رات کو پہرے دار جمیلہ کو نکال کر مہادیو کے آشرم میں لے جائیں گے' میں صرف اس وقت حملہ کر سکتا ہوں۔ رات کا اندھیرا بھی ہوگا۔ میری بیوی کال کوٹھڑی سے بھی باہر ہوگی۔ اس وقت میری کامیابی یقینی ہوگی۔

یہ سوچ کر میں نے کال کوٹھڑی کی طرف جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور وہیں جھاڑیوں میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ میں سانپ کی شکل میں کنڈلی مار کر جھاڑیوں کے اندر گھاس اور شاخوں میں چھپ کر بیٹھا تھا اور انسان کی حیثیت سے اپنے آپ کو جھاڑیوں کے باہر بھی محسوس کر رہا تھا۔ گو مجھے اپنا جسم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس کو اگر میں دنیا کی کسی بھی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کروں' بیان نہیں کر سکوں گا۔ کالی گھٹا اسی طرح چھائی ہوئی تھی۔ مجھے جھاڑیوں کے اندر چھپے چھپے جھاڑیوں کے پتوں پر اپنے اوپر بارش کے قطروں کی ٹپ ٹپ سنائی دی۔ بارش شروع

ہوگئی تھی لیکن ابھی ٹپ ٹپ کی شکل میں ہی تھی۔ گھٹا کا رنگ ڈھنگ بتا رہا تھا کہ یہ گھٹا ٹوٹ کر برسے گی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جب بارش ہوتی ہے تو سانپ کیا کرتے ہیں۔ کیا وہ بارش میں ہی بیٹھے رہتے ہیں یا کسی بل میں گھس جاتے ہیں۔ یہ بھی سانپ کے روپ میں مجھے نیا تجربہ ہونے والا تھا۔ میں سانپ کی حیثیت سے بارش کی بوندوں کو اپنے جسم پر محسوس بھی کر رہا تھا اور انسان کی غیبی شکل میں سانپ کو دیکھ بھی رہا تھا کہ بارش میں سانپ کیا کرتا ہے۔

بارش بوندا باندی کی شکل میں ہونے لگی۔

میں برابر سانپ کو دیکھ رہا تھا۔ سانپ نے کنڈلی کھول دی اور جھاڑیوں کی موٹی جڑوں کے پیچھے سمٹ گیا۔ مجھے بارش کی نمی اور گیلا پن بالکل محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ سانپ کو محسوس ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جھاڑیوں کی جڑوں میں ہوگیا تھا تاکہ اپنے آپ کو بارش سے بچا سکے۔ اس کا مطلب تھا کہ سانپ بارش میں چھپنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ اگر موسلادھار بارش شروع ہوگئی تو سانپ یہاں کس جگہ پر چھپے گا۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ میرا سانپ کے ارادوں پر پورا کنٹرول نہیں تھا۔ اگرچہ میں اس کے اور وہ میرے ارادوں سے واقف تھا اور جو میں چاہتا تھا سانپ وہی کر رہا تھا۔ لیکن سانپ کی اپنی جبلت بھی تھی وہ اپنی جبلت کے مطابق بھی کام کر رہا تھا۔ مثال کے طور پر سانپ بار بار منہ سے زبان باہر نکال کر لہراتا تھا' جبکہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں زبان نہیں نکالتا تھا۔

اتنے میں بادلوں میں زبردست گرج کی گونج پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی موسلادھار بارش شروع ہوگئی۔ سانپ جھاڑیوں کی جڑوں میں سے نکل کر باہر آگیا اور دوسری طرف سے ہو کر کال کوٹھڑی کی پچھلی دیوار کی طرف بھاگا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا بلکہ جیسے میں اس کے بالکل اوپر ہوا میں اڑ رہا تھا۔ میں اس سے الگ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اس کے بالکل اوپر تھا۔ ایک دو بار میں نے سانپ سے الگ ہو کر دوسری طرف جانے کی کوشش کی تو میں ایسا نہ کر سکا جیسے کسی غیبی طاقت نے مجھے سانپ کے

ساتھ باندھا ہوا تھا۔ میں نے سانپ کے اوپر ہوا میں تیرتے اور سانپ کے ساتھ ساتھ جاتے ہوئے دیکھا کہ کال کوٹھڑی کے باہر جو دو سپیرے سپاہی بیٹھے تھے وہ اٹھے اور دوڑ کر کوٹھڑی کے دروازے کے آگے جو چھجہ سا بنا ہوا تھا اس کے نیچے چلے گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اسی جگہ پر بارش سے بچ کر رہنے والے تھے۔ وہ کال کوٹھڑی سے دور نہیں جا سکتے تھے۔ سانپ کوٹھری کے پیچھے آ کر دیوار کے ساتھ ساتھ رینگنے لگا۔ یہ سب کچھ ایک طرح سے سانپ نہیں کر رہا تھا' میں ہی کر رہا تھا۔ چونکہ میں سانپ سے تین چار فٹ الگ رہ کر اسے ایسا کرتے دیکھ رہا تھا اس لیے مجھے محسوس ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ سانپ ہی کر رہا تھا۔ سانپ میرے ارادوں کا پابند تھا۔ ایک طرح سے میں اس سانپ کے اندر بھی تھا اور باہر بھی تھا۔

یہ میری زندگی کا سب سے انوکھا' ڈراؤنا اور ہیبت ناک تجربہ تھا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ میری جان اس سانپ میں تھی۔ اگر سانپ کو کچھ ہو جاتا ہے تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ مجھے یقین تھا۔ اگرچہ گندھرنی نے اس سلسلے میں مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ کیا سانپ کے مر جانے کی صورت میں' میں زندہ رہوں گا یا نہیں۔ سانپ کو کوٹھڑی کی دیوار میں سے ایک بل نظر آ گیا۔ وہ میری مرضی سے اس بل میں گھس گیا۔ یوں تصور کریں کہ میں خود سانپ کے روپ میں اس بل میں گھس گیا۔ بل تنگ و تاریک تھا۔ مگر جب میں نے سانپ کے احساسات سے محسوس کیا تو وہ بل مجھے ایک کمرے جتنا کشادہ اور روشن نظر آیا۔ میں سانپ کے روپ میں بل کے اندر گھس کر لیٹا رہا۔ باہر بڑی زور دار بارش ہو رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے' بجلی چمک رہی تھی۔ دیوار کی ڈھال چونکہ ٹیلے کی ڈھال تھی اور سطح زمین سے بلند تھی اس لیے بل کے اندر بارش کا پانی نہیں آ رہا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھ کر یا لیٹ کر رات ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں سانپ کی شکل میں زیادہ دیر تک اس بل میں گھس کر نہیں بیٹھ سکوں گا۔ لیکن یہاں بھی سانپ کی جبلت کام آئی۔ سانپ کی یہ بھی ایک قدرتی عادت ہے کہ وہ بل کے اندر کئی کئی دن تک چھپا رہتا ہے۔ ہم لوگ تو کسی جگہ

ایک آدھ گھنٹہ بھی مشکل سے کسی کا انتظار کر سکتے ہیں لیکن سانپ بچھو اور مکڑیاں وغیرہ بارہ بارہ بلکہ اڑتالیس اڑتالیس گھنٹے ایک جگہ چھپ کر اسی حالت میں گزار دیتی ہیں۔ قدرت نے ان کے اندر انتظار کرنے سے جو کوفت ہوتی ہے وہ مادہ بے حس کر دیا ہوتا ہے۔ لہٰذا انہیں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ میں سانپ کی شکل میں بل کے اندر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ باہر بارش ہوتی رہی۔ بجلی چمکتی رہی' بادل گرجتے رہے۔ یہ سوچ کر مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا کہ جس بل میں میں سانپ کے روپ میں چھپا ہوا ہوں اس کے اوپر کوٹھڑی کے اندر میری پیاری اور مصیبت زدہ بیوی جمیلہ قید و بند کی حالت میں پڑی ہے۔

ایک اور بات بھی مجھے پریشان کر رہی تھی کہ اگر جمیلہ نے مجھے انسانی روپ میں بھی پہچاننے سے انکار کر دیا' میری آواز سن کر بھی مجھے شناخت کرنے سے انکار کر دیا اور سپیروں اور مہا دیو کے منتروں کے ایک بار پھر زیر اثر ہوئی تو پھر میں کیا کروں گا۔ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ پھر تو میں اسے کسی صورت اپنے ساتھ نہ لے جا سکوں گا۔ پہلے روز کی طرح وہ دوبارہ شور مچاوے گی اور مسلح سپیرے وہاں پہنچ جائیں گے اور میں سانپ کی شکل میں ہوا یا انسانی شکل میں بھی ہوا تو مجھے اپنی جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔ میں ان خیالات کی گتھیاں سلجھاتا بل کے اندر سمٹا ہوا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال آنے لگا کہ اگر اس وقت مجھ پر گندھرنی کی آکاش بوٹی کا اثر کم ہوگیا یا کمزور ہوگیا اور میں انسان کی شکل میں واپس آگیا تو میں تو بل کے اندر گھٹ کر مر جاؤں گا۔ سانپ ایک بل کے اندر ایک آدمی کیسے سما سکتا ہے۔ میری تو ہڈیاں چور چور ہو جائیں گی۔ اس تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میرا جسمانی احساس سانپ سے ضرور الگ تھا۔ مثال کے طور پر سانپ اگر بارش میں بھیگتا تھا تو میں نہیں بھیگتا تھا۔ مجھے پانی کے جسم پر گرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا لیکن میرے سارے ارادے سانپ کے ساتھ تھے۔ سانپ وہی کچھ کرتا تھا جس کا میں ارادہ کرتا تھا۔ اس میں اس کی جبلت اپنا کام الگ کرتی تھی۔ اس کی جبلت اور عادت پر

میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔ باہر بارش موسلادھار ہو رہی تھی۔ مجھے سانپ کی شکل میں اس کی آواز برابر آ رہی تھی۔ یہاں میں یہ بات آپ کو بتاتا چلوں کہ سانپ کے کان نہیں ہوتے۔ بعض کہتے ہیں کہ سانپ اپنے جسم کی کھال کی وجہ سے سنتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ سانپ جو بار بار اپنی زبان باہر نکالتا ہے تو اس کی مدد سے وہ سنتا بھی ہے اور فضا کی سرسراہٹیں' آہٹیں اور نمی اور آوازوں کی لرزش کو محسوس کرتا ہے۔ بہرحال سانپ کے روپ میں بارش کی آواز مجھے آ رہی تھی۔ جب بارش تھم گئی تو میں بل سے باہر نکل آیا۔ ٹیلے کی ڈھلان کے نشیب میں بارش کا پانی کھڑا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ رینگتا ہوا کوٹھڑی کے دروازے کے طرف گیا اور دیوار میں سے سر ذرا سا باہر نکال کر دیکھا۔ ابھی دن کی روشنی باقی تھی۔ بارش تھم جانے کی وجہ سے سپیرے فوجی سٹین گنیں کندھوں پر لٹکائے کوٹھڑی کے آگے پتھر کے سٹولوں پر دوبارہ آ کر بیٹھ گئے تھے۔

میں واپس بل میں آ گیا۔ اس بار میں دیر تک بل کے اندر ہی رہا۔ جب باہر شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تو میں نے ایک بار پھر باہر نکل کر کوٹھڑی کے دروازے کا جائزہ لیا۔ کوٹھڑی کے باہر چھجے کے نیچے ایک لالٹین روشن کر دی گئی تھی۔ اس کی روشنی میں مجھے دو کی بجائے تین سپیرے فوجی دکھائی دیے۔ میں نے اب بل میں گھسنے کی بجائے باہر رہنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ جس وقت یہ لوگ میری بیوی کو مہادیو کے آشرم میں لے جانے کے لیے باہر نکالیں تو میں اپنا کمانڈو ایکشن شروع کر سکوں۔ یہ ایک سانپ کا کمانڈو ایکشن تھا' یا یوں سمجھ لیں کہ ایک کمانڈو سانپ کے روپ میں ایکشن کرنے والا تھا۔ میں کوٹھڑی کے قریب ہی ایک جگہ جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ چھوٹا سا سانپ کہیں بھی چھپ سکتا تھا۔ میں جھاڑیوں کی اوٹ میں کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔ شام گہری ہوتے ہوتے رات میں تبدیل ہو گئی۔ سپیرے فوجی بیٹھے بیٹھے کسی وقت اٹھ کھڑے ہوتے اور سٹین گن ہاتھ میں لیے کوٹھڑی کے آگے ٹہلنے لگ جاتے۔ اچانک مجھے چکر سے آنے لگے۔ میں کچھ گھبرا سا گیا۔

مجھے ایسا لگا جیسے میرا جسم بھاری ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے جب میں سانپ کے روپ میں تھا تو مجھے اپنے جسم کا بوجھ بالکل محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میں ہوا یا بادل کے ٹکڑے کی طرح ہلکا تھا۔ اب مجھے اپنے جسم کا بوجھ آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ میرے جسم پر گندھرنی کی آکاش بوٹی کا اثر کمزور ہونے لگا ہے اور اب میں کسی بھی وقت سانپ سے انسانی شکل میں واپس آ سکتا ہوں۔ میں گھبرا کر جھاڑیوں میں سے نکلا اور تیزی سے سامنے والے درختوں کی طرف رینگنے لگا۔ ان درختوں میں اندھیرا تھا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے میں انسانی شکل میں واپس آگیا تھا۔ میں سانپ کی بجائے کرم داد بن چکا تھا اور زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ میں اسی طرح لیٹا رہا۔ سانپ سے انسان کی شکل میں واپس آتے ہوئے مجھے ذرا سی بھی دقت نہیں ہوئی تھی۔ بالکل ایسے لگا تھا جیسے میں کسی پائپ میں سے سانپ کی شکل میں گزر رہا تھا۔ پائپ کے باہر آیا تو انسانی شکل اختیار کر چکا تھا۔ میں خوف زدہ نہیں تھا۔ پریشان ضرور تھا۔ سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اگر میں دوبارہ سانپ کی شکل میں واپس نہ آیا تو کیا ہوگا۔ انسان کی شکل میں رہ کر میں ان تین مسلح سپیرے فوجیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ہر حالت میں اس وقت سانپ کی شکل میں موجود ہونا چاہیے تھا جس وقت یہ لوگ میری بیوی کو کوٹھڑی سے نکال رہے ہوں۔ گندھرنی نے کہا تھا کہ میں تھوڑے وقفے کے بعد سانپ سے انسانی شکل میں اور انسانی شکل سے سانپ کی شکل اختیار کرتا رہوں گا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ وقفہ ایک گھنٹے کا بھی ہو سکتا ہے دو گھنٹوں کا بھی ہو سکتا ہے اور دو منٹ کا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سب کچھ آکاش بوٹی جس کا میں نے سفوف پیا تھا' اس کے میرے انسانی جسم سے کیمیکل ردعمل کی وجہ سے تھا۔

میں جہاں لیٹا ہوا تھا وہاں اندھیرا تھا۔ میں آہستہ سے اٹھ بیٹھا۔ سب سے پہلے میں نے کوٹھڑی پر نگاہ ڈالی۔ کوٹھڑی کے چھجے پر جو لالٹین لٹک رہی تھی اس کی روشنی میں مجھے وہاں تین کی بجائے چار سپیرے فوجی نظر آئے۔ میرے خدا! دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا اور میں نہتا تھا۔ میرے پاس پیاز چھیلنے والا چاقو تک نہیں تھا۔

کمانڈو ٹریننگ کے حساب سے بھی میں ایک ہی وقت میں سامنے جا کر ان کی گردنیں نہیں توڑ سکتا تھا۔ کیونکہ کمانڈو کبھی سامنے آکر نہیں لڑتا۔ وہ اندھیرے میں شب خون مارتا ہے اور دوسری بات یہ تھی کہ یہ چار سپیرے فوجی تھے اور مسلح تھے۔ میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر فرض کر لیا میں ایک دو کی گردنیں توڑنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہوں تو باقی دو مجھے سٹین گنوں کے برسٹ مار کر بھون سکتے تھے۔ میں خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ یا خدا مجھے پھر سے سانپ بنا دے۔ مجھے پھر سے سانپ کی شکل عطا کر دے۔ اتنے میں خدا جانے بارش کی خنکی وجہ سے یا جانے کس وجہ سے مجھے چھینک آ گئی۔ چھینک اس قدر زور دار اور میرے اختیار سے باہر تھی کہ میں اسے روکتا ہی رہ گیا لیکن وہ اپنا کام کر گئی۔ چھینک کی آواز بھی بڑی زور دار تھی۔

چھینک کی آواز سنتے ہی دو سپیرے فوجی تیز تیز قدموں سے میری طرف آئے۔ میں اٹھ کر دوڑ پڑا۔ انہوں نے سٹین گن کا برسٹ مارا۔ برسٹ انہوں نے اوپر کر کے فائر کیا تھا ورنہ میں وہیں ختم ہو گیا تھا۔ شاید وہ بھی مجھے زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے اندھیرے میں دوڑتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو آوازیں دے کر ہوشیار کرنے لگے۔ اچانک سامنے سے دو آدمی نکلے اور انہوں نے مجھے نیچے گرا لیا۔ اس دوران کال کوٹھڑی والے سپیرے فوجی بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے سٹین گنوں کی نالیاں میرے جسم سے لگا دیں اور ایک نے کہا۔

"کون ہو؟ جلدی اٹھو۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر لالٹین کے پاس لے آئے۔ اب وہ چھ آدمی تھے چار نے سٹین گنوں کا رخ میری طرف کر رکھا تھا۔ ایک نے مجھے پیچھے سے پکڑا ہوا تھا اور ایک ان کا کوئی جو سردار لگتا تھا میری طرف جھک کر مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے ان کے ساتھ جو میری جنگ ہوئی تھی تو ہم ایک دوسرے سے دور دور رہ کر ایک دوسرے پر فائرنگ کرتے رہے تھے۔ اس فوجی سپیرے نے مجھ سے پوچھا۔

"کون ہو تم؟ ادھر کیسے آ گئے؟"

میں نے فوراً" کہا۔

"میں شکاری ہوں مہاراج! جنگل میں شکار کھیلنے نکلا تھا۔ اندھیرے میں راستہ بھول کر ادھر نکل آیا۔ معاف کر دیں۔"

مجھے یہ بھی خیال تھا کہ کال کوٹھڑی میں بند میری بیوی جمیلہ شاید میری آواز سن لے اور اسے پتہ چل جائے کہ میں اس کی مدد کو وہاں پہنچ گیا ہوں۔ دوسرے سپیرے فوجی نے سخت لہجے میں کہا۔

"تم شکاری ہو تو تمہاری بندوق کہاں ہے۔ تم تو اپنے لباس سے کوئی جوگی معلوم ہوتے ہو۔ سچ بتاؤ تم کون ہو اور تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟"

تیسرے سپیرے فوجی نے کہا۔

"یہ پولیس کا جاسوس ہے۔ اسے جھانسی کی سی آئی ڈی پولیس نے آلوپ نگر کی جاسوسی کے لیے بھیجا ہے۔ اسے یہیں ختم کر دو۔ یہ ہمارا دشمن ہے۔"

سردار سپیرا بولا۔

"مجھے یہ ہمارے دشمن ناگ مندر والوں کا جاسوس لگتا ہے یا پھر یہ وہی جوگی ہے جو اس سے پہلے مہادیو جی کی نرتکی کو یہاں سے بھگانے آیا تھا۔"

ایک اور سپیرے فوجی نے اس خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس کو ابھی مہادیو جی کے آشرم میں لے جاتے ہیں۔ مہادیو جی خود اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ کریں گے۔"

میں دہائی دینے لگا کہ میں معمولی جوگی ہوں۔ میرا ناگ مندر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں جنگل میں اپنی کٹیا کا راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہوں۔ انہوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ وہ مجھے گھونسے مار رہے تھے۔ لاتیں مار رہے تھے اور کہتے جا رہے تھے۔

"تم دشمن کے آدمی ہو۔ ناگ مندر کے جوگی جاسوس ہو۔ ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ چلو اسے مہادیو جی اور گنگولی سپیرے کے پاس لے چلو۔"

انہوں نے فوراً" میرے دونوں ہاتھ سٹین گن کی سلنگ اتار کر میرے پیچھے کس کر باندھ دیے اور چار سپیرے مجھے ٹھڈے مارتے کھینچ بلکہ گھسیٹتے ہوئے مہا دیو کے شیطانی آشرم کی طرف لے کر چل پڑے۔ میری رہائی کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ میں مہا دیو کے آشرم تک پہنچنے سے پہلے انسان سے سانپ کی شکل میں واپس آ جاؤں۔ گندھرنی نے کہا تھا کہ یہ وقفہ ایک گھنٹے کا بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اس وقت میں اپنے جسم میں سانپ بن جانے سے پہلے کے کوئی اثرات اور نشانیاں محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں ان چاروں سے نمٹ سکتا تھا مگر ایک تو انہوں نے میرے دونوں ہاتھ بڑی مضبوطی سے میری پشت پر باندھ رکھے تھے دوسرے میں اس کش مکش میں تھا کہ اگر میں کسی طرح رسی تڑا کر ان سے گتھم گتھا ہو گیا اور انہوں نے فائرنگ شروع کر دی تو وہاں اور بھی فوجی آ جائیں گے اور پھر نہ صرف یہ کہ جمیلہ کو وہاں سے نکالنے کا مشن دھرے کا دھرا رہ جائے گا بلکہ ممکن ہے میں بھی زندہ نہ بچ سکوں گا۔ میں یہی کچھ سوچتا اور ان لوگوں کی لاتیں اور دھکے کھاتا ان کے ساتھ ساتھ گھسیٹتا چلا جا رہا تھا۔ سامنے آشرم کے پتھر کا بڑا دروازہ نظر آنے لگا جہاں پیتل کے دس بارہ دیے محرابوں میں روشن تھے۔ ابھی یہ دروازہ کوئی ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر تھا کہ اچانک مجھے چکر سا آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا جسم ہلکا ہونا شروع ہو گیا۔ میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

میرا روپ بدلنے والا تھا اور پھر جیسے ہی چاروں سپیرے فوجی مجھے کھینچتے ہوئے آشرم کے دروازے کے قریب پہنچے' میں ان کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا مگر وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں اس سانپ کو بھی دیکھ رہا تھا جو میرا دوسرا روپ تھا اور جو بڑی تیزی سے درختوں اور جھاڑیوں کی تاریکی میں غائب ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے سانپ کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہکا بکا ہو کر کھڑے پہلے ادھر ادھر دیکھنے لگے کہ میں کہاں غائب ہو گیا ہوں۔ پھر ایک دوسرے کی طرف حیرت زدہ ہو کر تکنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"یہ جوگی کہاں چلا گیا؟"

دوسرا بولا۔

"دھرم ویر جی! یہ جوگی کوئی بڑا تپسوی سادھو تھا۔ وہ آلوپ ہو گیا ہے۔"

آلوپ کا مطلب تھا کہ غائب ہو گیا ہے۔ بھارت میں اس قسم کے سادھوؤں اور جوگیوں کے بارے میں بڑے قصے مشہور تھے کہ فلاں جوگی بیٹھے بیٹھے غائب ہو جاتا ہے۔ فلاں سادھو ہوا میں اڑتا دیکھا گیا ہے۔ مہا دیو کے آشرم کے یہ لوگ بھی سپیرے پجاری تھے۔ ان کے لیے یہ بات کوئی اتنی اچنبھے کی نہیں تھی۔ پریشانی انہیں اس بات کی تھی کہ مہا دیو کے دشمن ناگ مندر کا سادھو جو وہاں جاسوسی کرنے آیا تھا ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ میں قریبی جھاڑیوں میں چھپا ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر میں ان چاروں کو ڈس کر اسی جگہ ڈھیر کر دوں تو اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میرے ڈستے ہی یہ لوگ گر کر مر جائیں گے یا مرنے سے پہلے منہ سے کوئی آواز وغیرہ بھی نکالیں گے۔ گندھرنی کے بقول میرے اندر اتنا زہر تھا کہ میرے ڈسنے سے آدمی کا جسم اسی وقت پھٹ جاتا۔ فرض کر لیا میں ایک آدمی کو ڈستا ہوں وہ گرتا ہے تو دوسرا شور مچاتا ہوا یا تو بھاگ سکتا ہے یا مجھے دیکھ کر مجھ پر اندھا دھند گولیاں برسا سکتا تھا اور فائرنگ کے دھماکے سارے آشرم کو بیدار کر سکتے تھے۔

یہاں بڑی عقل اور سوجھ بوجھ سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے انہیں کچھ نہ کہا اور جھاڑیوں کے اندھیرے میں چھپا رہا۔ چاروں واپس کوٹھڑی کی طرف چلے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے رینگنے لگا۔ انہوں نے کوٹھڑی کے باہر پہرہ دیتے سپیرے فوجیوں کو سارا ماجرا سنایا تو ان میں سے ایک نے کہا۔

"مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ رات کے وقت یہ جوگی جنگل کی طرف سے آیا ہے تو یونہی نہیں آیا۔ یہ ضرور آلوپ سادھو ہوگا۔"

"اب کیا کریں؟ اگر وہ آلوپ ہو گیا ہے تو یہیں کہیں موجود ہوگا۔"

ایک سپیرے فوجی نے کہا۔ دوسرا بولا۔

"موجود ہوگا تو ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔ وہ خود ہی یہاں سے بھاگ جائے گا یا پھر جاسوسی کرنے آشرم کی طرف چلا گیا ہوگا۔ ہمیں خاموش رہنا چاہیے کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہیے۔"

"ہاں یہ تم نے ٹھیک کہا۔" سپیرے فوجیوں کا سردار بولا۔ "ہم جاتے ہیں مہا دیو جی کے پجاری نرتکی کو لینے آتے ہی ہوں گے۔ تم ان سے بھی آلوپ جوگی کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔"

اتنا کہہ کر چاروں سپیرے فوجی وہاں سے چلے گئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ اب میں ان دو آدمیوں سے اور جو پجاری میری بیوی کو لینے آنے والے تھے نمٹ سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ دو پجاری ہی ہو سکتے تھے۔ میں ایک طرف جھاڑیوں میں سمٹ کر بیٹھا رہا۔ بارش تھم چکی تھی۔ چونکہ علاقہ نیم پہاڑی تھا۔ وہاں کہیں بھی پانی کھڑا نہیں ہوا تھا۔ دونوں سپیرے فوجی اپنے ساتھیوں کے جانے کے بعد پتھر کے سٹولوں پر بیٹھ گئے اور آپس میں آلوپ جوگی یعنی میرے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

رات گزرتی چلی گئی۔

کوئی ایک گھنٹے بعد دونوں سپیرے فوجی اٹھ کھڑے ہوئے اور چاق و چوبند ہو کر کوٹھڑی کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"آشرم کے پجاری آ رہے ہیں۔"

میں نے اپنی سانپ کی سری گھما کر آشرم کی جانب والے درختوں کی طرف دیکھا۔ دو دبلے پتلے آدمی گیروی دھوتیاں اور جینئو پہنے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے آہستہ آہستہ کوٹھڑی کی طرف چلے آ رہے تھے۔ کوٹھڑی کے پاس آ کر وہ رک گئے۔ ان میں سے ایک پجاری نے کہا۔

"ہم مہا دیو جی کی دلہن نرتکی کو لینے آئے ہیں۔"

سپیرے فوجیوں میں سے ایک نے کہا۔

"مہا دیو جی دلہن نرتکی ہم آپ کے حوالے کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ دوسرے سپیرے فوجی نے آگے بڑھ کر دروازے کے تالے کو چابی لگا کر گھمائی اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کوٹھڑی سے نکلا تو میرا انسانی دل زور سے دھڑک اٹھا۔ اس کے ساتھ میری بیوی جمیلہ سر جھکائے سرخ رنگ کی ساڑھی پہنے چلی آ رہی تھی۔ میرا خون تیزی سے میری رگوں میں گردش کرنے لگا۔ اس وقت مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ میں اس سارے آشرم کو تہس نہس کر سکتا ہوں۔ میں نے جمیلہ کے چلنے کے انداز سے معلوم کر لیا تھا کہ وہ باول نخواستہ چل رہی ہے۔ وہ مہا دیو کے آشرم میں نہیں جانا چاہتی اور اسے زبردستی لے جایا جا رہا ہے۔ وہ کوئی مزاحمت نہیں کر رہی تھی لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مہا دیو کے آشرم سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس پر پھونکے گئے منتروں کا اثر ضائع ہو چکا تھا اور وہ اپنی اصلی حالت میں تھی اور اگر میں نے اسے آواز دی تو وہ میری آواز پہچان لے گی۔ میں سانپ کے روپ میں تھا اور اسے اپنی انسانی آواز میں ہی بلا سکتا تھا۔ انسانی شکل میں اس کے سامنے نہیں آ سکتا تھا۔ یہ میری مجبوری تھی۔

دونوں پجاریوں نے آگے بڑھ کر میری بیوی کے گلے میں ہار ڈالے اور کہا۔

"ہے ستی ساوتری! ہے بن سندری! ہے آکاش کی اپسرا! تمہارے پتی دیو مہا دیو تا شری مہا دیو جی نے تجھے اپنے آشرم میں بلایا ہے۔ ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ چل۔"

میری بیوی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ جیسے ہی دونوں پجاری چلے وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ دونوں سپیرے فوجی اپنی جگہ پر اسی طرح اٹن شن ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اس کال کوٹھڑی سے مہا دیو کے شیطانی آشرم کی طرف ایک چھوٹی سی پگڈنڈی جاتی تھی جو سنگ مرمر کی تھی۔ اس کی دونوں جانب درخت اور پھولوں بھری جھاڑیاں تھیں۔ پگڈنڈی کے آدھے راستے میں اندھیرا تھا۔ میں نے اس جگہ ان پجاریوں پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی پجاری

میری بیوی کو لے کر آشرم کی طرف چلے' میں بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔ میں ان سے ذرا دور رہ کر پگڈنڈی کی جھاڑیوں کے درمیان رینگ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میں پگڈنڈی کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔

پہلے میری بیوی پجاریوں کے پیچھے تھی۔ پگڈنڈی پر آکر انہوں نے میری بیوی کو اپنے درمیان کر لیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اس طرح چل رہے تھے جیسے پوجا کرنے جا رہے ہوں۔ جب وہ پگڈنڈی کے آدھے راستے میں آگئے جہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا اور جہاں نہ تو آشرم کے دروازے پر جلنے والے چراغوں کی پوری روشنی پہنچ رہی تھی اور نہ کال کوٹھڑی کے دروازے پر جلنے والی لالٹین کی روشنی پہنچ رہی تھی تو میں آہستہ سے پگڈنڈی کے اوپر آگیا۔ سنگ مرمر کے پتھروں سے میں الگ ہو کر گھاس میں رینگ رہا تھا۔ میرا ٹارگٹ میری جانب چلنے والا پجاری تھا۔ پہلے مجھے اسی پر اٹیک کرنا تھا جیسے ہی یہ لوگ اندھیرے میں آئے میں تیزی سے رینگ کر اپنی سائیڈ پر چلنے والے پجاری کے پاؤں کے برابر آگیا اور پھر جیسے بجلی چمک جاتی ہے بالکل اتنی تیزی سے میں نے اچھل کر پجاری کے پاؤں پر ڈس لیا۔ دونوں پجاری پاؤں سے ننگے تھے۔ میں جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ میرا خیال تھا کہ پجاری کو جیسے ہی اپنے پاؤں پر میرے دانتوں کی چبھن محسوس ہوگی وہ کوئی نہ کوئی آواز ضرور نکالے گا۔ مگر اس نے کوئی آواز نہ نکالی اور دھڑام سے پگڈنڈی کی جھاڑیوں پر گر پڑا۔ دوسرا پجاری گھبرا کر اس کی طرف بڑھا اور گرے ہوئے پجاری کو اٹھاتے ہوئے بولا۔

"دھرمنتا دھرمنتا کیا ہوگیا ہے۔"

پھر وہ جیسے ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ میرا خیال ہے کہ میرے زہر سے پجاری کا جسم پھٹنا شروع ہوگیا تھا۔ جیسے ہی دوسرا پجاری پیچھے ہٹا میں نے اس پر بھی حملہ کر دیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ شور مچا دے گا۔ میں نے اچھل کر اس کی ننگی پنڈلی پر ڈسا تھا۔ وہ بھی بغیر کوئی آواز نکالے دھڑام سے گر پڑا۔ میری بیوی ڈر کر پیچھے ہٹ گئی اور اس سے پیشتر کہ وہ ڈر کر وہاں سے بھاگتی میں نے انسانی آواز میں اسے پکار کر کہا۔

"جمیلہ! بھاگو مت۔ میں ہوں کرم ولو۔ تمہارا خاوند۔"

جمیلہ نے جلدی سے ساڑھی کا آنچل ایک طرف کیا اور جدھر سے اسے میری آواز آئی تھی اس طرف حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ میں اس بات سے خوش ہوا کہ اس پر مہا دیو کے شیطانی منتروں کا اثر نہیں تھا۔ وہ اپنی اصلی حالت میں تھی۔ اس نے میری آواز پہچان لی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"جمیلہ! خدا کے لیے میری بات غور سے سنو! میں اس وقت تمہارے بالکل قریب ہوں۔ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں مگر تم مجھے نہیں دیکھ سکتیں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ساری باتیں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ فوراً" سیندھیا کی کٹیا کی طرف بھاگ چلو۔"

میرا قیاس کہتا تھا کہ وہ سیندھیا کی کٹیا کا راستہ جانتی تھی۔ کیونکہ سیندھیا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اسے لے کر اپنی کٹیا پر آئے گی۔ جمیلہ ابھی تک حیرت زدہ ہو کر کھڑی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس کو کہا۔

"خدا کے لیے جلدی کرو۔ اگر تم نے مزید وقت ضائع کر دیا تو یاد رکھو پھر ہم ساری زندگی کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے۔ میں جو کہتا ہوں اسی طرح کرو۔ میں ایک خاص طلسم کے اثر سے تمہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ یہاں سے نکلنے کے بعد میں تمہارے سامنے ظاہر ہو جاؤں گا۔ جلدی سے سیندھیا کی کٹیا کی طرف دوڑ پڑو۔ کیا تم جانتی ہو اس کی کٹیا کہاں ہے؟"

جمیلہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں۔ وہ اس طرف ہے۔"

میں بڑی دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"بس اس طرف بھاگ چلو مگر اپنے آپ کو چھپائے رکھنا۔ کوئی تمہیں دیکھ نہ لے۔ فکر نہ کرنا میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہ وہیں سے جھاڑیوں کی طرف ہو گئی اور اس نے مشرق کی طرف ان درختوں کی

طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ جن کے عقب میں سیندھیا کی کٹیا تھی۔ میں بھی تیزی سے اس کے پیچھے رینگنے لگا۔ رینگتے رینگتے کبھی میں جمیلہ کی دائیں جانب ہو جاتا۔ کبھی بائیں جانب ہو جاتا۔ کبھی اس کے آگے آگے رینگنے لگتا۔ مجھے علم تھا کہ جمیلہ کے جسم سے بھی ناگ منتروں کی خاص بو نکلتی ہے جس کی وجہ سے وہاں کے سانپ اس پر حملہ نہیں کر سکتے بلکہ اس کے جسم کی بو سے بن مانس بھی اس کے قریب نہیں آتے تھے۔ انہیں معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ نرتکی مہا دیو جی کی خاص نرتکی ہے۔ ڈر مجھے صرف کسی سپیرے فوجی کا تھا کہ اگر وہ اس طرف کہیں موجود ہوا تو جمیلہ کو اس طرح دوڑتے دیکھ کر اس کے پیچھے نہ آجائے۔ مگر رات کے اندھیرے نے جمیلہ کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ اسے بھاگتے ہوئے اندھیرے میں صرف میں ہی اپنی سانپ کی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ دوڑتے دوڑتے نشیب میں اتر گئی۔ میں اس کے قریب ہوگیا۔ میں نے اسے کہا۔

"جمیلہ! میری جان! گھبرانا بالکل نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

اس نے دوڑتے ہوئے پوچھا۔

"تم کہاں ہو؟ مجھے نظر کیوں نہیں آ رہے؟"

میں نے کہا۔

"ابھی میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا جمیلہ۔ یہاں سے کسی طرح نکل چلیں پھر ساری کہانی سنا دوں گا۔"

جمیلہ کا سانس پھول گیا تھا۔ میرا سانس نہیں پھول رہا تھا کیونکہ میں سانپ کے روپ میں دوڑ رہا تھا۔ سیندھیا کی جھونپڑی کے پاس آ کر میں نے جمیلہ سے کہا۔

"جنگل میں بائیں جانب اتر کر دوڑنا شروع کر دو۔ تم تھک تو نہیں گئیں؟"

وہ بولی۔

"میں تھک گئی ہوں۔"

خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت میں واپس آچکی تھی۔ وہ ناگ دیوتا اور

مہادیو کے سپیروں کے منتروں کے زیر اثر نہیں رہی تھی۔ میں نے کہا۔

”تھوڑی ہمت کرلو۔ اس خونی جنگل سے ایک بار نکل گئے تو پھر یہ لوگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔“

رات کی تاریکی میں جنگل مجھے تو صاف نظر آ رہا تھا مگر جمیلہ کو مشکل پیش آ رہی تھی۔ جنگل ویسے بھی گھنا ہوگیا تھا بار بار جھاڑیاں سامنے آ جاتی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ جمیلہ بڑی دلیری اور بے خوفی سے آدم خور درختوں اور بیلوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ وہ دوڑ نہیں سکتی تھی کیونکہ جنگل میں جھاڑ جھنکاڑ اتنا اگا ہوا تھا اور درخت اتنے قریب قریب تھے کہ یہاں دوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اس خیال سے پریشان تھا کہ جب مہادیو کے آشرم میں پجاری جمیلہ کو لے کر نہیں پہنچیں گے تو مہادیو ان کی تلاش میں اپنے آدمی بھیجے گا۔ جب اسے پتہ چلے گا کہ کال کوٹھڑی اور آشرم کے درمیان باغ کی پگڈنڈی پر دونوں پجاری مرے پڑے ہیں اور جمیلہ غائب ہے تو وہاں کہرام مچ جائے گا۔ مہادیو کی مسلح فوج سارے جنگل کو گھیرے میں لے لے گی‘ اس لیے میں جمیلہ کو لے کر خونی جنگ سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہتا تھا۔

لیکن جمیلہ ایک خاص رفتار سے زیادہ نہیں چل سکتی تھی۔ جنگل کے درخت بھی اسے تیز تیز نہیں چلنے دیتے تھے۔ میں سانپ کی شکل میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد گردن گھما کر پیچھے دیکھ لیتا تھا اور زبان نکال کر سونگھ لیتا تھا کہ پیچھے فوجی تو نہیں آ رہے؟ جنگل میں خاموشی طاری تھی۔ ابھی ہم خونی جنگل کے آدھے راستے میں ہی تھے کہ آشرم کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ سٹین گنوں کی فائرنگ تھی۔ جمیلہ سہم کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

”ان لوگوں کو پتہ چل گیا ہے۔ وہ ہمیں پکڑ لیں گے۔“

”میں رینگ کر اس کے بالکل قریب آگیا۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم زندہ سلامت یہاں سے نکل جائیں گے رکو نہیں۔ اب خونی جنگل ختم ہی ہونے والا ہے۔“

جمیلہ کو جس طرف سے میری آواز آ رہی تھی وہ اس طرف غور سے دیکھ رہی تھی بولی۔

"کرم داد! یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟"

اور اس نے بچوں کی طرح سسک سسک کر رونا شروع کر دیا۔ وہ بالکل پہلے روز والی نارمل جمیلہ بن چکی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"خدا کے لیے یہ وقت آنسو بہانے کا نہیں ہے۔ مہا دیو کے سپیرے فوجی ہمارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ اگر وہ یہاں تک آ گئے تو ہم زندگی بھر ایک دوسرے سے کبھی نہ مل سکیں گے۔"

جمیلہ میری آواز کی جانب برابر دیکھے جا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"کیا تم سانپ بن گئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"یہی سمجھ لو' لیکن میں انسان کی حیثیت سے بھی زندہ ہوں۔ یہ وقت ایسی باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ اٹھو اور درختوں کے دائیں جانب سے آگے بڑھو۔"

آشرم کی طرف فائرنگ کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ جمیلہ یہ آوازیں سن کر جلدی سے اٹھ کر دائیں جانب والے درختوں میں گھس گئی۔ کہنے لگی۔

"مجھے اس راستے کا پتہ ہے تم میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔ یہاں سے ایک آسان راستہ جنگل سے باہر نکلتا ہے۔"

جمیلہ مجھے ایک ٹیلے کی طرف لے گئی۔ وہاں سے ایک گھاٹی دوسری طرف اترتی تھی۔ ہم گھاٹی اتر گئے۔ آگے ایک ندی آگئی۔ ہم نے ندی پار کر لی۔ ندی کے دوسری طرف ایک ایسا جنگل تھا جو پہلے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ چونکہ میں سانپ کی شکل میں تھا اس لیے اندھیرے میں بھی مجھے بڑی بڑی چٹانیں اور نوکیلے پتھر زمین سے باہر نکل کر درختوں کی ٹہنیوں تک جاتے نظر آ رہے تھے۔ جمیلہ جھاڑیوں کو ایک طرف ہٹاتی تیز تیز چل رہی تھی۔ میں اس کے پاؤں کے ساتھ ہی رینگ رہا تھا۔ اسے معلوم ہوگیا تھا

کہ میں کسی حادثے کی وجہ سے یا کسی طلسم کی وجہ سے انسان سے سانپ کی شکل اختیار کر گیا ہوں۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے اس بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ راستہ میں نے پہلے نہیں دیکھا۔"

وہ بولی۔

"مجھے گنگولی سپیرا اسی راستے سے مہا دیو کے آشرم تک لے گیا تھا۔ یہ محفوظ علاقہ ہے اور چھوٹا بھی ہے۔"

جمیلہ نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ ہمارے عقب میں مہادیو کے سپیرے فوجیوں کی فائرنگ کی آواز اب دور ہوگئی تھی۔ وہ خونی جنگل کے روایتی راستے کی طرف ہماری تلاش میں جا رہے تھے جبکہ ہم دائیں جانب ایک دوسرے راستے پر چلے جا رہے تھے۔ راستے میں کہیں کہیں نشیب میں بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ ہم اس سے بچ کر جا رہے تھے۔ اس طرف کوئی دلدل بھی نہیں تھی اور مگرمچھوں کا کوئی تالاب بھی نہیں ملا تھا۔ میں حیران تھا کہ جمیلہ کو اندھیرے میں بھی راستے کا پتہ چل رہا تھا۔ ہم ایک کھلی پر نکل آئے۔ سامنے درختوں کی قطار سیاہ دیوار کی طرح کھڑی تھی۔ جمیلہ نے کہا۔

"یہ خونی جنگل کی آخری سرحد ہے۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

وہ بولی۔

"بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ ان درختوں پر آ کر خونی جنگل ختم ہو جاتا ہے۔"

ایسا ہی ہوا ہم درختوں کی دیوار کے دوسری طرف آئے تو دور میدان کے پار چوکھما گاؤں کی اکا دکا روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"جمیلہ! میں کس طرح خدا کا شکر ادا کروں کہ میں تمہیں زندہ سلامت لے کر خونی جنگل سے نکل آیا ہوں۔"

وہ اب آرام سے چل رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ابھی خطرہ ہمارے ساتھ ہی ہے۔ مہا دیو کے آدمی خونی جنگل سے باہر نہیں آئیں گے۔ لیکن اس کے جاسوس سپیرے جہاں بھی میں ہوں گی وہاں پہنچ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"ہم موت کے منہ سے نکل آئے ہیں۔ آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ہم پنجاب کی طرف نکل جائیں گے۔ وہاں سے کشمیر چلے جائیں گے۔ جاسوس سپیرے وہاں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ تم بے فکر رہو۔ کشمیر سے ہم سرحد پار کر کے پاکستان چلے جائیں گے۔"

جمیلہ خاموش رہی۔ کہنے لگی۔

"ہم اس وقت کہاں جائیں گے؟ کیا رات کے وقت ہمیں دیو گڑھ جانے والی کوئی بیل گاڑی مل جائے گی؟"

اسے معلوم تھا اور وہ نہیں بھولی تھی کہ چو کھمبا گاؤں سے ہمیں بیل گاڑی میں بیٹھ کر دیوگڑھ جانا تھا جہاں سے ٹرین پکڑ کر ہم جھانسی بھوپال سے ہوتے ہوئے بھارتی پنجاب کی طرف جا سکتے تھے۔ میں نے کہا۔

"ہم جوگن مایا دیوی کی کٹیا میں جائیں گے۔ اگر وہ وہاں پر موجود نہ ہوئی تو پیچھے مڑھی میں گندھرنی کے پاس جائیں گے۔"

میں نے اسے مختصر گندھرنی کے بارے میں بتایا کہ میں اسی کی ایک جڑی بوٹی اور منتروں کی وجہ سے انسان سے سانپ کے روپ میں آیا ہوں۔

"مگر تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بہت جلد بلکہ کسی بھی وقت اپنی اصلی انسانی شکل میں واپس آسکتا ہوں۔"

ہم رات کی تاریکی میں کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے چو کھمبا گاؤں کے کنارے جوگن مایا دیوی کی کٹیا میں پہنچے۔ جوگن ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اس کی کٹیا خالی پڑی

تھی۔ میں جمیلہ کو لے کر گندھرنی کی کٹیا کی طرف آ گیا۔ گندھرنی کٹیا میں موجود تھی۔ لالٹین روشن تھی۔ ہم دونوں کو دیکھ کر وہ بولی۔

"مجھے پورا وشواش تھا کہ تم اپنی بیوی کو ضرور نکال لاؤ گے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن اب مجھے انسانی شکل میں واپس لے آؤ۔ اب مجھے سانپ کے روپ میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

جمیلہ گندھرنی کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ گندھرنی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تم بڑی خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایک محبت کرنے والا بہادر پتی ملا ہے۔"

جمیلہ نے گندھرنی سے کہا۔

"مگر میں سانپ کے ساتھ کیسے زندگی گزار سکوں گی۔ میرے پتی دیو کو واپس انسانی شکل دے دو۔"

گندھرنی میری طرف تکنے لگی۔ میں کنڈل مارے جمیلہ اور گندھرنی کے بالکل سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے بھی کہا۔

"ہاں گندھرنی! اب کسی طرح سے مجھ پر آکاش بوٹی کا اثر ختم کر دو تاکہ میں انسانی شکل میں آ جاؤں اور اپنی بیوی کو لے کر جموں کشمیر کی طرف جا کر وہاں سے بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچنے کی کوشش کروں۔"

گندھرنی کہنے لگی۔

"کرم داد! میں نے تمہیں آکاش بوٹی پلانے سے پہلے بتا دیا تھا کہ اس بوٹی کا اثر تم پر ایک سال سے لے کر پانچ یا دس سال اور ہو سکتا ہے یا یہ کہ جب تک تم زندہ رہو تم پر اثر رہے۔ تم نے کہا تھا کہ مجھے منظور ہے۔ اب یہ میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں تمہیں سانپ سے ہمیشہ کے واسطے واپس انسانی شکل میں لے آؤں۔ یہ ضرور ہو گا کہ تم پر کسی بھی وقت آکاش بوٹی کا اثر ہلکا پڑنے لگے گا اور تم سانپ سے انسانی شکل اختیار کر

لو گے لیکن یہ تھوری دیر کے لیے ہوگا دس منٹ بعد آدھ گھنٹے بعد اور زیادہ سے زیادہ ایک پہر یا ایک رات کے بعد تم دوبارہ سانپ کی شکل اختیار کر لو گے۔"

میں یہ سن کر پریشان ہوگیا۔ جمیلہ کو بھی میں نے دیکھا کہ وہ بھی پریشان تھی۔ کہنے لگی۔

"گندھرنی! کیا تمہارے پاس اس مشکل کا کوئی حل کوئی اپائے نہیں ہے؟"

وہ بولی۔

"میرے پاس اس کا کوئی علاج ہوتا تو میں تمہارے خاوند کو ضرور بتا دیتی اور اسے اس مشکل سے نکال لیتی۔ لیکن جیسا کہ میں نے تمہارے خاوند کو پہلے روز خبردار کر دیا تھا میرے پاس اس مشکل کا کوئی حل نہیں ہے۔"

میں سانپ کے روپ میں اپنی بیوی جمیلہ کے پاؤں کے بالکل قریب بیٹھا تھا اور مجھے اس کے جسم کی بڑی تیز خوشبو آ رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اس مصیبت سے آگاہ تھا۔ گندھرنی نے واقعی مجھے پہلے بتا دیا تھا کہ آکاش بوٹی کا اثر ہو سکتا ہے ساری زندگی مجھ پر رہے اور میں نے اسے قبول بھی کر لیا تھا۔ صرف اس خیال سے کہ سانپ کی شکل میں جمیلہ کو میں بڑی آسانی سے مہادیو کے آشرم سے نجات دلا سکتا تھا۔ لیکن اب جبکہ میری بیوی میرے پاس آ گئی تھی تو میں اس کے ساتھ اس مصیبت سے چھٹکارا پا کر انسانی شکل میں زندہ رہنا چاہتا تھا جیسا کہ میں پہلے اس کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا۔

اس دوران گندھرنی کچھ سوچ رہی تھی اس نے میری طرف دیکھا کہنے لگی۔"ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟" مجھ سے پہلے جمیلہ نے بے تابی سے اس سے پوچھا۔

گندھرنی نے کہا۔

"شہر بھوپال میں سبز رومالوں والی ایک خانقاہ ہے۔ اس خانقاہ میں ایک بڑی کرنی والے مسلمان بزرگ کا مزار ہے۔ اگر تم وہاں جا کر پانچ راتیں اپنے خدا کی عبادت کرو

اور سبز رومالوں والے بزرگ کی روح کو ثواب پہنچاؤ تو ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس مشکل سے نجات مل جائے۔"

میں نے کہا۔

"میں یہ ضرور کروں گا۔ مجھے بتاؤ بھوپال شہر میں ان بزرگ کا مزار کہاں پر ہے؟"

گندھرنی نے کہا۔

"بھوپال کے ریلوے سٹیشن کے پچھم کی جانب ایک چھوٹا سا ٹبہ ہے' بزرگ کا مزار اس ٹبے کے اوپر ہے۔ یہ مزار شریف سبز رومالوں والی درگاہ کے نام سے مشہور ہے۔ تم بھوپال کے کسی آدمی سے پوچھو گے تو وہ تمہیں درگاہ کا پتہ بتا دے گا۔"

جمیلہ نے کہا۔

"میں آج ہی اپنے خاوند کو لے کر بھوپال چلی جاتی ہوں۔"

گندھرنی بولی۔

"مجھے یقین ہے کہ ان بزرگ کی آتما تمہاری ضرور مدد کرے گی۔ اس وقت رات کافی گزر چکی ہے۔ تم دونوں آرام کرو۔ صبح یہاں سے اپنے سفر پر روانہ ہو جانا۔"

رات کا باقی حصہ ہم نے گندھرنی کی کٹیا میں سو کر بسر کیا۔ دوسرے روز ہم نے بھوپال شہر کی جانب سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تیاری کیا کرنی تھی۔ بس میں نے جوگیوں والا حلیہ بدل ڈالا۔ زعفرانی دھوتی کی جگہ سفید دھوتی اور کرتہ پہن لیا۔ جمیلہ نے جو ساڑھی پہنی ہوئی تھی وہی رہنے دی۔ میرے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے۔ گندھرنی نے ہمیں کچھ روپے دیے اور کہا۔

"بھوپال پہنچنے کے بعد اگر تمہیں اور پیسوں کی ضرورت پڑ گئی تو بھوپال میں بھیروں جی کا مندر ہے۔ اس کا بڑا پجاری میرا دوست ہے۔ اس کو جا کر مل لینا۔ جتنی رقم کی تمہیں ضرورت ہو گی وہ تمہیں دے دے گا۔"

جب ہم گندھرنی کی کٹیا میں ناشتہ کرنے کے بعد چوکھمبا گاؤں کی طرف چلنے لگے تو گندھرنی نے کہا۔

"کرم داد! تم اپنی بیوی کو مہا دیو کے آشرم سے ضرور نکال لائے ہو لیکن مہا دیو تمہیں اتنی آسانی سے معاف کرنے والا نہیں ہے۔ وہ اپنے جاسوس سپیرے تمہارے اور تمہاری بیوی کے پیچھے لگا دے گا جو تمہاری بیوی کی بو سونگھتے ہوئے اس تک پہنچ جائیں اور یا اسے ہلاک کرنے کی اور یا اغوا کرنے کی کوشش کریں گے۔ تمہیں ان دشمنوں سے ہر وقت ہوشیار رہنا پڑے گا۔"

جمیلہ نے کہا۔

"گندھرنی بہن! میں ان سپیروں کے ہتھکنڈوں سے واقف ہوں۔ اگر انہیں میری بو آ جائے گی تو مجھے بھی ان کی بو پہلے سے آ جائے گی۔ ہم لوگ اپنا بچاؤ کر لیں گے۔"

"بس ٹھیک ہے۔" گندھرنی نے کہا۔ "بھگوان تمہاری مدد کرے۔ اب تم جاؤ۔"

میں نے گندھرنی کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولی۔

"شکریے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے جو کچھ کیا صرف اس لیے کیا کہ تم دونوں میاں بیوی' پتی اور پتنی ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے ہو۔"

پھر وہ کہنے لگی۔

"کرم داد تم اس طرح رینگتے ہوئے مت جانا۔ بہتر ہے تمہاری بیوی تمہیں اٹھا کر اپنے لباس کے اندر چھپا لے۔ کیونکہ تم لوگ کسی جنگل میں نہیں بلکہ شہروں کی دنیا میں جا رہے ہو۔ وہاں لوگ سانپ کو دیکھتے ہی اس کو ہلاک کرنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔"

جب گندھرنی نے میری ہلاکت کی بات کی تو مجھے اس سے پوچھنے والی ایک بڑی اہم بات یاد آ گئی۔ میں نے پوچھا۔

"گندھرنی! ایک ضروری بات تم سے پوچھنی رہ گئی تھی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ سانپ کے روپ میں اگر کسی نے مجھے مار ڈالا' میرا سر کچل دیا جس طرح کہ لوگ سانپوں کو مار ڈالتے ہیں تو کیا سانپ کے ساتھ میں بھی مر جاؤں گا؟"

اس وقت جمیلہ نے مجھے اپنی کلائی کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور میں نے اپنی گردن

اٹھائی ہوئی تھی۔ جمیلہ نے بھی میرے سوال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بات تو میں بھی پوچھنا چاہتی تھی۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو لیکن اگر کسی نے میرے خاوند کو سانپ سمجھ کر مار ڈالا تو کیا میں بیوہ ہو جاؤں گی؟"

گندھرنی نے کہا۔

"تم آدھی بیوہ ہو جاؤ گی۔"

"کیا مطلب؟" جمیلہ نے پوچھا۔

گندھرنی کہنے لگی۔

"بہت اچھا ہوا کہ تم لوگوں نے یہ سوال پوچھ لیا ورنہ تم لوگ ایک ایسی مصیبت میں پھنس جاتے کہ جس سے تم شاید کبھی نہ نکل سکتے۔ اب غور سے سنو۔ اگر کبھی ایسا ہو گیا کہ تمہارے خاوند کرم داد کو جبکہ وہ سانپ کی شکل میں ہو تو کسی نے لاٹھی یا پتھر مار کر کچل ڈالا اور وہ مر گیا یا زخمی ہو گیا یا اس کے جسم کا کوئی حصہ کٹ گیا تو تم اس کے جسم کے ٹکڑے اٹھا کر، سنبھال کر کسی ڈبے یا پٹاری میں بند کر لینا۔ اس کے بعد تمہیں ہندوؤں کے مقدس مقام متھرا شہر میں جانا۔ وہاں جو سب سے بڑی شمشان بھومی ہو گی یعنی جہاں ہندو اپنے مردوں کو جلاتے ہیں وہاں کسی تازہ جلے ہوئے مردے کی راکھ پر سانپ کے ٹکڑوں والی پٹاری یا ڈبے کو رکھ دینا۔ یہ پٹاری ساری رات تازہ جلے ہوئے مردے کی راکھ میں پڑی رہنے دینا اگلے دن جب تم آ کر پٹاری کھولو گی تو سانپ کے جسم کے ٹکڑے ایک دوسرے سے جڑ کر اصلی حالت میں آ گئے ہوں گے اور تمہارا خاوند زندہ ہو گیا ہو گا۔ اس کو اچھی طرح سے یاد کر لو۔"

جمیلہ نے کہا۔

"میں ایسا ہی کروں گی۔"

گندھرنی نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ جب تمہارا خاوند سانپ کے روپ میں ہو تو اس کی حفاظت کرنا اسے اپنے سے الگ مت ہونے دینا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بھوپال

کی درگاہ پر جا کر بزرگ کے مزار کی پانچ راتیں عبادت کرنے کے بعد تمہارے خاوند کو سانپ کے روپ سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی۔ اب تم لوگ جاؤ۔ سویرا ہونے والا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ دن نکلنے سے پہلے پہلے تم اس خطرناک علاقے سے جتنی دور نکل سکتے ہو نکل جاؤ۔"

میں نے گندھرنی سے کہا۔

"خدا تمہیں خوش رکھے۔"

"گندھرنی مسکرانے لگی۔ جمیلہ نے مجھے اپنی کلائی کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ وہ مجھے لے کر وہاں سے چوکھبا گاؤں کی طرف چل پڑی۔ ابھی صبح کی سپیدی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ گاؤں پہنچے تو ایک گاڑیبان ہمیں بیلوں کو گاڑی کے آگے جوتتا مل گیا۔ کہنے لگا۔

"باقی سواریاں پوری ہوں گی تو دیوگڑھ کی طرف چلوں گا۔ تم انتظار کرو۔"

جمیلہ نے کہا۔

"میں تمہیں باقی سواریوں کا بھی کرایہ دے دوں گی۔ ہمیں جلدی جانا ہے۔ ٹرین پکڑنی ہے دیوگڑھ سے۔"

میں ابھی تک سانپ کی شکل میں تھا۔ مجھ پر آکاش بوٹی کا اثر ایک سیکنڈ کے لیے بھی کم نہیں ہوا تھا۔ اگر ہوتا تو میں تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی انسان کی شکل اختیار کر لیتا۔ جمیلہ نے مجھے اپنی ساڑھی کے اندر چھپایا ہوا تھا۔ گاڑی بان نے ہمیں گاڑی پر بٹھایا۔ اور دیوگڑھ کی طرف چل پڑا۔ دیوگڑھ پہنچتے پہنچتے کافی دن نکل آیا۔ ہم سٹیشن پر جا کر بیٹھ گئے۔ بھوپال جانے والی گاڑی کافی دیر انتظار کرنے کے بعد آئی۔ جمیلہ ایک ڈبے میں بیٹھ گئی۔ میں اس کی ساڑھی کے اندر اس کے بلاؤز میں چھپ کر سمٹا ہوا تھا۔ جمیلہ نے اچھی طرح سے ساڑھی سے اپنے جسم کو ڈھانپا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم پر جب ہم اکیلے تھے تو میں انسانی آواز میں اس سے بات چیت کرتا رہا تھا۔ اب ڈبے میں دوسرے مرد اور عورتیں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اب ہم خاموش تھے۔

ٹرین چل پڑی۔ سارا دن ساری رات سفر میں گزر گئی۔ اگلے دن دوپہر کے وقت

ٹرین بھوپال پہنچی۔ جمیلہ مجھے لے کر ٹرین سے اتر کر سٹیشن سے باہر آ گئی۔ میں نے اسے کہا۔

"یہاں کسی سے پوچھ لو کہ سبز رومالوں والی درگاہ کہاں ہے۔"

جمیلہ نے کہا۔

"گندھرنی نے کہا تھا کہ سٹیشن سے پچھم کی طرف ٹیلا ہے۔ اس ٹیلے پر بزرگ کی درگاہ ہے۔ چل کر دیکھ لیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"کوئی تانگہ یا رکشہ کروا لو۔"

جمیلہ نے ایک خالی رکشے والے کو ہاتھ دیا۔ رکشا رک گیا۔ وہ اس میں بیٹھ گئی اور ڈرائیور سے کہا کہ مجھے سبز رومالوں والی درگاہ پر لے چلو۔ درگاہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ٹیلے کے اوپر سبز جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ میں جمیلہ کے بلاؤز کے اندر سے اپنی سانپ والی چھوٹی سی سری باہر نکال کر دیکھ رہا تھا۔ جمیلہ رکشے سے اتر کر ٹیلے کی طرف چلی تو اس نے میرا سر ہاتھ سے پکڑ کر اپنے بلاؤز میں کر لیا۔

"اس طرح تمہیں کوئی دیکھ لے گا تو سمجھے گا کہ میں کوئی چڑیل ہوں جو سانپ کو سینے سے لگائے چلی جا رہی ہوں۔"

میں نے اپنا سر اندر کر لیا۔ مجھے قوالی کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ٹیلے کے اوپر قوالی ہو رہی تھی۔ میں نے دھیمی آواز میں جمیلہ سے کہا۔

"یہاں تم کہاں ٹھہرو گی؟ ہمیں پانچ راتیں قیام کرنا ہو گا۔"

اس نے کہا۔

"خدا کے لیے خاموش رہو۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہاں کچھ اور لوگ بھی آ جا رہے تھے۔ شاید ٹیلے کی چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک جمیلہ درگاہ پر پہنچ کر ادھر ادھر پھرتی رہی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"میں اس وقت درگاہ کے پیچھے ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"اب میں باہر آ سکتا ہوں۔"

اور میں اپنی بیوی کی ساڑھی سے باہر نکل آیا۔ جمیلہ نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اپنی گود میں رکھ لیا اور کہنے لگی۔

"درگاہ پر رات کو عورتوں کے ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ہمیں شہر میں جا کر کسی ہوٹل میں ٹھہرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔

"تمہارے پاس کتنی رقم باقی ہے؟ کیونکہ ہوٹل کا پانچ چھ دن کا کرایہ تو بہت ہو جائے گا۔"

میں جمیلہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ساڑھی کے اندر سے رومال میں بندھے ہوئے نوٹ نکال کر گنے اور بولی۔

"میرے پاس اس وقت صرف ڈیڑھ سو روپیہ باقی رہ گیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"چل کر پتہ کرتے ہیں کہ ہوٹل کا کرایہ کتنا ہے ہو سکتا ہے کسی سستے ہوٹل میں جگہ مل جائے۔"

وہ مایوسی کے لہجے میں بولی۔

"کرم داد! سستے سے سستا ہوٹل بھی اتنا سستا نہیں ہوگا کہ میں ان پیسوں میں وہاں پانچ دن رہ سکوں اور پھر میرا کھانا پینا کہاں سے ہوگا۔ ہمیں واپس کشمیر کی طرف بھی جانا ہے۔ ہمیں نئے کپڑوں کی بھی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر کیا کیا جائے؟ ہمارے پاس تو ان تھوڑے سے پیسوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

جمیلہ کہنے لگی۔

"اللہ مالک ہے۔ صرف مجھے رات بسر کرنے کا ٹھکانہ چاہیے۔ تمہیں تو کوئی بھی نہیں دیکھے گا میں معلوم کرتی ہو۔ یہاں کوئی نہ کوئی ایسی جگہ ضرور ہوگی جہاں باہر سے آئی ہوئی عورتیں رات بسر کر سکیں۔"

وہ اٹھ کر ایک طرف چل پڑی۔ مجھے اس نے اپنی ساڑھی کے اندر چھپا لیا تھا۔ اب میں صرف اس کی آواز ہی سن سکتا تھا۔ یا درگاہ کے اندر جو قوالی ہو رہی تھی اس کی آواز آ رہی تھی۔ وہ شاید درگاہ کے اندر چلی گئی تھی۔ کیونکہ مجھے اگربتیوں کی خوشبوئیں آنے لگی تھیں۔ پھر وہ ایک عورت سے باتیں کرنے لگی۔ اس نے عورت سے رات بسر کرنے کے ٹھکانے کے بارے میں پوچھا تو اس عورت نے بڑی صاف اردو زبان میں کہا۔

"یہاں درگاہ شریف کے پیچھے چار پانچ حجرے ہیں جہاں باہر سے آنے والی خواتین رات کو ٹھہرتی ہیں۔ آؤ میں تمہیں درگاہ کے متولی سے ملاتی ہوں۔"

مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ جمیلہ کے یہاں پانچ راتیں ٹھہرنے کا انتظام ہو جائے گا۔ اب مجھے متولی سے جمیلہ کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ متولی نے جمیلہ سے پوچھا۔

"بی بی! تم کہاں سے آئی ہو؟ تمہارے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے۔"

جمیلہ نے کہا۔

"بابا جی! میں دلی سے آئی ہوں۔ مجھے میرے پیر مرشد نے حکم دیا ہے کہ میں سبز رومالوں والے مزار پر اکیلی جاؤں اور پانچ راتیں یہاں وظیفہ کروں۔ تب میرے خاوند کو آرام آ جائے گا۔ میرا خاوند بہت بیمار ہے۔"

متولی کی آواز آئی۔

"ٹھیک ہے بی بی۔ تم درگاہ کے پیچھے جو کوٹھڑیاں ہیں ان میں سے کونے والی کوٹھڑی میں رہ سکتی ہو۔"

جمیلہ نے متولی کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے ایک طرف چل پڑی۔ لگتا تھا کہ جو عورت اسے متولی کے پاس لائی تھی وہ جا چکی تھی کیونکہ جمیلہ خاموش تھی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

"کرم داد! میرے ٹھہرنے کا انتظام ہو گیا ہے۔ تم نے بھی ساری باتیں سن لی ہوں گی۔"

میں نے کہا۔

"ہاں جمیلہ! میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہوئی ہے۔"

جمیلہ نے آہستہ سے کہا۔

"میں کونے والی کوٹھڑی کے پاس آ گئی ہوں۔ اب میں تم سے کوئی بات نہیں کروں گی۔ تم بھی نہ بولنا۔ کوٹھڑی کے باہر ایک بوڑھی عورت چارپائی پر بیٹھی ہے۔ شاید یہ ان کوٹھڑیوں کی انچارج ہے۔"

میں چپ رہا۔ جمیلہ اس عورت کو سلام کر کے متولی کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے مجھے کونے والی کوٹھڑی میں پانچ دن رہنے کی اجازت دے دی۔ بوڑھی عورت کی آواز آئی۔

"تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟"

اس عورت کا لہجہ سخت تھا۔ جمیلہ نے بڑی عاجزی سے اپنے خاوند کی مصنوعی بیماری کا واقعہ بیان کر دیا۔ وہ عورت بے دلی سے بولی۔

"ٹھیک ہے۔ کونے والی کوٹھڑی میں چلی جاؤ۔ اس کا پانچ دن کا کرایہ پچاس روپے ہو گا۔ یہ رقم تمہیں ابھی ادا کرنی ہو گی۔"

میں نے محسوس کیا کہ جمیلہ ساڑھی میں سے پیسوں والی گتھلی نکال رہی ہے۔ اس نے عورت سے کہا۔

"بہن جی! یہ لیجئے پچاس روپے آپ کی بڑی مہربانی ہے۔"

عورت نے کہا۔

"کونے والی کوٹھڑی میں چلی جاؤ۔"

جمیلہ چلنے لگی میں ابھی تک اس کے بلاؤز میں ہی چھپا ہوا تھا۔ مجھے دروازہ کھولنے کی آواز آئی۔ جمیلہ نے کہا۔

"میں کوٹھڑی میں آگئی ہوں۔ تم باہر آسکتے ہو۔"

اور جمیلہ نے بلاؤز میں ہاتھ ڈال کر مجھے باہر نکال لیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی نیم روشن کوٹھڑی ہے جس میں ایک چارپائی بچھی ہوئی ہے۔ بستر ایک طرف کو لپیٹ کر رکھا ہوا ہے۔ دیوار کے ساتھ ایک لوہے کی کرسی پڑی ہے۔ جمیلہ نے مجھے کرسی پر ایک طرف بٹھا دیا۔ میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ میں چھوٹا سا سانپ تھا۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"یہاں تمہارے کھانے پینے کا کیا بندوبست ہوگا؟ میرا خیال ہے درگاہ میں لنگر ضرور کھلتا ہوگا۔"

جمیلہ نے چارپائی پر بستر کھولتے ہوئے کہا۔

"دیکھا جائے گا۔"

کوٹھڑی کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ اندر دن کی روشنی آ رہی تھی۔ اچانک ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ جمیلہ نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ لیکن میں اتنے عرصے میں کرسی پر سے رینگ کر نیچے اتر چکا تھا اور دیوار کے پاس اندھیرے میں چھپ گیا۔ وہ عورت بولی۔

"بی بی! صبح اور رات کو لنگر کھلتا ہے۔ تم لنگر سے کھانا لے سکتی ہو۔ اگر چاہو تو باہر سے بھی کھانا منگوا سکتی ہو مگر اس کے لیے تمہیں پچاس روپے پیشگی دینے ہوں گے۔"

معلوم ہوا کہ یہ وہی عورت تھی جس نے جمیلہ سے کوٹھڑی کے پچاس روپے وصول کیے تھے۔ جمیلہ نے کہا۔

"شکریہ! میں لنگر ہی سے تھوڑا بہت کھا لیا کروں گی۔"

عورت چلی گئی تو جمیلہ نے دروازہ بند کر کے بتی روشن کر دی اور کرسی کے پیچھے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میں دیوار سے الگ ہو کر رینگتا ہوا جمیلہ کے پاس آ گیا۔ جمیلہ نے مجھے دیکھ کر اٹھا لیا۔

"مجھے تو فکر پڑ گئی تھی کہ کہیں یہ عورت تمہیں دیکھ نہ لے۔ اگر دیکھ لیتی تو سانپ سانپ کا شور مچا دیتی اور لوگ تمہیں مارنے کے لیے دوڑ پڑتے۔"

میں انسانی آواز میں ہی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں تو عورت کو دیکھتے ہی چھپ گیا تھا۔"

جمیلہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے پاس ہی کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا۔

"ابھی تک مجھ پر گندھرنی کی آکاش بوٹی کا اثر ذرا بھی کم نہیں ہوا۔ جب سے ہم خونی جنگل سے نکلتے ہیں میں ایک بار بھی سانپ سے انسانی شکل میں واپس نہیں آیا۔"

جمیلہ فکرمند ہو کر بولی۔

"یہی تو مجھے بھی پریشانی لگی ہے کہ کہیں تمہاری یہ حالت مستقل نہ ہو جائے ہم بھی کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔"

اور وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔





شام کو جمیلہ مجھے کوٹھڑی میں ہی چھوڑ کر لنگر کی طرف چلی گئی۔ وہ ڈونے میں کچھ بریانی لے آئی۔ کہنے لگی۔

"کرم داد! میں خود وہاں بریانی کھا کر آئی ہوں۔ یہ تمہارے لیے لائی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"میری جان سانپ بریانی نہیں کھایا کرتے۔ مجھے تو نہ بھوک لگتی ہے' نہ پیاس لگتی ہے۔"

اس نے بریانی والا ڈونا طاقچے میں رکھ دیا۔

"میں نے درگاہ کے اندر ایک جگہ دیکھ لی ہے۔ وہیں بیٹھ کر رات کو وظیفہ وغیرہ پڑھوں گی۔ تم کوٹھڑی میں ہی رہنا۔ میں بتی جلتی رکھوں گی اور باہر سے تالا لگا جاؤں گی۔"

جب رات گہری ہو گئی تو جمیلہ مجھے بستر پر سرہانے کے پاس بٹھا کر باہر سے تالا لگا کر چلی گئی۔ کوٹھڑی میں بڑی مدھم روشنی والا بلب روشن تھا۔ بھوپال شہر کا شمار بھارت کے بڑے شہروں میں ہوتا تھا۔ یہ قیام پاکستان سے پہلے بہت مشہور مسلم ریاست تھی اور اس کے فرمانروا نے پاکستان کی جدوجہد میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ میں نے اخباروں میں پڑھ رکھا تھا۔ یہاں کے لوگ جنوبی بھارت کے مقابلے میں اردو بڑی اچھی بولتے تھے۔ یہاں مسلمان بھی کثیر تعداد میں آباد تھے۔ میں کوٹھڑی میں اکیلا بستر پر

سرہانے کے اوپر کنڈلی مار کر بیٹھا رہا۔ پھر میں نے سر نیچے کر لیا اور آرام سے سمٹ کر بیٹھ گیا۔ مجھے ساری رات بیٹھ کر گزارنی تھی۔ میں نے پہلے بھی یہ بات محسوس کی تھی کہ سانپ کی شکل میں مجھے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ انتظار کی کوفت بھی نہیں ہوتی تھی۔ میں سرہانے پر ہی پڑا رہا۔ درگاہ شریف کی طرف سے قوالی کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ باہر رات کی خاموشی طاری ہوتی گئی۔ پھر کسی کسی وقت کوئی آواز آ جاتی تھی۔ معلوم ہوا کہ رات گہری ہو گئی ہے۔

پھر دروازے کے کھلنے کی آواز آئی۔ جمیلہ نے باہر تالا اس لیے نہیں لگایا تھا کہ درگاہ کی عورت نے اسے کہہ دیا تھا کہ کوٹھڑی کو تالا نہیں لگایا جائے گا۔ رات کو اندر سے کنڈی لگائی جا سکتی ہے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ جمیلہ نے اندر آ کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ کچھ پریشان تھی اور جلدی واپس آ گئی تھی۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا ہوا جمیلہ! خیریت تو ہے؟"

وہ سانس پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"بڑی عجیب بات ہوئی ہے۔ میں وضو کر کے درگاہ کے صحن میں ایک طرف عبادت کرنے بیٹھی تو مجھے جو وظیفہ یاد تھا وہ بھول گیا۔ میں بار بار یاد کرتی۔ مجھے وظیفے کے عربی الفاظ یاد نہیں آ رہے تھے۔ میں آنکھیں بند کر کے اعوذ باللہ پڑھنے لگی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے چاروں طرف آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ توبہ استغفار پڑھی اور دوبارہ آنکھیں بند کر کے اعوذباللہ کا ورد شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے اردگرد وہی شعلے بھڑکنے لگے۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ پانچ چھ بار میرے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ میں گھبرا کر وہاں سے آ گئی ہوں۔ ایسا کیوں ہوا ہے کرم داد؟ لگتا ہے اللہ میاں ہم سے ناراض ہے۔"

میں بھی اس کی کوئی وضاحت نہ کر سکا۔ یہی کہا کہ ہو سکتا ہے تم پاکیزہ حالت میں نہ ہو۔ وہ بولی۔

"میں پاکیزہ حالت میں ہی ہوں اور میں نے وضو بھی کیا تھا۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

وہ بولی۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کل رات دوبارہ کوشش کروں گی اور غسل کر کے درگاہ شریف پر جاؤں گی۔"

وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے دروازے کی کنڈی چڑھا دی تھی۔ میں نے انسانی آواز میں ہی جمیلہ سے کہا۔

"اب تم سو جاؤ۔ کل بات کریں گے۔ میں یہیں تمہارے پاس ہی لیٹ جاتا ہوں۔"

جمیلہ نے کہا۔

"خدا حافظ!"

میں نے بھی جواب میں خدا حافظ کہا اور سانپ کے روپ میں جمیلہ کے ساتھ لگ گیا۔ اچانک مجھے چکر آنے لگے۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"جمیلہ مجھے چکر آ رہے ہیں۔ لگتا ہے میں انسانی شکل میں واپس آنے لگا ہوں۔"

جمیلہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس دوران مجھے اپنے جسم کا بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔ پھر جیسے میری آنکھوں کے آگے روشنی سی چمک کر بجھ گئی اور میں انسانی شکل میں واپس آ چکا تھا۔ کوٹھڑی میں بلب روشن تھا۔ اس کی دھیمی روشنی میں جمیلہ مجھے دیکھنے لگی۔ اس نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگی۔

"میری جان! تم کتنے کمزور ہو گئے ہو۔ کاش ہم پاکستان میں ہی رہتے۔ ڈھاکہ کبھی نہ آتے۔ یا اللہ پاک! ہمیں اس مصیبت سے نجات عطا فرما۔"

اور وہ سسکیاں بھرتے ہوئے میرے ساتھ لگ گئی۔ جمیلہ کو مجھ سے واقعی بڑی محبت تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے تھے۔ میں نے اسے حوصلہ

دیا اور کہا۔

"ہمت نہ ہارو جمیلہ! خدا نے ہمیں سب سے بڑی پپتا سے نکال دیا ہے۔ وہ اس مصیبت سے بھی ہمیں نکال دے گا۔"

جمیلہ نے ساڑھی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"خدا کرے کہ اب تم انسانی شکل میں ہی رہو۔"

میں نے کہا۔

"کوئی پتہ نہیں میری یہ حالت کتنی دیر تک قائم رہتی ہے۔"

وہ بولی۔

"ایسا نہ کہو۔ میں تمہیں دوبارہ سانپ کے روپ میں آتے نہیں دیکھ سکتی۔"

میں نے کہا۔

"مجھ پر بت پرستوں کے طلسم کا اثر ہے جمیلہ! یہ جادو ٹونہ اپنی جگہ پر موجود رہتا ہے۔ انشاء اللہ میں اللہ کے کرم کے صدقے اس طلسم سے بہت جلد آزاد ہو جاؤں گا۔"

میں نے انسانی شکل میں آتے ہی جمیلہ سے کھل کر باتیں کرنی شروع کر دی تھیں۔ یہ بات ہم دونوں ہی بھول گئے تھے کہ اس کوٹھڑی میں صرف عورت ہی رہ سکتی تھی۔ کوئی مرد نہیں رہ سکتا تھا اور جمیلہ نے بھی درگاہ کی بوڑھی عورت سے یہی کہا تھا کہ وہ اکیلی دلی سے آئی ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی اور عورت کی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو! دروازہ کھولو! تمہارے ساتھ اندر کون ہے؟"

جمیلہ نے انتہائی پریشانی سے میری طرف دیکھا۔ میں بھی گھبرا گیا۔ میں اپنی مرضی سے سانپ کی شکل اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اشاروں سے جمیلہ سے کہا کہ وہ گھبرائے نہیں میں چارپائی کے نیچے چھپ جاتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی میں بستر سے اتر کر چارپائی کے نیچے گھس گیا۔ چارپائی پر جو پرانی چادر بچھی ہوئی تھی اس کا پلو کافی

نیچے تک آیا ہوا تھا اور بلب کی روشنی میں بھی میں کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

جمیلہ نے پوچھا۔

"کون ہے؟ میں اکیلی ہوں۔ میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔"

باہر سے عورت نے غصے میں کہا۔

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ تمہارے پاس کوئی مرد ہے۔ میں نے خود تم دونوں کی آوازیں سنی ہیں۔ دروازہ کھولو نہیں تو میں متولی کو بلاتی ہوں۔"

جمیلہ نے آہستہ سے کہا۔

"یا خدا! یہ بلا اس وقت کہاں سے آ گئی ہے۔"

وہ چارپائی سے اتری اور اس نے سرگوشی میں مجھے ہدایت کی کہ میں ذرا سی بھی آواز نہ نکالوں اور دروازے کی کنڈی اتار دی۔ باہر والی عورت نے زور سے دروازہ کھول دیا۔ میں صرف اس عورت کے پاؤں ہی دیکھ سکتا تھا۔ اس کی آواز سے میں نے پہچان لیا تھا یہ وہی عورت تھی جو زنانہ کوٹھڑیوں کی انچارج تھی۔ میں چارپائی کے نیچے زمین کے ساتھ لیٹے لیٹے ہاتھ باندھ کر خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ اس عورت کی مجھ پر نظر نہ پڑے۔ عورت نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"وہ مرد کہاں ہے جس سے تم باتیں کر رہی تھیں؟"

جمیلہ نے کہا۔

"باجی جان! میں کوٹھڑی میں اکیلی ہوں۔ یہاں کوئی مرد نہیں ہے۔"

عورت نے کہا۔

"چارپائی کے نیچے چھپا ہو گا۔"

یہ سن کر میرا جسم ایک دم گرم ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اندر اچانک جوالا مکھی کا منہ کھل گیا ہو۔ خدا جانے یہ اس وقت کی شدید جذباتی کیفیت کا اثر تھا یا کیا بات تھی کہ مجھے چکر آیا اور میں دوسرے لمحے چھوٹے سے سانپ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ سانپ کے روپ میں آتے ہی میں چارپائی کے نیچے دیوار کی طرف اندھیرے

میں جا کر چھپ گیا۔ زیادہ سے زیادہ تین سیکنڈ کا وقفہ ہوا ہوگا۔ عورت نے چادر ہٹا کر جھک کر چارپائی کے نیچے دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت جمیلہ کی ذہنی حالت کیا ہوگی کیونکہ وہ تو یہی سمجھتی تھی کہ میں چارپائی کے نیچے پوری انسانی شکل میں چھپا ہوا ہوں۔

جب عورت کو چارپائی کے نیچے کوئی مرد نظر نہ آیا تو اس نے معذرت اور شرمندگی کے لہجے میں جمیلہ سے کہا۔

"مجھے غلط فہمی ہوئی تھی بی بی مجھے معاف کر دینا۔ مگر میں نے برابر اندر سے تمہاری کسی مرد کے ساتھ باتیں کرنے کی آواز سنی تھی۔"

جمیلہ نے کہا۔

"باجی آپ کو واقعی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اب آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ یہاں میرے سوا اور کوئی نہیں ہے۔"

عورت اپنی خفت مٹاتے ہوئے بولی۔

"بی بی! ہمیں یہاں زائر خواتین کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ خدا نہ کرے کوئی ایسا واقعہ ہو جائے تو ہماری بڑی بدنامی ہو سکتی ہے۔ اچھا میں جاتی ہوں' اندر سے کنڈی لگا لینا۔"

عورت چلی گئی۔ جمیلہ نے کنڈی لگا کر بے اختیار کہا۔

"یا اللہ! یہ سب کیسے ہو گیا کرم داد! تم کہاں ہو؟"

جمیلہ دھیمی آواز میں بولی تھی۔ میں چارپائی کے نیچے سے نکل آیا اور دھیمی آواز میں کہا۔

"جمیلہ! بس اللہ نے ہماری عزت رکھ لی ہے' ورنہ ہماری یہاں بڑی بدنامی ہوتی۔"

جمیلہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سرگوشی میں کہا۔

"خاموش رہو۔"

وہ بند دروازے کے پاس گئی۔ اس کی درز میں سے باہر جھانک کر دیکھنے کی

کوشش کی۔ جب اسے کوئی درز نہ ملی تو دروازے سے کان لگا کر سننے لگی۔ پھر جلدی سے چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔ مجھے زمین پر سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا اور آہستہ سے کہا۔

”تم اچانک کیسے سانپ کے روپ میں آ گئے ہو؟“

میں نے کہا۔

”مجھے خود معلوم نہیں کہ یہ سب کیسے ہوگیا۔ بس میرے اندر ایک لاوا سا پھٹ پڑا۔ میرا جسم گرم ہو کر کپکپایا۔ چکر آیا اور میں انسان سے سانپ کے روپ میں آ گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدا نے ہمیں ذلت سے بچا لیا ہے۔“

اس کے بعد جمیلہ چارپائی پر لیٹ گئی۔ میں اس کے پہلو میں بلکہ سرہانے کے قریب ہی اس کے ساتھ لگ گیا۔ مجھے جمیلہ کے سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے آہستہ سے اس کو آواز دی۔

”میری جان! سو گئی ہو؟“

جمیلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گہری نیند سو گئی تھی۔ میری آنکھیں کھلی تھیں۔ سانپ کی پلکیں نہیں ہوتیں۔ میں نہ پلکیں جھپک سکتا تھا' نہ آنکھیں بند کر سکتا تھا۔ مجھے جبلی طور پر اس کا علم ہوا تھا کہ سانپ آنکھیں کھلی رکھ کر سو جاتا ہے۔ شاید میں سو گیا تھا۔ کیونکہ میری انسانی آنکھیں مجھے بند محسوس ہو رہی تھیں۔

رات گزر گئی۔

دوسرے روز جمیلہ ناشتہ کرنے باہر جانے لگی تو اس نے مجھ سے کہا۔

”تم کوٹھڑی کے اندر ہی رہنا۔ میں باہر سے صرف کنڈی ہی لگا سکتی ہوں۔ میں کنڈی لگا دوں گی تم کسی سوراخ وغیرہ سے باہر جانے کی کوشش نہ کرنا۔

جمیلہ چلی گئی۔ آتی دفعہ وہ مٹی کے پیالے میں میرے لیے تھوڑا سا دودھ لیتی آئی۔ کہنے لگی۔

”میں تمہارے لیے دودھ لائی ہوں۔ میں نے سن رکھا ہے کہ سانپ دودھ بڑے

شوق سے پیتے ہیں۔"

مجھے کوئی بھوک پیاس بالکل نہیں تھی۔ کمزوری کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ پھر بھی میں نے دودھ پی لیا۔ کوٹھڑی کے دروازے کو جمیلہ نے اندر سے کنڈی لگا دی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا آج رات تم دوبارہ درگاہ پر وظیفہ پڑھنے جاؤ گی؟"

وہ بولی۔

"مجھے وظیفہ یاد آگیا ہوا ہے۔ میں ضرور جاؤں گی۔ ہو سکتا ہے آج رات کل والی بات نہ ہو۔ مجھے ہر حالت میں تمہیں بدبخت پجاریوں اور سپیروں کے منتروں کے اثر سے نکالنا ہے اور تمہیں بار بار سانپ اور سانپ سے انسانی شکل اختیار کر جانے کے عمل سے نجات دلانی ہے۔"

میں کوٹھڑی کے اندر ہی سانپ کے روپ میں بیٹھا رہا۔ دن گزر گیا۔ رات آ گئی۔ جمیلہ نے کہا۔

"میں نے اچھی طرح سے غسل کر کے اپنے آپ کو پاک کر لیا ہے۔ مجھے یقین ہے آج رات میں پوری توجہ اور اطمینان سے عبادت کر سکوں گی۔"

وہ مجھے چھوڑ کر کوٹھڑی میں چلی گئی۔ میں کل رات کی طرح چارپائی پر سرہانے کے اوپر کنڈلی مار کر مزے سے بیٹھ گیا۔ مجھے صبح ہونے تک اسی جگہ بیٹھے رہنا تھا کیونکہ جمیلہ کو عبادت سے فارغ ہو کر دن نکلنے کے قریب واپس آنا تھا۔ میرا خیال ہے جمیلہ کو گئے بمشکل آدھ گھنٹہ گزرا ہو گا کہ وہ کل رات کی طرح پریشان حال واپس آ گئی۔ اس نے دروازے کو کنڈی لگائی اور دھم سے بستر پر گر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا کل رات والی بات دوبارہ ہوئی ہے؟"

"ہاں ——" جمیلہ نے خوفزدہ اور پریشان لہجے میں کہا۔ "آج آگ کے شعلے بہت زیادہ تھے۔ میں نے درگاہ کے صحن میں بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے وظیفہ شروع ہی

کیا تھا کہ میرے چاروں جانب شعلے بھڑک اٹھے۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن میری آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔ کل رات میری آنکھیں کھل گئی تھیں۔ آج آنکھیں بھی نہیں کھل رہی تھیں۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کے بعد میری آنکھیں کھل گئیں۔ وہاں بیٹھی کچھ عورتیں میری طرف دیکھنے لگیں۔ میرا سانس پھولا ہوا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں وہاں سے بھاگ کر یہاں آ گئی ہوں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ جمیلہ نے سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کرم داد! ہم سے ضرور کوئی گناہ ہوگیا ہے۔ خدا میری عبادت کو قبول نہیں کر رہا۔ میں یہ پانچ راتوں کا چلہ شاید پورا نہ کر سکوں گی۔ اگر میں نے چلہ پورا نہ کیا تو تم اس جادو ٹونے کے منتروں کے اثر سے کیسے آزاد ہوگے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہم واپس گندھرنی کے پاس چلتے ہیں۔ اسے سارا ماجرا بیان کرتے ہیں۔ صرف وہی ہمیں کوئی مشورہ دے سکتی ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

جمیلہ بولی۔

"ہاں۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ ایک وہی عورت ہمیں کوئی دوسرا طریقہ بتا سکتی ہے جس پر عمل کر کے میں تمہیں آکاش بوٹی کے منحوس طلسم سے نکال سکوں گی۔"

"تو کیا اب تم درگاہ پر چلہ کشی نہیں کرو گی؟"

میرے سوال کے جواب میں جمیلہ نے کہا۔

"مجھے دو راتوں سے اس بات کے اشارے مل رہے ہیں کہ میری چلہ کشی درگاہ کے بزرگ کی روح کو قبول نہیں ہے۔ اگر کل رات وہاں بیٹھی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ آگ کے شعلے سامنے آ کر مجھے بھسم کر دیں۔ کیونکہ میں نے یہ سنا ہے کہ یہ بڑے جلالی پیر کا مزار ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں گندھرنی کے پاس جا کر ہی صلاح مشورہ

کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے کل کی رات درگاہ میں بیٹھ کر دیکھ لو۔ اگر کل رات بھی ایسا ہی ہوا تو پھر یہاں سے گندھنی کے پاس چلے چلیں گے۔ دراصل میں اس خونی جنگل کے قریب جانا نہیں چاہتا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔"

وہ رات بھی گزر گئی۔

دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا تو اپنے ساتھ بادلوں کو بھی لے آیا۔ دیکھتے دیکھتے گھنے بادل چھا گئے اور دوپہر کے بعد بارش شروع ہو گئی۔ ہم کوٹھڑی میں ہی رہے۔ میں سانپ کی شکل میں تھا اور چارپائی کی پائینتی بیٹھا تھا۔ ہم دونوں آپس میں ڈھاکہ کے زمانے کی باتیں کر رہے تھے جب ہماری زندگی بڑی سکون سے گزر رہی تھی۔ دوپہر کے بعد شام ہونے لگی تو بارش تھم گئی۔ یہ علاقہ نیم پہاڑی تھا۔ بارش کا پانی بہہ کر آگے نکل جاتا تھا۔ جمیلہ نے کہا۔

"میں لنگر سے کچھ کھانے کو لے آؤں۔ اس کے بعد نہا دھو کر درگاہ میں جا کر بیٹھوں گی۔"

میں نے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ میں کوٹھڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے سخت بور ہو گیا ہوں۔ میں کھلی ہوا میں کچھ دیر کے لیے نکلنا چاہتا ہوں۔"

جمیلہ نے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔"

اس نے مجھے اٹھا کر اپنی ساڑھی میں بلاؤز کے اندر چھپا لیا اور کوٹھڑی بند کر کے اس طرف چل پڑی جہاں شام کو لنگر تقسیم ہوتا تھا۔ یہ جگہ درگاہ کے احاطے کے اندر مزار کے پائینتی کی طرف تھی۔ ایک جگہ بہت ہی دیگیں دم کی ہوئی پڑی تھیں اور

لوگوں میں بریانی تقسیم کی جا رہی تھی۔ جمیلہ کے پاس تام چینی کی ایک تھالی تھی۔ وہ روز اسی میں لنگر کی بریانی لاتی تھی۔ میں نے اپنی سانپ والی چھوٹی سی سری اس کے بلاؤز میں سے تھوڑی سی باہر نکال رکھی تھی۔ میرے آگے اس کی ساڑھی کا پلو تھا مگر اس میں سے باہر کا سارا منظر مجھے نظر آ رہا تھا۔ جمیلہ لنگر والی دیگوں کی طرف بڑھی تو ایک جانب سے اچانک ایک دبلا پتلا اونچا لمبا ادھیڑ عمر کا آدمی جس کا سر مونچھیں اور بھنوئیں بھی منڈھی ہوئی تھیں' ہاتھ میں لمبا عصا تھا ایک جانب سے نکل کر جمیلہ کے سامنے آ گیا۔

"کدھر جا رہی ہے۔"

اس نے جلالی انداز میں جمیلہ سے پوچھا۔ جمیلہ وہیں رک گئی۔ وہ غور سے اس آدمی کو تکنے لگی۔ میں بھی ساڑھی کے پلو کے پیچھے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جمیلہ نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں لنگر لینے جا رہی ہوں۔"

اس آدمی نے کہا۔

"اب تمہارا یہاں کا لنگر ختم ہو چکا ہے۔ اپنی جان عزیز ہے تو یہاں سے چلی جا۔ آج رات تو درگاہ شریف میں چلے کے لیے بیٹھی تو جو آگ تجھے بند آنکھوں کے پیچھے نظر آتی تھی اب باہر آ جائے گی اور تو جل کر راکھ ہو جائے گی۔"

جمیلہ نے بڑی ہمت کر کے کہا۔

"بابا جی! میں سمجھی نہیں' آپ کس آگ کی بات کر رہے ہیں؟"

اس آدمی نے عصا کو زور سے زمین پر مارا اور کہا۔

"تو سب کچھ سمجھ گئی ہے کہ میں تمہیں کیا کہہ رہا ہوں۔ اگر تو اب بھی نہیں سمجھی تو سن میں تمہیں کھول کر بتاتا ہوں۔ تیرا نام جمیلہ بیگم ہے تو اپنے خاوند کے لیے درگاہ پر چلہ کشی کرنے آئی ہے۔ مگر یاد رکھ سبز رومالوں والے بزرگ کی روح تجھ سے سخت ناراض ہے۔ کیونکہ تو نے بت پرستوں میں جا کر اپنے ایمان کو خراب کیا ہے۔

تیرے خاوند نے ایک بت پرست نرتکی سے غیر شرعی بیاہ کر لیا تھا۔ تم دونوں مرتد ہو چکے ہو۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی کرنی والا فقیر ہے۔ جمیلہ پر بھی اس کی باتوں کا شدید اثر ہوا تھا۔ کیونکہ وہ اسے ایسی باتیں کھول کر بتا رہا تھا جن کا وہاں سوائے ہم دونوں کے اور کسی کو علم نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے کہا۔

"مجھے میری بدنصیبی بت پرستوں میں لے گئی تھی میں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا۔"

اس بزرگ نے کہا۔

"لیکن تمہارے خاوند نے اپنی مرضی سے ایک بت پرست نرتکی سے ایک رات کا بیاہ کیا تھا۔ اس کا ایمان جاتا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا خاوند اس وقت بھی تمہارے ساتھ ہے اور میری باتیں سن رہا ہے۔ اگرچہ وہ انسان کی شکل میں نہیں ہے وہ سانپ کی شکل میں ہے اور یہ خدا کی طرف سے اس پر عذاب نازل ہوا ہے کہ وہ انسان سے سانپ بنا دیا گیا ہے۔ اسے لے کر یہاں سے نکل جا۔ اس سے پہلے کہ تم دونوں پر اس درگاہ کے جلالی بزرگ کا عتاب نازل ہو۔"

اب تو میں خاموش نہ رہ سکا۔ اس بزرگ کو ساری باتیں اپنی ریاضتوں یا چلہ کشیوں کی وجہ سے معلوم ہو چکی تھیں۔ میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"محترم بزرگ! ہمیں معاف کر دیں۔ میں نے بھی اپنی مرضی سے بت پرست نرتکی سے بیاہ نہیں کیا تھا۔ مجھے اس کی مدد درکار تھی۔ میں اس کی مدد سے اپنی منکوحہ بیوی کو شیطان صفت سپیروں اور بت پرستوں کے چنگل سے چھڑانا چاہتا تھا۔ میں اس وقت مجبور تھا۔"

بزرگ نے سخت لہجے میں کہا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم مجبور نہیں تھے۔ تم خود اس بت پرست عورت سے عیاشی کرنا چاہتے تھے۔ تم دونوں سے بہت بڑے گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ تم دونوں

خدا کے عذاب میں مبتلا ہو چکے ہو۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اس درگاہ کی فضا کو آلودہ نہ کرو۔"

میں نے ایک بار پھر عاجزی سے کہا۔

"محترم بزرگ! اگر ہم سے واقعی کوئی گناہ ہو گیا ہے تو ہم دونوں اس پر توبہ کرتے ہیں۔ توبہ تو اللہ میاں بھی قبول کر لیتا ہے۔ ہم ایسا گناہ پھر کبھی نہیں کریں گے۔ ہمیں آپ بھی معاف کر دیں اور اس درگاہ شریف کے بزرگ کی روح سے بھی ہمیں معافی دلا دیں۔"

اس بزرگ کا جلال کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا۔ میں خاموش ہوا تو جمیلہ کہنے لگی۔

"شاہ جی ہم سے بڑی بھول ہوئی ہے۔ ہمیں معاف کر دیں اور ہماری مدد کریں۔ آپ بڑی کرنی والے بزرگ ہیں۔ آپ کو ہمارے سارے حالات کا علم ہے۔ آپ کسی طرح میرے خاوند کو انسان سے سانپ اور سانپ سے انسان بن جانے کی مصیبت سے نجات دلا دیں۔ یہ آپ کا ہم پر بڑا کرم ہو گا۔"

بزرگ نے کہا۔

"یہ بات اب میری طاقت سے باہر ہو گئی ہے۔ تمہارے خاوند کا معاملہ اب براہ راست خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جس وقت خدا نے تمہارے خاوند کے گناہوں کی معافی دے دی تمہارے خاوند کو اپنی مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ جہاں تک تیرا معاملہ ہے میں تجھے معاف کرتا ہوں لیکن تم درگاہ شریف میں چلہ کشی کرنے ہرگز نہ بیٹھنا تمہیں کچھ ہو گیا تو میں ذمے دار نہ ہوں گا۔"

میں اپنے بارے میں یہ سن کر مایوس ہو گیا کہ وہ بزرگ میرے حق میں کچھ کرنے سے مجبور تھا۔ جمیلہ نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"شاہ جی! پھر ہم پر اتنی مہربانی کر دیجئے کہ ہمیں یہ بتا دیں کہ ہم پاکستان خیریت سے پہنچ جائیں گے۔ میں اپنے خاوند کو لے کر اپنے وطن پاکستان جانا چاہتی ہوں۔ وہاں میں دن رات عبادت کر کے خدا سے اپنے خاوند کے گناہ بخشوانے کی کوشش کروں گی۔"

جمیلہ جس جگہ پر اس بزرگ سے باتیں کر رہی تھی وہ لنگر تقسیم کرنے والی کوٹھڑی سے سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھی اور وہاں نیم کا گھنا درخت تھا۔ آس پاس کوئی آدمی نہیں تھا۔ اس بزرگ نے کہا۔

"تم اپنی کوٹھڑی میں چلو میں ابھی آ کر تم سے بات کرتا ہوں۔"

"جیسا آپ کا حکم۔"

یہ کہہ کر جمیلہ نے بزرگ کو سلام کیا اور کوٹھڑی کی طرف چل پڑی۔ میں نے کہا۔

"جمیلہ! یہ تو کوئی بڑا زبردست روحانی بزرگ ہے۔ مگر میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ اگر مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے تو میں توبہ کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے خدا مجھے معاف کر دے گا۔"

جمیلہ بڑی وفاشعار اور مجھ سے محبت کرنے والی بیوی تھی۔ کہنے لگی۔

"اگر تم نے کسی نرتکی سے اپنی مرضی سے بھی بیاہ کر لیا تھا تو میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم نے مجبوری کی حالت میں ایسا کیا ہو گا۔ اس وقت ہم دونوں مجبور ہیں اور سخت مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

سامنے دو عورتیں اور ایک مرد آ رہے تھے۔ میں چپ ہو گیا۔ کوٹھڑی میں آ کر جمیلہ نے مجھے اپنے بلاؤز کے اندر سے نکال کر چارپائی پر رکھ دیا اور کہنے لگی۔

"میں حیران ہوں کہ اس بزرگ کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تم سانپ کے روپ میں اس وقت میرے پاس موجود ہو خدا کرے اب یہ بزرگ ہمیں پاکستان میں داخل ہونے کا کوئی راستہ بتا دے۔ کوئی ترکیب بتا دے تاکہ میں تمہیں پاکستان لے جا کر تمہارا روحانی علاج کراؤں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میں دن رات خدا کے حضور گڑگڑا کر تمہارے حق میں دعائیں مانگوں گی تو خدا میری فریاد ضرور سن لے گا۔"

میں سوچ رہا تھا کہ یہ بزرگ روحانی آدمی ہے۔ یہ ہمیں پاکستان کا بارڈر کراس کرنے کی کیا ترکیب بتائے گا۔

میں نے یہی بات جمیلہ سے کہی تو وہ بولی۔

"یہ بزرگ لگتا ہے سب کچھ کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہمیں کوئی ایسا عمل بتا دے جس کو پڑھ کر ہم دونوں غائب ہو جائیں اور آسانی سے بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچ جائیں۔"

میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ اگر میں سانپ بن سکتا ہوں تو ہم غائب بھی ہو سکتے ہیں۔"

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی' ساتھ ہی اس بزرگ کی آواز بلند ہوئی۔

"دروازہ کھولو۔ ہم آ گئے ہیں۔"

جمیلہ نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ بزرگ اندر آ گئے اور دروازہ بند کر کے سامنے جو پرانی کرسی پڑی تھی اس پر بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی بولے۔

"میں تمہیں ایک لکھا ہوا پرچہ دیتا ہوں۔ اس میں میں نے سب کچھ لکھ دیا ہے....."

پھر انہوں نے مجھے اس شخص کا نام بتایا جس کے نام یہ پرچہ لکھا تھا۔ اس کا نام انہوں نے کمانڈو منظر خالد بتایا۔ کہنے لگے۔

"اس مجاہد کا پورا نام منظر خالد ہی ہے۔ اس کے ساتھی اسے کمانڈو خالد کے نام سے بلاتے ہیں۔ کمانڈو خالد سچا مسلمان اور پاکستان اور اسلام کا شیدائی ہے۔ بھوپال میں اس کی خفیہ تنظیم ہے جو بھارت میں ہندوؤں کے ظلم کی چکی میں پسے ہوئے مسلمانوں کی مدد کے لیے کام کرتی ہے۔ یہ لوگ کشمیر کے جہاد میں شریک ہونے جاتے ہیں۔ ان کے کئی آدمی جہاد کشمیر میں کافروں کو جہنم رسید کرنے کے بعد شہید ہوئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کمانڈو منظر خالد تم لوگوں کو پاکستان پہنچانے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ تم اس سے جا کر ملو اور کہنا کہ تمہیں اسلام شاہ نے بھیجا ہے اور میرا پرچہ اسے دے دینا۔ میں نے نیچے کمانڈو منظر خالد کا ایڈریس مصلحت کی وجہ سے نہیں لکھا کیونکہ یہ پرچہ

کسی دوسرے کے ہاتھ بھی لگ سکتا ہے اور مدھیہ پردیش ہی نہیں بلکہ بھارت کے ہر صوبے کی پولیس کمانڈو منظر خالد کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ بھارت کی پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس کو پردھان منتری نے حکم دے رکھا ہے کہ کمانڈو منظر خالد اور اس کے ساتھیوں کو نظر آتے ہی گولیوں سے اڑا دیں۔ بھارتی حکومت اسے اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتی ہے۔ یہاں سے نکل کر تم بھی کسی سے اس بارے میں بات نہ کرنا۔ کمانڈو خالد میرا مرید خاص ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم اس کے خفیہ ٹھکانے تک کیسے پہنچ سکو گے۔"

اس کے بعد شاہ جی نے مجھے اور جمیلہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں غور سے سنو۔ کرم داد! میں جانتا ہوں تم سانپ کے روپ میں ہو اور کسی دوسرے شخص سے انسانی آواز میں بات کرو گے تو وہ ڈر کر بھاگ جائے گا۔ اس لیے تمہاری بیوی جمیلہ کمانڈو منظر خالد کے خفیہ ٹھکانے تک جائے گی۔"

شاہ نے اب جمیلہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بی بی! میں تمہیں سمجھاتا ہوں تم پہلے کبھی بھوپال شہر میں آئی ہو؟"

جمیلہ نے کہا۔

"نہیں شاہ جی! میں پہلے یہاں کبھی نہیں آئی۔ یہ میرے لیے بالکل نیا شہر ہے۔"

اس کے بعد شاہ جی نے ایک خاص جگہ کا نام لیا جو میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ کمانڈو منظر خالد کے مجاہد ساتھی آج بھی بھارت میں مسلمانوں کے جائز حقوق کی خاطر برہمنوں کی حکومت کے مسلم کش عزائم کو ناکام بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور ان کے مجاہد کشمیر کے محاذ پر بھی بھارتی مقبوضہ فوج کے خلاف جہاد میں حصہ لینے جاتے ہیں۔ اس لیے میں یہاں آپ کو ان لوگوں کے خفیہ ٹھکانے کا حدود اربعہ نہیں بتاؤں گا۔ شاہ جی نے یہ حدود اربعہ جمیلہ کو اچھی طرح سے سمجھا دیا اور کہا۔

"تم جب وہاں پہنچو گی جہاں میں نے تمہیں بتایا ہے کہ ایک محل کے کھنڈر کی بارہ دری ہوگی تو تم وہاں بارہ دری میں جا کر بیٹھ جانا۔ تمہیں وہاں بیٹھے دیکھ کر ایک

بوڑھا آدمی لاٹھی ٹیکتا تمہارے قریب سے گزرتے ہوئے تم سے پوچھے گا کہ بی بی نواب گنج محلے کو کون سا راستہ جاتا ہے۔ اس کے جواب میں تم وہی جملہ بولو گی جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ یہ خفیہ کوڈ کا جملہ ہو گا۔ وہ بوڑھا پھر بھی تم پر شک کرے گا اور اپنے شک کو دور کرنے کے لیے تم سے پوچھے گا۔ کیا تم راجپوتانہ سے آئی ہو؟ اس کے جواب میں تم دوسرا خفیہ جملہ بولو گی جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ تب وہ بوڑھا شخص سمجھ جائے گا کہ تم اپنا ہی بندہ ہو پھر تم اسے میرا پرچہ نکال کر پڑھا دینا۔ وہ تمہیں کمانڈو منظر خالد کے پاس لے جائے گا۔ تم ان دونوں خفیہ کوڈ کے جملوں کو اچھی طرح سے یاد کر لینا۔"

میں نے پوچھا۔

"شاہ! جی کیا میں بھی سانپ کے روپ میں اپنی بیوی کے ساتھ جا سکتا ہوں؟"

شاہ جی بولے۔

"نہیں۔ تم کمانڈو منظر خالد کے پاس اپنی بیوی کے ساتھ نہیں جاؤ گے۔ بارہ دری کے کھنڈر تک بے شک اپنی بیوی کے ساتھ چلے جانا۔ وہ تمہیں بارہ دری کے کھنڈر میں کہیں چھپا دے گی اور واپسی پر تمہیں وہاں سے لے لے گی۔"

جمیلہ نے پوچھا۔

"مجھے وہاں کس وقت جانا چاہیے۔"

شاہ جی نے کہا۔

"تم کسی بھی وقت وہاں جا سکتی ہو۔ کمانڈو منظر خالد کا کوئی نہ کوئی مجاہد خفیہ ٹھکانے پر ہر وقت موجود رہتا ہے لیکن بہتر ہو گا کہ تم کل شام عصر کی نماز کے بعد جاؤ۔ اس وقت کمانڈو منظر خالد وہاں پر موجود ہو گا۔ اب میں جاتا ہوں۔ میرا پرچہ سنبھال کر رکھنا اور کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔ دونوں خفیہ جملے اچھی طرح سے یاد کر لینا۔ یہ مت بھولنا کہ یہ جملے ہی تمہیں کمانڈو خالد سے ملوا سکیں گے۔ اگر تمہیں یہ خفیہ جملے یاد نہ رہے اور تم نے وہاں الٹ پلٹ کچھ بول دیا تو وہ بوڑھا وہاں سے آگے چل دے گا

لیکن کمانڈو خالد کے ساتھیوں کو فوراً" اطلاع مل جائے گی کہ کوئی ہندو عورت جاسوسی کرنے بارہ دری میں آکر بیٹھ گئی ہے اور پھر تمہاری جان خطرے میں ہوگی۔ خدا حافظ!"

شاہ جی کوٹھڑی سے نکل گئے۔

جمیلہ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ اب ہم پاکستان پہنچ جائیں گے۔ کمانڈو منظر خالد کشمیر کے محاذ پر بھی جاتا ہے اور حریت پرست کشمیریوں سے اس کی گہری وابستگی ہے۔ وہ ہمیں وہاں سے آزاد کشمیر میں پہنچانے کی پوری کوشش کرے گا۔"

میں نے کہا۔

"اب مجھے بھی امید کی کرن نظر آنے لگی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں گندھرنی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

جمیلہ نے ناراضگی کے لہجے میں کہا۔

"اس کو بھول جاؤ۔ ان بت پرستوں کی وجہ سے پہلے ہی ہم پر خدا کا بہت عذاب نازل ہوچکا ہے۔ اب ان لوگوں میں سے کسی کا نام بھی نہ لینا۔"

میں نے کہا۔

"خدا کے لیے مجھ پر شک نہ کرو۔ میں تو خود ان بت پرستوں کا نام بھی نہیں لینا چاہتا مجھے وہ پرچہ دکھاؤ جو شاہ جی نے کمانڈو منظر خالد کے نام لکھا ہے۔"

جمیلہ نے پرچہ میرے سامنے کر دیا۔ میں اسے اپنی انسانی آنکھوں سے پڑھ سکتا تھا۔ کیونکہ سانپ کی آنکھوں میں میری نظر بھی شامل تھی۔ اس پرچے میں شاہ جی نے مختصر کر کے میری اور جمیلہ کی ساری مصیبت بیان کر دی تھی۔ انہوں نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ہندو سپیروں نے کسی خاص منتر کے ذریعے جمیلہ کے خاوند کو سانپ بنا دیا ہے۔ اس مصیبت کا علاج یہاں ہمارے پاس نہیں ہے۔ یہ پاکستان جا کر اس کا روحانی علاج کرانا چاہتی ہے۔ تم انہیں پاکستان پہنچانے میں ان کی مدد کرو۔ نیچے شاہ جی نے اپنی ایک

خاص مہر بھی لگادی تھی جو ان کی کوئی خفیہ نشانی ہوگی۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"اس پرچے کو پڑھ کر کمانڈو خالد تم سے میرے بارے میں ضرور پوچھے گا کہ تمہارا خاوند کہاں ہے۔ بہتر ہے کہ تم مجھے اپنے ساتھ ہی لیتی چلو۔"

وہ بولی۔

"شاہ جی نے کہا ہے کہ میں تمہیں بارہ دری کے کھنڈر میں ہی کہیں چھپا دوں۔ میں ان کے حکم کے خلاف نہیں جاؤں گی۔ ہاں۔ اگر کمانڈو منظر خالد نے کہا تو میں تمہیں بارہ دری سے لے آؤں گی۔"

رات گزر گئی دوسرا دن بھی گزر گیا۔ جب ذرا شام ہونے لگی اور دن کی روشنی ذرا کم ہوئی تو جمیلہ نے کہا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں چل پڑنا چاہیے۔"

چنانچہ ہم درگاہ شریف سے نکل کر ایک تانگے میں سوار ہوگئے اور بھوپال شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ جمیلہ نے ایک خاص جگہ کا کوچوان کو بتایا تھا جہاں سے بقول شاہ جی کے بارہ دری کا کھنڈر دو کوس کے فاصلے پر ایک جنگل کے شروع میں تھا۔ کوچوان نے ہمیں اس خاص جگہ پر اتار دیا جس کا میں نام آپ کو نہیں بتا سکتا۔ وہاں سے جمیلہ اس جانب چلنے لگی جہاں سے جنگل کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ میں آگے تفصیل نہیں لکھوں گا کہ ہم کہاں کہاں سے گزرے۔ یوں سمجھ لیں کہ ہم ایک جگہ پہنچے تو سامنے ایک بارہ دری کا ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا۔ کھنڈر کا ذکر میں نے اس لیے کر دیا ہے کہ بھوپال میں اس قسم کی بہت سی بارہ دریوں کے کھنڈر موجود ہیں۔ اگر انڈیا میں کوئی سی آئی ڈی والا یہ کہانی پڑھ کر بارہ دری کی تلاش میں نکلے گا تو اسے کچھ پتہ نہیں چل سکے گا کہ کمانڈو منظر خالد کے خفیہ ٹھکانے والی بارہ دری کون سی ہے اور اگر وہ اس بارہ دری تک پہنچ بھی گیا تو کمانڈو خالد کے جاسوسوں کو اس آدمی کا فوراً پتہ چل جائے گا اور وہ اسے پکڑ لیں گے اور پھر جیسا وہ مناسب سمجھیں اس کے ساتھ سلوک کریں گے۔

میں نے اپنی سانپ والی گردن جملہ کے بلاؤز سے باہر نکال رکھی تھی۔ بارہ دری

کے کھنڈر کو میں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ میں نے کہا۔

"یہی بارہ دری ہے جس کے متعلق شاہ جی نے کہا تھا؟"

"ہاں کیونکہ یہاں اور کوئی بارہ دری نہیں ہے۔ میں تمہیں یہاں چھوڑ دیتی ہوں۔ تم بارہ دری کے قریب کسی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ جب میں واپس آؤں گی تو تمہیں میرے جسم کی خوشبو آ جائے گی۔ تم خود ہی میرے پاس آ جانا۔"

اس نے مجھے بلاؤز میں سے نکال کر بڑے پیار سے زمین پر رکھ دیا۔ اس وقت شام کی ہلکی ہلکی سرخی چھا رہی تھی۔ میں بارہ دری کے قریب ہی ایک طرف خشک سرکنڈوں میں بیٹھ گیا۔ یہاں سے میں جمیلہ کو صاف دیکھ رہا تھا۔ وہ بارہ دری میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اتنے میں ایک جانب سے ایک بوڑھا آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور بارہ دری کے پاس رک گیا۔ اس نے جمیلہ سے پوچھا۔

"بی بی! نواب گنج کے محلے کو کون سا راستہ جاتا ہے؟"

جمیلہ نے آگے وہی خفیہ جملہ بول دیا جو شاہ جی نے اسے بتایا تھا۔ بوڑھے نے دوسرا سوال کیا۔

"کیا تم راجپوتانہ سے آئی ہو؟"

اس کے جواب میں جمیلہ نے دوسرا خفیہ جملہ دہرا دیا۔ تب بوڑھے نے جمیلہ سے کہا۔

"تم اپنے ساتھ کچھ لائی ہو؟"

جمیلہ نے شاہ جی کا خط نکال کر اسے دے دیا۔ بوڑھے نے خط کو غور سے دو تین بار پڑھا نیچے لگی ہوئی مہر کو بار بار غور سے دیکھا اور جمیلہ سے کہا۔

"میرے ساتھ آ جاؤ۔"

جمیلہ کو لے کر بوڑھا بارہ دری سے کچھ فاصلے پر دکھائی دیتے جنگل کے درختوں کی طرف لے گیا۔ پہلا مرحلہ خیر و عافیت کے ساتھ طے ہو گیا تھا۔ میں سرکنڈوں میں ہی چھپ کر بیٹھا رہا۔ جمیلہ بوڑھے کے ساتھ جنگل کے درختوں میں میری نظروں سے

اوجھل ہوگئی تھی۔ اس کے جسم کی خوشبو بھی آہستہ آہستہ مدھم پڑ گئی تھی جسے میں سانپ ہونے کی وجہ سے برابر محسوس کر رہا تھا۔ اسے گئے کافی دیر گزر گئی۔ شام کی سرخی رات کے ابتدائی اندھیروں میں بدل گئی۔ میں پریشان ہونے لگا کہ خدا خیر کرے۔ جمیلہ نے اتنی دیر کیوں لگا دی ہے۔ اتنے میں مجھے اندھیرے میں جمیلہ درختوں کی طرف سے اپنی جانب آتی دکھائی دی۔ سانپ ہونے کی وجہ سے میں اسے اندھیرے میں بھی آسانی سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ بارہ دری کے پاس آئی میں سرکنڈوں سے نکل کر اس کے قریب آگیا اور کہا۔

"خیریت تو تھی ناں۔ تم نے بڑی دیر لگا دی۔"

اس نے مجھے گھاس پر جھک کر دیکھا اور ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ کہنے لگی۔

"کمانڈو منظر خالد سے میری ساری بات ہوگئی ہے۔ وہ بڑا سچا مجاہد مسلمان ہے۔ اس نے میری ساری مصیبت بڑی توجہ سے سنی۔ اب اس نے تمہیں بلایا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"جب تم کمانڈو منظر خالد کو اپنی پتا سنا رہی تھیں تو اس کے پاس اور کون کون تھا؟"

جمیلہ نے مجھے اپنی کلائی کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

"اس وقت کمانڈو خالد میرے پاس اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ اس نے شاہ جی کا پرچہ پڑھنے کے بعد جو دو ایک مجاہد وہاں بیٹھے تھے انہیں وہاں سے باہر بھجوا دیا تھا۔"

میں نے کہا۔

"یہی میں سوچ رہا تھا کہ میرا سانپ ہونا صرف کمانڈو خالد تک ہی محدود رہے اور یہ راز کسی دوسرے تک نہ ہی پہنچے تو اچھا ہے۔"

جمیلہ جنگل کی طرف جا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"شاید کمانڈو خالد بھی نہیں چاہتا کہ کسی دوسرے مجاہد کو تمہارے انسان سے سانپ بن جانے کا راز معلوم ہو۔ اسی لیے اس نے وہاں سے دوسرے لوگوں کو اٹھوا دیا

تھا۔ اب بھی وہ تمہیں اپنے حجرے میں اکیلا ہی ملے گا۔"

"کیا وہ کسی حجرے میں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

جمیلہ نے کہا۔

"عجیب و غریب جگہ ہے۔ چل کر خود دیکھ لینا۔"

رات کی تاریکی میں وہ مجھے لے کر ٹیبے کی جانب جو درخت اور جھاڑیاں تھیں چل پڑی۔ وہ اندھیرے میں راستہ غور سے دیکھ کر چل رہی تھی جبکہ سانپ ہونے کے ناطے مجھے اندھیرے میں بھی ہر شے صاف نظر آ رہی تھی۔ جھاڑیوں اور کیکر کے درختوں کے درمیان ایک جگہ گہرائی تھی جیسے کسی نے گڑھا کھود رکھا ہو۔ جمیلہ اس گڑھے میں اتر گئی۔ ایک جگہ سے اس نے جھاڑیوں کو ایک طرف ہٹایا اور اندر داخل ہوگئی۔ یہ کسی پرانی باؤلی کے کھنڈر کی پتھریلی سیڑھیاں تھیں جو جنگلی گھاس میں چھپی ہوئی تھیں۔ دس بارہ سیڑھیاں اترنے کے بعد ایک خشک تالاب تھا جس کے کناروں کی روشوں کے پتھر اکھڑ چکے تھے۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"یہ مغلیہ زمانے کی کوئی باؤلی ہے جہاں محل سرا کی خواتین غسل کرتی ہوں گی۔"

وہ بولی۔

"شاید ایسا ہی ہو۔"

اچانک ایک آدمی جس نے منہ اور سر پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا اور صرف اس کی چمکیلی آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں، سٹین گن لیے ہمارے سامنے آگیا۔ اس نے جمیلہ کو دیکھا تو ایک طرف ہوگیا۔ جمیلہ اس سے پہلے وہاں سے گزر چکی تھی اور اسے معلوم تھا کہ یہ عورت کمانڈو خالد سے ملنے آئی ہوئی ہے۔ تالاب کی ایک جانب دیوار میں کوٹھڑیاں سی بنی ہوئی تھیں جن میں سے ایک کوٹھڑی کے اندر سے ہلکی ہلکی روشنی باہر آ رہی تھی۔

جمیلہ نے کہا۔

"یہ کمانڈو منظر خالد کا حجرہ ہے۔"

ہم کوٹھڑی میں داخل ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ کوٹھڑی زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ اندر فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ لالٹین روشن تھی۔ ایک سرخ و سفید رنگت والا خوش شکل نوجوان سٹین گن گود میں رکھے بیٹھا تھا۔ جمیلہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نوجوان کا جسم باڈی بلڈروں ایسا مضبوط اور کسرتی تھا۔ سر کے بال نسواری رنگ کے تھے۔ ماتھے پر اس نے سبز رنگ کی پٹی باندھ رکھی تھی۔ اس نے جمیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کہاں ہے تمہارا خاوند!"

میں جمیلہ کی کلائی سے لپٹا ہوا تھا۔ اس نے کلائی اس کے سامنے کر دی اور کہا۔

"یہ ہے میرا خاوند کرم داد!"

یہ خوش شکل نوجوان کمانڈو منظر خالد تھا۔ وہ بڑے تعجب سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ سانپ اصل میں کوئی آدمی ہے۔"

جمیلہ نے کہا۔

"آپ اس سے بات کریں۔ یہ انسانی آواز میں آپ کو جواب دے گا۔ پھر شاید آپ کو یقین آ جائے۔"

"کیا واقعی تم انسان ہو؟"

میں نے انسانی آواز میں کہا۔

"ہاں کمانڈو! میں انسان ہوں۔ میرا نام کرم داد ہے۔ جمیلہ میری بیوی ہے۔ ہم ڈھاکہ فال کے بعد ایسے حالات کا شکار ہوگئے کہ جن کی وجہ سے ہم پر یہ مصیبت آن پڑی۔ جمیلہ نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔"

کمانڈو منظر خالد کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ ایک سانپ انسان کی آواز میں باتیں کر سکتا ہے۔ اس نے جمیلہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ بڑی حیران کر دینے والی بات ہے مگر یہ کفر ہے' جادو ہے۔ تم لوگ کن کافر

بت پرست سپیروں اور پجاریوں میں جا پھنسے تھے؟"

جمیلہ نے کہا۔

"میں خود حیران ہوں کہ ہمارے ساتھ یہ بھی گزرنی تھی۔ ہم تو ڈھاکہ میں بڑے سکون سے زندگی بسر کر رہے تھے۔"

جمیلہ کی آواز بھرا سی گئی۔ میں نے کہا۔

"کمانڈر! ہم سے ضرور کوئی گناہ سرزد ہوا ہے جس کی خدا نے ہمیں یہ سزا دی ہے۔ خداوند کریم ہمارے گناہ معاف کرے۔"

کمانڈو منظر خالد کو میں نے کمانڈر کہہ کر اس لیے مخاطب کیا تھا کہ وہ اس چھوٹی سی زیر زمین جماعت کا سربراہ تھا جو بھارت میں برہمنوں کی حکومت کے ظلم و ستم میں پسے ہوئے مسلمانوں کے حقوق کے لیے سرفروشی کے جذبے سے کام کر رہے تھے اور جو بھارتی مقبوضہ کشمیر میں بھی بھارتی فوجوں کے خلاف جہاد کر رہے تھے۔ کمانڈو منظر خالد نے ہاتھ تھوڑا سا اوپر اٹھا کر کہا۔

"انسان اگر گناہوں سے توبہ کر لے اور توبہ کرنے کے بعد پھر گناہ نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم پر کافر بت پرستوں کے جس خبیث جادو کا اثر ہوگیا ہے اور جس کے اثر سے تم انسان سے سانپ کی شکل اختیار کر گئے ہو اس سے کیسے نجات مل سکے گی؟"

میں نے کہا۔

"میری بیوی جمیلہ نے آپ کو بتا دیا ہوگا کہ مجھ پر ناگ دیوتا کے پجاری سپیروں نے جو منتر پھونکے ہیں ان کا اثر جس وقت ذرا کم ہوتا ہے تو میں انسانی شکل میں واپس آ جاتا ہوں لیکن یہ تھوڑی دیر کے لیے وقفہ آتا ہے اور پتہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ وقفہ کس وقت اچانک آ جائے۔"

کمانڈو منظر خالد کہنے لگا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے۔"

میں نے کہا۔
"سبز رومالوں والی درگاہ شریف کے بزرگ نے تو مجھے یہی کہا تھا کہ یہ مجھے میرے گناہوں کی سزا ملی ہے اور جب خدا میرے گناہ معاف کر دے گا تو اپنے آپ مجھے اس سے نجات مل جائے گی۔ اس کے سوا میری بیماری کا کوئی علاج نہیں ہے۔"
کمانڈو منظر خالد بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔
"یقین نہیں آتا کہ ایک سانپ میرے سامنے بیٹھا مجھ سے انسان کی آواز میں باتیں کر رہا ہے۔"
میں نے کہا۔
"اب تو آپ کو یقین کرنا ہی پڑے گا کمانڈر!"
اس نے کہا۔
"اب تم کیا چاہتے ہو۔ تمہاری بیوی نے بھی بتایا ہے اور جن بزرگ کا تم پرچہ لے کر آئے ہو انہوں نے بھی تمہارے بارے میں یہی لکھا ہے کہ تم اپنی بیوی کو لے کر پاکستان جانا چاہتے ہو۔"
میں نے کہا۔
"فی الحال میں نے یہی سوچا ہے۔"
کمانڈو خالد نے بھنوئیں سکیڑ کر پوچھا۔
"فی الحال سے تمہاری کیا مراد ہے۔ کیا تمہارے ذہن میں کچھ اور پروگرام بھی ہے؟"
میں نے کہا۔
"کمانڈر! بھارت کے ہندو غنڈوں اور مکتی باہنی والوں اور مندروں کے پجاریوں خاص طور پر آلوپ نگر کے شیطان پجاری مہادیو اور اس کے دہشت سپیروں نے مجھ پر اور میری بیوی جمیلہ پر بڑے ظلم کیے ہیں۔ ان لوگوں نے میری عزت خاک میں روندی ہے۔ میں ان سب سے ایک ایک کر کے انتقام لینا چاہتا ہوں لیکن اس سے

پہلے جمیلہ کو یہاں سے پاکستان ضرور پہنچا دینا چاہتا ہوں۔"

جمیلہ نے میری زبان سے اس قسم کی باتیں پہلے نہیں سنی تھیں۔ وہ بول پڑی۔

"میں تمہیں انڈیا میں دشمنوں کے پاس اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ پاکستان جائیں گے تو اکٹھے جائیں گے، ورنہ میں بھی تمہارے ساتھ انڈیا میں رہوں گی اور اپنی عزت خراب کرنے والوں سے بدلہ لوں گی۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کمانڈو منظر خالد کہنے لگا۔

"مجھے تمہارا جذبہ پسند آیا ہے۔ تمہیں اپنے دشمنوں سے ضرور بدلہ لینا چاہیے بلکہ اس کام میں میں بھی تمہارے ساتھ شریک ہوں گا۔ لیکن....."

وہ جمیلہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"لیکن میری بہن! تم اگر پاکستان چلی جاؤ تو زیادہ اچھا ہے۔ ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں ان بدمعاشوں سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگ ہی ان شیطانوں کو جہنم میں پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔"

مگر جمیلہ نہ مانی۔ کہنے لگی۔

"میں کرم داد کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ پاکستان میں مجھے ہر لمحہ اس کی فکر لگی رہے گی۔"

کمانڈو منظر خالد کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے ابھی ان باتوں کو ملتوی کر دیتے ہیں بعد میں سوچ کر اور آپس کے مشورے سے کوئی فیصلہ کریں گے۔"

پھر کمانڈو خالد نے مجھ سے پوچھا۔

"تم لوگوں کے یہاں رہنے کا کوئی بندوبست ہے یا نہیں؟"

جمیلہ نے کہا۔

"ہم سبز رومالوں والی درگاہ کی ایک کوٹھڑی میں رہ رہے ہیں۔ وہیں سے ہم سیدھا آپ کے پاس آئے ہیں۔"

کمانڈو خالد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں۔ تمہیں وہاں نہیں رہنا چاہیے۔ تمہاری رہائش کا کوئی اور انتظام کرتے ہیں۔ ابھی تم لوگ میرے ساتھ کھانا کھاؤ گے۔ اس کے بعد باتیں کریں گے۔"

کمانڈو منظر خالد نے جمیلہ سے کہا۔

"کرم داد! کو ساڑھی میں چھپالو۔ میں اپنے ایک مجاہد کو بلانے لگا ہوں۔"

جمیلہ نے کمانڈو خالد کے سامنے مجھے اپنے بلاؤز میں چھپانے کی بجائے اپنی کلائی ساڑھی کے پلو کے اندر کرلی۔ میں اس کی کلائی سے لپٹا ہوا تھا۔ کمانڈو خالد نے اپنے ایک مجاہد کو بلا کر کہا کہ کھانا لے آئے۔ تھوڑی دیر میں وہاں کھانا آ گیا۔ سادہ کھانا تھا۔ جمیلہ اور کمانڈو خالد نے مل کر کھایا۔ میرے لیے جمیلہ کے کہنے پر اس نے پیالے میں دودھ منگوا لیا تھا۔ اس وقت وہاں تیسرا کوئی مجاہد نہیں تھا۔ جمیلہ نے پیالہ میرے آگے رکھ دیا۔ میں نے کہا۔

"میری قسمت میں اب بھی دودھ پینا ہی رہ گیا ہے۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"اللہ نے چاہا تو بہت جلد تمہیں اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔"

کھانے کے بعد اس نے جمیلہ سے کہا۔

"جمیلہ بہن! میں اپنے ایک آدمی کے ساتھ تمہیں شہر بھیج رہا ہوں۔ تم میری ایک عزیزہ کے ہاں رہنا۔ وہ میری بہن بھی ہے اور ہماری زیر زمین ورکر بھی ہے۔ مگر ہماری خفیہ تنظیم کے بارے میں تم اس سے کوئی بات نہ کرنا۔ وہ بھی تم سے کوئی بات نہیں کرے گی۔ وہاں تمہیں اپنے گھر والا ماحول ملے گا۔ لیکن یہ سانپ تم وہاں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکو گی۔"

میں نے جمیلہ سے کہا۔

"کمانڈر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم مجھے یہیں چھوڑ جاؤ۔"

جمیلہ نے کہا۔

"تم یہاں کہاں رہو گے؟ باہر تو نہیں نکل جاؤ گے؟ مجھے تمہاری فکر رہے گی۔"
میں نے کہا۔

"یہاں میں کسی بھی کونے کھدرے میں چھپ کر رات گزار لوں گا۔ مجھے کون سے بیڈ روم یا کسی بستر کی ضرورت ہے۔"

کمانڈو منظر خالد بولا۔

"کرم داد ٹھیک کہتا ہے بھابھی۔ آپ اس کی فکر نہ کریں' یہ ہمارے پاس بالکل محفوظ ہو گا اور ہم اسے باہر بھی نہیں جانے دیں گے۔"

جمیلہ مطمئن ہو گئی۔ کمانڈو منظر خالد نے اپنے ایک خاص آدمی کو آواز دی اور ساتھ ہی مجھے کہا۔

"کرم داد! تم وہاں تکیئے کے نیچے چھپ جاؤ۔"

میں جلدی سے دری پر پڑے ہوئے تکیوں میں سے ایک تکیئے کے نیچے چھپ گیا۔ جب کمانڈو خالد کا خاص آدمی اندر آیا تو اس نے اس سے کہا۔

"گل خان! یہ ہماری بہن ہے۔ اسے لالہ رخ کے مکان پر لے جاؤ اور اسے کہو کہ ہماری بہن اس کے پاس رہے گی۔"

مجاہد گل خان نے کمر کے گرد میگزین بیلٹ باندھی ہوئی تھی اور کاندھے سے سٹین گن لٹک رہی تھی۔ اس نے بڑے ادب سے کہا۔

"او کے سر!"

کمانڈو خالد نے جمیلہ سے کہا۔

"جمیلہ بہن! تم گل خان کے ساتھ جاؤ۔ میں کل کسی وقت تمہیں یہاں بلا لوں گا' تب تک ہم کسی نتیجے پر بھی پہنچ جائیں گے کہ آپ لوگوں کو کب اور کہاں سے مقبوضہ کشمیر کا بارڈر کراس کرا کر پاکستان پہنچانا ہے۔"

"شکریہ خالد بھائی جان۔"

جب جمیلہ مجاہد گل خان کے ساتھ کوٹھڑی سے چلی گئی تو کمانڈو منظر خالد نے مجھے

آہستہ سے کہا۔

"کرم داد! باہر نکل آؤ۔"

میں تکیئے کے نیچے سے نکل کر کمانڈو خالد کے قریب ہی کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ مجھے حیرانی سی ہو رہی تھی کہ اتنی دیر گزر گئی تھی اور میں سانپ سے انسانی شکل میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ خدا جانے میری قسم میں انسانی شکل میں واپس آنا لکھا بھی تھا یا نہیں۔

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

کرم داد! تم نے اپنے دشمنوں سے جو اپنی بے عزتی اور جمیلہ کی بے حرمتی کا بدلہ لینے کی جو بات کی تھی وہ مجھے بڑی اچھی لگی ہے، غیرت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جن کافروں نے ایک پاکباز مسلمان عورت کی بے حرمتی کی ہے ان کو برباد کر دیا جائے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن کمانڈر! یہ ایک لمبا ایکشن ہے۔ اس میں کافی وقت لگ جائے گا۔ پوری منصوبہ بندی اور پلاننگ کرنی پڑے گی۔ کچھ کافر کلکتے میں ہیں جو مکتی باہنی والے ہیں اور جنہوں نے میری بیوی کو اغوا کر کے آگے بیچ دیا تھا۔ کچھ سنتھا ولی کے مندر میں ہیں۔ مجھے ان سب کو ایک ایک کر کے ہلاک کرنا ہے۔ اس طویل ایکشن میں جمیلہ کا میرے ساتھ رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوگا۔"

وہ بولا۔

"لیکن وہ تمہارے بغیر پاکستان جانے پر تیار نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا۔

"پھر اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے کہ میں اسے یہاں بھوپال میں ہی آپ کی رشتے دار خاتون لالہ رخ کے ہاں چھوڑ دوں اور خود سب سے پہلے مکتی باہنی والوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے کلکتے کی طرف روانہ ہو جاؤں۔"

کمانڈو خالد کسی سوچ میں تھا۔ کہنے لگا۔

"انتقام لینے کی اس مہم میں میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔ ہماری خفیہ تنظیم کا

مقصد ہی یہی ہے کہ بھارت کے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا سدباب کیا جائے اور جو کافر لوگ یہاں کے مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھتے ہیں۔ ان کو ایسا سبق سکھایا جائے کہ وہ دوبارہ کسی بھارتی مسلمان پر ہاتھ نہ اٹھا سکیں۔"

میں نے کہا۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ بھی اس مہم میں میرے ساتھ ہوں گے لیکن کیا آپ کے پاس اتنا ٹائم ہو گا؟"

کمانڈو خالد نے اپنی سٹین گن پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم اسلام کی حرمت اور مسلمانوں کی عزتیں بچانے کے لیے اگر مجھے مر کر بھی واپس آنا پڑے تو میں واپس آ جاؤں گا۔ مگر کیا جمیلہ بھابھی تمہارے بغیر بھوپال والے گھر میں رہ لے گی؟"

میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

"میں اسے راضی کر لوں گا۔"

"پھر ٹھیک ہے۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"تم مجھے بتاؤ کہ کلکتے میں کتنے مکتی باہنی والے کافر ہیں جنہوں نے تمہاری بیوی کو ڈھاکہ سے اغوا کر کے آگے فروخت کیا تھا؟ وہ کلکتے میں کہاں کہاں رہتے ہیں؟"

میں نے کمانڈو خالد کو مختصر الفاظ میں تینوں مکتی باہنی والے کافروں کے بارے میں بتایا کہ وہ کلکتے میں کہاں کہاں رہتے ہیں اور ان کے نام کیا ہیں۔ میں نے کہا۔

"میں صرف ان دو مکتی باہنی والے کافروں سے مل چکا ہوں جنہوں نے میری بیوی کو اغوا کر کے کلکتے میں بیچ ڈالا تھا۔ تیسرے آدمی کا نہ مجھے معلوم ہے' نہ ہی میں نے اسے دیکھا ہوا ہے۔"

"کیا وہاں پہنچ کر ہمیں اس تیسرے کافر کا ٹھکانہ معلوم ہو سکے گا؟"

میں نے کہا۔

"ہم پوری کوشش کریں گے۔"

اس کے بعد میں نے کمانڈو منظر خالد کو کلکتے والے حاجی صاحب کے بارے میں بتایا کہ ہم ان کے ہاں جا کر ٹھہریں گے اور مکتی باہنی والوں کے متعلق ان سے بھی تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو سکیں گی۔ اس پر کمانڈو خالد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ ہم وہاں ایک اور جگہ پر ٹھہریں گے تمہارے کسی واقف کار کے ہاں نہیں ٹھہریں گے۔ ہماری زیر زمین خفیہ تنظیم کے ہمدرد کلکتے میں بہت ہیں۔ تم ان کی فکر نہ کرو۔"

میں نے کہا۔

"اب میں جلدی سے انسانی شکل میں آ جاؤں تو اچھا ہے۔"

اس پر کمانڈو منظر خالد نے مسکرا کر کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ سانپ کی شکل میں رہ کر تم اپنے دشمنوں تک زیادہ آسانی سے پہنچ سکو گے۔"

میں کمانڈو خالد کا منہ تکنے لگا۔





اس نے بڑی صحیح اور مناسب بات کہہ دی تھی۔

میرے دشمنوں نے بھی مجھے سانپ بن کر ڈسا تھا۔ میں بھی انہیں سانپ کی طرح ڈسنے کی پوزیشن میں تھا۔ میں نے کہا۔

"کمانڈر آپ نے.....

کمانڈو منظر خالد نے مجھے وہیں روک دیا اور بولا۔

"سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تم مجھے آپ کہہ کر نہیں مخاطب کرو گے۔ مجھے تم کہہ کر بلاؤ۔ جس طرح میں تمہیں بلاتا ہوں، اسی طرح تم مجھے بلاؤ گے۔ اب بات کرو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

میں نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن ایک چیز کا خطرہ میرے سر پر منڈلاتا رہے گا۔ میں کسی بھی وقت انسانی شکل اختیار کر سکتا ہوں۔ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر عین کمانڈو ایکشن کے دوران میں سانپ سے انسانی روپ میں آ گیا تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔ پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

وہ کہنے لگا۔

"ایسا نہیں بھی ہو سکتا۔ بہرحال ہم جو قدم بھی اٹھائیں گے سوچ سمجھ کر اٹھائیں گے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ ہم مسلمانوں کی بہو بیٹیوں اور ہماری ماں بہنوں کی

عزتوں سے کھیلنے والوں کو معاف نہیں کریں گے۔"

میں بھوپال کے اس مسلمان مجاہد کمانڈو منظر خالد کے اسلامی جذبے سے بہت متاثر ہوا۔ اس وقت یہ بات پوری طرح سے میری سمجھ میں آگئی کہ بھارت کے مسلمان آج بھی اسی جذبے سے سرشار ہیں جس میں وہ اس وقت بھی سرشار تھے جب پاکستان بن رہا تھا اور انہوں نے برصغیر کے ہر صوبے کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے' پاکستان کو قائم کرنے اور ہندوؤں کی غلامی قبول نہ کرنے کے واسطے قائداعظم کی قیادت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ وہ آج بھی اگرچہ ہندو حکمرانوں کے ظلم و تشدد اور استحصال کی چکی میں پس رہے ہیں لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔

میں نے کمانڈو منظر خالد سے کہا۔

"کمانڈر! جیسا کہ تم جانتے ہو میں پاک آرمی کا سابق کمانڈو ہوں اور جیسا کہ تم نے مجھے بتایا ہے تم بھی کمانڈو تربیت حاصل کر چکے ہو۔ لہٰذا تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایک کمانڈو کو اپنی مہم پر جاتے ہوئے اسلحہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ یہاں ہمارا مقابلہ ابھی کسی بھارتی فوجی یونٹ سے نہیں ہے' پھر بھی ہمیں تھوڑے بہت ہتھیاروں کی ضرورت ہوگی۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ ہمیں جس قسم کے ہتھیاروں کی ضرورت ہوگی ہمیں مل جائیں گے۔ یہ بتاؤ کہ سب سے پہلے تم مسلمانوں کے کن دشمنوں کا سر کچلنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میری عزت' میری غیرت کو جہاں جہاں خاک میں روندا گیا ہے میں وہاں وہاں جا کر اپنے دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نہ صرف میری بیوی کو اغوا کر کے کلکتے کے بازاروں میں فروخت کیا بلکہ نہ جانے جیلہ

ایسی اور کتنی مسلمان عورتیں ہیں جن کو مکتی باہنی کے کافروں نے مشرقی پاکستان کے شہروں سے اغوا کر کے بھارت میں لا کر بے آبرو کیا اور پھر انہیں فروخت کر دیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس وقت بھارت کے شہروں میں کتنی ایسی بدنصیب عورتیں تباہی و بربادی کے دلدل میں گری ہوئی ہیں اور خاموش فریادوں سے کسی محمد بن قاسم کو آوازیں دے رہی ہیں لیکن ان کی مدد کو کوئی نہیں پہنچ رہا۔"

کمانڈو خالد کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا۔ اس نے پر جوش لہجے میں کہا۔

"کرم داد! غم نہ کرو۔ محمد بن قاسم کشمیر کی وادیوں سے لے کر کرناٹک اور تامل ناڈو تک ہر مسلمان کے دل میں زندہ ہے۔ آؤ ہم عہد کریں کہ بھارت کے جن کافروں نے ہماری ماؤں بہنوں کو بے عزت کیا ہے جب تک ان سے اپنی بے عزتی کا بدلہ نہیں لیں گے اور اغوا کی گئی عورتوں کو ان کی قید سے رہائی نہیں دلائیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔"

میں اس وقت سانپ کے روپ میں تھا۔ اگر انسان کی شکل میں ہوتا تو میں اٹھ کر مجاہد کمانڈو منظر خالد کو سینے سے لگا کر اس کی پیشانی چوم لیتا۔ بھوپال کے اس خوش شکل نوجوان مسلمان میں محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کے مجاہدوں کا سا جذبہ موجزن تھا۔ مگر میں سانپ کے روپ میں تھا۔ میں نہ اسے سینے سے لگا سکتا تھا اور نہ اس کا ماتھا چوم سکتا تھا۔ میں نے اسلامی جذبے میں سرشار ہو کر پرجوش آواز میں کہا۔

"کمانڈر خالد! میں عہد کرتا ہوں کہ اسلام کے دشمنوں سے جہاد کرنا اور مشرقی پاکستان سے اغوا کی گئی مسلمان عورتوں کو کافروں کے پنجے سے رہائی دلانا اور انہیں اغوا کرنے والوں کا سر کچلنا اب میرا مشن ہے اور جب تک میرا مشن مکمل نہیں ہوگا میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

کمانڈو منظر خالد بے اختیار ہو کر سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے لگا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

"کرم داد! تمہاری کیا رائے ہے۔ ہمیں سب سے پہلے کس طرف جانا چاہیے؟"

میں نے اس سے پوچھا۔

"کمانڈر! یہ بتاؤ اس مہم میں تمہارے ساتھ اور کون کون ہوگا؟"

اس نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔

"اس وقت ہماری خفیہ جماعت میں پچاس مجاہد ہیں جو مدھیہ پردیش کے علاقے کے مسلمانوں کے جائز حقوق کے لیے کام کر رہے ہیں۔ بھارت کے دوسرے صوبوں میں بھی ہمارے آدمی زیر زمین کام کر رہے ہیں اور وہاں اپنے طور پر مسلمانوں کے حق غصب کرنے والی برہمنی سرکار کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ ہمارے سارے مجاہد بھارتی فوجی یونٹوں کے تربیت یافتہ سابق فوجی ہیں۔ ہم ان میں سے چار پانچ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں نے کہا۔

"ہمارے آپریشن کمانڈو آپریشن ہوں گے۔ ہم دشمن کے ساتھ کھل کر جنگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔ ہمیں چھپ کر دشمن کے مورچوں پر اٹیک کرنا ہوگا۔ اس لیے میرے خیال میں ہمارے ساتھیوں کے طور پر پانچ آدمی ہی کافی ہوں گے۔ لیکن یہ پانچوں مجاہد ایسے ہونے چاہئیں جو ہر قسم کا ہتھیار چلا سکتے ہوں اور دشمن کو ہلاک کرنا جانتے ہوں۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"ہمارے ہر مجاہد کے سینے میں ایسا ہی جذبہ موجزن ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ سب سے پہلے ہمیں کس مہم پر روانہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ تم آگ اور خون کے دریا سے نکل کر آئے ہو اور خود زخم کھا چکے ہو۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگا کہ مشرقی پاکستان کے سانحے کے بعد مکتی باہنی والے مسلمان عورتوں کو اغوا کر کے کن کن علاقوں کی طرف گئے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"زیادہ تر عورتوں کو کلکتے میں فروخت کیا گیا ہے۔ وہاں ہری رام نام کے آدمی کا

قحبہ خانہ ہے اس قحبہ خانے میں اس وقت بھی مشرقی پاکستان کی تین چار مظلوم عورتیں بے بسی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہاں سے ہمیں دوسری جگہوں کا سراغ مل جائے گا۔"

"تو تمہارے خیال میں ہمیں سب سے پہلے کلکتے کی طرف جانا چاہیے۔"

کمانڈو خالد کے اس سوال کے جواب میں میں نے کہا۔

"لیکن کلکتے کی طرف جانے سے پہلے میں سنتھا ولی کے شیطان پجاری گورو دیو گری اور خونی جنگل کے مہا دیو کو ٹھکانے لگانا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے میں ان سانپوں کا سر کچلنا چاہتا ہوں۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"ٹھیک ہے ہمارا پہلا کمانڈو اپریشن سنتھا ولی کے جنگل میں ہوگا۔ جہاں ہم ناگ مندر کے شیطان صفت پجاری گورو دیو گری کو جہنم رسید کریں گے۔"

میں اس سے پہلے اپنی کہانی سناتے ہوئے کمانڈو خالد کو بتا چکا تھا کہ دلی کے مافیا لیڈر شری راج نے میری بیوی کو کلکتے سے خرید کر اپنے گورو دیو گری کو تحفے کے طور پر دیا تھا۔ کمانڈو خالد نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

"اور اس کے بعد ہم کلکتے کے کمانڈو آپریشن پر جاتے ہوئے راستے میں اس بین الاقوامی غنڈے شری راج کو بھی ٹھکانے لگاتے جائیں گے۔"

میں نے اپنی اس مہم کے تمام پہلوؤں پر ایک کمانڈو کی حیثیت سے غور کرنے کے بعد کمانڈو خالد سے کہا۔

"اس مہم کے لیے ہمیں کافی وسائل کی ضرورت ہوگی۔ ہم دو آدمی نہیں ہوں گے۔ سات آدمی ہوں گے ہمیں بھارتی انٹیلی جینس کی نظروں سے بھی چھپنا ہوگا۔ جیسا کہ تم بیان کرچکے ہو تمہاری خفیہ تنظیم سے بھارتی حکومت پوری طرح باخبر ہے اور انٹیلی جینس والے تم لوگوں کی تلاش میں ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ ہمیں بھارتی انٹیلی جینس سے بچنے کے لیے بھی پورے انتظامات کرنے ہوں گے۔ ہم دو آدمیوں کے لیے

یہ کام کوئی زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن ہم سات آدمی ہوں گے۔"

کمانڈو خالد نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"ہم سات نہیں چھ آدمی ہوں گے۔ تم سانپ کی شکل میں میری جیب میں ہو گے۔"

میں بھول گیا تھا کہ میں سانپ کے روپ میں کمانڈو خالد کے سامنے بیٹھا ہوں۔ دراصل میں ایک تو انسانی آواز میں بول رہا تھا دوسرے میری سوچ اور میرے تمام احساسات انسانی ہی تھے۔ صرف مجھے اپنے جسم کا وزن محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ گفتگو کی روانی اور موضوع کی گرم جوشی میں میں تھوڑی دیر کے لیے اپنے سانپ کے روپ کو بھول گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"تم نے ٹھیک یاد دلایا کمانڈر! ہم چھ آدمی ہی ہوں گے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا کہ میں کسی بھی وقت انسانی شکل اختیار کر کے سات کی نفری کو پورا کر سکتا ہوں۔"

میں نے کمانڈو خالد سے پوچھا۔

"کمانڈر! تم میرے سانپ کے روپ کو اپنے مجاہدوں سے کب تک چھپا سکو گے مہم کافی طویل ہو گی۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ تم انہیں میری اس مصیبت سے پہلے ہی آگاہ کر دو۔"

کمانڈو خالد چپ ہو گیا۔ پھر بولا۔

"میرا خیال ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے اس معاملے میں اپنے مجاہدوں کو اعتماد میں لے لینا چاہیے۔ وہ ایک انسان کو سانپ کی شکل میں یا ایک سانپ کو انسان کی آواز میں باتیں کرتے دیکھ کر حیران تو بہت ہوں گے لیکن میں انہیں ساری بات بیان کر دوں گا۔"

"دوسری بات یہ ہے۔" میں نے کہا۔ "کہ ہم کس طریقے سے سفر کریں گے۔ ہمیں بھارتی انٹیلی جینس کی نگاہوں سے بھی بچنا ہو گا اور ایک دوسرے کی نظروں میں بھی رہنا ہو گا۔ اگر ہم نے ایک ٹولی کی شکل میں سفر کیا تو خواہ مخواہ دوسروں کی نظروں

میں آجائیں گے۔"

وہ بولا۔

"ہم اس طرح سفر کریں گے کہ ایک دوسرے کے ساتھ بھی رہیں اور ایک دوسرے سے الگ الگ بھی رہیں۔ اس سے پہلے ہم اس طرح ایک شہر سے دوسرے شہر' خاص طور پر دلی اور ناگ پور کی طرف سفر کر چکے ہیں۔ تم دیکھ لو گے۔"

میں نے ایک اور ضروری سوال اس سے پوچھا۔

"کیا اپنے مجاہدوں میں سے کسی کی تصویر پولیس کے ریکارڈ میں ہے؟"

کمانڈو خالد نے میرے سوال کا ایکدم سے جواب نہ دیا۔ کچھ سوچ کر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"میرا نہیں خیال کہ مدھیہ پردیش یا مہاراشٹر کی پولیس کے پاس اپنے کسی مجاہد کا فوٹو ہو۔ کیونکہ ابھی تک ہمارا ایک بھی ساتھی گرفتار نہیں ہوا۔"

میں نے اپنے سابقہ تجربے کی بنا پر کہا۔

"کمانڈر! یہ ضروری نہیں کہ اپنا کوئی مجاہد گرفتار ہی ہو تو پولیس اس کا فوٹو اتار لے۔ پولیس اور خاص طور پر انٹیلی جینس والے کبھی کبھی مشکوک آدمیوں کی بھی اس طرح سے چھپ کر تصویریں اتار لیتے ہیں کہ اس آدمی کو خبر بھی نہیں ہوتی اور اس کی فوٹو پولیس کے خفیہ ریکارڈ میں پہنچ جاتی ہے۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"اگر کوئی ایسی بات ہوئی ہوگی تو مجھے اس کی خبر نہیں ہے اور پھر تمہیں اس بارے میں متفکر ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ ہم لوگ اپنے حلیے بدل کر اس مہم پر نکلیں گے۔"

ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب سارے معاملات طے ہوگئے تو کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"اب صرف ایک بات رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ تمہیں کسی طرح جمیلہ بھابی کو

راضی کرنا ہوگا کہ وہ یا تو پاکستان واپس چلی جائے اور اگر تمہارے بغیر وہ پاکستان نہیں جانا چاہتی تو پھر ہماری اس طویل مہم کے دوران میری کزن کے ہاں بھوپال میں ہی رہے۔ وہاں اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ کیا تم اسے راضی کر لو گے؟"

میں نے کہا۔

"میں کوشش کروں گا۔"

"پھر ایسا ہے کہ میں کل دن میں کسی وقت جمیلہ بھابی کو یہاں بلوا لوں گا۔ تم اس سے بات کر لینا۔ اب تم آرام کرو۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

یہ کہہ کر کمانڈو خالد وہیں دری پر ایک طرف ہو کر لیٹ گیا۔ میں نے سوچا کہ مجھے کہاں آرام کرنا چاہیے۔ کیا اسی کوٹھڑی کے کونے میں پڑا رہوں یا باہر کھلی فضا میں، کسی جھاڑی یا تالاب کے کنارے جا کر لیٹ جاؤں۔ مجھے یاد آگیا کہ کمانڈو خالد نے مجھے وہاں سے باہر جانے کو منع کر رکھا تھا۔ چنانچہ میں وہیں کوٹھڑی کے کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔

دوسرے دن کمانڈو خالد نے جمیلہ کو خفیہ ٹھکانے پر بلوا لیا۔ میں نے اسے ساری صورت حال پوری طرح سے سمجھائی اور آخر میں یہی کہا کہ اس کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ وہ پاکستان چلی جائے۔

"میں بھی اپنے مشن کو مکمل کر کے تمہارے پاس پاکستان آ جاؤں گا۔"

مگر جمیلہ مجھ سے الگ ہونے پر کسی طرح بھی راضی نہ ہوئی۔ وہ بھوپال میں کمانڈو خالد کی کزن کے ہاں ٹھہرنے پر تیار ہوگئی۔ اس وقت کوٹھڑی میں میرے، کمانڈو خالد اور جمیلہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں سانپ کے روپ میں ہی اس سے باتیں کر رہا تھا۔ کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"کرم داد! اگر جمیلہ بھابی تمہارے بغیر پاکستان نہیں جانا چاہتی تو اسے مجبور نہ کرو۔ ٹھیک ہے وہ میری کزن لالہ رخ کے ہاں بڑے آرام اور حفاظت سے رہ لے گی۔ جب ہم اپنا مشن مکمل کر لیں گے تو تم دونوں پاکستان چلے جانا۔"

جمیلہ کی طرف سے میں بے فکر ہو گیا تھا۔

اب میری ساری توجہ اپنے مشن کی طرف تھی اور مجھے ان لوگوں سے قہر آلود انتقام لینا تھا جنہوں نے میری بیوی اور مشرقی پاکستان سے اٹھائی ہوئی دوسری مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی تھی۔ اس کے علاوہ جن جن مسلمان اغوا شدہ عورتوں کا سراغ ملے انہیں کافروں کی قید سے نکال کر پاکستان واپس پہنچانا تھا۔ ہمارا سب سے پہلا ٹارگٹ سنھتا ولی کے ناگ مندر کا بڑا مہنت پجاری دیو گری تھا جس نے میری بیوی کو ولی کے شری راج سے تحفے کے طور پر وصول کیا تھا اور اسے اپنی قید میں رکھ کر اس پر ایسے ایسے منتر پھونکے تھے کہ وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی۔

ہمیں باتیں کرتے کرتے شام ہو گئی۔ جمیلہ واپس کمانڈو منظر خالد کی کزن کے گھر جانے لگی تو اچانک میرے جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے شروع ہو گئے۔ ساتھ ہی مجھے اپنے جسم کا بوجھ محسوس ہونے لگا۔ میں نے جمیلہ سے کہا۔

"میں انسانی شکل میں واپس آ رہا ہوں۔"

اتنا سن کر جمیلہ نے ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔"

وہ دونوں میری طرف غور سے تکنے لگے۔ کمانڈو منظر خالد کی آنکھوں میں حیرت انگیز تجسس تھا۔ مجھے ایک جھٹکا لگا اور میں سانپ سے انسان کے روپ میں واپس آ گیا۔ کمانڈو خالد مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔"

"اللہ!"

جمیلہ نے میرے دونوں ہاتھ تھام کر چوم لیے اور کمانڈو خالد سے کہا۔

"بھائی جان! یہ ہے کرم داد! میرا خاوند۔"

پھر وہ اللہ کا شکر ادا کرنے لگی۔ کمانڈو خالد نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور بولا۔

"میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس پر مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔ شاید ایسا منظر

میں زندگی میں کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔"

میں نے کہا۔

کمانڈر! خدا سے دعا کرو کہ اب میں انسانی شکل میں ہی رہوں۔ یہی میری سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ اب کوئی پتہ نہیں میں کب اور کس وقت انسانی شکل سے سانپ کی شکل اختیار کر جاؤں۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"خدا کرے کہ اب تم اسی شکل میں رہو۔ واقعی تم ایک خوش شکل کسرتی بدن والے جوان ہو۔"

جمیلہ تو آنکھوں ہی آنکھوں میں میری بلائیں لے رہی تھی۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔

"جمیلہ! جو معاملہ یہاں ہمارے درمیان طے ہوا ہے تم اسی پر قائم رہنا۔ تم بمن لالہ رخ کے ہاں چلی جاؤ۔ اپنا مشن مکمل کرنے کے بعد میں تمہیں لے کر پاکستان چلا جاؤں گا۔"

اتنے میں ایک مجاہد اندر آگیا۔ اسے کمانڈو خالد نے بلایا تھا۔ یہ اس کا خاص باڈی گارڈ تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور کچھ حیران سا ہوا۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

"یہ ہمارا ساتھی کمانڈو کرم داد ہے اور جمیلہ بی بی کا خاوند ہے۔ اب تم ایسا کرو کہ جمیلہ بھابی کو لالہ رخ بمن کے گھر لے جاؤ۔"

جمیلہ مجھ سے بغل گیر ہونا چاہتی تھی مگر دو آدمیوں کی موجودگی میں وہ ایسا نہ کر سکی اور صرف مجھ سے ہاتھ ملا کر اور مجھے دعائیں دے کر باڈی گارڈ مجاہد کے ساتھ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"بھائی کرم داد! یقین کرو تمہیں انسانی شکل میں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ میری دعا ہے کہ اب تم اسی شکل پر قائم رہو۔ باہر شام کا اندھیرا ہوگیا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔"

ہم دونوں خفیہ ٹھکانے سے نکلے اور ٹیلے کی جھاڑیوں والے گڑھے میں سے نکل کر ٹیلے کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ چلتے پیچھے ایک ویران جگہ پر آ گئے۔ شام کا اندھیرا کافی پھیل چکا تھا اور بھوپال میں بھی رات کو سردی ہو جاتی تھی۔ کمانڈو خالد مجھ سے ایک قدم آگے چل رہا تھا۔ آگے ایک اور چھوٹا سا ویران ٹیلہ تھا۔ ہم اس کے قریب سے ہو کر گزر گئے۔ ہمارے پیچھے پیچھے کمانڈو خالد کا باڈی گارڈ مجاہد سٹین گن تھامے چلا آ رہا تھا۔

ہم ویران میدان میں چلتے رہے۔ میدان کے کونے میں ایک شکستہ چار دیواری تھی۔ جس کی چھت غائب تھی۔ چار دیواری کے اندر پرانی اینٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ مجاہد باڈی گارڈ نے آگے بڑھ کر ایک جگہ سے اینٹیں ہٹانی شروع کر دیں۔ نیچے فرش نکل آیا۔ فرش پر لکڑی کا ایک تختہ تھا۔ اس نے تختے کو اٹھا دیا۔ نیچے کسی تہہ خانے کی سیڑھیاں تھیں۔ ہم سیڑھیاں اتر کر ایک تہہ خانے میں آگئے۔ باڈی گارڈ مجاہد نے بیٹری کا ایک لیمپ جو وہاں پڑا تھا روشن کر دیا۔ لیمپ کی روشنی میں مجھے تہہ خانے میں لکڑی کے دس بارہ بڑے بڑے بکس دکھائی دیے۔ کمانڈو خالد نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ان بکسوں میں ہر قسم کا اسلحہ اور ہتھیار موجود ہے۔ تم پاک آرمی والوں کے سابق عہدیدار ہو۔ تمہیں یہ اسلحہ دیکھ کر خوشی ہوگی۔"

باڈی گارڈ مجاہد نے بکسوں کے ڈھکن ہٹا دیے۔ ان بکسوں میں سٹین گنیں، سٹین گنوں کے میگزینوں کی بیلٹیں، بارودی سرنگیں، ہینڈ گرنیڈ، پستول اور دوسرے ہتھیار اور ڈائنامائیٹ کی چھڑیوں کے گٹھے اور ٹائم بم پڑے تھے۔ مجھے اتنا سارا اسلحہ دیکھ کر واقعی بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے کمانڈو خالد سے پوچھا کہ اتنا سارا اسلحہ انہوں نے کہاں سے حاصل کیا ہے۔

وہ کہنے لگا۔

"یہ سب بھارتی یونٹوں کا اسلحہ ہے جو ہمارے آدمی بھوپال اور گوالیار کے فوجی

کیمپوں اور کانوائیوں پر شب خون مار کر لائے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ ہمیں اپنے سنتھا ولی کے ناگ مندر والے کمانڈو اپریشن میں کس قسم کے ہتھیاروں کی ضرورت ہوگی؟"

میں نے کہا۔

"ہمیں کچھ بارودی سرنگیں اور ٹائم بموں کی خاص طور پر ضرورت ہوگی۔ اس کے علاوہ ہمارے آدمیوں کے پاس ایک ایک سٹین گن' چار چار دستی بم وغیرہ کافی ہوں گے۔"

وہ بولا۔

"ٹھیک ہے یہ سارا اسلحہ آج رات کو ہمارے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ جائے گا۔"

وہاں سے ہم واپس اپنے خفیہ ٹھکانے پر آ گئے۔

رات کو کمانڈو خالد کے مجاہدوں نے مطلوبہ اسلحہ اور ہتھیار ہماری کوٹھڑی میں پہنچا دیا۔ میں نے سارے ہتھیاروں کو اور ٹائم بموں کو چیک کیا۔ یہ بھارتی فوج کا اسلحہ تھا اور بڑا ٹھیک ٹھاک تھا۔ کمانڈو خالد اور میں دونوں نے رات کا کھانا وہیں منگوا کر کھایا اور پھر اپنی مہم کے پہلے منصوبے پر غور شروع کر دیا۔ کمانڈو خالد ایک فوجی کمانڈر کی طرح منصوبے کے ہر پہلو پر اپنی رائے کا اظہار کرتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھوپال کا یہ مجاہد کمانڈو ایکشن کی تمام باریکیوں سے آگاہ تھا۔ کہنے لگا۔

"سنتھا ولی کا ناگ مندر جھانسی سے آگے دیو گڑھ اور سنبل پور کے درمیان واقع ہے۔ وہاں سے آگے تم ہماری کمانڈو پارٹی کو گائیڈ کرو گے۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا ہمارے باقی آدمی یہاں سے ہمارے ساتھ جھانسی کی طرف روانہ ہوں گے۔"

کمانڈو خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہیں یہاں سے نکلنے کے بعد اپنے آپ معلوم ہو جائے گا۔"

دوسرے دن شام ہوتے ہی ہم نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ اب ہم سات آدمی تھے۔ پانچ کمانڈو خالد کے سرفروش مجاہد تھے جن کا تعلق بھوپال ہی سے تھا۔

ایک کمانڈو خالد تھا اور ایک میں۔ ہم دونوں نے معمولی کپڑے یعنی میل خورے رنگ کی جیکٹیں اور پرانی پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ میں نے سر پر گلوبند لپیٹا ہوا تھا۔ کمانڈو خالد نے چمڑے کی انجن ڈرائیوروں والی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اپنے لباس اور حلیے سے ہم ریلوے ورکشاپ کے مکینک لگتے تھے۔ ہمارے ساتھ پانچ مجاہد تھے۔ وہ سادھوؤں کے بھیس میں تھے اور ایک ٹولی کی شکل میں ہم سے ذرا پرے ہٹ کر چل رہے تھے۔ مجاہد سادھوؤں میں سے تین سادھوؤں نے ایک ایک گٹھڑی بغل میں دبائی ہوئی تھی۔ اس میں ضرورت کے وقت ہمارے کام آنے والا اسلحہ تھا۔ میرے اور کمانڈو خالد کے پاس ایک ایک پستول تھا جس کے آگے سیلنسر لگا ہوا تھا۔ کچھ فالتو گولیاں ہم نے جیکٹ کی اندرونی جیبوں میں چھپا رکھی تھیں۔ میرے پاس ایک بڑا کمانڈو چاقو بھی تھا۔ اپنے خفیہ ٹھکانے سے ہم شام کے جھٹپٹے میں نکلے تھے۔ جب بھوپال شہر کی آبادی شروع ہوئی تو مجاہد سادھوؤں کی ٹولی ہم سے الگ ہو گئی۔

بھوپال سے جھانسی تک کے دو ٹکٹ پہلے ہی ہم نے منگوا لیے تھے۔ بھوپال شہر کافی گنجان آباد شہر تھا۔ نئی کالونیاں بھی بن گئی تھیں اور پرانے گنجان محلے بھی تھے۔ تاریخی مسجدیں اور دوسری عمارتیں اور محل بھی تھے۔ ہم شہر سے ہٹ کر چل رہے تھے۔ شہر کی جانب اور نئی کالونیوں کی طرف رات کے پہلے اندھیرے میں بجلی کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ مجاہد سادھوؤں کی ٹولی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک جگہ سے ہم نے آٹو رکشا لے لیا اور بھوپال ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ جھانسی کو رات کے سوا آٹھ بجے گاڑی نکلتی تھی۔ یہ گاڑی بمبئی سے آ رہی تھی۔ ہم دونوں پلیٹ فارم پر آ کر ایک جگہ جہاں زیادہ روشنی نہیں تھی بنچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے کمانڈو منظر خالد سے پوچھا۔

"ہمارے مجاہد ساتھی بھی ہمارے ساتھ ہی جھانسی جائیں گے نا؟"

"ہاں مگر وہ ہمارے ڈبے میں نہیں ہوں گے۔"

گاڑی رات کے نو بجے آئی۔ کمانڈو خالد اس دوران عقابی نگاہوں سے پلیٹ فارم

کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رکی تو اس نے مجھ سے کہا۔

"ہم الگ الگ ڈبوں میں بیٹھیں گے' جھانسی پہنچ کر دوبارہ ایک دوسرے سے ملیں گے۔ اب تم جاؤ۔"

مسافر ٹرین سے اتر رہے تھے۔ ٹرین میں کافی رش تھا۔ میں ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ ٹرین کچھ دیر رکنے کے بعد بھوپال سے جھانسی کی طرف روانہ ہوگئی۔ یہ ٹرین بمبئی سے دلی جا رہی تھی۔ یہ ایکسپریس ٹرین تھی۔ بھارت کی ریلوے نے اس کا کوئی نام رکھا ہوا تھا جو میں بھول گیا ہوں۔ کوئی جنتا ایکسپریس قسم کا نام تھا۔ ٹرین کو رات کے پچھلے پہر جھانسی پہنچنا تھا مگر راستے میں ایک پل ٹوٹا ہوا تھا جس کی وجہ سے ٹرین کافی لیٹ ہوگئی اور اگلے روز دن کے دس گیارہ بجے جھانسی پہنچی۔ میں ڈبے سے اتر کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ جھانسی بھی بھوپال کی طرح ایک بڑا شہر تھا اور اس کا سٹیشن کافی با رونق تھا۔ وہاں پولیس کے کچھ سنتری بھی نظر آئے۔ میں پلیٹ فارم پر ایک آہنی ستون کی اوٹ میں کھڑا کمانڈو خالد کو مسافروں کے ہجوم میں تلاش کر رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے پیچھے سے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ کمانڈو خالد تھا۔ کہنے لگا۔

"یہاں پولیس کے سنتری کچھ زیادہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ہم پلیٹ فارم کے گیٹ سے نہیں نکلیں گے۔ کچھ فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ کمانڈو خالد پلیٹ فارم کے آخری سرے سے اتر کر لائینوں لائین چلا جا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ جھانسی سٹیشن کے حدود اربعہ سے پوری طرح واقف ہے۔ مجھے اپنے دوسرے مجاہد ساتھی جو سادھوؤں کے بھیس میں تھے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید وہ سٹیشن سے نکل گئے تھے۔ ریلوے لائن جب سٹیشن کی حدود سے ذرا دور نکل کر کھیتوں کے درمیان آ گئی تو کمانڈو خالد ریل کی پٹڑی سے نیچے اتر گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ وہ رک گیا اور بائیں جانب جدھر ایک سڑک نظر آ رہی تھی اس طرف دیکھنے لگا۔ میں اس کے قریب چلا آیا۔ کہنے لگا۔

"دیوگڑھ ہم ریل گاڑی سے نہیں جائیں گے۔"

دیوگڑھ کو برانچ لائن جاتی تھی۔ کمانڈو خالد مجھے لے کر کھیتوں میں چل پڑا۔ کہنے لگا۔

"ہم دیوگڑھ تک لاری میں سفر کریں گے۔"

میں نے کہا۔

"ہمارے ساتھی مجاہد کہاں ہیں؟"

اس نے بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"ہم اگرچہ انہیں نہیں دیکھ رہے مگر وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ جس طرف ہم جائیں گے وہ بھی اسی طرف آ جائیں گے۔"

جھانسی کافی بڑا اور پھیلا ہوا شہر تھا۔ شہر کے آس پاس بہت آبادی تھی۔ کارخانے تھے جن کی چمنیاں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ ایک ٹیلے پر قلعہ بھی تھا۔ زمین ہموار بھی تھی اور اونچی نیچی بھی تھی۔ کھیتوں میں کوئی چھوٹی فصل اگی ہوئی تھی۔ ادھر ادھر لوگ چل رہے تھے۔ سڑک پر بھی کافی ٹریفک تھی۔ میں کمانڈو خالد سے چھ قدم کے فاصلے پر چل رہا تھا۔ جس طرف وہ جاتا تھا میں بھی اسی طرف چل پڑتا تھا۔ جھانسی ریلوے سٹیشن بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ ابھی تک میں انسانی شکل میں ہی تھا۔ مجھ پر سانپ کی شکل نے حملہ نہیں کیا تھا' نہ ہی کسی وقت مجھے اس دوران کوئی چکر ہی آیا تھا۔ ایک جگہ بہت سی لاریاں کھڑی تھیں۔ مسافر ان میں چڑھ اتر رہے تھے۔ کمانڈو خالد لاری اڈے کے ایک طرف آ گیا۔ کہنے لگا۔

"وہ سامنے والی لاری دیوگڑھ کو جائے گی۔"

پہلے وہ لاری میں بیٹھا۔ اس کے دو تین منٹ بعد میں بھی دوسری طرف سے ہو کر لاری میں سوار ہو گیا۔ ہم دیوگڑھ پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم ایک بیل گاڑی میں بیٹھے اور سنبل پور کی طرف چلے۔ دیوگڑھ اور سنبل پور کے درمیان سنتھا ولی کے جنگل میں ناگ مندر تھا جس کا سب سے بڑا پجاری اور مہنت عیاش دیوگری تھا۔ بیل گاڑی

کے سفر کے دوران میں نے اپنے مجاہدوں کو سادھوؤں کے بھیس میں ایک طرف کھیتوں میں جاتے دیکھا۔ میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"وہ لوگ آ گئے ہیں۔"

کمانڈو خالد نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گاڑی بان ہماری باتیں سنے۔ مجاہد سادھوؤں کی ٹولی کھیتوں میں جاتے جاتے ایک طرف درختوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ سڑک پر ایک کنواں تھا۔ وہاں گاڑی بان نے گاڑی روک دی۔ یہاں سے ناگ مندر جنگل میں ایک کوس کے فاصلے پر تھا۔ ہم گاڑی سے اتر گئے۔

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"کیا ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "بالکل صحیح راستے پر ہیں۔ سامنے سنتھا ولی کا جنگل ہے ناگ مندر اسی جنگل میں ہے۔"

ہم جنگل کی طرف چلنے لگے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ مگر اب دن کا تیسرا پہر ہو گیا تھا اور دھوپ ماند پڑنے لگی تھی۔ جہاں سے سنتھا ولی کے جنگل کی جھاڑیاں اور درخت شروع ہوتے تھے وہاں جا کر کمانڈو خالد رک گیا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر ایک جگہ درختوں کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔ "یہاں سے ہمیں اپنے مجاہدوں کو ساتھ لے کر چلنا ہو گا۔ یہ بتاؤ کہ ناگ مندر یہاں سے کس سمت کو ہے؟"

میں نے اس جنگل کو پہچان لیا تھا۔ ایک طرف جدھر چھوٹے چھوٹے جنگلی جھاڑیوں والے ٹیلے تھے اشارہ کر کے کہا۔

"ان ٹیلوں کے پیچھے بڑے تالاب کے پاس ہے۔"

اس نے دوسرا سوال کیا۔

"یہ بدمعاش پجاری دیو گری رات کو کہاں سوتا ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ وہ ناگ مندر کے اندر ہی اپنے شاندار کمرے میں سوتا ہے

اور ہر رات اس کی من پسند دیوداسی یا نرتکی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

"آج کی رات اس کی زندگی کی آخری رات ہوگی۔"

اتنے میں ہمارے ساتھی مجاہد بھی آ گئے۔ وہ سادھو بنے ہوئے تھے۔ آتے ہی وہ ہمارے پاس درختوں کے درمیان بیٹھ گئے۔ ایک مجاہد نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"کمانڈر! تم ٹھیک ہو؟"

اس نے جواب دیا۔

"الحمدللہ! ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ اسلحہ وغیرہ سب ٹھیک ہے۔"

مجاہد نے جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک ہے کمانڈر۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"کرم داد! ناگ مندر کے پہلے گیٹ تک ہمیں گائیڈ کرے گا۔ بقول کرم داد کے ناگ مندر کے دو گیٹ ہیں۔ پہلا گیٹ جو پرانا ہے، ناگ مندر کی عقبی دیوار میں ہے۔ دوسرا گیٹ سامنے کی جانب ہے جو نیا نیا تعمیر ہوا ہے۔"

ایک اور مجاہد نے پوچھا۔

"سر! ہمیں کیا حکم ہے؟"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"تم میں سے ایک مجاہد ہمارے ساتھ جائے گا۔ باقی لوگ پرانے گیٹ کے پاس چھپ کر بیٹھیں گے۔"

"ٹھیک ہے سر!"

میں ان لوگوں کو لے کر وہاں سے آگے بڑھا۔ ناگ مندر کے گرد و نواح میں پہنچتے شام ہوگئی۔ اندھیرا درختوں میں اترنے لگا۔ دور سے ہمیں مندر کی روشنیاں دکھائی دیں۔ میں نے کمانڈو خالد کو دکھایا کہ مندر کا پرانا گیٹ کس طرف ہے اور نیا

گیٹ کس طرف ہے۔ اس نے ایک مجاہد اپنے ساتھ لے لیا اور باقی مجاہدوں سے کہا۔
"تم لوگ پرانے گیٹ کے قریب کسی جگہ چھپ جاؤ۔ ہمارے سگنل کا انتظار کرنا۔ اگر تمہاری ضرورت پڑی تو میں تمہیں مخصوص آواز کا سگنل دوں گا۔"

انہوں نے آپس میں کوئی خاص سگنل مقرر کر رکھے تھے۔ میں' کمانڈو خالد اور ایک مجاہد مندر کے نئے گیٹ کی طرف چل پڑے۔ باقی مجاہد سادھوؤں کے بھیس میں مندر کے پرانے گیٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ نئے گیٹ کے قریب ہی پجاری دیو گری کا کمرہ تھا۔ یہ کمرہ میں نے دیکھا ہوا تھا۔ ہمیں اس طرف جانا تھا۔ ہمارا ٹارگٹ وہی تھا۔

ہم نے زیادہ اسلحہ اپنے ساتھ نہیں لیا تھا۔ ہمارے پاس صرف ایک ایک سیلنسر والا پستول اور چار ہینڈ گرنیڈ ہی تھے۔ ہینڈ گرنیڈ ایمرجنسی کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تھے' ورنہ ہمیں سیلنسر والے پستولوں سے ہی اپنے آپریشن کو تکمیل تک پہنچانا تھا۔ کمانڈو خالد نے مجھے بتا دیا تھا کہ ہمیں مندر کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا' یہ ہندوؤں کی عبادت کی جگہ ہے۔ ہمیں صرف ایک آدمی سے بدلہ لینا ہے اور اگر اس کے باڈی گارڈ راستے میں حائل ہوئے تو انہیں بھی ختم کرنا ہے۔ جب ناگ مندر کا نیا گیٹ کچھ دور دکھائی دینے لگا تو ہم لوگ وہیں ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گئے۔ یہاں ہمیں رات گہری ہو جانے کا انتظار کرنا تھا' جب پجاری دیو گری ناگ مندر کی پوجا پاٹھ سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ جاتا تھا۔

مندر کی طرف سے بھجن کیرتن کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم خاموشی سے چھپ کر بیٹھے رہے۔ رات گزرتی چلی گئی۔ جب مندر کا بھجن کیرتن ختم ہو گیا اور ہر طرف خاموشی چھا گئی اور مندر کے نئے گیٹ کے اوپر جلنے والا بڑا بجلی کا بلب بجھا دیا گیا تو کمانڈو خالد نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولا۔

"رات کے سوا بارہ بجے کا وقت ہو گیا ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

میں نے کہا۔

"ہمیں ایک گھنٹہ مزید انتظار کر لینا چاہیے۔ اس وقت تک پجاری دیو گری اپنے

کمرے میں ضرور پہنچ چکا ہوگا۔"

ہم مزید ایک گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے۔ جب رات کا ٹھیک سوا ایک بج گیا تو میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"ٹائم ہوگیا ہے۔"

اس نے پستول نکال کر کہا۔

"چیک ایمونیشن۔"

میں اور مجاہد دونوں نے اپنے اپنے پستول نکال کر چیک کیے۔ مجاہد کے پاس چار ہینڈ گرنیڈ بھی تھے۔ کمانڈو خالد نے اسے حکم دیا۔

"میرے حکم پر گرنیڈ پھینکنا۔ میرے حکم کے بغیر مت پھینکنا۔"

اس نے کہا۔

"یس کمانڈر!"

کمانڈر خالد میری طرف متوجہ ہوا۔

"کرم داد! تم ہمیں پجاری کے کمرے تک گائیڈ کرو گے۔"

پھر اس نے اپنے مجاہد کو حکم دیا۔

"تم دس قدموں کے فاصلے پر ہمارے پیچھے رہو گے۔ میرے اشارے پر آگے آؤ گے۔"

"یس کمانڈر۔"

اپنے اپنے پستول ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ میں آگے آگے چلنے لگا۔ درختوں میں اندھیرا تھا۔ میں اس راستے سے اچھی طرح واقف تھا۔ جمیلہ کی تلاش میں ایک بار یہاں آ چکا تھا۔ میں انہیں مندر کے دھرم شالہ کی دیوار کے پیچھے سے ہوتا ہوا پجاری کے کمرے کی دیوار کے بالکل سامنے شریفے کے درختوں کے درمیان لے آیا۔ یہاں سے میں نے خالد کو کمرے کی ایک کھڑکی دکھائی جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"یہ پجاری کا کمرہ ہے۔ یہاں وہ رات کو شراب بھی پیتا ہے اور داد عیش بھی دیتا ہے۔"

کمانڈو خالد نے پوچھا۔

"کمرے کا دروازہ کس طرف ہے؟"

"دوسری طرف انار کے درختوں کے درمیان سے گزر کر سامنے آ جاتا ہے۔ وہاں رات کو پجاری کے دو باڈی گارڈ موجود ہوتے ہیں جو مسلح ہوتے ہیں۔"

کمانڈو خالد نے اپنے مجاہد کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور وہ میرے ساتھ شریفے کے پانچ چھ فٹ اونچے جھاڑی نما درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا پجاری کے کمرے کے عقب میں آ گیا۔ یہاں ہمیں پجاری کے کمرے کے دروازے پر جلتا بلب نظر آ رہا تھا۔ اس کی روشنی میں دو آدمی بنچ پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"یہ دروازہ کمرے کی ڈیوڑھی کا دروازہ ہے۔ یہ رات کو اندر سے بند کر دیا جاتا ہے۔ ڈیوڑھی میں پجاری کے خاص کمرے کا دروازہ ہے۔ ظاہر ہے وہ بھی اندر سے بند ہو گا۔ ہمیں ان دونوں دروازوں کو کھلوانا ہو گا۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"یہ بھی ہو جائے گا۔ پہلے ان دونوں گارڈز کو ٹھکانے لگانا ہے۔"

اس نے اپنے مجاہد کو اشارہ کیا۔ مجاہد کے ہاتھ میں بھی پستول تھا جس پر سائلنسر لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے فائر کے دھماکے کی آواز نہیں ہوتی تھی۔ وہ اشارہ ملتے ہی دائیں جانب اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"یہاں ہم پستول کا فائر نہیں کریں گے۔"

میں نے کمانڈو چاقو نکال کر اسے دکھایا اور کہا۔

"میں انہیں بڑی آسانی سے ذبح کر لوں گا۔"

کمانڈو خالد کچھ کہنے لگا تو میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے

کندھے کو ذرا سا دبا کر بائیں جانب جھک کر چلنے لگا۔ کمانڈو خالد بھی میرے ساتھ اسی طرح چلنے لگا۔ پجاری کے مکان کے دروازے سے کوئی بیس فٹ کے فاصلے پر دائیں جانب ہو کر ہم الگ الگ ہو کر انار کے درختوں میں چھپ گئے۔ ہمیں دونوں پہرے دار پجاریوں کے باتیں کرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ مجھے سگریٹ کی بو آئی جس میں چرس کی بدبو بھی شامل تھی۔ دونوں پہرے دار چرس پی رہے تھے۔ اس حالت میں وہ بڑی آسانی سے میرا شکار بن سکتے تھے۔ میں نے جیب سے پتھر کا ایک ٹکڑا نکال کر زور سے اپنے ذرا سا آگے پھینک دیا۔ پتھر کا یہ ٹکڑا میں نے اسی مقصد کے لیے اپنی جیب میں ڈال رکھا تھا۔ پتھر گرنے سے شور پیدا ہوا تو ایک پہرے دار نے اس طرف دیکھا۔

"کون ہے بے ادھر؟"

دوسرا بولا۔

"کوئی بلی کتا ہوگا۔"

پہلے نے کہا۔

"ارے نہیں رے۔ مجھے تو کوئی باہر کا آدمی لگتا ہے۔"

میں حیران ہوا کہ اس نے یہ کیسے اندازہ لگا لیا۔ میں فوراً الرٹ ہوگیا۔ کمانڈو خالد مجھ سے تھوڑے فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمارا ساتھی بھی ہمارے آس پاس ہماری حفاظت کے لیے موجود ہے۔ پہلے والا پجاری جس نے کندھے پر دو نالی بندوق لٹکا رکھی تھی اٹھ کر ہماری طرف آیا۔ وہ چرس کے نشے میں تھا۔ اس نشے کی وجہ سے اس کو اتنا بھی یاد نہ رہا کہ اگر وہ کسی باہر کے آدمی کو پکڑنے آیا ہے تو اسے بندوق اپنے ہاتھوں میں رکھنی چاہیے تھی۔ وہ بولا "کون ہے بے ادھر؟" کی آوازیں دیتا ہمارے بالکل قریب آگیا میں ایک طرف ہو کر ایک زاویے پر ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے کمانڈو خالد کو اشارہ کر دیا کہ اس کو میں سنبھال لوں گا۔ جہاں ہم چھپے ہوئے تھے وہاں اندھیرا تھا وہ آدمی جو دبلا پتلا سا تھا میرے بالکل قریب کوئی دو

فٹ کے فاصلے پر کھڑا اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ نشے کی حالت میں ہے۔ اس نے وہیں سے اپنے ساتھی کو آواز دی۔

"ارے مونگیا رے۔ یہاں تو کوئی بھی ناہیں رے۔"

اور خود ہی ہنسنے لگا۔ دوسرے پہرے دار پجاری نے دور ہی سے آواز دی۔

"ارے آ جائیو واپس رے۔ تو تو پاگل ہو گیا ہے نشے میں۔"

جیسے ہی پجاری واپس مڑنے لگا میں اس کی گھات میں تھا۔ کمانڈو چاقو میرے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اچھل کر بائیں ہاتھ سے اس کے منہ کو پوری طاقت سے بند کر دیا تھا کہ وہ کوئی آواز نہ نکال سکے اور دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے حلق پر پھیر دیا۔ اس کا نرخرہ بولنے لگا۔ میں نے اسے پرے گرا دیا۔ اس کم بخت کے نرخرے سے کچھ زیادہ ہی آوازیں نکلنے لگیں۔ ان آوازوں کو سن کر دوسرا پہرے دار کھڑا ہوا اور بولا۔

"ارے مونگیا! کیا ہوا رے؟"

جیسے ہی وہ آگے بڑھ کر انار کے درختوں کے اندھیرے میں آیا اسے ہمارے مجاہد نے وہیں دبوچ لیا۔ میں نے اسے زمین پر اس طرح گرتے دیکھا جس طرح درخت کا کٹا ہوا ٹہنا گرتا ہے۔ ہمارا مجاہد اس کے ساتھ ہی اندھیرے میں روپوش ہو گیا۔ کمانڈو خالد نے بھی یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ اس نے منہ سے ہلکی سی سیٹی کی آواز نکال کر مجھے دروازے کی طرف بڑھنے کا سگنل دیا۔

ہم دروازے کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ مشکل یہ تھی کہ ہم پر دروازے کے اوپر جلتے بلب کی سیدھی روشنی پڑ رہی تھی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو کمانڈو خالد میرا بازو پکڑ کر مجھے روشنی سے انار کے درختوں کی تاریکی میں لے گیا۔

اس نے سرگوشی میں کہا۔

"اس طرح کام خراب ہو جائے گا۔ ہمیں کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا ہو گا۔"

میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔

دوسرا راستہ کوئی نہیں ہے۔ پجاری کا کمرہ دوسری منزل پر ہے۔"

پجاری کے کمرے کی کھڑکی ہمیں نظر آ رہی تھی۔ کمانڈو خالد نے آہستہ سے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

ہم کھڑکی کے عین نیچے آ گئے۔ وہاں دیوار کے ساتھ لوہے کا ایک پائپ دیوار کے ساتھ چمٹا اوپر چھت سے نیچے آ رہا تھا۔ شاید یہ بارش کے پانی کے نکاس کے لیے لگایا گیا تھا۔ کمانڈو خالد نے آگے بڑھ کر پائپ کا جائزہ لیا۔ یہاں دیوار کی اوٹ تھی اور ہم روشنی میں نہیں تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے کمانڈو خالد نے پائپ پر اپنے ہاتھ اور پاؤں جمائے اور اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پائپ کو پکڑ کر اوپر چڑھنے کی کوشش میں لگ گیا۔ پائپ کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کلپ لگے ہوئے تھے۔ یہاں ہم اپنے پاؤں ٹکا سکتے تھے۔ خالد آگے تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس جا کر رک گیا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ آگے باریک سا پردہ گرا ہوا تھا۔

کمانڈو خالد نے اندر جھانک کر دیکھا اور پھر کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ کمرے کے اندر کود گیا۔ میں سمجھ گیا کہ کمرہ خالی تھا۔ میں بھی پائپ کو پکڑ پکڑ کر اوپر آیا اور کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ کمانڈو خالد نے ہاتھ ہلا کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی کھڑکی سے اندر کود گیا۔ کمرہ چھوٹا سا تھا اور وہاں کوئی انسان نہیں تھا۔ کچھ بوریاں اور پرانا فرنیچر ادھر ادھر پڑا تھا۔ میں نے کمانڈو خالد کے کان میں سرگوشی کی۔

"میرے خیال میں پجاری دیوگری کا یہی کمرہ تھا۔"

اس نے سرگوشی میں کہا۔ "یہاں کوئی نہیں ہے۔ آگے چلتے ہیں۔"

کمرے میں ایک اور دروازہ تھا جو بند تھا۔ ہم اس دروازے کے قریب گئے تو دوسری طرف سے ہلکی آوازیں سنائی دیں۔ ایک مرد اور ایک عورت کی آواز تھی۔ عورت سسکیاں بھرتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی جو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مرد کے

ڈانٹنے کی آواز آئی۔ دروازے میں کسی درز کو تلاش کر رہے تھے۔ آخر ایک جگہ چھوٹا سا سوراخ مل گیا۔ میں نے سوراخ کے ساتھ آنکھ لگا کر دیکھا۔

دوسرے کمرے میں ایک پلنگ بچھا تھا جس پر بڑا پجاری دیو گری نیم دراز تھا۔ اس نے پہلو میں ایک عورت کو لٹا رکھا تھا جس کے بال کھلے تھے اور جسم کے گرد ایک چادر لپٹی ہوئی تھی۔ چادر میں اس کا عریاں بدن جگہ جگہ سے دکھائی دے رہا تھا۔ بھارت کے اس علاقے میں موسم ویسا سرد نہیں تھا جیسا دلی اور بھوپال میں تھا۔ میں نے کمانڈو خالد کو یہ منظر دکھایا اور اس کے کان میں کہا۔

"یہی ہمارا ٹارگٹ پجاری دیو گری ہے۔"

عورت سہمی ہوئی تھی اور ڈرتے ڈرتے سسکیاں بھر رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ عیاش پجاری کے آدمی اس عورت کو کسی گاؤں سے اٹھا کر لے آئے ہیں۔ کمانڈو خالد نے پیچھے ہٹ کر دروازے کو ذرا سا اندر کو دبایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ پستول ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ میں نے کمانڈو خالد کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا۔

"تم ایک طرف ہٹ جاؤ' یہ میرا شکار ہے۔"

کمانڈو خالد دروازے کی ایک جانب ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ پہلی ہی دستک پر اندر سے پجاری دیو گری نے کرخت آواز میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

میں نے آواز میں عاجزی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! میں ہوں مونگیا——"

میں نے ایک پہرے دار کو مونگیا کے نام سے اپنے ساتھی کو پکارتے سن رکھا تھا

اندر سے دیو گری نے اور زیادہ غصیلی آواز میں کہا۔

"یہاں کیوں آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "مہاراج! بڑے سوامی مہاراج بھوپال سے آئے ہیں۔ وہ نیچے ڈیوڑھی میں کھڑے ہیں۔"

مجھے بڑے پجاری کے بڑبڑانے اور گالیاں دینے کی آواز آئی۔ پھر دروازے کی طرف بڑھتے قدموں کی آواز آئی۔ میں نے کمانڈو خالد کو الرٹ کیا اور پستول کا رخ دروازے کی طرف کر دیا۔ اندر سے کنڈی اتری۔ پھر دروازے کا ایک پٹ کھلا۔ میرے سامنے میری عزت سے کھیلنے والا میرا دشمن کھڑا تھا۔ میری شکل دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ آواز نکالنے ہی والا تھا مگر میں نے اسے اتنی مہلت نہ دی۔ میرے پستول کی نالی میں سے یکے بعد دیگرے دو گولیاں نکلیں۔ ایک گولی اس کے دل میں سے اور دوسری اس کی کھوپڑی کو چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ پجاری دھڑام سے آگے کو گر پڑا۔

کمانڈو خالد اور میں جلدی سے کمرے میں گھس گئے۔ پلنگ پر لیٹی عورت خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ یہاں دوسرے آدمی کہاں ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ خوف کے مارے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے کمانڈو خالد کی طرف دیکھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"نکل چلو۔ ہم نے ٹارگٹ مار لیا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ شاید ساتھ والے کمرے میں اس بدمعاش کے دوسرے ساتھی بھی ہوں اور ہم ان کا بھی کام تمام کرتے جائیں لیکن کمانڈو خالد مزید خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر تھی کہ ہم جس شخص کو ہلاک کرنے آئے تھے اس کی لاش دروازے میں پڑی تھی۔ ہم دوڑ کر دوسرے کمرے میں آ گئے۔ وہاں سے ہم پائپ کے ذریعے نیچے اترنے لگے۔ خدا جانے وہ کون تھا جس نے ہم دونوں کو پائپ کے ذریعے دیوار سے اترتے دیکھ لیا۔ ایک آواز ایک طرف سے آئی۔

"کون ہو تم؟"

ہم ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہ رکے اور نیچے اترنے کی بجائے ہم نے پائپ چھوڑ

دیا اور نیچے چھلانگیں لگا دیں۔ ہم آدھے سے زیادہ نیچے اتر چکے تھے۔ نیچے گرتے ہی ہم وہیں بیٹھ گئے۔ دوسری بار کسی کے ہماری طرف تیز تیز دوڑ کر آنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد ایسی آواز آئی جیسے کوئی نیچے گر پڑا ہو۔ اس کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی۔ درختوں کے اندھیرے میں سے ایک انسانی سایہ جھک کر چلتا ہماری طرف بڑھا۔ میں پستول کا فائر کرنے ہی والا تھا کہ کمانڈو خالد نے میرا ہاتھ نیچے کر دیا اور منہ سے ایک خاص قسم کی سیٹی کی ہلکی سی آواز نکالی۔ ایسی ہی آواز اس طرف سے بھی آئی تھی جس طرف سے انسانی سایہ ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔

پھر ایک آدمی دبے پاؤں چلتا ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ یہ اپنا مجاہد تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

"میں نے اسے ختم کر دیا ہے۔"

کمانڈو خالد نے پوچھا۔

"کوئی اور آدمی تو نہیں ہے۔"

"اس طرف نہیں ہے سر!"

کمانڈو خالد نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔

"کرم داد! اب واپس چلو۔"

ہم جس طرف سے آئے تھے اسی طرف کو واپس چل پڑے۔ ہمارا مشن کامیابی سے مکمل ہو گیا تھا۔ یہ کوئی ایسا مشکل مشن بھی نہیں تھا۔ ایک اکیلے آدمی کو کیفر کردار تک پہنچانا تھا۔ وہ آدمی کوئی کمانڈو ٹائپ کا نہیں تھا، مسلح بھی نہیں تھا۔ بڑی آسانی سے اسے مار لیا تھا۔ فائر کا دھماکہ بھی نہیں ہوا تھا کہ وہاں دوسرے پجاری بیدار ہو جاتے۔ اگر بیدار بھی ہو جاتے تو وہاں کے پجاری مہا دیو کے آشرم کی طرف مسلح نہیں تھے۔ ہمارے کمانڈو مجاہد علاقے میں موجود تھے۔ وہ انہیں آسانی سے قابو کر سکتے تھے۔ ہمارے پاس کافی اسلحہ تھا۔

رات کی تاریکی میں ہم سنتھا ولی کے ناگ مندر کی حدود سے باہر نکل آئے۔ اس

مندر میں مہادیو کے آشرم والے مندر کی طرح زہریلے سانپ رات کو گھوم پھر کر پہرہ نہیں دیتے تھے۔ ان کا خطرہ بھی نہیں تھا۔ سانپ مجھے تو کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ تو میرے جسم سے نکلنے والی بو سے دور بھاگ جاتے تھے۔ سنتھا ولی کے جنگل کی سرحد پر ہمارے دوسرے مجاہد بھی سادھوؤں کے بھیس میں تھے۔ ہمیں مل گئے۔ ان کے تھیلوں میں دستی بم' بارودی سرنگیں اور دوسرا اسلحہ بھرا ہوا تھا جو انہوں نے کاندھوں پر لٹکا رکھا تھا۔ کمانڈو خالد نے یہاں ایک میٹنگ کی اور اپنے مجاہد ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ الگ ہو کر کل شام تک جھانسی ریلوے سٹیشن کے مسافر خانے میں پہنچ جائیں۔ وہ حکم پا کر چلے گئے۔ کمانڈو خالد نے مجھے کہا۔

"اس وقت ہمیں دیو گڑھ سٹیشن تک کوئی بیل گاڑی نہیں ملے گی۔ ہمیں پیدل ہی جانا ہو گا۔ کیا تم تیار ہو؟"

میں نے کہا۔ "بالکل تیار ہوں۔"

ہم کھیتوں میں سے گزرتی ایک پگڈنڈی پر ہو گئے۔ رات کی تاریکی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے خالد سے کہا۔

"کمانڈر! ہمارا دوسرا مشن اتنا آسان نہیں ہو گا۔"

کمانڈو خالد کو میں نے سب کچھ بتا دیا ہوا تھا کہ مہادیو کے آشرم میں اس کے سپیرے فوجیوں کی پوری پلٹن موجود ہے اور اس کے پاس اسلحے کا بھی کافی ذخیرہ ہے اور جس خونی جنگل سے ہمیں گزر کر جانا ہو گا اس میں آدم خور درختوں کے علاوہ خونخوار مگرمچھ اور دلدلیں اور زہریلے سانپ بھی ہیں۔ یہ ساری باتیں کمانڈو خالد کے ذہن میں تھیں۔ وہ میری بات سن کر خاموشی سے چلتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"اگلے مشن کے لیے ہمیں باقاعدہ ایک منصوبہ بنانا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔

"اگر ہم مجاہد ساتھیوں کو بھی ساتھ لے گئے تو وہ زہریلے سانپوں اور آدم خور درختوں سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکیں گے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ ہم اپنے مجاہدوں

کو خونی جنگل سے باہر ہی کسی جگہ بٹھا دیں اور دونوں آگے جائیں۔ میرے جسم کی بو سانپوں، مگرمچھوں اور آدم خور جھاڑیوں اور درختوں کی شاخوں کو مجھ سے دور رکھے گی۔ اس کی وجہ سے تم بھی محفوظ ہو جاؤ گے لیکن اپنے مجاہد ساتھیوں کے لیے وہاں خطرہ ہوگا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ سارا وقت نہیں چل سکیں گے۔ ذرا الگ ہوئے تو انہیں کوئی نہ کوئی سانپ کسی نہ کسی طرف سے آکر ڈس دے گا۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"تم اس ٹارگٹ کو دیکھ چکے ہو۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ ہم دونوں وہاں اپنا مشن کامیابی سے پوار کر سکیں گے تو ہم اپنے ساتھیوں کو پیچھے بٹھا جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"آرمی میں اپنی سروس کے دوران ہم کمانڈو پارٹی لے کر اپنے مشن پر جایا کرتے تھے۔ مجھے اس کا تجربہ ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہم دونوں اس کمانڈو آپریشن کے لیے کافی ہوں گے۔"

ہم رات کی تاریکی میں چلے جا رہے تھے۔ یہ جنگل کا علاقہ نہیں تھا۔ کھیت تھے۔ کہیں جھاڑیوں والا میدان آ جاتا۔ ہم دو گھنٹے چلتے رہے اور دیوگڑھ پہنچ گئے۔ وہاں سے ہمیں رات کے پچھلے پہر تین بجے ایک مسافر ٹرین ملی جو جھانسی جا رہی تھی۔ جھانسی ریلوے سٹیشن کے مسافر خانے میں ہمارے ساتھی مجاہد سادھوؤں کے بھیس میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ سارے کے سارے ہماری طرف نہیں آئے۔ صرف ایک مجاہد ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا۔ کمانڈو خالد نے اسے بتایا کہ یہاں سے ہم بھوپال جا رہے ہیں۔ بھوپال سے آگے جنوب کی طرف ہم دونوں اپنے ٹارگٹ کی طرف جائیں گے۔ مجاہد ساتھی ہدایات لے کر چلا گیا۔ ہم نے وہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ تھرڈ کلاس کا مسافر خانہ تھا۔ وہاں پولیس کے سنتری نہیں تھے۔ پولیس سے مجھے اور کمانڈو خالد دونوں کو چوکنا رہنا پڑ رہا تھا۔ سب سے زیادہ خطرہ ہمیں بھارتی انٹیلی جینس سے تھا جو سویلین کپڑوں میں کسی بھی جگہ موجود ہو سکتے تھے۔

بھوپال کو جانے والی گاڑی تیسرے پہر روانہ ہونے والی تھی۔ ہم مسافر خانے میں ہی ایک طرف ہو کر بیٹھے رہے۔

تیسرے پہر ہم جھانسی سے بھوپال کی طرف روانہ ہوگئے۔

بھوپال وہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ ہم آدھی رات کے بعد پہنچے۔ ہمارے مجاہد ساتھی اپنے طور پر ٹرین سے اتر کر خفیہ ٹھکانے کی طرف روانہ ہوگئے تھے۔ میں اور کمانڈو خالد الگ الگ ہو کر سٹیشن سے باہر نکلے۔ ایک جگہ ہم ایک دوسرے سے آن ملے اور ایک رکشے میں بیٹھ کر اپنے خفیہ ٹھکانے سے کافی دور رکشے کو چھوڑ دیا۔ خفیہ ٹھکانے پر پہنچ کر ہم دونوں سوگئے۔ دوسرے روز ہم نے مہا دیو آشرم پر کمانڈو اٹیک کے بارے میں پلاننگ شروع کر دی۔ میں نے کمانڈو خالد کو آلوپ نگر کی کھنڈر نما عمارتوں کے سارے حدود اربعہ کا نقشہ بنا کر سمجھایا۔ مہا دیو کے آشرم کے بارے میں بھی پوری تفصیل سے بتایا۔ کمانڈو خالد ایک ایک پوائنٹ پر بار بار غور کرتا اور مجھ سے معلومات حاصل کرتا رہا۔ اس روز آسمان پر صبح ہی سے بادل چھانا شروع ہوگئے تھے۔ کمانڈو خالد نے خیال ظاہر کیا کہ ہو سکتا ہے رات کو بارش شروع ہو جائے۔ بارش میں آشرم کی عمارت کے اردگرد بارودی سرنگیں اور ٹائم بم لگانے میں ہمیں دشواری پیش آ سکتی ہے۔ میں نے کہا۔

"اگر بارش والا موسم بن گیا تو ہم کمانڈو آپریشن ایک دن اور آگے ڈال دیں گے۔"

مگر شام کے وقت بادل جدھر سے آئے تھے اسی طرف چلے گئے اور آسمان صاف ہوگیا۔ ہم نے اپنے مشن کی تیاریاں شروع کردیں۔ دو مجاہدوں کو ضروری گولہ بارود لے کر خونی جنگل کی سرحد تک ہمارے ساتھ جانا تھا۔ اس سے آگے مجھے اور کمانڈو خالد کو اکیلے ہی آلوپ نگر اور آشرم تک سفر کرنا تھا۔ ہم نے چھ بارودی سرنگیں' بارہ ٹائم بموں کی بارودی سٹکیں جو بنڈلوں کی شکل میں تھیں اور آٹھ ہینڈ گرنیڈ اپنے ساتھ لے جانے تھے۔ اس تمام اسلحے کو اچھی طرح سے چیک کرنے کے بعد ہم نے پلاسٹک

کے ایک تھیلے میں ڈال کر ایک طرف رکھ دیا۔ ہمارے پاس ایک ایک پستول' کمانڈو چاقو اور ایک ایک سٹین گن ہی کافی تھی۔ جیسے ہی شام کا اندھیرا ذرا گہرا ہوا تو ہم اپنے خفیہ ٹھکانے سے نکل پڑے۔ ہمارا ایک مجاہد اسلحے کا تھیلا لے کر پہلے ہی ٹارگٹ کی طرف روانہ ہوچکا تھا۔ وہ اس وقت بھی سادھو کے بھیس میں تھا۔ بھارت میں یہ بھیس بڑا کار آمد تھا اور کسی سادھو پر کوئی کم ہی شک کرتا تھا۔ ویسے بھی سادھو' جوگیوں اور سنیاسیوں سے لوگ ڈرتے تھے کہ کہیں یہ کوئی بد دعا نہ دے دیں۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ سادھو اور جوگی کی بد دعا کبھی خالی نہیں ہوتی۔

میں اور کمانڈو خالد ایک سکوٹر پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ ہمیں چوکھبا گاؤں جانا تھا۔ وہاں سے آگے مہادیو کے آشرم کو جانے والا خونی جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ رات ابھی زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی کہ ہم چوکھبا گاؤں پہنچ گئے۔ سکوٹر کو ہم نے ایک جگہ جھاڑیوں میں چھپا دیا اور پیدل ہی جھاڑ جھنکار والے میدان میں سے گزرنے لگے۔ دور خونی جنگل کے درختوں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ خونی جنگل کی سرحد پر آ کر ہم رک گئے۔ ہمارا ساتھی مجاہد پہلے سے وہاں پر موجود تھا۔ ہم نے اس سے اسلحہ کا تھیلا لے لیا۔ میں نے تھیلا اپنے کاندھے سے لٹکا لیا۔ مجاہد کو واپس بھیج دیا۔ یہاں میں نے کمانڈو خالد کو وہ ہدایات دیں جو خونی جنگل میں داخل ہونے سے پہلے اس کے گوش گزار کرنی بہت ضروری تھیں۔ میں نے اسے کہا۔

"کمانڈر! اب ہم خونی جنگل میں داخل ہو رہے ہیں۔ تمہیں ہر حالت میں میرے بالکل ساتھ رہ کر چلنا ہوگا۔ جہاں میں کہوں رک جانا۔ جہاں میں کہوں بیٹھ جانا۔ مجھ سے ایک قدم بھی دور مت ہونا۔ میرے جسم سے نکلنے والی خاص جڑی بوٹیوں کی بو سانپوں' مگرمچھوں اور آدم خور درختوں سے تمہیں بھی محفوظ رکھے گی۔ جہاں کوئی دلدل آئی میں تمہیں پہلے خبردار کر دوں گا۔"

کمانڈو خالد بڑے غور سے میری ہدایات سنتا رہا۔ کہنے لگا۔

"میں تمہاری ہدایات پر عمل کروں گا۔"

ہم نے بسم اللہ پڑھی۔ خدا سے اپنے مشن کی کامیابی کی دعا مانگی اور خونی جنگل میں داخل ہوگئے۔ جنگل میں تاریکی تھی۔ کمانڈو خالد بالکل میرے ساتھ لگ کر چل رہا تھا۔ ابھی درخت اتنے گنجان نہیں تھے۔ مگر اندھیرے میں غور سے دیکھ دیکھ کر راستہ تلاش کرنا پڑ رہا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ چلتے رہنے کے بعد پہلی دلدل آئی۔ میں نے دور ہی سے دلدل کی خاص بو سونگھ لی۔ میں نے کمانڈو خالد کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔

"آگے خوفناک دلدل ہے تم اب میرے پیچھے پیچھے چلو گے۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔ کوئی بیس قدم چلنے کے بعد اندھیرے میں میں نے دلدل کو دیکھا اور کمانڈو خالد کو بھی دکھائی اور کہا۔

اس دلدل میں سالم کے سالم ہاتھی غائب ہو جاتے ہیں۔"

کمانڈو خالد اندھیرے میں غور سے دلدل کو دیکھ رہا تھا جو چھوٹے سے سیاہ کھیت کی طرح تھی۔ وہ کہنے لگا۔ "دلدل اوپر نیچے ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ سب سے زیادہ ہلاکت خیز دلدل ہے۔ کوئی آدمی یا جانور اس میں گر جائے تو اس کے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دلدل اسے چند لمحوں میں اپنے اندر کھینچ لیتی ہے۔"

ہم وہاں سے آگے چل پڑے۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے جنگل کے درخت قریب قریب ہوتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک جگہ سے مجھے تین چار سانپوں کی خوفناک پھنکاریں سنائی دیں۔ کمانڈو خالد رک گیا۔ میں نے کہا۔

"کمانڈر! چلتے چلو۔ رکنا بالکل نہیں۔ میرے ساتھ لگ کر چلو۔ یہ سانپ ہمارے قریب نہیں آئیں گے۔"

رات کی تاریکی میں سانپ ہمیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ مگر ان کی پھنکاروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ہم سے زیادہ دور نہیں تھے۔ ہم آگے بڑھتے گئے۔ سانپوں کی پھنکاریں پیچھے رہ گئیں۔ درختوں کی وجہ سے جنگل کا راستہ انتہائی دشوار گزار تھا۔

ایک جگہ کسی جانور کی لمبی سسکاریں سنائی دیں۔ کمانڈو خالد الرٹ ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں کمانڈر! یہ تالاب والے مگرمچھ ہیں۔ انہوں نے میرے جسم سے نکلنے والی بو محسوس کر لی ہے۔ یہ ہماری طرف نہیں آئیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی ہمیں مگرمچھوں کے پانی میں چھلانگیں لگانے کی آوازیں آئیں۔ اس کے بعد ان کی سسکاریں بند ہو گئیں۔ کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"میں حیران ہوں کہ بھوپال میں ایسا خطرناک خونی جنگل بھی موجود ہے۔ ہم نے اتنا ضرور سن رکھا تھا کہ مدھیہ پردیش میں جنگل کا ایک حصہ ایسا ہے جہاں شکاری بھی جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہی وجہ ہے کہ شیطان مہا دیو نے اس جنگل میں ایک جگہ عیاشی کے لیے اپنا آشرم بنایا ہوا ہے۔ ادھر مدھیہ پردیش کی پولیس بھی آتے ہوئے خوف کھاتی ہے۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"پولیس کو ضرور اس شیطان مہا دیو نے اپنے ساتھ ملا لیا ہو گا۔ ورنہ وہ کبھی اتنی آزادی سے یہاں بیٹھ کر آس پاس کی عورتوں کی عزتوں سے نہیں کھیل سکتا۔"

ہم دھیمی آواز میں باتیں کرتے درختوں میں راستہ بناتے چلے جا رہے تھے۔ ایک دم سے ایسی آواز آئی جیسے کسی نے ہنٹر ہوا میں لہرایا ہو۔ میں نے کمانڈو کو بازو سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا اور کہا۔

"یہ آدم خور جھاڑیاں تھیں جو میرے جسم کی بو پا کر اوپر کی طرف چلی گئی ہیں۔"

کمانڈو خالد اندھیرے میں اوپر درخت کی جھاڑیوں کو تکنے لگا۔ حیران ہو کر بولا۔

"یہ باتیں ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ کفر ہے' شرک ہے۔ میں تو اس میں پھنس گیا ہوں۔ تم اسے نہ ہی سمجھو تو اچھا ہے۔"





گنجان درخت آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دور ہونے لگے تھے۔

اندھیرے میں ہمیں درختوں اور جھاڑیوں کے خاکے نظر آ رہے تھے۔ میں دل میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ ابھی مجھ پر سانپ کے منتروں کا حملہ نہ ہو۔ میں سانپ بن جانے کی صورت میں کمانڈو خالد کی اتنی مدد نہیں کر سکتا تھا جتنی مدد انسان کی حیثیت سے کر سکتا تھا۔ ہمیں صرف شیطان صفت مہا دیو کو ہی ہلاک نہیں کرنا تھا بلکہ اس کے سارے کے سارے آشرم کو بارود سے اڑانا تھا اور اس مشن کے لیے میرا انسانی شکل میں موجود رہنا بہت ضروری تھا۔ ابھی تک میرے سانپ کی شکل اختیار کرنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ نہ مجھے کوئی چکر ہی آیا تھا اور نہ مجھے کہیں بھی جگہ اپنے جسم کا بوجھ ہلکا ہوتا محسوس ہوا تھا۔ آپ کو میں بیان کر چکا ہوں کہ جب میں انسان سے سانپ کی شکل اختیار کرنے والا ہوتا تھا تو پہلے مجھے چکر آتا تھا۔ اس کے بعد میرے جسم کا بوجھ ہلکا ہونا شروع ہوجاتا تھا۔ جب میں سانپ سے واپس انسانی شکل اختیار کرتا تھا تو سب سے پہلے مجھے ہلکے ہلکے جھٹکے لگتے تھے پھر ایک زور سے جھٹکا لگتا تھا اور میرا جسم انسانی شکل میں واپس آ جاتا تھا۔ یہ ایک ایسا ہیبت ناک تجربہ تھا کہ جس کے تصور سے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جنگل کا گھنا پن کم ہوگیا تھا۔

ایک طرف سے بن مانس کے خر خر کرنے اور اپنا سینہ کوٹنے کی آواز آئی۔ کمانڈو

خال رک گیا۔

"یہ کیسی آواز ہے؟"

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ بن مانس ہے جو جوگن مایا دیوی کا خاوند بھی ہے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ چونکہ میرے جسم میں جوگن مایا دیوی کی بو بھی تھوڑی شامل ہوگئی ہے اس لیے وہ مجھ پر حملہ نہیں کرے گا۔ جب میں نے کمانڈو خالد کو یہ بات بتائی تو وہ اور زیادہ حیران ہوا۔ کہنے لگا۔

"کیا یہاں عورتیں بن مانس سے بھی شادی کرتی ہیں؟"

میں نے ہنس کر کہا۔

"کمانڈر! یہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ حیرانی تو مجھے اس بات کی ہے کہ میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں لیکن مجھے اس خونی جنگل کے سارے اسرار معلوم ہیں۔ جبکہ تم مدھیہ پردیش کے رہنے والے ہو اور تمہارے لیے یہ بالکل نئی باتیں ہیں۔"

وہ کہنے لگا۔ "بھارت میں ہندو دھرم کی حکومت ہے اور یہ دھرم عجیب عجیب قسم کی دیو مالائی رسومات کا ملغوبہ ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ لوگ کن کن چیزوں کی پوجا کرتے ہیں اور کیسی کیسی جنسی بے راہروی کے شکار ہیں؟"

بن مانس کی آوازیں ہم سے دور جا چکی تھیں۔

بن مانس کی موجودگی اس بات کی دلیل تھی کہ ہم آلوپ نگر کے کھنڈروں کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ میں بڑے غور سے ایک ایک درخت اور جھاڑیوں کو دیکھ دیکھ کر چل رہا تھا۔ میں نے کمانڈو خالد کو بھی یہ کہہ کر الرٹ کر دیا تھا کہ ہم ٹارگٹ کے قریب آ گئے ہیں۔ اسلحہ وغیرہ کا تھیلا اب اس نے اپنے کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ مجھے وہ چبوترہ نظر آ گیا جس پر سیندھیا کی کٹیا تھی۔ میں نے کمانڈو خالد کو کٹیا دکھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے تم سے سیندھیا نام کی ایک نرتکی کا ذکر کیا تھا ناں؟"

"ہاں۔"

"وہ سامنے اس کی کٹیا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہم ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں۔"

"کیا سیندھیا اپنی کٹیا میں ہوگی؟ کہیں وہ ہماری مخبری نہ کر دے؟"

میں نے کمانڈو خالد کے اس خدشے کے اظہار پر کہا۔

"سیندھیا خود مہادیو کے خلاف ہے۔ اس نے میری بیوی کو اس جہنم سے نکلوانے میں میری بہت مدد کی تھی۔ وہ خود بھی اس جہنم سے نکلنا چاہتی ہے۔ وہ ہماری مخبری نہیں کرے گی بلکہ اگر مل گئی تو وہ ہماری مدد کرے گی۔"

ہم چبوترے پر چڑھ گئے۔ میں نے کمانڈو خالد کے کان میں کہا۔

"ابھی بولنا نہیں۔"

اور دبے پاؤں کٹیا کی طرف بڑھا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ کٹیا کے دروازے پر وہی پرانا بوریا لٹک رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے بوریا اٹھایا' کٹیا میں اندھیرا تھا۔ میں نے آہستہ سے سیندھیا کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے کمانڈو خالد کو منہ سے ہلکی سی سیٹی بجا کر آل کلیئر کا سگنل دیا۔ وہ دوڑ کر میرے پاس آگیا۔ ہم کٹیا میں داخل ہوگئے۔ میں نے ماچس جلائی۔ کٹیا خالی تھی۔ سیندھیا کا تھوڑا بہت سامان پڑا تھا اور بستر بھی لگا ہوا تھا۔ کمانڈو خالد نے اسلحہ کا تھیلا نیچے رکھ دیا۔ ہم بیٹھ گئے۔ میں نے مٹکے سے پانی نکال کر کمانڈو خالد کو بھی پلایا اور خود بھی پیا۔ وہ کہنے لگا۔

"ہمارے لیے یہ جگہ بڑی مفید رہے گی۔ ہم یہاں سے اپنے کمانڈو آپریشن کا آغاز کریں گے۔"

میں نے طاق میں رکھا ہوا تیل کا دیا روشن کر دیا اور کٹیا کے آگے بوریا اس طرح گرا دیا کہ دیئے کی روشنی باہر نہیں جا سکتی تھی۔ ہم نے تھیلا کھول کر سارے اسلحے کو ایک بار پھر چیک کیا۔ کمانڈو منظر خالد نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"ابھی رات کے سوا بارہ ہی بجے ہیں۔"

میں نے اپنی سٹین گن صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ایک بجے کے بعد یہاں کے ناگ مندر کا دروازہ بھی بند کر دیا جاتا ہے۔"

خالد نے کہا۔
”تعجب کی بات ہے کہ ابھی تک ہمیں یہاں کے سپیروں کی پلٹن کا کوئی فوجی گشت کرتا نظر نہیں آیا۔“
میں نے اسے بتایا کہ اس سے آگے آلوپ نگر کے کھنڈر اور آشرم کی عمارتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ سپیرے فوجی اس طرف رات کو گشت لگاتے ہیں۔
”ہمیں یہاں سے آگے بہت ہوشیار رہ کر چلنا ہوگا کیونکہ کسی بھی جگہ پٹرول کرتے سپیرے فوجیوں سے مڈبھیڑ ہوسکتی ہے۔ ان کے پاس سٹین گنیں ہوتی ہیں۔“
میں نے سٹین گن صاف کر کے اپنے کندھے سے لٹکائی اور اسلحے کے تھیلے کو بند کر دیا تھا کہ جھونپڑی کے باہر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ ہم جیسے بیٹھے تھے ویسے کے ویسے ساکت ہوگئے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دیئے کو پھونک مار کر بجھا دیا۔ آواز قریب سے آئی تھی۔ کسی نے کسی سے کہا تھا۔
”چلو سیندھیا کے پاس چلتے ہیں‘ وہ اپنی کٹیا میں ہے۔“
دوسرے نے کہا۔ ”وہ تو آشرم میں ہوگی۔“
پہلے آدمی کی آواز آئی۔
”کٹیا میں دیا روشن ہے‘ وہ اندر ہی ہوگی۔“
دوسرا بولا۔ ”دیا کہاں جل رہا ہے؟“
پہلا بولا۔
”میں نے ابھی کٹیا میں روشنی دیکھی تھی۔ چلو اندر چل کر معلوم کرتے ہیں۔“
میں نے کمانڈو خالد کو آہستہ سے کہا۔
”فوراً“ نکل چلو۔ بائیں ہاتھ کو جھونپڑی کے پیچھے۔“
کمانڈو خالد بجلی ایسی تیزی سے اٹھ کر جھونپڑی سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی جھک کر چلتا تیزی سے باہر نکل گیا۔ خالد بائیں جانب گیا تھا۔ میں جھونپڑی کی دائیں جانب ہو کر وہیں دیوار کی اوٹ میں اوندھا لیٹ گیا۔ سٹین گن میں نے اپنی پشت

پر ڈال لی تھی اور جیکٹ کی جیب میں سے کمانڈو چاقو نکال لیا تھا۔ میں وہاں سٹین گن کے فائر کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میری عقابی آنکھیں اندھیرے میں دو آدمیوں کو کٹیا کی طرف آتے دیکھ رہی تھیں۔ جب وہ ذرا قریب آئے تو میں ان کی وردیوں سے انہیں پہچان لیا۔ یہ مہادیو کے سپیرے فوجی تھے۔ ان کی سٹین گنیں ان کے کاندھوں پر لٹک رہی تھیں۔ وہ میرے نزدیک سے ہوتے ہوئے کٹیا میں داخل ہوگئے۔ میں بالکل زمین کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اندھیرے میں وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں نے کچھ سوچ کر چاقو جیب میں ڈالا اور سلینسر والا پستول سیدھا کر لیا۔ اندر سے ان کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"ارے ماچس جلاؤ۔"

سیندھیا کو بھی انہوں نے دو تین آوازیں دیں۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وہ سو رہی ہے۔ دوسرے نے کہا۔

"دیا جلاؤ۔ وہ سامنے طاق میں ہے۔"

کٹیا میں روشنی ہوگئی۔ جو دروازے کے بوریئے کے نیچے سے مجھے نظر آنے لگی۔ ایک نے کہا۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے۔"

دوسرا بولا۔ "کٹیا میں دیا بجھے کے دھوئیں کی بو پھیلی ہوئی ہے۔ کسی نے دیا بجھایا تھا۔"

"کوئی بھوت ہوگا۔"

"چلو باہر نکل کر دیکھتے ہیں۔ کہیں پانڈی چری کے ناگ مندر کا کوئی جاسوس نہ ہو۔"

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ مہا دیو کے ناگ مندر کی جنوبی ہند کے دوسرے ناگ مندر والوں سے دشمنی چلتی رہتی تھی اور ان مندروں کے بڑے پجاری ایک دوسرے کی خوبصورت دیوداسیاں اغوا کر لیا کرتے تھے اور مندروں کو بھی نقصان

پہنچایا کرتے تھے۔ دونوں باہر آ گئے۔ اب انہوں نے سٹین گنیں سیدھی کر لی تھیں۔ وہ ایک دو سیکنڈ جھونپڑی کے دروازے کے پاس کھڑے رہے۔ پھر ان میں سے ایک آگے بڑھا۔ دوسرے نے کہا۔

"یہاں دشمن کا کوئی جاسوس چھپا ہوا ہے۔"

جو سپیرا فوجی میرے قریب کھڑا تھا اس کے ایک پاؤں کا بوٹ میرے منہ کے بالکل قریب تھا۔ میں ذرا کھسک کر پرے ہونے لگا تو آہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے جھک کر نیچے دیکھا۔ میں اسے نظر آ گیا۔ اس نے سٹین گن میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

"بنسی رام۔ یہ رہا جاسوس۔"

اس سے پہلے کہ اس کی سٹین گن فائر ہوتی' میں نے پستول کی نالی اوپر اٹھاتے ہوئے فائر کر دیا۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ گولی اس کے جسم کے اوپر والے حصے میں لگی اور وہ وہیں دہرا ہو گیا۔ میں تڑپ کر اٹھا اور دوسرا فائر اس کی کھوپڑی کے ساتھ پستول لگا کر کر دیا۔ وہ گر پڑا۔ مجھے دوسرے کی فکر تھی۔ اس دوران میں نے اندھیرے میں دیکھ لیا تھا کہ کمانڈو منظر خالد نے دوسرے آدمی کی گردن پر وار کیا ہے۔ دوسرا آدمی نیچے جھک گیا تھا اور کمانڈو خالد نے دوسرا وار کر دیا تھا۔ اس نے کمانڈو چاقو سے اس کی گردن آگے اور پھر پیچھے سے کاٹ دی تھی۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ دونوں ایکشن بجلی کی چمک ایسی تیزی سے ہوئے اور دونوں میں سے کسی کو سٹین گن فائر کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ ورنہ اگر وہاں سٹین گن کے برسٹ کے دھماکے ہو جاتے تو مہا دیو آشرم کے سارے سپیرے فوجی ایکدم اس طرف دوڑ پڑتے اور ہمارے مشن کی کامیابی پھر بہت مشکل تھی۔ پھر ہمیں وہاں سے فرار ہونا پڑتا۔ دونوں سپیرے فوجیوں کی لاشیں اندھیرے میں سیندھیا کی کٹیا کے باہر پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک ابھی زندہ تھا۔ یہ وہ فوجی تھا جس کی گردن پر کمانڈو خالد نے دو وار کیے تھے۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ کمانڈو خالد کو چاقو سے وار کرنے کی باقاعدہ ٹریننگ نہیں دی گئی تھی۔ وہ شدید زخمی تھا مگر زندہ تھا۔ میں نے اس کے سر کو

دونوں ہاتھوں میں لے کر ایک جھٹکے سے ایک طرف گھما دیا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کمانڈو خالد اندھیرے میں میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"ان لاشوں کو جنگل میں پھینک دیتے ہیں۔"

"میں نے کہا۔ "اس طرف مہا دیو کے فوجی رات کو گشت پر ہوتے ہیں۔"

"پھر ان لاشوں کو کیا کریں؟" کمانڈو خالد نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "انہیں کٹیا میں رکھ دیتے ہیں۔"

ہم نے دونوں لاشوں کو گھسیٹ کر سیندھیا کی کٹیا کے اندر ڈال دیا اور ایمونیشن کا تھیلا کندھے پر رکھ کر اندھیرے میں اس باغ کی طرف بڑھے جس کی دوسری جانب مہا دیو کا آشرم اور آلوپ نگر کے کھنڈروں کی عمارتیں شروع ہو جاتی تھیں۔ میں نے کمانڈو خالد کو اپنے پیچھے رکھا ہوا تھا۔ یہ وہی راستہ تھا جس طرف سے جوگن ملیا دیوی مجھے اندھیری رات میں لے کر مہا دیو کے آشرم والے تالاب کی طرف گئی تھی مگر ابھی مجھے اس طرف نہیں جانا تھا۔ میں تھوڑا آگے جا کر بائیں جانب مڑ گیا۔ کچھ فاصلے پر درختوں میں سے ناگ مندر اور اس کے عقب میں مہا دیو کے آشرم کی دو تین بتیاں جھلملاتی نظر آنے لگیں۔ میں نے کمانڈو خالد سے کہہ دیا تھا کہ اب ہم صرف سرگوشیوں میں بات کریں گے۔ میں نے اسے روشنیاں دکھائیں اور کہا۔

"ہمیں اس طرف جانا ہے۔"

آگے کچا راستہ تھا جو آلوپ نگر کی کھنڈر عمارتوں کے درمیان سے گزر کر ناگ مندر تک جاتا تھا۔ یہ مندر کوئی پوجا پاٹھ والا عام مندر نہیں تھا۔ یہاں سانپوں کو دشمنوں کے اترے ہوئے کپڑے سنگھا کر ان پر منتر پھونک کر انہیں ان کے پیچھے چھوڑا جاتا تھا۔ یہ سانپ جہاں وہ آدمی ہوتا تھا اسے جا کر ڈس کر ہلاک کر دیتے تھے۔ یہ خباثت قتل و غارت گری اور عیاشیوں کا اڈہ تھا۔ اس کو تباہ کرنا بھی ہمارے مشن میں شامل تھا۔ میں نے کمانڈو خالد کو اشارہ دے دیا کہ ہم ٹارگٹ پر آ گئے ہیں۔ ہم تیزی سے جھک کر دوڑتے ہوئے ناگ مندر کے عقب میں آ گئے۔ یہاں ہم نے اندھیرے

میں جھاڑیوں کے درمیان ایمونیشن کے تھیلے میں سے چار بارودی سرنگیں نکالیں اور مندر کے سامنے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ ہم زمین پر پیٹ کے بل لیٹ کر رینگ رہے تھے۔ ناگ مندر میں زیادہ روشنیاں نہیں تھیں۔ آدھی رات کے بعد مندر کے اکثر پیتل کے دیئے بجھا دیے جاتے تھے۔ مندر کے بڑے گیٹ کے اوپر ایک بڑا دیا روشن تھا۔

ہم نے اپنی اپنی ٹریننگ پر عمل کرتے ہوئے دو دو بارودی سرنگیں مندر کی سیڑھیوں کے آگے زمین میں اس طرح دبا دیں کہ اگر مندر میں موجود سپیرے فوجی باہر نکلیں تو بارودی سرنگیں پھٹ کر ان کے پرخچے اڑا دیں۔ یہ ہم نے ہنگامی صورت حال کے پیش نظر دبائی تھیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم واپس مندر کے پیچھے آ گئے اور مندر کی دیوار کے ساتھ زمین کی مٹی ہٹا کر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چار ٹائم بم لگا کر ان کے کلاک اون کر دیے۔ ان ٹائم بموں کے پھٹنے کا وقفہ ایک گھنٹہ تھا۔ یہ بم اس قدر طاقتور تھے کہ ایک گھنٹے کے بعد انہوں پھٹ کر مندر کی دیواروں کو بنیادوں سے اکھیڑ کر اس کی اینٹوں اور ملبے کو ہوا میں اچھال دینا تھا۔

میں رینگتا ہوا کمانڈو خالد کے پاس گیا اور اس کے کان میں کہا۔

"میرے پیچھے آ جاؤ۔"

ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور جھک کر دبے پاؤں چلتے سامنے والے باغ کی طرف بڑھ گئے۔ اس وقت ناگ مندر کے اندر سے سپیرے فوجیوں کے دو چار قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں بہت چوکنا ہو کر بڑی احتیاط سے چل رہا تھا۔ کیونکہ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہاں سپیرے فوجیوں کی کوئی پارٹی گشت پر نہ ہو۔ ایسا ہی ہوا۔ جیسے ہی میں کمانڈو کو لے کر سامنے والے باغ کے پھلدار درختوں کے قریب آیا۔ ایک جانب سے کسی نے آواز دی۔

"ارے کہاں مر گئے ہو۔ مندر میں چل کر سوم رس پی لینا۔ یہاں گانجا نہ پینا۔"

ہم وہیں پھلدار درختوں کے جھاڑ میں بیٹھ گئے۔ اندھیرے میں ایک فوجی بڑھ

مزے سے ٹہلتا مندر کی طرف جا رہا تھا۔ اسے ہمارے قریب سے گزرنا تھا۔ کیونکہ یہی راستہ مندر کو جاتا تھا۔ اس کو ہلاک کرنا ضروری ہوگیا تھا کیونکہ اگر وہ مندر کے دروازے کی طرف سے اوپر چڑھا تو سو میں سے ننانوے فیصد مجھے یقین تھا کہ اس کا پاؤں بارودی سرنگ پر پڑے گا اور بڑے زور کا دھماکہ ہوگا۔ اس وقت دھماکہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے کمانڈو خالد کے کندھے کو خاص انداز میں دبایا۔ وہ جلدی سے بیٹھے بیٹھے پیچھے ہٹ گیا۔ اس دوران سپیرا فوجی مجھ سے کوئی تین چار فٹ کے فاصلے پر آ گیا تھا۔ جیسے ہی وہ میرے قریب سے ہو کر ذرا آگے گیا میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی گردن میں بازو ڈال کر اس کی کھوپڑی کے ساتھ پستول کی نالی لگا کر ٹریگر دبا دیا۔

"ٹھک" کی آواز کے ساتھ سپیرے فوجی کا بدن میرے بازو کے شکنجے میں ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے بڑے آرام سے اسے وہیں زمین پر ڈال دیا۔ میری نگاہیں اندھیرے میں اس کے دوسرے ساتھی کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے کمانڈو خالد کو ایک طرف جھاڑی کے پاس بیٹھے دیکھا۔ وہ بالکل ساکت ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کا بازو مخصوص انداز میں دبا کر اسے اشارہ دے دیا تھا کہ وہ کچھ نہ کرے اور چھپ کر بیٹھ جائے۔ سامنے والے درختوں میں سے ایک اور انسانی سایہ نکل کر ہماری طرف آنے لگا۔ یہ پہلے سپیرے فوجی کا ساتھی تھا۔ وہ بھی بڑے آرام آرام سے ٹہلتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا جس کے وہ کش لگا رہا تھا۔ جب وہ میرے قریب آیا تو مجھے چرس کی بدبو محسوس ہوئی۔ میں رات کی تاریکی میں پھلدار درخت کے بالکل ساتھ لگ کر اپنے آپ کو سمیٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ آگے اس کے ساتھی کی لاش پڑی ہوئی تھی جس کے ساتھ اس کے پاؤں کے ٹکرانے کا امکان موجود تھا۔ میں اس سے پہلے اسے دبوچنا چاہتا تھا۔

اس نے اپنے ساتھی کو آواز دی۔ مگر اس کا ساتھی اب کبھی اس کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ چرس کی بدبو تیز ہوگئی۔ میں نے سانس روک لیا۔ وہ میرے قریب سے نکل گیا۔ میں نے اٹھ کر اسے دبوچنا چاہا تو اسے میرے پاؤں کی

آہٹ آ گئی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر فائر کر دیا۔ کمانڈو ٹریننگ کے دوران بھی میرا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا تھا۔ بہت کم ہوتا تھا کہ میری گولی رنگ کے سینٹر میں نہیں لگتی تھی۔ وہ منہ کی بل آگے کو گرا۔ میں پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ کمانڈو خالد گھٹنوں کے بل چلتا میرے پاس آ گیا۔ کہنے لگا۔

"کوئی تیسرا فوجی بھی ہو گا۔"

میں نے سرگوشی میں کہا۔

"دیکھا جائے گا۔"

ہم نے دونوں لاشوں کو گھسیٹ کر درختوں کے نیچے ایک طرف کر کے ڈال دیا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ کوئی دوسری گشتی پارٹی کو لاشیں نظر نہیں آ سکتی تھیں۔ میں نے کمانڈو خالد کا بازو دبایا اور آگے کو چلا۔ کمانڈو خالد سمجھ گیا کہ اب اسے میرے اشارے پر چلنا ہے۔ آگے کس طرف جانا ہے؟ مجھے معلوم تھا۔ اب ہمارا ٹارگٹ مہادیو کا آشرم تھا۔ ہمارے پاس صرف دو بارودی سرنگیں اور چار ٹائم بم باقی رہ گئے تھے۔ دو دستی بم ہماری جیبوں میں تھے۔ پستول ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے۔ سٹین گنیں کاندھوں سے لٹک رہی تھیں۔ میں تالاب کی طرف سے آشرم کی طرف گیا۔ مجھے علم تھا کہ یہاں رات کو کوئی گارڈ وغیرہ نہیں ہوتے۔ اس طرف صرف رات کے پچھلے پہر بلکہ سحر سے کچھ پہلے مہا دیو کی خاص نرتکی اس کے کمرے سے نکل کر اپنی سکھیوں کے ہمراہ اشنان کرنے آتی ہے۔ اس وقت سپیرے فوجیوں کی ایک ٹولی اس کی حفاظت یا نگرانی کے واسطے کچھ فاصلے پر ضرور موجود ہوتی تھی۔ اس کے سوا یہاں ساری رات خاموشی اور ویرانی چھائی رہتی تھی۔

تالاب پر سناٹا طاری تھا۔ ہم صرف اشاروں میں ایک دوسرے کو اپنا مفہوم سمجھا رہے تھے۔ سرگوشیوں میں بھی باتیں نہیں کر رہے تھے۔ میں سنگ مرمر کی اس روش پر آ گیا جہاں منہ اندھیرے آشرم میں رات گزار کر مہا دیو کی چہیتی نرتکی کو اشنان کرنے آنا تھا۔ یہ روش سیدھی مہا دیو کے آشرم کے کمرہ خاص کے عقبی دروازے کی طرف

جاتی تھی۔ ہم روش کو چھوڑ کر ساتھ والی پھولدار جھاڑیوں کی اوٹ لے کر آگے بڑھ رہے تھے۔ آشرم کی عمارت اندھیرے میں کسی چھوٹے قلعے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ایک کھڑکی میں مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ باقی ساری عمارت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ آشرم کا عقب تھا۔ آشرم کے صدر دروازے کی طرف گارڈز ہر وقت موجود رہتے تھے مگر اس طرف رات کوئی نہیں آتا تھا۔ یہ بات مجھے سیندھیا نے بھی بتا دی ہوئی تھی۔ آشرم کا عقبی دروازہ بند تھا۔ میں نے اسے ذرا سا دھکیلا' اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں دیوار کے بالکل ساتھ لگ کر قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔ کمانڈو خالد میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

ایک جگہ دیوار میں زمین سے کوئی ایک فٹ اوپر ایک چھوٹا سا شگاف تھا۔ وہاں سے دو تین اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے جھک کر اس کے اندر دو ٹائم بم رکھے اور کلاک کا بٹن دبا دیا۔ اسے بھی تقریباً" ایک گھنٹہ بعد پھٹنا تھا۔ اسی طرح میں نے دیوار میں آگے جا کر بھی دو ٹائم بم دیوار کے ایک سوارخ میں پھنسا کر بٹن دبا دیے۔ یہاں ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ برآمدہ اندھیرے میں خالی پڑا تھا۔ میں نے خالد کو برآمدے میں چلے آنے کا اشارہ کیا اور پنجوں کے بل چلتا برآمدے میں آکر سامنے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ چھوٹا دروازہ تھا۔ شاید یہاں سے سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ میں نے دروازے کو دھکیلا۔ وہ اندر کی طرف نہیں کھلتا تھا۔ میں نے اسے باہر کی طرف کھینچا تو اس کا پٹ کھل گیا۔ سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں۔ ہم آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے دروازے کے قریب آئے تو ہمیں ایک مرد کے ہنسنے اور نشے میں باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک چھوٹی سی گیلری تھی۔ جس کے آگے پتھر کی جالی داری چھوٹی سی دیوار تھی۔ ہم جھک کر گیلری میں آئے اور وہیں بیٹھ کر جالیوں میں سے دوسری طرف دیکھا۔

سامنے ایک منظر نظر آیا کہ مہا دیو ایک مسند پر نیم عریاں حالت میں بیٹھا جھوم رہاہے۔ ایک نرتکی گلاس میں بوتل میں سے شراب ڈال رہی ہے۔ ایک نرتکی جو تقریباً"

عریاں تھی اس کے زانو پر سر رکھے نیم دراز ہے اور مہا دیو اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے۔ میں نے کمانڈو خالد کے کان میں سرگوشی کی۔

"یہی وہ شیطان مہا دیو ہے جو میری بیوی سمیت نہ جانے کتنی معصوم عورتوں کی عزتیں برباد کر چکا ہے۔"

میں نے سٹین گن کی نالی پتھر کی جالی میں سے دوسری طرف تھوڑی سی نکالی اور مہا دیو کے پھولے ہوئے پیٹ کو شست میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔ سٹین گن سے نشانہ کارگر نہیں ہوتا جس طرح کہ رائفل کا نشانہ کارگر ہوتا ہے۔ اس کا نشانہ لیا بھی نہیں جاتا۔ ٹارگٹ کو سامنے دیکھ کر اس کے برسٹ کی بوچھاڑیں دائیں بائیں فائر کی جاتی ہیں۔ لیکن ایک تو میرے پاس رائفل نہیں تھی۔ پستول کا نشانہ اتنی دور سے دھوکا دے سکتا تھا۔ سٹین گن کا برسٹ میں اس لیے فائر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس شیطان کے زانوؤں میں ایک عورت لیٹی ہوئی تھی جسے مارنا میرے مشن میں شامل نہیں تھا۔ کمانڈو خالد نے مجھے سٹین گن کا نشانہ باندھتے ہوئے دیکھا تو میرے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔

"برسٹ فائر کرو۔"

میں نے سرگوشی میں کہا۔

"میں عورت کو نہیں مارنا چاہتا۔"

کمانڈو خالد نے بڑے نکتے کی بات کہی۔

"ایک برسٹ چھت پر فائر کرو۔ عورت ڈر کر بھاگ جائے گی۔ ٹارگٹ سامنے آ جائے گا' اسے مار لینا۔"

ہمارے پاس زیادہ وقت بھی نہیں تھا۔ پہلے ٹائم بم کو لگائے تقریباً" آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا۔ مزید آدھ گھنٹے بعد ناگ مندر نے ایک قیامت خیز دھماکے سے اڑ جانا تھا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا جلدی کر گزرنا تھا۔ میں نے سٹین گن کی نالی پتھر کی جالی میں سے باہر نکال لی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے نالی کا رخ چھت کی طرف کر کے

ایک برسٹ فائر کیا تو دھماکوں سے کمرہ گونج اٹھا۔ دونوں عورتیں چیخیں مارتی دروازے کی طرف دیوانہ وار دوڑیں۔ میرا ٹارگٹ سامنے تھا۔ مہا دیو بہت موٹا تھا۔ اس نے تیل کے چراغوں کی روشنی میں ایک آدمی کو گیلری میں سٹین گن کے ساتھ کھڑے دیکھا تو وہ بھی دروازے کی طرف دوڑنے کے لیے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا مگر ایک تو وہ نشے میں تھا دوسرا اس کا پیٹ باہر کو نکلا ہوا تھا۔ وہ اٹھتے اٹھتے گر پڑا۔ میں نے دوسرا برسٹ سیدھا مہا دیو کے پیٹ کو نشانہ بنا کر فائر کر دیا۔ میں اس وقت تک سٹین گن کے برسٹ فائر کرتا رہا جب تک کہ شیطان صفت مہا دیو کا پھولا ہوا موٹا جسم گولیوں سے چھلنی ہو کر لہولہان نہیں ہو گیا۔

کمانڈو خالد نے میرا بازو کھینچ کر کہا۔

"اب نکل چلو۔ کیا کر رہے ہو۔"

ہم گیلری میں سے نکل کر جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر برآمدے میں آئے تو سامنے سے تین سپیرے فوجی برآمدے کی طرف دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ میں نے اور کمانڈو خالد دونوں نے ان پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی تینوں الٹ گئے۔ ہم جس طرف سے آئے تھے اس طرف کو دوڑ پڑے۔ ہمیں مندر کی جانب سے لوگوں کے شور و غل کی آوازیں سنائی دیں۔ ادھر سے فائرنگ بھی شروع ہو گئی تھی۔ ہم دونوں دوڑتے چلے گئے۔ ہم سیندھیا کی جھونپڑی کی طرف دوڑ رہے تھے۔ وہاں سے ہمیں خونی جنگل میں داخل ہونا تھا کیونکہ خونی جنگل سے باہر نکلنے کا وہی ایک قریبی اور آسان راستہ تھا۔ مندر کی طرف سے اوپر تلے چار زبردست دھماکے ہوئے۔ مندر کے آگے ہم نے جو بارودی سرنگیں بچھائی ہوئی تھیں انہوں نے پھٹ کر چار سپیرے فوجیوں کو اڑا دیا تھا۔ ابھی ان ٹائم بموں کے دھماکے نہیں ہوئے تھے جو ہم نے مندر اور آشرم کی دیواروں میں لگائے تھے۔ ان کے پھٹنے میں میرے اندازے کے مطابق دس پندرہ منٹ ہی رہ گئے تھے۔ ہم خونی جنگل کے اندھیرے میں تیز تیز چل رہے تھے۔ پیچھے سے سٹین گن کے برسٹ آ رہے تھے مگر ان کی بوچھاڑیں درختوں کے اوپر اور دائیں

بائیں پڑ رہی تھیں۔

میں نے کمانڈو خالد کو فائر کرنے سے منع کر دیا۔ ہمارے فائر کے دھماکے دشمن کو ہماری سمت بتا سکتے تھے۔ مجھے کمانڈو خالد کو اپنے ساتھ لگا کر تیز تیز قدم چلنا پڑ رہا تھا تاکہ وہ میرے جسم کی بو کی وجہ سے سانپوں اور آدم خور درختوں کی ٹہنیوں سے بچ سکے۔ ہم جب دلدلی جوہڑ کے قریب پہنچے تو اچانک سامنے سے بن مانس نکل کر سامنے آ گیا۔ اس نے ہم پر حملہ تو نہ کیا لیکن ہمارا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ کمانڈو خالد نے برسٹ مار کر اسے گرا دیا۔ برسٹ کے دھماکے جنگل میں گونجے تو ہمارے پیچھے فائر آنا شروع ہو گیا۔ سپیرے فوجیوں کو ہماری فائرنگ نے بتا دیا تھا کہ ہم جنگل میں کس طرف ہیں۔ اس کے بعد اچانک خوفناک دھماکوں سے زمین ہلنے لگی۔ یہ ہمارے لگائے ہوئے ڈائنامائیٹ کے دھماکے تھے۔ یہ اس قدر زبردست تھے کہ جنگل میں زلزلہ سا آ گیا۔ دور مندر کی طرف سے واویلا کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر یہ چیخ و پکار دھیما پڑتا گیا۔

اب ہم پر پیچھے سے فائرنگ نہیں ہو رہی تھی۔ ہمارے لگائے ہوئے بموں کے دھماکوں نے ناگ مندر اور آشرم کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ ہم خونی جنگل سے نکل آئے تھے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ہماری دائیں جانب آسمان پر روشنیوں کی چمک پڑ رہی تھی۔ یقیناً" آشرم اور مندر کے در و دیوار آگ کی لپیٹ میں تھے۔ خونی جنگل کی سرحد پار کرنے کے بعد ہم رکے نہیں بلکہ تاریکی میں ڈوبے ہوئے ویران میدان میں تیز تیز چلتے چلے گئے۔ جب ہم چوکھبا گاؤں کے باہر کھیتوں کے کنارے جوگن ملیا دیوی کی کٹیا کے پاس پہنچے تو یہاں ہمارے مجاہد ساتھی بھی ہمیں مل گئے۔ ہمارے پاس چار دستی بم ابھی موجود تھے۔ کمانڈو خالد نے انہیں کہا۔

"یہاں سے ہمیں اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچنا ہے۔ تم فوراً" روانہ ہو جاؤ۔ ہم تمہارے بعد آئیں گے۔"

مجاہد اسی وقت گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی کی طرف چل دیے۔ میں اور

کمانڈو خالد جوگن کی کٹیا کے باہر بیٹھ گئے۔ ہم نے جوگن کے مٹکے میں سے پانی پیا اور خونی جنگل کے جنوب کی طرف آسمان کو تکنے لگے جہاں شعلوں کی چمک پڑ رہی تھی۔

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"کرم داد! ہمارا مشن خدا کے فضل و کرم سے کامیاب رہا۔"

میں نے کہا۔

"میں نے اس شیطان کو اس کے ساتھیوں سمیت جہنم میں پہنچا دیا ہے۔"

کمانڈو خالد نے اندھیرے میں میری طرف اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک تم انسانی شکل میں ہی ہو۔"

"اللہ کرے کہ اب میں ایسا ہی رہوں کیونکہ اگلا مشن زیادہ خطرناک اور نازک ہے۔ یہ تو جنگل کا مشن تھا' اگلا مشن بھارت کے بڑے شہر کلکتے میں شروع ہونے والا ہے۔ وہاں ہمارا مقابلہ مافیا کے چھپے ہوئے جرائم پیشہ قاتلوں سے ہوگا۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"ہم انشاء اللہ اس میں بھی کامیاب ہوں گے۔"

ہم نے ہینڈ گرنیڈ اور سٹین گنیں مجاہدوں کے حوالے کر دی تھیں جو تھیلے میں ڈال کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ہمارے پاس صرف ایک ایک پستول اور کمانڈو چاقو ہی تھے۔ خالد بولا۔

"میرا خیال ہے پو پھٹنے والی ہے۔ ہمیں اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

ہم اٹھے اور چوکھمبا گاؤں سے ذرا پرے ہو کر آگے چل دیے۔

اس وقت آسمان پر ایک بار پھر بادل چھانے لگے تھے۔ جس وقت ہم بھوپال شہر کے مضافات میں پہنچے تو بارش شروع ہوگئی۔ بادل کالے سیاہ تھے۔ بارش موسلادھار ہو رہی تھی۔ ہم شہر کے باہر سے گزرنے والی سڑک کے کنارے ایک جگہ درختوں کے نیچے بیٹھ گئے۔ بارش موسلادھار ہونے کی وجہ سے درختوں میں سے پانی ٹپک ٹپک کر ہم پر گر رہا تھا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہاں سے ہمیں کس طرف جانا ہوگا۔ شہر کی

عمارتیں اور ٹیلے پر پرانے قلعے کی عمارت دور سے نظر آ رہی تھی۔ سڑک پر بارش کی وجہ سے کسی کسی وقت کوئی موٹر یا رکشا گزرتا تھا۔ تین موٹر رکشا گزرے۔ ان میں کوئی خالی نہیں تھا۔ میں نے کمانڈو خالد سے پوچھا کہ ہمیں کس طرف جانا ہوگا۔ اس نے دائیں جانب اشارہ کیا۔

"ہمیں ان درختوں کے پیچھے سے نکل کر پرانے قلعے کی طرف جانا ہے۔"

میں نے اسے کہا۔

"سردی تو بالکل نہیں ہے۔ کیوں نہ ہم بارش میں ہی روانہ ہو جائیں' یہاں ہمارا زیادہ دیر بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔"

کمانڈو خالد اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

ہم درختوں کے نیچے سے نکل کر سڑک کے کنارے کنارے چل پڑے۔ ہم نے اپنی جیکٹوں کے کالر اوپر کر لیے تھے مگر بارش اتنی موسلادھار تھی کہ ہم تھوڑی دیر میں ہی شرابور ہوگئے۔ مگر ہم چلتے گئے۔ پیچھے سے ایک گاڑی آئی اور ہمارے قریب سے گزر گئی۔ ذرا آگے جا کر وہ رک گئی۔ ہم اس کے قریب سے گزرنے لگے تو اگلی سیٹ کا دروازہ کھل گیا۔ یہ پرانے ماڈل کی بڑی گاڑی تھی۔ اندر سے کسی مرد نے آواز دے کر کہا۔

"اندر آ جائیے۔ آپ کو جہاں جانا ہے پہنچا دوں گا۔"

کمانڈو خالد نے آہستہ سے کہا۔

"شکریہ! ہمیں قریب ہی جانا ہے۔"

میں گاڑی میں داخل ہوگیا۔

"آ جاؤ خان صاحب۔"

میں نے خالد کو خان صاحب کہہ کر پکارا۔ وہ ذرا ہچکچایا۔ پھر اندر داخل ہو کر میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ڈرائیور گاڑی کا مالک لگتا تھا۔ پکی عمر کا چوڑے ہڈ کاٹھ کا آدمی

تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ بڑا وضع دار لگتا تھا۔ کہنے لگا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے؟"

میں چپ رہا کہ کمانڈو خالد خود ہی بتائے گا۔ خالد نے کہا۔

"پرانے قلعے والے موڑ پر اتار دیجئے گا۔ ہمارا مکان وہاں قریب ہی ہے۔"

موٹر گاڑی بارش میں سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ اس آدمی نے پوچھا۔

"آپ اتنی تیز بارش میں کہاں سے آ رہے ہیں؟"

کمانڈو خالد نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے کہا۔

"ایک دوست سے مل کر آ رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔"

وہ آدمی بولا۔

"میرا نام صولت خان ہے۔ میرا لکڑی کا کاروبار ہے۔ کبھی ہمارے ہاں ضرور تشریف لائیں۔ یہ میرا کارڈ ہے۔"

اس نے ڈیش بورڈ میں سے کارڈ نکال کر مجھے دیا۔ پھر پوچھا۔

"آپ لوگ کیا کام کرتے ہیں؟"

کمانڈو خالد بالکل خاموش تھا۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

"میں میونسپل کمیٹی بھوپال میں کلرک ہوں۔ یہ میرا دوست ہے اس کی منیاری کی دکان ہے۔"

اس کے بعد صولت خان نے کوئی بات نہ کی۔ شاید ہم اس کے مطلب کے آدمی نہیں نکلے تھے۔ سڑک پر پرانے قلعے کا موڑ آیا تو انہوں نے گاڑی ایک طرف کر کے کھڑی کر دی۔ بارش کا زور کچھ ٹوٹ چکا تھا۔ ہم شکریہ ادا کر کے گاڑی سے اتر گئے۔

جب گاڑی آگے نکل گئی تو کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"کرم داد! تمہیں زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ یہ شخص کوئی ریٹائرڈ پولیس افسر لگتا تھا۔"

میں نے کہا۔

"میں نے کوئی فالتو بات نہیں کی تھی۔ اس نے سوال پوچھا میں نے محفوظ رہ کر مختصر سا جواب دے دیا۔"

ہم کھیتوں میں پرانے قلعے کی طرف چل رہے تھے۔ کمانڈو خالد بولا۔

"دراصل ہمیں یہاں بے حد محتاط ہو کر رہنا پڑتا ہے۔ ہماری تحریک انتہائی خفیہ بھی ہے لیکن ہم باہر عام لوگوں میں چلتے پھرتے رہتے ہیں ہمیں ایسا کرنا پڑتا ہے۔"

"کیا تمہیں پکڑے جانے کا ڈر نہیں ہے؟"

وہ بولا۔

"بھوپال کی پولیس یا انٹیلی جینس ہماری جماعت کے کسی آدمی کو ابھی تک نہیں پکڑ سکی۔ اس وجہ سے ان کے پاس ہماری کوئی شناخت نہیں ہے اور وہ ہم میں سے کسی کو نہیں پہچان سکتے۔ پھر بھی ہم دن کے وقت کم ہی باہر نکلتے ہیں۔ ہمارے مجاہد بھوپال شہر میں مختلف جگہوں پر ملازم ہیں۔ لیکن کسی کو ان کے بارے میں علم نہیں کہ وہ ہماری زیر زمین جماعت کے ممبر ہیں۔"

اسی طرح ہم باتیں کرتے ایک چھوٹی سی آبادی کے قریب سے گزر گئے۔ بارش اب رک گئی تھی۔ آبادی سے کچھ فاصلے پر بائیں جانب پرانے قلعے کے کھنڈر نظر آنے لگے۔ میں نے انہیں پہچان لیا۔ ان کھنڈروں میں ہی ہمیں جانا تھا اور ان کے نیچے کمانڈو خالد اور اس کے مجاہدوں کی خفیہ کمین گاہ تھی۔ قلعے سے پہلے ایک چھوٹا سا ویران ٹیلہ تھا جس پر کیکر کے درخت اور جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ٹیلے کے قریب بارہ دری کا کھنڈر تھا۔ بارہ دری سے چند قدم پیچھے کمانڈو خالد رک گیا۔ اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ وہاں بٹھا لیا۔ اگرچہ آسمان کالے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا مگر یہ دن کا وقت تھا اور کافی روشنی تھی۔

اس کی عقابی نظریں بارہ دری کے آس پاس کے علاقے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ وہاں اور کوئی دوسرا انسان نہیں ہے تو کہنے لگا۔

"میرے پیچھے آ جاؤ۔"

ہم بارہ دری کے قریب سے ہو کر ٹیلے کی طرف نکل گئے۔ یہاں وہی گڑھا تھا جس میں سے بارش کا پانی ایک جانب نالے کی شکل میں باہر نکل رہا تھا۔ ہم گڑھے میں اتر گئے اور جھاڑیوں کو ہٹا کر خفیہ کمین گاہ کے شگاف میں سے غار میں داخل ہو گئے۔ ہمارے مجاہد ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ کمانڈو خالد نے اس وقت اپنے ایک مجاہد کے ہاتھ میری بیوی جمیلہ کو پیغام پہنچا دیا کہ ہم اپنا مشن کامیابی سے مکمل کر کے خیریت سے واپس آ گئے ہیں۔ اس سے میری بھی تسلی ہو گئی۔ ہم نے کھانا کھایا اور سو گئے۔ ساری رات کے جاگے اور تھکے ہوئے تھے۔ جب جاگے تو رات ہو گئی تھی۔

کمانڈو خالد نے چائے بنوائی۔ ہم چائے پیتے ہوئے اپنے اگلے مشن کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"کمانڈر! میں کلکتے مکتی باہنی والوں کو ٹھکانے لگانے سے پہلے دلی میں شری راج کو ٹھکانے لگانا چاہتا ہوں۔ اس شخص نے میری بیوی کو کلکتے سے خریدا تھا اور اس کو اپنے گورو دیو گری کو تحفے کے طور پر پیش کیا تھا۔ میں اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔"

کمانڈر خالد خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ کہنے لگا۔

"یہ شری راج دلی میں کس جگہ رہتا ہے؟"

میں نے اسے اس کی عالی شان کوٹھی کا حدود اربعہ بتایا اور کہا۔

"میرے محسن مشتاق علی صاحب اس مشن میں ہمیں گائیڈ کریں گے۔ ان کا ایک آدمی شری راج کے گینگ میں کام کرتا ہے۔ اس کی مدد سے ہمارے ہاتھ شری راج کی گردن تک پہنچ سکتے ہیں۔"

کمانڈو خالد نے بڑی عقل مندی کی بات کی۔ کہنے لگا۔

"کرم داد! میرا نہیں خیال کہ مشتاق علی صاحب ہماری مدد کریں گے جیسا کہ تم نے بتایا ہے کہ دلی میں ان کا ہوٹل کا کاروبار ہے۔ سب لوگوں سے ان کے تعلقات ہیں۔ وہ شری راج کے گینگ سے دشمنی لینے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔"

میں نے سوچا کہ کمانڈو خالد نے کوئی غلط بات نہیں کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے مجھے اور میری بیوی کو پناہ دی تھی اور ہماری ہر طرح سے مدد کی تھی لیکن انہیں معلوم تھا کہ ہم ایک روز وہاں سے کلکتے کی طرف جانے والے ہیں۔ شری راج کے معاملے میں ہو سکتا ہے وہ اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔ میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"پھر تم کیا مشورہ دیتے ہو؟ یہ بات طے ہے کہ میں شری راج کو کسی حالت میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

خالد چینک میں سے اپنی پیالی میں چائے انڈیل رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"تمہارا یہ فیصلہ حق بجانب ہے اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ ہمیں مشتاق علی صاحب سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے اپنے طور پر کرنا چاہیے۔ مشتاق علی صاحب کو ہم کچھ نہیں بتائیں گے۔ ان کے پاس ٹھہریں گے اور کسی بہانے تم ان سے شری راج کے معمولات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو گے"

کمانڈو خالد کا مشورہ مجھے پسند آیا۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے ہم ایسا ہی کریں گے۔"

وہ بولا۔

"تم انہیں میرا تعارف اس طرح کراؤ گے کہ یہ میرا دوست علی اکبر ہے۔ تم انہیں یہ بھی نہیں بتاؤ گے کہ تمہیں تمہاری بیوی جمیلہ مل گئی ہے۔ مہا دیو آشرم کے کمانڈو مشن کے سلسلے میں بھی کوئی بات نہیں کرو گے۔ انہیں یہی کہنا کہ علی اکبر کے ذریعے مجھے معلوم ہوا ہے کہ میری بیوی شری راج کے پاس ہی ہے۔ اس نے سنتھا دلی کے گورو دیو گری سے واپس منگوا لیا ہے اور دلی میں ہی کسی خفیہ جگہ پر رکھا ہوا ہے۔ باقی مشتاق علی صاحب کو میں خود ہی بتاؤں گا کہ میں تمہارے ساتھ بھوپال سے دلی کیوں آیا ہوں۔"

یہ ساری باتیں طے کرنے کے بعد ہم نے دلی مشن کے پروگرام پر غور شروع کر

دیا۔ میں نے خالد سے کہا۔

"ہمیں کتنے مجاہد اپنے ساتھ لے جانے ہوں گے؟"

کمانڈو خالد نے مسکرا کر کہا۔

"یہاں سے ہمیں ایک بھی آدمی لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دلی میں ہمارے مجاہد موجود ہیں۔ وہ ہماری مدد کریں گے۔ ہماری خفیہ جماعت کے کارکن بھارت کے ہر بڑے شہر میں موجود ہیں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"

یہ پروگرام بنا کہ ہم اگلے روز شام کی گاڑی سے دلی روانہ ہو جائیں گے۔ کمانڈو خالد نے کہا کہ ہمیں اپنے ساتھ کسی قسم کا اسلحہ وغیرہ لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں جس قسم کے اسلحہ کی ضرورت پڑی دلی کے مجاہد ہمیں مہیا کر دیں گے۔ اگلے روز جمیلہ مجھ سے ملنے خفیہ کمین گاہ پر آئی۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا تھا۔ یہ جان کر اسے اور بھی خوشی ہوئی کہ اتنے دن گزر جانے کے باوجود مجھ پر سانپ کی شکل اختیار کر جانے کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"جمیلہ! لگتا ہے کہ اللہ میاں نے میرے گناہ معاف کر دیے ہیں۔ اب انشاء اللہ میں اپنی اصلی شکل میں ہی زندہ رہوں گا۔"

وہ بولی۔

"میں تو دن رات یہی دعائیں مانگتی رہی ہوں کہ خدا ہمارے گناہ بخش دے اور ہم جلدی واپس پاکستان پہنچ جائیں۔"

پھر کہنے لگی۔

"تم نے دیو گری اور مہا دیو کو ہلاک کر کے میرے سینے میں ٹھنڈ ڈال دی ہے۔ اب ہمیں پاکستان روانہ ہو جانا چاہیے۔"

اس وقت ہم دونوں اکیلے تھے۔ کمانڈو خالد ہمارے پاس نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"جمیلہ! ابھی میرے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ ابھی مجھے کچھ اور لوگوں

سے بھی اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا ہے' جنھوں نے تمہیں ڈھاکہ سے اغوا کیا۔ کلکتے کے بازار میں فروخت کیا۔ ان لوگوں کو بھی ٹھکانے لگانا ہے جنھوں نے تمہیں کلکتے کے بازار سے خریدا اور میری عزت اور غیرت سے کھیلتے رہے۔"

جمیلہ نے سر جھکا لیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگی۔

"کرم داد! تم ایک غیرت مند اور بہادر مرد ہو۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ میں خوش ہوں کہ تم میرے خاوند ہو لیکن میری جان—— یہ پردیس کا معاملہ ہے اور پھر ہم دشمن ملک میں ہیں۔ تمہارے پیچھے بھارت کی پولیس اور انٹیلی جینس والے لگے ہوئے ہیں۔ تم کسی بھی جگہ کسی بھی وقت پکڑے جا سکتے ہو۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر شاید ہم کبھی پاکستان نہ پہنچ سکیں گے۔"

میں نے جمیلہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"میری جان! خدا پر بھروسہ رکھو۔ جس طرح اس نے اب تک ہماری حفاظت کی ہے' اسی طرح وہ آگے بھی ہماری حفاظت کرے گا۔ لیکن اتنا ضرور یاد رکھنا کہ اگر میں اپنی عزت کے لٹیروں سے انتقام لیے بغیر یہاں سے چلا گیا تو میرا ضمیر وہاں مجھے ایک لمحے کے لیے بھی چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ میں خود اپنی نظروں سے گر جاؤں گا۔ کیا اسے گوارا کر لو گی؟"

جمیلہ نے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور کہا۔

"کمانڈو خالد میرے ساتھ ہو گا۔ ہم بہت جلد اپنے مشن میں کامیاب ہو کر واپس آ جائیں گے۔ چار پانچ دنوں کی بات ہے۔ اس کے بعد کمانڈو ہمیں کشمیر کی پہاڑیوں میں سے بھارت کا بارڈر کراس کرا دے گا اور ہم اپنے وطن پاکستان چلے جائیں گے۔"

شام ہونے سے ذرا پہلے جمیلہ واپس کمانڈو خالد کی کزن سسٹر لالہ رخ کے گھر چلی گئی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ وہاں بڑے آرام سے رہ رہی ہے۔ جمیلہ کے جانے

کے بعد میں نے اور کمانڈو خالد نے دلی روانہ ہونے کی تیاری شروع کر دی۔

گاڑی شام کے ساڑھی سات بجے چھوٹتی تھی۔ دلی میں سردی کا موسم تھا۔ مگر مجھے اور خالد کو معلوم تھا کہ کلکتے پہنچنے کے بعد سردی کی شدت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ ہم نے گرم کپڑے نہیں پہنے تھے۔ کمانڈو خالد نے ٹھنڈی جیکٹ کے اوپر ایک گرم چادر لے لی تھی۔ کہنے لگا۔

"یہ چادر میں راستے میں جہاں چاہوں پھینک سکتا ہوں۔"

چادر کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنے آپ کو پولیس اور انٹیلی جینس کی نظروں سے کسی حد تک محفوظ رکھ سکتا تھا۔ اس سے زیادہ مجھے اپنی فکر تھی کیونکہ میں پولیس اور انٹیلی جینس کی نگاہوں میں آ چکا تھا۔ اگرچہ بھارت کے کسی تھانے میں میری تصویر نہیں لگی تھی پھر بھی مشرقی بھارت کی پولیس کے کچھ عہدیداروں کو میری شناخت تھی اور میں ان لوگوں کے علاقے میں ہی جا رہا تھا لیکن میں رک نہیں سکتا تھا۔ میرا جانا ضروری تھا۔ تاہم ہمیں کچھ روز دلی میں بسر کرنے تھے اور شری راج جیسے بدقماش کو ٹھکانے لگانا تھا۔

میں اور خالد دونوں نے اپنے ساتھ کسی مجاہد کو نہیں لیا تھا۔ ہم اکیلے ہی تھے۔ ہم دلی پہنچ گئے۔ دلی کی پولیس کو پہلے ہی سے میری تلاش تھی۔ سٹیشن پر ہم ہر طرح سے چوکنے ہو کر الگ الگ سمت سے باہر نکلے۔ ہم نے ایسی ٹرین پکڑی تھی جو ہمیں رات کے وقت دلی پہنچائے۔ پھر بھی دلی جیسے بڑے شہر اور بھارت کے دارالحکومت میں رات کے وقت بھی ہر طرف روشنیاں ہوتی تھیں اور پولیس جگہ جگہ گشت لگاتی تھی۔ اس کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"ہمیں مشتاق علی کو ٹیلی فون پر اطلاع دینی ہوگی۔"

ہم اس وقت سٹیشن سے باہر کچھ فاصلے پر رکشا ٹیکسی کے اڈے پر کھڑے تھے۔ وہ بولا۔

"کہاں سے فون کرو گے؟"

میں نے کہا۔

"تم اسی جگہ ٹھہرو میں پبلک بوتھ سے فون کر کے ابھی آتا ہوں۔"

پبلک بوتھ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس وقت رات کے دو بجنے والے تھے۔ میں پبلک بوتھ سے مشتاق علی صاحب کے گھر کا نمبر ملایا اور انہیں بتایا کہ میں دلی واپس آگیا ہوں اور میرے ساتھ میرا ایک رازدار دوست بھی ہے۔ وہ نیند بھری آواز میں بولے۔

"میاں! یہ تمہارا دوست کون ہے اور تم نے اسے اپنا رازدار کیوں بنا لیا؟"

میں نے کہا۔

"مشتاق صاحب یہ میری مجبوری تھی۔ مگر آپ کے بارے میں' میں نے اسے صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ آپ میرے محسن ہیں اور میری بیوی کی تلاش میں آپ نے ایک مسلمان ہونے کے ناطے میری مدد کی ہے۔ میرا دوست بڑا سچا مسلمان ہے اور پاکستان سے محبت کرتا ہے۔ آپ اس سے مل کر خوش ہوں گے۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"اس وقت رات کافی ہو گئی ہے۔ تم ایسا کرو کہ رات کسی جگہ گزار لو۔ صبح مجھے ہوٹل پر فون کرنا۔"

میں مشتاق صاحب کی مجبوری کو سمجھتا تھا۔ میں نے کہا۔

"بہت بہتر۔ میں صبح دس گیارہ بجے فون کروں گا۔"

انہیں خدا حافظ کہا اور فون بند کر کے ساری بات آ کر کمانڈو خالد کو بتا دی۔ وہ بولا۔

"فتح پوری مسجد کے چوک میں پنجاب ہوٹل ہے۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل ہے وہیں چل کر ایک کمرہ لے لیتے ہیں۔"

ہم نے رکشا پکڑا اور فتح پوری مسجد کے چوک میں پنجاب ہوٹل کے سامنے اتر گئے۔ یہ ہوٹل ایک پرانی بلڈنگ میں بنا ہوا تھا اور زیادہ مہنگا نہیں تھا۔ ہم نے یہاں

ایک کمرہ لے لیا اور الگ الگ بستروں پر دوہرے کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ دلی میں کافی سردی پڑ رہی تھی۔ ہم نے بتی بجھا دی اور سو گئے۔ صبح صبح میری جاگ کھل گئی۔

مجھے چکر سا آیا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یا اللہ خیر کہیں مجھے دورہ تو نہیں پڑ رہا۔ میں نے دل میں گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگی کہ یا پاک پروردگار مجھے سانپ بننے کے عذاب سے محفوظ رکھنا۔ میں بار بار یہی دعا مانگ رہا تھا۔ چکر ایک بار آ کر رک گیا۔ کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ کمانڈر خالد کمبل سے منہ سر لپیٹے گہری نیند سو رہا تھا۔ روشندانوں میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ دوسری بار پھر چکر آیا۔ میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے اور خدا سے دعائیں مانگنے لگا۔ اس کے بعد ایک اور چکر آیا اور مجھے اپنا جسم ہلکا محسوس ہونے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ میں سانپ کی شکل اختیار کرنے لگا ہوں۔ اس وقت مجھے انسانی شکل کی اشد ضرورت تھی۔ مشتاق علی صاحب کو ساری بات سمجھائی تھی۔ ان کے خاص آدمی کے تعاون سے ہمیں شری راج تک پہنچنا اور اسے اس کے انجام تک پہنچانا تھا۔ میں تو وہیں سجدے میں گر گیا اور عاجزی سے خدا کے حضور دعا مانگنے لگا۔

مجھے یقین ہے کہ یہ میری دعا کا اثر تھا کہ خداوند کریم نے مجھ پر رحم کر دیا اور تیسری بار چکر نہیں آیا اور میرا جسم بھی ہلکا ہونا بند ہو گیا۔ میں نے اپنے سارے جسم کو غور سے دیکھا۔ میں سانپ نہیں بنا تھا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔ اسی دوران کمانڈو خالد بھی اٹھ بیٹھا تھا۔ میں غسل خانے سے باہر نکلا تو اس نے بستر پر سے اٹھتے ہوئے گھڑی دیکھی اور بولا۔

"دن کے دس بج گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں مشتاق صاحب کو فون کر کے آتا ہوں۔"

میں نیچے ہوٹل کے دفتر والے کمرے میں آ گیا۔ کاؤنٹر پر سے مشتاق صاحب کو فون کیا۔ وہ اپنے ہوٹل میں ہی تھے۔ کہنے لگے۔

"میاں! تم کہاں پر ہو؟"

میں نے انہیں بتایا کہ ہم لوگ پنجاب ہوٹل میں ہیں۔ وہ بولے۔

"کمرے کا نمبر بتاؤ۔"

میں نے کمرے کا نمبر بتایا تو بولے۔

"میں پہنچ رہا ہوں' تم کمرے میں رہنا۔"

میں نے واپس آ کر خالد کو بتایا کہ مشتاق صاحب تھوڑی دیر میں پہنچنے والے ہیں۔

وہ بولا۔ "ان کے آنے پر ناشتہ منگوائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"ہم ناشتہ کر لیتے ہیں۔ انہیں شاید کچھ دیر لگ جائے اور پھر وہ ناشتہ کر چکے ہوں گے۔"

میں نے ملازم لڑکے کو بلا کر ناشتہ لانے کو کہا۔ وہ چلا گیا تو کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"مشتاق صاحب آئیں گے تو ان کے ساتھ ایک بار پھر چائے پئیں گے۔"

لڑکا ناشتہ لے آیا۔ یہ پندرہ سولہ برس کا لڑکا تھا۔ اس نے ناشتہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"صاحب آپ لوگ بھوپال سے آئے ہیں کیا؟"

کمانڈو خالد نے اس کی طرف ذرا سا چونک کر دیکھا اور پوچھا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ ہم بھوپال سے آئے ہیں؟"

لڑکا بھولا بھالا سا تھا۔ مسکرا کر کہنے لگا۔

"صاحب! ہمارے مالک کے پاس ایک آدمی بیٹھا تھا۔ آپ فون کر کے اوپر گئے تو اس نے مالک سے کہا تھا کہ یہ لوگ بھوپال سے آئے ہیں۔"

میں نے لڑکے سے پوچھا۔

"اس نے اور کیا کہا تھا تمہارے مالک کو؟"

وہ بولا۔

"صاحب میں نے صرف اتنا ہی سنا تھا۔ اس کے بعد میں ناشتے کی پرچی لے کر اوپر آ گیا۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"وہ آدمی کون تھا؟ کیا وہ اب بھی نیچے تمہارے مالک کے پاس بیٹھا ہے؟"

لڑکا بولا۔

"نہیں صاحب۔ وہ تو چلا گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کیا کام کرتا ہے۔ کبھی کبھی ہمارے مالک کے پاس آیا کرتا ہے اور اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے بھی پیتا ہے۔ سگریٹ بھی پیتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔"

میں نے لڑکے سے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ کوئی ہو گا' ہمیں اس سے کیا۔ تم جاؤ۔"

لڑکا چلا گیا۔ میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"یہ آدمی ضرور انٹیلی جینس کا آدمی ہے۔ میرا تجربہ یہی ہے کہ اس قسم کے درمیانی درجے کے ہوٹلوں میں انٹیلی جینس کے آدمی آتے رہتے ہیں۔"

خالد نے تشویش کے ساتھ کہا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ اسے یہ کیسے پتہ چلا کہ ہم بھوپال سے آئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے اس نے سٹیشن پر ہمیں ریل گاڑی سے اترتے دیکھ لیا ہو۔ جس گاڑی سے ہم آئے ہیں وہ بھوپال ہی سے تیار ہوئی تھی۔"

کمانڈو خالد ٹوسٹ پر جام لگا رہا تھا۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"کرم داد! معاملہ خراب ہوتا لگتا ہے۔ ہمیں اس ہوٹل سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہیے۔"

میں نے کہا۔

"مشتاق صاحب بھی آ رہے ہیں۔ وہ اپنے ہوٹل سے چل پڑے ہوں گے۔ اب

تو ان سے ملنے کے بعد ہی کوئی دوسرا پروگرام بنائیں گے کہ کس جگہ قیام کریں۔ ہو سکتا ہے مشتاق صاحب ہمیں اپنے کواٹر میں لے جائیں۔"

میں نے کمانڈو خالد کو بالکل نہ بتایا کہ مجھ پر شیطانی طاقتوں کا حملہ ہوا تھا لیکن خدا نے مجھے بچا لیا اور میں سانپ بنتے بنتے رہ گیا۔ ہم نے جلدی جلدی ناشتہ کیا۔ اس خیال سے کہ مشتاق صاحب آنے والے تھے اور ہم چاہتے تھے کہ ان سے بھی مختصر بات کریں گے اور اس ہوٹل کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے جائیں گے۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں سمجھا کہ ہوٹل کا ملازم آیا ہے۔ میں نے کہا۔

"آ جاؤ۔"

دروازہ کھلا اور مشتاق صاحب سیاہ گرم اچکن میں ملبوس سر پر گرم ٹوپی اوڑھے اسلام علیکم کہتے ہوئے اندر آ گئے۔ میں نے معذرت کی کہ میں ہوٹل والا لڑکا سمجھا تھا۔ وہ بولے۔

"میاں! ہم بھی ہوٹل والے ہی ہیں۔ بس اب لڑکے نہیں رہے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ کہو کیسے ہو؟"

میں نے کمانڈو خالد کا ان سے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے دوست علی اکبر ہیں۔ بھوپال میں ان کا منیاری کا کاروبار ہے۔ مہا دیو کے ناگ مندر میں جمیلہ کی تلاش کے سلسلے میں انہوں نے میری بڑی مدد کی ہے۔ بلکہ ایک مہم میں تو یہ میرے ساتھ گئے تھے۔"

مشتاق صاحب بیٹھ گئے۔ کہنے لگے۔

"یہ تم نے مجھے کیسے کہہ دیا کہ بھابھی جمیلہ اب دلی میں ہے اور شری راج اسے یہاں لے آیا ہے؟ تمہیں یہ خبر کیسے معلوم ہوئی؟"

میں نے اب جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔

"مشتاق صاحب! یہ خبر ہمیں اس وقت ملی تھی جب ہم مہا دیو کے آشرم میں جمیلہ کی تلاش میں ناکام ہونے کے بعد شری راج کے شیطان گورو کمارگری کے مندر کو جانے

کے لیے جھانسی روانہ ہونے والے تھے۔ ایک خاص آدمی نے ہمیں بتایا کہ گورو دیو گری کو کسی نے قتل کر دیا ہے اور میری بیوی کو شری راج کے اشارے پر ایک آدمی وہاں سے دلی لے گیا ہے۔"

مشتاق صاحب بڑے غور سے میری جھوٹی کہانی سن رہے تھے۔ کہنے لگے۔

"یہ تو معلوم کرنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو لیکن یہ کمار گری کو کس نے قتل کر دیا؟ اخبار میں تو کوئی خبر نہیں چھپی۔"

میں نے کہا۔

"آپ اپنے اس آدمی سے پتہ کریں جو شری راج کے پاس کام کرتا ہے۔"

مشتاق صاحب بولے۔

"یہ تو معلوم کرنا ہی پڑے گا۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"مشتاق صاحب! جس آدمی نے ہمیں یہ خبر دی تھی وہ بڑا قابل اعتبار آدمی ہے اور ہمارا خاص آدمی ہے۔ اس کے علاوہ بھوپال کے ایک مندر میں بھی یہ خبر پھیلی ہوئی تھی کہ سنتھا ولی میں سوامی کمار گری کا خون ہو گیا ہے۔"

یہ بھی جھوٹ تھا۔ مشتاق صاحب ہمارے جھوٹ پر اعتبار کیے جا رہے تھے۔ کہنے لگے۔

"میاں! یہ تو آج ہی معلوم ہو جائے گا مگر سوال یہ ہے کہ بھابھی اگر دلی میں ہے تو اس کا کیسے پتہ چلے گا کہ وہ کہاں ہے۔ جیسا کہ تم نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ شری راج نے جمیلہ بھابھی کو اپنے پاس نہیں رکھا بلکہ کسی خفیہ ٹھکانے پر رکھا ہوا ہے تو اس کے ٹھکانے تک تو کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا۔"

میں نے کہا۔

"یہ ساری باتیں کسی دوسری جگہ بیٹھ کر اطمینان سے کریں گے۔ پہلے ہمیں یہاں سے کسی دوسری جگہ پر لے چلیے۔ کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ یہاں ہمارے پیچھے انٹیلی

جینس والے نہ لگ جائیں۔"

مشتاق صاحب انٹیلی جینس کا نام سن کر ذرا چونکے۔ کہنے لگے۔

"میاں! یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں تمہیں اپنے ہوٹل میں نہیں لے جا سکتا۔ تم وہاں گئے تو شری راج تک یہ خبر پہنچ جائے گی اور وہ نہ صرف یہ کہ تمہیں اغوا کرا دے گا بلکہ ہو سکتا ہے مجھے بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے اور میرے بھائی مجھے تو دلی میں ہی رہنا ہے۔"

میں نے کہا۔

"مشتاق صاحب! میں سب کچھ جانتا ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ میں آپ کے اور کلکتہ والے حاجی فرید صاحب کے احسانوں کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ ہم یہاں سے کسی دوسرے ہوٹل میں بھی نہیں جانا چاہتے۔ ہوٹلوں کے اردگرد سی آئی ڈی والے ضرور منڈلاتے رہتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم آپ کے شہر کے باہر والے کوارٹر میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر جائیں۔"

مشتاق صاحب نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ لوگ وہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ کوارٹر خالی پڑا ہے صرف میرا بوڑھا ملازم ہے وہ وہاں ہوتا ہے۔ لیکن میری شرط وہی ہوگی کہ رات کو آپ لوگ وہاں بجلی کی بتی روشن نہیں کریں گے اور دن کے وقت بھی کوارٹر کے باہر دھوپ میں نہیں بیٹھیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو پتہ چلے کہ میرے کوارٹر میں آپ لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

پھر انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اسلام کے لیے، مسلمانوں کے لیے اور خاص طور پر پاکستان کے لیے میری جان بھی حاضر ہے۔ لیکن ہم بھارت کے مسلمان بڑے نازک حالات میں یہاں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم ہندو حکومت کے جبر مسلسل کی زد میں ہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کے مستقبل کی بھی فکر ہے۔ ہمیں بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ اب تم لوگ ایسا کرو کہ میرا

کواٹر تو تم نے دیکھا ہوا ہے۔"

میں نے کہا۔

"مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا کہ وہ کس جگہ پر ہے۔"

مشتاق صاحب نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔

"پھر ایسا ہے کہ تم لوگ اسی جگہ میرے آدمی کا انتظار کرو۔ میں اسے جاتے ہی بھیج دیتا ہوں۔ وہ تمہیں میرے کواٹر میں پہنچا دے گا۔ میں خود تمہیں ملنے رات کو کسی وقت آؤں گا۔ ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

"شکریے کی کوئی بات نہیں میاں یہ تو میرا فرض ہے جو ادا کر رہا ہوں۔"

انہوں نے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور میرے اصرار پر بھی چائے پینے کے لیے نہ ٹھہرے اور چلے گئے۔

کمانڈو خالد نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"مشتاق علی صاحب بہت مخلص آدمی ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ان کے دل میں مسلمانوں کے لیے محبت اور قربانی کا جذبہ ہے۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"اب ایسا ہے کہ تم کمرے میں ہی ٹھہرو میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں کہ ہوٹل کے مالک کے پاس کون آدمی بیٹھا ہوا ہے۔"

میں نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

"کمانڈر! تمہیں نیچے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوٹل کے ملازم لڑکے کو بلاتا ہوں۔ بلانے کی ضرورت نہیں۔ وہ خالی برتن لینے آنے ہی والا ہوگا۔ اس سے معلوم کریں گے کہ وہ مشکوک آدمی دوبارہ آیا تھا یا نہیں۔ تم مت پوچھنا میں خود اس

سے بات کروں گا۔"

ہم بیٹھ کر شری راج اور سنتھا ولی کے گورو کمار گری کی ہلاکت اور مہا دیو کے آشرم کی تباہی کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے خالد سے کہا۔

"شری راج کو اس کے گورو کمار گری کے قتل کی رپورٹ مل گئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہ دلی سے وہاں گیا ہوا ہو۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"اگر وہاں گیا بھی ہو گا تو وہ ایک روز میں واپس آ جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"چاہے وہ ایک ہفتے میں واپس آئے میں اس کا انتظار کروں گا۔ اسے کیفر کردار تک پہنچائے بغیر میں یہاں سے کلکتے نہیں جاؤں گا۔"

اتنے میں ملازم لڑکا برتن اٹھانے آ گیا۔ میں نے اسے پانچ روپے ٹپ دیئے تو وہ بڑا خوش ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ آدمی تمہارے مالک کے پاس پھر تو نہیں آیا۔"

وہ بولا صاحب! "ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا تھا۔ مالک سے ایک دو منٹ باتیں کرنے کے بعد چلا گیا۔"

میں نے کہا۔

"دفع کرو ہمیں اس سے کیا لینا۔"

یہ میں نے لڑکے پر ظاہر کرنے کے لیے کہا تھا کہ ہمیں تشویش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جب لڑکا چلا گیا تو میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"اس آدمی کا دوبارہ آنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہ انٹیلی جینس کا ہی آدمی ہے۔"

کمانڈو خالد کچھ متفکر ہوا کہنے لگا۔

"مشتاق صاحب کے آدمی کے آنے تک انٹیلی جینس والے کو دوبارہ نہیں آنا چاہیے۔ اگر اس نے ہمیں یہاں سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تو ضرور ہمارا پیچھا کرے گا یا

کسی دوسرے کو ہمارے پیچھے لگا دے گا۔ یہ لوگ بڑے شہروں میں جہاں بھی جاتے ہیں ان کے ساتھ ایک دو پولیس والے ضرور ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"مشتاق صاحب کے آدمی کا انتظار کرنا ضروری ہے۔ ہم یہاں سے کسی دوسری جگہ چلے گئے تو تو....."

کمانڈو خالد نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اب یہ بات خدا پر چھوڑ دو جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

ہم کمرے میں ہی بیٹھے رہے۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

میں نے پوچھا۔ "کون ہے؟"

کسی نے کہا۔

"مجھے مشتاق صاحب نے آپ کو لینے بھیجا ہے۔"

ہماری جان میں جان آ گئی۔ یہ ان کا ڈرائیور تھا جو مجھے پہچانتا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور ہم اس کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ میں نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔ ہوٹل کا مالک اکیلا ہی تھا۔ اس کے پاس کوئی دوسرا آدمی نہیں تھا۔ ہم نے بل ادا کیا اور خاموشی سے باہر نکل گئے۔ گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی مشتاق صاحب کے کوارٹر کی طرف چل پڑی۔ دن کا وقت تھا۔ دلی کے شہر کی سڑکوں پر ٹریفک زور و شور سے جاری تھی۔ پرانی د کے علاقے سے نکل کر گاڑی ایک نسبتاً غیر آباد سڑک پر دوڑنے لگی۔ دیر تک ہم دلی شہر کے مضافات کی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے ایک نالے کے پل پر سے گزرے تو میں نے نالے کو پہچان لیا۔ یہ وہی نالہ تھا جس کی ایک جانب مشتاق صاحب کا کوارٹر تھا۔ مگر یہ کوارٹر نالے کے دوسرے پل کے پاس تھا جہاں اردگرد کوئی آبادی نہیں تھی۔

گاڑی اسی کوارٹر کے آگے جا کر رک گئی۔ جہاں میں اور جمیلہ پہلی بار اترے تھے اور جہاں سے سپیرے نے اسے اغوا کیا تھا۔ بوڑھا ملازم وہاں موجود تھا۔ اس نے مجھے

سلام کیا۔ میں نے اس کا حال وغیرہ پوچھا۔ ہمارے پاس کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا۔ صرف ایک چمڑے کا سفری تھیلا کمانڈو خالد کے پاس تھا جس میں دو چار کپڑے اور تولیہ وغیرہ تھا۔ ڈرائیور گاڑی لے کر واپس چلا گیا۔ بوڑھے ملازم نے ہمیں چائے بنا کر دی۔ ہم نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا لی۔ مشتاق صاحب نے ہمیں اس بات کی خاص طور پر ہدایت کی تھی۔ کمانڈو خالد نے میری طرف غور سے دیکھ کر کہا۔

"کرم واد! تمہیں کوئی چکر وکر تو نہیں آ رہے ہیں؟"

اس کا مطلب تھا کہ کہیں مجھ پر سانپ کی شکل اختیار کرنے کا دورہ تو نہیں پڑنے والا۔ میں نے کہا۔

"خدا کے لیے کمانڈر اس کا نام نہ لو۔ ابھی تک تو اللہ کا کرم ہے۔ میرا خیال ہے یہ بلا میرے سر سے ٹل گئی ہے۔"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ اگرچہ تم سانپ کے روپ میں بڑی آسانی سے شری راج کو ختم کر سکتے ہو مگر میں تمہیں سانپ کی شکل میں ہرگز نہیں دیکھنا چاہتا۔"

دوپہر کو ہم نے کمرے میں ہی بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہم پھر باتیں کرنے لگے۔ کمانڈو خالد بولا۔

"ہم مشتاق صاحب کے ساتھ دوہری گیم کھیل رہے ہیں۔ ہمیں اپنی باتوں میں بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ مشتاق صاحب کو ہم نے یہ تاثر دیا ہے کہ تمہاری بیوی جمیلہ بھابھی کو شری راج دلی لے آیا ہے اور ہم اسی کی تلاش میں آئے ہوئے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم شری راج کو قتل کرنے آئے ہیں۔ ہمیں اپنی گفتگو میں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔

"مشتاق صاحب کو اصل حقیقت کی خبر نہیں لگنے دیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔"

کمانڈو خالد نے پوچھا۔

"مشتاق صاحب کا جو آدمی شری راج کے گینگ میں کام کرتا ہے ہمیں اس سے

رابطہ قائم کرنا ہوگا۔ کیونکہ شری راج کی روزمرہ کی مصروفیات اور معمولات کے بارے میں وہی آدمی صحیح اطلاع فراہم کر سکے گا۔"

میں نے کہا۔

"میں اس آدمی سے ایک بار مشتاق صاحب کے ہوٹل میں مل چکا ہوں۔ وہ مُسلمان ہے اور اسے معلوم ہے کہ شری راج نے میری بیوی کو اغوا کرنے کے بعد تحفے کے طور پر اپنے گور کمار گری کو دی ہوئی ہے۔"

خالد بولا۔

"کیا اس آدمی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"ہمیں اس پر بھروسہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ ہمیں تو اس سے کسی بہانے شری راج کی صبح و شام کی مصروفیات کے بارے میں ہی معلوم کرنا ہوگا تاکہ ہم یہ طے کر سکیں کہ اس پر کس جگہ اور کس وقت قاتلانہ حملہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ہمارا مشن ختم ہو جائے گا اور ہم یہاں سے کلکتے کی طرف نکل چلیں گے۔"

رات کو مشتاق صاحب بھی آگئے۔ انہوں نے آتے ہی بتایا کہ کسی نے شری راج کے گورودیو کمارگری کو قتل کر کے ان کے مندر اور آشرم کو بموں سے اڑا دیا ہے اور شری راج وہیں گیا ہوا ہے۔ ہم نے مصنوعی حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ کب ہوا اور کیسے ہوا؟"

مشتاق صاحب بولے۔

"ابھی کچھ پتہ نہیں چلا کہ یہ کام کس نے کیا ہے۔ میرے آدمی نے جو شری راج کے ہاں ملازم ہے صرف اتنا ہی بتایا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"شری راج آپ کے خیال میں کب واپس آئے گا؟"

وہ کہنے لگے۔

"اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

ہم لوگ مشتاق صاحب کے خاص آدمی سے رابطہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔

"مشتاق صاحب اب جبکہ شری راج دلی میں نہیں ہے تو ہمیں جمیلہ کا سراغ لگانے میں نسبتاً آسانی ہوگی لیکن اس کے لیے آپ کے آدمی سے ملنا بہت ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے اسے معلوم ہو کہ شری راج نے میری بیوی کو دلی میں کس جگہ چھپا رکھا ہے۔"

مشتاق صاحب سیدھے سادے آدمی تھے۔ کہنے لگے۔

"ہاں میاں صرف رستم ہی اس بارے میں کچھ بتا سکے گا کیونکہ شری راج کو اس پر بڑا بھروسہ ہے۔"

رستم اس آدمی کا نام تھا جو مشتاق صاحب کا دوست تھا اور جو شری راج کے پاس ملازم تھا۔ کمانڈو خالد بولا۔

"کیا آج رات یا کل کسی وقت رستم سے ملاقات ہو سکتی ہے۔"

مشتاق صاحب نے کہا۔

"کچھ پتہ نہیں رستم کو شری راج اپنے ساتھ ہی گورو دیو کے کریا کرم کرنے لے گیا ہو۔ یہ میں تمہیں کل ہی بتا سکوں گا۔"

مشتاق صاحب کے جانے کے بعد ہم دونوں اپنی سکیم تیار کرنے میں لگے رہے۔ پھر سو گئے۔ دوسرا دن نکل آیا۔ کمرے میں ٹھنڈ تھی۔ کوارٹر کے پیچھے جو ویران گراؤنڈ تھی، وہاں دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں اور کمانڈو خالد کوارٹر کی عقبی دیوار کے ساتھ چارپائی ڈال کر دھوپ میں بیٹھ گئے۔ دور سے مجھے وہ ویران کھنڈر نظر آ رہا تھا۔ جس کے تہہ خانے میں میں نے بھارتی انٹیلی جینس کے آدمی کو قتل کر کے پھینکا تھا۔ خدا جانے اس کا کیا بنا تھا۔ اب تو اس کی وہاں صرف ہڈیاں ہی رہ گئی ہوں گی۔ میں نے

اس کے متعلق کمانڈو خالد سے کوئی بات نہ کی۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کچھ دیر دھوپ میں بیٹھنے کے بعد ہم واپس کوارٹر میں آگئے۔ رات کے پہلے پہر مشتاق صاحب اپنی گاڑی میں آ گئے۔

انہوں نے بتایا کہ رستم شری راج کے ساتھ نہیں گیا۔ وہ دلی میں شری راج کے بنگلے پر ہی ہے۔ ہمیں یہ سن کر اطمینان ہوا۔ مشتاق صاحب بولے۔

"اسے یہ جگہ معلوم ہے۔ وہ کل صبح تمہیں ملنے یہاں آئے گا۔"

پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولے۔

"میاں کرم داد! تم تو رستم کی شکل پہنچانتے ہو ناں۔ تم اس سے مل چکے ہو؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ میں اسے پہچان لوں گا۔"

"بس وہ کل نو دس بجے یہاں پہنچ جائے گا۔ تم خود اس سے جو باتیں کرنی ہیں کر لینا۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا کہ اس کے ساتھ میرے بارے میں کوئی غیر ضروری بات نہ کرنا۔ ہو سکتا ہے اسے جمیلہ بھابھی کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔"

میں نے کہا۔

"آپ اطمینان رکھیں ہم آپ کے بارے میں اس سے کوئی بات نہیں کریں گے۔"

تھوڑی دیر بیٹھ کر مشتاق صاحب چلے گئے۔

اگلے دن پورے دس بجے رستم آگیا۔ میں نے کمانڈو خالد سے اس کا تعارف کروا دیا۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے ہمیں ملا۔ مشتاق صاحب نے اسے بتا دیا ہوا تھا کہ ہم جمیلہ کی تلاش میں دلی آئے ہیں جس کو شری راج نے کسی خفیہ جگہ پر چھپا رکھا ہے۔ رستم نے بات شروع کرتے ہی کہا۔

"جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے جمیلہ بی بی شری راج کے پاس نہیں ہے۔ اسے تو شری راج نے اپنے گورو دیو گری کو دے دیا تھا اور گورو دیو کا کسی نے خون کر

دیا ہے۔ شری راج وہاں اپنے گورو کا کریا کرم کرنے گیا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ جمیلہ بھابی کو وہاں سے ساتھ ہی لیتا آئے۔"

ہمیں جمیلہ کے بارے میں مزید باتیں کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ ہمارا ٹارگٹ شری راج تھا جمیلہ نہیں تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں شری راج کریا کرم کے بعد دلی کب واپس آئے گا۔ کیونکہ اس کے آنے کے بعد ہی ہمیں جمیلہ کے بارے میں کچھ پتہ چل سکے گا۔ ہو سکتا ہے وہ اسے ساتھ ہی لیتا آئے۔"

رستم اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا۔

"ہو سکتا ہے وہ جمیلہ بھابی کو ساتھ ہی لے آئے لیکن آپ کا جمیلہ بھابی تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شری راج اسے اپنے بنگلے پر ہی رکھے گا اور وہاں دن رات گارڈز کا پہرہ ہوتا ہے۔ وہاں تو باہر سے کوئی چڑیا بھی اڑ کر نہیں آ سکتی۔"

ہمیں صرف شری راج کے معمولات سے غرض تھی۔ جمیلہ تو پہلے ہی سے ہمارے پاس تھی۔ میں نے رستم سے کہا۔

"رستم بھائی! جمیلہ میری بیوی ہے۔ میں اسے واپس لانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا۔ تم ہماری اتنی مدد کرو کہ ہمیں صرف یہ بتا دو کہ شری راج کس وقت اپنے بنگلے پر ہوتا ہے کس وقت نہیں ہوتا۔ رات کو کس وقت سو جاتا ہے۔ باقی کام ہم خود ہی کرلیں گے۔"

وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "اب یہ باتیں تو شری راج کے دلی آنے پر ہی میں بتا سکوں گا۔ ویسے وہ رات کو دو تین بجے ہی سوتا ہے۔ رات گئے تک اس کے ہاں لوگ پینے پلانے میں مصروف رہتے ہیں اور صبح ایک بجے سے پہلے نہیں اٹھتا۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"رستم بھائی! تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ جمیلہ بھابی کرم داد کی منکوحہ بیوی ہے اور اس بدمعاش شری راج نے اسے زبردستی اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ کرم داد ہمارا مسلمان

بھائی ہے اور پاکستانی ہے۔ اس کی مدد ہمارا فرض ہے۔"
رستم کہنے لگا۔
"مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں ضرور کروں گا لیکن میری کچھ مجبوریاں بھی ہیں۔ میں ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کو مجھ سے وعدہ کرنا ہو گا کہ آپ کسی کے آگے میرا نام نہیں لیں گے۔ میرے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔"

میں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔
"رستم بھائی! ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ چاہے کچھ ہو جائے ہم پر کیسی ہی مصیبت کیوں نہ آن پڑے، ہماری زبان پر تمہارا نام نہیں آئے گا۔"
رستم مطمئن نظر آنے لگا۔ بولا۔
"اب ایسا ہے کہ جیسے ہی شری راج اپنے گورو دیو گری کا کریا کرم کر کے دلی واپس آیا میں آپ کو خود یہاں آکر اطلاع کر دوں گا کہ وہ اکیلا آیا ہے یا جمیلہ بھابی کو بھی ساتھ لے کر آیا ہے۔"
ہم نے رستم کا شکریہ ادا کیا۔ وہ چلا گیا۔
مشتاق صاحب کے دور افتادہ اور دلی شہر سے دور واقع کوارٹر میں ہمیں تین دن گزر گئے۔ اس دوران وہاں کوئی مشکوک آدمی منڈلاتا نظر نہ آیا۔ میں بھی انسانی شکل میں ہی رہا۔ کسی وقت بہت حیران ہوتا اور خدا کا شکر ادا کرتا کہ مجھ پر دورہ نہیں پڑا اور میں انسان کی شکل میں ہی قائم ہوں۔ مجھے کچھ یقین سا ہونے لگا کہ اس مصیبت سے مجھے واقعی نجات مل گئی ہے۔ اس دوران دو بار مشتاق صاحب رات کو ہمیں آکر مل گئے۔ رستم دوبارہ ہمارے پاس نہیں آیا تھا۔ چوتھے روز مشتاق صاحب آئے تو انہوں نے بتایا کہ شری راج دلی واپس آگیا ہے۔
"مگر یہ معلوم نہیں کہ جمیلہ بھابی کو بھی وہاں سے اپنے ساتھ لایا ہے یا نہیں۔ اس بارے میں رستم ہی بتا سکے گا۔"

میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ان کی رستم سے کوئی بات ہوئی ہے۔ تو مشتاق صاحب نے کہا۔

"کل کسی وقت اس سے بات کرنے کی کوشش کروں گا۔ بہرحال جیسے بھی حالات ہوئے میں کل اسے رات کو تمہارے پاس بھیجوں گا۔"

دوسرے روز رات کے وقت رستم بھی آ گیا۔ کہنے لگا۔

"شری راج دلی آ گیا ہے مگر جمیلہ بھابی اس کے ساتھ نہیں ہے۔"

ہمیں تو معلوم تھا کہ جمیلہ اس کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ جمیلہ تو بھوپال میں کمانڈو خالد کی کزن لالہ رخ کے ہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ ہم نے پریشان ہونے کی اداکاری کی اور میں نے مصنوعی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے رستم سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں شری راج جمیلہ کو ساتھ کیوں نہیں لایا جبکہ اس کا گورو بھی مر چکا ہے اور جیسا کہ ہم نے سنا ہے وہاں گورو کا آشرم بھی جل کر راکھ ہو گیا ہے۔"

رستم سر کو نفی میں ہلا کر بولا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے شری راج نے جمیلہ کو کسی دوسری جگہ بھیج دیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اسے ساتھ لایا ہو مگر اسے کسی خفیہ جگہ پر رکھا ہو۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"اسے جمیلہ کے بارے میں اتنی رازداری کی کیا ضرورت ہے۔"

رستم کہنے لگا۔

"بات یہ ہے کہ جمیلہ پاکستانی خاتون ہے۔ اگرچہ یہاں کی پولیس میں شری راج کا بڑا اثر رسوخ ہے اور وہ دلی کے تمام تھانوں میں ہر ماہ ایک خاص رقم تقسیم کرتا ہے۔ پھر بھی جہاں تک میرا خیال ہے جمیلہ کے بارے میں شری راج نہیں چاہتا کہ کسی کو پتہ چلے کہ وہ اس کے پاس ہے۔ اس معاملے میں اس نے ہمیشہ راز داری برتی ہے۔"

میں نے رستم سے کہا۔

"رستم بھائی! تم ہماری صرف اتنی مدد کرو کہ ہمیں یہ بتا دو کہ شری راج کے بنگلے

کا حدود اربعہ کیا ہے اور وہاں رات کے وقت کسی خفیہ راستے سے بنگلے میں داخل ہوا جا سکتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ میری بیوی شری راج کے بنگلے پر ہی ہے۔"

رستم نے جواب میں کہا۔

"شری راج کے بنگلے کا کوئی خفیہ راستہ نہیں ہے۔ چاروں طرف دس فٹ اونچی دیوار ہے جس پر خاردار تار لگی ہوئی ہے۔ صرف ایک گیٹ ہے جہاں ہر وقت مسلح گارڈز کا پہرہ ہوتا ہے۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اگر شری راج رات کو کسی دوسری جگہ جائے تو تم ہمیں خبر کر دو کیونکہ بہت ممکن ہے کہ اس نے جمیلہ بھابی کو جس کسی دوسری جگہ پر رکھا ہوا ہے وہاں وہ اس سے ملاقات کرنے رات کو جائے۔"

رستم نے کہا۔

"آج رات تو شری راج نے بنگلے پر دلی کے کسی بہت بڑے افسر کی دعوت کر رکھی ہے۔ آج رات تو وہ بنگلے پر ہی رہے گا۔ کل رات اس نے پیلس ہوٹل میں اپنے خاص آدمیوں کو ڈنر پر بلایا ہوا ہے۔ کل رات بھی اسے ہوٹل میں رات کے دو تین بج جائیں گے۔ پرسوں آپ کو اگر وہ کسی جگہ گیا تو آپ کو خبر کر دوں گا۔"

پیلس ہوٹل میں اپنے خاص آدمیوں کے ڈنر کا سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔

میں نے باتوں ہی باتوں میں رستم سے پوچھا۔

"یہ شری راج کے خاص آدمی کون ہیں جن کو وہ ڈنر دے رہا ہے؟ کیا یہ کوئی پولیس کے یا سول محکمے کے افسر ہیں؟"

رستم نے کہا۔

"نہیں نہیں۔ اس ڈنر سے کسی پولیس افسر یا دوسرے افسروں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ خاص آدمی شری راج کے وہ لوگ ہیں جن کی مدد سے اپنا سمگلنگ اور بلیک میلنگ کا کاروبار چلاتا ہے۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہ سارے جرائم پیشہ لوگ ہوں گے۔"

"ایسا ہی سمجھ لیں۔" رستم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "شری راج کا گروہ ایسے ہی لوگوں کا ہے۔ سب کو معلوم ہے' پولیس کو بھی معلوم ہے مگر شری راج کا بھارت سرکار کے وزیروں کے ساتھ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ وہ ان پر لاکھوں روپے خرچ کرتا ہے اور کروڑوں روپے سمگلنگ سے کماتا ہے۔ اس پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ پولیس جانتی ہے کہ کل رات پیلس ہوٹل میں شری راج نے اپنے سارے جرائم پیشہ آدمیوں کو کھانے پر بلایا ہے مگر پولیس خاموش رہے گی۔"

میں نے کمانڈو خالد کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ اس نے میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔

میں نے رستم سے دو ایک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد پوچھا۔

"یہ ڈنر کس وقت ہوگا؟"

وہ بولا۔ "رات کو ہی ہوگا۔"

"کیا تم ڈنر میں شرکت کرو گے؟"

رستم سے یہ سوال پوچھنے کا میرا ایک خاص مقصد تھا۔ وہ بولا۔

"ارے نہیں صاحب۔ ہم تو شری راج کے معمولی ملازم ہیں اور پھر میں جرائم پیشہ نہیں ہوں۔ میرا اس کی جرائم پیشہ اونچے درجے کی سرگرمیوں سے کبھی بھی کوئی براہ راست تعلق نہیں رہا۔ میں تو رات کو اپنے کوارٹر میں ہوں گا۔ ویسے بھی شری راج کسی مسلمان پر بھروسہ نہیں کرتا۔ میرے سوا اس کے گینگ کے سارے آدمی ہندو ہیں۔"

میں نے رستم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"میرے بھائی ہم دو دن اور انتظار کر لیتے ہیں۔ اگر پرسوں رات کو شری راج خفیہ طور پر کسی سے ملنے گیا تو تم یہ ضرور سراغ لگانا کہ کہیں وہ تمہاری بھابی جمیلہ کے پاس تو نہیں گیا۔ اگر گیا ہے تو وہ جگہ کون سی ہے۔"

رستم نے وعدہ کیا کہ وہ شری راج کی رات کی سرگرمیوں پر نظر رکھے گا اور ہمیں ضرور خبر کر دے گا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے کمانڈو خالد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"کمانڈر! کیا تم بھی وہی سوچ رہے ہو جو میں سوچ رہا ہوں؟"

اس نے کہا۔

"تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔"

میں نے کہا۔

"کل رات کو پیلس ہوٹل ہمارا ٹارگٹ ہوگا۔"

ہم دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور آنے والی رات کے کمانڈو آپریشن کی ایک ایک تفصیل پر غور شروع کر دیا۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

"ہمیں یہاں دلی میں مقیم اپنے آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔"

میں نے کہا۔ "وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ بیچ میں صرف ایک کل کا دن باقی ہے۔ ایک بار پھر سوچ لو۔"

وہ بولا۔ "ہمیں ہنگامی صورت حال کے مطابق کام کرنا ہوگا۔"

میں نے اسے اپنی طرف سے مشورہ دیا کہ وہ کل صبح صبح اپنے آدمیوں سے رابطہ پیدا کرنے کے لیے نکل جائے۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

"کل کے دن کا ہم انتظار نہیں کر سکتے۔ مجھے ابھی اپنے آدمیوں کے پاس جانا ہوگا۔"

"رات ہو گئی ہے کیا تم انہیں تلاش کر لو گے؟"

وہ بولا۔

"میرے لیے دلی کوئی نیا شہر نہیں ہے اور پھر مجھے صرف اپنے ایک آدمی کے پاس جانا ہوگا۔ باقی جس جس کی ضرورت ہوگی' وہ جہاں کہیں بھی ہوں گے جس حالت میں بھی ہوں گے فوراً" وہاں پہنچ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ ”کیا میں تمہارے ساتھ جا سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں۔“ کمانڈو خالد نے کہا۔

ہم نے بوڑھے ملازم سے کہا کہ ہم ایک ضروری کام سے شہر جا رہے ہیں۔ کوارٹر کا دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور رات کے اندھیرے میں نالے کے پل کی طرف چل پڑے۔ کمانڈو خالد دلی شہر کے گلی کوچوں سے واقف تھا۔ اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے۔ ہم ایک سڑک پر نکل آئے جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ اس وقت ہمیں بھارتی انٹیلی جنس کا زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ ہم نے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ ہماری نگرانی نہیں کی جا رہی۔ ایک خالی ٹیکسی ہم نے ہاتھ دے کر روکی اور اس میں بیٹھ گئے۔ کمانڈو خالد نے دلی کے ایک علاقے کا نام لے کر ڈرائیور سے کہا کہ وہاں چلو۔ میں اس علاقے کا نام ظاہر نہیں کروں گا کیونکہ کمانڈو خالد کے ساتھی اور اسلام اور پاکستان کے نام پر اپنی جانیں قربان کرنے والے اور دشمن کی جان لینے والے مجاہد آج بھی اس علاقے میں رہ رہے ہیں۔ ٹیکسی دلی کی کھلی آبادیوں میں سے نکل کر شہر کی گنجان آبادی میں داخل ہوگئی۔

ایک جگہ ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور ایک محلے میں داخل ہوگئے۔ یہاں ایک تنگ و تاریک گلی تھی۔ کمانڈو خالد نے ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا اوپر والی منزل کی کھڑکی کھول کر کسی نے پوچھا۔

”کون صاحب؟“

گلی میں زیادہ روشنی نہیں تھی۔ کمانڈو خالد نے منہ اوپر کر کے کہا۔

”رحمت خان سے کہو کہ رام پور کے مرزا خدا داد خان ملنے آئے ہیں۔“

کمانڈو خالد نے میرے کان میں کہا۔

”یہ ہمارا کوڈ ورڈ ہے۔“

تھوڑی ہی دیر بعد ایک دبلے پتلے مگر چمکیلی آنکھوں والے نوجوان نے درواز کھول دیا۔ ڈیوڑھی کی بتی روشن تھی۔ اس نے خالد کو گلے لگا لیا اور میری طرف

طرف دیکھا۔ خالد نے کہا۔

"یہ بھی رام پور کے مرزا خداداد کے بھائی ہیں۔"

وہ نوجوان ہمیں ایک کمرے میں لے گیا جہاں آمنے سامنے چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کمانڈو خالد نے میرا اس سے تعارف کروایا اور کہا۔

"رحمت خان! یہ کرم داد ہے۔ اس کی داستان غم تمہیں تفصیل کے ساتھ بعد میں سناؤں گا۔ اس وقت ہنگامی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ یہاں بیٹھو میرے پاس اور میری بات غور سے سنو۔"

کمانڈو خالد نے رحمت خان کو مختصر الفاظ میں صرف اتنا بتایا کہ ہم بھوپال سے صرف مافیا کے سرغنہ اور جرائم پیشہ وروں کے سردار شری راج کو قتل کرنے آئے ہیں۔ وہ کل رات دلی کے پیلس ہوٹل میں اپنے سارے جرائم پیشہ بدمعاش ساتھیوں کو ڈنر دے رہا ہے۔ ہمارے لیے یہ ایک سنہری موقع ہے اور ہم شری راج کے ساتھ اس کے سارے بدمعاشوں کو اڑا دینا چاہتے ہیں۔"

رحمت خان بڑی توجہ سے کمانڈو خالد کی باتیں سنتا جا رہا تھا۔ جب خالد نے اپنی بات مکمل کی تو وہ کہنے لگا۔

"اس کے لیے مجھے خود اپنے مجاہد انور خان کو ساتھ لے کر پیلس ہوٹل جا کر معلوم کرنا ہوگا کہ کل کی دعوت ہوٹل کے کون سے ہال میں ہو رہی ہے اور وہاں کتنے لوگ ہوں گے۔ نشستوں کا انتظام کس طرح کا ہوگا اور ڈنر پارٹی کتنے بجے سے کتنے بجے تک جاری رہے گی۔ اس کے علاوہ مجھے ان نوکروں کے بارے میں بھی پوری معلومات حاصل کرنی ہوں گی جو اس ڈنر پارٹی میں کھانا اور مشروبات وغیرہ کی سروس کریں گے۔ آپ لوگ میرے گھر میں ٹھہریں میری بیوی آپ کو یہاں کھانا پہنچا دے گی۔ میرے واپس آنے تک آپ کہیں نہ جائیں۔"

مجاہد رحمت خان گرم چادر کی بکل مار کر مکان سے نکل گیا۔ وہ کوئی تین گھنٹوں کے بعد واپس آیا جبکہ آدھی رات ہوچکی تھی۔ ہم اس کے مکان کی بیٹھک میں ہی

بیٹھے تھے۔ بیٹھک میں آ کر وہ ہمارے قریب بیٹھ گیا اور بولا۔

"منظر خالد جی! سارا معاملہ طے ہو گیا ہے لیکن اس کمانڈو اٹیک میں آپ دونوں کو بڑا اہم رول ادا کرنا ہو گا۔"

میں اور خالد اس کی طرف دیکھنے لگے۔ رحمت خان نے کہا۔

"شری راج کے حکم سے حفاظتی اقدام کے طور پر اس پارٹی میں سروس کرنے والے ملازم ہوٹل کے ملازموں میں سے نہیں لیے۔ ڈنر پارٹی میں جو بیرے کھانا اور کافی وغیرہ کی سروس کریں گے وہ کل سات بیرے ہیں اور یہ ساتوں کے ساتوں دوسرے شہر کے تھری سٹار ہوٹلوں سے بلائے گئے ہیں۔"

اس کے بعد مجاہد رحمت خان نے ہمیں دلی کے پیلس ہوٹل میں شری راج سمیت اس کے سارے کے سارے وہاں بدمعاشوں کو جہنم رسید کرنے کی ایکشن کی تفصیل بتائی۔ کمانڈو خالد نے مجھ سے پوچھا۔

"کرم داد! تم تربیت یافتہ کمانڈو ہو۔ اس ایکشن پلان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں نے کہا۔

"اگر ہمارے مجاہدوں کو وہاں کسی نے پہچان نہ لیا تو انشاء اللہ ہم اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہوں گے۔"

مجاہد رحمت خان بولا۔

"ہم آپ لوگوں سمیت وہاں صرف پانچ آدمی ہوں گے۔ دو پیلس ہوٹل کے کیٹرنگ سیکشن میں ہوں گے جہاں سے کھانا اور کافی وغیرہ ٹرالیوں میں لگ کر لفٹ کے ذریعے دوسری منزل پر واقع رانی جھانسی ڈائننگ ہال میں جائے گی۔ میں کافی سیکشن کاؤنٹر پر ہوں گا' باقی آپ دونوں بھی کیٹرنگ سیکشن میں پیلس ہوٹل کے بیروں کی مخصوص وردی میں اسی جگہ موجود ہوں گے۔ دوسرے بیرے بھی ہوں گے۔ چونکہ سارے بیرے دوسرے شہروں سے آئے ہوئے ہوں گے اس لیے کوئی کسی کو نہ پہچان

سکے گا۔ سب ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوں گے۔ جہاں تک اپنے مجاہدوں کا سوال ہے وہ بھی ہم ایسے مجاہدوں کو لے رہے ہیں جو کبھی پیلس ہوٹل میں نہیں گئے۔"

جب ہم رحمت خان مجاہد کے مکان سے نکلنے لگے تو اس نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"آپ لوگ کل شام ہونے سے پہلے پہلے گنج آباد والے مکان پر پہنچ جانا۔ میں وہاں آپ کا انتظار کر رہا ہوں گا۔"

رحمت خان مجاہد کے مکان سے نکلنے کے بعد ہم دلی کی گنجان اور نیم روشن گلیوں میں سے گزر کر ایک بازار میں آئے جہاں سے رکشا لے کر نالے کے پل پر پہنچ کر اتر گئے۔ اپنے کوارٹر میں آکر ہم کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پھر سو گئے۔

دوسرے دن شام ہوتے ہی ہم کوارٹر سے نکل کھڑے ہوئے۔ گنج آباد کا علاقہ میرا دیکھا ہوا نہیں تھا۔ یہ کوئی پرانی آبادی تھی۔ بڑی سڑک قریب سے گزرتی تھی جس پر سٹریٹ لائیٹس کی چمک دمک میں گاڑیاں وغیرہ گزر رہی تھیں۔ مجاہد رحمت خان نے جس مکان کا کہا تھا وہ آبادی کے باہر ایک مسجد کے عقب میں واقع تھا۔ مجاہد رحمت خان وہاں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی بولا۔

"جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

اس نے ہمیں پیلس ہوٹل کے خاص بیروں کی وردیاں الماری سے نکال کر دیں جو ہینگروں کے ساتھ لٹکی ہوئی تھیں اور خوب استری کی ہوئی تھیں۔ وردیوں کے کوٹ زعفرانی رنگ کے تھے۔ کالر سیاہ تھے اور پتلونیں بھی سیاہ رنگ کی تھیں۔ ہم نے وردیاں پہن لیں۔ پاؤں میں نئے جوتے بھی پہن لیے۔ کوٹ کے کالروں کے ساتھ پیلس ہوٹل کے ریشمی سفید پھول اور نیچے شناختی کارڈ لگے ہوئے تھے جن میں ہمارے نام لکھے تھے۔ میرے کوٹ پر کسی رام داس کا نام لکھا تھا اور کمانڈو منظر خالد کے کوٹ پر رادھا کشن کا نام لکھا تھا۔ مجاہد رحمت خان نے ایک وردی خود پہن لی۔ جب ہم تیار ہو گئے تو اس نے کھڑکی کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ پھر اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈال کر بولا۔

"انور خان کو اب تک آجانا چاہیے تھا۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔ "کیا وہ اپنے گھر سے آ رہا ہے؟"

رحمت خان نے کہا۔

"نہیں کمانڈر! وہ پیلس ہوٹل سے ہوٹل کی گاڑی لے کر آ رہا ہے۔"

کمانڈو خالد نے رحمت خان سے پوچھا۔

"رحمت خان! جن بیروں کے شناختی کارڈ ہماری وردیوں پر لگے ہوئے ہیں وہ کہاں ہیں؟"

مجاہد رحمت خان نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"کمانڈر! تمہیں تو معلوم ہوگا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم نے انہیں ٹھکانے نہیں لگایا۔ مشن مکمل ہونے کے بعد انہیں آزاد کر دیا جائے گا۔"

اتنی دیر میں باہر کسی بڑی ویگن کے رکنے کی آواز آئی۔

رحمت خان جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف گیا اور باہر جھانک کر بولا۔

"انور خان آگیا ہے۔"

مکان کے آگے زعفرانی رنگ کی ایک لمبی کوسٹر ویگن کھڑی تھی جس پر انگریزی اور ہندی میں بڑے لفظوں میں پیلس ہوٹل لکھا تھا اور اوپر فور سٹار بنے ہوئے تھے۔ یہ فور سٹار ہوٹل تھا۔ ظاہر ہے دلی کا کوئی اعلیٰ اور فیشن ایبل ہوٹل تھا جہاں شری راج ایسا سمگلروں کا بادشاہ اپنے خاص آدمیوں کی دعوت کر رہا تھا۔ انور خان خود ہوٹل کے ملازموں کی وردی میں تھا۔ اس نے اشاروں میں ہی کمانڈو خالد کو اور مجھے سلام کیا اور ہم دروازہ کھول کر ویگن میں سوار ہوگئے اور ویگن پیلس ہوٹل کی طرف چل پڑی۔

بہت بڑا چھ سات منزلہ ہوٹل تھا جس کے آگے روشنیوں میں جگمگاتا ہوا سبزہ زار تھا۔ درمیان میں ایک فوارہ چل رہا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں چمکتی ہوئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ لابی کو جانے والا دروازہ شیشے کا تھا جس کے آگے ایک اونچا لمبا ملازم قدیم

راجاؤں کا لباس پہنے کھڑا تھا۔ دروازہ کمپیوٹرائزڈ تھا۔ آدمی قریب جاتا تو خود بخود ایک طرف کو کھسک جاتا تھا۔ لابی میں بڑے جھاڑ فانوس اور صوفے لگے تھے۔ دلی کی حسین عورتیں رنگ برنگی ریشمی ساڑھیوں میں ملبوس تتلیوں کی طرح ادھر ادھر چہکتی پھر رہی تھیں۔ ہوٹل پوری طرح سے ائرکنڈیشنڈ تھا اور اس کی فضا میں ہلکی ہلکی گرمائش تھی۔ دلی کی شام کی شدید سردی باہر ہی رہ گئی تھی۔

انور خان ہمیں گائیڈ کر رہا تھا۔ ہم بیروں کی وردیوں میں ملبوس اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ وہ ہمیں لابی میں اس کے دائیں جانب والے دروازے سے نکال کر ایک راہ داری میں لے آیا۔ جہاں قسم قسم کے مشروبات اور کھانوں کی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں اور سفید ٹوپیوں والے ویٹر ہاتھوں میں ٹرے لیے آ جا رہے تھے۔ ان میں خاتون ویٹرس بھی تھیں۔ راہ داری سے گزر کر ہم ایک مستطیل کمرے میں آ گئے جہاں کاؤنٹر پر شیشے اور سٹین لیس سٹیل کے مختلف برتن پڑے تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے گیس کے چولہوں پر سٹین لیس سٹیل کی بڑی بڑی دیگچیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ شیف اور اس کے اسسٹنٹ بڑی گرمجوشی اور مشین کے پرزوں ایسی تیزی کے ساتھ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ انور خان نے ہم تینوں کو ایک طرف بٹھا دیا اور ایک سوٹ بوٹ والے کالے رنگ کے آدمی کو انگریزی میں کہا۔

"سر! کانپور والے بیرے آ گئے ہیں۔"

اس آدمی نے قریب آ کر ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ہمارے شناختی کارڈ جو ہمارے کوٹ کے کالروں سے لگے تھے چیک کیے اور ہوں ہوں کرتا دوسری طرف نکل گیا۔ مجاہد انور خان نے رحمت خان کو بلا کر کچھ کہا اور خود دوسری طرف چلا گیا۔ رحمت خان میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور آہستہ سے کہنے لگا۔

"ڈنر ٹھیک نو بجے شروع ہو گا۔ مگر اس سے پہلے ہال میں شراب چلے گی۔"

میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"کیا شری راج وہاں پر ہو گا؟"

رحمت خان بولا۔

"کیوں نہیں ہو گا۔ میں تمہیں اس کی شکل دکھا دوں گا۔"

کمانڈو خالد بھی میرے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اس کا نام یہاں نہ لو۔"

میں چپ ہو گیا۔ ہم کوئی پون گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے۔ اس دوران مجاہد انور خان نے ہمیں چائے لا کر دی۔ مجاہد انور خان کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھی وہاں باہر کے بیرے کے بھیس میں آیا ہے اور وہاں کوئی بھی اسے نہیں پہچانتا۔ کالے چیف بٹلر کو اور کچن کے دوسرے آدمیوں کو یہ ضرور معلوم تھا کہ ہم باہر سے منگوائے گئے شری راج کے خاص بیرے ہیں جن پر اسے پورا بھروسہ ہے۔ پون گھنٹے بعد ایک طرف سے شیشے کی بڑی خوبصورت ٹرالیاں آنے لگیں۔ یہ چھ ٹرالیاں تھیں جن پر مختلف شرابوں کی بوتلیں لگی ہوئی تھیں۔ رنگ برنگے بلور کے ہر سائز اور ہر قسم کے گلاس تھے۔ ہر ٹرالی پر کافی تعداد میں استری کیے ہوئے سفید رومال تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ ہر ٹرالی میں ایک ایک تانبے کا گلدان تھا جس میں موسم کے پھول سجے ہوئے تھے۔

کالا چیف بٹلر انگریزی بولتا ہوا آ گیا اور بولا۔

"جلدی سے اٹن شن ہو جاؤ۔ پارٹی کا پہلا سیشن شروع ہو رہا ہے۔"

وہاں باہر سے آئے ہوئے تین چار دوسرے بیرے بھی تھے جو ہمارے قریب ہی سٹولوں پر بیٹھے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم بھی اٹھ کر اٹن شن ہو گئے۔

ایک ایک ویٹر کو ایک ایک ٹرالی دے دی گئی۔ چیف بٹلر نے کرخت آواز میں کہا۔

"لفٹ نمبر ۴۔ سٹوری نمبر ۵۔ او کے۔ جاؤ۔"

انور خان وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک ٹرالی کمانڈو خالد کو دی گئی۔ ایک ٹرالی مجھے اور ایک ٹرالی مجاہد رحمت خان لے کر لفٹ کی طرف بڑھا۔ وہ ہمارے آگے آگے تھا۔ ہم لفٹ کے پاس جا کر رک گئے۔ لفٹ کھلی۔ میں نے دیکھا کہ مجاہد انور خان لفٹ کے

اندر موجود تھا۔ ہمارے پیچھے پیچھے دوسرے شہروں سے آئے ہوئے تین بیرے بھی تھے۔ انور خان نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے بلا کر کہا۔

"تم پہلے آؤ۔ جلدی۔"

تینوں بیرے شراب کی بوتلوں سے لدی ہوئی ٹرالیاں لے کر جلدی جلدی ٹرالی کو ہاتھوں سے چلاتے لفٹ میں داخل ہوگئے۔ انور خان نے لفٹ کا دروازہ بند کر دیا۔ میں' کمانڈو خالد اور مجاہد رحمت خان اپنی اپنی ٹرالیوں کے پاس کھڑے لفٹ کے دروازے کے اوپر بدلتے ہوئے نمبروں کو تکنے لگے۔ لفٹ پانچویں منزل پر رک گئی تھی۔ اس کے بعد لفٹ نے نیچے آنا شروع کر دیا۔ گراؤنڈ فلور پر آ کر لفٹ کا دروازہ کھلا اور انور خان نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی لفٹ کا دروازہ بند ہوا۔ انور خان نے لفٹ کا بٹن نہ دبایا اور کونے میں پڑا ہوا پیتل کا ایک گلدان اٹھا کر ٹرالی والے گلدان کے ساتھ بدل دیا۔ کونے والا گلدان اس نے ٹرالی میں رکھ دیا اور ٹرالی والا گلدان لفٹ کے کونے میں رکھ کر لفٹ پر پانچ نمبر کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ اوپر چڑھنے لگی۔

مجاہد رحمت خان نے مجھے کہا۔

"تم میرے ساتھ ہال میں جاؤ گے۔"

کمانڈو خالد سے اس نے کہا۔

"کمانڈر! تم دوسری طرف ٹرالی لے کر جاؤ گے اور جہاں تمہیں ہال کمرے کا اٹن ڈنٹ کہے گا وہاں ٹرالی رکھ کر واپس نیچے والے کمرے میں آ جاؤ گے۔"

انور خان نے مجھ سے کہا۔

"یہ گلدان شری راج والی ٹیبل پر اس کے سامنے رکھنا ہوگا۔"

فکر نہ کرو۔ ایسا ہی ہوگا۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

لفٹ پانچویں منزل پر آ کر رک گئی۔ لفٹ کا دروازہ کھلتے ہی کمانڈو منظر خالد اپنی ٹرالی کو ایک طرف لے کر چلا گیا۔ مجھے مجاہد رحمت خان گائیڈ کر رہا تھا۔ وہ میرے آگے

آگے تھا۔ ہم ایک روشنیوں سے جگمگاتی ہوئی راہ داری سے گزر رہے تھے۔ سامنے ڈائنگ ہال کا دروازہ تھا جس کے باہر ایک مسلح گارڈ کھڑا تھا۔ اس نے پہلے مجاہد رحمت خان کی ٹرالی چیک کی۔ پھر میری ٹرالی پر لگی بوتلوں' گلاسوں اور دوسری چیزوں کو چیک کیا اور دروازے کا ایک پٹ کھول کر کہا۔

"یہ چیزیں رکھ کر فوراً" واپس آ جاؤ۔"

میں نے کہا۔

"یس سر!"

ڈائنگ ہال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا اور لوگ باتیں کر رہے تھے۔ کسی کسی وقت ہلکے سے قہقہوں کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ رحمت خان ٹرالی لے کر میرے ساتھ چلنے لگا۔ اس نے ایک ستون کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"سامنے والے ستون کے پاس سنہری فریم والی عینک لگائے شری راج بیٹھا ہے۔ تمہیں ٹرالی درمیان میں رکھ کر اپنا گلدان شری راج کے سامنے میز پر رکھنا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ دوسرے ونگ کی طرف نکل گیا۔ میں آہستہ آہستہ ٹرالی کو لیے مہمانوں کی بڑی میزوں کے درمیان آ گیا۔ ٹرالی وہیں رہنے دی اور گلدان اٹھا کر سنہری فریم والی عینک جس نے لگائی ہوئی تھی اس کے سامنے والی شیشے کی میز پر رکھ دیا۔ میں نے ایک نظر شری راج پر ڈالی۔ پچاس کے قریب عمر ہوگی۔ بالوں میں سفید جھلکنے لگی تھی۔ چہرے پر کرختگی اور درختگی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے جو اس کی بے راہ روی اور شراب نوشی کی غمازی کر رہے تھے۔ گلدان میں سرخ گلاب کے پودے کھلے ہوئے پھول سجے ہوئے تھے۔ لیکن ان پھولوں کے درمیان گلدان کی تہہ میں ایسا دھماکہ خیز مادہ بھرا ہوا تھا کہ جو اس ہوٹل کی پوری منزل کو تہس نہس کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں گلدان رکھتے ہی پیچھے ہٹا اور بڑے ادب سے چلتا دروازے کی طرف بڑھا۔ مجھے نہیں پتہ اس وقت مجاہد رحمت خان اور کمانڈو خالد کہاں تھے۔ مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں گلدان رکھنے کے فوراً" بعد نیچے کیٹرنگ روم کے باتھ روم

میں آ کر بیروں والی وردی اتار کر دوسرے کپڑے پہنوں گا اور ہوٹل سے فوراً نکل جاؤں گا اور دوسرے چوک میں ایک خاص ریستوران میں رک کر اپنے ساتھیوں کا انتظار کروں گا۔ دھماکہ خیز گلدان مجاہد رحمت اور انور خان نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے خاص طور پر تیار کروایا تھا جو دھماکہ خیز مواد تیار کرنے میں ماہر تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ گلدان میں لگایا ہوا بم یا بارود ایک گھنٹے بعد پھٹ پڑے گا۔ انور خان نے دھماکہ خیز گلدان لفٹ میں میری ٹرالی پر رکھتے ہوئے اس کے ایک خاص بٹن کو دبا دیا تھا۔ گلدان بم کی الٹی گنتی اسی وقت سے شروع ہوگئی تھی۔

میں لفٹ میں بیٹھ کر نیچے کیٹرنگ روم میں آ گیا۔ یہاں دو ایک بیروں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنے کپڑے باتھ روم کے ایک بکس میں چھپائے ہوئے تھے۔ باتھ روم میں گھس کر میں نے جلدی جلدی بیرے کی وردی اتار کر بکس میں چھپا دی اور اپنے کپڑے پہن کر باتھ روم سے نکلا اور جیکٹ کے کالر اوپر چڑھائے اور تیز تیز قدموں سے کیٹرنگ روم میں چلتا ہوا کوریڈور میں اور وہاں سے ہوٹل کی لابی میں آ گیا۔ دھماکہ ہونے میں میرے حساب سے ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ میں ہوٹل کے سبزہ زار کے قریب سے ہوتا ہوا گیٹ میں سے باہر نکل گیا۔ جس ریستوران میں پہنچ کر مجھے اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنا تھا وہ معمولی سا چائے خانہ تھا اور پیلس ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ ہمیں وہاں سے کافی دور جا کر ایک دوسرے سے ملنا چاہیے تھا۔ مگر اب جگہ نہیں بدلی جا سکتی تھی۔ یہ بات بھی تھی کہ مجھے گنج محلے کا راستہ بھی معلوم نہیں تھا جہاں رحمت خان کا گھر تھا اور مشتاق صاحب کے کوارٹر کا بھی راستہ معلوم نہیں تھا۔

مجھے ہر حال میں ریستوران میں اپنے مجاہدوں کا انتظار کرنا تھا۔ میں ریستوران میں آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے چائے منگوائی اور ریستوران کی دیوار پر لگے کلاک پر نگاہ ڈالی۔ میرے حساب سے ہوٹل میں دھماکہ ہونے میں دس پندرہ منٹ ہی رہ گئے تھے۔ یہ خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے گلدان میں لگایا ہوا دھماکہ خیز مواد اگر نہ پھٹ سکا تو ہماری

ساری محنت رائیگاں جائے گی اور دوبارہ ایک طویل منصوبہ بندی کرنی پڑے گی۔ میں چائے بھی پی رہا تھا اور تھوڑی دیر بعد سامنے دیوار پر لگے کلاک کو بھی دیکھ لیتا تھا جس کی سیکنڈ کی سوئی برابر چل رہی تھی۔ میرے کان دھماکے کی آواز سننے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ بازار میں ٹریفک چل رہی تھی۔ یہ دلی کا بڑا بارونق علاقہ تھا۔ رات کے وقت بھی یہاں بڑی چہل پہل تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ میرے خیال میں گلدان بم کے بٹن کو اون کیے ایک گھنٹے سے اوپر ہوگیا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ بم نہیں پھٹے گا۔ ان لوگوں سے کوئی غلطی ہوگئی ہے اور مواد کو ٹھیک طرح سے نہیں لگایا گیا۔ ریستوران کا لڑکا میری میز پر سے چائے کے برتن اٹھاتے ہوئے بولا۔

"سر! کچھ اور پئیں گے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔"

اس نے جیب سے بل نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے دس روپے کا نوٹ اسے دے کر کہا۔

"باقی تم رکھ لینا۔"

بیرا تھینک یو کہہ کر ٹرے میں خالی برتن رکھ کر واپس مڑا ہی تھا کہ ریستوران کا فرش ایک دھچکے سے آگے کو ہلا۔ جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس قدر خوفناک دھماکے کی آواز آئی کہ لگتا تھا علاقے کے سارے مکان پھٹ پڑے ہیں۔ بیرے کے ہاتھ سے ٹرے گر پڑا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ریستوران میں اور باہر بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جس طرف منہ اٹھا دوڑنے لگا۔ درختوں میں سوئے ہوئے پرندوں نے شور مچا دیا۔ کتے بھونکنے لگے۔ ریستوران کا مالک گھبرایا ہوا ریستوران سے نکل کر بازار میں آکر ہر ایک سے پوچھنے لگا۔ کیا ہوا بھائی؟ کہاں بم پھٹا ہے۔ لوگ سخت خوفزدہ تھے۔ ہر شخص بھاگ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ پر خاموش ہو کر بیٹھا۔ خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ ہمارا مشن کامیاب ہوگیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اتنے زبردست دھماکے

کے بعد شری راج زندہ نہیں بچا ہو گا۔ بلکہ اس کے بدمعاشوں میں سے بھی کوئی زندہ نہیں رہا ہو گا۔ سب کے پرخچے اڑ گئے ہوں گے۔ یہی ہم چاہتے تھے۔ یہی میرا مشن تھا۔

میرا ریستوران میں زیادہ دیر بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں جائے واردات کے بہت قریب تھا اور کسی بھی وقت پولیس یا فوج اس علاقے کو گھیرے میں لے سکتی تھی۔ لیکن مجھے ہر حالت میں کمانڈو خالد اور مجاہد رحمت خان کا انتظار کرنا تھا۔ ان لوگوں نے بھی اسی ریستوران میں آنا تھا۔ اس قیامت خیز دھماکے کے بعد بازار کی دکانیں بند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ جس طرف دھماکہ ہوا تھا اس طرف سے شور و غل کی آوازیں ابھی تک آ رہی تھیں اور آسمان روشن ہو گیا تھا۔ ہوٹل کی پانچویں منزل میں یقیناً" آگ لگی ہوئی تھی۔ اب پولیس کی گاڑیوں کے ہوٹروں کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ میری گھبراہٹ قدرتی امر تھا۔ میرے ساتھیوں میں سے ابھی تک کسی کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ ریستوران میں بیٹھے ہوئے میرے سوا سارے گاہک بھاگ گئے تھے۔ ریستوران کا مالک اور بیرا بھی ابھی تک باہر کھڑے اس طرف دیکھ رہے تھے جس طرف آسمان آگ کے شعلوں سے روشن تھا۔

آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر لگا ہوا تھا۔

اچانک پولیس کی وین شور مچاتی بازار میں داخل ہو گئی۔ ویگن ریستوران کے قریب رکی۔ اس میں سے پولیس کی پوری گارد باہر نکلی اور بازار میں دوڑنے بھاگنے لگی۔ میں ریستوران سے کھسک کر بازار کی دوسری جانب چل پڑا۔ میرے سامنے پولیس کے سپاہیوں نے دو آدمیوں کو پکڑ رکھا تھا اور اسے ویگن کی طرف لے جا رہے تھے۔ میں پیچھے نہیں مڑ سکتا تھا۔ پیچھے بھی پولیس تھی۔ آگے کی جانب نہیں دوڑ سکتا تھا آگے بھی پولیس پکڑ دھکڑ کر رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں نکل جاؤں گا۔ میں ایسے چل رہا تھا جیسے مجھے پتہ ہی نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہو چکا ہے۔ تین پولیس کانسٹیبل ایک آدمی کو پکڑ کر ویگن کی طرف لا رہے تھے۔ جیسے میں بظاہر بڑی بے نیازی

سے ان کے قریب سے گزرا ایک کانسٹیبل نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"کہاں سے آ رہے ہو بابو؟ ٹھہر جاؤ۔"

میں ٹھہر گیا۔ بھاگنے سے معاملہ مزید خراب ہو سکتا تھا۔ وہ کانسٹیبل میری طرف بڑھے۔ ایک نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ میں نے کہا۔

"کیا بات ہے۔ میں ہوٹل میں چائے پی کر آ رہا ہوں۔"

دوسرے سنتری نے میری گردن کو پکڑتے ہوئے پوچھا۔

کون ہو تم؟ مجھے تو تم اتنک وادی (دہشت گرد) لگ رہے ہو۔"

میں نے کہا۔

"میں گورنمنٹ سرونٹ ہوں۔ میرا نام ہری چند ہے۔"

کانسٹیبل نے مجھے پولیس وین کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"تھانے چلو پہلے۔"

میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی تو کانسٹیبل نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔

"ارے ادھر آؤ۔ میں نے اتنک وادی پکڑ لیا ہے۔"

شاید میں نے جو اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کی تھی اس سے وہ سمجھا کہ میں بھاگنے لگا ہوں اور ضرور پیلس ہوٹل کے دھماکے سے میرا کوئی تعلق ہے۔ تین چار مسلح پولیس کانسٹیبل دوڑ کر آ گئے۔ انہوں نے مجھے قابو کر لیا اور دوسرے آدمیوں کے ساتھ ویگن میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔

یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور غیر متوقع طور پر ہو گیا تھا کہ میں سوائے حیران اور پریشان ہونے کے اور کچھ نہیں کر سکا تھا۔ میرا اس طرح پولیس کے ہاتھوں پکڑا جانا میرے ساتھیوں کے لیے خطرے کا باعث ہو یا نہ ہو لیکن میرے لیے بہت ہی خطرناک بات تھی۔ کیونکہ اس دلی شہر میں میں پولیس انٹیلی جینس کے تین آدمیوں کو ہلاک کر چکا تھا اور ایک سی آئی ڈی والے نے مجھے کچھ عرصہ پہلے مشتاق صاحب والے کوارٹر

میں آتے جاتے دیکھا بھی تھا۔ اگر اس سے آمنا سامنا ہو گیا تو وہ مجھے فوراً پہچان سکتا تھا۔ انٹیلی جینس کے تینوں آدمیوں کا خون اسی کوارٹر کے اردگرد ان کی ڈیوٹی کے دوران ہوا تھا۔ ویگن چاروں طرف سے بند تھی۔ میرے ساتھ تین اور آدمی بھی تھے جن کو پولیس نے شبے میں پکڑ لیا تھا۔ یہ تینوں گھبرائے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک بار بار کہہ رہا تھا۔

"میرا بیٹا اخبار کے دفتر میں کام کرتا ہے میں ان پولیس والوں سے سمجھ لوں گا۔"

یقین کریں میں نے اس وقت بڑے خلوص دل سے خدا سے دعا مانگی کہ میں انسان سے سانپ کی شکل اختیار کر لوں۔ کیونکہ اب میرے بچنے کی یہی ایک صورت تھی کہ میں سانپ کے روپ میں آ جاؤں۔ مگر میری دعا کو باریابی حاصل نہ ہوئی۔ میں سانپ نہ بن سکا۔ پولیس ویگن رات کی تاریکی میں دلی کی مختلف سڑکوں پر سے تیزی سے گزرتی ایک طرف گھوم کر رک گئی۔ ہمیں باہر نکالا گیا۔

یہ کوئی پولیس سٹیشن تھا۔ وہاں پولیس کی پوری گارد موجود تھی۔ ایک تھانیدار ہماری طرف دوڑتا ہوا آیا وہ سکھ تھا۔ اس نے پوچھا۔

"ملزموں کو پکڑا کہ نہیں؟"

جس کانسٹیبل نے مجھے دبوچا تھا وہ بولا۔

"سر! یہ تینوں اٹنک والی ہیں سر۔ جائے واردات سے بھاگ رہے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں قابو کیا سر۔"

سکھ تھانیدار نے ہمیں پنجابی میں گالی دے کر کہا۔

"اندر دے دو ان کو۔"

اس وقت ہمیں حوالات میں بند کر دیا گیا۔ میں سوچنے لگا۔ یا اللہ! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اب کیا ہو گا۔ وہ لوگ مجھے کہاں تلاش کر سکیں گے۔ میری مدد کو تو کوئی بھی نہیں آئے گا۔ میں مشتاق صاحب کا نام بھی ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ پولیس سٹیشن پر ایک افراتفری سی مچی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ پیلس ہوٹل کا پورا

ایک بلاک دھماکے سے اڑ گیا ہے اور ایک بھی آدمی زندہ نہیں بچا۔ اس خبر سے مجھے اطمینان ضرور ہوا تھا لیکن میں ایک ایسی مشکل میں پھنس گیا تھا جس سے بظاہر مجھے چھٹکارا ملتا نظر نہیں آتا تھا۔

میرے ساتھ حوالات میں تین آدمی تھی۔ ان میں دو نوجوان تھے۔ ایک پکی عمر کا تھا۔ تینوں ہندو تھے۔ پکی عمر والے آدمی کا بیٹا دلی کے کسی اخبار میں ملازم تھا۔ وہ بار بار حوالات کے باہر کھڑے مسلح سنتری کو کہہ رہا تھا کہ مجھے ٹیلی فون کرنے دو۔ میں تم سب لوگوں کو لائن حاضر کروا دوں گا۔ اس کا شور سن کر ایک ہیڈ کانسٹیبل آ گیا۔ اس نے جب سنا کہ اس آدمی کا بیٹا دلی کے کسی اخبار میں کام کرتا ہے تو اس نے کہا۔

"لالہ جی! اپنے بیٹے کا ٹیلی فون نمبر بتاؤ ہم ابھی معلوم کر لیتے ہیں کہ تم سچ بول رہے ہو یا جھوٹ۔"

لالہ جی نے اخبار کے دفتر کا نمبر دیا اور کہا۔

"میرے بیٹے کا نام بشن داس ہے۔ وہ رات کی ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔ اس وقت دفتر میں ہی ہوگا۔ میری اس سے بات کراؤ۔"

ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"بس بس آرام سے بیٹھو۔ ہم ابھی فون کر کے معلوم کرتے ہیں۔"

ہیڈ کانسٹیبل چلا گیا۔ لالہ جی بار بار ایک ہی فقرہ دہرانے لگے۔"

"میں پورے تھانے کو ڈس مس کرا دوں گا۔ انہیں ایک شریف آدمی کو حوالات میں بند کرنے کا مزہ چکھا دوں گا۔"

تھوڑی دیر بعد وہی ہیڈ کانسٹیبل آیا۔ اس نے لالہ جی سے کہا۔

"لالہ جی! باہر آ جائیں۔"

لالہ جی نے بڑے فخر کے ساتھ کہا۔

"اب تم لوگوں کو پتہ چلا کہ میں کون ہوں۔"

ہیڈ کانسٹیبل لالہ جی کو حوالات سے نکال کر اپنے ساتھ لے گیا۔ میں اپنے دو

ساتھیوں سمیت حوالات میں ہی بند پڑا رہا۔ یہ دونوں نوجوان ہندو تھے اور کسی کالج میں پڑھتے تھے۔ ان میں سے ایک کہنے لگا۔

"پولیس ہماری سٹوڈنٹس یونین کی پاور سے شاید واقف نہیں ہے۔ صبح ہونے دو میں یہاں ایجی ٹیشن شروع کرا دوں گا۔"

انہوں نے مجھ سے بھی پوچھا کہ میں کہاں کام کرتا ہوں۔ میں نے یونہی کہہ دیا کہ دلی کی ایک فرم میں ہیڈ کلرک ہوں۔ ریستوران میں چائے پی رہا تھا کہ دھماکہ ہوا۔ میں ریستوران سے نکل کر جانے لگا تو پولیس نے مجھے بھی پکڑ لیا۔ میں بے گناہ ہوں۔ ایک دوسرے سٹوڈنٹ نے کہا۔

"میاں جی! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے آپ کو بھی ہم یہاں سے نکلوا کر ہی دم لیں گے۔"

مگر مجھے معلوم تھا کہ میرا وہاں سے نکلنا اب تقریباً" ناممکن تھا۔ میں نے پولیس کو کہا تھا کہ میں گورنمنٹ سرونٹ ہوں اور جب انہیں معلوم ہوگا کہ میں نے جھوٹ بولا تھا تو مجھ پر ان کا شک شبہ اور پختہ ہو جائے گا اور مجھے کسی ٹارچر سینٹر پر لے جا کر مجھ پر تشدد کا گھناؤنا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے سکھ تھانیدار کے سامنے لے جایا گیا۔ اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ مجھ سے غلطی ہوگئی تھی کہ میں نے گھبراہٹ میں اپنے آپ کو ہندو ظاہر کیا تھا اور اپنا نام ہری چند بتایا تھا۔ یہ نام ہندو کانسٹیبل کو یاد تھا۔ یہ ہندو کانسٹیبل بھی وہاں موجود تھا۔ میں کوئی دوسرا نام نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

"میرا نام ہری چند ہے۔"

"کہاں کام کرتے ہو؟"

سکھ تھانیدار نے پوچھا۔

کانسٹیبل نے کہا۔

"جناب یہ کہتا ہے کہ میں گورنمنٹ سرونٹ ہوں۔"

سکھ تھانیدار نے میری طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کون سے ڈیپارٹمنٹ میں ہو؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ ہوں۔"

سکھ تھانیدار بولا۔

"تم دلی والے نہیں لگتے۔ پنجابی ہو؟"

میں نے پنجابی میں کہا۔

"جی ہاں جالندھر میں ہمارا گھر ہے۔"

میں نے یہ سوچے سمجھے بغیر جالندھر کا نام لے لیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا پنجابی بولنے کا لہجہ جالندھریوں والا نہیں تھا۔ یہی اعتراض سکھ تھانیدار نے کیا اور کہا۔

"تم جالندھر کے نہیں ہو۔ تم تو پاکستان کے جہلم اور چکوال کے رہنے والوں کی طرح پنجابی بولتے ہو۔ سچ سچ بتا دو کہ اس دھماکے میں تمہارے ساتھ اور کون کون تھا۔"

میں خود ہی اپنے جال میں پھنس گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں اتنک وادی نہیں ہوں۔ میں بھارت سرکار کا ملازم ہوں۔ آپ پتہ کر سکتے ہیں۔"

میں جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا تھا اور اپنے جال میں خود الجھتا جا رہا تھا۔ میں ایسا کرنے پر اب مجبور تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل بولا۔

"جناب یہ مجھے پاکستانی اتنک وادی لگتا ہے۔ ہم نے ٹھیک مجرم کو پکڑا ہے۔"

سکھ تھانیدار کو یقین ہو گیا تھا کہ اس نے جلیس ہوٹل میں دھماکہ کرنے والے پاکستانی دہشت گردوں میں سے ایک کو پکڑ لیا ہے۔ وہ بڑا خوش تھا۔ اس نے اسی وقت کسی جگہ فون کیا اور کہنے لگا۔

"سر! میں گوردواس سنگھ ایس ایچ او تھانہ نمبر نو بول رہا ہوں۔ سر! ہم نے ایک

اٹنگ وادی کو پکڑ لیا ہے۔ یس سر! تھینک یو سر!"

اس نے فون بند کر دیا اور میری طرف فاتحانہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"ابھی تم سب کچھ بک دو گے۔"

اس نے کانسٹیبل سے کہا۔

"اسے الگ لے جا کر دوسری حوالات میں بند کر دو اور ہتھکڑی لگا کر لے جانا۔ تم نے ابھی تک اسے ہتھکڑی کیوں نہیں لگائی۔"

اس نے چلا کر باہر سے کسی سنتری کو آواز دی اور کہا۔

"ہتھکڑی لاؤ اوئے۔"

مجھے اسی وقت ہتھکڑی لگا دی گئی۔ میری تلاشی لی گئی۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ سکھ تھانیدار نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میرے بالکل قریب آ کر کہا۔

"کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟"

میں نے بے دلی سے کہا۔

"ہری چند۔"

میں اور کیا نام بتاتا۔ پھنس گیا تھا۔ اب اپنے جھوٹ کو جوں کا توں سچ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سکھ تھانیدار نے ہندو کانسٹیبل کو حکم دیا۔

"اس کی پتلون اتارو۔ ابھی پتہ چل جاتا ہے یہ کون ہے۔"

یہ ایک ایسا امتحان تھا کہ جس میں میں فیل تھا۔ کانسٹیبل نے میری پتلون نیچے کر دی۔ سکھ تھانیدار نے فاتحانہ گرج کے ساتھ کہا۔

"یہ پاکستانی مسلمان اٹنگ وادی ہے۔"

اس نے مجھے گردن سے پکڑ کر فرش پر بٹھا دیا اور ہیجانی میں انتہائی دھیمے لہجے میں بولا۔

"یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ تم مسلمان ہو اور پاکستانی ہو اور تم لوگوں نے ہی پیلس ہوٹل میں دھماکہ کر کے ستر آدمیوں کو ہلاک کیا ہے۔ لیکن چونکہ تم ہیجانی ہو میں

بھی پنجابی ہوں۔ اگر تم مجھے اپنے ساتھیوں کے نام پتے بتا دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں ضرور بچالوں گا۔"

میں نے کہا۔

"سردار جی آپ نے مجھ سے سچ بولنے کو کہا ہے تو سچ یہ ہے کہ میں پنجابی ہوں۔ مسلمان ہوں۔ مشرقی پاکستان میں کاروبار کرتا تھا۔ ڈھاکہ فال ہوا تو مکتی باہنی والوں سے جان بچا کر بھارت میں داخل ہوگیا۔ اب میں واپس پاکستان جانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی ہوٹل میں دھماکہ ہوگیا اور آپ کی پولیس نے مجھے پکڑ لیا۔ یہ میں خدا کو حاظر ناظر جان کر بالکل سچ سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا کسی اتنک وادی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

سکھ تھانیدار نے میری گردن چھوڑ دی اور کانسٹیبل سے کہا۔

"اسے بند کر دو۔"

مجھے ایک دوسری حوالات میں باقی حوالاتیوں سے الگ کر کے بند کر دیا گیا۔ ساری رات میں پھٹے پرانے کمبل میں ٹھنڈے فرش کے کونے میں پڑا ٹھٹھرتا رہا۔ صبح ہوئی تو ایک سنتری آگیا۔ میری ہتھکڑی حولات میں بند کرنے سے پہلے کھول دی گئی تھی۔ سنتری نے آتے ہی مجھے دوبارہ ہتھکڑی لگائی اور ایک تنگ کمرے میں لے گیا جہاں تین چار کرسیاں پڑی تھیں۔ اس نے مجھے زمین پر بٹھا دیا اور ہتھکڑی کی زنجیر دیوار کے ایک کنڈے سے باندھ دی۔ اتنے میں سکھ تھانیدار ایک اور آدمی کے ساتھ آگیا جس نے سویلین کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس آدمی کو دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ ایک دم سے میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ یہ وہی انٹیلی جینس والا آدمی تھا جو کچھ عرصہ پہلے جب میں اپنی بیوی جمیلہ کے ساتھ مشتاق علی صاحب کے کوارٹر میں مقیم تھا تو وہاں منڈلایا کرتا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی مجھے پہچان لیا اور تھانیدار سے کہا۔

"یہ وہی پاکستانی جاسوس ہے۔"

سکھ تھانیدار نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

"تم پر اب ہم اب ہمارے محکمے کے تین آدمیوں کا قتل بھی ثابت ہوگیا ہے۔ تم گندے نالے والے کوارٹروں میں روپوش تھے اور تم نے ایک رات ہمارے دو آدمیوں کو اور اس کے بعد ہمارے ایک انٹیلی جینس آفیسر کو قتل کر کے اس کی لاش غائب کر دی تھی۔"

میں نے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ میں مشرقی پاکستان سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں نے مکتی باہنی سے جان بچانے کے لیے بھارت میں پناہ لی ہے۔ آپ مجھے عدالت میں پیش کریں۔"

سکھ تھانیدار نے میرے سر پر کھڑے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ کانسٹیبل نے میری پسلیوں میں اتنی زور سے ٹھڈا مارا کہ میں دہرا ہوگیا۔ درد کی شدت سے میرا جسم پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ اوپر سے سکھ تھانیدار نے مجھے گھونسے مارنے شروع کر دیے۔ میں نے سر دونوں بازوؤں میں چھپا لیا اور مار کھاتا رہا اور بار بار کہتا رہا۔ میں بے قصور ہوں۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔

سکھ تھانیدار جب مجھے مارتے مارتے تھک گیا تو اس نے دو سنتریوں کو بلایا۔ اب انہوں نے مجھ پر گھونسوں اور لاتوں سے حملہ کر دیا۔ جب میں ادموا ہو کر گر پڑا اور نیم بے ہوش ہوگیا تو تھانیدار نے مجھے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

"میں تھوڑی دیر بعد پھر آؤں گا۔ اگر تم نے اپنے پاکستانی ساتھی دہشت گردوں کے نام پتے نہ بتائے تو میں اپنے ریوالور کی گولی تیری کھوپڑی میں اتار دوں گا۔"

وہ چلا گیا۔ سنتری نے مجھے جاتے جاتے ایک لات ماری اور وہ بھی کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر کے چلا گیا۔ مجھے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ ہتھکڑی کی زنجیر دیوار کے ہک میں پھنسا کر وہاں بھی چھوٹا سا تالا لگادیا گیا تھا۔ میں وہیں دیوار کے ساتھ اکٹھا ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے دکھتے ہوئے جسم کو سہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ میرا سارا جسم درد کر رہا

تھا۔ پسلیوں میں سانس لینے سے تکلیف ہوتی تھی۔ میں دل میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ یا خدا مجھے انسان سے سانپ بنا دے۔ کیونکہ میری نجات اسی صورت میں تھی کہ میں انسان سے سانپ کی شکل میں تبدیل ہو جاؤں۔ سانپ بن کر نہ صرف یہ کہ میں وہاں سے آسانی کے ساتھ فرار ہو سکتا تھا بلکہ اپنے دشمنوں کو ڈس کر ان سے اپنے اوپر کیے گئے تشدد کا بدلہ بھی لے سکتا تھا۔ مگر میری قسمت میں شاید اب انسان سے سانپ بننا نہیں لکھا تھا۔

کافی دیر بعد ایک سنتری اندر آیا۔ اس نے میرے آگے لوہے کا میلا کچیلا ڈونگا رکھ دیا اور میری جھولی میں آدھی ڈبل روٹی پھینک کر بولا۔

"لے بے۔ اسے کھا لے۔"

ڈونگے میں پتلی سی چائے تھی جو گرم تھی۔ میں نے گرم چائے کے تین چار گھونٹ پئے تو میرے جسم کو ایک سکون سا ملا۔ چائے بد ذائقہ اور پانی کی طرح تھی۔ میں ڈبل روٹی کے ٹکڑے اس میں ڈبو کر کھاتا رہا۔ ساری چائے پی گیا۔ گرم چائے پینے اور ڈبل روٹی کھانے سے میری کھوئی ہوئی توانائی کچھ بحال ہوئی۔ میں اس قابل ہوا کہ سوچ سکوں۔ پولیس کو اپنے ساتھیوں کے بارے میں کسی قسم کی اطلاع فراہم کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے سامنے صرف ایک ہی سوال اور ایک ہی مسئلہ تھا کہ وہاں سے کس طرح فرار ہوا جائے۔ بظاہر فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے ایک اور پریشانی بھی تھی۔ ان لوگوں کو پتہ چل گیا تھا کہ میں گندے نالے والے کوارٹر میں مقیم تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ پولیس نے مشتاق علی صاحب کو بھی ضرور شامل تفتیش کیا ہوگا۔ پولیس کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ کوارٹر ان کی ملکیت ہے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میری وجہ سے وہ بھی مصیبت میں پھنس گئے ہوں گے۔





کافی دیر گزر گئی۔

کوئی میرے پاس نہ آیا۔ میں کمبل میں سمٹا اپنے دکھتے ہوئے بدن کو لیے بیٹھا سوچتا رہا کہ میرے ساتھی کہاں ہوں گے۔ کیا سوچ رہے ہوں گے۔ کمانڈو خالد کہاں ہو گا۔ کیا انہیں معلوم ہو گا کہ میں پولیس کی حراست میں ہوں۔ انہیں کیسے پتہ چل سکتا تھا۔ وہ تو ابھی اس ریستوران میں نہیں آئے تھے جہاں انہیں مجھ سے ملنے واپس آنا تھا۔ مجھے جمیلہ کا خیال آ رہا تھا۔ اگر ان لوگوں نے مجھے سچ مچ موت کے گھاٹ اتار دیا تو جمیلہ کو میرے انجام کی کبھی خبر نہ ہو سکے گی۔ یہ سوچ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ لیکن میں نے فوراً اس قسم کے خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور یہ سوچنے لگا کہ یہاں سے کس طرح فرار ہو سکتا ہوں۔ پولیس کو یقین ہو چکا تھا کہ میں پاکستانی دہشت گرد ہوں اور میں نے ان کے تین آدمیوں کو قتل کیا ہے۔ ایسی صورت حال میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ مجھے زندہ چھوڑ دیتے۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ مجھے مارنے سے پہلے مجھ سے جتنی معلومات فراہم کر سکتے ہیں کر لیں اور اس کے بعد مجھے شوٹ کر دیں اور میری لاش وہیں کہیں زمین میں دبا دیں۔ پولیس نے نہ تو میرا کیس دلی کی عدالت میں پیش کرنا تھا اور نہ مجھے زیادہ دیر حوالات میں بند رکھنا تھا۔

یہ ساری باتیں میرے لیے بہت زیادہ پریشان کر دینے والی اور مجھے فوراً کوئی قدم اٹھانے پر آمادہ کر دینے والی تھیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں لوہے کی زنجیروں

میں جکڑا ہوا تھا۔ میں کوئی قدم کیسے اٹھا سکتا تھا۔ مجبوراً" مجھے انتظار کرنا تھا موافق حالات کا۔ ایسے حالات کا کہ مجھے یہ لوگ ہتھکڑی کے بغیر کسی دوسری کوٹھڑی یا حوالات میں بند کر دیں اور میں وہاں سے فرار ہونے کی کسی سکیم پر غور کر سکوں گا۔ اس دوران اگر میں سانپ کی شکل اختیار کر جاتا ہوں تو اس سے بڑھ کر میری اور کوئی خوش قسمتی ان حالات میں نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ایسا اب شاید کبھی نہ ہو اور مجھے انسان رہ کر ہی کوئی خطرہ مول لینا پڑے گا۔ جس تنگ کمرے میں پولیس نے مجھے ہتھکڑی لگا کر دیوار کے ساتھ جکڑ رکھا تھا وہاں دن کی روشنی بالکل نہیں آ رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا بلب دیوار پر جل رہا تھا۔ باہر دوسرے کمروں سے کبھی کبھی آدمیوں کے باتیں کرنے اور دروازے کے آگے سے گزرنے کی آواز آ جاتی تھی۔ خدا جانے کتنا وقت گزر گیا ہو گا کہ سنتری اندر آیا اس نے میری زنجیر کھولی۔ مجھے آگے لگا کر ایک تنگ اور گندے غسل خانے میں لے گیا اور مجھے گالی دے کر بولا۔

"چل بے۔ جو کچھ کرنا ہے جلدی کر کے باہر آجا۔ دو منٹ سے زیادہ لگائے تو میں گردن توڑ دوں گا۔"

اس کے بعد مجھے واپس اس کوٹھڑی میں لا کر دیوار کے ساتھ جکڑ دیا گیا۔ اس دوران مجھے اتنا اندازہ ہو گیا کہ دن کی روشنی غائب ہو چکی ہے اور باہر شام پڑ گئی ہے۔ مگر میرے لیے دن اور رات ایک برابر تھے۔ میں نے سنتری سے کہا کہ میں یہاں سے بھاگ نہیں سکتا۔ کم از کم میری ہتھکڑی تو کھول دو۔ اس نے مجھے گالی دی اور چلا گیا۔ اس کے کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے دوبارہ چائے اور ڈبل روٹی کھانے کو دی گئی۔ میں نے کھا لی اور دیوار سے لگ کر بیٹھے ہوئے کمبل کو جسم کے گرد لپیٹ کر سردی سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ میرا خیال ہے کہ رات ہو گئی ہو گی۔ کیونکہ پولیس سٹیشن سے جو آوازیں کسی وقت سنائی دے جاتی تھیں اب وہ سنائی نہیں دیتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے مجھ پر بھی ہلکی ہلکی غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی کہ دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا کہ سکھ تھانیدار دو آدمیوں کے ساتھ اندر آ رہا ہے۔ میں انتہائی

بے بسی کے عالم میں ان کو دیکھ رہا تھا۔ سکھ تھانیدار کے ساتھ جو دو آدمی تھے وہ پولیس کے آدمی ہی لگتے تھے مگر وردی میں نہیں تھے شاید انٹیلی جینس کے آدمی تھے۔ تینوں میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ سکھ تھانیدار نے بڑی رعب دار آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"کیوں۔ ابھی تک تمہارا دماغ درست ہوا ہے یا نہیں؟"

میں نے کہا۔

"آپ لوگوں نے مجھے ناحق یہاں قید کر رکھا ہے۔ نہ میں پاکستانی جاسوس ہوں' نہ میں دہشت گرد ہوں اور نہ ہی میں نے کسی کو قتل کیا ہے۔"

سکھ تھانیدار نے آواز دے کر باہر سے اسی سنتری کو بلوایا جس نے مجھے ہتھکڑی لگائی تھی۔

"مرلی دھرن! اس کو مغل اعظم کے شیش محل میں لے آؤ۔"

یہ کہہ کر سکھ تھانیدار اور اس کے دونوں ساتھی کمرے سے چلے گئے۔ سنتری نے زنجیر دیوار کے ہک سے کھول کر اپنی پیٹی کے ساتھ باندھی اور مجھے کھینچ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"چلو۔ تمہیں مغل اعظم کے شیش محل کی سیر کرائیں۔"

میں ایسا بھی احمق نہیں تھا کہ یہ سمجھتا کہ یہ لوگ واقعی مجھے دلی میں مغل اعظم شہنشاہ اکبر کے شیش محل کی سیر کرانے لے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے وہ مجھے کسی دوسرے عقوبت خانے میں لے جا رہے تھے جہاں مجھے اس سے زیادہ تشدد کا نشانہ بنایا جانے والا تھا اور اس سے زیادہ اذیتیں دی جانے والی تھیں۔ میرا خیال درست نکلا۔ اب مجھے جس کمرے میں لے جایا گیا وہاں پہلے سے ایک آدمی لوہے کے ایک شکنجے کے پاس زمین پر بیٹھا تھا۔ تھانیدار اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر وہ جلدی سے سلام کرتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تھانیدار نے اس سے پوچھا۔

"کیوں اوئے معلی! کھڈا لگا دیا ہے؟"

اس آدمی نے ہاتھ جوڑ کر کہا

"ہاں سرکار۔ سب کچھ تیار ہے"

تھانیدار نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ کانسٹیبل نے میری ہتھکڑی اتار دی۔ تین آدمیوں نے مجھے پکڑ کر زبردستی شکنجے پر لٹا دیا۔ یہ شکنجہ لوہے کے ایک سٹریچر کی طرح کا تھا جس کے دونوں جانب لوہے کے کلپ لگے ہوئے تھے۔ میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں لوہے کے کلپوں میں پھنسا کر جکڑ دیئے گئے۔ اس کے بعد جو آدمی شکنجے کا انچارج تھا اس نے ایک کل ہینڈل کو آہستہ آہستہ گھمانا شروع کر دیا۔ میرے دونوں بازو اور دونوں ٹانگیں کھنچی جانے لگیں۔ تین چار سیکنڈ کے بعد ہی میری چیخیں نکل گئیں۔ میرے بازو اور ٹانگیں ایسا لگتا تھا اپنے جوڑوں سے نکلنے والی ہیں۔ میں نے چلا کر کہا۔

"میں بے گناہ ہوں۔ میں بے گناہ ہوں مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔"

شکنجے کا ہینڈل آہستہ آہستہ گھمایا جا رہا تھا اور میرے بازو اور ٹانگیں میرے جسم کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔ درد کی ایسی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں جیسے کوئی میرے جسم میں لوہے کی سلاخیں ٹھونک رہا ہو۔ جب میری چیخوں کی آواز بھی کمزور پڑ گئی تو تھانیدار کی آواز آئی۔

"ٹھہر جاؤ۔"

درد رک گیا۔ ٹیسیں اپنی جگہ پر ٹھہر گئیں۔ میرے بازو اور ٹانگوں کے پیچھے سمٹنے لگے۔ ہڈیوں کے جوڑ ایک دوسرے کے قریب آ گئے لیکن میرے بدن میں جیسے بالکل جان نہیں رہی تھی۔ میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ تھانیدار اور اس کے دونوں ساتھی جو سویلین کپڑوں میں تھے میرے دائیں بائیں قریب آ گئے۔ تھانیدار نے اپنی چھڑی میرے ہونٹوں پر آہستہ سے مار کر کہا۔

"اب بھی وقت ہے اپنے ساتھیوں کے نام پتے بتا دو تمہیں اسی وقت چھوڑ دیا جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی مشرقی پاکستان سے جان بچا کر بھاگا تھا۔ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔"

تھانیدار کے حکم سے میرے جسم کو ایک بار پھر شکنجے میں کسا جانے لگا۔ ایک بار پھر میری چیخیں بلند ہونے لگیں۔ ان چیخوں پر واقعی میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میرے اندر کوئی دوسرا آدمی ہے جو شدید تکلیف کے عالم میں بے اختیار ہو کر چیخ رہا ہے۔ شاید یہ ایک قدرتی بات تھی۔ اس بار مجھے اس قدر ٹارچر کیا گیا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو میں اسی طرح شکنجے کے شہتیر پر پڑا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ اور پاؤں لوہے کے کلپوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ لیکن مجھے شکنجے میں کسا نہیں جا رہا تھا۔ تھانیدار اور اس کے ساتھی وہیں بیٹھے تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر تھانیدار میرے پاس آ گیا۔

"اب بھی وقت ہے میں تمہیں آخری بار مہلت دے رہا ہوں۔ اگر اس مہلت کے بعد بھی تم نے یہ نہ بتایا کہ تمہارے ساتھی ہال میں کس جگہ پر ہیں تو میں اپنے ہاتھ سے تمہیں گولی سے اڑا دوں گا۔"

مجھے شکنجے سے نکال کر واپس پہلے والے تنگ کمرے میں لا کر ڈال دیا گیا۔ اسی طرح مجھے ہتھکڑی لگا کر زنجیر کے ساتھ دیوار کی ہک میں جکڑ دیا گیا تھا۔ میری کلائیاں اور پاؤں سخت درد کر رہے تھے۔ شانوں میں بھی درد ہو رہا تھا اور کولہے کی ہڈیاں بھی دکھ رہی تھیں۔ میں اکیلا رہ گیا تو میں نے گڑگڑا کر خدا سے اپنی نجات کی دعا مانگی۔ دعا مانگنے کے بعد مجھے سکون سا مل گیا۔ سنتری میرے لیے میلے کچیلے ڈونگے میں چائے اور ڈبل روٹی لے کر آ گیا۔ اس نے ڈونگا اور ڈبل روٹی میرے آگے رکھی اور میرے قریب ہی بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"تم دوسروں کی خاطر اپنی جان سے کیوں دشمنی کر رہے ہو؟ وہ لوگ آج نہیں تو کل پکڑے ہی جائیں گے۔ پھر تم کیوں اتنی تکلیف اٹھاتے ہو؟ ایک بات میں تمہیں

بتائے دیتا ہوں۔ سردار جی ہمارے تھانیدار ہی نہیں دلی کے سب سے ظالم پولیس افسر مشہور ہیں۔ یہ جو کہتے ہیں کر کے دکھاتے ہیں۔ انہوں نے کئی مجرموں کو اپنے ہاتھ سے گولی ماری ہے۔"

میں نے کہا۔

"بھائی میں انہیں کیا بتاؤں؟ میرا کوئی ساتھی ہی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی ڈھاکے سے بھاگا تھا۔"

سنتری بولا۔

"ٹھیک ہے اگر تم مرنا ہی چاہتے ہو تو پھر تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ ایک اور بات میں تمہیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں، تمہیں گولی سے نہیں اڑایا جائے گا جس طرح تمہیں مارا جائے گا اگر میں تمہیں بتا دوں تو خوف کے مارے تمہاری ابھی جان نکل جائے گی۔ یاد رکھو اگر تم نے اپنے ساتھیوں کے نام نہ بتائے تو تمہیں بے حد اذیت ناک موت مارا جائے گا۔"

یہ کہہ کر سنتری چلا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ تھانیدار نے اسے مجھے ڈرانے کے لیے بھیجا تھا کہ میں اس قسم کی باتوں سے خوف کھا کر اسے اپنے ساتھیوں کے نام پتے بتا دوں گا مگر میں کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ایسی باتوں سے ڈرنے والا نہیں تھا۔

وہ رات گزر گئی۔ دوسرا دن آ گیا۔ اس روز مجھے شام تک کسی نے کچھ نہ کہا۔ رات ہو گئی تو مجھے دو سویلین کپڑوں والے آدمی کوٹھڑی سے نکال کر ایک تہہ خانے میں لے گئے۔ یہ تہہ خانہ پولیس سٹیشن کی عمارت کے نیچے بنا ہوا تھا۔ یہاں سکھ تھانیدار کے ساتھ دو سنتری بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف خالی بوری پڑی تھی۔ درمیان میں سٹول رکھا ہوا تھا۔ مجھے سٹول پر بٹھا دیا گیا۔ تھانیدار کہنے لگا۔

"اس جگہ سے تمہاری زندگی کا سفر ختم بھی ہو سکتا ہے اور تمہیں ایک نئی زندگی بھی مل سکتی ہے۔ اگر تم ہمیں اپنے ساتھی پاکستانی اتنک وادیوں کے نام پتے بتا دو تو تمہاری نئی زندگی کا آغاز ہو گا۔ اگر نہیں بتاؤ گے تو تمہاری زندگی کا سفر اسی جگہ پر ختم

ہو جائے گا اور تمہیں ایسی موت مارا جائے گا کہ جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"تھانیدار صاحب یقین کریں میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ جب میرا کوئی ساتھی ہی نہیں ہے تو میں آپ کو ان کے نام پتے کیسے بتا سکتا ہوں۔"

تھانیدار نے سویلین کپڑوں والے آدمی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"پرسو!" "یہ نہیں مانتا۔ چل اپنا کام شروع کر دے۔"

مجھے ہتھکڑی نہیں لگی ہوئی تھی۔ صرف میرے ہاتھ پشت پر رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ پرسو اس شخص کا نام تھا جس نے میلی سی دھوتی اور پرانی گرم چادر اوپر لے رکھی تھی اور خالی بوری کے پاس زمین پر بیٹھا تھا۔ تھانیدار کا حکم سن کر وہ اٹھا۔ دو سنتریوں نے میرے بازو مضبوطی سے پکڑ لیے۔ پرسو نے خالی بوری اٹھا لی۔ دونوں سنتریوں نے مجھے سٹول پر سے اوپر اٹھا لیا۔ پرسو نے بوری کھول کر میری ٹانگوں پر چڑھائی اور کمر تک لا کر اسے اس طرح رسی سے باندھ دیا جس طرح ہم شلوار باندھا کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا تھا کہ یہ لوگ میری ٹانگیں بوری میں کس لیے ڈال رہے ہیں۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ بوری خالی ہے۔ جیسے ہی میری ٹانگیں بوری میں ڈال کر انہوں نے اس کی رسی میر کمر کے گرد کسی' بوری کے اندر سے پھنکاروں کی خوفناک آوازیں آنے لگیں۔ یہ محسوس کر کے میرا جسم دہشت کے مارے سرد پڑ گیا کہ جس بوری کو میں خالی سمجھ رہا تھا اس میں پہلے ہی سے ایک سانپ ڈال دیا گیا تھا سانپ بار بار میری ٹانگوں سے ٹکرا کر پھنکاریں مار رہا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ وہ میری ٹانگوں سے دور بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ میرے جسم سے دلی کے پر اسرار سادھو کی پلائی ہوئی جڑی بوٹی کی خاص بو خارج ہو رہی تھی جس کی وجہ سے سانپ مجھ سے دور بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بوری اوپر سے بند تھی اور وہ بوری سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ بوری کے اندر وہ کبھی بوری کے

ایک طرف ہو جاتا، کبھی دوسری طرف پھنکار کر دوڑتا اور میری ٹانگوں اور پاؤں اور گھٹنوں سے بار بار ٹکرا جاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سانپ جس سے یہ لوگ مجھے ڈسوا کر مارنا چاہتے ہیں مجھے نہیں ڈسے گا۔ مگر وہ مجھ سے دور بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ شدید غصے اور بے بسی کے عالم میں بوری کے اندر پھنکار کر اپنے غصے کا اظہار کر رہا تھا۔ دھوتی کھیس والا پرسو شاید سرکاری سپیرا تھا۔ وہ بوری کی طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سانپ بوری کے اندر اتنا پریشان کیوں ہو رہا ہے اور اس نے ابھی تک مجھے ڈسا کیوں نہیں۔

تھانیدار نے سپیرے کی طرف دیکھا اور کہا۔

"قیدی تو ابھی تک زندہ ہے؟"

پرسو بولا۔

"مہاراج! سانپ اپنے شکار سے کھیل رہا ہے۔ ابھی ڈسے گا۔ اس کے بعد یہ آدمی سٹول پر بیٹھا نہیں رہ سکے گا۔"

خدا جانے کیا وجہ ہوئی کہ سانپ نے میری پنڈلی پر ڈس دیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ حرکت اس نے گھبراہٹ میں کی تھی۔ وہ مجھ سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن اسے کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی مرضی کے خلاف جھنجلا کر مجھے ڈس دیا تھا۔ مجھے تو کچھ نہ ہوا لیکن میں نے محسوس کیا کہ سانپ بوری کے اندر مجھے ڈسنے کے بعد نیچے میرے پاؤں کے پاس گر گیا تھا۔ اس کی پھنکاریں بھی بند ہو گئی تھیں۔ اچانک مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میرا سر ڈولنے لگا۔ اس کے بعد میرا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا اور مجھے اپنا جسم ہلکا ہوتا محسوس ہوا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ شاید میں انسان سے سانپ کی شکل اختیار کر رہا ہوں۔ مگر ایسی کوئی بات نہ تھی۔ میرا جسم معمولی سا ہلکا ہو گیا تھا لیکن میں انسانی روپ میں ہی تھا۔ میرا سر ڈھلک گیا تھا۔ جن دو سنتریوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا ان میں سے ایک نے کہا۔

"جناب عالی! قیدی مر گیا ہے۔ میرے سانپ نے اس کا کام ختم کر دیا ہے۔"

سکھ تھانیدار اٹھ کر میرے قریب آیا۔ میں اسے صاف دیکھ رہا تھا مگر میں اپنے جسم کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ آنکھیں بھی ادھر ادھر نہیں گھما سکتا تھا' نہ گردن ہلا سکتا تھا۔ سانپ کے زہر نے میرے خون میں داخل ہو کر مجھے ساکت کر دیا تھا۔ میں مرا نہیں تھا لیکن اگر کوئی دیکھتا تو اسے یہی لگتا کہ میں مر چکا ہوں۔ میرے دل کی دھڑکن بھی یا تو بند ہو گئی تھی یا اتنی مدھم پڑ گئی تھی کہ صرف دل کا ڈاکٹر ای سی جی کر کے ہی دھڑکن کو محسوس کر سکتا تھا۔

تھانیدار نے میری نبض دیکھی۔ میری گردن پر ایک طرف الٹا ہاتھ رکھ کر دیکھا کہ میرا دل دھڑک رہا ہے یا نہیں۔ اس نے سپیرے سے کہا۔

"تمہارے سانپ نے کام دکھا دیا ہے۔ بوری کھول دو۔"

مجھے فرش پر لٹا دیا گیا تھا۔ میں ان لوگوں کی آوازیں سن رہا تھا' ان کو دیکھ رہا تھا۔ پرسو سپیرے نے جلدی سے بوری کی رسی کھول کر اسے میری ٹانگوں سے الگ کیا اور اندر ہاتھ ڈال کر سانپ کو پکڑ کر باہر نکالا۔ میں دیکھ رہا تھا۔ سانپ اس کے ہاتھوں میں بے جان رسی کی طرح لٹک گیا تھا۔ اس نے انتہائی حیران کے ساتھ کہا۔

"سرکار! میرا سانپ بھی مر گیا ہے۔"

"کیسے مر گیا؟" تھانیدار نے سانپ کی طرف دیکھ کر کہا۔

سپیرا پرسو اپنے سانپ پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا جناب کہ یہ کیسے ہو گیا۔ قیدی بھی مر گیا ہے اور میرا سانپ بھی مر گیا ہے۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

تھانیدار نے کہا۔

"ہو گیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ مردہ سانپ کو باہر لے جا کر پھینک دینا۔ جاؤ۔ صبح تھانے آ جانا' تمہاری پے منٹ ہو جائے گی۔"

میری آنکھیں کھلی تھیں جو دیکھنے پر یقیناً" پتھر کی طرح بے جان لگ رہی ہوں گی۔ لیکن مجھے ان آنکھوں سے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ سپیرا مردہ سانپ کو لے کر تہہ

خانے سے نکل گیا۔ تھانیدار نے دونوں سنتریوں سے کہا۔

"اٹنک ولاوی دشمن مرگیا ہے۔ اس کا یہی انجام ہونا تھا۔ ہم ایک ایک اٹنک ولاوی کو اسی طرح مار مار کر ختم کر دیں گے۔ اسے اٹھا کر پرانے کھال پر لے جاؤ اور گڑھا کھود کر دبا دو۔"

دونوں سنتریوں نے مجھے بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کر اٹھالیا اور تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر ایک دوسرے کمرے میں لے آئے۔ یہاں انہوں نے مجھے ایک پرانے کمبل میں لپیٹا اور ایک سنتری نے مجھے اپنے کاندھے پر ڈال لیا۔ میرا چہرہ کمبل میں چھپ گیا تھا۔ میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے لے کر سنتری چلتا رہا۔ پھر مجھے یا میری لاش کو ایک گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ رات کا وقت تھا۔ لگتا تھا رات کافی ہوگئی ہے۔ کیونکہ باہر خاموشی تھی۔ سانپ نے بوری کے اندر میری پنڈلی پر کاٹا تھا۔ اس نے یہ حملہ شاید اپنی جان بچانے کے لیے کیا تھا۔ کیونکہ وہ میرے جسم سے نکلنے والی خاص جڑی بوٹی کی بو سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا مگر بوری اوپر سے بند تھی اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے گھبرا کر مجھے ڈس دیا تھا۔ اس کے زہر کا اثر مجھ پر یہ ہوا کہ میں مر تو نہ سکا لیکن میرا جسم بے جان ہوگیا۔ میں کوئی حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ صرف میرے ہوش و حواس برقرار تھے۔ میں سن سکتا تھا دیکھ سکتا تھا مگر اپنی آنکھوں کو دائیں بائیں' اوپر نیچے گھما نہیں سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں بولنا چاہوں تو بول بھی سکتا تھا۔

اس خیال سے مجھ پر خوف طاری ہوگیا تھا کہ یہ سنتری مجھے کسی ویران جگہ پر گڑھے میں دبانے لے جا رہے ہیں۔ اگر میں اسی طرح بے جان رہا تو میرا انجام کیا ہوگا؟ میں سانس ضرور لے رہا تھا مگر اتنی آہستہ آہستہ سانس کی آمدورفت جاری تھی کہ خود مجھے بھی اس کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میرا دل بھی بہت آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ ظاہر ہے اگر میں زمین کے اندر دفن کر دیا گیا تو میں خود باہر نہیں نکل سکوں گا اور گڑھے میں زمین کے اندر پڑے پڑے میرا جسم گلنے سڑنے لگ جائے گا۔ یہ تصور

ہی بڑا ہیبت ناک تھا کہ میں زندہ حالت میں اپنے جسم کو ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل ہوتے محسوس کروں گا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آگے چل کر کیا ہوگا۔

جس گاڑی یا ویگن میں مجھے پھینکا گیا تھا وہ دلی کی سڑکوں پر دوڑتی چلی جا رہی تھیں۔ میں کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ میرا چہرہ بھی کمبل میں چھپا ہوا تھا جس کی وجہ سے مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ گاڑی نے کئی موڑ کاٹے۔ آخر ایک جگہ پہنچ کر اس کی رفتار ہلکی ہوگئی اور پھر رک گئی۔ ساتھ دو یا تین سنتری تھے۔ وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے نیچے اترے۔ میری لاش کو گھسیٹ کر زمین پر ڈال دیا گیا۔ مجھے پھاؤڑا چلانے کی آواز آئی۔ مجھے دفن کرنے کے لیے گڑھا کھودا جا رہا تھا۔ مجھ پر ناقابل بیان خوف کی کیفیت طاری تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں زمین کے اندر دفن کیا جانے والا تھا۔ میں نے دعا مانگنی شروع کر دی کہ اے خدا تو ہی زندگی اور موت دینے والا ہے' میرے گناہ معاف کر دے۔ مجھے اس زندہ حالت میں اپنے آپ کو مرتے دیکھنے کے عذاب سے بچا لے۔

سنتریوں کو کونسی باقاعدہ قبر کھودنی تھی اور لحد وغیرہ بنانی تھی۔ انہوں نے زمین میں دو تین فٹ گہرا گڑھا کھودا اور پھاؤڑا چلانے کی آواز رک گئی۔ ایک سنتری نے کہا۔

"چلو اسے اٹھا کر گڑھے میں ڈال دو۔"

مجھے کسی نے اٹھایا نہیں بلکہ میری ٹانگیں دو آدمیوں نے پکڑیں اور گھسیٹ کر اس گڑھے میں پھینک دیا۔ میں گڑھے میں اس طرح گرا کہ میرے گھٹنے میرے سینے کے ساتھ لگ گئے اور چہرہ گڑھے کی دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ میرے اوپر دھڑ دھڑ مٹی گرنا شروع ہوگئی۔ گڑھے کو مٹی سے پر کیا جا رہا تھا۔ مٹی میں چھوٹے بڑے پتھر بھی تھے جو میرے جسم پر گر رہے تھے۔ سنتری آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے ان کی آوازیں مدھم ہوتی گئیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہوں نے اپنی آوازیں دھیمی کر لی تھیں بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ میں زمین کے اندر چلا گیا تھا اور مٹی سے گڑھا بھر دیا گیا تھا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ دو آدمی مٹی کو اپنے پاؤں سے دبا رہے ہیں۔ اس کے

بعد کسی نے دوسرے سے کچھ کہاجو میری سمجھ میں نہ آیا۔ گڑھے کو دبانے والے پاؤں رک گئے۔ اس کے ساتھ ہی پھاوڑا گاڑی میں پھینکنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ گاڑی کا انجن سٹارٹ ہوا اور انجن کی آواز میرے کانوں سے دور ہو کر غائب ہو گئی۔

اب ہر طرف موت کا سناٹا طاری ہوگیا تھا۔

کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اگر دور سے کسی گاڑی کے گزرنے کی آواز آتی بھی ہوگی تو وہ مجھے قبر کے اندر سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک طرح سے میں قبر میں ہی پڑا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ مرنے کے بعد مردہ اسی طرح قبر میں پڑا ہوتا ہوگا۔ میں دل میں توبہ استغفار پڑھ رہا تھا اور خداوند کریم سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا کہ اگر میرے جسم میں کچھ دیر تک حرکت پیدا نہ ہوئی تو میرا انجام وہی ہوگا جو ایک لاش کا ہوتا ہے۔ اگرچہ میرے جسم سے خارج ہونے والی جڑی بوٹی کی خاص بو کی وجہ سے ابھی تک کوئی کیڑا مکوڑا یا چیونٹی میرے قریب نہیں آئی تھی مجھے معلوم تھا کہ اگر میں دو ایک دن تک اسی حالت میں قبر میں پڑا رہا تو خود میرا جسم کیڑے مکوڑوں میں تبدیل ہو جائے گا۔

یہی سوچ سوچ کر میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ میں بے جان پتھر کی طرح زمین کے اندر پڑا تھا۔ وقت کا کچھ احساس نہیں تھا۔ میں نے ہلکی سی چیخ ماری' یہ دیکھنے کے لیے کیا میں بول سکتا ہوں۔ میں اونچی آواز میں اللہ سے دعا مانگنے لگا۔ یہ دیکھ کر مجھے تھوڑا سا اطمینان ضرور ہوا کہ میں بول سکتا ہوں۔ لیکن میرے بولنے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیونکہ میں کچھ وقت کے بعد ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل ہونے والا تھا۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ میں زمین میں زندہ دفن کر دیا گیا ہوں۔ باہر سے کسی قسم کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ مجھے کسی دور دراز ایسی ویران جگہ پر زمین میں دفن کیا گیا ہے جہاں سے کسی انسان کا گزر نہیں ہوتا۔ کچھ پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا تھا رات گزر گئی تھی یا نہیں۔ میرے لیے تو قبر کے اندر بھی رات ہی پڑی تھی۔ آنکھوں کے آگے کمبل تھا جو اوپر مٹی گرنے کی وجہ سے دبکر میرے چہرے کے ساتھ لگ گیا تھا۔ سارے

جسم پر مجھے اوپر پڑی ہوئی تین فٹ مٹی کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے بلند آواز میں چیخنا چلانا شروع کر دینا چاہیے۔ شاید باہر سے کوئی میری آواز سن کر گڑھے کے قریب آ جائے اور مجھے اس عذاب سے نجات دلائے۔ اول تو باہر کوئی نہیں تھا۔ میں چیختا بھی تو وہاں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ فرض کرو وہاں کوئی آدمی آ بھی جاتا اور میری آواز سن کر گڑھے میں سے مجھے نکال بھی لیتا تو مجھے بولتا دیکھ کر وہ یہ سمجھتا کہ مردہ زندہ ہو گیا ہے اور بھاگ جاتا۔

میرے لیے وقت رک گیا تھا۔ گڑھے میں پڑے ہوئے مجھے ہاتھ پر شدید چبھن سی محسوس ہوئی اور ایسے لگا کہ کوئی چیز میرے اوپر سے رینگ کر گزری ہے۔ میں گڑھے میں دبا ہوا تھا اس لیے اسے نہ دیکھ سکا۔ غالباً" یہ کوئی سانپ تھا جس نے مجھے کاٹا تھا۔

باہر شاید رات گزر چکی تھی۔

مجھے بڑی مدھم مدھم آوازیں دور سے گاڑیوں کے گزرنے کی کسی وقت آ جاتی تھیں۔ گاڑی کے انجن یا ہارن کی بہت ہی دھیمی سی آواز آتی اور اس کے بعد موت ایسی خاموشی طاری ہو جاتی۔ اب میرے ساتھ ایک ایسی بات ہوئی جس کا میں کئی روز سے انتظار کر رہا تھا۔ شاید خدا نے میری فریاد سن لی تھی۔ مجھے چکر سے آنے شروع ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں بڑی عاجزی سے دعا مانگی کہ اے میرے پاک پروردگار مجھے سانپ کی شکل عطا کر دے۔ میرے سر کے چکروں کی شدت زیادہ بڑھ گئی۔ پھر ایک زور کا چکر آیا اور میرے جسم کا بوجھ مجھ سے الگ ہو گیا۔ ساتھ ہی میں خود بھی جیسے اپنے جسم سے الگ ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ میں وہی بالشت بھر سانپ کی شکل میں کمبل کے اندر کھسک رہا تھا۔ میرے اندر سانپ کی ساری جبلتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ میں مٹی کے اندر کی اور گڑھے کے باہر کی ساری خوشبوئیں اور بوئیں محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے قبر کی تاریکی میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ مجھے اپنا آپ ہوا کی طرح ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ میں سانپ سے الگ بھی

تھا اور سانپ کے وجود میں بھی تھا۔ وہی مٹی جو ایک بوجھ بن کر میرے اوپر پڑی تھی اب میرے رینگنے سے خود بخود آگے سے ہٹتی جا رہی تھی۔

میں تھوڑی سی جدوجہد کے بعد قبر نما گڑھے سے باہر آگیا۔ باہر دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ رات کو کہیں سے بادل آگئے تھے۔ آسمان سیاہ کالے بادلوں میں چھپ گیا ہوا تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ میں نے چاروں طرف سر گھما کر اپنی زبان بار بار باہر نکال کر فضا کو سونگھا۔ مجھے ایک جانب سے ایک ایسی بو آتی محسوس ہوئی جس سے میں مانوس تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ میرے ساتھی کمانڈو منظر خالد کے جسم کی بو تھی۔ مگر یہ بو ایک تو بے حد مدھم تھی دوسرے ہوا کی وجہ سے کسی وقت آتی اور کسی وقت اچانک غائب ہو جاتی تھی۔ سمت کا تعین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن کمانڈو خالد کی بو نے مجھے یہ بتا دیا تھا کہ وہ دلی شہر میں ہی ہے۔ دلی سے باہر نہیں گیا۔ سانپ کی حیثیت سے میں کمانڈو خالد کی بو سے اس لیے مانوس ہو گیا تھا کہ وہ کافی دیر سے میرے ساتھ رہ رہا تھا۔ مجھے اب کمانڈو خالد کے پاس پہنچنا تھا۔ میں گڑھے سے نکل کر ایک طرف سرکنڈوں میں چھپ کر بیٹھ گیا اور کمانڈو خالد کی بو کا تعین کرنے لگا کہ یہ کس سمت سے آ رہی ہے۔ ہوا کے جھونکے بار بار بو کو مجھ سے دور کر دیتے تھے۔ پھر بھی میں نے معلوم کر لیا۔ کمانڈو خالد کی بو ایک خاص سمت سے برابر آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی جگہ بیٹھا ہوا ہے یا چھپا ہوا ہے۔ اگر وہ وہاں سے حرکت کر کے کسی دوسری طرف چلا جاتا تو اس کی بو ضرور ادھر ادھر یا آگے پیچھے ہو جاتی۔ لیکن میں نے سانپ کی حیثیت سے اپنی جبلت کی مدد سے معلوم کر لیا کہ کمانڈو خالد ایک خاص جگہ پر موجود ہے کیونکہ اس کے جسم کی بو ایک سمت سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مسلسل آ رہی تھی اور اس میں ذرا سی بھی کمی بیشی نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے اللہ کا نام لے کر اس سمت کو رینگنا شروع کر دیا۔

ایک سانپ کے لیے دلی ایسے آباد اور لوگوں سے بھرے ہوئے زبردست ٹریفک والے شہر میں دن کے وقت اپنے کسی ساتھی کی تلاش میں نکل پڑنا بے حد خطرناک

ثابت ہو سکتا تھا۔ چونکہ میرا انسانی شعور زندہ تھا اس لیے میں کسی حد تک خطرے کے وقت اپنا بچاؤ کر سکتا تھا۔ لیکن یہ خطرہ تو تلوار کی طرح میرے سر پر برابر لٹکا ہوا تھا کہ اگر مجھ پر کسی انسان کی نظر پڑ گئی تو میرا زندہ رہنا ناممکن ہے۔ لوگ تو مجھے اسی وقت کچل ڈالیں گے۔ لوگ سانپ کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور ایسا سمجھنے میں وہ حق بجانب بھی ہیں۔ مگر کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ میں سانپ نہیں انسان ہوں۔ اگر میں انسان کی آواز میں بولتا تو بھی کسی کو یقین نہیں آ سکتا تھا کہ میں سانپ نہیں بلکہ سانپ کی شکل میں انسان ہوں۔ بلکہ ایسی صورت میں تو لوگ مجھے کوئی بدروح سمجھ کر کسی صورت میں بھی زندہ نہ چھوڑتے۔

میں نے کمانڈو خالد کی بو کو اپنے سامنے رکھا ہوا تھا اور اسی سمت کو آہستہ آہستہ سرکنڈوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا رینگتا چلا جا رہا تھا۔ میں گندے نالے کے اونچے کنارے پر رینگ رہا تھا۔ یہ بالکل ویران جگہ تھی۔ کہیں کہیں کوئی درخت تھا۔ ہر طرف خشک سرکنڈے اور جھاڑیاں تھیں۔ میں کمانڈو خالد کی بو کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ آسمان پر بادل جھکے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ کسی بھی وقت بارش شروع ہو جائے گی۔ بارش میں میرا چلنا مشکل تھا۔ لیکن ابھی تک بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔ کمانڈو خالد کی بو ویسی ہی مدھم تھی جیسے پہلے تھی۔ ہوا کا جھونکا کبھی کبھی ہمارے درمیان میں آ کر اس کی بو کو مجھ سے الگ کر دیتا تھا۔ تب میں رک جاتا۔ دوبارہ بو محسوس ہوتی تو پھر رینگنے لگتا۔ چونکہ علاقہ غیر آباد اور اجاڑ تھا اس لیے میں جتنی تیزی سے رینگ سکتا تھا رینگ رہا تھا۔ گندے نالے کا پل آ گیا۔ پل پر سے کچھ آدمی گزر رہے تھے۔ کمانڈو خالد کی بو پل کی دوسری طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں وہیں ایک جگہ چھپ کر پل پر سے آدمیوں کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگا۔ پل کی دوسری جانب کسی بستی کے مکان نظر آ رہے تھے۔ ایک ہوائی جہاز شور مچاتا آسمان پر سے گزر گیا۔ دور سے کسی ٹرک کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ جب پل بالکل خالی ہو گیا تو میں اوٹ میں سے نکلا اور پل پر آ گیا۔ پل لکڑی کے تختے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔

پل کے نیچے گندا نالہ بہہ رہا تھا۔ وہاں سے میں نالہ عبور نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے لامحالہ پل کے اوپر سے ہی گزرنا تھا۔ میں پل کی ریلنگ کے بالکل ساتھ لگ کر رینگنے لگا۔ میں ویسے بھی چھوٹا سا تھا۔ میرا رنگ بھی بھورا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کسی کو نظر نہیں آؤں گا لیکن پیچھے سے آتے ہوئے دو آدمیوں نے مجھے دیکھ لیا اور سانپ سانپ کا شور مچا دیا۔ دوسری طرف سے ایک آدمی میری طرف دوڑا۔ اس کے ہاتھ میں سونٹا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی زور سے سونٹا مارا۔ میری قسمت اچھی تھی میں بچ گیا۔ لیکن جلدی سے پل کے نیچے ہو گیا۔ اب میں ان سے محفوظ ہو گیا تھا۔ میں پل کے نیچے لگ کر آگے کو جلدی جلدی رینگنے لگا۔ لیکن بہت جلد مجھے محسوس ہوا کہ میں پل کی چھت سے لگ کر چھپکلی کی طرح زیادہ دیر نہیں رینگ سکوں گا۔ میں فوراً" پل کی ریلنگ کے نیچے ہو گیا۔ اتنی دیر میں وہاں اور لوگ جمع ہو گئے تھے۔ چھوٹا سا پل تھا۔ جیسے ہی میں پل کے دوسرے سرے پر نکلا تو لوگوں نے مجھ پر پتھروں اور ڈنڈوں کی بارش کر دی۔ میں یونہی کسی کو ڈس کر ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی اس میں اپنی جان جانے کا خطرہ تھا۔ میں بڑی تیز رفتاری سے رینگتا ہوا گندے نالے کی جھاڑیوں میں گھس گیا اور جھاڑیوں کے اندر ہی دشمن لوگوں سے کافی دور نکل گیا۔

جب میں نے محسوس کیا کہ میں خطرے سے نکل آیا ہوں اور لوگوں کی آوازیں آنا بھی بند ہو گئی تھیں تو میں جھاریوں سے نکل کر نالے کے کنارے پر آیا اور میں نے دیکھا کہ سامنے ایک سڑک تھی جس پر سے گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ سڑک کی دونوں جانب مکان اور عمارتیں تھیں۔ سامنے کی جانب دکانیں بھی تھیں۔ کافی لوگ چل پھر رہے تھے۔ میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہیں سر گھما کر ایک خاص سمت کی ہوا کو سونگھا۔ ہوا میں کمانڈو خالد کی بو بہت ہی مدھم ہو چکی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ جہاں پہلے بیٹھا تھا اب وہاں سے دور ہٹتا جا رہا ہے۔ میں بے اختیار ہو کر اس کی بو کے پیچھے چل پڑا۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا بو کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کمانڈو خالد کسی ریل گاڑی یا موٹر گاڑی میں سوار ہو کر شہر سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک

کہ جب میں سڑک سے دس بارہ فٹ پیچھے ایک اونچی عمارت کی عقبی دیوار کے پاس پہنچا تو فضا میں سے کمانڈو خالد کی بو ختم ہو چکی تھی۔ یہ لمحات میرے لیے انتہائی مایوسی کے لمحات تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس طرف جاؤں۔ مشتاق صاحب کے ہوٹل اور ان کے کوارٹر کا راستہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اگر معلوم بھی ہوتا تو ٹریفک سے بھرے ہوئے بازاروں اور چلتی گاڑیوں میں سے گزرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

عمارت کی دیوار کے پیچھے ایک جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا اور اپنے انسانی دماغ سے سوچنے لگا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے۔ میرے پاس اپنے ساتھی کمانڈو منظر خالد تک پہنچنے کا ایک ہی ذریعہ اس کے کپڑوں سے نکلنے والی اس کے جسم کی بو تھی جو اب مجھے محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یہ بو مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کمانڈو خالد اب دلی شہر میں بھی تھا یا وہاں سے نکل چکا تھا۔ میں دشمنوں میں گھرا ہوا اکیلا اور بے سہارا رہ گیا تھا۔ کوئی بھی آدمی مجھے دیکھ کر سانپ سانپ کا شور مچا کر دوسروں کو بلا کر مجھے ہلاک کر سکتا تھا۔ میں وہیں جھاڑی میں بیٹھا رہا۔ میرے قریب ہی سے ایک چوہا نکل کر مجھے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ جیسے ہی میں نے اس کی طرف نگاہ ڈالی وہ خوف کے مارے ایسے غائب ہوا جیسے اسے زمین کھا گئی ہو۔ ویسے بھی میرے جسم سے نکلنے والی خاص بو کی وجہ سے کوئی کیڑا مکوڑا اور جانور وغیرہ میرے قریب نہیں پھٹک سکتا تھا۔ مجھے دلی والے پر اسرار سادھو کا خیال آ گیا جس نے مجھے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں' سانپوں اور مگرمچھوں کو مجھ سے دور رکھنے والی خاص جڑی بوٹی کا سفوف پانی میں گھول کر پلایا تھا اور جس کی وجہ سے میں خونی جنگل میں سے آسانی کے ساتھ گزر گیا تھا۔ مجھے اس کی جھونپڑی کا بھی راستہ معلوم نہیں تھا۔

میں نے سوچا کم از کم اس وقت تک مجھے اسی جگہ چھپے رہنا چاہیے جب تک کہ رات کا اندھیرا نہیں چھا جاتا۔ میں جتنا چاہے انتظار کر سکتا تھا۔ میرے سانپ کے جسم کو کوئی کسی قسم کی کوفت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ صرف میرا انسانی ذہن زیادہ انتظار کی

تکلیف برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ میں خاموشی سے جھاڑی میں بیٹھا رہا۔ ابھی تک بارش نہیں ہوئی تھی۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں ہوا کو ایک خاص سمت کی طرف منہ کر کے سونگھ لیتا تھا کہ شاید مجھے کمانڈو خالد کی بو آ جائے لیکن ہر بار مجھے مایوسی ہوتی۔ میں نے ایک دفعہ چاروں طرف سر گھما کر ہوا کو سونگھا۔ کسی طرف سے بھی اس کی بو نہیں آ رہی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کمانڈو خالد میری تلاش میں ناکام ہونے کے بعد یا میرا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو کر واپس بھوپال چلا گیا ہے۔ کیونکہ وہ بھی اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ زیادہ دن لوگوں کی نظروں کے سامنے رہ سکے۔ میں سوچنے لگا کہ جب اس نے بھوپال پہنچ کر جمیلہ کو بتایا ہو گا کہ ہم نے شری راج اور اس کے بدمعاشوں کو تو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا لیکن کرم داد ہم سے بچھڑ گیا ہے تو اس بے چاری پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ لیکن ہم حالات کی ستم رانیوں کا شکار تھے۔ جو مصیبت ہم پر پڑ چکی تھی ہمیں بہرحال اس میں سے گزرنا ہی تھا۔ خدا سے یہی دعا تھی کہ یا اللہ ہمیں زندہ سلامت رکھنا تاکہ ہم دونوں میاں بیوی جو ایک دوسرے کو دیوانہ وار پیار کرتے ہیں اور جو بے قصور ہیں خیریت سے اپنے وطن پاکستان پہنچ جائیں۔

سڑک پر سے گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگوں کی بھی آوازیں آ رہی تھیں۔ دن گزرتا گیا۔ آخر سورج غروب ہونا شروع ہو گیا۔ پھر شام کا اندھیرا زمین پر اتر آیا۔ میں نے جھاڑی میں سے سر باہر نکال کر دیکھا عمارت کی دونوں جانب سڑک کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ دوسری عمارتوں کی بتیاں بھی جل اٹھی تھیں۔ ایک بار پھر پریشان کر دینے والا سوال میرے سامنے آ گیا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ مجھے اپنے محسن مشتاق علی صاحب کے ہوٹل کا راستہ معلوم بھی ہوتا تو سانپ کے روپ میں ان کے پاس جانا مناسب نہیں تھا۔ اگر میں انسانی آواز میں ان کو ساری کہانی سنانی بھی شروع کر دیتا تو یقینی بات تھی کہ وہ ڈر جاتے اور یہی سمجھتے کہ یہ کوئی بدروح یا چڑیل ہے جو سانپ بن کر میری آواز میں باتیں کرنے لگی ہے۔ اگر فرض کر لیا کہ وہ مجھ پر

اعتبار بھی کر لیتے تو سوائے اس کے میری اور کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے کہ مجھے کسی جگہ چھپا دیتے اور کہتے کہ اپنے ساتھیوں کا انتظار کرو۔ میں انہیں یہ تو نہ بتا سکتا تھا کہ پیلس ہوٹل میں قیامت خیز دھماکہ کر کے ہم نے ہی شری راج اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کیا ہے۔ انہیں تو ہم نے یہی بتایا تھا کہ ہم جمیلہ کی تلاش میں دلی آئے ہیں۔

جب کچھ بھی میری سمجھ میں نہ آیا اور میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو آخر میں نے یہی سوچا کہ اسی جگہ بیٹھے رہتا ہوں۔ جب رات آدھی گزر جائے گی اور سڑک پر خاموشی چھا جائے گی تو یہاں سے نکل کر کسی اور طرف جانے کی کوشش کروں گا۔ ہو سکتا ہے اس وقت تک مجھے کمانڈو خالد کی بو آنے لگے۔ عجیب بات تھی کہ میں دلی میں مشتاق صاحب مجاہد رحمت خان' انور خان وغیرہ کے ساتھ بھی رہا تھا مگر ان کی بو مجھے بالکل نہیں آ رہی تھی۔ یا مجھے ان کی بو کا ادراک نہیں تھا۔ لیکن کمانڈو خالد کے کپڑوں اور جسم کی بو کو میں نے فوراً" پہچان لیا تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ کمانڈو خالد کو میرے ساتھ ساتھ رہنے کا زیادہ موقع ملا تھا۔ جیسے جیسے رات گہری ہوتی جا رہی تھی خاموشی بھی گہری ہو رہی تھی۔ پہلے دور سے کسی موٹر گاڑی کی آواز آ جاتی تھی۔ اب وہ بھی نہیں آتی تھی۔ مجھے باہر نکل کر سیر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سانپ تو ایک ایک مہینہ اپنے بل میں گھس کر گزار دیتا ہے۔ صرف میرا انسانی ذہن یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتا تھا کہ میں سانپ کی شکل میں یہاں سے نکل کر کس طرف جا سکوں گا۔ سانپ کا تو شہر دشمن ہوتا ہے۔ میں اپنا چھوٹا سا سر اپنی کنڈلی میں چھپائے بالکل ساکت ہو کر جھاڑی کے اندر بیٹھا تھا کہ مجھے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ ہو سکتا تھا کوئی شخص اس عمارت میں رہتا ہو اور کسی دوسرے شہر سے رات کی گاڑی میں آیا ہو۔

میں اپنا سر نیچے کیے خاموش بیٹھا رہا۔

گاڑی کا انجن رکا تو مجھے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ وہ روتے ہوئے کسی کو بڑی عاجزی سے کہہ رہی تھی۔

"بھگوان کے لیے مجھے کچھ نہ کہنا۔ میرا پرسوں بیاہ ہونے والا ہے۔ بھگوان کے لیے مجھے کچھ نہ کہنا۔"

میں نے کنڈلی میں سے سر اوپر اٹھالیا۔ کسی مرد نے کرختگی سے کہا۔"

رام داس! یار کیا سوچ رہے ہو۔ اٹھاؤ اس کو۔ لے چلو اندر۔"

عورت نے روتے ہوئے کہا۔

"بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں کنواری ہوں۔ بھگوان کے واسطے مجھے کچھ نہ کہنا۔"

یہ کوئی لڑکی تھی جو روئے جا رہی تھی۔ دوسرے مرد کی آواز آئی۔

"یار اٹھاؤ اسے۔ لے چلو اندر۔"

پھر مجھے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے دو تین آدمی لڑکی کو اٹھانے اور گھسیٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لڑکی بری طرح رو رہی تھی اور ان لوگوں کی منتیں کر رہی تھی۔ مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ یہ کوئی بدمعاش تھے جو کسی کنواری لڑکی کو اٹھا کر لے آئے تھے اور اب اس کی زندگی برباد کرنے والے تھے۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں تیزی سے جھاڑی میں سے نکل کر عمارت کے سامنے کی جانب آگیا۔ اس وقت تک بدمعاش لوگ اس لڑکی کو اٹھا کر اندر لے جا چکے تھے۔ یہ کوئی مکان تھا جس کا گیٹ تھوڑا سا کھلا رہ گیا تھا۔ سامنے ایک گاڑی کھڑی تھی۔

میں تیزی سے گیٹ میں گھس گیا۔ آگے ایک تنگ سا راستہ مکان کے برآمدے تک جاتا تھا۔ میں تیزی سے رینگتا ہوا برآمدے میں آگیا۔ برآمدے میں ایک کمرہ تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ میں دیوار پر چڑھنے لگا۔ اندر سے مجھے لڑکی کی گھٹی گھٹی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ابھی تک مزاحمت کر رہی تھی اور روئے جا رہی تھی۔ میں روشندان میں سے کمرے کی دیوار پر آگیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ صرف ایک بتی روشن تھی۔ کونے میں پلنگ پر بستر بچھا تھا اور دو آدمی ایک نیم عریاں لڑکی کی ساڑھی کو کھینچ کھینچ کر اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لڑکی نے دونوں ہاتھوں سے اپنے جسم کی بچی ہوئی

ساڑھی کے پلو کو پکڑ رکھا تھا اور رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"بھگوان کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔ بھگوان کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔"

ایک آدمی نے جس نے فل سویٹر پہنا ہوا تھا۔ میز پر شراب کی بول کھول کر ایک گلاس میں شراب ڈال رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"کیا کرتے ہو تم لوگ۔ تم دونوں مل کر ایک لڑکی کو ننگا نہیں کر سکتے۔"

ایک دم سے میرا انسانی ذہن غصے سے بھر گیا۔ خواہ یہ لڑکی ہندو تھی۔ مگر کسی کی بہن اور بیٹی تھی اور کنواری تھی اور بہت جلد اس کا بیاہ ہونے والا تھا۔ یہ بدمعاش اس کو کہیں سے اٹھا کر لے آئے تھے اور اب اس کے ساتھ گینگ ریپ کر کے اس کی زندگی ہمیشہ کے لیے تباہ کرنے والے تھے۔ اس کے بعد مجھے نہیں پتہ کہ مجھے کیا ہوا۔ میں نے دیوار پر سے پلنگ پر چھلانگ لگا دی۔ میں ایک بدمعاش کی گردن پر گرا اور گرتے ہی اسے ڈس لیا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ میرا زہر کس قدر ہلاکت خیز اور جلدی اثر کرنے والا تھا۔ وہ آدمی تو وہیں دہرا ہو گیا۔ میں نے پلک جھپکنے میں دوسرے کو بھی ڈس دیا۔ وہ بھی وہیں اوندھا ہو گیا۔

لڑکی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ چیخ مار کر پلنگ سے دوسری طرف کود گئی۔ اب تیسرے بدمعاش نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے مجھ پر شیشے کا گلاس دے مارا مگر وہ مجھے نہ لگا۔ میں وہیں سے اچھل کر تیسرے بدمعاش کی گردن سے چمٹ گیا اور اسے بھی ڈس کر وہیں ڈھیر کر دیا۔ لڑکی ساڑھی سے اپنے نیم عریاں بدن کو چھپائے دیوار کے ساتھ لگی' خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ وہ دروازے کی طرف دوڑی کہ کنڈی کھول کر باہر نکل جائے باہر سے کسی نے زور سے دروازے پر دستک دی اور کہا۔

"ابے رام داس! ہماری باری کب آئے گی بے؟"

لڑکی وہیں بیٹھ گئی۔ میں تیسرے آدمی کو ہلاک کرنے کے بعد میز پر کنڈلی مارے پھن پھیلا کر بیٹھا ہوا تھا۔ جب اندر سے کسی نے جواب نہ دیا تو باہر والے بدمعاش نے دوبارہ آواز دی۔

"رام داس! دروازہ کھولو کیا شراب پی کر الٹ گئے ہو؟ ہمارا بھی حصہ دو۔"

لڑکی کبھی میری طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھتی اور کبھی دروازے کی طرف دیکھتی۔ اس نے کنڈی نہیں کھولی تھی۔ میں اسی طرح میز پر بیٹھا تھا۔ باہر والے بدمعاش نے گالیاں بکنی شروع کر دیں۔

"تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ حرام زادو! میں آ رہا ہوں۔"

باہر سے دروازے کو زور زور سے دھکیلا جانے لگا۔ پھر باہر والے بدمعاش نے زور سے دروازے کو دھکا دیا اور دروازے کی کنڈی اکھڑ گئی اور دروازہ دھڑک سے کھل گیا۔ ایک پہلوان ٹائپ کا آدمی شراب کے نشے میں جھومتا جھامتا اندر داخل ہوا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو تو نہ دیکھا۔ لڑکی کو دیکھا تو اس سے لپٹ گیا اور اس کی ساڑھی نوچنی شروع کر دی۔ ظاہر ہے میں اسے کیسے معاف کر سکتا تھا۔ میں نے میز پر سے چھلانگ لگائی اور اس چوتھے بدمعاش کی ٹانگ پر ڈس دیا۔ وہ ایک سیکنڈ کے لیے تو کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر دھڑام سے پیچھے کو گر پڑا۔

اس واردات کے بعد میں واپس میز پر آ کر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ لڑکی ہندو تھی۔ ہندو لوگ سانپ کو بہت مانتے ہیں۔ اس لیے کہ میں نے کتابوں میں پڑھ رکھا تھا کہ ان کے دیوتا شو جی کے سر پر بھی ایک سانپ کنڈل مارے بیٹھا ہوتا ہے۔ شو جی ہندوؤں کے بہت بڑے دیوتا ہیں اور شو جی دیوتا کے سانپ کی ہندو لوگ پوجا کرتے ہیں۔ لڑکی سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے دروازے سے باہر نکلنے لگی تو میں نے انسانی آواز میں کہا۔

"بہن! باہر مت جاؤ۔ وہاں کوئی اور بدمعاش مل گیا تو کیا کرو گی۔"

لڑکی وہیں پتھر کی طرح ساکت ہو گئی۔ اس کو کبھی یقین نہیں آ سکتا تھا کہ یہ جملے سانپ نے بولے ہیں۔ وہ کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

"بہن! ڈرو مت۔ یہاں میرے سوا اور کوئی زندہ آدمی نہیں ہے۔ میں ہی تم سے بات کر رہا ہوں۔"

لڑکی کے چہرے پر اب خوف کی بجائے عقیدت کا تاثر زیادہ نمایاں تھا۔ اس نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا تم ناگ دیوتا ہو؟"

مجھے اپنے آپ کو چھپانے کا بڑا اچھا موقع مل گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں ناگ دیوتا کا بھائی ہوں۔ مجھے ناگ دیوتا نے تمہاری مدد کے لیے یہاں بھیجا ہے۔ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے چاروں بدمعاشوں کو جو تمہاری عزت برباد کرنا چاہتے تھے ہمیشہ کی نیند سلا دیا ہے۔ مجھے بتاؤ تم کہاں جانا چاہتی ہو۔"

لڑکی نے جلدی جلدی اپنے جسم کے گرد ساڑھی لپیٹی اور میرے آگے ہاتھ جوڑ کر سجدے میں گر گئی۔

"ناگ دیوتا کی جے ہو۔ جے ہو شوجی مہاراج کی۔"

اس نے سجدے سے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں عقیدت کے آنسو تھے۔

میں نے کہا۔

"بہن! جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل چلو۔ یہاں چار لاشیں پڑی ہیں۔ یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔"

لڑکی نے ایک بار پھر مجھے ماتھا ٹیکا اور جے ہو ناگ دیوتا کی کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے فوراً اسے روکا اور کہا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ رات کا وقت ہے کوئی پتہ نہیں راستے میں کوئی اور بدمعاش مل جائے۔"

وہ بولی۔

"مہاراج آپ کی بڑی کرپا ہوگی میرے ساتھ میرے گھر تک چلئے۔"

میں خود یہی چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل کر کسی ایسی جگہ پہنچوں جہاں سے مجھے معلوم ہو سکے کہ میں کہاں ہوں اور وہاں سے کس طرف نکل سکتا ہوں۔ اس لڑکی کو میں نے تباہی سے بچایا تھا اور وہ مجھے ناگ دیوتا کا بھائی بھی سمجھ رہی تھی۔ یہ لڑکی

میری اتنی مدد ضرور کر سکتی تھی کہ مجھے بھوپال جانے والی گاڑی میں چھوڑ دے تاکہ میں واپس جمیلہ کے پاس پہنچ سکوں۔ میں نے کہا۔

"تم مجھے اپنی ساڑھی میں چھپا لو۔ اگر راستے میں کسی آوارہ بدمعاش نے تم پر حملہ کیا تو میں اس کو سنبھال لوں گا۔"

لڑکی نے بڑے آرام سے مجھے اٹھا لیا۔ یہ اس کی عقیدت کا اثر تھا کہ اسے اب مجھ سے سانپوں والا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے پاس مجھے چھپانے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں چھوٹا سا سانپ تھا۔ اس نے اٹھا کر اسی طرح مجھے اپنے بلاؤز کے اندر چھپا لیا جس طرح مجھے میری بیوی جمیلہ کبھی کبھی چھپا لیا کرتی تھی۔ میں نے لڑکی سے اس کا نام پوچھا۔ اس نے اپنا نام کوشیلا بتایا۔ میں نے پوچھا۔

"تمہارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے۔ تم یہاں سے کس طرح گھر جاؤ گی؟"

اس نے کہا۔

"جس طرح بھی ہوگا میں گھر پہنچ جاؤں گی اور اب تو ناگ دیوتا میری رکھشا کے لیے میرے ساتھ ہے۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔"

ہم اس مکان سے باہر آ گئے۔ سڑک رات کے سناٹے میں خالی پڑی تھی۔ وہ جلدی جلدی سڑک پر ایک طرف چلنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سارے علاقے سے واقف ہے۔ ایک بات اسے کہنی بہت ضروری تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا راز کسی کو معلوم ہو۔ میں نے اسے کہا۔

"کوشیلا بہن! میں ناگ دیوتا کا خاص بھائی ہوں۔ مجھے ناگ دیوتا نے دلی کی راجدھانی میں اس لیے بھیجا ہے کہ میں شریف عورتوں کو بدمعاشوں سے بچاؤں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ ناگ دیوتا کا بھائی تمہارے گھر میں ہے۔ کیا تم اس راز کو راز رکھ سکو گی؟"

کوشیلا چلتے چلتے بولی۔

"مہاراج! آپ میرے لیے بھگوان سمان ہیں۔ آپ جو کہیں گے میں اس کا پالن

کروں گی۔ میرے دھن بھاگ کہ ناگ دیوتا جس کا بھائی ہمارے گھر میں ہرا جے گا۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

میں مطمئن ہوگیا۔ اب اس لڑکی سے میں بھوپال پہنچنے کے سلسلے میں راہ نمائی حاصل کر سکتا تھا۔ مجھے صرف اتنا چاہیے تھا کہ یہ لڑکی مجھے بھوپال جانے والی گاڑی تک لے جائے۔ آگے مجھے کسی کی راہ نمائی کی ضرورت نہیں تھی۔ لڑکی سڑک کے کنارے کنارے ادھر ادھر دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ میں اس کے بلاؤز میں سے سر باہر نکالے رات کے اندھیرے میں بھی سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سامنے سے کسی گاڑی کی روشنی ہم پر پڑی۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"ہو سکتا ہے یہ کوئی ٹیکسی ہو۔ اگر خالی ہوئی تو تم اسے روک لینا۔"

لڑکی نے ابھی ہاتھ نہیں دیا تھا کہ گاڑی تیزی سے ہمارے قریب آ کر رک گئی۔ لڑکی پیچھے ہٹ گئی۔ یہ جیپ تھی۔ جیپ میں سے تین پولیس والے اور ایک سویلین کپڑوں والا آدمی باہر نکلا۔ اس کو دیکھتے ہی لڑکی پتا جی کہہ کر اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ وہ آدمی لڑکی کو حوصلہ دینے لگا۔ پولیس والوں میں سے ایک ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا۔

"وہ لوگ کہاں ہیں؟"

لڑکی کے باپ نے بھی لڑکی سے یہی پوچھا کہ وہ بدمعاش کہاں بھاگ گئے ہیں اور انہوں نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں؟ لڑکی کوشیلا نے جلدی جلدی ساری کہانی بیان کر دی اور کہا کہ تینوں بدمعاش اسے ایک کمرے میں لے گئے تھے لیکن وہاں سے ایک سانپ نکل آیا۔ اس نے ان تینوں کو اور ان کے ایک چوتھے ساتھی کو ڈس کر مار ڈالا۔

"وہ کونے والے مکان میں چاروں کی لاشیں پڑی ہیں۔"

لڑکی کے ادھیڑ عمر باپ نے اسے اپنے ساتھ جیپ میں بٹھایا اور جیپ بڑی تیزی سے کونے والے مکان کے باہر آ کر رک گئی۔ سب لوگ مکان میں آ گئے۔ وہاں واقعی چار آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ جو میرے زہر کی وجہ سے پھٹ چکی تھیں۔ ہیڈ

کانسٹیبل نے لاشوں کا بغور معائینہ کرنے کے بعد کہا۔
"بھنڈاری جی! ان کی موت سانپ ڈسنے سے ہوئی ہے۔ بھگوان نے تمہاری بچے کو بچالیا۔"
پھر اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ لاشوں کو اسی طرح پڑا رہنے دو۔ تم یہاں گارڈ ڈیوٹی کرو گے۔ میں ایس ایچ او صاحب کو لاتا ہوں۔"
"آیئے بھنڈاری جی! میں آپ کو اور بیٹی کو گھر پر چھوڑ دیتا ہوں۔"
لڑکی کوشیلا اپنے باپ بھنڈاری کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ وہ باپ کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گئی۔ ہیڈ کانسٹیبل بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ جیپ ایک طرف روانہ ہوگئی۔ پندرہ بیس منٹ بعد جیپ دلی کی کسی کالونی میں داخل ہوگئی۔ جہاں ایک جیسے کوارٹر قطاروں میں بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کوارٹر میں کوشیلا اپنے ماتا پتا اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ ماں نے بیٹی کو دیکھا تو اسے سینے سے لگا کر زاروقطار رونا شروع کردیا۔ کوشیلا کے باپ نے کہا۔
"کملا! رونا دھونا بند کرو۔ بھگوان کی بڑی کرپا ہوئی ہے۔ ہماری بچی جیسے گئی تھی ویسے ہی پوتر گھر واپس آئی ہے۔"
پھر اس نے کوشیلا کی ماتا کو بتایا کہ عین وقت پر آ کر ناگ دیوتا نے چاروں بدمعاشوں کو ڈس کر مار ڈالا اور ہماری بیٹی کی عزت پر حرف نہیں آیا۔ ماں نے اپنے آنسو ساڑھی کے پلو سے پونچھتے ہوئے کہا۔
"میں ناگ دیوتا کے مندر کو دودھ سے دھوؤں گی۔ شو جی مہاراج نے ہماری عزت بچالی۔"
کوشیلا کا باپ پولیس کے ساتھ موقع واردات پر آیا تھا اور جس انداز میں ہیڈ کانسٹیبل نے کوشیلا کے باپ سے باتیں کی تھیں اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خود بھی پولیس میں ملازم ہے۔ ساتھ والے کوارٹروں میں سے ایک آدمی اور دو عورتیں آ گئیں۔ وہ کوشیلا کی ماں کو لڑکی کے واپس آ جانے پر مبارک بادیاں دینے لگیں۔ کوشیلا

کی ماں کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ ساری واردات پرانی خاندانی دشمنی کی بنا پر ہوئی تھی۔ کوشیلا کے باپ کا نام چھمن داس بھنڈاری تھا۔ اس کی اپنے دور کے رشتے داروں کے ساتھ دشمنی چلی آ رہی تھی۔ وہاں یہ بھی ثابت ہوگیا کہ کوشیلا کا باپ پولیس کے محکمے میں ملازم ہے۔ پولیس کے محکمے میں ہونے کی وجہ سے اس نے اپنے دشمنوں کے تین چار آدمیوں کو تھانے بلوا کر مارا پیٹا جس کا بدلہ لینے کے لیے انہوں نے تین چار غنڈوں کو پیسے دے کر بھیجا جو رات کے وقت کوشیلا کو اس کے گھر سے اغوا کر کے لے گئے۔ اس وقت کوشیلا کا والد کسی ضروری تفتیش کے سلسلے میں پولیس سٹیشن پر ہی تھا۔

مجھے ان لوگوں کی دشمنیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو صرف کوشیلا کی مدد سے بھوپال جانے والی گاڑی میں سوار ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اسی دوران اگر مجھ پر دورہ پڑ جاتا ہے اور میں سانپ سے انسانی شکل میں واپس آ جاتا ہوں تو پھر مجھے کوشیلا سے مدد لینے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن لگتا تھا کہ جس طرح اس بار میرے انسانی شکل میں قائم رہنے کا دورانیہ بہت طویل تھا اسی حساب سے میں سانپ بھی کافی عرصے تک بنا رہوں گا۔ کیونکہ مجھے اپنے انسانی شکل میں واپس آنے کے کوئی آثار محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ اس بات کا انکشاف میرے لیے تھوڑی سی پریشانی کا باعث ضرور تھا کہ کوشیلا کا باپ چھمن داس بھنڈاری پولیس میں تھا اور یقینی طور پر وہ پولیس انٹیلی جینس میں تھا۔ لیکن مجھے کوئی اتنی زیادہ فکر بھی نہیں تھی۔ ایک تو میں سانپ کے روپ میں تھا۔ دوسرے کوشیلا میری حفاظت کر رہی تھی۔ میں نے دل میں سوچ لیا کہ میں کل کوشیلا کی مدد سے بھوپال جانے والی کسی نہ کسی گاڑی میں سوار ہو جاؤں گا۔ مجھے کوشیلا کے باپ اور اس کے گھر والوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ رات کو سب سو گئے۔ کوشیلا پہلے کوارٹر کے اکیلے کمرے میں سوتی تھی جہاں سے غنڈوں نے اس کے منہ کو بند کر کے اسے اغوا کر لیا تھا۔ اب اس کے ماتا پتا اور چھوٹے بھائی نے اسے اپنے درمیان سلایا۔ میں ابھی تک کوشیلا کے بلاؤز کے اندر ہی تھا۔

میں ساری رات اس کے بلاؤز کے اندر ہی رہا۔

دوسرے دن رات والا ہیڈ کانسٹیبل جو ہندو تھا خود کوشیلا کے کوارٹر میں آ گیا۔ رات کو کوشیلا مجھ سے کوئی بات نہ کر سکی تھی۔ صبح کے وقت وہ غسل خانے میں گئی تو اس نے مجھے بلاؤز میں سے نکال کر کونے میں پڑی ہوئی پرانی کرسی پر رکھا اور ہاتھ جوڑ کر میرے آگے ماتھا ٹیکا اور آہستہ سے بولی۔

"مہاراج! میں اشنان کرنے لگی ہوں۔ آپ یہاں میرے سامنے بیٹھیں' میرے سارے پاپ جھڑ جائیں گے۔ میرے بڑے دھن بھاگ ہیں کہ مجھے دیوتا اشنان کرتے دیکھیں گے۔"

میں کرسی پر کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے بہت کہا کہ میں باہر چلا جاتا ہوں۔

وہ بولی۔

"مہاراج! باہر پتا جی کے افسر تھانیدار مہتہ جی آئے ہوئے ہیں۔ آپ سب کو نظر آ جائیں گے۔"

میں کرسی پر ہی بیٹھا رہا۔ کوشیلا جیسے ہی ساڑھی اتار کر بالٹی کے سامنے بیٹھی۔ میں نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے اس ہندو لڑکی کو بہن کہہ دیا تھا۔ اب وہ میرے لیے بہن کے برابر تھی۔ جب تک وہ نہاتی رہی میں منہ دوسری طرف کر کے بیٹھا رہا۔ جب اس نے ساڑھی پہن لی تو میں نے منہ اس کی طرف کر لیا۔ اسے بالکل محسوس نہ ہوا۔ نہانے کے بعد اس نے مجھے دوبارہ اپنے بلاؤز میں چھپا کر رکھ لیا۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا کہ وہ مجھے گھر میں کسی جگہ چھپا دے۔

وہ کہنے لگی۔

"گھر میں صرف دو کمرے ہیں۔ ایک میں ماتا جی سو رہی ہیں۔ دوسرے کمرے میں پتا جی تھانیدار مہتہ جی کے ساتھ بیٹھے ہیں۔"

وہ مجھے لے کر غسل خانے سے باہر آ گئی۔ اس کے پتا جی نے کہا۔

"کوشیلا بیٹی! مہتہ جی آئے ہیں ان کے واسطے چائے بنا کر لاؤ۔"

ساتھ ہی چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔ کوشیلا اچھا پتا جی کہہ کر باورچی خانے میں گئی اور چائے بنانے لگی۔ اس وقت تھانیدار مہتہ کوشیلا کے باپ سے رات کی واردات کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال پہنچا دی ہیں۔

"اپنے ڈاکٹر نے لاشیں دیکھ کر ہی کہہ دیا تھا کہ انہیں کسی موذی سانپ نے ڈسا ہے۔ پوسٹ مارٹم بڑا مشکل ہے۔ میں نے اسے کہا کہ آپ جتنا پوسٹ مارٹم کر سکتے ہو کر کے رپورٹ بھجوا دو۔"

چونکہ باروچی خانہ بالکل ساتھ ہی تھا اس لیے مجھے ان لوگوں کی باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اس دوران تھانیدار مہتہ نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ میں چونک پڑا۔ اس نے کوشیلا کے باپ سے کہا۔

"بھنڈاری! پیلس ہوٹل والے کیس کا ایک اٹنک وادی تو ڈی ایس پی صاحب نے ٹارچر کر کے مار ڈالا تھا۔"

کوشیلا کا پتا بولا۔

"ڈی ایس صاحب نے یہ کام ٹھیک نہیں کیا۔ ہمیں اس سے دوسرے اٹنک وادیوں کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔"

تھانیدار مہتہ کہنے لگا۔

"ڈی ایس پی صاحب سکھ ہیں اور سکھ کسی کی نہیں سنتے۔ لیکن ایک اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ ہم نے اس کیس کے دوسرے ملزم کو پکڑ لیا ہے۔"

"وہ کون ہے؟"

"جس اٹنک وادی کو ڈی ایس پی صاحب نے سانپ ڈسوا کر زمین میں دبا دیا تھا یہ اسی کا ساتھی ہے۔ ابھی تک کچھ بکا نہیں۔ لیکن ہمیں اتنا معلوم ہوگیا ہے کہ اس کا تعلق بھوپال شہر سے ہے۔ بھوپال پولیس کے دو آدمی اس سے پوچھ گچھ کرنے آ رہے ہیں۔ آج کسی وقت وہ دلی پہنچ جائیں گے۔"

یہ میرے لیے حیران اور پریشان کر دینے والا انکشاف تھا۔ یہ لوگ یقینی طور پر کمانڈو منظر خالد کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ کیونکہ ہماری پارٹی میں صرف وہی بھوپال کا رہنے والا تھا۔ یہ خبر سن کر میں فکر مند ہو گیا۔ اگر واقعی پولیس نے کمانڈو منظر خالد کو گرفتار کر لیا تو یہ بہت خطرناک بات ہوئی ہے۔ کیونکہ کمانڈو منظر خالد مدھیہ پردیش میں بھارتی مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرنے والی ایک زیر زمین خفیہ جماعت کا لیڈر تھا۔ ظاہر ہے اس کو اذیت ناک تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا۔ اگر خدا نہ کرے کمانڈو منظر خالد اذیت برداشت نہ کر سکا اور اس نے کچھ بتا دیا تو نہ صرف بھوپال میں ان کی جماعت کے مجاہد پکڑے جائیں گے بلکہ بھارت کے دوسرے شہروں میں جہاں جہاں اس جماعت کے لوگ موجود ہیں ان کی بھی گرفتاریاں شروع ہو جائیں گی اور بھارتی پولیس انہیں کبھی زندہ نہیں چھوڑے گی۔

کوشیلا چائے کے دو پیالے ٹرے میں رکھ کر باہر آ گئی۔ اس وقت تھانیدار مہتہ سے کوشیلا کا باپ پوچھ رہا تھا۔

"یہ جو اتنک وادی ہماری آدمیوں نے پکڑا ہے کیا تمہیں پورا وشواش ہے کہ وہ بھوپال کا رہنے والا ہے؟"

تھانیدار مہتہ چائے کا گھونٹ نگل کر بولا۔

"ہماری انٹیلی جینس نے یہی رپورٹ دی ہے۔ باقی تم بھی اپنی انٹیلی جینس کے آدمی ہو اور پرانے تجربہ کار ہو۔ میرے ساتھ چل کر اس کو دیکھ لو۔ اور پھر شام تک بھوپال پولیس کے دو آدمی بھی پہنچ جائیں گے۔ پوری بات سامنے آ جائے گی۔"

"یہ اتنک وادی اس وقت کہاں ہے؟"

تھانیدار مہتہ نے کہا۔

"سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں ہے۔"

کوشیلا کا باپ کہنے لگا۔

"مہتہ جی! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ پاکستانی جاسوس ہے یا پھر کشمیری کمانڈو ہے۔"

مہتہ نے کہا۔

"تم ابھی میرے ساتھ چلو۔ خود اس سے بات کر کے دیکھ لو۔"

اس وقت کوشیلا اس کمرے سے نکل کر اپنی ماتا جی کے پاس دوسرے کمرے میں آ گئی۔ اب مجھے تھانیدار مہتہ اور کوشیلا کے باپ بھنڈاری کی باتیں صاف سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ کوشیلا اپنی ماتا جی کا سر دبانے لگی تھی۔ میں اس کے بلاؤز میں چھپا ہوا تھا۔ اسے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دوسرے کمرے میں واپس جائے۔ اتنی دیر میں کوشیلا کا باپ دروازے میں نمودار ہوا۔ کہنے لگا۔

"کوشیلا کی ماں! میں ذرا ہیڈ کوارٹر تک جا رہا ہوں۔ جلدی واپس آ جاؤں گا۔"

اس وقت مجھے کوشیلا کے باپ کے ساتھ جانا چاہیے تھا تاکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا کہ بھوپال کے جس نوجوان کو دلی پولیس نے پیلس ہوٹل کے بم دھماکے کی واردات کے شبہے میں پکڑا ہے وہ کمانڈو منظر خالد ہی ہے یا کوئی دوسرا آدمی ہے۔ لیکن میں کوشیلا کے باپ کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے کمانڈو منظر خالد کے بارے میں صحیح رپورٹ معلوم کرنے کے لیے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا تھا۔ میں نے دلی سے بھوپال جانے کا پروگرام کینسل کر دیا تھا۔ اب میں یہ تصدیق کیے بغیر دلی شہر سے باہر نہیں جا سکتا تھا کہ کیا دلی پولیس نے واقعی کمانڈو منظر خالد کو ہی گرفتار کیا ہے۔

کوشیلا کا باپ چلا گیا۔ میرے ساتھ بھی عجیب حادثہ ہوا تھا۔ کہاں یہ کہ میں دلی پولیس کی انٹیلی جینس سے بچتا پھرتا تھا اور کہاں یہ حالات کے الٹ پھیر نے مجھے دلی پولیس کی انٹیلی جینس کے ہی ایک عہدیدار کے گھر پہنچا دیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ میں اس وقت انسانی شکل میں نہیں تھا۔ ورنہ شاید اب تک میں پرانے قلعے کے ٹارچر سیل میں ہوتا۔ کوشیلا اپنی ماتا کے کمرے میں تھوڑی دیر اس کا سر دباتی رہی پھر وہ کسی بہانے کوارٹر کی چھت پر آ گئی۔ رات کو جو بادل دلی کے آسمان پر چھائے ہوئے تھے وہ چھٹ چکے تھے اور دھوپ نکل آئی تھی۔ چھت کی منڈیریں اونچی تھیں۔ ایک لوہے کی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔

کوشیلا نے مجھے اپنے بلاؤز سے نکال کر اپنے سامنے چارپائی پر بٹھا دیا اور ہاتھ جوڑ کر اپنا سر سجدہ کرنے کے انداز میں جھکایا اور کہنے لگی۔

"مہاراج! آپ دھوپ میں آرام سے بیٹھیں' میں آپ کے لیے دودھ لاتی ہوں۔ آپ کو بھول لگ رہی ہوگی۔"

میں خاموش رہا۔ وہ نیچے اتر گئی۔ دھوپ نے میرے جسم کو بڑا سکون دیا۔ میں سوچنے لگا کہ کمانڈو منظر خالد کے بارے میں صحیح رپورٹ کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔ میرا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ کوشیلا تھی۔ میں اس کے باپ سے براہ راست اس بارے میں کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ اچانک میرے دماغ میں ایک ترکیب آ گئی۔ میں کوشیلا کی ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ کوشیلا ایک پیالی میں دودھ لے کر آ گئی۔ اس نے بڑی عقیدت سے پیالی میرے سامنے رکھ دی اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مہاراج! دودھ پیجئے۔"

میں نے تھوڑا سا دودھ پیا اور جلدی سے اپنا منہ پیچھے ہٹا کر ہلکی سی پھنکار ماری۔ کوشیلا نے پریشان سی ہو کر کہا۔

"مہاراج! کیا بات ہوئی؟"

میرے ذہن میں جو ترکیب آئی تھی میں نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے کہا۔

"کوشیلا بہن! اس دودھ میں تمہارے گھر کی نحوست کا زہر ملا ہوا ہے۔ میرے سوا اس زہر کو کوئی محسوس نہیں کر سکتا۔"

کوشیلا ایک دم گھبرا گئی۔

"مہاراج! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"ہاں کوشیلا! اس گھر پر کوئی بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ اس مصیبت کا اثر سب سے پہلے تمہارے گھر کے دودھ میں ظاہر ہوا ہے۔ کیونکہ دودھ دیوتاؤں کی پوتر

خوراک ہے۔"

اب تو کوشیلا بہت پریشان ہوئی۔ مجھ سے اسے اندھی عقیدت ہو گئی تھی اور یہ عقیدت اسے ہونی بھی چاہیے تھی۔ میری سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ میں سانپ ہو کر انسان کی آواز میں بولتا تھا اور باتیں کرتا تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ ہو گا۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

"مہاراج! بھگوان کے لیے ہمارے گھر کو آنے والی مصیبت سے بچا لو۔"

میں نے کہا۔

"کل رات تمہارے ساتھ جو حادثہ ہوا تھا۔ وہ اسی آنے والی مصیبت کی ایک نشانی تھی۔ اگر عین وقت پر میں اس کمرے میں نہ پہنچ جاتا تو تمہارے گھر کی عزت خاک میں مل چکی ہوتی۔"

کوشیلا نے عاجزی سے کہا۔

"مہاراج! ہم پر کرپا کریں۔ ہمیں آنے والی مصیبت سے بچا لیں۔"

جب میں نے دیکھا کہ کوشیلا پوری طرح تیار ہو چکی ہے تو میں نے کہا۔

"مجھے ناگ دیوتا سے مشورہ کرنے دو۔ اگر ناگ دیوتا نے مجھے اجازت دی تو میں تمہاری مصیبت کو ضرور ٹال دوں گا۔ میں دھیان لگانے لگا ہوں۔ مجھے بلانا مت۔"

اور میں نے یونہی اپنا سر نیچے کر لیا۔ دس پندرہ سیکنڈ تک میں اسی حالت میں کنڈلی مارے بیٹھا رہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کوشیلا بے چینی سے اُدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ کبھی آسمان کی طرف منہ اٹھا کر ہاتھ جوڑتی۔ میں نے گردن اوپر اٹھالی اور کوشیلا سے کہا۔

"تم بڑی بھاگوان ہو کوشیلا! ناگ دیوتا نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ میں تمہاری مدد کروں اور تمہارے گھر پر آنے والی مصیبت کو ہمیشہ کے لیے بھگا دوں۔"

کوشیلا کا چہرہ فرط عقیدت سے کھل گیا۔ اس نے جھک کر میرے آگے سجدہ کر دیا اور بولی۔

"آپ بھگوان کے اوتار ہیں۔ میں آپ کا اپکار جنم جنم میں یاد رکھوں گی۔"

میں نے کہا۔

"تمہیں شاید ایک کام کرنا پڑے۔"

"آپ حکم کریں مہاراج! آپ جو کہیں گے میں کروں گی۔"

میں نے سوچی سمجھی ترکیب کے مطابق کہا۔

"ناگ دیوتا نے مجھے بتایا ہے کہ دلی شہر میں اس وقت ایک ایسا آدمی موجود ہے جس کی جنم کنڈلی تمہارے پتا جی کے دادا سے ملتی ہے۔ اگر وہ آدمی میرے سامنے آ جائے اور میں اس پر ناگ دیوتا کا خاموش منتر پڑھ کر پھونک دوں تو تمہارے گھر پر آنے والی مصیبت ٹل سکتی ہے۔ بلکہ اس کے بعد تمہارے گھر پر کبھی کوئی پتا نہیں آئے گی۔"

کوشیلا بے تابی سے بولی۔

"مہاراج وہ آدمی کون ہے؟ وہ کہاں ملے گا؟ مجھے بتائیں۔ میں اس کی منت کر کے اسے یہاں لے آؤں گی۔"

میں نے کہا۔

"نہیں نہیں اسے یہاں لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سارا کام راز داری میں ہوگا۔ تم اسے یہاں نہیں لاؤ گی۔ میں اس کے سامنے جاؤں گا۔"

کوشیلا نے کہا۔

"ٹھیک ہے مہاراج آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گی۔ لیکن مہاراج! وہ آدمی کہاں ملے گا؟ دلی شہر تو آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔"

میں نے کہا۔

"اس کے لیے مجھے ایک بار پھر دھیان میں جا کر ناگ دیوتا سے پوچھنا ہوگا کہ وہ آدمی ہمیں کہاں ملے گا؟"

اور میں نے فوراً" سر نیچے کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد سر اوپر کر کے میں نے کوشیلا

سے کہا۔

"کوشیلا! ناگ دیوتا نے مجھے اس آدمی کی شکل دکھا دی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ آدمی اس وقت تمہارے پتا جی کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں مہاراج۔" کوشیلا نے تعجب سے کہا۔

میں نے کہا۔

"تمہارے پتا جی اس وقت کہاں گئے ہیں؟"

اس نے بتایا کہ وہ تھانیدار مہتہ جی کی ساتھ سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر گئے ہیں۔"

میں نے فوراً بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اور تم نے یہ بھی سنا ہوگا کہ تھانیدار مہتہ نے ایک مجرم کو پکڑا ہے جو سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں بند ہے اور تمہارے پتا جی اس مجرم کو دیکھنے گئے ہیں۔ یہ وہی آدمی ہوگا جس کی تصویر مجھے ناگ دیوتا نے دکھائی ہے اور جس کی جنم کنڈلی تمہارے پتا جی کے دادا کی جنم کنڈلی سے ملتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہی آدمی اس وقت تمہارے پتا جی کے سامنے بیٹھا ہے۔"

کوشیلا کے چہرے پر امید کی روشنی سی پھیل گئی۔

کہنے لگی۔

"مہاراج! مجھ پر کرپا کریں۔ آپ خود وہاں جا کر اس آدمی کو دیکھیں۔ اگر یہ وہی آدمی ہے تو بھگوان کے واسطے اس پر ناگ دیوتا کا منتر پڑھ کر پھونک دیں تاکہ ہمارے گھر کی مصیبت ٹل جائے۔"

میں نے کہا۔

"مورکھ لڑکی! میں کیسے جا سکتا ہوں۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں ہے کہ سی آئی اے کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے۔ پھر میں سانپ کے روپ میں ہوں۔ میں اپنا روپ شیو جی مہاراج کے حکم کے بغیر نہیں بدل سکتا اور شیو جی مہاراج اس وقت کیلاش پربت میں سادھی

لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔"

کوشیلا کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ آخر میں نے اسے ایک ترکیب سمجھائی۔ میں نے کہا۔

"ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔"

کوشیلا کا چہرہ دھوپ میں چمک اٹھا۔

"وہ کیا مہاراج؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

"وہ آدمی جس کی شکل مجھے ناگ دیوتا نے دکھائی ہے پولیس کی قید میں ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کچھ دیر سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں ہی بند رہے گا۔ تم کسی طرح اپنے پتا جی سے کہو کہ تم ان مجرموں کو دیکھنا چاہتی ہو جنہیں پولیس نے سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں قید کر رکھا ہے۔ تم مجھے چھپا کر اپنے ساتھ لے جانا۔ میں ان مجرموں کی شکل دیکھ کر پہچان لوں گا کہ وہ کونسا مجرم ہے جس کی شکل مجھے ناگ دیوتا نے دکھائی تھی۔ میں تمہیں اس وقت خاص اشارہ کروں گا کہ یہی وہ آدمی ہے۔ تم وہاں کسی بہانے تھوڑی دیر کے لیے رک جانا۔ اس آدمی سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دینا۔ اتنی دیر میں میں ناگ دیوتا کا منتر پڑھ کر اس پر پھونک دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی تمہارے گھر کی ساری مصیبتیں، ساری بلائیں دور ہو جائیں گی۔"

اس نے اداس لہجے میں کہا۔

"میں پتا جی کو کیسے راضی کروں گی؟"

"میں نے بظاہر بے تعلق سا ہو کر کہا۔

"اب یہ تمہارا کام ہے۔ میں نے تمہیں آنے والی مصیبت سے آگاہ کر دیا ہے۔ آگے تم جانو اور تمہارا کام۔ میں تو کچھ وقت یہاں ٹھہر کر چلا جاؤں گا۔"

کوشیلا نے جلدی سے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"نہیں نہیں مہاراج! آپ ہمیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ میں پتا جی کو راضی کر

لوں گی خواہ مجھے کچھ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ میں آج ہی پتا جی سے بات کروں گی۔"

اتنے میں نیچے سے گھر کی ملازمہ نے کوشیلا کو آواز دی۔

"بی بی جی! نیچے آئیں کھانا کھالیں۔"

کوشیلا نے کہا۔

"مہاراج! وعدہ کریں کہ جب تک آپ اس آدمی پر ناگ دیوتا کا منتر نہیں پھونک لیتے مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

کوشیلا خوش ہوگئی۔ اس نے مجھے اٹھا کر بلاؤز میں چھپایا تو میں نے کہا۔

"تم مجھے گھر میں کسی اور جگہ کیوں نہیں چھپا دیتیں۔ اپنی ساڑھی میں کب تک چھپاتی پھرو گی؟"

وہ بولی۔

"آپ کہتے ہیں تو میں آج رات آپ کو اپنے کپڑوں کی چھوٹی الماری میں چھپا دوں گی۔ وہاں آپ کا دم تو نہیں گھٹے گا؟"

میں نے کہا۔

"ہم دیوتا سمان ہیں۔ ہمارا دم نہیں گھٹ سکتا۔"

وہ چھت سے نیچے اتر گئی۔ ماتا جی کی چارپائی کے سامنے بیٹھ کر اس نے کھانا کھایا۔ میں اس وقت بھی اس کے بلاؤز کے اندر چھپا بیٹھا تھا۔ اس طرح ایک جگہ ساکت ہو کر بیٹھے رہنے سے مجھے بھی بڑی کوفت ہوتی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد کوشیلا ہاتھ دھونے غسل خانے میں آئی تو میں نے اسے کہا۔

"تم مجھے ابھی اپنی الماری میں چھپا دو۔"

وہ بولی۔

"ٹھیک ہے مہاراج! میں ابھی آپ کو اپنی الماری میں بٹھا دیتی ہوں۔"

کوشیلا کی الماری دوسرے کمرے میں تھی۔ دیوار میں بنی ہوئی چھوٹی سی الماری تھی۔ جس میں اس کی کچھ کتابیں اور ساڑھیاں وغیرہ پڑی تھیں۔ کوشیلا بی اے کر چکی تھی اور اب انگریزی اور ہندی رسالوں اور اخباروں میں سوشکل فلاح و بہبود کے مضامین لکھتی تھی۔ اس نے الماری کھولی اور ذرا آگے ہو کر مجھے اپنے بلاؤز میں سے نکالا اور اپنی ساڑھیوں کے پیچھے بٹھا دیا اور آہستہ سے پوچھا۔

"مہاراج! یہاں آپ کو تکلیف نہ ہوگی۔"

میں نے کہا۔

"مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ لیکن پتا جی سے تمہاری جو بات ہو مجھے فوراً آ کر بتا دینا کیونکہ مصیبت کو میں تمہارے گھر کے اوپر منڈلاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اگر جلدی کوئی اپائے نہ کیا گیا تو اس گھر کی خوشیاں اور سکون برباد ہو جائے گا۔"

اس نے کہا۔

"مہاراج میں فوراً آپ کو بتا دوں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے الماری بند کر دی۔ میری سکیم اگرچہ ذرا پیچدار ہو گئی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ کامیاب ضرور ہوگی۔ کیونکہ میں کوشیلا کو ناگ دیوتا کے بھائی کی حیثیت سے ڈرانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اپنے گھر کو تباہی سے بچانے کے واسطے کوشیلا کچھ بھی کر سکتی تھی۔ الماری کی بند فضا میں عجیب سی نامانوس بو پھیلی ہوئی تھی۔ شاید یہ فنائیل کی گولیوں کی بو تھی۔ پہلے تو میں انسان اور سانپ ہونے کی حیثیت سے اس بو کو برداشت کرتا رہا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ میں زیادہ دیر الماری میں اس بو کو برداشت نہ کر سکوں گا۔ فنائیل کی گولیاں تہہ کی ہوئی ساڑھیوں میں کچھ زیادہ ہی رکھی گئی تھیں۔ ان کی تیز بو سیدھی میرے انسانی دماغ میں چڑھ رہی تھی اور مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن میں الماری میں بند تھا اور مجھے اس وقت تک یہیں بند رہنا تھا جب تک کہ کوشیلا دوبارہ نہیں آتی۔ خدا نے مجھ پر بڑا کرم کیا کہ کوئی ایک گھنٹے بعد ہی کوشیلا میرے لیے دودھ لے کر آ گئی۔ اس نے الماری کا پٹ کھولا تو تازہ ہوا اندر آئی

اور میری جان میں جان آ گئی۔ میں نے اسے اپنی مصیبت بتائی تو وہ کہنے لگی۔

"مہاراج! میں نے تو آپ کی اچھیا پر آپ کو یہاں رکھا تھا ورنہ مجھے تو بڑی خوشی تھی کہ بھگوان کے اوتار میرے دل کے پاس ہیں اور پھر آپ چھوٹے سے ہیں۔ آپ کو کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا کہ آپ میرے بلاؤز میں چھپے ہوئے ہیں۔"

اس نے مجھے دودھ پلایا اور اٹھا کر اپنے بلاؤز میں چھپانے لگی تو میں نے پوچھا۔

"پتا جی سے کوئی بات ہوئی؟"

وہ بولی۔

"پتا جی ابھی تک واپس نہیں آئے۔ ان کے آتے ہی میں ان سے بات کروں گی۔ میں نے ایک سکیم سوچ لی ہے۔"

"مجھے بتاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے مجھے بلاؤز کے اندر رکھ کر اپنی ساڑھی کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! آپ تو میرے ساتھ ہی ہیں۔ پتا جی سے جب بات کروں گی تو آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔"

کوشیلا کا چھوٹا بھائی جس کی عمر دس گیارہ برس کی ہو گی اندر آ گیا۔ بولا۔

"دیدی! تم الماری میں کس سے باتیں کر رہی ہو؟"

کوشیلا نے کہا۔

"میری اس الماری میں بھگوان کرشن کی جو تصویر ہے نا میں اس سے باتیں کر رہی تھی۔"

اور وہ ماتا جی کے کمرے میں آ گئی۔

شام کے وقت کوشیلا کا باپ واپس آیا۔ اس نے اپنی بیوی یعنی کوشیلا کی ماں کی خیریت دریافت کی۔ کہنے لگا۔

"ہیڈ کوارٹر میں دیر ہو گئی۔ پیلس ہوٹل کے دھماکے کی وجہ سے کیندری منتری نے سخت دباؤ ڈالا ہوا ہے۔ ایک اتنک وادی (دہشت گرد) پکڑا ہے۔ ابھی تک وہ کچھ

نہیں بتا رہا۔ بڑا ٹائم دینا پڑتا ہے۔"

کوشیلا بھی پاس ہی بیٹھی تھی۔ اس نے جو سکیم سوچ رکھی تھی۔ اس پر عمل شروع کرتے ہوئے اپنے باپ سے کہا۔

"پتا جی! میرا ایک کام کر دیں گے؟"

اس کے باپ نے کہا۔

"کہو بیٹی کیا کام ہے؟"

کوشیلا نے کہا۔

"پتا جی! کلکتے کے انگریزی اخبار "امرت بازار پتریکا" کے ایڈیٹر نے مجھے کہا ہے کہ میں ان کے لیے اتنک وادی (دہشت گردی) پر ایک ریسرچ مضمون لکھ دوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میں ایک دو دہشت گردوں سے خود بات چیت کروں' ان کو ایک نظر دیکھوں۔ آپ کے پاس اس وقت ایک دو اتنک وادی سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں موجود ہیں۔ اگر مجھے ان کو دیکھنے اور ان سے دو ایک باتیں پوچھنے کا موقع مل جائے تو میرا مضمون بڑا کامیاب رہے گا اور ہو سکتا ہے "امرت بازار پتریکا" کے ایڈیٹر مجھے دلی میں اپنے اخبار کا مستقل نمائندہ مقرر کر دیں۔"

میں نے دل میں کوشیلا کے ذہن کی داد دی۔ اس نے ایسی سکیم سوچی تھی کہ اس کے باپ کے لیے انکار کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اس کے باپ نے کہا۔

"بیٹی! اگر ایسی بات ہے تو میں تمہیں کل ہی اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ اس وقت سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں صرف دو آدمی ہم نے ایسے پکڑ رکھے ہیں جن پر ہمیں شبہ ہے کہ وہ اتنک وار (دہشت گرد) ہیں۔ تم بے شک ان سے بات چیت کر لینا۔ مگر میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔ تمہیں ان خطرناک لوگوں سے اکیلا نہیں ملنے دوں گا۔"

کوشیلا نے کہا۔

"میں اکیلی ملنا بھی نہیں چاہتی پتا جی۔ آپ ضرور میرے ساتھ رہیں گے۔"

کوشیلا اتنی خوش نہیں ہوگی جتنا خوش میں ہوا تھا۔

دوسرے روز دوپہر سے پہلے کوشیلا کا باپ تھانے سے آگیا اور کوشیلا کو ساتھ لے کر سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہوا۔ میں کوشیلا کے بلاؤز میں ہی چھپا ہوا تھا۔ ہم رکشے میں تھے۔ میں بلاؤز میں سے اپنا سر باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ خطرہ تھا کہ کوشیلا کا باپ مجھے دیکھ نہ لے۔ چنانچہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ رکشا کون کون سی سڑکوں پر گزرتا ہوا آخر ایک جگہ گھوم کر تھوڑی دور تک چلا اور پھر رک گیا۔

کوشیلا رکشے سے اتری اور چلنے لگی۔ میں نے ذرا سی گردن اوپر کی۔ میرے آگے کوشیلا کی ساڑھی کا پلو تھا۔ سردی کی وجہ سے کوشیلا نے سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی جس میں سے مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کوشیلا نے مجھے روانہ ہونے سے پہلے غسل خانے میں جا کر بتا دیا تھا کہ جس آدمی کو ہم دیکھنے جا رہے ہیں اس سے باتیں کرتے وقت پتا جی میرے پاس ہی بیٹھے ہوں گے۔ اس لیے آپ خاموشی سے منتر پڑھ کر پھونک دیں۔ میں نے کونسا منتر پڑھ کر پھونکنا تھا۔ مجھے تو صرف یہ دیکھنا تھا کہ جس آدمی کو پولیس نے دہشت گردی کے شبہے میں پکڑ کر زیر حراست رکھا ہوا ہے وہ کمانڈو خالد ہی ہے یا کوئی اور ہے۔ میں نے کوشیلا سے کہا تھا۔

"فکر نہ کرو میں خاموشی سے منتر پڑھ کر پھونکوں گا۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ بھگوان کرے یہ وہی آدمی ہو جس کی شکل مجھے ناگ دیوتا نے دکھائی ہے۔"

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کوشیلا ایک دو راہ داریوں میں سے گزری ہے۔ اس کے پتا جی کو دو تین آدمیوں نے نمستے بھنڈاری جی بھی کہا تھا۔ یہ آدمی خفیہ پولیس کا آدمی تھا اور یہاں اس کو سبھی جانتے تھے۔ پھر ایسے لگا جیسے ہم لوگ سیڑھیاں اتر رہے ہیں۔ ہم دلی سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر کے کسی تہہ خانے میں جا رہے تھے۔ جو یقینی طور پر ٹارچر سیل ہی تھا۔

نیچے پہنچ کر کسی نے کوشیلا کے باپ کو نمسکار بھنڈاری صاحب کہا۔ کوشیلا کے باپ نے پوچھا۔

"ملزم اسی سیل میں ہے یا کسی دوسرے سیل میں پہنچایا گیا ہے؟"

دوسرے آدمی نے کہا۔

"سر! اسی سیل میں ہے۔"

یہ کوئی پولیس کا سنتری ہوگا جو وہاں گارڈ کی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ میں کوشیلا کے بلاؤز کے اندر تھا۔ کوشیلا کے باپ نے سنتری سے کہا۔

"لکھ رام! دروازہ کھول دو۔ مجھے ملزم سے کچھ باتیں پوچھنی ہیں۔"

مجھے پہلے تالا کھلنے اور پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ کوشیلا آگے بڑھی۔ اچانک مجھے کمانڈو خالد کے جسم کی تیز بو محسوس ہوئی۔ میں آج بھی اس معمے کو حل نہیں کر سکا کہ مجھے اس سے پہلے کمانڈو خالد کی بو کیوں نہیں محسوس ہوئی تھی جبکہ ایک روز پہلے تیز ہوا میں بھی میں نے اس کے جسم کی بو دور سے آتی ہوئی محسوس کر لی تھی۔ پھر ایسا کیوں ہوا کہ کمانڈو خالد دلی شہر میں ہی تھا اور مجھے اس کی بو بالکل نہیں آئی تھی۔ بلکہ عین اس وقت محسوس ہونے لگی جب اس کوٹھڑی کا دروازہ کھولا گیا جس میں وہ بند تھا۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ مجھ پر جو دورہ پڑتا تھا' میں اس کی وجہ سے سانپ کی شکل میں تبدیل نہیں ہوا تھا بلکہ اس سانپ کے ڈسنے سے میری انسانی شکل تبدیل ہوئی تھی جس نے مجھے گڑھے میں دفن شدہ حالت میں کاٹا تھا۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جس سانپ نے مجھے ڈس کر انسانی روپ میں تبدیل کیا تھا اس کے زہر کا اثر مجھ پر کب تک قائم رہے گا اور مجھ میں اور کون کون سی تبدیلیاں ہوں گی۔ اس سانپ کے زہر کا پہلا اثر تو یہ ہوا تھا کہ مجھے اپنے کسی قریبی ساتھی کی بو دور سے آ جایا کرتی تھی۔ اس میں گڑبڑ پیدا ہو گئی تھی۔ کوشیلا کے باپ نے کسی کو حکم دینے کے انداز میں کہا۔

"سیدھے ہو کر بیٹھ جاؤ۔"

کوشیلا جانتی تھی کہ مجھے اس آدمی کو دیکھ کر شناخت کرنا ہے کہ آیا یہ وہی شخص ہے جس کی شکل مجھے ناگ دیوتا نے دکھائی تھی۔ اس نے ساڑھی کے پلو کو سنبھالنے

کے بہانے اپنے بلاؤز کو ذرا سا نیچے کرلیا۔ بلاؤز نیچے کرنے سے میرا سر بلاؤز سے تھوڑا سا باہر آگیا۔ میں نے دیکھا کہ تہہ خانے کی مدھم روشنی میں ایک آدمی زمین پر کمبل لپیٹے بیٹھا ہے۔ میں اسے کیسے نہیں پہچان سکتا تھا۔ یہ میرا محسن اور میرا مجاہد ساتھی کمانڈو منظر خالد تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ کوشیلا کے باپ نے اپنی بیٹی سے کہا۔

"کوشیلا بیٹی! یہ اتنک وادی پاکستان سے جاسوسی کرنے یہاں آیا ہے۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی ہیں جنہیں ہم بہت جلد گرفتار کرلیں گے۔ تمہیں اس سے کچھ پوچھنا ہے تو پوچھ لو؟"

میرے اور کوشیلا کے درمیان یہ بات طے ہوچکی تھی کہ اگر یہ شخص وہی ہوا جس کی شکل مجھے ناگ دیوتا نے دکھائی تھی تو میں اس کے بلاؤز کے اندر اپنا سر اس کے جسم سے دو بار رگڑوں گا۔ چنانچہ منظر خالد کمانڈو کو دیکھنے کے بعد میں نے ایسا ہی کیا۔ کوشیلا فوراً" سمجھ گئی کہ ہمیں ہمارا مطلوبہ شخص مل گیا ہے۔ اس نے کمانڈو خالد سے یونہی سوالات پوچھنے شروع کردیے۔ جن کے جواب کمانڈو خالد نے بے دلی سے ہاں اور ناں میں دیے۔ کوشیلا مجھے وقت دے رہی تھی تاکہ میں ناگ دیوتا کا خاص منتر پڑھ کر اس آدمی پر پھونک سکوں جس کے بعد اس کے خاندان پر آنے والی مصیبت سے نجات ملنی تھی۔ میں یہ سب کچھ ڈرامہ کر رہا تھا۔ مجھے بھلا کون سا منتر پڑھنا تھا۔ میں نے یونہی ایک بار کوشیلا پر ظاہر کرنے کے لیے منہ سے پھنکار کی ہلکی سی آواز نکالی جس کو وہی سن سکی ہوگی۔ اس سے میری مراد یہ تھی کہ وہ سمجھ جائے کہ میں نے منتر پڑھ کر پھونک دیا ہے۔

حقیقت میں میں یہ سوچ رہا تھا کہ کمانڈو خالد کو یہاں سے کس طرح فرار کرایا جا سکتا ہے۔ یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ کوٹھڑی تہہ خانے میں تھی اور باہر پولیس کا سنتری پہرے پر موجود تھا۔ اس کے علاوہ یہ تہہ خانہ بھارت کی مرکزی حکومت کی انٹیلی جینس کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں تھا۔ یہاں تک میرا ایک سانپ کی شکل میں پہنچنا اتنا

آسان نہیں تھا۔ مجھے راستے کا بھی علم نہیں تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا اور کوشیلا کے بلاؤز سے ذرا سا سر باہر نکالے اپنے ساتھی مجاہد کمانڈو منظر خالد کو بھی بے بسی کی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی شکل صورت ظاہر کر رہی تھی کہ اس پر بے پناہ تشدد کیا گیا ہے۔ لیکن وہ ایک بہادر اور اسلام کا سچا مجاہد تھا۔ اس نے ابھی تک اپنے کسی ساتھی کا نام پتہ نہیں بتایا تھا۔

جب کوشیلا کو یقین ہوگیا کہ میں نے منتر پھونک دیا ہے تو اس نے اپنے باپ سے کہا۔

"پتا جی اب مجھے کسی دوسرے اتنک وادی سے ملوا دیں۔ اس سے جو پوچھنا تھا میں نے پوچھ لیا ہے۔"

اس دوران میں نے بڑی کوشش کی اور کوئی ایسا طریقہ نکالوں جس سے میں کمانڈو خالد کو بتا سکوں کہ وہ فکر نہ کرے میں نے اسے دیکھ لیا ہے اور میں اسے اس جہنم سے نکالنے کی پوری کوشش کروں گا۔ لیکن کوشیلا کے باپ کے ہوتے ہوئے میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس کا باپ ہمارے ساتھ نہ ہوتا تو میں کمانڈو خالد پر اپنا آپ ظاہر کر سکتا تھا اور مجھے دیکھ کر اس کا حوصلہ بھی بڑھ جاتا اور امید بھی بندھ جاتی کہ میں اس کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ لیکن کوشیلا کا باپ اپنی بیٹی کے بالکل ساتھ ہی سٹول پر بیٹھا تھا اور ایک گارڈ سنتری بھی ہمارے پیچھے رائفل لے کر کھڑا تھا۔

دونوں باپ بیٹی کوٹھڑی سے باہر آ گئے۔

کوشیلا قدرتی طور پر یہ جاننے کے لیے بے قرار تھی کہ کیا یہ ہمارا مطلوبہ آدمی ہی تھا اور کیا میں نے اس پر ناگ دیوتا کا منتر پھونک دیا ہے۔ وہ اپنے باپ سے الگ ہونے کے بہانے تلاش کرنے لگی تھی۔ ایک بار اس نے باپ سے کہا کہ یہاں فضا بڑی بند ہے میں باہر جاؤں گی جب باپ نے کہا کہ اب آئی ہو تو دوسرے دہشت گرد سے بھی بات چیت کر لو۔ صرف ایک منٹ ہی لگے گا۔ دوسرا دہشت گرد کوئی بھارتی سکھ تھا۔

کوشیلا نے اس سے یونہی دو ایک باتیں پوچھیں اور اپنے باپ سے کہا۔

"پتا جی! یہاں باتھ روم کس طرف ہے؟"

باپ نے کہا۔

"اوپر والے کمرے میں آ جاؤ بیٹی۔"

میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ کوشش کر کے اپنا چھوٹا سا سر کوشیلا کے بلاؤز سے تھوڑا سا اوپر کر رکھا تھا تاکہ میں دیکھ سکوں کہ کمانڈو خالد کے تہہ خانے والی کوٹھڑی کو یہاں سے کون سا راستہ جاتا ہے۔ میں ایک ایک زینے اور راہ داری کو اپنے ذہن میں بٹھاتا جا رہا تھا۔ ہم لوگ ایک زینے پر سے ہو کر اوپر والی منزل میں آ گئے۔ کوشیلا کا باپ ایک کمرے میں آ کر کہنے لگا۔

"بیٹی! وہ سامنے زنانہ باتھ روم ہے۔"

کوشیلا تیز تیز قدموں سے باتھ روم میں آ گئی۔ اندر آتے ہی اس نے دروازے کو چٹخنی لگائی اور چہرہ اپنے بلاؤز کی طرف جھکا کر بولی۔

"مہاراج! کیا یہ وہی آدمی تھا؟"

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کوشیلا! پرلوک کے سارے دیوتا تم پر بڑے مہربان ہیں۔ تیر ٹھیک نشانے پر لگا ہے۔ یہ وہی آدمی ہے جس کی شکل مجھے ناگ دیوتا نے دکھائی تھی۔"

کوشیلا نے خوش ہو کر آہستہ سے پوچھا۔

"مہاراج! آپ نے ناگ دیوتا کا منتر پڑھ کر پھونک دیا تھا ناں؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے اس آدمی کو شناخت کرنے کے فوراً بعد ناگ دیوتا جی کا خاص منتر پڑھ کر پھونک دیا تھا۔"

کوشیلا نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں مہاراج! اب ہمارے گھر پر آنے والی مصیبت ٹل گئی ہے ناں؟"

میں نے کہا۔

"یہ میں تمہیں گھر چل کر بتاؤں گا۔"

دراصل مجھے ابھی کوشیلا سے کام لینا تھا۔ کیونکہ سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں کمانڈو خالد کی موجودگی ثابت ہو گئی تھی اور مجھے اسے وہاں سے فرار کرنا تھا اور کوشیلا کی مدد کے بغیر کمانڈو خالد کے فرار کا کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں اس کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔

کوشیلا نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

"مہاراج! آپ تو کہتے تھے کہ منتر پھونکنے کے بعد ہمارے پریوار پر آنے والی ساری مصیبتیں ٹل جائیں گی۔"

میں نے کہا۔

"یہ میں تمہیں گھر جا کر ہی بتا سکوں گا۔"

کوشیلا کا باپ تو سی آئی اے ہیڈ کوارٹر میں ہی رہا۔ کوشیلا اکیلی رکشا لے کر گھر آ گئی۔ گھر آتے ہی اس نے اپنی ماتا کو بتایا کہ پتا جی نے مجھے دو اٹنک وادیوں سے ملایا ہے۔

"ماتا جی! مجھے ان سے باتیں کر کے بڑی اچھی انفارمیشنز ملی ہیں۔ اب میرا مضمون لوگوں کو بڑا پسند آئے گا۔"

اس کی ماں بڑی خوش ہوئی۔ تھوڑی دیر اپنی ماں کے پاس بیٹھنے کے بعد کوشیلا دھوپ تاپنے کے بہانے مجھے لے کر چھت پر آ گئی۔ چھت پر آتے ہی وہ چارپائی پر بیٹھ گئی اور مجھے بلاؤز میں سے نکال کر اپنے سامنے چارپائی پر رکھ دیا اور ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور بولی۔

"مہاراج! مجھے بتائیں کہ اب کیا کسر باقی رہ گئی ہے۔ میں اپنے پریوار، اپنے خاندان کو آنے والی مصیبتوں سے بچانے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

میں نے کہا۔

"کوشیلا! میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔ ناگ دیوتا نے مجھے کہا تھا کہ اگر تمہیں یہ آدمی مل جائے جس کی شکل میں نے تمہیں دکھائی ہے تو اس پر میرا خاص منتر پڑھ کر

پھونک دینا۔ جب تم منتر پھونک چکو گے تو وہ آدمی اس کے اثر سے تین بار دائیں بائیں سر ہلائے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو سمجھ لینا کہ میرے منتر کا اثر اس پر ہو گیا ہے۔ اگر اس نے سر نہ ہلایا تو اس کا مطلب ہو گا کہ اس پر کسی دوسرے ہمارے دشمن دیوتا کا اثر ابھی باقی ہے۔ سمجھ لینا کہ کوشیلا کے پریوار پر آنے والی مصیبت آدھی ختم ہوئی ہے آدھی ختم نہیں ہوئی۔"

کوشیلا کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ میں نے اسے کہا۔

"جب میں نے ناگ دیوتا کا منتر اس اٹک وادی پر پھونکا تھا تو یہ دیکھ کر میں بھی پریشان ہو گیا تھا کہ اس شخص نے تین بار تو کیا ایک بار بھی دائیں بائیں سر نہیں ہلایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس پر ناگ دیوتا کے دشمن دیوتا کا اثر کافی گہرا اور طاقتور ہے۔ چنانچہ اس پر ناگ دیوتا کے منتر کا آدھا اثر ہوا تھا۔"

کوشیلا نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"مہاراج اب کیا ہو گا؟ ہماری آدھی مصیبت کیسے ختم ہو گی؟"

میں نے کہا۔

"اس بابت مجھے ناگ دیوتا سے پوچھنا پڑے گا۔"

کوشیلا نے التجا کی۔

"مہاراج! آپ ابھی ناگ دیوتا جی سے پوچھ لیں۔ وہ جو حکم دیں گے' میں ویسے ہی کروں گی۔"

میں نے کہا۔

"اس کے لیے مجھے تھوڑی سی سادھنا کرنی ہو گی۔ سادھی میں جانا ہو گا۔ یہ کام میں رات کے وقت ہی کر سکتا ہوں جب چاروں طرف خاموشی ہو گی۔"

کوشیلا بولی۔

"آپ حکم کریں مہاراج! کیا میں آپ کو رات کے وقت جب گھر میں سب سو

رہے ہوں ساتھ لے کر چھت پر آ جاؤں؟"

میں سردی میں رات کے وقت چھت پر نہیں جانا چاہتا تھا۔ مجھے کرنا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ ابھی مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ یہ لڑکی کمانڈو خالد کو فرار کرانے میں میری کس طرح مدد کر سکتی ہے۔ میں نے کہا۔

"نہیں نہیں رات کے وقت چھت پر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ایسا کرنا کہ رات کے ٹھیک بارہ بجے غسل خانے میں آ جانا' میں وہیں دھیان میں جا کر ناگ دیوتا جی کو حاضری دوں گا اور ان سے ساری بات کر لوں گا۔"

کوشیلا نے کہا۔

"میں آپ کے حکم پر عمل کروں گی مہاراج!"

سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ کوشیلا نے مجھے اٹھا کر جلدی سے اپنے بلاؤز میں چھپا لیا۔ نوکرانی چھت کے دروازے میں آ کر کہنے لگی۔

"ماتا جی کہتی ہیں نیچے آ کر بھوجن کر لو۔"

"آ رہی ہوں۔"

کوشیلا نے اپنے سینے پر ساڑھی کو درست کرتے ہوئے کہا اور پھر چارپائی سے اٹھی اور نیچے اتر گئی۔ میں نے بڑی تیزی سے غور کرنا شروع کر دیا کہ میں اپنے مجاہد ساتھی کمانڈو خالد کو دلی پولیس کی اذیت ناک حراست سے کیسے نجات دلا سکتا ہوں اور اس سلسلے میں یہ لڑکی کوشیلا جو سی آئی اے کے انسپکٹر کی بیٹی ہے میری کیا اور کیسے مدد کر سکتی ہے۔ مختلف قسم کے خیالات میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں اکیلا سانپ کی شکل میں یہ کام سر انجام نہیں دے سکتا تھا۔ ایک ہی طریقہ قابل عمل لگ رہا تھا کہ میں کوشیلا سے کہوں کہ وہ مجھے کمانڈو خالد کے تہہ خانے کو جانے والی سیڑھیوں میں چھوڑ آئے۔ میرا خیال تھا کہ میں وہاں چھپ رہوں گا کیونکہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ تہہ خانے کو جاتی سیڑھیوں میں تھوڑا تھوڑا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جب کوشیلا واپس چلی جائے گی تو میں کمانڈو خالد کی کوٹھڑی کے باہر

کھڑے سنتری کا کام تمام کر دوں گا۔ لیکن اس میں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ میں سنتری کو ڈس کر اسے اپنے راستے سے ہٹا سکتا تھا لیکن اس کی پیٹی سے لگی ہوئی چابی سے تہہ خانے کے دروازے کا تالا نہیں کھول سکتا تھا۔ ایک سانپ کیسے دروازے کا تالا کھول سکتا ہے۔ پھر سوچتا کہ جب کوشیلا کوٹھڑی سے نکل رہی ہوگی اور سنتری تالا لگانے والا ہوگا تو میں اسے ڈس کر ہلاک کر دوں گا اور جلدی سے اندر داخل ہو جاؤں گا۔ لیکن اس طرح کوشیلا گھبرا جائے گی۔ اگر میں نے اسے پہلے اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا کہ میں سنتری کو ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں تو میرے پاس اس کو قائل کرنے کے واسطے کوئی دلیل نہیں تھی کہ آخر میں ایک بے گناہ سنتری کو کیوں مار رہا ہوں۔ کسی وقت سوچتا کہ میں کوئی ایسی ترکیب لڑاؤں کہ کوشیلا خود کمانڈو خالد کو سی آئی اے ہیڈ کوارٹر سے باہر لے آئے تو یہ بات ناممکن لگتی تھی۔

کافی سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے کوشیلا کی مدد سے تہہ خانے کی سیڑھیوں تک پہنچ کر وہاں چھپ جانا چاہیے۔ میں کوشیلا کو یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مجھے کمانڈو خالد کی کوٹھڑی کے اندر چھوڑ آئے۔ یہ کام میں اس سے آسانی سے لے سکتا تھا۔ لیکن اس میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ اس کے جاتے ہی سنتری باہر سے دروازے کو تالا لگا دیتا اور میں بھی کمانڈو خالد کے ساتھ کوٹھڑی میں بند ہو کر رہ جاتا۔ کیونکہ میں اندر سے باہر آ کر سنتری کو ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔ تہہ خانے کی کوٹھڑی کا دروازہ لوہے کا تھا۔ ظاہر ہے اس میں کوئی ایسا سوراخ نہیں تھا جس میں سے میں گزر کر باہر سیڑھیوں میں آ سکتا۔ بہتر یہی تھا کہ کوشیلا کی مدد سے تہہ خانے کی نیم روشن سیڑھیوں میں کسی جگہ چھپ کر بیٹھ جاؤں اور عین اس وقت سنتری کو ڈس دوں جب وہ دروازے پر تالا ڈال رہا ہو لیکن اس وقت کوشیلا بھی موجود ہوگی۔ میں اس کی موجودگی میں یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک میں ذہن میں ایک خیال آ گیا کیوں نہ میں سنتری کے ساتھ کوشیلا کو بھی ہلاک کر دوں؟

نہیں نہیں میرے دل نے کہا۔ کوشیلا ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی ہے۔ اس کو

قتل کرنے سے خدا مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ مجھے ایک معصوم لڑکی کو قتل نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ کوشیلا میری دشمن نہیں تھی۔ وہ میری جان نہیں لینا چاہتی تھی۔ بجلی کی چمک کی طرح میرے ذہن میں ایک اور خیال لہرا گیا۔ مجھے گندھرنی نے ایک بار بتایا تھا کہ اگر میں چاہو کہ کوئی میرے زہر سے ہلاک نہ ہو صرف تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش ہو جائے تو مجھے اس کو اس طرح ڈسنا ہوگا کہ میرے زہر کی بڑی تھوڑی سی مقدار اس کے جسم میں داخل ہو۔ مجھے یاد ہے میں نے گندھرنی سے سوال کیا تھا۔

”مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ میں نے کسی انسان کے جسم میں صرف اتنا ہی زہر داخل کیا ہے جو اس کو بے ہوش کر دے گا۔“

اس کے جواب میں گندھرنی نے مجھے کہا تھا۔

”یاد رکھو۔ اگر تم کسی کو ڈس کر مارنا نہیں چاہتے بلکہ صرف تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش کرنا چاہتے ہو تو تم اس کو اس طرح کاٹو گے کہ تمہارے صرف دانت اس کے جسم میں چبھیں گے اس کے فوراً بعد تم اپنا منہ پیچھے ہٹا لو گے۔“

اس وقت یہی ایک ترکیب میرے لیے کارگر اور قابل عمل تھی۔ اس کے بعد مجھے کوشیلا سے بھی جدا ہو جانا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حالات کے پیش نظر اس کے بعد مجھے کوشیلا کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے ہر طرح غور کر کے اس سکیم کو ذہن میں آخری شکل دے دی اور مطمئن ہو کر کوشیلا کے بلاؤز میں دب کر بیٹھا رہا۔ رات ہو گئی۔ کوشیلا نے اپنے پتا جی اور ماں کے ساتھ کھانا کھایا اور غسل خانے میں ہاتھ دھونے کے لیے گئی اور میری طرف سر جھکا کر کہنے لگی۔

”مہاراج! میں اب رات کے ٹھیک بارہ بجے اس غسل خانے میں آپ کو لے آؤں گی۔ آپ اس وقت دھیان میں جا کر ناگ دیوتا جی سے دوسرا اپائے معلوم کیجئے گا۔“

میں نے کہا۔

”ٹھیک رات کے بارہ بجے آنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جب گھر والے سو جائیں

تو تم رات کو کسی بھی وقت مجھے لے کر یہاں آ جانا۔"

میں نے سارا منصوبہ ذہن میں تیار کر لیا تھا۔ اب یہ لڑکی مجھے رات کو غسل خانے میں نہ بھی لاتی تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن مجھے اپنی بات نبھانی تھی اور کوشیلا پر یہ اثر ڈالنا تھا کہ میں ناگ دیوتا سے مشورہ کرنے کے بعد اس کو وہی کچھ بتا رہا ہوں جو مجھے ناگ دیوتا نے بتایا ہے۔

رات کو وہ کسی وقت اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلی۔ میں جاگ رہا تھا۔ غسل خانے میں جا کر اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی اور مجھے اپنے بلاؤز میں سے نکال کر اس نے مجھے اپنے ماتھے کے ساتھ لگا لیا اور دونوں ہاتھوں میں لے کر بولی۔

"مہاراج! سادھی لگائیے اور ناگ دیوتا جی سے میری طرف سے بھی پرارتھنا کیجئے کہ وہ ہمارے گھر کی بلائیں ہمیشہ کے لیے دور کر دیں۔"

میں نے کہا۔

"مجھے سامنے والی کرسی پر بٹھا دو۔"

اس نے مجھے ٹوٹی ہوئی کرسی پر بٹھا دیا جو نہ جانے کب سے وہاں پڑی تھی۔ میں نے کہا۔

"اب تم خاموش رہنا۔ میں گیان دھیان کرنے لگا ہوں۔"

میں نے اپنی گردن نیچے ڈال دی۔ مجھے کچھ کرنا تو تھا نہیں۔ بس ایک ڈیڑھ منٹ ہی گزارنا تھا۔ یہ ایک ڈیڑھ منٹ میں نے بڑی مشکل سے گزارا۔ ہلکی سی پھنکار ماری اور پھن اٹھا کر دھیمی آواز میں کوشیلا سے کہا۔

"میں ناگ دیوتا کے دربار سے ہو آیا ہوں۔ ان سے ساری بات کر لی ہے۔ انہوں نے جو کچھ مجھے بتایا ہے وہ میں تمہیں صبح بتاؤں گا۔ بات لمبی ہے تم نے غسل خانے میں زیادہ دیر لگا دی تو باہر سے کوئی نہ کوئی آواز دے دے گا۔"

اس نے مجھے ہتھیلی پر اٹھا لیا اور عاجزی سے کہا۔

"مہاراج! مجھے کچھ تو بتا دیجئے۔ ناگ دیوتا نے ہماری پرارتھنا سویکار کی ہے یا

نہیں؟"

میں نے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا کوشیلا! جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں تم پر کوئی آفت نہیں آ سکتی۔ کل باقی باتیں ہوں گی۔"

اس نے مجھے بلاؤز میں چھپا لیا اور یونہی سنک میں دوبارہ ڈونگے سے پانی گرا کر غسل خانے سے نکل گئی۔

دوسرے روز اس سے کہاں صبر ہوتا تھا۔ دن نکلنے کے بعد جب اس کا باپ تھانے چلا گیا اور اس نے ماتا جی کو بھی ناشتہ کرا دیا تو مجھے لے کر اوپر چھت پر دھوپ میں آ گئی۔ یہاں میں نے اسے بتایا۔

"کوشیلا! جس آدمی پر میں نے ناگ دیوتا کا منتر پھونکا ہے اس پر ایک بار پھر منتر پھونکنا پڑے گا۔ ناگ دیوتا کو جب میں نے بتایا کہ میرے منتر پھونکنے پر اس نے سر نہیں ہلایا تھا تو دیوتا مہاراج نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا کہ وہ ہمارے دشمن دیوتاؤں کا آدمی ہے۔ تب ناگ دیوتا جی نے مجھے شوجی مہاراج کا ایک اشلوک بتایا اور کہا کہ جا اور اس آدمی پر یہ اشلوک پڑھ کر پھونک۔ تم لوگوں کی ساری نحوستیں دور ہو جائیں گی اور وہ آدمی بھی ختم ہو جائے گا۔"

کوشیلا بڑے غور اور اشتیاق سے میری بات سنتی رہی۔ جب میں نے بات ختم کی تو وہ الجھن میں پڑ گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! میں دوسری بار پتا جی کو لے کر وہاں کیسے جاؤں گی؟"

میں نے کہا۔

"کوشیلا بہن! یہ تم جانو۔ میں نے تو تمہاری خاطر اور تمہارے گھر بار کی سلامتی کی خاطر جو کر سکتا تھا کر دیا ہے۔ اب اگر تم اپنے گھر کی بھلائی نہیں چاہتی ہو تو بے شک مجھے وہاں نہ لے جاؤ۔"

وہ فوراً" ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"نہیں نہیں مہاراج! ایسا نہ کہیں۔ میں آپ کو وہاں ضرور لے جاؤں گی خواہ مجھے کچھ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔"

میں نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

"اس بار ناگ دیوتا نے ایک اور شرط بھی لگا دی ہے۔"

"وہ کیا مہاراج؟" کوشیلا مزید گھبرا سی گئی۔

میں نے کہا۔

"ناگ دیوتا جی نے ہدایت کی ہے کہ اس بار جب میں اس آدمی پر شو جی مہاراج کا اشلوک پڑھ کر پھونکوں تو وہاں کوشیلا کے پریوار' اس کے خاندان کا کوئی آدمی وہاں موجود نہیں ہونا چاہیے۔"

کوشیلا سوچ میں پڑ گئی۔ میں نے اس کی مشکل حل کرتے ہوئے اور اپنے منصوبے کی راہ نکالتے ہوئے کہا۔

"تم ایسا کرنا کہ جب ہم لوگ سی آئی اے کے ہیڈکوارٹر میں تہہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگیں تو پتا جی سے کہہ دینا کہ میں مجرم سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

میں نے محسوس کیا کہ کوشیلا کے چہرے پر جو فکرمندی کے اثرات تھے وہ ختم ہوگئے ہیں۔ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"مہاراج! میں اس دفعہ پتا جی کے بغیر اکیلی ہی وہاں جاؤں گی۔ سب کو معلوم ہے کہ میں سی آئی ڈی انسپکٹر لچھمن داس بھنڈاری کی بیٹی ہوں۔ مجھے کوئی نہیں روکے گا اور پھر ایک بار میں سب کے سامنے اس آدمی سے مل بھی آئی ہوں۔"

کوشیلا نے اپنے ساتھ میرا مسئلہ بھی حل کر دیا تھا۔ میں نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے کہا۔

"لیکن وہاں تمہیں سورج دیوتا کے غروب ہونے کے بعد جانا پڑے گا۔ کیونکہ شو جی مہاراج کے اشلوکوں کا اثر سورج دیوتا کے غروب ہونے کے بعد زیادہ گہرا ہو جاتا

ہے۔"

دراصل میں اپنی آسانی کے لیے یہ کہہ رہا تھا۔ کیونکہ میں چاہتا تھا کہ تہہ خانے کے سنتری کوہلاک کرنے کی بعد اگر میں کمانڈو منظر خالد کو وہاں سے نکلوانے میں کامیاب ہوجاتا ہوں تو یہ فرار ایسے وقت میں ہونا چاہیے جب شام کا اندھیرا چھا چکا ہو۔ تاکہ ہم اس اندھیرے میں روپوش ہو سکیں۔ کوشیلا نے کچھ دیر غور کیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"مہاراج! کوئی بات نہیں۔ اگر یہ ضروری ہے تو میں شام کو ہی گھر سے نکلوں گی۔ میں گھر میں کہہ دوں گی کہ یونیورسٹی میں ایک فنکشن ہے' وہاں جا رہی ہوں۔ مجھے کبھی کسی نے وہاں جانے سے نہیں روکا۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر یہ کام آج شام کو ہی ہو جانا چاہیے۔ ہمیں زیادہ دیر نہیں لگانی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس اس آدمی کو تفتیش کے لیے دلی سے کسی دوسرے شہر لے جائے۔ پھر ہمارے لیے بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی۔"

اس نے جلدی سے کہا۔

"نہیں نہیں مہاراج ہم دیر نہیں کریں گے۔ میں آج شام کو ہی آپ کو لے کر وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔ جیسے ہی شام پڑی اس نے اپنی ماں سے کہا کہ میں کالج کے ایک فنکشن میں حصہ لینے کے لیے میلا یونیورسٹی جا رہی ہوں۔ ایک گھنٹے تک واپس آ جاؤں گی۔ اس کی ماں نے کہا۔

"بیٹی وہاں زیادہ دیر نہ لگانا۔ تمہارے پتا جی پریشان ہوں گے۔"

کوشیلا نے کہا۔

"نہیں ماتا جی! میں جلدی واپس آ جاؤں گی۔"

شام کو دلی میں سردی بڑھ گئی تھی۔ کوشیلا نے ساڑھی کے اوپر گرم ہاف کوٹ پہن کر گلے میں سکارف بھی باندھ لیا تھا۔ گھر سے نکل کر وہ کالونی کے چوک میں آ کر

ک گئی۔ ایک خالی رکشہ لیا اور اسے کہا۔

"سی آئی ڈی کے ہیڈ کوارٹر چلو۔"

رکشا چل پڑا۔ میں نے کوشیلا سے کہا۔

"تمہارا مفلر میرے چہرے کے آگے آ رہا ہے اسے ذرا پیچھے کر دو۔"

میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہاں رکشا ڈرائیور بھی ہے۔ وہ میری آواز سن سکتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ رکشار ڈرائیور نے رکشے کے شور میں بھی اپنے پیچھے ایک مرد کی آواز سنی تو سر گھما کر دیکھا کہ رکشے میں تو صرف ایک عورت سوار ہوئی تھی' یہ مرد کہاں سے آ کر بیٹھ گیا ہے۔ کوشیلا بڑی محتاط تھی۔ اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ رکشے والے کو جب پیچھے کوئی مرد بیٹھا نظر نہ آیا تو وہ یہی سمجھا کہ یہ آواز باہر سے آئی ہوگی۔ اس دوران کوشیلا نے اپنے مفلر کو آگے سے ذرا سا ہٹا لیا تھا۔

رکشا کافی دیر تک دلی کی سرد شام کے دھندلکوں میں روشن روشن سڑکوں پر چلتا رہا۔ پھر ایک دو منزلہ عمارت کے احاطے میں داخل ہوگیا۔ مفلر میرے آگے سے تھوڑا سا ہٹ گیا تھا اور مجھے باہر کا منظر نظر آنے لگا تھا۔ گیٹ پر مسلح سنتری پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے رکشے کو ہاتھ دے کر روک لیا۔ کوشیلا نے چہرہ باہر نکال کر کہا۔

"شریمان جی! میں کوشیلا ہوں۔ بھنڈاری جی کی سپتری۔"

سنتری کوشیلا کو پہچان کر گیٹ کے آگے سے ہٹ گیا۔ رکشا سے اتر کر کوشیلا اس طرف چلنے لگی جس طرف پہلی بار اس کا باپ اسے لے کر گیا تھا۔ میں اب اس سارے رستے کو اچھی طرح ذہن میں بٹھاتا جا رہا تھا۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہوگئی جہاں ایک سفید بالوں اور نظر کی عینکوں والا آدمی بیٹھا فائیل پر کچھ لکھ رہا تھا۔ ایک سنتری اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ کوشیلا نے جاتے ہی اسے نمسکار کیا۔

"کوشیلا بیٹی! تم کیسے آگئی ہو اس وقت؟ بھنڈاری جی تو ایک ضروری تفتیش کے سلسلے میں نئی دلی گئے ہوئے ہیں۔"

کوشیلا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"گپتا انکل! آپ کو یاد ہے۔ میں کل یہاں اپنے "امرت بازار پتریکا" والے مضمون کے سلسلے میں ایک مجرم کا انٹرویو لینے آئی تھی؟"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں یاد۔ میں نے ہی تو تمہیں اس کی اجازت دی تھی۔ کہو کیا بات ہے؟"

کوشیلا نے کہا۔

"انکل! مجھے یاد نہیں رہا۔ ایک دو ضروری باتیں اس مجرم سے اور پوچھنی ہیں۔ ان کے بغیر انٹرویو غیر مکمل رہ جائے گا۔ مجھے صبح پہلی ڈاک میں انٹرویو ٹائپ کر کے کلکتے بھجوانا ہے۔ میرا خیال تھا پتا جی یہاں پر موجود ہوں گے وہ مجھے مجرم سے ملانے لے جائیں گے۔ اب آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اسی مجرم سے دو تین باتیں پوچھ لوں جو بہت ضروری تھیں مگر مجھے پوچھنی یاد نہیں رہی تھیں۔"

یہ گپتا کوئی سپرنٹنڈنٹ وغیرہ ہو گا۔ اس نے تھوڑا توقف کیا۔ پھر کہنے لگا۔

"کوئی بات نہیں بیٹی! میرا سنتری تمہیں اس کے پاس لے جائے گا۔ تم وہاں زیادہ دیر نہ لگانا۔ کیونکہ یہ آدمی خاص طور پر بڑا خطرناک اگروادی (دہشت گرد) ہے۔"

کوشیلا نے فوراً کہا۔

"بالکل نہیں انکل۔ مجھے زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگیں گے۔ بس اس سے صرف دو سوال پوچھنے ہیں۔"

گپتا انکل نے اپنے قریب کھڑے سنتری کی طرف دیکھ کر کہا۔

"گنگا رام! بھنڈاری جی کی سپتری کو تہہ خانے میں پاکستانی قیدی کی کوٹھڑی میں لے جاؤ اور خود ہی اسے لے کر میرے کمرے میں واپس آنا۔"

سنتری گنگا دین کوشیلا کو لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ یہ معلوم کر کے مجھے بڑا اطمینان ہوا تھا کہ کمانڈو منظر خالد ابھی تک دلی کے سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں ہی تھا۔ ورنہ اگر اسے وہاں سے کسی دوسرے شہر منتقل کر دیا جاتا تو میرے لیے بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنا چھوٹا سا سر بلاؤز میں سے اوپر کر لیا ہوا تھا اور دفتر

کے اس سارے رستے کو غور سے دیکھتا جا رہا تھا جہاں جہاں سے گزر کر سنتری گنگا رام کوشیلا کو لے جا رہا تھا۔ وہ دفتر کے کمروں کے درمیان میں جو راہ داری تھی اس پر سے ہو کر جا رہا تھا۔ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ سارے دفتر بند تھے اور وہاں کوئی چپڑاسی یا سنتری پہرے پر نہیں تھا۔ وہ آخر میں جا کر بائیں جانب مڑ گیا۔ یہاں سے سیڑھیاں شاید نیچے تہہ خانے کو جاتی تھیں۔ راہ داری یہاں ختم ہو گئی۔ مگر آگے کوئی دیوار نہیں تھی بلکہ سامنے چھوٹا سا صحن تھا جہاں بلب کی روشنی میں دیوار کے ساتھ ایک ٹرک کھڑا تھا۔ یہ پولیس کا ٹرک ہی ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی سنتری سیڑھیاں اترنے لگا۔ کوشیلا نے اسے روک دیا اور کہا۔

"گنگا دین تم یہیں ٹھہرو۔ میں اکیلے ہی اٹنک وادی سے کچھ باتیں پوچھنا چاہتی ہوں۔"

سنتری گنگا دین کوئی زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا لیکن کوشیلا نے اس کے آفیسر گپتا سے جو باتیں کی تھیں اس نے سن لی تھیں اور اسے علم ہو چکا تھا کہ بھنڈاری کی بیٹی کسی اخبار میں مضمون چھپوانے کے لیے مجرم کا انٹرویو لینا چاہتی ہے۔ پھر بھی وہ بولا۔

"بہن جی! یہ لوگ خطرناک ہوتے ہیں۔ آپ کا اس سے اکیلے ملاقات کرنا ٹھیک نہیں ہے۔"

کوشیلا نے کہا۔

"نیچے جو گارڈ سنتری دروازے پر ہے۔ اسے خبردار کر دوں گی تم فکر نہ کرو۔ میں پتا جی کے ساتھ کل بھی اس آدمی سے مل چکی ہوں۔ ایک دو باتیں پوچھنی ہیں۔ ابھی واپس آ جاؤں گی۔"

سنتری گنگا دین مجبور سا ہو کر وہیں کھڑا رہا اور بولا۔

"جلدی آ جانا بہن جی۔"

کوشیلا نے کہا۔ "بس ایک منٹ میں واپس آتی ہوں۔"

اور وہ تہہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ یہ پندرہ بیس سیڑھیاں تھیں۔ اینٹوں

کی سیڑھیاں تھیں۔ آخر میں جا کر جہاں تہہ خانے کا دروازہ تھا وہاں ایک دھیما سا بلب روشن تھا۔ باقی سیڑھیوں میں سے زیادہ روشنی نہیں تھی۔ جب کوشیلا آخری سیڑھی پر پہنچی تو وہاں جو سنتری پہرہ دے رہا تھا وہ اٹن شن ہوگیا لیکن اس نے کوشیلا کو پہچان لیا تھا۔ کہنے لگا۔

"بہن جی! آپ کیسے آئی ہیں۔"

کوشیلا نے اس سے کہا۔ "دروازہ کھولو۔ مجھے مجرم سے ایک ضروری بات پوچھنی ہے۔ پتا جی بھی آ رہے ہیں۔"

گارڈ سنتری نے دروازہ کھول دیا۔" اس دوران میں اس کے بلاؤز سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے گھبرا کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا تاکہ مجھے سنتری کی نظروں سے چھپا سکے۔ میں نے کہا۔

"کوشیلا میرا باہر آنا بہت ضروری ہے۔"

میں نے جان بوجھ کر انسانی آواز میں بات کی تھی۔ سنتری نے جب ایک ایسے آدمی کی آواز سنی جو اسے وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا تو وہ گھبرا گیا۔ کوشیلا بھی گھبرا گئی۔ اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ وہ سمجھی شاید میرا باہر آنا بہت ضروری ہوگا۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ کوشیلا کے بلاؤز سے نکل کر زمین پر آتے ہی اس کی پنڈلی پر بڑی احتیاط سے ڈس دیا۔ کوشیلا نے جلدی سے اپنا پاؤں پیچھے کیا اور جھک کر مجھے دیکھنے لگی۔ جیسے ہی وہ جھکی' وہ گر پڑی۔ سنتری اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو میں نے اچھل کر اس کی گردن پر ڈس دیا۔ سانپ اگر آدمی کے پاؤں پر کاٹے تو اس کے زہر کا اثر دماغ تک پہنچنے میں تھوڑا وقت لگتا ہے۔ لیکن اگر گردن پر کاٹے تو زہر کا اثر آدمی کے دماغ میں بڑی جلدی پہنچ جاتا ہے اور آدمی پر فوری اثر ہوتا ہے۔ گارڈ سنتری کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

جیسے ہی میں نے اس کی گردن پر پوری طاقت سے کاٹا وہ وہیں منہ کے بل کوشیلا کے اوپر گر پڑا۔ گارڈ سنتری نے دروازے کا ابھی صرف تالا ہی کھولا تھا۔ دروازہ ابھی

بند تھا۔ میں ایک دو سیکنڈ کے لیے ایک طرف ہو کر وہیں بیٹھا رہا۔ جب مجھے اطمینان ہوگیا کہ کوشیلا بے ہوش ہے اور گارڈ سنتری مرچکا ہے تو میں دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے لوہے کے دروازے کے درمیان دونوں پٹوں کے درمیں سر ڈال کر ذرا زور لگایا تو دروازہ اتنا کھل گیا کہ میں اس میں سے آسانی سے گزر سکتا تھا۔ مجھے بڑی جلدی جلدی سب کچھ کرنا تھا۔ میں تہہ خانے کی کوٹھڑی میں داخل ہوگیا۔ کمانڈو خالد دیوار کے ساتھ سمٹ کر کمبل لپیٹے بیٹھا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ میں نے جاتے ہی کہا۔

"کمانڈر خالد! میں آگیا ہوں۔ جلدی سے میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو۔ سیڑھیوں میں گارڈ سنتری کی لاش پڑی ہے اور ایک سنتری زندہ حالت میں موجود ہے مگر اس کے پاس رائفل وغیرہ نہیں ہے۔"

کمانڈو خالد نے میری آواز سنی تو سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں رینگ کر اس کے بالکل سامنے چلا گیا۔ میں نے کہا۔

"میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ یہ وقت باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ جلدی سے اٹھو اور یہاں سے بھاگ چلو۔ جلدی کرو۔"

کمانڈو خالد نے کمبل اتار کر ایک طرف پھینک دیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازے کے ایک پٹ کو پیچھے کیا۔ اس کی دلخراش آواز بلند ہوئی۔ اوپر والا سنتری یہی سمجھا ہوگا کہ بھنڈاری کی بیٹی کوشیلا واپس آ رہی ہے یا ابھی اندر گئی ہے۔ کمانڈو خالد نے سیڑھیوں میں ایک عورت اور گارڈ سنتری کی لاش دیکھی تو سب کچھ سمجھ گیا کہ یہ کام میں نے ہی کیا ہے۔ میں نے کہا۔

"ایک سنتری اوپر کھڑا ہے تم یہیں ٹھہرو جب میں منہ سے سانپ کی سیٹی کی آواز نکالوں تو تم اوپر آ جانا۔"

یہ کہہ کر میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر آ گیا۔ باہر والا سنتری بے چینی سے سیڑھیوں کے آگے ٹہل رہا تھا اور بیڑی پی رہا تھا۔ وہاں اندھیرا سا تھا۔ صرف کاریڈور میں کچھ فاصلے پر ایک بلب روشن تھا۔ جس کی روشنی یہاں تک پہنچتے پہنچتے اندھیرے

میں جذب ہو رہی تھی۔ میں ایک طرف سے ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ میں چھوٹا سا بھورے رنگ کا سانپ تھا۔ میں اسے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ مجھے کہاں حملہ کرنا ہے۔ جیسے ہی وہ ٹہلتے ہوئے واپس ہونے لگا میں نے اچھل کر اس کی کلائی پر ڈس دیا۔ سنتری نے گھبرا کر اپنا ہاتھ زور سے جھٹکا۔ لیکن یہ اس کے جسم کی آخری حرکت تھی۔ میرے زہر کا کوئی علاج نہیں تھا۔ یہ بڑا مہلک زہر تھا۔ سنتری ایک طرف جھکا اور دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ میں تیزی سے سیڑھیوں میں اتر گیا اور کمانڈو خالد سے کہا۔

"کمانڈر! اوپر آ جاؤ۔"

وہ مجھ سے پہلے اوپر آ گیا۔ میں سیڑھیاں رینگ کر چڑھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"مجھے اٹھا لو۔"

اس نے مجھے اٹھا لیا۔ میں نے کہا۔

"سامنے احاطے میں جو ٹرک کھڑا ہے۔ اس طرف بھاگ چلو۔"

کمانڈو خالد کاریڈور کی تین چار سیڑھیاں پھلانگ کر احاطے میں دیوار کے ساتھ کھڑے ٹرک کی طرف دوڑا۔ میں اس کے کندھے سے لپٹا ہوا تھا اور پیچھے اور دائیں بائیں بھی دیکھ رہا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ دفتر سارے بند ہو گئے تھے۔ وہاں کوئی سنتری وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس وقت تہہ خانے میں سے ایک خطرناک مجرم نکل کر فرار ہو جائے گا۔ میں نے خالد سے کہا۔

"ٹرک خالی ہے۔ اس کے پیچھے دیوار ہے۔ ٹرک کی چھت پر جا کر دیوار کی دوسری طرف چھلانگ لگا دو۔"

وہ ٹرک کی چھت پر چڑھ گیا۔ ٹرک اور دیوار کے درمیان تھوڑا سا ہی فاصلہ تھا۔ کمانڈو خالد چھلانگ لگانے کی بجائے اچھل کر دیوار پر آ گیا اور وہیں دیوار کی منڈیر سے لپٹ گیا۔ ہم دونوں نے دوسری طرف نگاہ ڈالی۔ دوسری طرف شام کے جھٹپٹے میں ایک کھائی نظر پڑی۔ میں نے خالد سے کہا۔

"نیچے کھائی میں چھلانگ لگا دو۔ جلدی کرو۔"

دیوار زمین سے کوئی دس گیارہ فٹ اونچی ہوگی۔ کمانڈو خالد دیوار کی منڈیر کو پکڑ کر دوسری طرف لٹک گیا۔ اس طرح سے دیوار کی اونچی کا فاصلہ پانچ چھ فٹ کم ہوگیا۔ پھر اس نے ہاتھ چھوڑ دیے اور ہم دونوں کھائی میں گر پڑے۔ میں ابھی تک اسی کے کندھے سے چمٹا ہوا تھا۔ کھائی میں کوڑا کرکٹ اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ گندا پانی نیچے جا کر درمیان میں بہہ رہا تھا۔ ہم کھائی کے کنارے کی دیوار کے قریب گرے تھے۔ میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ دلی کا یہ کون سا علاقہ ہے؟"

وہ کھائی کے اندر ہی اندر سامنے کی طرف دوڑتے ہوئے بولا۔

"فکر نہ کرو۔ میں اس سارے علاقے سے واقف ہوں۔"

میں یہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ وہ یونہی ایک طرف نہیں دوڑ پڑا۔ دلی میں کمانڈو خالد کی خفیہ تنظیم کے دو آدمی موجود تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جلدی ان کے پاس پہنچ جائے تاکہ ہم محفوظ ہو جائیں۔ آگے جا کر وہ کھائی سے باہر نکل آیا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کی عمارت کی روشنیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ میرے خیال کے مطابق کم از کم آدھ گھنٹے تک کمانڈو خالد کے فرار کا پولیس کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں صرف آفس پرنٹنڈنٹ گپتا ہی اس وقت موجود تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے کوشیلا کو سنتری گنگا رام کے ساتھ تہہ خانے میں کمانڈو خالد سے ملاقات کے لیے بھیجا ہے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد ہی وہ کسی کو یہ معلوم کرنے کے لیے بھیج سکتا تھا کہ یہ لوگ ابھی تک کیوں نہیں آئے۔ اس دوران ہمیں سی آئی اے ہیڈ کوارٹر سے زیادہ سے زیادہ دور چلے جانا چاہیے تھا۔ یہ علاقہ جہاں ہم جا رہے تھے دلی شہر کے آس پاس کا علاقہ ہی تھا۔ اتنا ویران بھی نہیں تھا۔ دور روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ابھی شام ہی ہوئی تھی۔ کمانڈو خالد اب دوڑنے کی بجائے تیز چلنے لگا تھا۔

میں اس کے کندھے سے چمٹا ہوا تھا میں نے پوچھا۔

"مجاہد رحمت خان اور انور خان وغیرہ کا کیا ہوا؟ تمہیں پولیس نے کہاں سے پکڑا تھا؟ میں تو ریستوران میں تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ دھماکہ ہوا اور وہاں شور مچ گیا۔ تھوڑی دیر میں وہاں پولیس کی گارد آ گئی۔ میں ریستوران سے نکل کر ایک طرف چل پڑا۔ سامنے پولیس کے سپاہی ایک آدمی کو پکڑ کر لا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی پکڑ لیا۔"

کمانڈو خالد کا سانس دوڑنے اور تیز چلنے سے پھول گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ ساری باتیں اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد کریں گے۔"

وہ کھائی سے ہٹ کر ایک کھلے میدان میں سے گزرنے لگا جہاں کوڑے کرکٹ کے ایک ڈھیر کو کسی نے آگ لگا دی تھی اور اس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ میدان کی دوسری طرف ایک چھوٹی سی سڑک تھی۔ اس کے آگے کسی کالونی کے مکان تھے جہاں کسی گاڑی کے انجن کی مسلسل چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ کمانڈو خالد کالونی سے بچ کر اس کے عقب میں سے گزرتا ہوا دوسری طرف نکل آیا۔ کہنے لگا۔

"سامنے جو اونچا ٹیلہ ہے اس کے پار جمنا دریا بہہ رہا ہے۔ ہمیں وہاں پہنچنا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ادھر کوئی سنتری وغیرہ تو گشت پر نہیں ہوتے؟"

وہ بولا۔

"مجھے معلوم نہیں۔ میں کبھی کبھار ہی دلی میں آتا ہوں۔ میں احتیاط کے طور پر ٹیلے کی دوسری طرف سے دریا پر جاؤں گا۔"

یہ نسبتاً خاموش اور بے آباد سا علاقہ تھا۔ سردیوں کی شام یہاں بڑی خاموش اور ڈراؤنی سی لگ رہی تھی۔ کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"میں حیران ہوں کہ تم تہہ خانے میں کیسے آ گئے؟ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم وہاں پہنچ جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔

"میں ایک دن پہلے بھی تمہارے پاس آیا تھا۔ تمہیں یاد ہے کل سی آئی ڈی کا انسپکٹر بھنڈاری اپنی بیٹی کو لے کر تمہارے پاس آیا تھا۔"

وہ چلتے چلتے بولا۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں اس لڑکی کے ساتھ ہی تھا مگر سانپ کی شکل میں اس کے بلاؤز میں چھپا ہوا تھا۔ بہرحال ساری باتیں تمہیں آرام سے بیٹھ کر سناؤں گا۔"

وہ کہنے لگا۔

"مجھے یقین ہے کہ ہمارے ساتھی مجاہد رحمت خان اور انور خان پولیس کے ہاتھ نہیں آئے ہوں گے۔ ہم تو دھماکے بعد پیلس ہوٹل کے قریب ہی تھے کہ پولیس نے ہمیں للکارا اور ہم دوڑ پڑے۔ میں ان کے قابو آگیا۔ دو سنتری رحمت اور انور خاں کے پیچھے دوڑے تھے۔ پھر پتہ نہیں پولیس انہیں پکڑ سکتی ہے یا نہیں۔"

شام کا جھٹپٹا رات کے اندھیرے میں تبدیل ہوگیا تھا اور دریا کنارے والے مٹی کے چھوٹے سے ٹیلے پر کسی بھوت کا گمان ہو رہا تھا۔ ٹیلے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم دریا کے کنارے آ گئے۔ سردیوں کا موسم ہونے کی وجہ سے دریا اترا ہوا تھا اور اس پر کہرا چھایا ہوا تھا۔ کمانڈو خالد کے کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے کچیلے تھے۔ ایک جانب کچھ درختوں کے جھنڈ رات کے پہلے اندھیرے میں سیاہ بادلوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے جو آسمان سے زمین پر اتر آئے ہوں۔ کمانڈو خالد ان درختوں میں آ کر ایک جگہ رک کر اندھیرے میں دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔

"مجھے بتاؤ تم کیا دیکھنے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں سانپ کے روپ میں ہوں اور مجھے اندھیرے میں سب کچھ نظر آ رہا ہے۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"ذرا دیکھو یہاں ایک گیراج کا چھپڑ ہے۔"

مجھے درختوں کے آخری کنارے پر ایک کھوکھا سا صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"سامنے والے درختوں کے پاس ایک کھوکھا سا دیکھ رہا ہوں۔"

اس نے کہا۔

بس وہی جگہ ہے جہاں ہمیں جانا ہے۔"

میں اسے گیراج تک لے گیا۔ گیراج کے باہر ایک رکشے کا پنجر ٹیڑھا ہو کر پڑا تھا۔ کمانڈو خالد گیراج کے پیچھے آ گیا۔ یہاں بھی گیراج کا ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ اندر تنگ سا کمرہ تھا جس میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ کمانڈو خالد نے ایک کونے میں جا کر ٹین کا صندوق کھول کر اندھیرے میں ہی ٹٹول کر ایک پرانا کمبل نکال لیا اور بولا۔

"تم میرے کندھے سے نیچے آ جاؤ۔ میں کمبل اوڑھوں گا۔"

میں اس کے کندھے سے اتر کر ٹین کے صندوق کے پاس بیٹھ گیا۔ گیراج میں اندھیرا تھا اور ڈیزل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ کمانڈو خالد کو تھوڑا تھوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ وہیں کمبل اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

"یہ بھی اپنے آدمیوں کا خفیہ ٹھکانہ ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ جب تک اپنے کسی آدمی کو ہماری اطلاع نہیں ملے گی یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"اپنے آدمی کو کیسے خبر دی جا سکتی ہے؟"

اس نے کہا۔

"رات گہری ہو جانے کے بعد مجھے ہی جانا پڑے گا۔ کیونکہ تم اس شخص کا گھر نہیں جانتے جو ہماری تنظیم کے آدمیوں کو خبر کر سکتا ہے۔"

میں نے اسے کہا۔

”آدھی رات تک دلی پولیس تمہاری تلاش میں نکل چکی ہوگی۔ تمہارا جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔“

کمانڈو خالد بولا ”اور تم بھی تو اس حالت میں نہیں جا سکتے۔ ہمارے مخبر کا گھر یہاں سے اگرچہ زیادہ فاصلے پر نہیں ہے لیکن تمہیں راستے کا پتہ نہیں چلے گا۔ میں رات کے اندھیرے میں نکل جاؤں گا۔“

ہم اس چھوٹے سے گیراج کے اندھیرے میں چھپ کر بیٹھے رہے۔ یہاں ہم نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی کہانی سنائی۔ کمانڈو خالد میرے واقعات سن کر کہنے لگا۔

”میں سمجھتا ہوں قدرت نے تمہاری مدد کی۔ ورنہ جس طرح تمہیں سانپ سے ڈسوا کر زندہ دفن کر دیا گیا تھا تمہاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو زندہ نہ بچتا۔“

میں نے کہا۔

”اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم اپنا مشن مکمل کرنے کے بعد بھوپال پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔“

خالد بولا۔

”خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اپنا مشن کامیابی سے مکمل کر لیا ہے۔ اب بھوپال پہنچنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ ہمارے آدمی ہمیں دلی سے نکالنے میں ہماری مدد کریں گے۔“

میں نے خالد سے کہا۔

”تم یہاں سے رات کے اندھیرے میں خطرہ مول لے کر اپنے آدمی کے ہاں جاؤ گے اور پھر اسی جگہ واپس آؤ گے۔ کیا اس سے یہ بہتر نہیں ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلا جاؤں اور ہم یہاں واپس آنے کی بجائے رات اپنے مخبر کے گھر پر ہی بسر کریں اور اپنے آدمیوں سے وہیں ملاقات بھی کر لیں؟“

کمانڈو خالد نے کہا۔

”اپنے مخبر کے پاس ہم دن نکلنے کے بعد نہیں ٹھہر سکتے۔ وہاں دن کے وقت

دوسرے آدمی آ جاتے ہیں۔ جبکہ یہاں دن کے وقت بھی کوئی نہیں آتا۔ ہمارے آدمیوں میں سے کوئی نہ کوئی اطلاع ملتے ہی یہاں پہنچ جائے گا۔ اگر وہ دن کے وقت بھی آیا تو ہم اس کا انتظار کرسکتے ہیں۔"

ہم اندھیرے میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ مجھے اندھیرے میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ اچانک باہر آہٹ سی سنائی دی۔ کمانڈو خالد نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔





ہم نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا رکھی تھی۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔"

میں رینگ کر دروازے کے نیچے سے باہر نکل گیا۔ باہر رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ مگر مجھے درختوں کے تنے اور جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے تیزی سے رینگتے ہوئے درختوں کے اردگرد چکر لگایا۔ وہاں مجھے کوئی آدمی یا جانور دکھائی نہ دیا۔ میں نے واپس آ کر کمانڈو خالد کو بتایا کہ باہر کوئی نہیں ہے۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ کسی انسان کے قدموں کی آہٹ تھی۔"

میں نے کہا۔

"تم ایک طرف ہٹ کر بیٹھ جاؤ۔ اگر کوئی سپاہی ہوا تو میں اسے سنبھال لوں گا۔"

اس کے بعد باہر سے دوبارہ کوئی آہٹ وغیرہ سنائی نہ دی۔ لیکن کمانڈو خالد بے چین ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"مجھے یہاں خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے ہم دونوں کو یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔"

میں نے کہا۔

"کیا اس وقت تمہارا آدمی اپنے گھر پر مل جائے گا؟"

خالد کہنے لگا۔

"ہم اب اپنے مخبر کے گھر نہیں جائیں گے۔ یہاں سے سیدھا اپنی تنظیم کے رکن بشیر بھائی کے مکان پر جائیں گے۔"

"بشیر بھائی کا مکان یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"پرانے قلعے کے پاس ہے۔ یہاں سے کافی دور ہے۔ لیکن ہم یہاں بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ لگتا ہے کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔"

یہ کہہ کر کمانڈو خالد نے کھڑے ہو کر کمبل کو اپنے جسم اور منہ سر کے گرد اچھی طرح سے لپیٹا اور مجھے زمین پر سے اٹھاتے ہوئے بولا۔

"اللہ کا نام لے کر نکل پڑتے ہیں۔"

گیراج سے نکلنے کے بعد کمانڈو خالد نے اس طرف چلنا شروع کر دیا جس طرف شہر کی آبادی کی روشنیاں بہت کم تھیں۔ دور کہیں کہیں کوئی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ مجھے اس نے پہلے تو اپنی کلائی پر لپیٹا ہوا تھا لیکن میرے اصرار پر اس نے مجھے اپنے کندھے پر بٹھا دیا۔ میں اس کے کندھے پر کمبل سے چمٹ کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میں نے خالد کو بتا دیا کہ ہمارے آگے پیچھے دائیں بائیں جہاں تک سانپ کی حیثیت سے میری نگاہ کام کرتی ہے مجھے کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا۔ یہ سن کر کمانڈو خالد تیز تیز چلنے لگا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہمیں بڑی دور جانا ہے۔ دلی کا پرانا قلعہ یہاں سے پندرہ بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ آگے جا کر ہمیں ماڈرن کالونی کی سڑکوں پر سے بھی گزرنا پڑے گا۔ وہاں پکڑے جانے کا خطرہ ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں اب تک میرے فرار کا سی آئی اے ہیڈ کوارٹر والوں کو علم ہو چکا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"یہاں کوئی ٹیکسی رکشا بھی نہیں ہے۔ اگر فرض کر لیا آگے جا کر کوئی سواری مل بھی جاتی ہے تو کیا تمہارے پاس کچھ پیسے ہوں گے؟"

خالد نے کہا۔

"میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہاں سے تو نکلیں۔ آگے جا کر سوچ لیں گے۔"

علاقہ ویران تھا۔ کوئی مکان وغیرہ نہیں تھا۔ خالد کمبل کی بکل مارے تیز تیز چلتا جا رہا تھا۔ میں اس کے کندھے سے چمٹا ہوا تھا اور اس کے او پی یعنی دیدبان کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ یہ شروع رات کے لمحات تھے اور بھارت کی راجدھانی کی روشنیاں جھلملاتی ہوئی دور دور سے نظر آ رہی تھیں۔ کمانڈو خالد ایسے علاقے سے ہو کر جا رہا تھا جہاں آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ دریا ہماری بائیں جانب دور ہوتا جا رہا تھا۔ ہم ایک سڑک پر نکل آئے جہاں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی ٹرک یا بس گزر جاتی تھی۔ خالد ایک طرف جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا

"ہمیں یہاں سے کسی ٹیکسی رکشے میں سوار ہونا چاہیے۔ پیدل گئے تو آگے شہر کے بارونق علاقے شروع ہو جاتے ہیں' پکڑے جانے کا خطرہ ہوگا۔"

میں نے کہا۔

"اس سڑک پر تو ابھی تک کوئی رکشا ٹیکسی مجھے دکھائی نہیں دیا۔ صرف ایک بس گزر رہی ہے اور تین چار ٹرک گزر رہے ہیں۔"

کمانڈو خالد غور سے سڑک پر دور سے آنے والی روشنی دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے یہ کوئی ٹیکسی ہے اور خالی بھی ہے۔ اس کے اوپر کی سرخ بتی روشن ہے۔"

میں نے اس طرف دیکھا تو واقعی ایک گاڑی آ رہی تھی جس کی چھت پر سامنے کی جانب سرخ بتی جل رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ ٹیکسی ہے اور خالی ہے۔ میں نے خالد سے کہا۔

"تم گاڑی چلا لیتے ہو ناں؟"

وہ بولا۔ "ہاں۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر سڑک پر آکر کسی طرح اس ٹیکسی کو روکو۔ آگے میں سنبھال لوں گا۔"

وہ ذرا ہچکچایا۔ میں نے کہا۔

"اگر تمہیں یقین ہے کہ یہ ٹیکسی ہے اور خالی بھی ہے تو آگے جا کر اسے ہاتھ دو۔ اس کے بعد شاید تمہیں کوئی سواری نہ مل سکے۔"

وہ اٹھا اور سڑک پر ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ٹیکسی کی روشنیاں قریب آئیں تو اس نے آگے بڑھ کر اسے ہاتھ دیا۔ یہ ٹیکسی ہی تھی۔ ٹیکسی رک گئی۔ جیسے ہی ٹیکسی رکی میں اندھیرے میں اچھل کر ٹیکسی کی چھت پر جا بیٹھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کھڑکی کے شیشے میں سے سر باہر نکال کر کمانڈو خالد کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا۔

"کیا بات ہے بھائی؟"

خالد نے کہا۔

"بھارت نگر تک لے چلو بھائی۔ جتنے پیسے کہو گے دے دوں گا۔"

کمانڈو خالد نے صرف کمبل لپیٹا ہوا تھا وہ حلیئے سے کوئی چور ڈاکو لگ رہا تھا۔

ڈرائیور نے کہا۔

"بھائی! میں بھارت نگر کی طرف نہیں جا رہا۔"

جیسے ہی اس نے ایکسیلیٹر دبا کر گاڑی آگے کی' میں چھت پر سے اتر کر کھڑکی کے ادھ کھلے شیشے میں اندر کود گیا اور ڈرائیور کی گردن سے چمٹتے ہوئے کہا۔

"گاڑی روکو' بریک لگاؤ' نہیں تو میں تمہیں ڈس دوں گا۔"

ڈرائیور کے خوف کے مارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے فوراً" بریک لگا دی۔

میں نے کمانڈو خالد کو آواز دی۔

"آ جاؤ دوست!"

ٹیکسی ڈرائیور پر دہشت طاری تھی۔ ایک تو اس کی گردن سے سانپ لپٹا ہوا تھا

دوسرے یہ سانپ انسانی آواز میں بول رہا تھا۔ کمانڈو خالد دوڑ کر آ گیا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ بس خاموشی کے ساتھ ٹیکسی سے اتر جاؤ۔"

وہ خوف کے مارے کانپ رہا تھا۔ جلدی سے ٹیکسی سے اتر کر وہیں سڑک پر ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ میں نے خالد سے کہا۔

"ڈرائیونگ سیٹ پر آ جاؤ۔"

خالد نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے سٹیرنگ سنبھالا تو میں نے گرج دار آواز میں ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"خبردار! کسی سے ہرگز ذکر نہ کرنا کہ ہم تمہاری ٹیکسی لے گئے تھے۔ یاد رکھو اگر تم نے کسی کو بتایا تو تو جہاں بھی ہوگے میں وہیں آ کر تمہیں ڈس دوں گا۔ میں ناگ دیوتا ہوں۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"جے ہو ناگ دیوتا کی' جے ہو۔"

اور وہیں سجدے میں گر پڑا۔ تب کمانڈو خالد نے اسے کہا۔

"دو گھنٹے بعد گاندھی نگر کے چوک میں آ کر اپنی ٹیکسی لے جانا۔"

اور خالد نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے خالد سے پوچھا۔

"یہ گاندھی نگر کا چوک کہاں پر ہے؟"

اس نے کہا۔

"پرانے قلعے کے قریب ہی ہے۔"

ٹیکسی سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر خالد کے فرار کا پولیس کو پتہ چل چکا ہے تو کہیں سڑک کے چوراہوں پر پولیس رکاوٹیں ڈال کر چیکنگ نہ کر رہی ہو۔ جب ایک چوک آ کر گزر گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ پولیس ابھی تک خالد کے فرار سے لاعلم ہے یا اگر اس کے فرار کا راز کھل چکا ہے تو پولیس نے اس علاقے

میں ابھی چیکنگ شروع نہیں کی۔ ٹیکسی کی رفتار خالی سڑک پر ستراسی کے قریب تھی۔ خالد نے ٹیکسی کے اوپر سرخ بتی بجھا دی تھی۔ کافی دیر تک ہم شہر کی نسبتاً" غیر آباد سڑکوں پر سے گزرتے رہے۔ آخر دور سے بہت سی روشنیوں کے جھمگھٹے نظر آنے لگے خالد نے کہا۔

"یہ گاندھی نگر کی روشنیاں ہیں۔ اسکے پیچھے پرانے قلعے کی آبادی ہے۔ ہم ٹیکسی اس کالونی کے بڑے چوک کے قریب چھوڑ دیں گے۔ میں ٹیکسی کو اپنے آدمی کے مکان تک نہیں لے جانا چاہتا۔"

گاندھی نگر کی روشنیوں کو ایک جانب چھوڑتے ہوئے کمانڈو خالد گاڑی ایک چھوٹی سڑک پر لے آیا۔ یہاں ایک نالہ سڑک کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ اس نالے کو میں اندھیرے میں بھی اچھی طرح سے دیکھ رہا تھا۔ سو ڈیڑھ سو گز آگے جانے کے بعد ایک چوراہے کی ٹریفک لائٹس روشن تھیں۔ خالد نے ایک طرف گاڑی کھڑی کر دی اور مجھے اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ گاندھی نگر کا بڑا چوراہا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو یہاں گاڑی مل جائے گی۔ یہاں سے آگے ہم پیدل جائیں گے۔"

وہ جگہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا جہاں کمانڈو خالد کی خفیہ تنظیم کا مجاہد پرانے قلعے کی آبادی میں رہتا تھا اور وہ کیا کام کرتا تھا۔ میں نے اس کا نام کمانڈ خالد کی زبانی بشیر بتایا ہے' یہ نام بھی فرضی ہے۔ اس کا اصل نام کچھ اور ہے جو میں نہیں بتانا چاہتا۔

آپ یوں سمجھ لیں کہ ہم مجاہد بشیر کے پاس خیریت سے پہنچ گئے۔

کمانڈو خالد کو دیکھتے ہی اس نے اسے سینے سے لگا لیا اور بولا۔

"کمانڈر! ہمیں تمہاری گرفتاری کی خبر مل گئی تھی۔ ہمارے سارے ساتھی اس وقت روپوش ہوگئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"سب سے پہلے مجھے دوسرے کپڑے دو۔ میں منہ ہاتھ دھوؤں گا۔"

خالد نے مجھے ابھی تک چھپایا ہوا تھا اور مجاہد بشیر کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ مجاہد بشیر دوسرے کپڑے لانے کے لیے گیا تو خالد نے مجھے کمبل کے اندر سے نکال کر آہستہ سے کہا۔

"یہاں کسی جگہ چھپ جاؤ۔ میں ابھی تمہارے بارے میں کسی کو نہیں بتانا چاہتا۔ کسی کو یقین بھی نہیں آئے گا۔"

کمانڈو خالد نے مجھے کوٹھڑی نما اس تنگ سے کمرے میں چھوڑ دیا۔ میں جلدی سے رینگ کر لکڑی کے صندوق کے نیچے اس طرح چھپ کر بیٹھ گیا کہ مجھے کمرے کا سارا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ مجاہد بشیر خالد کے لیے گرم سویٹر اور دھلے ہوئے کپڑے لے کر آگیا۔ خالد نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر دوسرے کپڑے بدلے' اتنی دیر میں قریب ہی رکھے گیس کے چولہے پر مجاہد بشیر نے چائے تیار کر لی تھی۔ دونوں چولہے کے پاس بیٹھ کر چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ خالد نے اس سے پوچھا۔

"ہمارے باقی مجاہد کہاں کہاں روپوش ہیں؟"

مجاہد بشیر نے کہا۔

"اپنے تین آدمی دلی سے باہر ہیں۔ دو جمنا پار کشن گنج کی بستی میں روپوش ہیں۔"

مجاہد بشیر نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔

"اپنے انور خان اور رحمت کا بھی کچھ پتہ نہیں' پولیس انہیں کہاں لے گئی ہے۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"وہ جہاں بھی ہوں گے وہاں سے ایک نہ ایک دن ضرور فرار ہو کر اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔"

مجاہد بشیر نے پوچھا۔

"کمانڈو! تمہارا پروگرام کیا ہے؟"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"میں بھوپال واپس چلا جاؤں گا۔ وہاں ابھی کئی کام ادھورے پڑے ہیں۔"

مجاہد کہنے لگا۔

"لیکن کمانڈر! دلی پولیس مدھیہ پردیش کی پولیس کو بھی تمہارے فرار سے خبردار کر دے گی۔ تمہیں بھوپال میں بڑا چوکنا ہو کر رہنا ہوگا۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"ہمیں وہاں ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ وہاں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ ہم پولیس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

مجاہد بشیر نے کہا۔

"بھوپال کی گاڑی تو اب منہ اندھیرے ہی جائے گی۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"ٹھیک ہے میں یہی گاڑی پکڑنا چاہتا ہوں۔"

مجاہد بشیر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں حلیہ بدل کر سٹیشن پر جانے کا مشورہ دوں گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"میرا خیال ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں تھوڑا سا حلیہ بدل کر ہی جاؤں گا۔"

مجاہد بشیر نے کہا۔

"ٹرین منہ اندھیرے کوئی چار بجے کے قریب بھوپال کو جاتی ہے۔ میں تمہارے ساتھ سٹیشن تک چلوں گا۔"

انہوں نے وہیں بازار سے کھانا منگوا کر کھایا۔ بشیر باہر گیا تو کمانڈو خالد نے مجھے آہستہ سے آواز دی۔

"کرم داد! یہیں ہو ناں؟"

میں نے کہا۔

"ہاں کمانڈر! میں لکڑی کے صندوق کے نیچے ہوں۔"

پھر میں وہاں سے نکل کر خالد کے سامنے آ گیا۔ وہ بولا۔

"ہم یہی گاڑی پکڑیں گے۔ تم نے سن ہی لیا ہوگا۔ میں تھوڑا سا بھیس بدل لوں گا۔"

اتنے میں مجاہد بشیر کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے صندوق کے نیچے ہو گیا۔ میں بڑا خوش تھا کہ بہت جلد میں اپنی پیاری بیوی جمیلہ سے ملوں گا۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ بھوپال پہنچنے کے بعد میں کمانڈو خالد سے کہوں گا کہ وہ مجھے اور جمیلہ کو جموں کشمیر لے جائے اور وہاں سے کسی طرح بارڈر کراس کروا کے آزاد کشمیر پہنچا دے۔

مجاہد بشیر اپنے ساتھ ایک تھیلا لایا تھا۔ کہنے لگا۔

"اس میں کھدر کا کانگریسی کرتہ پاجامہ اور نہرو کٹ واسکٹ ہے۔ میرا خیال ہے اتنا حلیہ بدلنا ہی کافی ہوگا۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ لباس نہیں پہنوں گا۔ رات کا وقت ہے۔ دلی سے نکل گیا تو پھر کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

"جیسے تمہاری مرضی اب تم سو جاؤ۔ میں تین بجے تمہیں جگا دوں گا۔"

وہ چلا گیا۔ میں صندوق کے نیچے سے نکل آیا۔ وہ کہنے لگا۔

"خدا کرے کہ ہماری دلی کے ساتھی پولیس سٹیشن سے بچ کر نکل گئے ہوں۔"

میں نے کہا۔

"کوشیلا کا باپ تو یہی کہہ رہا تھا کہ ابھی تک باقی آدمی گرفتار نہیں ہو سکے۔ ہمارے ساتھی یقیناً" ناگ پور یا بھوپال کی طرف نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میں سو رہا ہوں، تم بھی آرام کرو۔"

کمانڈو خالد لحاف میں گھس گیا۔ مجھے نیند کہاں آنی تھی۔ میں کچھ دیر وہیں کنڈل مارے بیٹھا رہا۔ پھر صندوق کے نیچے چلا گیا۔ جب سے میں سانپ کے کاٹنے سے سانپ

کی شکل میں تبدیل ہوا تھا میرے اندر صرف ایک ہی تبدیلی آئی تھی۔ وہ تبدیلی یہ تھی کہ مجھے اپنے بہت زیادہ قریب رہنے والے کمانڈو خالد کے جسم کی بو کسی وقت آتی تھی اور کسی وقت بالکل نہیں آتی تھی۔ حالانکہ وہ مجھ سے چھ سات فٹ کے فاصلے پر تھا۔

مجھے نہیں معلوم کتنا وقت گزر گیا تھا۔ دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ پھر مجاہد بشیر کی آواز آئی۔

"کمانڈر! تین بج گئے ہیں۔ تیار ہو جاؤ۔"

خالد شاید پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ غسل خانے میں جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے پہن کر تیار ہوگیا۔ اس نے مجھے بھی کہا کہ تیار ہو جاؤ۔ ہم سٹیشن پر جا رہے ہیں۔ میں نے کہا۔

"مجھے کون سے کپڑے پہننے ہیں۔ میں تیار ہوں۔"

کمانڈو خالد نے مجھے اٹھا کر اپنی جیکٹ کی باہر والی جیب میں ڈال لیا اور مجاہد بشیر کے ساتھ مکان سے نکل کر گلی میں آگیا۔ میں نے اپنا سر جیکٹ میں سے تھوڑا سا باہر نکال رکھا تھا۔ ابھی دن کا اجالا نہیں ہوا تھا۔ رات کا اندھیرا ہی تھا۔ بازار میں سٹریٹ لائٹس روشن تھیں۔ بازار خالی پڑا تھا۔ دونوں مجاہد تیز تیز قدموں سے ایک طرف جا رہے تھے۔ ایک چوک میں انہیں رکشا مل گیا۔ وہ رکشے میں بیٹھ کر دلی کے سٹیشن پر آ گئے۔

سٹیشن پر رات کے تین ساڑھے تین بجے بھی کافی چہل پہل تھی۔ مجاہد بشیر نے خالد کو ایک طرف کھڑے رہنے کو کہا اور خود جا کر دلی سے بھوپال تک کا ایک ٹکٹ لے آیا۔ پھر اس نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"بھوپال پہنچ کر خاص نمبر پر ٹیلی فون کروا دینا۔ میں سمجھ جاؤں گا کہ تم خیریت سے پہنچ گئے ہو۔"

مجاہد بشیر چلا گیا۔ کمانڈو خالد نے جیکٹ کا کالر اوپر کر رکھا تھا۔ سر پر گرم اونی ٹوپی تھی وہ اتنی جلدی پہچانا نہیں جاتا تھا۔ وہ اس پلیٹ فارم پر آکر ایک بنچ پر بیٹھ گیا جہاں

بھوپال کو ٹرین روانہ ہونی تھی۔ ٹرین کسی دوسرے شہر سے آ رہی تھی۔ کمانڈو خالد جہاں بیٹھا تھا وہاں زیادہ روشنی نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم ٹھیک ہوناں کرم داد!"

میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہوں کمانڈر۔"

وہ بولا۔

"ٹرین آنے میں ابھی دیر ہے۔ سفر لمبا ہے۔ میرا خیال ہے میں تھوڑا سا ناشتہ کر لوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کر ٹی سٹال کی طرف چل دیا۔ ٹی سٹال پر صرف دو آدمی کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑے چائے پی رہے تھے۔ کمانڈو خالد بھی ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس نے چائے اور ٹوسٹ کا آرڈر دیا۔ پلیٹ فارم پر سردی تھی۔ مجھے جیکٹ کی جیب میں بھی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ خالد ناشتہ کرنے لگا۔ میں نے جیکٹ کی جیب میں سے تھوڑی سی سری باہر نکال رکھی تھی۔ اگرچہ خالد نے مجھے منع کیا تھا کہ میں سر باہر نہ نکالوں۔ مگر میں ہر طرف سے چوکس رہنا چاہتا تھا۔ کمانڈو خالد اپنے پیچھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جو آدمی کاؤنٹر کے کونے میں کھڑے چائے پی رہے تھے ان میں سے ایک آدمی بڑے غور سے کمانڈو خالد کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس کے ساتھی نے بھی گردن گھمانے کے بہانے کمانڈو خالد پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور خاموشی سے چائے پینے لگا۔ مجھے ان پر شک پڑ گیا۔ دال میں کچھ کالا کالا ضرور تھا۔ یہ دونوں آدمی مجھے انٹیلی جینس کے آدمی لگتے تھے۔ وہ ہم سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ میں اگر خالد سے کوئی بات کرتا تو وہ سن سکتے تھے۔ کمانڈو خالد کو خبردار کرنا بھی ضروری تھا۔ میں نے اپنے سر کو جیب کے اندر ہی خالد کے جسم سے دو تین بار زور، زور سے رگڑا۔ اس نے ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔ میں اس کے ہاتھ کو بھی زور زور سے رگڑنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی بات ہے جو کرم داد کہنا چاہتا ہے۔

اس نے بل ادا کیا اور واپس چل کر بنچ کے کونے پر بیٹھ گیا اور آہستہ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے کرم داد!"

ہمارے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کمانڈر! کاؤنٹر پر جو دو آدمی کھڑے ہیں مجھے ان پر شبہ ہے کہ وہ انٹیلی جینس کے آدمی ہیں۔ وہ تمہاری طرف بڑے غور سے دیکھ رہے تھے اور تمہیں دیکھنے کے بعد دونوں نے سر جوڑ کر آپس میں کوئی بات بھی کی تھی۔"

میں نے خالد کی جیب میں سے ذرا سا سر باہر نکال رکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کمانڈو خالد ٹی سٹال کے کاؤنٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے منہ نیچے کر لیا اور کہنے لگا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے وہ آدمی انٹیلی جینس کے نہیں لگتے۔ وہ تو آپس میں باتیں کر کے ہنس رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے تمہارا خیال بھی درست ہو۔ مجھے جو شبہ ہوا تھا وہ میں نے تمہیں بیان کر دیا ہے۔ بہرحال تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔"

وہ بولا۔

"وہ میں ضرور رہوں گا۔"

ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔ مسافروں میں ہل چل مچ گئی۔ قلی ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔ کمانڈو خالد اٹھ کر ٹرین کی طرف بڑھا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ٹی سٹال کے کاؤنٹر پر کھڑے دونوں آدمیوں میں سے ایک آدمی اس ڈبے کی طرف بڑھا جس ڈبے میں کمانڈو خالد سوار ہو رہا تھا۔ اب مجھے پورا یقین ہوگیا کہ معاملہ کچھ گڑ بڑ ضرور ہے اور یہ دونوں آدمی انٹیلی جینس والے ہی ہو سکتے ہیں۔ ورنہ وہ کسی دوسرے ڈبے میں بھی سوار ہو سکتا تھا۔ پلیٹ فارم کی تمام بتیاں روشن تھیں۔ میں نے اپنا سر خالد کی جیکٹ کے اندر کر لیا تھا۔ کیونکہ وہاں مسافروں کا رش تھا اور میں دیکھا جا سکتا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ خالد ایک سیٹ پر بیٹھ گیا ہے۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین چل پڑی۔ دلی سے بھوپال کا سفر بڑا لمبا تھا۔ گاڑی گڑگاؤں پہنچی تو صبح کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ اس وقت کمانڈو خالد اٹھ کر لیٹرین میں گیا تو میں نے اسے کہا۔

"انٹیلی جینس کا ایک آدمی تمہارے ڈبے میں چڑھا تھا۔ کیا وہ ڈبے میں ہی ہے؟"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"میں اسے اچھی طرح سے نہیں پہچانتا تم اسے دیکھ کر بتانا۔"

باہر آنے کے بعد خالد اپنی سیٹ پر بیٹھا تو اس نے اپنی جیکٹ کو تھوڑا کھول دیا۔ اس کی وجہ سے میں نے اپنا سر تھوڑا سا جیب سے باہر نکال لیا اور مسافروں کا جائزہ لیا۔ مجھے ڈبے کی سامنے والی کھڑکیوں کے پاس وہی آدمی بیٹھا ہوا نظر آگیا۔ گاڑی متھرا کی طرف دوڑتی جا رہی تھی۔ وہ آدمی تھوڑی تھوڑی دیر بعد کمانڈو خالد کو گہری نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔ مجھے اب کوئی شک نہیں رہا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ یہ انٹیلی جینس کا ہی آدمی ہے۔ میں نے اپنا سر جیب کے اندر لے جا کر خالد کے جسم سے رگڑا۔ وہ اٹھ کر ایک بار پھر باتھ روم میں آگیا۔ ڈبے میں میں خالد سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ باتھ روم میں آتے ہی میں نے خالد سے کہا۔

"کمانڈر! وہ آدمی ڈبے میں موجود ہے اور تمہیں گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔"

میں نے اسے بتا دیا کہ سامنے والی کھڑکیوں کی قطار میں دروازے کے پاس والی کھڑکی کے پاس نسواری کوٹ اور کالے مفلر والا جو آدمی بیٹھا ہے وہی انٹیلی جینس کا آدمی ہے۔ خالد کہنے لگا۔

"ہم ٹرین میں بیٹھے ہیں یہاں وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ابھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"تمہیں یہ بات اتنی آسانی سے نہیں لینی چاہیے۔ یہ شخص کسی بھی سٹیشن پر کچھ

بھی کر سکتا ہے۔"

مگر کمانڈو خالد نے میری بات کی زیادہ پروا نہ کی اور بولا۔

"تمہیں ضرورت سے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کرم داد! میں اس قسم کے آدمیوں کے ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف ہوں اور ان سے نمٹنا جانتا ہوں۔"

یہ اتنا کہہ کر کمانڈو خالد لیٹرین سے باہر آگیا۔ اب میری یہ مجبوری تھی کہ میں سانپ کی حیثیت میں دوسرے مسافروں کے سامنے اس کے ساتھ انسانی آواز میں باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ میں جیب کے کنارے کے اوپر سے انٹیلی جنس کے آدمی کو دیکھ رہا تھا۔ خدا جانے کیا بات تھی اب وہ بھی کچھ بے نیاز ہوگیا تھا اور کمانڈو خالد کی طرف بالکل توجہ نہیں کر رہا تھا۔ وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔

ٹرین متھرا کے سٹیشن پر رکی اور پھر آگے چل پڑی۔

آگے آگرہ، گوالیار اور جھانسی کے شہر تھے۔ ٹرین آگرہ اور گوالیار کو بھی پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئی۔ سارا دن گزر گیا تھا۔ اس دوران ایک بار وہ پر اسرار آدمی صرف گوالیار کے سٹیشن پر ٹرین سے اتر کر تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا اور پھر واپس آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے رویئے سے اب مجھے بھی کچھ کچھ محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ آدمی انٹیلی جنس کا نہیں ہے۔ مجھے یونہی اس پر شک پڑا تھا۔

آدھی رات کے بعد جھانسی کے سٹیشن پر گاڑی رکی تو میں نے کمانڈو خالد کی جیب میں سے سر نکال کر دیکھا کہ وہ پر اسرار آدمی اپنی سیٹ پر نہیں تھا۔ میں نے یہی خیال کیا کہ وہ چائے وغیرہ پینے پلیٹ فارم پر اتر گیا ہوگا۔ کمانڈو خالد اپنی سیٹ پر کھڑکی سے سر لگائے سو رہا تھا۔ جھانسی ایک بڑا شہر اور جنکشن تھا۔ یہاں ٹرین کو کافی دیر ٹھہرنا تھا۔ میں ایک بار پہلے یہاں سے گزر چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پر اسرار آدمی ڈبے میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ تین سپاہی بھی تھے۔ یہ پولیس کے سپاہی تھے۔ میں ان لوگوں کو حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں جلدی سے اپنے سر کو جیب کے اندر کمانڈو خالد کے جسم سے زور زور سے رگڑنے لگا۔ مگر وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ اس وقت جاگا

جب تین سپاہیوں میں سے ایک نے جو پولیس انسپکٹر کی وردی میں تھا' خالد کو کندھے سے پکڑ کر زور سے ہلایا اور درشت لہجے میں کہا۔

"کہاں سے آئے ہو تم؟"

خالد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اپنے سامنے دو سپاہیوں اور ایک پولیس انسپکٹر کو دیکھ کر وہ یقیناً" حیران پریشان ہو کر رہ گیا۔ میں اس کی جیکٹ کی جیب میں تھا۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کمانڈو خالد نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"دلی سے آ رہا ہوں۔ کیوں کیا بات ہے؟"

پولیس انسپکٹر نے دوسرا سوال کیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

خالد نے کہا۔

"للت پور اپنے انکل کے ہاں جا رہا ہوں۔"

"دلی کیا کرنے گئے تھے؟"

"دلی میں ہمارا گھر ہے۔ میرے والد کی چاوڑی بازار میں اچار مربوں کی دکان ہے۔ میں ان کے ساتھ دکان پر بیٹھتا ہوں۔"

میں نے اپنا چھوٹا سا سر خالد کی جیب میں سے ذرا سا باہر نکال لیا۔ انسپکٹر پولیس نے انٹیلی جینس کے آدمی کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا۔

"یہی آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر سے فرار ہونے والا پاکستانی دہشت گرد ہے جس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ مل کر پیلس ہوٹل میں دھماکہ کیا تھا۔"

پولیس انسپکٹر نے اپنے سنتری سے کہا۔

"اسے پولیس کے ڈبے میں لے چلو۔"

کمانڈو خالد نے بہت کچھ کہا کہ آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا پیلس ہوٹل کے دھماکے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن کسی نے اس کی نہ سنی اور دونوں سنتریوں

نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور کھینچتے ہوئے ڈبے سے باہر لے آئے۔ میں اس کی جیکٹ کی جیب میں تھا۔ سنتری اور انسپکٹر اسے پولیس کے چھوٹے سے ڈبے میں لے آئے جو ٹرین کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہاں پہلے سے چار پانچ پولیس کے سپاہی موجود تھے۔ انہوں نے کمانڈو خالد کو پکڑ کر دونوں سیٹوں کے درمیان فرش پر بٹھا دیا۔ انسپکٹر نے خالد کی گردن میں اس کا مفلر ڈال دیا اور بولا۔

”تمہارے ساتھ اور کون کون تھا؟“

خالد نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”جناب! میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ لوگوں نے غلط آدمی کو پکڑ لیا ہے۔“

اس دوران ٹرین جھانسی کے سٹیشن سے چل پڑی تھی۔ مجھے ایک زور دار طمانچے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی کمانڈو خالد کا جسم ایک طرف کو جھک گیا۔ میں نے ذرا سا سر باہر نکالا اور فورا" اندر کر لیا۔ ایک سپاہی بالکل میرے قریب ہی بیٹھا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھوں میں تھی۔ سنتریوں نے کمانڈو خالد کو ذرا قریب کرنا شروع کر دیا۔ مجھے طمانچوں اور تھپڑوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے سخت غصہ آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ باہر نکل کر ان سب کو ڈس کر ہلاک کر دوں۔ مگر یہ سوچ کر میں خالد کی جیب میں ہی چھپا رہا کہ میں ایک دم ڈبے کے سارے سپاہیوں کو نہیں ڈس سکوں گا۔ زیادہ سے زیادہ دو یا تین سنتریوں کو ڈسوں گا اور اتنی دیر میں کوئی نہ کوئی سپاہی مجھے اپنے بھاری جوتوں سے کچل ڈالے گا یا رائفل کا فائر کر کے میرے جسم کے چیتھڑے اڑا دے گا۔ ساری کی ساری پولیس مسلح تھی اور یہ ٹرین کے ساتھ گارڈ ڈیوٹی پر جا رہی تھی۔ انٹیلی جنیس والا آدمی بھی اسی ڈبے میں تھا۔ جب طمانچوں اور تھپڑوں کی آواز آنی بند ہو گئی۔ پولیس انسپکٹر نے کسی سنتری کو حکم دیا۔

”اس کے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر کونے میں بٹھا دو بھوپال چل کر اسے سی آئی اے کے حوالے کریں گے۔“

کمانڈو خالد کے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر کونے میں بٹھا دیا گیا۔ ٹرین نے رفتار پکڑ لی تھی۔ میں نے سر جیب میں سے اوپر کر کے ڈبے کا جائزہ لیا۔ کمانڈو خالد کے ہاتھ پیچھے تھے۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ دونوں پولیس سنتری اوپر آمنے سامنے سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ایک دم سے صورت حال بدل گئی تھی۔ وہاں دس گیارہ سنتری تھے جو سب کے سب جاگ رہے تھے۔ ہر ایک مسلح تھا۔ میں ان سب کو ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔ دو تین کو ہلاک کرنے کے بعد میری موت یقینی تھی۔ فرار کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ بھوپال میں سی آئی اے کے حوالے کر دینے کے بعد کمانڈو خالد کے بچ نکلنے کی ساری امیدیں ڈوبنے والی تھیں۔ پھر میں بھی اسے نہیں بچا سکتا تھا۔ ٹرین بھوپال کی طرف پوری رفتار سے دوڑتی چلی جا رہی تھی۔

مجھے نیچے سے خالد کا سوجا ہوا چہرہ اور ہونٹوں کے کناروں پر جما ہوا خون ڈبے کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ خالد نے گہرا سانس لے کر اپنا سر اوپر اٹھایا اور سنتری سے کہا۔

"میں لیٹرین جانا چاہتا ہوں۔"

سنتری نے اسے جھڑک دیا۔

"بک بک مت کر، چپکے سے بیٹھے رہو۔"

تھوڑی دیر بعد خالد نے پھر کہا۔

"مجھے لیٹرین جانا ہے۔"

پولیس انسپکٹر جو ذرا پرے بیٹھا تھا' کہنے لگا۔

"پرکاش چند! اسے لے جاؤ لیٹرین میں۔"

سنتری نے کمانڈ خالد کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور لیٹرین کے دروازے کے پاس لے گیا۔ خالد نے کہا۔

"میرے ہاتھ کھول دو۔ میں لیٹرین میں سے بھاگ نہیں جاؤں گا۔"

سنتری نے اس کے دونوں ہاتھ کھول دیئے۔ کمانڈو خالد نے لیٹرین میں آ کر اس

کے دروازے کی چٹخنی لگا دی اور کموڈ کے پیچھے دیوار کی کھڑکی کے شیشے کے چوکھٹے کو دونوں ہاتھوں سے باہر کو دھکیلا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا کر رہے ہو؟"

اس نے کہا۔

"آگے دریا آ رہا ہے۔ میرے پاس فرار کا یہی ایک موقع ہے۔ یہ موقع نکل گیا تو پھر میری موت یقینی ہے۔"

میں نے کہا۔

"چوکھٹا تو بند ہے۔"

وہ بولا۔

"یہی دیکھ رہا ہوں۔"

کھڑکی کے چوکھٹے پر ایسا شیشہ لگا تھا جس میں سے باہر کا منظر نظر نہیں آتا تھا۔ میں اس کی جیب سے سر نکالے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ زور زور سے کھڑکی کے چوکھٹے کو دھکے دے رہا تھا۔ گاڑی کے شور میں اس کے دھکوں کی آواز ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ وہ آواز بھی گاڑی کے شور کی آواز کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔ ڈبے کے پہیے بڑی زور دار آوازیں اور گڑگڑاہٹ پیدا کرنے لگے۔ شاید یہاں دو تین کانٹے بدلے جا رہے تھے۔ کمانڈو خالد نے ایک بار زور سے دھکا دیا تو کھڑکی کا چوکھٹا ایک طرف سے اکھڑ گیا۔ ٹرین نے کانٹا بدلا تو بڑے زور کا شور بلند ہوا۔ کمانڈو خالد نے اس شور کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چوکھٹے پر زور سے اپنا کندھا مارا۔ چوکھٹا اکھڑ کر دوسری طرف گر گیا۔ باہر سے ٹھنڈی ہوا کے تیز جھونکے اور شور اندر آنے لگا۔ میں نے کہا۔

"خدا کے لیے باہر چھلانگ نہ لگانا' مارے جاؤ گے۔"

وہ باہر جھانک رہا تھا۔ اندر منہ کر کے بولا۔

"میں اس سارے علاقے سے واقف ہوں۔ دریا کا پل آنے والا ہے۔ جیسے ہی دریا کا پل آیا میں چھلانگ لگا دوں گا۔ تم میری جیب میں ہی رہنا یا میرے ساتھ

تیرنا۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔" میرے لیے بھی کمانڈو خالد کی ہر بات کو تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"کمانڈو! کہیں تم پل کے گارڈوں سے نہ ٹکرا جاؤ۔"

وہ کہنے لگا۔

"اس پل پر لوہے کی قینچیاں نہیں ہیں۔ یہ بالکل صاف پل ہے۔"

وہ لیٹرین کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے سر نکالے سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیٹرین کے بلب کی روشنی میں مجھے اس کے سر کے بال اڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اتنے میں سنتری نے باہر سے بند دروازے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

"باہر نکلو۔ اندر کیا کر رہے ہو؟"

خالد نے اونچی آواز میں کہا۔

"بس آ رہا ہوں"

اس کے ساتھ ہی گڑ گڑ کی زور دار آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ کمانڈو خالد نے کموڈ کے اوپر چڑھتے ہوئے کہا۔

"دریا آ گیا ہے۔ میں باہر کودنے لگا ہوں"

میں اس کی جیکٹ کی جیب میں ڈر کے مارے سمٹ گیا۔ میں اس کے ساتھ دریا میں گرنے والا تھا۔ خدا جانے یہ کتنا بڑا، کتنا گہرا دریا تھا۔ سانپ دریا میں تیر لیتا ہے۔ میں بھی تیر سکتا تھا۔ مگر ایک نہ معلوم سا خوف مجھ پر طاری ہو گیا تھا۔ باہر سے سنتری نے خالد کو گالی دے کر کہا۔

"دروازہ کھولو نہیں تو میں فائر کر دوں گا۔"

اس وقت کمانڈو خالد کھڑکی کے چوکھٹے میں سے اپنی ٹانگیں باہر نکال چکا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں کسی پیراشوٹ کے ساتھ بندھا ہوا ہوں اور پیراشوٹ کھل نہیں سکا اور میں بڑی تیزی سے نیچے جا رہا ہوں۔ یہ کیفیت بامشکل

دو سیکنڈ تک رہی اور پھر دھڑام کی آواز آئی اور جیب میں پانی بھر گیا۔ کمانڈو خالد دریا میں کود چکا تھا۔ میں جلدی سے پانی میں سے باہر نکل آیا۔ لیکن ابھی تک میں دریا کی تہہ میں ہی تھا۔ کیونکہ کمانڈو خالد دریا میں کودنے کے بعد پانی کے اندر کافی نیچے چلا گیا تھا۔ میں نے دریا کی سطح پر آنے کے لیے جدوجہد شروع کر دی اور چند لمحوں کے اندر میں دریا کے سطح پر آگیا۔ رات کی تاریکی میں دریا مجھے نظر آ رہا تھا۔ دریا کی لہریں بڑی تیزی سے مجھے ایک طرف بہائے لیے جا رہی تھیں۔ کمانڈو خالد مجھے دریا کی سطح پر کہیں نظر نہ آیا۔ پھر اس کا سر پانی سے ابھرا اور اس نے ہاتھ پاؤں چلانے شروع کر دیئے۔

میں نے اسے آواز دی تو اس نے میری طرف مڑ کر دیکھنے کی بجائے اونچی آواز میں کہا۔

"دریا کے دوسرے کنارے کی طرف چلو۔"

میں نے دریا کے دوسرے کنارے کی طرف رخ کر لیا۔ میں چونکہ سانپ کے روپ میں تھا اس لیے کمانڈو خالد کے مقابلے میں دریا کے سطح پر بل کھاتا زیادہ تیزی سے تیر رہا تھا۔ ہم اس وقت دریا میں کودے تھے جب ٹرین دریا کے درمیان پہنچ چکی تھی۔ دوسرے کنارے کے درخت مجھے دکھائی دے رہے تھے۔ میں کمانڈو خالد کو بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ دریا اگرچہ سیلابی نہیں تھا مگر اس کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ کمانڈو خالد کو تیز موجوں کو ایک طرف سے کاٹ کر کنارے کی طرف تیرنا پڑ رہا تھا جس کی وجہ سے اسے کافی ہاتھ پاؤں مارنے پڑ رہے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ خدا جانے دریا میں کیسے پیچھے سے ایک بہت تیز رفتار موج آگئی جس نے کمانڈو خالد کو ایک دفعہ اوپر اٹھایا اور پھر اسے میری نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ دریا میں عام طور پر اس قسم کی اچانک موجیں نہیں آیا کرتیں۔ مگر معلوم نہیں یہ لہر پیچھے کہاں سے اور کس وجہ سے دریا کی سطح سے تین چار فٹ بلند ہو کر چلی آ رہی تھی۔ اس موج نے مجھے بھی اوپر اٹھا کر نیچے جھٹک دیا تھا مگر مجھے سانپ ہونے کا یہ فائدہ حاصل تھا کہ میں ہر قسم کی طوفانی موجوں میں تیر سکتا

تھا۔

میں نے دریا پر آگے کی طرف اور دوسرے کنارے کی جانب نگاہ دوڑائی۔ کمانڈو خالد مجھے کہیں نظر نہ آیا۔

میں نے اسے آواز دی مگر کسی طرف سے جواب میں خالد کی آواز نہ آئی۔ اتنا مجھے اطمینان تھا کہ کمانڈو خالد ڈوبے گا نہیں۔ کیونکہ وہ بڑا اچھا تیراک تھا۔ شاید دریا کی تیز موج اسے مجھ سے بہت دور آگے لے گئی تھی۔ میں دریا کے بائیں جانب والے کنارے کی طرف تیزی سے تیر بھی رہا تھا اور خالد کو تھوڑی دیر بعد آواز بھی دے رہا تھا۔ دریا پر رات کی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خاموشی میں صرف دریا کی تیز روانی کی عجیب دہشت ناک سنسناہٹ سی مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ یہ آواز بڑے بڑے تیراکوں پر خوف طاری کر دیتی ہے۔ میں انسان کی حیثیت سے اس خوف کو محسوس کر رہا تھا۔ مگر سانپ کی حیثیت سے مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں دریا کی لہروں کے اوپر اس طرح بل کھاتا؛ سر کو اوپر اٹھائے کنارے کی طرف تیرتا جا رہا تھا جیسے شیشے پر چل رہا تھا۔ کسی وقت کوئی تیز لہر آ جاتی تو میں گردن کے نیچے تک پانی میں ڈوب جاتا۔ کمانڈو خالد کی مجھے پریشانی لگی ہوئی تھی۔ میں دریا کے پاٹ کو آگے کی طرف بھی دیکھ رہا تھا اور کنارے کی طرف بھی دیکھ رہا تھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

دریا کا کنارہ آہستہ آہستہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔

میں دریا میں آدھے ڈوبے ہوئے سرکنڈوں کی جھاڑیوں میں سے نکلتا ہوا دریا کے کنارے پر چڑھ گیا اور دریا کو دیکھنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دریا کی اوپر کو اٹھی ہوئی تیز رفتار موج کمانڈو خالد کو کہاں لے گئی ہے۔ میں سانپ کی شکل میں تھا اور یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ سانپ اندھیرے میں بھی دیکھ لیتا ہے۔ مجھے دریا کا پاٹ دوسرے کنارے تک نظر آ رہا تھا۔ اگر کمانڈو خالد دریا میں کسی جگہ تیر رہا ہوتا تو مجھے ضرور دکھائی دیتا۔ لیکن دریا کا پاٹ دور تک خالی تھا۔ کمانڈو خالد کو دریا کی تیز رفتار

موج نے مجھ سے جدا کر دیا تھا۔ یہ بات میری پریشانی اور تشویش کا باعث تھی۔ اب اس کی مزید تلاش بے سود تھی۔

میں ایک بار پھر اکیلا رہ گیا تھا۔ اس طرف دریا کا کنارہ اونچا تھا۔ میں مٹی کی ایک ڈھیری کے اوپر بیٹھا تھا۔ کمانڈو خالد کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ آگے للت پور کا شہر نزدیک ہے اور اس کے آگے بھوپال بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ جمیلہ سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن میں آدمی کے جسم میں نہیں تھا۔ سانپ کے روپ میں تھا اور سانپ کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچنا اتنی آسان بات نہیں تھی۔ دوسرے مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ مجھے جانا کس طرف ہے۔ کمانڈو خالد نے دریا میں چھلانگ لگانے کے بعد ابھرتے ہوئے کہا تھا کہ دریا کے دوسرے کنارے کی طرف چلو۔ اس کا مطلب تھا کہ للت پور کو راستہ دریا کے دوسرے کنارے کی طرف سے ہی جاتا ہو گا۔

میں ان باتوں پر انسانی دماغ سے غور بھی کر رہا تھا اور سانپ کی حیثیت سے آس پاس کے درختوں کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ ہر طرف رات کا سناٹا اور تاریکی تھی۔ دور دور تک کوئی روشنی ٹمٹماتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جن درختوں کے نیچے میں مٹی کی ڈھیری پر کنڈلی مار کر بیٹھا تھا ان کے آگے بائیں جانب میدان تھا۔ اتنی دور سے میں صاف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میدان میں یا تو جھاڑیاں تھیں یا کھیت تھے۔ اس کے آگے اندھیرا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے دریا کے کنارے کنارے چل پڑنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے آگے للت پور کا ہی شہر ہو اور یہ دریا شہر کے درمیان سے یا قریب سے گزرتا ہو۔ یہ خیال بھی تھا کہ مجھے رات کے اندھیرے میں جتنا فاصلہ طے کر سکتا ہوں کر لینا چاہیے۔ دن نکل آیا تو اس کی روشنی میں میں دوسروں کی نظر میں آ جاؤں گا اور لوگ مجھے مارنے کی کوشش کریں گے۔

میں نے دل میں خدا کو یاد کیا اور دریا کے کنارے کنارے آگے کی طرف تیزی سے رینگنا شروع کر دیا۔ سانپ کے روپ میں آنے کے بعد مجھ پر سانپ کی بعض ایسی

خصوصیات کا علم ہو گیا تھا جنہیں سپیرے بھی شاید نہ جانتے ہو۔ مثلاً" سانپ جب تیزی سے رینگتا ہے تو شروع میں اسے بڑی دقت محسوس ہوتی ہے لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اس کی ریڑھ کی لچکیلی ہڈیوں میں اپنے آپ چکنائی پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے جو تیل کا کام دیتی ہے اور سانپ کو تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔

تجربے نے مجھے پر یہ ثابت کیا تھا کہ چھوٹا سانپ تین چار میل تک بے تکان تیزی سے دوڑ سکتا ہے۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا اور ایک ہی ہلے میں چار پانچ میل کا فاصلہ طے کر گیا۔ اس کے بعد مجھے تھکاوٹ محسوس ہونے لگی اور میں نے اپنی رفتار آہستہ کر دی۔ اس دوران میں درختوں سے نکل کر ایک کھلے علاقے میں آگیا تھا جہاں کہیں کہیں فصلیں اگی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ انسانوں کی آبادی یا کوئی گاؤں وغیرہ قریب ہی ہے۔ میں رینگتے ہوئے کبھی مٹی کی ڈھیریوں اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی اوٹ میں آجاتا اور کبھی باہر نکل آتا۔ میں ابھی تک دریا کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔

ایک جگہ کافی فاصلے پر مجھے روشنی کے ایک دو نقطے جھلملاتے دکھائی دیئے۔ شاید کوئی گاؤں تھا۔ یہ علاقہ انڈیا کے وسطی گھنے جنگلوں کا علاقہ تھا مگر وہاں کوئی جنگل نہیں تھا۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ آگے شہری آبادیاں شروع ہونے والی ہیں۔ رات ابھی کافی باقی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اپنی رفتار تیز کر دی۔ چار پانچ میل تک تیزی سے رینگتا چلا گیا۔ اس کے بعد پھر رینگنے کی اپنی نارمل رفتار پر آگیا۔ کافی دیر کے بعد مجھے دور روشنیاں نظر آنے لگیں۔ یہ روشنیاں کسی شہر کی معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے اپنا رخ ان روشنیوں کی طرف کر لیا اور دریا کے کنارے سے اتر کر کھیتوں کے درمیان جو مینڈھیں بنی ہوئی تھیں ان پر چلنے لگا۔ روشنیاں قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ ملت پور شہر کی روشنیاں ہی ہو سکتی ہیں۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا کچھ اور روشنیاں بھی دکھائی دینے لگی تھیں۔ میں ابھی تک کھیتوں میں چلا جا رہا تھا۔ یہ سارے زیر کاشت کھیت تھے۔ کسی کھیت میں فصلیں کھڑی تھیں۔ کہیں پانی دیا ہوا تھا۔ کھیتوں کے کناروں پر کہیں کہیں تاڑ اور ناریل کے چھتریوں والے بلند قامت درخت

بھی تھے۔ میرا خیال تھا کہ آدھی رات کا وقت ہو گیا ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی کھیت میں کوئی کسان وغیرہ نظر نہیں آتا تھا۔

دور جو روشنیاں تھیں وہ پہلے جھرمٹوں کی شکل میں نظر آتی تھیں اب پھیل گئی تھیں۔ دریا بھی شاید دائیں جانب مڑ گیا تھا۔ میں روشنیوں کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ کھیت ختم ہو گئے اور میں ایک سڑک پر نکل آیا۔ سڑک پر روشنی کا کوئی کھمبا نہیں تھا۔ میں نے اپنا رخ شہر کی طرف ہی رکھا اور سڑک کے ساتھ ساتھ گھاس اور جھاڑیوں میں چلتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ للت پور کا شہر ہی ہے۔ اس طرح مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ میں بھوپال سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ ابھی تک مجھے کمانڈو خالد کی بو کسی جگہ پر بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کمانڈو خالد دریا سے دوسرے کنارے کی طرف بہتا ہوا مجھ سے کافی فاصلے پر جا چکا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مجھے خالد کی بو آنا بند ہو گئی ہو۔ یعنی سانپ کے ڈسنے کے اثر سے میری یہ حس کچھ دیر کی لیے معطل ہو گئی ہو۔ جیسا کہ ایک بار پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ شہر کے نام کا علم مجھے اس طرح ہو سکتا تھا کہ میں شہر کی آبادی میں جا کر کسی دکان یا سٹور کے باہر لکھا ہو بورڈ پڑھوں یا کوئی ایسی لاری دیکھوں جو شہر کی طرف جا رہی ہو اور جس کی پیشانی پر للت پور لکھا ہوا ہو۔

اگرچہ میں انسان کی آواز میں بات کر سکتا تھا۔ لیکن میں کسی سے شہر کا نام پوچھتے ہوئے گھبراتا تھا۔ کیونکہ ایک سانپ کو انسان کی آواز میں بولتے دیکھ کر کوئی بھی چیخ مار کر مجھ سے دور بھاگ سکتا تھا۔ چونکہ وہ رات کا وقت تھا اس لیے شہر کی آبادی میں جانا میرے لیے اتنا خطرناک نہیں تھا۔ ظاہر ہے اس وقت سڑکیں خالی ہوں گی۔ لوگ گھروں میں سو رہے ہوں گے۔ اگر کسی دکان یا سٹور کے بورڈ پر للت پور لکھا ہوا ہو گا تو میں آسانی سے اسے پڑھ سکوں گا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ اس شہر کا ریلوے اسٹیشن کس طرف ہے ورنہ میں اسی طرف جاتا۔ سڑک آگے جا کر ایک اور سڑک سے مل گئی جہاں بجلی کے کھمبوں پر بلب روشن تھے۔ ایک ٹرک پیچھے سے آیا اور شور مچاتا تیزی

سے گزر گیا۔ میں ایک طرف جھاڑیوں کی اوٹ میں تھا۔ اچانک ایک بلی ایک طرف سے نکل کر غراتی ہوئی میرے سامنے آگئی۔ میں نے زور سے پھنکار ماری۔ بلی دوڑ کر ایک طرف ہو گئی اور پھر وہیں بیٹھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے زور زور سے غرانے لگی۔ تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرے جسم سے وہ خاص بو خارج نہیں ہو رہی جس کی وجہ سے جانور اور کیڑے مکوڑے اور کتے بلیاں مجھ سے دور بھاگ جاتی تھیں۔ یہ بھی شاید اسی سانپ کے زہر کا اثر تھا جس نے مجھے گڑھے کے اندر کاٹا تھا۔ یہ بات میرے لیے بہت بڑے خطرے کا باعث تھی۔ اب مجھ پر کوئی بھی جانور یا دوسرا سانپ حملہ کر سکتا تھا۔ سب سے زیادہ خطرہ مجھے نیولے سے تھا۔ نیولہ سانپ کا دشمن ہوتا ہے۔ سانپ کو دیکھ کر انسان کی طرح وہ بھی اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور جب تک اسے مار نہ ڈالے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اب مجھے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ میں نے پھن کھول کر اتنی زور سے پھنکار ماری کہ بلی بھاگ گئی۔

میں شہر کی روشنیوں کی طرف منہ کر کے بار بار زبان باہر نکالنے لگا۔ سانپ اسی طرح فضا میں دوسرے جانوروں اور انسانوں کی بو سونگھتا اور ان کی آوازیں اور آہٹیں سنتا ہے۔ اپنے ساتھی کمانڈو خالد کی بو کسی طرف سے بھی نہیں آ رہی تھی۔ کہیں خدا نہ خواستہ خالد دریا میں ڈوب تو نہیں گیا؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ کمانڈو خالد بڑا ماہر تیراک تھا۔ میں نے یہی نتیجہ نکالا کہ دریا میں جس موج نے بلند ہو کر اسے اٹھایا تھا وہی موج اسے بہاتی ہوئی دور لے گئی ہے۔ شہر سے بھی آگے لے گئی ہے۔ مجھے اب انسانوں اور جانوروں اور درندوں دونوں دشمنوں سے بچنا بھی تھا اور شہر جا کر یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کرنی تھی کہ یہ کون سا شہر ہے۔ میں رات کے اندھیرے میں ہی شہر میں جا سکتا تھا۔ میں بڑی سڑک کے ایک طرف ہو کر جا رہا تھا۔ یہ کوئی بڑا شہر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ دور دور مکان اور عمارتیں تھیں جن میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ سڑکوں پر بھی کوئی ٹریفک نہیں تھی۔ بڑے شہر کی سڑکوں پر رات کو بھی ٹرک وغیرہ گزرتے رہتے ہیں لیکن یہاں بالکل خاموشی تھی۔

سڑک کی دونوں جانب دکانیں آ گئیں جو بند تھیں۔ ایک جگہ جو چوہرائے ٹریفک کا گول تھڑا تھا جس میں ایک کھمبا نصب تھا۔ کھمبے کے اوپر ایک نیون سائن کا ایک چوکور بورڈ لگا تھا جو روشن تھا۔ اس پر انگریزی اور ہندی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں اس کے قریب گیا تو یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ اس پر لکھا تھا۔

"للت پور کی مزے دار مٹھائیاں گنشام جی کی دکان پر آئیں یہ للت پور کا شہر ہی تھا۔ بقول کمانڈو خالد کے اس کے آگے بھوپال کا شہر تھا۔ میں اسی طرح رینگ کر بھوپال نہیں جا سکتا تھا۔ راستے میں قدم قدم پر خطرہ تھا۔ سب سے آسان طریقہ یہی تھا کہ میں کسی طرح للت پور کے سٹیشن سے بھوپال جانے والی گاڑی پکڑ لوں۔ پہلے تو یہ پتہ کرنا تھا کہ للت پور کا ریلوے سٹیشن کہاں ہے۔ اس کا آسان طریقہ یہ تھا کہ میں دن نکلنے سے پہلے پہلے ریلوے لائن کا سراغ لگاؤں اور پھر اس کی ساتھ ساتھ چلتا ہوا سٹیشن پر پہنچ جاؤں۔ مجھے اب شہر میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں وہیں سے کھیتوں کی طرف جانے والی سڑک ہو گیا۔ میں نے شہر سے نکلتے ہی چاروں طرف ذرا اوپر کر کے نگاہ دوڑائی کہ شاید کہیں مجھے ریلوے کے سگنل کی بتی نظر آ جائے۔ جب ریلوے سگنل کسی طرف بھی دکھائی نہ دیا تو میں شہر کی آبادی سے ہٹ کر جنوب کی طرف تیزی سے رینگنے لگا۔

ایک جگہ نہر آ گئی۔ نہر کے اوپر چھوٹا سا پل تھا۔ میں پل پر سے گزر گیا۔ آگے نشیبی جگہ تھی۔ اس کے آگے تھوڑی سی چڑھائی تھی۔ جیسے ہی میں چڑھائی چڑھ کر لمبے سے بند کے اوپر آیا سامنے ریلوے کی پٹڑی بچھی ہوئی تھی۔ یہاں زمین اونچی تھی تو یہ کوئی بند نہیں تھا بلکہ اس پر سے ریلوے لائن گزرتی تھی دور سٹیشن کی سُرخ اور سبز بتیاں جھلملا رہی تھی۔ میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ سٹیشن کی روشینوں کی طرف رینگنے لگا۔ جب اس جگہ پہنچا جہاں سے ریلوے لائن پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی تو بورڈ لگا تھا۔ جو ہر سٹیشن پر پلیٹ فارم کے شروع میں لگا ہوتا ہے۔ اس پر بجلی کی روشنی پڑ رہی تھی اور اس پر انگریزی اور ہندی زبان میں للت پور لکھا ہوا تھا۔

اب اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ یہ للت پور ہی ہے اور میں بھوپال کی طرف ہی جارہا ہوں جہاں میری بیوی اور میری محبوبہ جمیلہ میرا انتظار کر رہی ہے اور جو مجھ سے دور نہیں ہے۔ لیکن بھوپال پہنچنا بھی ایک مرحلہ تھا۔ سب سے پہلے تو مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ کون سی گاڑی کس وقت بھوپال کی طرف جائے گی۔ یہ مجھے کوئی دوسرا آدمی ہی بتا سکتا تھا۔ یہ کوئی دلی یا بمبئی جیسا بڑا سٹیشن نہیں تھا کہ جہاں بورڈ پر لکھا ہو کہ فلاں گاڑی فلاں شہر کو اس وقت جائے گی۔ للت پور کے پلیٹ فارم پر کافی روشنی تھی اور مسافر بھی دور سے نظر آ رہے تھے۔ میں پلیٹ فارم پر چڑھنے کی بجائے دوسری طرف ہوگیا۔ جہاں سٹیشن کے احاطے کی دیوار تھی۔ دیوار کے قریب ہی سے ایک کتا زور سے بھونکنے لگا۔ میں نے سوچا کہ باہر کی طرف سے سٹیشن میں داخل ہونا زیادہ محفوظ اور مناسب رہے گا۔ اس خیال سے میں دیوار پر چڑھ گیا اور رینگتا ہوا دوسری جانب اتر گیا۔ دوسری جانب میرا خیال تھا سٹیشن کے سامنے والی کوئی سڑک ہو گی مگر وہاں چھوٹا سا میدان تھا جہاں تین چار جھگیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ یہ خانہ بدوشوں کی جھگیاں لگتی تھیں۔ ان کے پیچھے سٹیشن کی عمارت کی روشنیاں تھیں۔ میں بڑے اطمینان سے جھگیوں کے درمیان سے ہو کر گزرنے لگا۔ جیسے ہی میں تیسری یا چوتھی جھگی کی پاس پہنچا مجھے زور زور کی تین چار پھنکاریں سنائی دیں اور اس کے ساتھ ہی جھگی میں سے چار سیاہ رنگ کے بڑے بڑے سانپ نکل آئے جنہوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

چاروں کے چاروں سانپ مجھ سے کوئی دس گنا بڑے سانپ تھے۔ وہ اپنے پھن کھولے زمین سے تین تین فٹ بلند ہو کر کھڑے تھے۔ جھوم رہے تھے اور میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے ہوئے پھنکار رہے تھے۔ اس قسم کی صورت حال سے مجھے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ میں چھوٹا سا سانپ تھا۔ اگرچہ میں انسانوں کی طرح بات کر سکتا تھا اور انسانوں کی طرح سوچ سکتا تھا مگر ان چار طاقتور سانپوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مجھے پکڑنا چاہتے ہیں۔ یہاں میں نے اپنی انسانی

طاقت کا استعمال کیا اور زوردار آواز میں دو تین بار شی شی کیا کہ شاید سانپ ڈر کر ادھر ادھر ہو جائیں گے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی سانپ اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ پھر میں نے انسانی آواز نکال کر انہیں ڈرانے کی کوشش کی اور کہا۔

"بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔"

میری انسانی آواز سن کر ایک لمحے کے لیے وہ بالکل ساکت ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے زیادہ شدت سے پھنکارنا شروع کر دیا۔ اتنے میں جھگی میں سے ایک بوڑھی عورت باہر نکل کر سانپوں کے قریب آئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس نے ضرور میری انسانی آواز سن لی تھی اور اب یہ دیکھ رہی تھی کہ ابھی ابھی جو آدمی یہاں بولا تھا وہ کہاں ہے۔ پھر اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ دو سانپوں نے مجھ پر حملہ کر دیا اور ایک نے مجھے اپنے منہ میں پکڑ کر اٹھا لیا۔ بوڑھی عورت نے سانپ کو ڈانٹا اور مجھے اس کے منہ سے نکال کر بڑے غور سے میرا جائزہ لینے لگی۔ چاروں سانپوں نے اپنے پھن سمیٹ لیے تھے۔ بوڑھی عورت کے سر کے بالوں کی میلی کچیلی لٹیں دائیں بائیں لٹک رہی تھی۔ اس نے مجھے گردن سے پکڑ کر اٹھایا ہوا تھا۔ وہ مجھے لے کر اپنی جھگی کی طرف جانے لگی تو میں نے اپنے جسم کو جھٹکا دے کر چھڑانے کی کوشش کی تا کہ اس سے پہلے کہ یہ پراسرار عورت مجھ پر کوئی منتر پھونک کر مجھے اپنے قبضے میں کرے، میں فرار ہو جاؤں۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم میں وہ پھرتی نہیں رہی۔ تب مجھے یاد آیا کہ جب بڑے سانپ نے مجھے اپنے منہ میں اٹھایا تھا تو میری گردن میں ایک سوئی سی چبھی تھی۔ ضرور یہ زہر کی ہلکی سی مقدار تھی جس نے میرے جسم میں داخل ہو کر میرے جسم کی پھرتی اور تیزی ختم کر دی تھی۔ اس خیال سے میں پریشان ہو گیا کہ میں عورت کے قبضے میں آ چکا ہوں۔ بوڑھی عورت مجھے جھگی میں لے آئی۔ یہاں سانپوں کی چھ سات چھوٹی بڑی پٹاریاں پڑی تھیں۔ ایک بوڑھا سپیرا جس کے بال سفید ہو گئے تھے بیٹھا ناریل کا حقہ پی رہا تھا۔ اس نے بوڑھی سپیرن سے پوچھا۔

"کلکنی! تمہارے سانپوں نے یہ کیا چھوٹا سے کیڑا پکڑا ہے؟ اس کو چھوڑ دو۔"

بوڑھی سپیرن نے مجھے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ جھگی میں مٹی کے تیل کی لالٹین جل رہی تھی اور مٹی کے تیل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بوڑھے سپیرے کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"واسو! مجھے سانپ اچرج لگ رہا ہے۔ اس کے بدن سے انسانوں کی بو آ رہی ہے۔ کیا تم کو یہ بو نہیں آئی؟"

بوڑھے سپیرے نے ناریل کے حقے کا کش لگا کر کہا۔

"نہیں آئی۔ یہ تو معمولی سانپ ہے اس کو باہر پھینک دو"

بوڑھی سپیرن میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے جا رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے ناک کے پاس لے جا کر سونگھا۔ اس وقت میں نے اسے ڈسنے کی کوشش کی لیکن میں اپنا منہ پوری طرح نہ کھول سکا۔ میرے جسم کی آدھی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے مجھے بوڑھے سپیرے کو بھی سنگھایا اور پوچھا۔

"اب بتاؤ۔ کیا تمہیں مانش کی بو نہیں آتی؟"

بوڑھے سپیرے کو کچھ بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"نہیں بالکل نہیں۔ تم سٹھیا گئی ہو۔ یہ کوئی آوارہ کیڑا ہے۔ باہر لے جا کر اسے چھوڑ دو۔

مگر بوڑھی سپیرن اپنے بوڑھے سپیرے خاوند سے زیادہ عقل مند اور تجربہ کار معلوم ہوتی تھی۔ اس نے میرے جسم میں چھپی ہوئی انسان کی بو کو محسوس کر لیا تھا۔ پتہ نہیں وہ میرے ساتھ اب کیا سلوک کرنے والی تھی۔ اتنا مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مجھے پکڑنے میں بڑی خوش تھی۔ میں نے ایک بار پھر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی مگر میں اپنے جسم کو پوری تیزی کے ساتھ نہ ہلا سکا۔ بس ذرا سا ہل جل کر وہیں رہ گیا۔ بوڑھی سپیرن نے اپنے آدمی سے کہا۔

"یہ بھاگنا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ ہماری باتیں سن رہا ہے۔"

بوڑھے سپیرے نے ناریل کا حقہ ایک طرف رکھ دیا اور مجھے جھک کر غور سے

دیکھنے لگا۔ بولا۔

"کلکنی! لگتا ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو شاید"

وہ بولی۔

"واسو! میں نے ساری زندگانی سانپوں میں گزاری ہے۔ میں نے گورو گورکھ کی بھی سیوا کی ہے۔ میں گورو گورکھ کے دربار میں سیوا کرنے والے سانپوں کی بو پہچانتی ہوں۔ یہ گورو گورکو کے دربار کا سیوا دار سانپ ہے۔ یہ مرد کا روپ دھار سکتا ہے۔"

بوڑھے نے کہا۔

"تو پھر ابھی تک اس نے انسان کا روپ کیوں نہیں دھارا؟ ایسا کر کے یہ یہاں سے فرار بھی ہو سکتا ہے؟"

بوڑھی سپیرن کہنے لگی۔

"گورو گورکھ کے دربار کے سانپ کبھی کسی سنسار واسی پر اپنا راز ظاہر نہیں کرتے اگر وہ دنیا میں رہنے والے کسی انسان کے سامنے آدمی کے روپ میں ظاہر ہو جائیں تو گورو گورکھ کے دربار سے ہمیشہ کے لیے دھتکار دیئے جائیں گے۔"

بوڑھے سپیرے نے کہا۔

"تو پھر تمہیں اس سانپ کا کیا فائدہ ہے؟"

وہ اپنے پوپلے منہ کو کھول کر ہنسنے لگی۔

"واسو! تم بیوقوف کے بیوقوف ہی ہو مورکھ! میں اس سانپ پر گورو گورکھ کا تیس دن کا چلہ کروں گی۔ تیس دنوں کے چلے کے بعد یہ سانپ اپنے آپ مجھ پر اپنا انسانی روپ ظاہر کر دے گا۔ پھر یہ میرا غلام ہو گا۔ میں اس کی مدد سے دھرتی کے نیچے دبے ہوئے راجے مہاراجوں کے سارے خزانے باہر نکلوا کر سنسار کی سب سے دولت مند عورت بن جاؤں گی۔"

بوڑھا سپیرا بہت متاثر ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"ایسا ہے تو اس کو پٹاری میں بند کر کے ابھی سے چلہ شروع کر دو۔ میں بھی چاہتا

ہوں کہ میرے پاس بڑی دھن دولت آجائے۔"

بوڑھی سپیرن نے مجھے ایک پٹاری میں بند کر دیا۔ بوڑھے نے کہا۔

"تمہارے کالیے نے اس کو ٹیکہ لگایا ہے کہ نہیں؟"

بوڑھی سپیرن بولی۔

"میرا کالیا سانپ اس کی گردن پر ٹیکہ نہ لگاتا تو یہ اب تک بھاگ گیا ہوتا۔"

مجھ پر ایک اور ناگہانی مصیبت نازل ہو گئی تھی۔ کہاں میں للت پور کے سٹیشن پر آکر بھوپال کی طرف جا رہا تھا کہ اپنی بیوی سے جا کر ملوں گا اور کہاں اس بوڑھی سپیرن کے جال میں پھنس گیا تھا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ میرا جسم آدھا سن ہو گیا تھا اور میں اپنی طاقت استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ایک نیا عذاب مجھ پر نازل ہوا تھا۔

میں نے جان بوجھ کر اپنی انسانی آواز نہیں نکالی تھی۔

اگر میں ایسا کرتا تو ان دونوں کو پورا یقین ہو جاتا کہ میں ان کے مطلب کا ہی سانپ ہوں۔ پھر تو وہ مجھے کسی حالت میں بھی آزاد نہ کرتے۔ میں تو پہلے ہی کالے سانپ کے بے ہوشی والے ٹیکے سے نیم جان ہو چکا تھا۔ اس انکشاف کے بعد کہ میں واقعی انسان ہوں جس نے سانپ کا روپ دھار رکھا ہے بوڑھی سپیرن شاید مجھے کسی لوہے کے صندوق میں بند کر دیتی اور اسی وقت مجھ پر قابو پانے کا عمل شروع کر دیتی۔ لیکن اس چڑیل کی قید میں زیادہ دیر رہنا میرے لیے ناممکن تھا۔ میں وہاں سے فرار ہونے کے طریقے سوچنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ کالے سانپ نے میرے جسم میں جو زہر داخل کیا ہے اس کا اثر کچھ وقت گزرنے کے بعد ضرور ختم ہو جائے گا۔ پھر چاہے کچھ ہو جائے میں پٹاری کو توڑ کر یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ اس وقت میری شدید خواہش تھی کہ میں سانپ سے انسانی شکل میں واپس آجاؤں۔ انسان کی شکل اختیار کرنے کے بعد سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہ مجھے وہاں روک سکتے۔ لیکن خدا جانے قبر کے اندر کس قسم کے سانپ نے مجھے کاٹا تھا کہ اس کے زہر کا اثر مجھے مستقل لگتا تھا اور لگتا تھا کہ اب شاید میں کبھی اپنی انسانی شکل میں واپس نہیں آسکوں گا۔

مجھے بوڑھی سپیرن اور بوڑھے سپیرے کی باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ بوڑھی سپیرن اسے کہہ رہی تھی کہ کل بسنت پنچھی کی رات ہے۔ میں کل اس پر اپنا چلہ شروع کروں گی۔ بوڑھے نے اسے کہا۔

"اچھا اب باتیں نہ کرو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

دونوں کی آواز آنا بند ہو گئی۔ شاید وہ سو گئے تھے۔ میں پٹاری میں نیم جان ہو کر پڑا تھا۔ اپنے جسم کو زیادہ حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ ساری رات میں پٹاری میں بند اپنی قسمت کے الٹ پھیر پر سوچتا رہا کہ ڈھاکے سے نکلنے کے بعد میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی میری یہ حالت بھی ہو جائے گی۔ ریلوے سٹیشن پر کوئی گاڑی آکر رکی شاید یہ بھوپال جانے والی گاڑی تھی۔ مجھے اسی گاڑی پر سوار ہونا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی کے چلنے کی آواز آئی اور آہستہ آہستہ یہ آواز رات کے سناٹے میں تحلیل ہو گئی۔ کسی کسی وقت دور سے کسی انجن کے شنٹ کرنے کی آواز آ جاتی تھی۔ رات میں بے بسی کے عالم میں پٹاری میں بند پڑا رہا اور باہر رات گزرتی چلی گئی۔ ایک دو ریل گاڑیاں سٹیشن پر آکر رکیں اور آگے بھوپال یا دلی کی طرف نکل گئیں۔ صبح ہو گئی۔ میں پٹاری میں بند تھا۔ پٹاری میں اندھیر تھا۔ دن کی روشنی نہیں آ رہی تھی۔ باہر لوگوں کی آوازوں اور سٹیشن کے ہلکے ہلکے شور سے معلوم ہوا کہ دن نکل آیا ہے۔

اسی دوران بوڑھے کے کھانسنے کی آوازیں آئیں اور پھر یہ آوازیں جھگی سے باہر چلی گئیں۔ کافی وقت گزر گیا۔ مجھے محسوس ہوا کوئی جھگی میں داخل ہوا ہے۔ یہ بوڑھی سپیرن تھی۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔

"گورو گورکھ دیو جی! میری پتسیا سپھل کر دینا۔ میں تیرے سیواداروں کی سیوا دار ہوں۔ مجھے لکشمی دیوی کے درشن کرا دو۔"

لکشمی دیوی ہندو دیو مالا میں دولت کی دیوی سمجھی جاتی ہے۔ ہندو لوگ دھن دولت حاصل کرنے کے لیے اس کی پوجا کرتے ہیں۔ لکشمی دیوی جس ہندو کو اپنے درشن دے دے ان کے عقیدے کے مطابق وہ آدمی مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس بوڑھی

سپیرن کے سر پر بھی بڑھاپے میں دولت کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اس عورت نے میری پٹاری کو اٹھا لیا اور وہاں سے چل پڑی۔ وہ چلتی گئی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں وہ مجھے لے کر کہاں جا رہی تھی۔ میں نے ایک دوبار اپنے ساتھی کمانڈو منظر کی بو سونگھنے کی کوشش کی مگر کالے سانپ کے زہر کے اثر سے میری بو سونگھنے کی حس بھی کمزور پڑ گئی تھی۔ مجھے کسی سمت سے بھی کمانڈو خالد کی بو نہ آئی۔

میرا خیال ہے کہ بوڑھی سپیرن میرے پٹاری کو لے کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پیدل چلتی رہی ہو گی۔ وہ کسی کسی وقت کوئی منتر بھی گنگنانے لگتی تھی جو میری سمجھ سے باہر تھا۔ ایک جگہ پر وہ رک گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ بیٹھ گئی ہے۔ اس نے بیٹھتے ہوئے گہرا سانس لیا تھا۔ پھر مجھے ایسے لگا جیسے وہ کوئی سیڑھیاں اتر رہی ہے۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد وہ کسی طرف چل پڑی۔ وہ دوبارہ رکی اور بیٹھ گئی۔ اس نے میری پٹاری زمین پر رکھ کر اسے ہاتھوں سے دھکیل کر جیسے کسی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ مجھے بوڑھی سپیرن کے منتر پڑھنے کی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھی اور بولی۔

"گورکھ دیو! میں آج رات کے پچھلے پہر تیرا چلہ کاٹنے آؤں گی۔ میرا چلہ سوئیکار کرنا۔"

اور منتر پڑھتے پڑھتے وہ مجھ سے دور ہٹتی چلی گئی۔ پھر اس کی آواز غائب ہو گی۔ میری پٹاری کا منہ بند تھا۔ میں نے کوشش کی کہ اپنا سر اوپر اٹھا کر پٹاری کے ڈھکن کو الگ کر دوں مگر میرا سر ڈولنے لگا اور میں اپنا سر زیادہ اونچا نہ کر سکا۔ اس کالے سانپ نے خدا جانے میرے اندر کس قسم کا زہر داخل کر دیا تھا کہ میں پوری طاقت سے کوئی حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بے بسی کی حالت میں پٹاری میں پڑا رہا۔ وقت کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر دن کتنا باقی رہ گیا ہے۔ شام ہو گئی ہے یا نہیں۔ اتنا مجھے احساس تھا کہ یہ بوڑھی سپیرن مجھے کسی زمین کے اندر لائی ہے اور میں زمین کے نیچے کسی سرنگ یا غار میں پڑا ہوں۔ باہر کوئی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ کسی کسی وقت کوئی پرندہ بولتا ہوا

آسمان پر سے گزر جاتا تھا اور اس کی آواز مجھے بڑی دھیمی آتی تھی۔ اس عورت نے کہا تھا کہ وہ رات کے پچھلے پہر آئے گی۔ آج رات سے اس نے مجھے ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنانے کے واسطے مجھ پر اپنا چلہ شروع کرنا تھا۔ میں پہلے ہی ایک مصیبت میں پھنسا ہوا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ عورت مجھے کس نئی مصیبت میں پھنسانے والی ہے۔ میں پٹاری سے نکل کر بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن میرے جسم کی طاقت میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

باہر خاموشی زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ شاید رات ہو گئی تھی۔ بوڑھی سپیرن نے رات کے پچھلے پہر مجھ پر چلہ کرنے اور منتر پھونکنے کے لیے آنا تھا۔ میں اس کے آنے سے پہلے پہلے وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن یہ بات میرے اختیار میں نہیں رہی تھی۔ میں دعائیں مانگنے لگا کہ خدا مجھے اس عذاب سے نجات دلائے اور مجھے طاقت دے کہ میں پٹاری میں سے نکل کر فرار ہو سکوں۔ اچانک مجھے ایک بو محسوس ہوئی۔ سانپ ہونے کی وجہ سے میں نے اس بو کو فوراً" پہچان لیا۔ بو میری پٹاری کے قریب آ رہی تھی۔ یہ بو مجھے اس لیے محسوس ہوئی تھی کہ یہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ یہ کسی دوسرے سانپ کی بو تھی جو مادہ سانپ یعنی ناگن تھی۔ سانپ نر اور مادہ کی بوؤں کو دور سے پہچان لیتے ہیں۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ یہ ناگن یہاں کیا کرنے آ رہی ہے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اس جگہ رہتی ہو اور رات کو اپنے ٹھکانے پر واپس آئی ہو۔ اتنا مجھے یقین تھا کہ ناگن کو بھی میری بو آ گئی ہو گی اور جب وہ وہاں ایک پٹاری دیکھے گی تو ضرور اسے کھولنے کی کوشش کرے گی۔

میں نے باہر کی آوازوں پر کان لگا دیئے۔ یہ میں نے محاورے کے طور پر استعمال کیا ہے ورنہ سانپ کے کان نہیں ہوتے وہ زیادہ آوازیں اپنے جسم کی کھال اور اپنی زبان کے ذریعے سنتا ہے۔ باہر کی کوئی آواز جب اس کے جسم سے ٹکراتی ہے تو اس سے ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور سانپ سمجھ جاتا ہے کہ یہ کس کی آواز تھی۔ کیا سانپوں کی کوئی اپنی زبان بھی ہوتی ہے؟ اس کا ابھی تک مجھے کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی

تک نہ کسی سانپ نے مجھ سے سانپوں کی زبان میں بات کی تھی اور نہ میں نے اس زبان میں کوئی بات کی تھی۔ مجھے تو علم ہی نہیں تھی کہ سانپ بھی اپنی زبان میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ سانپوں کی بھی ایک زبان ہوتی ہے اور وہ اس زبان میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔ اس کی حیرت انگیز تفصیل میں آگے چل کر آپ کو بیان کروں گا۔

پٹاری سے باہر ہلکی ہلکی پھنکارنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جو ناگن وہاں آئی ہے وہ میری پٹاری کے اردگرد چکر لگاتے ہوئی آہستہ آہستہ پھنکار رہی ہے۔ میں خاموش رہا اور اپنی طرف سے کسی قسم کی پھنکار کی آواز نہ نکالی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ ناگن میرے پٹاری کے گرد چکر کیوں لگا رہی ہے اور اپنی پھنکاروں سے مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہے یا مجھے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کر رہی ہے کیونکہ اسے پتہ چل گیا تھا کہ پٹاری کے اندر ایک نر سانپ ہے۔ ناگن کی پھنکاریں رک گئی تھیں۔ میری پٹاری تیلیوں کو جوڑ کر بنائیں گئی تھی جس طرح عام طور پر سپیروں کی پٹاریاں ہوتی ہیں۔ اس کے اوپر تیلیوں کا بنا ہوا ہی ڈھکنا تھا جو نیچے سے اوپر کرنے سے کھل جاتا تھا۔ میری پٹاری ہلنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ ناگن پٹاری کے اوپر چڑھ رہی ہے۔ پھر اچانک پٹاری کا ڈھکن اوپر اٹھ کر ایک طرف کو گر پڑا۔ ناگن نے اسے اپنے سر سے اوپر اٹھا کر دوسری طرف پھینک دیا تھا۔ میں نقاہت کی وجہ سے تھوڑا سا ہی سر اوپر اٹھا سکتا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

اندھیرے میں مجھے ایک سیاہ رنگ کے سانپ کا سر دکھائی دیا جس کی سرخ آنکھیں مسلسل میرے طرف دیکھ رہی تھیں۔ یہ ناگن تھی۔ اس کے جسم کی تیز بو مجھے برابر آ رہی تھی۔ میں بھی اسے تک رہا تھا۔ دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے میری مدد کے لیے ایک سانپ کو بھیج دیا۔ کم از کم پٹاری کا ڈھکن تو کھل گیا۔ اب میں اس کمزوری اور نقاہت کی حالت میں بھی وہاں سے نکل کر فرار ہو سکوں گا۔

اچانک میرا سانپ والا جسم کانپ کر رہ گیا۔ مجھے کسی لڑکی کی مترنم آواز آئی۔

"تم سانپ کی شکل میں کیسے آ گئے؟"

پہلے تو میں یہی سمجھا کہ وہاں کوئی عورت بھی ہے جس کو میرا انسان سے سانپ بن جانے کا راز معلوم ہو گیا ہے اور یہ سوال اسی نے کیا ہے۔ میں ناگن کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جس عورت نے مجھ سے یہ بات پوچھی ہے وہ ابھی اپنا چہرہ آگے کر کے مجھے دیکھے گی مگر کوئی عورت آگے نہ آئی۔ بلکہ اس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"میں جانتی ہوں تم سانپ نہیں ہو۔ تمہیں ناگ پوری کے ناگ دیوتاؤں کا خاص منتر پھونک کر سانپ کے روپ میں بدل دیا گیا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم اپنی انسانی آواز میں بات کر سکتے ہو۔"

چونکہ اس اندھیرے میں بھی میں سانپ ہونے کی وجہ سے بہت کچھ دیکھ سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بات کرتے ہوئے ناگن کی زبان تھوڑی بار بار باہر کو نکل رہی تھی۔ انسانی آواز میں بات کرتے ہوئے میری بھی سانپ کی زبان تھوڑی تھوڑی باہر نکلا کرتی تھی۔ میں سوچ کر حیرت زدہ ہو کر رہ گیا کہ کہیں یہ ناگن تو انسانی آواز میں مجھ سے ہمکلام نہیں ہے؟ اگر یہ ناگن ہی مجھ سے انسان کی آواز میں بات کر رہی تھی تو مجھے اس سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا اور پھر مجھے اس کی مدد کی ضرورت بھی تھی۔ میں نے جواب دینے کی بجائے اس سے سوال کیا۔

"کیا یہ تم عورت کی آواز میں بول رہی ہو؟"

اس نے کہا۔

"ہاں۔ یہ میں ہی تم سے عورت کی زبان میں بول رہی ہوں۔"

"کیا تم بھی میری طرح انسان ہو یا تم سانپ ہو اور انسان کی زبان میں بات کرنا جانتی ہو۔"

ناگن نے کہا۔

"اسکا جواب میں بعد میں دوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں کس نے انسان سے سانپ کے روپ میں تبدیل کیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ انسان ہونے کے ناطے پہلے میری مدد کرو اور مجھے یہاں سے نکالو۔"

ناگن نے کہا۔

"میں نے تمہاری پٹاری کا ڈھکن ہٹا دیا ہے۔ تم باہر آ سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔

"میں باہر نہیں نکل سکتا۔ میرے جسم کی طاقت آہستہ آہستہ جواب دے رہی ہے۔"

پھر میں نے اسے بتایا کہ کس طرح میں للت پور ریلوے سٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ بوڑھی سپیرن کے سانپوں نے مجھے گھیر لیا اور ایک سانپ نے مجھے اپنے منہ میں لے کر میرے جسم میں ایسا زہر داخل کر دیا کہ جس سے مجھ پر شدید کمزوری اور نقاہت طاری ہو گئی اور اب اس کمزوری میں اضافہ ہو گیا ہے اور میں اپنے جسم کو زیادہ ہلا جلا بھی نہیں سکتا۔ ناگن ابھی تک پٹاری کے کنارے سے سر نکالے مجھے دیکھ رہی تھی اور باتیں کر رہی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ بے ہوشی والے زہر کے اثر سے میرا جسم نیم جان ہو چکا ہے اور میں سر بھی اوپر اٹھاؤں تو وہ ڈولنے لگتا ہے تو وہ رینگتی ہوئی پٹاری کے اندر آ گئی۔ وہ کالے سیاہ رنگ کی ناگن تھی اور اس کا جسم ایسے چمک رہا تھا جیسے کسی نے پالش کیا ہو۔ وہ بھی ڈیڑھ دو فٹ کی ناگن تھی۔ میرے سامنے پٹاری میں بیٹھ گئی اور بولی۔

"میں سمجھ گئی ہوں۔ تم اس بوڑھی سپیرن کے جال میں پھنس گئے تھے جو گورو گورکھ کے سیوا دار سانپ کی تلاش میں بڈھی کھوسٹ ہو گئی ہے۔ دھن دولت کے

لالچ نے اس کو اندھا کر دیا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہار علاج میرے پاس ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ناگن نے اپنے منہ کو کھول کر میرا سر اوپر اٹھایا اور میرے چہرے اور گردن پر اپنی زبان پھیرنی شروع کر دی۔ جیسے جیسے وہ زبان پھیر رہی تھی میرے جسم میں توانائی کی لہریں دوڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ دیر تک وہ ایسا کرتی رہی۔ پھر اس نے میرا چہرہ نیچے کرتے ہوئے کہا۔

"اب خود اپنا سر اوپر اٹھاؤ۔"

میں نے فوراً" سر اوپر اٹھا لیا۔ مجھے ذرا سی بھی کمزوری محسوس نہ ہوئی۔ میری ساری توانائی واپس آ چکی تھی۔ ناگن نے کہا۔

"اپنا پھن کھولو۔"

میں نے اپنا پھن بڑی آسانی سے کھول دیا اور ہلکی پھنکار بھی ماری۔ ناگن نے کہا۔

"تمہارے بدن میں سے بوڑھی سپیرن کے سانپ کے زہر کا اثر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔"

میں نے اس سے کہا۔

"میں یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں کیونکہ بوڑھی سپیرن رات کے پچھلے پہر مجھ پر گورو گودکھ کے منتروں کا چلہ کرنے یہاں آ رہی ہے۔"

ناگن بولی۔

"اب وہ بوڑھی چڑیل تمہاری ہوا کو بھی نہیں چھو سکتی۔ میرے ساتھ آ جاؤ۔"

میں بڑی آسانی سے پوری توانائی کے ساتھ پٹاری کے باہر نکل آیا۔ ناگن میرے ذرا آگے آگے رینگنے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

اس نے انسانی آواز میں کہا۔

"یہ رانی کا مرگھٹ ہے۔ یہاں سپیرے جادو ٹونہ کرنے اور چلہ کاٹنے آتے

ہیں۔"

ہم سیڑھیاں چڑھ کر اس زیر زمین مرگھٹ سے باہر آگئے۔ باہر رات کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سامنے جھاڑیاں تھیں اور ان کے پیچھے کچھ فاصلے پر چھوٹے چھوٹے ٹیلے رات کے اندھیرے میں اس طرح سے نظر آ رہے تھے جیسے کالے سیاہ بھوت کمبل اوڑھ کر بیٹھے ہوئے ہوں۔ ناگن مجھے جھاڑیوں میں سے نکال کر ایک چھوٹی سی ندی کے پاس لے آئی۔ اور کہنے لگی۔

"اس ندی کی دوسری طرف وشوا متر کے پرانے مندر کا کھنڈر ہے۔ میں وہیں رہتی ہوں۔ تم میرے ساتھ وہاں چلو۔ وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ میں تمہیں اتنا بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں بھی حقیقت میں ایک عورت ہوں۔ مجھ پر بھی کسی جادو ٹونہ کرکے منتر پھونک کر مجھے ناگن بنا دیا ہے۔"

میں سوچنے لگا کہ کیا یہ عورت سچ مچ سانپ نہیں ہے؟ شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اگر وہ سانپ ہوتی تو کبھی عورت کی آواز میں بات نہیں کر سکتی تھی۔ جس طرح میں حقیقت میں سانپ نہیں ہوں اور انسانی آواز میں بول سکتا ہوں اسی طرح یہ ناگن بھی حقیقت میں انسان ہے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر یہ لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح میں بھوپال اپنی بیوی جمیلہ کے پاس پہنچ جاؤں۔ لیکن یہ معلوم بھی کرنا چاہتا تھا کہ عورت جس کی آواز اتنی مترنم ہے اور ناگن کی شکل میں میرے ساتھ ساتھ رینگ رہی ہے اصل میں کون ہے اور کیسے ناگن بن گئی ہے۔

ایک جگہ ندی پر درخت کا کٹا ہوا تنا گرا کر پل بنا دیا گیا تھا۔ ہم پل پر سے رینگتے ہوئے گزر گئے۔ دوسری طرف ایک ویران علاقہ تھا۔ کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ تھے۔ ایک جھنڈ میں ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا جس کی دیواریں بھی ڈھے چکی تھیں۔ صرف درمیان میں ایک چبوترہ اور اس پر ایک چار دیواری سی باقی رہ گئی تھی۔ ناگن مجھے چار دیواری کے اندر لے آئی۔ یہاں جگہ جگہ اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ ایک جگہ سے نیچے تہہ خانے کا راستہ جاتا تھا۔ ناگن نے کہا۔

"نیچے چھوٹی سی کوٹھڑی بنی ہوئی ہے۔ کسی زمانے میں یہاں وشوامتر کے بھکشو یاترا کرنے آیا کرتے تھے۔ پھر اس جنگل میں کہیں سے آدم خور شیر اور شیرنی کا جوڑا آ گیا۔ اس جوڑے نے لوگوں کو ہڑپ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد سے یاتریوں نے ادھر آنا چھوڑ دیا اور یہ مندر ویران ہو گیا۔

"کیا آدم خور شیر اور شیرنی اب بھی یہاں پر ہیں؟"

ناگن نے کہا۔

" شاید اب وہ یہاں سے کسی دوسری طرف چلے گئے ہیں مگر یاتریوں نے دوبارہ اس طرف کا رخ نہیں کیا۔"

زمین کے اندر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بنی ہوئی تھی یہ بڑی ٹھنڈی جگہ تھی۔ تہہ خانہ ہی تھا۔ ناگن نے تھوڑی سی گھاس باہر سے لا کر وہاں ایک طرف بچھا رکھی تھی۔ ہم دونوں آمنے سامنے گھاس پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے ناگن سے پوچھا۔

"کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ تم انسان سے ناگن کیسے بن گئی؟"

اس نے کہا۔

" میرا نام درگا ہے۔ میں لکشمن پور کے ایک برہمن کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ سورگ باشی ہو چکا ہے۔ میں اپنی ماتا کے ساتھ گاؤں کے ایک مکان میں رہتی تھی۔ گاؤں کے مندر کا پجاری مجھ پر ڈورے ڈالنے لگا۔ میں مندر میں پوجا کرنے جاتی تو وہ مجھے ورغلانے کی کوشش کرتا۔ ایک بار اس نے میری ساڑھی پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا تو میں نے بڑے زور سے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ درگا! تو نے برہم پتر کے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ میں تجھ سے اس کا بدلہ لے کر رہوں گا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ ہمارے گھر میں ایک جوگی آیا۔ اس نے اپنی باتوں سے ہمارے اوپر بڑا اثر ڈالا۔ اس نے ایک دوبار پانی کو دودھ اور دودھ کو پانی میں بھی تبدیل کر دیا۔ میری ماتا جی تو اس کی گرویدہ ہو گئی۔ وہ مجھ سے بڑی شفقت

سے پیش آتا تھا۔ ایک بار اس نے مجھے برفی لا کر دی اور کہا' پتری! یہ برفی مجھے ہنومان جی نے لا کے دی ہے۔ اس کو کھا جاؤ' تمہارا کام ہو جائے گا۔ تمہارا بیاہ کسی راج کمار سے ہوگا' میں نے برفی نہ کھائی تو میری ماں نے مجھے مجبور کیا کہ ہنومان جی کی برفی ہے۔ نہیں کھاؤ گی تو تمہیں ان کی بددعا لگے گی۔ کچھ مجھ پر بھی ہنومان جی کا اثر تھا۔ کیونکہ میں نے ہندو گھرانے میں جنم لیا تھا۔ میں نے برفی کھالی اس کے بعد جوگی چلا گیا اور پھر ہمارے گھر نہ آیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ میرا گورا رنگ آہستہ آہستہ سانولا ہونا شروع ہو گیا۔ میرے پیٹ میں درد رہنے لگا۔ ایک روز میری طبیعت ذرا سنبھلی تو میں پوجا کرنے کے لیے مندر میں گئی تو بدمعاش پجاری مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گیا۔ کہنے لگا' درگا! میں نے تم سے برہم پتر کے منہ پر طمانچہ مارنے کا بدلہ لے لیا ہے۔ میں اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے نفرت سے کہا' بھگوان میری سہائتا کرے گا۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے' اس نے کہا۔ تم نے بھگوان کی بے عزتی کی تھی۔ بھگوان تمہاری کیسے سہائتا کرے گا۔ جو برفی تم نے جوگی کے ہاتھ سے کھائی تھی اس کا اثر تم پر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ تم ایک ہفتے کے بعد عورت سے ناگن بن جاؤ گی اور پھر ساری زندگی ناگن بن کر زندہ رہو گی' یہ کہہ کر پجاری ہنستا ہوا چلا گیا۔ میں نے ڈر کے مارے ماتا جی سے بھی بات نہ کی۔ آخر جوگی کی برفی نے اپنا اثر دکھا دیا اور میں ایک ہفتے بعد بستر سے سو کر اٹھی تو میں انسان کی بجائے ایک ناگن بن چکی تھی۔ میری ماتا جی مندر گئی ہوئی تھیں۔ میں خوف زدہ ہو کر بستر سے نکل کر جنگل کی طرف بھاگ گئی۔ اس بات کو پانچ برس گزر گئے ہیں۔ تب سے لے کر اب تک میں ناگن کی شکل میں زندہ ہوں اور اپنی انسانی شکل اور اپنے انسانی جسم کو دیکھنے کے لیے ترس گئی ہوں۔ یہ ہے میری دردناک رام کہانی ـــ اب تم مجھے اپنی داستان سناؤ کہ تم انسان سے سانپ کیسے بن گئے۔"

میں نے بھی اسے اپنی شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی بیان کر ڈالی۔ اس میں سے میں نے وہ ٹکڑے نکال دیئے جس میں میں نے اور کمانڈو خالد نے مل کر

بھارتی ظلم و ستم کے خلاف کمانڈو ایکشن کیا تھا اور پیلس ہوٹل میں دھماکہ کیا تھا اور بھارتی انٹیلی جنیس والوں کو ختم کیا تھا۔ یہ ضرور بتایا کہ میری بیوی جمیلہ اس وقت بھوپال میں میرے ایک دوست کے گھر پر ہے۔ میں اپنے دوست کے ساتھ دلی آیا تھا کہ مجھے پولیس نے پاکستانی جاسوس ہونے کے الزام میں پکڑ لیا اور پھر مجھے سانپ سے ڈسوا کر ایک گڑھے میں دبا دیا جہاں کسی عجیب و غریب سانپ نے مجھے ڈس دیا اور میں انسان سے سانپ کی شکل اختیار کر گیا۔ جس کی وجہ سے مجھے کبھی اپنے دوست کی بو آتی ہے اور کبھی نہیں آتی اور مجھے لگتا ہے کہ اس سانپ کے زہر کی وجہ سے اب میں کبھی انسانی شکل میں واپس نہیں آسکوں گا۔

ناگن بڑے توجہ سے میری کہانی سنتی رہی۔ جب میں چپ ہو گیا تو وہ کہنے لگی۔

"جس سانپ نے تجھے کاٹا تھا وہ کپٹ شری کے قبیلے کا سانپ تھا۔ اس کے زہر کا اثر ختم ہونے کو ایک منٹ میں ختم ہو سکتا ہے اور جب تک تم زندہ ہو اس وقت تک بھی ختم نہیں ہو سکتا۔"

میں پریشان ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اب کبھی دوبارہ انسانی شکل اختیار نہیں کر سکوں گا۔"

ناگن نے کہا۔

"میرے کہنے کا مطلب یہی تھا۔ کپٹ شری کے سانپ کے بارے میں ویدوں میں یہی لکھا ہے کہ جس انسان کو یہ سانپ کاٹے وہ پگھل کر پانی بن جائے گا۔ جس سانپ کے روپ میں آئے ہوئے انسان کو کاٹے وہ دوبارہ کبھی انسان کے روپ میں نہ آ سکے گا۔"

میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ ناگن کچھ بھی نہیں جانتی۔ اسے کیا معلوم ہے کہ ایک ایمان کی طاقت کیا ہوتی ہے۔ میرے خدا نے چاہا تو میں ایک بار پھر اپنی اصلی انسانی شکل میں واپس آجاؤں گا۔ اب میں نے ناگن سے اصل بات کی۔ میں نے کہا۔

" مجھے بھوپال جانا ہے۔ کسی طرح رات مجھے للت پور کے سٹیشن سے بھوپال جانے والی ریل گاڑی پر سوار کرا دو۔ بھوپال پہنچ کر میں خود ہی اپنی بیوی کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ مجھے اپنے دوست کے گھر کا راستہ معلوم ہے۔"

ناگن کہنے لگی۔

"رات کے وقت للت پور سے مال کے بھرے ہوئے ٹرک بھوپال کی طرف چلتے ہیں۔ تم کسی ٹرک پر بیٹھ کر کیوں نہیں چلے جاتے' ریل گاڑی میں تو بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ تمہیں کوئی بھی دیکھ کر مار سکتا ہے۔ ٹرک میں میں گھس کر بیٹھ جانا۔ وہاں تو سوائے ڈرائیور اور کلینر کے اور کوئی نہیں ہوتا۔"

ناگن کی تجویز مجھے بہت پسند آئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ ٹرک کہاں سے چلتے ہیں؟"

وہ بولی۔

" ٹرکوں کا جہاں اڈہ ہے' وہاں سے چلتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں کل رات تمہیں وہاں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

ہم نے رات اور دوسرا سارا دن اسی مندر کے کھنڈر میں گزار دیا۔ درگا نے مجھے بتایا کہ وہ ایک خاص تپسیا کر رہی ہے جس کی تھوڑی مدت باقی رہ گئی ہے۔ اس کے پورا ہونے کے بعد اسے امید ہے کہ وہ ناگن سے عورت کی شکل میں واپس آ جائے گی۔

" پھر کبھی اگر تم لکشمن پور کی طرف آؤ تو مجھے ضرور ملنا۔ ہمارا گھر گاؤں کے کونے میں مندر کے پاس ہے"۔

میں نے یقین دلایا کہ اگر میں اس طرف گیا تو اسے ضرور ملوں گا۔

وہ کہنے لگی۔

" مجھے عورت کے روپ میں دیکھ کر کیا تم مجھے پہچان لو گے؟"

میں نے کہا۔

"کوشش کروں گا۔"

وہ بولی۔

"کوئی بات نہیں ہم ایک دوسرے کی بو سے پہچان لیں گے۔"

جب رات گہری ہو گئی تو ناگن مجھے ساتھ لے کر للت پور کے ٹرکوں کے اڈے کی طرف روانہ ہو گئی۔ شہر پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سڑکوں پر کوئی ٹریفک نہیں تھی وہ مجھے کھیتوں کھیت لے کر جا رہی تھی۔ ایک بڑے مندر کی پچھلی دیوار کے قریب سے ہو کر ہم تھوڑی سی چڑھائی طے کر کے اوپر سڑک پر آئے تو سامنے ایک جگہ دو تین ٹرک کھڑے تھے۔ ناگن نے کہا۔

"یہاں سے دلی اور بھوپال کو ٹرک مال لے کر جاتے ہیں۔ چلو۔ وہاں چل کر کسی طرح معلوم کرتے ہیں کہ بھوپال کی طرف کونسا ٹرک جا رہا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ہم یہ کیسے معلوم کریں گے؟ ہم تو سانپوں کے روپ میں ہیں اور انسانوں کی آواز میں کسی سے بات نہیں کر سکتے۔"

وہ بولی۔

"کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔ تم چلو تو سہی۔"

ٹرکوں کے اڈے پر چار پانچ آدمی ہی دکھائی دے رہے تھے۔ دو آدمی ایک ٹرک پر مال لاد رہے تھے۔ ہم ایک طرف اندھیرے میں چھپے ہوئے تھے۔ ناگن اس ٹرک کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"اس کا رخ بھوپال کی طرف ہے۔ تم ٹھہرو۔ میں ابھی معلوم کر کے آتی ہوں۔"

میں اس سے پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ کس طرح معلوم کرے گی کہ وہ ایک طرف کو رینگتی ہوئی نکل گئی۔ میری نظر ٹرک پر لگی ہوئی تھی۔ ایک نوجوان سا لڑکا ٹرک پر لدے ہوئے بوروں کو رسیوں سے جکڑ رہا تھا۔ ٹرک کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ خاموشی ہی تھی۔ اتنے میں مجھے ناگن کی آواز سنائی دی۔ اس نے عورت کی آواز میں کسی سے

پوچھا۔

"بھائی یہ ٹرک بھوپال جا رہا ہے؟"

لڑکے نے رسیوں کو باندھتے ہوئے کہہ دیا۔

"ہاں بی بی۔"

پھر جلدی سے ٹرک کی ایک طرف ہو کر دیکھنے لگا کہ یہ کس عورت کی آواز تھی۔ جب اسے وہاں کوئی عورت دکھائی نہ دی تو حیران سا ہو کر بولا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

پھر وہ ٹرک کے آس پاس جس عورت کی آواز آئی تھی اس کو تلاش کرتا دوسری طرف نکل گیا۔ اتنے میں ناگن میرے پاس آ چکی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں نے معلوم کر لیا ہے۔ یہ ٹرک بھوپال ہی جا رہا ہے۔ جلدی سے جا کر ٹرک پر سوار ہو جاؤ۔ بوریوں کے بیچ میں چھپ کر بیٹھ جانا۔"

میں نے ناگن سے کہا۔

"درگا تمہارا شکریہ! تم نے میری بڑی مدد کی ہے۔"

وہ بولی۔

"لکشمن پور کی طرف آنا ہوا تو مجھے ضرور ملنا۔ میں دو ایک ماہ میں انسانی شکل میں بدل کر واپس گھر چلی جاؤں گی۔ بھگوان ضرور میری مدد کریں گے۔"

اور وہ اندھیرے میں کھیتوں کی طرف رینگتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے کچھ فاصلے پر کھڑے ٹرک کا جائزہ لیا۔ اس وقت دو آدمی ٹرک کے آگے کی جانب کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ٹرک کے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ موقع اچھا تھا۔ میں نے تیزی سے ٹرک کی طرف رینگتا ہوا اس کے پہیے پر چڑھ گیا۔ وہاں سے اچھل کر ٹرک کی باڈی سے چمٹ گیا اور رینگ کر ٹرک کے اندر بوریوں کے درمیان چھپ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک بھوپال کی طرف روانہ ہو گیا۔ درگا ناگن کے خاص عمل سے میری کھوئی ہوئی توانائی واپس آ چکی تھی۔ میں نے سر اوپر اٹھا کر فضا میں اپنے

دوست کمانڈو خالد کی بو سونگھنے کی کوشش کی۔ مگر مجھے کسی طرف سے اس کی بو نہ آئی۔ پھر اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر ایسا لگتا تھا کہ ادھر ادھر سے بادل جمع ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ایک بھی ستارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہاں اتنی سردی نہیں تھی جتنی دلی اور جھانسی وغیرہ کے شہروں میں تھی۔ بس خنکی تھی۔ سانپ کے حیثیت سے مجھے سردی گرمی کا احساس تو ہوتا تھا مگر نہ سردی لگتی تھی' نہ گرمی لگتی تھی۔

ٹرک کی رفتار تیز نہیں تھی۔ اس پر کافی بوجھ لدا ہوا تھا اور وہ دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ زمین غیر ہموار ہونے لگی تھی۔ یہ سطح مرتفع کا علاقہ تھا۔ کوہ مری کی طرح کا پہاڑی علاقہ بھی نہیں تھا۔ دور دور پہاڑیاں تھیں۔ زمین کہیں اونچی ہو جاتی تھی اور کبھی دو دو' تین تین' میل تک نشیب میں اترتی چلی جاتی۔ اس کے بعد پھر معمولی سی چڑھائی شروع ہو جاتی۔ کچھ دور تک کھیتوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ اس کے بعد جنگل شروع ہو گیا۔ کوئی زیادہ گھنا جنگل نہیں تھا۔ درخت سڑک سے ہٹ کر تھے۔ مجھے للت پور سے بھوپال تک فاصلے کا اندازہ نہیں تھا۔ ٹرک کی رفتار بھی ہلکی تھی۔ راستے کے دیہات میں رک کر مزید مال ٹرک میں لادا جا رہا تھا۔ رات گزر گئی۔ دن کا اجالا پھیلنے لگا۔ ایک گاؤں کے باہر ٹرک رک گیا۔ یہاں ڈرائیور اور کلینر ناشتہ کرنے کے لیے ایک دکان میں چلے گئے۔ میں بوریوں کے درمیان میں سے سر نکالے انہیں دیکھ رہا تھا۔

وہاں ٹرک تقریباً" ایک گھنٹہ رکا رہا۔ وہاں سے چلا تو اگلے گاؤں میں بھی رک گیا۔ یہاں ٹرک پر مزید بوریاں لادی گئی۔ جب مزدور ٹرک پر بوریاں لاد رہے تھے تو میں بوریوں کے نیچے ایک طرف چھپ گیا تھا۔ یہاں سے ٹرک چلا تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔

ڈرائیور نے ٹرک روک لیا۔ بوریوں کے اوپر ترپال کھول کر ڈالی جانے لگی۔ جب ساری بوریوں پر ترپال پھیلا کر باندھ دی گئی تو کلینر نے کہا۔

"ٹھیک ہے دادا۔ چلو۔"

بوریوں کے اوپر ترپال ڈال دی گئی تھی۔ میں بھی اس کے سائے میں آگیا تھا۔ ترپال پر بارش کے قطروں کے گرنے کی آواز ٹرک کے شور میں مجھے صرف سنائی دیتی تھی۔ ایک مقام پر پہنچ کر یہ آواز تیز ہو گئی۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔ ٹرک گیلی سڑک پر مزید آہستہ ہو گیا تھا۔ بھوپال پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب جو بڑا شہر آ رہا ہے وہ بھوپال ہی ہے۔ ٹرک شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ بارش بہت ہلکی ہلکی ہو رہی تھی۔ میں نے فضا میں بو سونگھنے کے لیے سر اٹھایا اور اپنی زبان بار بار باہر لہرائی۔ مجھے یہ جان کر بڑی بڑی خوشی ہوئی کہ فضا میں میری بیوی جمیلہ کی بو کے ساتھ کمانڈو خالد کی بو بھی شامل تھی۔ اپنی بیوی کی بو محسوس کرتے ہوئے مجھے ایک روحانی خوشی مل رہی تھی۔ بیوی سے جدا ہوئے اگرچہ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا لیکن خوشی اس بات کی ہو رہی تھی کہ میں ایک بہت بڑی مصیبت سے نکل کر اپنی بیوی سے ملنے والا تھا۔

مگر جمیلہ شہر میں کمانڈو خالد کی کزن سسٹر کے ہاں مقیم تھی۔ میں سانپ کے روپ میں وہاں نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اپنی ساری توجہ اس طرف کر دی جس طرف سے کمانڈو خالد کی بو آ رہی تھی۔ یہاں سے مجھے اس کے خفیہ ٹھکانے کا راستہ معلوم نہیں تھا۔ ٹرک ایک جگہ موڑ کاٹنے لگا تو میں نے ٹرک سے چھلانگ لگا دی اور گیلی سڑک پر گرتے ہی تیزی سے رینگتا ہوا ایک طرف شام کے اندھیرے میں لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اس سمت کو چلنا شروع کر دیا جس سمت سے کمانڈو خالد کی بو آ رہی تھی اور جیسے جیسے میں آگے جا رہا تھا بو تیز ہوتی جا رہی تھی۔ خالد کی بو میری راہ نمائی کر رہی تھی۔ میں ایک باغ سے گزرا۔ پھر ایک پارک میں سے گزر گیا۔ اس کے بعد ریلوے لائن عبور کی۔ چار پانچ کھیتوں میں سے گزرا' سامنے ایک فیشن ایبل کالونی آگئی جہاں خوب روشنیاں ہو رہی تھیں۔ خالد کی بو ادھر ہی سے آ رہی تھی۔ میں کالونی سے ذرا ہٹ کر آگے نکل گیا۔ سامنے دور اونچی نیچی پہاڑیاں نظر آنے لگیں۔ میری بیوی کی بو مدہم ہو گئی تھی جب کہ خالد کی بو زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ میں گیلی زمین' گھاس' پتھروں اور جھاڑیوں میں سے جتنی تیزی سے گزر سکتا تھا گزرتا چلا جا رہا تھا۔

رات ہو گئی تھی لیکن میں اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے کچھ فاصلے پر ایک کھنڈر دکھائی دیا۔ یہ وہی بارہ دری تھی جس کے پیچھے کسی پرانی عمارت کے کھنڈر اور ٹیلے کے پہلو میں زمین کے اندر کمانڈو خالد اور اس کے ساتھیوں کا خفیہ ٹھکانہ تھا۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ آخر میں بارہ دری کے قریب سے ہوتا ہوا اندھیرے میں اس گڑھے میں اتر گیا جہاں ایک جانب جھاڑیوں کے اندر سے خفیہ ٹھکانے کو راستہ جاتا تھا۔ یہاں میں نے دو مجاہدوں کو ایک طرف چھپ کر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے پاس سٹین گنیں بھی تھی۔ وہ گارڈ ڈیوٹی پر تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں اندھیرے میں انہیں کہاں نظر آ سکتا تھا۔ میں جھاڑیوں کے اندر سے ہو کر تہہ خانے میں اتر گیا۔ مجھے معلوم تھا مجھے کہاں جانا ہے۔ کمانڈو خالد کی بو بتا رہی تھی کہ وہ کہاں ہو گا۔ میں چھوٹے حجرے کے باہر پہنچ کر ایک طرف دیوار کے ساتھ اندھیرے میں ہو گیا۔ ایک مجاہد حجرے میں سے باہر نکل رہا تھا۔

جب وہ چلا گیا تو میں حجرے میں داخل ہو گیا۔

کمانڈو خالد دری پر بیٹھا لالٹین کی روشنی میں ایک کاغذ ہاتھ میں لیے کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی اسے سلام کیا تو اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"کرم داد تم ہو؟"

میں نے کہا۔

"ہاں کمانڈو! میں کرم داد ہی ہوں۔"

اس نے کاغذ دری پر ایک طرف رکھ دیا۔ اس دوران میں رینگتا ہوا اس کے قریب آ گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ سلامت واپس آ گئے۔ میں تو دعائیں مانگ رہا تھا۔ جمیلہ بھابی نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے اصل بات نہیں بتائی۔ یہی کہا کہ کرم داد دوسرے مجاہدوں کے ساتھ دو ایک دن میں واپس آ جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"مجھے تمہاری فکر تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بھی زندہ سلامت واپس پہنچ گئے۔"
کمانڈو خالد کہنے لگا۔

" دریا کی تیز موج نے مجھے تم سے الگ کر دیا تھا۔ ورنہ مجھے معلوم تھا کہ تم سانپ کی شکل میں میرے ساتھ ساتھ تیر رہے ہو گے۔ طوفانی موج مجھے بہاتی ہوئی کہاں سے کہاں لے گئی۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے زندہ سلامت بیٹھے ہیں۔ انٹیلی جینس والوں نے تو ہمیں پکڑوا دیا تھا اور اس بار میرے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔"

میں جمیلہ کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ میں نے خالد سے کہا۔

"کمانڈو کیا اس وقت جمیلہ سے میری ملاقات ہو سکتی ہے۔"

وہ ایک لمحہ غور کرنے کے بعد کہنے لگا۔

"اس وقت میں کسی مجاہد کو کمین گاہ سے باہر بھیجنے اور جمیلہ بھابی کو یہاں لانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ کل انشااللہ اس ضرور بلوا لوں گا۔"

اس کے بعد وہ دری پر سے کاغذ اٹھا کر اسے دوبارہ پڑھنے لگا۔ میں نے پوچھا۔

"کمانڈر! یہ کیا پڑھ رہے ہو؟"

اس نے آہستہ سے کہا۔

"کرم داد! ہمارے ایک اور امتحان کا وقت آ گیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا انڈین آرمی کی کسی ٹرین کو اڑانا ہے؟"

کمانڈو منظر خالد نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ابھی اس قسم کے امتحان کا وقت نہیں آیا۔ لیکن یہ امتحان بھی بڑا اہم اور ہمت طلب ہے۔"

میں نے کہا۔

"کمانڈر! اللہ کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کے لیے میں ہر وقت تیار ہوں۔ تم

حکم کرو۔ مجھے کیا کرنا ہو گا۔"

کمانڈو خالد نے کاغذ کا پرزہ میرے آگے کیا اور بولا۔

"یہ خط خفیہ اشاروں میں لکھا ہوا ہے۔ یہ ہماری تنظیم کا خفیہ کوڈ ہے۔ تم اسے نہیں پڑھ سکو گے مگر میں تمہیں اس کا مطلب سمجھاتا ہوں۔"

اس نے خط ایک طرف رکھ دیا اور بولا۔

"جموں سے ہمارے آدمی نے یہ خبر دلی پہنچائی ہے اور دلی سے ہمارے آدمی نے ٹیلی فون کے ذریعے خفیہ اشاروں میں یہ خبر ہم تک پہنچائی ہے۔"

"اس میں کیا لکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

کمانڈو خالد نے حجرے کے دروازے کی طرف دیکھا اور مجھے ایک طرف چھپ جانے کا اشارہ کیا۔ کوئی مجاہد آ رہا تھا۔ میں جلدی سے تکئے کے پیچھے ہو گیا ایک مجاہد چائے ٹرے میں لیے آ گیا۔ چائے کا ٹرے اس نے کمانڈو خالد کے سامنے رکھا اور واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں تکئے کے پیچھے سے نکل کر کمانڈو خالد کے سامنے آ گیا۔ وہ کہنے لگا۔

"چائے پیو گے؟"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے جلدی سے بتاؤ جموں سے کیا خبر آئی ہے۔"

کمانڈو خالد اپنی پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے بولا۔

"خبر ملی ہے کہ کشمیری حریت کانفرنس کے ایک لیڈر غلام حسین وائیں کو بھارتی ملٹری پولیس نے گرفتار کر لیا ہے اور اسے ہوشنگ آباد کے ٹارچر سینٹر میں لے جایا جا رہا ہے۔ ہوشنگ آباد کا ٹارچر سینٹر انسانوں کا بوچڑ خانہ ہے۔ وہاں جب کسی کشمیری حریت پرست کمانڈو کو گرفتار کر کے لیے جایا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے وہاں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ ہمارے کئی کشمیری حریت پرست وہاں شہید ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ہم صرف تین کشمیری حریت پرست مجاہدوں کو بچانے

میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انڈین ملٹری پولیس انتہائی رازداری اور زبردست سیکورٹی کے انتظام کے ساتھ کشمیری مجاہدوں کو قتل کرنے کے لیے ہوشنگ آباد کی قتل گاہ میں لے جاتی ہے۔ اس ٹارچر سینٹر میں اذیت دینے کے جدید ترین اور انتہائی تکلیف دہ آلات موجود ہیں۔ وہاں مجاہدوں کو وحشیانہ اذیتیں دی جاتی ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ اس کے بعد انہیں بجلی کے جھٹکے دے دے کر شہید کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے جموں کے خاص آدمی نے جان پر کھیل کر یہ اطلاع حاصل کی ہے کہ حریت پرست لیڈر غلام حسین وائیں کو بھارتی فوج نے گرفتار کر لیا ہے اور اب اسے ہوشنگ آباد پہنچایا جا رہا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"کشمیری حریت پرست لیڈر کو کس طرف سے اور کب ہوشنگ آباد لے جایا جائے گا اور یہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے۔"

خالد نے کہا۔

"ہوشنگ آباد یہاں سے بمبئے لائین پر زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ سارا علاقہ خطرناک جنگلوں والا علاقہ ہے۔ اس خط میں درج ہے کہ کشمیری لیڈر کو جموں سے فوجی ہیلی کاپٹر میں سوار کرا کر دلی کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔ دلی والے ہمارے آدمی نے بتایا ہے کہ آج رات اسے ہوشنگ آباد بذریعہ فوجی ہیلی کاپٹر روانہ کر دیا جائے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ آج رات کسی بھی وقت کشمیری حریت پرست لیڈر غلام حسین وائیں ہوشنگ آباد کے ٹارچر سینٹر پہنچ جائے گا۔"

میں نے کمانڈو خالد سے پوچھا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ ٹارچر سینٹر ہوشنگ آباد میں کس جگہ پر ہے۔ اس نے کہا۔

"ہمارے سارے کمانڈو اس ٹارچر سینٹر کو دیکھ چکے ہیں۔ مجھے اس کا سارا محل وقوع معلوم ہے۔ اب ہمیں اس ٹارچر سینٹر پر کمانڈو ایکشن کر کے اپنے کشمیری لیڈر کو وہاں سے نکالنا ہے۔ لیکن اس کے لیے بڑی احتیاط اور عقل کے ساتھ پلان بنانا ہو گا۔

کیونکہ ہوشنگ آباد ٹارچر سینٹر پر سیکورٹی کے زبردست انتظامات ہیں۔ اس سے پہلے ہم وہاں کمانڈو اٹیک کر کے اپنے تین کشمیری مجاہدوں کو نکال چکے ہیں۔ اس کمانڈو آپریشن کے لیے ہمیں کچھ ایسے ایمونیشن اور ہتھیاروں کی بھی ضرورت ہو گی جو ہمارے پاس نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ ہم ان ہتھیاروں کی فراہمی کا بندوبست کریں۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے اس سے کام لینا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"کمانڈر! تم فکر نہ کرو۔ جہاں تمہیں بڑے ہتھیاروں کی ضرورت ہو گی وہاں میں تمہارے کام آؤں گا۔ میں بڑی آسانی سے دشمن کے مشین گن مورچوں میں گھس کر ان کو ختم کر سکتا ہوں۔"

کمانڈو خالد کسی اہم نکتے پر غور کر رہا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"اس میں کوئی شک شبہ نہیں کہ تم اس آپریشن میں ہماری بہت مدد کر سکتے ہو۔ لیکن وہاں ہوشنگ آباد ٹارچر سینٹر میں انڈین آرمی کی پوری پلٹن مورچہ بند ہے جس میں تین انفنٹری کی کمپنیاں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ٹارچر سینٹر میں بڑے اہم کشمیری حریت پرستوں کو اگر وہ پکڑے جائیں تو لایا جاتا ہے اور ان سے پوچھ گچھ کر کے بڑی نتیجہ خیز معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں ہمیں اس مشن پر کس وقت روانہ ہونا چاہیے اور ہوشنگ آباد ہم کس طرح پہنچیں گے۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"میں نے اپنے پانچ تجربہ کار کمانڈو مجاہدوں کو الرٹ کر دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج رات کو ہم اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہو جائیں۔ ہماری پاس صرف ایک پرانی جیپ ہو گی۔ لیکن ہم جنگل میں شارٹ کٹ راستے پر سفر کریں گے اور صبح ہونے سے

پہلے پہلے ہوشنگ آباد پہنچ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"کمانڈو میں بالکل تیار ہوں۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"یہ میرے پانچوں کمانڈو مجاہد بڑے تجربہ کار کمانڈوز ہیں اور میں نے انہیں تمہارے بارے میں یہ بتا دیا ہے کہ تم انسان ہو' سابق کمانڈو ہو مگر ایک جوگی کے طلسم کی وجہ سے کبھی سانپ کی شکل اختیار کر لیتے ہو اور کبھی اپنی انسانی شکل میں واپس آجاتے ہو۔ اس مشن کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کمانڈوز کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔"

میں نے پوچھا۔

"ان پر اس انکشاف کا کیا ردعمل ہوا؟"

وہ بولا۔ "وہ بڑے حیران ہوئے۔ لیکن کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ ان کے سامنے سرفروشانہ مشن ہے۔ وہ صرف اپنے مشن کے بارے میں پوچھتے رہے۔ بہرحال تمہیں شامل کر کے ہم کل سات کمانڈو ہوں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مشن کے لیے اتنے ہی آدمی کافی ہیں۔ ابھی جو مجاہد چائے لے کر آیا تھا اس کو تمہارے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ تم یہیں بیٹھو۔ میں اپنے پانچوں کمانڈوز کو یہاں لے کر آتا ہوں۔"

کمانڈو منظر خالد اٹھ کر حجرہ نما کوٹھڑی سے نکل گیا۔ مجھے اپنی بیوی جمیلہ کا خیال آ گیا۔ اس کی ہلکی ہلکی بو مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اسی شہر میں تھی۔ میں بھی اسی شہر میں تھا۔ لیکن ہم ایک دوسرے سے ابھی مل نہیں سکتے تھے۔ میرے سامنے ایک اہم مجاہدانہ مشن تھا۔ مجھے اللہ کی راہ میں اس کے نام اور اس کے رسولؐ پاک کے نام پر اپنی جانیں قربان کرنے والے کشمیری مجاہدوں کے دشمنوں کے خلاف جنگ کرنی تھی۔ جہاد میں شامل ہونا تھا۔ اگر اس کمانڈو مشن میں سے زندہ نکل آیا تو جمیلہ سے بھی مل لوں گا۔ اگر شہید ہو گیا تو اللہ مالک ہے۔

کمانڈو خالد اندر آیا۔ اس کے ساتھ پانچوں مجاہد کمانڈوز بھی تھے۔ انہوں نے مجھے دری پر کنڈلی مار کر بیٹھے ہوئے دیکھا اور کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہ کیا۔ میں نے انہیں اسلام و علیکم کہا۔ انہوں نے وعلیکم السلام کہا اور دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ کمانڈو خالد میرے قریب بیٹھ گیا۔ وہ اپنے کمانڈوز کو مخاطب کر کے بولا۔

"غازیو! جیسا کہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے۔ انڈین ملٹری پولیس کشمیر کے سب سے بڑے حریت پرست اور مجاہد غلام حسین وائیں کو گرفتار کر کے ہوشنگ آباد کے ٹارچر سیل میں لا رہی ہے۔ بلکہ اس وقت تک وہ ٹارچر سیل میں پہنچ بھی چکی ہو گی۔ حریت پرست کشمیری لیڈر سے محض برائے نام پوچھ گچھ ہو گی۔ بھارتی ملٹری انٹیلی جینس انہیں یہاں اس لیے لائی ہے کہ اسے شہید کر دیا جائے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی یہاں کئی کشمیری مجاہدوں کو شہید کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد مقبوضہ کشمیر کی بھارتی فوجی ہائی کمان یہ افواہ پھیلا دے گی کہ کشمیری لیڈر مفرور ہو کر پاکستان یا آزاد کشمیر چلا گیا ہے۔ ہم یہاں اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ ہمیں کشمیری لیڈر اور کشمیری حریت پرست کو بھارتی فوج کے چنگل سے نکال کر لانا ہے۔ ہمارے وسائل محدود ہیں۔ ہوشنگ آباد کے ٹارچر سیل میں جیسا کہ آپ لوگ دیکھ چکے ہیں انڈین آرمی کی پوری پلاٹون تعینات ہے۔ چاروں طرف مشین گن پوسٹیں ہیں اور کانٹے دار باڑ لگی ہے۔ بھارتی فوج کے پاس اسلحے اور ہتھیاروں کی کمی نہیں ہے۔ ہمارے پاس پورے ہتھیار بھی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں اس معرکے کو سر کرنا ہے۔ اس مشن کو کامیاب بنانا ہے اور ٹارگٹ کو مار کر کشمیری لیڈر کو بھارتی درندوں کی قید سے نکال کر اپنے ساتھ لانا ہے۔ ہم سات آدمی اس خطرناک مشن پر جا رہے ہیں۔ کمانڈو کرم داد کے بارے میں تم سب جانتے ہو کہ وہ اگرچہ سانپ کی شکل میں ہے لیکن وہ انسان ہے۔ ایک بت پرست کے جادو نے اس پر اثر کر رکھا ہے جو انشاءاللہ جلدی دفع ہو جائے گا۔ کمانڈو کرم داد بھی اس مہم پر ہمارے ساتھ جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم میں سے کوئی زندہ واپس نہ آئے۔ لیکن ایک بات طے شدہ ہے کہ ہمیں کشمیری لیڈر کو ضرور رہا کرانا ہے خواہ ہم سارے

کے سارے مارے جائیں۔ اگر تمہارے دلوں میں کوئی ہچکچاہٹ یا شک ہو تو ابھی بتا دو۔"

کمانڈو خالد خاموش ہو گیا۔ بھوپال کے چاروں مجاہدوں نے بیک زبان ہو کر کہا کہ ان کے دل صاف ہیں۔ ان کے دلوں میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ کوئی شک و شبہ نہیں۔ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ پاک کے نام پر اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار ہیں اور وہ اپنی جان دے کر بھی کشمیری حریت پرست مجاہد کو ظالموں کے پنجے سے چھڑائیں گے۔ کمانڈو خالد نے بے اختیار کہا۔

"جزاک اللہ!"

پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کمانڈو کرم داد! کیا تم بھی تیار ہو؟"

میں نے فوراً کہا۔ "میں دل و جان سے تیار ہوں۔

کمانڈو خالد نے اپنے مجاہد کمانڈو ہارون سے کہا۔

"تم فوراً" جیپ میں ضروری ایمونیشن اور اسلحہ وغیرہ رکھ دو اور آکر رپورٹ کرو۔"

ہارون اسی وقت یس سر کہہ کر باہر نکل گیا۔

کمانڈو خالد نے کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا۔

"ابھی رات کے آٹھ بجے ہیں۔ اگر ہم نو بجے بھی نکل پڑتے ہیں تو گیارہ بجے سے پہلے ہوشنگ آباد کے جنگل میں اپنے ٹارگٹ پر پہنچ جائیں گے۔"

ان میں سے ایک مجاہد کمانڈو کا نام راشد تھا۔ اس نے کہا۔

"سر! ہمارے پاس ہینڈ گرنیڈ چھ سات ہی ہیں۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"اللہ مالک ہے۔ اگر ہینڈ گرنیڈ نہ بھی ہوتے تو ہمیں اس مہم پر ضرور نکلنا تھا اور اسے کامیاب بنانا تھا۔ یہ بتاؤ کہ ہمارے پاس لائیٹ مشین گنیں کتنی ہیں؟"

کمانڈو راشد نے کہا۔

"اس وقت صرف چار لائیٹ مشین گنیں ہیں۔ میگزین کی آٹھ بیلٹیں ہیں۔"

"یہ کافی ہیں۔ باقی ہمارے پاس سٹین گنیں ہوں گی۔ سلینسر والے پستول ہوں گے اور کمانڈو چاقو بھی ہوں گے۔ اگر ہم نے سوچ سمجھ کر اور منصوبہ بندی سے کام لیا تو انشااللہ ہم اس مہم میں ضرور کامیاب ہوں گے۔"

"انشااللہ۔" میں نے کہا۔

کمانڈو ہارون نے آکر بتایا کہ اس نے جیپ میں لائیٹ مشین گنیں میگزین کے پٹے اور سٹین گنیں وغیرہ رکھ دی ہیں۔ کمانڈو خالد نے ایک بار پھر گھڑی پر وقت دیکھا اور بولا۔

"ہم ٹھیک پندرہ منٹ بعد یہاں سے نکل پڑیں گے۔ پندرہ منٹ میں ضروری تیاری کر لو۔"

پانچوں مجاہد کمانڈو اٹھے اور ایک دوسرے کے پیچھے حجرے سے نکل گئے۔ میں نے خالد سے کہا۔

"کمانڈر! کسی کے ہاتھ جمیلہ کو پیغام پہنچا دینا کہ میں اس مہم پر تمہارے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"جمیلہ بھابی کو پیغام پہنچ جائے گا۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔"

اس کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد پانچوں کمانڈو اپنے کمانڈر خالد کی قیادت میں تیار ہو کر خفیہ ٹھکانے سے باہر آ گئے۔ مجھے خالد نے اپنی سیاہ کمانڈو جیکٹ کے کالر کے اندر اس طرح چھپا رکھا تھا کہ میرا سر کالر سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اور میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھے کمانڈو خالد نے اس پوزیشن میں اس لیے رکھا تھا کیونکہ میں سانپ ہونے کی حیثیت میں رات کے اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ پرانی جیپ جس پر درختوں کی شاخیں ڈال کر اسے کیموفلاج کیا گیا تھا' پرانی بارہ دری کے کھنڈر کے پاس کھڑی تھی۔ یہ لوگ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے جیپ کے پاس آئے۔ جیپ میں رکھی ہوئی سٹین

گنیں ایک ایک کر کے اٹھالیں اور اپنے کندھوں سے لٹکا لیں۔ یہ چھ کے چھ کمانڈو ایک ہی قسم کی سیاہ جیکٹوں سیاہ پرانی پتلونوں میں ملبوس تھے۔ سروں پر سیاہ رومال باندھے ہوئے تھے۔ چار لائیٹ مشین گین جیپ میں رکھی ہوئی تھیں۔ کمانڈو خالد نے کمانڈو ہارون کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی سیلف دبایا اور جیپ ایک دھچکے کے ساتھ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔ بڑی سڑک پر آتے ہی جیپ کی رفتار تیز ہو گئی۔ دس منٹ میں ہم بھوپال شہر سے نکل آئے تھے اور جیپ بھوپال سے ناگ پور جانے والی سڑک پر فل سپیڈ سے دوڑتی جا رہی تھی۔

بارش رک گئی تھی۔ میں کمانڈو خالد کی جیکٹ کے کالر کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہوا تھا اور سامنے دیکھ رہا تھا۔ مجھے دور تک سڑک اندھیرے میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں کمانڈو خالد کو بتاتا جارہا تھا کہ سڑک پر دور تک کوئی فوجی یا سویلین گاڑی نظر نہیں آ رہی۔ ہم نے دو تین گاڑیوں کو کراس کیا۔ دو تین پلوں پر سے گزرے۔ ہمارے دائیں بائیں جنگل شروع ہو گیا تھا۔ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ راستے میں کوئی چیک پوسٹ بھی نہیں تھی۔ ہم بڑی بے فکری اور آزادی سے چلے جا رہے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دور سے ہمارے دائیں جانب روشنیاں ٹمٹماتی نظر آئیں تو خالد نے مجھے کہا۔

"یہ ہوشنگ آباد کی روشنیاں ہیں۔ ہم ہوشنگ آباد پہنچ گئے ہیں۔"

ایک جگہ سے اس نے گاڑی بائیں طرف موڑ کر ایک چھوٹی اور کچی سڑک پر ڈال دی۔ کہنے لگا۔

"یہ سڑک ہمیں ہوشنگ آباد کے جنگل میں لے جائے گی۔"

ہوشنگ آباد کے جنگل رات کے وقت بہت زیادہ ہیبت ناک لگ رہے تھے۔ کہیں سڑک اتنی تنگ ہو جاتی تھی کہ درختوں کی شاخیں جیپ کی ونڈ سکرین سے ٹکرا ٹکرا کر پیچھے جاتیں۔ کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون اپنے سر نیچے کر لیتے۔ ایک جگہ جیپ روک دی گئی۔ کمانڈو خالد اور ہارون نیچے اتر آتے اور ایک طرف درختوں میں جاتی

پگڈنڈی کو دیکھنے لگے۔ خالد نے مجھ سے کہا۔

"کرم داد! اب آگے تم ہمیں گائیڈ کرو گے۔ یہ دیکھو کہ آگے اندھیرے میں تمہیں کوئی خاص شے تو دکھائی نہیں دیتی؟"

میں جیکٹ کے کالر کے اندر چمٹا ہوا تھا۔ وہاں سے نکل کر میں خالد کے کاندھے میں پر بیٹھ گیا۔ میں نے جنگل کے درختوں کی طرف اندھیرے میں دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں کمانڈو! آگے سوائے درختوں اور جھاڑیوں کے اور کچھ نہیں ہے۔"

تمام کمانڈوز نے اپنی اپنی سٹین گنیں لٹکا رکھی تھیں۔ ایک مجاہد کے دونوں کاندھوں پر لائیٹ مشین گین تھیں۔ یہ کمانڈو پارٹی گھنے جنگل میں داخل ہو گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑے ہی گھنے اور تاریک جنگل تھے۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ مجھے بھی دیکھنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے قطار بنا کر چل رہے تھے۔ سارے کمانڈو اس راستے سے واقف تھے۔ کمانڈو خالد نے ایک جگہ رک کر دھیمی آواز میں کہا۔

"ٹارگٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ اس کے بعد آپس میں بات چیت نہیں ہو گی۔ کوئی سگریٹ بیڑی نہیں پیئے گا۔ کوئی نہیں کھانسے گا۔ کوئی نہیں چھینکے گا اگر کوئی شہید ہو گیا تو اسے کوئی اٹھانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو فوراً ہی شہید ہو جائے گا۔ زخمی خود یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے گا۔ اگر کوئی پکڑا گیا تو مر جائے گا مگر ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ گو۔"

پانچوں کمانڈو ہم سے ذرا ہٹ کر دائیں ہو کر بڑے احتیاط سے آگے کو چل پڑے۔ خالد ان کے آگے آگے تھا اور میں جنگل کی تاریکی میں اس کی راہ نمائی کر رہا تھا اور اسے اپنی انسانی آواز میں بتاتا جا رہا تھا۔ کہ آگے کیا کچھ ہے۔ ایک درخت کے نیچے آکر خالد نے ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ اس کے پیچھے آنے والے کمانڈو رک گئے۔ پھر

آہستہ آہستہ چل کر اس کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ کمانڈو خالد نے سرگوشی میں کہا۔

"تین ایک طرف۔ اور دو ایک طرف۔ گو۔ GO>

فوراً" تین کمانڈو ہماری ایک جانب اور دو کمانڈو ہماری دوسری طرف ہو کر چار چار قدم کا فاصلہ ڈال کر آگے بڑھنے لگے۔ کمانڈو ہارون کمانڈو خالد کے ساتھ تھا۔ خالد نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا۔

"کرم داد! آگے کوئی گشتی سنتری تو نظر نہیں آ رہا۔"

میں نے سانپ کی نگاؤں سے اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"نہیں۔"

دس پندرہ قدم چلنے کے بعد ہاتھ اوپر کر کے دائیں بائیں لہرایا۔ تمام کمانڈو رک گئے۔ جس کمانڈو کے پاس چاروں لائیٹ مشین گنیں تھیں وہ دوڑ کر خالد کے پاس آ گیا۔ خالد نے اس کو سرگوشی میں کہا۔

"ہمارے پیچھے' ہمارے پیچھے۔"

کمانڈو فوراً" کمانڈو خالد اور ہارون کے پیچھے ہو گیا۔ یہاں درخت اتنے گنجان تھے کہ راستہ نہیں مل رہا تھا۔ یہاں کوئی راستہ تھا بھی' نہیں،راستہ بنانا پڑ رہا تھا۔ یہ احتیاط بھی کرنی پڑ رہی تھی کہ قدموں کی آہٹ پیدا نہ ہو۔ بارش کی وجہ سے گھاس اور پتے گیلے تھے اور ان پر پاؤں پڑتا تو آواز پیدا نہیں ہوتی تھی لیکن غلطی سے کسی پتھر پر پاؤں پڑتا تھا تو پھسل جاتا تھا اور آواز پیدا ہوتی تھی۔ اس لیے ہماری کمانڈو پارٹی پاؤں دبا دبا کر چل رہی تھی۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔

"ہالٹ"

کمانڈو خالد وہیں رک گیا۔ کمانڈو ہارون بھی رک گیا۔ ہمیں دیکھ کر ہمارے دائیں بائیں ہٹ کر درختوں میں چلنے والے ہمارے ساتھی بھی وہیں رک گئے۔ میں نے خالد کے کان میں کہا۔

"تین درخت چھوڑ کر چوتھے درخت کے پاس مجھے ایک آدمی نظر آ رہا ہے۔ وہ

اندھیرے میں کھڑا پیچھے کو دیکھ رہا ہے۔"

کمانڈو خالد اور ہارون وہیں بیٹھ گئے۔ ہمارے دوسرے ساتھی بھی جھاڑیوں کی اوٹ میں پوزیشن لے کر بیٹھ گئے۔ کمانڈو خالد نے سرگوشی میں پوچھا۔

"کیا یہ فوجی ہے؟"

میں نے سانپ کی آنکھوں سے بڑے غور سے دیکھا اور سرگوشی میں کہا۔

"ہاں۔ اس نے فوجی وردی پہن رکھی ہے۔ اب ایک اور آدمی درختوں سے نکل کر اس کے پاس آ گیا ہے۔ وہ بھی فوجی وردی میں ہے۔"

کمانڈو خالد اور ہارون بھی جھک کر بیٹھے اندھیرے میں آنکھیں کھولے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر اس اندھیرے میں صرف ایک سانپ ہی دیکھ سکتا تھا۔ انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"اب دونوں فوجی بائیں طرف درختوں میں چلے گئے ہیں۔"

دونوں کمانڈو چپ تھے۔ مجھے ان کے سانسوں کے چلنے کی آواز صرف سنائی دے رہی تھی۔ دو تین سیکنڈ کے بعد خالد نے آہستہ سے پوچھا۔

"کوئی اور فوجی بھی ہے؟"

میں نے کہا۔

"کوئی نہیں ہے۔"

خالد نے کمانڈو ہارون سے سرگوشی کی۔

"دائیں بائیں لائیٹ مشین گن پوسٹیں لگا دو۔ کوئیک۔"

یہ سنتے ہی کمانڈو ہارون جھک کر تیزی سے اپنے ساتھیوں کی طرف نکل گیا جو دائیں بائیں درختوں کی آڑ لے کر پوزیشن لیے ہوئے تھے۔ چونکہ میں اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بائیں جانب دو کمانڈو اٹھے اور ایک سیدھی قطار میں پندرہ پندرہ قدم کا فاصلہ ڈال کر لائیٹ مشین گنیں رکھ کر ان کے پیچھے اوندھے ہو کر لیٹ گئے۔ اسی طرح دائیں جانب جو ہمارے تین کمانڈو ساتھ تھے ان میں سے بھی دو

کمانڈو جھک کر مخالف سمت میں تیز تیز دوڑے اور پندرہ سولہ قدموں کا فاصلہ ڈال کر لائیٹ مشین گنوں کو سامنے رکھ کر پوزیشنوں میں لیٹ گئے۔ کمانڈو ہارون اس طرح جھک کر دبے پاؤں چلتے ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"ان پوزیشن سر!"

کمانڈو خالد نے ہارون کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور دونوں جھک کر آہستہ آہستہ ان درختوں کی طرف بڑھنے لگے جدھر میں نے انہیں بتایا تھا کہ دو فوجی ایک طرف گئے ہیں۔ ان درختوں سے کوئی پانچ قدم پیچھے خالد اور ہارون زمین پر پیٹ کے بل لیٹ گئے۔ ان کی سٹین گنوں کا رخ درختوں کی طرف تھا جہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مگر میں انہیں سرگوشی میں اوپی کی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہوئے بتا رہا تھا کہ درختوں کے پاس کوئی بھارتی فوجی نہیں ہے۔ یہ سن کر دونوں رینگ رینگ کر آگے چل پڑے۔ درختوں کے نیچے آکر وہ رک گئے اور سٹین گنوں کا رخ اس طرف کر دیا جس طرف وہ دونوں فوجی گئے تھے۔ میں خالد کے منہ کے بالکل قریب تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"کرم داد! آگے دیکھو۔"

میں نے کہا۔

"آگے کچھ فاصلے پر خاردار تار کی دیوار ہے۔"

کمانڈو خالد نے ہارون سے کہا۔

"چاقو نکال لو"

ان دونوں نے اپنی اپنی سٹین گنیں پیٹھ پر ڈال دیں اور پتلون کی جیبوں میں بڑے کمانڈو چاقو نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ خالد نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔

"دونوں نائیٹ پڑول پارٹی کے سنتری تھے۔ کرم داد! تم آگے جا کر ریکی کرو اور آ کر بتاؤ، خار دار دیوار کہاں تک خالی ہے۔"

میں نے کہا۔

"ویلر، سر!"

اور فوراً خالد کی جیکٹ کے کالر میں سے نکل کر اس کے کندھے پر سے نیچے گھاس پر آگیا اور جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان رینگتا ہوا خاردار تاروں والی دیوار کی طرف چل پڑا۔ میں دیوار سے کوئی دس بارہ گز ابھی دور تھا کہ اچانک مجھے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو خوف سے میرا جسم سرد پڑ گیا۔



سومنات کے بُت شکن



اے حمید



انڈین فوجی نے مجھے خاردار تاروں کے پاس گھاس میں رینگتا دیکھ لیا تھا۔

خدا جانے اس نے مجھے رات کے اندھیرے میں کیسے دیکھ لیا تھا۔ جب میں نے اپنے پیچھے فوجی بوٹوں کی دھمک سن کر پلٹ کر دیکھا تو میرا جسم خوف سے سرد پڑ گیا۔ بھارتی فوجی کا بھاری بوٹ والا پاؤں مجھے کچلنے کے لیے مجھ پر پڑنے ہی والا تھا۔ میں تڑپ کر ایک طرف ہوگیا۔ بھارتی فوجی جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور جھک کر مجھے گھاس میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس دوران میں اس کے پیچھے آ چکا تھا۔ اس کے عقب میں آتے ہی میں اچھل کر اس پر چڑھ گیا اور اس کی گردن پر ڈس دیا۔ کوئی ذی روح میرے زہر کا ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے سے زیادہ متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ انڈین فوجی وہیں ایک طرف کو گر گیا۔ اس کے گرنے سے آواز پیدا ہوئی تھی۔ یہ آواز مجھ سے چند قدم پیچھے پوزیشن میں بیٹھے کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون نے بھی ضرور سنی ہوگی مگر وہ اپنی پوزیشنوں پر بیٹھے رہے۔ ان کی طرف سے کسی قسم کی کوئی حرکت نہ ہوئی تھی۔

یہ بات میرے علم میں تھی کہ یہاں کیمپ میں دو بھارتی سنتری رات کی پٹرول ڈیوٹی پر تھے۔ میں نے اور کمانڈو خالد نے ان دونوں کو اندھیرے میں خاردار تاروں کے پاس درختوں کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا۔ میں آگے دیکھ بھال اور ریکی کے لیے جانے کی

بجائے وہیں گھاس میں بیٹھا رہا۔ مجھے دوسرے بھارتی سنتری کا انتظار تھا۔ اسے اسی طرف سے ضرور آنا تھا۔ یہ دونوں رات کی پٹرول ڈیوٹی پر تھے۔

اتنے میں پیچھے درختوں کی طرف سے جہاں اندھیرا تھا کسی کی آواز آئی۔

"لکا رام! کہاں ہے بے تو۔"

درختوں کے اندھیرے میں سے دوسرا بھارتی سنتری نکل کر اس طرف آیا جہاں اس کے ساتھی کی لاش پڑی تھی۔ میں اسے اتنا موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنے ساتھی کی لاش دیکھ کر کیمپ گیٹ کے گارڈز کو آواز دے سکے۔ اس کا مطلب ہمارے مشن کی تباہی ہی نہیں تھا بلکہ ہم میں سے ایک بھی زندہ نہ بچ سکتا تھا۔ دوسرا سنتری ذرا آگے آیا تو میں اس کے دائیں جانب ہوگیا۔ وہ ابھی لاش تک نہیں پہنچا تھا کہ میں نے دیکھا کہ وہ ایک دم جھک گیا ہے۔ شاید اسے اپنے ساتھی کی لاش اندھیرے میں نظر آگئی تھی۔ جھکنے سے وہ میرے لیے بڑا آسان ٹارگٹ بن گیا تھا اور اس کی گردن مجھے صاف نظر آنے لگی تھی۔ میں تیزی سے اچھل کر اس کی گردن میں چمٹا اور فوراً گردن میں ڈس کر زہر اس کی شہ رگ میں داخل کر دیا۔

اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔ وہ بغیر آواز نکالے وہیں گر پڑا۔ میں تیزی سے رینگتا ہوا پیچھے کمانڈو خالد کی پوزیشن پر گیا۔ کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون پیٹ کے بل لیٹے سٹین گنیں سیدھی کیے ہوئے تھے۔ میں نے دھیمی انسانی آواز میں کمانڈو خالد کو سارا ماجرا بیان کیا۔ وہ بولا۔

"آگے جاؤ کرم داد آگے جاؤ' معلوم کرو کشمیری لیڈر کا ٹارچر سیل کہاں ہے۔ گو۔"

میں وہیں سے واپس ہوگیا۔ میں جتنی تیز رینگ سکتا تھا' رینگتا ہوا دونوں بھارتی فوجیوں کی لاشوں کے درمیان سے گزرتا ہوا کیمپ کی خاردار تاروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ آگے مجھے خاردار تاروں والی دیوار کی اندر کی جانب فوجی بیرکیں دکھائی دیں۔ یہ دو چھوٹی بیرکیں تھیں۔ ان کے باہر بلب روشن تھے اور ایک ایک فوجی گارڈ پہرے

پر موجود تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اور آپ کو علم ہی ہو گا ہمارا مشن کشمیری حریت پرست لیڈر وائیں کو اس بھارتی فوجی کیمپ سے نکال کر اپنے ساتھ لے جانا تھا۔

یہ بھارتی فوجی کیمپ اپنے ہولناک مظالم کی وجہ سے بڑا بدنام ٹارچر سیل تھا جہاں مقبوضہ جموں کشمیر سے کشمیری حریت پرست مجاہدوں' کمانڈوز اور لیڈروں کو گرفتار کر کے انیٹروگیشن کے لیے لایا جاتا تھا اور ایسی ایسی وحشیانہ اور غیر انسانی اذیتیں دی جاتی تھیں کہ کوئی بھی کشمیری مجاہد یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکتا تھا۔ یہ ہولناک ٹارچر سیل ضلع ہوشنگ آباد کے ایک گنجان جنگل میں انڈین آرمی نے بنایا ہوا تھا جہاں پونا ہارس کی دو کمپنیاں تعینات تھیں۔ اس کیمپ کے ٹارچر سیل میں ایسے کشمیری حریت پرستوں کو لایا جاتا تھا جن کے بارے میں مقبوضہ کشمیر کی انڈین آرمی کو یقین ہوتا تھا کہ ان سے بے حد مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

چنانچہ کشمیری حریت پرست لیڈر غلام حسین وائیں کو بھی اسی لیے یہاں لایا گیا تھا۔ کشمیری لیڈر کا یہاں سے زندہ واپس جانا ناممکن تھا۔ ہمارا کمانڈو مشن اسے یہاں سے نکالنا اور ہو سکے تو اس بھارتی ٹارچر سیل کو تباہ کرنا تھا۔ پیچھے درختوں میں ہمارے تین کمانڈو ایک طرف اور دو کمانڈو دوسری طرف لائیٹ مشین گنوں کے ساتھ پوزیشنوں میں تھے۔ ان کے درمیان کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون سٹین گنوں کے ساتھ الرٹ تھے۔ میں یہ معلوم کرنے آگے جا رہا تھا کہ کشمیری لیڈر کو جس ٹارچر سیل میں رکھا گیا ہے وہ کہاں ہے۔ اس کی پوزیشن کیا ہے اور وہاں کس طرف سے کمانڈو اٹیک کیا جا سکتا ہے۔ میں اس لیے بھیجا گیا تھا کہ میں سانپ کے روپ میں تھا۔ اگر انسانی شکل میں ہوتا تو شاید میری جگہ کمانڈو خالد خود ریکی پر آتا۔ مجھے دیکھ بھال کی ڈیوٹی پر بھیجتے ہوئے یہ خطرہ بھی مول لیا گیا تھا کہ میں کسی بھی وقت سانپ سے انسانی شکل میں واپس آ سکتا تھا جیسا کہ آپ پچھلی کتاب میں پڑھ چکے ہیں۔ جب سے مجھے زمین میں دفن کیے جانے کے بعد ایک عجیب و غریب سانپ نے کاٹا تھا' میری سانپ کے روپ میں رہنے کی مدت میں حیرت انگیز اضافہ ہو چکا تھا۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ دوسرے تیسرے

روز مجھے جھٹکا سا لگتا تھا اور میں سانپ کی شکل میں ہوتا تھا تو اپنی انسانی شکل میں اور اگر انسان کے روپ میں ہوتا تو سانپ کے روپ میں تبدیل ہوجاتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا عذاب تھا جس میں، میں مبتلا تھا۔ میری بیوی جمیلہ بھی سخت پریشان تھی جو بھوپال میں کمانڈو خالد کی کزن کے گھر میری واپسی کا انتظار کر رہی تھی اور میرے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھ پر یہ عذاب ایک سپیرے کے طلسم کی وجہ سے نازل ہوا تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ مجھے اس عذاب سے کب اور کیسے نجات ملتی ہے۔ اس مشن کے بعد میرا پروگرام کلکتے جا کر ان مکتی باہنی والوں کو ٹھکانے لگانا تھا جنہوں نے سانحہ مشرقی پاکستان کے وقت سینکڑوں غیر بنگالی مسلمانوں کو اذیتیں دے دے کر قتل کیا تھا اور ان کی عورتوں کو اغوا کر کے مغربی بنگال لے جا کر فروخت کردیا تھا۔ ان میں میری بیوی جمیلہ بھی شامل تھی۔ جمیلہ کو تو میں نے برآمد کر لیا تھا لیکن دوسری بدنصیب غیر بنگالی عورتوں کو کافروں کی قید سے رہائی دلانا ابھی باقی تھا۔ ان کو برآمد کر کے انہیں اپنے ساتھ پاکستان لے جانا میرے مشن کا آخری ایکشن تھا۔ لیکن ابھی ہمارے سامنے صرف ایک ہی مشن تھا کہ کشمیری لیڈر غلام حسین وائیں کو انڈین آرمی کے ٹارچر سیل سے رہائی دلا کر واپس کشمیر پہنچایا جائے۔ اسی مشن پر ہم لوگ اپنی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ہوشنگ آباد کے جنگل کے آرمی ٹارچر سیل میں آئے تھے۔

خاردار تاروں والی پانچ چھ فٹ اونچی دیوار کی دوسری جانب آمنے سامنے والی دونوں بیرکوں کے باہر دو بھارتی فوجی گارڈ ڈیوٹی پر کھڑے تھے۔ بیرکوں کے باہر بلب روشن تھے۔ ایک جانب کونے میں دو فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ ان دونوں بیرکوں میں ٹارچر سیل کہاں ہے۔ رات گزر جا رہی تھی۔ ہمیں دن نکلنے سے پہلے پہلے اپنا مشن مکمل کر کے کشمیری لیڈر کو ساتھ لے کر یہاں سے بھوپال کی طرف نکل جانا تھا۔ جو فوجی سنتری پٹرول ڈیوٹی پر ہوتے ہیں انہیں کوئی بھی کمانڈو پارٹی کبھی ہلاک نہیں کرتی کیونکہ انہیں ایک مقررہ وقت کے بعد اپنی پوسٹ پر واپس رپورٹ کرنی ہوتی ہے اور ان کی جگہ دوسری پٹرول پارٹی کو ڈیوٹی سنبھالنی ہوتی ہے۔ میں نے

دونوں گشتی سنتریوں کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ میں نے انتہائی مجبوری کی حالت میں ایسا کیا تھا۔ اس انڈین پٹرول پارٹی کو زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے بعد اپنی پوسٹ پر جا کر رپورٹ کرنی تھی۔ ہمارے پاس صرف آدھا گھنٹہ ہی تھا۔ اس عرصے میں ہمیں ٹارچر سیل کا بھی کھوج لگانا تھا اور وہاں سے کشمیری لیڈر کو بھی نکالنا تھا۔ اس حقیقت کا احساس میرے علاوہ کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون کو بھی تھا۔

میں وقت ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں نے دل میں خدا کو یاد کیا اور رینگتا ہوا خاردار تاروں میں سے دوسری طرف نکل گیا اور جو فوجی بیرک میرے سامنے تھی اس کی عقبی دیوار کی طرف چلنے لگا۔ میں نے اندھیرے میں دیوار کو اوپر تک دیکھا۔ سانپ کے روپ میں ہونے کی وجہ سے میں اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ دیوار میں کسی جگہ کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ دیوار کے اوپر جا کر بیرک کی چھت کے قریب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو روشندان بنے ہوئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس بیرک میں دو کمرے ہیں۔ میں دیوار پر رینگتا ہوا ایک روشندان کے پاس آ گیا۔ روشندان پر اندھیرا چھایا ہوا تھا اندر کوئی بلب وغیرہ روشن نہیں تھا۔ روشندان پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور یہ روشندان اتنا چھوٹا تھا کہ کسی آدمی کے اس میں سے گزرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے گردن سلاخوں میں ڈال کر اندر دیکھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اندھیرے میں دیکھا کہ چھوٹی سی بیرک تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چار پانچ چارپائیاں بچھی تھیں جن پر فوجی مچھر دانیاں لگائے سو رہے تھے۔ وہاں ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں دیوار پر رینگتا ہوا دوسرے روشن دان کے پاس آ گیا۔ یہاں بھی روشندان میں موٹی سلاخیں لگی تھیں اور اندھیرا تھا۔ میں نے گردن سلاخوں میں سے نکال کر دیکھا۔ یہاں بھی چارپائیوں پر انڈین فوجی سو رہے تھے۔ میں دیوار سے نیچے اتر آیا۔ اب مجھے سامنے والی بیرکوں کی طرف جانا تھا۔

میں اندھیرے میں سے رینگتا ہوا دوسری بیرکوں کی عقبی دیوار کے پاس آ گیا۔ اس دیوار کے اوپر بھی دو روشندان تھے۔ پہلے روشندان کے پاس جا کر دوسری طرف

جھانک کر دیکھا یہاں بھی فوجی سو رہے تھے۔ دوسرے روشندان کی طرف چلا آیا۔ دوسرے روشن دان کی سلاخوں میں سے گردن نکال کر دیکھا تو مجھے اندھیرے میں ایک آدمی زمین پر اوندھا پڑا نظر آیا۔ وہ اس حالت میں پڑا تھا جیسے اسے زدوکوب کرنے کے بعد وہاں پھینک دیا گیا ہو۔ مجھے شک ہوا کہ ہو سکتا ہے یہی ہمارا کشمیری لیڈر غلام حسین وائیں ہو۔ میں دیوار پر رینگ کر بیرک کے اندر چلا گیا۔ بیرک میں کوئی فوجی نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ فرش پر رینگتے ہوئے اوندھے پڑے آدمی کے پاس آگیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی کالی شرعی داڑھی تھی۔ ایک آنکھ کے پاس خون جما ہوا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کشمیری لیڈر کو نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ یہی ہمارا مجاہد کشمیری لیڈر غلام حسین وائیں ہے لیکن اس کے باوجود میں اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اگر وہ سو رہا ہے تو اسے جگاؤں اور انسانی آواز میں اس سے پوچھوں کہ اس کا نام کیا ہے۔ لیکن یہ خدشہ بھی تھا کہ کشمیری لیڈر پر ایک سانپ کو انسانی آواز میں بولتے دیکھ کر اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ بہرحال مجھے ہر حالت میں یہ تصدیق ضرور کرنی تھی میں نے آہستہ سے آواز دے کر کہا۔

"وائیں صاحب! وائیں صاحب!"

وہ آدمی اسی طرح پڑا رہا۔ پہلے تو مجھے خیال آیا کہ شاید یہ شخص بے ہوش ہے لیکن جب میں نے اس کے کان کے پاس جا کر اسے آواز دی تو اس نے نحیف آواز میں کہا۔

"چلے جاؤ۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ جتنا ٹارچر کرنا ہے کر لو۔"

میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"آپ کا نام غلام حسین وائیں ہے؟"

تب اس شخص نے سر اٹھایا اور اندھیرے میں دائیں بائیں دیکھا۔

"تم کون ہو؟"

اتنے میں باہر کسی فوجی ٹرک کے کھڑے ہونے اور پھر فوجی بوٹوں کے دروازے

کی طرف بڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں جلدی سے دیوار کی طرف دوڑا۔ دروازہ کھل گیا۔ بیرک کے دروازے کے اوپر جو بلب جل رہا تھا اس کی روشنی اندر آنے لگی۔ چھ سات فوجی اندر داخل ہوگئے۔ میں تیزی سے رینگتا ہوا دیوار پر چڑھ کر روشندان کی سلاخوں میں آکر چھپ گیا اور نیچے دیکھنے لگا۔ ایک فوجی نے بجلی کا بٹن دبایا، کمرہ روشن ہوگیا۔ ایک فوجی آگے آگے تھا۔ وہ کیپٹن یا میجر ہوگا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ اس نے فائل کھول کر کچھ پڑھا اور فرش پر اوندھے پڑے کشمیری لیڈر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"کیا یہ ہوش میں ہے؟"

دو فوجی جلدی سے آگے بڑھے۔ انہوں نے کشمیری لیڈر کو بازوؤں سے پکڑ کر بٹھا دیا۔ کشمیری لیڈر کا سر ڈول رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ماتھے پر بھی خون جما ہوا تھا۔ لگتا ہے کہ اسے وحشیانہ اذیت کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ فوجی افسر نے پوچھا۔

"تمہارا نام غلام حسین وائیں ہے؟"

کشمیری لیڈر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا' یہ ادھیڑ عمر لیڈر تھا۔ روشنی میں میں نے دیکھا کہ اس کے سر اور داڑھی کے بال اکثر سفید ہو رہے تھے۔ جسم پر سوائے ایک بوسیدہ سی قمیض' شلوار کے اور کچھ نہیں تھا۔ بھارتی فوجی افسر نے دوسری بار کرخت آواز میں اپنا سوال دہرایا تو ایک فوجی نے کشمیری لیڈر کا سر سختی سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میجر صاحب تم سے پوچھ رہے ہیں' جواب دو۔"

کشمیری لیڈر نے آہستہ سے کہا۔

"میں ہی غلام حسین ہوں۔"

بھارتی فوجی افسر نے فائل بند کرتے ہوئے اپنے ساتھی فوجی سے کہا۔

"اس کو نیچے لے چلو۔"

دونوں فوجی کشمیری لیڈر کو گھسیٹتے ہوئے بیرک سے باہر لے گئے۔ فوجی افسر پہلے

ہی باہر نکل چکا تھا۔ بیرک کی بتی جلتی رہنے دی گئی۔ دروازہ بند کردیا گیا۔ میں تیز تیز رینگتا ہوا بیرک کی چھت پر آگیا۔ چھت کی دوسری طرف جا کر منڈیر پر سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ دو فوجیوں نے کشمیری لیڈر کو باہر زمین پر رکھے ایک سٹریچر پر ڈالا۔ سٹریچر کو اٹھایا اور دوسری بیرک کی طرف چل پڑے۔ باقی فوجی بھی اپنے آفیسر کے ساتھ اسی طرف چل پڑے۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ لوگ کشمیری لیڈر کو کہاں لے جا رہے ہیں۔ میں کونے کی طرف چھت سے نیچے اتر آیا اور ذرا ہٹ کر اندھیرے میں اس طرف چلنے لگا جدھر فوجی کشمیری لیڈر کو لے کر گئے تھے۔ وہ اسے سامنے والی بیرک میں لے گئے۔ میں ان کے پیچھے بیرک میں نہیں جا سکتا تھا کیونکہ وہاں روشنی تھی اور میں نظر آسکتا تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے کام لیا اور دیوار پر سے ہو کر بیرک کے روشندان میں آگیا۔ اندر سر ڈال کر دیکھا اس دوران فوجی بیرک میں آ چکے تھے۔ سٹریچر زمین پر ڈال کر دو فوجیوں نے کشمیری لیڈر کو پکڑ کر اٹھایا۔ اس بیرک کے اندر ایک اور چھوٹا دروازہ تھا۔ وہ اسے چلاتے ہوئے اس دروازے میں سے دوسری طرف لے گئے۔ دوسری طرف کوئی تہہ خانہ ہوگا۔ کیونکہ وہ سیڑھیاں اتر کر گئے تھے۔ بھارتی میجر بھی دوسرے فوجیوں کے ساتھ تہہ خانے میں اتر گیا۔ تہہ خانے کا دروازہ بند ہوگیا جیسے ہی دروازہ بند ہوا میں روشندان کے اندر چلا گیا اور دیوار پر سے نیچے اتر کر تہہ خانے کے دروازے کے پاس آیا۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ فوجی گارڈ بیرک کے باہر تھی۔

اندر کوئی گارڈ نہیں تھی۔ میں دروازے کے درمیان سے نکل کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیوں میں تہہ خانے کی ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ پانچ چھ سیڑھیاں تھیں۔ میں آخری سیڑھی میں ایک طرف چھپ کر دیکھنے لگا۔ تہہ خانہ ایک حوالات کی طرح تھا۔ دیوار پر بلب روشن تھا۔ کشمیری لیڈر کو اسی کی قمیض اتار کر چھت کے ساتھ الٹا لٹکایا جا رہا تھا۔ بھارتی میجر سٹول پر بیٹھا تھا۔ کشمیری لیڈر کو الٹا لٹکا کر ایک انڈین سنتری اس کی گردن میں کپڑا ڈال کر مروڑنے لگا۔

بھارتی میجر نے کہا۔

"غلام حسین! اگر اب بھی تم اپنے ساتھیوں کے ٹھکانے بتا دو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

کشمیری لیڈر نے کہا۔

"کبھی نہیں بتاؤں گا۔"

میجر نے غصیلی آواز میں کہا۔

"ایک بار پھر تمہیں موقع دیا جاتا ہے' سوچ لو۔"

کشمیری لیڈر نے کہا۔

"سوچنا تم درندوں کو چاہیے جنہوں نے کشمیر پر زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔ یاد رکھو تمہارا یوم حساب آن پہنچا ہے۔"

انڈین میجر سٹول سے اٹھا اور اس نے الٹے لٹکے ہوئے کشمیری لیڈر پر مزید تشدد شروع کر دیا۔ انسان آخر انسان ہوتا ہے کشمیری لیڈر اپنے ایمان پر قائم تھا لیکن درد کی شدت سے وہ آہستہ آہستہ کراہنے لگا۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اس بھارتی فوجی درندے کو موت کے گھاٹ اتار دوں لیکن وہاں پانچ اور بھی فوجی تھے۔ میرے زندہ بچنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ میرے اس ایکشن سے کشمیری لیڈر کا فرار بھی خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ آدھا گھنٹہ گزرنے ہی والا ہے اور پٹرول ڈیوٹی کے سنتری واپس اپنی پوسٹ پر نہ پہنچے تو دوسری پارٹی ضرور ان کی تلاش میں نکلے گی اور پھر ممکن ہے کہ اس سارے علاقے کو فوجی حراست میں لے لیں۔ انہیں یقین ہو جائے گا کہ وہاں کشمیری کمانڈو پہنچ چکے ہیں۔ اس لحاظ سے مجھے یہاں سے جلدی واپس اپنے ساتھیوں کے پاس جا کر انہیں ساری صورت حال سے باخبر کرنا تھا۔ کشمیری لیڈر کو اس قدر ٹارچر کیا گیا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ انڈین میجر نے حکم دیا۔

"اسے چھت سے اتار کر کونے میں ڈال دو۔ صبح دوبارہ انٹیروگیشن ہو گی۔

کشمیری لیڈر کو چھت سے اتارا جانے لگا۔ میں تیزی سے تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر بیرک میں آیا اور وہاں سے دیوار پر رینگ کر روشندان سے ہوتا ہوا بیرک کی دوسری طرف نکل گیا۔ رات کے اندھیرے میں رینگتا ہوا خاردار تاروں کے نیچے سے گزر کر اس جگہ پہنچا جہاں کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون جھاڑیوں کے پیچھے پوزیشن لیے بیٹھے تھے۔ میں نے جاتے ہی کمانڈو خالد کو سارا واقعہ بیان کر دیا۔ وہ کہنے لگا۔

"ہمیں اب یہاں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ دوسری انڈین گشتی پارٹی اپنے ساتھیوں کو تلاش کرتی ادھر ضرور آئے گی۔"

کمانڈو ہارون بولا۔

"یہ معلوم ہونے کے بعد کہ پٹرول پارٹی کے جوان مارے گئے ہیں' کیمپ کے سارے فوجی الرٹ ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس اتنا اسلحہ نہیں ہے کہ ہم ان کا مقابلہ کر سکیں۔"

"اوکے۔" کمانڈو خالد نے کہا۔ "واپس چلو۔"

ہمارے دونوں پہلوؤں پر جو کمانڈو لائٹ مشین گنیں لیے بیٹھے انہیں بھی سگنل دے دیا گیا۔ ہم اندھیرے میں تیز تیز چلتے وہاں سے نکل آئے۔ کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون اس جنگلی علاقے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ کسی زمانے میں انہوں نے وہاں ایک ندی کے پاس اپنا خفیہ ہائیڈ آؤٹ بنایا ہوا تھا۔ کمانڈو خالد نے ہارون سے کہا۔

"ہارون! ہم اپنے پرانے ہائیڈ آؤٹ میں جائیں گے۔"

"اوکے' کمانڈر!"

دوسرے مجاہد ساتھی بھی ہمارے ساتھ آ کر مل گئے تھے۔ کمانڈو خالد نے مجھے کہا۔

کرم دلو! ہمیں آپریشن کل تک ملتوی کرنا پڑے گا یہ بڑی اچھی بات ہوئی ہے کہ ہمیں کشمیری لیڈر کا سراغ مل گیا ہے۔ ہم کل رات اٹیک کریں گے۔"

ان لوگوں کا پرانا ہائیڈ آؤٹ وہاں سے کوئی ایک میل دور ایک برساتی ندی کے پاس جھاڑیوں اور درختوں میں گھرے ہوئے چھوٹے سے ٹیلے کی ایک قدرتی غار میں

تھا۔ ہم لوگ یہاں آ کر بیٹھ گئے۔ سارے اسلحے اور ہتھیاروں کی پھر سے پڑتال کی گئی۔

کمانڈو خالد نے اپنے ایک مجاہد سے کہا۔

"تم رات کو گارڈ ڈیوٹی پر رہو گے۔"

وہ مجاہد اسی وقت باہر نکل گیا۔ دوسرے کمانڈو ساتھی غار کے دہانے کے پاس جا کر لیٹ گئے۔ میں خالد کے پاس ہی زمین پر بیٹھا تھا۔ کمانڈو ہارون بھی وہاں موجود تھا۔

کمانڈو خالد نے ہارون سے کہا۔

"ہمیں کل کا پورا دن یہاں گزارنا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں صبح صبح اپنا آدمی بھیج کر بھوپال سے کچھ اور اسلحہ منگوا لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ہمیں کیمپ کی پوری پلٹن سے مقابلہ کرنا پڑ جائے۔"

کمانڈو ہارون بولا۔

"کمانڈو ارشد کو منہ اندھیرے روانہ کر دیں گے۔"

اس کے بعد کمانڈو خالد مجھ سے کیمپ کی بیرکوں کے محل وقوع اور دوسری بیرک کے اس تہہ خانے کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے لگا جہاں انڈین آرمی نے کشمیری لیڈر کو قید کیا ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ وہیں ادھر ادھر پڑ کر سو گئے۔ میں کونے میں بیٹھا جاگتا رہا۔ رات گزر گئی۔ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی جب غار کے دہانے سے اندر آنے لگی تو کمانڈو خالد نے مجاہد ارشد کو اٹھایا اور اسے کچھ مزید اسلحہ اور کچھ کھانے کا سامان لانے کے لیے بھوپال روانہ کر دیا۔ ہماری جیپ جنگل کے شروع میں پرانے تالاب کے پاس جھاڑیوں میں موجود تھی۔ مجاہد ارشد کو اسی جیپ کے ذریعے واپس بھوپال جانا تھا۔





دو گھنٹے بعد مجاہد کچھ نان اور اچار لے کر آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک تھیلے میں سٹین گنوں اور لائٹ مشین گنوں کا میگزین اور ہینڈ گرنیڈ بھی لایا تھا۔ ہم سب نے مل کر نان کھائے اور رات کے کمانڈو اٹیک کا منصوبہ تیار کرنا شروع کر دیا۔

کمانڈو خالد نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"کمانڈو کرم داد! کل رات کی طرح آج رات بھی تم دیکھ بھال کے لیے پہلے جاؤ گے اور ہمیں واپس آ کر صورت حال کی رپورٹ کرو گے۔ تمہاری رپورٹ کی روشنی میں شب خون مارنے کا طریقہ کار طے کیا جائے گا۔"

میں نے خالد سے کہا۔

"کمانڈر! ابھی تک تو آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ میں سانپ کی شکل میں ہی ہوں اور اس شکل میں ہونے کی وجہ سے میں بڑی آسانی سے ٹارگٹ کی سراغ رسانی کرنے نکل جاؤں گا لیکن اگر خدا نہ کرے ایسا ہو گیا کہ ٹارگٹ پر پہنچ کر اچانک مجھے جھٹکا لگا اور میں نے سانپ سے انسان کی شکل اختیار کر لی تو صورت حال سنگین بھی ہو سکتی ہے اور میں پکڑا بھی جا سکتا ہوں کیونکہ سانپ کی شکل سے جب میں نے اپنی انسانی شکل اختیار کی تو میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہو گا، کوئی ہتھیار نہیں ہو گا۔ میں بڑی آسانی سے

دشمن کے قابو آ سکتا ہوں۔"

کمانڈو خالد نے پوچھا۔

"کرم داد! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہوگئی تو میں مخصوص جانور کی آواز نکال کر آپ کو سگنل دے دوں گا۔ یہ سگنل سننے کے بعد آپ اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر فوراً اپنے اسی ہائیڈ آؤٹ میں واپس آ جائیں گے۔ کیونکہ میں اگر پکڑا بھی گیا تو ہر ممکن طریقے سے فرار ہونے کی کوشش کروں گا اور اسی ہائیڈ آؤٹ میں آ جاؤں گا۔"

کمانڈو ہارون نے کہا۔

ہم کب تک تمہارا انتظار کر سکتے ہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تم کیمپ سے فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو سکو۔"

میں نے کہا۔

"ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ انسانی شکل میں پکڑے جانے کے گھنٹہ دو گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ چھ سات گھنٹوں کے بعد مجھ پر دوبارہ دورہ پڑ جائے اور میں انسان سے واپس سانپ کے روپ میں آ جاؤں۔ اس حالت میں میں بڑی تیزی سے اور بڑی آسانی سے آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا اور ہم تیسرے اٹیک کا پروگرام تیار کر سکیں گے۔ کیونکہ کشمیری لیڈر کو ہمیں ہر حالت میں یہاں سے نکال کر ساتھ لے جانا ہے خواہ ہمیں پورے انڈین کیمپ سے ہی کیوں نہ مقابلہ کرنا پڑ جائے۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو کرم داد! ہم ایسا ہی کریں گے۔ اگر ہمیں تمہارا ایمرجنسی سگنل مل گیا تو ہم اس وقت اپنی پوزیشن چھوڑ کر یہاں ہائیڈ آؤٹ میں آ کر چھپ جائیں گے۔"

کمانڈو ہارون بولا۔

"لیکن ہم زیادہ دیر تک تمہارا انتظار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔ ہم پوری طرح تیار ہو کر اسلحہ سمیت یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہم تمہیں زیادہ سے زیادہ دو دن دیکھیں گے اگر اس دوران تم نہ آئے تو ہم اپنے طور پر کمانڈو ایکشن کر کے کشمیری لیڈر کو یہاں سے نکال لے جانے کی کوشش کریں گے۔ اس کیمپ میں پچاس سے زیادہ انڈین فوجی نہیں ہوں گے۔ اگر ہمیں ان کا مقابلہ کرنا پڑا تو ہم سب تربیت یافتہ کمانڈوز ہیں۔ ہمارے پاس اسلحہ بھی کافی ہے اور انڈین فوج کو یہاں کسی طرف سے کمک بھی اتنی جلدی نہیں پہنچ سکتی۔ ہم انہیں ختم کر سکتے ہیں۔"

کمانڈو ہارون نے غلط بات نہیں کی تھی۔ ان لوگوں کے پاس کافی اسلحہ ہوگیا تھا اور اندھیرے میں چھپ کر وہ کیمپ کے پچاس ساٹھ فوجیوں کو ختم کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ سارے کمانڈوز تھے اور انہوں نے انڈین آرمی کے ایک مسلمان سابق کمانڈو سے باقاعدہ تربیت حاصل کی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر میں وہاں پھنس گیا اور آپ لوگوں کو میرا سگنل مل گیا تو آپ صرف ایک دن میرا انتظار کریں۔ اس کے بعد اپنے طور پر پلان بنا کر کمانڈو اٹیک کر دیں۔ بیرکوں کی پوزیشن میں نے آپ لوگوں کو سمجھا دی ہے۔ کیمپ میں صرف دو بیرکیں ہی ہیں۔ اگر ہنگامی حالات میں کیمپ کمانڈر نے پیچھے کمک کے لیے وائرلیس بھی دیا تو کمک اتنی جلدی اس جنگل میں نہیں پہنچے گی۔ اتنی دیر میں ہم لوگ اپنا مشن مکمل کر کے یہاں سے فرار ہو سکیں گے۔"

سارا دن اسی منصوبہ بندی میں گزر گیا۔

رات ہوگئی تو ہم نے اپنے مشن کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب رات کافی گہری ہوگئی تو ہم لوگ ہائیڈ آؤٹ سے نکل کر اپنے ٹارگٹ کی طرف چل پڑے۔ ہم اسی طرح بکھر کر چل رہے تھے۔ راستہ ہمیں معلوم تھا۔ میں اندھیرے میں لوپی کے فرائض انجام دیتے ہوئے ان کی راہ نمائی کر رہا تھا۔ کیونکہ میں سانپ کے روپ میں تھا اور اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ سانپ اندھیرے میں بخوبی دیکھ سکتا ہے۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم انڈین فوجی کیمپ کے قریب پہنچ گئے۔ کمانڈو خالد نے اپنے ساتھیوں کو کیمپ کے داخلہ گیٹ کی جانب دونوں طرف لائٹ مشین گنیں دے کر پوزیشنیں سنبھالنے کا آرڈر دے دیا۔ وہ لوگ اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ کمانڈو ہارون اور خالد درختوں کے نیچے جھاڑیوں میں کل والی پوزیشنیں لے کر بیٹھ گئے۔ میں کمانڈو خالد کی جیکٹ کے کالر کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔

اس نے مجھ سے کہا۔

"کرم داد! اب تمہارا کام شروع ہوتا ہے ہم اسی جگہ تمہارا انتظار کریں گے۔ معلوم کر کے آؤ کہ کشمیری لیڈر کیمپ کے تہہ خانے میں ہی ہے یا اسے وہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا ہے۔"

"او کے کمانڈر!"

میں چھلانگ لگا کر اس کی جیکٹ کے کالر سے اترا اور اندھیرے میں کیمپ کی خاردار تاروں والی دیوار کی طرف چل پڑا۔ میں کل والے راستہ پر ہی چل رہا تھا۔ خاردار باڑھ کے پاس آ کر میں رک گیا۔ میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں کل میں نے دو فوجیوں کو ہلاک کیا تھا۔ وہاں لاشیں نہیں تھیں۔ کیمپ میں مجھے کوئی غیر معمولی فوجی سرگرمی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس سے ظاہر تھا کہ دونوں فوجیوں کے بارے میں ان لوگوں نے یہی سمجھا ہے کہ انہیں کسی سانپ نے ڈس دیا تھا۔ یہ بات ان بھارتی فوجیوں کی گلی سڑی لاشوں سے بھی ظاہر ہو گئی ہو گی۔

میں مطمئن ہو کر خاردار باڑھ کے نیچے سے گزر گیا۔ میں نے بیرکوں کے قریب پہنچ کر دیکھا کہ دونوں بیرکوں کے باہر ایک ایک گارڈ موجود تھا۔ حالات بڑے نارمل تھے۔ اگر کوئی ایمرجنسی والی بات ہوتی تو یہاں سیکورٹی کے انتظامات بڑے سخت کر دیے گئے ہوتے۔ اب میں پہلی بیرک کو چھوڑ کر دوسری بیرک کی طرف بڑھنے لگا۔ کیونکہ تہہ خانہ دوسری بیرک کے کمرے میں ہی تھا۔ مجھے اسی بیرک کے تہہ خانے میں جانا تھا اور معلوم کرنا تھا کہ کیا کشمیری لیڈر ابھی تک اسی تہہ خانے میں ہی ہے۔ میں بڑی

آسانی سے دوسری بیرک کی دیوار پر چڑھ کر روشندان میں سے اندر چلا گیا۔ یہ بیرک خالی تھی۔ تہہ خانے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازے کے اوپر نیچے ہر جگہ دیکھا مگر مجھے کہیں کوئی ایسا سوراخ یا درز نہ ملی جس میں سے نکل کر میں تہہ خانے میں داخل ہو سکتا تھا۔ دروازے کو باہر سے تالا نہیں لگا تھا۔ صرف کنڈی لگی تھی۔ مگر میں اس کنڈی کو بھی نہیں کھول سکتا تھا۔ اگر میں اپنی انسانی شکل میں ہوتا تو میرے لیے کنڈی کھولنی بہت آسان تھی۔ میں نے کنڈی سے لپٹ کر ایک دو بار زور لگا کر اسے کھولنے کی کوشش بھی کی لیکن کنڈی اتنی سخت لگی ہوئی تھی کہ میں اسے ذرا سا بھی نہ ہلا سکا۔

بیرک میں صرف ایک بتی جل رہی تھی۔ بیرک کا اپنا دروازہ بھی بند تھا جس کے باہر گارڈ پہرہ دے رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ یہ معلوم کرنا بھی ضروری تھا کہ کشمیری لیڈر تہہ خانے میں ہی ہے۔ کہیں اسے کسی دوسری جگہ تو نہیں منتقل کر دیا گیا۔ اگر وہ تہہ خانے میں نہیں ہے تو پھر ہمارا سارا کمانڈ آپریشن بیکار ہو جاتا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ میرے ساتھی پیچھے میری واپس کا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے واپس جا کر انہیں صحیح معلومات فراہم کرنی تھی اور میری رپورٹ کی روشنی میں انہوں نے کمانڈو اٹیک کرنا تھا۔ باہر فوجیوں کی باتیں کرنے کی آواز آئی۔ لگتا تھا تین چار فوجی ہیں۔ آواز بیرک کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں جلدی سے کونے میں لکڑی کے ایک ڈبے کے پیچھے چھپ گیا۔ بیرک کا دروازہ کھلا اور چار انڈین فوجی سٹین گنیں کاندھوں سے لٹکائے اندر داخل ہوئے۔

میں انہیں غور سے دیکھنے لگا۔

ان میں ایک فوجی صوبیدار یا حوالدار ہوگا وہ آگے آگے تھا۔ اس نے تہہ خانے کے دروازے کے پاس آکر حکم دینے کے انداز میں کہا۔

”نائیک رلیا رام! نیچے جا کر قیدی کی پوزیشن چیک کرو اور آکر رپورٹ کرو۔ ڈبل سے۔“

ایک فوجی فوراً آگے بڑھا۔ تہہ خانے کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ تینوں فوجی باہر کھڑے رہے۔ ان کے افسر نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا اور بولا۔

"ادھر کل رات کو سانپ نے اٹیک کیا تھا تم لوگ نائٹ پٹرول پر دیکھ بھال کر جایا کرو۔"

میں لکڑی کے ڈبے کے پیچھے چھپا ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان فوجیوں کی نظر مجھ پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ اس وقت ایک ایسی بات ہوئی کہ جس نے میرا خون خشک کر دیا۔ مجھے اپنے سانپ والے جسم کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ میں گھبرا گیا۔ میں وہاں سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔ مجھے علم تھا کہ میری ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ابھی میں پہلے والے ہلکے جھٹکے سے سنبھل نہیں سکا تھا کہ مجھے دوسرا جھٹکا لگا۔ یہ دوسرا جھٹکا زیادہ زوردار تھا۔

میں نے بے اختیار دل میں کہا۔ "یا اللہ خیر!"

لیکن مجھ پر وہ دورہ پڑ چکا تھا جو میں نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت مجھ پر پڑے۔ دوسرے جھٹکے کے ساتھ ہی میرا جسم سانپ سے انسان میں تبدیل ہو گیا۔ سانپ کی حیثیت سے میں لکڑی کے ڈبے کے پیچھے سارے کا سارا چھپا ہوا تھا لیکن آدمی کی شکل میں آتے ہی میں سب کو نظر آنے لگا۔ ایک فوجی کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے ایک دم سٹین گن کندھے سے اتار کر میری طرف سیدھی کر لی اور بولا۔

"ہالٹ!"

سب مجھے دیکھنے لگے۔ ان کے صوبیدار بھارتی فوجی نے سگریٹ پھینک دیا۔ سب نے سٹین گنوں کا رخ میری طرف کر دیا۔ صوبیدار نے کہا۔

"اوئے یہ کہاں سے آ گیا۔ کون ہو تم؟؟"

میں انہیں کیا کہتا کہ میں کون ہوں اور وہاں کیسے آ گیا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر بڑی معصومیت سے کہا۔

"جناب میرا نام وریام داس ہے۔ میں صفائی کا کام کرتا ہوں۔ صفائی کرتے کرتے یہاں سو گیا تھا۔

بھارتی صوبیدار نے میرے قریب آکر مجھے غور سے دیکھا۔

"تم کو ہم نے پہلے ادھر نہیں دیکھا' سچ بولو تم کون ہو؟"

پھر اس نے اپنے فوجیوں کو حکم دیا۔

"اس کو باندھ کر لے چلو۔"

اس دوران تہہ خانے سے واپس آکر فوجی نے بتایا قیدی ٹھیک ٹھاک ہے۔ وہ فوجی میری طرف حیران ہو کر دیکھنے لگا۔

"سر! یہ سویلین کون ہے سر؟"

صوبیدار بولا۔

"کوئی دشمن کا جاسوس لگتا ہے۔ ابھی معلوم پڑ جاتا ہے کہ اس کو کس نے بھیجا تھا۔ یہ ضرور کشمیری کمانڈو کو نکالنے آیا ہے۔ لے چلو اسے۔"

بھارتی فوجی مجھے گھسیٹتے ہوئے بیرک سے باہر لے آئے۔ میرے ساتھ بہت بڑی ٹریجڈی ہو گئی تھی۔ باہر آتے ہی گارڈز نے بھی اپنی سٹین گنیں سیدھی کر لیں۔ صوبیدار نے دونوں گارڈ سنتریوں کو گالی دے کر کہا۔

"تم کو کس لیے یہاں ڈیوٹی پر رکھا ہوا ہے؟ دشمن کا جاسوس قیدی کو نکالنے اندر آگیا اور تمہیں معلوم ہی نہیں پڑا؟ ہم کیمپ کمانڈر کو تمہاری رپورٹ کرے گا۔"

فوجی مجھے گھسیٹتے ہوئے دوسری بارک کی طرف لے جا رہے تھے۔ مجھے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ کشمیری لیڈر تہہ خانے میں ہی ہے مگر اب اس رپورٹ کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کو جا کر یہ معلومات فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ میری گرفتاری کے بعد یہ امر طے شدہ تھا کہ کیمپ کے گرد فوجی چیکنگ شروع کر دیں گے۔ اس طرح میرے ساتھیوں کے پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ چنانچہ بھارتی صوبیدار نے آرڈر بھی دے دیا کہ کیمپ کے جنگل کی تلاشی لو۔ دشمن کے آدمی ضرور کسی جگہ چھپے ہوئے ہوں گے۔ یہ اکیلا نہیں آیا ہو گا۔

یہ سنتے ہی میں نے اپنے حلق سے چیخ کے انداز میں ایک آواز نکالی اور ساتھ ہی

بھارتی صوبیدار سے کہا۔

"سر! میں بے قصور ہوں۔ مجھے کچھ نہ کہیں۔"

یہ فقرہ میں نے چیخ کی آواز کے ساتھ ہی کہہ دیا تھا تاکہ میری چیخ کی آواز پر اسے کوئی شک نہ پڑے کہ میں نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنے کے لیے سگنل دیا ہے' حقیقت میں میں نے اپنے ساتھیوں کو سگنل ہی دیا تھا کہ میں پھنس گیا ہوں تم اپنی اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر روپوش ہو جاؤ۔

صوبیدار نے مجھے ٹھڈا مار کر گالی دی اور کہا۔

"ابھی مالوم پڑ جاتا ہے کہ تم کون ہے۔ لے چلو اسے اندر۔"

مجھے دوسری بیرک میں دھکیل دیا گیا۔ میں فرش پر چارپائیوں کے پاس گرا جن پر فوجی سو رہے تھے۔ دو تین فوجی اٹھ بیٹھے۔

"کیا ہوا ہے سر؟" ایک بھارتی فوجی نے پوچھا۔

صوبیدار نے کہا۔

"اوئے ادھر ہم نے کشمیر کا ایک اور کمانڈو پکڑا ہے۔ یہ اپنے کمانڈو ساتھی کو فرار کرانے آیا تھا۔"

دو تین فوجی وہیں مجھے زدوکوب کرنے لگے۔ صوبیدار چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔

"کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

میں نے کہا۔

"وریام داس سر!"

اس نے ایک فوجی کو حکم دیا کہ میری پتلون کھول کر دیکھا جائے۔ یہ ایک ایسا ثبوت تھا جس کی میں تردید کر ہی نہیں سکتا تھا۔ انہیں فوراً معلوم ہو گیا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے فوراً بعد میرے ہاتھ پیچھے باندھ دیے گئے۔ میں تو ناگہانی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ لیکن مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ میرے سگنل کے سنتے

ہی میرے ساتھی کمانڈو وہاں سے نکل چکے ہوں گے۔ کیونکہ اس کے فورا" بعد ادھر ادھر سے فوجیوں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ یہ بھارتی فوجی میرے ساتھیوں کو تلاش کر رہے تھے۔

بھارتی صوبیدار نے میرے منہ پر چھ سات تھپڑ مارے اور گالیاں دیتے ہوئے بولا۔

"ہم کو معلوم ہے تم کشمیری کمانڈو ہے۔ تم ہم کو بتائے گا کہ تمہارا دوسرا ساتھی ادھر کہاں چھپا ہوا ہے۔ نہیں تو ہم تمہاری بوٹی بوٹی کر دے گا۔"

ایک دم چھ سات تھپڑ پڑنے کے بعد میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ ایک طرف سے ہونٹ پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ ایک دوسرے فوجی نے مجھے ٹھڈوں سے مارنا شروع کر دیا۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرا برا حال ہو گیا۔ بھارتی صوبیدار نے حکم دیا۔

"اس کو کوارٹر گارڈ میں لے چلو۔ ابھی ادھر یہ سب کچھ بتا دے گا۔"

کیمپ کی چھوٹی سے کوارٹر گارڈ میں جس کا لوہے کی سلاخوں والا دروازہ تھا' مجھے فرش پر بٹھا دیا گیا۔ بھارتی صوبیدار سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ اب اس نے مجھ سے انیٹروگیشن شروع کر دی۔ وہ مجھ سے یہی پوچھ رہا تھا کہ میرے دوسرے کمانڈو کشمیری ساتھی جنگل میں کہاں چھپے ہوئے ہیں اور ہماری تعداد کتنی ہے۔ یہ وہ راز تھا جو میں انہیں کسی قیمت پر نہیں بتا سکتا تھا۔ میں یہی کہتا رہا کہ میں کشمیری کمانڈو نہیں ہوں۔ میں نے یہ موقف اختیار کیا کہ میں بھوپال کے ایک قریبی گاؤں میں رہتا ہوں۔ چھوٹی چھوٹی چوریاں کر کے گزارہ کرتا ہوں۔ آج رات بھی میں کیمپ میں چوری کرنے کی نیت سے آیا تھا کہ پکڑا گیا۔ صوبیدار نے گالی دے کر کہا۔

"تم جھوٹ بکتا ہے کوئی چور کبھی کسی فوجی کیمپ میں چوری کرنے نہیں آتا۔ ابھی کیمپ کمانڈو کو ہم نے انفارم کر دیا ہے وہ بڑا ظالم ہے تمہاری بوٹی بوٹی کر دے گا۔ پھر تمہارا باپ بھی بتا دے گا کہ تمہارے ساتھی کمانڈو جنگل میں کدھر کدھر چھپا ہوا ہے۔"

باہر فوجی بوٹوں کی آواز آئی۔ صوبیدار جلدی سے کرسی چھوڑ کر دروازے کی طرف گیا۔ ایک درمیانے قد کا فوجی فل وردی میں اندر آگیا۔ اس کے کندھے پر لگے نین پھول تھے۔ وہ کیپٹن رینک کا فوجی تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ ہاتھ میں بید تھا۔ وہ بید کو اپنی طرف سے بجاتے ہوئے میرے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے صوبیدار سے پوچھا۔

"صوبیدار! یہ کچھ بولا؟

صوبیدار نے کہا "سر! ابھی تک یہ نہیں بکا۔"

بھارتی کیپٹن نے صوبیدار کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم کیسا صوبیدار ہے۔ دشمن کا کمانڈو پکڑا اور اس سے ابھی تک معلوم نہیں کر سکا کہ اس کا ساتھی ادھر کہاں کہاں پر ہے؟"

صوبیدار نے اٹن شن ہو کر کہا۔

"سر! یہ بڑا پکا بدمعاش ہے ہم اس پر تھرڈ ڈگری استعمال میں لائے گا۔ پھر اس کا باپ بھی بتا دے گا۔"

بھارتی کیپٹن مجھے گھور رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں اس کے بالکل سامنے فرش پر اس طرح سمٹ کر بیٹھا ہوا تھا کہ میرے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور سر جھکا ہوا تھا۔ بھارتی کیپٹن نے بید سے میرا چہرہ اوپر کیا اور بولا۔

"دیکھو ہم تم کو ٹارچر نہیں کرے گا۔ تم ہم کو صاف صاف اپنے ساتھی کمانڈوز کا ہائیڈ آؤٹ بتا دو۔ ہم تم کو آزاد کر دے گا۔ ہم تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تمہارے ساتھیوں کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔"

میں نے کہا۔ "سر! میں کمانڈو وغیرہ کچھ نہیں ہوں۔ میں چور ہوں' یہاں چوری کرنے آیا تھا۔"

بھارتی کیپٹن نے اتنی زور سے میرے کندھے پر بید مارا کہ میرا کندھا اور ساتھ ہی دماغ بھی سن ہوگیا۔ میں درد سے بلبلا اٹھا۔ بھارتی کیپٹن مجھے گالیاں دینے لگا۔

"تم اس طرح نہیں بتائے گا۔ ہم کو تمہیں بکانا آتا ہے۔"

وہ کرسی سے اٹھا اور صوبیدار کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اس کو سیل نمبر ۲ میں لے چلو۔ ہم بھی وردی بدل کر ادھر آتا ہے۔"

وہ چلا گیا۔ اس کے بعد مجھے کوارٹر گارڈ سے نکال کر کیمپ کے چار فوجی کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے کیمپ کی ایک جانب درختوں کی طرف لے آئے جہاں ایک اونچا ٹبہ تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا جس طرح کے اسلحہ بارود رکھنے کے واسطے ڈمپ بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ٹبے کے باہر کوئی سنتری وغیرہ نہیں تھا۔ لوہے کا ایک دروازہ لگا ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا گیا۔ تین انڈین فوجی میرے ساتھ تھے۔ میں نے اپنے آپ کو اندھیرے میں پایا۔ اگر میں سانپ کے روپ میں ہوتا تو اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا مگر میں انسانی شکل میں تھا۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک فوجی نے بٹن دبا کر بتی روشن کر دی۔ یہ ایک تنگ سی کوٹھڑی تھی جس کی ایک دیوار کے ساتھ لوہے کے کنڈوں میں زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ ایک سٹریچر پڑا تھا جس کی دونوں جانب چمڑے کے پٹے بندھے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ کھول کر مجھے اٹھا کر سٹریچر پر ڈال دیا گیا اور میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں چمڑے کے پٹوں کے ساتھ کس کر باندھ دیے گئے۔ میرے ساتھ جو وحشیانہ سلوک ہونے والا تھا میں اس سے واقف تھا۔ دل میں اس وقت ایک ہی دعا بار بار مانگ رہا تھا کہ اے خدا! میرے حال پر رحم فرما اور مجھے انسان سے دوبارہ سانپ بنا دے۔ میرے بچاؤ کی وہاں صرف ایک صورت تھی کہ میں انسان سے سانپ کی شکل اختیار کر جاؤں۔ اس کے بعد میں وہاں سے جان بچا کر فرار ہونے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی بچاؤ کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن خدا نے میری دعا قبول نہ کی اور میں اپنی اصلی انسانی حالت میں ہی سٹریچر پر پڑا رہا۔

اتنے میں بھارتی کیپٹن بھی آ گیا۔ وہ شب خوابی کے سویلین کپڑوں میں تھا۔ بید اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے ساتھ ایک فوجی سپاہی تھا جس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی صندوقچی تھی۔ بھارتی کیپٹن کے لیے فوراً" ایک کرسی آ گئی۔ وہ کرسی پر

بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ جو فوجی سپاہی آیا تھا اس نے اپنی صندوقچی سٹریچر پر رکھ دی اور اسے کھول کر کچھ ٹٹولنے لگا۔

بھارتی کیپٹن اب مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ابھی تمہارے پاس ٹائم ہے۔ ابھی تم ہم کو اپنے ساتھیوں کے بارے میں بتا دو۔"

میں نے بڑی انکساری کے ساتھ کہا۔

"میرا کوئی ساتھی نہیں ہے جناب! میں اکیلا ہی رات کو چوریاں کرتا ہوں۔"

بھارتی کیپٹن نے سٹریچر پر میرے پاس کھڑے فوجی کو اشارہ کیا۔ فوجی سپاہی اس دوران صندوقچی میں سے ایک لوہے کا بڑا زنبور نکال چکا تھا۔ وہ زنبور ہاتھ میں لیے میرے چہرے کے پاس آیا اور سرہانے کی جانب جو فوجی کھڑا تھا اس سے کہا۔

"اس کا منہ کھولو جوان۔"

فوجی نے فوراً آگے بڑھ کر میرے جبڑے کھول دیے۔ میں نے منہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن فوجی کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں اپنے جبڑوں کو بالکل نہ ہلا سکا۔ میرے منہ میں دوسرے فوجی نے زنبور ڈال کر ایک دم سے میری ایک ڈاڑھ کو زنبور کے شکنجے میں جکڑا اور پھر اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ میری چیخ نکل گئی۔ ایسا شدید درد ہوا جیسے کسی نے میرے سر میں لوہے کی سلاخ ٹھونک دی ہو۔ مجھے اپنے ہونٹوں سے خون بہتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ خدا جانے میری پوری ڈاڑھ اکھڑی تھی یا آدھی ٹوٹ گئی تھی لیکن درد کا یہ عالم تھا کہ میں ذبح کیے جانے والے اونٹ کی طرح بلبلا رہا تھا۔ مجھے بھارتی کیپٹن کی کرخت آواز سنائی دی۔

"ہم ایک ایک کر کے تمہارے سب دانت اکھاڑ دے گا' نہیں تو اپنے ساتھیوں کا ٹھکانہ بتا دو۔"

اس وقت جس فوجی نے میرے جبڑے کھولے ہوئے تھے اس نے ہاتھ اٹھا لیے۔

میرا منہ جیسے خون سے بھر گیا تھا۔ میں سوائے درد کی شدت سے کراہنے کے اور کچھ نہ

بول سکا۔ بھارتی کیپٹن نے اپنا فقرہ دہرایا۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں تو غریب چور ہوں------"

"چلو۔ ایکشن کرو۔"

بھارتی کیپٹن نے حکم دیا میرے سر پر کھڑے فوجی نے فوراً" میرا جبڑا پکڑ کر کھول دیا۔ دوسرے فوجی نے فوراً" زنبور میرے منہ میں ڈال کر دوسری قطار میں ایک ڈاڑھ کو شکنجے میں پکڑا اور زبردست جھٹکا دے کر میری دوسری ڈاڑھ کو نکال دیا یا توڑ دیا۔ میرے حلق سے ڈکرانے کی آواز نکلی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے آپ کسی بھینس کی آدھی گردن کاٹ کر اسے چھوڑ دیں۔ درد کا دوسرا شدید جھٹکا مجھ سے برداشت نہ ہوسکا اور مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ اس غشی کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ درد کی لہروں کی شدت کم ہونے لگی۔ میں نے بھارتی کیپٹن کی کرخت آواز سنی۔

"اس کو بے ہوش مت ہونے دینا۔"

اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو میرا منہ اکڑا ہوا تھا۔ میں اسی سٹریچر پر پڑا تھا۔ سارا بدن درد سے پتھر کا ہوگیا تھا۔ منہ سے خون نکل نکل کر ہونٹوں پر جما ہوا تھا۔ میرے دونوں گال سوجے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے منہ کے اندر زبان پھیر کر دیکھا۔ میری دونوں طرف کی ڈاڑھیں اکھڑی نہیں تھیں آدھی سے زیادہ ٹوٹ چکی تھیں اور اتنی درد کر رہی تھیں کہ وہاں زبان نہیں لگائی جاتی تھی۔ کوٹھڑی خالی تھی میرے ہاتھ پاؤں سٹریچر پر اسی طرح بندھے ہوئے تھے۔ ایک فوجی اندر آگیا۔ اس نے روئی سے میرا منہ صاف کر کے دوائی لگا دی۔ پھر میرے حلق میں نالی ڈال کر مجھے کچھ پلایا۔ جب نالی باہر نکالی تو مجھے نمک کا ذائقہ محسوس ہوا شاید یہ گلی سڑی سبزیوں کا سوپ تھا۔ یہ لوگ مجھ سے راز معلوم کرنے سے پہلے مجھے زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ دوپہر کو بھی مجھے وہی سوپ نالی کے ذریعے پلایا گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کھولے گئے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ سٹریچر سے اتر کر ٹہلنے لگا تو بے حد کمزوری محسوس ہوئی۔ سٹریچر پر جا کر

لیٹ گیا۔ سارا دن گزر گیا۔ شام کو بھی کوئی نہ آیا۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ میں نے اٹھ کر اسے ذرا سا باہر کو دھکیلا۔ مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ یہ لوگ اتنے احمق نہیں تھے کہ دروازہ کھلا چھوڑ دیتے۔ رات کو بھی کوئی نہ آیا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا فوجی کمپاؤڈر آ کر مجھے دوائی لگا جاتا تھا اور سوپ پلا جاتا تھا۔ دوسرے دن رات کو درد بھی کم ہوگیا' سوجن بھی تھوڑی اتر گئی تھی۔ تیسرے دن مجھے کافی آفاقہ محسوس ہو رہا تھا لیکن اسی روز دوبارہ آفت نازل ہوگئی۔ وہی بھارتی میجر کیپٹن پھر نمودار ہوا۔

اس دفعہ اس کے ساتھ ایک اور فوجی تھا جس کے ہاتھ میں تھیلا تھا۔ تھیلا اس نے میرے سٹریچر کے پاس رکھ دیا۔ بھارتی میجر کیپٹن میرے قریب آ کر بولا۔

"کیوں! تم کو کچھ عقل آیا؟ اب بھی وقت ہے' اگر اپنے ساتھی کشمیریوں کا ٹھکانہ بتا دو تو تمہاری جان بچ جائے گی۔"؟

میں نے اپنی طرف سے بڑی سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"جناب والا! میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ آپ مجھے ناحق پیٹ رہے ہیں۔ اگر میرا کوئی کشمیری ساتھی ہوتا تو میں آپ کو ضرور بتا دیتا مگر میں کشمیری نہیں ہوں۔ میں ضلع نکودر کا غریب مسلمان ہوں' بھوپال کے علاقے میں آ کر بس گیا۔ کام نہ چلا تو چوریاں کرنی شروع کر دیں۔ ایک چور نے بتایا کہ اس فوجی کیمپ میں ایک صندوق نوٹوں سے بھرا ہوا ہے' بس اس کے لالچ میں یہاں آ گیا۔"

بھارتی میجر کیپٹن میرا بیان سن کر مسکراتا رہا۔ پھر اس کا چہرہ غصے سے اور زیادہ کالا ہوگیا۔ اس نے تھیلے والے فوجی کو اشارہ کیا اور خود پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھیلے والے فوجی نے سب سے پہلے میرے ہاتھ پیر سٹریچر پر باندھ دیے۔ پھر اپنے تھیلے میں سے بجلی کے تاروں کا گچھا نکالا۔ میرے ٹخنوں اور کلائیوں کے ساتھ چار کلمپ باندھے۔ سب تاریں ایک تار کے ساتھ جوڑیں اور اس کا سوئچ ہاتھ میں لے کر دیوار والے بجلی کے پلگ کے ساتھ لگا کر بھارتی میجر کیپٹن کی طرف دیکھا جیسے حکم کا منتظر ہو۔

بھارتی میجر کیپٹن نے مجھ سے کہا۔

"میں تمہیں ایک چانس اور دے رہا ہوں۔ بتاؤ تمہارے دوسرے ساتھی جنگل میں کہاں چھپے ہوئے ہیں؟"

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ مجھے بجلی کے جھٹکے دینے والے ہیں۔ میں اندر سے ڈر گیا تھا۔ شاید یہ بجلی کے جھٹکے مجھے موت کے منہ میں دھکیل دیں۔ فوجی نے بھارتی کیپٹن کا اشارہ پاتے ہی بٹن دبا دیا۔ مجھے بجلی کا شدید جھٹکا لگا اور میں سٹریچر سے ایک فٹ اوپر کو اچھل کر گر پڑا۔ بجلی کا بٹن آف کر دیا گیا تھا۔ میرا جسم اس طرح سنسنا رہا تھا جیسے میرے سارے جسم میں چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ دماغ میں گھنٹیاں سی بجنے لگی تھیں' آنکھوں میں تارے ناچ رہے تھے اور جسم میں جیسے بالکل جان نہیں رہی تھی۔ بھارتی میجر کیپٹن نے ایک بار کہا۔

"اب بھی بتا دو گے تو تمہاری جان بچ جائے گی۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور آہستہ آہستہ کراہتا رہا۔ دوسری بار مجھے پھر بجلی کا جھٹکا دیا گیا۔ یہ جھٹکا ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے کا ہوتا تھا' مگر اتنے وقفے میں ہی میرے جسم سے جیسے میری روح نکل جاتی تھی۔ تیسری جھٹکے پر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو میں اسی طرح سٹریچر پر پڑا تھا اور جسم روئی کی طرح دھنکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ساری رات اسی طرح پڑا رہا۔ شاید صبح ہونے والی تھی کہ مجھے سٹریچر سے کھول کر ایک باتھ روم میں لے جایا گیا۔ جہاں میرے لیے ایک ٹب میں نیم گرم پانی تھا۔ بھارتی فوجی جو مجھے وہاں تک لایا تھا' بولا۔

"اچھی طرح اپنے مسلمانوں والے طریقے سے نہا دھو لو۔ یہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔"

وہ چلا گیا۔ میں یہی سمجھا کہ یہ سب کچھ مجھے ڈرانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ پھر خیال آیا کہ ہوشنگ آباد کا یہ فوجی ٹارچر سیل اس معاملے میں بہت بدنام تھے کہ یہاں کشمیری مجاہدوں کو صرف اسی لیے لایا جاتا ہے کہ ان سے جتنی معلومات حاصل ہو سکتی

ہوں، حاصل کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ یہاں سے کبھی کوئی کشمیری مجاہد زندہ واپس نہ جاسکا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے ایک بار خدا سے اپنی زندگی کی دعا مانگی اور کہا کہ اے میرے خدا مجھے ان ظالموں کی اذیت ناک موت سے بچالے۔

میں نے نیم گرم پانی سے اپنے جسم کو پاک صاف کیا۔ وہی پرانی قمیض اور پرانی پتلون پہنی اور فوجی مجھے واپس کوٹھڑی میں لے آیا۔ مجھے کھانے کو تھوڑے سے چاول اور شوربہ دیا گیا۔ میں سٹریچر پر لیٹ گیا۔ مجھے اپنی بیوی جمیلہ کا خیال آ گیا۔ خدا جانے اب اس سے کب ملنا ہوگا۔ اس سے مل بھی سکوں گا یا نہیں۔ کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہ صرف دو دن جنگل والے خفیہ ہائیڈ آؤٹ میں میرا انتظار کریں گے اس کے بعد یا تو بھوپال واپس چلے جائیں گے اور یا اپنے طور پر کوئی منصوبہ بندی کر کے کیمپ پر حملہ کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ کشمیری لیڈر کو رہا کرایا جا سکے۔ جہاں تک میرا خیال تھا کمانڈو خالد شاید ایسا نہ کرے کیونکہ فوجی کیمپ پر براہ راست حملہ کرنے سے ایک تو کامیابی کے امکانات بہت کم تھے دوسرے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کیمپ کمانڈر کشمیری لیڈر کو فوراً ہلاک نہ کر دے۔

معلوم نہیں یہ میرے نیم گرم پانے سے نہانے کا اثر تھا یا دورے کا وقت پورا ہوگیا تھا میرے جسم پر پہلے تو کپکپی طاری ہوگئی اس کے بعد پسینہ آنے لگا۔ میں سمجھا کہ مجھے بخار ہوگیا ہے مگر میرا جسم گرم نہیں تھا۔ میں سٹریچر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے چھوٹے چھوٹے جھٹکے لگنے شروع ہوگئے۔ میں سمجھ گیا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ اب آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ میں بہت خوش ہوا کیونکہ میں سانپ کی شکل اختیار کرنے والا تھا اور صرف سانپ کی شکل میں آ کر ہی میں ان درندوں کی قید سے نہ صرف آزاد ہو سکتا تھا بلکہ ان سے اپنے اوپر کیے گئے وحشیانہ تشدد کا انتقام بھی لے سکتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں بڑی بے تابی سے خود کو سانپ میں تبدیل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے غیر شعوری طور پر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پھر جیسا کہ ہوا کرتا تھا مجھے میرے جسم کا بوجھ ہلکا محسوس ہونے لگا۔ میں

نے اپنا بازو اوپر اٹھایا تو مجھے اس کا بوجھ بہت ہی ہلکا لگا۔ اس کے بعد ایک گرم رو میرے جسم میں سے گزر گئی اور دوسرے لمحے میں سانپ کی شکل میں سٹریچر پر پڑا تھا۔ سانپ کی شکل میں آتے ہی میں سٹریچر سے اتر گیا۔

سیل میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ وہاں مجھے دو کام کرنے تھے۔ پہلا کام تو یہ تھا کہ مجھے ان بھارتی فوجیوں کو ہلاک کرنا تھا جنہوں نے مجھے شدید اذیتیں دی تھیں۔ دوسرا اہم کام اپنے کشمیر لیڈر کو وہاں سے نکال کر لے جانا تھا۔ میں نے کیمپ کمانڈر میجر کیپٹن کی شکل تو دیکھ رکھی تھی مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا۔ اس کوٹھڑی میں میرا زیادہ دیر رہنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ کوئی فوجی اندر آ جاتا تو وہ مجھے دیکھ سکتا تھا اور ہلاک کرسکتا تھا۔ میں دروازے کی طرف بڑھا کہ یہاں سے تو باہر نکلوں۔ باہر جا کر کہیں چھپ جاؤں گا۔ پھر کیمپ کمانڈر بھارتی میجر کیپٹن کو تلاش کر کے سب سے پہلے اسے ڈسوں گا۔ جیسے ہی میں دروازے کی طرف بڑھا باہر سے ایک فوجی دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ یہ وہی فوجی تھا جس نے مجھے بجلی کے جھٹکے دیئے تھے۔ وہ ہندو تھا' اسے بھارتی میجر کیپٹن نے اس کے ہندو نام سے ایک بار پکارا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ کہیں یہاں کوئی مسلمان نہ ہو' کیونکہ انڈین آرمی میں تھوڑے بہت سہی مگر مسلمان فوجی بھی ہوتے ہیں اور میں اپنے کسی مسلمان بھائی کو ڈسنا نہیں چاہتا تھا خواہ اس کے ہاتھوں مجھے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچی ہو۔ میں جلدی سے کونے میں چھپ گیا۔

ایک تو میں چھوٹا سا سانپ تھا دوسرا میرا رنگ بھورا تھا۔ میں تھوڑے سے اندھیرے میں بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ بھارتی فوجی نے سٹریچر کو دیکھا وہاں میں نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔

"یہ سالا کدھر چلا گیا ہے۔"

میں نے انسانی آواز میں کہا۔

"میں تمہارا باپ سٹریچر کے پاس ہوں۔"

بھارتی فوجی نے چونک کر دائیں بائیں دیکھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ کمرے میں تو کوئی انسان نہیں ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ مجھے ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔ میں کونے میں سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ اس نے اپنے سامنے ایک سانپ کو پھن پھیلائے آتے دیکھا تو تھر تھر کانپنے لگا۔ مگر فورا" ہی اس نے آگے بڑھ کر مجھے ٹھڈا مار کر ہلاک کرنا چاہا تو میں اس کی ٹانگ سے لپٹ گیا۔ اس نے گھبرا کر اپنی ٹانگ پر ہاتھ مار کر مجھے ہٹانے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ڈس دیا اور اچھل کر پرے ہوگیا۔ بھارتی فوجی کے جسم میں میرے زہر کا داخل ہونا ہی شرط تھا۔ جیسے ہی اس کے خون نے میرے زہر کا ذائقہ چکھا وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔

یہ کوٹھڑی جہاں مجھے سٹریچر پر باندھ کر وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا دونوں فوجی بیرکوں سے ذرا ہٹ کر عقب میں تھی۔ میں نے دروازے میں سے سر باہر نکالا تو دیکھا کہ باہر صبح کا دھندلا دھندلا اجالا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ کشمیری لیڈر تہہ خانے میں ہی ہے۔ کیمپ کی زمین پر جگہ جگہ گھاس اور جھاڑیاں تھیں۔ میں بڑی آسانی سے چھپ کر رینگ سکتا تھا۔ میں اس بیرک کی طرف بڑھا جس کے اندر تہہ خانے والا ٹارچر سیل تھا۔ ایک چھوٹے سانپ کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا جہاں جھاڑ جھنکاڑ کافی ہو' کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ دن کے وقت بیرک کے باہر کوئی فوجی گارڈ نہیں تھا۔ دو تین انڈین فوجی جوان ادھر ادھر نظر آئے۔ کچن کی طرف سے بھی کچھ فوجی جوانوں کے قہقے لگانے کی آواز آ جاتی تھی۔ یہ وقت ایسا تھا کہ کیمپ کے تقریبا" سبھی فوجی ناشتہ کرنے میں مشغول تھے۔ اس کے باوجود میں نے بیرک کے دروازے میں سے اندر جانے کا خطرہ مول نہ لیا۔ میں پچھلی دیوار پر چڑھ کر روشندان کی سلاخوں میں سے بیرک میں اتر گیا' بیرک خالی تھی۔ پھر وہی مسئلہ درپیش ہونے والا تھا کہ تہہ خانے کا دروازہ اگر بند ہوا تو میں اندر کیسے جاؤں گا۔ دروازہ واقعی بند تھا۔ میں ایک طرف چھپ کر اپنے انسانی دماغ سے سوچنے لگا۔ تہہ خانے میں کیسے اترا جائے۔ ایک تو وہ صبح کا وقت تھا دوسرے اتفاق ایسا ہوا کہ

عین اس وقت ایک بھارتی فوجی ٹین کے مگ میں شاید چائے یا گلی سڑی سبزیوں کا سوپ لے کر بیرک میں داخل ہوا۔ اس نے تہہ خانے والے دروازے کی چٹخنی کھولی اور نیچے اتر گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے نیچے اتر گیا۔ سیڑھیوں میں اندھیرا تھا۔ آخری سیڑھیوں پر تہہ خانے میں جلتے ہوئے چھوٹے سے بلب کی کمزور روشنی پڑ رہی تھی۔

میں سیڑھیوں سے ہٹ کر کونے میں چھپ گیا۔

میں نے کشمیری لیڈر کو دیکھ لیا تھا۔ وہ فرش پر بازو پر سر رکھ کر سمٹا ہوا پڑا تھا۔ بھارتی فوجی نے اس کے پاؤں پر ٹھڈا مار کر کہا۔

"چلو اٹھو' چائے لو۔"

ساتھ ہی اس نے اپنی جیب میں سے روٹی نکال کر اس کے آگے رکھ دی اور چلا گیا۔ کشمیری لیڈر کچھ دیر ویسے ہی ٹانگیں اکٹھی کیے لیٹا رہا۔ پھر اس نے اٹھ کر کلمہ پڑھا اور اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر کر اللہ تعالیٰ سے جہاد کشمیر کی فتح کی دعا مانگی اور سوکھی روٹی کھانے اور چائے پینے لگا۔ کم بخت بھارتی فوجی جاتے ہوئے ایک بار پھر باہر سے دروازے کو چٹخنی لگا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ میں کونے کے اندھیرے میں چھپ کر بیٹھا کشمیری لیڈر کو بڑی بے بسی کے ساتھ سوکھی روٹی کھاتے اور بار بار یا اللہ کا ورد کرتے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا اس پر اپنا آپ ظاہر کر دوں؟ ایک سانپ کو انسانی آواز میں بات کرتے دیکھ کر اس پر کیا اثر ہوگا؟ یہی سوال مجھے پریشان کر رہا تھا۔ لیکن اس سے بات کرنی اور اسے اپنے منصوبے کے بارے میں بتانا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ میں نے اس بدلی ہوئی صورت حال کے مطابق ذہن میں یہ پروگرام بنایا تھا کہ اگر ہو سکے تو کشمیری لیڈر کو میں خود یہاں سے نکال کر لے جاتا ہوں۔ ہماری کمانڈو پارٹی کو حملہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ ویسے بھی ہماری کمانڈو پارٹی ٹارگٹ سے بہت دور جا چکی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہمیں دیر لگ جائے اور اس دوران کشمیری لیڈر کو شہید کر دیا جائے۔

اس اعتبار سے کشمیری لیڈر غلام حسین وائیں سے بات کرنی ضروری تھی۔ میں

نے آہستہ سے کہا۔

"السلام علیکم!"

سوکھی روٹی توڑتے ہوئے کشمیری لیڈر کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ اس نے حیران سا ہو کر جس طرف سے آواز آئی تھی اس طرف دیکھا۔ میں اسے نظر نہ آیا۔ میں نے کہا۔

"وائیں صاحب! میں کوئی غیبی روح نہیں ہوں۔ میں بھی آپ کی طرح انسان ہوں اور جہاد کشمیر کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔ اگر آپ مجھے یقین دلا دیں کہ آپ مجھے دیکھ کر سراسیمہ نہیں ہوں گے تو میں اپنا آپ تم پر ظاہر کر دوں گا۔"

کشمیری لیڈر کے لیے یہ ایک غیبی آواز تھی۔ کیونکہ میں اسے سانپ کے روپ میں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ابھی تک حیرانی کی کیفیت میں تھا۔ میں نے دوبارہ کہا۔

"وائیں صاحب! میں اپنی کمانڈو پارٹی کے ساتھ آپ کو بھارتی درندوں کی قید سے نجات دلانے آیا ہوں۔"

کشمیری لیڈر ذرا سنبھل سا گیا۔ اس نے پوچھا۔

"بھائی تم کون ہو؟ کیا تم کوئی فرشتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں فرشتہ نہیں ہوں۔"

"تو پھر تم دکھائی کیوں نہیں دیتے؟"

کشمیری لیڈر کی آواز میں نقاہت اور کمزوری تھی۔ اس مجاہد کو بھارتی درندوں نے اذیتیں دے دے کر نیم جان کر دیا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"حقیقت یہ ہے کہ میں آپ ہی کی طرح کا ایک انسان ہوں۔ الحمدللہ مسلمان ہوں' جہاد کشمیر کا کمانڈو ہوں اور صرف آپ کو تلاش کرتا یہاں تک پہنچا ہوں۔ لیکن میرے ساتھ ایک عجیب بات ہو گئی ہے۔ ایک ناخوشگوار حادثے کے بعد میں جادوگر

سپیروں کے طلسم اور ان کے منتروں کے اثر سے انسان سے سانپ بنا دیا گیا ہوں۔"

کشمیری لیڈر کے چہرے پر حیرت اور تعجب کے آثار نمایاں ہوں رہے تھے۔ وہ آہستہ سے بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آیا تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے دھیمی آواز میں مختصر طور پر کشمیری لیڈر کو اپنی داستان بیان کی اور کہا۔

"اب میں آپ پر اپنا آپ ظاہر کر رہا ہوں۔"

اور میں اندھیرے کونے سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ کشمیری لیڈر نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سوکھی روٹی وہیں رکھ دی اور ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے کہا۔

"ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہارا دوست ہوں اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں میرا نام کرم داد ہے اور جہاد کشمیر کا مجاہد ہوں۔"

تھوڑی سی گفتگو کے بعد کشمیری لیڈر نے مجھے سانپ کے روپ میں ذہنی طور پر قبول کر لیا۔ ہم بڑی آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کشمیری لیڈر سے کہا۔

"میں آپ کو یہاں سے نکال کر لے جانا چاہتا ہوں۔ جنگل میں ہمارا ایک خفیہ ٹھکانہ ہے۔ آپ کو وہاں چھپا کر میں اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینے جاؤں گا اور پھر ہم رات کے اندھیرے میں آپ کو بھوپال لے جائیں گے۔"

کشمیری لیڈر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا تمہیں ابھی تک یقین نہیں آیا کہ میں انسان ہوں اور عارضی طور پر سانپ کی شکل اختیار کیے ہوئے ہوں؟"

کشمیری لیڈر نے کہا۔

"قربان جاؤں میں خدا کی قدرت کے۔ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں یہ میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ بھائی! مجھے یقین نہیں آ رہا لیکن یقین کرنا ہی پڑ رہا ہے۔ لیکن مجھے یہاں سے نکال کر لے جانا اتنا آسان نہیں ہے۔"

میں نے کشمیری لیڈر کو مختصر الفاظ میں سمجھا دیا تھا کہ ہماری کمانڈو پارٹی کا پلان کیا ہے۔ جب اس نے وہاں سے میرے ساتھ اکیلے فرار ہونے کی مشکلات کا ذکر کیا تو میں نے کہا۔

"سانپ کی حیثیت سے مجھے کچھ ایسی سہولتیں حاصل ہیں جو ہماری کمانڈو پارٹی کو حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ میں آپ کو یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔ صرف ہمیں رات کا اندھیرا ہو جانے کا انتظار کرنا ہوگا۔ تم مجھے یہ بتا دو کہ کیا رات کے وقت یہاں کوئی سنتری تمہارے لیے کچھ لے کر آتا ہے؟"

اس نے کہا۔

"ہاں ایک سنتری سوکھی روٹی اور چائے کا مگ لے کر آتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"تم نے یہ بتا کر میرا کام آسان کر دیا ہے کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی دروازے کے باہر لگی چٹخنی نہیں کھول سکتا۔ یہ کام رات کو آنے والا سنتری کرے گا اور وہی وقت ہمارے فرار کا ہوگا۔"

کشمیری لیڈر کو ابھی تک میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے میرے پلان کی کامیابی پر شک ہے۔ میں نے کہا۔

"سنتری باہر سے دروازے کو چٹخنی لگا گیا ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ دروازے میں کوئی درز یا سوراخ نہیں ہے کہ جہاں سے میں باہر نکل سکوں۔ ویسے بھی مجھے اکیلا یہاں سے نہیں نکلنا۔ تمہیں ساتھ لے کر جانا ہے اور اس کے لیے دروازے کی چٹخنی کا باہر سے کھلنا ضروری ہے اور یہ کام رات کو باہر سے آنا والا سنتری ہی کر سکتا ہے۔ ہمیں رات پڑنے کا انتظار کرنا ہوگا۔"

کشمیری لیڈر آہستہ آہستہ سوکھی روٹی کھا رہا تھا۔ اس نے ٹین کا مگ خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا اور ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا' اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے اور وہیں لیٹتے ہوئے بولا۔

"کمزوری کی وجہ سے میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا۔"

میں نے کہا۔

"تم بے شک آرام کرو۔ میں کونے میں چھپ جاتا ہوں۔"

"اور میں ٹارچر سیل کے کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔





اوپر بیرک میں فوجیوں کی آوازیں آنے لگیں۔

کشمیری لیڈر تو اسی طرح فرش پر پڑا رہا مگر میں ہوشیار ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں سٹریچر والے ٹارچر سیل میں ایک بھارتی سپاہی کو ڈس آیا ہوں اور ان لوگوں کو اس کی لاش کا علم ہو گیا ہو گا اور بہت ممکن ہے کہ وہ سانپ کو مارنے کے لیے اسے ادھر ادھر تلاش کر رہے ہوں کیونکہ بھارتی سپاہی کی لاش سے صاف ظاہر ہو رہا ہو گا کہ اسے سانپ نے کاٹا ہے۔ پچھلی سے پچھلی رات کو بھی میں نے دو سپاہیوں کو ڈس کر ہلاک کیا تھا اور ان کی لاشیں بھی کیمپ کے فوجیوں کو مل چکی تھیں۔ چنانچہ وہ اب یہ چاہتے ہوں گے کہ سانپ کہیں اسی جگہ بیرکوں میں کہیں چھپا ہوا ہے، اسے فوراً ہلاک کر دیا جائے تاکہ وہ کسی اور سپاہی کو نہ کاٹ لے۔

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ دو سپاہی دروازہ کھول کر سیڑھیاں اترنے لگے۔ میں تیزی سے دیوار پر چڑھ کر چھت کی کڑیوں میں ایک جگہ چھپ گیا۔ فوجی سپاہیوں نے اندر آ کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ میں نے دیکھا ایک فوجی کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں گھاس کاٹنے والا لمبا چھرا تھا۔ کشمیری لیڈر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک سپاہی نے کہا۔

"یہاں کوئی سانپ تو نہیں آیا؟"

کشمیری لیڈر نے کہا۔

"میں نے تو نہیں دیکھا۔"

دوسرا فوجی سپاہی بولا۔

"سانپ آتا تو اس کو ڈس کر مار نہ ڈالتا۔ چلو باہر جھاڑیوں میں چل کر دیکھتے ہیں۔"

پہلا فوجی کہنے لگا۔

"دیکھ لیتے ہیں' کہیں ادھر ادھر چھپا ہوا نہ ہو۔"

وہ سانپ سے ڈر بھی رہے تھے۔ بڑی احتیاط سے کوٹھڑی میں انہوں نے دائیں بائیں دیکھا اور جلدی سے سیڑھیوں کی طرف آ گئے۔

"یہاں نہیں ہے۔ جھاڑیوں میں ہی ہو گا۔"

جب وہ باہر نکل گئے اور انہوں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی تو کشمیری لیڈر نے اس کونے کی طرف دیکھا جہاں میں اس کے سامنے جا کر چھپ گیا تھا۔ میں چھت پر سے اتر کر نیچے آ گیا اور اسے دھیمی آواز میں ساری روئیداد سنا دی کہ کس طرح میں نے تھوڑی دیر پہلے اس انڈین فوجی کو بیرک میں ڈس کر موت کی نیند سلا دیا تھا جس نے مجھے بجلی کے جھٹکے دیئے تھے۔ کشمیری لیڈر میری طرف دیکھتا رہا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک سانپ انسان کی آواز میں کسی سے ہم کلام ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا۔

"میں اوپر چھت میں جا کر چھپ گیا تھا۔ میں نے ان سپاہیوں کی آوازیں سن لی تھیں۔"

میں نے کشمیری لیڈر کو بتا دیا تھا کہ میں کسی بھی وقت سانپ سے اپنی اصلی انسانی شکل میں واپس آ سکتا ہوں۔ اسے میری اس بات پر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ کوئی بھی یقین نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ سارا ماجرا ہوتے نہ دیکھ لے۔ میں نے کہا۔

"میں چھت میں جا کر ہی چھپ جاتا ہوں رات ہو جائے گی تو نیچے آ جاؤں گا۔ تم

اپنے آپ کو فرار کے لیے تیار کر لو۔"

کشمیری لیڈر پھر بھی کچھ نہ بولا اور میری طرف تکتا رہا۔ میں دیوار پر سے رینگ کر چھت میں جا کر چھپ گیا۔ کشمیری لیڈر اس طرح ٹانگیں سمیٹ کر فرش پر لیٹ گیا۔

دن گزرتا چلا گیا۔ تہہ خانے میں ہونے کی وجہ سے باہر کی آوازیں بہت کم سنائی دیتی تھیں۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر دن کتنا گزر گیا ہے۔ جس سنتری نے کشمیری لیڈر کے لیے سوکھی روٹی اور پانی یا گلی سڑی سبزیوں کا سوپ لے کر آنا تھا بس اسی کی آمد سے ہمیں معلوم ہونا تھا کہ باہر رات ہو گئی ہے۔ کیونکہ کشمیری لیڈر نے کہا تھا کہ اب سنتری رات کو ہی آئے گا۔ مجھے یہ بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر خدا نہ کرے میں چھت میں چھپے ہوئے اچانک انسانی شکل میں آ گیا تو دھڑام سے نیچے فرش پر گر پڑوں گا اور ہو سکتا ہے میری ٹانگ ٹوٹ جائے۔ پھر خیال آیا کہ میں یک لخت کبھی بھی انسان سے سانپ اور سانپ سے انسان کے روپ میں نہیں آیا۔ پہلے مجھے ہلکے ہلکے جھٹکے ضرور لگتے ہیں۔ چنانچہ اگر مجھے اس قسم کے جھٹکے لگتے محسوس ہوئے تو میں فوراً چھت سے اتر جاؤں گا لیکن خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ جب تک میں کشمیری لیڈر کو یہاں سے نکال کر نہیں لے جاتا سانپ ہی بنا رہوں۔

نہ دوپہر کا کچھ پتہ چلا' نہ یہ پتہ چلا کہ باہر شام ہو گئی ہے یا رات پڑ گئی ہے۔ وقت کافی گزر گیا تھا۔ تہہ خانے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں چوکنا ہو گیا اور نیچے دیکھنے لگا۔ سیڑھیوں پر قدموں کی آواز آئی۔ یہ دو بھارتی سپاہی تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ٹین کا مگ اور اس کے اوپر سوکھی روٹی رکھی ہوئی تھی۔ دوسرے نے سٹین گن اٹھائی ہوئی تھی۔ سٹین گن والا فوجی سیڑھیوں کے پاس ہی رک گیا۔ دوسرے فوجی نے مگ اور روٹی کشمیری لیڈر کے ہاتھوں میں دی اور کہا۔

"کیمپ کمانڈر صاحب نے کہا ہے آج روٹی چاہے کھا لو' صبح تمہیں شوٹ کر دیا جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور سٹین گن بردار سپاہی سے کہنے لگا۔
"جب تک قیدی راشن کھاتا ہے اس کو گارڈ کرو۔ یہ ٹین کا ڈبہ توڑ کر خودکشی نہ کر لے۔ مجھے کمانڈر صاحب کو جا کر رپورٹ کرنی ہے۔"
وہ چلا گیا۔ سٹین گن والا فوجی سیڑھیوں سے ہٹ کر کشمیری لیڈر کے سر پر آکر کھڑا ہو گیا۔ کشمیری لیڈر سر جھکائے فرش پر بیٹھا آہستہ آہستہ روٹی چبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلا سپاہی جو باہر گیا تھا اس نے تہہ خانے کا دروازہ ضرور بند کر دیا تھا مگر چٹخنی نہیں لگائی تھی کیونکہ مجھے چٹخنی لگانے کی آواز نہیں آئی تھی۔ ضرور باہر رات ہو گئی ہوگی۔ اب مجھے اپنا کمانڈو آپریشن شروع کرنا تھا۔ وقت زیادہ نہیں تھا۔ میں نے چھت کی کڑیوں میں سے انڈین فوجی کو دیکھا۔ پہلے تو وہ کشمیری لیڈر کے اردگرد ٹہلتا رہا۔ پھر اس کے بالکل سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور اسے غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔
میں چاہتا تھا کہ وہ پوزیشن میں آ جائے۔ میں چھت کی کڑیوں میں رینگ کر اس کے عقب میں دیوار کے پاس آ گیا۔ پھر بڑے آرام سے رینگتا ہوا دیوار سے اتر کر فرش پر آ گیا۔ میں نے ٹارگٹ پر حملے کا سارا نقشہ ذہن میں بنا لیا ہوا تھا۔ میں بھارتی سپاہی کی طرف اس کے عقب میں آگے بڑھا۔ وہ اسی طرح سٹین گن ہاتھ میں لیے کھڑا کشمیری لیڈر کو دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔
"کیوں دوسروں کی خاطر اپنی جان گنواتے ہو۔ صبح صبح تمہیں گولی مار دی جائے گی۔ کیمپ کمانڈر کو اپنے ساتھیوں کے نام پتے بتا دو' نہیں تو مجھے ہی بتا دو' تمہاری جان بچ جائے گی۔"
کشمیری لیڈر نے کوئی جواب نہ دیا اور آہستہ آہستہ روٹی چبا کر نگلنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر وہ چائے پینے لگا۔ اس دوران میں فرش پر رینگتا ہوا بھارتی سپاہی کے فوجی بوٹوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں اسے پتلون کے اندر جا کر پنڈلی پر ڈسنا چاہتا تھا۔ میں اس کے بوٹوں پر چڑھ گیا۔ کشمیری لیڈر مجھے برابر دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ فوجی سپاہی کے بوٹ اتنے بھاری تھے کہ اسے سانپ کے چڑھنے اور رینگنے کا بالکل احساس نہ

ہوا۔ اس کی پتلون کا پائنچہ میرے اوپر تھا۔ آدھی پنڈلی خاکی رنگ کی موٹی جرابوں میں چھپی ہوئی تھی۔ یہ اونی جرابیں تھیں اور میرے دانت ان میں سے گزر کر فوجی کی پنڈلی میں کھب سکتے تھے۔

میں نے ایک لمحہ بھی اب ضائع نہ کیا اور بجلی ایسی تیزی سے اس کی پنڈلی پر ڈس دیا۔ ڈسا بھی اتنی شدت سے کہ ضرورت سے زیادہ زہر اس کے خون میں شامل کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے زہر کا پہلا اثر یہ ہوتا تھا کہ آدمی کا سارا بدن سن ہو جاتا تھا اور وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ گر پڑتا تھا اور اس کے ناک اور منہ سے خون جاری ہوجاتا تھا اور اس کے بعد جسم پھٹنے لگتا تھا۔ اس انڈین فوجی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ غنیمت ہوئی کہ وہ کشمیری لیڈر کے اوپر نہیں گرا بلکہ پہلو کی طرف گرا۔

میں نے کشمیری لیڈر سے کہا۔

"غلام حسین! سٹین گن اٹھا لو۔ میں تمہارے کندھے پر آ رہا ہوں۔"

کشمیری لیڈر جلدی سے اٹھا اس نے فرش پر گرے ہوئے بھارتی فوجی کی سٹین گن اٹھا لی۔ میں فوجی کی پتلون سے باہر آ گیا تھا۔ میں اچھل کر کشمیری لیڈر کے کندھے سے چمٹ گیا وہ ذرا گھبرایا۔ میں نے کہا۔

"گھبراؤ نہیں اور جلدی سے اوپر چلو۔ فکر نہ کرو۔ میں سانپ ہونے کی وجہ سے اندھیرے میں دیکھ سکتا ہوں۔ تمہیں جدھر چلنے کو کہوں ادھر کو ہی چلنا۔"

کشمیری لیڈر کوئی اناڑی نہیں تھا۔ باقاعدہ تربیت یافتہ کمانڈو تھا اور مقبوضہ کشمیر کے محاذ پر انڈین آرمی کے ساتھ لڑ چکا تھا۔ رہائی کا سنہری موقع دیکھ کر اس میں تھوڑی بہت طاقت بھی آ گئی تھی۔ آہستہ سے بولا۔

"ایسا ہی کروں گا۔ فکر کی بات نہیں۔"

وہ سٹین گن ہاتھوں میں پکڑے تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کے پاس آ کر رک گیا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔

"دروازے کو ذرا سا باہر کو دھکیلو۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے کہا۔

"میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔ تم اسی جگہ چھپ کر بیٹھ جاؤ۔"

وہ وہیں سیڑھیوں میں بیٹھ گیا۔ میں اس کے کندھے سے اترا اور ذرا سے کھلے دروازے میں سے باہر نکل گیا۔ باہر رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ کچھ فاصلے پر دونوں بیرکوں کی بتیاں روشن تھیں۔ کوارٹر گارڈ اور لنگر خانے کی طرف بھی روشنی ہو رہی تھی۔ کسی فوجی گاڑی کا انجن ایک دم سٹارٹ ہوا اور پھر اپنے آپ رک گیا۔ دور سے کسی بھارتی فوجی کے کسی کو بلانے کی آواز آئی۔ میں نے واپس آ کر کشمیری لیڈر کو ساتھ لیا اور اسے بیرک میں سے نکال کر دیوار کے عقب میں لے آیا۔ باہر کوئی سنتری نہیں تھا۔ شاید وہی سنتری گارڈ ڈیوٹی پر تھا جس کو میں نے تہہ خانے میں ہلاک کر ڈالا تھا۔ اس کو تہہ خانے کے باہر گارڈ ڈیوٹی پر واپس آنا تھا۔ بیرکوں کے پیچھے جو درخت اور جھاڑیاں تھیں وہاں اندھیرا تھا۔ میں نے کشمیری لیڈر سے کہا۔

"ان درختوں میں سامنے کی طرف چلنا شروع کرو۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ سٹین گن پوزیشن میں کیے تجربہ کار سپاہیوں کی طرح جھک جھک کر قدم قدم چل رہا تھا۔ میں اسے اسی طرح چلتا ہوا خاردار تاروں والی دیوار کے پاس لے آیا۔ ظاہر ہے اس کے پاس تار کاٹنے والا کوئی اوزار نہیں تھا اور میں اسے خاردار باڑھ میں سے نہیں نکال سکتا تھا۔ میرا ٹارگٹ فوجی کیمپ کا گیٹ تھا۔ صرف اس گیٹ میں سے میں اسے باہر نکال سکتا تھا۔ وہاں سے باہر نکلنے کی دوسری کوئی جگہ نہیں تھی، کوئی راستہ نہیں تھا اور اس فوجی کیمپ کے گیٹ سے ایک خطرناک زیر حراست کشمیری مجاہد کا نکل جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہر قدم پر اس کی موت کا خطرہ تھا۔ یہ میں دیکھ چکا تھا اور ہمیں ریکی کے دوران معلوم ہو چکا تھا کہ اس فوجی کیمپ میں رات کو صرف ایک سنتری پہرہ دیتا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کوئی باقاعدہ فوجی کیمپ نہیں تھا۔ یہ ایک بھارتی فوجی

ٹارچر سیل تھا جس کی حفاظت اور ملٹری انٹیلی جینس کی طرف سے انیٹروگیشن اور ٹارچر کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے پونا ہارس کی ایک انڈین پلاٹون تعینات کی ہوئی تھی۔ چنانچہ گیٹ پر سخت سیکورٹی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ گیٹ پر کوئی گارڈ روم بھی نہیں تھا۔ چھوٹا سا ایک کھوکھا ایک طرف بنا ہوا تھا جہاں گارڈ سنتری بارش کے وقت آ جاتا تھا لیکن کوارٹر گارڈ وہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا اور اگر مجھ سے ذرا سی بے احتیاطی ہو جاتی ہے تو سنتری گارڈ فائر کر کے سارے کیمپ کو الرٹ کر سکتا تھا اور ہمیں گھیرے میں لیا جاسکتا تھا۔ سٹین گن کا میگزین زیاہ دیر تک کشمیری لیڈر کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ یہ سارے حقائق میرے ذہن میں تھے اور مجھے ایک ایک قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا۔ میں کشمیری لیڈر کے کندھے سے چمٹا ہوا تھا اور سر اٹھا کر سامنے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا چونکہ مجھے اندھیرے میں ایک ایک چیز ایک ایک درخت صاف نظر آ رہا تھا اس لیے میں کشمیری لیڈر کو بڑی اچھی طرح گائیڈ کر رہا تھا۔

ہم خاردار تاروں کے بالکل ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ کشمیری لیڈر جھک کر چل رہا تھا۔ کیمپ کے گیٹ کے قریب پہنچ کر میں نے کشمیری لیڈر سے کہا۔

"یہاں جھاڑیوں میں بیٹھ جاؤ۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔ کچھ بھی ہو جائے فائر مت کرنا۔"

میں خاردار تاروں کے ساتھ ساتھ رینگتا گیٹ کے پاس آ گیا۔ مجھے کوئی اتنی جلدی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ گارڈ ڈیوٹی پر جو سنتری تھا وہ بند گیٹ کے آگے ٹہل رہا تھا۔ یہ گیٹ زمین سے تین چار فٹ اونچا تھا اور بانسوں کو آڑھے ترچھے لگا کر بنایا گیا تھا۔ یہ کوئی باقاعدہ دروازہ نہیں تھا۔ محض رکاوٹ کے طور پر لگایا گیا تھا۔ چاروں طرف میں نے نگاہیں دوڑائیں۔ صرف کوارٹر گارڈ کے پاس دو فوجی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے وہاں سے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بیرکوں کی طرف چل پڑے۔ اب میری ساری توجہ گیٹ کے سنتری کی طرف تھی۔ میں اس کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ میرا ٹارگٹ تھا جس پر مجھے حملہ کرنا تھا۔ وہ کسی جگہ رکتا نہیں تھا۔

چار قدم چل کر گیٹ کے اس طرف آتا تھا پھر ٹہلتا ہوا گیٹ کی دوسری طرف چلا جاتا تھا۔ سٹین گن اس نے کندھے سے لٹکائی ہوئی تھی۔ مجھے صرف یہی ٹارگٹ مارنا تھا۔ آگے راستہ صاف تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں کشمیری لیڈر کو اتنی جلدی ٹارچر سیل سے نکال کر لے آیا ہوں۔ تہہ خانے میں انڈین سپاہی کی لاش پڑی تھی۔ اس کی خبر صبح ہی کسی کو ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کسی کو خیال آ جائے کہ فلاں جوان زیر حراست قیدی کا کھانا لے کر آگیا تھا ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا۔ اگر اب تک کسی کو خبر نہیں ہوئی تھی تو دن نکلنے پر ہی لاش مل سکتی تھی۔ لاش کی مجھے زیادہ فکر اس لیے نہیں تھی کہ اسے بھی سانپ نے ہی کاٹا تھا اور اس لاش کو بھی سانپ کے کھاتے میں ہی پڑنا تھا۔

میں رینگتا ہوا اندھیرے میں سے ہو کر گیٹ کے پیچھے آیا اور گیٹ پر جو آڑے ترچھے بانس لگے تھے ان پر چڑھ گیا۔ میں ایسی پوزیشن میں بیٹھ گیا کہ جہاں سے میں قریب سے گزرتے ہوئے سنتری پر آسانی سے حملہ کر سکتا تھا۔ سنتری ٹہلتا ہوا گیٹ کی ایک طرف گیا۔ وہاں تھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ خدا جانے وہ کیا کر رہا تھا کبھی جھک کر زمین پر دیکھتا کبھی وردی کی جیب کو ٹٹولتا۔ میں دل میں اسے برا بھلا کہنے لگا کہ کم بخت اتنی دیر کیوں لگا رہا ہے۔ آخر وہ واپس مڑا۔ آرام آرام سے ٹہلتا جیسے ہی میرے قریب سے گزر کر ایک قدم آگے ہوا میں نے اس کی گردن پر چھلانگ لگا دی۔ مجھے صرف اتنا کمال دکھانا تھا کہ اس سے پہلے کہ سنتری کی آواز نکلے یا وہ ہاتھ اوپر کر کے مجھے گردن سے جھاڑے یا الگ کرنے کی کوشش کرے اس وقت تک میں اپنا کام کر لوں۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ کچھ مجھے اس ایکشن کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ بھارتی سنتری کی گردن سے چمٹنا اور اس کی گردن پر ڈسنا یہ دونوں کام ایک ہی وقت میں ہو گئے۔ گلے پر ڈسنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے اس کی آواز بند ہو گئی تھی۔ میں ابھی تک اس کی گردن سے ہی چمٹا ہوا تھا کہ اس کے جسم نے لرزنا شروع کر دیا۔ مجھے آج تک

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا جسم اتنی شدت سے کیوں لرزا تھا۔ وہ لرزتے ہوئے ایک طرف کو گھوم گیا۔ میں نے اس کی گردن سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ زمین پر گر پڑا اور زمین پر ہی لرزنے لگا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ میں تیزی سے اس کے منہ کے پاس گیا۔ اس کا سانس بند ہو چکا تھا۔

اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں جلدی جلدی اس جھاڑی کے پاس گیا جہاں کشمیری لیڈر سٹین گن لیے بیٹھا اندھیرے میں گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کو میں نظر نہیں آیا۔ میں نے قریب جا کر آہستہ سے کہا۔

"سنتری مر چکا ہے۔ آ جاؤ۔"

وہ اٹھنے لگا تو میں نے اسے سختی سے کہا۔

"غلام حسین جھک کر چلو۔ کوارٹر گارڈ کا سنتری دیکھ لے گا۔ گیٹ پر سے اسی طرح کود جانا۔ چلو۔"

میں اچھل کر اس کے کندھے سے چمٹ گیا۔ کشمیری لیڈر نے گارڈ سنتری کو گرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا جھک کر چلتا گیٹ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"بیٹھنے کا وقت نہیں ہے غلام حسین۔ گیٹ پر سے کود جاؤ۔"

وہ اٹھا اور گیٹ کے اوپر سے باہر کی طرف کود گیا۔ میں نے کہا۔

"بائیں جانب اندھیرے میں بھاگ چلو۔"

وہ اسی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان اندھیرے میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میں اس کے کندھے سے چمٹا اندھیرے میں اس کی راہ نمائی کر رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔ اب بائیں جانب مڑ جاؤ' اب دائیں جانب ہو جاؤ کیونکہ مجھے سارے راستے کا علم تھا۔ ہم درختوں میں سے نکل کر اونچے نیچے چھوٹے ٹیلوں میں آ گئے۔ یہ ٹیلے نہیں تھے۔ وہاں سے زمین اونچی نیچی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"غلام حسین تھکنا بالکل نہیں۔ تمہیں کم از کم آدھے گھنٹے تک دوڑتے چلے جانا

ہے۔"

اس کا سانس پھول گیا تھا۔ بھارتی درندوں نے اسے اس قدر اذیتیں دی تھیں' اتنا ٹارچر کیا تھا اور اتنے فاقے کرائے تھے کہ اس کے جسم کی آدھی طاقت ضائع ہو گئی تھی۔ پھر بھی اس نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میں اللہ کا سپاہی ہوں' اللہ میری مدد کرے گا۔"

وہ دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ کیونکہ وہاں جھاڑیاں زیادہ گنجان نہیں تھیں اور پگڈنڈیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ یہ پگڈنڈیاں مجھے اندھیرے میں صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں اسے ان پر دوڑا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے ہم فوجی کیمپ سے دور نکل جائیں۔ کیونکہ گارڈ سنتری کی لاش ملنے پر وہاں ہنگامی صورت حال پیدا ہو سکتی تھی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ ہانپنے لگا ہے تو میں نے اسے کہا۔

"غلام حسین! تھوڑی دیر رک جاؤ۔"

وہ وہیں بیٹھ گیا۔ سٹین گن اس نے زمین پر رکھ دی۔ میں نے کہا۔

"میں تمہیں صرف دو منٹ دیتا ہوں۔ اتنی دیر تم سانس لے لو۔ میں پیچھے جا کر دیکھتا ہوں کہ کوئی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا۔"

میں اس کے کندھے سے اتر کر عقب میں ٹیلوں کی طرف نکل گیا۔ میں نے دو منٹ تک قریب کا علاقہ اچھی طرح سے دیکھ لیا' وہاں کوئی نہیں تھا۔ کیمپ کی روشنیاں ٹیلے کی اوٹ میں ہو گئی تھیں۔ میں جلدی جلدی کشمیری لیڈر کے پاس آ گیا۔ اس کا سانس کچھ درست ہو گیا تھا۔ میں نے جاتے ہی کہا۔

"پیچھے سب ٹھیک ہے۔ اب چل پڑو۔"

میں اس کے کندھے پر آ گیا۔ کشمیری لیڈر نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری کمانڈو پارٹی کا ہائیڈ آؤٹ کتنی دور ہے؟"

میں نے کہا۔

"زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں ہماری پارٹی کا شاید ہی کوئی آدمی ہو لیکن میں ہائیڈ

آؤٹ چیک ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ اب دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے' بس ذرا تیز تیز چلو۔ سامنے جو درخت ہیں ان کے درمیان سے ہوتے ہوئے دائیں جانب مڑ جانا۔ آگے ایک چھوٹی ندی آئے گی۔"

وہ تیز تیز چلتا جا رہا تھا۔ میں اپنی نظروں سے اسے راستہ دکھا رہا تھا۔ درختوں میں سے گزرنے کے بعد ندی آگئی۔ ہماری کمانڈو پارٹی اسی ندی کے چھوٹے سے پل سے گزر کر فوجی کیمپ کی طرف گئی تھی۔ اس ندی کو دیکھ کر میری بھی تسلی ہوگئی کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔ ہم نے ندی پار کر لی اور سامنے والے جنگل میں داخل ہوگئے۔ کشمیری لیڈر نے کہا۔

"یہاں بڑا اندھیرا ہے۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

میں نے کہا۔

"تمہاری طرف سے میں دیکھ رہا ہوں۔ قدم اٹھاؤ۔ سامنے جھاڑیاں ہی ہیں۔ ان کے درمیان سے گزرتے جاؤ۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔ یہ جنگل واقعی بڑا خطرناک تھا۔ جھاڑیوں کے بعد درخت ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے کہ گزرنا مشکل تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں کہیں غلط راستے پر تو نہیں آگیا۔ لیکن ایک جگہ مجھے ستون کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی ایک کالی چٹان نظر پڑی۔ یہ چٹان ہماری کمانڈو پارٹی کو بھی ملی تھی اور ہم اس کے قریب سے گزرے تھے۔ میرا اعتماد بحال ہوگیا۔ اب مجھے یاد آگیا کہ ہمارا خفیہ ہائیڈ آؤٹ اس جنگل کے دوسرے کنارے پر تھا کچھ ٹیلے ایک دوسرے کے بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ ہم نے یہ گھنا جنگل قریباً" آدھے گھنٹے میں طے کیا۔ یہ دھڑکا بھی مجھے لگا تھا کہ کسی طرف سے کوئی جنگلی درندہ نہ نکل آئے۔ ان جنگلوں میں شیر اور چیتے کثرت سے پائے جاتے ہیں لیکن خدا کا شکر رہا' راستے میں کوئی شیر چیتا نہ ملا اور ہم اپنے ہائیڈ آؤٹ کے پاس گئے۔ دو ٹیلے بالکل ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ایک کی ڈھلان ختم ہوتی تھی تو دوسرے ٹیلے کی چڑھائی شروع ہوجاتی تھی۔ ان کے پیچھے ایک جگہ کمانڈو خالد اور ان کے

ساتھیوں نے ایک خفیہ ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ میں وہاں ان کے ساتھ آ چکا تھا۔ جب ہم خفیہ ٹھکانے میں داخل ہوئے تو وہ خالی پڑا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ کشمیری لیڈر بیٹھ گیا۔

کہنے لگا۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے۔"

میں نے اسے بتایا کہ کمانڈو پارٹی میرا دو دن انتظار کرنے کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق یہاں سے بھوپال روانہ ہو گئی ہو گی۔ وہ کہنے لگا۔

"بھوپال تو یہاں سے کافی دور ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"اتنی دور بھی نہیں ہے۔ آگے ایک قصبہ ہے جہاں سے لاریاں اور یکے بھوپال کی طرف جاتے ہیں۔ مگر ہم اس طرف نہیں جائیں گے۔"

"تو پھر بھوپال کیسے پہنچیں گے؟" اس نے پوچھا۔

میں خود یہی سوچ رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر غور کیا اور پھر کہا۔

"غلام حسین! میرا خیال ہے ہمیں قصبے کی طرف ہی نکل جانا چاہیے۔ اگر ہم نے دیر کر دی اور فوجی کیمپ میں تمہارے فرار کا کیمپ کمانڈر کو علم ہو گیا تو پھر ہمارا بھوپال پہنچنا ناممکن ہو گا۔ کیمپ کی پلٹن اس علاقے کو گھیرے میں لے لے گی۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو پھر دیر نہ کرو کرم داد۔ ابھی نکل چلتے ہیں۔"

ہم نے بڑی عقلمندی سے کام لیا تھا۔ ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ ہم اسی وقت خفیہ ٹھکانے سے نکل کر قصبے کی سمت روانہ ہو گئے۔ جنگل ختم ہو گیا تھا اور اونچا نیچا میدانی علاقہ اور کھیت شروع ہو گئے تھے۔ ہم میدانوں کو عبور کر کے کھیتوں میں سے گزرنے لگے۔ کچھ دیر رکنے کے بعد دور سے قصبے کی ٹمٹماتی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ قصبے میں جا کر معلوم ہوا کہ ابھی رات کے گیارہ بھی نہیں بجے۔ مشکل یہ پیش

آئی کہ کشمیری لیڈر کے پاس لاری کا کرایہ نہیں تھا۔ اس کا حلیہ بھی مفرور قیدیوں والا تھا۔ میں سانپ کی شکل میں تھا۔ قصبے کے باہر ایک جگہ ایک لاری کھڑی تھی جس میں کچھ مسافر بیٹھے ہوئے تھے اور اوپر سامان لدا ہوا تھا۔ میں نے غلام حسین سے کہا۔

"وہاں چل کر کسی سے پوچھو کہ یہ لاری کہاں جا رہی ہے۔ بس تم صرف اتنا ہی پوچھنا۔ آگے کوئی بات نہ کرنا۔"

وہ لاری کے پاس آ گیا۔ ایک ہندو لالہ جس نے ہندو لالوں کی طرح دھوتی باندھ رکھی تھی لاری کے آگے ڈرائیور کے پاس کھڑا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ کشمیری لیڈر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ لالہ ڈرائیور سے کہہ رہا تھا۔

"بھوپال جاتے ہی گنگا دیوی سے کہنا کہ میری طرف سے بھگوان شو کے مندر میں پانچ سیر لڈو پجاریوں کو خود جا کر دے آئے اور لاری تیز مت چلانا۔ ابھی میں نے اس کی انشورنس نہیں کرائی۔ سمجھ گئے؟"

ڈرائیور نے بیڑی کا کش لگا کر کہا۔

"سمجھ گیا مالک۔"

"بس دو چار منٹ سواریوں کو دیکھ لو' نہ ملیں تو چل پڑنا۔ زیادہ رات ہو جائے گی۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ لالہ اس لاری کا مالک ہے اور یہ لاری بھوپال جا رہی ہے۔ لالہ لاری سے ہٹ کر اڈے کی طرف جانے لگا تو کشمیری لیڈر سے پوچھا۔

"کیا بات ہے جی۔ بھوپال جانا ہے تو بیٹھ جاؤ لاری میں۔"

میں نے انسانی آواز میں لالہ سے کہا۔

"اوم نمشوا! لالہ یہ آدمی میرا بھگت ہے۔ میں شو جی مہاراج کا سانپ ہوں۔"

اور یہ کہہ کر میں نے کشمیری لیڈر کے کندھے پر بیٹھے بیٹھے اپنا پھن پھیلا لیا۔ لالہ اس وقت لاری سے کوئی چھ سات قدم کے فاصلے پر ذرا اندھیرے میں تھا۔ لاری کا ڈرائیور لاری کی دوسری جانب کھڑا اپنے کلینر سے باتیں کر رہا تھا۔ لالہ نے ایک آدمی

کے کندھے پر پھن دار سانپ کو دیکھا تو تھر تھر کانپنے لگا۔ میں نے کہا۔

"ڈرو نہیں بالک! مجھے معلوم ہے تم بھی شو جی مہاراج کے بھگت ہو۔ مجھے شو جی نے تمہارے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ ہمارے اس بھگت کو اپنی لاری میں بھوپال پہنچا دو۔"

میرے لیے یہ اداکاری کرنی کوئی مشکل نہیں تھی۔ میں ایسا بڑی آسانی سے کر سکتا تھا۔ میں سانپ کی شکل میں تھا۔ میں انسانوں کی آواز میں باتیں کر سکتا تھا اور یہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندو شو جی مہاراج کو بھگوان کا ایک روپ مانتے ہیں اور شو جی مہاراج کے سر پر ہمیشہ ایک سانپ جٹاؤں میں پھن کھولے بیٹھا رہتا تھا۔

ہندو لالہ تو ہاتھ جوڑنے لگا۔ بولا۔

"مہاراج! میرے دھن بھاگ کہ میں شو جی مہاراج کے بھگتوں کی کوئی سیوا کروں۔"

میں نے کہا۔

"یہ بات کسی کو مت بتانا کہ تم نے شو جی مہاراج کے ناگ سے باتیں کی تھیں۔"

لالہ تھرتھراتی آواز میں بولا۔

"مہاراج میں کسی سے کوئی بات نہیں کروں گا۔ پدھاریئے مہاراج!"

اس نے کشمیری لیڈر کے آگے ہاتھ باندھ کر کہا۔ میں نے کشمیری لیڈر سے کہا۔

"شو جی کے بھگت! ہم نے اپنا وچن پورا کر دیا۔ لالہ جی کی لاری میں بیٹھ کر بھوپال پہنچ جاؤ۔ چلو۔"

کشمیری لیڈر غلام حسین نے اس قسم کے مکالے بھلا پہلے کہاں سنے ہوں گے۔ وہ ایک با عمل مجاہد تھا اور دشمن سے جنگ کر رہا تھا۔ حیران ہو کر ہماری باتیں سنتا رہا۔ جب میں نے اسے لاری میں سوار ہونے کو کہا تو وہ جلدی سے لاری کی طرف چل پڑا۔ لالہ جی اس کے آگے آگے تھے۔ لالہ جی نے جاتے ہی ڈرائیور سے کہا۔

"ملکی داس! یہ ہمارے مہمان ہیں' خاص مہمان ہیں۔ انہیں بڑے آرام سے اپنے ساتھ بٹھا کر بھوپال پہنچا دو۔"

ڈرائیور بولا۔

"مگر لالہ جی! فرنٹ سیٹ تو بک ہو چکی ہے۔"

لالہ جی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"جس کی سیٹ ہے اس کو پیسے واپس کر دو۔ میرے مہمان کو فرنٹ سیٹ پر بٹھاؤ۔"

ڈرائیور نے بہت اچھا لالہ جی کہہ کر کشمیری لیڈر سے کہا۔

"آ جاؤ جی——"

میں اس دوران کشمیری لیڈر کی قمیض کے اندر چھپ گیا تھا۔ کشمیری لیڈر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لالہ جی ہاتھ باندھے قریب آکر بولا۔

"مہاراج! مجھے کوئی سیوا بتائیں۔"

کشمیری لیڈر نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں' کوئی بات نہیں۔"

ڈرائیور نے لاری سٹارٹ کر دی۔

جس وقت ہم بھوپال پہنچے رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ لاری اڈے پر کشمیری لیڈر اتر گیا۔ میں نے اس سے کہا۔

"جس طرف میں کہوں اس طرف چلتے جانا۔"

یہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ رات کی تاریکی میری نگاہوں میں حائل نہیں ہو رہی تھی۔ میں اسے شہر سے باہر بارہ دری کے کھنڈر پر لے آیا۔ یہاں سے کمانڈ خالد کی کمین گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔ جیسے ہی ہم کمین گاہ کے پاس آئے دو آدمیوں نے اندھیرے سے نکل کر کشمیری لیڈر کو گھیر لیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟ کون ہو تم؟"

میں نے اندھیرے میں ان لوگوں کو پہچان لیا۔ یہ ہماری کمانڈو پارٹی کے جوان تھے۔ ان میں کمانڈو ارشد بھی تھا۔ ان لوگوں نے مجھے سانپ کے روپ میں دیکھا ہوا تھا۔ میں جلدی سے کشمیری لیڈر کی قمیض سے نکل کر اس کے کندھے پر آگیا اور انسانی آواز میں کہا۔

"میں کرم داد ہوں! یہ کشمیری لیڈر غلام حسین ہے۔"

کمانڈو ارشد نے شین گن نیچے کرلی اور کہا۔

"خدا کا شکر ہے تم لوگ خیریت سے پہنچ گئے۔ اندر آ جاؤ کمانڈو خالد حجرے میں ہے۔"

کمانڈو خالد حجرے میں سو رہا تھا۔ اسے ارشد نے جگا دیا اور کہا۔

"کرم داد! کشمیری لیڈر کو لے کر آگیا ہے۔"

کمانڈو ارشد نے لالٹین کی بتی اونچی کر دی۔ کمانڈو خالد آنکھیں ملتے ہوئے کشمیری لیڈر کو دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔

"خالد بھائی! یہ ہمارا کشمیری لیڈر غلام حسین وائیں ہے۔"

کشمیری لیڈر سے بھی میں نے خالد کا تعارف کرایا۔ دونوں ایک دوسرے سے گلے لگ کر ملے۔

"کرم داد! تم نے کمال کر دکھایا کہ غلام حسین کو وہاں سے نکال کر لے آئے۔ ہم نے تمہارے سگنل کی آواز سن لی تھی۔ سمجھ گئے تھے کہ تم کسی مشکل میں پھنس گئے ہو مگر ہم تمہاری مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ مجبوراً" وہاں سے چل دیے۔ ہائیڈ آؤٹ میں آکر ہم نے دو دن تک تمہارا انتظار کیا۔ جب تم نہ آئے تو واپس بھوپال آ گئے۔"

میں نے کمانڈو خالد کو اپنی ساری روئیداد سنائی تو وہ بولا۔

"اس دفعہ خدا نے تمہاری مدد کی تم عین وقت پر سانپ کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔"

میں نے کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا خالد بھائی یہ میرے لیے مصیبت بھی ہے اور اس سے مصیبت دور بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب میں اس بار بار کی کایا پلٹ سے سخت تنگ آ چکا ہوں۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"جس روز اللہ نے چاہا تمہاری مشکل آسان ہو جائے گی۔"

میں نے اپنی بیوی جمیلہ کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

"جمیلہ بھابی تمہارے لیے بڑی پریشان تھی۔ لیکن میں نے اسے نہیں بتایا کہ تم فوجی کیمپ میں رہ گئے ہو۔ میں نے یہی کہا کہ ایک ضروری کام سے تمہیں بمبئی جانا پڑ گیا ہے۔ اب تم بھی اسے یہی بتانا کہ تم بمبئی سے آئے ہو۔"

میں نے کہا۔

"کاش! میں آدمی کی شکل میں ہوتا اور کرم داد بن کر اس سے ملتا۔ سانپ بن کر ملنے سے جمیلہ کو بھی دکھ ہوتا ہے۔"

کشمیری لیڈر غلام حسین میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مجھے ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا کہ میں ایک سانپ کو انسان کی آواز میں باتیں کرتے دیکھ رہا ہوں۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ آپ دشمن کی قید سے رہا ہو کر ہمارے پاس آ گئے۔ جس طرح میں آپ کے سامنے بیٹھا آپ سے گفتگو کر رہا ہوں یقین کریں اسی طرح ہمارا مجاہد ساتھی کرم داد بھی آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔"

میں نے کشمیری لیڈر سے پوچھا۔

"اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

وہ بولا۔

"میں جتنی جلدی ہو سکے واپس جانا چاہتا ہوں۔ کشمیر کے جہاد میں میرے ساتھیوں کو میری ضرورت ہے۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"انشاء اللہ ہم آپ کو کل رات کو کشمیر کی طرف روانہ کر دیں گے۔ ہمارے دو کمانڈو آپ کی حفاظت کے لیے ساتھ جائیں گے۔"

اس وقت وہاں کھانا آ گیا۔ کشمیری لیڈر کو ہم نے سیر ہو کر کھانا کھلایا' چائے پلائی وہ کہنے لگا۔

"ایک مدت کے بعد میں نے کھانا کھایا ہے۔ انڈین آرمی نے مجھ پر ہر قسم کا تشدد کیا اگر کرم داد میری مدد کو نہ پہنچتا تو آج رات کے پچھلے پہر اُن لوگوں نے مجھے شوٹ کر دینا تھا۔"

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد کشمیری لیڈر کو ہم نے وہیں ایک طرف سلا دیا۔ کمانڈو خالد بھی سو گیا۔ میں کونے میں بیٹھا جاگتا رہا اور صبح ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ دوسرے دن جمیلہ مجھ سے ملنے کے لیے آ گئی۔ مجھے سانپ کے روپ میں دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی لیکن میری آواز سن کر اس کا چہرہ کھل گیا۔ کہنے لگی۔

"تم اکیلے بمبئی کیوں چلے گئے تھے؟ اگر راستے میں کوئی سپیرا تمہیں پکڑ لیتا تو میں کیا کرتی۔"

میں نے کہا۔

"میں اکیلا نہیں گیا تھا جمیلہ۔ اپنا ایک آدمی میرے ساتھ تھا۔"

جمیلہ دوپہر تک ہمارے پاس ہی رہی۔ پھر وہ کمانڈ خالد کی سسٹر کے ہاں چلی گئی۔ وہ مجھ سے پوچھتی رہی کہ پاکستان کب جانا ہوگا۔ میں نے اسے کہا کہ انشاء اللہ بہت جلد ہم پاکستان کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن میں جب تک بنگال کے مکتی باہنی والوں سے مسلمان خواتین کی بے حرمتی اور ان کے اغوا کا بدلہ نہیں لے لیتا میں پاکستان کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات میں نے جمیلہ کو نہیں بتائی تھی۔ کمانڈو خالد کو یہ

سب کچھ معلوم تھا۔

اسی روز رات کے اندھیرے میں کمانڈو خالد نے اپنے دو بڑے تجربہ کار اور تربیت یافتہ کمانڈوز کے ساتھ کشمیری لیڈر غلام حسین کو سری نگر کی طرف روانہ کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کرم داد بھائی! اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں مکتی باہنی سے بدلہ لیے بغیر پاکستان نہیں جاسکتا۔ میرا پلان یہ ہے کہ یہاں سے کلکتے جاؤں گا اور جہاں جہاں مکتی باہنی والے ہیں انہیں تلاش کر کے ایک ایک کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا اور اگر مجھے اغوا کی ہوئی کسی پاکستانی خاتون کا سراغ ملا تو میں اسے نکال کر اپنے ساتھ پاکستان لے جانے کی کوشش کروں گا۔

کمانڈو خالد نے کہا۔

"تم مکتی باہنی والوں کو کہاں تلاش کرو گے۔ کلکتہ بڑا وسیع شہر ہے۔"

میں نے کہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ مجھے تین مکتی باہنی بدمعاشوں کے ٹھکانے کا علم ہے۔ سب سے پہلے میں انہیں ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر دوسرے لوگوں کا سراغ نہ بھی ملا تو کم از کم ان بدمعاشوں سے تو میں ضرورت بدلہ لوں گا جن کو میں دیکھ چکا ہوں اور جن کے ٹھکانے کا مجھے علم ہے۔"

"ایسی بات ہے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

کمانڈ خالد کی اس بہادرانہ پیش کش پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

میں نے کہا۔

"تم میرے ساتھ ہوگے تو میرا کام آسان ہو جائے گا کیونکہ میں وہاں بہو بازار والے حاجی فرید صاحب کے ہاں نہیں ٹھہرنا چاہتا۔"

کمانڈ خالد کہنے لگا۔

"ہمیں کسی واقف کے ہاں ٹھہرنا بھی نہیں چاہیے۔ ہم ایک خطرناک اور خفیہ

مشن پر جا رہے ہیں۔ وہاں ہمارا ایک آدمی موجود ہے۔ ہم اسی کے پاس ٹھہریں گے۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر اسے تم آج ہی اطلاع کر دو۔ ہم کل یہاں سے چل پڑیں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے مزید دیر کر دی تو ہو سکتا ہے کہ مکتی باہنی کے بدمعاش کلکتے سے کسی دوسرے شہر چلے جائیں۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"ٹھیک ہے ہم کل شام کو جانے والی گاڑی پکڑیں گے۔"

"میں جمیلہ کو بتائے بغیر اس مشن پر جانا چاہتا ہوں۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔ "اوکے' میں اسے کہہ دوں گا کہ ہم پاکستان جانے کے سلسلے میں ایک آدمی سے ملنے امرتسر جا رہے ہیں۔"

ہم نے کلکتے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ کمانڈو خالد نے بنگالیوں کا پہناوا دھوتی کرتہ پہن لیا۔ موسم بھوپال میں بھی بدلنے لگا تھا۔ سردی کم ہونا شروع ہوگئی تھی۔ بنگال میں باقاعدہ گرمیوں کا موسم تھا۔ کمانڈو خالد نے جمیلہ کو شام کے وقت پیغام بھجوایا کہ مجھے اور کرم داد کو پاکستان جانے کی تیاریوں کے سلسلے میں ایک آدمی سے ملنے امرتسر جانا پڑ گیا ہے۔ دو ایک روز میں واپس آ جائیں گے۔ ظاہر ہے جمیلہ سوائے صبر کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر یہ بات میں خود اسے کہوں گا تو وہ مجھے کبھی جانے نہیں دے گی۔

شام کے ساڑھے چھ بجے میں اور کمانڈو خالد اپنی خفیہ کمین گاہ سے نکل پڑے۔ بنگالی لباس میں وہ بالکل ہندو بنگالی لگ رہا تھا۔ ایک آٹومیٹک پستول اس نے اپنی دھوتی کے اندر چھپا کر رکھ لیا تھا۔ میں اس کی بنیان کے اندر چھپنا چاہتا تھا لیکن کمانڈو خالد نے کہا۔

"بنیان کے اندر تم پر کسی نہ کسی کی نظر پڑ سکتی ہے۔ میں تمہیں کرتے کی جیب میں چھپا لوں گا۔ اس طرح تمہیں ہوا بھی لگتی رہے گی اور تم جیب میں سے سر نکال کر

باہر کا منظر بھی دیکھ سکو گے۔"

اس نے مجھے اپنے کرتے کی بغل والی جیب میں چھپا لیا۔ میں چھوٹا سانپ تھا' اس کی جیب میں آسانی سے آ گیا۔ دو کمانڈو مجاہد خالد کی حفاظت کے لیے اس کے ساتھ سٹیشن تک گئے۔ انہوں نے چادریں اوڑھ رکھی تھیں اور چادروں کے اندر آٹو میٹک پستول چھپائے ہوئے تھے۔ ہمیں ریلوے سٹیشن پر پہنچا کر وہ واپس چلے گئے۔ بھوپال سٹیشن پر کافی رونق تھی۔ کلکتے جانے والی سواریاں پلیٹ فارم پر اپنے اپنے سامان کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ کمانڈو خالد بھی ایک محفوظ جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا۔ کلکتہ جانے والی ٹرین لیٹ تھی۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے بعد آئی۔ کافی رش تھا۔ ہم ایک ڈبے میں سوار ہو گئے۔

ٹرین کلکتہ کی طرف چل پڑی۔ یہ بھی کافی لمبا سفر تھا۔ ساری رات گزر گئی۔ دوسرے دن شام کے وقت ٹرین کلکتے کے ہاوڑہ جنکشن پر پہنچی۔ راستے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ کمانڈو خالد نے سٹیشن سے باہر آ کر ایک موٹر رکشا لیا اور اسے کسی جگہ چلنے کو کہا۔ میں اس کی جیب میں ہی تھا۔ کبھی کبھی سر باہر نکل کر باہر کا منظر دیکھ لیتا تھا۔ موٹر رکشا کلکتے کے بارونق بازاروں میں سے گزر رہا تھا۔ اس شہر سے میری تھوڑی بہت واقفیت ہو چکی تھی۔ مگر یہ اتنا بڑا شہر تھا کہ میں نے ابھی تک کسی سڑک کو نہیں پہچانا تھا۔ میں نے کمانڈو خالد کی جیب میں سے سر تھوڑا سا باہر نکالا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ رکشا شہر کی آبادی سے باہر آ گیا ہے۔ عمارتوں کی روشنیاں دور ہو گئی تھیں۔ مجھے ہوا میں دریا کی خوشبو آئی۔ شاید رکشا دریا کے قریب سے گزر رہا تھا۔ پھر خالد نے ایک جگہ پہنچ کر رکشا رکوا لیا اور ڈرائیور کو کرایہ دینے کے بعد ایک طرف چل پڑا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ کلکتے کا کون سا علاقہ ہے کمانڈر؟"

اس نے مجھے جیب سے نکال کر اپنی کلائی کے گرد لپیٹ لیا۔ کہنے لگا۔

"یہ دریائے ہگلی کا جنوبی علاقہ ہے۔"

اس نے مجھے اس علاقے کا نام بھی بتایا تھا جو میں آپ کو نہیں بتاؤں گا کیونکہ وہاں

خالد کی خفیہ اسلامی تنظیم کا آدمی رہتا تھا۔ آگے ایک چھوٹی سی مضافاتی بستی آ گئی۔ اس وقت تک رات ہوگئی تھی مگر یہ علاقہ کسی جنگل کا علاقہ نہیں تھا۔ کلکتے ایسے بڑے شہر کا مضافاتی علاقہ تھا۔ ہم ایک پکی سڑک کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ یہ کوئی کالونی تھی۔ کالونی کی روشنیاں قریب ہو رہی تھیں۔ کمانڈو خالد ایک جگہ سڑک سے اتر کر ناریل کے درختوں کے درمیان سے گزرنے والی پگڈنڈی پر ہوگیا۔ وہاں زیادہ اندھیرا نہیں تھا۔ کچھ فاصلے پر بجلی کے کھمبوں پر بجلی کے بلب روشن تھے اور ان کی روشنیاں وہاں تک آ رہی تھیں۔ ہم کالونی میں داخل ہوگئے تھے۔ درمیانے درجے کی کالونی تھی۔ پرانی پرانی عمارتیں تھیں۔ بازار میں دکانیں اور معمولی قسم کے سٹور بھی تھے۔ ایک جگہ پان کی دکان تھی وہاں سے بنگلہ گانے کی آواز آ رہی تھی۔ کمانڈو خالد ایک تنگ بازار میں مڑ گیا اور پھر ایک بلڈنگ میں داخل ہو کر اس کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

دوسری منزل میں ایک لمبی سی گیلری یا راہ داری تھی۔ ساتھ ساتھ کمرے تھے۔

خالد نے ایک دروازے کے پاس آ کر گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دوسری بار گھنٹی بجاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔

"یہاں اپنا ایک بڑا بہادر مجاہد رہتا ہے۔"

کالونی میں داخل ہونے سے پہلے اس نے مجھے اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ میں کچھ کہنے لگا تھا کہ خالد نے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ کسی نے دروازہ کھول دیا۔ خالد کے کرتے کی جیب میں سے سارا منظر نظر آ رہا تھا۔ ایک درمیانے قد کے مضبوط جسم والے گورے چٹے آدمی نے دروازہ کھولا تھا۔ اس نے اپنے سامنے خالد کو دیکھا تو بولا۔

"اندر آ جاؤ۔ ساتھ کوئی اور تو نہیں ہے؟"

کمانڈو خالد نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"ایک آدمی ہے۔"

میزبان وہیں رک گیا۔ بولا۔

"اسے بھی اندر بلا لو۔ باہر مت کھڑا رہنے دو۔"

خالد بولا۔

"وہ میرے ساتھ ہی ہے۔ تم دروازہ بند کر دو۔"

میزبان نے دروازہ بند کر دیا اور بڑی عجیب نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"کمانڈر! کہاں ہے تمہارا ساتھی؟"

کمانڈو خالد نے جیب سے مجھے نکال کر اپنی ہتھیلی پر بٹھایا اور بولا۔

"یہ ہے ہمارا ساتھی۔"

میزبان کا نام کمانڈو خالد نے مجھے بتا دیا تھا' وہ نام میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ آپ اس کا نام حیدر رکھ لیں۔ حیدر ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ سانپ تم نے کب سے پکڑنے شروع کر دیے ہیں؟"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"یہ سانپ نہیں ہے۔ غور سے دیکھو۔"

حیدر میری طرف غور سے دیکھ کر بولا۔

"کیا بچوں ایسی باتیں کرتے ہو کمانڈر! یہ سانپ ہی تو ہے۔ خدا کے واسطے اسے باہر پھینک آؤ۔ تمہیں ڈس لے گا۔"

کمانڈو خالد نے مجھے اپنی کلائی کے گرد لپیٹ لیا اور کہنے لگا۔

"پہلے مجھے کھانا کھلاؤ' چائے پلاؤ اور میرے دوست سانپ کے لیے دودھ لاؤ۔ پھر اطمینان سے ساری باتیں ہوں گی۔"

حیدر حیرت سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"میں سب کچھ ابھی لے آتا ہوں مگر خدا کے لیے اس سانپ سے بچ کر رہنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ میں نے خالد سے کہا۔

"کمانڈر! کیا تم اسے میرے بارے میں بتا دینا چاہتے ہو؟"

"ہاں" خالد بولا۔ "اسے تمہارے بارے میں سب کچھ بتائے بغیر ہم اپنے مشن

میں کامیابی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ حیدر ہمارا بڑا اہم ترین ساتھی مجاہد ہے۔ یہ کلکتے میں ہماری خفیہ اسلامی تنظیم کا سرگرم مجاہد ہے۔ بھوپال کا پٹھان ہے۔ دس برس سے کلکتے میں رہ رہا ہے۔ اس شہر کے چپے چپے سے واقف ہے۔"

کچھ دیر بعد حیدر ہمارے لیے کھانے کا سامان لے کر آگیا۔ ایک پیالی میں میرے لیے دودھ بھی لے آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"یار خالد! پہلے اپنے اس لاڈلے سانپ کو دودھ پلا کر باہر کسی جگہ چھوڑ آؤ' پھر بیٹھ کر اطمینان سے کھانا کھائیں گے۔ میں نے بھی ابھی کھانا نہیں کھایا تھا۔"

کمانڈو خالد نے مجھے کلائی سے اتار کر پلنگ پر بٹھا دیا اور دودھ کی پیالی میرے آگے رکھ کر کہا۔

"کرم داد! لو بھائی تھوڑا سا دودھ پی لو۔"

حیدر بولا۔

"اچھا تو تم نے اس کا نام بھی رکھ دیا ہوا ہے۔"

خالد نے کہا۔

"میں نے نہیں رکھا۔ بھائی اس کا نام ہی کرم داد ہے۔ یہ پاک آرمی کا سابق کمانڈو ہے اور ہماری تنظیم کا بڑا جیالا رضاکار ہے۔"

میں نے دیکھا کہ حیدر ایسی نظروں سے خالد کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے خالد کی ذہنی صحت پر شبہ ہو رہا ہے۔ کہنے لگا۔

"خالد! تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو؟ یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں' تم بھی دیکھ رہے ہو کہ یہ ایک سانپ ہے۔ پھر یہ پاک آرمی کا سابق کمانڈو کہاں سے بن گیا؟ اور اس کا نام کرم داد کیسے ہوگیا؟"

کمانڈو خالد پورا ڈرامہ کر رہا تھا۔ میں خاموشی سے منہ ڈالے پیالی میں سے دودھ پی رہا تھا۔ خالد نے حیدر سے کہا۔

"اچھا بھائی حیدر اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آتا تو خود اس سے پوچھ لو۔

پوچھو۔"

"کیا پوچھوں؟" حیدر نے تعجب سے کہا۔

"یہی پوچھو کہ اے سانپ! تمہارا نام کیا ہے اور تم کون ہو؟"

حیدر زچ ہو کر بولا۔

"خدا کے لیے یہ فضول باتیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کلکتے کیسے آنا ہوا؟ کیا کسی خاص مشن پر آئے ہو؟"

کمانڈو خالد نے کہا۔ "پہلے تم میرے سانپ سے اس کا نام پوچھو پھر تمہیں بتاؤں گا کہ میں کس مشن پر آیا ہوں۔ یہ میری شرط ہے۔"

حیدر نے تنگ آ کر مجھ سے پوچھا۔

"بھائی سانپ تم سانپ ہی ہو۔ میں جانتا ہوں تم مجھے کچھ نہیں بتا سکو گے لیکن میں اپنے دوست کی شرط پوری کر رہا ہوں۔ بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے دودھ پیتے ہوئے پیالی میں سے سر اٹھا کر حیدر کی طرف دیکھا اور کہا۔

"میرا نام کرم داد ہے۔ میں پاک آرمی کا سابق کمانڈو ہوں اور کمانڈو خالد کے ساتھ ایک اہم ترین مشن پر کلکتے آیا ہوں۔"

ایک سانپ کو آدمی کی آواز میں باتیں کرتے دیکھ کر میں بیان نہیں کر سکتا کہ حیدر کی کیا حالت ہوئی تھی۔ آج بھی اس آدمی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو میری بے اختیار ہنسی نکل جاتی ہے۔ وہ اس بچے کی طرح حیران پریشان کھڑا تھا جس کے ہاتھ سے جادو کے زور سے اچانک اس کا کھلونا غائب ہو گیا ہو۔ کمانڈو خالد نے ہنس کر پوچھا۔

"اب بتاؤ یقین آیا کہ نہیں۔"

وہ کبھی میری طرف دیکھتا۔ کبھی خالد کی طرف دیکھتا۔ کہنے لگا۔

"کمانڈر! مجھے یقین آ گیا ہے لیکن یقین نہیں آ رہا کہ ایک سانپ انسان کی طرح بھی بول سکتا ہے۔"

اب میں نے اس کو مخاطب کیا اور کہا۔

”حیدر بھائی! میں صرف انسان کی طرح بول ہی نہیں سکتا بلکہ انسانوں کی طرح محسوس بھی کرتا ہوں۔ انسانوں کی طرح سوچتا بھی ہوں اور سنتا بھی ہوں۔ میں اصل میں تمہاری طرح کا انسان ہوں۔ میرے ساتھ ایک حادثہ ہوا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر ایک طلسم کا اثر ہوگیا ہے اور مجھ پر دورہ پڑتا ہے جس سے میں انسان سے سانپ اور سانپ سے واپس انسان کی شکل میں آ جاتا ہوں۔“

”تو کیا تم سانپ سے انسان بھی بن سکتے ہو؟“

میں نے کہا۔

”بن سکتا نہیں بس بن جاتا ہوں۔ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ جب تک مجھ پر طلسم کا اثر رہتا ہے میں سانپ کی شکل میں رہتا ہوں جب اس کا اثر ختم ہوجاتا ہے تو سانپ سے اپنی اصلی انسانی شکل اختیار کر لیتا ہوں۔ اس کے بعد جب پھر طلسم کا اثر زور پکڑتا ہے تو میں اچانک سانپ بن جاتا ہوں۔“

”حیرت کی بات ہے۔ کبھی اس قسم کی بات دیکھی نہیں۔“

کمانڈو خالد بولا۔

”اب تو دیکھ لی ہے ناں۔ آؤ بیٹھو۔ پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر تمہیں بتاتے ہیں کہ ہم دونوں کمانڈو کلکتہ کس مشن پر آئے ہیں۔“

میں پلنگ پر بیٹھا رہا۔ تھوڑا سا دودھ میں نے پی لیا تھا۔ دونوں کمانڈو مجاہد کھانا کھاتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ کمانڈو خالد نے حیدر کو وہ سب کچھ بتا دیا جس کے لیے ہم کلکتہ آئے تھے۔ اس نے اسے میری زندگی کے پس منظر اور تمام واقعات سے بھی آگاہ کردیا۔ حیدر نے باتیں شروع کرنے سے پہلے دروازہ ذرا سا کھول کر باہر دیکھ لیا تھا اور پھر اندر سے کنڈی لگا دی تھی۔ کہنے لگا۔

”ڈھاکہ فال کے بعد وہاں سے کئی پاکستانی بھارت میں داخل ہوئے ہیں۔ پولیس ان کی تلاش میں رہتی ہے اور پھر تم جانتے ہو کہ ہمیں بہت چوکنا ہو کر رہنا پڑتا ہے۔“

خالد نے پوچھا۔

"اپنی تنظیم کے دوسرے مجاہدوں کا کیا حال ہے؟"

حیدر نے کہا۔

"سب اپنی اپنی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ پچھلے دنوں کالی گھاٹ کے علاقے میں ہندوؤں نے ایک مسجد میں بم پھینک کر دو نمازیوں کو شہید کر دیا تھا۔ ہم نے ان انتہا پسند ہندوؤں کا سراغ لگا کر انہیں ان کے گھروں کے اندر جا کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے بعد کالی گھاٹ کے علاقے میں بالکل امن ہو گیا۔ بلکہ شہر میں بھی کسی مسجد میں اس قسم کی واردات دوبارہ نہیں ہوئی۔"

"ہمارا مشن بھی یہی ہے" خالد نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "ہم بھارت میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کر رہے ہیں۔ ہم حکومت کے باغی نہیں ہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ بھارت میں مسلمانوں کو بھی امن اور خود اختیاری کے حقوق کے ساتھ رہنے کی سہولیات دی جائیں۔"

حیدر نے میری طرف دیکھا۔

"کرم داد! کیا تم میری بات سن رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"کیوں نہیں۔ تم بولو' میں سن رہا ہوں۔"

وہ ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

"خدا جانے کیوں مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ تم سانپ نہیں انسان ہو۔"

خالد نے کہا۔

"تم پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

حیدر نے مجھ سے سوال کیا۔

"کیا تمہیں یاد ہے تم جب ڈھاکہ سے فرار ہو کر کلکتے آئے تھے تو کون سے علاقے میں مکتی باہنی والوں سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی؟"

مجھے وہ علاقہ یاد تھا۔ میں نے اسے اس علاقے کا نام بتا دی اور اس چھوٹے سے چائے خانے کا نام بھی بتا دیا جس کے پچھلے کمرے میں ایک مکتی باہنی والے نے مجھے میری بیوی جمیلہ کا پتہ بتایا تھا۔ حیدر نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"وہ اس معاملے میں بڑا بدنام علاقہ ہے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہاں مکتی باہنی نے انڈین آرمی کے ساتھ مل کر غیر بنگالی پاکستانیوں پر جو ظلم و ستم کیا تھا اور عورتوں کو اغوا کر کے لائے تھے تو ان عورتوں کو زیادہ تر اسی علاقے میں فروخت کیا جاتا تھا۔"

خالد نے کہا۔

"ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہاں جتنے بھی مکتی باہنی والے آتے جاتے رہتے تھے وہ اس وقت کہاں کہاں پر ہیں۔ ہم ان میں سے ہر ایک کو موت کے گھاٹ اتارنے کا مشن لے کر آئے ہیں۔ اس کے علاوہ تمہیں اپنے ذرائع سے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ جو عورتیں مشرقی پاکستان سے اغوا کی گئی تھیں اگر ان میں سے کچھ ابھی تک کلکتے میں ہیں تو وہ کہاں کہاں ہیں۔"

حیدر چینک سے پیالیوں میں چائے انڈیلتے ہوئے کہنے لگا۔

"انشاء اللہ یہ سب کچھ معلوم کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ لیکن تمہیں یہاں میری کھولی میں نہیں رہنا ہوگا۔ یہاں تم پولیس کی نظروں میں آ جاؤں گے۔ اس علاقے میں پولیس انٹیلی جینس کے آدمی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔"

خالد نے کہا۔

"ہم دریا کے پرانے گھاٹ والی جگہ پر چلے جائیں گے۔ وہ جگہ ابھی تمہارے پاس ہی ہے نا؟"

"ہاں' وہ ہمارے پاس ہی ہے۔ رات کو تم یہاں آرام کرو۔ صبح صبح میں تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔"

اچانک مجھے دروازے کے باہر کسی آدمی کی نئی نئی بو محسوس ہوئی۔ سانپ ہونے کی وجہ سے مجھے آتے جاتے آدمیوں کی بو آ جاتی تھی۔ لیکن یہ اجنبی بو ایسی تھی کہ جو

حیدر کے کمرے یا کھولی کے بند دروازے کے پاس آکر رک گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر راہ داری میں کوئی شخص دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہماری باتیں سن رہا ہے۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔

"اسی طرح باتیں کرتے ہو۔ موضوع بدل لو۔"

یہ کہہ کر میں پلنگ سے اتر کر دروازے کی طرف رینگنے لگا۔ کمانڈو خالد فوراً سمجھ گیا کہ باہر کوئی ہماری باتیں سن رہا ہے۔ اس نے حیدر سے کہا۔

"یار کلکتے میں اس بار زیادہ گرمی ہے۔ شاید بارشیں جلدی شروع ہو جائیں۔"

اس وقت تک حیدر بھی سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"تمہارے لیے چائے اور بناؤں؟"

میں نے دروازے کے ایک سوراخ میں سے سر باہر نکل کر دیکھا۔ باہر راہ داری میں معمولی سی روشنی تھی۔ میں نے آدمی کو دیکھا جو دروازے کے ساتھ سر لگائے جھک کر کھڑا تھا اور دروازے کی کسی درز میں سے اندر بھی دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اندر جو باتیں ہو رہی تھیں انہیں سننے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ یہ انٹیلی جینس کا آدمی ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے بہت سی باتیں سن لی تھیں۔ مجھ سے اور تو کچھ نہ ہو سکا۔ میں نے باہر نکل کر اس کے پاؤں پر ڈسنے لگا تو مجھے خیال آگیا کہ یہاں ایک پولیس کے آدمی کی لاش کا پایا جانا حیدر کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ میں تیزی سے واپس کمرے میں گھس گیا اور ایک طرف چھپ گیا تاکہ انٹیلی جینس کا آدمی دروازے کی درز میں سے مجھے نہ دیکھ سکے۔ میں نے خالد سے کہا۔

"کمانڈر! باہر ایک آدمی دروازے کے ساتھ لگا تمہاری ساری باتیں سن رہا ہے۔"

کمانڈو خالد نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے میری بات بالکل نہیں سنی۔ وہ حیدر سے کلکتے کی بارشوں اور فلمی دنیا کی ایکٹرسوں کی باتیں کرنے لگا۔ اس نے حالات کی نزاکت کو دیکھ کر موضوع بدل دیا تھا۔ میرے خبردار کرنے پر تو وہ اور زیادہ محتاط ہو گئے تھے۔ اتنے میں حیدر چائے کے خالی برتنوں والا ٹرے لے کر اٹھا اور دروازے کی طرف

بڑھا۔ میں بھی اندھیرے میں سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھا اور حیدر کے دروازہ کھولنے سے پہلے ہی دروازے کے باہر نکل چکا تھا۔ میں نے اس آدمی کو گیلری میں اس طرف تیز تیز قدموں سے جاتے دیکھا جہاں سیڑھیاں پہلی منزل کو اترتی تھیں۔

حیدر بھی ٹرے ہاتھ میں لیے گیلری میں آ گیا۔ میں نے اسے اس آدمی کا حلیہ بتایا اور کہا کہ وہ سیڑھیوں کی طرف بھاگ گیا ہے۔ حیدر نے مجھ سے کہا۔

"خدا کے لیے تم اندر چل کر بیٹھو۔"

میں اندر آ گیا۔ خالد پرانے صوفے پر بیٹھا تھا۔ حیدر دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

کمانڈو خالد نے مجھ سے پوچھا۔

"کون تھا وہ آدمی؟"

میں نے کہا۔

"مجھے انٹیلی جینس کا آدمی لگتا تھا۔ دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ مجھے اس کی بو آ گئی تھی۔"

خالد کہنے لگا۔

"تمہاری اس خصوصیت کا مجھے ابھی تک علم ہی نہیں تھا۔ اس سے تو بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ہر انسان کی ایک خاص بو ہوتی ہے۔ سانپ آدمیوں کے درمیان ہو تو اسے یہ بو نہیں آتی لیکن اگر کوئی سانپ کسی کے پاس زیادہ دنوں تک رہے یا اسے کسی آدمی کے جسم کا اترا ہوا کپڑا سنگھا دیا جائے تو اسے وہ بو یاد رہتی ہے اور جہاں سے وہ بو آ رہی ہوگی وہ اس کی تلاش میں اسی طرف جائے گا۔"

خالد نے کہا۔

"ابھی حیدر آ کر بتائے گا کہ وہ آدمی کون ہو سکتا ہے۔"

حیدر نے آ کر بتایا کہ وہ سی آئی ڈی کا آدمی ہی تھا اور اس کا نام مراری تھا۔

"میں نے اسے بنگالی پولیس انسپکٹر کے ساتھ نکڑ والے ہوٹل میں اکثر دیکھا ہے۔"

"پھر تمہارا کیا خیال ہے؟" خالد نے پوچھا۔

حیدر کہنے لگا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' ایسا تو یہاں ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہاں کوئی اجنبی بلڈنگ کے کسی کمرے میں آجائے تو سی آئی ڈی اس کا ضرور پیچھا کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے ہماری باتیں نہیں سنی ہوں گی۔"

میں نے کہا۔

"اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں صبح ہونے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسی وقت یہاں سے دریا کے پرانے گھاٹ والے ہائیڈ آؤٹ میں چلے جانا چاہیے۔"

حیدر بولا۔

"اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ تم نے وہ جگہ تو دیکھی ہی ہوئی ہے۔ تم کرم داد کو لے کر وہاں جاؤ۔ میں کل کسی وقت تمہیں وہیں آکر ملوں گا۔ اس دوران میں مکتی باہنی والوں کی سراغ رسانی کرنے کی بھی کوشش کروں گا۔"

کمانڈو خالد نے مجھے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا حیدر اٹھ کر دروازے تک گیا۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ اندر آکر بولا۔

"گیلری میں کوئی نہیں ہے۔ تم نکل جاؤ۔"

کمانڈو خالد مجھے لے کر کمرے سے نکل آیا۔ بلڈنگ کے باہر آکر اس نے کالونی کی اس سڑک پر چلنا شروع کیا جو باہر کھیتوں کی طرف جاتی تھی اور جن کے آگے دریائے ہگلی کا کنارہ آجاتا تھا وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا تاکہ کسی کو اس پر شک نہ گزرے اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کرم داد! کیا تمہیں پیچھے کسی اجنبی کی بو آ رہی ہے؟"

میں نے جیب سے گردن پہلے ہی باہر نکالی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔

"نہیں کمانڈر! پیچھے کوئی آدمی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا۔"

یہ سن کر کمانڈو خالد نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ کہنے لگا۔

"اب یہاں سے جتنی جلدی نکل جائیں' اچھا ہے۔"

ہماری دائیں جانب کلکتہ شہر کی اونچی اونچی عمارتوں کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور بائیں جانب اندھیرا تھا اور کافی فاصلے پر کچھ روشنی کے نقطے جھلملا رہے تھے۔ خالد کہنے لگا۔

"ہماری بائیں جانب دریا ہے' کلکتے کا سب سے بڑا دریا ہگلی----- یہ جو دور دور تمہیں ٹمٹماتی روشنیاں نظر آ رہی ہیں یہ دریا پار کے کارخانوں کی روشنیاں ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"پرانے گھاٹ والی خفیہ کمین گاہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

اس نے کہا۔

"زیادہ دور نہیں ہے۔"

پھر بھی وہ کچھ نہیں تو آدھ گھنٹے تک چلتا رہا۔ اب ہم دریا کے کنارے پر آ گئے تھے۔ اندھیرے میں مجھے دریا کا چوڑا پاٹ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دور دریا کے دوسرے کنارے سے کسی سٹیمر کے وسل کی دو بار آواز سنائی دی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ دو تین فرلانگ تک دریا کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد کمانڈو خالد نیچے نشیب میں اتر گیا۔ یہاں اتنی لمبی لمبی گھاس تھی کہ خالد اس میں چھپ گیا۔ دیر تک وہ اسی گھنی گھاس میں چلتا رہا۔ گھاس کا میدان ختم ہو گیا۔ میں چونکہ اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا مجھے بیس پچیس قدموں کے فاصلے پر ایک عمارت کے کھنڈر نظر آئے۔ دیواریں ٹوٹی پھوٹی تھیں' جگہ جگہ اینٹیں پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف چار دیواری کھڑی تھی۔ خالد اسی طرف آ گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی کھولی تھی جس کے دروازے کے پٹ آدھے کھلے تھے وہ اندر داخل ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"یہ ہماری عارضی اور ایمرجنسی پناہ گاہ ہے۔ ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے تو ہم یہاں آ کر چھپ جاتے تھے۔ یہاں سے کوئی نہیں گزرتا۔"

اس نے دیوار میں ٹٹول کر ایک جگہ سے ماچس اٹھائی۔ دروازے کے دونوں پٹ بند کر دیے اور ماچس جلا دی۔ اس کی روشنی میں مجھے کونے میں مٹی کی تھالی میں ایک موم بتی نظر آئی جس کے نیچے کافی موم جمی ہوئی تھی۔ خالد نے موم بتی روشن کر کے کونے میں ہی رہنے دی۔ دیوار کے ساتھ بانس کی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا اور مجھے جیب سے نکال کر چارپائی پر ایک طرف رکھ دیا اور کہنے لگا۔

"مجھے یقین ہے حیدر کل مکتی باہنی والوں کا ٹھیک سراغ لگا کر آئے گا۔"

میں نے کہا۔

"اگر اس نے دیر کر دی تو مجھے خود وہاں جانا پڑے گا۔"

خالد بولا۔

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔"

میں نے کہا۔

"تم میرے ساتھ نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔ اس لیے کہ میں تو ادھر ادھر چھپ کر اپنا بچاؤ کر سکتا ہوں مگر تم پر اگر کسی کو ذرا سا بھی شک پڑ گیا تو تمہارے لیے وہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ لوگ بڑے قاتل بدمعاش قسم کے لوگ ہیں۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"دوست کرم داد! ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا ہے تو اب ساتھ جئیں گے' ساتھ مریں گے۔"

یہ بات اس نے کچھ ایسے جذباتی لہجے میں کہی کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں بھی جذباتی ہو گیا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑنا چاہتا تھا مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ میں انسان کے روپ میں نہیں تھا' سانپ کے روپ میں تھا۔ میں نے کہا۔

"کمانڈو! تم واقعی میرے سچے دوست ہو۔ تم میرے ساتھ ہی چلو گے۔ آگے جو

ہو گا دیکھا جائے گا۔"

رات ہم نے اسی کھولی میں گزاری۔ اگلے روز سورج غروب ہونے کے وقت ہمارا ساتھی حیدر آ گیا' کہنے لگا۔

"دو آدمیوں کا میں نے سراغ لگا لیا ہے۔ یہ دونوں کلکتے کے ہندو بنگالی ہیں۔ ایک کا نام دھلیا ہے' دوسرے کا نام رلیا ہے۔ مشرقی پاکستان میں یہ مکتی باہنی والوں کے ساتھ گئے تھے۔ وہاں سے انہوں نے غیر بنگالی مسلمانوں کا بہت سا مال اسباب لوٹا اور ایک عورت کو بھی اغوا کر کے ساتھ لے آئے تھے۔ دونوں کالی گھاٹ کے پاس ایک کلال خانے کے اوپر رہتے ہیں۔ وہیں کام کرتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"یہ کلال خانہ میں نے دیکھا ہوا ہے۔ جس مسلمان غیر بنگالی عورت کو یہ اغوا کر کے لائے تھے وہ کہاں ہے؟"

حیدر بولا۔

"یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔ ہو سکتا ہے ان کے پاس ہی ہو۔"

خالد کہنے لگا۔

"اس عورت کا پتہ چلانا بہت ضروری ہے؟"

میں نے کہا۔

"وہاں چلو تو سہی' وہ خود سب کچھ بتا دیں گے۔"

حیدر نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"خالد بھائی تمہیں اپنے ساتھ کوئی اسلحہ وغیرہ ضرور رکھنا ہو گا۔"

اس نے کہا۔

"میرے پاس ایک آٹومیٹک پستول موجود ہے۔"

حیدر تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ جب ذرا شام کا اندھیرا ہو گیا تو خالد کہنے لگا۔

"میں نے وہ کلال خانہ یعنی شراب کا اڈہ نہیں دیکھا ہوا۔ تم میری راہ نمائی کرنا۔

میں وہاں جا کر یہ ظاہر کروں گا کہ میں شراب پینے آیا ہوں۔"

حیدر نے ہمیں دونوں مکتی باہنی کا حلیہ بتا دیا تھا جس کو میں نے اپنے ذہن میں بٹھا لیا تھا۔ اس کے بعد کمانڈو خالد نے مجھے اپنی جیب میں ڈالا اور ہم کھولی میں سے باہر آ گئے۔ کالونی کے چوک میں آ کر خالد ایک بس میں سوار ہو گیا۔ یہ بس کالی گھاٹ کو جاتی تھی۔ وہاں سے کالی گھاٹ کافی دور تھا۔ کلکتہ شہر کے مغربی کنارے پر یہ علاقہ تھا۔ کہیں آبادی تھی اور کہیں خالی پلاٹ پڑے تھے۔ خالد نے مجھ سے پوچھا۔

"یہاں شراب خانہ کہاں ہو گا؟"

میں جیب میں سے گردن نکالے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"کسی غریب مزدور ٹائپ آدمی سے پوچھو' وہی بتائے گا۔"

ایسا ایک آدمی نظر آ گیا۔ خالد نے اس سے شراب خانے کا پوچھا تو وہ بولا۔

"رلیا دھلیا کا کلال خانہ کھو بابو۔ وہ سامنے ناریل پٹی میں ہے۔"

ناریل پٹی سے مطلب وہ جگہ تھی جہاں ناریل کے درختوں کی قطار تھی۔ خالد کہنے لگا۔

"کرم داد! تم میری جیب میں ہی رہنا' باہر مت نکلنا۔ کہیں سارا کام الٹ پلٹ نہ ہو جائے۔"

میں نے اس سے کہا۔

"مجھے اپنی جیب میں رکھو گے تو مجھے کچھ نظر نہیں آئے گا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ تم ایسا کرنا کہ شراب خانے میں داخل ہونے کے بعد مجھے اندھیرے میں کسی جگہ چھوڑ دینا۔ اس طرح میں حالات کا جائزہ بھی لے سکوں گا اور تمہاری مدد بھی کر سکوں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔"

خالد ناریل پٹی کی طرف بڑھ گیا۔

ناریل کے بینگے ٹیڑھے درختوں کے درمیان ایک بڑا سا جھونپڑا تھا جہاں مزدور اور محنت کش قسم کے بنگالی شراب میں اپنی مفلسی کو ڈبونے کی کوشش کر رہے تھے۔

لوگ بڑی تیز تیز بنگلہ زبان میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ یہ شراب خانہ خلاف قانون نہیں تھا۔ کلکتے میں شراب پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ لائسنس لے کر کوئی بھی شراب خانہ کھول سکتا تھا۔ جھونپڑی کے باہر اور اندر بجلی کے بلب روشن تھے۔ مجھے جھونپڑے کے باہر ہی خالد نے جیب سے نکال کر زمین پر چھوڑ دیا۔ میں اندھیرے میں شرابیوں کی نگاہوں سے بچتا ہوا جھونپڑے کے اندر ایک جگہ چھپ گیا۔ خالد ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں اس کے قریب ہی تھا۔ خالد نے شراب خانے کے ملازم لڑکے سے کہا۔

"یہ بتاؤ کہ رلیا اور دھلیا کہاں ملیں گے؟"

لڑکے نے وہیں سے آواز دی۔

"رلیا دادا! یہ تمہیں ملنے آیا ہے۔"

کالے رنگ کا ایک ہٹا کٹا بنگالی کندھے پر پرنا ڈالے دھوتی بنیان پہنے ایک طرف سے اٹھ کر آگیا۔

"کیوں بے جھریا' کون ملنے آیا ہے ہم کو؟"

ملازم لڑکے نے خالد کی طرف اشارہ کر کے۔

"دادا! یہ بابو ہے۔"

"کیوں بابو! کیا کام ہے مجھ سے؟ کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ حیدر نے جو حلیہ بتایا تھا بالکل وہی شکل و صورت تھی اس کی۔ خالد نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ اس نے جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔

"رلیا بھیا! میرا نام موہن داس ہے میں جانکی پور سے آیا ہوں۔ بیٹھ جاؤ' تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

رلیا نے نوٹ اٹھا لیا اور مسکراتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سمجھ گیا ہے کہ یہ اجنبی نوجوان کیا چاہتا ہے۔ اس نے ملازم لڑکے کو آواز دے کر کہا۔

"ابے جھریا! بابو کے لیے دارو لاؤ۔"

خالد نے کہا۔

"نہیں رلیا بھیا! ابھی نہیں۔ پہلے کام کی بات ہو جائے۔"

کام کی بات رلیا نے خود ہی آسان کر دی۔ خالد کی طرف جھک کر بولا۔

"بابو! لونڈیا چاہیے تو ایک گھنٹے کے پورے ایک سو روپے لوں گا۔ ہاں۔ مگر لونڈیا نگینے ایسی ہوگی۔"

خالد نے آہستہ سے کہا۔

"دادا! اگر ڈھاکہ سے لایا ہوا کوئی مال ہو تو وہ دکھاؤ۔ پسند آگیا تو دو سو روپے بھی دے دوں گا۔"

رلیا نے خالد کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔

"ارے بابو! ڈھاکہ سے لایا ہوا مال ہی ہے۔ بس ایک نگ باقی رہ گیا ہے۔"

تب کمانڈو خالد نے دھلیا کے بارے میں پوچھا کیونکہ اس کا اتا پتہ معلوم کرنا بھی ضروری تھا۔ اس نے کہا۔

"سنا ہے دھلیا کے پاس بڑا اچھا مال ہے۔"

رلیا نے دھلیا کو بنگلہ میں گالی دی اور کہا۔

"اس سالے کے پاس مال کہاں سے آئے گا۔ ایک بوڑھی عورت چٹاگانگ سے پکڑ کر لایا تھا، وہ کلکتے پہنچتے ہی مر گئی۔"

خالد نے کہا۔

"دھلیا اگر خود مجھے کہہ دے کہ میرے پاس ڈھاکے کا کوئی مال نہیں ہے تو میں تم سے ہی بات طے کر لوں گا۔ یہ لو ایک سو روپے پیشگی۔"

اور خالد نے ایک سو روپے نکال کر رلیا کو دے دیے۔ وہ دھلیا کو لانے کے لیے مجبور ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"دھلیا سالے کو بھی وہیں بلوا لوں گا۔ بے شک پوچھ لینا۔ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ بولو ابھی چلو گے یا دارو پینے کے بعد چلو گے؟"

خالد نے کہا۔

"میں تو آیا اسی لیے ہوں۔ ابھی چلوں گا۔"

"تو آ جاؤ میرے پیچھے پیچھے۔"

رلیا اٹھ کر شراب خانے کے عقبی دروازے کی طرف چلا۔ شراب خانے میں شرابی لوگ آپس میں لگے ہوئے تھے۔ کسی نے خالد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ خالد نے اٹھتے ہوئے دائیں بائیں اور بنچ کے نیچے نگاہ ڈالی۔ میں اس دوران اچھل کر اس کے کرتے کے ساتھ چمٹ گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہی ہوں۔"

اس نے ذرا گھبرا کر کہا۔

"میری جیب میں آ جاؤ گرم داؤ! باہر تمہیں کوئی دیکھ لے گا۔"

میں اس کے کرتے کی بغل والی جیب میں گھس گیا۔ خالد رلیا کے پیچھے پیچھے نکل گیا۔ شراب خانے کے پیچھے ایک تالاب تھا۔ اس کے سامنے والے کنارے دو تین کوٹھڑیاں تھیں۔ وہاں تھوڑی تھوڑی روشنی ہو رہی تھی۔ ہٹا کٹا مکتی باہنی والا بنگالی آگے آگے جا رہا تھا۔ کمانڈو خالد اس کے پیچھے تھا۔ وہ ایک کوٹھڑی میں چلا گیا۔ کمانڈو خالد بھی اس کے ساتھ ہی کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ اندر بانس کی دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ دیوار پر بلب جل رہا تھا۔ ایک بوڑھا بنگالی رلیا کو دیکھ کر چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ رلیا نے اس سے کہا۔

"جھگڑو! جاؤ سالے دھلیا کو یہاں بلا لاؤ اور سنو۔ ڈھاکے والی کو بھی یہاں لے آؤ۔ جلدی جاؤ۔"

رلیا اور کمانڈو خالد آمنے سامنے چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔

رلیا بولا۔

"بابو! دارو چاہیے تو ابھی بتا دو میں جھگڑو سے کہہ کر بوتل منگوائے دیتا ہوں۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

”نہیں دادا! دارو نہیں چاہیے۔“

”اچھا‘ اچھا تو پھر گانجا پئیو گے؟“

”میں کچھ نہیں پیا کرتا۔“

”اچھا اچھا۔“

رلیا دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ بولا۔

”بابو‘ تم مجھے پنجابی لگتے ہو۔“

خالد نے کہا۔

”میں بہاری ہوں دادا۔ جانکی پور سے آیا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔“

میں سوچ رہا تھا کہ دھلیا آ جائے اور مشرقی پاکستان سے انہوں نے جو غیر بنگالی مسلمان عورت اغوا کی ہے وہ بھی آ جائے تو ان دونوں کو ٹھکانے لگایا جائے۔ بوڑھا بنگالی ایک لڑکی کو لے کر آ گیا۔ لڑکی کا رنگ گورا تھا۔ جسم صحت مند تھا۔ چہرے پر گہری اداسی اور ویرانی سی چھا رہی تھی۔ رلیا نے جھگڑو سے کہا۔

”ابے وہ دھلیا کہاں ہے؟“

بوڑھے بنگالی نے کہا۔

”آ رہا ہے دادا آ رہا ہے۔“

”تو پھر تم جاؤ‘ جاؤ۔“

بوڑھا بنگالی چلا گیا‘ میں اور خالد غیر بنگالی لڑکی کو دیکھ رہے تھے جو چارپائی کے پاس ہی ہوئی کھڑی تھی۔ مکتی باہنی والے رلیا نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور بولا۔

”اری شرماتی کیوں ہے۔ یہ اپنے ہی بابو ہیں۔ جانکی پور سے آئے ہیں۔ بڑے دھن وان ہیں۔ ان کو خوش کرے گی تو یہ تمہیں مالا مال کر دیں گے۔ جا بابو کے پاس جا اور بیٹھ جا۔“

لڑکی ایسے اٹھ کر کمانڈو خالد کے پاس آ کر بیٹھ گئی جیسے اسے کسی نے چابی دی ہوئی ہو۔ اس کا چہرہ اسی طرح ویران تھا۔ اس نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ رلیا کہنے لگا۔

"یہ ساڑھی نہیں پہنتی۔ کہتی ہے میں اپنا لباس ہی پہنوں گی۔ ہی ہی ہی۔"

رلیا اٹھا۔ کہنے لگا۔

"میں چلتا ہوں۔ ایسا کرو باقی کی رقم بھی مجھے دے دو بابو' ہاں۔"

کمانڈو خالد نے اسے باقی کے پیسے نکال کر دیے اور دھلیا کا پوچھا۔ رلیا نے بیزار سے لہجے میں کہا۔

"ارے بابو! تو دھلیا سے مل کر کیا کرے گا' سالا کہیں دارو پی کر پڑا ہوگا۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"دادا! مجھے اس سے ایک ضروری کام ہے۔"

"ارے کون سا کام ہے؟ مجھے بتاؤ وہ سالا تمہارا کیا کام کرے گا۔"

کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ایک دبلا پتلا کالا بنگالی داخل ہوا۔ رلیا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"لو سالا دھلیا بھی آ گیا۔ ارے دھلیا یہاں بیٹھ جا بابو کو تجھ سے کوئی کام ہے۔"

دھلیا نے کمانڈو خالد کی طرف گھور کر دیکھا اور رلیا سے بنگلہ زبان میں پوچھا۔

"اس کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے دادا؟"

میں بنگلہ زبان سمجھتا تھا۔ رلیا نے اسے بنگلہ زبان میں ہی کہا کہ معلوم کر لے کیا کام ہے' شاید اس میں کوئی فائدہ ہو۔"

کمانڈو خالد نے اس دوران ایسا کیا کہ چارپائی پہ بیٹھے بیٹھے دائیں جانب کو ذرا ٹیڑھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی بغل والی جیب جس کے اندر میں چھپا ہوا تھا ان دونوں کمتی باہنی والوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ کمانڈو خالد نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تاکہ میں ان لوگوں کی نظر میں آئے بغیر جیب سے باہر نکل سکوں۔ ہمارے دونوں ٹارگٹ

ہمارے سامنے موجود تھے۔ بلکہ وہ لڑکی بھی وہاں موجود تھی جس کو ہمیں وہاں سے نکالنا تھا۔ کوٹھڑی میں بلب کی روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی اور ہماری چارپائی کے پیچھے اندھیرا تھا۔ میں خاموشی سے رینگتا ہوا کمانڈو خالد کی جیب سے نکل کر چارپائی کے نیچے چلا گیا۔ کمانڈو خالد نے ان دونوں کو باتوں میں لگا لیا تھا۔ غیر بنگالی لڑکی جو شکل صورت سے پنجابی لگتی تھی خالد کے پاس سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ رلیا اور دھلیا سامنے والی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ ان کی ٹانگیں مجھے صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں دیوار کے ساتھ رینگتا ہوا دوسری چارپائی کے پیچھے سے ہو کر اس کے نیچے آ گیا۔ دونوں مکتی باہنی والے ہندو بنگالیوں کی ٹانگیں میرے سامنے تھی۔ ان کی دھوتیاں پنڈلیوں سے اوپر تھیں۔ کالی کالی پنڈلیاں مجھے صاف نظر آ رہی تھیں۔ مجھے نہیں پتہ کمانڈو خالد ان سے کیا باتیں کر رہا تھا۔ میں فرش پر رینگتا ہوا ٹانگوں کی طرف بڑھا اور جاتے ہی پہلے ایک مکتی باہنی اور اس کے ساتھ ہی دوسرے مکتی باہنی والے کی پنڈلی پر ڈس دیا۔ مجھے ان میں سے ایک کی آواز ضرور آئی تھی۔ اس نے بنگلہ زبان میں کہا تھا۔

"ارے سالے' یہ کیا ہے۔"

اس کے بعد دونوں بنگالیوں کی ٹانگیں ایک طرف سے اوپر ہو گئیں۔ وہ چارپائی پر ڈھیر ہو گئے تھے۔ میں جلدی سے باہر نکل آیا۔ لڑکی نے سانپ کو دیکھا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ کمانڈو خالد سمجھ گیا کہ میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اس نے لڑکی سے کہا۔

"گھبراؤ نہیں' خاموش رہو۔ ہم مسلمان ہیں' تمہارے بھائی ہیں۔ تمہیں یہاں سے نکالنے آئے ہیں۔ یہ سانپ نہیں ہے' یہ میرا بھائی ہے۔ جلدی سے ہمارے ساتھ نکل چلو۔"

لڑکی ششدر سی ہو کر کبھی میری طرف دیکھتی اور کبھی دونوں بنگالیوں کی لاشوں کو دیکھتی۔ دہشت کے مارے اس کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں نے انسانی آواز میں کہا۔

"کمانڈر! اسے لے کر نکلو۔"

لڑکی نے جب ایک ایسے انسان کی آواز سنی جو اس کمرے میں نہیں تھا تو اور زیادہ دہشت زدہ ہو گئی۔ خالد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے دوست کی آواز تھی۔ یہ سانپ نہیں ہے۔ یہ انسان ہے' میرا دوست ہے' تمہارا بھائی ہے۔ اسی نے ان دونوں دشمنوں کو ہلاک کیا ہے۔ ہم اسی مقصد کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ ہمیں بتاؤ یہاں سے فرار ہونے کا کوئی دوسرا راستہ ہے؟"

اپنی رہائی کا سن کر لڑکی میں جیسے ایک نئی طاقت آ گئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمانڈو خالد نے اس کے سامنے مجھے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ لڑکی ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ کہنے لگی۔

"ان جھونپڑوں کے پیچھے ایک راستہ ہے۔"

اس کا اردو بولنے کا لہجہ خالص پنجابی تھا۔ لڑکی ہمیں لے کر جھونپڑی سے نکلی اور باہر پیچھے اندھیرے میں آ گئی اور سامنے درختوں کی طرف چل پڑی۔ خالد اس کے ساتھ ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"اس طرف کون سا علاقہ آئے گا؟"

لڑکی اب ہوشیار ہو گئی تھی۔ اسے ایک عذاب سے رہائی مل گئی تھی۔ اس نے یہ بالکل خیال نہ کیا کہ میں سانپ ہوں اور انسان کی آواز میں اس سے بات کر رہا ہوں۔ کہنے لگی۔

"معلوم نہیں کون سا علاقہ ہے۔ آگے ایک بڑی سڑک آئے گی۔"

اس سڑک کی روشنیاں ہمیں درختوں کے عقب میں نظر آنے لگی تھیں۔ میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"یہاں سے ٹیکسی رکشا جو ملے لے لینا اور اپنے ٹھکانے پر ہی چلنا۔"

سڑک پر آ کر کمانڈو خالد لڑکی کے ساتھ ایک جگہ رک گیا۔ ابھی رات کا پہلا پہر ہی تھا۔ سڑک پر سے گاڑیاں وغیرہ گزر رہی تھیں۔ ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ خالد نے

ڈرائیور سے کہا۔

"پرانے گھاٹ کی طرف چلو۔"

ٹیکسی چل پڑی۔ کئی سڑکوں پر سے گزرنے کے بعد جب ٹیکسی دریائے ہگلی کے پاس آئی تو خالد نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ یہاں سے اسے پیدل ہی اپنے خفیہ ٹھکانے تک جانا تھا۔ لڑکی بھی اس کے ساتھ جلدی جلدی چل رہی تھی۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے بہن؟"

لڑکی نے کہا۔

"رضیہ۔"

میں نے اس کے بعد کچھ نہ پوچھا۔ ہم اپنے خفیہ ٹھکانے کے قریب آئے تو لڑکی نے کہا۔

"یہاں مکتی باہنی والے نہ آ جائیں۔"

خالد نے کہا۔

"فکر نہ کرو' یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

خالد نے کوٹھڑی میں آ کر موم بتی روشن کر دی اور دروازہ بند کر دیا۔ لڑکی سے کہا۔

"یہاں بیٹھ جاؤ رضیہ بہن۔"

لڑکی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے جیب سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور لڑکی سے کہا۔

"تم کو سب کچھ معلوم ہوچکا ہے' اب بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ سانپ میرا دوست کرم داد ہے۔ اس پر ایک سپیرے نے جادو کر کے سانپ بنا دیا ہے مگر یہ کسی بھی وقت اپنی انسانی شکل میں واپس آ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ تمہیں جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

پھر اس نے رضیہ کو مختصر الفاظ میں بتایا کہ ہمارا مشن غیر بنگالی عورتوں کو آزاد کرانا

اور مکتی باہنی والوں کو ان کے ظلم کی سزا دینا ہے۔ لڑکی کا ڈر خوف کافی حد تک دور ہو چکا تھا لیکن ایک سانپ کو خالد کی کلائی میں لپٹا ہوا دیکھ کر اور اس کو انسانی آواز میں باتیں کرتے سن کر اس پر ایک دہشت سی ضرور تھی۔ میں نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ مشرقی پاکستان میں کہاں رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے بتایا کہ اس کی شادی کو دو سال گزرے ہیں۔ اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس کا خاوند گیس کے چولہوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ اس کی وزیر آباد میں دکان تھی۔ کسی نے کہا کہ مشرقی پاکستان کے شہر کھلنا میں ایک بڑے مشہور حکیم صاحب ہیں وہ روحانی علاج بھی کرتے ہیں اور ان کے علاج سے بانجھ عورتوں کو بھی اولاد مل چکی ہے۔ اس کا خاوند اسے لے کر مشرقی پاکستان آگیا۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہم کھلنا میں حکیم صاحب کے پاس گئے تو انہوں نے کہا کہ دو ماہ کا کورس پورا کرنا ہوگا۔ انہوں نے مجھے کھانے کو گولیاں بھی دیں اور کہا کہ میں چالیس دن وظیفہ کروں گا۔ اس دوران مشرقی پاکستان میں گڑ بڑ شروع ہو گئی۔ میں نے اپنے خاوند سے کہا واپس وزیر آباد چلے چلو۔ وہ بولا علاج ادھورا رہ جائے گا اور یہ گڑ بڑ معمولی ہے' جلدی ختم ہو جائے گی لیکن گڑ بڑ بڑھ گئی۔ ایسی قیامت مچی کہ کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ہندو بنگالیوں نے پنجابیوں' پٹھانوں اور مسلمان بہاریوں کے مکانوں کو آگ لگانا شروع کر دی۔ پھر مکتی باہنی والے بھی انڈیا سے آ گئے جو بنگالی نہیں تھے ان کو قتل کیا جانے لگا۔ ہم کسی طرح کھلنا سے نکل کر چٹا گانگ آ گئے۔ وہاں میرے خاوند کا ایک ملنے والا رہتا تھا۔ ہمیں وہاں آئے دوسرا دن تھا کہ رات کو ہمارے گھر پر مکتی باہنی والے آ گئے۔ انہوں نے میرے خاوند کو گولی مار کر مار ڈالا اور مجھے اٹھا کر لے گئے۔"

لڑکی رونے لگی۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ کمانڈو خالد نے اور میں نے اسے حوصلہ دلانے کی کوشش کی مگر لڑکی کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ خالد نے اسے چارپائی پر لیٹ جانے کو کہا اور مجھ سے بولا۔

"میں کچھ کھانے کو لاتا ہوں تم یہاں رہ کر رضیہ بہن کی حفاظت کرو۔"

وہ مجھے کوٹھڑی میں چھوڑ کر چلا گیا۔ لڑکی چارپائی پر سر جھکائے بیٹھی دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ میں نے بھی اسے تسلی دینے کی کوشش کی اور کہا۔

"رضیہ بہن! یہ ایک قیامت تھی جو آئی اور اپنے ساتھ سینکڑوں خاندانوں کو تباہ و برباد کر کے گزر گئی۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں گناہ کی دلدل سے نکال لیا ہے۔ مشرقی پاکستان میں نہ جانے کتنے بچے یتیم ہو گئے۔ کتنے غیر بنگالیوں کا خون گلیوں اور بازاروں میں بہہ گیا اور وہ شہید ہو گئے۔ نہ جانے کتنی عورتوں کے سہاگ اجڑ گئے۔ بہن! تم بھی صبر کرو۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔"

لڑکی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"خدا جانے ابھی میرا کیا حال ہونے والا ہے۔ میں وزیر آباد اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کے پاس کیسے پہنچوں گی۔ وہ تو یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ میں مر چکی ہوں۔ کاش میں بھی جمیل کے ساتھ ہی مر جاتی۔"

اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جمیل اس کے شہید خاوند کا نام تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"بہن! ہم تمہیں جہنم سے نکال لائے ہیں تو تمہیں تمہارے ماں باپ کے پاس بھی ضرور پہنچا دیں گے، تم فکر نہ کرو۔ یہ ہمارا فرض ہے جسے ہم ضرور پورا کریں گے۔"

اس نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"بھائی! تم تو ایک سانپ ہو۔ تم مجھے میرے ماں باپ کے پاس کیسے پہنچا سکو گے؟"

میں نے اسے کہا۔

"ہم اکیلے نہیں ہیں۔ ہمارے اور بھی مسلمان مجاہد ہیں۔ وہ تمہیں خود پاکستان تمہارے گھر پہنچا کر واپس آئیں گے۔"

خدا جانے کچھ دیر بعد کس ہوٹل سے کمانڈو خالد تھوڑا بہت کھانے پینے کو لے

آیا۔ اس نے رضیہ کو مجبور کر کے کچھ کھلایا۔ اس نے بھی لڑکی کو تسلی دی اور کہا کہ ہم لوگ اسے ہر حالت میں پاکستان اس کے گھر پہنچا دیں گے۔ لڑکی کو کچھ اطمینان ہو گیا۔ کہنے لگی۔

"تم لوگ فرشتہ بن کر آئے ہو۔ خدا تمہیں اس نیکی کا بڑا ثواب دے گا۔"

میں نے کہا۔

"رضیہ بہن! ہم نے ثواب کی خاطر یہ سب کچھ نہیں کیا۔ یہ تو ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض تھا۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں کچھ اور عورتوں کا بھی علم ہے جنہیں مکتی باہنی والے اٹھا کر یہاں کلکتہ لے آئے تھے۔"

رضیہ نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مجھے یہاں ان درندوں نے اکیلی ہی رکھا ہوا تھا۔"

ایک لمحہ کے لیے خاموشی چھا گئی۔ لڑکی نے کہا۔

"خدا نے دونوں ظالموں سے میری بربادی کا بدلہ لے لیا۔ ان کی لاشیں دیکھ کر میرا سینہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔"

میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں رات کے اندھیرے میں یہاں سے نکل کر حیدر بھائی کے پاس چلے جانا چاہیے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

کمانڈو کچھ سوچ کر بولا۔

"وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ حیدر بھائی کی کھولی انٹیلی جینس والوں کی نگاہوں میں آ چکی ہے۔ ہم رضیہ بہن کو لے کر وہاں گئے تو ڈر ہے کہ پکڑے جائیں گے۔"

"پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

خالد کہنے لگا۔ "میں آدھی رات کے بعد حیدر کے پاس جاؤں گا اور اسے لے کر یہاں آ جاؤں گا۔ اگر وہ نہ آ سکا تو اس سے مشورہ ضرور کروں گا کہ رضیہ کو ہم کیسے پاکستان پہنچا سکتے ہیں؟"

میں نے خالد سے کہا۔

"میرا مشورہ تو یہی ہے کہ ہم رضیہ کو لے کر بھوپال چلے جاتے ہیں وہاں اپنے مجاہدوں کی ڈیوٹی لگائیں گے کہ وہ رضیہ کو اپنی حفاظت میں مقبوضہ کشمیر اور وہاں سے جنگ بندی لائن پار کر کے آزاد کشمیر لے جائیں اور اسے اس کے گھر وزیر آباد چھوڑ آئیں۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"میرے خیال میں یہی طریق کار ٹھیک رہے گا کیونکہ یہاں کلکتے میں حیدر بھائی کے اتنے وسائل نہیں ہیں۔ بھوپال میں ہمارے پہنچنے تک دونوں مجاہد کشمیری لیڈر غلام حسین کو سری نگر چھوڑ کر واپس آ چکے ہوں گے۔ وہی رضیہ بہن کو اپنے ساتھ آزاد کشمیر اور وہاں سے وزیر آباد لے جائیں گے۔ دونوں تجربہ کار بھی ہیں اور جنگ بندی لائن کے علاقے سے اچھی طرح واقف بھی ہیں۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر کیوں نہ ہاوڑہ سٹیشن سے صبح صبح بھوپال جانے والی کوئی گاڑی پکڑ لیں۔ حیدر کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

"یہ تجویز بھی مناسب ہے۔ میں بھوپال پہنچ کر حیدر کو کسی طریقے سے اطلاع کر دوں گا کہ ہم بھوپال آ چکے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"لیکن ایک بات ہے' کلکتے میں ابھی مکتی باہنی والے موجود ہیں۔ ہمیں ان سے بھی انتقام لینا ہے اور انہیں ان کے ظلم و ستم کی سزا دینی ہے اور اگر یہاں کسی جگہ اغوا شدہ عورتیں ہوں تو انہیں بھی رہا کروا کر پاکستان پہنچانا ہے۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"ہم رضیہ کو بھوپال میں اپنے مجاہدوں کے ساتھ کشمیر کی طرف روانہ کر کے دوبارہ یہاں واپس آ جائیں گے۔" آخر یہی طے پایا کہ ہمیں کلکتے سے سیدھا بھوپال ہی

جانا چاہیے۔ اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ لڑکی کو ہم نے مجبور کر کے چارپائی پر سلا دیا کہ وہ کچھ دیر آرام کرے۔ سٹیشن پر جانے سے پہلے اسے اٹھا دیں گے۔ رضیہ بے چاری جانے کب کی جاگی ہوئی تھی' چارپائی پر سمٹ کر پڑ گئی اور تھوڑی دیر بعد گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے خالد سے کہا۔

"تمہارے پاس بھوپال تک کا دو آدمیوں کا کرایہ ہے؟"

اس نے بتایا کہ اس کے پاس کافی پیسے ہیں۔ میں نے کہا۔

"رضیہ کو اپنے ساتھ ٹرین پر بٹھانا۔ عورتوں والے ڈبے میں اکیلی نہ بٹھانا۔"

"میں اپنے ساتھ ہی بٹھاؤں گا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ بھوپال جانے والی گاڑی کس وقت چھوٹتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"صبح ہونے سے پہلے ہم سٹیشن پر پہنچ جائیں گے۔ بھوپال کی طرف جو گاڑی بھی جاتی ہوگی اس میں بیٹھ جائیں گے۔ یہاں سے نکلنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ میرا خیال ہے صبح تک کلال خانے والوں کو مکتی باہنی والوں کی لاشوں کا پتہ چل جائے گا۔"

"تو پھر ابھی یہاں سے نکل پڑتے ہیں ہو سکتا ہے کوئی گاڑی مل جائے۔"

"رضیہ کو جگا دو۔ ابھی چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

خالد نے رضیہ کو جگا دیا۔

"رضیہ بہن! ہمیں ابھی جانا ہوگا۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کمانڈو خالد نے مجھے اٹھا کر اپنی قمیض کی جیب میں ڈالا اور رضیہ سے کہا۔

"میرے ساتھ آ جاؤ۔"

علاقہ غیر آباد تھا۔ رات کے وقت ادھر اور بھی سناٹا تھا۔ ہم کالونی سے ہٹ کر جا رہے تھے۔ دریا ایک طرف رہ گیا تھا۔ دور سے دریائے ہگلی کے پل کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک جگہ سے رکشا مل گیا۔ ہم سٹیشن پر آ گئے۔ کلکتے کے دو سٹیشن ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ایک سٹیشن کا نام ہاوڑہ ہے' دوسرے سٹیشن کا نام سیالدہ ہے۔ بھوپال کی طرف گاڑیاں ہاوڑہ جنکشن سے جاتی تھیں۔ ہاوڑہ جنکشن پر بہت رونق تھی۔ دھوتی کرتوں والے بنگالی عام نظر آ رہے تھے۔ بنگلہ دیش بن جانے کی وجہ سے یہاں لوگوں کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی تھی۔ پولیس بھی تھی اور ملٹری پولیس کے آدمی بھی تھے۔ میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"زیادہ ہوشیار رہنا خالد بھائی۔ پولیس ادھر ادھر پھر رہی ہے۔ انٹیلی جینس والے بھی ضرور ہوں گے۔"

کمانڈو خالد نے آہستہ سے کہا۔

"خدا کے لیے تم خاموش رہو۔"

رضیہ نے چونکہ بنگالی عورتوں کی طرح ساڑھی نہیں پہنی ہوئی تھی۔ وہ شلوار قمیض میں تھی اس لیے بنگالی اس کے قریب سے گزرے ہوئے اسے ایک نظر گھور کر ضرور دیکھتے تھے۔ وہ اپنے لباس اور حلیے سے صاف پہچانی جاتی تھی کہ پنجابی عورت ہے۔ خالد ساتھ تھا جس نے بنگالیوں والا دھوتی کرتہ پہنا ہوا تھا۔ اس نے بھوپال کے دو ٹکٹ لے لیے اور جس پلیٹ فارم سے گاڑی جانے والی تھی وہاں آ گیا۔ وہاں مسافروں کا رش نہیں تھا جس کی وجہ سے اسے دور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ یہاں پولیس کے سپاہی بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک قلی نے بتایا تھا کہ دن کے چھ بجے سے پہلے کوئی گاڑی بھوپال سیدھی نہیں جائے گی۔ راستے میں گاڑی بدلنی پڑے گی۔ ایک ٹرین دو بجے وایا کان پور دلی جا رہی تھی۔ ہمیں کان پور سے بھوپال والی گاڑی پکڑنی تھی۔ ہم ٹرین میں بیٹھ گئے۔ رضیہ کو کمانڈو خالد نے اپنے ساتھ ہی ڈبے میں بٹھالیا۔ میں اس کی جیب میں تھا۔ سٹیشن پر کوئی مشتبہ آدمی نظر نہیں آیا تھا۔

ٹرین دلی کی طرف روانہ ہو گئی۔

یہ بھی بڑا تھکا دینے والا طویل سفر تھا۔

دوسرے دن شام کے وقت ٹرین کان پور پہنچی۔ یہاں سے ہمیں ٹرین بدلنی تھی

اور بھوپال جانے والی گاڑیاں پکڑتی تھیں۔ ہم ایک پلیٹ فارم پر آکر بیٹھ گئے۔ یہیں خالد اور رضیہ نے کھانا کھایا۔ چونکہ ہمارے پاس کوئی نہیں تھا اس لیے ہم بے فکر ہو کر گفتگو کر سکتے تھے۔ میں نے خالد سے کہا میں جیب سے باہر نکل رہا ہوں۔ اس نے مجھے سختی سے منع کر دیا۔

"کسی کی نظر پڑ گئی تو نظروں میں آجائیں گے۔"

گاڑی کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ تھا۔ خالد چائے کی کینٹین سے چائے کے گلاس لے آیا۔ یہ مٹی کے گلاس تھے۔ چائے پینے کے بعد یہ گلاس پھینک دیے جاتے تھے۔ خالد اور رضیہ پلیٹ فارم کے خالی بنچ پر بیٹھے تھے۔ میں نے اس کی بغلی جیب میں سے گردن باہر نکالی ہوئی تھی۔ دور ریلوے یارڈ پر شام کی سیاہی انجنوں کے دھوئیں میں گھل مل رہی تھی۔ انجنوں کے ادھر ادھر شنٹ کرنے اور ڈبوں کے آپس میں ٹکرا کر رکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

کان پور کا شہر بڑا پرانا اور گنجان شہر ہے۔ اس کا ریلوے سٹیشن بھی ویسا ہی پرانا اور گنجان تھا۔ لوگوں کے چہروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ مفلسی کا شکار ہیں اور انہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں مل رہا۔ کمانڈو خالد رضیہ کو تسلی دے رہا تھا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ ہمارے آدمی اس کو پاکستان پہنچا کر واپس آئیں گے۔ میں بیچ میں کوئی ایک آدھ بات کر لیتا تھا۔ ایک درمیانی عمر کا دبلا پتلا گھنگھریالے بالوں والا دیہاتی ایک ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھڑی پکڑے ہمارے سامنے سے گزرا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا اور جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ لگتا تھا۔ بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ وہ جب قریب آیا تو میں خالد کی جیب کے اندر ہو گیا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد گردن باہر نکالی۔ کمانڈو خالد رضیہ سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گھنگھریالے بالوں والا ادھیڑ عمر دیہاتی ہم سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ کبھی سامنے دیکھتا' کبھی اوپر پلیٹ فارم کی چھت کو دیکھتا اور کبھی گردن موڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگتا۔ میں نے اس دیہاتی کو دیکھ لیا تھا۔ خالد نے شاید اسے قریب سے گزرتے ہوئے سرسری نظر سے ہی دیکھا ہو گا۔

دیہاتی آدمی کوئی ایک آدھ منٹ وہیں کھڑا رہا۔ پھر وہیں سے الٹے پاؤں واپس ہماری طرف آنے لگا۔ ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے کمانڈو خالد پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور آگے نکل گیا۔ میں نے خالد سے کہا۔

"یہ بوڑھا دیہاتی تمہاری طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔"

خالد کہنے لگا۔

"مجھے دیکھنے سے اسے کیا ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ رضیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔"

میں نے کہا۔

"کمانڈر! ایسی بات نہیں ہے۔ یہ تمہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ سی آئی ڈی کا آدمی لگتا ہے۔"

کمانڈو خالد رضیہ سے باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گیا تھا۔ بوڑھا دیہاتی بیس تیس قدم آگے جانے کے بعد واپس آ رہا تھا۔ میں نے خالد سے کہا۔

"وہ واپس آ رہا ہے۔ وہ تمہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔"

بوڑھا دیہاتی ہمارے قریب سے گزر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پہلے کی نسبت زیادہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اس دفعہ اس نے ہماری طرف بالکل نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اپنی رفتار آہستہ کر دی تھی۔ جب وہ آگے چلا گیا تو کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"مجھے تو اس میں کوئی سی آئی ڈی والوں کی بات دکھائی نہیں دیتی۔ عام سا دیہاتی بوڑھا ہے شاید اپنے کسی ساتھی کو ادھر ادھر دیکھ رہا ہے۔"

میں خالد کی جیب سے تھوڑی سی گردن نکالے بوڑھے دیہاتی کو آگے کی طرف جاتے برابر دیکھ رہا تھا۔ وہ دس بارہ قدم چل کر ایک بار پھر رک گیا۔ اب وہ وہیں ایک طرف ہو کر پلیٹ فارم کی چھت کے آہنی ستون کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور بیڑی پینے لگا۔ میری نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ بیڑی کے دو ایک کش لگانے کے بعد بوڑھے دیہاتی نے ایک بار پھر مشکوک انداز میں ہماری طرف دیکھا۔ میں نے خالد سے کہا۔

"خالد بھائی یہاں سے اٹھ کر کسی دوسری طرف چلے چلو' یہ بوڑھا انٹیلی جینس کا آدمی ہے۔"

خالد اٹھ کھڑا ہوا۔ رضیہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پر کوئی آدمی نہیں تھا۔ وہاں جا کر خالد ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے جیب سے سر نکال کر دیکھا۔ بوڑھا دیہاتی جہاں بیٹھا تھا وہاں نہیں تھا۔ وہ چلا گیا تھا مجھے بھی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے یہ آدمی سی آئی ڈی کا نہ ہو۔ مجھے یونہی وہم ہوگیا ہو۔ لیکن میں نے وقت پر چوکنا ہو کر اپنی ذمہ داری کا ثبوت دیا تھا۔ کمانڈو خالد بھی پولیس کو مطلوب تھا اور سی آئی ڈی اس کی خفیہ اسلامی تنظیم کے کارکنوں کو تلاش کرتی پھرتی تھی۔ اتنے میں پلیٹ فارم پر مسافروں کی آمد شروع ہوگئی۔

بھوپال جانے والی ٹرین آ رہی تھی۔ ٹرین آ گئی۔ مسافر ڈبوں کی طرف دوڑ پڑے۔ ٹرین میں پہلے بھی کافی رش تھا۔ خالد کو بھی ایک ڈبے میں جگہ مل گئی۔ اس نے رضیہ کو ایک عورت کے ساتھ بٹھایا اور خود اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ خالد کے کرتے کی جیب ڈبے کے دروازے کی طرف تھی۔ میں جیب سے تھوڑا سا سر باہر نکال کر دروازے میں سے آنے جانے والے مسافروں کو دیکھ رہا تھا۔ یونہی مجھے وہم تھا کہ کہیں وہی بوڑھا دیہاتی ہمارے ڈبے میں نہ آ جائے مگر وہ نہ آیا۔ ٹرین چل پڑی۔ ٹرین جھانسی پہنچی تو خالد رضیہ کو یہ کہہ کر اٹھا کہ میں چائے لے کر آتا ہوں۔ میں اس کی جیب میں ہی تھا۔ ڈبے سے باہر آ کر اس نے آہستہ سے مجھ سے پوچھا۔

"وہ آدمی تمہیں دوبارہ تو نظر نہیں آیا؟"

میں نے بھی آہستہ سے کہا۔

"نہیں' دوبارہ اسے نہیں دیکھا۔ تمہارا خیال ٹھیک تھا وہ کوئی عام دیہاتی تھا۔ ویسے ہمیں محتاط ہی رہنا چاہیے۔"

کمانڈو خالد سامنے چائے کے سٹال کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"اپنی طرف سے تو ہم کافی احتیاط کرتے ہیں باقی اللہ مالک ہے۔"

اس نے چائے کے دو مٹی کے کٹورے لیے اور واپس ڈبے کی طرف چل پڑا۔ پلیٹ فارم پر کافی روشنی تھی۔ اچانک مجھے وہی بوڑھا دیہاتی نظر آ گیا۔ وہ ہمارے ساتھ والے ڈبے کی کھڑکی کے پاس کھڑا اندر جھانک کر جیسے کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ میں نے خالد کو ایک خاص سیٹی کی آواز میں خطرے کا سگنل دیا۔ یہ ہلکی سی سیٹی میں سانپ ہونے کی وجہ سے اپنے منہ سے دو بار نکالتا تھا اور یہ اس وقت نکالتا تھا جب آس پاس کوئی خطرہ ہوا اور میں انسانی آواز میں خالد کو خطرے سے آگاہ نہ کر سکتا ہوں۔ سگنل کی آواز پر خالد کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کیا بات ہے؟"

میں کچھ نہ بولا۔ کیونکہ ہم ڈبے کے مسافروں کے درمیان آ گئے ہوئے تھے۔ چونکہ میں نے خطرے کا سگنل دے دیا تھا اس لیے خالد مجھ سے بات کرنے کو بے چین تھا۔ اس نے چائے کے گلاس رضیہ کو پکڑائے اور یہ کہہ کر لیٹرین کی طرف گیا کہ میں ابھی آتا ہوں۔ لیٹرین میں آکر اس نے دروازہ بند کیا اور مجھ سے پوچھا۔

"کیا بات ہو گئی ہے؟"

میں نے کہا۔

"میں اسی مشتبہ بوڑھے کو ساتھ والے ڈبے کے باہر دیکھا ہے۔ وہ کھڑکی میں سے جھانک کر کسی کو تلاش کر رہا تھا۔"

خالد نے کہا۔

"تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی دیہاتی بوڑھا تھا؟"

میں نے کہا۔

"یہاں تو روشنی ہے۔ میں تو اندھیرے میں بھی آدمی کی شکل دیکھ لیتا ہوں۔ یقین ہے یہ وہی بوڑھا تھا۔"

خالد کہنے لگا۔ "کیا خیال ہے تمہارا؟ ہم جھانسی میں اتر جائیں؟"

میں نے کہا۔

"ٹرین سے اتر جاؤ گے تو پولیس کا خطرہ بڑھ جائے گا۔ اگر یہ واقعی سی آئی ڈی کا آدمی ہے اور تم کو اس نے شناخت کر لیا ہے تو یہ فوراً پولیس کو خبر کر کے تمہیں پکڑوا دے گا۔ میرا خیال ہے اسی ٹرین میں بیٹھے رہو۔"

اتنے میں ٹرین کو ایک دھچکا لگا اور وہ آگے کو چلنے لگی۔

"اب تو اسی ٹرین میں رہنا ہو گا فکر نہ کرو۔ آٹومیٹک پستول میرے پاس موجود ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں بھی چوکس ہو کر تمہاری جیب میں رہوں گا۔"

خالد لیٹرین سے باہر آ کر رضیہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹرین اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ بھوپال وہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں نے دو ایک بار جیب میں سے سر تھوڑا سا نکال کر ڈبے کے مسافروں کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے مشکوک بوڑھا دیہاتی کہیں دکھائی نہ دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بوڑھا کوئی عام دیہاتی مسافر ہے اور ہمیں خواہ مخواہ اس پر شک ہو گیا ہے یا سچ مچ انٹیلی جنس کا آدمی ہے۔ راستے میں سٹیشن آتے اور گزر جاتے۔ ٹرین جنگلوں دریاؤں پر سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ کسی سٹیشن پر رکتی، کسی سٹیشن کو چھوڑ کر آگے نکل جاتی۔ دن کی سفیدی ابھی نہیں پھیلی تھی۔ رات کا پچھلا پہر ہو گا کہ ٹرین بھوپال کے سٹیشن میں داخل ہو گئی۔ ہم لوگ پلیٹ فارم پر اتر آئے۔ دوسرے مسافر بھی یہاں اترے تھے۔ ہم ان کے درمیان میں چل رہے تھے۔ یہ خالد کی عقلمندی تھی کہ وہ مسافروں سے الگ نہیں ہوا تھا۔ وہ اور رضیہ پلیٹ فارم کے گیٹ پر سے نکل گئے۔ یہ خالد کا اپنا شہر تھا۔ اس نے باہر آتے ہی ایک رکشا لے لیا۔ رضیہ کو ساتھ بٹھایا اور اسے ایک خاص علاقے کی طرف چلنے کو کہا۔ یہ علاقہ ہماری خفیہ کمین گاہ کا ایک قریبی علاقہ تھا۔ وہاں آ کر رکشا چھوڑ دیا۔ آگے اندھیرے میں خالد رضیہ کو لے کر ایک میدان میں سے گزرنے لگا۔ یہ میدان میرا دیکھا ہوا تھا۔ بھوپال شہر میں داخل ہوتے ہی جمیلہ کی خوشبو کافی تیز ہو کر مجھے محسوس ہونے لگی

تھی۔ اپنی بیوی کے جسم کی خوشبو میرے دل و دماغ کو فرحت بخش رہی تھی۔ میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ زندہ سلامت واپس اپنی بیوی کے پاس پہنچ گیا تھا ورنہ راستے میں میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایک تو پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ دوسرے میں سانپ کی شکل میں تھا۔ ذرا خالد کی جیب سے باہر نکلتا تو لوگ مجھ پر پتھروں اور لاٹھیوں کی بارش کر دیتے اور کچل ڈالتے۔ انسان کی شکل میں ہوتا تو کوئی تعجب نہیں تھا کہ انڈین پولیس یا ملٹری پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا۔ زندہ سلامت واپس آنے پر مجھے واقعی خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا۔

خفیہ کمین گاہ کے باہر اپنے مجاہد ہمیں دیکھ کر اندھیروں میں سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے اپنے لیڈر کو پہچان لیا تھا۔ وہ خالد اور رضیہ کو اپنی حفاظت میں لے کر کمین گاہ کے اندر آ گئے۔

اندر حجرے میں آ کر کمانڈو نے رضیہ سے کہا۔

"بہن! یہ ہماری خفیہ کمین گاہ ہے۔ یہاں تم ہر طرف سے محفوظ ہو۔"

رضیہ کہنے لگی۔

"بھائی جان! جیسے بھی ہو مجھے پاکستان پہنچا دیں۔ میں آپ کا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔"

خالد نے کہا۔

"میں کل ہی کوئی بندوبست کرتا ہوں۔"

میں نے خالد سے کہا۔

"معلوم کرنا چاہیے کہ ہمارے جو مجاہد کشمیری لیڈر کو کشمیر چھوڑنے گئے تھے وہ واپس آ گئے ہیں۔"

خالد نے اسی وقت کمانڈو ارشد کو بلوایا اور اس سے اپنے دونوں مجاہدوں کے بارے میں پوچھا۔ کمانڈو ارشد نے کہا۔

"سر! وہ دونوں کشمیری حریت پرست لیڈر کو سری نگر ان کی خفیہ ہائیڈ آؤٹ میں

پہنچا کر واپس آ گئے تھے۔ اس وقت وہ اپنے دوسرے ہائیڈ آؤٹ میں ہیں۔ آپ حکم دیں تو میں انہیں وہاں سے بلوا لیتا ہوں۔"

خالد نے کہا۔

"دن نکل لینے دو۔ پھر تم خود جا کر انہیں لے آنا۔"

خالد نے رضیہ کے ساتھ تھوڑا سا ناشتہ کیا۔ چائے بنوائی۔ مجھے اس حجرے میں آنے کے فوراً بعد جیب سے نکال کر سامنے تپائی پر بٹھا دیا۔ کہنے لگا۔

"مجھے تو بھوپال کے سٹیشن پر وہ بوڑھا دیہاتی کہیں نظر نہیں آیا۔ تم نے اسے کہیں دیکھا تھا؟"

میں نے کہا۔

"میں تمہاری جیب میں تھا اردگرد مسافر چل رہے تھے۔ مجھے دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

وہ بولا۔

"میرا خیال ہے وہ بھوپال سے آگے بمبئی کی طرف چلا گیا ہوگا۔"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔"

کمانڈو خالد کے مشورے پر میں نے رضیہ کو اپنے اور اپنی بیوی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ خالد نے بالکل صحیح سوچا تھا کہ اگر ہم نے رضیہ کو بتا دیا تو حالات بدلتے کچھ دیر نہیں لگتی اگر پولیس نے رضیہ کو پکڑ لیا تو وہ ایک منٹ میں اس سے میرے اور میری بیوی کے بارے میں معلومات حاصل کر لے گی اور ہم سارے لوگ پکڑے جائیں گے۔ اپنی کمین گاہ کے بارے میں بھی خالد کو بتانا ہی پڑا تھا لیکن وہ اس لیے مطمئن تھا کہ رضیہ اس کی تحویل میں ہے اور یہیں سے وہ اسے اپنے مجاہدوں کے حوالے کر دے گا جو اسے اپنی حفاظت میں آزاد کشمیر پہنچا آئیں گے۔ رضیہ کو ہم نے دوسری کوٹھڑی میں آرام کرنے کے لیے بھجوا دیا۔ میں اور خالد اسی حجرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہم نے چائے پی۔ خالد نے جمیلہ کو بلانے کے لیے آدمی بھجوا دیا

تھا۔ وہ اسی وقت آ گئی میری طرف دیکھ کر بولی۔

"خدا کے واسطے تم کب انسانی شکل میں واپس آؤ گے۔ یا اللہ! ہمیں اس مصیبت سے نجات عطا فرما۔"

میں نے کہا۔

"جمیلہ! اب فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد ہم پاکستان چلے جائیں گے۔ وہاں جاتے ہی مجھے اللہ کی حکم سے اس عذاب سے چھٹکارا مل جائے گا۔"

"ہم کب پاکستان جائیں گے۔ تم ہر بار یہی کہتے ہو اور پھر بھول جاتے ہو۔"

میں نے کہا۔

"بس یہ سمجھ لو کہ انشاء اللہ اگلے مہینے ہم یہاں سے آزاد کشمیر کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔"

جمیلہ کافی دیر میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ پھر وہ واپس چلی گئی۔ کمانڈو ارشد نے دونوں مجاہدوں کو بلوا بھیجا تھا جو کشمیری لیڈر کو سری نگر چھوڑنے گئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کمانڈو خالد کو سیلوٹ کیا اور ادب سے کھڑے ہو گئے۔ کمانڈو خالد نے اسے رضیہ کے بارے میں ساری بات تفصیل سے بتائی اور پوچھا۔

"کیا تم لوگ ہماری اس بہن کو وزیر آباد تک لے جاسکتے ہو؟"

ایک مجاہد نے کہا۔

"سر! ہم آزاد کشمیر کا بارڈر کراس کرا دیں گے' آگے اپنا ایک آدمی اس خاتون کو وزیر آباد اس کے گھر تک چھوڑ آئے گا۔"

"کیا تمہیں اس آدمی پر بھروسہ ہے۔"

"یس سر! وہ اپنا حریت پرست مجاہد ہے۔ اس کے لیے خاتون کو وزیر آباد پہنچانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ وہ پورا بھروسے کا آدمی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر تم تیاری شروع کر دو۔ شام کا اندھیرا ہوتے ہی تمہیں رضیہ بہن کو ساتھ لے کر یہاں سے مقبوضہ کشمیر کی طرف نکل جانا ہے لیکن تمہارے ساتھ کسی

مدبر عورت کا ہونا ضروری ہے۔ اس کا تمہارے پاس کیا انتظام ہے؟"

دوسرا مجاہد بولا۔

"سر! ہماری ایک خالہ ہے وہ ہمارے ساتھ جائے گی۔ وہ کشمیر کی رہنے والی ہے۔ ان دنوں بھوپال آئی ہوئی ہے۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے اب تم جا کر ضروری تیاری کرو۔ یہاں سے تم جیپ میں جاؤ گے اور بھوپال سے آگے لاکھن پور سے دلی والی ٹرین پکڑو گے۔ بھوپال سٹیشن سے ٹرین میں سوار نہیں ہو گے۔"

"اوکے سر!"

اور دونوں مجاہد سلام کر کے چلے گئے۔ میں کمانڈو خالد کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"رضیہ بی بی تو خدا کا شکر ہے اپنے گھر پاکستان پہنچ جائے گی۔"

میں نے کہا۔

"لیکن ابھی کلکتے میں اور بدنصیب رضیہ بھی ہیں جنہیں ہمیں نکال کر پاکستان پہنچانا ہے اور ہندو درندوں کی قید سے آزاد کرانا ہے۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"تم مطمئن رہو رضیہ کو بھجوانے کے بعد ہم واپس کلکتے جا کر بنگلہ دیش سے اغوا کی ہوئی دوسری عورتوں کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے اور جن مکتی باہنی والوں نے انہیں اغوا کیا ہے ان سے بھی اس درندگی کا پورا پورا انتقام لیں گے۔"

"انشاء اللہ۔" میں نے بے اختیار کہا۔

جیسے ہی شام کا اندھیرا ہوا کمانڈو خالد نے رضیہ کو اپنے دو مجاہدوں کے ساتھ جموں کشمیر کی طرف روانہ کر دیا۔ اتنا اس نے ضرور کیا کہ رضیہ کو ساڑھی پہنا دی تاکہ کسی کو اس پر کوئی شک نہ پڑے۔ اب ہمارا مشن ایک بار پھر کلکتے جا کر مشرقی پاکستان سے اغوا کی ہوئی عورتوں کو بازیاب کرنا اور انہیں اغوا کرنے والوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ جمیلہ کو

ہم نے یہی بتایا کہ ہم ایک ضروری کام کے سلسلے میں ناگ پور جا رہے ہیں۔ چند روز میں واپس آ جائیں گے۔ اب ہم نے اپنے مشن کے سلسلے میں ضروری تیاریاں شروع کردیں۔ اس بار کمانڈو خالد نے اپنے ساتھ دو آٹومیٹک پستول رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک پستول میرے لیے تھا۔ یہ فیصلہ اس امکان کے پیش نظر کیا گیا تھا کہ مجھے انسان سے سانپ کی شکل میں تبدیل ہوئے کافی دن گزر گئے ہیں۔ کوئی پتہ نہیں میں کب انسان کی شکل میں واپس آ جاؤں۔

لیکن مجھے اس کا امکان کم ہی نظر آ رہا تھا۔ مجھے سانپ سے انسان میں تبدیل ہونے کے پہلے کی سنسناہٹ ایک لمحے کے لیے بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ پولیس سٹیشن کی قبر میں ڈسنے والے سانپ نے میرے اندر زبردست تبدیلی پیدا کر دی تھی اور میرے دورے کا وقفہ طویل ہوگیا تھا۔ مجھے کمانڈو خالد کی خفیہ کمین گاہ میں چھپے رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں سانپ کے روپ میں تھا اور میں اگر کمین گاہ سے باہر بھی نکل جاؤں تو مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کمین گاہ کے تقریباً" سبھی مجاہد میری اس کلایا پلٹ سے واقف ہوچکے تھے۔ رضیہ کو مقبوضہ جموں کشمیر کی طرف بھجوانے کے دوسرے دن کا واقعہ ہے۔ میں کمین گاہ میں بیٹھے بیٹھے بیزار ہوگیا تھا۔ دن کا وقت تھا۔ میں نے سوچا کہ ذرا باہر نکل کر کھلی ہوا کی سیر کرنی چاہیے۔ چنانچہ میں خاموشی سے رینگتا ہوا کمین گاہ کے دہانے سے نکل کر گڑھے میں آیا اور وہاں سے دیوار پر چڑھ کر باہر آگیا۔

موسم بڑا خوشگوار تھا۔ اگرچہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے لیکن دن کی روشنی خوب پھیلی ہوئی تھی۔ سردی کا موسم رخصت ہو رہا تھا۔ دن کے وقت زیادہ سردی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میں یونہی مزے مزے سے رینگتا ہوا پرانی بارہ دری کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور سامنے والے درختوں تلے درمیان سے گزرتی پگڈنڈی کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک مجھے بین کی آواز سنائی دی۔ یہ میں آپ سے سانپ کی حیثیت سے اپنے تجربے کی بات بیان کرنے لگا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ سانپ پر بین کی آواز کا کوئی اثر

نہیں ہوتا۔ کیونکہ سانپ کے تو کان ہی نہیں ہوتے' وہ بین کی آواز سن ہی نہیں سکتا۔ وہ تو محض سپیرے کے بین ہلانے سے ادھر ادھر پھن پھیلا کر ہلانے لگتا ہے' یہ بات درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ میں پہلے آپ کو بتا چکا ہوں سانپ پر ہر آواز کا اثر ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے کان نہیں ہوتے مگر وہ ہر آواز کو سن لیتا ہے۔ آواز کی لہریں جب اس کے جسم سے ٹکراتی ہیں اور یہ لہریں اپنے ارتعاش سے سانپ پر پورا اثر ڈالتی ہیں۔ خاص طور پر بین کی آواز کا سانپ پر بہت زیادہ اور فوری اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ سپیرا بین کی لے کو تیز بجاتا ہے اور اس کی تال بھی تیز ہوتی ہے۔ جب بین میں سے ٹک' ٹک' ٹک' کی مسلسل اور جلدی جلدی آواز نکلتی ہے تو سانپ کے جسم پر اس BEAT کا زبردست اثر ہوتا ہے۔ اس تال کی تیز لے پر سانپ جھومنے لگ جاتا ہے۔ سپیرے کو جب کوئی سانپ پکڑنا ہوتا ہے تو وہ یہی حربہ استعمال کرتا ہے۔ سانپ کے بل کے باہر بیٹھ کر وہ بین بجاتے ہوئے اپنی لے اور تال کو آہستہ آہستہ تیز سے تیز تر کرتا جاتا ہے۔ اس تال کے اپنے جسم پر مسلسل ٹکراؤ کی وجہ سے سانپ بے حال ہو کر بل سے باہر آ جاتا ہے۔ بین کی تال کی ضربیں اس کے جسم پر بارش کے قطروں کی طرح مسلسل پڑ رہی ہوتی ہیں۔ سانپ اپنی سدھ بدھ بھول جاتا ہے اور سپیرے کے آگے بے بس ہو کر دائیں بائیں جھومتا ہے اور پھر تھک کر اس کے آگے سر ڈال دیتا ہے اور چالاک سپیرا اسے پکڑ کر پٹاری میں بند کر لیتا ہے۔

بارہ دری کے قریب بیٹھے بیٹھے مجھے سپیرے کی بین کی آواز آئی تو میرا جسم بے چین ہونے لگا۔ کیونکہ سپیرا بڑی تیز تال کے ساتھ بین بجا رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں انسان کی طرح بول لیتا تھا انسان کی طرح سوچ سکتا تھا اور سانپ سے الگ ہو کر انسان کی آنکھوں سے اسے دیکھ بھی سکتا تھا لیکن اس کے باوجود میں انسانی وجود میں نہیں تھا۔ میں سانپ کے وجود میں تھا۔ بین کی لے اور تال بہت تیز تھی اور میرے جسم پر اس کی ضرب مسلسل پڑ رہی تھی۔ میں نے گھبراہٹ میں اس طرف گردن موڑ کر دیکھا جس طرف سے بین کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے ایک سپیرے کو دیکھا جو بین بجاتے

ہوئے میری طرف آہستہ آہستہ بڑھا چلا آ رہا تھا۔ وہ مجھ سے ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر تھا۔ میں سانپ کی حیثیت سے فوراً" سمجھ گیا کہ یہ سپیرا مجھے پکڑنا چاہتا ہے۔ ورنہ وہ کبھی بین اتنی تیز تال اور لے کے ساتھ نہ بجاتا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ گرمیوں کی دوپہروں میں جب کوئی سپیرا گلی محلے میں سے گزرتا ہے تو وہ بڑی ست لے میں بین بجا رہا ہوتا ہے۔ یعنی اس کی بین کی لے تیز نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ سانپ پکڑنے کے لیے بین نہیں بجا رہا ہوتا۔

لیکن یہ سپیرا جو آہستہ آہستہ بارہ دری کی طرف جہاں میں بیٹھا تھا بڑھ رہا تھا، بڑی تیز لے اور تال میں بین بجا رہا تھا۔ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کی اصطلاح میں اس لے کو درت تال کہتے ہیں۔ یعنی سپیرے نے مجھے یا تو دور سے دیکھ لیا تھا یا پھر اس نے میری بو محسوس کر لی تھی۔ وہ میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ پرانے تجربہ کار سپیروں کو سانپ کی بو دور سے آ جاتی ہے۔ میں نے ابھی اس سپیرے کو نہیں دیکھا تھا۔ میں نے پھن کھول لیا تھا اور بین کی تال پر پھن کو لہرانے لگا تھا۔ میں نے ارادہ بھی کیا اور کوشش بھی کی وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن بین کی لے کاری اور تیز تال کا مجھ پر اس قدر شدید اور مسلسل اثر پڑ رہا تھا کہ میں کوشش کے باوجود وہاں سے بھاگ نہ سکا۔

سپیرا میرے قریب پہنچ چکا تھا۔

جیسے میری نگاہ اس پر پڑی دہشت کے مارے میرا سارا بدن جھنجھنا اٹھا۔ یہ سپیرا وہی دیہاتی بوڑھا تھا جس کو میں نے کان پور کے سٹیشن پر دیکھا تھا اور جس نے جھانسی کے سٹیشن تک ہمارا تعاقب کیا تھا اور ہمارے خیال میں جو جھانسی میں ہی رک گیا تھا اور جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے اور کمانڈو خالد کا پیچھا کر رہا ہے۔ تب مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ یہ بوڑھا دیہاتی سپیرا تھا اور کمانڈو خالد کا نہیں بلکہ میرا پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے اپنے علم کے زور سے یا میرے جسم سے نکلنے والی خاص بو کی وجہ سے محسوس کر لیا تھا کہ میں حقیقت میں سانپ نہیں ہوں' انسان ہوں جس نے سانپ کا روپ اختیار کر رکھا ہے۔ اب یہ بات ثابت ہو گئی

تھی کہ وہ میرا پیچھا اس لیے کر رہا تھا کہ مجھے پکڑ کر اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایسا کیوں کرنا چاہتا تھا یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ بہرحال جب میں نے بوڑھے دیہاتی کو سپیرے کے لباس میں پہچان لیا اور یہ حقیقت بھی مجھ پر کھل گئی کہ وہ مجھے پکڑنے کے ارادے سے آیا ہے اور اب میری خیر نہیں ہے تو میں نے اپنے جسم کی ساری طاقت اور انسانی ذہن کی پوری قوت ارادی کو جمع کر کے اپنے آپ کو وہاں سے بھگا کر لے جانے کی کوشش شروع کر دی۔ میں جب بھی اپنے آپ کو پیچھے لے جانے کی کوشش کرتا مجھے بین کی تال کا جھٹکا سا لگتا اور مجھے ایسے محسوس ہوتا جیسے میرے سانپ والے بدن میں طاقت نہیں رہی اور میں انتہائی کمزور ہو چکا ہوں۔

عیار بوڑھا سپیرا بھی شاید میری کیفیت کو بھانپ گیا تھا۔ اس نے بین کی لے اور تیز کر دی اور مجھ سے کوئی دس گز کے فاصلے پر آ کر زمین پر بیٹھ گیا اور بین بجاتے ہوئے آہستہ آہستہ میری طرف کھسکنے لگا۔ اس کے کندھے سے ایک کپڑے کا تھیلا لٹک رہا تھا جس میں ضرور سانپوں کو بند کرنے والی پٹاری ہوگی۔ میں جلیبی کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ میری گردن اوپر کو اٹھی ہوئی تھی اور پھن کھلا تھا۔ میرے دل میں خیال ضرور آیا کہ میں اپنی انسانی آواز نکال کر اسے ڈرا دوں۔ اس سے کہوں کہ میں شو جی مہاراج کا خاص سانپ ہوں اور اگر اس نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو اس پر دیوتاؤں کا عذاب آئے گا۔ لیکن یہ سوچ کر میں نے فوراً اس خیال کو ذہن سے نکال دیا کہ ابھی تو سپیرے کا قیاس ہی ہے کہ میں انسانی سانپ ہوں۔ اگر میں نے اس کے ساتھ انسانی آواز میں بات کی تو اس کو پورا یقین ہو جائے گا کہ جس سانپ کی اسے تلاش تھی وہ میں ہی ہوں اور پھر تو یہ کسی صورت میں مجھے نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ میں نے اپنی طرف سے اپنے انسان ہونے کا راز راز ہی رہنے دیا۔ کیونکہ مجھے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ انسانی آواز میں بولنے کے بعد بھی میرے اندر کوئی خاص طاقت پیدا نہیں ہو جائے گی اور میں پھر بھی سپیرے کے ہاتھوں پکڑا جاؤں گا۔ چنانچہ میں انسانی آواز میں بولنے کی بجائے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ سپیرا میرے اس قدر قریب پہنچ گیا تھا کہ مجھے اس کی سرخ آنکھیں صاف نظر آ رہی تھیں جو انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور بغیر پلکیں جھپکے مسلسل میری طرف گھور رہی تھیں۔ سپیرا اپنی بین کی لے کو بے حد تیز کرتا جا رہا تھا۔ گرمی کا موسم نہیں تھا مگر اس بوڑھے سپیرے کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے جسم میں طاقت نہیں رہی۔ میرا پھن لہرانے کی بجائے ڈولنے لگا تھا۔ میرا پھن بھی اپنے آپ سمٹا جا رہا تھا۔ میں کوشش کر کے سر کو اوپر اٹھاتا تو وہ پھر نیچے کو گر پڑتا۔ میرا انسانی ذہن پوری طرح بیدار تھا اور فرار ہونے کی ترکیبیں دھڑا دھڑ سوچ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے زور زور سے چلانا اور مدد کے لیے پکارنا شروع کر دینا چاہیے۔ میری آواز سن کر خفیہ کمین گاہ سے جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی لوگ ضرور میری مدد کو پہنچ جائیں گے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سپیرے نے پلک جھپکنے میں اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے گردن سے پکڑ لیا۔ اس کا ہاتھ لگتے ہی جیسے میری آواز خشک ہو گئی اور میں کوشش کے باوجود اپنی انسانی آواز نہ نکال سکا۔ شاید بوڑھے سپیرے کو بھی میرے ارادے کا علم ہو گیا تھا اور اسے خدشہ تھا کہ میں انسانی آواز میں شور نہ مچا دوں' اس نے میری گردن نہ چھوڑی اور اس طرح مجھے اپنی کلائی کے گرد لپیٹ کر اٹھا اور تیز تیز قدموں سے درختوں کے درمیان جو پگڈنڈی تھی اس طرف چل پڑا۔ مجھے اپنا سانس رکتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اپنے دوستوں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ بوڑھا سپیرا مجھے اپنی کلائی کے ساتھ لپیٹے میری گردن انگلیوں میں جکڑے پکی سڑک پر آ گیا جس کو پار کر کے وہ سامنے والے کھیتوں میں چلنے لگا۔





میرے لیے یہ ایک بلائے ناگہانی تھی۔

میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب میرے دل میں کمین گاہ سے باہر نکل کر کھلی ہوا میں سیر کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ کھیتوں میں اونچی اونچی فصل کھڑی تھی۔ بوڑھا سپیرا ایک جگہ کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ گیا' اس کا سانس ابھی تک پھولا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ابھی تک گردن سے پکڑا ہوا تھا۔ پھر اس نے انگلیوں کی گرفت میری گردن پر ڈھیلی کر دی اور اپنی آنکھوں کے سامنے لا کر مجھے اپنی سرخ انگارہ ایسی آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور بولا۔

"میں جانتا ہوں تم میری آواز سن رہے ہو۔ میں جانتا ہوں تم سانپ نہیں ہو۔ تم انسان ہو اور تمہیں کسی سپیرے نے شو ناگ کا منتر پڑھ کر سانپ بنا دیا ہوا ہے۔ میرے پاس اس منتر کا توڑ نہیں ہے۔ میں تمہیں انسانی شکل میں واپس نہیں لا سکتا لیکن اگر تم مجھ سے اپنی انسانی آواز میں کوئی بات کرو گے تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ بتاؤ' تمہارا نام کیا ہے؟"

میں اب شور مچا کر اپنے ساتھی مجاہدوں کو نہیں بلا سکتا تھا۔ میں ان سے بہت دور ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس مکار سپیرے نے ضرور کسی خاص مقصد کے لیے مجھے پکڑا ہے۔ اس کے لیے میں ایک نایاب سانپ ہوں اور وہ اپنا مقصد پورا کیے بغیر مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا۔ اگر میں نے اس کے ساتھ انسان کی آواز میں کوئی بات کی تو یہ

بات اس پر ثابت ہو جائے گی کہ میں اصل میں انسان ہوں اور میں نے سانپ کا روپ اختیار کیا ہوا ہے۔ پھر تو یہ مجھے کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑے گا۔ یہ اس کی چال ہے۔ وہ صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کیا واقعی میں سانپ نہیں بلکہ انسان ہوں۔ وہاں کسی کو شور مچا کر بلانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ لوگ تو ویسے بھی ایک سانپ کو انسان کی آواز میں بات کرتے دیکھ کر ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں بالکل نہیں بولوں گا اور اس بوڑھے مکار سپیرے پر یہ راز کبھی افشا نہیں کروں گا کہ میں سانپ نہیں بلکہ انسان ہوں۔ چنانچہ میں خاموش رہا۔

بوڑھے سپیرے نے میری گردن تو چھوڑ دی تھی مگر مجھے پوری طرح سے قابو کیا ہوا تھا اور میں اس کی گرفت سے نکل کر فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر تم اپنا آپ مجھ پر ظاہر کر دو اور انسان کی آواز میں مجھ سے کوئی بات کر لو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں سانپ کے جسم سے نکال کر انسان کے روپ میں واپس لے آؤں گا۔ میرے گورو کے پاس شو ناگ کے منتر کا توڑ موجود ہے۔ میں تمہیں اس کے پاس لے جاؤں گا اور وہ منتر پھونک کر تمہیں سانپ سے انسان بنا دے گا۔"

یہ بھی اس عیار سپیرے کی ایک چال تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کسی مار پر ہے۔ وہ یونہی کان پور سے میرا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ اس کو میری بو سے محسوس ہو گیا تھا کہ میں سانپ کی شکل میں انسان ہوں۔ چنانچہ وہ مجھے اپنے قبضے میں کر کے مجھ سے کوئی زبردست کام لینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے لیے شرط تھی اور ضروری تھا کہ میرا انسان ہونا ثابت ہو جائے۔ ابھی تک اس پر یہ ثابت نہیں ہوا تھا کہ میں واقعی سانپ کی شکل میں انسان ہوں۔ اگر میں ذرا بول دیتا تو یہ بات ثابت ہو جاتی اور پھر مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ میں خاموش رہا۔ بوڑھے سپیرے نے ایک بار پھر میری گردن مضبوطی سے پکڑ لی اور بین زمین پر رکھ کر بائیں ہاتھ سے

زمین پر سے تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور دھیمی آواز میں عجیب و غریب قسم کے منتر پڑھنے شروع کر دیے۔ منتر پڑھتے پڑھتے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے ہاتھ میں لی ہوئی تھوڑی سی مٹی میرے اوپر ڈال دیتا۔ میرے جسم میں پہلے ہی کافی کمزوری آ چکی تھی۔ اس کے منتر پڑھ کر میرے اوپر مٹی ڈالنے سے مجھے ایسے لگا جیسے میری رہی سہی طاقت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔

کھیتوں میں خاموشی تھی کوئی کسان وغیرہ وہاں نہیں تھا۔ کوئی آتا جاتا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بوڑھا سپیرا بڑی بے فکری سے منتر پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونک بھی رہا تھا اور مجھ پر مٹی بھی ڈالتا جا رہا تھا۔ ایک بار اس نے مجھ پر مٹی ڈالی تو مجھے اپنا جسم پہلے سے زیادہ بوجھل محسوس ہونے لگا۔ بوڑھے سپیرے نے میری گردن پر ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ میری گردن اس کے ہاتھ میں ڈھلک گئی۔ وہ برابر منتروں کا جاپ کرتا جا رہا تھا اور مجھ پر تھوڑی مٹی ڈالتا جا رہا تھا۔ جب اس کے ہاتھوں کی مٹی ختم ہو گئی تو اس نے زور سے اپنا ہاتھ زمین پر مارا اور مجھے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔

میں زمین پر بے جان سا ہو کر گر پڑا۔ میں نے کھیت کی فصل میں بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن میرا جسم اتنا بوجھل ہو گیا تھا کہ میں تھوڑا سا رینگ کر وہیں رہ گیا۔ ایسی میری حالت پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ بالکل وہی کیفیت تھی جیسے آدمی خواب میں کسی چڑیل کو دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے پاؤں من من بھاری ہو جاتے ہیں اور دوڑ نہیں سکتا۔ آپ کو بھی شاید خواب میں اس کا تجربہ ہوا ہو گا۔ میری بھی وہی حالت ہو رہی تھی۔ میں نے دو تین بار فرار ہونا چاہا لیکن میرا جسم اتنا بوجھل اور بھاری ہو چکا تھا کہ میں ایک دو انچ رینگ کر وہیں رہ گیا۔

تب بوڑھے سپیرے نے جھک کر کہا۔

"تم مجھ سے کب تک اپنا آپ چھپاؤ گے؟ میں تمہیں ایک بار پھر موقع دیتا ہوں۔ مجھ سے انسان کی آواز میں بات کرو۔ میں جانتا ہوں تم میری آواز سن بھی رہے ہو اور انسان کی آواز میں میرے سوال کا جواب بھی دے سکتے ہو۔ میں تمہارا دوست ہوں'

تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ اگر تم مجھ سے انسان کی آواز میں بات کرو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست بن جائیں گے۔ میں تمہیں اپنے گورو سپیرے کے پاس لے جاکر سانپ سے انسانی شکل میں واپس بھی لے آؤں گا۔ اس کے بعد میں تمہیں ایک ایسا راز بتاؤں گا کہ ہم دونوں مالا مال ہو جائیں گے۔ بھارت میں امیر سے امیر اور دھن وان سے دھن وان بھی ہماری دولت کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ بولو' کیا کہتے ہو۔"

میں پھر بھی خاموش رہا اور زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ بوڑھے سپیرے نے سرہلایا اور بولا۔

"تم بڑے ضدی آدمی ہو۔ کوئی بات نہیں۔ میں بھی اس وقت تک تمہیں اپنی قید میں رکھوں گا جب تک کہ تم مجھ سے انسان کی آواز میں بات نہیں کرتے۔ میں نے تم پر ایسا اگنی منتر پڑھ کر پھونکا ہے کہ تم اپنی جگہ سے زیادہ ہل جل نہیں سکو گے اور میں اگر تمہیں میدان میں کھلا بھی چھوڑ دوں گا تو تم وہاں سے بھاگ نہیں سکو گے۔ میرے منتر کے اثر سے تم اسی طرح سانپ کی شکل میں ہی رہو گے۔ بتاؤ کیا سوچا ہے تم نے؟"

میں اس کے باوجود خاموش رہا' کوئی بات نہ کی۔ بوڑھے سپیرے نے مجھے اٹھا کر پٹاری میں بند کیا۔ پٹاری جھولے میں ڈالی اور لاٹھی ٹیکتا ایک طرف چل پڑا۔ میں پٹاری میں بند تھا۔ پٹاری کو اس نے کپڑے میں باندھ رکھا تھا۔ مجھے باہر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہاں جمیلہ کے جسم کی اور کمانڈو خالد کے جسم کی بو ضرور آ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ دونوں بوئیں ہلکی ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ بوڑھا سپیرا مجھے پٹاری میں بند کر کے شہر سے دور نکلتا چلا جا رہا تھا۔ پھر وہ کسی ایسی جگہ پر آ کر رک گیا جہاں موٹر گاڑیوں اور لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہاں سے بوڑھا سپیرا ایک رکشے میں سوار ہوگیا۔ رکشا دیر تک چلتا رہا۔ وہ جہاں رکا وہاں بھی لوگوں کی کافی آوازیں تھیں۔ ان آوازوں میں ریل گاڑی کے انجن کی آواز آئی تو میں سمجھ گیا کہ سپیرا

ریلوے سٹیشن پر آ گیا ہے اور مجھے یہاں سے کسی دوسرے شہر لے جا رہا ہے۔ میری سوچنے سننے اور محسوس کرنے کی حس اسی طرح نارمل حالت میں تھی۔ صرف میرا جسم سن ہو کر بوجھل ہو گیا ہوا تھا اور میں اسے مرضی کے مطابق زیادہ حرکت نہیں دے سکتا تھا۔

بوڑھا سپیرا کسی ٹرین میں سوار ہو گیا۔

ٹرین کسی طرف جا رہی تھی؟ مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ شروع میں مجھے وقت کا کچھ احساس رہا۔ پھر یہ اندازہ بھی جاتا رہا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ ٹرین مختلف سٹیشنوں پر رکتی آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں پٹاری میں بند پڑا تھا۔ مجھے اب نہ کمانڈو خالد کی بو آ رہی تھی' نہ جمیلہ کے جسم کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ یہ لوگ مجھ سے بہت دور ہو چکے تھے۔ شاید ٹرین ایک دن اور ایک رات چلتی رہی تھی۔ اس دوران بوڑھا سپیرا ٹرین سے کئی بار اترا تھا۔ ایک بار وہ اترا تو مجھے سنائی دیا کہ وہ کسی سے دوسری ٹرین کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ یہ سپیرا اتنا عیار تھا کہ اس نے کسی سے پوچھتے ہوئے شہر وغیرہ کا نام نہیں لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں شہر کا نام سن لوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے معلوم ہو کہ وہ مجھے کہاں لیے جا رہا ہے۔ یہاں اس نے ٹرین بدلی تھی۔ یہاں سے آگے پھر ریل گاڑی کا طویل سفر شروع ہو گیا۔ ہندوستان کا ملک بڑا کشادہ ملک ہے۔ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب کی طرف جائیں تو تین تین دن گاڑی چلتی رہتی ہے۔

اس دوران بوڑھے سپیرے نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی پٹاری سے باہر نہیں نکالا تھا۔ مجھے باہر نکالنے کی اسے ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سانپ کئی کئی دن کچھ کھائے پئے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ آخر ایک جگہ وہ ریل گاڑی سے اتر کر کسی لاری میں سوار ہو گیا۔ لاری اونچی جگہوں پر دیر تک چلتی گئی۔ کافی دیر بعد ایک جگہ رک گئی۔ مسافروں کے اترنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہاں لوگ ٹھیک ٹھاک اردو زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ سپیرا پیدل چل رہا ہے۔ شاید

کوئی ویران علاقہ تھا۔ کسی گاڑی' موٹر یا آدمی کی کوئی آواز نہیں آتی تھی۔ ایک بار صرف ایک ہوائی جہاز کی آواز سنائی دی جو آسمان پر سے گزر رہا تھا۔ یہ آواز بھی آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔ پھر پرندوں کی آواز آئی۔ یہ آوازیں بھی پیچھے رہ گئیں اور خاموشی چھا گئی۔ بوڑھا سپیرا ایک خاص نپی تلی رفتار سے چلتا چلا جا رہا تھا۔ خدا جانے وہ مجھے کہاں لیے جا رہا تھا۔ ایک بیل گاڑی قریب سے گزری۔ مجھے بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز آئی۔ کسی دیہاتی نے بوڑھے سپیرے کو مخاطب کر کے کہا۔

"پرنام میرو دادا۔"

"پرنام بھیا۔"

بوڑھے سپیرے نے جواب میں کہا۔ یہاں مجھے معلوم ہوا کہ اس سپیرے کا نام میرو ہے اور وہ کسی ایسی بستی کے قریب پہنچ گیا ہے جہاں لوگ اسے جانتے ہیں۔ کسی آٹے کی چکی کے چلنے کی آواز دور سے آ رہی تھی۔ یہ چکی کے انجن کی ٹک ٹک کی آواز تھی۔ یہ آوز دور ہو گئی۔ لگتا تھا ہم بستی سے بھی دور نکل آئے ہیں۔ میں بوڑھے سپیرے کو گالی دے کر پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے کہاں لیے جا رہا ہے مگر میں انسانی آواز نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ بولنے سے میرا راز فاش ہو جاتا۔ میں صبر شکر کر کے پٹاری میں خاموش پڑا رہا۔ بوڑھے سپیرے کو لاری سے اتر کر پیدل چلے آدھا گھنٹہ ضرور گزر گیا تھا۔ کم بخت ایسا چاق و چوبند بوڑھا تھا ذرا نہیں تھکا تھا۔ آخر ایک جگہ وہ رک گیا۔ وہ بیٹھ گیا تھا۔ پھر ایسا لگا جیسے اس نے اپنا جھولا کندھے سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ مجھے پانی کی آواز آئی۔ بوڑھا منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ شاید یہ کوئی ندی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھا سپیرا وہاں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد پھر آگے روانہ ہو گیا مگر اب وہ قدم قدم چل رہا تھا' لگتا تھا کہ اس کی منزل آ گئی ہے۔ دور سے کچھ بچوں کے کھیلنے اور ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں آئیں۔ بوڑھا سپیرا رک گیا۔ کسی نے اس کو پکار کر کہا۔

"میرو! تم اندر بیٹھو میں آ رہا ہوں۔"

میرو سپیرا چند قدم چل کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ جھولے کو اس نے اپنے گھٹنوں

پر رکھ لیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہی آدمی جس نے اسے آواز دی تھی۔ اس کی آواز قریب سے آئی۔

''کہو دادا! کہاں گئے تھے؟ کوئی کمائی وغیرہ ہوئی؟ بڑے دن لگا دیے ہیں اس بار؟''

بوڑھے سپیرے نے جواب دیا۔

''لوگ بھاگ سانپوں کا تماشہ اب نہیں دیکھتے۔ بچے بھی دوسرے کھیل کھیلتے ہیں۔ سانپ کا تماشہ دکھاؤں تو ان کی مائیں انہیں پکڑ کر گھروں میں لے جاتی ہیں کہ ناگ ڈس لے گا۔''

پھر بوڑھے سپیرے نے اس آدمی سے پوچھا۔

''مرادی آیا تھا؟''

دوسرے نے کہا۔

''کل آیا تھا۔ کہتا تھا میرو دادا آئے تو اسے کہنا میں اگلے دن رات کو آؤں گا۔''

''شاید آج آ جائے۔''

''ہاں دادا! تمہارے لیے کھچڑی لاؤں۔ تیری بہو نے آج کھچڑی پکائی ہے۔''

''لے آؤ۔''

دوسرا آدمی چلا گیا۔ بوڑھے شکاری نے جھولے میں سے پٹاری نکالی' اس کا ڈھکنا کھولا اور مجھے گردن سے پکڑ لیا۔ حیرانی کی بات ہے کہ اس کے ہاتھ میں عجیب طاقت تھی۔ جیسے ہی وہ میرے قریب آیا مجھ پر اور زیادہ نقاہت طاری ہوگئی اور میں کوشش کے باوجود بوڑھے سپیرے کے ہاتھ پر نہ ڈس سکا۔ لیکن وہ اتنا تجربے کار اور پرانا سپیرا تھا کہ اگر میں ڈس بھی لیتا تو اس کے پاس میرے زہر کا توڑ ضرور موجود تھا۔ اس قسم کے پرانے اور تجربہ کار بوڑھے سپیروں کے پاس شو ناگ کا منکا ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ ان پر زہریلے سے زہریلے سانپ کے زہر کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ انہیں ایسے منتر یاد ہوتے ہیں کہ جن کے پھونکنے سے سانپ کے زہر کا اثر ختم ہوجاتا ہے۔ لیکن میں نے اس خیال سے اسے ڈسنے کی کوشش کی تھی کہ شاید میرا زہر

اسے ہلاک کر دے۔ میں اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہلا ضرور تھا لیکن ڈسنے کے لیے جتنا منہ کھولنے کی ایک سانپ کو ضرورت اور دانت گاڑنے کے لیے جتنی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھ میں نہیں رہی تھی۔

بوڑھے سپیرے نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میں تمہیں جہاں لے کر آ گیا ہوں یہاں سے تم کبھی واپس نہیں جا سکو گے۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ مجھ کو اپنا بھیدی بنا لو۔ مجھ سے آدمیوں کی طرح بات کر کے بتا دو کہ تم آدمی ہی ہو اور تم پر فلاں سپیرے نے منتر کر کے تمہیں سانپ بنا دیا تھا۔ بولو۔"

میں نے تو فیصلہ کر رکھا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے یہ راز میں اس مکار کو نہیں بتاؤں گا۔ یہی ایک چیز میرے پاس باقی رہ گئی تھی جس کی میں پوری طرح حفاظت کر رہا تھا اور جس پر میرا اختیار بھی تھا اور اس عیار سپیرے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس کے پاس ایسا کوئی منتر نہیں تھا جس کو پھونک کر وہ مجھے انسانوں کی طرح بولنے پر مجبور کر سکے۔ میں چپ رہا۔ بوڑھے سپیرے نے پھر کہا۔

"تم میرے دوست بن جاؤ۔ میں تمہیں دنیا کا سب سے بڑا دھن وان سب سے بڑا دولت مند بنا دوں گا۔ لوگ دور دور سے تمہاری پوجا کرنے آئیں گے اور تیرے قدموں میں سونے چاندی کے ڈھیر لگا دیں گے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ تم دن میں ایک بار اپنے پجاریوں کے آگے انسانی آواز میں ایک اشلوک پڑھ دیا کرو۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے کسی مندر میں رکھ کر لوگوں کو احمق بنا کر یہ مشہور کر کے میری اندھا دھند پوجا کروانا چاہتا تھا کہ میں شو جی دیوتا کا مقدس سانپ ہوں اور میرے اندر شو جی بول رہے ہیں۔ اس طرح سے وہ میرے ذریعے خود بے پناہ دولت کمانا چاہتا تھا۔ مجھے خیال بھی آیا کہ اگر میں اس پر یہ ظاہر کر دوں کہ میں واقعی انسانی آواز میں بات کر سکتا ہوں تو یہ مجھے کسی مندر میں ہی بٹھائے گا۔ میں وہاں سے آسانی سے فرار ہو سکوں گا۔ پھر خیال آیا کہ یہ مکار سپیرا اتنا احمق اور گدھا نہیں ہے کہ آسانی سے

مجھے فرار ہونے کا موقع دے دے۔ اس کو بھی معلوم ہے کہ میں فرار ہو سکتا ہوں۔ یہ کوئی ایسا منتر پڑھ کر مجھ پر پھونک دے گا کہ میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکوں گا یا تھوڑی سی حرکت ہی کر سکوں گا۔ اس کا علاج تو ایک ہی تھا کہ میرا دورہ ختم ہو جائے اور میں خود بخود سانپ سے اپنی انسانی شکل میں واپس آ جاؤں اور یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ پھر یہ خیال بھی آتا کہ مجھ پر سپیرے نے جو نیم بے ہوشی کا منتر پھونکا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے میرے انسان بن جانے پر بھی وہ اثر میرے جسم پر قائم رہے اور میں اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکوں۔ غرض کہ میں عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ لیکن یہ میں نے عہد کر لیا تھا کہ میں سپیرے پر یہ ظاہر نہیں ہونے دوں گا کہ میں انسان کی طرح بات کر سکتا ہوں۔

صرف اسی طرح میں اسے شکست دے سکتا تھا۔

میں ایک جھونپڑی میں تھا جس کے دروازے میں سے ڈوبتے سورج کی پھیکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ یہاں بھوپال والی سردی نہیں تھی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہندوستان کا جنوبی علاقہ ہے۔ جھونپڑی کے دروازے میں سے باہر ویران میدان تھا جہاں دور ایک دو جھونپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید یہ سپیروں کی کوئی بستی تھی۔ باہر سے کسی کے قدموں کی آہٹ آئی تو بوڑھے سپیرے نے جلدی سے مجھے پٹاری میں بند کر کے پٹاری چارپائی کے نیچے رکھ دی۔ وہی آدمی جس نے بوڑھے شکاری سے کھچڑی کے بارے میں کہا تھا' کیلے کے پتوں میں اس کے لیے کھچڑی اور پانی لے کر آیا تھا۔ اس نے کہا۔

"دادا ! لو کھچڑی کھاؤ' پانی بھی لے آیا ہوں۔"

بوڑھا شکاری بولا۔

"جیتے رہو بیٹا۔"

دونوں آپس میں دوسرے سپیروں اور سانپوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ آدمی چلا گیا۔ سپیرا چارپائی پر لیٹ گیا۔ مجھے چارپائی کے چرچرانے کی آواز آئی تھی

جس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ لیٹ گیا ہے۔ کافی وقت گزرنے کے بعد کسی نے باہر سے آواز دی۔

"ارے میرو دادا! اندر ہو' کیا؟"

بوڑھا شکاری جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بولا۔

"مراری! اندر آ جاؤ۔ میں تمہاری ہی راہ دیکھ رہا تھا۔"

کوئی آدمی اندر آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا نام مراری تھا۔ مراری نے پوچھا۔

"کہو' کوئی سپھلتا ہوئی؟ کچھ ملا؟"

بوڑھے شکاری نے فرط مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ارے مراری! لکشمی دیوی ہم پر مہربان ہو گئی ہے۔ آج کل ایسے سانپ کہاں ملتے ہیں جو آدمی کی جون میں آ جاتے ہوں لیکن لکشمی دیوی ہم پر مہربان تھی۔ مجھے ایک ایسا سانپ مل گیا ہے۔"

مراری نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

"کہاں ہے یہ سانپ؟ مجھے دکھاؤ' جلدی دکھاؤ۔ ارے ہم تو کروڑ پتی بن جائیں گے۔"

یہ دونوں ایک دوسرے کے ہم راز لگتے تھے۔ بوڑھے سپیرے نے چارپائی کے نیچے سے پٹاری نکال کر اپنے آگے چارپائی پر رکھی اور اسے کھول کر بولا۔

"دیکھو۔ یہ ہے وہ سانپ۔"

جھونپڑی میں لالٹین روشن تھی۔ رات ہو گئی تھی۔ اس کے ہم راز ساتھی مراری نے جھک کر مجھے دیکھا اور بولا۔

"دادا! کیا یہ آدمی کی طرح بولتا ہے؟"

بوڑھا شکاری کہنے لگا۔

"بس یہی ایک مصیبت ہے' یہ آدمی کی آواز جان بوجھ کر نہیں نکال رہا۔ ارے میرا تجربہ بتا رہا ہے اور اس کے جسم سے وہی بو آ رہی ہے جو ایک منش ناگ کے جسم

سے آتی ہے مگر یہ بڑا چالاک آدمی ہے۔ منہ بند کر کے بیٹھ گیا ہے۔ میرے لالچ دینے پر بھی نہیں بولتا۔"

مراری بھی کوئی سپیرا تھا۔ اس نے مجھے اٹھا کر سونگھا اور بولا۔

"دادا! ہے تو یہ منش سانپ۔ ارے تم نے تو کمال کر دکھایا دادا۔ راجہ سے ہم دس لاکھ سونے کی مہریں لیں گے۔ پوری دس لاکھ۔ مگر دادا! جب تک یہ سانپ آدمی کی زبان میں کوئی بات نہیں کرے گا راجہ تو ہمیں پھوٹی کوڑی بھی نہیں دے گا۔ بلکہ الٹا ہمیں ریاست کی جیل میں بند کر دے گا، جہاں سے ہم کبھی باہر نہیں نکل سکیں گے۔ وہیں مرکھپ جائیں گے۔"

بوڑھے سپیرے نے کہا۔

"یہ ضرور بولے گا' یہ ضرور بولے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ تم مجھے راجہ کے پاس تو لے کر جاؤ۔ راجہ کے سامنے جا کر یہ سانپ اپنے آپ آدمی کی آواز نکالے گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔"

مراری کہنے لگا۔

"پہلے ہمیں راجہ کے منتری جی سے ملنا ہو گا۔ وہ سالا بھی تو انعام میں سے اپنی پتی مانگے گا۔ اس کو بھی ایک حصہ دینا ہو گا۔"

بوڑھا سپیرا بولا۔

"ہم راجہ سے بیس لاکھ مہریں طلب کریں گے۔ اس میں سے ایک حصہ منتری کو دینے کے بعد بھی ہمارے پاس بہت کچھ بچ جائے گا۔"

مراری نے کہا۔

"میرا وچار کہتا ہے کہ راجہ اس سے بھی زیادہ انعام دے گا۔ آخر اس کی ریاست کی گدی کی وراثت کا معاملہ ہے۔ راجہ کیسے گوارا کرے گا کہ اس کے مرنے کے بعد ریاست پر اس کے بھائی کا بیٹا بیٹھ جائے۔"

بوڑھے سپیرے نے کہا۔

"مراری! راجہ کا باپ بھی بیس لاکھ طلائی مہریں دے گا۔ تم مجھے اس کے پاس تو لے چلو۔"

مراری بولا۔

"دادا! لے تو میں جاؤں گا۔ پر یہ سوچ لو اگر تمہارا سانپ آدمی کی بولی نہ بولا تو ہم دونوں کی خیر نہیں۔"

بوڑھے سپیرے نے کہا۔

"مراری! یہ ضرور بولے گا' ضرور بولے گا۔ تم منتری سے بات کرو' جاؤ۔"

میں دل میں بڑا حیران ہو رہا تھا کہ آخر یہ عیار سپیرا اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ رہا ہے کہ میں راجہ کے آگے انسانی آواز میں بول پڑوں گا۔ بہت غور کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس مکار سپیرے نے دل میں کیا سوچا ہوا ہے۔ آخر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہ راجہ کے دربار میں جا کر مجھ پر ضرور کوئی خاص قسم کا طلسمی منتر پھونکے گا جس کے اثر سے میں اپنے آپ بول پڑوں گا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں زبان نہیں کھولوں گا۔

وہ رات گزر گئی۔ دوسرے دن مراری نے آ کر بوڑھے سپیرے کو بتایا کہ راجہ کے منتری نے اپنے محل میں بلایا ہے۔ بوڑھا سپیرا اسی وقت اس کے ساتھ چل پڑا۔ جس پٹاری میں میں بند تھا وہ اس نے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ یہ میرے کڑے امتحان کا وقت تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ راجہ کے دربار میں جا کر کیا ہو جائے۔ اگر اس پرانے پاپی سپیرے نے کوئی ایسا منتر پڑھ دیا جس کا مجھ پر اثر ہوگیا اور میں اپنے آپ بول پڑا تو یہ میری شکست اور اس بدمعاش کی فتح ہوگی جو میں نہیں چاہتا تھا۔ یہ خاص منتر اس بوڑھے سپیرے نے آخری وقت کے لیے شاید اسی لیے بچا کر رکھا ہوا تھا۔

میں پٹاری میں بند تھا۔ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے اور یہ لوگ مجھے لے کر کہاں آ گئے ہیں۔ باہر کی آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ ہم کسی بڑے محل میں آ گئے ہیں۔ جگہ جگہ بوڑھے سپیرے اور مراری سے پوچھ گچھ ہوتی کہ کون ہو'

• کہاں جا رہے ہو' اجازت نامہ دکھاؤ۔ مراری اس کی راہ نمائی کر رہا تھا۔ اس کے پاس ریاست کے راجہ کے منتری کا خاص اجازت نامہ تھا جسے دکھا کر وہ محل میں ایک کمرے میں پہنچ گیا جہاں اسے بتایا گیا کہ یہاں بیٹھو۔ منتری جی ابھی تشریف لاتے ہیں۔ دونوں بیٹھ گئے اور آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ان کے بیک وقت پرنام کرنے کی آواز آئی۔

"منتری جی کو مہاراج شو جی کے درشن ہوں۔ مہاراج! میرو سپیرا حاضر ہے۔"

ایک بھاری آواز آئی۔

"کیا وہ سانپ مل گیا ہے؟"

میرو نے کہا۔

"ہاں مہاراج! مل گیا ہے۔ یہ دیکھئے۔ یہ شو جی کے ایک اوتار کا ناگ ہے۔ یہ دیوتا سمان ہے' پر سانپ کی جون میں ہے۔"

منتری نے پوچھا۔

"یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ دیوتا ہے' اس کو بلا کر دکھاؤ۔ پہلے یہ آدمی کی آواز میں بات تو کرے۔"

میرو نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"مہاراج! آپ ہمیں راجہ جی کے حضور لے چلیں' میں آپ کو وشواش دلاتا ہوں وہاں جاتے ہی یہ آدمی کی آواز میں باتیں کرنے لگے گا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ پہلے یہاں اس سے بات کر کے دکھاؤ۔ راجہ کے حضور نہ بولا تو میری بھی بے عزتی ہوگی اور تم دونوں بھی قید میں ڈال دیے جاؤ گے۔"

خدا جانے بوڑھا سپیرا کیوں اصرار کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! یہ راجہ کے دربار کے سوا اور کسی جگہ نہیں بولے گا۔ آپ وشواش رکھیں مہاراج' یہ راجہ کے دربار میں اپنے آپ بولنے لگے گا۔ میرے پاس ایک خاص منتر ہے جس کا اثر صرف راجہ کے سامنے ہی اس پر ہوگا۔"

منتری نے کہا۔

"اگر تمہارا منتر نہ چلا تو میری جو بے عزتی ہوگی وہ تو ہوگی مگر تم بھی زندہ نہ بچ سکو گے۔ یہ سوچ لو۔"

بوڑھے شکاری نے اسی پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"مہاراج! یہ ضرور بولے گا' ضرور بولے گا۔"

تب منتری نے مراری سے کہا۔

"مراری! تم نے اس سپیرے سے میرے حصے کی بات کرلی ہے ناں؟ تمہیں راجہ سے جو انعام ملے گا اس کا تیسرا حصہ میرا ہوگا۔"

مراری نے کہا۔

"مہاراج! میں نے بات کرلی ہے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

منتری بولا۔

"تم لوگ یہاں آرام کرو' میں راجہ صاحب سے جا کر بات کرتا ہوں۔"

خدا جانے یہ ہندوستان کی کون سی ریاست تھی۔ کوئی چھوٹی سی گمنام ریاست ہی ہوگی کیونکہ بڑی بڑی ریاستیں تو بھارتی حکومت نے ختم کر دی تھیں۔ منتری کے جانے کے بعد مراری ایک بار پھر بوڑھے سپیرے سے کہنے لگا کہ میرو دادا ایک بار پھر سوچ لو۔ ابھی وقت ہے کم از کم مجھے ہی بتا دو کہ تم راجہ کے سامنے جا کر اس پر کونسا منتر پڑھو گے۔ بوڑھے سپیرے نے اسے کچھ نہ بتایا۔ تھوڑی دیر بعد یہ لوگ میری پٹاری لے کر چلے گئے۔ ان کے قدموں کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ قالینوں پر چل رہے ہیں۔ پھر وہ ایک جگہ رک گئے۔ مراری اور بوڑھے سپیرے نے کسی کو ہندی سنسکرت میں زبردست طریقے سے پرنام وغیرہ کیا۔ منتری کی آواز بلند ہوئی۔

"مہاراج! ادھیراج! بوڑھا سپیرا میرو اوتاری ناگ لے کر آپ کی سیوا میں حاضر ہے۔"

کسی مرد نے باوقار آواز میں پوچھا۔

"میرو کیا تمہیں پورا وشواش ہے کہ اوتاری ناگ ہی ہے؟"

بوڑھے سپیرے نے عاجزی سے کہا۔

"مہاراج! میری سات سنتانیں ناگوں میں گزر گئی ہیں۔ میں سانپ کی بو سونگھ کر اس کی نسل کو پہچان لیتا ہوں۔ یہ اوتاری ناگ ہی ہے۔ مجھے پورا وشواش ہے۔"

باوقار آواز یقیناً" راجہ کی تھی۔ اس نے دوسرا سوال کیا۔

"کیا تم اس سے انسان کی آواز میں بات کر سکتے ہو؟ کیونکہ یہی اوتاری ناگ کی پہچان ہے اور ہمیں اسی ناگ کی ضرورت ہے۔"

بوڑھا سپیرا بولا۔

"مہاراج! ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ میں ابھی ناگ سے بات کر کے دکھلاتا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے میری پٹاری کھول دی۔ مجھے گردن سے پکڑ کر باہر نکالا۔ میں نے دیکھا کہ میں کسی عالی شان محل کے سجے ہوئے کمرے میں ہوں۔ دیواروں پر ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ ستونوں کے پاس سرخ وردیوں والے خادم ادب سے کھڑے تھے۔ چھت منقش تھی جس میں کہیں کہیں بلور کے قیمتی فانوس لگے تھے۔ میرے قریب ہی مسند پر گاؤ تکیے لگائے ایک بھاری بھرکم آدمی جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں' گلے میں ہیرے موتیوں کے ہار تھے' چمکیلی اچکن اور ریشمی پگڑی باندھے بیٹھا تھا۔ بوڑھے سپیرے کے پاس ہی مراری اور منتری ادب سے کھڑے تھے۔ بوڑھے سپیرے نے مجھے چاندی کی چھوٹی سی میز پر بٹھا دیا۔ اس کے ہاتھ میں جانے کون سا طلسم تھا کہ اس کا ہاتھ لگتے ہی میرے بدن کی نقاہت بڑھ جاتی تھی اور میں زیادہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ سپیرے نے اپنی جیب میں سے ایک کالا دھاگا نکالا اور اسے سامنے رکھ کر اسی پر منتر پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگا۔ پھر اس نے وہ کالا دھاگہ میری گردن میں باندھ دیا۔ اُس کے بعد دوبارہ منتر پڑھنے لگا۔ جیسے جیسے وہ منتر پڑھ کر مجھ پر پھونکتا جاتا تھا ویسے میرے اندر ایک تموج سا پیدا ہونے لگا تھا۔ کوئی شے بے اختیار ہو کر میرے

اندر سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ یہ میری آواز ہے جو میرے سانپ والے جسم کے اندر سے بلبلوں کی شکل میں میرے منہ کے قریب آ رہی ہے۔

بوڑھے سپیرے نے منتروں کی آواز تیز کر دی تھی۔ میں چاندی کی میز پر بیٹھا ادھر ادھر بل کھانے لگا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ مجھے اپنی آواز پر قابو نہیں رہا اور میں کسی وقت انسانی آواز میں بول پڑوں گا۔ میں اپنی انسانی آواز کو روکنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا اور آواز کے بلبلے میرے گلے میں آ کر جمع ہو رہے تھے اور باہر نکلنے کو زور لگا رہے تھے۔ منتر پڑھتے پڑھتے بوڑھے سپیرے نے بلند آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

میں نے خاموش رہنے کی بہت کوشش کی لیکن آواز کے بلبلے میرے حلق کے ساتھ ٹکرا کر باہر نکلنے کو زور لگا رہے تھے۔ بوڑھا سپیرا بار بار اونچی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"تم کون ہو؟ بولو تم کون ہو؟"

اور پھر میرے حلق سے اپنے آپ آواز بلند ہوئی۔ یہ میری اپنی انسانی اور مرد کی آواز تھی۔ میں نے کہا۔

"میں انسان ہوں۔ میں انسان ہوں۔"

راجہ اور منتری کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"جے ہو شو جی مہاراج کی۔"

اس کے بعد مجھ پر نقاہت طاری ہو گئی۔ میں راجہ کو بتانا چاہتا تھا کہ میں کسی دیوتا کا اوتار نہیں ہوں۔ میں ایک مصیبت میں پھنسا ہوا انسان ہوں۔ لیکن اپنے بارے میں ان کو بتانا بھی میرے لیے خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ اگر میں اپنی اصل حقیقت وہاں ظاہر کر دیتا تو یہ بات محل تک محدود نہیں رہ سکتی تھی۔ ریاست میں اور ریاست کے

باہر دوسرے شہروں میں یہ بات عام ہو جاتی کہ راجہ کے پاس ایک سپیرا ایسا سانپ لایا ہے جو پاکستانی جاسوس ہے۔ پولیس میری تلاش میں وہاں پہنچ سکتی تھی۔ میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا اور یہ سوچ کر خاموش رہا کہ تھوڑی سی نقاہت دور ہو جائے تو میں یہاں سے فرار ہو جاؤں گا۔

بوڑھے شکاری نے مجھ سے کہا۔

"سنو اوتاری ناگ! تمہیں راجہ ادھیراج جو حکم دیں اسے پورا کرنا ہوگا۔ کیا ان کا حکم مانو گے؟"

میرے حلق سے آواز کے کچھ بلبلے باہر نکل کر پھٹ گئے اور مجھے اپنی آواز یہ کہتی سنائی دی۔

"میں ہر حکم مانوں گا۔"

اس کے بعد راجہ نے منتری سے کہا۔

"منتری جی! اوتاری ناگ کو ہماری مہارانی کے کمرے میں پہنچا دیا جائے اور میرو شکاری کو اس کا پورا پورا انعام دیا جائے۔"

"جو حکم مہاراج!" منتری نے سر جھکا کر کہا۔

میرے لیے اسی وقت بلور کا چھوٹا سا مرتبان لایا گیا۔ بوڑھے شکاری نے مجھے اس میں ڈال کر بند کر دیا اور راجہ سے کہا۔

"مہاراج! تین راتیں یہ اوتاری ناگ مہارانی جی کے کمرے میں رہے گا اور جیسا میں نے منتری جی کو کہا ہے ویسا ہی کیا جائے گا۔ اگر مہارانی جی کے پاس یہ اوتاری ناگ تین راتیں رہ گیا تو بھگوان کی کرپا سے مہارانی جی کے ہاں بڑا خوبصورت لڑکا پیدا ہوگا جو مہاراج کا نام روشن کرے گا۔"

راجہ نے خوش ہو کر کہا۔

"ہم ایسا ہی کریں گے۔"

بوڑھے سپیرے نے کہا۔

"مہاراج! ایک بات اور کہنے والی رہ گئی ہے اس اوتاری ناگ پر میں نے شو ناگ کا منتر پھونک دیا ہے۔ یہ چاہے بھی تو بھاگ نہیں سکے گا۔ مہارانی جی کو ہدایت کر دیجئے گا کہ جب تک اوتاری ناگ کمرے میں رہے وہ کمرے کے سارے دروازے بند رکھیں۔"

منتری نے جواب میں کہا۔

"بے فکر رہو۔ جیسا تم کہتے ہو ایسا ہی ہوگا۔ اب تم جا سکتے ہو۔ صبح آ کر اپنا انعام و اکرام لے جانا۔"

مجھے راجہ کے محل میں چھوڑ کر بوڑھا سپیرا اور مراری ادب سے جھک کر سلام کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ میں شیشے کے مرتبان میں بند سمٹا ہوا پڑا تھا۔ میری گردن میں مکار سپیرا کالا دھاگہ باندھ گیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ دھاگہ اس نے کس لیے باندھا ہے۔ میں یہی سمجھا کہ اس کالے دھاگے کی وجہ سے مجھ پر منتروں کا اثر ہوا ہے۔ اگر یہ دھاگہ اتار دیا جائے تو ہو سکتا ہے مجھ پر منتروں کا اثر ختم ہو جائے اور میری توانائی واپس آ جائے۔ توانائی واپس آ جانے کی صورت میں میں محل سے فرار ہو سکتا تھا۔

راجہ نے منتری سے کہا۔ "منتری جی! اوتاری ناگ کو لے کر ہمارے ساتھ آئیں' ہم مہارانی کے پاس جائیں گے۔ بھگوان کی کرپا سے ہمیں اوتاری ناگ مل گیا ہے۔ اب شو جی مہاراج کی کرپا سے ہم بہت جلد بیٹے کے باپ بن جائیں گے اور ہماری ریاست کو ولی عہد مل جائے گا جو ہمارا نام روشن کرے گا اور ہماری ریاست پر ہمارے بعد راج کرے گا۔ آ جائیں ہمارے ساتھ۔"

منتری نے یہ کہہ کر شیشے کا مرتبان اٹھا لیا۔

"مہاراج! بھگوان کی کرپا سے ایسا ہی ہوگا۔"

محل کے کئی بڑے بڑے کمرے تھے جن کی دیواروں پر مخملیں پردے لٹک رہے تھے۔ چھت سے جھاڑ فانوس لٹک رہے تھے۔ جگہ جگہ باوردی خدمت گار کھڑے

تھے۔ راجہ گزرتا تو وہ جھک جاتے۔ آخر راجہ ایک کمرے کے دروازے پر آکر رک گیا۔ اس نے شیشے کا مرتبان منتری سے لے لیا اور اسے واپس جانے کا حکم دیا۔ منتری تعظیم بجا لاکر چلا گیا۔

راجہ نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور کہا۔

"مہارانی سندران' میں ہوں بکرم سنگھ۔"

"آ جائیں مہاراج۔"

کمرے کے اندر سے نسوانی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے ایک حسین عورت مہارانیوں کے لباس میں کھڑی تھی۔ اس نے ہیرے جواہرات کے زیورات پہنے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ باندھ کر راجہ کو پرنام کیا اور شیشے کے مرتبان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مہاراج! کیا یہی اوتاری ناگ ہے؟"

راجہ اندر آکر مخملیں کاؤچ پر بیٹھ گیا اور مرتبان میز پر رکھ کر بولا۔

"سندران رانی! ہم بڑے خوش نصیب ہیں۔ ہمیں اوتاری ناگ مل گیا ہے۔ بھگوان کی بڑی کرپا ہوئی ہے۔ اب تمہاری گود ضرور بھر جائے گی اور رشی مینوں اور جوشیوں کے کہنے کے مطابق تمہارے ہاں لڑکا پیدا ہوگا جو ہماری ریاست کا وارث بنے گا۔"

رانی نے خوش ہو کر کہا۔

"مہاراج! کیا آپ سچ کہتے ہیں؟"

راجہ نے رانی کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور کہا۔

"ہم سچ کہتے ہیں رانی۔ یہ شو جی مہاراج کا اوتاری ناگ ہے۔ ہمارے بڑے دھن بھاگ تھے کہ سپیرے کو یہ ناگ مل گیا۔"

رانی نے پوچھا۔

"مہاراج! کیا یہ انسان کی آواز میں بات کرتا ہے؟"

راجہ بولا۔ "کیوں نہیں۔ میں نے خود اسے بات کرتے سنا ہے۔ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔"

راجہ نے مرتبان کا ڈھکن اٹھا دیا۔ رانی نے ذرا ڈری ہوئی آواز میں کہا۔

"مہاراج! یہ کہیں آپ کو کاٹ نہ لے۔"

راجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بوڑھے سپیرے نے مجھے بتا دیا ہے کہ اس نے اس پر جو منتر پڑھ کر پھونکا ہے اس کی وجہ سے اس کے زہر کا اثر ختم ہو چکا ہے۔ یہ ڈسنا بھی بھول گیا ہے۔"

اور راجہ نے مرتبان میں ہاتھ ڈال کر مجھے باہر نکال کر میز پر رکھ دیا۔ میں نے اس دوران کچھ سوچ کر ایک فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب میرے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ رانی اور راجہ پر یہی ظاہر کروں کہ میں شو جی کا اوتاری ناگ ہوں اور سانپ کے روپ میں بانجھ عورتوں کو اولاد نرینہ کی نعمت سے مالا مال کرنے کے لیے دنیا میں آیا ہوا ہوں۔ اس طرح سے میں رانی کو اپنے تقدس کے اثر میں لے کر اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکوں گا اور یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر سکوں گا۔ میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ان لوگوں کے سامنے انسان کی آواز میں بات نہ کرنے اور خاموش رہنے کا اب مجھے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ان لوگوں سے بات کرنے میں ہی میری تھوڑی بہت نجات تھی۔ چنانچہ جب راجہ نے اپنی رانی پر میرا اوتاری ناگ ہونا ثابت کرنے کے لیے مجھ سے میرا نام پوچھا تو میں نے انسانی آواز میں جواب دیا۔

"اے راجہ! میرا نام وشوامتر ہے۔ تو بڑا خوش بخت ہے کہ مجھے حاصل کرنے میں سپھل ہوئے ہو۔"

مہارانی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ راجہ بھی خوشی سے نہال ہو رہا تھا۔ اس نے رانی سے کہا۔

"دیکھا مہارانی! میں نہ کہتا تھا بھگوان نے ہم پر بڑی کرپا کی ہے۔ تم نے اپنے

کانوں سے سن لیا کہ یہ اوتاری ناگ ہے اور اس کا نام وشوامتر ہے جو شبو جی مہاراج کا داس تھا۔"

دونوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر اپنے اپنے سر جھکا دیے۔ میں نے بھی اداکاری شروع کر دی۔ کیونکہ اب میرا ٹارگٹ بوڑھا سپیرا نہیں تھا بلکہ یہ راجہ اور زیادہ تر اس کی رانی تھی۔ راجہ نے مجھ سے کہا۔

"مہاراج کا ہمارے محل میں آنا ہمارے لیے بڑا نیک شگون ہے۔ مہاراج مجھے وشواش ہے کہ آپ کی کرپا سے میری رانی کی گود ضرور ہری ہو جائے گی۔"

میں نے دل میں کہا ہری ہوگی کہ لال ہوگی یہ تو خدا ہی جانتا ہے لیکن میں تمہاری رانی کی مدد سے یہاں سے فرار ضرور ہو جاؤں گا۔ اوپر سے میں نے انسانی آواز میں کہا۔

"تمہاری رانی کے ہاں نو ماہ بعد ایک سندر بیٹا پیدا ہوگا۔"

دونوں خوشی سے اچھل پڑے اور ہاتھ جوڑ کر میرے آگے سجدے کرنے لگے۔ میں نے کہا۔

"لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا مہاراج۔" راجہ نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ "رانی کو میرا ہر حکم ماننا پڑے گا۔ اگر اس نے میرا کوئی حکم نہ مانا تو پھر یہ بانجھ کی بانجھ ہی رہے گی۔"

رانی نے میرے، آگے سر جھکا دیا۔ بولی۔

"مہاراج! آپ جو حکم کریں گے میں وہی کروں گی میں تو آپ کی داسی ہوں۔ بس مجھے ایک بیٹا دے دیجئے۔"

"ہمارا حکم مانو گی تو بیٹا ضرور تمہیں مل جائے گا۔"

مجھے یہ علم نہیں تھا کہ رانی میرے ساتھ کیا کرنے والی تھی یا مجھے رانی کے ساتھ کیا کرنا تھا۔ یہ سب کچھ شاہی محل کے جوشیوں نے راجہ اور اس کی رانی کو سمجھا دیا

ہوا تھا۔ راجہ نے کہا۔

"مہاراج! میں جاتا ہوں۔"

اس نے سر جھکا کر مجھے ماتھا ٹیکا اور الٹے قدموں کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد مہارانی نے دروازے کو بند کر کے چٹخنی لگا دی اور آہستہ آہستہ چل کر میرے قریب آ کر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! مجھے حکم کیجئے۔"

میں کیا اسے حکم کرتا۔ پہلے تو میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ شاہی محل کے جوشیوں نے اسے کیا ہدایات دے رکھی ہیں۔ لیکن میری توجہ کا مرکز میری گردن میں بندھا ہوا کالا دھاگہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میری گردن سے یہ کالا دھاگہ اتار دیا گیا تو میری توانائی بحال ہو جائے گی اور میں رانی کو ڈس کر بے ہوش کر دوں گا اور بڑے آرام سے محل میں سے باہر نکل جاؤں گا اور کسی نہ کسی طرح بھوپال پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے کہا۔

"رانی! میری گردن میں جو دھاگہ بندھا ہوا ہے وہ اتار کر پھینک دو۔"

یہ سننا تھا کہ رانی کا چہرہ مارے خوف کے زرد ہو گیا۔ وہ دو زانو ہو کر جس میز پر میں بیٹھا تھا اس کے آگے سجدہ میں گر پڑی اور التجائیں کرنے لگی۔

"مہاراج! مجھے ایسا حکم نہ دیں۔ مجھے ایسا حکم نہ دیں۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔

"کیوں اس میں ڈرنے کی کون سی بات ہے؟"

تب رانی نے سہمی ہوئی آواز میں مجھے بتایا کہ شیو جی مندر کے بڑے جوتشی پجاری نے راجہ کو رانی کی کنڈلی دیکھ کر بتایا تھا کہ رانی کے ہاں صرف ایک صورت میں بیٹا پیدا ہو سکتا ہے کہ کہیں سے شو جی مہاراج کا اوتاری ناگ لایا جائے۔ یہ ناگ دیوتا کا اوتار ہو گا مگر سانپ کے روپ میں ہو گا اور دیوتاؤں کی زبان میں بات کرتا ہو گا۔ مہارانی اس ناگ کے ساتھ تین راتیں بسر کرے گی۔ اس کے نو مہینے بعد رانی کو بھگوان چاند

سا بیٹا دے گا لیکن اس کی ایک شرط ہوگی جو سپیرا اوتاری ناگ پکڑ کر لائے گا وہ اس کی گردن میں نارد متی کا کالا دھاگہ ضرور باندھ دے گا۔ یہ کالا دھاگہ کسی حالت میں بھی ناگ کے گلے سے نہیں اتارا جائے گا۔ اوتاری ناگ رانی کو مجبور بھی کرے تو وہ اسے نہیں اتارے گی۔ اگر اس نے کالا دھاگہ ناگ کی گردن سے اتار دیا تو پھر رانی کے ہاں کبھی اولاد نہیں پیدا ہوگی اور وہ بانجھ کی بانجھ ہی رہے گی اور اگلے جنم میں لومڑی کی شکل میں پیدا ہوگی۔

جب میں نے یہ سنا تو سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ میرے اختیار میں نہیں تھا کہ میں فوراً اپنی گردن سے سپیرے کا باندھا ہوا کالا دھاگہ اتار دوں۔ یہ اب مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اس کالے دھاگے نے ہی مجھے منتروں کے طلسم میں باندھ رکھا ہے۔ اگر کسی طرح اسے میری گردن سے الگ کر دیا جائے تو میری طاقت مجھے واپس مل سکتی ہے اور میں فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔ دوسری صورت میں' میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں بول ضرور سکتا تھا' سن ضرور سکتا تھا لیکن زیادہ دور تک رینگ نہیں سکتا تھا۔ چند قدم رینگنے سے میرا جسم پتھر کی طرح بے جان ہوجاتا تھا۔ ایسی حالت میں میرا محل سے فرار ہونا ناممکن تھا۔

آخر میرے دماغ میں ایک ترکیب آ گئی۔

مجھے یقین تھا کہ یہ ترکیب ضرور کارگر ثابت ہوگی۔ آگے چل کر آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ ترکیب کیا تھی۔ چنانچہ میں نے رانی سے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو بے شک تم میری گردن میں دھاگہ بندھا رہنے دو۔ اسے مت اتارو۔"

رانی بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! آپ نے مجھے خوش کر دیا ہے۔ میں آپ کی دھن وادی ہوں۔ میں بھگوان کے سامنے آپ کو وچن دیتی ہوں کہ اگرچہ آپ مرد کے روپ میں نہیں ہیں لیکن میں عورت کے روپ میں ضرور ہوں۔ میں آپ کو اس طرح پیار کروں گی

جیسے ایک پتنی اپنے پتی سے پیار کرتی ہے۔"

میں دل میں خوش ہوا کیونکہ میں نے جو ترکیب سوچی تھی اور جو منصوبہ بنایا تھا یہ رانی اپنے آپ اسی طرف آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"اگر تم ایسا کرو گی تو وشواش رکھو' بھگوان تمہیں چاند سا بیٹا ضرور دے گا۔"

رانی نے بے اختیار ہو کر مجھے اپنی ہتھیلیوں میں اٹھا لیا اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے لباس اور جسم سے یورپ اور امریکہ کے پرفیوم کی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔ رانی نے مجھے اٹھایا اور اپنے نرم ریشمی بستر پر لے جا کر بٹھا دیا اور بولی۔

"مہاراج! آپ میرے لیے کام دیوتا سمان ہیں۔ کام دیوتا عشق اور پریم کا دیوتا ہے۔ عورت اور مرد کے ملاپ کا دیوتا ہے۔ میں تین راتوں کے لیے آپ کی داسی ہوں۔ آپ کی پتنی ہوں۔ میں وہی پوجا پاٹھ کروں گی جو آکاش کی دیوداسیاں اپنے دیوتاؤں کو رجھانے کے لیے کیا کرتی ہیں۔"

رانی کے بیڈ روم میں ایک شاندار سنگھار میز تھا۔ وہ مجھے بستر پر بٹھانے کے بعد انگڑائی لے کر آرام آرام سے قدم اٹھاتی اور کچھ گنگناتی سنگھار میز کی طرف گئی اور اپنے بال کھول کر ان میں برش پھیرنے لگی۔ اس کے سیاہ بال لمبے اور چمکیلے تھے۔ بیڈ روم میں کافی روشنی تھی۔ اس نے بالوں میں برش کرنے کے بعد سوائے پلنگ کے ساتھ رکھے ٹیبل لیمپ کے باقی ساری روشنیاں بجھا دیں۔ اس ٹیبل لیمپ کا شیڈ سرخ رنگ کا تھا۔ بیڈ روم میں ہلکی ہلکی سرخ روشنی پھیل گئی۔

مجھے اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے رانی سے ایک فرمائش کرنی تھی لیکن یہ فرمائش میں صرف اس وقت کرنا چاہتا تھا جب رانی خوب موڈ میں آ چکی ہو۔ اس چھوٹی سی ریاست کی مہارانی جس کا نام سندران تھا ہندو دیومالا کی دلدلوں میں سر سے پاؤں تک ڈوبی ہوئی تھی اور پھر اس وقت وہ اپنی ریاست کی وراثت کی خاطر ایک سانپ سے بیاہ کر چکی تھی۔ بہت جلد اس پر کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے اپنا سارا لباس اتار دیا اور مجھے گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے کہا۔

"مہارانی! کیا دیوتاؤں کی شراب سوم رس نہیں پیو گی؟ اس کے بغیر تو تمہارا یگیہ پورا نہیں ہو گا۔"

"شما کریں مہاراج! میں تو بھول ہی گئی تھی۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر ایک الماری میں سے شراب کی بوتل اور دو گلاس لے آئی۔

میں نے کہا۔

"ہم سوم رس میں پہلے ہی ڈوبے ہوئے ہیں۔ صرف تم سوم رس پیو گی۔"

"جو حکم مہاراج۔"

اس نے میرے سامنے گلاس میں شراب ڈالی اور غٹاغٹ چڑھا گئی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ شراب کی عادی ہے۔ شراب پینے کے بعد وہ مجھ سے کھیلنے لگی۔ کبھی مجھے چومتی، کبھی مجھے اپنے سینے سے لگا لگا کر بھینچتی اور کبھی مجھے اپنے جسم پر چھوڑ کر مسکراتے ہوئے دیکھتی رہی۔ میں نے اسے دوسرا گلاس بھی پینے کو کہا۔ اس کی کیا مجال تھی کہ میری حکم عدولی کرتی۔ وہ دوسرا اور پھر تیسرا گلاس بھی چڑھا گئی۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی اور مجھے اپنے جسم کے ساتھ لگا کر زور زور سے وحشیوں کی طرح بھینچنے لگی۔

یہی وہ وقت تھا جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔

میں نے اسے کہا۔

"رانی! کیا تم نہیں چاہتی کہ اس وقت میں ایک مرد کی شکل میں تمہارے سامنے آؤں اور تمہیں ایک مرد کی طرح پیار کروں؟"

رانی نشے میں جھومتے ہوئے بولی۔

"مہاراج! مجھ پر کرپا کریں اور مرد بن کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیں۔"

میں نے کہا۔

"میں مرد کی شکل میں صرف اسی وقت واپس آ سکتا ہوں جب میری گردن میں بندھا ہوا یہ دھاگہ اتار دو گی۔ اسے میری گردن سے اتار دو پھر دیکھنا میں تمہیں کس طرح پیار کرتا ہوں۔"

رانی اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ اسے مندر کے جوتشی نے میری گردن کا دھاگہ اتارنے سے منع کر رکھا ہے۔ اس نے نشے میں کہا۔

"مہاراج جی! یہ کون سی مشکل بات ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے میری گردن میں بندھا ہوا کالا دھاگہ اتار دیا۔ کالا دھاگہ اترتے ہی مجھے اپنے جسم میں خون کی گردش تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ حالانکہ سانپ کا خون سرد ہوتا ہے اور اس کی گردش بھی بہت ہی سست ہوتی ہے لیکن میرے اندر جیسے ایک دم گرمی آ گئی اور میری کھوئی ہوئی توانائی بحال ہو گئی۔ میں اپنے جسم کو بھی تیزی سے حرکت دے سکتا تھا۔ میں نے اپنا پھن بھی بڑی آسانی سے کھول لیا۔ رانی میری طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ جب میں آدمی کی شکل اختیار نہ کر سکا تو وہ بولی۔

"مہاراج! آپ ابھی تک ناگ ہی ہیں۔ مرد کے روپ میں کیوں نہیں آئے؟"

میں اسے کہنے لگا کہ ابھی کچھ وقت لگے گا لیکن میرا دل بیٹھ سا گیا۔ میرے گلے سے انسانی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے دو تین بار اپنی مردانہ آواز میں بولنے کی کوشش کی لیکن میری آواز جیسے مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔ میں انسانی آواز میں بالکل نہ بول سکا۔ میں پریشان ہو گیا۔ میں رانی کو کیا کہتا۔ وہ مجھے اٹھا کر اپنے ساتھ لگا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

"میرے دیوتا! جلدی سے مرد بن کر میرے سامنے آ جاؤ۔ بس صرف ایک بار تھوڑی دیر کے لیے مرد بن جاؤ۔"

میں سخت پریشان تھا۔ مجھے یہ غم لگ گیا تھا کہ دھاگہ اترنے کے بعد شاید اب میں نہ تو کبھی انسانی شکل میں واپس آ سکوں گا اور نہ سانپ کے روپ میں کبھی انسانی آواز میں بول ہی سکوں گا۔ میں رانی کو یہ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ کالا دھاگہ میری گردن میں دوبارہ باندھ دے کیونکہ دھاگہ باندھنے سے میرے جسم کی ساری توانائی ختم ہو جاتی تھی اور میں وہاں سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرح کم از کم میری توانائی تو بحال ہو گئی تھی اور میں وہاں سے فرار ہو سکتا تھا۔ میرے دل کی آواز نے مجھے کہا۔

"کرم داد! اللہ کا نام لے کر اس گناہ کی دنیا سے بھاگ جاؤ۔ آگے اللہ مالک ہے۔ وہ تمہیں اس عذاب سے بھی نجات دلا دے گا۔"

میں نے رانی کے سینے سے لگے لگے جلدی سے اپنا منہ پیچھے ہٹایا۔ پھن کھول کر گرج دار پھنکار ماری۔ رانی تو ڈر کر پیچھے گر پڑی۔ میں اچھل کر اس گناہ کے بستر سے نیچے آ گیا' دروازہ بند تھا۔ میں رانی کو انسانی آواز میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دروازہ کھول دے۔ دروازے میں کسی قسم کے سوراخ یا درز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ کسی گیراج کا دروازہ نہیں تھا۔ ایک ریاست کی مہارانی کے بیڈ روم کا بڑی قیمتی لکڑی کا دروازہ تھا۔ میں بیڈ روم کی دیوار کے ساتھ ساتھ چکر لگانے لگا۔ رانی گھبرا گئی تھی۔ وہ ہاتھ باندھ کر بستر پر بیٹھ گئی اور مجھ سے معافیاں مانگنے لگی۔

"مہاراج! مجھ سے کوئی بھول ہو گئی ہے تو مجھے شما کر دیں۔ میری غلطی معاف کر دیں-----"

مجھے اب اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں اس بیڈ روم سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ آخر مجھے ایک راستہ مل گیا۔ اس بیڈ روم کا ایک دوسرا دروازہ بھی تھا۔ اس دروازے کے نیچے قالین ذرا سا پیچھے ہٹا ہوا تھا اور وہاں دوسری طرف سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں وہاں سے دوسری طرف نکل گیا۔ دوسری طرف لکڑی کی سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ یہ بیڈ روم کا عقبی اور ہنگامی دروازہ معلوم ہوتا تھا۔ وہاں اوپر ایک جلتے ہوئے بلب کی روشنی تھی۔ میں سیڑھیوں پر سے رینگتا ہوا اوپر چلا گیا۔ اوپر ایک بند کوریڈور یا راہ داری تھی۔ یہ راہ داری ایک سرنگ کی طرح تھی مگر اس میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں اس میں سے تیزی سے رینگتا ہوا آگے نکل گیا۔

آگے ایک چھوٹا سلاخ دار دروازہ تھا۔ میں اس میں سے بھی گزر گیا۔ اب میرے سامنے ایک اور سیڑھیاں تھیں جو اوپر کو جا رہی تھیں۔ میں سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ یہ سیڑھیاں محل کی چھت پر جاتی تھیں۔ میں چھت پر آیا تو دیکھا کہ آسمان پر کہیں بادل تھے اور کہیں تارے جھلملا رہے تھے۔ میں چھت پر سے ہوتا ہوا اس کی منڈیر پر آ گیا

اور دوسری طرف جھانک کر دیکھا۔ دوسری طرف نیچے محل کا ایک باغ تھا۔ میں دیوار سے اتر کر باغ میں آگیا۔ مجھے اگر اس بات کی خوشی تھی کہ میں بوڑھے سپیرے کی قید سے آزاد ہوگیا ہوں تو اس بات کا غم بھی لگ چکا تھا کہ میں انسانی آواز میں بول نہیں سکتا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ میری انسانی آواز عارضی طور پر بند ہوئی تھی یا ہمیشہ کے لیے میں انسانی آوز سے محروم ہوگیا تھا۔

انہی پریشان خیالات میں الجھا ہوا میں محل کے باغ میں سے نکل کر اس کی اونچی دیوار کے پاس آگیا۔ ایک سانپ کے لیے اونچی دیوار کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں دیوار پر سے ہوتا ہوا دوسری طرف آگیا جہاں ایک ندی بہہ رہی تھی۔ میں محل سے باہر آچکا تھا۔ معلوم نہیں یہ کون سی جگہ تھی' کون سی ریاست تھی اور کون سے بڑے شہر سے کتنی دور تھی۔ شاہی محل پر بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور محل کے چاروں طرف کھیتوں اور دور دور تک پھیلے درختوں کے جھنڈوں پر بھی سناٹا طاری تھا۔ میں نے ایک جگہ رک کر چاروں طرف منہ کر کے فضا کو سونگھا۔ مجھے کسی طرف سے بھی جمیلہ یا اپنے دوست کمانڈو منظر خالد کی بو نہیں آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں ان لوگوں سے بہت دور آگیا ہوا تھا۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل کافی چھٹ گئے تھے۔ تارے نظر آرہے تھے۔ میں نے تاروں کے حساب سے مغرب کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ کیونکہ میرے اس وقت کے قیاس کے مطابق بھوپال مغرب کی سمت واقع تھا اور مجھے بھوپال ہی جانا تھا۔ اگرچہ مجھے رات کے اندھیرے میں نظر آرہا تھا لیکن دن کی روشنی میں میں سمت کا زیادہ خیال رکھ سکتا تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ راتوں رات اس دوزخی محل اور عیار سپیروں کی بستی سے جتنی دور نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔ جب سورج نکلے گا تو اس کی روشنی میری بہتر طریقے سے راہ نمائی کر سکے گی۔ میں رینگتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کھیتوں میں سے گزر گیا۔ پھر درختوں کے جھنڈ بھی عبور کر لیے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری توانائی بحال ہوچکی تھی۔ گو میں انسانی آواز میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے چلتے چلتے

دو ایک بار اپنے آپ سے بات کرنے کی کوشش بھی کی لیکن میرے حلق سے انسانی آواز نہ نکل سکی۔

دور سے مجھے کسی گاؤں کی روشنیاں نظر آئیں۔ میں گاؤں میں جانے کی بجائے اس کے پہلو سے ہو کر آگے نکل گیا۔ اب میں ایک کچی سڑک پر تھا جس کے درمیان بیل گاڑیوں کے چلنے کے گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ دونوں طرف جھاڑیاں تھیں۔ دور تک رات کا اندھیرا اور خاموشی تھی۔ کچی سڑک کھیتوں میں دور تک چلی گئی تھی۔ مجھے فضا میں پانی کی نمی کا احساس ہوا۔ میں نے دو تین بار زبان باہر نکالی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ دریا کی نمی ہے اور کوئی دریا قریب ہی ہے۔ میں فکر مند ہوا کہ اگر سامنے دریا آ گیا تو اسے تیر کر ہی پار کرنا ہوگا اور دریا کی لہریں مجھے کافی دور آگے لے جائیں گی اور خدا جانے میں اپنی منزل سے کتنی دور جا پڑوں۔ دریا کنارے اگے ہوئے سرکنڈوں کی مرطوب خوشبو قریب ہوتی جا رہی تھی۔ آخر میں دریا پر پہنچ گیا۔ دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ میں اسے تیر کر پار کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

میں نے بائیں جانب نگاہ ڈالی تو مجھے کچھ فاصلے پر دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جاتی روشنیاں ٹمٹماتی دکھائی دیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دریا کا پل ہے۔ میں نے اپنا رخ پل کی طرف کر لیا۔ میں دریا کے پل پر سے آسانی کے ساتھ گزر سکتا تھا۔ مجھے پل تک پہنچتے پہنچتے کافی وقت لگ گیا۔ یہ پل لوہے کے گارڈوں کو قینچیوں کی طرح جوڑ کر بنایا گیا تھا اور بہت بڑا پل تھا۔ اس پر ایک طرف پیدل اور بیل گاڑیوں وغیرہ کے چلنے کا راستہ تھا اور درمیان میں ریلوے لائن تھی۔ میں ریلوے لائن سے ہٹ کر پل پر چل پڑا۔ ابھی آدھا پل عبور کیا تھا کہ پیچھے سے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ریل گاڑی آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ریلوے لائن پر انجن کی روشنی پڑنے لگی۔ پھر انجن کی آواز آنا شروع ہو گئی۔ گاڑی بڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ میں ایک طرف ہٹ کر دور سے آتی ریل گاڑی کو دیکھنے لگا۔ خدا جانے کیا بات تھی کہ دریا کے پل پر گاڑی بڑی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ عام طور پر دریا کے پلوں پر

گاڑیاں اتنی آہستہ آہستہ نہیں چلا کرتیں۔ انجن اپنی تیز روشنی کو اپنے ساتھ ہی سمیٹتا آہستہ آہستہ چلتا میرے قریب سے گزر گیا۔ ڈبوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ شاید مسافر سو رہے تھے۔ کسی کسی کھڑکی میں سے کوئی مسافر باہر جھانک رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار اور آہستہ ہوگئی۔ آخر پہیوں کے چرچرانے کی آواز کے ساتھ ٹرین رک گئی۔ ٹرین کا آخری ڈبہ میرے قریب سے گزر گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں بھی مغرب کی طرف جا رہا ہوں اور ٹرین کا رخ بھی مغرب کی طرف ہے۔ کیوں نہ ٹرین پر چڑھ جاؤں، آگے کوئی نہ کوئی بڑا شہر ضرور آئے گا۔ وہاں کم از کم یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ میں بھوپال شہر سے کتنی دور ہوں۔ وہاں سے میں کسی دوسری ٹرین پر چڑھ کر بھوپال کی طرف نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ یہ اچھا خیال تھا۔

میں تیز تیز رینگتا ہوا ریل کی پٹڑی پر آگیا۔

گاڑی کے آخری ڈبے کی سرخ روشنی مجھ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ ٹرین کسی بھی وقت چل سکتی تھی۔ چلتی ٹرین پر میں سانپ ہونے کی صورت میں نہیں چڑھ سکتا تھا۔ میں آخری ڈبے کے پہیے پر سے رینگتا ہوا ڈبے کی عقبی دیوار سے ہو کر چھت پر آگیا۔ اتنے میں ایک دھچکے کے ساتھ ٹرین چل پڑی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ٹرین صرف میرے لیے وہاں رکی تھی۔ ٹرین کی چھت پر میں بڑے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ دونوں جانب دور تک دریا کا پاٹ پھیلا ہوا تھا۔ ٹرین اسی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ اس طرح وہ پل پر سے گزر گئی۔ پل پر سے گزرنے کے بعد ٹرین نے آہستہ آہستہ رفتار پکڑنی شروع کر دی اور پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ یہ پہاڑی علاقہ نہیں تھا۔ دونوں طرف کھیت اور میدان تھے کہیں کہیں دور ناریل اور تاڑ کے درخت تھے جنہیں میری سانپ کی آنکھیں واضح طور پر پہچان سکتی تھیں۔ ٹرین ایک چھوٹے سٹیشن کو چھوڑتی ہوئی گزر گئی۔ اسی طرح اس نے کئی سٹیشن چھوڑے۔ کافی دیر بعد کوئی شہر آگیا۔ یہ زیادہ بڑا شہر نہیں لگتا تھا۔ میں سٹیشن پر اس شہر کا نام پڑھنا چاہتا تھا۔ ٹرین سٹیشن پر جا کر رک گئی۔ میں چھت پر بیٹھا تھا۔ میں نے سر ذرا

نیچے کر کے پلیٹ فارم پر سٹیشن کا نام پڑھنے کی کوشش کی مگر وہاں کسی جگہ سٹیشن کا نام لکھا ہوا نہیں تھا۔ کچھ مسافر اتر گئے۔ کچھ مسافر سوار ہوئے۔ ٹرین چند منٹ کے بعد وہاں سے چل پڑی۔ میں کسی بڑے شہر کے انتظار میں تھا۔ ٹرین نے ایک بار پھر سپیڈ پکڑ لی۔ اس دفعہ گاڑی کافی دیر تک بغیر کسی جگہ رکے چلتی رہی۔ راستے میں ایک دریا بھی آیا' کھیت بھی آئے' جنگل بھی آیا۔ زمین کسی جگہ اونچی نیچی بھی ہوئی۔ پھر میدان شروع ہو گئے۔ آخر دور سے روشنیاں نظر آنے لگیں۔ یہ کوئی بڑا شہر تھا۔ کافی دیر تک ٹرین ان روشنیوں کے درمیان سے گزرتی چلی گئی۔ پھر ایک دریا کا پل آ گیا۔ ٹرین پل عبور کر گئی۔ یہ واقعی کوئی بہت بڑا شہر تھا۔ دریا کی دونوں جانب اس طرح روشنیاں ہو رہی تھیں جیسے وہاں کوئی تہوار منایا جا رہا ہو۔ مجھے ڈبے کے اندر سے مسافروں کے نعروں کی آواز آئی۔

"جے گنگا میا! جے گنگا میا۔"

میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ ہندوؤں کا مقدس دریا گنگا تھا۔ ٹرین ایک با رونق اور روشن روشن پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔ جس طرف پلیٹ فارم تھا میں اس طرف جھانک رہا تھا۔ میں پلیٹ فارم کے شروع میں لگے بورڈ پر سٹیشن کا نام پڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے نام پڑھ لیا۔ یہ بنارس کا شہر تھا۔ مجھے اطمینان ہوا کہ میں بنارس پہنچ گیا ہوں۔ یہاں سے مجھے بھوپال جانے والی گاڑی مل سکتی تھی۔ ٹرین کے رکتے ہی میں لوگوں کی نظریں بچا کر ڈبے میں سے دوسری جانب اتر گیا۔ یہاں کافی روشنی تھی' مجھے دیکھا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف بھی ایک پلیٹ فارم تھا۔ درمیان میں ریل کی پٹڑی تھی۔ میں ریل کی پٹڑی کی اوٹ میں ہو کر رینگ رہا تھا۔ اچانک اس پلیٹ فارم پر بھی ایک گاڑی آ گئی۔ میں جلدی سے پٹڑی کو چھوڑ کر پلیٹ فارم کی دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ جب ٹرین گزر گئی تو میں نے دیوار پر چڑھ کر سر باہر نکال کر پلیٹ فارم پر نگاہ ڈالی۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کا رش وغیرہ نہیں تھا۔ پھر بھی ادھر ادھر کچھ لوگ اپنے سامان کے پاس بیٹھے تھے۔ پلیٹ فارم پر روشنی تھی۔ میں ریلوے سٹیشن کے احاطے

کے اندر ہی رہنا چاہتا تھا اور کسی طریقے سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہاں سے بھوپال والی گاڑی کب اور کس پلیٹ فارم پر سے جائے گی۔

اتنا مجھے اندازہ تھا کہ بنارس سے بھوپال کافی دور ہے۔ بنارس کا سٹیشن بھوپال جانے والی مین لائن پر نہیں تھا۔ یہ دلی کلکتہ روٹ تھا' ہو سکتا تھا کہ مجھے راستے میں گاڑی تبدیل بھی کرنی پڑتی جو میرے لیے مزید مشکلات کا باعث تھا لیکن میں وہاں ٹھہر بھی نہیں سکتا تھا۔ میری پرابلم یہ تھی کہ میں کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اول تو میری انسانی آواز بند ہو چکی تھی اور اگر میں بول بھی سکتا تو ایک سانپ کو انسان کی آواز میں بولتے دیکھ کر لوگ ڈر کر بھاگ جاتے یا مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کرتے۔ میں ہر طرح سے مجبور تھا۔ یہاں بھی میں نے بولنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ میری انسانی آواز لگتا تھا بالکل ختم ہو گئی ہے اور شاید اب میں انسانی شکل میں آنے کے بعد بھی نہ بول سکوں گا۔

میں پلیٹ فارم کی دیوار کے ساتھ اندر کی جانب رینگتا ہوا آگے نکل گیا۔ جہاں پلیٹ فارم ختم ہوتا تھا وہاں سے اوپر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ یہاں بھی کھمبوں پر طاقتور بلب لگے تھے جن کی روشنی میں چیونٹی تک نظر آ سکتی تھی۔ میں تو سانپ تھا۔ میں تیزی سے پلیٹ فارم پار کر کے دوسری طرف ریلوے لائن سے گزرتا ہوا سامنے والی ایک منزلہ عمارت کے احاطے میں پہنچ گیا۔ یہاں بھی روشنی تھی مگر آدمی کوئی نہیں تھا۔ صحن میں ایک طرف سامان تولنے والا کنڈا لگا ہوا تھا۔ شاید یہ ریلوے کا کوئی آفس تھا جو رات ہونے کی وجہ سے بند تھا۔ میں آفس کے برآمدے کے ستون کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے کیسے معلوم کرنا چاہیے کہ بھوپال والی گاڑی کس پلیٹ فارم سے کس وقت روانہ ہوتی ہے۔ یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ کسی سے پوچھے بغیر مجھے پتہ نہیں چل سکتا تھا اور میں بول نہیں سکتا تھا۔

دفتر بند تھا اس کے برآمدے میں بلب جل رہا تھا۔ خدا جانے کہاں سے ایک چوکیدار آ گیا۔ اس نے کہیں مجھے دیکھ لیا۔ فوراً" سانپ سانپ کا شور مچا کر مجھ پر لٹھ

لے کر حملہ کر دیا۔ اس کی آواز سن کر دو تین اور آدمی کسی طرف سے نکل آئے۔ میں تیزی سے ایک طرف دوڑ پڑا۔ دوڑنا کیا تھا بس رینگ ہی سکتا تھا۔ وہ لوگ میرے پیچھے پڑ گئے۔ میں کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل کر ایک تنگ راستے میں سے ہوتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ لوگ شور مچاتے زمین پر لٹھ مارتے میرا تعاقب کر رہے تھے۔ میں گھبرا گیا۔ گھبرانا قدرتی بات تھی۔ اگر وہ مجھے مار ڈالتے تو میرا کیا حشر ہوتا؟ مجھے معلوم نہیں تھا جوگن مایا دیوی نے مجھے اتنا بتا دیا تھا کہ اگر کبھی میں زخمی ہو جاؤں یا میرے جسم کے دو ٹکڑے ہو جائیں تو میرے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہوگی کہ کوئی مجھے مٹی کے کوزے میں بند کر کے بھارت کے مشہور مذہبی شہر متھرا لے جائے۔ وہاں پرانے راجاؤں کا ایک مرگھٹ ہے۔ اس مرگھٹ میں ہندو لوگ اپنے مردے جلاتے ہیں۔ مجھے وہاں تازہ جلے ہوئے مردے کی ٹھنڈی راکھ میں تین دن تک دبائے رکھے۔ تین دن کے بعد میرا جسم اپنے آپ جڑ جائے گا اور میں پھر سے زندہ ہو جاؤں گا۔ یہ بات میں نے احتیاط کے طور پر کمانڈو منظر خالد اور جمیلہ کو بھی بتا دی تھی۔ لیکن یہاں بنارس میں نہ کمانڈو خالد میرے پاس تھا' نہ جمیلہ ہی میرے پاس تھی۔ اگر یہاں میں ہلاک کر دیا جاتا ہوں تو پھر شاید قیامت تک زندہ حالت میں واپس نہیں آ سکتا تھا۔

اس وجہ سے مجھے اپنی جان کے لالے پڑے تھے اور جس طرف منہ اٹھا اسی طرف بھاگ رہا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ میں جہاں سے گزر رہا تھا وہاں روشنی تھی۔ میں اپنے پیچھے آنے والوں کو صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ لوگ میرے سر پر پہنچ گئے کیونکہ میری رفتار آدمی کے دوڑنے کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ ایک لٹھ بالکل میرے قریب پڑا۔ میں نے فوراً" پھن اٹھا کر اتنی زور سے پھنکار ماری کہ چوکیدار اور اس کے ساتھی ڈر کر پیچھے کو بھاگے۔ مجھے موقع مل گیا۔ سامنے ایک تنگ سا راستہ تھا۔ میں اس میں سے ہو کر دوسری طرف نکل گیا۔ میرا خیال تھا کہ آگے کوئی ویران جگہ ہوگی جہاں میں اندھیرے میں چھپ جاؤں گا۔ مگر وہ شہر تھا اور شہر بھی بنارس تھا اور ریلوے سٹیشن کا علاقہ تھا۔ میں ایک بازار میں نکل آیا۔ جہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ سڑک

پر سے رات کے وقت بھی گاڑیاں اور موٹر رکشے گزر رہے تھے۔ اب میرے پیچھے لگے ہوئے آدمیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ مجھے ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

مجھے ایک ٹرک نظر آگیا جو ایک جگہ کھڑا تھا۔ اس کا انجن چل رہا تھا۔ میں ٹرک پر چڑھ کر اس کے پچھلے حصے میں ترپال کے ڈھیر میں چھپ گیا۔ کسی نے مجھے ٹرک پر چڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ لوگ سانپ سانپ کا شور مچاتے ٹرک کے قریب سے گزر گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں کچھ دیر تک ٹرک میں ہی چھپا رہنا چاہتا تھا۔ اتنے میں ٹرک چل پڑا۔ میں نے سوچا کہ آگے جا کر ٹرک پر سے چھلانگ لگا دوں گا۔ پھر سوچا کہ ٹرک خالی ہے اس پر سامان وغیرہ نہیں لدا ہوا۔ یہ شہر میں ہی کسی جگہ جا رہا ہوگا۔ میں بھی وہاں تک اس کے ساتھ جاتا ہوں۔ جان بچانی بھوپال جانے سے زیادہ ضروری تھی۔ ٹرک شہر سے باہر نکل کر دریا کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ میں ترپالوں کے نیچے سے نکل آیا تھا۔ دریا کی سامنے کی جانب شہر کے مکانوں اور گھاٹ کی روشنیاں دریا کے پانی میں منعکس ہو رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ نہ جانے یہ ٹرک کسی دوسرے شہر نہ جا رہا ہو۔ مجھے نیچے چھلانگ لگا دینی چاہیے لیکن ٹرک کی رفتار تیز تھی۔ اگر میں اصلیت میں سانپ ہوتا تو شاید باہر چھلانگ لگا دیتا مگر میں حقیقت میں انسان تھا اور چھلانگ لگاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ یہ خیال بھی تھا کہ زخمی بھی ہوگیا تو یہاں مجھے اٹھا کر متھرا کے مرگھٹ تک لے جانے والا کوئی نہیں ملے گا۔ میں ٹرک میں ہی بیٹھا رہا۔

ٹرک شہر سے کچھ زیادہ باہر آکر دریا کے کنارے کی طرف گھوم گیا۔ اب وہ دریا کی ریت پر چل رہا تھا۔ ایک جگہ آکر وہ رک گیا۔ میں جلدی سے ٹرک سے نیچے اتر گیا۔ ٹرک شاید وہاں ریت لینے آیا تھا۔ کیونکہ وہاں پہلے سے کچھ آدمی کھڑے تھے۔ میں ریت پر پیچھے بنارس شہر کی طرف روانہ ہوا۔ دریائے گنگا جو ہندوؤں کا مقدس دریا ہے بنارس شہر کے درمیان سے گزرتا ہے۔ اس کے دونوں کنارے پر گھاٹ بنے ہوئے ہیں۔ یہ بڑے بڑے گول' کٹاؤ دار اور چوکور چبوتروں کی شکل میں ہوتے ہیں جن کے عقب میں دریا تک سیڑھیاں اترتی ہیں۔ ان چبوتروں پر سادھو لوگ آسن

جمائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہندو عورتیں اور مرد صبح صبح وہاں آ کر اشنان کرتے ہیں۔ ان سادھوؤں کو آ کر ماتھا ٹیکتے ہیں۔ سادھو ان کے ماتھوں پر تلک لگاتے ہیں۔ انہیں پرشاد دیتے ہیں اور ان سے دکھشنا کے طور پر رقم وصول کرتے ہیں۔ یہ قدیم زمانے سے ان سادھو لوگوں کا کاروبار چلا آ رہا ہے۔ گرمیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ دن کا اجالا ہولے ہولے پھیلنے لگا تھا۔ گھاٹوں پر سادھو لوگ اپنی اپنی دکانیں سجا رہے تھے اور اشنان کرنے کے بعد اشلوک پڑھتے ہوئے چبوترے پر گنگا کا پانی چھڑک رہے تھے۔ میں ان سے دور ہو کر آگے نکلتا چلا گیا۔

ایک جگہ درختوں کے درمیان کٹیا تھی۔ سورج طلوع ہو گیا تھا اور اس کی روشنی دریا کو روشن کر رہی تھی۔ ہر طرف دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔ میں کٹیا کے قریب سے گزرا تو کٹیا کے اندر سے میں نے ایک صحت مند جسم والی دراز قد عورت کو ہاتھ میں پیتل کی تھالی لیے باہر نکلتے دیکھا۔ اس نے اپنے جسم کے گرد سفید ساڑھی لپیٹ رکھی تھی مگر اس کا جسم جگہ جگہ سے نمایاں ہو رہا تھا۔ پیتل کی تھالی میں گیندے کے کیسری پھول رکھے تھے۔ مجھے اس عورت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو کسی طرح بنارس کے ریلوے سٹیشن پر پہنچنا چاہتا تھا تاکہ وہاں سے بھوپال جانے کا کوئی بندوبست کر سکوں۔ وہاں اور کوئی انسان نہیں تھا۔ دریا پر کچھ عورتیں مرد اشنان کر رہے تھے۔ دور مندروں میں سے پوجا پاٹھ کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ میں اس عورت کے قریب آنے سے پہلے اس کی کٹیا کے آگے سے نکل جاؤں گا لیکن اندازہ غلط پڑ گیا۔ جس وقت میں کٹیا کے سامنے سے گزرنے لگا تو اس عورت کی مجھ پر نگاہ پڑ گئی۔ میں نے اسے اپنی طرف دیکھتے دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ عورت مجھے دیکھ کر چیخ مار کر بھاگ جائے گی لیکن اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ جیسے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اس نے پیتل کی تھالی ریت پر رکھ دی اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"دیوتا ناگ منی کی جے ہو۔ میرا اگلا جنم سپھل ہو گیا کہ دیوتا ناگ منی کے درشن ہو گئے۔ ہے مہاراج! مجھ ابھاگن کو درشن دیے ہیں تو میرے ساتھ گنگا میا کا اشنان

کر کے مجھے آواگون سے مکتی دلا دیجئے۔ میں ناگ دیوتا کی پجارن ہوں اور آپ کی داسی ہوں۔"

میں آگے نکلنے لگا تھا کہ خیال آگیا اس عورت سے کام لیا جاسکتا ہے۔ یہ میری عقیدت مند ہے۔ اس کی مدد سے میں بھوپال جانے والی گاڑی میں سوار ہو سکتا ہوں۔ ہندو عورتوں کی ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی سے میں اچھی طرح واقف ہوچکا تھا۔ میں وہیں رک گیا اور اس عورت پر مزید اثر ڈالنے کے لیے میں نے گردن اٹھائی' پھن پھیلایا اور ہلکی سی پھنکار بار کر اپنے پھن کو دائیں بائیں جھلانے لگا۔ میری اس حرکت سے وہ عورت خوشی سے نہال ہوگئی۔

کہنے لگی۔

"میں کتنی سوبھاگیہ وتی ہوں کہ ناگ منی دیوتا نے میری التجا قبول کر لی ہے۔ ہے مہاراج! ہے ناگوں کے دیوتا ناگ منی! میں جنم جنم سے آپ کی کھوج میں تھی۔ میرے ساتھ گنگا میا کے چرنوں میں چل کر اشنان کیجئے تاکہ میرے جنم جنم کے پاپ جھڑ جائیں اور مجھے آواگون سے مکتی مل جائے۔"

میں نے اپنا پھن پھیلا لیا اور آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے اس عورت کے قریب آ گیا۔ اس عورت نے ذرا سے بھی ڈر خوف کے بغیر مجھے اٹھا کر اپنی ساڑھی کے اندر چھپا لیا اور کہا۔

"میرے مہاراج ناگ منی جی! میں نہیں چاہتی کہ کسی دوسرے کو پتہ چلے کہ مجھے ناگ منی جی نے درشن دیے ہیں۔"

اس نے پیتل کی تھالی اٹھائی اور دریا کی طرف چل پڑی۔ دریا بالکل سامنے تھا۔ میں اس کی ساڑھی میں سے سر باہر نکالے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس عورت کو کس طریقے سے بتایا جائے کہ میں بھوپال جانا چاہتا ہوں۔ کاش میں انسان کی زبان میں اس سے بات کر سکتا ہوا اس وقت مجھے شدید محرومی کا احساس ہوا۔ دریا پر سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو نیچے پانی تک جاتی تھیں۔ دریا کی لہریں آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے ٹکرا

رہی تھیں۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ اس عورت نے مجھے ساڑھی کے اندر سے نکال کر اپنے پاس سیڑھی کے پتھر پر بٹھا دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"مہاراج ناگ منی! آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے کہ میں بدری پور کی بیوہ سوشیلا دیوی ہوں اور اپنی ساس کے ظلم سے تنگ آ کر گنگا میا کے پاس آ کر اپنی کٹیا میں بیٹھ گئی ہوں اور دن رات مہا ناگ دیوتا کی پوجا کرتی ہوں۔ میرے دھن بھاگ کہ آپ نے مجھے درشن دے کر میرا جیون سپھل کر دیا۔ اب میری ایک ہی خواہش ہے کہ آپ کچھ روز میرے ساتھ میری کٹیا میں بسر کریں۔ میں آپ کی ہر طرح سے سیوا کروں گی۔ میرے لیے یہ سنسار سورگ بن جائے گا۔"

وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے سر کو اثبات کے انداز میں ہلایا جیسے اسے کہہ رہا ہوں کہ میں ضرور تمہارے پاس رہوں گا۔ سوشیلا دیوی خوشی سے نہال ہوگئی۔ اس نے مجھے اٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیا اور جھوم جھوم کر کوئی اشلوک پڑھنے لگی۔ پھر اس نے مجھے دریا کی آخری سیڑھی پر بٹھا دیا اور کہا۔

"مہاراج! میں اشنان کرنے لگی ہوں۔ میرے سریر (جسم) پر سے اپنی نظریں نہ ہٹائیں۔ میرے سریر پر جہاں جہاں آپ کی نظر پڑے گی وہاں وہاں سے میرے پاپ جھڑ جائیں گے۔ اوم اوم! پربھو مہا ناگ اوم!"

وہ دریا کی آخری سیڑھی پر اس طرح بیٹھ گئی کہ دریا کی لہریں اس کی پنڈلیوں کو چھو رہی تھیں۔ اس نے اشلوک پڑھتے ہوئے مجھ پر دریا کا پانی چلو میں بھر کر ڈالا اور پھر اپنی سفید ساڑھی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ اس عورت کی عمر تیس سال کے قریب ہوگی۔ جسم گورا اور صحت مند تھا۔ یہ واہیات خیال ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا اور میں نے اسے اپنے ذہن سے نکال دیا۔ وہ دریا کے پانی کو دونوں ہاتھوں سے اپنے جسم پر ڈالنے لگی۔ وہ اشلوک بھی پڑھتی جا رہی تھی اور بار بار ہر زاویئے سے مجھے اپنا جسم بھی دکھا رہی تھی تاکہ میری نگاہ اس کے بدن کے ہر حصے پر پڑے اور اس کے عقیدے کے مطابق اس کے پاپ جھڑتے جائیں۔ مجھ پر اس عورت کے جسم کے

زاویوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ایک تو میں انسانی جسم میں نہیں تھا' سانپ کے روپ میں تھا۔ دوسرے میرا ذہن صرف ایک ہی مسئلے پر غور و فکر کر رہا تھا بلکہ الجھا ہوا تھا کہ اس عورت کی مدد سے میں بھوپال کیسے پہنچ سکتا ہوں۔ اگر میں بول سکتا تو یہ کام اتنا مشکل نہیں تھا۔ میں بڑے آرام سے اسے کہتا کہ مجھے لے کر بھوپال کے فلاں مندر میں چلو وہ بڑی خوشی اور عقیدت کے ساتھ مجھے لے کر بھوپال روانہ ہو جاتی لیکن میں اسے انسان کی زبان سے کچھ نہیں بتا سکتا تھا' لکھ کر بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ میں اسی سوچ میں گم تھا اور وہ میرے سامنے طلوع ہوتے سورج کی سنہری روشنی میں دریا کی سیڑھیوں پر بیٹھی نہا رہی تھی۔

نہانے کے بعد اس نے کھڑی ہو کر اپنے بالوں کو نچوڑ کر جھاڑا' کنگھی کی اور ساڑھی جسم کے گرد لپیٹ کر مجھے گودی میں اٹھا لیا اور کہا۔

''مہاراج کی کرپا سے میرے جسم کے سارے پاپ جھڑ گئے ہیں۔ اب میرا جیون سپھل ہو گیا ہے۔ میرے ساتھ کٹیا میں چل کر دودھ پئیں۔ آپ کو اپنے ہاتھوں سے دودھ پلاؤں گی۔''

میرا خیال تھا کٹیا میں اس نے کسی برتن میں دودھ رکھا ہو گا لیکن وہاں آ کر وہ مجھے اپنا دودھ پلانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں ہر بار منہ دوسری طرف کر لیتا۔ میں اس قسم کی حرکتوں سے سخت بیزار ہو چکا تھا۔ میری سوچ انسانی تھی۔ انسان جب کسی مسئلے میں الجھا ہوا ہو تو اسے اس قسم کی حرکتیں اچھی نہیں لگتیں۔ جب میں نے دودھ نہ پیا تو اس نے مجھے بوریئے پر بٹھا دیا اور ہاتھ باندھ کر کہا۔

''جو میرے مہاراج کی مرضی وہی میری مرضی۔ میں آپ کو بازار سے لا کر دودھ پلاؤں گی۔''

پھر اس نے میرے آگے گیندے کے پھول رکھے۔ لوبان سلگایا اور اشلوک پڑھتے ہوئے میری پوجا شروع کر دی۔ لوبان کی تیز بو نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ میں اٹھ کر باہر کی طرف جانے لگا تو اس نے مجھے بڑی محبت سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ لگا کر

بولی۔

"مہاراج! باہر کیوں جا رہے ہو؟ اگر لوبان کا دھواں پسند نہیں تو میں اسے بجھا دیتی ہوں۔"

اور اس نے لوبان بجھا دیا۔ سارا دن میں نے اس عورت کی کٹیا میں گزار دیا۔ اس دوران کئی بار خیال آیا کہ باہر نکل کر بنارس ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑوں۔ پھر یہ سوچ کر وہیں بیٹھا رہا کہ دن کا وقت ہے۔ میں ہر ایک کو نظر آجاؤں گا اور لوگ مجھے مارنے کو دوڑیں گے۔ سٹیشن ویسے بھی وہاں سے کافی دور تھا۔ یہی طے کیا کہ رات جب کافی گزر جائے گی اور لوگ سڑکوں پر نہیں ہوں گے تو سٹیشن پر پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ شاید بھوپال کی طرف جانے والی کوئی گاڑی مل جائے۔

یہ بیوہ عورت جس نے اپنا نام سوشیلا دیوی بتایا تھا سارا دن اپنی کٹیا میں بیٹھی پوجا پاٹھ کرتی رہی۔ بھوجن بھی اس نے وہیں کیا۔ مجھے بازار سے دودھ بھی لاکر پلایا۔ شام کو وہ مجھے ساتھ لے کر دریا کنارے دوبارہ اشنان کرنے گئی۔ رات ہوئی تو اس نے کٹیا میں دیا جلایا اور کونے میں سانپ کی جو مورتی رکھی تھی اس کے آگے پھول رکھ کر مجھے اپنے سامنے بٹھایا اور اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ رات ذرا گہری ہو تو میں کٹیا سے نکل کر دریا کے کنارے کنارے چلتا بنارس ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑوں۔ میں اس عورت کو پجارن کہوں گا۔ پجارن کافی رات پڑے تک پوجا پاٹھ کرتی رہی۔ پھر مجھے بچے کی طرف اپنے ساتھ لگا کر وہیں بوریئے پر لیٹ گئی۔ باہر سے دریا کی طرف سے کبھی کبھی شہر کی جانب سے کسی موٹر یا ٹرک کے ہارن کی آواز آجاتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ رات ذرا اور گہری ہو جائے تو وہاں سے نکلوں۔ اس کے کچھ دیر بعد باہر گہری خاموشی چھا گئی۔ پجارن گہری نیند سو رہی تھی۔ میں آہستہ سے اس کے پہلو سے نکل کر کٹیا کے دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر مجھے دو آدمیوں کے سرگوشیوں میں باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں وہیں رک گیا۔ باہر دو آدمی ایک دوسرے کو کچھ کہہ رہے تھے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ باہر اندھیرا تھا۔ کٹیا میں

دیے کی ہلکی روشنی تھی۔ میں کٹیا کے دروازے پر جو بوریا پڑا تھا اس کے نیچے سے ہو کر باہر آ گیا۔

اندھیرے میں میں نے دو آدمیوں کو دیکھا ایک داہنی جانب سے اور ایک بائیں جانب سے دبے پاؤں کٹیا کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس نیت سے وہاں آئے ہیں۔ پجارن نے میری بڑی خدمت کی تھی۔ میں اس پر یہ ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ دونوں آدمی چوری کی نیت سے وہاں نہیں آئے تھے کیونکہ پجارن کی کٹیا میں چرانے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اس کی عزت پر حملہ کرنے آ رہے تھے۔ یہ پجارن بیوہ تھی اور اپنی ساس کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر یہاں اپنے طریقے اور اپنے عقیدے کے مطابق پوجا پاٹھ کر کے زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں تیزی سے واپس پلٹ کر کٹیا کے اندر چلا گیا اور جہاں سانپ کی مورتی رکھی تھی اس کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ دونوں آدمی جو شکل صورت سے ہی بدمعاش لگ رہے تھے' بوریا اٹھا کر کٹیا میں داخل ہو گئے۔ ایک نے جیب سے خنجر نکال لیا اور دوسرے کو اشارہ کیا۔ دوسرے بدمعاش نے جھک کر پجارن کو غور سے دیکھا پھر آہستہ سے اس کے ساتھ لیٹ گیا۔

پجارن اس طرح ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی جیسے اُسے کسی سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ اپنی کٹیا میں دو بدمعاشوں کو دیکھ کر اس نے شور مچانے کے لیے منہ کھولا تو دوسرے آدمی نے اس کی گردن پر خنجر رکھ دیا اور کہا۔

"آواز نکالی تو گردن کاٹ دوں گا۔"

دوسرے بدمعاش نے پجارن پر دست درازی شروع کر دی۔ میں اسی انتظار میں تھا کہ پہلے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ کس نیت سے اندر آئے ہیں۔ مجھے یہ خیال آیا تھا کہ شاید یہ سانپ کی وہ مورتی چرانے آئے ہوں جو کٹیا کے اندر رکھی ہوئی تھی۔ بھارت کے مندروں سے پرانی مورتیاں چرانے کی وارداتیں ہوتی ہی رہتی تھیں۔ جب دوسرے بدمعاش نے پجارن سے دست درازی شروع کی تو میں سانپ کی مورتی کے

پیچھے سے رینگ کر اس بدمعاش کے عقب میں آگیا جس نے خنجر پجارن کی گردن پر رکھا ہوا تھا۔ اس بدمعاش نے دھوتی دہری کر کے اوپر کی ہوئی تھی اور اس کی پنڈلیاں ننگی تھیں۔ میرے لیے اس سے آسان ٹارگٹ اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے لپک کر اس کی پنڈلی پر ڈس دیا۔ بدمعاش کے منہ سے عجیب سی آواز نکلتے نکلتے ادھوری رہ گئی اور وہ ایک طرف کو کٹے ہوئے درخت کی طرح گر پڑا۔ میرے زہر کا فوری اثر یہی ہوتا تھا کہ آدمی کی سب سے پہلے آواز بند ہو جاتی تھی۔ اس بدمعاش کی بڑی ہمت تھی کہ میرے ڈسنے کے بعد بھی اس کے حلق سے ادھوری آواز نکل آئی تھی۔

اپنے ساتھی کو گرتے دیکھ کر دوسرے بدمعاش نے گھبرا کر پجارن کو چھوڑ دیا اور باہر کی طرف بھاگا۔ لیکن میں اسے کیسے بھاگنے کی اجازت دے سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ باہر کو دوڑا میں اچھل کر اس کے کندھے پر آیا اور اس کی گردن پر ڈسنے کے بعد فوراً اس کے جسم سے الگ ہو گیا۔ دوسرا بدمعاش بھی منہ کے بل گر پڑا۔ پجارن نے دیے کی روشنی میں دونوں بدمعاشوں کو گرتے دیکھا تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں دونوں لاشوں کے درمیان پھن کھولے بیٹھا تھا۔ وہ روتے ہوئے میرے آگے سجدے میں گر پڑی۔

"مہاراج! آپ نے میری عزت بچا لی۔ مہاراج آپ نے مجھ ابھاگن کی عزت بچا لی۔"

وہ روئے جا رہی تھی۔ میں اسے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ میرے آگے سجدے میں پڑی روتی رہی اور میں خاموش اپنی جگہ پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر روتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب سے یہ دنیا بنی ہے عورتوں پر مردوں نے بڑے ظلم کیے ہیں۔ بلکہ سب سے زیادہ ظلم عورتوں پر ہی ہوئے ہیں۔

پھر میں خاموشی سے دروازے کی طرف رینگنے لگا۔ اس نے بے اختیار ہو کر مجھے دونوں ہاتھوں سے اٹھا لیا۔ شاید وہ میرا ارادہ بھانپ گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔ میں بھی اب یہاں نہیں رہوں گی۔ میں لکشمن پور کے ناگ مندر میں چلی جاؤں گی۔ باقی سارا جیون وہیں بسر کروں گی۔ آپ بھی میرے ساتھ جائیں۔ آپ کے بغیر میری پوجا ادھوری ہوگی۔"

لکشمن پور کا سن کر میں چونکا۔ لکشمن پور میں ناگن درگا رہتی تھی جو میری محسن تھی اور جو میری قوت گویائی کے ختم ہو جانے کا علاج کر سکتی تھی۔ میں ناگن درگا کے بارے میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ ناگن درگا لکشمن پور کے ایک برہمن کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ مر چکا تھا۔ گاؤں میں ایک مندر تھا جس کے پجاری نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔ ایک روز وہ مندر پوجا کرنے آئی تو پجاری نے اس کے ساتھ دست درازی کی۔ درگا نے اس کو تھپڑ دے مارا۔ پجاری نے کہا۔

"میں تم سے اس بے عزتی کا بدلہ لوں گا' درگا۔"

پجاری کے پاس منتروں کی طاقت تھی۔ اس نے برفی کی ایک ڈلی پر منتر پڑھ کر کسی طریقے سے درگا کو کھلا دی۔ برفی کھانے کے پندرہ دن بعد درگا عورت سے ناگن بن گئی۔ ناگن بننے کے بعد سب سے پہلے اس نے پجاری کو ڈس کر ہلاک کر دیا۔ اب اس کی دنیا تاریک ہو گئی تھی۔ عورت کے روپ میں واپس آنے کے لیے وہ تپسیا کر رہی تھی۔ جب وہ مجھے وسطی ہندوستان کے ایک جنگل میں ملی تو اس کو ناگن بنے پانچ برس گزر چکے تھے۔ اس نے مجھے کہا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ پانچ برس کے بعد جب میں لکشمن پور کے قریب للت پور کے وشوامترجی کے مندر میں بیٹھ کر ایک ماہ تپسیا کروں گی تو دوبارہ اپنی عورت کی شکل میں واپس آ جاؤں گی۔ تم کبھی لکشمن پور آؤ تو للت پور وشوامترجی کے مندر میں مجھ سے ضرور ملنا۔ میں وہیں تمہیں ملوں گی۔"

مجھے یقین تھا کہ لکشمن پور کی ناگن درگا ہی میری اس بیماری کا علاج کر سکے گی۔ وہ خود ناگن بننے کے عذاب سے گزر چکی ہے اور اب تک ضرور عورت کے روپ میں واپس آ چکی ہوگی۔ اس نے مجھے سانپ کے روپ میں ہی دیکھا ہوا تھا اور وہ مجھے

ضرور پہچان لے گی۔ پہچان نہ سکی تو میری بو اسے ضرور بتا دے گی کہ میں وہی کرم داد ہوں جو کبھی اسے جنگل کے ایک مندر میں ملا تھا۔

میں پجارن سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ لکشمن پور وہی ہے جس کے بارے میں ناگن درگا نے مجھے بتایا تھا یا کوئی اور ہے۔ مگر میں اس سے پوچھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن میں نے اب پجارن کے ساتھ ہی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس طرح سے کم از کم میں بنارس سے تو نکل جاؤں گا۔ پجارن اس لیے وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی کہ اس کی کٹیا میں دو آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ صبح ہوتے ہی سب کو معلوم ہو جائے گا اور پولیس اسے پکڑ کر لے جائے گی۔ پجارن نے مجھے اپنی ساڑھی کے اندر چھپایا۔ ایک گٹھڑی میں اپنے پرانے کپڑے ڈالے۔ گٹھڑی بغل میں دبائی اور کٹیا سے نکل کر دریا کے بہاؤ کی سمت رات کے اندھیرے میں تیز تیز چل پڑی۔ وہ کچھ دور تک دریا کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ پھر ایک جگہ دریا سے الگ ہو کر درختوں کے درمیان سے گزرتی ایک سڑک پر آ گئی۔ آگے کوئی بستی تھی۔ بستی کی روشنیاں دور ہی سے نظر آ رہی تھیں۔ پجارن وہاں سے بھی ایک طرف ہو گئی اور بستی سے دور ہٹ کر آگے نکل گئی۔

بستی سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا ریلوے سٹیشن تھا۔ یہ بنارس سے دلی کی جانب جاتے ہوئے پہلا سٹیشن تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پجارن بنارس کے ریلوے سٹیشن سے گاڑی میں سوار ہونا نہیں چاہتی۔ اس نے سٹیشن پر آ کر کسی جگہ کا ٹکٹ لیا اور پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے جس جگہ کا ٹکٹ خریدا تھا اس کا نام میں اچھی طرح سے نہ سن سکا۔ آدھے گھنٹے بعد بنارس کی طرف سے ایک ٹرین آ گئی۔ پجارن گٹھڑی بغل میں دبائے ٹرین میں سوار ہو گئی۔ ٹرین چل پڑی۔ وہ عورتوں کے ڈبے میں بیٹھی تھی جو عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اکثر عورتیں بے سدھ ہو کر سو رہی تھیں۔ پجارن نے سر نیچے کر کے مجھے آہستہ سے کہا۔

"مہاراج! ہم بہت جلد لکشمن پور پہنچ جائیں گے۔"

ٹرین باقی ساری رات چلتی رہی اور سٹیشنوں پر کھڑی بھی ہوتی رہی۔ ابھی دن کا اجلا پھیلنے لگا تھا کہ ایک سٹیشن پر پجارن گاڑی سے اتر گئی۔ چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ پجارن نے مجھ سے کہا۔

"مہاراج! ہم لکشمن پور پہنچ گئے ہیں۔ ناگ مندر یہاں سے دور نہیں ہے۔ پیدل جانا ہوگا مجھے۔ اس وقت کوئی سواری ادھر نہیں جاتی۔"

میں اسے کوئی جواب نہ دے سکا اور وہ سٹیشن سے باہر نکل کر صبح کاذب کے دھندلکے میں کھیتوں میں چل پڑی۔





دن نکل آیا تھا جب وہ ایک پرانے مندر کے پاس آ کر رک گئی۔ میں اس کے گریبان کے اندر تھا۔ اس نے کہا۔

"مہاراج! یہ ناگ جی کا پرانا مندر ہے۔ میں ان کی بھگتنی ہوں۔ یہاں میری ایک ماسی ایک کوٹھڑی میں اکیلی رہتی ہے۔ میں اس کے پاس جا رہی ہوں۔ مجھے وہ ایک دوسری کوٹھڑی لے دے گی۔ پھر میں اور آپ اس کوٹھڑی میں اکیلے رہیں گے اور میں آپ کی دن رات سیوا کروں گی۔"

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہاں سے للت پور کہاں ہے جہاں وشوامتر کا مندر تھا اور جہاں ناگن درگا رہتی تھی۔ مگر میری مجبوری یہ تھی کہ میں پجارن سے انسان کی زبان میں کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ یہی ہو سکتا تھا کہ وہاں کے لوگوں کی باتوں سے مجھے اتنا معلوم ہو جائے کہ لکشمن پور کس طرف ہے۔ ناگن درگا کے پاس میں زیادہ دیر نہیں رہا تھا اس لیے مجھے اس کے جسم کی بو کی شناخت نہیں تھی۔ اگر مجھے اس کے جسم کی بو کی شناخت ہوتی تو میں اسے تلاش کر سکتا تھا۔ پجارن مجھے مندر کی ایک کوٹھڑی میں لے آئی۔ یہاں ایک بوڑھی عورت باہر بیٹھی دیگچی میں چائے پکا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر پجارن کے گلے لگ کر ملی۔ دونوں عورتیں رونے لگیں۔ یہ پجارن کی ماسی تھی۔ دونوں باتیں کرنے لگیں۔ پجارن نے اسے بنارس والی کٹیا میں جو حادثہ ہوا تھا اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ یہی کہا کہ میں اب باقی کی عمر ناگ مندر میں ناگ

جی کی پوجا پاٹھ میں بسر کروں گی۔

پجارن کی ماسی نے مندر کے بڑے پجاری سے کہہ کر اسے ایک علیحدہ کوٹھڑی لے دی۔ پجارن نے اپنی کوٹھڑی میں آتے ہی مجھے دیوار کے طاق میں بٹھا دیا اور کہا۔

"مہاراج میں کتنی بھاگیہ وتی ہوں کہ آپ میرے ساتھ یہاں آ گئے ہیں۔ میں آپ کی بڑی سیوا کروں گی۔ مجھے معلوم ہے آپ نے ان دونوں بدمعاشوں کو ڈس کر میری عزت بچا لی تھی۔ میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں اتار سکتی۔ آپ اس رات وہاں نہ ہوتے تو نہ جانے میرا کیا حال ہوتا۔"

وہ کوٹھڑی میں جھاڑو دے رہی تھی۔

اس کوٹھڑی میں مجھے آئے تین دن گزر گئے تھے۔ پجارن صبح شام مجھے ساتھ لے کر ناگ مندر پوجا کرنے جاتی تھی۔ جب تک وہ پوجا کر رہی ہوتی' اس نے مجھے اپنی ساڑھی میں چھپایا ہوتا تھا۔ رات کو مجھے پیالی میں دودھ ڈال کر پلاتی۔ صبح مجھے اشنان کراتی۔ میرے جسم کو کپڑے سے صاف کرتی۔ مجھ سے باتیں کرتی اور پھر مجھے ماتھا ٹیکتی اور میرے آگے ادب سے بیٹھ کر اشلوک پڑھتی۔ تین دن اسی طرح گزر گئے۔ چوتھے دن شام کے وقت پجارن مجھے اپنی ساڑھی میں چھپائے ناگ مندر پوجا کرنے آئی تو وہاں ایک ایک عورت ملی جو لکشمن پور سے آئی تھی۔ اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ مندر کے پاس ہی ایک جگہ سے بیل گاڑیاں لکشمن پور کو جاتی ہیں۔ جو وہاں سے تین چار کوس کے فاصلے پر ہی ہے۔ مجھے یہی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔

رات گزارنے کے بعد دن کا اجالا ابھی پوری طرح سے نہیں پھیلا تھا کہ میں پجارن کی کوٹھڑی سے رینگتا ہوا نکلا اور ناگ مندر کی طرف چل پڑا۔ مجھے یہ علم ہو چکا تھا کہ لکشمن پور کو بیل گاڑیاں صبح صبح بھی چلتی ہیں۔ ناگ مندر کے عقب میں کچھ فاصلے پر ایک لالٹین جل رہی تھی۔ وہاں دو تین بیل گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ رینگتا وہاں پہنچ گیا۔ ایک بیل گاڑی پر عورتیں اور بچے سوار تھے۔ گاڑی بان گدی پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ اس نے آواز لگائی تو معلوم ہوا یہ بیل گاڑی لکشمن

پور ہی جا رہی ہے۔ ابھی رات کا اندھیرا باقی تھا۔ میں اندھیرے میں دوسری طرف سے آ کر بیل گاڑی کے نیچے چھپ کر بیٹھ گیا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا کہ بیل گاڑی لکشمن پور کی طرف چل پڑی۔ دو تین کوس کا فاصلہ کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ بیل گاڑی کی رفتار سست تھی لیکن لکشمن پور پہنچتے زیادہ دیر نہ لگی۔ سورج مشرقی افق پر تھوڑا اوپر ہی آیا تھا کہ بیل گاڑی لکشمن پور پہنچ گئی۔ دن کی روشنی میں مجھے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ناگن درگا نے کہا تھا کہ وہ وشوامتر کے مندر کے قریب ایک جھونپڑی میں رہتی ہے۔ میں نے اونچی جگہ چڑھ کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مجھے اسی طرح وشوامتر کے مندر کو تلاش کرنا تھا۔ میں کسی سے مندر کا پوچھ نہیں سکتا تھا۔ ایک جانب تاڑ کے اونچے اونچے ستونوں ایسے درختوں کے درمیان مجھے ایک چھوٹا سا مندر نظر پڑا۔ یہی وشوامتر کا مندر ہو سکتا تھا۔ وہاں اور کوئی مندر نہیں تھا۔ میں نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ مندر میں پوجا ہو رہی تھی۔ آرتی اتاری جا رہی تھی۔ بھجن کیرتن کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں مندر کے عقب میں آ گیا۔

میری آنکھیں اس کھنڈر کو تلاش کر رہی تھیں جس کے قریب ناگن درگاہ کی جھونپڑی تھی۔ آخر میری نگاہوں نے اسے تلاش کر لیا۔ یہ بانس کے ڈنڈوں کو جوڑ کر بنائی گئی جھونپڑی تھی۔ ڈھلانی چھت ناریل کی شاخیں جوڑ کر بنی ہوئی تھی۔ جھونپڑی کے آگے بوریا لٹک رہا تھا۔ باہر ایک طرف مٹی کے دو گھڑے پڑے تھے۔ میں ناگن درگا کے جسم کی بو سے مانوس نہیں تھا کیونکہ میں اس کے پاس زیادہ دن نہیں رہا تھا۔ اگر زیادہ دن رہا ہوتا تو مجھے اس کے جسم کی بو شناخت ہو جاتی۔ اب مجھے اسے تلاش کرنا تھا۔ جھونپڑی پر خاموشی چھائی تھی۔ ہو سکتا ہے ناگن درگا جھونپڑی میں بیٹھی ہو۔ یہ سوچ کر میں بوریئے کے نیچے سے گزر کر جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ جھونپڑی خالی تھی۔ اندر چارپائی بچھی تھی۔ دو تین مٹی کے برتن ایک پیتل کی گاگر' ایک چوکی پڑی تھی۔ رسی پر گیروے رنگ کی دھوتیاں لٹک رہی تھیں۔ ناگن درگا چونکہ وہاں نہیں

تھی اس لیے میں جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ آسمان روشن تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ مجھے دور سے ایک عورت جھونپڑی کی طرف آتی دکھائی دی۔ میں نے دور ہی سے اسے پہچان لیا یہ ناگن درگا تھی۔

میں جلدی سے ایک طرف ہو کر گھاس میں چھپ گیا۔ ناگن درگا نے مجھے انسانی روپ میں دیکھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے سانپ کے روپ میں نہیں دیکھا تھا۔ یہی خیال آتا کہ وہ مجھے پہچان نہیں سکے گی۔ میں بول کر اسے بتا نہیں سکوں گا۔ میں گھاس میں چھپا رہا اور ناگن درگا میرے قریب سے گزر گئی۔ شاید وہ ندی میں اشنان کر کے آئی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے۔ سفید ساڑھی اس نے اس طرح سے باندھ رکھی تھی کہ اس کا ایک بازو شانے تک عریاں تھا۔ یہاں میں آپ کو سانپوں کی ایک خصلت بیان کرنی ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ ضرور سوچتے ہوں گے کہ میں نے ناگن درگا کو کیسے پہچان لیا تھا کیونکہ میں نے تو اسے ناگن یعنی سانپ کی شکل میں دیکھا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ سانپ جس کے پاس سو برس زندہ رہنے کے بعد یہ طاقت آ جاتی ہے کہ وہ سانپ سے انسان کا روپ بدل لیتا ہے تو اس میں یہ شکتی بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کسی ایسے دوسرے سانپ کو جو انسان سے سانپ بن گیا ہو' اس کی اصل شکل سے پہچان لیتا ہے۔

میں خود بول کر اسے بتا نہیں سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ناگن درگا مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر جا کر چلتے چلتے اچانک رک گئی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ پھر واپس مڑی۔ قدم قدم چلتی جہاں میں گھاس میں چھپا ہوا تھا وہاں سے ایک دو گز دور کھڑی ہو کر فضا کو سونگھنے لگی۔ میرے دل میں امید کی کرن روشن ہو گئی۔ شاید ناگن درگا نے اپنی شکتی سے میرے جسم کی بو پا لی تھی۔ وہ بو سونگھتے سونگھتے میرے قریب آئی اور جھک کر مجھے گھاس میں چھپے ہوئے دیکھا۔

"کرم داد! یہ تم ہو؟"

میں نے گھاس میں سے گردن اوپر اٹھائی اور آہستہ آہستہ آگے پیچھے سر ہلانے لگا۔ جیسے اسے کہہ رہا تھا کہ ہاں میں ہی کرم داد ہوں۔ ناگن درگا غور سے مجھے تک رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"کرم داد! تم بول نہیں سکتے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو ناگن درگا نے مجھے جھک کر اٹھا لیا اور مجھے اپنے منہ کے قریب لے جا کر ایک بار پھر سونگھا۔

"ہاں تم کرم داد ہی ہو' مجھے تمہاری خوشبو آ رہی ہے جو میں نے ناگن کے روپ میں سونگھی تھی۔"

میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا تو ناگن درگا مسکرائی۔ اس نے میرا منہ چوم لیا اور بولی۔

"تمہیں اشارے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ تم کرم داد ہو۔ تم اس لیے نہیں بول سکتے کہ تم پر کسی نے ناگ منی کا منتر پھونکا ہوا ہے۔ فکر نہ کرو میں تم پر کیا ہوا جادو اتار دوں گی۔ آخر میں بھی پانچ سال تک ناگن بنی رہی ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم میرے پاس آ گئے ہو۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ ضرور ہوئی ہوگی مگر تم نے کمال کر دیا کہ سانپ ہو کر اتنی دور آ گئے۔ آؤ میرے ساتھ جھونپڑی میں۔ میں تمہیں دودھ پلاتی ہوں۔"

وہ مجھے جھونپڑی میں لے آئی۔ پیتل کی گڑوی میں سے اس نے دودھ نکال کر مٹی کی پیالی میں ڈالا اور میرے آگے رکھ دیا۔ میں بڑے سکون کے ساتھ دودھ پینے لگا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب ناگن درگا کی مجھ سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ ناگن کے روپ میں تھی تو میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا کہ میں کون ہوں اور ہندوستان میں کیسے آیا تھا اور میری بیوی کا نام جمیلہ ہے جو مجھ سے بچھڑ چکی ہے۔ میں نے دودھ پی لیا تو اس دوران ناگن درگا بالوں میں کنگھی کرتی رہی۔ اس نے مجھ سے

پوچھا۔

"تمہاری پتنی کہاں ہے؟"

پھر خود ہی بولی۔

"مگر تم تو شہر کا نام نہیں بتا سکو گے۔ یہ بتاؤ کہ دورہ پڑنے پر سانپ کے روپ میں آنے کے بعد تم پر کس نے منتر پھونک کر تمہاری انسانی آواز ختم کر دی تھی۔"

میں خاموش رہا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مسکرا کر بولی۔

"میں پھر بھول گئی تھی کہ تم تو بول نہیں سکتے۔ خیر کوئی بات نہیں میں تمہارا جادو اتارنے کی کوشش کروں گی۔ ایک جگہ مجھے معلوم ہے جہاں تم پر کیا گیا جادو اتر سکتا ہے۔ بس مجھے تھوڑا سا چلہ کرنا پڑے گا۔ تمہاری خاطر میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

اس نے ایک خاص انداز سے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور مجھے اٹھا کر میرا منہ چوم لیا۔ یہ پہلی عورت میں نے دیکھی تھی جو میرا سانپ والا منہ چوم رہی تھی۔ اس کی یہ گرم جوشی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ آگے چل کر مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا کہ ناگن درگا مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔ لیکن اس وقت تک اس نے اپنی زبان سے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ناگن درگا نے مجھے چوکی پر بٹھا دیا اور گیندے کے پھول جو وہ ندی پر سے لائی تھی' انہیں تھالی میں سجایا اور تھالی میرے آگے رکھ کر ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور بولی۔

"کرم داد! یہاں سے کچھ دور جنگل میں ماتا کنتی کا مرگھٹ ہے۔ اس مرگھٹ میں ماتا کنتی کی سمادھ ہے۔ مجھے وہاں سات راتیں تمہیں ساتھ لے کر چلہ کرنا ہو گا۔ بھگوان نے چاہا تو آٹھویں روز تمہارا جادو ٹوٹ جائے گا اور تم اپنی انسانی آواز میں بولنے لگو گے۔ اب تم شانت ہو جاؤ۔ میں آج رات ہی سے یہ چلہ شروع کر دوں گی۔"

شام کو اس نے چلہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ مجھے ساتھ لے کر ندی پر گئی۔ شام کے جھٹپٹے کا وقت تھا۔ اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ اس نے مجھے کنارے پر بٹھا دیا اور خود ندی میں اتر کر نہانے لگی۔ وہ ایک جوان عورت تھی۔ میں اس کے صحت مند جسم کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ عورت کس طرح ایک خاوند کے بغیر ساری زندگی بسر کرے گی۔ جس طرف سورج غروب ہو چکا تھا' ناگن درگا نے اس طرف منہ کیا ہوا تھا اور ہاتھوں سے ندی کا پانی اچھال کر اپنے اوپر ڈال رہی تھی اور اشلوک پڑھ رہی تھی۔ میں ندی کے کنارے پر گھاس میں کنڈلی مار کر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا کہ میں کس مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ مجھے جمیلہ کا خیال آ رہا تھا کہ وہ میرے لیے کس قدر پریشان نہیں ہو گی۔ کمانڈو منظر خالد نے اسے بتا دیا ہو گا کہ کرم داد! ہم سے بچھڑ گیا ہے۔

اشنان کرنے کے بعد ناگن عریاں حالت میں ندی سے نکل آئی۔ اس نے ساڑھی اٹھا کر جھاڑی اور اسے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ پھر مجھے اٹھا کر سینے سے لگایا۔ گڑوی میں ندی کا پانی بھرا اور کہنے لگا۔

"یہ ماتا کنتی کا خاص اشنان تھا۔ اب میں تمہیں لے کر ماتا کنتی کے سلادھ پر جاؤں گی اور ساری رات چلہ کروں گی۔ تم میرے پاس ہی رہو گے۔ تم سے الگ ہو کر میں یہ چلہ نہیں کر سکتی۔ تم چلو گے نا میرے ساتھ کرم داد!"

وہ اس طرح مجھ سے پوچھ رہی تھی جیسے میں انسانی شکل میں اس کے پاس موجود ہوں۔ میں بول نہیں سکتا تھا۔ اگر بول سکتا تو اسے اک ہی بات کہتا کہ اپنے بھگوان کے لیے مجھے کسی طرح بھوپال میری بیوی جمیلہ کے پاس پہنچا دو۔ مگر میں یہ بات اپنی زبان سے ادا نہیں کر سکتا تھا۔ میری قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔

آدھی رات تک ناگن درگا مجھے جھونپڑی میں اپنے سامنے چوکی پر بٹھا کر عجیب و غریب زبان میں اشلوک پڑھتی رہی۔ جب کافی رات گزر گئی اور اس نے مجھے اٹھا کر

اپنی گردن میں ڈالا اور بولی۔

"کرم داد! اب تم میرے ساتھ ماتا کنتی کے سادھ پر چلو گے۔"

اس نے پانی کی گڑوی اپنے ساتھ لے لی تھی۔ جھونپڑی سے نکل کر وہ نشیب میں اتر گئی۔ آگے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ جنگل میں سناٹا اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ناگن درگا جنگل کے ایک طرف ہو کر چل رہی تھی جہاں کچی پگڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ مجھے اندھیرے میں پگڈنڈی صاف نظر آ رہی تھی۔ کوئی ایک میل تک پگڈنڈی پر چلنے کے بعد ناگن درگا پگڈنڈی سے اتر کر بائیں جانب درختوں کی طرف ہو گئی۔ ان درختوں میں مجھے دور سے ایک پرانے کھنڈر کی شکستہ عمارت نظر آئی۔ ناگن درگا نے کہا۔

"کرم داد! ہم ماتا کنتی کے سادھ پر پہنچ گئے ہیں۔ پریشان مت ہونا یہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

کھنڈر کی ایک طرف چبوترے پر ایک چھوٹی سی سادھ تھی۔ چبوترے کا فرش پرانی اینٹوں کا تھا۔ سادھ کے طاق میں ایک سانپ کی مورتی مجھے اندھیرے میں نظر آ گئی۔ ناگن درگا اس مورتی کے آگے بیٹھ گئی۔ مجھے اس نے اپنے قریب ہی بٹھا دیا۔ کہنے لگی۔

"یہ ماتا کنتی کی بھگتنی ناگن مورتی ہے۔ جب میں سات راتیں چلہ پورا کر لوں گی تو اس ناگن کی مورتی کے منہ سے پھنکار کی آواز آئے گی۔ اس کے ساتھ ہی تمہارا جادو ٹوٹ جائے گا اور تمہاری بولنے کی شکتی واپس آ جائے گی۔ اب میں چلہ شروع کرتی ہوں۔"

اس نے ہاتھ باندھ لیے اور آگے پیچھے ہلتے ہوئے اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔ ظاہر ہے میں وہاں سوائے بور ہونے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں وہاں سے جا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ناگن درگا صرف میرے لیے یہ چلہ کر رہی تھی اور میرا وہاں موجود ہونا بقول اس کے ضروری تھا۔ وہ ہر پانچ سات منٹ کے بعد اشلوک پڑھتے پڑھتے مجھ پر پھونک مار دیتی تھی۔ میرے لیے یہ سب بیکار کی باتیں تھیں۔ لیکن دل میں یہ خیال

ضرور آتا تھا کہ مجھ پر جو سفلی جادو ہوا ہے اس کا توڑ ناگن درگا کا سفلی چلہ ہی ہو سکتا ہے۔ باقی کی آدھی رات ناگن درگا اشلوک پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکتی رہی۔ جب پو پھٹنے لگی تو وہ مجھے لے کر واپس جھونپڑی میں آگئی اور اپنے ساتھ لگا کر سوگئی۔ جب وہ خراٹے لینے لگی تو میں چارپائی سے کھسک کر چارپائی سے نیچے اتر آیا اور جھونپڑی سے نکل گیا۔ باہر خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ درختوں پر پرندے بول رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے پریشان خیالوں میں کھو گیا۔ کبھی سوچتا کہ اس بک بک کو یہیں چھوڑ کر یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ لکشمن پور پہنچا ہوں تو کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا بھوپال بھی پہنچ جاؤں گا لیکن مجھے معلوم تھا کہ میں بھوپال سے کافی دور ہوں۔ دوسری بات یہ تھی کہ بہت ممکن تھا کہ ناگن درگا کی چلہ کشی سے میری انسانی قوت گویائی واپس آجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں چلہ کشی کے اثر سے پھر سے انسانی شکل اختیار کر جاؤں۔ بس یہی ایک موہوم سی امید تھی جو مجھے ناگن درگا کے پاس روکے ہوئے تھی اور میں اس کے پاس رہنے پر مجبور تھا۔

ناگن درگا کا چلہ سات راتوں تک جاری رہا۔ ہر رات میں اس کے ساتھ ماتا کنتی کے سادھ پر جاتا اور جب تک وہ چلہ کشی کرتی میں اس کے پہلو میں بیٹھا رہتا۔ جب آٹھویں رات آئی تو ناگن درگا بڑی خوش تھی۔ اس نے مجھے ندی پر لے جا کر مجھے بھی نہلایا خود بھی اشنان کیا اور کہنے لگی۔

"کرم داو! آج رات کو تم اپنی انسانوں والی آواز میں بولنا شروع کر دو گے۔ تم پر کیا گیا جادو ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ ماتا کنتی کی ناگن تم پر پھنکار مارے گی اور تم فوراً بولنا شروع کر دو گے۔ اب تو تم خوش ہو ناں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو ناگن درگا نے مجھے چوم لیا۔ جس طرح کہ وہ فرط جذبات سے مجھے پہلے بھی چوما کرتی تھی۔ جب رات گہری ہو گئی تو وہ ماتا کنتی کے سادھ پر آ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ مجھے اس نے معمول کے مطابق اپنے ساتھ ہی ایک طرف بٹھا دیا۔ وہ سامنے والے طاق کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں ماتا کنتی ناگن کی

مورتی رکھی ہوئی تھی۔ جنگل میں چاروں طرف گہری تاریکی اور خاموشی تھی۔ آسمان پر بادل بھی تھے اور کہیں کہیں تارے بھی نظر آ رہے تھے۔ ناگن درگا نے اشلوک پڑھنے شروع کر دیے۔ دس پندرہ منٹ تک وہ اشلوک پڑھتی رہی۔ پھر خاموش ہو گئی۔ ایک منٹ تک خاموش رہی پھر ماتا کستی کی ناگن کو مخاطب کر کے بولی۔

"ہے ماتا کستی! ہے مہا ناگن! میں نے تیرا چلہ پورا کر دیا ہے اب مجھے اپنا آشیرباد دے اور کرم داد کو بولنے کی شکتی دے۔"

جیسے ہی اس نے یہ الفاظ ادا کیے جنگل کی طرف سے ایسی چیخ کی آواز آئی جیسے کسی چڑیل نے آواز بلند کی ہو۔ میں کنڈلی مار کر بیٹھے بیٹھے ڈر گیا۔ ناگن درگا بھی کچھ پریشان سی ہوئی۔ اس نے گردن موڑ کر جنگل کی طرف دیکھا۔ پھر ہاتھ باندھ کر ناگن کی مورتی سے کہا۔

"ہے میا ناگن! مجھ سے کوئی بھول ہو گئی ہو تو مجھے شما کر دے' مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہو تو شما کر دے۔"

وہ بار بار یہ جملہ دہرانے لگی۔ جنگل میں ایک بار پھر وہی بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی جس طاق میں ناگن کی مورتی تھی اس کے پیچھے ایک ڈراؤنی شکل نمودار ہوئی۔ یہ ڈراؤنی شکل ایک عورت کی تھی جس کی سرخ زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ سر کے اوپر ایک سانپ پھن کھولے بیٹھا تھا۔ ناگن درگا نے اس شکل کو دیکھا تو اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"ماتا! مجھے شما کر دے' ماتا مجھے شما کر دے۔"

ڈراؤنی شکل والی عورت کی سرخ زبان اندر چلی گئی۔ تب اس عورت نے اپنی شکل سے زیادہ ڈراؤنی اور گھسی ہوئی آواز میں کہا۔

"درگا! درگا! اگر تیرا نام درگا نہ ہوتا تو میں تمہیں اسی جگہ بھسم کر دیتی۔ پر یہ نام کالی ماتا کا ایک نام بھی ہے۔ لیکن تو نے جو اپرادھ (جرم) کیا ہے تمہیں اس کی سزا مل کر رہے گی۔"

میں بھی ڈر کر ناگن درگا کے ساتھ لگ گیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ سفلی جادوگری کی کارستانیاں ہیں اور یہ کوئی بدروح ہے جس کے شکنجے میں ناگن درگا پھنس گئی ہے۔ ناگن درگا کی یہ حالت تھی کہ اب اس کے منہ سے لفظ بھی نہیں نکل رہے تھے۔ وہ رک رک کر ایسی آوازیں نکال رہی تھی جیسے بین کر رہی ہو۔ ڈراؤنی شکل نے ایک بار پھر اپنی وحشت ناک اور غضب آلود آواز میں کہا۔

"درگا! تو نے ایک مسلمان کو میرے سادھ پر لا کر میرے استھان کو بھرشٹ کر دیا ہے۔ میں تجھے اس کی سزا دوں گی۔ میں تجھے شراپ (بددعا) دیتی ہوں کہ تو ایک بار پھر ناگن کا روپ اختیار کرے گی اور اس وقت تک ناگن ہی رہے گی جب تک کہ یہ دھشٹ مسلمان جو ناگ بن کر تمہارے پاس بیٹھا ہے اپنی انسانی صورت میں واپس آ کر تیرا منہ نہیں چومتا۔ دفع ہو جا آلوپ ہو جا۔"

اندھیرے میں مجھے اس بدروح کی ڈراؤنی صورت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی بددعا پوری کر کے فوراً" ہی غائب ہو گئی۔ مجھے اپنے پہلو میں جہاں ناگن درگا بیٹھی تھی ایک جھٹکا سا لگتا محسوس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو خوف سے کانپ اٹھا۔ میرے پہلو میں اب درگا نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ ناگن کنڈلی مارے بیٹھی تھی اور بار بار اپنا سر زمین پر مار رہی تھی۔ مجھے ناگن درگا کی عورت کی آواز آئی۔

"کرم داد! ماتا کنتی نے مجھے دھتکار دیا ہے۔ مجھے شراپ دیا ہے۔ اب میں اس وقت تک ناگن ہی بنی رہوں گی جب تک کہ تو اپنی انسانی شکل میں واپس آ کر میرا منہ نہیں چومتا۔"

اچانک میرے منہ سے انسانی آواز نکلی۔ میں اپنی آواز پر حیران بھی ہوا اور خوش بھی ہوا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"خدا مجھے معاف کر دے گا درگا! میری وجہ سے تمہیں——"

میں اپنا جملہ پورا نہ کر سکا اور اپنی آواز سن کر حیران ہونے لگا۔ ناگن درگا بھی سانپ کی شکل میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی عورت کی آواز میں کہا۔

"کرم داد! بھگوان کی بڑی کرپا ہوئی ہے کہ تمہاری انسانی آواز پھر سے واپس آ گئی۔ اگر مجھ پر دیوتاؤں کا عذاب پڑتا ہے تو کوئی بات نہیں میں اس مصیبت کو جھیل لوں گی لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم پھر سے بولنے لگے ہو۔"

میں نے کہا۔

"لیکن درگا میرے لیے یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ تم پھر سے ناگن بن گئی ہو۔ لیکن تم فکر نہ کرو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گا اور جیسے ہی انسانی شکل میں واپس آیا تمہارا منہ چوم کر تمہیں بھی انسانی شکل میں واپس لے آؤں گا۔ لیکن درگا! کیا اس طرح کرنے سے تم دوبارہ عورت کے روپ میں واپس آ جاؤ گی؟"

درگا ناگن نے اپنے منہ سے سسکاری سی بھر کر اداس لہجے میں کہا۔

"ہاں کرم داد! ماتا کنتی نے جو کچھ کہا ہے ایسے ہی ہوگا۔ لیکن تم مجھے اپنے ساتھ کہاں لیے پھرو گے؟ تم خود سانپ کے روپ میں ہو۔"

میں نے کہا۔

"اس دھرتی پر اور بھی تو ناگ ناگنیں زندہ رہتی ہیں۔ ہم بھی رہ لیں گے۔ تم گھبراؤ نہیں مجھ پر کسی وقت دورہ پڑ سکتا ہے اور میں کسی بھی لمحے انسانی شکل میں واپس آ سکتا ہوں۔"

ناگن درگا نے کہا۔

"تم ماتا کنتی کے شراپ (بد دعا) کو نہیں جانتے۔ وہ اپنے جادو سے تمہیں کبھی انسانی شکل میں واپس نہیں آنے دے گی۔"

میں نے غصے کے ساتھ کہا۔

"اس تمہاری ماتا کنتی کی ایسی کی تیسی۔"

ناگن درگا نے رحم طلب لہجے میں کہا۔

"بھگوان کے لیے ایسا نہ کہو کرم داد! ماتا کنتی شاید ابھی یہیں ہوگی۔ چلو۔ یہاں

سے چلے چلو۔"

جب ہم وہاں آئے تھے تو میں سانپ کے روپ میں تھا اور ناگن درگا عورت کے روپ میں تھی۔ اب جبکہ ہم وہاں سے واپس جا رہے تھے تو دونوں ناگ اور ناگن کے روپ میں تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے میں بول نہیں سکتا تھا۔ اب میں بھی اپنی انسانی آواز میں بات کر سکتا تھا۔ خدا جانے یہ درگا کے اشلوکوں کا یا چلے کا اثر تھا یا کیا تھا لیکن میری خوش قسمتی کی یہ ایک بات ہو گئی تھی۔

ہم دونوں اسی طرح رینگتے ہوئے سادھو کے چبوترے سے اتر کر ناگن درگا کی جھونپڑی کی طرف چل پڑے جس طرح جنگل میں ناگ ناگن کا جوڑا رات کو سیر کیا کرتا ہے۔ ہم ناگ ناگن کا جوڑا ہی بن گئے تھے۔ جھونپڑی میں پہنچنے کے بعد ناگن درگا چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے پاس کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ ناگن درگا کے منہ سے جیسے ایک آہ نکل گئی۔ کہنے لگی۔

"کرم داد! تم میری خاطر اپنی زندگی کیوں مصیبتوں میں ڈالتے ہو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور تم یہاں سے اپنی بیوی کے پاس واپس چلے جاؤ۔"

میں نے کہا۔

"درگا! تمہاری قسمت مجھ سے جوڑ دی گئی ہے۔ تم اس صورت میں عورت کی شکل میں واپس آ سکتی ہو جب میں انسان کی شکل میں واپس آؤں گا اور تمہارے منہ کو چوم لوں گا تو پھر میں تمہیں کیسے اکیلا چھوڑ سکتا ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ ہی چلو۔ کوئی پتہ نہیں میں کس وقت سانپ سے انسان کی شکل میں واپس آ جاؤں۔ تب تم بھی اپنی اصلی شکل اختیار کر کے واپس یہاں لکشمن پور میں آ جانا۔"

ناگن درگا آہ سی بھر کر خاموش رہی۔

میرا خیال ہے اس وقت رات کے دو ڈھائی بجے کا وقت ہو گا۔ مجھے نیند کی حاجت نہیں تھی۔ سانپ کے روپ میں آنے کے بعد ناگن درگا کو بھی نیند کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"کرم داد! ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تم کبھی بھی انسانی شکل میں واپس نہ آ سکو۔"
میں نے کہا۔
"ایسا نہیں ہوگا میرا انسان اور سانپ کے درمیان کا وقفہ لمبا ہو سکتا ہے لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ اگر میں انسان ہوں تو سانپ کے روپ میں اور اگر سانپ ہوں تو انسان کے روپ میں واپس نہ آؤں۔"
ناگن درگا نے مایوس لہجے میں کہا۔
"نہیں کرم داد! تم مسلمان ہو۔ تم ہندو دیوی دیوتاؤں اور بد روحوں کے شراپ سے واقف نہیں ہو۔ ان کی بد دعائیں ان کے ماننے والوں کو ضرور لگتی ہیں۔"
میں نے کہا۔
"لیکن تمہاری ماتا کنتی کی ڈراؤنی بدروح نے یہ بھی تو کہا تھا کہ جب کرم داد انسان کی شکل میں واپس آ جائے گا تو تمہیں چومنے کے بعد تم بھی عورت کی شکل اختیار کرلو گی۔"
ناگن درگا بولی۔
"یہ اس نے ویسے ہی کہہ دیا تھا میں ماتا کنتی کی بد روح کو جانتی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب ہم دونوں میں سے کوئی بھی انسانی شکل میں واپس نہیں آ سکے گا۔"
میں نے بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا۔
"اگر تم سمجھتی ہو کہ ایسا ہی ہوگا تو میں تمہیں اسے غلط کر کے دکھا دوں گا۔ میں مسلمان ہوں اور مسلمان کا اپنے اللہ پر یقین کامل ہوتا ہے وہ اللہ کے سوا اور کسی کو انسانوں کی قسمت کا مالک نہیں سمجھتا۔ ہم یہاں سے بھوپال چلتے ہیں۔ میں اپنے دوست کمانڈو منظر خالد سے بات کروں گا۔ ہم دونوں کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لیں گے۔"
ناگن درگا نے کہا۔
"جب تمہاری بیوی جمیلہ کو معلوم ہوا کہ تم اپنے ساتھ ایک ناگن کو بھی لائے ہو

جو حقیقت میں ایک عورت ہے تو تم اسے کیا جواب دو گے؟"
میں نے کہا۔
"میں تمہیں اپنی بیوی سے نہیں ملاؤں گا۔ تم میرے ساتھ کمانڈو خالد کی خفیہ کمین گاہ میں رہو گی ہم اسے تمہارے بارے میں بتائیں گے بھی نہیں۔"
ناگن درگا نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے پوچھا۔
"یہاں سے بھوپال کتنی دور ہے اور ہم وہاں کس طرح پہنچیں گے؟"
ناگن درگا کہنے لگی۔
"بھوپال یہاں سے کافی دور ہے۔ یہاں سے ہمیں دو بار گاڑیاں بدلنی ہوں گی۔ پہلے ہم نرسنگ پور جائیں گے۔ وہاں سے ساگر پہنچیں گے۔ ساگر کے سٹیشن سے ہمیں بھوپال جانے والی گاڑی ملے گی۔ یہ تو وہ سفر ہے جو انسان کرتے ہیں۔ ہم سانپ ہیں ہم انسانوں کی طرح نہ تو گاڑی میں بیٹھ سکیں گے' نہ گاڑیاں راستے میں بدل سکیں گے۔ میں نے اگر کافی زندگی ناگن کی شکل میں گزاری ہے لیکن میں نے یہ سارا وقت جنگلوں میں بسر کیا ہے۔"
میں نے کہا۔
"مجھے شہروں اور ریلوے سٹیشنوں میں آنے جانے کا کافی تجربہ ہے۔ اگرچہ انسانوں کے درمیان جا کر ہمیں ہر وقت اپنی جان کی فکر رہے گی کیونکہ سانپ کو انسان اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور دیکھتے ہی اسے مارنے کو دوڑتے ہیں۔ لیکن ہم رات کے وقت سفر کریں گے اور چھپ چھپ کر سٹیشن پر پہنچیں گے اور ریل گاڑی کے ڈبے میں بیٹھنے کی بجائے ڈبے کی چھت پر لیٹ کر سفر کریں گے۔"
ناگن درگا نے آہ بھر کر کہا۔
"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔"
رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ جھونپڑی کے باہر جنگل میں اندھیرا تھا۔ اب ہم دونوں ہی اندھیرے میں دیکھ سکتے تھے۔ میں نے کہا۔

"اگر ہمیں بھوپال جانا ہی ہے اور رات کے اندھیرے میں ہی یہاں سے نکلنا ہے تو پھر صبح کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی رات باقی ہے' ابھی یہاں سے نکل جاتے ہیں۔"

ناگن درگا نے کہا۔

"ابھی نکل چلتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"یہاں سے ریلوے سٹیشن کتنی دور ہوگا۔ میں تو ایک ٹرک پر سوار ہو کر آیا تھا۔"

ناگن درگا کی آواز میں اب کچھ اعتماد سا آتا جا رہا تھا۔ لگتا تھا اس نے اپنی بدنصیبی کو قبول کر لیا تھا۔ کہنے لگی۔

"یہاں سے ایک نزدیکی راستہ جنگل میں سے ہو کر ریلوے لائن تک جاتا ہے۔ وہاں سے سٹیشن زیادہ دور نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے صبح ہونے تک ہمیں کوئی گاڑی مل جائے جو نرسنگ پور کی طرف جا رہی ہو۔"

ناگن درگا نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ایک نگاہ چاروں طرف جھونپڑی میں ڈالی اور چارپائی سے اتر کر میرے ساتھ جنگل کی طرف چل پڑی۔ وہ میرے آگے آگے جا رہی تھی۔ چونکہ اب وہ سانپ کے روپ میں تھی اس لیے مجھے اس کے جسم کی بو بڑی صاف صاف محسوس ہو رہی تھی۔ اسی طرح اسے بھی میرے جسم کی بو صاف صاف محسوس ہو رہی ہوگی۔ ناگ اور ناگن ایک دوسرے سے چاہے کتنی دور کیوں نہ ہوں وہ ایک دوسرے کی بو محسوس کر کے ایک دوسرے کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ اسے ریلوے لائن تک پہنچنے کے آسان راستے کا علم تھا۔ جنگل میں رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی لیکن یہ تاریکی ہمارے راستے میں رکاوٹ نہیں بن رہی تھی۔ ہمیں سانپ یعنی ناگ اور ناگن ہونے کی وجہ سے درخت جھاڑیاں بالکل صاف نظر آ رہی تھیں۔

ناگن درگا بڑی تیزی سے جا رہی تھی۔ ہم بڑی جلدی جنگل کو پار کر گئے۔ آگے

ایک کھلا میدان آ گیا جہاں اونچا گھاس تھا۔ ایک جگہ گزرنے کا راستہ بنا ہوا تھا۔ ہم اس میں سے ہو کر گزرنے لگے۔ گھاس کا میدان کافی لمبا چوڑا تھا۔ کافی دیر اسے پار کرتے لگ گئی۔ جب باہر نکلے تو دور سے ریلوے سگنل کی سرخ بتی دکھائی دی۔ ناگن درگا رک کر کہنے لگی۔

"یہ سگنل کی بتی ریلوے لائن کی ہے۔ ہم اسی طرف جائیں گے۔"

تھوڑی دیر میں ہم ریلوے لائن پر تھے اور پٹڑی کے ساتھ ساتھ شمال مشرق کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں ایک نہر کا پل بھی آیا۔ کافی کشادہ نہر تھی۔ ہم پل کے اوپر سے رینگتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے۔ یہاں سے ہمیں دور سٹیشن کی روشنیاں جھلملاتی نظر آئیں۔ ناگن درگا نے کہا۔

"یہ بھوگنج کا سٹیشن ہے۔ یہاں سے ہمیں نرسنگ پور جانے والی گاڑی مل سکتی ہے لیکن معلوم نہیں کس وقت ملے۔"

میں نے کہا۔

"یہ ہمیں کیسے معلوم ہو گا کہ کون سی گاڑی نرسنگ پور جا رہی ہے؟ ہم تو کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتے۔"

ناگن درگا میرے ساتھ رینگ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم فکر نہ کرو۔ یہ میں معلوم کر لوں گی۔"

ہم ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلتے بھوگنج سٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ گئے۔ پلیٹ فارم رات کے وقت خالی خالی تھا۔ یہ معمولی سا سٹیشن تھا۔ قریب قریب کوئی آبادی بھی نہیں تھی۔ دور کسی گاؤں کی اکا دکا روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ پلیٹ فارم کے شروع میں ہی ایک جانب کوئی سٹال تھا جو بند پڑا تھا۔ ہم سٹال کی اوٹ میں آ گئے۔ ناگن درگا کہنے لگی۔

"تم اسی جگہ ٹھہرو میں معلوم کر کے آتی ہوں کہ نرسنگ پور جانے والی گاڑی کس وقت آئے گی۔"

میں نے اسے کہا۔

"میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گا۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

وہ بولی۔

"تمہارا میرے ساتھ جانا بے فائدہ ہے۔ میں ہندی زبان بھی پڑھ لیتی ہوں۔ یہاں ہندی زبان ہی چلتی ہے۔ اگر کسی جگہ ہندی میں گاڑیوں کے آنے جانے کا بورڈ لگا ہو گا تو میں اسے پڑھ سکتی ہوں۔ تم یہیں چھپ کر بیٹھے رہو میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔"

وہ چلی گئی۔ میں سٹال کی لکڑی کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہا۔ وہ مجھے اینٹوں کے پلیٹ فارم کی دھندلی روشنی میں کچھ دور تک جاتی نظر آئی پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں اسی جگہ بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ اس نے کافی دیر لگا دی۔ جب واپس آئی تو اس کے ساتھ ہی دور سے ریلوے انجن کی سیٹی کی آواز بھی آئی۔ ناگن درگا کہنے لگی۔

"یہی گاڑی نرسنگ پور جائے گی۔"

میں سٹال کی اوٹ سے نکل آیا۔ ناگن درگا نے کہا۔

"ہم اسی جگہ چھپ کر ریل گاڑی کا انتظار کریں گے۔"

ہم پلیٹ فارم کے آخری سرے پر تھے یہاں سے پلیٹ فارم کی ڈھلان اترتی تھی اور بھوگنج نام کا بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"یہاں تو انجن آکر رکے گا۔ ہمیں دوسری طرف ریلوے لائن پر جا کر مسافروں کے ڈبے کی چھت پر چڑھنے کی کوشش کرنی ہو گی۔"

وہ بولی۔

"یہ مسافر ٹرین ہے۔ کافی لمبی ہو گی ہم یہیں سے انجن کے ساتھ والے ڈبے پر چڑھ جائیں گے۔"

ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی تھی اور پلیٹ فارم پر اس کی دھمک ہمیں صاف محسوس ہو رہی تھی۔ انجن کی لائٹ روشن تھی۔ یہ روشنی آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا

رہی تھی۔ پھر وہ ہمارے قریب سے گزر گئی اور تھوڑا آگے جا کر انجن رک گیا۔ ٹرین بھی رک گئی۔ ڈبوں میں روشنی تھی مگر تقریباً" سبھی مسافر سو رہے تھے۔ ناگن درگا نے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔ ہم پلیٹ فارم سے نیچے اتر کر انجن کے ساتھ والے ڈبے کی چھت پر چڑھیں گے۔

میں اس کے پیچھے رینگنے لگا۔ ہم بڑی تیزی سے پلیٹ فارم پر سے گزر کر ٹرین کے نیچے ریل کی پٹڑیوں میں آ گئے۔ یہاں سے ہم پٹڑی کی دوسری طرف گئے اور ایک پہیئے پر سے ہو کر ڈبے کی عقبی دیوار پر سے رینگ کر ڈبے کی چھت پر آ گئے۔ میں نے ناگن درگا سے پوچھا۔

"ہمیں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ نرسنگ پور کا سٹیشن آگیا ہے۔"

وہ کہنے لگی۔

"میں نرسنگ پور کے سٹیشن کو بھی پہچانتی ہوں۔ وہاں کئی بار جا چکی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد انجن نے سیٹی بجائی اور ہلکے سے دھچکے کے ساتھ ٹرین چل پڑی۔"





ٹرین باقی ساری رات اور دوسرا دن بھی چلتی رہی۔
شام کے وقت جا کر کہیں نرسنگ پور کا سٹیشن آیا۔ اس دوران ہم ڈبے کی چھت پر ہی کبھی بیٹھے اور کبھی لیٹے رہے۔ ہمیں کھانے پینے کی اتنی حاجت بھی نہیں تھی۔ جب ٹرین نرسنگ پور شہر کے قریب پہنچی تو ناگن درگا نے اس کی عمارتوں کو پہچانتے ہوئے کہا۔

"کرم داد! نرسنگ پور کا شہر آگیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے اب یہاں سے ہمیں کونسی گاڑی پکڑنی ہوگی؟"

وہ کہنے لگی۔

"ساگر جانے والی گاڑی پکڑنی پڑے گی۔ نرسنگ پور کا سٹیشن بڑا سٹیشن ہے۔ یہاں سے بڑی جلدی معلوم ہو جائے گا کہ ساگر جانے والی گاڑی کون سی ہے۔"

نرسنگ پور کے سٹیشن پر ٹرین کھڑی ہوئی تو ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے رینگ کر ڈبے کی دوسری جانب یعنی جس طرف دوسرا ریلوے ٹریک تھا اتر گئے۔ ٹرین لمبی تھی اور ہمارا ڈبہ انجن کے ساتھ والا ڈبہ تھا جو پلیٹ فارم کے سرے پر جا کر رکا تھا۔ یہاں اکا دکا مسافر ہی تھے۔ ہم دوسری طرف والے ریلوے ٹریک میں کچھ دور تک گئے۔ ناگن درگا اس سٹیشن کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ میری راہ نمائی کر رہی تھی۔ وہ

اوپر سے ہو کر دوسرے پلیٹ فارم کے عقب میں آ گئی۔ یہاں اندھیرا تھا اور ایک خالی ڈبہ لائن پر کھڑا تھا۔ ناگن نے مجھے کہا۔

"کرم داد! تم اس خالی ڈبے میں بیٹھو میں ساگر جانے والی گاڑی کا پتہ کر کے آتی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ میں خالی ڈبے میں آ کر سیٹ کے نیچے چھپنے کی بجائے سیٹ کی کھڑکی پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے میں باہر کا نظارہ دیکھ سکتا تھا۔ میرے سامنے ریلوے لائن تھی۔ اس کے آگے پلیٹ فارم تھا جو بالکل خالی تھا۔ اس کے آگے پھر ایک ریلوے لائن تھی اور آگے ایک اور پلیٹ فارم تھا جس پر ہماری گاڑی آ کر رکی تھی۔ کافی دیر گزر گئی۔ ناگن درگا واپس نہ آئی۔ میں بھی فکر مند ہو گیا کہیں اسے کسی نے کچل کر مار نہ ڈالا ہو۔ کہیں وہ کسی شنٹ کرتے انجن یا ڈبے کے نیچے نہ آ گئی ہو۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے فضا میں سونگھا' ناگن درگا کی بو ایک جانب سے برابر آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ریلوے سٹیشن کی حدود میں ہی ہے۔ اس بو سے میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ناگن درگاہ زندہ ہے یا مر گئی ہے۔ کیونکہ سانپ جب مر جاتا ہے تو اس کے جسم سے اس وقت تک تیز بو نکلتی رہتی ہے جب تک کہ اس کا جسم بالکل مٹی نہیں بن جاتا۔ آخر مجھے اس کی بو تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ میری طرف آ رہی تھی۔ بو تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر میں نے اسے سامنے والے خالی پلیٹ فارم پر تیزی سے رینگتے اور نیچے لائنوں میں اترتے دیکھ لیا۔

کچھ دیر بعد وہ میرے ڈبے میں آگئی۔ میں نے کہا۔

"تم نے بہت دیر لگا دی۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔"

وہ کہنے لگی۔

"جس پلیٹ فارم پر گاڑیوں کے آنے جانے کا لکھا ہوا تھا وہاں کافی لوگ تھے۔ میں انتظار کرتی رہی کہ لوگ وہاں سے ہٹیں تو میں جا کر بورڈ پڑھوں۔ آخر ایک مسافر

نے میری مشکل آسان کر دی۔ وہ ایک قلی سے پوچھ رہا تھا کہ ساگر جانے والی گاڑی کس پلیٹ فارم پر آئے گی۔ قلی نے کہا۔ پلیٹ فارم نمبر ۲ پر آئے گی۔ اب ہمیں پلیٹ فارم نمبر ۲ پر جا کر کسی جگہ چھپ کر بیٹھنا ہو گا۔ کیونکہ کوئی پتہ نہیں یہ گاڑی کب آئے گی۔ ہو سکتا ہے ابھی آ جائے۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ پلیٹ فارم نمبر ۲ کہاں پر ہے؟"

وہ بولی۔

"میرے ساتھ آؤ' مجھے معلوم ہے۔"

ہم خالی ڈبے سے اتر گئے۔ ریل کی پٹڑیوں میں سے گزرتے ہوئے پلیٹ فارم نمبر ۲ کے سرے پر آ کر ایک لکڑی کے کھوکھے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ یہ بڑی غنیمت کی بات تھی کہ میری طرح ناگن درگا کا سانپ کا جسم بھی دو ڈھائی بالشت کا تھا اور اس کا رنگ بھی خاکستری تھا۔ ہمیں خاص طور پر اندھیرے میں آسانی سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ہمیں وہاں سے نمبر دو پلیٹ فارم نظر آ رہا تھا۔ جب وہاں ایک گاڑی آ کر رکی تو ناگن درگا نے کہا۔

"یہی گاڑی ساگر کو جائے گی۔ ہمیں اس کی پچھلی طرف سے چھت پر چڑھنا ہو گا۔"

اگرچہ پلیٹ فارم پر کافی روشنیاں تھیں۔ یہ بڑے شہر کا سٹیشن تھا اس کے باوجود پلیٹ فارم کی ریلوے لائنوں میں کہیں کہیں اندھیرا تھا اور ہم اس اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ادھر ادھر سے رینگ کر نمبر دو پلیٹ فارم پر کھڑی ٹرین کے نیچے آ گئے۔ یہ ٹرین کا پچھلا ڈبہ تھا۔ ہم اس کی دیوار پر سے ہو کر چھت پر چڑھ کر لیٹ گئے۔ بیٹھنے سے ہم اوپر پل پر سے گزرنے والے مسافروں کو نظر آ سکتے تھے۔ میں نے ناگن درگا سے کہا۔

"کہیں یہ گاڑی کسی دوسرے شہر کو تو نہیں جا رہی؟"

اس نے کہا۔

"یہ بھوپال ہی کو جا رہی ہے۔ مجھے پورا وشواش ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ٹرین چل پڑی۔

ساگر سے بھوپال بہت دور ہے۔ رات بھر ٹرین سفر کرتی رہی۔ راستے میں سٹیشن آتے۔ کسی سٹیشن پر ٹرین ٹھہرتی اور پھر چل پڑتی۔ رات کے پچھلے پہر بارش شروع ہوگئی۔ ہم بارش میں بھیگنے لگے تو ناگن درگا نے کہا۔

"شاید یہ گارڈ کا ڈبہ ہے۔ میں نیچے اتر کر دیکھتی ہوں۔ ہو سکتا ہے اس ڈبے میں ہمیں بارش سے بچنے کے لیے کوئی جگہ مل جائے۔"

میں نے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ آتا ہوں۔"

"تو پھر میرے پیچھے پیچھے آنا۔"

یہ کہہ کر ناگن درگا ڈبے کی کھڑکی کی طرف نیچے چلی گئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس نے اپنا سانپ والا سر کھڑکی کے شیشے کے ساتھ لگا کر اندر دیکھا۔ ڈبے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس نے سر اوپر کر لیا اور کہنے لگی۔

"یہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ لگتا ہے۔ اندر ایک عورت سیٹ پر سو رہی ہے۔ دوسری سیٹ پر کوئی مرد سو رہا ہے۔ ڈبے میں صرف دونوں ہی ہیں۔"

بارش اور تیز ہوگئی تھی۔ میں نے کہا۔

"یہ کھڑکی بند ہے تو دوسری کھڑکی دیکھتے ہیں۔"

ہم ڈبے کے باہر رینگ رہے تھے۔ دوسری کھڑکی کھلی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے ڈبے میں داخل ہوگئے۔ یہ بڑا آرام دہ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ تھا جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ عورت اور مرد الگ الگ سیٹوں پر سو رہے تھے۔ عورت نے سفید چادر اوپر کی ہوئی تھی۔ میں نے ناگن درگا کو سرگوشی میں کہا۔

"مرد والی سیٹ کے نیچے گھس جاتے ہیں۔ جب بارش تھم جائے گی تو موقع پا کر

واپس چھت پر چلے جائیں گے۔"

ہم سیٹ کے نیچے گھس کر بڑے آرام سے بیٹھ گئے۔ وہاں تو ایک ہلکا اندھیرا تھا دوسرے کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ ٹرین پوری رفتار سے دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اگرچہ اس علاقے میں سردیوں کا موسم نہیں تھا لیکن اتنی گرمی بھی نہیں تھی جس کی وجہ سے ڈبہ ائرکنڈیشنڈ نہیں تھا۔ یا ائرکنڈیشننگ ان دونوں نے بند کر دی تھی۔ دونوں نوجوان تھے اور میاں بیوی لگتے ہیں۔ یہ دو سیٹوں والا کوپے تھا۔ دونوں سیٹوں کے درمیان دیوار کے ساتھ میز تھی جس پر عورت کا سنگھار بکس' تھرمس اور شیشے کے دو گلاس اور ایک کپ پڑا تھا۔ سامنے والی سیٹ کے نیچے ایک چمڑے کا بڑا اور ایک چھوٹا سوٹ کیس بھی نظر آ رہا تھا۔ چھت پر گرتی ہوئی بارش شور مچا رہی تھی۔ کوئی سٹیشن آیا۔ ٹرین پوری رفتار کے ساتھ پٹڑیوں کو جھنجھناتی ہوئی وہاں رکے بغیر گزر گئی۔ بہت دیر تک ٹرین تیز رفتاری سے چلتی رہی۔ پھر اس کی رفتار کم ہونے لگی۔ میں نے ناگن سے سرگوشی کی۔

"میرا خیال ہے کوئی سٹیشن آ رہا ہے۔"

وہ بولی۔

"ہاں مگر یہ بھوپال نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے بھوپال کا سٹیشن کل دوپہر کے وقت کہیں جا کر آئے گا۔"

یہ کوئی اہم سٹیشن تھا۔ ٹرین آہستہ ہوگئی اور پھر رک گئی۔ رکنے سے ٹرین کو ہلکا سا دھچکا لگا تو نوجوان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ ہم اس نوجوان کی سیٹ کے نیچے تھے۔ ہمیں سیٹ کے چرچرانے کی آواز آئی۔ پھر اس کی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ سیٹ پر سے اٹھ کر دوسری سیٹ پر سوئی ہوئی عورت کے پاس گیا اور کندھے کو ہلا کر بولا۔

"بملا! بملا!۔"

نوجوان عورت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کھڑکی کے شیشے میں سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"راکیش جی! کون سا سٹیشن ہے؟"

راکیش نے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے لائن کی مرمت ہو رہی ہے یہ کوئی سٹیشن نہیں ہے۔"

بملا نے کہا۔

"پانی دینا تھوڑا۔"

اور وہ بالوں کو درست کرنے لگی' نوجوان اور خوبصورت عورت تھی۔ اس نے شب خوابی کا ریشمی گاؤن پہنا ہوا تھا۔ لڑکا بھی شب خوابی کے لباس میں تھا۔ دونوں کسی پڑھے لکھے اچھے گھرانے کے لگتے تھے۔ راکیش نے تھرمس میں سے پانی گلاس میں ڈال کر بملا کو دیا۔ میں اور ناگن درگا سیٹ کے نیچے چھپے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔ ڈبے کی چھت پر بارش کی ٹپ ٹپ جاری تھی مگر موسلادھار بارش نہیں تھی۔ انجن کے وسل کی آواز آئی اور ٹرین چل پڑی۔ نوجوان کھڑکی میں سے باہر جھانک رہا تھا۔

"دریائے نربدا کا جنگل لگتا ہے۔"

اس نے کھڑکی بند کر دی اور بملا سے کہا۔

"تم آرام کرو' میں بھی سو جاتا ہوں۔ بھوپال ابھی بہت دور ہے۔"

اس کے اس جملے سے میری ڈھارس بندھی اور خوشی بھی ہوئی کہ ہم غلط ٹرین میں نہیں بیٹھ گئے۔ یہ ٹرین بھوپال ہی جا رہی تھی مگر ابھی تک مجھے اپنی بیوی جمیلہ اور کمانڈو خالد میں سے کسی کی بو نہیں آئی تھی۔ شاید ہم ابھی بھوپال سے کافی دور تھے۔ باہر سے سوائے ٹرین کے چلتے پہیوں کی آواز کے سوا اور کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ٹرین کسی ویران جنگل میں سے گزر رہی تھی۔

نوجوان راکیش بھی اپنی سیٹ پر آ کر لیٹ گیا۔ لڑکی بملا نے بھی چادر اوپر کر کے پہلو بدل لیا تھا۔ ابھی ٹرین نے پوری رفتار نہیں پکڑی تھی۔ ناگن درگا میرے پاس ہی اپنا سر کنڈل میں چھپائے بیٹھی تھی۔ میں نے سر ذرا سا اٹھا رکھا تھا اور سامنے والی

کھڑکی کے شیشے کو دیکھ رہا تھا جس میں کمپارٹمنٹ کی روشنی کا عکس پڑ رہا تھا۔ میں اپنے انسانی ذہن سے سوچ رہا تھا کہ بھوپال ہم دن کی روشنی میں پہنچیں گے۔ مجھے اور ناگن درگا کو کسی جگہ چھپ کر رات ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔ تاکہ رات کے اندھیرے میں میں اسے لے کر کمانڈو خالد کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچوں۔ دن کی روشنی میں ہمیں لوگوں سے اپنی جان کا خطرہ تھا۔ میں اپنی سوچ میں گم تھا کہ مجھے ایسی آواز آئی جیسے کسی نے باہر کی طرف سے دروازے کو زور سے اندر کی طرف کھول کر دھکیلا ہو۔ گاڑی کے پہیوں کے شور میں یہ آواز صاف سنائی دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک مرد کی کرخت آواز آئی۔

"آ جاؤ دھنیا' آجاؤ۔ سالے سو رہے ہیں۔"

ناگن درگا نے سر اٹھا لیا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔

"کوئی ڈاکو لگتے ہیں۔"

ہمیں سیٹ کے نیچے سے دو آدمیوں کی ٹانگیں نظر آئیں۔ ان کی آواز سے نوجوان راکیش اٹھ بیٹھا۔

"کون ہو تم؟"

اس نے رعب سے پوچھا۔

اس کی آواز پر بملا بھی اٹھ بیٹھی اور گھبرا کر بولی۔

"کون ہو؟"

اتنی دیر میں دونوں ڈاکو ان کے سروں پر پہنچ گئے تھے۔ میں اور درگا تیزی سے رینگ کر سیٹ کے آخری کنارے پر آ گئے جہاں سے اپنے سر نکال کر ڈبے کا جائزہ لیا۔ دونوں ڈاکو دیہاتی لباس میں تھے۔ انہوں نے اپنے چہرے چھپا رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں دو نالی بندوقیں تھیں۔ ایک نے بندوق بملا کے سر کے ساتھ لگا رکھی تھی۔ دوسرے نے نوجوان لڑکے کی گردن سے بندوق لگائی تھی۔

"زنجیر کھینچنے کی کوشش کی تو بھون کر رکھ دوں گا۔ زیور پیسہ جو کچھ بھی ہے نکال

کر رکھ دو۔ ہم تمہیں جان سے نہیں ماریں گے۔"

لڑکی بے چاری خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ اس کے خاوند کا بھی برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔

"سنگھار بکس میں زیور پڑا ہے۔ لے جاؤ۔ ہمیں کچھ نہ کہو۔"

ایک ڈاکو نے دوسرے سے کہا۔

"ارے دھنیا! دیکھ بے بکسے میں زیور سونا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔"

دوسرے ڈاکو نے سنگھار بکس کو پکڑ کر الٹ دیا۔ اندر سے سونے کے کچھ زیورات نکلے۔

"ارے کیشو رام بڑا زیور ہے رے۔"

اور وہ سونے کے زیوروں کو اپنی صدری کی جیب میں ٹھونسنے لگا۔ دوسرے ڈاکو نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا اور بولا۔

"بندھیلا کا سٹیشن آ رہا ہے۔"

پہلا ڈاکو بولا۔

"گاڑی ہولے ہوگی تو کود جائیں گے۔"

انہوں نے جیب سے رسی نکال کر لڑکے اور لڑکی کے ہاتھ پاؤں باندھے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے ناگن درگا کے سر کے قریب منہ لے کر سرگوشی میں کہا۔

"انہیں چھوڑنا نہیں چاہیے۔"

ناگن درگا نے ہلکی سی پھنکار کی آواز کے ساتھ سرگوشی میں کہا۔

"یہ خونی لوگ ہیں۔ میں ادھر والے کو پکڑتی ہوں۔"

چلتی گاڑی کے شور میں ہماری آوازیں سننا ناممکن تھا۔ دونوں ڈاکو اب بیڑیاں پی رہے تھے اور زیوروں کو نکال کر دیکھ رہے تھے۔ ایک نے بلا اور اس کے خاوند کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ابے سالو! یہ نقلی تو نہیں ہیں؟"

وحشت زدہ نوجوان نے عاجزی سے کہا۔

"اصلی ہیں۔ ہم کو معاف کر دو۔ یہ زیور میری ماتا جی کے ہیں۔"

ڈاکو نے اسے گالی دی اور بولا۔

"ہم معاف نہیں کیا کرتے۔ تیرے بھاگ اچھے ہیں کہ زیور نکل آیا۔ نہیں تو تیری لونڈیا کو اٹھا کر لے جاتے۔"

دونوں ڈاکو سامنے والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ جہاں بے چاری لڑکی بملا سمٹ کر بیٹھی خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ناگن درگا کسی طرح دوسری سیٹ کے نیچے پہنچ چکی تھی۔ وہ تیزی سے رینگتی ہوئی ایک ڈاکو کی ٹانگ کے پاس آئی اور اس نے لپک کر اس کے پنڈلی پر ڈس دیا۔ ناگن درگا کا زہر مجھ سے زیادہ ہلاکت خیز ثابت ہوا۔ ڈاکو آگے کو لڑھک کر گر گیا۔ دوسرے ڈاکو نے بندوق ایک طرف رکھ کر گھبراہٹ میں اسے سنبھالنے کی کوشش کی تو اس دوران ناگن درگا نے دوسرے ڈاکو کو بھی ڈس دیا۔ وہ بھی پہلے ڈاکو کے اوپر ڈھیر ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر لڑکی بملا اور لڑکا راکیش کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ گاڑی شور مچاتی بھاگی جا رہی تھی۔

لڑکے نے اپنے حواس کو ٹھیک کیا اور بملا سے کہا۔

"ان کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔"

بملا رونے لگی۔

"ہے رام! ہے رام!"

لڑکے نے کہا۔

"رام نے تو ہماری سائیتا کر دی ہے بملا۔ کسی طرح میرے ہاتھ پاؤں کھول دو میں زنجیر کھینچوں گا۔"

بملا بولی۔

"میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں، کیا کروں؟"

راکیش بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ کوئی سٹیشن آ رہا ہے۔ شاید گاڑی کھڑی ہو جائے۔ پھر شور مچا کر گارڈ کو بلائیں گے۔"

ناگن درگا ابھی تک سامنے والی سیٹ کے نیچے ہی تھی۔ دونوں ڈاکوؤں کی لاشیں ایک دوسری کے اوپر درمیان میں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔ بندوقیں پاس ہی گری ہوئی تھیں۔ ٹرین کی سپیڈ کم ہونے لگی۔ پھر ٹرین رک گئی۔ یہ فرسٹ کلاس کا کوپے تھا۔ کوئی اس طرف نہ آیا۔ سٹیشن بھی غیر اہم تھا۔ باہر سے مسافروں کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ لڑکے نے شور مچانا شروع کر دیا۔ وہ بار بار گارڈ کو آواز دیتا تھا۔ پھر اس نے اپنا کندھا کھڑکی کے شیشے پر ٹکرانا شروع کر دیا۔ لیکن شیشہ نہ ٹوٹ سکا۔ اتنے میں پلیٹ فارم کی جانب سے کسی نے شیشے میں سے جھانک کر اندھر دیکھا۔ نوجوان لڑکے نے زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ اس کے بعد ایک گارڈ دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

"مائی گاڈ! کیا ہوا سر؟"

لڑکے راکیش نے جلدی جلدی گارڈ کو بتایا کہ دو ڈاکو اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے بندوقیں دکھا کر ہمارے زیور لوٹے۔ پھر انہیں دل کا دورہ پڑا اور گر گئے۔ گارڈ نے جلدی سے دونوں کی رسیاں کھولیں اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سر! میں پولیس کو بلاتا ہوں۔ لاشوں کو ہاتھ نہ لگائیں۔ میں پولیس کو بلاتا ہوں۔"

پولیس شاید ٹرین کے ساتھ ہی تھی۔ گارڈ فوراً پولیس کے تین سپاہیوں کو لے کر آ گیا۔ انہوں نے لاشوں کو دیکھا۔ ایک سپاہی نے پوچھا۔

"انہیں کس نے مارا ہے؟"

لڑکے نے کہا۔

"یہ تو ہمیں مارنے آئے تھے۔ ہم انہیں کیسے مار سکتے تھے؟"

دوسرے سنتری نے کہا۔

"لاشیں اسی جگہ رہیں گی، آگے دولت آباد کا سٹیشن آ رہا ہے۔ وہاں آپ لوگوں

ہمارے ساتھ ریلوے پولیس ہیڈ کوارٹر چلنا ہوگا۔ آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

جب نوجوان نے انہیں بتایا کہ بلا مدھیہ پردیش کے کسی وزیر گردھاری لال کی بھانجی ہے تو تینوں سنتریوں کے لہجے بدل گئے۔ پہلے والا سنتری بولا۔

"آپ چنتا نہ کریں جی۔ ہم سب ٹھیک کر لیں گے۔ یہ دونوں تو بڑے خونی ڈاکو تھے۔ اچھا ہوا کہ دل کا دورہ پڑا اور مر گئے۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

نوجوان لڑکے نے کہا۔

"بھوپال جا رہے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" سنتری بولا۔ "آپ کو ہم تکلیف نہیں دے سکتے۔ ضرورت پڑی تو آپ کے پاس خود بھوپال پہنچ جائیں گے۔ اپنا پتہ نوٹ کروا دیں۔"

نوجوان نے انہیں اپنا بھوپال کا پتہ لکھوا دیا۔ تینوں سنتری لاشوں کے پاس بیٹھ گئے۔ گارڈ باہر نکل گیا۔ گاڑی وہاں سے روانہ ہوگئی۔ ناگن درگا ابھی تک سامنے والی سیٹ کے نیچے ہی تھی۔ میں اسے ایک طرف چھپ کر بیٹھے دیکھ رہا تھا۔ گاڑی کے شور میں سنتری نوجوان راکیش سے اس علاقے کے ڈاکوؤں کے بارے میں اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ٹرین دولت آباد کے سٹیشن پر ٹھہر گئی۔ اس وقت ایک سنتری ڈبے سے اتر گیا اور اپنے ساتھ دو اور سنتری لے آیا۔ انہوں نے مل کر دونوں ڈاکوؤں کی لاشوں کو گھسیٹ کر ڈبے سے باہر ڈال دیا۔ ایک سنتری گارڈ کے ساتھ ڈبے میں آیا۔ گارڈ نے کہا۔

"آپ کے زیور وغیرہ تو محفوظ ہیں ناں سر!"

اس دوران نوجوان لڑکے نے سارے زیور ڈاکو کی جیب سے نکال کر سنگھار بکس میں سنبھال لیے تھے۔ اس نے کہا۔

"جی ہاں! سارے زیورے ہمارے پاس محفوظ ہیں۔"

گارڈ نے ایک پرچہ نوجوان کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

"پلیز! یہاں دستخط کر دیں کہ آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ باقی کام ریلوے پولیس

خود کرے گی۔"

نوجوان راکیش نے کاغذ کو ہاتھ میں لے کر پڑھا اور پھر اس پر دستخط کر کے گارڈ کو واپس کر دیا۔ ہم اس سارے ڈرامے کو بڑے سکون کے ساتھ اپنی اپنی طرف سیٹ کے نیچے بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ سٹیشن ماسٹر بھی ڈبے میں ایک ٹی ٹی کے ساتھ آیا۔ نوجوان راکیش سے کچھ باتیں پوچھیں اور انہیں تسلی دے کر اور ایک کاغذ پر دستخط کروا کر چلا گیا۔ خدا خدا کر کے یہ کاروائی ختم ہوگئی۔ گارڈ نے سیٹی بجائی۔ انجن نے وسل دیا اور ٹرین دولت آباد کے سٹیشن سے چل پڑی۔

نوجوان لڑکا اپنی بیوی کی سیٹ پر آ گیا تھا اور اس کو تسلیاں دے رہا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بھگوان کی بڑی کرپا ہوئی کہ ہم ڈاکوؤں سے بچ گئے۔ لڑکی ابھی تک دہشت زدہ تھی۔ ناگن درگا سامنے والی سیٹ سے نکل کر میرے پاس آ گئی تھی۔ گاڑی کے شور میں ہم ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں تھوڑی تھوڑی بات کر لیتے تھے۔ سٹیشن آتے رہے' گزرتے رہے۔ دن نکل آیا۔ اس کے بعد ایک بہت بڑا ریلوے سٹیشن آیا۔ وہاں گاڑی دیر تک کھڑی رہی۔ لڑکے نے ناشتہ منگوا لیا تھا۔ دونوں میاں بیوی ناشتہ کرتے رہے۔ ہم سیٹ کے نیچے خاموش بیٹھے رہے۔ یہاں سے گاڑی چلی تو جنگلوں' دریاؤں' میدانوں میں سے گزرتی چلی گئی۔ کافی دیر تک گاڑی چلتی رہی۔ اس نے تین چار چھوٹے چھوٹے سٹیشن بھی چھوڑے۔ میں نے ناگن درگا سے پوچھا۔

"تمہیں کوئی اندازہ ہے کہ بھوپال یہاں سے کتنی دور ہوگا؟"

اس نے آہستہ سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں بھوپال پہنچنے والے ہیں۔"

آخر بھوپال آ گیا۔

ٹرین زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ پلیٹ فارم میں داخل ہونے کے بعد رک گئی۔ نوجوان جوڑا ڈبے سے اتر گیا۔ ناگن درگا نے کہا۔

"یہاں گاڑی کافی دیر رکتی ہے۔ ذرا لوگوں کا رش کم ہوگا تو ہم پچھلی طرف سے

ہو کر سٹیشن سے باہر نکلنے کی کوشش کریں گے۔"

میں نے فضا کو سونگھا تو مجھے سب سے پہلے اپنی بیوی جمیلہ کی خوشبو آئی۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں جمیلہ کے پاس بیٹھا ہوں۔ میں نے بے اختیار ہو کر ناگن درگا سے کہا۔

"درگا! مجھے اپنی بیوی جمیلہ کی خوشبو آ رہی ہے۔"

ناگن درگا نے آہستہ سے کہا۔

"یہ بڑی خوشی کی بات ہے کرم داد!"

اس کے بعد ناگن درگا نے کوئی بات نہ کی۔ جب باہر پلیٹ فارم پر لوگوں کا شور ذرا کم ہوا تو وہ بولی۔

"ہم ریل کی لائن کی طرف سے باہر نکلیں گے۔"

ہم سیٹ کے نیچے سے نکل آئے۔ ڈبہ خالی تھا۔ ایک طرف پلیٹ فارم تھا دوسری طرف ریل کی پٹڑی تھی اور لوہے کے جنگلے کی دیوار تھی۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ہم ڈبے کی دیوار کے ساتھ لگ کر نیچے گاڑی کے پہیے پر سے ہوتے ہوئے ریلوے ٹریک پر آ گئے اور ریل کی پٹڑی کے بالکل ساتھ لگ کر پیچھے کی طرف تیزی سے رینگنے لگے۔ ناگن درگا مجھ سے زیادہ اس شہر سے واقف تھی۔ وہ میرے آگے آگے بڑی تیز تیز جا رہی تھی۔ ایک جگہ پر آ کر سامنے والے پلیٹ فارم کی دیوار ختم ہو گئی۔ ہم پٹڑی چھوڑ کر اس طرف رینگنے لگے جدھر ریلوے سٹیشن کا یارڈ تھا اور لائنوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف سے انجن کے شنٹ کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے ذرا آگے ہو کر ناگن درگا سے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کس طرف جا رہی ہو؟"

اس نے تیزی سے رینگتے ہوئے کہا۔

"تم میرے پیچھے پیچھے آتے جاؤ۔"

بھوپال کا ریلوے یارڈ کافی بڑا تھا۔ ہمیں اس کو پار کرتے کافی وقت لگ گیا۔ اس

اس دوران ایک اور ٹرین دلی کی طرف سے آئی اور سٹیشن میں داخل ہوگئی۔ ہم سگنل کیبن کے پاس آ گئے۔ یہاں دو تین جھاڑیاں تھیں۔ ناگن درگا ایک جھاڑی میں گھس گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے جھاڑی میں آگیا۔ وہ کہنے لگی۔

”سامنے مال گودام کی دیوار ہے۔ ہم اس دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف جائیں گے۔ اس طرف زیادہ لوگ نہیں ہوتے۔ دوسری طرف ایک گندا نالہ بہتا ہے۔ ہم نالے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھیں گے۔“

یہ کہہ کر ناگن درگا جھاڑی سے نکلی اور تیزی کے ساتھ مال گودام کی دیوار پر چڑھ گئی۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ دیوار کی دوسری طرف گندا نالہ بہہ رہا تھا۔ ہم نیچے اتر کر اس کے کنارے سے ذرا نیچے ہو کر آگے کو چل پڑے۔ آگے نالے کے دو پل آئے۔ ایک جگہ نالہ بائیں جانب مڑتا تھا۔ ناگن درگا وہاں سے باہر نکل آئی۔ سامنے ریلوے پل تھا۔ ناگن درگا کہنے لگی۔

”اب مجھے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں کہاں جانا ہے اور تمہاری بیوی بھوپال کے کس محلے میں رہتی ہے۔“

تب مجھے خیال آیا کہ مجھے ناگن درگا کو کمانڈو منظر خالد کے خفیہ ٹھکانے کے بارے میں نہیں بتانا چاہیے۔ وہ بھوپال کے سرفروش مجاہدوں کی خفیہ کمین گاہ ہے جو بھارت میں مسلمانوں کے جائز حقوق کے لیے ہندو حکومت کے ظلم و ستم کے خلاف جہاد کر رہے ہیں اور بھوپال کی پولیس ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ کل کو ناگن درگا انسانی شکل میں آ گئی اور میں اس سے الگ ہوگیا تو ممکن ہے وہ کسی کو اس خفیہ ٹھکانے کے بارے میں بتا دے اور پولیس چھاپہ مار کر بھوپال کے ان گمنام مجاہدوں کو گرفتار کر لے۔ میں نے سوچ لیا کہ میں اسے کسی جگہ پر بیٹھنے کو کہہ کر اکیلا ہی کمانڈو خالد کے ٹھکانے پر جاتا ہوں۔ مجھے سٹیشن سے اس ٹیلے تک کا راستہ معلوم تھا جس کے دامن میں کمانڈو خالد کی خفیہ کمین گاہ تھی۔ میں نے یہ سوچنے کے بعد ناگن درگا سے کہا۔

”مجھے جگہ پوری طرح سے یاد نہیں ہے۔“

وہ بولی۔

"تمہیں اپنی بیوی کی خوشبو آ رہی ہے نا؟"

میں نے فوراً" جھوٹ بول دیا اور کہا۔

"پہلے آتی تھی اب بالکل نہیں آتی مگر میں کوشش کر کے اس مکان تک پہنچ سکتا ہوں۔"

ناگن درگا بولی۔

"اس طرح تو ہم کسی نہ کسی جگہ پھنس جائیں گے۔"

میں نے فوراً" کہا۔

"پھر ایسا کرتے ہیں کہ تم کسی جگہ بیٹھ کر کچھ دیر میرا انتظار کرو میں اکیلا اپنی بیوی کے مکان پر جاتا ہوں۔ اگر وہ وہاں مجھے مل گئی تو میں تمہیں بھی آ کر لے جاؤں گا۔ اگر راستے میں لوگوں نے مجھے دیکھ کر مار ڈالنے کی کوشش کی تو میں اکیلا کسی نہ کسی طرف نکل کر اپنی جان بچا لوں گا۔ تم بھی میرے ساتھ ہوئیں تو ہمیں اپنی اپنی جان کے ساتھ ایک دوسرے کی فکر بھی پڑ جائے گی۔"

ناگن درگا بھی مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور تھی۔ میرے بغیر وہ اپنی عورت کی انسانی شکل میں واپس نہیں آ سکتی تھی۔ کہنے لگی۔

"ٹھیک ہے کرم داد! آگے پل کے پار بھیروں جی کا مندر ہے۔ میں وہاں تالاب کے پیچھے جھاڑیوں میں تمہارا انتظار کروں گی۔ آؤ میرے ساتھ۔"

ہم اوپر کی طرف جانے کی بجائے ریلوے پل کے نیچے سے ہو کر سڑک کی دوسری طرف آ گئے۔ سڑک پر زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ ہم جلدی سے سڑک پار کر گئے۔ اب ہم ایک چھوٹے سے میدان میں اگی ہوئی جھاڑیوں اور گھاس میں سے گزر رہے تھے۔ ناگن درگا نے مجھے دور سے درختوں کے درمیان ایک مندر کا تکونی مینار دکھایا۔ کہنے لگی۔

"وہ بھیروں جی کا مندر ہے۔ اس کے پیچھے ایک تالاب ہے۔ میں تمہیں وہیں

جھاڑیوں میں ملوں گی۔ ویسے بھی میری خوشبو تمہیں مجھ تک پہنچا دے گی مگر زیادہ دیر نہ لگانا۔"

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میں جلدی واپس آ جاؤں گا۔"

اس کے بعد ناگن درگا مندر کی طرف چل دی اور میں وہاں سے نکل کر ایک بڑی سڑک کی طرف چل دیا جس کو میں پہچانتا تھا۔ اس سڑک کے دوسرے چوک سے مجھے ایک نشیب میں اتر جانا تھا۔ جہاں سے وہ ٹیلا صاف دکھائی دیتا تھا جس کے اندر مجاہدوں کی خفیہ کمین گاہ تھی۔ مجھے کمانڈو خالد کی بو بھی اسی طرف سے آ رہی تھی۔ مجھے یہ بھی تسلی تھی کہ اگر میں راستہ بھول گیا تو کمانڈو خالد کی بو میری راہ نمائی کرے گی۔ میں میدان میں ایک طرف کو چل پڑا۔ آگے لڑکے گیند بلا کھیل رہے تھے۔ میں فوراً دوسری طرف ہوگیا۔ بدقسمتی سے ایک لڑکے کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ یہ بارہ بارہ' چودہ چودہ سال کے لڑکے تھے۔ انہوں نے سانپ سانپ کا شور مچا دیا اور مجھے مارنے کے لیے میری طرف دوڑے۔ میں نے اپنی سپیڈ تیز کر دی۔ ایک بار رک کر پھنکار مار کر انہیں ڈرایا۔ لڑکے جلدی سے پیچھے کی طرف بھاگے۔ جب میں آگے کو دوڑا تو دوبارہ شور مچاتے میرے پیچھے لگ گئے۔

ان کا سانپ سانپ کا شور سن کر ادھر ادھر سے کچھ اور لوگ بھی آ گئے اور وہ بھی مجھ پر پتھر پھینکنے لگے۔ میرے اردگرد پتھر گر رہے تھے۔ موت کا سخت خطرہ تھا۔ میں گھبرا کر اس طرف نکل گیا جدھر سڑک تھی۔ لوگ مجھ پر پتھر اینٹیں پھینکتے برابر میرے پیچھے آ رہے تھے۔ سامنے ایک سفید رنگ کی ویگن کھڑی تھی جس پر صلیب کا سرخ نشان بنا ہوا تھا۔ یہ ایمبولینس کی گاڑی تھی۔ میں جلدی سے اس گاڑی کے نیچے گھس گیا اور اس کے پہیئے کے اوپر سے گزر کر ایمبولینس کی اگلی چھوٹی سی کھڑکی میں سے ویگن کے اندر آ گیا۔ ویگن میں اندھیرا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ویگن میں ایک تابوت پڑا تھا جس کا ڈھکنا ایک طرف سے ہٹا ہوا تھا۔ مجھے ہر حالت میں اپنی جان بچانی تھی مجھے

اور کچھ نہ سوجھا میں تابوت کے اندر داخل ہوگیا۔ تابوت میں کسی کی لاش پڑی تھی۔
مجھے اپنی جان کی پڑی تھی۔ لاش مجھے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا سکتی تھی۔ میں تیزی سے لاش کے نیچے گھس گیا۔ باہر لوگ کھڑے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ سانپ اسی طرف گیا تھا۔ وہ ضرور ویگن میں گھس گیا ہے۔ اتنے میں مجھے ویگن کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ کسی نے کہا۔

"جناب ویگن میں ابھی ابھی ایک سانپ گھس گیا ہے۔"

کسی دوسرے شخص نے جواب دیا۔

"ویگن چاروں طرف سے بند ہوتی ہے۔ اس کے اندر سانپ کہاں سے آئے گا۔ جاؤ دوسری جگہ اسے تلاش کرو۔"

مجھے اطمینان ہوگیا۔ اس کے بعد ویگن میں دو تین آدمیوں کے چڑھنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ میں لاش کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ لاش کے تابوت کو ہسپتال سے مرنے والے کے گھر لے جا رہے ہیں۔ میں راستے میں یا مرحوم کے گھر پہنچ کر موقع پاتے ہی تابوت سے نکل کر فرار ہو جاؤں گا۔

مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ قدرت میرے ساتھ کس قدر عجیب و غریب کھیل کھیلنے والی ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے تابوت کا ڈھکنا بند کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہتھوڑی سے کیل ٹھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں گھبرا گیا۔ اگر تابوت کو کیل ٹھونک کر بند کر دیا گیا تو میں تابوت سے باہر نہیں نکل سکوں گا۔ جب تک کہ وہ قبر کے اندر لاش کے ساتھ گل سڑ کر مٹی نہیں ہو جاتا۔ میں لکڑی کی دیوار میں سوراخ کر کے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ میں گھبرا کر لاش کے نیچے سے نکل آیا۔ تابوت پر ڈھکنا چڑھا ہوا تھا اور تابوت میں ہتھوڑی کی ضربوں سے دھمک پیدا ہو رہی تھی۔

یقین کریں اس وقت ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میں ایک ایسے ڈبے میں ایک مردے کے ساتھ بند کر دیا گیا تھا جہاں سے میرا فرار ہونا ناممکن تھا۔ تابوت بند کرنے کے بعد آدمی باہر نکل گئے۔ ایمبولینس کا دروازہ بند ہوگیا

اور ویگن سٹارٹ ہو کر تیزی سے کسی طرف روانہ ہوگئی۔ اس گھبراہٹ میں مجھے خیال آیا کہ انسانی آواز میں شور مچا کر باہر نکل سکتا ہوں لیکن خدا جانے یہ میری گھبراہٹ کی وجہ تھی یا تابوت کے اندر لاش پر لگائی گئی تیز دواؤں کا اثر تھا کہ میری آواز حلق میں بند ہو کر رہ گئی۔ میں نے ایک دو بار آواز نکالی لیکن وہ ایسے نکلی جیسے میں ہچکی لے رہا ہوں۔ پھر یہ ہچکی بھی بند ہوگئی اور میری قوت گویائی ایک بار پھر جاتی رہی۔ لاش پر ہسپتال والوں نے ایسی تیز دوائیں لگائی ہوئی تھیں کہ ان کی وجہ سے میرا سر چکرانے لگا تھا۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا اور کوشش کے بعد حلق سے آواز کی بجائے خرخر کی آواز نکلتی تھی۔

بے اختیار میرے دل نے کہا۔

"اے خدا! میرے گناہ معاف فرما دے۔ مجھ پر رحم فرما اور مجھے اس نئے عذاب سے چھٹکارا دلا۔"

لیکن اس نئے عذاب نے آگے چل کر میرے ساتھ بہت کچھ کرنا تھا۔ میرے ساتھ ایسے ایسے واقعات پیش آنے والے تھے کہ جن کے بارے میں میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ایمبولینس بڑی تیز رفتاری سے بھاگتی جا رہی تھی۔ مجھے لاش کی تیز دواؤں کی وجہ سے اب نہ کمانڈو خالد کی بو آ رہی تھی اور نہ اپنی بیوی جمیلہ کے جسم کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ لاش پر لگی ہوئی تیز دواؤں سے میرے حواس بھی جواب دینے لگے تھے۔ تابوت میں گھپ اندھیرا تھا۔ اگر میں سانپ نہ ہوتا تو مجھے کچھ نظر نہ آتا۔ لیکن میں سانپ ہونے کی وجہ سے اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا۔ میں ابھی تک تابوت کی دیوار سے چمٹا ہوا تھا۔ میں نیچے لاش پر اتر آیا۔

میں نے لاش کو غور سے دیکھا۔

یہ لاش کسی گوری چٹی سرخ بالوں والی لڑکی کی لاش تھی جو انگریزی لڑکی لگتی تھی۔ اس نے دلہنوں والا سفید ریشمی لباس پہنا ہوا تھا۔ سر کے بال سفید ریشمی فیتے سے بندھے ہوئے تھے۔ دونوں نازک ہاتھ سینے پر بندھے تھے۔ ناخنوں پر نیل پالش لگا

ہوا تھا۔ کانوں میں سفید موتیوں کے بندے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاید اس انگریز لڑکی کا بیاہ ہو رہا تھا کہ دل کا دورہ پڑنے سے مر گئی اور اسے دلہنوں والے لباس میں ہی دفنایا جا رہا تھا۔ میں اس کے سینے سے اتر کر اس کے پہلو میں خاموش ہو کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ قسمت نے میرے ساتھ جو مذاق کیا ہے اس کا کیا انجام ہو گا۔ لاش پر ڈالی گئی تیز دواؤں کے اثر سے مجھ پر غنودگی یا بے ہوشی سی طاری ہونا شروع ہو گئی تھی۔ میں تابوت سے نکل کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ میرے ہوش و حواس جواب دیتے گئے اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں۔ میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا۔ کتنا وقت گزر گیا میں تو تابوت میں لاش کے ساتھ لاش کی طرح بند تھا۔ ہوش آباد آیا تو انجن کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ پہلے میں نے یہی خیال کیا کہ یہ ایمبولینس کی گاڑی کے انجن کی آوز ہے۔ مگر پھر خیال آیا کہ یہ آواز موٹر کے انجن کی آواز سے مختلف ہے۔ میں نے غور کیا تو یہ آواز ہلکی ہلکی گونج کی طرح تھی جس میں کسی وقت سیٹی کی سی آواز بھی آتی تھی اور تابوت کسی وقت اوپر نیچے بھی ہو جاتا تھا اور اسے ہلکے ہلکے جھٹکے بھی لگتے تھے۔ اچانک ایک خیال آیا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کہیں میں کسی ہوائی جہاز میں تو نہیں ہوں؟

میرے خدایا! اگر میں کسی ہوائی جہاز میں ہوں تو خدا جانے یہ جہاز مجھے کہاں کس شہر میں پہنچا دے گا۔ تابوت کے دائیں بائیں ڈولنے اور ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں ہوائی جہاز میں ہی ہوں اور یہ لاش ہوائی جہاز کے ذریعے مرحومہ کے لواحقین کے پاس پہنچائی جا رہی ہے جہاں اسے دفن کیا جائے گا۔ تابوت میں سردی بھی بہت ہو گئی تھی۔ لاش جہاز کی کسی ائرکنڈیشنڈ جگہ پر رکھی گئی تھی۔ اب مجھے یہ دیکھنا تھا کہ یہ جہاز ہندوستان کے کس شہر میں جا کر اترتا ہے۔ کتنا وقت گزر گیا اور جہاز کب سے پرواز کر رہا ہے اس کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ لاش کی دوائیوں کی بو نے ایک بار مجھے بے ہوش کرنے کے بعد اپنا عادی بنا لیا تھا۔ اب مجھے ان کی تیز بو کچھ نہیں کہتی تھی۔ لیکن میری آواز ابھی تک خرخر کی طرح سے نکلتی تھی۔ میں نے ایک

دو بار اپنے آپ کو کرم داد کرم داد کہہ کر پکارنا چاہا لیکن میرے حلق سے خرخراہٹ ایسی آواز ہی نکلی۔ خدا جانے یہ کس قسم کی تیز دوائیاں تھیں کہ جو لاش کو کچھ عرصے تک محفوظ کرنے کے واسطے لگائی گئی تھیں لیکن انہوں نے میری آواز بند کر دی تھی۔ اتنا اطمینان مجھے ضرور تھا کہ جیسے ہی میں تابوت سے باہر آیا میری آواز بحال ہو جائے گی۔

جہاز مسلسل پرواز کر رہا تھا۔ اپنی آرمی سروس میں کمانڈو ٹریننگ کے دوران ہمیں ہوائی جہاز میں بٹھا کر کافی بلند پر لے جایا جاتا تھا اور پھر وہاں سے ہم پیرا شوٹوں کے ساتھ چھلانگ لگایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی میں نے ڈھاکہ میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں لاہور سے ڈھاکہ تک کئی بار سفر کیا تھا۔ جہاز میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کے انجن کی آواز اور ڈولنے سے فوراً سمجھ گیا تھا کہ میں جیٹ ہوائی جہاز میں ہوں۔ جہاز ایک ہی رفتار پر ایک ہی آواز کے ساتھ مسلسل چلا جا رہا تھا۔ پھر ایسے محسوس ہوا کہ جہاز نے ایک چکر لگایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نیچے کی طرف اترنا شروع کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب کوئی شہر آ گیا ہے۔ لیکن میں اپنی مرضی سے نہیں اتر سکتا تھا۔ مجھے تو وہیں اترنا تھا جہاں لاش والے تابوت کو اتارا جانا تھا۔ میں تو لاش کے ساتھ نتھی کر دیا گیا تھا۔

جہاز کے پہیئے کھلنے کی زبردست گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ پھر اس کے پچھلے پہیوں کے رن وے پر ٹکرانے کی آواز آئی اور جہاز کی رفتار کم ہونے لگی۔ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ یا خدا یہ تابوت اسی شہر میں اتارا جائے۔ ایک بار جہاز تابوت سے اتر جائے اس کے بعد میں اس میں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر لوں گا۔ ایک ہلکی سی امید میرے دل میں باقی تھی کہ ہو سکتا ہے تابوت جو عارضی طور پر بند کیا گیا ہو اور جب یہ تابوت لاش کے لواحقین تک پہنچے تو وہ مرحومہ کے آخری دیدار کے لیے اس کو دوبارہ کھولیں یا ہو سکتا ہے اسے کسی دوسرے تابوت میں منتقل کیا جائے کیونکہ یہ تابوت لکڑی کے کھوکھے کی طرح تھا۔ میں نے گرجا گھر میں ایک بار جو تابوت دیکھا تھا

اس کے اندر مخمل لگی ہوئی تھی۔ جبکہ اس تابوت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی بالکل سادہ لکڑی کا تابوت تھا۔ بس جہاں یہ تابوت کھولا جائے گا میں تیزی سے نکل کر بھاگ جاؤں گا۔

جہاز رک گیا تھا معلوم نہیں یہ کس شہر کا ہوائی اڈہ تھا۔ تابوت کارگو کے حصے میں تھا۔ یہاں تک لوگوں کی آوازیں بھی بڑی مدہم مدہم آ رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ تابوت کو یہاں اتار لیا جائے گا مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی اور جہاز ایک بار پھر وہاں سے بھی پرواز کر گیا۔ یا خدا! میں کہاں جا رہا ہوں مجھے لڑکی کی لاش کے ساتھ کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ لاش کا جسم بھی ٹھنڈا تھا۔ سانپ زیادہ سردی برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے بھی سردی زیادہ لگنے لگی تھی۔ میں لڑکی کی لاش کے نیچے گھس گیا۔ لڑکی کے کپڑے بھی ٹھنڈے تھے لیکن پھر بھی وہاں تھوڑا سکون محسوس ہوا۔ جہاز ایک بار پھر خاص بلندی پر آکر اپنے طے شدہ راستے پر مقررہ رفتار کے ساتھ محو پرواز تھا۔ کسی وقت خیال آیا کہ کہیں یہ لاش ہندوستان سے باہر کسی ملک میں تو نہیں لے جائی جا رہی۔ پھر سوچتا کہ نہیں انڈیا کافی بڑا ملک ہے اس کے شہروں کا فاصلہ بھی بہت زیادہ ہے۔ ہو سکتا ہے انگریز لڑکی کی یہ لاش بھوپال سے مدراس لے جائی جا رہی ہو جو بھوپال سے کافی دور ہے اور ہوائی جہاز میں چار پانچ گھنٹے ضرور لگ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے راستے میں جہاز ناگ پور رکا ہو۔ بس اسی طرح میں اپنے آپ کو تسلیاں دے رہا تھا اور جہاز ایسے پرواز کر رہا تھا جیسے وہ اب کہیں بھی نہیں رکے گا۔

ایک بار پھر جہاز نے جیسے ایک چکر کاٹا اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ آہستہ آہستہ نیچے ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی ائرپورٹ آگیا ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ ہندوستان کا ائرپورٹ ہی ہے یا کسی دوسرے ملک یعنی سری لنکا کا ائرپورٹ ہے۔ جہاز کے پہیئے کھلنے کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد جہاز زمین سے لگ کر دوڑنے لگا۔ مجھے صرف ایک بار کا ڈر تھا کہ کہیں جہاز یہاں سے بھی آگے پرواز نہ کر جائے۔ ابھی تک تو مجھے یہی امید تھی کہ جہاز ہندوستان کے ملک میں

ہی ہوگا۔ اگر یہاں سے بھی پرواز کر جاتا ہے تو یقینی بات تھی کہ جہاز کسی دوسرے ملک میں جا رہا ہے۔ جہاز رک گیا تھا۔ باہر سے لوگوں کی اور گاڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جب کافی دیر گزر گئی تو میں سمجھ گیا کہ جہاز کی منزل یہی ائرپورٹ ہے۔ پھر مجھے دروازہ کھلنے اور آدمیوں کے اندر آنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے کان ان کی آوازوں پر لگا دیے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کس زبان میں بات کر رہے ہیں۔ یہ سن کر مجھے انتہائی خوشی ہوئی کہ وہ کسی ہندوستانی زبان میں ہی بات کر رہے تھے۔ یہ مجھے تامل زبان لگتی تھی۔ ڈھاکہ میں ایک مدراسی ایجنٹ مال خریدنے کلکتہ سے آیا کرتا تھا۔ وہ یہی زبان بولتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جنوبی ہند کے تامل ناڈو صوبے میں تامل زبان بولی جاتی ہے۔

یہ بات میرے لیے بڑے سکون کا باعث تھی کہ میں بھارت میں ہی تھا۔ اگر یہ جہاز مجھے کسی دوسرے ملک لے جاتا تو میرے لیے مشکل حالات پیدا ہو سکتے تھے اور میرا وہاں سے واپس بھوپال اپنی بیوی جمیلہ کے پاس آنا تقریباً" ناممکن تھا۔ جہاں تابوت پڑا تھا وہاں سے سامان باہر نکالے جانے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر ائرپورٹ کے پورٹروں نے میرے تابوت کو بھی اٹھایا اور وہاں سے لے جانے لگے۔ پھر ایسا لگا جیسے تابوت ایک گاڑی میں رکھ دیا گیا ہے۔ مجھے ایک آدمی کے انگریزی میں باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں زیادہ نہیں لیکن تھوڑی بہت انگریزی سمجھ لیتا تھا۔ وہ کسی کو صبر کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کسی عورت کے سسکیاں بھرنے کی آواز آئی۔ یہ مرنے والی انگریز لڑکی کے ماں باپ ہی ہو سکتے تھے جو ائرپورٹ پر لاش کا تابوت وصول کرنے آئے تھے۔ گاڑی کا دروازہ بند ہوگیا اور وہ چل پڑی۔ میں تابوت کے اندر انگریزی لڑکی کی لاش کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ دوائیوں کی تیز بو لاش سے اسی طرح اٹھ رہی تھی۔ اگرچہ یہ تیز بو میں اب برداشت کرنے لگا تھا لیکن میرا گلا خشک ہوچکا تھا او میری آواز بالکل نہیں نکلتی تھی۔ اگر نکلتی تھی تو خرخراہٹ ایسی آواز نکلتی تھی۔ میر اپنی آواز میں ایک لفظ بھی بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

تابوت والی گاڑی دیر تک چلتی رہی۔ تابوت میں اب وہ جہاز والی سردی نہیں رہی تھی۔ بلکہ ہلکی ہلکی گرمی ہوگئی تھی۔ اس گرمائش نے میرے سانپ والے جسم کی توانائی کافی بحال کر دی تھی۔ اب مجھے یہ خطرہ تھا کہ اس تابوت کو اسی طرح قبر میں دفن نہ کر دیا جائے۔ اگر لاش کے لواحقین نے ایسا کیا تو میں بھی لاش کے ساتھ زندہ درگور ہو جاؤں گا۔ اگر قبر میں تابوت سے باہر ہوتا تو میں مٹی میں سوراخ کر کے قبر سے باہر نکل سکتا تھا لیکن تابوت کی لکڑی کی دیواروں میں سوراخ کرنا میرے اختیار سے باہر تھا۔ اس بات کا امکان کم ہی نظر آتا تھا کہ تابوت کو کھولا جائے گا۔ یقین کریں اس وقت میں بھی ایک طرح سے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا اور دل میں خداوند کریم سے اپنی زندگی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ تابوت والی گاڑی مختلف سڑکوں کے موڑ گھومتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے تابوت کے اندر سمندر کی ہوا کی نمی کو محسوس کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ گاڑی ساحل سمندر کے قریب کسی طرف جا رہی ہے۔ پھر ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر گاڑی رک گئی۔

باہر سے لوگوں کی دھیمی آواز میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کسی نے تامل زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ پھر کسی نے انگریزی زبان میں کسی سے کہا۔

"شام ہو رہی ہے فادر۔ میت کو دوسرے تابوت میں رکھ دیا جائے۔"

یہ سنتا تھا کہ میری جان میں جان آ گئی۔ یہ میرے لئے تابوت سے نجات حاصل کرنے کا سنہری موقع تھا۔ چاہے لوگ مجھے مارنے کو دوڑیں لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جیسے ہی تابوت سے لاش نکال کر دوسرے تابوت میں رکھی جائے گی میں چھلانگ لگا کر بھاگ جاؤں گا۔ میرے بچنے کا صرف یہی ایک راستہ تھا۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ ایک بار تو لوگ سانپ کو دیکھ کر ادھر ادھر دوڑ پڑیں گے کیونکہ سانپ کی بڑی دہشت ہوتی ہے۔

پادری کے دھیمی زبان میں بائبل پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر میرے والے

تابوت کے کیل اکھاڑے جانے لگے۔ میں لاش کے نیچے ہوگیا۔ ایک طرف کے کیل اکھاڑنے کے بعد اس کے ڈھکن کو دوسری طرف کر دیا گیا۔ اس وقت مجھے باہر کی تازہ ہوا محسوس ہوئی۔ میں نے لاش کے نیچے سے ذرا سی گردن باہر نکال کر اوپر دیکھا۔ یہ کوئی گرجا گھر تھا۔ اس کی مخروطی چھت اونچی تھی۔ کچھ گورے مرد اور گوری عورتیں تابوت میں جھک کر لاش کو دیکھنے لگیں۔ ایک عورت سسکیاں بھر رہی تھی۔ باہر بجلی کے بلب کی روشنی تھی۔ میں رینگ کر لاش کے پاؤں کی طرف آگیا کیونکہ اس طرف کوئی عورت یا مرد نہیں تھا۔ پادری صاحب بلند آواز میں مناجات پڑھ رہے تھے اور لاش پر مقدس پانی چھڑکا جا رہا تھا۔

اب میرے لیے انتظار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں کسی قسم کی احتیاط کا خیال رکھے بغیر لاش کے درمیان سے نکلا اور تابوت کی دیوار پر جتنی تیزی سے رینگ سکتا تھا رینگ کر اچھل کر تابوت سے باہر جا گرا۔ وہاں سانپ سانپ کا شور مچ گیا۔ اس کے بعد مجھے پتہ نہیں کہ وہاں کیا ہوا اور لوگ کس طرف کو بھاگے۔ میرا منہ جس طرف کو اٹھا میں نے اسی طرف بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا۔ ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ میں دیوانہ وار اور پوری شدت اور پوری طاقت کے ساتھ رینگتا ہوا اس میں سے نکل گیا۔ سامنے ایک چھوٹا سا صحن تھا جہاں روشنی ہو رہی تھی صحن بغیر گھاس کے تھا۔ چکنے فرش پر میں زیادہ تیزی سے نہیں دوڑ سکا تھا لیکن مٹی کے صحن میں آتے ہی میری رفتار اور تیز ہوگئی۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگ میرے پیچھے پیچھے مجھے مارنے کے لیے نہیں دوڑے تھے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی۔ میں صحن میں سے نکل گیا۔ آگے جھاڑیوں کی دیوار تھی۔ میرے لیے یہ بہترین پناہ گاہ تھی۔ کیونکہ وہاں اندھیرا بھی تھا۔ میں جھاڑیوں میں گھس گیا اور دوسری طرف سے باہر آگیا۔ دوسری طرف ایک چھوٹی سی کچی سڑک تھی جس کی دونوں جانب ناریل کے درخت جھکے ہوئے تھے۔ یہ جنوبی ہند کا علاقہ ہی تھا۔ کیونکہ جنوبی بھارت کے شہروں میں ناریل کے درخت بہت ہوتے ہیں۔ میں سڑک پار کر گیا۔ اس کے آگے پھر ایک میدان تھا جس میں کافی گھاس اگا ہوا

تھا۔ چونکہ میں اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا اس لیے بے دریغ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ میں لوگوں کی دسترس سے باہر ہوگیا ہوں تو میں گھاس میں ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر تک تیز دوائیوں والے تابوت میں لاش کے ساتھ بند رہنے کے بعد تازہ ہوا نے مجھے پھر سے تازہ دم کر دیا تھا۔ مجھے اپنے قریب سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک موٹا چوہا ڈر کر ایک طرف کو بھاگا تھا۔ یونہی میں نے اسے ڈرانے کے لے پھنکار ماری تو مجھے احساس ہوا کہ میرے گلے کی خرخراہٹ دور ہو چکی ہے۔ میں نے فورا" حلق سے آواز نکالی اور کہا۔

"یا اللہ مدد!"

میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ جب میں نے اپنی انسانی آواز سنی۔ لاش پر لگائی گئی تیز دوائیوں کا اثر ختم ہوچکا تھا اور میری قوت گویائی یعنی بولنے کی طاقت پھر سے واپس آگئی تھی۔ مجھے اتنی خوشی ہوئی جیسے کسی فقیر کو اچانک کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ میں نے شوق میں آکر اپنے آپ سے باتیں شروع کر دیں۔

"کرم داد! خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ' وہی بخشنے والا مہربان ہے۔ تجھ سے بڑے گناہ ہوئے ہیں۔ یا اللہ میرے گناہ معاف فرما دے۔"

پھر جمیلہ سے تصور میں ہی باتیں کرنے لگا۔

"جمیلہ! تو مجھے معاف کر دینا۔ میری وجہ سے تجھے بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں۔ مجھے معاف کر دینا۔ انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب میں پھر تم سے آن ملوں گا۔ ہم دونوں پاکستان اپنے گھر واپس پہنچ جائیں گے اور داتا صاحب دیگ چڑھائیں گے اور پھر سے ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگیں گے۔"

اچانک مجھے خیال آیا کہ وہاں کوئی میری آواز سن نہ رہا ہو۔ گھاس اونچی تھی۔ میں نے پوری گردن اوپر اٹھا کر دیکھا۔ وہاں کوئی انسان نہیں تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ بھارت کا کون سا شہر ہے اور میں کس جگہ پر ہوں۔ میں تیزی سے گھاس کے میدان کو پار کر کے دوسری طرف آگیا۔ یہاں کھیت تھا جس کی مینڈھ پر ناریل اور تاڑ

کے درخت تھے۔ ان درختوں کے ستونوں جیسے تنوں کے درمیان میں سے دور کچھ
روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ میری دائیں جانب سے سمندر کی تیز ہوا آ رہی تھی۔
سانپ ہونے کی وجہ سے میں سمندر کی ہوا کی نمی فوراً محسوس کر سکتا تھا۔ اس ہوا
میں مچھلیوں کی بو بھی کسی وقت آ جاتی تھی۔

سمندر کی طرف جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میرا مقصد کسی طرح واپس بھوپال پہنچنا تھا۔ بھوپال ہی میرا اس وقت ٹارگٹ تھا۔
مجھے ناگن درگا کا بھی خیال آیا کہ وہ میرے جانے کے بعد بھیروں جی کے مندر میں میرا
انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوگی۔ رات ہوگئی ہے اب تک وہ وہاں کہاں بیٹھی ہوگی۔
وہ بھی سانپ کے روپ میں تھی۔ ہو سکتا ہے وہیں کسی جگہ چھپ کر میرا انتظار کرتی
رہے۔ لیکن ہم ایک دوسرے سے بچھڑ چکے تھے۔ میں کتنی بھی کوشش کرتا ہفتہ دس
دن سے پہلے میں بھوپال نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پہلے تو مجھے اس شہر کا ریلوے سٹیشن معلوم
کرنا تھا۔ پھر یہ معلوم کرنا تھا کہ یہاں سے بھوپال کی طرف کون سی گاڑی جاتی ہے۔ پھر
اس گاڑی میں سوار ہونے کی تگ و دو کرنی تھی۔ یہ بات ظاہر تھی کہ اتنی دور جنوبی
بھارت کے اس شہر سے کوئی بھی گاڑی سیدھی بھوپال نہیں جاتی ہوگی۔ خدا جانے
راستے میں کتنی بار گاڑی بدلنی پڑے۔

مجھے ناگن درگا پر بھی ترس آ رہا تھا۔ قسمت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ تقدیر
نے اسے میرے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ جب تک میں انسانی شکل میں واپس آ کر اس کا
ناگن والا منہ نہیں چوم لیتا وہ اپنی عورت کی شکل میں واپس نہیں آ سکتی تھی۔ اس کو
ہر حالت میں مجھے تلاش کرنا تھا اور میرے پاس پہنچنا تھا۔ اتنی دور سے ہمیں ایک
دوسرے کی بو بھی نہیں آ رہی تھی۔ خدا جانے دن نکلنے پر ناگن درگا کیا کرے، کس
طرف نکل جائے۔ میری تلاش میں کہاں کہاں ماری ماری پھرتی رہے۔ تقدیر نے ہمیں
ایک دوسرے سے عجیب حالات میں جدا کر دیا تھا۔ ہوائی جہاز تابوت کے ساتھ مجھے
بھارت کے جنوب میں کافی دور لے آیا تھا۔ یہاں مجھے نہ اپنے دوست کمانڈو خالد کی لا

آ رہی تھی' نہ جمیلہ کے جسم کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ سامنے دور جو روشنیاں دکھائی دے رہی ہیں ان کی طرف چلنا چاہیے اور معلوم کرنا چاہیے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی ریلوے سٹیشن ہی ہو اور مجھے اس شہر کا نام معلوم ہو جائے۔

میں نے کھیت کی مینڈھ پر روشنیوں کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ ایک کھیت کے بعد دوسرا کھیت آیا تو مجھے کسی سانپ کی بو آئی۔ میں وہیں رک گیا۔ اندھیرے میں ایک کافی موٹا تازہ سانپ کھیت میں سے نکل کر مینڈھ پر آ گیا۔ اس نے بھی میری موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ گزر جائے گا لیکن اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنا پھن کھول لیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے پھنکارنے لگا۔ میں نے بھی پھن کھول لیا۔ میرا پھن اس کی نسبت کافی چھوٹا تھا۔ کالے سانپ نے اتنی زور سے میری طرف جھک کر پھنکار ماری کہ مجھے اس کی پھنکار کی گرمی محسوس ہوئی۔ میں بھی جواب میں زور سے پھنکارا مگر سانپ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ آخر انسانی جبلت سے مجبور ہو کر میں نے انسانی آواز میں اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تو میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں انسان ہوں تو صرف سانپ ہے بھاگ جا یہاں سے۔"

کالے سانپ پر میری آواز کا عجیب اثر ہوا۔ میری انسانی آواز سنتے ہی اس نے اپنا پھن سکیڑ لیا اور میرے اردگرد دائرے کی شکل میں چکر لگانے شروع کر دیے۔ میں پریشان ہو گیا میں نے اسے ایک بار پھر ڈانٹ کر کہا۔

"کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں دیوتا شو جی کا سانپ ہوں؟ دفع ہو جا' نہیں تو میں تجھے ایسی بد دعا دوں گا کہ تو زندہ بھی نہیں رہے گا اور مرے گا بھی نہیں۔"

یہ سنتے ہی سانپ نے میرے آگے اپنا سر جھکایا اور جلدی سے کھیت کی طرف بھاگ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری انسانی آواز سمجھ رہا تھا مگر میں اس کے پیچھے کیا کرنے جاتا۔ کیونکہ وہ خود تو انسانی آواز میں مجھ سے کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال

میری انسانی آواز واپس آ گئی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں سانپ سے واپس انسانی روپ میں آ گیا ہوں۔ اگرچہ میرا جسم اب بھی سانپ کا جسم تھا لیکن کم از کم میں انسان کی آواز میں بول تو سکتا تھا۔ اپنی آواز سن تو سکتا تھا۔ میں نے دور نظر آنے والی جھلملاتی روشنیوں کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔ کھیت ختم ہو گئے۔ پھر ایک چھوٹی سی تلیا آئی۔ میں اس سے بھی آگے نکل گیا۔ روشنیاں قریب آتی جا رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ ساتھ ساتھ بنے ہوئے تین چار کوارٹر ہیں۔ ذرا آگے گیا تو سمندر کی ایک کھاڑی دکھائی دی جہاں ایک سٹیمر کھڑا تھا۔ یہ روشنیاں اسی سٹیمر کی تھیں جنہیں میں کسی عمارت کی روشنیاں سمجھ رہا تھا۔ کھاڑی اسے کہتے ہیں جہاں سمندر کنارے کو کاٹ کر ایک بہت بڑے تالاب یا جھیل کی شکل میں اندر آ گیا ہوتا ہو۔

ایک طرف اندھیری رات میں سمندر بھی دیکھا جس میں کہیں کہیں ٹیلے سے ابھرے ہوئے تھے اور ان کے اوپر بھی روشنی ہو رہی تھی۔ یہ کوئی بندرگاہ لگتی تھی۔ میں کھاڑی کے کنارے کنارے رینگتا سٹیمر سے پانچ چھ سو گز کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ سٹیمر جہاں کھڑا تھا اس کے سامنے ایک اونچی جیٹی سی بنی ہوئی تھی۔ اتنی دور سے مجھے نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہاں کوئی مزدور یا پورٹر وغیرہ ہے یا نہیں۔ جیٹی کے ایک طرف تین چار کوارٹر تھے جہاں اندھیرا چھایا تھا۔ صرف ایک کونے والے کوارٹر میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہاں میرا کوئی کام نہیں تھا کیونکہ مجھے ریلوے سٹیشن کی تلاش تھی اور یہ کوئی گھاٹ تھا جہاں سے شاید مال بردار سٹیمر ساحل کی ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک جاتے ہوں گے۔ میں نے مایوسی کے عالم میں گردن اٹھا کر اپنی بائیں جانب دیکھا۔ ادھر کافی فاصلے پر جگہ جگہ روشنیوں کے نقطے روشن تھے۔ میں واقعی مایوس ہو گیا تھا۔ آدمی کی شکل میں ہوتا تو کسی سے سٹیشن کا راستہ بھی پوچھ سکتا تھا اور کسی جگہ سے کوئی سواری لے کر یا پیدل ہی چل کر اسٹیشن تک پہنچ سکتا تھا لیکن میں ایک چھوٹے سے سانپ کی شکل میں تھا اور میری رفتار بھی بہت سست تھی۔ مجھے راستوں کا بھی علم نہیں تھا۔

وہیں ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کس طرف جانا چاہیے اور یہ کس طرح معلوم کرنا چاہیے کہ یہ کون سا شہر ہے اور اس کا ریلوے سٹیشن کس طرف ہے۔ کیونکہ ریل گاڑی ہی مجھے بھوپال پہنچا سکتی تھی۔ کافی دیر تک میں سانپ کی شکل میں بیٹھا آدمی کے ذہن سے سوچتا رہا۔ سوچ سوچ کر آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کھاڑی میں جو سٹیمر کھڑا ہے اس میں کہیں چھپ جاتا ہوں۔ رات کو نہیں تو صبح یہ سٹیمر چل پڑے گا اور اس میں اس شہر کی کسی بندرگاہ پر پہنچ جاؤں گا۔ اس طرح شہر سے خدا جانے کتنے میل دور میں کب تک بیٹھا رہوں گا۔ صبح ہو گئی تو لوگ یہاں بھی مجھے مارنے کے لیے دوڑیں گے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں سٹیمر کی طرف چل پڑا۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ سٹیمر کافی بڑا تھا اور دو آدمی لکڑی کی مچان ایسی گودی پر کھڑے تھے۔ انہوں نے فوجی وردیاں پہنی ہوئی تھیں اور ہاتھوں میں سٹین گنیں تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ یا تو یہ انڈین نیوی کا سٹیمر ہے اور یا پھر اس میں فوجی سامان کسی دوسری بندرگاہ کو لے جایا جا رہا ہے۔ سٹیمر میں میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا تھا کیونکہ اتنے بڑے سٹیمر میں میرے چھپنے کے لیے کوئی بھی جگہ نکل سکتی تھی۔ سٹیمر کے دو ڈیک تھے۔ ایک اپر ڈیک تھا۔ ایک لوئر ڈیک تھا۔ دونوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ اپر ڈیک کا جنگلہ خالی تھا۔ لوئر ڈیک کے جنگلے کے ساتھ ایک آدمی کھڑا گودی میں کھڑے فوجیوں کو اپنی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ سٹیمر کے لوئر ڈیک سے گودی کی مچان تک ایک تختہ لگا دیا گیا تھا۔ دونوں فوجیوں میں سے ایک ڈیک کی طرف گیا۔ اس نے ایک کے جنگلے کے پاس کھڑے دوسرے آدمی سے کوئی بات کی اور دوڑ کر واپس آ گیا اور اپنے ساتھی فوجی سے کچھ کہا۔

وہ فوجی ایک طرف دوڑ کر گیا۔ میں نے غور سے دیکھا وہ سٹیمر کا رسہ کھول رہا تھا جو کسی جگہ بندھا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے صرف اس لیے دکھائی دے رہی تھی کہ میں سانپ ہونے کے ناطے اندھیرے میں بھی دیکھ لیتا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ سٹیمر کا رسہ کھولا جا رہا ہے تو میں تیزی سے رینگ کر لکڑی کے تختے کے نیچے ہو گیا اور تختے

کے اوپر جانے کی بجائے تختے کے نیچے رینگتا ہوا سٹیمر کے لوئر ڈیک کی دیوار کے ساتھ چمٹ گیا اور پھر پچھلی طرف چلا گیا۔ سٹیمر کی لوہے کی چادر والی دیوار زنگ آلود تھی۔ میں جلدی جلدی رینگتا ہوا سٹیمر کے عقب میں لوئر ڈیک کے جنگلے کے پاس آگیا اور میں نے گردن ذرا سی باہر نکال کر دیکھا۔

لوئر ڈیک کی گیلری یا راہ داری یہاں آ کر سٹیمر کی دوسری جانب مڑ گئی تھی۔ دونوں گیلریوں میں ہلکی روشنی تھی اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ اتنے میں سٹیمر کے انجن کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ سٹیمر کی دیوار جس کے ساتھ میں لگا ہوا تھا تھرتھرانے لگی۔ میں جنگلے کے درمیان سے ہو کر گیلری میں اتر گیا۔ جگہ جگہ لکڑی کے کھوکھوں اور بڑے بڑے بوروں اور لوہے کی پیٹیوں کی شکل میں سامان لدا ہوا تھا۔ میں وہیں سامان کے نیچے گھس کر بیٹھ گیا۔ سٹیمر کنارے سے آہستہ آہستہ ہٹ رہا تھا۔ پھر اس نے کھاڑی میں کسی طرف چلنا شروع کر دیا۔ میں لکڑی کے کریٹوں کے درمیان ایک جگہ سمٹ کر بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دیکھیں یہ سٹیمر بھارت کے کس دوسرے شہر کی بندرگاہ پر پہنچتا ہے یا اسی شہر کی کسی دوسری گودی پر جاتا ہے۔ مجھے لوئر ڈیک پر فوجی بوٹوں کی آواز آئی۔ میں غور سے سننے لگا۔ کوئی فوجی ان لکڑی کے کریٹوں کے پاس چل پھر کر جیسے پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ یہ فوجی سٹیمر تھا۔ رات کو اس پر پہرہ تو ہوتا ہی ہے۔ میں جہاں بیٹھا تھا وہاں لکڑی کے لمبوترے اور چوڑائی میں چھوٹے بکسے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ رسیوں کے ہینڈل لگے ہوئے تھے۔ یہ آفیسرز کریٹ تھے۔

میں آرمی میں رہ چکا تھا اور ان کریٹوں کو پہچانتا تھا۔ اس قسم کے اٹیچی کیس نما مگر ذرا لمبوترے لکڑی کے کریٹوں میں آفیسرز اپنی فائلیں اور ضروری کاغذات یا کتابیں وغیرہ لے کر ایک شہر سے دوسرے شہر جایا کرتے تھے۔ میں بیکار بیٹھا تھا۔ سوچا کوئی مصروفیت ہونی چاہیے۔ میں ایک کریٹ پر اوپر کی طرف رینگ کر گیا۔ وہاں رسی کے ہینڈل کے پاس ہی ایک سوراخ بنا ہوا تھا۔ شاید یہ کریک ہونے سے بن گیا تھا یا اندر ہوا

کے آنے جانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ میں نے سر سوراخ کے اندر ڈال کر دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے کتابیں اور فائلیں ایک دوسرے کے اوپر لگی ہوئی نظر آئیں۔ میں نیچے اتر آیا۔

ان کتابوں اور فائلوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس وقت ہنگامی حالات بھی نہیں تھے کہ میں سوراخ میں گھس کر چھپ جاتا۔ میں اپنی جگہ پر کریٹوں کے درمیان آرام سے بیٹھا رہا۔ سٹیمر ساری رات چلتا رہا۔ کسی کسی وقت اس کے وسل دینے کی آواز آ جاتی یا کبھی کبھی کوئی دوسرا سٹیمر کچھ فاصلے پر سے وسل دیتا ہوا گزر جاتا۔ اوپر والے ڈیک پر سے ملاحوں کے قہقہے لگانے کی آواز آ جاتی' پھر خاموشی چھا جاتی۔ رات گزر گئی دن کی روشنی ہو گئی۔ لکڑی کے کریٹوں کے درمیان سے دن کی روشنی مجھ تک بھی پہنچ رہی تھی۔ مجھے صرف اس صورت میں وہاں سے باہر نکلنا تھا جب سٹیمر کسی بندرگاہ پر جا کر رکتا۔ سٹیمر ابھی تک چل رہا تھا۔

پھر اس کی رفتار ایسا لگا ہلکی ہو گئی ہے۔

وہ ایک طرف کو گھوم رہا تھا۔ ڈیک پر ملاحوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ تامل یا تلیگو زبان میں ایک دوسرے کو کچھ کہہ سن رہے تھے۔ جو فوجی اس سامان کے آگے پہرہ دے رہا تھا اس کی جگہ رات کو ایک دوسرا آدمی آ گیا تھا اور وہ برابر ٹہل رہا تھا۔ لکڑی کے فرش پر اس کے بھاری بوٹوں کی ٹھک ٹھک صاف سنائی دے رہی تھی۔ سٹیمر کے انجن بند ہو گئے۔ وہ کسی بندرگاہ کی گودی سے جا کر لگ گیا تھا۔ گودی کی طرف سے بھی لوگوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ دوسرے سٹیمروں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی بڑی بندرگاہ ہے۔ میں کریٹوں سے باہر نکلنے کی ترکیب یا موقع دیکھ رہا تھا کہ بہت سے بھاری بوٹوں کی ٹھک ٹھک وہاں آ کر رک گئی۔ جہاں میں بکسوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ لگتا تھا چار پانچ فوجی وہاں آ گئے ہیں۔ اتنے میں کسی نے میرے آگے کا جو کریٹ تھا اس کو اپنی طرف گھسیٹا۔ میں گھبرا گیا کیونکہ کریٹ کے ہٹ جانے کی صورت میں میں انہیں نظر آ سکتا تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجا میں

تیزی سے آفیسرز کریٹ کے اوپر چڑھا اور سوراخ میں سے کریٹ کے اندر داخل ہوگیا۔
میں اگر ایک دو سیکنڈ کی دیر کر دیتا تو میرا مارا جانا یقینی تھا کیونکہ جیسے ہی میں آفیسرز کریٹ کے اندر گیا اس کریٹ کو گھسیٹ کر باہر نکال لیا گیا۔ پھر ایسے لگا جیسے کریٹ کو کسی لوڈر پر لادا گیا ہے۔ لوڈر سٹیمر کے ڈیک پر سے ہوتا ہوا لکڑی کے تختے کے ذریعے نیچے اتار دیا گیا۔ اب میں بندرگاہ کی جیٹی پر تھا۔ جیٹی کے فرش پر بھی لوڈر دیر تک کسی طرف چلتا رہا۔ دو فوجی جو لوڈر کو دھکیل رہے تھے تامل زبان میں ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ باہر کافی آوازیں تھیں۔ ان میں گاڑیوں کے ہارن کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں بھی تھیں۔ لوڈر ایک جگہ آ کر رک گیا۔ میں نے سوراخ کے پاس سر لا کر باہر دیکھنے کی کوشش کی اور فوراً" سر اندر کر لیا۔ کریٹ کے سوراخ کا رخ دونوں فوجیوں کی جانب تھا۔ وہ مجھے دیکھ سکتے تھے مگر خدا کا شکر ہے کہ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ اس سوراخ میں سے دن کی روشنی میں سانپ کی شکل نظر آ سکتی تھی۔ جب انہوں نے کریٹ کو لوڈر پر سے اتار کر زمین پر ڈالا تو میں نے سوراخ میں سے باہر دیکھا۔ میرے قریب ہی ایک فوجی ٹرک کھڑا تھا۔ کریٹ کو اٹھا کر ٹرک میں رکھ دیا گیا اس کے بعد دونوں فوجی بھی ٹرک میں بیٹھ گئے اور ٹرک کسی جانب روانہ ہوگیا۔





میں ایک بار پھر پھنس گیا تھا۔

آفیسرز کریٹ کے اندر فائیلوں' کتابوں اور کاغذات کے پلندوں کے درمیان میں سمٹ کر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ جہاں یہ فوجی ٹرک جا کر رکے وہاں کریٹ کے سوراخ میں سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے ایک بار پھر سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا۔ فوجی ٹرک میں بتی جل رہی تھی اور دونوں انڈین فوجی سپاہی میرے بالکل سامنے بیٹھے تھے۔ اس وقت باہر نکلنا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ ٹرک جنوبی ہندوستان کے اس ساحلی شہر کی سڑکوں پر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ کئی سڑکوں کے موڑ گھومتا ہوا فوجی ٹرک ایک طرف مڑا اور رک گیا۔ دونوں سپاہیوں نے جلدی سے کریٹ کو اٹھا کر ٹرک سے باہر نکالا اور ایک کمرے میں لے جا کر رکھ دیا۔ یہ کام انہوں نے اتنی جلدی کیا کہ مجھے راستے میں باہر نکلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ جس کمرے میں انہوں نے لکڑی کے آفیسرز کریٹ کو لے جا کر رکھا' میں نے سوراخ میں سے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ درمیان میں میز بچھی تھی۔ میز کے اوپر ایک بلب روشن تھا۔ دونوں انڈین سپاہی باہر جانے کی بجائے وہیں کریٹ کے پاس کھڑے رہے۔ میرے لیے باہر نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔

اتنا میں سمجھ گیا تھا کہ اس آفیسرز کریٹ میں کوئی اہم فوجی دستاویزات ہیں جن کی اتنی حفاظت کی جا رہی ہے۔ دو انڈین فوجی آفیسر کمرے میں داخل ہوئے۔ دونوں

سپاہیوں نے انہیں سیلوٹ کیا۔ میں سوراخ کے ساتھ آنکھیں لگائے دیکھ رہا تھا۔ دونوں انڈین فوجی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے اپنے بریف کیس میز پر رکھ دیے۔ کیپٹن یا میجر رینک کے لگتے تھے۔ دونوں جنوبی ہند کی کسی رجمنٹ کے آفیسرز تھے۔ رنگ گہرے سانولے تھے۔ ایک کی مونچھیں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک آفیسر نے سپاہیوں کی طرف دیکھ کر انگریزی میں کہا۔

"کریٹ میں سے بریف کیس نکالو۔"

"یس سر!"

جس کریٹ میں میں چھپا ہوا تھا وہ کھولا جانے والا تھا۔ میرے لیے یہ بڑی نازک گھڑی تھی۔ میں کریٹ کے اندر ہی رینگ کر کونے میں فائیلوں کے پیچھے چھپ گیا۔ کریٹ کا تالا کھول کر اس میں سے بریف کیس نکالا گیا۔ کریٹ دوبارہ بند کر دیا گیا۔ کریٹ کے بند ہوتے ہی میں جلدی سے رینگ کر سوراخ کے پاس آگیا میرے دل میں خیال پیدا ہوا تھا کہ دیکھنا چاہیے کہ اس بریف کیس میں کیا ہے۔ جس کی اتنی زیادہ حفاظت کی جا رہی تھی اور جس کی خاطر انڈین آرمی کے دو اعلیٰ آفیسر رات کے وقت یہاں آئے ہیں۔

بریف کیس ٹین کے ایک چوکور ڈبے میں بند تھا۔ ایک انڈین آفیسر نے چابی لگا کر ٹین کا بکس کھولا۔ اس میں سے بریف کیس نکالا اور دونوں سپاہیوں کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ دونوں انڈین سپاہی سیلوٹ مار کر کمرے سے نکل گئے۔ اب کمرے میں دونوں انڈین آرمی آفیسر اکیلے تھے یا میں تھا جو کریٹ کے سوراخ میں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ فوجی آفیسر نے کریٹ والے بریف کیس کو کھول کر اس میں سے سیاہ رنگ کی ایک فائیل نکالی اور اس کے کاغذات کو الٹنے پلٹنے لگا۔ دوسرا فوجی آفیسر فائیل کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے انگریزی میں کہا۔

"تمام کاغذات او کے ہوں گے۔"

دوسرے نے کہا۔ "یس کیپٹن' اٹ از او کے۔"

پہلے والا انڈین آفیسر کیپٹن رینک کا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگا لیا اور بولا۔

"میجر صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ ہمارا یہ خفیہ پراجیکٹ کامیاب ثابت ہوگا؟"

دوسرا فوجی آفیسر میجر رینک کا تھا۔ اس نے فائیل پر نظریں جما رکھی تھیں۔ کہنے لگا۔

"کیپٹن پانڈے! یہ پراجیکٹ نہ صرف پاکستانی سمندر میں ان کے سارے کے سارے بحری بیڑے کو تباہ و برباد کر دے گا بلکہ اس کی مار کراچی بندرگاہ تک بھی ہو سکتی ہے۔"

یہ سننا تھا کہ کریٹ کے سوراخ میں سے میں ان دونوں انڈین آرمی افسروں کو دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ یہ پاکستان کے خلاف کسی خفیہ آرمی منصوبے کی سیکریٹ فائل تھی۔ یہ پاکستانی بحریہ اور کراچی کی بندرگاہ پر زبردست تباہی پھیلانے کا پلان یا بلیو پرنٹ تھا۔ اب میرے وہاں سے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں ہر حالت میں بلکہ اپنی جان کی بازی لگا کر اس خفیہ منصوبے کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتیں سننے لگا۔ انڈین کیپٹن نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"سر! اگر دوارکا کی نیول رپورٹ سے ہم کراچی کی بندرگاہ پر اٹیک کر سکتے ہیں تو پھر ہم اس خفیہ پراجیکٹ کی مدد سے امرتسر سے لاہور پر بھی اٹیک کر سکتے ہیں۔"

انڈین میجر بولا۔

"اس بار ایسا ہی ہوگا۔ سن ۶۵ء میں پاک آرمی کا ڈیفنس ناقابل شکست تھا۔ ہمارے پاس بھی روائتی ہتھیار تھے لیکن اس بار حالات بدل چکے ہیں۔ ہمارے سائنس دانوں نے جو خفیہ ہتھیار ہمیں تیار کر کے دیا ہے اور جس کا ہم راجستھان کے صحرا میں تجربہ کر چکے ہیں' یہ پاک آرمی اور نیوی کے ڈیفنس کو پہلے ہی اٹیک میں تہس نہس کر کے رکھ دے گا۔ اس بار بھگوان نے چاہا تو ہم لاہور میں داخل ہو جائیں گے۔"

انڈین کیپٹن نے سگریٹ ایش ٹرے میں دبایا اور بولا۔

"سر! یہ فائیل اور خفیہ منصوبے کے بلیو پرنٹ کل شام تک دوارکا نیول ہیڈ کوارٹر میں پہنچ جانے چاہیں۔"

انڈین میجر نے فائیل میں سے کچھ چیزیں اپنی نوٹ بک میں درج کیں اور فائیل بند کر کے بریف کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ڈونٹ وری کیپٹن! آرمی کا ایک ڈیکوٹا صبح سات بجے دوارکا سے ہوتا ہوا بمبئی جارہاہے۔ یہ کریٹ اسی جہاز میں جائے گا۔"

انڈین میجر نے خفیہ پراجیکٹ فائیل والا بریف کیس ٹین کے ڈبے میں بند کر کے تالا لگایا اور سپاہیوں کو آواز دی۔ دونوں سپاہی تیز تیز چلتے اندر آ گئے۔ میجر نے انہیں آڈر دیا۔

"دیکھو جوان یہ کریٹ یہاں سے سیدھا آرمی ائرپورٹ پر جائے گا۔ تم لوگ اس کو گارڈ کرے گا۔"

دونوں سپاہیوں نے بیک آواز کہا۔

"ٹھیک ہے سر!"

"اس کو کریٹ میں ہمارے سامنے بند کرو۔"

سپاہیوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ٹین کے بکس کو کریٹ میں رکھ کر کریٹ بند کر کے تالا لگا دیا اور چابی انڈین میجر کے حوالے کر دی۔ میجر نے کہا۔

"تم اسے سیدھا آرمی ائرپورٹ پر لے جائے گا اور رات کو اس کی گارڈ ڈیوٹی پر رہے گا۔ ہم صبح ادھر آ کر اسے وصول کر لے گا۔"

"یس سر۔"

دونوں سپاہیوں نے سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔ دونوں انڈین آرمی آفیسرز کمرے سے نکل گئے۔ میرے وہاں سے نکل کر فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں ہر حالت میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ انڈین آرمی نے پاکستان کے خلاف ایسا کون سا خفیہ ہتھیار بنایا ہے جس کی مدد سے وہ کراچی اور لاہور پر قبضہ کرنے کا پلان تیار کر چکا

ہے۔ انڈین سپاہیوں نے ٹین کے بکس کو آفیسرز کریٹ میں رکھا اور اسے اٹھا کر باہر لائے۔ باہر فوجی ٹرک موجود تھا۔ کریٹ کو ٹرک میں رکھ دیا گیا اور ٹرک اس شہر کے فوجی ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔

ساری رات میں کریٹ میں چھپا رہا۔ کریٹ فوجی ائرپورٹ کے کسی کمرے میں رکھا گیا تھا۔ دونوں انڈین سپاہی رات بھر اس کے پاس موجود رہے۔ دوسرے دن وہی رات والے انڈین آرمی آفیسرز آ گئے۔ میں کریٹ کے سوراخ میں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے کریٹ کو باہر ہی سے چیک کیا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ کریٹ لوڈ کیا جائے۔ کریٹ کمرے سے باہر لایا گیا۔ اسے لوڈر پر رکھ کر دور کھڑے آرمی کے ایک ڈیکوٹا ہوائی جہاز کے پاس لے جایا گیا۔ وہاں بھی دو آرمی آفیسرز موجود تھے۔ انہوں نے اپنی نگرانی میں کریٹ کو جہاز میں رکھوا دیا گیا۔ جہاز تھوڑی دیر بعد ٹیک آف کر گیا۔ اس جہاز کی منزل دوارکا تھی جہاں جہاز نے پہلے اترنا تھا۔ میرے کریٹ کو دونوں انڈین آرمی افسروں یعنی کیپٹن پانڈے اور میجر نے اپنے پاس ہی رکھوایا تھا۔ یہ بھی کافی لمبی فلائیٹ تھی۔ آخر جہاز دوارکا کے آرمی ائرپورٹ پر اتر گیا۔ ائرپورٹ سے ایک فوجی جیپ کریٹ کو لے کر آرمی کے کسی گیریزن میں لے آئی۔ میں کسی کسی وقت کریٹ کے سوراخ میں سے باہر دیکھ لیتا تھا۔ یہاں فوجی دفتر تھے۔ فوجی گاڑیاں بھی ادھر ادھر کھڑی تھیں۔ کریٹ کو ایک کمرے میں لے جا کر رکھ دیا گیا۔ دونوں آرمی افسر کریٹ کے ساتھ تھے۔ کمرے میں پہلے سے ایک کرنل رینک کا انڈین آرمی افسر موجود تھا۔ دونوں آرمی افسروں نے اسے سیلوٹ کیا۔ کرنل کے کندھے کا فیتہ میں نے دور ہی سے دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ وہ کرنل رینک کا افسر تھا۔ اس نے سنہری فریم والا چشمہ لگا رکھا تھا۔ سر درمیان سے تھوڑا گنجہ تھا۔ رنگ اس کا بھی گہرا سانولا تھا۔ وہ سگار پی رہا تھا۔ اس نے انگریزی میں میجر سے کہا۔

”میجر گو کھلے! میں نے ہائی کمانڈ سے منظوری لے لی ہے۔ تم دونوں گن پوسٹ پر جا کر آج ہی سے لیزر پراجیکٹ پر کام شروع کر دو گے۔ تمہارے خیال میں تمہیں

لیزر گن کی فائنل چیکنگ میں کتنا وقت لگ جائے گا۔"

میجر گوکھلے نے کہا۔

"سر! یہ کام ایک ہفتے کا ہے لیکن ہم اسے جلدی سے جلدی ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔"

انڈین کرنل نے سگار کا ہلکا سا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"میجر! ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کشمیر میں ہماری فوج بری طرح مر رہی ہے۔ ہماری ساری فوجی قوت اس لیزر گن پر ڈپینڈ کرتی ہے۔ سن پینسٹھ کی جنگ میں پاکستان کی نیوی نے ہماری دوارکا گن پوسٹوں کو تباہ کردیا تھا۔ ہماری نیوی کو بری طرح شکست ہوئی تھی مگر اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ ہم اگلے مہینے پاکستان پر اٹیک کرنا چاہتے ہیں اور اس بار ہم سمندر کی طرف سے اٹیک کریں گے اور ہماری یہ لیزر گن ہمارے نیول ٹروپس کے لیے کراچی کی بندرگاہ صاف کردے گی۔"

کیپٹن پانڈے نے کہا۔

"سر! ہم ایک ہفتے سے پہلے اپنا کام ختم کرلیں گے۔ آپ اطمینان رکھیں۔"

"اوکے۔"

انڈین کرنل چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میجر گوکھلے نے کیپٹن سے کہا۔

"کیپٹن! سیکرٹ فائیل نکال لاؤ۔ میرا خیال ہے ہمیں اسی جگہ بیٹھ کر کام شروع کر دینا چاہیے۔"

انڈین کیپٹن کریٹ کی طرف بڑھا تو میں جلدی سے سوراخ سے ہٹ کر کریٹ کی دوسری طرف فائیلوں اور کتابوں کے پیچھے چھپ گیا۔ جب کیپٹن کریٹ میں سے سیکرٹ فائیل نکال کر لے گیا تو میں واپس سوراخ کے پاس آ کر انہیں دیکھنے لگا۔ اس دفعہ کیپٹن نے ٹین کا بکس کریٹ میں ہی رہنے دیا تھا۔ وہ اس میں سے سیکرٹ فائیل نکال کر لے گیا تھا۔ فائیل کھول کر دونوں اس کے کاغذات کی جانچ پڑتال کرنے لگے۔ ان میں ایک بلیو پرنٹ بھی تھا۔ بلیو پرنٹ کو انہوں نے میز پر پھیلا دیا اور اس پر جھک کر

جگہ جگہ پنسل سے نشان لگانے لگے۔ وہ آپس میں انگریزی میں باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ بھارتی ہائی کمان نے اسرائیل کی فوجی ٹیکنیکل مدد سے ایک ایسی لیزر گن تیار کرلی ہے جس کی مار دوار کا سے کراچی تک ہے اور جو اپنی شعاعوں سے کھلے سمندروں میں پاکستانی جہازوں پر حملہ کر سکتی ہے اور کراچی بندرگاہ پر بھی تباہی مچا سکتی ہے۔

مجھے تو محض اتفاق سے انڈین ملٹری کے پاکستان کے خلاف ایک بڑے خطرناک خفیہ منصوبے کا سراغ مل گیا تھا۔ میں نے اسی وقت دل میں طے کر لیا تھا کہ مجھ سے جیسے اور جس طرح سے بھی ہو سکا میں اس پاکستان دشمن منصوبے کو خاک میں ملانے کی کوشش کروں گا۔ یہ میرا قومی فرض بھی بن گیا تھا۔ افسوس صرف یہ تھا کہ میں انسانی شکل میں نہیں تھا۔ پھر خیال آیا کہ اگر میں سانپ کی شکل میں نہ ہوتا تو اس خفیہ منصوبے کا مجھے کبھی پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ میرا سانپ کا روپ ہی میری مدد کا بہت بڑا سبب بن گیا تھا۔ لیکن اس منصوبے کو تباہ کرنے کے لیے کمانڈو اٹیک کی ضرورت تھی اور اس کے لیے نہ صرف مجھے اپنے ساتھیوں کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون کی ضرورت تھی بلکہ میرا واپس انسانی شکل میں آنا بھی ضروری تھا۔

میں اکیلا سانپ بن کر انڈین آرمی کے اتنے خطرناک اور اہم فوجی منصوبے کو تباہ نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں آرمی افسر دیر تک بلیو پرنٹ کا معائنہ کرتے اور نشانات لگاتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد میجر گوکھلے نے کمر سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

"کیپٹن پانڈے! اس وقت کافی پینے کو جی چاہتا ہے۔"

کیپٹن پانڈے نے کہا۔

"سر! یہاں تو ہم کافی نہیں منگوا سکتے' یہ تو ٹاپ سیکرٹ روم ہے۔"

میجر نے پنسل میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"آؤ میس میں چل کر پیتے ہیں۔ یہ کاغذات اس طرح میز پر رہنے دو۔ ہم باہر سے لاک کر جائیں گے دروازے کو۔ ہمیں دس پندرہ منٹ ہی لگیں گے۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

اور وہ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ مجھے دروازہ لاک کرنے کی آواز آئی۔ اس کے فوراً بعد میں کریٹ کے سوراخ میں سے نکل کر فرش پر رینگتا ہوا میز کے اوپر آگیا۔ میرے سامنے بھارتی ملٹری کے خطرناک ہتھیار لیزر گن کا بلیو پرنٹ کھلا پڑا تھا۔ سابق آرمی کمانڈو ہونے کی وجہ سے میں کچھ کچھ اس قسم کے پرنٹ سمجھ لیتا تھا۔ میں نے پرنٹ کے نشانات اور آڑھے ترچھے زاویوں کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ ڈی کے اے لکھا تھا' اس کا مطلب دوارکا ہی ہو سکتا تھا۔ اس جگہ ایسے نشان بنے ہوئے تھے جو پہاڑیوں کے نشان ہو سکتے تھے۔ ایک جانب سمندر دکھایا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ لیزر گن دوارکا کے سمندری ساحل کی کسی پہاڑی میں لگائی گئی تھی۔ میں نے یہ سارے خفیہ نشانات اور اشارے اپنی یاد داشت میں محفوظ کر لیے۔ بلیو پرنٹ کو بار بار دیکھا۔ اس کی بعض ڈگریاں بھی جو میری سمجھ میں آئیں اپنے انسانی ذہن میں محفوظ کر لیں۔ میں نے دیوار پر لگے کلاک پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت دن کے سوا بارہ بج رہے تھے۔ میں وہاں سے اب فرار ہونا چاہتا تھا۔ مجھے پاکستان کے خلاف بھارتی فوج کے ایک خطرناک ترین منصوبے کا راز مل گیا تھا۔ میں وہاں سے نکل کر کسی نہ کسی طرح جلدی سے جلدی بھوپال پہنچ کر کمانڈو خالد کو اس خطرناک پاکستان دشمن منصوبے کی ساری تفصیلات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ میری دو مجبوریاں تھیں۔ سانپ ہونے کی وجہ سے میں دن کی روشنی میں وہاں سے باہر نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ دوسری مجبوری یہ تھی کہ میں سانپ کی روپ میں تھا اور میرے لیے اس حالت میں بھوپال پہنچنا اتنا آسان نہیں تھا۔ مجھے یہ تو معلوم ہوچکا تھا کہ میں دوارکا میں آرمی کے ہیڈ کوارٹر یا اس کے کسی گریزن میں ہوں۔ وہاں سے مجھے ٹرین کے ذریعے پہلے بمبئی اور اس کے بعد بھوپال پہنچنا تھا۔ یہ کام پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنے کے برابر تھا۔ مگر مجھے ہر حالت میں یہ پہاڑ کاٹنا تھا۔

دروازے کا تالا باہر سے کوئی کھول رہا تھا۔

میں میز پر سے چھلانگ لگا کر فرش پر آیا اور تیزی سے کریٹ کے سوراخ میں گھس گیا۔ دونوں انڈین آرمی افسر کافی پی کر واپس آ گئے تھے۔ میں سوراخ کے ساتھ لگ کر بیٹھا اپنے ذہن میں بلیوپرنٹ کے اشاروں اور ڈگریوں کے نشانات کو دہراتے ہوئے پختہ کر رہا تھا تاکہ وقت آنے پر مجھے سب کچھ یاد رہے۔ کچھ دیر کے بعد دونوں افسروں نے بھی اپنا کام ختم کر لیا اور فائیل کو بند کر کے کریٹ میں رکھ کر کریٹ کو تالا لگا دیا۔ میجر گوکھلے نے کہا۔

"یہاں سے ہم گن پوسٹ پر جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے سر!" کیپٹن پانڈے بولا۔

دونوں سیکرٹ روم سے نکل گئے۔ انہوں نے باہر سے دوبارہ تالا لگا دیا تھا۔ میں کریٹ سے نکل آیا اور کمرے کا جائزہ لیا کہ وہاں باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہے یا نہیں۔ میں چھوٹا سا سانپ تھا مجھے باہر نکلنے کے لیے چھوٹا سا سوراخ ہی کافی تھا۔ دیوار کے اوپر چھت کے قریب ایک چھوٹا سا روشندان تھا جس پر آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے دیوار پر چڑھ کر روشندان کی سلاخوں میں سے جھانک کر باہر دیکھا۔ سامنے فوجی دفتروں کی دو منزلہ عمارت تھی۔ دو چار فوجی گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ ملٹری پولیس کا ایک جوان عمارت کے باہر گارڈ ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ ادھر ادھر انڈین فوجی چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ میں دن کے وقت نہیں نکل سکتا تھا۔ مجھے شام ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ میں روشندان سے نیچے اتر آیا اور کریٹ کے اندر جانے کی بجائے اس کے پیچھے چھپ گیا۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں' سانپ بن کر مجھے بہت سے نئے تجربے ہوئے تھے۔ ایک تجربہ یہ بھی تھا کہ سانپ کبھی بور نہیں ہوتا۔ وہ کئی کئی گھنٹے چھپ کر بڑے آرام سے انتظار کر سکتا ہے۔ میں بور تو نہیں ہو رہا تھا مگر مجھے بے چینی ضرور لگی تھی کیونکہ میں وقت ضائع کیے بغیر بھوپال روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ بھوپال جانے کی اہم ترین مہم میرے سامنے تھی۔ یہ ایک مہم ہی تھی۔ جس طرح ایڈمنڈ ہلیری کے سامنے ماؤنٹ ایورسٹ فتح کرنے کی مہم تھی۔ تعجب کی بات تھی کہ اتنی مدت گزر جانے کے

باوجود میں ابھی تک سانپ ہی کے روپ میں تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس دوران اپنی انسانی شکل میں واپس نہیں آیا تھا۔

قدرت میرے ساتھ عجیب و غریب مذاق کر رہی تھی۔

مجھے شام کا اندھیرا ہونے تک اسی کمرے میں رہنا تھا۔ میں اسی کمرے میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دیوار پر لگے کلاک کو اور روشندان میں سے آنے والی دن کی روشنی کو دیکھ لیتا تھا۔ آخر وہ وقت بھی آگیا جب روشندان پر دن کی روشنی ماند پڑتے پڑتے شام کے اندھیرے میں تبدیل ہوگئی۔ میں فوراً" دیوار پر رینگتا روشندان پر پہنچا۔ سلاخوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ سامنے والی فوجی عمارت میں روشنی ہو رہی تھی مگر میرے کمرے والی دیوار اندھیرے میں تھی۔ میں نیچے اتر گیا اور ایک جانب جھاڑیوں میں آکر گردن نکال کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ فوجی ہیڈکوارٹر تھا۔ کچھ فاصلے پر اونچی دیوار تھی جس پر خاردار تار لگی تھی۔ اس طرف سے باہر نکلنے میں ہی عافیت تھی۔ چنانچہ میں اندھیرے میں رہ کر رینگتے رینگتے دیوار تک آیا۔ دیوار پر چڑھ کر خاردار تاروں کے نیچے سے گزر کر دیوار کی طرف آگیا۔ دوسری طرف نشیب میں کھائی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے سٹیشن پر کس طرح پہنچنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا مرحلہ تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سٹیشن کس طرف ہے۔ میرے پاس ادھر ادھر بھٹکنے کے لیے وقت بھی نہیں تھا۔ میرے انسانی ذہن پر مایوسی بھی چھانے لگی تھی۔ کسی وقت خیال آتا کہ میں شاید بھوپال نہ پہنچ سکوں۔

لیکن جب یہ خیال آتا کہ دشمن میرے وطن پاکستان کو نقصان پہنچانے کا منصوبہ بنا چکا ہے تو میرے اندر نئی طاقت آ جاتی۔ میں نے دور سے نظر آنے والی روشنوں کو اپنا ٹارگٹ بنایا اور اللہ کا نام لے کر کھائی پار کی اور روشنیوں کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایک چھوٹی سڑک بڑی مشکل سے گاڑیوں سے بچ کر اور لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہ کر پار کی۔ یہ سارا علاقہ اونچا نیچا تھا۔ زمین پتھریلی تھی۔ کہیں کہیں کھیت بھی تھے اور دائیں بائیں ناریل اور تاڑ کے درخت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ مگر ریلوے سگنل کی

ہری یا لال بتی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ صرف یہی ایک نشان مجھے ریلوے سٹیشن تک پہنچا سکتا تھا۔ میں اللہ پر توکل رکھ کر رینگتا چلا جا رہا تھا۔

میرا خیال ہے کہ میں بمشکل ایک ڈیڑھ سو گز دور گیا ہوں گا کہ میرے جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے شروع ہوگئے۔ میں وہیں رک گیا۔ اللہ کا مجھ پر بہت بڑا کرم ہونے والا تھا۔ میں سانپ کے روپ سے اپنی انسانی شکل میں واپس آنے والا تھا۔ یہ عمل شروع ہوگیا تھا۔ میں بے حد خوش تھا اور خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ یہ جھٹکے اب رکیں نہیں۔ لگتے ہی چلے جائیں۔ پندرہ بیس سیکنڈ کے بعد وہی ہونے لگا جو اس سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ یعنی مجھے اپنے جسم کا احساس ہونا شروع ہوگیا۔ ایسے لگا جیسے مجھ پر کسی نے بوجھ سا ڈال دیا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر ایک جھٹکا لگا۔ یہ آخری جھٹکا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں سانپ سے اپنی انسانی شکل میں واپس آ چکا تھا۔ میرا لباس وہی تھا جو کمانڈو خالد سے بچھڑتے وقت میں نے پہنا ہوا تھا۔ یہ ہندوانہ لباس تھا۔ یعنی کھدر کا کرتہ اور پاجامہ۔ پاؤں میں پرانی چپل تھی۔ میں نے جلدی سے کرتے کی جیب ٹٹولی۔ اس میں سے پندرہ روپے نکل آئے لیکن یہ میرے کسی کام کے نہیں تھے۔ کیونکہ دوارکا سے بمبئی اور پھر وہاں سے بھوپال تک میں بذریعہ ریل گاڑی اتنے کم پیسوں میں نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے یہی سوچا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کروں گا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

انسان کے روپ میں آنے کے بعد سب سے پہلا فرق یہ پڑا تھا کہ میں اندھیرے میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دوسرے مجھے اب کمانڈو خالد اور جمیلہ کی بو بھی نہیں آ سکتی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کلمہ شریف پڑھ کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو مجھے احساس ہوا کہ میری شیو کافی بڑھ آئی ہے۔ میں ایک نئے عزم کے ساتھ دور نظر آنے والی روشنیوں کی طرف چل پڑا۔ اب میں اس پوزیشن میں تھا کہ اچھی طرح دیکھ بھال کر راستے کو روشنیوں کی طرف نکال سکوں۔ جلد ہی مجھے ایک سڑک مل گئی۔ پھر ایک موٹر گاڑی کی آواز بھی آئی۔ ابھی رات کا پہلا پہر تھا۔ پیچھے سے ایک گاڑی آ رہی

تھی۔ میں نے ہاتھ دے دیا۔ اس خیال سے کہ شاید رک جائے۔ گاڑی رک گئی۔ یہ ایک پرانی سی کار تھی۔ ایک بوڑھا گجراتی اسے چلا رہا تھا۔ اس نے گجراتی میں مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں نے سٹیشن کا نام لیا۔ اس نے اشارہ کیا کہ اندر آ جاؤ۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ ہندوستانی میں بولا۔

"تم گجراتی ناہیں؟"

میں نے کہا۔

"ناہیں ہم پنجابی' امرتسر کا ہے۔ رام پرشاد نام ہے۔"

وہ بولا۔

"سٹیشن پر جائے گا؟"

میں نے کہا۔

"دلی جائے گا۔ دلی والا گاڑی کب جاتا ہے؟"

وہ بولا۔

"مالوم نہیں۔ ہم تمہیں سٹیشن پر چھوڑ دے گا۔"

اس نے مجھے سٹیشن پر چھوڑ دیا۔ وہاں کافی رونق تھی۔ انسانی روپ میں آنے کے بعد اب ایک بار پھر میرے سر پر پولیس اور سی آئی ڈی کا خطرہ منڈلانے لگا۔ لیکن میں جس مشن پر جا رہا تھا اس کی اہمیت اس خطرے کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ کافی پوچھ گچھ کے بعد پتہ چلا کہ بھوپال کو وہاں سے کوئی گاڑی سیدھی نہیں جاتی۔ پہلے بمبئی جانا پڑے گا۔ وہاں سے پھر بھوپال والی گاڑی ملے گی۔ میرے پاس کرائے کے پیسے نہیں تھے۔ میں بغیر ٹکٹ کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ساری رات ٹرین چلتی رہی۔ رات ہونے کی وجہ سے کوئی ٹکٹ چیکر نہ آیا۔ صبح بمبئی پہنچ گیا۔ یہاں سے جنتا ایکسپریس میں بھی بغیر ٹکٹ کے بیٹھ گیا اور بھوپال کی جانب روانہ ہوگیا۔ راستے میں جہاں ٹکٹ چیکر کے آنے کا خطرہ ہوتا۔ وہاں ٹرین سے اتر کر کسی دوسرے ڈبے میں بیٹھ جاتا۔ اسی طرح سارا دن گزر گیا۔

رات آ گئی۔ رات کے پہلے پہر ٹرین بھوپال کے سٹیشن میں داخل ہو گئی۔ میں نے فضا کو سونگھا۔ مجھے جمیلہ اور ناگن ورگا اور کمانڈو خالد میں سے کسی کی بو محسوس نہ ہوئی۔ اگر میں سانپ ہوتا تو یہ بو ضرور آتی۔ میں مین گیٹ کی بجائے لائینوں لائن چل کر سٹیشن سے دور نکل آیا۔ راستے کا مجھے علم تھا۔ پندرہ روپوں میں سے چھ روپے میرے پاس باقی رہ گئے تھے۔ میں نے ایک رکشے والے کو چھ روپے دیئے اور کمانڈو خالد کی کمین گاہ والے علاقے میں آ کر ایک جگہ اتر گیا۔ وہاں سے پیدل کمین گاہ کے ٹیلے تک گیا۔ گڑھے میں سے ہو کر غار میں جانے لگا تو مجھے دو مجاہدوں نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ جب مجھے پہچانا تو ایک مجاہد مجھے اندر لے گیا۔ کمانڈو خالد مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گلے لگ کر ملا۔ میں نے سب سے پہلے جمیلہ کا پوچھا۔ کہنے لگا۔

"وہ بے چاری تو بس صبر شکر کر کے بیٹھی ہوئی ہے۔ تمہارا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ابھی ہمارے ساتھ ہوتے ہو۔ ابھی غائب ہو جاتے ہو۔"

میں نے پوچھا۔

"یہاں تم نے آس پاس یا اس حجرے میں کسی سانپ کو تو نہیں دیکھا؟"

میرا خیال تھا کہ شاید ناگن درگا اس طرف آئی ہو۔ خالد بولا۔

"کیوں کیا بات ہے؟ کیا کوئی اور بھی آدمی سانپ کی جون میں ادھر آیا ہوا ہے؟"

میں نے اسے مختصراً" ناگن درگا کے بارے میں اور پھر اپنی کہانی سنائی اور کہا۔

"ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے کمانڈو۔ انڈین آرمی کی لیزر گن دوارکا کی ساحلی پہاڑیوں میں کسی جگہ ڈیپلائے کر دی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے دو گنیں ہوں۔ جیسا کہ میں نے بھارتی فوجی افسروں کو باتیں کرتے سنا ہے اس توپ کی مار کراچی تک ہے اور تم خوب جانتے ہو کہ لیزر گن کیا تباہی مچا سکتی ہے۔"

کمانڈو خالد بڑے غور سے میری بات سن رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"بلیو پرنٹ والے نقشے میں اس گن پوسٹ کی کوئی خاص جگہ نہیں دکھائی گئی تھی؟ دوارکا کی ساحلی پہاڑیاں تو کاٹھیا وار سے لے کر آگے بہت دور تک چلی گئی

ہیں۔"

میں نے اسے بلیوپرنٹ پر دیکھے ہوئے اور اپنی یادداشت میں محفوظ کیے ہوئے سارے نشانات بتائے اور کہا۔

"جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ یہ لیزر گن پوسٹ دوارکا کے شمال مشرق میں سب سے اونچی پہاڑی پر ہے۔ کیا تم اس علاقے میں کبھی گئے ہو؟"

کمانڈو خالد بولا۔

"وہ سارا علاقہ میرا دیکھا ہوا ہے لیکن یہ یاد نہیں کہ دوارکا کے ساحل پر سب سے اونچی پہاڑی کون سی ہے؟"

میں نے کہا۔

"یہ تو وہاں چل کر معلوم ہو جائے گا لیکن ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں انڈیا کب ساحل کی طرف سے کراچی پر حملہ کر دے۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"ایسا بھی کوئی اندھیر نہیں مچ گیا۔ آخر پاکستان کی ملٹری انٹیلی جینس بھی غافل نہیں بیٹھی ہوگی۔ تم فکر نہ کرو۔ یہ پاکستان کی بقا کے ساتھ ساتھ ہم بھارت کے مسلمانوں کی بقا کا بھی مسئلہ ہے۔ ہم دوارکا کی لیزر گن پوسٹ کو ضرور تباہ کریں گے خواہ اس کے لیے ہمیں اپنی جانیں کیوں نہ قربان کرنی پڑیں۔"

میں نے کہا۔

"تمہارے خیال میں ہمیں اپنے ساتھ کتنے کمانڈو لے جانے ہوں گے۔"

کمانڈو خالد نے ایک لمحے سوچ کر جواب دیا۔

"اس مشن کے لیے زیادہ کمانڈوز کی ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم کمانڈو ہارون کو ساتھ لے چلیں گے۔ وہ گجراتی کے ساتھ ساتھ تامل زبان بھی سمجھ اور بول لیتا ہے۔"

"ہمیں اسلحہ کی بھی ضرورت ہوگی۔" میں نے کہا۔

کمانڈو خالد بولا۔

"ہم یہاں سے زیادہ اسلحہ اپنے ساتھ لے کر وہاں نہیں جا سکے۔ یہ کسی جنگل کا کمانڈو مشن نہیں ہے۔ یہ ایک طرح سے شہر کا اور بہت اہم فوجی اڈے کو تباہ کرنے کا مشن ہے۔ یہاں جانباز کمانڈو کی جرأت و دلیری کے ساتھ ساتھ سراغ رسانی کی بھی ضرورت ہے۔ کمانڈو ہارون فوجی اسلحہ کی ٹیکنیکل باریکیوں کی بھی سمجھ بوجھ رکھتا ہے اور بھیس بدلنے میں بھی بڑا ماہر ہے اور پھر ہم پہلے کاٹھیاواڑ جائیں گے۔ کاٹھیاواڑ میں ہمارے مجاہد موجود ہیں۔ وہ بھی ہماری راہ نمائی کریں گے۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں صبح صبح یہاں سے کاٹھیاواڑ کی طرف نکل پڑنا چاہیے۔"

کمانڈو خالد نے ہنس کر کہا۔

"کیا جمیلہ بھابھی سے نہیں ملو گے؟ وہ تو بے چاری ہر روز کسی نہ کسی کو بھجوا کر تمہارا پوچھ لیتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"تم اسے ابھی کسی کو بھیج کر بلوا لو۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے انڈین کیپٹن پانڈے اور میجر گوکھلے کی پاکستان کے خلاف جو باتیں سنی ہیں اس سے مجھے بے حد تشویش ہے۔ یقین کرو خالد بھائی بھارت کی ملٹری ہائی کمانڈ کراچی سے پاکستان پر حملے کا فیصلہ کر چکی ہے۔"

کمانڈو خالد کو بھی اب کچھ تشویش ہوئی تھی۔ کہنے لگا۔

"ہو سکتا ہے بھارتی نیوی لیزر گن کی طاقت کے نشے میں اس قسم کی حرکت کر بیٹھے۔ ٹھیک ہے ہم صبح ہی کاٹھیاواڑ چل پڑیں گے۔"

اس نے ایک مجاہد کو شہر میں بھیج کر جمیلہ کو بلوا لیا۔ مجھے دیکھ کر جمیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"جمیلہ! مجھے معاف کر دو۔ میری وجہ سے تمہیں بے حد مصیبتوں اور پریشانیوں کا

سامنا کرنا پڑا ہے لیکن یقین کرو میں نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر رہا ہوں ایک مسلمان اور پاکستانی کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ ہم صبح جس مشن پر روانہ ہو رہے ہیں وہ ہم سب کی سلامتی اور بقا کا مشن ہے۔ شاید انڈیا میں میرا یہ آخری مشن ہوگا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بعد اگر میں زندہ بچ گیا تو تمہیں لے کر فورا" پاکستان چلا جاؤں گا۔"

"خدا تمہیں سلامت رکھے۔ تمہاری جگہ میں مر جاؤں۔"

یہ کہہ کر جمیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر حوصلہ دیا اور ایک بار پھر کہا کہ ہم اس مشن کی تکمیل کے بعد ضرور پاکستان روانہ ہو جائیں گے۔ جمیلہ ایک دو گھنٹے میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ ہم نے وہیں ایک ساتھ کھانا کھایا' چائے پی۔ پھر وہ اپنے ایک مجاہد کے ساتھ شہر کی طرف چل دی۔

اس کے جانے کے بعد کمانڈو خالد نے کمانڈو ہارون کو بھی وہاں بلوا لیا۔ اسے دوارکا مشن کی ساری تفصیلات سمجھائیں۔ کمانڈو ہارون بڑی توجہ سے سنتا رہا۔ کہنے لگا۔

"کمانڈر! اس مشن کی کامیابی کے لیے ہمیں اپنے کاٹھیا واڑ کے مجاہدوں سے مشورہ کرنا ضرور ہوگا۔"

"ان سے تو ہم ضرور مشورہ کریں گے۔" خالد نے کہا۔

میں نے پوچھا۔

"کمانڈو ہارون! تم جدید فوجی اسلحہ کو تکنیکی طور پر سمجھتے ہو۔ یہ بتاؤ کہ ایک لیزر گن کی مار کتنی دور تک ہو سکتی ہے اور وہ کتنی تباہی مچا سکتی ہے؟"

کمانڈو ہارون کہنے لگا۔

"اگر جیسا کہ تم کہہ رہے ہو انڈین آرمی کے فوجی اس گن کے ذریعے دوارکا سے کراچی پر وار کرنے کی بات کر رہے تھے تو ظاہر ہے یہ بڑی طاقتور لیزر گن ہوگی اور یہ ضرور اسرائیلی ٹیکنالوجی کی مدد سے تیار کی گئی ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ بات تو میں نے ان آرمی افسروں کی زبانی خود سنی تھی کہ یہ لیزر گن اسرائیلی فوجی ہائی کمانڈ کے تعاون سے تیار کی گئی ہے۔"

ہارون بولا۔

"تو پھر یہ اس برعظیم کی سب سے مہلک اور خطرناک لیزر گن ہوگی۔ اگر انڈین آرمی کے پاس اس قسم کی ایک اور گن بھی ہے تو وہ واہگہ بارڈر سے لاہور پر بھی اٹیک کر سکتے ہیں۔"

"وہ تو اس ناپاک عزائم کا بھی اظہار کر رہے تھے۔"

اس کے بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد کمانڈو خالد نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں دوسری لیزر گن کو تلاش کر کے اسے بھی تباہ کرنا ہوگا تاکہ واہگہ کی جانب سے بھی لاہور کو بچایا جا سکے۔"

کمانڈو ہارون بولا۔

"اتنی بڑی لیزر گن تیار کرنا کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اس پر اربوں ڈالر خرچ ہوتے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ انڈین فوجی ہائی کمانڈ نے ایک گن ضرور تیار کر لی ہے اور اسے جیسا کہ کمانڈو کرم داد نے ہمیں بتایا ہے' دوارکا کی ساحلی پہاڑی پر ضرور نصب کر رکھا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اسے تباہ کرنا ہوگا۔"

کمانڈو خالد نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم آج ہی صبح کی ٹرین سے بمبئی روانہ ہو رہے ہیں۔ فرنٹیئر میل منہ اندھیرے بھوپال پہنچتی ہے۔ ہم عام قمیض پتلون کے لباس میں ہوں گے اور الگ الگ ڈبوں میں سفر کریں گے۔ اوکے؟"

"اوکے۔" ہم دونوں نے جواب دیا۔

اس کے بعد ہم وہیں سو گئے۔ رات کے تین بجے ہمیں جگا دیا گیا۔ ہم جلدی جلدی تیار ہو گئے۔ ایک ایک پیالی چائے کی اور خفیہ کمین گاہ سے الگ الگ نکل کر بھوپال ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ سٹیشن پر ہم ایک طے شدہ جگہ پر آ کر مل

گئے۔ کمانڈو خالد نے ہارون کو تھرڈ کلاس کے بمبئی تک کے دو ٹکٹ لانے کے لیے بھیج دیا اور مجھ سے کہا۔

"پولیس کی نگاہوں سے بچ کر رہنا۔"

ہم سٹیشن پر ایک ایسی جگہ بیٹھے تھے جہاں زیادہ روشنی نہیں تھی۔ کمانڈو ہارون ٹکٹ لے کر آ گیا۔ ہم نے اپنے اپنے ٹکٹ لے لیے۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

"یہ ٹرین بمبئی سنٹرل کے سٹیشن پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ ہم آخری ٹرمینل کے پاس ملیں گے۔ اوکے۔ گو۔"

اور ہم الگ الگ ہو کر سٹیشن کے گیٹ کی طرف چلنے لگے۔

بھوپال کافی با رونق اور بڑا اسٹیشن تھا۔ رات کے پچھلے پہر بھی پلیٹ فارم پر کافی رونق تھی۔ میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ مجھے مسافروں میں کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون میں سے کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم اپنے ساتھ کسی قسم کا اسلحہ تو کیا چاقو بھی لے کر نہیں چلے تھے۔ یہ چیزیں ہمیں راستے میں کسی مشکل میں پھنسا سکتی تھیں۔ راستے میں ان کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ گاڑی آ گئی۔ میں بھی ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ ٹرین بھوپال سے روانہ ہو گئی۔

اسی روز رات کے گیارہ بجے کے قریب ٹرین نے ہمیں بمبئی سنٹرل پہنچا دیا۔ ٹرمینل پلیٹ فارم کے آخری سرے پر تھا۔ میں ٹہلتا ہوا وہاں آ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون بھی آ گئے۔ ہم وہیں سے ریل کی پٹڑی میں اتر گئے اور چند لمحوں کے بعد ہم سٹیشن کے باہر والے مسافر خانے میں تھے۔ یہاں سے ہمیں معلوم ہوا کہ کاٹھیاواڑ کی طرف ٹرین ابھی ابھی نکل کر گئی ہے۔ اب اگلی ٹرین جو پسنجر ہے دو گھنٹے بعد جائے گی۔ ہم وہیں مسافر خانے میں بیٹھے رہے۔ وہیں ہم نے کھانا بھی کھایا' چائے پی اور سر جوڑ کر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مسافر خانے میں کافی لوگ تھے۔ بچوں کا شور بھی تھا۔ پولیس کا کوئی سپاہی وہاں نہیں تھا۔ جس وقت کاٹھیاواڑ جانے والی ٹرین آئی تو ہم الگ الگ ہو کر اس میں سوار ہو گئے۔

بارشوں کی وجہ سے بمبئی اور کاٹھیاواڑ کے درمیان دو تین جگہوں سے ریلوے لائن ٹوٹ گئی تھی۔ وہاں ٹرین کو بار بار کافی دیر رکنا پڑا۔ اس طرح ٹرین پانچ چھ گھنٹے لیٹ پہنچی۔ کاٹھیاواڑ میں رات ہوگئی تھی اور بارش ہو رہی تھی۔ یہ علاقہ ہمارے لیے اتنا خطرناک نہیں تھا جتنا بھوپال' بمبئی اور دلی کا علاقہ تھا۔ ہم یہاں ایک ساتھ سٹیشن سے باہر نکلے اور ایک طرف ہو کر کھڑے ہوگئے۔ بارش کافی زوردار تھی۔ میں پہلی بار اس شہر میں آیا تھا جبکہ کمانڈو ہارون اور کمانڈو خالد وہاں کئی بار آ چکے تھے۔ ہارون نے کہا۔

"ٹیکسی پکڑ لیتے ہیں۔"

کمانڈو خالد بڑی گہری نگاہوں سے ادھر ادھر ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہاں سے ہم ٹیکسی نہیں لیں گے۔ بارش تھم جائے تو مندر والے چوک سے ٹیکسی لیں گے۔"

ذرا بارش تھمی تو ہم سٹیشن کے احاطے میں سے گزر کر ہوگے بازار میں چلنے لگے۔ یہ علاقہ بھی دوارکا کی طرح اونچا نیچا تھا۔ بازار میں بیل گاڑیاں بھی چل رہی تھیں۔ مندر والا چوک آگیا۔ وہاں ایک جین مندر تھا جہاں سے شبد کیرتن کی آوازیں آ رہیں تھیں۔ یہاں سے کمانڈو خالد نے ایک خالی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو خالد نے کسی جگہ کا نام بتایا تھا۔ وہ جگہ شہر سے باہر تھی۔ وہاں آ کر ٹیکسی ہم نے چھوڑ دی اور پیدل چل پڑے۔ سٹیشن سے چلے تھے تو پھوار سی پڑ رہی تھی' اب وہ بھی رک گئی تھی۔ آسمان پر دور دور بجلی کی ہلکی ہلکی چمک پیدا ہو رہی تھی۔

کچھ دور چلنے کے بعد نیم چٹانی علاقہ شروع ہوگیا۔ یہ ایسا علاقہ تھا کہ سڑک کی دونوں جانب بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں تھیں۔ یہاں اندھیرا بھی تھا۔ دونوں کو معلوم تھا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ ایک جگہ ڈھلانی چھتوں والے کچھ کوارٹر سے بنے ہوئے تھے۔ کمانڈو ہارون اور خالد میرے آگے آگے چل رہے تھے۔ زمین پتھریلی ہونے کی

وجہ سے وہاں بارش سے کیچڑ نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ مکان کے دو کمرے تھے جو ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ ڈھلانی چھت ایک ہی تھی۔ باہر تنگ صحن میں ایک طرف رکشا کھڑا تھا۔ خالد نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اندر سے کسی نے گجراتی میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

خالد نے کہا۔

"بھوپال سے آئے ہیں"

اسی وقت دروازہ کھل گیا۔ اندر بجلی کے بلب کی روشنی ہو رہی تھی۔ ایک دبلے پتلے نوجوان نے دروازہ کھولا تھا۔ اس نے بنیائن اور پتلون پہنی ہوئی تھی۔ گھنگھریالے سیاہ بال بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس نے باری باری خالد اور ہارون کو گلے لگایا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

"یہ کمانڈو کرم داد ہے! پاکستان سے آیا ہے۔"

اس نوجوان نے مجھے بھی گلے لگا لیا اور بولا۔

"اللہ پاکستان کو سلامت رکھے۔"

اس نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی اور ہمیں دوسرے کمرے میں لے گیا۔ دوسرا کمرہ پہلے کمرے سے مختلف نہیں تھا۔ چیزیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ کونے میں رکشے کے دو ٹائر پڑے تھے۔ دو بانس کی چارپائیاں پڑی تھیں۔ وہیں کونے میں گیس کا چولہا دو چار برتن بھی پڑے تھے۔ ہم چارپائیوں پر آمنے سامنے ہو کر بیٹھ گئے۔ اس مجاہد کا مجھ سے تعارف کرایا گیا۔ اس کا نام قاسم تھا۔ وہ شہر میں رکشا چلاتا تھا۔ مگر بھوپال کے مجاہدین کی خفیہ تنظیم کا انتہائی سرگرم رکن تھا۔ قاسم نے کہا۔

"میں ابھی ہوٹل سے کھانا لے کر آتا ہوں۔"

ہارون اور خالد نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ چلا گیا۔ خالد کہنے لگا۔

"کرم داد! یہ دبلا پتلا نوجوان بڑا دلیر مجاہد ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کو اگر ہندو تنگ کریں تو یہ فوراً" ان کی مدد کو پہنچتا ہے اور دشمنوں کو خفیہ طور پر ٹھکانے لگانے سے

بھی گریز نہیں کرتا۔ بڑا سرفروش مسلمان ہے۔"

قاسم کھانا لے کر آ گیا۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ قاسم نے گیس کا چولہا جلا کر خود چائے بنائی۔ ہم بیٹھ کر چائے پینے لگے تو قاسم نے پوچھا۔

"کمانڈو! کیا کوئی خاص مشن ہے؟"

کمانڈو خالد نے اسے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات بیان کر دی۔ قاسم خاموشی سے سنتا اور چائے پیتا رہا۔ کہنے لگا۔

"حیرانی کی بات ہے۔ ہمیں خبر ہی نہیں کہ ہم سے تھوڑی دور دوارکا میں پاکستان پر حملہ کرنے کی ناپاک سازش ہو رہی ہے اور انڈین آرمی نے طاقتور لیزر گن بھی نصب کر دی ہے۔"

کمانڈو خالد نے مجاہد قاسم سے پوچھا۔

"سب سے پہلے تو ہمیں یہاں سے دوارکا پہنچنا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ دوارکا میں اپنا کوئی ایسا آدمی ہے جس کے پاس ہم کچھ دیر چھپ کر رہ سکیں؟"

مجاہد قاسم نے کہا۔

"وہاں اپنا ایک مجاہد موجود ہے۔"

اس مجاہد کا نام قاسم نے ہمیں بتایا مگر میں آپ کو اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ آپ میری داستان سن رہے ہیں اب تک آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں بھارت میں ان مجاہدوں کے اصلی نام اور اصلی ٹھکانے کیوں نہیں بتاتا۔ اس لیے دوارکا کے مجاہد کا اصلی نام نہیں بتاؤں گا۔ آپ اسے شیر خان سمجھ لیں۔ شیر خان بھوپال کی خفیہ بھارتی اسلامی تنظیم کا ہی ایک رکن تھا اور دوارکا کی بندرگاہ کے قریب دوارکا کے چھوٹے سے بازار میں سٹیشنری کی دکان کرتا تھا۔ سن ۶۵ء کی جنگ میں جب پاکستان نیوی کی توپوں نے دوارکا کی ساحلی توپوں کا صفایا کر دیا تھا اور دوارکا قلعے کے گولہ بارود کے ذخیرے کو اڑا دیا تھا تو شیر خان نے ہی سب سے پہلے آ کر مجاہد قاسم کو دوارکا کی تباہی کا چشم دید حال سنایا تھا۔ مجاہد قاسم نے ہمیں مجاہد شیر خان کے بارے میں بعض ضروری تفصیل

بیان کی اور کہا۔

"ہم شیر خان کے گھر پر ہی جا کر ٹھہریں گے۔ دوارکا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ صرف سومنات کے مندر کی وجہ سے اس کی رونق ہے۔ بندرگاہ پر جہاز بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔"

کمانڈو ہارون نے کہا۔

"قاسم بھائی! ہمیں جتنی جلدی ہو سکے دوارکا پہنچ کر بھارتی نیوی کی لیزر گن پوسٹ کی سائیٹ تلاش کرنی ہوگی۔ یہ کام کافی وقت لے سکتا ہے اور ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کوئی پتہ نہیں بھارت کب کراچی پر حملہ کر دے۔ ان کے عزائم بڑے خطرناک ہیں کیونکہ کشمیر کے محاذ پر ایک تو بھارت سرکار کا آدھا بجٹ صرف ہو رہا ہے' دوسرے اس کی فوج کٹ رہی ہے۔ وہ پاکستان پر حملہ کر کے بہت سے مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

مجاہد قاسم کہنے لگا۔

"ہم دن کے وقت یہاں سے نکل چلیں گے۔ ایک ٹرین دوپہر کے وقت یہاں سے دوارکا کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ میں اس کے ٹکٹ لے آؤں گا۔"

یہی پروگرام طے ہوگیا۔ دوسرے دن ہم ایک میٹر گیج ٹرین میں سوار ہو کر دوارکا کی طرف روانہ ہوگئے۔ دوارکا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد ہم دوارکا پہنچ گئے۔ یہ سارا علاقہ سطح مرتفع کا ساحلہ علاقہ تھا۔ ایک طرف شمال میں خلیج کچھ کا سمندر تھا۔ مغرب میں بحرہ عرب تھا۔ مجاہد قاسم ہمیں دوارکا کے مجاہد شیر خان کے مکان پر لے آیا جو تاڑ اور ناریل کے درختوں کے پیچھے ایک چٹان کے قریب تھا۔ دو کمروں والا پرانا بیرک کی طرح کا مکان تھا جس کی دیواریں ٹین کی تھیں۔ چھت ڈھلواں تھی اور کھپریل کی تھی۔ دیواریں زنگ آلود تھیں۔ مکان کے باہر دو لوہے کی پرانی کرسیاں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔

مجاہد قاسم کو وہ جگہ معلوم تھی جہاں شیر خان دکان پر جاتے ہوئے اپنی ایک ڈبلی

کیٹ چابی چھپا کر رکھ جاتا تھا۔ یہ چابی صرف بھارتی اسلامی تنظیم کے مجاہدوں کے لیے چھپائی جاتی تھی کہ اگر وہ ادھر آئیں تو انہیں شیر خان کی دکان پر جانے کی ضرورت نہ پڑے اور اس خفیہ جگہ سے چابی لے کر مکان کھول کر بیٹھ جائیں۔ ہم بھی مکان کھول کر کمرے میں بیٹھ گئے۔ یہ بالکل ویسا ہی الٹ پلٹ کمرہ تھا جیسا کاٹھیاواڑ میں مجاہد قاسم کا تھا۔ شیر خان اکیلا ہی وہاں رہتا تھا اور اسے وہاں رہتے ہوئے دس پندرہ سال ہو گئے تھے۔ وہ گجراتی اور مراٹھی زبانیں بڑی روانی سے سمجھ اور بول لیتا تھا۔ قاسم ہمیں وہاں بٹھا کر خود شیر خان کو لینے چلا گیا۔ وہ شیر خان کو اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ شیر خان کی عمر چالیس سے کچھ اوپر ہو گی۔ گٹھا ہوا بدن تھا' رنگ سانولا تھا۔ چھوٹی چھوٹی شرعی ڈاڑھی تھی۔ خوش شکل آدمی تھا۔ آنکھوں میں خاص چمک تھی۔ ہم سے گلے لگ کر ملا۔ مجاہد قاسم نے اسے راستے میں ساری بات بتا دی تھی۔

شیر خان نے ہمارے لیے چائے بنائی۔ کھانا ہم نے دوارکا کے سٹیشن پر ہی کھا لیا تھا۔ جب ہماری کمانڈو پارٹی کسی مشن پر روانہ ہوتی تھی تو ہمیں آرڈر دیا جاتا ہے کہ جہاں اور جب تم لوگوں کو کھانا پانی ملے کھا پی لو۔ ہم نے بھی ایسے ہی کیا تھا اور دوارکا کے سٹیشن پر گاڑی سے اترتے ہی ریلوے کینٹین پر کھانا کھایا تھا۔ کمانڈو خالد نے شیر خان سے کہا۔

"شیر خان! کیا تمہیں انڈین نیوی کی لیزر گن کے بارے میں اس سے پہلے کچھ معلوم تھا؟"

شیر خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں' اور میں حیران ہوں کہ مجھے آج تک پتہ کیوں نہیں چل سکا۔ میں تو یہاں بڑا چوکس رہتا ہوں۔ جب بھی کوئی انڈین نیوی کا جہاز بندرگاہ پر لگتا ہے تو میرے خاص آدمی مجھے آ کر بتا دیتے ہیں کہ اس جہاز سے گولہ بارود اترا ہے یا فوج کی کوئی رجمنٹ اتری ہے۔ لیکن اتنی خطرناک گن پوسٹ یہاں بن گئی اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔"

میں نے کہا۔

"یہ انتہائی خفیہ فوجی منصوبہ ہے شیر خان! بھارتی فوجی ہائی کمانڈ نے اس سلسلے میں انتہائی راز داری سے کام لیا ہے اور اسی حساب سے وہاں سیکورٹی کا بھی انتہائی سخت انتظام ہوگا۔"

کمانڈو خالد نے کمانڈو شیر خان سے کہا۔

"کمانڈو ہارون آج رات کو لیزر گن پوسٹ کی ریکی اور سراغ رسانی کی مہم پر نکلے گا۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ ہتھیار لا دو۔"

"کس قسم کے ہتھیار آپ لوگوں کو چاہئیں؟"

کمانڈو خالد نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

"اس وقت صرف دو آٹومیٹک مگر سیلنسر لگے ہوئے پستولوں کی ضرورت ہے۔ ایک ایک کمانڈو چاقو بھی چاہیے۔ اس کے بعد جس قسم کے ہتھیاروں کی ضرورت پڑے گی تمہیں بتا دیں گے۔"

شیر خان نے کہا۔

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دونوں آٹومیٹک پستول سیلنسروں کے ساتھ اور دو کمانڈو چاقو آپ کو شام سے پہلے مل جائیں گے۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔ "ہمارے دو آدمی سراغ رسانی کی اس مہم پر جائیں گے۔ ہمارے پاس اس مہم پر جانے کے لیے مناسب لباس نہیں ہے۔ کمانڈو لباس نہ سہی لیکن ہمیں نیلے یا سیاہ رنگ کی دو پتلونیں اور اسی رنگ کی دو قمیضیں ضرور چاہئیں۔"

شیر خان بولا۔

"یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ کپڑے بھی مل جائیں گے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ جو کمانڈو اس مہم پر جا رہے ہیں انہیں دوارکا کے ساحلی علاقے سے کوئی واقفیت بھی ہے یا نہیں؟"

اس پر مجاہد قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے شیر خان۔ میں اس مہم پر کمانڈو کرم داد کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

شیر خان نے ہنس کر کہا۔

"قاسم بھائی پھر تو کسی قسم کی فکر کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ تم دوارکا کی پہاڑیوں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو لیکن خالد بھائی۔ اگر آپ لوگوں میں سے کوئی دن کی روشنی میں بھی سمندر کی جانب سے دوارکا کی ساحلی پہاڑیوں کا جائزہ لے لیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ کیونکہ رات کے وقت آپ کو وہاں کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ کم از کم میں نے آج تک ان پہاڑیوں میں کبھی مستقل طور پر کوئی روشنی نہیں دیکھی۔ کبھی کبھی کسی ٹرک کے ادھر سے گزرنے کی آواز آ جاتی ہے اور رات کو کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی مدھم سی روشنی بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ حیران ہوں کہ انڈین آرمی اور انڈین نیوی نے اتنی راز داری سے اتنا بڑا فوجی پراجیکٹ مکمل کر لیا اور ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔"

کمانڈو خالد نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"کرم داد! مجھے شیر خان کی دن کے وقت ریکی کرنے کی تجویز پسند آئی ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں اور قاسم کو دن کے وقت علاقے کا جائزہ ضرور لینا چاہیے۔"

کمانڈو ہارون کہنے لگا۔ "مگر اس لباس میں ادھر جانا خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ وہاں تو زبردست سیکورٹی ہوگی اور انڈین آرمی اور نیوی کے تجربہ کار کمانڈو پہاڑیوں میں چھپ کر پہرہ دے رہے ہوں گے۔"

شیر خان بولا۔

"آپ لوگ جینی سادھوؤں کا بھیس بدل کر ان پہاڑیوں میں آسانی سے چل پھر سکتے ہیں کیونکہ یہاں کے لوگ جین مت کو ماننے والے ہیں اور جینی سادھو کبھی کبھی دوارکا کی پہاڑیوں میں تپسیا کرنے آتے رہتے ہیں۔ وہ سمندر کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور دیر تک اسی طرح بیٹھے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"لیکن مجھے تو گجراتی زبان نہیں آتی۔ قاسم گجراتی زبان بول لیتا ہے۔"

اس پر شیر خان نے ہنس کر کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم مون برت رکھ لینا۔ یہ ظاہر کرنا کہ تم نے خاموشی کا برت رکھا ہوا ہے۔ جینی سادھو عام طور پر خاموشی کا روزہ رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں گجرات میں خاموشی کا روزہ یعنی مون برت تو عورتیں اور مرد ہفتے میں ایک بار اپنے گھروں میں بھی رکھ لیتے ہیں۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"یہ اچھی بات ہے۔ کمانڈو کرم داد خاموش رہے گا۔ قاسم ضرورت کے وقت وہاں کسی آرمی یا نیوی کے گشتی سپاہی سے آمنا سامنا ہوگیا تو ان سے گجراتی میں بات کر لے گا۔"

شیر خان نے کہا۔

"جین کے سادھو دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو بالکل الف ننگے رہتے ہیں۔ دوسری طرح کے سادھو سفید چادر جسم کے گرد لپیٹ لیتے ہیں۔ عام طور پر وہ سادھوؤں والے لمبے لمبے بال بھی نہیں رکھتے۔ کیونکہ جین مت کے پیشوا مہاویر نے بال نہیں بڑھائے ہوئے تھے۔ میں تم دونوں کے واسطے پرانی سفید چادریں لا دوں گا' جن کو اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر تم کالے ریٹھوں کی مالائیں گلے میں ڈال لینا اور پاؤں میں چپل پہن لینا۔ یہ لباس بالکل درست رہے گا۔"

اس کے بعد شیر خان چادریں لانے دکان پر چلا گیا۔ سراغ رسانی کے اس مشن پر صرف میں اور مجاہد قاسم جا رہے تھے۔ مجاہد قاسم کو اس لیے چنا گیا تھا کہ وہ اس علاقے سے بخوبی واقف بھی تھا اور گجراتی مراٹھی زبانیں روانی سے بول لیتا تھا اور میں اس لیے ساتھ جا رہا تھا کہ میں آرمی کا تربیت یافتہ کمانڈو تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں نے لیزر گن سائیٹ کا نقشہ دیکھا ہوا تھا اور بلیوپرنٹ پر سب سے اونچی پہاڑی کی ڈگریاں' زاویے اور دوسرے اہم نشانات بھی یاد کر رکھے تھے۔ شیر خان دکان سے

ہمارے لیے دو سفید مگر پرانی چادریں لے کر آ گیا۔ وہ رنٹھوں کی چھ سات مالائیں بھی لایا تھا۔ سفید روغن کی چھوٹی سی ڈبیا اس کے پاس تھی۔ ابھی دن کا وقت تھا۔ ہمیں دن کی روشنی میں ہی یہ سراغ رسانی کرنی تھی۔ میں نے اور مجاہد قاسم نے اپنے کپڑے اتار کر سفید چادریں جین سادھوؤں کی طرح لپیٹ لیں۔ اس سلسلے میں شیر خان نے ہماری مدد کی۔ کیونکہ وہ جینی سادھوؤں کو ہر روز دیکھا کرتا تھا۔ اس نے ہمارے ماتھوں اور بازوؤں پر سفید روغن سے لمبی لمبی تین تین لکیریں بنا دیں۔ یہ جین مت کے سادھوؤں کا خاص نشان تھا۔ ہم نے گلے میں کالے رنٹھوں کی مالائیں بھی پہن لیں۔ اس وقت ہمیں اپنے ساتھ آٹومیٹک پستول یا کمانڈو چاقو لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ یہ سراغ رسانی کا مشن تھا۔

جب ہم پوری طرح سے جینی سادھو بن گئے تو شیر خان نے ہمارا پوری طرح سے جائزہ لیا اور بولا۔

"اب تم پورے جینی سادھو بن گئے ہو۔ ایک بات یاد رکھنا۔ جینی سادھو نہ گوشت کھاتے ہیں' نہ انڈا' پیاز اور لہسن کھاتے ہیں۔ جین مت کے پیشوا کا نام وردھنا تھا مگر سب اسے مہاویر کے لقب سے ہی یاد کرتے ہیں۔ دوارکا کی ان بنجر ساحلی پہاڑیوں میں کہیں کہیں مزدوروں کی جھونپڑیاں بھی ہیں۔ ان کی عورتوں نے تمہیں کھانے کو دہی وغیرہ دیا تو لے لینا۔ مگر پیاز' انڈے اور گوشت کو ہاتھ نہ لگانا۔"

کمانڈو خالد نے شیر خان سے کہا۔

"شیر خان! اب ایسا ہے کہ ان دونوں کو وہ راستہ بتا دو جو یہاں سے دوارکا کی ساحلی پہاڑیوں کی طرف جاتا ہو۔ مجاہد قاسم تو اس علاقے سے واقف ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم کوئی ایسا راستہ بتاؤ جو شارٹ کٹ بھی ہو اور محفوظ بھی ہو۔"

شیر خان قاسم سے مخاطب ہوا۔ کیونکہ قاسم وہاں اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ اس نے قاسم کو ایک خاص راستہ بتا دیا۔ قاسم بولا۔

"میں سمجھ گیا ہوں۔ آؤ کرم داد! ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

میں اور قاسم شیر خان کے پرانے مکان سے نکلے اور اس کے عقب میں جو چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیے اور گھاٹیاں تھیں ان میں سے گزرتے ہوئے ایک ایسی جگہ آ گئے جہاں اونچی نیچی بنجر پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ ہم جینی سادھوؤں کے لباس میں ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ مجاہد قاسم نے پہاڑیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ دوارکا کی ساحلی پہاڑیاں ہیں۔ ان کی دوسری طرف بحیرہ عرب کا سمندر اور دوارکا کی نیوی کی بندرگاہ ہے۔"

پھر اس نے مجھے دور سے ایک پہاڑی دکھائی جو باقی تمام پہاڑیوں میں سے اونچی تھی۔ کہنے لگا۔

"یہ سب سے اونچی پہاڑی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہی گن سائیٹ ہے۔ اسی جگہ لیزر گن کی پوسٹ ہو گی' تمہارا کیا خیال ہے۔ تم نے تو اس گن پوسٹ کو نقشے میں ضرور دیکھا ہو گا۔"

میں دن کی روشنی میں پہاڑی کو غور سے دیکھ رہا تھا مگر بلیو پرنٹ اور اصل سائیٹ میں بڑا فرق ہوتا ہے اور اسے کوئی انجینئر ہی پہچان سکتا ہے۔ میں نے کہا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا یہ تو پہاڑی کے دامن میں جا کر ہی معلوم ہو سکے گا کہ یہی گن پوسٹ ہے کیونکہ بلیو پرنٹ کے نقشے میں جہاں تک میں سمجھ سکا تھا دو آمنے سامنے لال رنگ کے تیر بنائے ہوئے تھے۔ یہ تیرے میرے علم کے مطابق دو پہاڑی کھائیوں کی علامت ہیں۔ یہ کھائیاں سمندر کی جانب ہیں اور یہاں ضرور آرمی نے لیزر گن کی حفاظت کے لیے یا تو چھوٹی توپیں نصب کر رکھی ہوں گی اور یا وہاں ہوائی حملے سے بچاؤ کے لیے اینٹی ائرکرافٹ گنیں لگائی ہوئی ہوں گے۔"

مجاہد قاسم نے کہا۔

"یہ تم نے بڑی کار آمد اطلاع بہم پہنچائی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں سمند کی طرف سے پہاڑی کی طرف جانا چاہیے۔"

میں نے کہا۔

"کہیں ہم ان پہاڑیوں میں راستہ تو نہیں بھول جائیں گے؟ ساری پہاڑی ایک ہی طرح کی لگتی ہیں۔"

مجاہد قاسم ہنستے ہوئے بولا۔"

"مہاراج! آپ اطمینان رکھیں۔ میں ان پہاڑیوں کی لومڑی ہوں' بس تم صرف یہ یاد رکھنا کہ تم نے خاموشی کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ اگر کوئی آدمی یا عورت مل گئی تو خاموش رہنا۔ تم کوئی بات نہ کرنا۔"

میں نے کہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔"

"ہم چلتے چلے گئے۔ سارا علاقہ پہاڑی تھا مگر یہ ہمارے پاکستان کی پہاڑی علاقوں کی طرح نہیں تھا۔ یہ سمندری ساحل کا علاقہ تھا۔ پہاڑیاں خشک اور بنجر تھیں۔ کہیں کہیں کوئی تاڑ کا درخت پنسل یا بال پوائنٹ کی طرح اوپر کو اٹھا ہوا نظر آ جاتا تھا۔ اردگرد چھوٹے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ زمین سے چار چار پانچ پانچ فٹ باہر کو نکلی ہوئی چٹانیں بھی تھیں۔ ہم کافی لمبا چکر کاٹ کر پہاڑیوں کے دامن میں پہنچ گئے۔ یہاں کہیں کہیں گڑھوں میں پانی کھڑا تھا۔ یہ سمندر کا پانی تھا جو جوار بھاٹا کے وقت وہاں آ گیا ہوا تھا۔ اب ہم ایک پہاڑی کی چڑھائی چڑھنے لگے۔

مجاہد قاسم کہنے لگا۔

"تھک تو نہیں گئے؟"

میں نے کہا۔

"میں سابق آرمی کمانڈو ہوں قاسم بھائی' تھکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ مسکرانے لگا۔ ہم ایک ٹیلے پر سے ہو کر دوسری طرف نشیب میں آ گئے۔ یہاں بھی گڑھوں میں سمندر کا پانی کھڑا تھا جو گندا ہو رہا تھا۔ اس کے آگے پھر چڑھائی شروع ہو گئی۔ اسی طرح ٹیلوں پر اترتے چڑھتے ہم نے ایک ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ کر

دوسری طرف دیکھا تو سامنے سبز رنگ کا سمندر حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ دور ایک دو جہاز بھی سمندر میں کھڑے تھے۔ قاسم کہنے لگا۔

"یہ بحیرہ عرب کا سمندر ہے۔"

وہ اپنی بائیں جانب دیکھنے لگا۔ ادھر سب سے اونچی پہاڑی نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

"میرا خیال ہے اسی پہاڑی کے اندر لیزر گن نصب ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے پہلے پہاڑی کو دیکھا۔ پھر دائیں بائیں زمین کے پہاڑی نشیب و فراز کا جائزہ لیا اور کہا۔

"مگر مجھے یہاں کھائیاں کہیں دکھائی نہیں دے رہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں بائیں جانب ان ٹیلوں کے ساتھ ساتھ کچھ آگے جانا چاہیے۔"

ہم بائیں جانب چل پڑے۔ ایک جگہ ٹیلوں کے درمیان تھوڑی سی کھلی جگہ آ گئی۔ یہاں ایک جھونپڑا تھا۔ جھونپڑے کے باہر ایک عورت چولہے کے پاس بیٹھی کچھ پکا رہی تھی۔ اس کا ننگ دھڑنگ بچہ قریب ہی کھیل رہا تھا۔ مجاہد قاسم نے مجھے آہستہ سے کہا۔

"تم بالکل نہ بولنا۔"

یہ کہہ کر وہ سادھوؤں کی طرح بڑی بے نیازی سے قدم اٹھاتا ہوا جھونپڑی کی طرف بڑھا۔ ہم جھونپڑی کے پاس آ گئے تو عورت نے پلٹ کر دیکھا اور ساڑھی کے پلو سے ہاتھ صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ہم دونوں کے پاؤں چھوئے اور گجراتی میں کچھ کہا۔ اس کے جواب میں مجاہد قاسم نے بھی گجراتی زبان بولنی شروع کر دی۔ مجھے زیادہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ویسے گجراتی زبان کے کچھ لفظ اردو فارسی کے تھے جو میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ قاسم نے میری طرف اشارہ کر کے عورت کو کچھ کہا۔ ظاہر ہے یہی کہا ہو گا کہ میرے ساتھی نے مون برت رکھا ہوا ہے۔ عورت نے ہاتھ جوڑ کر میرے آگے سر جھکا دیا۔ جلدی سے

جھونپڑی میں سے ایک پھٹا پرانا بوریا لے کر آگئی۔ بوریئے کو زمین پر بچھا دیا۔ قاسم نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ عورت نے بچے کو ہمارے آگے ڈال دیا اور گجراتی میں قاسم سے کچھ کہا۔ قاسم نے بڑے مہان اور پہنچے ہوئے سادھوؤں کی طرح بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے گجراتی زبان میں آشیر باد دی۔ عورت نے کیلے کے پتے صاف کر کے اس پر کھچڑی ڈال کر ہمارے آگے رکھ دی اور خود دو زانو ہو کر سامنے ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی۔ قاسم نے مجھے کھانے کا اشارہ کیا۔ ہم کھچڑی کھانے لگے۔ قاسم گجراتی زبان میں عورت سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ ضرور وہ اس سے علاقے کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم اس عورت کے پاس دو تین منٹ بیٹھے۔ پھر اٹھ کر ایک طرف چل پڑے۔ ذرا آگے جا کر میں نے مجاہد قاسم سے پوچھا۔

"عورت سے تم کیا باتیں کر رہے تھے؟"

وہ بولا۔

"اس عورت کا خاوند نیول گودی پر مزدوری کرتا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ اوپر والی پہاڑی پر کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے اسے کہا تھا' ہم پہاڑی پر جا کر تپسیا کرنا چاہتے ہیں' وہ بولی۔' اوپر سادھو مہاراج بھی نہیں جاتے۔"

میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اس بات کی تصدیق ہوگئی ہے کہ لیزر گن کی پوزیشن اسی پہاڑی میں کسی جگہ پر ہے۔"

وہ بولا۔

"ہاں لیکن ان کھائیوں کا بھی سراغ لگانا ضروری ہے جہاں آرمی کی توپیں یا اینٹی ائر کرافٹ گنیں لگی ہوئی ہیں۔ ان کی پوزیشن کی تصدیق کے بغیر ہمارا کسی طرف کو نکلتے چلے جانا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن ہم تو جین مت کے سادھوؤں کے بھیس میں ہیں۔ کسی نے چیک کیا تو کہہ دیں گے کہ ہم باہر سے آئے ہوئے سادھو ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس طرف آنے جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

مجاہد قاسم نے کہا۔

"لیکن تم ایک بات بھول گئے ہو کہ ہم دونوں مسلمان ہیں اور اپنے مسلمان ہونے کی ناقابل تردید نشانی اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ اگر آرمی یا نیوی کے گشتی سپاہیوں کو ہم پر ذرا سا بھی شک پڑ گیا کہ ہم دشمن کے جاسوس ہیں تو وہ سب سے پہلے یہ دیکھیں گے کہ ہمارے ختنے تو نہیں ہوئے اور ایک سیکنڈ میں سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اس لیے ہمیں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور جان بوجھ کر ہمیں اپنے آپ کو خطرے میں نہیں ڈالنا ہوگا۔ ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں۔"

میں یہ بات بھول ہی گیا تھا۔ مجاہد قاسم نے عین وقت پر بڑی اہم اور خطرناک بات بتا دی تھی۔ میں نے کہا۔

"پھر ایسا کرتے ہیں تم یہاں بیٹھو۔ میں نے یہاں کا نقشہ دیکھا ہوا ہے۔ میں نشیب میں اتر کر آگے جا کر دیکھتا بھالتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہاں کھائیاں نظر آ جائیں۔"

قاسم کہنے لگا۔ "لیکن تمہیں بے حد محتاط ہو کر جانا ہوگا اگر نیوی یا آرمی کے کسی سپاہی سے آمنا سامنا ہو گیا تو بولنا بالکل نہیں۔ وہیں آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کھڑے ہو جانا۔"

میں نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں کمانڈو ہوں ان باتوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

اور میں مجاہد قاسم کو وہیں چھوڑ کر پہاڑی نشیب میں اتر گیا۔ سامنے دور تک سمندر ہی سمندر تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ میں بہت آہستہ آہستہ نشیب میں اتر رہا تھا۔ اچانک مجھے کسی آدمی کی آواز سنائی دی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔





میرے آگے پچاس قدموں کے فاصلے پر پہاڑی کی زمین پھر اونچی ہوگئی تھی اور آگے جھاڑیوں کی چھوٹی سی دیوار تھی۔ یہ آواز ان جھاڑیوں کی طرف سے آئی تھی۔ میں بڑی احتیاط سے بظاہر بے نیازی سے چلتا جھاڑیوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے جھاڑیوں میں سے دوسری طرف دیکھا۔ میرے خدا! جس چیز کی ہمیں تلاش تھی وہ میرے سامنے تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خندق ٹائپ کی لمبی کھائی ہے جس میں ساتھ ساتھ دورمار توپیں لگی ہوئی ہیں۔ انڈین آرمی کے کالے کالے ناٹے قد کے دو تین سپاہی توپوں کے پاس بیٹھے مگوں میں چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ سوچ کر دوسری بار گہری نظر سے کھائی کا جائزہ لیا۔ یہ کھائی چھ سات فٹ گہری تھی اور نصف دائرے کی شکل میں پہاڑی کے ساتھ ساتھ آگے تک چلی گئی تھی۔ توپوں پر جال ڈال کر انہیں کیموفلاج کیا گیا تھا۔ یہ کل چھ توپیں تھیں جن کی نالیاں خندق یا کھائی سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور ان کا رخ سمندر کی طرف تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جس کو نقشے پر تیروں کے نشان سے ظاہر کیا گیا تھا۔ میں دبے پاؤں چلتا وہیں سے واپس آ گیا اور مجاہد قاسم کو توپوں کے بارے میں بتایا۔

وہ کہنے لگا۔

''تمہارا اندازہ صحیح تھا۔ یہ توپیں ساحل کے دفاع کے لیے ہیں یا اس لیے بھی ہیں کہ اگر لیزر گن میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو ساحل کی طرف بڑھنے والے جہازوں پر

گولہ باری کی جا سکے۔"

میں نے کہا۔

"چھوٹی توپیں تو ہم نے تلاش کرلی ہیں۔ اب ہمیں بڑی گن کا سراغ لگانا ہے۔"

وہ کہنے لگا۔

"وہ سامنے والی پہاڑی پر ہی ہوگی لیکن لگتا ہے کہ ہم ممنوعہ علاقے میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہاں کسی بھی وقت کوئی کسی طرف سے نکل کر ہمیں پکڑ سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"سامنے والی پہاڑی زیادہ بلندی پر نہیں ہے اور اس کی ڈھلان پر باہر نکلی ہوئی چٹانیں بھی ہیں جن کی آڑ ہمیں نظروں سے بچا سکتی ہے۔"

"تم کیا مشورہ دیتے ہو۔ تم فوجی کمانڈو ہو۔"

مجاہد قاسم نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا۔

"ہم دشمن کی ناک کے بالکل نیچے آ گئے ہیں۔ اب ہمیں سراغ رسانی کا مشن مکمل کر کے ہی واپس جانا چاہیے۔ ہم پہاڑی کے اوپر جائیں گے اور اس طرح چڑھائی چڑھیں گے جیسے سادھو پہاڑوں پر جڑی بوٹیاں تلاش کرتے ہیں۔"

"اوکے۔ آ جاؤ مگر یاد رکھنا تم کوئی بات نہیں کرو گے۔"

ہم ایک دوسرے کے درمیان میں چار پانچ قدم کا فاصلہ رکھ کر پہاڑی کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ ہم جھک کر چل رہے تھے اور کسی وقت پتھروں کو زمین پر سے اٹھا کر دیکھ بھی لیتے تھے۔ ہم یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ سادھو لوگ ہیں اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں ہیں۔ چڑھائی زیادہ سیدھی نہیں تھی لیکن وہاں جھاڑیاں بالکل نہیں تھیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زمین سے چٹانیں ضرور نکلی ہوئی تھیں۔ ہم ان کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ جاتے اور جب دیکھتے کہ چاروں طرف کوئی فوجی نظر نہیں آ رہا تو دوبارہ چڑھائی چڑھنی شروع کر دیتے۔ ہم کافی چڑھائی چڑھ آئے تھے۔ ایک جگہ چٹان کے پیچھے چھپ کر سستا رہے تھے اور ماحول کا جائزہ لے رہے تھے کہ نیچے سے ہمیں

چار فوجی چڑھائی چڑھتے نظر آئے۔ انہوں نے سروں پر لکڑی کے بکس اٹھا رکھے تھے۔ قاسم نے آہستہ سے کہا۔

"کہیں یہ ہماری طرف تو نہیں آ رہے؟"

میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے' ہم نے لیزر گن سائیٹ کا سراغ لگا لیا ہے۔ یہ فوجی سپلائی لے کر گن سائیٹ کے پیرامیٹر میں جا رہے ہیں۔ آڑ میں ہی رہنا۔ کوئی بات نہ کرنا اور اپنے آپ کو چھپائے رکھنا۔"

چٹان کافی بڑی تھی جس کی اوٹ میں ہم چھپے ہوئے تھے۔ چاروں فوجی سپاہی بکس سروں پر اٹھائے آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ وہ ہم سے زیادہ سے زیادہ سو گز کے فاصلے پر تھے۔ ہم بیٹھنے کی بجائے زمین پر لیٹ گئے تھے اور سر اٹھا کر چٹان کے کنارے پر سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ چاروں انڈین فوجی ہانپتے ہوئے' آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے جب ہم سے کافی اوپر چلے گئے تو ہم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ہماری نگاہیں ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ چاروں سپاہی ایک قطار کی شکل میں اوپر جا رہے تھے۔ اوپر بھی اب دو سپاہی نظر آئے۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ دونوں فوجی پہاڑی دیوار کے کسی شگاف میں سے نکل کر باہر آئے تھے۔ ان میں سے ایک فوجی نے نیچے سے آنے والے فوجیوں کو جلدی اوپر آنے کا آرڈر دیا تھا۔ سپاہی ہانپتے ہانپتے اوپر پہنچ گئے۔ پھر اوپر والے دونوں فوجیوں کے ساتھ غائب ہو گئے۔ وہ غائب نہیں ہوئے تھے بلکہ پہاڑی کی دیوار میں جو غار یا شگاف تھا اس میں چلے گئے تھے۔ میں نے قاسم سے کہا۔

"قاسم! لیزر گن اسی پہاڑی کی دوسری طرف لگی ہوئی ہے۔ اس طرف غار کا دہانہ ہے۔ یہ غار دوسری طرف سمندر کے رخ پر چلی گئی ہے۔ لیزر گن دوسری جانب کسی بہت بڑی خندق میں نصب کی گئی ہے۔"

پہاڑی کے اوپر مجھے ایک جگہ ٹوکری سی اوپر کو اٹھی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے قاسم کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھو لیزر گن کا ریڈار پہاڑی کے اوپر لگا ہوا ہے۔"

قاسم نے ریڈار کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا خیال ہے اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ ہمارا سراغ رسانی کا مشن مکمل ہوگیا ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں نے سارے علاقے کی اہم جگہوں کو اپنے حساب سے ذہن میں نوٹ کر لیا ہے۔ چلو واپس چلتے ہیں۔"

اس وقت دن ڈھلنے لگا تھا۔ سورج دوارکا کی ساحلی پہاڑیوں کے اوپر نکلتا چلا جا رہا تھا۔ ہم جس طرف سے آئے تھے اسی طرف سے واپس چل پڑے۔ جب ہم پہاڑی ڈھلان سے اتر کر اس جگہ پر آئے جہاں پتھروں اور چٹانوں کے درمیان سمندری لہروں کا پانی جمع ہوگیا تھا تو ایک طرف سے دو فوجی سپاہی نکل کر ہمارے سامنے آگئے۔ انہوں نے ہمیں روک لیا۔ ایک فوجی نے پوچھا کہ ہم کون ہیں اور ادھر کیا کرتے پھرتے ہیں۔ میں خاموش رہا کیونکہ میں نے یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں نے خاموشی کا روزہ یعنی مون برت رکھا ہوا ہے۔ مجاہد قاسم نے انہیں سنبھال لیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ قاسم بڑا اچھا اداکار بھی ہے۔ وہ ہندوؤں کی دیوی دیوتاؤں اور سادھو سنیاسیوں کے بارے میں اور ان کی کمزوریوں سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے بازو اوپر اٹھا کر گجراتی زبان میں کوئی اشلوک پڑھا اور کہا۔

"ہم مہاویر کے بھگت ہیں۔ دوارکا جی کے مندر کی یاترا کرنے کے بعد یہاں گیان دھیان کرنے آئے ہیں۔"

دونوں سپاہیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان پر مجاہد قاسم کے اپدیش کا اثر ہوگیا تھا۔ دوسرے سپاہی نے کہا۔

"مہاراج! آپ کو معلوم نہیں ادھر کسی کو آنے کی پرمیشن نہیں ہے۔ یہ سویلین کے لیے آؤٹ آف باؤنڈ علاقہ ہے۔"

قاسم نے ایک بار پھر بازو اٹھا کر بلند آواز میں کہا۔

"ہم مہاویر کے داس ہیں۔ ان پہاڑیوں میں ہمارے مہاویر جی بھگوان کی تپسیا کرتے رہے ہیں۔ یہ جگہ ہمارے لیے پوتر ہے۔"

پہلے سپاہی نے کہا۔

"مہاراج! آپ ادھر نہیں جا سکتے۔ آپ یہاں سے نیچے دوسری پہاڑیوں میں چلے جائیں وہاں جا کر سادھی لگا لیں۔"

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ جان چھوٹی۔ میں ایک طرف چل پڑا۔ قاسم جیسے میرے چلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سپاہیوں سے کہا۔

"ست بچن' ست بچن۔ جے ہو مہاویو مہاویر کی۔"

اور وہ بھی میرے پیچھے چلنے لگا۔ ہم وہاں سے نشیبی علاقے میں اتر گئے۔ مجاہد قاسم رک گیا۔ اس نے بازو اٹھا کر جے مہاویر جے مہاویر کا نعرہ لگایا اور پیچھے دیکھا۔ اصل میں وہ اس بہانے دیکھنا چاہتا تھا کہ سپاہی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہے۔ میں نے بھی پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سپاہی ٹیلے کی چڑھائی چڑھتے دکھائی دیے۔ میں نے قاسم سے کہا۔

"تم تو بڑے اچھے ایکٹر ہو قاسم بھائی!"

وہ مسکرایا۔ کہنے لگا۔

"میں نے ساری زندگی گجرات کاٹھیاواڑ میں گزاری ہے۔ ان لوگوں کے ذہن کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ لیکن سوچتا ہوں اگر ان کی جگہ سکھ یا گورکھا فوجی ہوتے تو پھر ہم پھنس گئے تھے۔ کیونکہ ان پر مہاویر جین کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ضرور ہمیں اینٹروگیشن کے لیے پکڑ کر لے جاتے۔"

اسی طرح آپس میں باتیں کرتے ہم اس علاقے سے نکل کر دوارکا شہر کو جانے والی پتھریلی سڑک پر آ گئے۔ قاسم کہنے لگا۔

"اب ہمیں یہاں سے سیدھا شیر خان کے مکان پر نہیں جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہو کیونکہ ہم فوج کے ایک انتہائی حساس علاقے سے نکل کر آ رہے

ہیں۔"

"تو پھر کیا کریں؟" میں نے پوچھا۔

قاسم بولا۔

"یہاں قدم قدم پر جین مندر ہیں۔ کسی مندر میں چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جب اندھیرا ہوگا تو شیر خان کے گھر کی طرف چلے جائیں گے۔"

قاسم ان جگھوں کو خوب جانتا ہے۔ وہ قریب ہی پیپل کے ایک درخت کے پاس لے گیا جس کے نیچے ایک بیل کی مورتی لگی تھی۔ بیل کے اوپر ایک آدمی سوار تھا۔ وہاں صرف ایک بوڑھی عورت جھاڑو دے رہی تھی۔ گائے اور بیل تو میں نے ہندوستان کے تقریباً" ہر شہر میں شتر بے مہار کی طرح سڑکوں پر چلتے پھرتے دیکھتے تھے۔ ہمارے شہر میں اس طرح کوئی لا وارث بیل پھرتا نظر آئے تو دوسرے لمحے وہ بوچڑ خانے پہنچ جائے مگر بھارت کے شہروں میں تو بیل اور گائے کی پوجا ہوتی ہے۔ گائے کو ہندو گئو ماتا کہتے ہیں۔ بیل پر چونکہ دیوتا شو سواری کرتا تھا اس لیے اسے بھی مقدس سمجھا جاتا ہے۔ جنوبی اور بھارت کے مغربی علاقے میں تو کوئی بیل بازار میں نظر آ جائے تو لوگ اسے دودھ پلاتے ہیں۔ لڈو کھلاتے ہیں۔ اس پر ہار ڈالتے ہیں۔ یہاں بھی اسی طرح کے ایک بیل کی مورتی پیپل کے درخت تلے نصب تھی۔ درخت میرے خیال میں پیپل کا ہی تھا۔ اگرچہ اس علاقے میں پیپل تقریباً" ختم نہ ہونے کے برابر ہے۔ عورت نے دو جینی سادھوؤں کو آتے دیکھا تو جھاڑو چھوڑ کر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی۔ مجاہد قاسم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے گجراتی زبان میں آشیر باد دی اور ہم بیل کی مورتی کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔

ہمیں دن ڈوبنے کا انتظار تھا کہ ذرا اندھیرا ہو تو ہم وہاں سے شیر خان کے گھر کی طرف چلیں۔ دو جینی سادھوؤں کو بیل کی مورتی کے پاس بیٹھے دیکھ کر دو تین دیہاتی مزدور ٹائپ کے لوگ بھی وہاں آ گئے۔ ہمارے پاؤں چھو کر ان میں سے دو تو اٹھ کر چلے گئے۔ ایک وہیں ہاتھ باندھے بڑے ادب سے بیٹھا رہا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ

ہمارے پاس کوئی بیٹھے۔ ہمیں آپس میں باتیں بھی کرنی تھیں۔ قاسم نے اسے گجراتی میں کچھ کہا۔ وہ آدمی رونے لگا۔ اس نے روتے ہوئے گجراتی میں کوئی جواب دیا اور قاسم کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ ان کے درمیان گجراتی زبان میں کچھ مکالمے ہوئے اور وہ آدمی اٹھ کر اپنے آنسو پونچھتا ہوا چلا گیا۔ درمیانی عمر کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ رنگ کھلتا ہوا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے مجاہد قاسم سے پوچھا۔

"یہ آدمی کیا کہہ رہا تھا؟"

قاسم نے کہا۔

"کرم داد بھائی! ان دیہاتی لوگوں کے بڑے مسئلے ہوتے ہیں۔ کہتا تھا میں غریب ہوں۔ روزگار نہیں ملتا۔ ساہوکار سے قرض لیا تھا' اب وہ تنگ کرتا ہے۔ کہتا ہے قرض مع سود واپس کرو یا اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دو۔"

میں نے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہ کی اور اپنے مشن کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ میں نے مجاہد قاسم سے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے ہمیں رات کو کس وقت اس طرف آنا چاہیے۔"

وہ بولا۔

"آدھی رات کے بعد کا وقت ٹھیک رہے گا۔ اس وقت گشت کرنے والے سنتریوں پر بھی نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور ان سے غفلت ہو سکتی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اب کسی دوسرے راستے سے لیزر گن پوسٹ والی پہاڑی پر جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس طرف سیکورٹی زیادہ ہو کیونکہ توپوں کے بنکرز بھی اسی طرف ہیں۔"

مجاہد قاسم بولا۔

"پہاڑی کے اوپر جانے کا صرف یہی ایک محفوظ راستہ ہے۔ دوسرا راستہ سمندر کی طرف سے ہے جو اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہاں سیکورٹی بھی سخت ہوگی اور

ڈھلان پر ہو سکتا ہے نیوی کی مشین گن چوکیاں بھی ہوں۔ اس لیے ہم اسی راستے سے پہاڑی پر چڑھیں گے۔ آگے چڑھائی زیادہ نہیں ہے۔"

"ہمیں اپنے ساتھ ہتھیار ضرور رکھنے ہوں گے۔"

"ایک ایک چاقو اور آٹومیٹک پستول کافی ہو گا۔"

مجاہد قاسم نے کہا۔

"کیونکہ یہ ہمارا کمانڈو آپریشن نہیں ہے۔ یہ ریکی مشن ہے۔ ہمیں ٹارگٹ کی نشان دہی کرنی ہے۔"

میں خاموش رہا۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ ایک عورت ہمارے لیے مٹی کے پیالے میں دہی لے کر آ گئی۔ دہی کا پیالہ اس نے ہمارے آگے رکھ دیا اور ہاتھ باندھ کر بولی۔

"مہاراج! مجھے آشیرباد دیجئے۔ میرے بچے کو گودی پر نوکری مل جائے۔"

مجاہد قاسم نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"بن جا! بھگوان مہاویر تیرے بچے کو روزگار پر لگا دیں گے۔ اب تو جا۔"

عورت چلی گئی۔ قاسم کہنے لگا۔

"یہ لوگ انتہائی توہم پرست اور ضعیف الاعتقاد ہیں۔ جب تک ہم یہاں بیٹھے رہے یہ کسی نہ کسی طرف سے نکل کر یہاں آتے رہیں گے۔ میرا خیال ہے ہمیں لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے اور یہاں سے نکل پڑنا چاہیے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بیل کی مورتی والے درخت کے قریب سے ایک پتھریلا رستہ پتھروں اور سوکھی گھاس کے درمیان سے گزرتا کھاڑی کی طرف جاتا تھا۔ ہم اس پر چلنے لگے۔ قاسم بولا۔

"تم بھی اس سارے علاقے کو یاد کر لو۔ کچھ پتہ نہیں رات کس قسم کے حالات بن جائیں اور تمہیں اس طرف اکیلا آنا پڑ جائے۔"

شیلا نے کہا۔

"یہ علاقہ میرے ذہن میں ہے تم بے فکر رہو۔"

ابھی شام نہیں ہوئی تھی۔ ہم شیر خان کے گھر اندھیرا ہو جانے کے بعد جانا چاہتے تھے۔ یہ سارا علاقہ ایسا تھا کہ کہیں خشکی تھی اور کہیں پانی جمع تھا اور کہیں دلدل سی بنی ہوئی تھی۔ قاسم ایک بہت بڑے پتھر کی اوٹ میں مجھے ساتھ لے کر بیٹھ گیا۔ یہاں آس پاس کوئی انسان نہیں تھا۔ ہم دیر تک وہاں بیٹھے اپنے رات والے مشن کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ پھر سورج مغرب کی جانب دوارکا کی ساحلی پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا اور اندھیرا چھانے لگا۔ جب کافی اندھیرا ہو گیا تو ہم اٹھ کر شیر خان کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہاں شیر خان کے علاوہ کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون بھی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کمانڈو خالد نے مجھ سے پوچھا۔

"مشن کیسا رہا کرم داد؟"

میں نے کہا۔

"سر او کے۔"

پھر ہم نے انہیں ساری روئیداد سنائی اور بتایا کہ جہاں بڑی لیزر گن کی پوسٹ ہے وہاں تک دن کی روشنی میں ہم نہیں جا سکتے۔ کمانڈو خالد نے پوچھا۔

"کھائی میں توپیں کس قسم کی تھیں۔ تم آرمی کے آدمی ہو۔ تمہیں تو ان کی شناخت ہو گی۔"

یہ سوال کمانڈو خالد نے مجھ سے کیا تھا۔ میں نے کہا۔

"جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ فیلڈ گنیں ہیں ان کی مار کافی دور تک ہے۔ وہاں دونوں جانب مشین گنوں کی چوکیاں بھی ہیں۔"

کمانڈو ہارون کہنے لگا۔

"ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ ہم ان توپوں کو بھی اڑا سکیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنی ساری توجہ بڑی لیزر گن پوسٹ پر دینی چاہیے۔ کیونکہ یہی ہمارا

ٹارگٹ ہے۔ کیونکہ یہ ہمارا کمانڈو مشن ہے ہم کسی فوجی کیمپ پر فوجی حملہ نہیں کرنے جا رہے۔"

کمانڈو خالد نے ہارون کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن اس کے واسطے ہمیں بڑی لیزر گن پوسٹ کی پوری پوزیشن کا علم ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا۔

"یہ پوزیشن ہم انشاء اللہ آج رات معلوم کر کے ہی آئیں گے۔ دن کی روشنی میں گن پوسٹ نئی پہاڑی کی طرف جانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ وہاں سیکورٹی بڑی سخت ہونے کا امکان ہے۔"

کمانڈو خالد نے مجھ سے پوچھا۔

"کرم داد! تم کیا مشورہ دیتے ہو۔ اس صورت حال میں ہمیں کس قسم کا اسلحہ ساتھ لے کر جانا ہو گا؟"

میں نے کہا۔

"کمانڈر! اس کا فیصلہ تو گن پوزیشن اور وہاں کی سیکورٹی اور حالات کو دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" کمانڈو خالد بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے تم دونوں رات کے اندھیرے میں گن پوزیشن کا درست اندازہ لگا سکو گے؟"

میں نے کہا۔

"میں آرمی کا آدمی ہوں۔ توپوں کے ڈیپلائے سسٹم کی شناخت کر سکتا ہوں۔ لیکن ہمیں رات کے وقت اس مہم پر جاتے ہوئے ہتھیاروں کی ضرورت ہو گی۔"

شیر خان بولا۔

"جو اسلحہ ہمیں یہاں میسر ہے وہ ہم آپ لوگوں کو دے دیں گے۔ تم نے کہا تھا کہ تمہیں آٹومیٹک پستولوں کی ضرورت ہو گی۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "دو آٹومیٹک پستول جن پر سلینسر کی نالیاں لگی ہوں اور ایک ایک کمانڈو چاقو کافی رہیں گی۔ کیونکہ ہم دیکھ بھال اور ریکی مہم پر جا رہے ہیں۔ گن پوسٹ اڑانے کے لیے کس قسم کے اسلحہ کی ضرورت ہوگی۔ یہ گن پوزیشن دیکھنے کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"میرا خیال ہے رات کے وقت آپ لوگوں کو سادھوؤں کے بھیس میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نارمل کمانڈو لباس میں جائیں گے۔"

مجاہد قاسم بولا۔

"ہاں کمانڈو لباس کی سیاہ پتلون اور جیکٹ ہمیں اندھیرے میں چھپائے رکھی گی' جبکہ سادھوؤں والا سفید لباس دور سے نظر آ سکتا ہے۔"

"تو پھر تیاریاں شروع کر دو۔" خالد نے کہا۔

ہارون بولا۔

"پہلے کچھ کھا پی لو۔ تم کس وقت یہاں سے نکلنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آدھی رات کے بعد یہاں سے نکلیں۔ وہ وقت نیند کے غلبے کا وقت ہوتا ہے اور سیکورٹی گارڈز کسی حد تک غافل ہوسکتے ہیں کیونکہ یہ جنگی صورت حال نہیں ہے۔ ابھی حالات نارمل ہیں۔"

شیر خان اٹھتے ہوئے بولا۔

"میں کھانے کا بندوبست بھی کرتا ہوں اور ہتھیاروں کا بھی انتظام کرتا ہوں۔"

شیر خان مکان سے باہر چلا گیا۔ میں ہارون' خالد اور قاسم سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور رات کی سراغرسانی مہم کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ کمانڈو خالد نے مجھ سے پوچھا۔

"تم لوگوں کو وہاں کوئی مشتبہ شخص تو نہیں ملا؟"

کمانڈو قاسم نے کہا۔

"کوئی نہیں۔ ایک عورت ملی تھی۔ دو تین آدمی ملے تھے اور ہاں یاد آ گیا۔۔۔۔۔"

حیرانی کی بات ہے کہ ہم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ جب ہم کھائی والی توپوں کی پوزیشن سے واپس آ رہے تھے تو ہمارا دو انڈین سپاہیوں سے آمنا سامنا ہوگیا تھا۔ یہ واقعہ نہ مجھے یاد رہا تھا' نہ قاسم کو ہی اس کا خیال آیا تھا۔ دراصل وہاں دوسری اہم باتوں پر اتنی جلدی جلدی بحث ہونے لگی تھی کہ یہ واقعہ ذہن سے نکل گیا تھا۔ جب ہم نے اس کا ذکر کیا تو کمانڈو خالد نے کہا۔

"اب تمہیں زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تمہیں رات کو اس طرف سے نہیں جانا ہوگا۔"

پھر اس نے قاسم سے پوچھا۔

"قاسم! کیا پہاڑی پر جانے کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے کوئی ایسا راستہ جو توپوں والے بنکر سے ہٹ کر ہو؟"

قاسم بولا۔

"کمانڈر! دوسرا راستہ سمندر کی طرف سے ہے۔ جہاں میں سمجھتا ہوں کہ سیکورٹی زیادہ سخت ہوگی اور مشین گنوں کے خفیہ مورچے بھی ہوسکتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو میں اور کمانڈو کرم داد توپوں سے کافی دور ہوکر پہاڑی پر جائیں گے۔ میں ان پہاڑیوں سے اچھی طرح واقف ہوں اور دن کے وقت بھی انہیں اچھی طرح دیکھ چکا ہوں۔"

"اگر تم سمجھے ہو تو ٹھیک ہے۔" خالد نے آہستہ سے کہا۔

شیر خان ایک گھنٹے بعد آیا۔ وہ تھیلے میں ہمارے لیے کھانا بھی لایا تھا اور ہتھیار بھی لایا تھا۔ میں نے آٹومیٹک پستولوں کو چیک کیا۔ بارہ راؤنڈ کے پستول تھے۔ سلینسر کی نالی کو کھول کر دوبارہ فٹ کیا۔ فالتو میگزین کے چار پیک بھی تھے۔ میں نے کہا۔

"فالتو میگزین کی ہمیں شاید ضرورت نہ پڑے۔ یہ پیک یہیں رہنے دو۔ بارہ راؤنڈ

میرے پستول کے اور بارہ راؤنڈ قاسم کے پستول کے بہت کافی ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کمانڈو چاقو بھی ہوں گے۔ ہماری یہی کوشش ہوگی کہ کمانڈو چاقو سے کام لیا جائے پستول کا فائر وہاں ہوگا جہاں ضروری ہوگا۔"

کمانڈو خالد میری بات کو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جب میں اپنی بات مکمل کر چکا تو اس نے کہا۔

"کیا خیال ہے کرم داد! تمہارے ساتھ ہارون نہ چلا جائے؟"

میں نے کہا۔

"کمانڈر! میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارا کمانڈو آپریشن نہیں ہے۔ صرف ریکی مشن ہے اور اس وقت صرف میں اور قاسم ہی دو ایسے کمانڈو ہیں جو علاقے کی پہاڑیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہارون کے لیے علاقہ اجنبی ہوگا اس لیے ابھی ہم دونوں ہی کافی ہیں۔ ہاں کمانڈو آپریشن کے وقت وہ بھی ہمارے ساتھ ہوگا اور آپ بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔"

ہارون بولا۔

"کرم داد! ٹھیک کہتا ہے کمانڈر! ابھی ان دونوں کو ہی جانا چاہیے۔"

"او کے۔ او کے۔" خالد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کے بعد ہم کھانا کھانے لگے۔ اس دوران شیر خان نے چائے تیار کر لی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد چائے کا دور شروع ہوگیا۔ ہم چائے بھی پیتے رہے اور باتیں بھی کرتے رہے۔ رات گزرتی چلی گئی۔ پھر رات کے بارہ بج گئے۔ تب کمانڈو خالد نے کہا۔

"تم لوگ تیار ہو جاؤ وقت ہوگیا ہے۔"

ہم نے منہ ہاتھ دھویا۔ ماتھے پر لگے ہوئے جین مت کے سفید نشانوں کو اچھی طرح سے صاف کیا۔ وضو کر کے دو نفل ادا کیے۔ اللہ کے حضور مہم کی کامیابی کی دعا مانگی اور سیاہ پتلون اور سیاہ جیکٹیں پہن لیں۔ کمانڈو چاقو ہم نے پتلون کی جیبوں میں

رکھ لیے اور پستول جیکٹ کی جیبوں میں اس طرح رکھ لیے کہ وقت پڑنے پر انہیں بڑی آسانی سے نکالا جا سکتا تھا۔ ہم نے چپلیں اتار کر ربڑ کے نسواری رنگ کے جوگر شوز پہن لیے تھے۔ میں نے اور کمانڈو قاسم نے اپنی اپنی گھڑیوں پر وقت ملایا۔ رات کے ٹھیک بارہ بج کر دس منٹ پر ہم شیر خان کے مکان سے نکل کر اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔

رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اگر میں سانپ کے روپ میں ہوتا تو اس اندھیرے میں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ پھر خیال آیا کہ کہیں میں سانپ کی شکل نہ اختیار کرلوں۔ اس وقت اس امر کی ضرورت تھی کہ انسانی شکل میں ہی رہوں۔ کیونکہ بڑی لیزر گن پوزیشن کی ایک ایک تفصیل کو دیکھنا اور ازبر کرنا تھا۔ سانپ کے روپ کی ضرورت کمانڈو مشن پر جاتے ہوئے پڑ سکتی تھی۔ لیکن میرے جسم کی حالت بالکل نارمل تھی۔ اور لگتا تھا کہ اب میں کافی عرصے تک انسانی شکل میں ہی رہوں گا۔ مجھے ناگن درگا کا خیال آنے لگا۔ اسے میری اشد ضرورت تھی مگر میں اس سے دور تھا۔ خدا جانے وہ سانپ کی شکل میں کہاں چھپی ہوئی ہوگی۔ واپس لکشمن پور جانا اس کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ میں اس سے بھوپال شہر کے نواح میں بھیروں جی کے مندر کے پاس جدا ہوا تھا۔ وہاں سے لکشمن پور کئی دنوں کے سفر پر تھا۔ ہو سکتا ہے وہ بھیروں جی کے مندر میں ہی کسی جگہ میرے انتظار میں چھپ کر بیٹھ گئی ہو۔ اسے میری بو بھی نہیں آ رہی ہوگی کیونکہ میں اس سے کافی دور تھا۔ سانپ دوسرے سانپ کی بو تو اتنی دور سے سونگھ لیتا ہے مگر انسان کی بو ہزار میل سے محسوس نہیں کر سکتا۔

میں یہی سوچتا ہوا مجاہد قاسم کے ساتھ اندھیرے میں چلا جا رہا تھا۔ ہم اندھیرے میں بہت دیکھ بھال کر چل رہے تھے۔ مجاہد قاسم اسی راستے سے مجھے لے جا رہا تھا جس راستے سے ہم دن کے وقت گئے تھے۔ ایک گھنٹے تک ہم چلتے رہے۔ آسمان بادلوں سے خالی تھا۔ ستارے چمک رہے تھے۔ ستاروں کی دھیمی سی روشنی آسمان پر مشرق

سے مغرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ پھر مجھے دوارکا کی ساحلی پہاڑیاں نیم روشن آسمان کے پس منظر میں دکھائی دینے لگیں۔ ہمارا رخ بھی اسی طرف ہوگیا۔ ہمیں پہاڑیوں کے دامن میں پہنچتے پہنچتے مزید ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ ہماری نگاہیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوگئی تھیں۔ علاقہ بھی میرا جانا پہچانا تھا۔

ایک جگہ سے زمین بلند ہو رہی تھی۔ دائیں جانب پتھروں کے درمیان سمندری لہروں کا چھوڑا ہوا پانی بھی دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر مجاہد قاسم رک گیا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں علاقے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"سامنے والے ٹیلے کا راستہ کھائی میں لگی ہوئی توپوں کی طرف جاتا ہے۔ ہمیں یہاں سے دائیں جانب چلنا ہوگا۔"

میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"تم اپنے حساب سے ٹھیک راستے پر چل رہے ہو ناں؟"

"انشاء اللہ۔"

یہ کہہ کر قاسم دائیں طرف مڑ گیا۔ یہ پہاڑیوں کے دامن کا علاقہ تھا۔ ہم چھوٹے بڑے پتھروں اور چٹانوں میں سے گزر رہے تھے۔ اندھیرے میں ہم دیر تک چلتے رہے۔ قاسم ایک جگہ ٹیلے کی چڑھائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا اور سرگوشی میں کہنے لگا۔

"تھوڑی سی چڑھائی کے بعد گن پوسٹ والی پہاڑی شروع ہو جائے گی۔ اب ہمیں بڑی احتیاط کرنی ہوگی۔ ہمیں کھانسی آئے تو اسے روکنا ہوگا۔ چھینک آئے تو اسے بھی دبانا ہوگا۔ ہم انتہائی ضرورت کے وقت صرف سرگوشی میں بات کریں گے۔ اوکے؟"

"اوکے" میں نے جواب دیا۔

مجاہد قاسم نے آہستہ سے بسم اللہ پڑھی اور چڑھائی چڑھنی شروع کر دی۔ چڑھائی

سیدھی نہیں تھی۔ پھر بھی ہمیں جھک کر چلنا پڑ رہا تھا۔ مجاہد قاسم ایک بار پھر رک گیا اور میرے کان میں کہنے لگا۔

"پاؤں اس طرح رکھنا کہ کوئی پتھر نیچے نہ لڑھک جائے۔ پتھروں پر چلنے کی آواز بھی نہیں آنی چاہیے۔"

میں نے اس کے کان میں کہا۔

"فکر نہیں۔"

ہم سنبھل سنبھل کر دبا دبا کر پاؤں رکھتے ٹیلے کی چڑھائی چڑھ گئے۔ ہمارے سامنے ایک پیالے کی طرح کا چھوٹا سا نشیب تھا۔ ہم وہیں ٹیلے کے کنارے بیٹھ گئے۔ قاسم کی نگاہیں سامنے والی پہاڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

"یہ سامنے والی پہاڑی ہمارا ٹارگٹ ہے۔ پستول تیار رکھو لیکن ہاتھ میں چاقو پکڑو۔"

ہم نے جیکٹوں کی جیبوں میں سے اپنے اپنے پستول نکال کر اپنے حساب سے انہیں بغیر آواز پیدا کیے چیک کیا۔ انہیں واپس جیبوں میں رکھا اور کمانڈو چاقو کھول کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ مجاہد قاسم نے میرے کان کے پاس آ کر کہا۔

"تم میری بائیں جانب پانچ قدم کا فاصلہ رکھ کر ساتھ ساتھ چلو گے۔ تم ٹرینڈ آرمی کمانڈو ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ کیسے چلنا ہوگا۔ یہ سمجھ لو کہ ہم ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں۔"

ہم نے اپنے درمیان میں چھ قدم کا فاصلہ ڈال لیا اور نشیب میں اتر کر اندھیرے اور رات کے سناٹے میں چوکنے ہو کر جھک کر چلنے لگے۔ پہاڑی کی ڈھلان پر ہم نہ اوپر چڑھ رہے تھے' نہ نیچے اتر رہے تھے۔ ہم پہلو کی طرف سے ہو کر سیدھے چل رہے تھے۔ یہ رستہ قاسم کا جانا پہچانا لگتا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہمیں ستاروں کی روشنی میں سامنے پھیلا ہوا بحیرہ عرب کا سمندر نظر آنے لگا۔ ہم پہاڑی کی سمندر والی سائیڈ پر آ گئے تھے۔ یہاں سے قاسم آہستہ آہستہ پہاڑی کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ میں اس کے پہلو

میں پانچ چھ قدم کے فاصلے پر تھا اور ہم اس طرح اوپر چڑھ رہے تھے جس طرح کبھی میں سانپ کی طرح رینگ کر چڑھائی چڑھا کرتا تھا۔

یہاں اوپر کو اٹھی ہوئی چھوٹی چھوٹی چٹانیں' پتھر اور نشیب تھے۔ ایک جگہ قاسم رینگتے ہوئے رک گیا۔ میں بھی رک گیا۔ اس نے بازو کے خاص اشارے سے ایک چٹان مجھے دکھائی اور خاص اشارے کا سگنل دیا۔ میں پیچھے سے ہو کر رینگتا ہوا اس کی دائیں جانب آ گیا۔ دس قدم کے فاصلے پر ایک اونچی جگہ تھی۔ مجاہد قاسم نے میرے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی کی۔

"یہ مشین گن پوسٹ ہے۔ اس کو ذہن میں یاد رکھنا۔"

ہم بھی آگے گئے تو وہاں بھی دائیں بائیں ہمیں دو اسی طرح کی مشین گن پوسٹیں نظر آئیں۔ ہم کیڑے مکوڑوں کی طرح دم سادھے رینگتے ہوئے ان کے درمیان سے گزر گئے۔ مجھے صرف ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں یہاں انڈین آرمی نے بارودی سرنگیں نہ بچھائی ہوئی ہوں۔ انہیں ایسا کرنا چاہیے تھا مگر شاید انہوں نے اس خیال سے ایسا نہیں کیا تھا کہ وہاں تک ساحلی توپوں کی وجہ سے کوئی جنگی جہاز اپنی انفنٹری لے کر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ہم 'زخمی سانپ کی طرح سانس روکے مشین گن پوسٹ کی تین فٹ اونچی دیوار کے بالکل قریب سے ہو کر نکل گئے۔ یہ بڑی خطرناک گھڑی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر ہم پر قیامت ٹوٹ سکتی تھی۔

مشین گن پوسٹ کی دیوار کے بالکل ساتھ لگ کر رینگتے ہوئے مجھے پوسٹ کے اندر سے سگریٹ کے دھوئیں کی بو بھی آ رہی تھی۔ ہم رینگتے ہوئے آگے نکل گئے۔ قاسم بالکل زگ زیگ سا بناتا ہوا مجھے آگے لے جا رہا تھا۔ ہم پہاڑی کی چوٹی کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ ابھی تک ہم اس لیے سیکورٹی گارڈز کی نگاہوں سے بچے ہوئے تھے کہ ایک تو رات کی تاریکی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی دوسرے پہاڑی ڈھلان پر پتھروں کی آڑیں اور گہرائیاں بہت تھیں۔ جھاڑیاں کہیں کہیں ہی تھیں۔ قاسم ایک پتھر کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے پاس دبک کر بیٹھ گیا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اوپر اشارہ کیا۔

میں نے اوپر دیکھا وہاں ایک شگاف میں سے ہلکی ہلکی روشنی باہر آرہی تھی۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"یہاں لیزر گن نصب ہے' یہی ہمارا ٹارگٹ ہے۔"

میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"اس پوسٹ کے گشتی سنتری ضرور ہوں گے۔ وہ یہاں دکھائی نہیں دے رہے۔"

مجاہد قاسم اس بات کو زیادہ نہ سمجھ سکا۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کے کان میں سرگوشیاں کر کے سمجھایا کہ دفاعی مورچوں کی گن پوسٹوں پر رات کو سپاہی دو دو تین تین کی ٹولیوں میں پٹرول کرتے ہیں۔ ان کو گشتی پٹرول کہا جاتا ہے۔ ابھی یہ بات میرے منہ میں ہی تھی کہ ہمیں اپنے دائیں جانب کسی کے ہلکے سے قہقے کی آواز آئی۔ میں نے مجاہد قاسم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے وہیں نیچے کیا اور خود بھی زمین کے ساتھ اوندھا ہو کر لگ گیا۔ میری نظریں اپنی دائیں جانب لگی ہوئی تھیں' جدھر پہاڑی ڈھلان پر ستاروں کی دھندلی روشنی میں دو آدمی چلے آ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے باتیں بھی کر رہے تھے۔ وہ سیدھے ہماری طرف ہی آ رہے تھے۔ میں پریشان ہوا میں نے قاسم کے کان میں صرف اتنی سرگوشی کی۔

"ان پر حملہ نہ کرنا۔"

مجھے ڈر تھا کہ جوش میں آکر قاسم ان پر اس خیال سے چاقو سے حملہ نہ کر دے کہ ایک کو وہ سنبھال لے گا اور دوسرے کو میں ہلاک کر دوں گا۔ بعد میں قاسم نے مجھے بتایا کہ اگر تم مجھے منع نہ کرتے تو میں نے یہی طے کر لیا تھا کہ ایک فوجی کو میں دبوچ کر ہلاک کر دوں گا اور دوسرے کو تم جہنم رسید کر دو گے۔ جب دونوں آدمی قریب آئے تو میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ دونوں انڈین سپاہی تھے جو رات کے وقت گشتی ڈیوٹی پر تھے۔ اس وقت کسی بھی بھارتی فوجی کو ہلاک کرنے کی پوزیشن میں نہیں

تھے کیونکہ ہم سراغ رسانی کے مشن پر تھے۔ کمانڈو اپریشن کے لیے نہیں آئے تھے۔ اگر گشتی سنتریوں میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو بھی ہلاک کر دیتے تو ہمیں تو کوئی فائدہ نہ پہنچنا تھا مگر ان کی لاشیں ملنے پر پوسٹ کی گارڈ الرٹ ہو جاتی اور سیکورٹی بھی انتہائی سخت کر دی جاتی۔ اور ہمارا کمانڈو آپریشن کا منصوبہ ناکام ہو جاتا۔

دونوں سنتری ایک دوسرے سے دبی آواز میں باتیں کرتے ہمارے بالکل اوپر سے گزر گئے۔ اوپر سے مراد یہ ہے کہ جس پتھر کی آڑ میں ہم چھپے ہوئے تھے وہ اس کے بالکل قریب سے گزر گئے۔ وہاں ڈھلان پر چھوٹی سی پگڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ جب وہ دور چلے گئے تو میں نے مجاہد قاسم کے کان میں کہا۔

"یہ سنتری واپس بھی آئیں گے ہمیں ان سے خبردار رہنا ہوگا۔"

قاسم اوپر پہاڑی شگاف کو دیکھ رہا تھا جہاں روشنی تھی۔ کہنے لگا۔

"ہمیں یہاں سے دوسری طرف رینگ کر اوپر جانا ہے۔ لیزر گن کو دیکھ کر نشان دہی ضروری ہے۔"

میں بھی اوپر دیکھ رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"دوسری طرف مشین گن کے مورچے ضرور ہوں گے۔"

اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

"ہم چوکس ہو کر جائیں گے۔ لیزر گن کی نشان دہی ضروری ہے۔ بسم اللہ پڑھ کر آجاؤ۔"

ہم اپنی دائیں جانب پہاڑی ڈھلان کے متوازی رینگنے لگے۔ ابھی تک ہم صرف اس لیے بچے ہوئے تھے کہ یہ جگہ پاکستان سے بہت دور تھی اور سمندر میں انڈین نیوی کے جنگی جہاز بھی موجود تھے اور آج تک وہاں کمانڈو آپریشن کی کوئی واردات بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہاں اتنی سخت اور گنجان سیکورٹی نہیں تھی۔ انڈین نیوی اور آرمی نے بڑی گن پوسٹ کے آس پاس سیکورٹی کی خاطر چند ایک مشین گن پوسٹیں ہی کافی سمجھی تھیں۔ ان کے علاوہ نیچے ٹرینچ یا کھائی میں نصب توپیں اور چوٹی پر طیارہ

شکن گنیں بھی دفاعی مقاصد کے لیے کافی تھیں۔ مجاہد قاسم اور میں اوپر کو ہو گئے۔ ہم پہاڑی ڈھلان کے ساتھ پیٹ کے بل چپٹے زمین سے نکلے ہوئے پتھروں اور جھاڑیوں کی سوکھی جڑوں کو پکڑ پکڑ کر آہستہ آہستہ اوپر کی طرف جا رہے تھے۔

یہاں مجھے پہلی بار ستاروں بھرے آسمان کے پس منظر میں ریڈار کا ایریل دکھائی دیا۔ قاسم میرے آگے تھا۔ وہ پندرہ بیس گز رینگتا اور پھر ذرا دائیں جانب کو ہو جاتا۔ اسی طرح رینگتے ہوئے ہم ایک ہموار جگہ پر آ کر اوندھے لیٹ گئے۔ یہاں سے ہمیں شگاف کا روشن دہانہ صاف نظر آ رہا تھا۔ گہری خاموشی تھی' کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کسی کسی وقت دور نیچے سمندری لہروں کے ساحلی پتھروں سے ٹکرانے کا ہلکا ہلکا شور سنائی دے جاتا تھا۔ قاسم نے میرا کندھا خاص انداز میں دبایا۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ دائیں جانب سے اور میں بائیں جانب سے اوپر جاؤں گا۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ چڑھائی خطرناک نہیں تھی۔ جگہ بڑی خطرناک تھی۔ کسی بھی وقت ہم پر کسی مشین گن پوسٹ سے گولیوں کی بوچھاڑ آ سکتی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر روشنی کا گولا فائر ہو سکتا تھا اور وہاں دن کی طرح روشنی پھیل سکتی تھی اور دشمن ہمیں دیکھ کر وہیں بھون سکتا تھا۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ میں بائیں جانب اوپر کی طرف رینگ رہا تھا۔ ہم ٹارگٹ کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دشمن کے مورچے کے اندر آ گئے تھے۔

پہاڑی شگاف کے دہانے کی روشنی قریب ہو رہی تھی۔ ہم چونکہ سمندر کی جانب سے چڑھائی چڑھ رہے تھے اس لیے ابھی تک محفوظ تھے کیونکہ اس طرف سیکورٹی اتنی سخت نہیں تھی اور صرف تین چار مشین گن مورچے ہی تھے جس کے توپچی شاید سو گئے ہوئے تھے۔ اگر جاگ رہے تھے تو ہم ان کے مورچوں کے قریب سے اس قدر محتاط ہو کر گزرے تھے کہ انہیں ہماری ہلکی سی آہٹ تک بھی نہیں آئی تھی۔ یقین کریں جب میں شگاف کے بالکل قریب آ گیا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ خوف اور دہشت کی وجہ سے میں لاکھ کہوں کہ میرے اندر ایمان کا جذبہ اپنے عروج پر تھا۔ میں بڑا بہادر تھا۔ میں بڑا تربیت یافتہ کمانڈو تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس خطرناک تباہ

کن بڑی لیزر گن کی قلعہ بندی کے دہانے پر پہنچ کر ایک بار میں بھی خوف زدہ ہوگیا تھا۔

میں چونکہ آرمی کا سابق کمانڈو تھا لیکن یہ خوف ایک لمحے کے لیے اس لیے بھی طاری ہوگیا تھا کہ مجھے فوج کو چھوڑے کئی سال ہوگئے تھے اور فوجی زندگی کی مجھے عادت نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے دوسرے ہی لمحے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ ڈر خوف کو دل سے نکال کر پھینک دیا اور اللہ کا نام لے کر دہانے میں سے سر ذرا سا اوپر کر کے شگاف میں دیکھا۔ یہاں پہاڑی کھود کر ایک غار سا بنا دیا گیا تھا۔ شگاف سے پانچ سات فٹ کے فاصلے پر ایک بہت بڑی مشین ٹائپ کی گن نصب تھی۔ گن کی نالی چمک رہی تھی۔ نالی زیادہ لمبی نہیں تھی۔ دیواروں پر بلب کی روشنی میں مختلف ڈائیل نظر آ رہے تھے۔ ایک فوجی جوان گن کے اوپر لگے ہوئے ایک ڈائیل کو سفید کپڑے سے چمکا رہا تھا۔ برین گن اس کے کندھے سے لٹکی ہوئی تھی۔ میری نگاہ شگاف کے سامنے والے دہانے پر پڑی تو مجھے مجاہد قاسم کا سر دکھائی دیا۔ وہ بھی سر اوپر کیے فوجی کو دیکھ رہا تھا۔ یہی بھارتی فوجی ہائی کمان کا وہ خطرناک ترین ہتھیار یعنی لیزر گن تھی کہ جس کے بل بوتے پر بھارت کراچی پر حملہ کرنے کے منصوبے تیار کر چکا تھا۔

ایک اور فوجی دوسری طرف سے اندر آگیا۔ اس نے پہلے فوجی سے شاید مراٹھی زبان میں کوئی مذاق کیا جس کے جواب میں پہلے فوجی نے ہنس کر اسے کوئی جواب دیا۔ میں نے دہانے کی دوسری طرف قاسم کو دیکھا۔ اس نے ہاتھ کا ہلکا سا اشارہ کیا۔ ہم دونوں وہیں سے نیچے ہو کر دبک گئے۔ اب ہمیں واپس جانا تھا۔ ہم نے ٹارگٹ دیکھ لیا تھا۔ ہمارا سراغرسانی کا مشن مکمل ہوچکا تھا۔ واپسی کی مہم زیادہ خطرناک تھی۔ آتی دفعہ تو ہم پہاڑی پر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے آتے تھے۔ جاتی دفعہ ہم رینگ کر نہیں جا سکتے تھے۔ اترائی پر ہمیں بیٹھ کر ہی واپس جانا تھا۔ یہ خطرناک عمل تھا لیکن راستے کی نشان دہی چونکہ ہم کر چکے تھے اس وجہ سے ہمیں تھوڑی سی سہولت میسر تھی۔ لیکن ہماری کمانڈو تربیت نے ہمارا ساتھ دیا اور اللہ نے ہماری مدد کی اور ہم کسی نہ کسی طرح

بڑی گن پوسٹ کی اترائی خیریت سے اتر گئے۔ آگے راستہ اتنا مشکل نہیں تھا لیکن ہمیں ڈھلان اترتے ہوئے ایک گھنٹہ لگ گیا۔

ہم مشین گن کے مورچوں کے قریب سے بھی خیریت سے نکل آئے۔ کہیں ہم پاؤں کے بل بیٹھ کر خرگوشوں کی طرح چلتے، کہیں گھٹنوں کی بل ہو کر لومڑیوں کی طرح چلتے رہے تھے۔ آخر ہم اس مقام پر آگئے جہاں گڑھوں میں سمندر کا گدلا پانی بھرا ہوا تھا اور چڑھائی اترائی تقریباً ختم ہوگئی تھی۔ ہم واقعی تھک گئے تھے۔ وہاں پہنچ کر ہم ایک دوسرے کے قریب ہوگئے اور بیٹھ گئے۔ مجاہد قاسم نے آہستہ سے یا اللہ تیرا شکر ہے کہا اور اندھیرے میں میری طرف دیکھا۔ میں خاموش تھا۔ میرا ذہن ان تمام نازک اور حساس مقامات کو محفوظ کر رہا تھا جہاں سے ہم دو بار گزر کر آئے تھے اور جہاں سے ایک بار ہمیں گزر کر کمانڈو آپریشن کر کے دشمن کی لیزر گن پوسٹ کو تباہ کرنا تھا۔ قاسم آس پاس پھیلے ہوئے اندھیرے میں غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"چلو۔"

ہم وہاں سے اٹھے اور تیز تیز واپس چل پڑے۔ یہاں بھی اگرچہ ہم ایک دوسرے کے درمیان تین چار قدموں کا فاصلہ رکھ کر چل رہے تھے لیکن ہم خطرے کے علاقے سے نکل آئے تھے۔ ہمیں اس علاقے سے نکلتے ہوئے بھی ایک گھنٹہ لگ گیا۔ جب ہم اس درخت کے پاس آگئے جہاں بیل کی مورتی لگی ہوئی تھی تو قاسم رک گیا اور مجھے ساتھ لے کر درخت کی دائیں جانب سے آگے نکل گیا۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد چھوٹی سی سڑک آگئی۔ ہم وہاں بیٹھ گئے۔ قاسم نے کلائی والی گھڑی کو غور سے دیکھ کر دھیمی آواز میں کہا۔

"رات کے تین بجنے والے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ ہمارا مشن کامیابی سے مکمل ہوگیا۔"

اس نے آہستہ سے کہا۔

"تم نے تمام حساس مقامات نوٹ کر لیے ہیں ناں؟"

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ ایک ایک تفصیل میرے ذہن میں محفوظ ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہیے۔"

"آ جاؤ۔"

قاسم اٹھ کھڑا ہوا اور ہم سڑک پار کر کے ایک نشیب سے اتر کر اس جگہ پر آ گئے جہاں سے دور دوارکا شہر کی روشنیاں ہمیں صاف نظر آنے لگی تھیں۔ ہمیں شیر خان کے مکان تک پہنچتے مزید آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ وہ لوگ یعنی کمانڈو ہارون' کمانڈو خالد اور شیر خان جاگ رہے تھے اور ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ وہ چائے کی نہ جانے کتنی پیالیاں پی چکے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان کے چہروں پر رونق آ گئی۔ شیر خان نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ کمرے میں صرف ایک ہلکی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ شیرخان نے چینک میں سے ہمیں چائے پیالیوں میں ڈال کر دی۔ گرم گرم چائے نے ہمارے اعصاب کو بڑا سکون دیا۔ ہم نے انہیں اپنے سراغرسانی کے مشن کی پوری تفصیل بیان کر دی۔ کمانڈو خالد' کمانڈو ہارون اور شیر خان بڑے غور سے سنتے رہے۔ جب ہم سب کچھ بیان کر چکے تو کمانڈو خالد نے ہماری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ اب تم ایک کام کرو جو بہت ضروری ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"حکم کریں کمانڈر!"

وہ بولا۔

"ساتھ والے کمرے میں زمین پر بستر لگا دیے گئے ہیں' فوراً وہاں جا کر سو جاؤ۔"

شیر خان اور کمانڈو ہارون بھی مسکرا رہے تھے۔ ہم نے پستول اور چاقو شیر خان کے حوالے کیے اور ساتھ والے کمرے میں جا کر بستروں پر گر پڑے۔ تھوڑی دیر میں

ہم گہری نیند سو رہے تھے۔

اگلے روز ہم دن کے ایک بجے اٹھے، غسل کیا اور اسی کمرے میں کمانڈو خالد، کمانڈو ہارون اور شیر خان بھی آ گئے۔ شیر خان کہنے لگا۔

"میں نے آج دکان سے چھٹی کی ہے، نوکر کو چھوڑ آیا ہوں۔ میرا خیال ہے ہمیں پہلے کھانا کھا لینا چاہیے۔"

شیر خان نے خود مچھلی اور چاول تیار کیے تھے۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر چائے کے دور پر اہم ترین گفتگو کا آغاز ہوا۔ کمانڈو ہارون پہلے ہی سے پنسل اور کاپی لے آیا تھا۔ اس نے کاپی اور پنسل میری طرف بڑھائی تو کمانڈو خالد نے کہا۔

"کرم داد! رات تم نے جو کچھ دیکھا ہے اور جہاں جہاں سے گزرے ہو وہاں کا نقشہ بنا دو اور حساس اور نازک مقامات کی نشان دہی بھی کر دو۔"

میں کاپی کھول کر اس پر اپنی یادداشت سے آڑھی ترچھی لکیریں بنانے لگا۔ قاسم میرے پاس ہی بیٹھا تھا، مجھے نقشہ بناتے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جہاں میں بھول جاتا وہ مجھے یاد دلا دیتا کہ یہاں بائیں جانب مشین گن پوسٹ تھی۔ پندرہ بیس منٹ میں نقشہ تیار ہو گیا۔ کمانڈو خالد اور ہارون اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ کمانڈو خالد نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھ کر مجھ سے پوچھا۔

"یہ تیر کا نشان کیسا ہے؟"

میں نے کہا۔

"یہاں سے اوپر وہ پگڈنڈی ہے جس پر سے گشتی پٹرول کے بھارتی سنتری گزرے تھے۔"

"کیا وہ اسی پگڈنڈی سے واپس بھی آئے تھے؟"

کمانڈو خالد نے یہ سوال مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے کہا۔

"ہم ان کے گزر جانے کے فوراً بعد دائیں جانب اوپر کی طرف چلے گئے تھے۔"

میرے اس جواب کی مجاہد قاسم نے بھی تائید کی۔ اس کے بعد دیر تک ہمارے

دونوں ساتھی کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون بڑے غور سے نقشے کا جائزہ لیتے رہے۔ حساس مقامات پر انگلیاں رکھ کر ان کی نشاندہی بھی کرتے رہے۔ جب وہ پوری طرح مطمئن ہو گئے اور نقشے کی ایک ایک تفصیل کو انہوں نے اپنے ذہن میں نقش کر لیا تو کمانڈو خالد نے شیر خان سے کہا۔

"شیر خان! میرے بھائی چائے کی ایک ایک گرما گرم پیالی اور ہو جائے۔"

شیر خان بولا۔

"ابھی بنا کر لاتا ہوں۔"

اور وہ چینک اٹھا کر کچن کی طرف چلا گیا۔ کمانڈو منظر خالد کہنے لگا۔

"یہ مشن اتنا آسان نہیں ہے۔ مجھے یہ خیال پریشان نہیں کر رہا کہ اس مشن سے ہمارے زندہ واپس آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ پریشانی صرف اس بات کی ہے کہ کیا ہم دشمن کی لیزر گن تباہ کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے؟"

سب پر خاموشی چھا گئی۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا کیونکہ ٹیکنیکل نقطۂ نظر سے یہ مشن خالص موت کا مشن تھا۔ ہم تو سراغرسانی کے مشن پر گئے تھے۔ ہم دشمن کے کسی ایک فوجی کو ہلاک کرنے اور فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ دوسرے ہم رات کے اندھیرے میں صرف تین چار مشین گن مورچے ہی دیکھ سکے تھے۔ یقینی طور پر وہاں اور مورچے بھی تھے جنہیں ہم نہیں دیکھ سکے تھے اور جو ہماری ٹریکنگ کی راہ میں نہیں آئے تھے۔ اب ہمیں ایکشن مشن پر جانا تھا اور ہمارے ساتھ دو کمانڈو اور جانے والے تھے یعنی خالد اور کمانڈو ہارون۔ ان لوگوں نے لیزر گن پوسٹ پر جانے والے راستے کو صرف نقشے پر ہی دیکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہم چاروں ایک ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ ہمیں بکھر کر ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر رہ کر اپنے اپنے راستوں پر چلنا تھا اور کمانڈو ہارون اور کمانڈو خالد ان کو ان راستوں کا تجربہ نہیں تھا۔ وہ چوکس ہو کر' چوکنے رہ کر ضرور چلتے مگر اس طرف مشین گن پوسٹیں بھی ہو سکتی تھیں اور کچھ تعجب نہیں کہ وہاں دشمن نے بارودی سرنگیں بھی بچھا رکھی ہوں۔ دوسری اہم بات یہ تھی

کہ پہاڑوں کے اندر غار بناکر جو لیزر گن دشمن نے نصب کر رکھی تھی اس کے اندر جا کر گن کو تباہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا کیونکہ یہ عام گولے والی توپ نہیں تھی۔ یہ لیزر گن تھی جس کی ساخت بھی ایک مشین کی طرح تھی۔ وہاں ہر وقت مسلح گارڈ موجود رہتی تھی اور خطرے کے الارم کا انتظام بھی ضرور کیا گیا ہوگا جس کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کس جگہ اچانک ہاتھ لگ جانے سے یہ الارم بج اٹھے گا۔ ہم نے گن کا جو مشاہدہ کیا تھا' وہ ایک بہت بڑی اور فولادی مشین لگ رہی تھی۔ اس کی نالی بہت چھوٹی تھی۔ جب میں نے لیزر گن کی فوجی نقطہ نگاہ سے کمانڈو خالد کو پوری تفصیل بتائی تو وہ کہنے لگا۔

"جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس لیزر مشین کی مضبوطی ٹینک سے کم نہیں ہے اور اس پر ہینڈ گرنیڈ کا شاید ہی کوئی اثر ہو۔"

کمانڈو ہارون نے کہا۔

"انڈین میرین کا یہ بہت بڑا پراجیکٹ ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں ریموٹ کنٹرول ٹی وی کیمرہ بھی کسی جگہ لگا ہوا ہو اور جیسے ہی ہم بنکر میں داخل ہوں' ہم ٹی وی سکرین پر دیکھ لیے جائیں۔"

کمانڈو خالد نے قاسم سے پوچھا۔

"کیا تم لوگوں نے شگاف کے اندر لگے ہوئے ڈائیلوں کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا؟"

مجاہد قاسم نے کہا۔

"میری نگاہ سامنے والی دیوار پر تھی۔ وہاں مجھے کچھ ڈائیل اور ایک پینسل پر دو کمپیوٹر پڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔"

کمانڈو خالد نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

"میں نے بھی اپنی سامنے والی بنکر کی دیوار پر ڈائیل دیکھے تھے۔"

کمانڈو خالد کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔

"کرم داد ! تمہارا کیا خیال ہے ہمیں کس قسم کا کمانڈو ایکشن پلان تیار کرنا چاہیے۔"

شیر خان چائے کی چینک لے کر آ گیا۔ کمانڈو خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے پہلے گرم چائے کی ایک ایک پیالی پی جائے۔ پھر دماغ زیادہ روشن ہو کر سوچے گا' کیا خیال ہے ہارون؟"

شیر خان پیالیوں میں چائے ڈالنے لگا۔ چائے بڑی اچھی بنائی تھی شیر خان نے۔ بھارت کے اس علاقے میں چائے اچھی مل جاتی تھی' وہاں سے ذرا نیچے جائیں تو کافی کا رواج شروع ہو جاتا تھا۔ چائے پیتے ہوئے ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب چائے پی چکے تو خالد نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"اوکے کرم داد! تمہارے خیال میں ہمیں کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے؟"

میں اس دوران کافی کچھ سوچتا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"کمانڈر! مجھے تو ایک ہی صورت نظر آتی ہے۔"

"وہ کیا؟" کمانڈو ہارون نے پوچھا۔

کمانڈو خالد بولا۔

"تم آرمی کے سابق کمانڈو ہو کرم داد! تم ضرور کوئی بڑی کارگر تدبیر بتاؤ گے۔"

میں نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ہم صرف ایک ہی طریقے سے یقینی طور پر دشمن کی لیزر گن کو تباہ کر سکتے ہیں کہ جس قدر بارود اوپر لے جا سکتے ہیں لے جائیں۔ اسے توپ کے نیچے لگا کر سارے کے سارے بنکر کو ایک ہی دھماکے سے اڑا دیں۔"

کمانڈو خالد اور ہارون ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ہارون بولا۔

"اتنا بارود ہم اس قدر خطرناک علاقے میں اتنی بلندی پر کیسے پہنچائیں گے جہاں قدم قدم پر دشمن مشین گنیں اور توپیں لگائے بیٹھا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ہم یہ بارود انتہائی دھماکہ خیز ٹائم بموں کی شکل میں لے جائیں گے۔ یہ ٹائم بم بارودی سنکوں والے ہوں گے جو ریموٹ کنٹرول کے ذریعے پھٹیں گے۔"

کمانڈو خالد نے ہارون سے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے ہارون؟"

وہ بولا۔

"کمانڈر! تجویز تو صحیح ہے اپنی جگہ پر۔ بارود سے تو ساری پہاڑی اڑائی جا سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"میں یہی چاہتا ہوں کہ صرف لیزر گن کی بجائے پہاڑی کے سارے کے سارے اوپر والے حصے کو اڑا دیا جائے۔ ہم یہ انتہائی طاقتور دھماکہ خیز بم لیزر گن کے بائی پاڈ کے نیچے لگائیں گے۔ یہ بم کم از کم تعداد میں دس ضرور ہونے چاہییں۔ جب اتنی کثیر مقدار کا بارود زبردست دباؤ کے ساتھ پھٹے گا تو لیزر گن کے ساتھ پہاڑی بنکر بھی اڑ جائیں گے۔ ہمارے مشن کی کامیابی کی یہی ایک صورت ہے۔"

کمانڈو خالد نے شیر خان کی طرف دیکھا۔

"کیوں ہمارے شیر خان! تم نے بھی ساری بات سن لی ہے۔ کیا تم اس قسم کے دس پندرہ ٹائم بموں کا انتظام کر سکتے ہو؟"

شیر خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کمانڈر! دستی بموں کا تو بندوبست ہو سکتا ہے مگر اس قسم کے ٹائم بم ہمارے آدمیوں کے پاس نہیں ہیں۔ یہ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔"

کمانڈو خالد نے ہارون سے پوچھا۔

"کیوں ہارون! تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

کمانڈو ہارون کہنے لگا۔

"خالد بھائی! بارودی سنکوں والے ٹائم بم ہمارے بھوپال والی خفیہ کمین گاہ میں بھی نہیں ہیں۔ اس کے لیے تو ہمیں بھوپال چھاؤنی میں انڈین آرمی کے کسی گولہ بارود کے ذخیرے پر شب خون مارنا ہوگا۔"

تب شیر خان نے کہا۔

"اگر کسی فوجی ایمونیشن ڈپو پر ہی شب خون مار کر یہ اسلحہ حاصل کرنا ہے تو بھوپال جانے کی کیا ضرورت ہے' دوارکا میں ہی کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔"

خالد نے پوچھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

شیر خان نے کہا۔

"یہاں ساحل کے جنوب میں ایک پہاڑی کے دامن میں انڈین نیوی کا ایک گولہ بارود کا ڈپو ہے۔ وہاں نیوی کے ٹرک آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے گولہ بارود کے اس ذخیرے میں آپ کے مطلوبہ ٹائم بم بھی ہوں۔"

میں نے اس پر کہا۔

"اگر یہ ڈپو نیوی کا ہے تو وہاں بارودی سنکوں والے ٹائم بم ضرور ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ بم بحریہ کے غوطہ خور کمانڈو دشمن کے جہازوں کو اڑانے کے لیے جہاز کے نیچے جا کر اس کے پیندے سے چپکا دیتے ہیں۔ یہ بم مائیکرو ویوز کے ذریعے ریموٹ کنٹرول سے منسلک ہوتے ہیں اور ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبانے سے پھٹ جاتے ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو ہمیں اسی گولہ بارود کے ڈمپ پر شب خون مارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

اتنا کہہ کر کمانڈر خالد نے شیر خان کی طرف دیکھا۔

"شیر خان! انڈین نیوی کا یہ ایمونیشن ڈپو یہاں سے کتنی دور ہے اور وہاں سیکورٹی کی پوزیشن کیا ہے؟"

شیر خان نے کہا۔

"یہ ایک چھوٹا سا ایمونیشن ڈپو ہے۔ پہاڑی کے اندر بنا ہوا ہے۔ سامنے احاطے میں خاردار تاروں والی چار دیواری ہے۔ ایک نیم پہاڑی سڑک کچھ فاصلے پر سے گزرتی ہے۔ وہاں سے کبھی کبھی بس پر سے گزرتے ہوئے میں نے اس ڈپو کو دیکھا ہے۔ مجھے تو وہاں دو چار فوجی ہی پہرہ دیتے نظر آئے تھے۔"

میں نے کہا۔

"یہ سپاٹ ہمیں خود جا کر دیکھنا ہوگا۔"

کمانڈو خالد نے شیر خان سے پوچھا۔

"یہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہوگی؟"

اس نے بتایا کہ زیادہ سے زیادہ چار میل کا فاصلہ ہوگا۔ اس سے کچھ فاصلے پر دوارکا سے کاٹھیاوار جانے والی سڑک گزرتی ہے۔ اس کے پیچھے پہاڑیاں ہیں اور ان کے پیچھے سمندر کا ساحل ہے۔ کمانڈو خالد نے مجھ سے کہا۔

"کرم داد! تم اور قاسم آج ہی یہ جگہ جا کر دیکھو گے۔ مگر تمہیں دن کے وقت جانا ہوگا اور وہی جینی سادھوؤں والے بھیس میں جاؤ گے۔"

اس وقت دوپہر ہو چکی تھی۔ میں نے اور قاسم نے تیاریاں شروع کر دیں۔ شیر خان نے سپاٹ کی نشان وہی کے لیے ٹارگٹ سے کچھ دور تک ہمارے ساتھ جانا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی جینی سادھوؤں والا لباس پہنا۔ وہی حلیہ بنایا اور شیر خان کے ساتھ اپنے نئے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔ شیر خان ہمارے آگے آگے تھا۔ اس نے ہمیں بتا دیا تھا کہ دوارکا کے ایک لاری اڈے سے ہمیں کاٹھیاواڑ جانے والی ایک لاری پر سوار ہونا ہوگا اور راستے میں جہاں بائیں جانب جین مندر نظر آئے گا وہیں اتر جانا ہوگا۔ وہ ہماری راہ نمائی کرتا ہمیں دوارکا شہر کے لاری اڈے پر لے آیا۔ وہ خود بھی لاری میں بیٹھ گیا۔ ہم بھی اسی لاری میں سوار ہوگئے۔ شیر خان نے کسی اگلے گاؤں تک کا ٹکٹ لیا تھا۔ کنڈکٹر نے ہمیں کوئی ٹکٹ وغیرہ لینے کو نہ کہا۔ بھارت میں سادھو

سنیاسی ریل گاڑیوں' بسوں اور لاریوں میں بغیر ٹکٹ کے سفر کرتے ہیں۔ ان سے ٹکٹ کوئی نہیں پوچھتا۔

لاری شہر کے سنگلاخ علاقہ میں سے نکل کر ایک کھلی سڑک پر آ گئی۔ جہاں ایک طرف دور تک ساحلی پہاڑیوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا تھا اور دوسری طرف شہر کی اونچی نیچی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔





لاری شہر سے چھ سات میل باہر گئی ہوگی کہ ہمیں سڑک کی بائیں جانب ایک جین مندر کا منار نظر آیا۔ آگے بیٹھے ہوئے شیر خان نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہہ کر لاری رکوائی۔ وہ بھی نیچے اتر پڑا۔ میں اور قاسم بھی نیچے اتر پڑے۔ شیر خان درمیان میں فاصلہ ڈال کر سڑک پر آگے کی طرف چلنے لگا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ کچھ دور جا کر وہ سڑک سے اتر کر دائیں جانب ہوگیا جہاں چھوٹے بڑے ٹیلے پھیلتے چلے گئے تھے۔

ہم اس کی راہ نمائی میں کئی گہرائیاں اور سمندری چٹانوں کو عبور کر گئے۔ یہ علاقہ انسانوں سے بالکل خالی تھا۔ شیر خان ایک ٹیلے کے اوپر چڑھنے لگا۔ ہم بھی اس کے پیچھے تھے۔ ٹیلہ چھوٹا سا تھا۔ اوپر جا کر وہ بیٹھ گیا۔ ہم بھی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔ اس نے دوسری طرف جھانک کر کہا۔

"وہ دیکھو۔ وہ ہے انڈین نیوی کا ایمونیشن ڈمپ۔"

وہ پیچھے ہٹ گیا۔ ہم سر ذرا ذرا سے اوپر نکال کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ دوسری طرف ایک اور چھوٹا سا ٹیلہ یا پہاڑی تھی۔ یہ سمندری پہاڑیاں تھیں جن پر کوئی سبزہ وغیرہ نہیں تھا۔ پہاڑی کے دامن میں ایک احاطہ نظر آیا جس کی دیوار کانٹے دار تاروں کی تھی۔ دن کی روشنی میں یہ خاردار تاروں والی دیوار بڑی واضح دکھائی دے رہی تھی۔ فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ احاطے کا ایک داخلہ کا چھوٹا سا گیٹ تھا

جہاں ایک نیوی کی وردی والا سنتری رائفل لیے پہرہ دے رہا تھا۔ پہاڑی کی دیوار میں ایک جگہ دروازہ بنا ہوا تھا جو بند تھا۔ اس کے آگے دو انڈین آرمی کی کسی رجمنٹ کے سپاہی سٹولوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شیر خان بھی اب ہمارے قریب سے سر نکال کر دیکھنے لگا۔ بولا۔

”یہاں بس اتنے ہی سنتری ہمیشہ دیکھے گئے ہیں۔ وہ دیکھو دائیں جانب سڑک ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جو دوارکا سے کاٹھیاواڑ کو جاتی ہے اور جس پر ہم سفر کر رہے تھے۔ یہ یہاں سے گھوم کر دوسری طرف نکل جاتی ہے۔“

میں اپنے نقطۂ نظر سے ٹارگٹ کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ آپریشن بظاہر آسان لگتا تھا۔ ان تین چار سنتریوں کو رات کے اندھیرے میں قابو کرنا کوئی اتنا مشکل کام نہیں تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ ایمونیشن ڈپو کی چابی ان کے پاس ہونی چاہیے۔ کیونکہ ڈپو کے دروازے پر ضرور تالا لگا ہوا ہوگا۔ عام طور پر جو فوجی دستہ ایمونیشن لینے آتا ہے ڈپو کی چابی اس کے انچارج کے پاس ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی چھوٹا ایمونیشن ڈپو ہو تو اس کی چابی سیکورٹی گارڈ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ میں نے قاسم سے اس خدشے کا اظہار کیا تو اس نے آہستہ سے کہا۔

”ممکن ہے ڈپو کی چابی سیکورٹی گارڈ کے پاس ہی ہو۔ یہ خطرہ تو ہمیں مول لینا ہی پڑے گا۔“

میں مسلسل ایمونیشن ڈپو کی خاردار دیوار کی تاروں کو دیکھ رہا تھا جو گچھوں کی شکل میں تھے۔ یہ دیوار کوئی سات آٹھ فٹ بلند ہوگی۔ میں نے کہا۔

”ہمیں ایک تار کاٹنے والے پلاس کی ضرورت ہوگی۔“

”وہ مل جائے گا۔“ قاسم نے آہستہ سے کہا۔

شیر خان کہنے لگا۔

”تم لوگ اس راستے سے بھی آسکتے ہو جس راستے سے میں تمہیں لایا ہوں لیکن ایک راستہ دوارکا کاٹھیاواڑ سڑک کی طرف سے یہاں تک آتا ہے۔ اس راستے کے

ذریعے نیوی اور آرمی کے فوجی ٹرک آتے جاتے ہیں۔ میں تمہیں اس لیے ادھر سے نہیں لایا کہ اگر کوئی فوجی ٹرک آ گیا تو فوج ہمیں روک کر ضرور پوچھ گچھ کرے گی کہ ہم اس طرف کیا کرنے جا رہے ہیں جبکہ وہ راستہ صرف ایمونیشن ڈپو تک ہی جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ہم اسی پہاڑی راستے سے ہی آئیں گے۔ یہ محفوظ راستہ ہے۔"

مجاہد قاسم نے مجھ سے پوچھا۔

کسی اور جگہ کو دیکھنا ہو تو۔۔۔۔۔؟"

میں نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ یہ مختصر سا کمانڈو آپریشن ہو گا لیکن دعا کرو کہ گولہ بارود کے اس ذخیرے میں سے ہمارے مطلوبہ ٹائم بم نکل آئیں۔"

ہم پیچھے ہٹ گئے۔ مجاہد قاسم کہنے لگا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ بحریہ کے پاس اس قسم کے ٹائم بم ضرور ہوتے ہیں۔"

میں نے پہاڑی سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

"یہ انتہائی دباؤ والے زبردست دھماکہ خیز بم ہوتے ہیں اور صرف یہی پھٹنے کے بعد جنگی جہازوں کے فولادی پیندے کو پھاڑ سکتے ہیں۔"

شیر خان حسب سابق تھوڑا فاصلہ ڈال کر ہماری بائیں جانب آگے آگے چل رہا تھا۔ ہم جینی سادھوؤں کے حلیئے میں ایک دوسرے کے آگے پیچھے بڑے سکون کے ساتھ ڈھلان اتر رہے تھے۔ جیسے ہم دنیا اور دنیا داری کے جھمیلوں سے بالکل آزاد ہوں۔

ہم واپس شیر خان کے مکان پر آ گئے۔

کمانڈو خالد اور ہارون ہمارے انتظار میں ہی تھے۔ کمانڈو خالد نے مجھ سے سوال کیا۔

"کرم داد! کیا خیال ہے تمہارا؟"

میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ کوئی مشکل ٹارگٹ نہیں ہے کمانڈر! ہم آج رات کو ہی اسے مار لیں گے۔ لیکن دعا کرو کہ ہمیں مطلوبہ ٹائم بم ڈپو کے ذخیرے سے مل جائیں۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"یہ بات تو ہمیں خدا پر چھوڑنی ہوگی۔ اگر خدا نے چاہا تو مطلوبہ ٹائم بم مل جائیں گے۔ اگر نہ ملے تو پھر کل منہ اندھیرے بھوپال کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ ٹارگٹ تم نے اچھی طرح سے دیکھ لیا ہے ناں؟"

"بالکل دیکھ لیا ہے۔ ہمیں صرف ایک تار کاٹنے والے پلاس کی ضرورت ہوگی۔"

شیر خان نے کہا۔

"وہ میں ابھی لا دوں گا۔ آپ لوگ اس مہم پر کس وقت روانہ ہوں گے؟"

میں نے کہا۔

"وہی آدھی رات کے بعد والا ٹائم ہی ٹھیک رہے گا۔"

شیر خان بولا۔

"تو پھر میں شہر جا کر وائر کٹر لے آتا ہوں۔ کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

میں نے کہا۔

"اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ کمانڈو چاقو اور آٹومیٹک پستول ہمارے پاس موجود ہیں۔"

شیر خان شہر کی طرف چل دیا۔ میں کمانڈو خالد' ہارون اور قاسم فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھ کر رات والے مشن کے بارے میں مزید تفصیلات طے کرنے لگے۔ کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"اگرچہ یہ چھوٹا سا نیول ایمونیشن ڈپو ہے اور سیکورٹی گارڈ بھی وہاں تین چار ہی ہیں لیکن اس بات کی تمہیں تسلی ضرور کر لینی چاہیے تھی کہ کہیں اوپر کسی پہاڑی پر

کوئی مشین گن پوسٹ نہ ہو۔"

میں نے کہا۔

"اب یہ معاملہ بھی خدا پر ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن ہم انتہائی خاموشی سے ٹارگٹ کی طرف بڑھیں گے۔ اگر پہاڑی پر کوئی مورچہ بھی ہوا تو اس کے سپاہیوں کو خبر تک نہیں ہوگی۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"تمہاری اولیں کوشش اور کمال یہ ہونا چاہیے کہ سیکورٹی گارڈ کوئی فائر نہ کر سکے۔"

میں نے کہا۔

"کوئی فکر نہیں کمانڈر! اس سے پہلے کہ وہ گن کا ٹریگر دبائے وہ موت کی نیند سو چکا ہوگا۔"

"مجھے تم سے یہی امید ہے کرم داد!"

کمانڈو خالد نے میری طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ہارون نے چائے کی چینک کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا اور بولا۔

"ابھی اس میں کافی چائے ہے۔ مگر ٹھنڈی ہوگئی ہے میں ابھی گرم کر کے لاتا ہوں۔"

ہارون چینک لے کر کچن کی طرف چل دیا جو دوسرے کمرے میں تھا۔ کچن کیا تھا' بس کمرے کے کونے میں ایک تھڑے پر مٹی کے تیل کا چولہا اور کچھ برتن رکھے ہوئے تھے۔

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"بھائی کرم داد! اگر اس مہم کے راستے میں ہی تم سانپ بن گئے تو کیا ہوگا؟"

میں نے کہا۔

"سانپ بن گیا تو مشن زیادہ آسان ہو جائے گا۔ میں سیکورٹی گارڈ کو بڑی جلدی

ختم کر دوں گا۔ لیکن مجھے اس کی امید نہیں ہے۔ کوئی ایسے آثار بھی نظر نہیں آ رہے۔ لگتا ہے اس بار بھی میرا انسانی روپ والا وقفہ کافی لمباہو گا۔"

چونکہ ناگن درگا کے متعلق میں نے ساری کہانی کمانڈو خالد کو بتا دی ہوئی تھی۔ وہ کہنے لگا۔

"بے چاری ناگن درگا کو تمہاری اس وقت شدید ضرورت تھی۔ اس وقت تم اس کا منہ چوم کر اسے عورت کی شکل میں واپس لا سکتے تھے۔ لیکن خدا جانے وہ تم سے سینکڑوں میل دور سانپ کے روپ میں کہاں دربدر پھر رہی ہو گی۔"

میں نے کہا۔

"یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ابھی تک بھوپال والے بیروں جی کے مندر کے آس پاس ہی کہیں چھپی ہوئی ہو گی۔ میں نے اسے وہیں ٹھہرنے کے لیے کہا تھا۔"

"لیکن" خالد بولا۔ "اس بات کو تو کئی دن گزر گئے ہیں۔ اتنی دیر تک وہ کہاں انتظار کرے گی۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"سانپ بڑی دیر تک انتظار کر سکتا ہے۔"

کمانڈو خالد ہنس پڑا۔

"ہاں بھائی! تم یہ بات کہہ سکتے ہو کیونکہ یہ تمہارے اپنے تجربے کی بات ہے۔"

ہارون چائے گرم کر کے لے آیا۔ اس دوران مجاہد قاسم ہمارے قریب ہی دری پر ایک طرف ہو کر لیٹ گیا تھا اور سو رہا تھا۔ ہارون نے اسے جگانا چاہا تو خالد نے کہا۔

"نہیں ہارون! اسے سونے دو۔ رات کو اس نے پھر کمانڈو مشن پر جانا ہے۔"

ہم چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد مجاہد قاسم بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"دوستو! تم اکیلے اکیلے چائے پی رہے ہو۔ چائے کی اس وقت مجھے بھی ضرورت

ہے۔"

ہارون نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھ دی اور اس میں چینک میں سے گرم چائے انڈیلتے ہوئے بولا۔

"لو بھائی تم بھی چائے پی لو۔"

"شام ہونے لگی تو شیر خان تار کاٹنے والا پلاس لے کر آ گیا۔ میں نے پلاس کو لے کر اس کا جائزہ لیا۔ کافی مضبوط پلاس تھا۔ شیر خان بولا۔

"یہ فوجی پلاس ہے کرم داد بھائی۔ تم بے شک تجربہ کر کے دیکھ لو۔"

میں نے کہا۔

"تجربہ کر کے تو ہر حالت میں دیکھنا پڑے گا۔"

شیر خان لوہے کا ایک تار کہیں سے ڈھونڈھ کر لے آیا۔ میں نے اسے کاٹا' تار ایک دم کٹ گیا۔ کمانڈو خالد نے پلاس کو لے کر دیکھا اور بولا۔

"بالکل ٹھیک ہے کرم داد!"

میں نے کہا۔

"جی ہاں!"

رات کو ہم نے اسی کمرے میں بیٹھے بیٹھے کھانا کھایا۔ ہم نے اپنا سادھوؤں والا حلیہ آتے ہی بدل لیا اور دھوتی کرتہ پہن لیا تھا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد کمانڈو خالد نے کہا۔

"تم لوگ ابھی سے کمانڈو لباس پہن لو اور سو جاؤ' رات ٹھیک ساڑھے بارہ بجے تمہیں جگا دیا جائے گا۔ اس وقت لباس تبدیل کرنے کے لیے وقت نہیں ہو گا۔"

میں نے اور مجاہد قاسم نے دوسرے کمرے میں جا کر سیاہ رنگ کی جیکٹیں اور پتلونیں پہن لیں۔ چاقو اور آٹومیٹک پستول بھی جیبوں میں رکھ لیے۔ تار کاٹنے والا پلاس میں نے پتلون کی پیٹی کے ساتھ لٹکا دیا۔ ہم نے بوٹ بھی پہن لیے تھے۔ گویا ہم مشن پر جانے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ شیر خان نے دوارکا کاٹھیاواڑ روڈ والے جین

مندر تک ہمارے ساتھ جانا تھا۔ اگرچہ قاسم نے کہا بھی کہ شیر خان کی ضرورت نہیں پڑے گی ہم نے راستہ دیکھ لیا ہوا ہے لیکن کمانڈو خالد نے کہا کہ شیر خان جین مندر تک تمہارے ساتھ ہی جائے گا۔ وہاں سے وہ واپس آ جائے گا۔"

اس کے بعد ہم دوسرے کمرے میں جا کر الگ الگ چارپائیوں پر سو گئے۔ رات کے ٹھیک ساڑھے بارہ بجے کمانڈو خالد نے ہمیں جگا دیا۔ ہمیں کسی قسم کی تیاری تو کرنی نہیں تھی۔ شیر خان پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ ہم نے کلمہ شریف پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیرا۔ اسلحہ چیک کیا۔ تار کاٹنے والا پلاس پتلون کے ساتھ لٹکایا اور اللہ کا نام لے کر اپنے ٹارگٹ کی طرف چل پڑے۔ ہم تینوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ مجاہد قاسم نے شیر خان سے کہا۔

"سڑک چھوڑ کر چلنا۔"

وہ بولا۔

"فکر نہ کرو۔"

وہ ہمیں سڑک سے ہٹ کر ایک متوازی راستے سے لے جا رہا تھا۔ سڑک رات کے وقت ویسے ہی سنسان پڑی تھی۔ دوارکا گجرات صوبے کا کوئی اتنا بڑا اور صنعتی شہر بھی نہیں تھا کہ وہاں رات کو بھی سڑک پر ٹرکوں وغیرہ کی آمد و رفت جاری رہتی ہو۔ لیکن احتیاط کے طور پر ہم سڑک پر نہیں چل رہے تھے۔ کوئی فوجی گاڑی وہاں سے گزر سکتی تھی۔ دوارکا بھارت کے مغربی ساحل پر ایک اہم فوجی اڈہ تھا جہاں جدید ترین لیزر گن نصب تھی۔ مجاہد قاسم اسی خیال سے سڑک پر نہیں چلنا چاہتا تھا۔ ہم رات کے اندھیرے میں تینوں خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ جب ہماری بائیں جانب جین مندر کا تکونی مینار ستاروں کی دھندلی روشنی میں نظر پڑا تو شیر خان بولا۔

"یہاں سے تم لوگ دائیں جانب جاؤ گے۔ میرا خیال ہے اب تمہیں میری ضرورت نہیں ہوگی۔"

قاسم نے کہا۔

"بالکل نہیں شیر خان۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

شیر خان وہیں سے واپس ہوگیا۔

میں اور قاسم نے ایک لمحے کے لیے رک کر علاقے کا جائزہ لیا اور نصف دائرے کا ایک چکر کاٹ کر اس چھوٹی سی ویران سڑک پر نکل آئے جو سیدھی فوجی گولہ بارود کے ذخیرے کو جاتی تھی۔ ہم سڑک پار کر کے پتھروں اور چٹانوں کی آڑ لیتے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ یہاں اندھیرا زیادہ تھا۔ اس لیے کہ یہ پہاڑی کا دامن تھا۔ لیکن چونکہ ہم دن کے وقت ٹارگٹ کی نشان دہی کر چکے تھے اس لیے ہمیں خاردار تاروں والی دیوار کے پاس پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ یہ ایمونیشن ڈپو کی خاردار دیوار تھی۔ ایمونیشن ڈمپ کے گیٹ اور احاطے کے داخلہ گیٹ پر ایک ایک بلب روشن تھا۔ ان کی روشنی کافی تھی۔ اس بات کا امکان تھا کہ رات کے وقت سیکورٹی گارڈز کے سنتری گشت پر نہ ہوں۔ محض شک دور کرنے کے واسطے ہم اندھیرے میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم نے چاقو نکال کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے۔ دس پندرہ منٹ تک ہم نے انتظار کیا۔ جب اس دوران کوئی گشتی پارٹی ادھر نہ آئی تو ہم نے خاردار دیوار کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ ہم پہلو بہ پہلو زمین پر اوندھے لیٹ کر رینگ رہے تھے۔ پلاس میرے ہاتھ میں تھا۔ وہاں کوئی اتنی زیادہ سیکورٹی بھی نہیں تھی۔ داخلہ گیٹ پر ایک سنتری ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑا پہرہ دے رہا تھا اور تین سنتری ایمونیشن ڈمپ کے دروازے پر ڈیوٹی دے رہے تھے۔ ان میں سے دو لکڑی کے کریٹ یا سٹولوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ باتوں کی مدھم آواز ہم تک پہنچ رہی تھی۔

اس کے سوا وہاں کوئی سپاہی نظر نہیں آتا تھا۔ ہم خاردار تاروں کی دیوار کے پاس پہنچ گئے تھے۔ میں نے پلاس نکال لیا۔ ایک بار پھر تینوں فوجیوں پر نظر ڈالی۔ وہ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ مجاہد قاسم نے آٹومیٹک پستول نکال لیا تھا۔ میں نے کانٹے دار تاروں کے گچھوں کا اندھیرے میں جائزہ لیا۔ چونکہ احاطہ چھوٹا تھا اس لیے ڈپو کے

باہر جلتے بلب کی روشنی یہاں تک تھوڑی تھوڑی آ رہی تھی۔ مجھے اس قسم کے تاروں کو کاٹنے کی باقاعدہ ٹریننگ ملی ہوئی تھی جو میں بھولا نہیں تھا۔ میں نے بسم اللہ پڑھ کر ایک خاص زاویے سے پہلے تار کو پلاس کے شکنجے میں رکھ کر دونوں ہاتھوں سے اسے دبا دیا کٹک کی آواز کے ساتھ تار کٹ گیا۔

اس آواز نے ہمیں چوکنا کر دیا۔ میں نے اور قاسم نے سر نیچے کر لیے اور غور سے فوجی سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے یہ آواز نہیں سنی تھی لیکن ابھی مجھے چار پانچ جگہوں سے تار کاٹ کر وہاں آدمی کے گزرنے کے برابر جگہ بنانی تھی۔ خطرہ یہی تھا کہ کہیں تار کٹنے کی آواز سپاہیوں تک نہ پہنچ جائے۔ میں جتنی احتیاط کر سکتا تھا اس سے بھی زیادہ احتیاط کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے پانچ جگہوں سے تار کاٹ ڈالے اور بڑی آہستگی کے ساتھ تاروں کے کٹے ہوئے گچھے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اب وہاں اتنی جگہ پیدا ہوگئی تھی کہ ہم رینگ کر اس میں سے گزر سکتے تھے۔ میں نے قاسم کو بتا دیا ہوا تھا کہ احاطے کے اندر جاتے ہی ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ پہلے میں تاروں کے شگاف میں سے رینگ کر نکل گیا۔ میرے بعد قاسم بھی رینگتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ ہم ابھی تک زمین پر پیٹ کے بل لیٹے ہوئے تھے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق مجاہد قاسم کانٹے دار دیوار کے ساتھ داخلہ گیٹ کی طرف رینگنے لگا۔ اسے داخلہ گیٹ پر پہرہ دیتے سنتری کو ختم کرنا تھا۔ یہ کام ہم داخلہ گیٹ کی طرف سے داخل ہو کر نہیں کر سکتے تھے۔

جیسے ہی قاسم داخلہ گیٹ کی طرف گیا میں نے پستول نکال کر ڈمپ والے دروازے کے باہر ڈیوٹی گارڈ کو نشانے میں لے لیا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ پھر بھی میں ہنگامی صورت حال میں ایک دو کو ڈھیر کر سکتا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی فائر کر بھی دیتا تو فائر کی آواز سے کوئی خاص فرق پڑنے کا امکان نہیں تھا۔ ہاں یہ خدشہ ضرور تھا کہ اگر پہاڑی کی ڈھلان پر کوئی مشین گن پوسٹ تھی تو ہم پر گولیوں کی بوچھاڑیں ہو سکتی تھیں اور ہمارا مشن ناکام ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ خطرہ مول لیے بغیر ہمارا مشن مکمل بھی

نہیں ہو سکتا تھا۔ میں قاسم کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں کچھ دور تک رینگتا ہوا داخلہ گیٹ کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ گیٹ پر بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے قاسم خاردار تاروں کے گچھوں کے ساتھ لگا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گارڈ سنتری اس سے ذرا آگے کھڑا تھا۔ اس کی پشت قاسم کی طرف تھی۔ سنتری کے ہاتھ میں رائفل ضرور تھی مگر وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ رائفل کا سیفٹی کیچ آگے نہیں کیا ہوا ہوگا۔ کیونکہ یہ کوئی جنگی محاذ نہیں تھا۔ فائر کرنے کے لیے رائفل کا سیفٹی کیچ آگے کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے اچانک فائر کرنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ میری نگاہیں کبھی ڈمپ کے دروازے والے سپاہیوں کی طرف جاتیں اور کبھی میں قاسم کو دیکھنے لگتا کہ یہ شخص اتنی دیر کس لیے کر رہا ہے۔ یہ کام "آناً فاناً" کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس میں ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی بھی دیر ہو جائے تو سارے کیے دھرے پر پانی پھر جاتا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ قاسم گیٹ والے سپاہی کی طرف آہستہ آہستہ ایسے سانپ کی طرح رینگنے لگا ہے جس نے اپنا شکار دیکھ لیا ہو اور اس پر ایک دم سے جھپٹنے والا ہو۔

قاسم کو یہی کرنا چاہیے تھا۔

اور پھر اس نے ایسا ہی کیا اور کمال کر دکھایا۔ گارڈ سنتری اپنی جگہ سے چلا ہی تھا کہ قاسم نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ کمانڈو کے چھلانگ لگانے اور ایک عام آدمی کے چھلانگ لگانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ عام آدمی چھلانگ لگا کر دشمن کو گرا دیتا ہے اور گرانے کے بعد اس سے گتھم گتھا ہو جاتا ہے جبکہ کمانڈو جب پیچھے سے دشمن پر چھلانگ لگاتا ہے تو چھلانگ لگانے کے ساتھ ہی دشمن کی گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں اس طرح جکڑ لیتا ہے کہ وہ کوئی آواز پیدا نہ کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی وہ سیدھے ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو اس کی گردن پر پوری طاقت سے پھیرتا ہے اور اسے فوراً" ہی زمین پر پھینک دیتا ہے۔ قاسم نے بھی ایک تجربہ کار کمانڈو کی طرح ایسے ہی کیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ گارڈ سنتری کے حلق پر چاقو چلانے کے بعد اسے ایک دم اپنے

سے الگ نہیں کیا تھا بلکہ اسے وہیں بٹھا دیا تھا اور اس کے ساتھ خود بھی وہیں بیٹھ گیا تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔

گارڈ سنتری کی شہ رگ یقینی طور پر کٹ چکی تھی اور اس کے آواز نکالنے یا زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ قاسم اسے جلدی سے کھینچ کر پیچھے لے گیا اور اسے وہیں چھوڑ کر رینگتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ میرے قریب آ کر اس نے ہاتھ کی دو انگلیاں اوپر کر کے اشارہ کیا کہ کام تمام ہوگیا ہے۔ اب ہمارا ٹارگٹ ڈمپ کے دروازے کے باہر کھڑے تین انڈین آرمی کے سنتری تھے۔ گیٹ پر جو گارڈ سنتری تھا وہ بھارتی بحریہ کا سپاہی تھا۔ یہ تینوں سنتری ہری وردیوں میں تھے اور آرمی کے سپاہی تھے۔ پلان کے مطابق میں نے قاسم کو اشارہ کیا اور ہم ایک دوسرے کے پیچھے رینگتے ہوئے ٹیلے کی دیوار کے بالکل ساتھ لگ گئے۔ یہاں اندھیرا تھا۔ ہمیں سنتریوں کے باتیں کرنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ہم نے اپنے اپنے آٹومیٹک پستول نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے۔ یہاں کمانڈو چاقو کی بجائے ہمیں آٹومیٹک پستولوں سے کام لینا تھا۔ یہاں ہم پتھر وغیرہ پھینک کر ان میں سے کسی ایک سنتری کو اس طرف بلوا کر ہلاک نہیں کر سکتے تھے۔ اس تدبیر کے یہاں کارگر ہونے کے امکانات بہت کم تھے۔ کیونکہ یہ تین سنتری تھے اور آواز سن کر دو سنتری بھی اس طرف آ سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے اندھیرے میں قاسم کے کان میں سرگوشی کر کے اسے بتایا کہ ہم گارڈ سنتریوں کو آٹومیٹک پستولوں سے ریپڈ فائر کر کے یکے بعد دیگرے ہلاک کریں گے۔

اس کام کی مجھے تو بہت ٹریننگ مل چکی تھی۔ چنانچہ میں نے قاسم کو اشارہ کر کے بتایا کہ میں بائیں جانب والے دونوں سنتریوں کو نشانہ بناؤں گا اور قاسم سامنے کھڑے سنتری پر فائر کرے گا۔ جن دو سنتریوں پر میں نے فائر کرنا تھا وہ لکڑی کے کھوکھوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ تیسرا سنتری ان کے قریب کھڑا تھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ سنتریوں کی شکلیں ہمیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کہیں ان کی نظر ہم پر نہ پڑ جائے۔ ہمیں تیز اور جلدی ایکشن کرنا تھا۔ قاسم بالکل میرے پہلو

میں اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھا اور ہم نے پستول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ میں نے قاسم کی طرف دیکھ کر انگلی اٹھا کر خاص اشارہ کیا۔ قاسم نے آہستہ سے سر ہلایا۔ میرا ٹارگٹ کھوکھوں پر بیٹھے ہوئے دونوں سنتری تھے۔ وہ میرے پستول کی زد میں تھے۔ کمانڈو ٹریننگ کے دوران بھی میرا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا تھا۔ میں نے اپنے تمام سابقہ تجربے اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پستول کی نالی کا رخ دونوں سنتریوں کی طرف کیا اور اوپر تلے دو فائر کر دیے۔ پہلا فائر کرنے کے بعد میں نے دوسرے فائر سے پہلے آٹومیٹک پستول کو ذرا دائیں جانب کر لیا تھا کیونکہ دوسرا سپاہی دائیں جانب تھا۔ میرے فائر کے ساتھ ہی قاسم کے پستول میں سے بھی ٹھک ٹھک دو بار فائر کرنے کی آواز آئی تھی۔

میں دل میں حیران ہوا تھا کہ قاسم کا ٹارگٹ تو ایک ہی سنتری تھا پھر اس نے دو فائر کیوں کیے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس نے تیسرے سنتری پر ہی دو بار فائر جھونک دیا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میرے پستول سے نکلی ہوئی گولیوں نے دونوں سنتریوں کو وہیں ڈھیر کر دیا تھا اور اس سے پہلے کہ تیسرا سپاہی گھبرا کر کسی کو مدد کے لیے بلاتا یا ہوائی فائرنگ کرتا اسے قاسم کی گولی نے ہلاک کر دیا تھا۔ یہ کام بڑی جلدی ختم ہوگیا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ ہم ان چاروں بھارتی سنتریوں کو اتنی جلدی مار لیں گے لیکن ہم نے انہیں مار لیا تھا۔ قاسم اٹھ کر چلنے لگا تو میں نے اس کے کندھے کو دباتے ہوئے وہیں بٹھا لیا اور سرگوشی میں کہا۔

"اگر اوپر کسی جگہ کوئی دشمن کی مشین گن پوسٹ ہے تو انہوں نے سلینسر والی فائر کی آواز بھی ضرور سن لی ہوگی۔ یہ آواز ہر فوجی پہچان لیتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے رک جاؤ۔"

ہم دم سادھے وہیں پڑے رہے۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ اوپر کوئی مشین گن پوسٹ نہیں ہے تو میں نے قاسم کو اشارہ کیا۔ ہم دوڑ کر بھارتی سپاہیوں کی لاشوں کے پاس آ گئے۔ قاسم ان کی جیبیں اور بیلٹیں دیکھنے لگا۔ اسے ڈمپ کے دروازے پر لگے

ہوئے تالے کی چابی کی تلاش تھی۔ میں نے اسے آہستہ سے کہا۔

"مت تلاش کرو۔ آ جاؤ۔"

میں نے تالا دیکھ لیا تھا۔ اسے میرا پلاس اکھاڑ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے پلاس کی مدد سے تالے کو ایک طرف سے کنڈے سمیت اکھاڑ دیا۔ ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ اندر چھت کے ساتھ بلب لگا تھا جس کی مدھم روشنی میں ہمیں جگہ جگہ اسلحہ کے کریٹ لگے ہوئے نظر آئے۔ یہ چھوٹا سا ڈمپ تھا۔ دیوار کے ساتھ پٹرول کے کنٹینرز لگے ہوئے تھے۔ لوہے کی لمبی میز پر اسلحہ کے چھوٹے بڑے بکسے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ میں جلدی جلدی ان بکسوں کو دیکھتا چلا گیا۔ ایک بکس کو میں نے پہچان لیا۔ میں نے پلاس کی مدد سے اسے توڑ ڈالا۔ میرا اندازہ غلط نہیں نکلا تھا۔ بکسے میں بارودی سٹکوں والے کتنے ہی ٹائم بم ایک دوسرے کے ساتھ بڑے قرینے سے لگے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ٹائم بم نکال کر اس کو اچھی طرح سے دیکھا۔ یہی وہ اسلحہ تھا جس کی ہمیں تلاش تھی۔ میں نے بم بکس میں رکھ دیا۔ اس کے اوپر لکڑی کا تختہ لگا دیا اور قاسم سے کہا۔

"ہمیں یہ بکس اٹھا کر ساتھ لے جانا ہو گا۔"

بکس زیادہ بڑا نہیں تھا۔ قاسم نے اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھ لیا اور ہم جلدی جلدی ایمونیشن ڈمپ سے باہر آ گئے۔ دروازے کو اسی طرح بند کر دیا۔ تینوں بھارتی سنتریوں کی لاشیں اسی طرح پڑی تھیں۔ ہم دوڑتے ہوئے خاردار تاروں والی دیوار کے شگاف کے پاس آئے۔ ہم نے سب سے پہلے ٹائم بموں والے بکس کو شگاف میں دھکیل کر دوسری طرف کیا۔ پھر ایک دوسرے کے پیچھے رینگتے ہوئے باہر نکل آئے۔

اس کے بعد ہم جتنی تیز چل سکتے تھے چلتے ہوئے رات کی تاریکی میں اونچے نیچے پتھروں کے درمیان سے ہو کر چھوٹی ملٹری روڈ پر آ گئے۔ قاسم نے بکس کندھے پر اٹھایا ہوا تھا۔ اندھیرے میں سڑک خالی اور سنسان تھی۔ ہم جلدی سے سڑک پار کر گئے۔

ہم جس طرف سے آئے تھے اسی طرف سے ہو کر واپس جا رہے تھے۔ جب ہم جین مندر سے بھی آگے نکل گئے تو میں نے قاسم سے کہا۔

"بکس مجھے دے دو۔"

وہ ہانپ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"نہیں۔ تم عمر میں مجھ سے بڑے ہو۔ میں جوان ہوں۔"

مگر میں نے زبردستی اس سے بکس لے لیا۔ قاسم واقعی بری طرح ہانپ رہا تھا۔ بکس کافی وزنی تھا۔ دو ایک میل تک میں بکس کو اٹھا کر چلتا گیا۔ آگے جہاں سے ہمیں شیر خان کے مکان کو جانے والی پگڈنڈی کی طرف مڑنا تھا قاسم نے بکس مجھ سے لے لیا۔

جب ہم رات کے اندھیرے میں شیر خان کے مکان پر پہنچے تو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم نے ایک اہم ترین مشن اتنی جلدی اور کامیابی کے ساتھ مکمل کر لیا ہے۔ شیر خان کے مکان کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے خاص قسم کی دستک دی تو شیر خان نے ہی دروازہ کھولا۔ ہم تیزی سے اندر گھس گئے۔ کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون میں سے کوئی نہیں سویا تھا۔ انہیں ہمارا انتظار تھا۔ قاسم کے کندھے پر بکس دیکھ کر وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

"میرا خیال ہے تم سو فیصد کامیاب لوٹے ہو۔"

میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ ایمونیشن کریٹ ہماری کامیابی کی نشانی ہے۔"

اسی وقت بکس کے اوپر والے تختے اکھاڑ دیئے گئے۔ ایک کے بعد ایک اندر سے ٹائم بم نکلتے آئے۔ یہ انتہائی طاقتور دباؤ والے دھماکہ خیز بارودی سنکوں کو جوڑ کر بنائے گئے ٹائم بم تھے۔ ان میں مائیکرو ویو سگنلز کے سوئچ بھی تھے۔ ہر ٹائم بم کے ساتھ ریموٹ کنٹرول ٹیپ سے لگا ہوا تھا۔ ہم نے انہیں گنا۔ وہ پچاس ٹائم بم تھے۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

"کرم داد! کیا خیال ہے ہمارے کمانڈو مشن کے لیے اتنے کافی رہیں گے؟"

میں نے کہا۔

"یہ بہت ہیں۔"

مجاہد قاسم کہنے لگا۔

"وہاں ایمونیشن کے اور بھی بکسے تھے۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں جس قسم کے اسلحے کی ضرورت ہے وہ ہمیں مل گیا ہے۔ ہمارا ٹارگٹ ایسا ہے کہ اس کو تباہ کرنے کے لیے اسی اسلحے کی ضرورت تھی۔"

کمانڈو ہارون ایک ٹائم بم کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ امریکی اسلحہ ہے۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"امریکی ہی ہو گا جو بھارت کو اسرائیل کے ذریعے سپلائی ہوا ہے۔"

کمانڈو خالد نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"اب انہیں لگانے کا مسئلہ ہے۔ کرم داد! تم نے تو قاسم کے ساتھ ٹارگٹ سپاٹ کا معائنہ کیا ہے۔ تمہارے خیال میں ہمیں وہاں تک پہنچنے اور ان ٹائم بموں کو گن پاؤڈ کے ساتھ چپکانے کے لیے اور کن چیزوں کی ضرورت ہو گی؟"

میں نے کہا۔

"کمانڈر! ابھی تو حقیقت یہ ہے کہ مجھے نیند آ رہی ہے۔ یہ ساری باتیں کل کریں گے بالکل تازہ دم ہو کر۔"

"یہ تم نے میرے دل کی بات کہی ہے کرم داد۔" قاسم نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد ہم سب اپنی اپنی جگہوں پر روانہ ہو گئے۔

اگلے روز ناشتے کے بعد کمانڈو خالد نے وہ کاپی نکال کر سامنے رکھ لی جس پر میری یادداشت کی بنیاد پر اس نے لیزر گن کے ٹارگٹ کا نقشہ تیار کیا ہوا تھا۔ میں، قاسم اور

ہارون بھی وہیں بیٹھ گئے۔ ہم کافی دیر تک سوچ بچار کرتے رہے۔ رات کے اندھیرے میں ہم کسی نہ کسی طرح لیزر گن کی پہاڑی پر تو پہنچ سکتے تھے مگر سب سے مشکل مرحلہ ان ٹائم بموں کو گن کے بنکر کے اندر جا کر انہیں لیزر گن کے ساتھ اور اس کے فولادی پیڈ کے نیچے چپکانا تھا۔ میں نے گن پوسٹ کے بنکر کے اندر چار فوجی سپاہیوں کو دیکھا تھا۔ کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"وہاں اور بھی سپاہی ضرور ہوں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ رات کے وقت اپنی اپنی باری پر صرف چار سپاہی ہی گارڈ ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔"

مجاہد قاسم بولا۔

"ان سب پر ہم کیسے قابو پا سکیں گے؟ یہ کام ہمیں ایک ہی وقت میں کرنا ہوگا۔"

ہارون کہنے لگا۔

"ہم چار آدمی ہوں گے۔ میں 'کمانڈو خالد' کرم داد اور قاسم بھائی۔ ہم چاروں ایکدم سے بنکر میں کود کر ان پر قابو پا سکتے ہیں۔ قابو کیا پانا ہے بس انہیں قتل کرنا ہے اور وہ ہم کر سکتے ہیں۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ وہاں کوئی کلوز سرکٹ کیمرہ تو نہیں لگا ہوا اور کوئی خفیہ خطرے کا الارم تو نہیں ہے۔ ان دونوں حالتوں میں ہم فوراً پکڑ لیے جائیں گے بلکہ ہلاک کر دیے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"میں نے بنکر کے شگاف سے اندر کا جو جائزہ لیا تھا۔ وہاں مجھے کسی کونے میں کوئی کلوز سرکٹ ٹیلی ویژن کیمرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ باقی خطرے کا الارم تو وہاں کا کوئی ڈیوٹی گارڈ ہی بٹن دبا کر بجا سکتا ہے۔ ہم اسے اتنا موقع ہی نہیں دیں گے۔"

مجاہد قاسم بولا۔ "کمانڈر! اگر ہم ان باتوں کو سوچتے رہے تو ہم اپنا مشن کامیابی سے مکمل نہ کر سکیں گے۔ ہمیں ہر حالت میں دشمن کی اس گن کو تباہ کرنا ہے جس کی زد

میں پاکستان کے ساحلی شہر اور جہاز ہیں۔"

ہارون کہنے لگا۔

"قاسم نے بالکل درست کہا ہے۔ ہمیں ہر قاسم کا خطرہ مول لے کر وہاں اٹیک کرنا ہوگا۔"

"لیکن ہمارا پلان کیا ہوگا؟" کمانڈو خالد نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

"میرا تجربہ اور ٹریننگ یہ بتاتی ہے کہ ہم ان سارے بموں کو دو تھیلوں میں ڈال کر ساتھ لے جائیں گے۔ ہمارے لیڈر کے پاس ریموٹ کنٹرول ہوگا جس کا بٹن دبا کر وہ دھماکہ کرے گا۔ ہم شمال اور جنوب کی سمت سے گن پوسٹ کی پہاڑی پر چڑھیں گے۔ گن پوسٹ تک پہنچنے کے لیے ہمیں جس چیز کا سب سے زیادہ خیال رکھنا ہوگا وہ یہ ہے کہ راستے میں کسی گشتی پٹرول کے سپاہیوں اور کسی مشین گن پوسٹ کے عملے کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اگر ہم گن پوسٹ کے شگاف تک زندہ پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تو پوسٹ کے بنکر کے اندر چار بھارتی سپاہیوں کو قابو کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔"

ہارون' خالد اور قاسم بڑے غور سے میری بات سن رہے تھے۔ کمانڈو خالد نے قاسم کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"قاسم! تمہارا کیا خیال ہے؟"

وہ میرے ساتھ ٹارگٹ کو دیکھ آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"کرم داد! نے بالکل ٹھیک پلان پیش کیا ہے۔ کمانڈر! ہمیں دو دو کی ٹولی میں پہاڑی پر چڑھنا ہوگا۔ ایک ٹولی شمال کی طرف سے اور دوسری جنوب کی طرف سے آگے بڑھے گی۔ ہم ساحل سمندر کی طرف سے آپریشن شروع کریں گے۔ اس طرف مشین گن کی صرف دو ہی پوسٹیں ہیں۔ ان کی نشان دہی ہم کر چکے ہیں۔ ہم ان سے دور رہنے کی کوشش کریں گے۔"

پھر اس نے نقشے پر سب کو وہ دونوں مشین گن مورچے دکھائے اور کہا۔

"یہ ایک مورچہ ہے۔بیس قدموں کے فاصلے پر اس کے بالکل متوازی دوسرا مشین گن مورچہ ہے۔ ہم اس کے دائیں بائیں سے ہو کر رات کے اندھیرے میں پہاڑی کے شگاف کی طرف جائیں گے۔ یہاں چڑھائی زیادہ سیدھی نہیں ہے۔ پھر بھی ہمیں پیٹ کے بل لیٹ کر اوپر چڑھنا ہو گا۔"

کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون نقشے کی وہ جگہ غور سے دیکھنے لگے جہاں مشین گن مورچوں کے نشان بنائے گئے تھے۔

شیر خان چائے بنا کر لے آیا۔ خالد نے نقشے والی کاپی ایک طرف رکھ دی اور ہم چائے پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کرم داد! تم ہم میں سب سے زیادہ تجربہ کار اور سند یافتہ' تربیت یافتہ کمانڈو ہو۔ تمہارے خیال میں ہمیں اپنے ساتھ اور کیا کیا اسلحہ لے جانے کی ضرورت ہے؟"

میں نے کہا۔

"کمانڈر! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب بھی یہی کہوں گا کہ ہمیں سوائے بارودی سٹکوں والے ٹائم بموں کے اور کسی اسلحہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس آٹومیٹک پستول اور کمانڈو چاقو تو ضرور ہوں گے۔ ہم اپنے ساتھ دستی بم بھی نہیں لے جا سکتے۔ اگر ہم نے وہاں دستی بم سے ایک بھی دھماکہ کر دیا تو علاقے کی ساری یونٹیں بیدار ہو جائیں گی اور روشنی کے گولوں سے سارا آسمان سارا علاقہ دن کی طرح روشن ہو جائے گا اور ہم میں سے کوئی بھی واپس نہ آ سکے گا اور ہم اپنا ٹارگٹ بھی نہیں مار سکیں گے اور یہ ہماری سب سے بڑی بد نصیبی ہو گی۔"

کافی دیر تک ہماری خفیہ میٹنگ جاری رہی۔ آخری یہ طے پایا کہ ہم دو کمانڈو پارٹیوں کی شکل میں چلیں گے۔ ایک کمانڈو پارٹی کو قاسم گائیڈ کرے گا اور ایک کمانڈو پارٹی کو میں گائیڈ کروں گا۔ کیونکہ ہم دونوں نے پہاڑی علاقے کا راستہ دیکھا ہوا تھا۔

قاسم کہنے لگا۔

"ہمیں آج رات کمانڈو اٹیک کر دینا چاہیے۔"

ہارون نے کہا۔

"ہم رات کو جس فوجی کیمپ کے ذخیرے کو توڑ کر وہاں سے بموں کا بکس اڑا لائے ہیں اس کا علم فوج کو ہوگیا ہوگا۔ اس بات کا امکان ہے کہ پہاڑی والی گن پوسٹ پر بھی سیکورٹی سخت کر دی گئی ہو۔"

میں نے کہا۔

"اگر ہم نے آج رات اٹیک نہ کیا تو کل پرسوں تک ممکن ہے کاٹھیاواڑ سے مزید فوجی دستے آ جائیں اور سیکورٹی اتنی سخت ہو جائے کہ ہمارے لیے یہ مشن ناممکن ہو جائے۔"

کرم داد کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔" خالد نے کہا۔ "ہمیں آج رات کو ہی اپنے ٹارگٹ پر اٹیک کر دینا ہوگا۔ سیکورٹی تو سخت ہوتی ہی ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

آخر سب اس بات پر متفق ہوگئے کہ ہمیں اسی رات کو اپنے مشن پر روانہ ہو جانا چاہیے۔ اس وقت دن کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ باہر دھوپ نہیں تھی۔ آسمان ہلکے بادلوں میں چھپ گیا تھا اور کھڑکی میں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

"میرا خیال ہے ذرا باہر کھلی ہوا میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ دماغ تر و تازہ ہو جائے گا۔ ہم جس مشن پر جا رہے ہیں' یہ موت کا مشن ہے۔ کیا خبر پھر یہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہمیں کبھی نصیب نہ ہوں۔"

خالد نے شیر خان کی طرف دیکھا۔

"کیوں شیر خان تمہارا کیا خیال ہے۔ ہمیں مکان کے باہر بیٹھنا چاہیے یا نہیں؟"

وہ بولا۔

"مکان کے پچھواڑے ایک چارپائی بچھی ہوئی ہے۔ وہاں تھوڑی دیر جا کر بیٹھ جائیں۔ اس طرف سامنے کوئی مکان بھی نہیں ہے۔"

شیر خان دوسرے کمرے میں جا کر کھانا وغیرہ تیار کرنے میں لگ گیا۔ میں' کمانڈو

خالد' کمانڈو ہارون اور مجاہد قاسم مکان کے پچھواڑے آ کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے زمین اونچی نیچی تھی۔ کہیں پتھر بکھرے ہوئے تھے کہیں جھاڑیاں تھیں۔ میں چارپائی کی پائینتی کی طرف بیٹھا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اچانک میرے قریب بیٹھے ہوئے قاسم نے اچھل کر ایک طرف ہوتے ہوئے کہا۔

"سانپ کرم داد!"

مجھے اپنی گردن پر سانپ رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ میری جیکٹ پر سے ہو کر میری گردن پر پہنچا تھا۔ میں نے گھبرا کر اس پر ہاتھ مارا اور جلدی سے اسے دبوچ لیا۔ اس دوران سانپ نے میری گردن پر ڈس دیا تھا مگر میں نے سانپ کو نہ چھوڑا۔ سانپ کو ڈستے ہوئے کمانڈو خالد نے دیکھ لیا تھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کرم داد! تمہیں سانپ نے کاٹ لیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔"

قاسم' ہارون اور خالد ڈر کر مجھ سے ایک قدم پیچھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ سانپ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا اور میں نے اس کو گردن سے دبوچ رکھا تھا۔ خالد پریشان ہو کر بولا۔

"کرم داد! اندر چلو پلیز! شاید شیر خان کے پاس سانپ کے کاٹے کی کوئی دوا ہو۔"

قاسم نے کہا۔

"ہمیں کرم داد کو ہسپتال لے چلنا چاہیے۔"

میں نے کہا۔

"پلیز! ایک منٹ کے لیے خاموش ہو جائیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ مجھ پر سانپ کے زہر کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ سانپ اگر آدمی کی گردن پر کاٹے تو زہر کا اثر بڑی تیزی سے دماغ تک پہنچ کر آدمی کے اعصاب کو ساکت کر دیتا ہے اور آدمی کی فوراً" موت واقع ہو جاتی ہے مگر میرے ساتھ

ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ ان سب دوستوں کو علم تھا کہ میں کبھی کبھی سانپ کی جون بدل لیتا ہوں۔ میں نے کہا۔

"دوستو! مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ سانپ کے زہر نے میرے خون پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ میرے اندر کبھی کبھی سانپ کے روپ میں آنے کی وجہ سے جو زہر جمع ہوگیا ہوا ہے اس نے سانپ کے زہر کو بے اثر کر دیا ہے۔"

وہ لوگ بھی تعجب سے مجھے دیکھ رہے تھے کیونکہ میرے جسم پر زہر کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

"خدا کے لیے اس سانپ کو تو مار ڈالو۔"

مگر میں اس سانپ کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ سانپ کے ڈسنے کی وجہ سے میرے ذہن میں ایک عجیب و غریب سکیم جنم لے چکی تھی۔ میں نے یہ سکیم خفیہ ہی رکھی اور خالد سے کہا۔

"میں ابھی اس سانپ کو مارنا نہیں چاہتا۔"

میں نے سانپ کو الٹا کر کے دیکھا اور کہا۔

"یہ مادہ ناگن ہے۔ اس کا نر بھی یہیں کہیں ہوگا۔"

کمانڈو ہارون نے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو کرم داد! تمہیں اس کے نر سے کیا دلچسپی ہے۔ خدا کے واسطے اس موذی کا سر کچل دو۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"ہو سکتا ہے یہ بھی میری طرح کا انسان ہو جو میری ہی طرح کی مصیبت میں گرفتار ہو اور انسان سے جون بدل کر سانپ بن گیا ہو۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"کرم داد! مذاق بہت ہوچکا۔ اس سے پہلے کہ یہ سانپ تمہارے ہاتھ سے نکل کر کسی اور کو ڈس دے۔ اسے مار ڈالو۔"

میں نے کہا۔

"کمانڈو خالد! تم میرے ساتھ آؤ' ہارون اور قاسم بھائی تم بے شک اندر چلے جاؤ۔"

کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ لیکن میرے اصرار پر قاسم اور ہارون مکان کے اندر چلے گئے اور کمانڈو خالد وہیں کھڑا رہا۔ "تم کہاں جانا چاہتے ہو؟" خالد نے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے سانپ کی گردن کو اچھی طرح سے دبوچ لیا۔ اس خیال سے نہیں کہ دوسری دفعہ مجھے کاٹ ڈالے گا اور مجھ پر ہو سکتا ہے دوسری بار ڈسنے سے زہر کا اثر ہو جائے کیونکہ مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ سانپ چاہے ساری رات مجھے ڈستا رہے اس کے زہر کا مجھ پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہو گا۔ میں نے سانپ کی گردن اس لیے دبوچ رکھی تھی کہ میں اس کے زہر کو منہ کے اندر ہی محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے اس سانپ کے زہر سے بڑا ضروری کام لینا تھا۔

میں نے خالد سے کہا۔

"کمانڈر! میرے ساتھ آؤ۔ میں اس مادہ ناگن کے نر سانپ کو بھی پکڑنا چاہتا ہوں۔"

کمانڈو خالد کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ کچھ نہیں سمجھ سکا کہ میں اسے کیا کہہ رہا ہوں اور کیوں کہہ رہا ہوں مگر وہ میرے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ میں نے ناگن سانپ کو اس کی دم سے پکڑ کر اسے نیچے لٹکا لیا۔ اب وہ میرے پھیلے ہوئے بازو کے ساتھ جھول رہی تھی اور منہ اوپر لا کر میری کلائی پر ڈسنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ایک تو ناگن کی لمبائی زیادہ تھی دوسرے میں اسے اوپر نہیں آنے دے رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر مادہ ناگن یہاں پر ہے تو اس کا نر سانپ بھی ضرور یہیں کہیں ہو گا۔ ایک جگہ جھاڑیوں کے پاس آ کر ناگن سانپ نے پھنکارنا شروع کر دیا۔

میں نے خالد سے کہا۔

"تم اسی جگہ ٹھہرو۔"

میں جھاڑیوں میں چلا گیا۔ اچانک ایک جھاڑی میں سے پھنکار کی آواز آئی اور ایک مٹیالے رنگ کے سانپ نے تیزی سے لپک کر میری پنڈلی پر ڈس دیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے وہیں اس کی دم دبوچ کر اسے اٹھا لیا۔ دونوں سانپ میرے ہاتھوں میں تھے۔ دونوں میرے ہاتھوں میں لٹک رہے تھے اور مجھے ڈسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری پنڈلی ایک دو سیکنڈ کے لیے گرم ہو کر پھر اپنی نارمل حالت میں آ گئی تھی۔ اس سانپ کے زہر نے بھی مجھے کچھ نہیں کہا تھا۔ کمانڈو خالد نے میرے دوسرے ہاتھ میں بھی سانپ دیکھا تو گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس نے بھی مجھے ڈس لیا ہے مگر مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجھے تو اب پتہ چلا ہے کہ مجھ پر سانپ کے کاٹے کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ آ جاؤ مکان پر چلتے ہیں۔"

"مگر ان سانپوں کو کیوں لے جا رہے ہو؟"

خالد نے حیرانی سے پوچھا۔ میں نے کہا۔

"یہ میں تمہیں کمرے میں جا کر بتاؤں گا۔"

ہم شیر خان کے مکان والے کمرے میں آ گئے۔ وہاں ہارون اور قاسم پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھوں میں دو سانپ دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئے۔ میں نے قاسم سے کہا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں قاسم۔ شیر خان کے پاس جاؤ اور کوئی موٹے پلاسٹک کا تھیلا ہو تو لے آؤ۔"

قاسم دوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں شیر خان کھانا تیار کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اس کو قاسم نے جب بتایا کہ کرم داد دو سانپ پکڑ لایا ہے اور پلاسٹک کا تھیلا مانگ رہا ہے تو وہ آ گیا۔ میرے ہاتھوں میں سانپ دیکھ کر ڈر گیا۔

"بھائی کرم داد! ان موذیوں کو یہاں کیوں لے آئے ہو؟"

کمانڈو خالد نے شیر خان سے کہا۔

"اگر گھر میں موٹے پلاسٹک کا تھیلا ہو تو لے آؤ۔"

وہ بولا۔

"تھیلا تو نہیں ہے' بناسپتی گھی والا چھوٹا خالی ڈبہ ہے۔"

میں نے کہا۔

"وہی لے آؤ۔"

شیر خان بناستی گھی کا گول ڈبہ لے آیا۔ اس کا سائیز درمیانہ تھا۔ میں نے قاسم سے کہا۔

"ڈبے کا ڈھکنا کھول کر میرے آگے کر دو۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے کوشش کر کے دونوں سانپوں کو ڈبے میں ڈال کر اس کا ڈھکنا بند کر دیا۔ کمانڈو خالد نے میرے جسم پر اس جگہ کو دیکھا جہاں مجھے دونوں سانپوں نے کاٹا تھا۔ یہ دیکھ کر میں خود حیران رہ گیا کہ وہاں ذرا سی بھی سوجن نہیں پڑتی تھی۔ صرف سانپ کے دانتوں کا نشان تھا جہاں تھوڑا سا خون نکل کر جم گیا تھا۔

شیر خان کہنے لگا۔

"بھائی کرم داد! کیا تم سپیرے بھی ہو؟"

میں نے ہنس کر کہا۔

"میں سپیرا ہی نہیں سانپ بھی ہوں۔"

اس پر کمانڈو خالد اور میرے دوسرے ساتھی ہنسنے لگے۔ وہ میرے سانپ بن جانے کے راز کو جانتے تھے۔ شیر خان کو معلوم نہیں تھا۔ وہ چلا گیا' تب خالد نے مجھ سے پوچھا۔

"اب بتاؤ تم نے یہ سانپ کیوں پکڑے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میں راز ابھی کسی کو بھی نہیں بتانا چاہتا۔ میرے ذہن میں ایک

سکیم ہے اگر میری سکیم کامیاب ہوگئی تو تم سب کو اپنے آپ پتہ چل جائے گا کہ میں نے یہ سانپ کیوں پکڑے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مادہ ناگن نے مجھے ڈس کر خود یہ سکیم بتائی ہے۔"

"تو کیا تم ان سانپوں کو ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟"

کمانڈو ہارون کے اس سوال پر میں نے کہا۔

"ارادہ تو یہی ہے۔ آگے اللہ مالک ہے۔ میں چاہتا ہوں دوستو! کہ ان سانپوں کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہ پوچھا جائے۔"

"اوکے' اوکے۔"

کمانڈو خالد نے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اب تم سے کوئی کچھ نہیں پوچھے گا۔"

میں نے شیر خان سے کپڑے کا ایک تھیلا منگوا کر سانپوں والے ڈبے کو تھیلے میں ڈال کر اوپر رسی لپیٹ دی۔

دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد ہم سب سو گئے۔ رات کو ہمیں بڑے اہم کمانڈو مشن پر جانا تھا۔ ہم شام تک سوئے رہے۔ شام کو چائے پی اور اپنے اپنے آٹومیٹک پستولوں کو چیک کر کے ان میں نئے میگزین ڈالے۔ رات کے نو بجے ہم نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد کافی بنوا کر پی تاکہ جسم چوکس رہے۔ ساڑھے دس بجے ہم سب نے کمانڈو کی وردیاں پہن لیں۔ طے یہ ہوا کہ ایک کمانڈو پارٹی میں میرے ساتھ کمانڈو خالد ہوگا اور دوسری کمانڈو پارٹی میں مجاہد قاسم کے ساتھ ہارون ہوگا۔ قاسم اس پارٹی یعنی ہارون کو گائیڈ کرے گا۔ جب رات کو پورے بارہ بج گئے تو خالد نے شیر خان کو اشارہ کیا وہ باہر کی فضا کی دیکھ بھال کو نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آگیا اور بولا۔

"اوکے کمانڈر! سب ٹھیک ہے۔"

ہم نے اپنی اپنی جگہ گھڑیاں ملالیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک چاقو اور ایک ایک آٹومیٹک پستول تھا جس کی نالی پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ ہم سیاہ جیکٹ اور

پتلونوں میں تھے۔ اندھیرے میں ہمیں دیکھنا مشکل تھا۔ میں اور قاسم ذرا آگے آگے اپنے ساتھیوں کو گائیڈ کرتے چل رہے تھے۔ ہم نے اپنی رفتار مکان سے نکلتے ہی تیز کر لی تھی۔ تاکہ اپنے ٹارگٹ پر جلدی پہنچ سکیں۔ رات تاریک تھی۔ آسمان پر پتلے بادلوں کی وجہ سے ستارے کہیں کہیں بڑے دھندلے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ ہوا بند تھی۔ قاسم کہنے لگا۔

"خدا کرے کہیں بارش نہ ہو جائے۔"

کمانڈو خالد نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ بادل بارش والے نہیں ہیں۔"

مجھے اور قاسم کو سارا رستہ یاد تھا۔ ہم ایک گھنٹے میں ان پہاڑیوں کے دامن میں ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں جوار بھاٹا کی سمندری لہروں کا پانی جگہ جگہ نشیبی علاقے میں بھرا ہوا تھا۔ یہاں سے ہم نے راستہ بدل لیا۔ کیونکہ ہمیں سمندر کی طرف سے اپنے ٹارگٹ تک پہنچنا تھا۔ اس طرف راستے میں بڑی توپوں کے بنکر بھی تھے اور مشین گنوں کے مورچے بھی تھے۔ جبکہ سمندر کی جانب پہاڑی ڈھلان پر ہمیں صرف دو مشین گن پوسٹیں نظر آئی تھیں۔ ہمیں صرف ان گن پوسٹوں اور گشتی پٹرول کے سپاہیوں سے اپنے آپ کو بچانا تھا۔ لیکن اب ہم اس پوزیشن میں تھے کہ اگر کوئی ایمرجینسی والی صورت حال پیدا ہوگئی تو گشتی پارٹی کے سپاہیوں کو وہیں ڈھیر کر دیں کیونکہ ہمیں دوبارہ اس طرف نہیں آنا تھا۔ اگر ہم زندہ بچ گئے تو!

ہم پہاڑی کی طرف جانے کی بجائے اس کے دامن میں چٹانوں اور پتھروں کے درمیان سے ہو کر شمال مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جس طرف سمندر کا ساحل تھا۔ ہمیں اسی طرف سے پہاڑی پر چڑھنا تھا۔ اس طرف گشتی پارٹی کے سنتریوں کا بھی خطرہ کم ہی تھا۔ کیونکہ یہ علاقہ گن پوسٹ سے کافی دور تھا۔

زمین ریتلی شروع ہوگئی تھی جہاں کہیں کہیں سمندر کا پانی کھڑا تھا۔ میں دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ بارش نہ شروع ہو جائے۔ بارش ہمارے مشن کی راہ میں رکاوٹیں

ڈال سکتی تھی۔ میں نے سانپوں والا تھیلا اپنی کمر کے گرد رسی سے باندھا ہوا تھا۔ ان سانپوں سے مجھے وہ کام لینا تھا جو ہم نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کر سکتے تھے تو اس میں کامیابی کے چانس بہت کم تھے۔ اسی طرح بے حد محتاط رہ رہ کر چلتے چلتے آخر ہم اس مقام پر آگئے جہاں ہماری ایک جانب سنگلاخ ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہاں سے ہم چٹانوں کی آڑ لیتے ساحل سمندر کی طرف ہوگئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہمیں سمندر میں دور کھڑے ایک جہاز کی دھندلی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ ہم بائیں جانب مڑ گئے۔ دو سو گز تک ہم اونچی نیچی سمندری چٹانوں کے درمیان پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے چلتے گئے۔ میں اور مجاہد قاسم آگے آگے تھے۔ کیونکہ ہمیں یہ رستہ یاد تھا۔ کمانڈو خالد اور کمانڈو ہارون ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ ہم اس پہاڑی کے دامن میں آگئے جس کی چوٹی پر بڑی لیزر گن کا مورچہ تھا۔ یہاں آ کر ہم اندھیرے میں بیٹھ گئے۔ میں نے اپنی پارٹی سے دھیمی آواز میں کہا۔

''یہاں سے ہمارے ٹارگٹ کا اصل اور خطرناک علاقہ شروع ہو رہا ہے۔ دو سو گز کی چڑھائی کے بعد ہم دو دو کی ٹولیوں میں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ اب ہم آپس میں کوئی بات چیت نہیں کریں گے۔ ساری باتیں اشاروں میں ہوں گی۔ جب ہم الگ الگ ہو جائیں گے تو اس کے بعد ہمیں کیڑے مکوڑوں کی طرح پہاڑی چڑھائی پر رینگنا ہوگا۔ آٹومیٹک پستول کے فائر سے گریز کرنا ہوگا۔ انتہائی ضرورت کے وقت کمانڈو چاقو سے کام لینا ہوگا۔ کھانسی چھینک کو ہر حالت میں روکنا ہوگا۔ اوکے۔''

ہم نے اللہ کا نام لے کر پہاڑی کی ڈھلان پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ہم رات کی تاریکی میں پتھروں پر پاؤں جما جما کر چڑھ رہے تھے۔ ابھی چڑھائی سیدھی اور مشکل نہیں تھی۔ جب ہم تقریباً دو ڈھائی سو گز کا فاصلہ طے کر چلے تو مجاہد قاسم نے ایک طرف اشارہ کیا۔ اس طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو جگہ سے زمین ابھری ہوئی تھی۔ میں اور مجاہد قاسم نے پہچان لیا تھا کہ یہ دشمن کی مشین گن پوسٹیں تھیں۔ میں نے یہ مورچے دور سے کمانڈو خالد کو بھی دکھائے اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"تمہیں اور ہارون کو ان مشین گن مورچوں سے بہت چوکس رہ کر گزرنا ہوگا۔ یہاں سے تم رینگ کر آگے بڑھو گے۔"

پھر میں نے اوپر پہاڑی کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ اوپر ایک جگہ ہلکی ہلکی روشنی باہر نکل رہی تھی۔ میں نے کمانڈو خالد کو روشنی کا وہ سپاٹ دکھایا اور سرگوشی میں کہا۔

"یہ بڑی لیزر توپ کے بنکر کی روشنی ہے۔ قاسم اور ہارون اس شگاف کی دوسری جانب سے نمودار ہوگے۔ میں اور تم اس طرف سے جائیں گے۔ بنکر کے شگاف پر پہنچ کر تم لوگ صرف ہمیں اپنے چہرے دکھاؤ گے۔ اس کے بعد جب میں اشارہ کروں گا تو تم بنکر کے اندر کود پڑو گے۔ میرے اشارے کے بغیر تم دم سادھے وہیں بیٹھے رہو گے۔ اوکے؟"

کمانڈو خالد نے سرگوشی میں کہا۔

"اوکے!"

"گو۔"

اس مقام سے ہماری کمانڈو پارٹی دو دو کی ٹولیوں میں بٹ گئی مجاہد قاسم' کمانڈو ہارون کو لے کر دوسری طرف اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ میں اور کمانڈو خالد پہاڑی کی اپنی طرف والی ڈھلان پر آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگے۔ اس جانب گشتی سنتریوں کے پٹرول کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس علاقے کو ہم نے اس لیے منتخب کیا تھا۔ یہاں دشمن نے صرف دو مشین گن مورچے ہی کافی سمجھے تھے۔ آہستہ آہستہ پہاڑی کی چڑھائی سیدھی ہوتی گئی۔ پھر بیٹھ کر اور جھک کر چڑھائی چڑھنا مشکل ہوگیا۔ ہم پیٹ کے بل رینگنے لگے۔ سب سے زیادہ احتیاط ہمیں یہ کرنی پڑ رہی تھی کہ ہمارے جسموں سے دب کر یا لگ کر کوئی پتھر نیچے نہ لڑھک جائے۔ ہم بہت آہستہ آہستہ رینگ رہے تھے۔ میں کمانڈو خالد کا گائیڈ بھی تھا۔ میں اسے اسی راستے سے لے جا رہا تھا جس راستے سے میں اور قاسم ایک رات پہلے ریکی کر چکے تھے۔ ہم کافی اوپر آ گئے تھے۔ سمندر کی طرف سے لہروں کے پتھروں اور چٹانوں سے ٹکرانے کی آواز بڑی مدھم سنائی دے رہی تھی۔

کمانڈو چاقو ہم نے اپنے اپنے ہاتھوں میں پکڑ رکھے تھے۔ ہماری آنکھیں چالاک چیتے کی آنکھوں کی طرح اندھیرے میں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پہاڑی گن پوسٹ والے شگاف کی دھیمی روشنی قریب ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں پہاڑی کی ڈھلان پر ایک پگڈنڈی آتی ہے جہاں گزشتہ رات نائیٹ پٹرول کے سنتری ہم نے ایک دوسرے سے باتیں کرتے گزرتے دیکھے تھے۔ میں نے کمانڈو خالد کے کندھے کو آہستہ سے دبایا۔ وہ رک گیا۔ میں نے اوپر کی طرف اشارہ کرکے انگلیوں کو دائیں بائیں گھمایا۔ اس کا مطلب تھا کہ آگے خطرہ ہے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کسی طرف سے گشت لگاتے سنتری تو نہیں آ رہے۔ جب میری تسلی ہوگئی کہ ادھر کوئی رات کو گشت لگانے والی پارٹی نہیں ہے تو میں نے رینگنا شروع کر دیا۔ کمانڈو خالد نے بھی ایسا ہی کیا۔ جب ہم پہاڑی کی چھوٹی سی پگڈنڈی پر پہنچے تو اچانک ایک طرف سے باتیں کرنے اور ہلکے قہقے کی آواز سنائی دی۔

آواز بڑے قریب سے آئی تھی۔ میں نے کمانڈو خالد کے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ مارا اور تڑپ کر پگڈنڈی پار کرکے دوسری طرف ایک پتھر کے پیچھے اپنے آپ کو گرا دیا۔

کمانڈو خالد نے بھی بالکل ایسے ہی کیا۔ پتھر بڑا نہیں تھا۔ اگر پگڈنڈی پر سے گزرتے ہوئے کوئی ہماری طرف دیکھتا تو ہم نظر آ سکتے تھے۔ صرف رات کا اندھیرا ہی ہمیں کسی حد تک بچا سکتا تھا۔ ہم اوپر چڑھائی پر بھی نہیں چھپ سکتے تھے۔ اتنی دیر میں دو گشتی سنتری جو نائیٹ پٹرول پر تھے پہاڑی کے پہلو سے نمودار ہو کر پگڈنڈی پر آ چکے تھے۔ ہم مردہ سانپوں کی طرح اندھیرے میں پیٹ کے بل پڑے تھے اور آنکھیں پھاڑے دشمن کو قریب آتا دیکھ رہے تھے۔ میری نگاہیں بھارتی سپاہیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ چاقو پر میری گرفت مضبوط ہوگئی تھی۔ اب کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ خالد کی بھی یہی کیفیت تھی۔ میں نے انگلی کے اشارے سے ایک سگنل دیا۔ وہ اوندھے پڑے پڑے لڑھک کر دو قدم پرے ہوگیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں نے اسے کیا سگنل دیا ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ہم بچ نہیں سکتے۔ بھارتی سپاہیوں کی ہمارے قریب

سے گزرتے ہوئے ہم پر ضرور نظر پڑ جاتی تھی۔ ایک سپاہی میری جانب چلا آ رہا تھا۔ دوسرا سپاہی کوئی دو تین فٹ پیچھے چل رہا تھا۔ دونوں کے پاس سٹین گنیں یا برین گنیں تھیں جو ان کے کندھوں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ میں نے کمانڈو خالد کو جو سگنل دیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ میں پیچھے آنے والے بھارتی سپاہیوں کو نشانہ بناؤں گا اور وہ ذرا آگے چلنے والے سنتری کو دبوچ لے گا۔

یہ ایکشن اتنا آسان نہیں تھا۔ کوئی آسان زاویہ بھی نہیں بن رہا تھا۔ ہمیں چیتے کی طرح زمین سے اچھل کر دشمن کی گردنوں پر وار کرنا تھا۔ اور اس طرح وار کرنا تھا کہ ایک ہی وار میں دشمن کی شہ رگ کٹ جائے یا گردن کا منکا ٹوٹ جائے اور وہ کوئی آواز نہ نکال سکیں۔ یہ کام بیک وقت ہونا تھا۔ اس ایکشن میں ایک سیکنڈ کا وقفہ ہمارے سارے منصوبے کو ہمارے ساتھ ہی خاک میں ملا سکتا تھا۔ پہاڑی کی یہ پگڈنڈی چونکہ زیادہ چوڑی نہیں تھی اس لیے لامحالہ دونوں سنتریوں کو ایک دوسرے کے پیچھے چلنا پڑ رہا تھا۔ وہ بڑی بے نیازی اور خوشگوار موڈ میں چلے آ رہے تھے اور کسی وقت باتیں بھی کرنے لگتے تھے۔ میری نگاہیں پیچھے آنے والے سنتری پر جم گئی تھیں۔ جیسے ہی یہ سنتری ہمارے قریب سے گزرے ان میں سے جو آگے تھا اس نے اندھیرے میں کمانڈو خالد کو دیکھ لیا اور پوچھا۔

"کون ہے؟"

یہ ہماری خوش قسمتی اور خوش نصیبی تھی کہ اس اناڑی بھارتی سپاہی نے کمانڈو خالد پر فائر نہیں کیا تھا حالانکہ جس قسم کے نازک اور حساس علاقے میں وہ پٹرولنگ ڈیوٹی پر تھا اس کا تقاضا تھا کہ وہ اندھیرے میں کسی انسان کو دیکھتے ہی فائر کر دے مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا بلکہ وہ اونچی آواز میں بول بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ فوجیوں کی طرح بلند آواز میں بولتا تو ڈر تھا کہ قریبی مشین گن پوسٹ تک اس کی آواز پہنچ جاتی اور وہ لوگ الرٹ ہو جاتے یا مشین گن کی بوچھاڑیں مارنے لگتے اور روشنی کے راؤنڈ بھی فائر کر دیتے۔ جن کی روشنی میں ہم صاف نظر آسکتے تھے۔ مگر اس ناتجربہ کار بھارتی

سپاہی نے ایسا بھی نہیں کیا۔ میں وہ غلطی کرنے کی حالت میں نہیں تھا جو اس سپاہی نے کی تھی۔ اس سے پہلے کہ بھارتی سنتری کا پورا جملہ ختم ہوتا میں اس پر اور کمانڈو خالد دوسرے سنتری پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ چھلانگ لگانا' گردن کو شکنجے میں لینا اور دشمن کے حلق پر پوری طاقت سے چاقو پھیرنا یہ تینوں کام ایک ہی ایکشن میں ہو گئے تھے۔ کمانڈو خالد نے بھی اپنی زد میں آئے ہوئے بھارتی سپاہیوں کو کوئی آواز نکالنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ مجھے اس کا ڈر تھا کیونکہ وہ فوجی کمانڈو نہیں تھا۔ اس کو فوجی کمانڈو ٹریننگ نہیں ملی ہوئی تھی پھر بھی اس نے کمال کر دکھایا۔

دوسرے لمحے دونوں بھارتی سپاہیوں کی لاشیں رات کے اندھیرے میں پہاڑی پگڈنڈی پر اوندھی پڑی تھیں۔ ہم نے جلدی سے ان لاشوں کو گھسیٹ کر پتھروں اور چٹانوں کے پیچھے کر لیا۔ یہاں سے وہ دیکھے نہیں جا سکتے تھے۔ ہم اس کام سے فارغ ہو کر بے دم سے ہو کر ڈھلوان زمین پر اوندھے پڑ گئے تھے۔ ہمارے سانس پھول رہے تھے۔ میں نے کمانڈو خالد کو اوپر توپ کے مورچے کے شگاف میں سے آتی روشنی کی طرف اشارہ کر کے آگے بڑھنے کا سگنل دیا۔ ہم اوپر کی طرف رینگنے لگے۔ آہستہ آہستہ مورچے کے شگاف کی روشنی قریب آتی جا رہی تھی۔ میرا ذہن اپنی دوسری کمانڈو پارٹی کی طرف بھی لگا تھا۔ سب سے زیادہ خطرہ مشین گن کے مورچوں کا تھا جہاں اپنے دونوں ساتھیوں کو بڑے قریب سے ہو کر گزرنا تھا۔ لیکن قاسم کمانڈو ہارون کے ساتھ تھا اس لیے مجھے تھوڑا بہت اطمینان تھا۔ مجاہد قاسم اس جگہ کے سارے نشیب و فراز سے واقف تھا۔ ابھی تک اس طرف کوئی خطرناک صورت حال پیدا نہیں ہوئی تھی' ورنہ مشین گنوں کے دھماکے سنائی دینے لگ جاتے اور روشنی راؤنڈ فائر ہو کر سارے علاقے میں دن کی روشنی کر دیتے۔

ہم کنکھجوروں کی طرح رینگتے ہوئے توپ کے مورچے کے دہانے کے بالکل قریب پہنچ کر وہیں دبک کر بیٹھ گئے۔ ہم دم سادھے بیٹھے تھے اور ہمارے کان شگاف کے اندر سے آنے والی ٹک ٹک کی آواز پر لگے تھے۔ یہ کمپیوٹر کی آواز تھی۔ کوئی شخص

کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا۔ شگاف میں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ ہم اندھیرے میں پہاڑی دیوار کی اوٹ میں تھے۔ میں نے کمانڈو خالد کو وہیں دبکے رہنے کا اشارہ دیا اور خود آہستگی سے سر کو اونچا کیا اور شگاف کے دہانے سے اندر بنکر میں دیکھا۔ بنکر میں خطرناک لیزر گن اپنے فولادی بائی پاڈ پر کسی عفریت کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ بنکر میں روشنی ہو رہی تھی۔ سامنے والے پینل پر ایک بارودی سپاہی کمپیوٹر کے آگے بیٹھا کام کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں سر نیچے کرنے ہی لگا تھا کہ توپ کے پیچھے سے دو بھارتی سپاہی اندر آ گئے۔ میں نے جلدی سے سر نیچے کر لیا۔ اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کمانڈو خالد خرگوش کی طرح دبک کر اندھیرے میں پتھروں سے لگا ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے جلدی سے نیچے ہوتے دیکھا اور مورچے کے اندر سے آوازیں آتی سنیں تو سمجھ گیا کہ خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں چیتے کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے آہستہ سے کمر کے ساتھ بندھا ہوا سانپوں کے جوڑے کا تھیلا اتارا۔ دونوں زہریلے سانپ ڈالڈا کے ڈبے میں بند تھے۔ ڈبہ باہر نکال کر میں نے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ ان سانپوں کو میں نے اسی نازک گھڑی کے لیے پکڑا تھا۔ کمانڈو خالد ضرور اس وقت مجھے حیران آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا۔ لیکن اس وقت میں اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میری ساری توجہ اوپر مورچے سے آنے والی آوازوں کی طرف لگی ہوئی تھی۔





مجھے سگریٹ کے تمباکو کی بو محسوس ہوئی۔

مورچے کے اندر کسی نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اپنے سر کو اوپر کھسکانے لگا۔ پھر جب صرف میری آنکھیں بنکر کے دہانے کے کناروں سے ذرا اوپر ہوئیں تو مجھے وہاں جو منظر نظر آیا وہ یہ تھا۔ کمپیوٹر پر بیٹھا ہوا فوجی اسی طرح بیٹھا کام کر رہا تھا اور بار بار کمپیوٹر کی سکرین کو دیکھتا جاتا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک سنتری سٹین گن کندھے سے لٹکائے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ دوسرا سنتری لیزر گن کے بالکل سامنے سٹول پر بیٹھا اپنی برین گن کو گھٹنوں پر رکھے کپڑے سے اس کی نالی کو رگڑ رہا تھا۔ اتنے میں اچانک مجھے دہانے کے سامنے والے سرے سے ایک انسانی سر ابھرتا دکھائی دیا۔ یہ مجاہد قاسم تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ ہماری دوسری کمانڈو پارٹی خیریت سے ٹارگٹ تک پہنچ گئی تھی۔ میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر انگلی سے اشارہ کیا۔ مجاہد قاسم نے میرے اشارے کو دیکھا اور جلدی سے اپنا سر نیچے کر لیا۔ اب مجھے ترپ کا پتا پھینکنا تھا جو ڈالڈا گھی کے ڈبے میں بند تھا۔ میں نے بڑے آہستگی سے ڈبے کا ڈھکن کھولا کہ اس کی ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ڈبے میں ہاتھ ڈال کر ایک سانپ کو گردن سے دبوچ لیا۔ اس نے مجھے فوراً ہاتھ پر ڈس لیا۔ میں نے اسے باہر نکال کر دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن کو پکڑ لیا اور پھر دوسرے سانپ کو بھی نکال کر اس کی گردن کو دبوچ لیا۔ ڈبے کو میں بڑی

آہستگی اور احتیاط کے ساتھ رکھنا چاہتا تھا لیکن میرے دونوں ہاتھوں میں سانپ تھے۔ کمانڈو خالد مجھے برابر دیکھ رہا تھا۔

اس نے فوراً میری گود سے ڈبا اٹھا لیا۔ میں اپنا سر اونچا کرنے لگا۔ شگاف کے کنارے سے ذرا سا سر نکال کر دیکھا۔ تینوں فوجی اسی پوزیشن میں بیٹھے تھے۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ جو بھارتی سنتری لیزر گن کے سامنے سٹول پر بیٹھا تھا۔ اب وہ بھی سگریٹ پی رہا تھا۔ اور گجراتی زبان میں اپنے ساتھی سے کوئی بات کر رہا تھا۔ میں نے سر نیچے کر لیا۔ اس کے فوراً بعد میں نے ایک ہاتھ شگاف کے اندر ڈال کر سانپ کو دیوار کی اندر کی طرف چمٹا دیا۔ اس کے بعد دوسرے سانپ کو بھی اس طرح شگاف کے اندر داخل کر دیا۔ اب سارا کام سانپوں کے اس جوڑے نے کرنا تھا۔ لیکن میں بے خبر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے سر اونچا کر کے اپنی آنکھیں شگاف کے کنارے کے ساتھ لگا دیں۔

وہاں ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ خدا جانے دونوں سانپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ دونوں سانپ مورچے کی دیوار کے ساتھ رینگتے ہوئے بنکر سے باہر نکل جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کمپیوٹر والے پینل کے پیچھے جا کر چھپ گئے ہوں۔ اتنی دیر میں میں نے صرف اتنا کیا کہ جیب سے آٹو میٹک پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور اشارے سے کمانڈو خالد کو بھی الرٹ کر دیا تھا۔ ابھی تک میں نے سر کو نیچے ہی کیا ہوا تھا۔ میں اندر سے آنے والی گھبرائی ہوئی آوازیں سننا چاہتا تھا جو ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ ہمارے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔ میں نے پستول سے تینوں بھارتی سنتریوں کو موت کی نیند سلانے کا فیصلہ کیا اور سر کو اوپر کر کے بنکر میں جھانک کر دیکھا تاکہ ایسی پوزیشن بنا سکوں کہ یکے بعد دیگرے تینوں سپاہیوں کو نشانہ بنا سکوں۔ پستول آٹو میٹک تھا۔ اس کی نالی پر سلینسر چڑھا ہوا تھا جس کی وجہ سے فائر کا دھماکہ نہیں ہونا تھا۔ میں نے ایک خاص زاویے پر پوزیشن بنائی اور پستول والا ہاتھ آہستہ آہستہ کھسکاتے ہوئے اوپر کر ہی رہا تھا کہ اچانک اس فوجی نے جو کمپیوٹر کے

سامنے بیٹھا ہوا تھا زور سے اپنی ٹانگ پر ہاتھ مارا اور اس کے ساتھ ہی کرسی سے لڑھک گیا۔ ایک سانپ نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ اسے کرسی سے گرتے دیکھ کر دونوں مسلح سنتری اس کی کی طرف لپکے۔ گرے ہوئے فوجی کے منہ سے صرف سانپ کے الفاظ ہی نکل سکے۔ سانپ کا سن کر دونوں فوجیوں نے ادھر ادھر گھبرا کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اپنی گنوں کو انہوں نے فائرنگ کی پوزیشن میں کر لیا تھا۔ ان کے ادھر ادھر گھبرائی ہوئی حرکتیں کرنے سے ان کے بوٹوں کی دھمک نے سانپوں کو بھی ہراساں کر دیا۔

دونوں سانپ وہیں تھے اور شاید ایک کو ڈسنے کے بعد وہ چھپنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کر رہے تھے کہ فوجیوں کے شور اور ان کے بھاری جوتوں کی آوازوں سے وہ گھبرا گئے اور اپنی جان بچانے کے لیے انہوں نے ان سنتریوں کو بھی ڈس دیا۔ عجیب منظر سامنے آیا۔ وہ منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ دونوں فوجی دہشت ناک انداز میں سانپ سانپ کی آوازیں نکالنے لگے۔ مجھے یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ ان کی آوازیں سن کر باہر سے زیادہ فوجی اندر نہ آ جائیں۔ لیکن لگتا تھا کہ رات کے وقت صرف وہ دونوں سپاہی ہی ڈیوٹی پر تھے۔ دونوں فوجی چکرا کر ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر ہو گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سانپ بڑے زہریلے تھے اور کلر کے سانپ تھے۔ خود سانپ بن جانے کی وجہ سے مجھے سانپوں کے بارے میں اتنا کچھ معلوم ہو چکا تھا کہ اتنا علم پرانے سے پرانے سپیرے کے پاس بھی نہیں ہوگا۔ کلر سانپ کا زہر بھی سب سے پہلے آدمی کے گلے کی رگوں کو مفلوج کرتا ہے اور اس کی آواز بند ہو جاتی ہے۔ یہی حال ان تینوں بھارتی فوجیوں کا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ گرے میں نے مورچے کے دہانے کے دوسرے کنارے کی طرف دیکھا۔ کمانڈو قاسم سر اوپر کیے ہوئے تھا اور اس نے تینوں بھارتی فوجیوں کو گرتے دیکھ لیا تھا۔ جیسے ہی میں نے اسے اشارہ کیا وہ مورچے کی دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہارون بھی اندر آ گیا۔ میں اور کمانڈو خالد بھی مورچے میں بڑے آرام سے کود کر اندر آ گئے۔ میں نے انہیں سانپوں سے ہوشیار رہنے کا اشارہ بھی کر دیا تھا۔

میں خود بنکر کے پیچھے کی طرف کھسکنے لگا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس طرف کوئی فوجی پوسٹ تو نہیں ہے۔ تاکہ اگر ہو تو اس کے سنتریوں کو بھی ختم کر دیا جائے تاکہ ہم اپنا کام شروع کر سکیں۔ پیچھے ایک دروازہ بنا ہوا تھا۔ میں نے اسے ذرا سا کھول کر دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا صحن تھا جس کے کونے پر ایک بیرک سی بنی ہوئی تھی۔ وہاں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں دوروازہ بند کرنے لگا تو مجھے دونوں سانپ فرش پر نظر آئے۔ وہ دروازے کی طرف آ رہے تھے۔ میں نے دروازہ تھوڑا سا اور کھول دیا۔ دونوں سانپ باہر نکل گئے۔ میں نے مجاہد قاسم کر اشارہ کر کے بلایا اور سرگوشی میں کہا کہ وہ دروازے کو تھوڑا سا کھول کر باہر دیکھتا رہے۔ اگر کوئی سپاہی ادھر آ رہا ہو تو ہمیں فوراً خبردار کر دے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں تیز قدم اٹھاتا اپنے ساتھیوں کے پاس آ گیا۔ طاقتور ٹائم بموں کا ایک تھیلا مجاہد قاسم اور کمانڈو ہارون لائے تھے۔ ایک تھیلا کمانڈو خالد اپنی پشت پر باندھ کر لایا تھا۔ میں نے خالد سے کہا۔

"ٹائم بم فوراً باہر نکال لیں۔"

کمانڈو ہارون نے بھارتی فوجیوں کی لاشیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"پستول کے فائر کی آواز ہم نے نہیں سنی تھی۔ ان کو کیسے ختم کیا؟"

کمانڈو خالد بولا۔ "انہیں ان سانپوں نے ڈس کر ہلاک کیا ہے جو کرم داد ڈبے میں بند کر کے لایا تھا۔ یہ ایکشن بھی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

ہم نے جلدی جلدی ٹائم بموں کے پیک لگانے شروع کر دیئے۔ زیادہ بم ہم نے بزر گن پر اور اس کے بائی پاڈ کے نیچے اور پہلوؤں پر لگائے۔ بائی پاڈ فولادی تھا جس کی جہ سے بم اس کے ساتھ آسانی سے چپک گئے۔ اچانک دروازے کی درز کے پاس کھڑے قاسم نے منہ سے ہلکی سی سسکی کی آواز نکال کر ہمیں بتایا کہ باہر سے دو سپاہی آ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ دروازے کی ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ میں نے کمانڈو الد کو اشارہ کیا۔ وہ دوازے کی دوسری جانب دیوار کے بالکل ساتھ لگ گیا۔ میں اور

کمانڈو ہارون لیزر گن کے دائیں اور بائیں لوہے کی اونچی الماریوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ اس وقت وہاں صورت حال یہ تھی کہ اگر دونوں سپاہی بنکر میں داخل ہو جاتے تو انہیں لیزر گن اور بائی پاؤ پر لگے ہوئے لمبی سنکوں والے ٹائم بم صرف نظر آ سکتے تھے۔ ان کے علاوہ تین بھارتی سپاہیوں کی لاشیں بھی درمیان میں اسی طرح پڑی تھیں۔ میں نے کمانڈو خالد اور قاسم کو اشارہ کیا کہ دونوں سپاہی زندہ حالت میں اندر نہ آئیں۔

دروازے کے باہر دونوں سپاہیوں نے کسی بات پر قہقہ لگایا۔ ہم ہوشیار ہو گئے۔ ان کے بھاری جوتوں کی آواز قریب آ گئی تھی۔ پھر باہر سے انہوں نے دروازہ اندر کو دھکیلا اور اندر آ گئے۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے ایک طرف سے مجاہد قاسم نے اور دوسری جانب کمانڈو خالد نے ان پر حملہ کر دیا اور دونوں کی گردنوں کو اپنے بازوؤں کے شکنجے میں لے کر تین چار اتنے شدید جھٹکے دیئے کہ ان کے جسم لٹک گئے۔ یہ جنوبی ہند کے دھان پان سپاہی تھے۔ وہ تو پہلے جھٹکوں میں ہی ختم ہو گئے تھے اور ان کی گردنوں کے منکے ٹوٹ چکے تھے۔ میں نے کمانڈو ہارون سے کہا۔

"تم دروازے کے باہر پوزیشن لے کر لیٹ جاؤ کوئی اور سنتری بھی آ سکتا ہے۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے اور خالد نے جلدی جلدی چھ سات باقی بچے ہوئے ٹائم بم ریڈار کے پینسل کے نیچے چسپاں کر دیئے۔ ہمارا کام ختم ہو چکا تھا۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

"کرم داد! ایک بار پھر چیک کر لو۔"

میں نے جھک کر تمام چپکے ہوئے بموں کا جائزہ لیا۔ اور باری باری سب کے سیفٹی پن اون کر دیئے۔ ان ٹائم بموں نے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبانے پر ایک ساتھ پھٹنا تھا۔ یہ کلاک بم نہیں تھے جو ٹائم دینے پر پھٹتے ہیں۔ اگرچہ ہم انہیں ٹائم بم ہی کہہ کر پکار رہے تھے۔ یہ بم بہت طاقت ور بم تھے اور جنگی جہازوں کی موٹی سے موٹی فولادی چادر کو پھاڑ ڈالتے تھے۔ میں نے خالد سے کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔ اب یہاں سے نکل چلو۔"

میں نے سس کی آواز سے کمانڈو ہارون کو اندر بلا لیا۔ ہمیں الگ الگ جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم گن پوسٹ کے بنکر کے شگاف میں سے ایک ساتھ نیچے پہاڑی ڈھلوان پر اتر گئے اور ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم اس سمت سے واپس جا رہے تھے جدھر دشمن کی کوئی مشین گن پوسٹ نہیں تھی۔ یہ ہمارا خیال تھا۔ ہم چاروں کمانڈو بیٹھ کر تھوڑا تھوڑا آگے کھسکتے ہوئے پہاڑی ڈھلوان سے نیچے اتر رہے تھے۔ ریموٹ کنٹرول میں نے خالد سے لے لیا تھا اور اسے اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے ایک سرخ بٹن کو دبانا تھا اور لیزر گن پوسٹ کی پہاڑی چوٹی کو دھماکے سے اڑ جانا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے ذرا ترچھے ہو کر اتر رہے تھے۔ ہمارا لباس کالا تھا۔ رات کے اندھیرے میں ہم نظر نہیں آتے تھے۔ چونکہ ہم بیٹھ کر اترائی اتر رہے تھے اس لیے اس بات کا خیال رکھ رہے تھے کہ کوئی پتھر ہمارے نیچے سے پھسل کر لڑھک نہ جائے۔ اس کی آواز سے سیکورٹی اور مشین گن مورچوں کے سنتری فائر کھول سکتے تھے۔

ہم گن پوسٹ کی پہاڑی سے اتر آئے تھے۔ اب دوسرے ٹیلے کی ڈھلوان شروع ہو گئی تھی جہاں ہمارے بائیں جانب کچھ فاصلے پر مشین گن کے دونوں مورچے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اترتے وقت مجاہد قاسم اور کمانڈو ہارون وہ احتیاط نہیں کر رہے تھے جس کی اشد ضرورت تھی مگر میں انہیں آواز دے کر خبردار نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ جب ہم پہاڑی کے دامن میں سمندری ساحل کے قریب پہنچے جہاں سے ہمیں دائیں جانب مڑنا تھا تو کمانڈو ہارون کسی پتھر سے پھسل گیا اور پتھروں کے ساتھ لڑھکنیاں کھاتا ہوا نیچے تک چلا گیا۔ رات کے سناٹے میں پتھروں کے لڑھکنے کی آواز پیدا ہوئی تو بائیں جانب ایک فائر ہوا اور ساتھ ہی سارا علاقہ دن کی طرح روشن ہو گیا۔ کسی مورچے سے روشنی راؤنڈ فائر کیا گیا تھا۔ ہم جہاں بیٹھے تھے وہیں زمین کے ساتھ لگ گئے۔ خدا جانے مشین گن پوسٹوں سے کسی نے ہمیں دیکھا تھا یا نہیں مگر روشنی راؤنڈ کے فائر ہونے کے کوئی دو سیکنڈ بعد ہم پر مشین گنوں کا فائر آنا

شروع ہو گیا۔ زبردست دھماکوں کے ساتھ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے نکل رہی تھیں۔

کمانڈو خالد نے چیخ کر کہا۔

"ڈبل اے۔ گو"

یہ اس کا اناڑی پن تھا۔ برین گنوں اور مشین گنوں کی بوچھاڑوں میں آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں تو وہیں لیٹا رہا لیکن مجاہد قاسم' اور کمانڈو ہارون اٹھ کھڑے ہوئے اور ڈھلوان پر اپنی دائیں جانب دوڑ پڑے۔ دوسرے لمحے کمانڈو خالد بھی ان کے پیچھے دوڑ پڑا۔ میں وہیں اوندھا لیٹ گیا۔ گولیاں چیختی چلاتی میرے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ کمانڈو ہارون اور مجاہد قاسم ایک ساتھ دوڑ رہے تھے۔ اچانک وہ گر پڑے۔ کمانڈو خالد ان سے دس پندرہ قدم ہٹ کر بھاگ رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کمانڈو ہارون اور مجاہد قاسم میں سے ابھی تک کوئی نہیں اٹھ سکا تھا۔ یقینی طور پر مشین گن کا برسٹ ان کے جسموں سے پار ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ اٹھ کر ضرور دوڑنے لگتے۔

گن پوسٹ کی سیکورٹی بیدار ہو گئی تھی۔

اس بات کا خطرہ تھا کہ گن پوسٹ کی عقبی بیرک میں سے گارڈ پوسٹ کے اندر آ جائے گی اور ہمارا پلان ناکام ہو جائے گا۔ میں نے جیب سے ریموٹ کنٹرول نکال لیا اندھیرے میں اس کے سرخ بٹن کو غور سے دیکھ کر اس پر اپنی انگلی رکھ کر اوپر گن پوسٹ کے شگاف کی طرف دیکھا۔ عین اس وقت سمندر کی جانب سے ایک ہیلی کاپٹر گڑگڑاتا ہوا آیا اور اپنی ہیڈ لائیٹ کی روشنی ڈالتا ہوا میرے اوپر سے گن پوسٹ کی طرف نکل گیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر سرخ بٹن دبا دیا۔

مجھے شک تھا کہ شاید دھماکہ نہ ہو۔ کیونکہ اس سے پہلے ہم کمانڈو مشقوں میں بھی ٹائم بم ہی لگایا کرتے تھے اور وہ دیئے گئے مقررہ وقت کو پورا کر کے اپنے آپ پھٹ جاتے تھے۔ ریموٹ کنٹرول کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ لیکن یہ امریکی ریموٹ کنٹرول بم تھے

اور ان کا مائیکرویوسسٹم بے حد مکمل اور اعلیٰ تھا۔ جیسے ہی میں نے سرخ بٹن کو دبایا۔ زمین اوپر نیچے کو ایک بار زور سے ہلی۔ پھر ایک ایسا خوفناک دھماکہ ہوا جیسے دس آتش فشاں پہاڑ بیک وقت پھٹ گئے ہوں۔ میں نے اوندھے ہو کر اپنا چہرہ زمین کے ساتھ لگا دیا تھا۔ میں نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ پہاڑی کی جس چوٹی پر لیزر گن کا بنکر تھا وہ پہاڑی آدھی سے زیادہ اڑ چکی تھی اور وہاں سے اس طرح آگ کے شعلے اور دھواں اٹھ رہا تھا جیسے کراکاٹوا کا آتش فشاں ایک بار پھر پھٹ گیا ہو۔

چھوٹے چھوٹے دھماکے شروع ہو گئے تھے۔ پہاڑی کے دہانے میں سے بجلی کی طرح شعلے نکل کر آسمان کی طرف اٹھتے۔ کبھی زرد شعلے' کبھی نیلے اور کبھی سرخ۔ جو ہیلی کاپٹر گن پوسٹ کی طرف گرجتا ہوا گیا تھا اس کا کہیں نام و نشان نہیں مل رہا تھا۔ آسمان شعلوں سے دن کی طرح روشن ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر اس طرف دوڑا جہاں میں نے مجاہد قاسم اور کمانڈو ہارون کو گرتے دیکھا تھا۔ شعلوں کی روشنی میں وہ دونوں مجھے صاف نظر آ گئے۔ دونوں زمین پر اوندھے پڑے تھے ان کے جسم کا نچلا دھڑ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ میں قریب جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے ہارون اور پھر قاسم کو سیدھا کیا۔ دونوں کے پیٹ پھٹ چکے تھے اور چہروں پر موت کا سکوت تھا۔ دونوں شہید ہو چکے تھے۔ سمندر میں کوئی انڈین نیوی کا جنگی جہاز ہو گا جس نے تیز تیز وسل دینے شروع کر دیے۔ یہ خطرے کے الارم تھے۔ اتنے میں سمندر ہی کی طرف سے دو ہیلی کاپٹر گرجتے ہوئے نمودار ہوئے۔ ان کی ہیڈ لائٹس بھی روشن تھیں اور روشنی گول دائروں کی شکل میں ادھر ادھر پڑ رہی تھی۔ میں وہیں اپنے شہید کمانڈوز کی لاشوں کے پاس ہی لیٹ گیا۔

ہیلی کاپٹر میرے اوپر سے نکل گئے۔ پہاڑی کی دوسری جانب سے مشین گنوں کی فائرنگ کے دھماکے سنائی دے رہے تھے۔ میں وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ میں دونوں شہیدوں کی لاشوں کو نہ ساتھ لے جا سکتا تھا' نہ وہاں زمین کھود کر دفن کر سکتا تھا۔ میں اٹھا اور بے تحاشا دوڑ پڑا۔ پہاڑی کے اوپر ابھی تک دھماکے ہو رہے تھے اور نیلے'

نارنجی اور سفید شعلے بھڑک کر اٹھتے اور رات کی تاریکی کو روشن کر رہے تھے۔ خدا جانے وہاں گن پوسٹ کے نیچے کوئی گولہ بارود کا ذخیرہ تھا جو پھٹ رہا تھا۔ میں پہاڑی کے دامن کی طرف ہو گیا۔ میں اس طرف سے نکل کر شہر کے ویران حصے کی طرف جانا چاہتا تھا۔ اچانک سامنے سے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی اور پھر کسی فوجی ٹرک کی اگلی روشنیاں اوپر نیچے ہوتی ہوئی میری طرف بڑھنے لگیں۔ جگہ کھنڈروں والی تھی جس کی وجہ سے فوجی ٹرک اوپر نیچے ہو رہا تھا مگر یہ گڑگڑاہٹ کسی ٹرک کی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں بھاگ کر ایک طرف پتھروں کی آڑ میں چھپ گیا۔

یہ ایک چھوٹا ٹینک تھا جس کی گن کی نالی پھٹتے ایمونیشن کی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے دو اور ٹینک تیز رفتاری سے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ جب یہ تینوں ٹینک گزر گئے تو میں اٹھ کر چلنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے ایک اور ٹینک کی گڑگڑاہٹ بلند ہوئی۔ میرے لیے اس طرف جانا خطرے کا باعث بن سکتا تھا۔ میں سیدھا سمندر کی طرف دوڑ پڑا۔ دوڑتے دوڑتے میں چھوٹے سے سمندری ٹاپو کے درختوں کی جھنڈ میں آ گیا۔ یہاں تین چار جھونپڑیاں تھیں جن کے باہر خستہ حال تین چار آدمی اور عورتیں کھڑی دہشت زدہ چہروں سے دور اوپر گن پوسٹ کی پہاڑی کو پھٹتے اور وہاں سے نکلتے شعلوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں ان سے ذرا پرے ہو کر آگے نکل گیا۔ اب مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ میں کس جگہ پر آ گیا ہوں اور وہاں سے شیر خان کے مکان کو کون سا راستہ جاتا تھا۔ کیونکہ مجھے ہر حالت میں شیر خان کے مکان پر پہنچنا تھا۔ میں سمندری ٹاپو کے ساتھ ساتھ شمال مشرق کی سمت کا اندازہ کر کے چلنے لگا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ یہاں انڈین نیوی کے کوسٹل گارڈز ایمرجنسی کی اس حالت میں ضرور آ چکے ہوں گے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھ گچھ کی تو میری جیب سے پستول اور کمانڈو چاقو برآمد ہو سکتا ہے۔ میں ان دونوں ہتھیاروں کو اپنے سے الگ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں ایک جگہ ناریل کے درختوں کے پاس رک گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے کس طرف جانا چاہیے۔

میں زندگی میں پہلی بار گجرات صوبے کے دوارکا شہر میں وارد ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس شہر کا سومنات کے حوالے سے نام ہی سنا ہوا تھا کہ یہاں سومنات کا ایک بت ہوا کرتا تھا جس کو مجاہد اسلام محمود غزنوی نے پاش پاش کر دیا تھا۔ دور سے ایک سٹیمر کی آواز آنے لگی۔ میں سمندری ٹاپو کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ دور سے کچھ روشنیاں آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان کی روشنیوں کا عکس ٹاپو کے پانی میں پڑ رہی تھیں۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ یہ کوئی فوجی سٹیمر یعنی گن بوٹ ہی ہو سکتی تھی کیونکہ وہ بڑی تیزی سے آگے سمندر کی جانب نکل گئی تھی۔ لیزر گن پوسٹ کی تباہی کی اطلاع اس دوران یقینی طور پر علاقے کی ساری آرمی اور نیوی کو مل چکی تھی اور ساری فوج اور فوج کی سیکورٹی الرٹ ہوچکی تھی۔ اگرچہ مجھے کمانڈو ہارون اور مجاہد قاسم کی موت کا سخت صدمہ ہوا تھا مگر مجھے اس بات کی خوشی بھی تھی کہ ہم نے اپنا ٹارگٹ مار لیا تھا اور ہمارا مشن کامیاب ہوگیا تھا۔ ہارون اور قاسم نے شہادت پائی تھی اور شہید کی موت پر افسوس نہیں کیا کرتے۔ جنگی گن بوٹ کے گزر جانے کے بعد میں اٹھ کر شمال مشرق کی طرف ہی چل پڑا۔

پہاڑی میرے پیچھے درختوں کے جھنڈوں کی اوٹ میں چھپ چکی تھی اور جہاں سے میں گزر رہا تھا وہاں رات کا اندھیرا تھا۔ دور کہیں کہیں کوئی روشنی ٹمٹماتی نظر آ جاتی تھی۔ میں اب سمندر سے ہٹ کر شہر کی سمت چلنے لگا تھا۔ میں ایک سڑک پر نکل آیا۔ چھوٹی سڑک تھی اور رات کے سناٹے میں ویران پڑی تھی۔ سڑک پر آتے ہی کسی طرف سے ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ میں نے کوئی پروا نہ کی اور سڑک پر چلتا رہا۔ میرے پاس پستول بھی تھا اور چاقو بھی تھا۔ اگر کسی کتے نے مجھ پر حملہ کیا تو میں اسے آسانی سے ہلاک کر سکتا تھا۔ سڑک ختم ہوگئی۔ سامنے ایک میدان سا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا یہ میدان دلدلی تھا یہاں سمندر کا پانی چاندنی راتوں میں بھر جاتا ہوگا۔ میں نے پاؤں کو دبایا۔ میرا پاؤں دلدل میں دھنسنے لگا میں نے پاؤں جلدی سے باہر نکالا اور دوسری طرف چلنے لگا۔

تباہ شدہ گن پوسٹ کی جانب سے دھماکوں کی آوازیں اب دھیمی پڑ گئی تھیں مگر اس طرف کا آسمان اب شعلوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ شیر خان کے مکان کے پاس جس طرف سمندر تھا' اس طرف رات کے وقت ایک مینارے پر روشنی ہوا کرتی تھی۔ شاید یہ کسی ایڈورٹائزنگ کی روشنی یعنی نیون سائنز کی روشنی تھی۔ یہ روشنی جلتی بجھتی رہتی تھی۔ میری نگاہیں دور شہر کی اکا دکا روشینوں میں سے اسی روشنی کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں دوارکا کے ساحلی کوہستانی علاقے سے نکل کر اب دوارکا شہر کے مضافات میں داخل ہوچکا تھا۔ اونچی نیچی جگہوں پر مکانوں میں کہیں کہیں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ آخر مجھے ایک جگہ وہ نیون سائنز کی جلتی بجھتی روشنی نظر آ گئی جو میرے انداز کے مطابق شیر خان کے مکان کے پاس والی روشنی ہی تھی۔ میں نے اسی طرف چلنا شروع کر دیا۔ کئی چھوٹی چھوٹی پتھریلی اور کچی سڑکوں پر سے گزرتا ہوا میں رات کی خاموشی اور اندھیرے میں ایک مندر کے قریب سے گزرا تو میں نے اس کو پہچان لیا۔ ہم شیر خان کے مکان سے نکل کر اس مندر سے ہٹ کر اپنے ٹارگٹ کی ریکی کرنے گئے تھے۔

جب ایک تلاب کا چبوترا دکھائی دیا تو میری جان میں جان آ گئی۔ میں شیر خان کے مکان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ یہاں سے شیر خان کا مکان قریب ہی تھا۔ ناریل کے درختوں میں سے ہو کر گزرا تو سامنے شیر خان کے مکان کا دروازہ تھا جو بند تھا۔ اندر کوئی روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ کمانڈو خالد کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ ہم سے بہت پہلے اور دوسری طرف نکلا تھا وہ ضرور بچ گیا ہوگا۔ میں نے خاص انداز میں دروازے پر تین بار دستک دی تو تھوڑی دیر بعد شیر خان نے دروازہ کھول دیا اور میرے کندھے کے اوپر سے پیچھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہارون اور قاسم بھائی کہاں ہیں؟"

میں بیٹھک میں داخل ہوگیا اور اس سے سوال کیا۔

"کمانڈو خالد پہنچ گیا ہے؟"

"ہاں وہ دوسرے کمرے میں ہے۔"

اتنے میں کمانڈو خالد بھی دوسرے کمرے کے دروازے میں سے اندر آ گیا۔

"خدا کا شکر ہے تم آ گئے۔ گن پوسٹ کے دھماکوں نے سارے شہر کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ قاسم اور ہارون کہاں ہیں؟"

میں نے کہا۔

"کیا وہ ابھی تک نہیں پہنچے؟ وہ تو میرے آگے نکل گئے تھے۔"

یہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ اس لیے کہ میں ابھی انہیں ان دونوں کی شہادت کی خبر نہیں سنانا چاہتا تھا۔ کمانڈو خالد نے شیر خان سے کہا۔

"شیر خان جلدی سے چائے لے آؤ۔"

پھر وہ میرے پاس ہی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اور بڑے پر جوش لہجے میں بولا۔

"یہ ہماری ہی نہیں بھارت کے اور پاکستان کے سارے مسلمانوں کی' بلکہ سارے عالم اسلام کی کامیابی ہے۔ پاکستان ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ سارے عالم اسلام کے لیے اسلام کا قلعہ ہے اور بھارت کی برہمنی حکومت نے یہ لیزر گن پاکستان کو تباہ کرنے کے ناپاک ارادے سے نصب کی ہوئی تھی جس کے ہم نے پرخچے اڑا دیے ہیں۔ تم نے ضرور دیکھا ہوگا کہ پہاڑی ساری کی ساری اڑ گئی تھی اور دھماکے تو تھوڑی دیر پہلے تک سنائی دے رہے تھے۔ میں جب تم سے الگ ہو کر دوڑا تو مجھے بار بار خیال آیا کہ کہیں تم ریموٹ کنٹرول دبانے میں دیر نہ کر دو۔ کیونکہ اس وقت گن پوسٹ کی ساری سیکورٹی بیدار ہو چکی تھی اور اس بات کا امکان تھا کہ سیکورٹی والے ہمارے لگائے ہوئے بموں کو ناکارہ نہ کر دیں۔ لیکن جب خوفناک دھماکوں کے ساتھ زمین میں بھونچال آ گیا تو میں وہیں بیٹھ گیا اور پہاڑی کے اوپر سے جوالا مکھی ایسے شعلے نکلتے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔ یہ بتاؤ ہارون اور قاسم تم سے کہاں جدا ہوئے تھے؟"

میں نے کہا۔

"جس وقت قاسم کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا اور اس کے ساتھ ہی کسی

پوسٹ پر سے روشنی راؤنڈ فائر ہوااور ساتھ ہی مشین گن کی بوچھاڑیں پڑنے لگیں تو قاسم اور ہارون کو میں نے پہاڑی کی ڈھلان پر سمندر کی طرف دوڑتے دیکھا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

پھر جو کچھ ہوا تھا وہ میں نے غم زدہ آواز کے ساتھ کمانڈو خالد کو بیان کر دیا۔ کمانڈو خالد کا سر جھک گیا۔ وہ کچھ دیر بالکل ساکت ہو کر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"شہیدوں کے درجات کی بلندی کے لیے فاتحہ شریف پڑھو۔"

ہم نے دعائے فاتحہ پڑھ کر چہروں پر ہاتھ پھیرے۔ شیر خان عین اس وقت چائے کی پیالیاں لیے اندر داخل ہوا۔ ہمیں اس نے چہروں پر ہاتھ پھیرتے دیکھا تو پوچھا۔

"خیر تو ہے۔ کیا ہوا ہے؟"

ہم نے اسے بھی بتا دیا کہ ہارون اور قاسم اس معرکے میں شہید ہوگئے ہیں۔ اس نے چائے کی پیالیاں وہیں چٹائی پر رکھ دیں اور ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"وہ خوش قسمت تھے۔ شہادت کا رتبہ کسی خوش نصیب کو ہی ملتا ہے۔ میری طرف سے بھی دعائے فاتحہ پڑھی جائے۔"

ہم نے ایک بار پھر کمانڈو ہارون اور مجاہد قاسم کی ارواح کو ثواب پہنچایا اور خاموشی سے چائے پینے لگے۔ رات باتیں کرنے اور کچھ دیر سونے میں گزر گئی۔ شیر خان صبح ہمیں ناشتہ کرا کے اپنی دکان پر چلا گیا۔ میں اور کمانڈو خالد بیٹھک میں چٹائی پر بیٹھ گئے اور واپسی کا پروگرام بنانے لگے۔ اب ہمارا دوارکا میں کوئی کام نہیں تھا۔ ہم نے اپنا مشن مکمل کر لیا تھا۔ اب ہمیں بھوپال واپس جانا تھا۔ شیر خان کو دکان پر گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ واپس آگیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ آتے ہی بولا۔

"فوج نے سارے شہر کا محاصرہ کر لیا ہے۔ جگہ جگہ فوجی ٹرک آ کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ گھر گھر تلاشیاں شروع ہوگئی ہیں۔ کسی کو شہر سے باہر نکلنے اور شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔"

یہ خبر ہمارے لیے بڑی تشویش ناک تھی۔ کیونکہ ہم دوارکا کے رہنے والے نہیں تھے۔ کمانڈو خالد بھوپال کا تھا اور بڑی عمدہ اردو بولتا تھا میں پنجابی تھا اور میرا اردو بولنے کا لہجہ پنجابی تھا۔ ہم سے پوچھ گچھ ہو سکتی تھی۔ کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"یہ تو قدرتی بات تھی۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔ بھارتی آرمی کے بہت بڑے دفاعی پوسٹ کو تباہ کیا گیا ہے۔"

شیر خان بولا۔

"شہر میں جگہ جگہ بھارتی فوج پر تنقید ہو رہی ہے کہ وہ دوارکا کا دفاع کرنے کے قابل نہیں ہے۔ کشمیری کمانڈو کھلے بندوں آ کر ان کی ڈیفنس کے پرخچے اڑا رہے ہیں۔ لوگوں میں گھبراہٹ بھی ہے۔ رات کو جب دھماکہ ہوا تو لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ ہر کوئی یہی سمجھ رہا تھا کہ پاکستان نے حملہ کر دیا ہے۔"

میں نے شیر خان سے کہا۔

"بھائی تم ہمیں یہ بتاؤ کہ کوئی ایسا خفیہ رستہ ہے جہاں سے ہم شہر سے نکل سکیں۔"

شیر خان کہنے لگا۔

"سارے راستے تمہارے سامنے ہیں۔ کوئی ایسا خفیہ رستہ نہیں ہے۔"

کمانڈو خالد نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ اسی جگہ چھپے رہنا چاہیے۔ جب ذرا حالات نارمل ہو جائیں تو ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

شیر خان کہنے لگا۔

"خالد بھائی! میں شہر کی سڑکوں پر جس طرح فوج کو گشت کرتے دیکھ کر آیا ہوں مجھے نہیں امید کہ حالات اتنی جلدی نارمل ہوں گے۔ شہر میں تو ایسا لگتا ہے جیسے مارشل لاء لگ گیا ہے اور فوج کا پورا ڈویژن داخل ہو گیا ہے۔ ہر چوک میں فوج نے مورچے بنا کر پوزیشنیں سنبھال لی ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شیر خان! تم نہیں جانتے جب اس قسم کی کوئی واردات ہوتی ہے تو فوج ایسا ہی کرتی ہے۔ یہ ان کی سیکورٹی کا تقاضہ ہے۔"

پھر میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ ہمیں آج ہی رات کے اندھیرے میں یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم کاٹھیاواڑ کی بجائے خلیج رن کچھ کی طرف جائیں گے۔"

وہ بولا۔

"رن کچھ میں تو فوجی نقل و حرکت زیادہ ہوگی۔ وہ تو سارا فوجی علاقہ ہے۔ سن ۶۵ء کی جنگ میں پاکستان سے شکست کھانے کے بعد انڈین آرمی نے اسے چھاؤنی بنا لیا ہوا ہے۔"

شیر خان نے کہا۔

"میرا مشورہ ہے کہ آپ لوگ جس طرح اور جتنی جلدی ہو سکے جل گام والی کھاڑی کی کمین گاہ میں جا کر چھپ جائیں۔ یہاں مجھے زیادہ خطرہ لگتا ہے۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"تمہارا مشورہ بھی درست ہے۔ لیکن اس پر عمل کرنے کے لیے بھی ہمیں رات کا اندھیرا ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ جیسے ہی رات کا اندھیرا ہو ہم شیر خان کے مکان سے نکل کر جل گام کی کھاڑی والی پہاڑی کمین گاہ میں چلے جائیں گے۔ خالد نے اس خفیہ جگہ کے بارے میں بتایا کہ وہ ہمارے مجاہدوں نے ہنگامی صورت حال کے لیے بنائی ہوئی ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ خفیہ جگہ بہت محفوظ ہے۔ چاروں طرف ویران ٹیلے ہیں اور ادھر کوئی آبادی بھی نہیں میں نے کہا۔

"لیکن ہم وہاں کب تک چھپے رہیں گے۔ یہ بتاؤ کہ وہاں سے بھوپال جانے کا کیا سلسلہ ہو سکے گا؟"

کمانڈو خالد بولا۔

"جس قسم کے شہر کے حالات شیر خان نے بتائے ہیں ان کو دیکھا جائے تو ہم ایک ہفتے سے پہلے تو وہاں سے نہیں نکل سکتے۔ کیونکہ ان ٹیلوں سے ایک میل آگے ناریلوں کا ایک ذخیرہ ہے جہاں سے ایک راستہ کاٹھیاواڑ جانے والی بڑی سڑک کو جا نکلتا ہے۔ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم مناسب موقع دیکھ کر وہاں سے بڑی سڑک پر پہنچیں اور وہاں سے الگ الگ ہو کر کسی لاری یا بس میں بیٹھ کر کاٹھیاواڑ پہنچ جائیں۔ وہاں سے ہمیں بھوپال جانے والی گاڑی مل سکتی ہے۔"

شیر خان چلا گیا۔ اس نے احتیاط کے طور پر جاتے ہوئے مکان کو باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ ہمیں بھی ہدایت کی تھی کہ ہم کھڑکیوں کو نہ کھولیں اور اندر ہی بیٹھے رہیں۔ ہمارے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا۔ صرف دو آٹومیٹک پستول اور دو فالتو میگزین تھے۔ دو کمانڈو چاقو تھے۔ ان کو ہم نے مکان کے ایک کونے میں محفوظ جگہ پر چھپا دیا تھا۔

دوپہر کے وقت شیر خان آیا تو اس کے ہاتھ میں تھیلا تھا۔ کہنے لگا۔

میں کھانا ہوٹل سے ہی لے آیا ہوں۔"

کمانڈو خالد نے باہر کے حالات کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔

"فوج کی نفری زیادہ ہو گئی ہے۔ ہر چوک میں چیک پوسٹ ہے جہاں فوجی جس پر ذرا شک پڑے اس کو چیک کرتے ہیں۔ سڑکوں پر لوگوں کی آمد و رفت بھی کم ہے۔ یہ افواہ بھی ہے کہ پاکستان ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے اور پاکستان نیوی کے جنگی جہاز دوارکا سے کچھ دور گشت کر رہے ہیں۔"

کمانڈو خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس قسم کی افواہیں ان حالات میں پھیلا ہی کرتی ہیں۔ پاکستان کو حملہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سن ۶۵ء میں بھی بھارت نے ہی پاکستان پر حملہ کیا تھا' اب بھی بھارت ہی کراچی کی طرف سے پاکستان پر حملہ کرنے کا پلان بنا چکا تھا۔ اگر ہم لیزر گن پوسٹ کو جان کی قربانیاں دے کر تباہ نہ کرتے تو انڈین فوجی ہائی کمان نے پاکستان پر حملہ کر دینا

تھا۔"

شیر خان بولا۔

"اب تو ہندو سرکار کا پاکستان اور اسلام کے خلاف سارا ناپاک منصوبہ برباد ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے شہید ساتھیوں کے جنت الفردوس میں درجات بلند فرمائے۔

میں نے اور خالد نے بیک وقت کہا۔

"آمین !"

میں نے کہا۔

"شہادت کا رتبہ بڑا بلند رتبہ ہے۔ کمانڈو ہارون اور مجاہد قاسم نے شہادت کا مرتبہ پایا ہے اور شہید سیدھا جنت میں جاتا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔"

ہم نے کھانا کھایا اور دوسرے کمرے میں جا کر آرام کرنے لگے۔ دن گزرتا جا رہا تھا۔ پھر سورج غروب ہو گیا۔ شیر خان دوپہر کے بعد دکان پر نہیں گیا تھا۔ وہ ہمارے پاس ہی رہا۔ جب رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تو شیر خان نے کھانا گرم کیا۔ ہم تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ چائے پی اور جل گام کی خفیہ کمین گاہ کی طرف جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ شیر خان کہنے لگا۔

"میں رات کو روزانہ تمہارے لیے کھانا وغیرہ لے کر آ جایا کروں گا۔ پانی کی بڑی تھرمس تم اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔"

وہ کمانڈو خالد سے مخاطب تھا۔ بولا۔

"کمانڈر! تم تو اس جگہ سے اچھی طرح واقف ہو۔ کوشش یہی کرنا کہ دن کے وقت تم زیادہ تر کمین گاہ کے اندر ہی رہو۔ جیسے ہی فوج شہر سے نکل گئی اور حالات نارمل ہوئے میں تمہیں خبردار کر دوں گا۔ اس کے بعد تم جس طرف بھی جانا چاہو جا سکو گے۔"

ہم نے اپنا لباس وہی جیکٹ اور پتلون ہی رکھا۔ احتیاطاً" ہم نے اپنے پستول اور

کمانڈو چاقو ساتھ لے لیے۔ جب رات ذرا گہری ہوگئی اور باہر خاموشی چھا گئی تو ہم مکان سے نکل کر خفیہ کمین گاہ کی طرف چل پڑے۔ شیر خان کے ہاتھ میں تھیلا تھا جس میں کھچڑی کی ایک پتیلی تھی۔ یہ ہمیں صبح کے وقت اور دوپہر کے وقت کام آ سکتی تھی۔ میں نے پانی سے بھری ہوئی تھرمس اٹھا رکھی تھی۔

شیر خان کے مکان سے کچھ دور نکل آنے کے بعد ہم محتاط ہو کر چلنے لگے تھے۔ کیونکہ دور بڑی سڑک پر سے ہمیں فوجی ٹرکوں کے گزرنے کی آوازیں اور ان کی ہیڈ لائٹس کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ شیر خان بولا۔

"میرا خیال ہے شہر میں اور ملٹری آ گئی ہے۔"

خالد نے کہا۔

"ہم بڑی سڑک سے دور رہ کر جائیں گے۔"

شیر خان اور کمانڈو خالد نے وہیں سے راستہ تبدیل کر لیا اور ہم بڑی سڑک سے ہٹ کر اس کی مخالف سمت کو چل پڑے۔ اس علاقے کی طرف میں پہلے نہیں آیا تھا۔ زمین ناہموار تھی۔ کہیں کہیں راستے میں ناریل کا یا کوئی دوسرا درخت آ جاتا تھا۔ ہم ایک جوہڑ کے قریب سے بھی گزرے۔ اس کے بعد بالکل ہی ویران اور غیر آباد علاقہ شروع ہوگیا۔ شیر خان اور خالد کو چونکہ راستے کی شناخت تھی اس لیے انہیں راستہ تلاش کرنے اور سمت برقرار رکھنے میں وقت پیش نہیں آ رہی تھی۔ راستہ تبدیل کرنے کی وجہ سے زیادہ دیر لگ گئی۔ اندھیرے میں کچھ فاصلے پر جنوب کی جانب اونچے نیچے ٹیلوں کے خاکے ابھرنے لگے۔ خالد نے مجھے بتایا۔

"ہمیں ان پہاڑیوں میں جانا ہے۔"

یہ پہاڑیاں نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے جہاں کسی طرف بھی آبادی کی کوئی روشنی ٹمٹماتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم ان ٹیلوں میں داخل ہوگئے۔ شیر خان نے ایک جانب اشارہ کیا اور مجھے کہنے لگا۔

"صرف اس طرف تاڑ کے درختوں کے درمیان ایک کچا راستہ شہر کو جاتا ہے۔ مگر

یہ رات کے وقت ویران ہوتا ہے۔ دن کے وقت بھی کبھی کبھی کوئی دیہاتی ادھر سے گزرتا ہے۔"

پھر اس نے خالد سے کہا۔

"کمانڈر! تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ لوگوں کو اس طرف سے ہوشیار ہو کر رہنا ہوگا۔"

خالد نے کہا۔

"تم بالکل فکر نہ کرو شیر خان۔ میں ان ساری باتوں کو اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔"

یہاں ٹیلوں کے درمیان ایک قدرتی غار بنا ہوا تھا۔ غار کا دہانہ دو ساتھ ساتھ کھڑی سیاہ چٹانوں کے درمیان تھا جو سمندری سرکنڈوں میں چھپا ہوا تھا۔ ہم غار میں داخل ہوگئے۔ غار میں جاتے ہی شیر خان نے موم بتی جلا کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ موم بتی کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ان ٹیلوں کے نیچے قدرت نے عجیب قسم کا عجائب خانہ بنایا ہوا تھا۔ کہیں چھوٹے دالان تھے، کہیں قدرتی چٹانوں کے ستون چھت سے فرش تک آئے ہوئے تھے۔ ایک جگہ پتھریلی دیوار کے آگے چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ خالد نے کہا۔

"کرم داد! یہ ہماری دوارکا کی پہاڑی خفیہ کمین گاہ ہے۔ یہاں ہم کبھی کبھی آ کر چھپ جاتے ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب گجرات میں ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے اور جن سنگھی اور راشٹریہ سیوک سنگ کے انتہا پسند ہندو یہاں کے مسلمانوں پر وحشیانہ ظلم و ستم کر رہے تھے۔ یہاں ہم نے کچھ اسلحہ چھپایا ہوا تھا جو ہم دوارکا کے گنتی کے مسلمانوں میں خفیہ طور پر تقسیم کر دیا کرتے تھے تاکہ وہ اپنی جان اور اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کر سکیں۔ کیونکہ یہاں کے ہندو غنڈہ عناصر کو گجرات پرانت کی حکومت باقاعدہ اسلحہ سپلائی کرتی تھی۔"

شیر خان نے موم بتی پتھر کے ایک طاق میں رکھ دی۔ وہ موم بتیوں کا ایک فالتو

پیکٹ اور ماچس کی ڈبی بھی لایا تھا۔ تھیلے میں سے کھچڑی کی پتیلی اور دو تھالیاں دو چمچ اور گلاس نکال کر چٹائی کی ایک طرف رکھ دیے اور بولا۔

"یہ کھانا کل شام تک تمہارے لیے کافی ہوگا۔ میں رات ہوتے ہی مزید کھانا لے کر آ جاؤں گا۔"

ہم چٹائی پر بیٹھ گئے۔ خالد ہنس کر کہنے لگا۔

"یہاں شیر خان کے گھر والا آرام تو نہیں ہے مگر تم یہی سمجھنا کہ ہم اپنے کسی کمانڈو مشن پر آئے ہوئے ہیں۔"

شیر خان بولا۔

"یہ کمانڈو مشن ہی ہے۔ شہر میں ملٹری آپ لوگوں کی تلاش میں چھاپے مار رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کل تک میرے گھر کی تلاشی کی باری بھی آ جائے گی۔ دوارکا کی آبادی ہی کتنی ہے۔ فوج تو ایک ایک گھر کی تلاشی لے سکتی ہے۔"

شیر خان کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اگلے دن رات کو آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ کمانڈو خالد نے تھرمس میں سے پانی نکال کر پیا اور پھر ہم اپنے اپنے آٹومیٹک پستول نکال کر انہیں چیک کرنے اور باتیں کرنے لگے۔ یہ ہتھیار ہم اپنے ساتھ ہی لائے تھے۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

"یہاں کسی فوجی کے آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ گمنام جگہ ہے اور اس قسم کے غار یہاں کے ٹیلوں کے نیچے عام پائے جاتے ہیں۔"

غار کی فضا میں عجیب سی نمدار بو تھی۔ کسی جانب سے تازہ ہوا اندر ضرور آ رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ غار کافی کشادہ تھا اور اس کی چھت بھی بہت اونچی تھی۔ یہ غار نہیں تھا بلکہ ٹیلے کے اندر قدرتی طور پر بنے ہوئے اور ساتھ ساتھ جڑے ہوئے دو دالان تھے جن کو چٹانی ستونوں نے الگ کیا ہوا تھا۔ ہم نے اپنی اپنی گھڑیوں پر وقت دیکھا۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ کھانا اور چائے ہم شیر خان کے مکان پر ہی کھا پی کر آئے تھے۔ طاق میں موم بتی جل رہی تھی۔

ہم بھوپال کی باتیں کرنے لگے۔ اس نے جمیلہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ کہنے لگا۔

"کرم داد بھائی! کسی کسی وقت مجھے خیال آتا ہے کہ ہماری بھابھی جمیلہ بھی دلیری اور بہادری میں تم سے کم نہیں ہے۔ یہ جواں ہمت خاتون کس بہادری اور صبر و استقامت سے نہ صرف اپنے خاوند کی جدائی بلکہ دشمن ملک میں طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہی ہے اور کمال کی بات یہ ہے کہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی۔"

میں نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"یہ صرف اس لیے ہے کہ جمیلہ کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بڑا بھروسہ ہے۔ اس کا ایمان بے حد پختہ ہے۔ وہ اللہ کی رضا میں راضی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی ہے۔ میاں بیوی اگر ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے ہوں تو پھر پیش آنے والی کوئی مصیبت مصیبت نہیں لگتی' ایک آزمائش لگتی ہے۔ اور محبت تو آزمائشوں کی بھٹی میں تپ کر ہی کندن بنتی ہے۔"

کمانڈو خالد ہنسنے لگا۔

"کرم داد! تم واقعی خوش نصیب ہو کہ تمہیں بھابھی جمیلہ ایسی بیوی مل گئی۔"

کچھ دیر تک ہم یہی باتیں کرتے رہے۔ پھر خالد نے درگا ناگن کا ذکر چھیڑ دیا اور کہنے لگا۔

"مجھے اس ہندو عورت ناگن درگا پر بھی ترس آتا ہے۔ وہ بے چاری بھی کس مشکل میں پھنس گئی ہے۔ اب جبکہ تم اسے سانپ سے انسانی روپ میں واپس لا سکتے تھے مگر وہ تمہارے پاس نہیں ہے۔ حالات نے اسے تم سے سینکڑوں میل دور کر دیا ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ بھوپال میں ہی ہے یا وہاں سے کسی اور طرف نکل گئی ہے۔"

مجھے بلی ناگن درگا یاد آنے لگی۔ میں نے کہا۔

"بھوپال جا کر میں جمیلہ سے ملنے کے فوراً بعد ناگن درگا کی تلاش میں بھروں جی کے مندر جاؤں گا۔ خدا کرے کہ وہ مجھے وہاں مل جائے۔"

کمانڈو خالد نے ایک دم گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"کرم داد! تم جو یہ سانپ سے انسان اور انسان سے سانپ بننے کی مشکل میں پھنس گئے ہو تو اللہ نے چاہا کہ بہت جلد تمہیں اس سے نجات مل جائے گی۔ لیکن میرے دوست تمہیں اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ تم پر سانپ کے ڈسنے کا بالکل اثر نہیں ہوتا یہ بہت بڑی بات ہے۔"

میں نے کہا۔

"ہاں خالد بھائی مجھے خود یقین نہیں آ رہا۔ جب پہلی بار مجھے شیر خان کے مکان کے باہر چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ایک مادہ سانپ نے ڈسا تھا تو میں واقعی گھبرا گیا تھا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ سانپ کا زہر بے اثر ہو گیا ہے تو پھر اچانک میرے ذہن میں یہ پلان آیا کہ اگر میں اس مادہ سانپ کے نر کو بھی کسی طرح پکڑ لوں تو یہ ہمارے کمانڈو مشن میں بڑا اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"اور ان سانپوں نے ہمارے کمانڈو ایکشن کو ہمارے لیے واقعی آسان بنا دیا تھا ورنہ بڑی لیزر گن کے اندر جو گارڈ موجود تھی وہ مسلح تھی اور پوری طرح ہوشیار تھی۔ ہم اگر اپنے پستولوں سے ایک ایک کو الگ الگ نشانہ بناتے اور ہمارا نشانہ بھی ٹھیک ٹارگٹ پر بیٹھتا پھر بھی اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ تیسرا سپاہی فائر کر کے دوسرے فوجیوں کو خبردار کر دے اور کچھ نہیں تو اندھا دھند فائرنگ ہی شروع کر سکتا تھا جس سے ہمارے مشن کی کامیابی ناممکن ہو جاتی۔"

میں نے چٹائی پر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ابھی تک تو مجھ پر سانپ کا دورہ پڑنے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

کمانڈو خالد بھی ایک طرف ہو کر لیٹ گیا اور بولا۔

"انشاء اللہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اللہ نے تمہیں اس بیماری سے شفا عطا کر دی

ہے۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔"

اس کے بعد ہم ایک آدھ منٹ تک باتیں کرتے رہے۔ پھر ہمیں نیند آ گئی۔ جس وقت میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ غار میں گھپ اندھیرا تھا۔ موم بتی جل جل کر موم بن چکی تھی۔ میں نے اٹھ کر نئی موم بتی روشن کی۔ کمانڈو خالد گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے وقت دیکھا۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہم کافی دیر تک سوئے تھے۔ میں نے کمانڈو خالد کو جگانا چاہا۔ پھر میں نے اسے نہ جگایا اور غار سے باہر نکل آیا۔ باہر دن کی روشنی تھی مگر دھوپ نہیں تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ کمانڈو خالد نے مجھے بتا دیا تھا کہ ٹیلے کے پیچھے ایک جگہ ندی بہتی ہے۔ میں ٹیلے کے پیچھے آ گیا۔ یہاں نشیب میں ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی جس کا پانی گدلا گدلا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ پانی کو چکھا تو وہ کڑوا تھا۔ یہ سمندر کا پانی تھا اور کسی کھاڑی سے ندی کی شکل میں نکل کر ان ٹیلوں میں بہہ رہا تھا۔

میں واپس غار میں آ گیا۔ خالد جاگ چکا تھا۔ اس نے بھی ندی پر جا کر منہ ہاتھ دھویا اور واپس آ گیا۔ ہم نے رات کی کھچڑی تھوڑی سی کھائی۔ چائے کی بڑی طلب ہو رہی تھی مگر چائے کا تھرمس ہم جلدی میں ساتھ لانا بھول گئے تھے۔ شام تک ہم غار کے اندر ہی کبھی سو کر اور کبھی باتیں کر کے وقت گزار دیا۔ اندھیرا ہوتے ہی شیر خان ہمارے لیے کھانا لے کر آ گیا۔ اس کے تھیلے میں ایک اور تھرمس تھی۔ کہنے لگا۔

"میں تمہارے لیے چائے بھی لایا ہوں۔"

ہم بڑے خوش ہوئے۔ کھانا کھاتے ہوئے خالد نے شہر کے حالات پوچھے۔ شیر خان بولا۔

"دوارکا کا شہر فوجی چھاؤنی بن گیا ہے۔ ہر طرف فوج کے سپاہی اور گاڑیاں پھر رہی ہیں۔ کئی لوگوں کو فوج شک کی بنا پر پکڑ کر لے گئی ہے۔ شہر کے تین حصوں کی تلاشی لی جا چکی ہے۔ میرا خیال ہے کل ہمارے علاقے کے مکانوں کی فوج تلاشی لے گی۔

میری دکان پر تو گورکھا فوجی آ گئے تھے۔ چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے پھر دکان کی پوری تلاشی لی۔ مجھ سے پوچھ گچھ بھی کی۔ میں گجراتی ہی بولتا رہا۔ میں نے اپنے آپ کو ہندو ہی ظاہر کیا۔ تم لوگ بتاؤ۔ ادھر تو کوئی نہیں آیا؟"

"نہیں ابھی تک تو یہاں خیریت ہے۔"

شیر خان بولا۔

"میں آتی دفعہ اس سڑک پر سے ہوتا ہوا آیا ہوں جو دوارکا سے آگے کاٹھیاواڑ کو جاتی ہے۔ ادھر بھی فوج گشت کر رہی تھی۔ تم لوگ ابھی یہاں سے فرار نہیں ہو سکو گے۔ لیکن یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔"

جب شیر خان چلا گیا تو کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"اس کا مطلب ہے کہ فوج نے سارے شہر کو اپنے محاصرے میں لے رکھا ہے اور ہم بڑی سڑک کی جانب سے بھی کاٹھیاواڑ کی طرف فرار نہیں ہو سکیں گے۔"

میں غار میں بیٹھے بیٹھے ایک ہی دن میں تنگ آ گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"خالد بھائی۔ شیر خان ہمیں کچھ زیادہ ہی ڈرا رہا ہے۔ وہ بہت زیادہ مبالغے سے کام لے رہا ہے۔ انڈین آرمی کی رجمنٹیں شہر میں ضرور آ گئی ہیں اور انہیں آنا بھی چاہیے تھا۔ دوارکا میں بھارتی حکومت کو جو شدید نقصان پہنچا ہے اس کا تقاضا بھی یہی تھا لیکن اس کے باوجود ہم تربیت یافتہ کمانڈو ہیں۔ ہمیں فرار کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔"

کمانڈو خالد پہلے تو خاموش رہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

"شیر خان نے جو کچھ بتایا ہے وہ سو فیصد درست ہو گا۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا ہو گا۔"

طاق میں موم بتی روشن تھی۔ غار کے اندر بھی خاموشی تھی اور باہر سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ہم تھرمس میں سے تھوڑی تھوڑی چائے پیالیوں میں ڈال کر پی رہے تھے۔ کل سارا دن بھی ہمیں یہی چائے پینی تھی۔ میں کوئی بات کرنے لگا تھا کہ

اچانک ہمیں گھرر گھرر کی آواز سنائی دی۔ میں بولتے بولتے رک گیا۔ میں نے کمانڈو خالد کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔

"یہ کیسی آواز ہے؟"

آواز غار کے باہر سے آ رہی تھی۔ آواز رک گئی۔ میں نے کہا۔

"یہ فوجی ٹرک کی آواز تھی۔"

کمانڈو خالد جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"جلدی سے یہ ساری چیزیں سمیٹ کر کسی دوسری جگہ چھپا دو۔"

ہم نے جلدی جلدی برتن تھرمس اور چٹائی، موم بتیوں کا پیکٹ وہاں سے اٹھایا اور غار کے دوسرے دالان میں لے جا کر ایک ستون کے پیچھے چھپا دیا۔ اس کے بعد اپنے اپنے پستول نکال لیے۔ موم بتی بجھا دی اور غار کی دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر اس مقام پر آ گئے جہاں غار کا دہانہ تھا اور جس کے آگے سمندری سرکنڈوں کی جھاڑیاں تھیں۔ ہم نے بڑی احتیاط کے ساتھ جھاڑیوں کو ایک طرف ہٹایا اور سامنے کی جانب نگاہ ڈالی۔ وہاں ہمیں کچھ نظر نہ آیا۔ اچانک گھرر گھرر کی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔

میں آرمی کا کمانڈو تھا فوراً پہچان گیا کہ یہ بڑے فوجی ٹرک کے انجن کی آواز ہے جسے سٹارٹ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں نے خالد کو اشارہ کیا اور ہم غار کے منہ سے نکل کر دائیں جانب ٹیلے کی تھوڑی سی چڑھائی کے اوپر آ کر اندھیرے میں بیٹھ گئے اور دیکھا کہ ٹیلے سے کچھ فاصلے پر جہاں کچی سڑک تھی اور ٹیلے کے دائیں بائیں اور عقب میں بھی فوجی گاڑیوں کی نقل و حرکت ہو رہی تھی۔ گاڑیوں کی لائٹیں روشن تھیں اور فوجیوں کے اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

"فوج ان ٹیلوں کی تلاشی لینے آئی ہے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ندی کی طرف سے ایک فوجی ٹرک پتھروں پر اچھلتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ ہم نے نیچے چھلانگیں لگا

دیں اور غار کے آگے سرکنڈوں میں چھپ کر ٹرک کی روشنیوں کو دیکھنے لگے۔ اتنے میں ایک کے بعد ایک دو روشنی کے راؤنڈ فائر ہوئے۔ روشنی کے یہ گولے پیراشوٹوں والے تھے جو اوپر جا کر روشن ہو جاتے تھے اور پھر آہستہ آہستہ نیچے آتے ہیں۔ سارے علاقے میں جیسے دن چڑھ گیا۔ ہر طرف ٹیلوں میں روشنی ہو گئی۔ اس روشنی میں ہمیں غار والے ٹیلوں کے سامنے کتنی ہی فوجی گاڑیاں نظر آئیں جن میں سے آرمی کے جوان کود رہے تھے۔ جو ٹرک ہماری طرف آ رہا تھا وہ ہمارے ٹیلے کے قریب آ کر رک گیا۔

میں نے خالد کا بازو کھینچ کر کہا۔

"اندر آ جاؤ۔"

اور ہم دوڑ کر غار میں واپس آ گئے اور اندھیرے میں ہی جلدی جلدی دیواروں اور ستونوں کو ٹٹول ٹٹول کر غار کے آخری سرے پر جو پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے ان کے پیچھے چھپ گئے۔ خالد نے کہا۔

"اگر فوجی اندر آ گئے تو ان کے پاس ٹارچیں ہوں گی وہ ہمیں تلاش کر لیں گے۔"

میں نے کہا۔

"ہم باہر بھی نہیں جا سکتے کمانڈر۔ اس غار میں چھپنے کی یہی ایک جگہ ہے۔ اب سب کچھ اللہ پر چھوڑ دو۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

باہر سے فوجی گاڑیوں کے رکنے اور فوجی سپاہیوں کے بولنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ پھر ایسے لگا جیسے فوجی ٹیلوں پر چل پھر رہے ہیں۔ وہ دھماکہ کرنے والے مجاہدین کو ان ٹیلوں میں تلاش کرنے آئے تھے۔ اس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ شیر خان مبالغہ نہیں کر رہا تھا۔ انڈین آرمی دوارکا شہر اور اس کے آس پاس کے سارے علاقے کی چھان بین کر رہی تھی۔ اتنی بڑی اور قیمتی لیزر گن کی تباہی کوئی معمولی نقصان نہیں تھا۔ یہ آرمی ہائی کمانڈ اور انڈین بحریہ کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ تھا۔ چنانچہ دونوں فوجوں کے یونٹ دوارکا میں طوفانی تلاشیاں لے رہے تھے۔

ہم اندھیرے میں پتھروں کے پیچھے چھپ کر بیٹھے تھے۔ سلینسروں والے پستول ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ کان باہر کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ آنکھیں اندھیرے میں غار کے دہانے کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہم اندر بھی محفوظ نہیں تھے اور باہر بھی نہیں نکل سکتے تھے۔ نہ جانے اسی طرح کتنا وقت گزر گیا۔ ٹیلے کے اوپر فوجی سپاہیوں کے چلنے پھرنے کی آوازیں اب نہیں آ رہی تھیں۔ باہر کی آوازیں بھی کچھ رک گئی تھیں۔ میں نے خالد سے کہا۔

"میرا خیال ہے فوجی یونٹ چلے گئے ہیں۔"

"چل کر دیکھتے ہیں۔"

ہم غار کے سرکنڈوں میں آ گئے۔ سرکنڈوں میں اندھیرا نہیں تھا۔ ان پر دوسری جانب سے روشنی پڑ رہی تھی۔ ہم نے بڑی احتیاط سے سرکنڈوں کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا کہ ہم سے کوئی سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر جو ٹرک کھڑا تھا وہ اسی طرح کھڑا تھا اور اس کے پیچھے دو اور فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دو گاڑیوں کے اوپر عارضی بلب لگا کر انہیں روشن کر دیا گیا تھا۔ اس روشنی میں ہمیں پندرہ بیس فوجی سپاہی ادھر ادھر چلتے پھرتے دکھائی دیے۔ ہم وہیں سے اٹھے اور دبے پاؤں غار میں آ کر واپس پتھروں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

خالد بولا۔

"ان فوجیوں نے تو یہاں چھاؤنی ڈال لی ہے۔"

میں نے کہا۔

"جب تک وہ اس سارے علاقے کا سروے نہیں کر لیتے واپس نہیں جائیں گے۔"

خالد نے کہا۔

"یہ پہاڑی ٹیلے تو کافی دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔"

"فوج کے آگے دوری نزدیکی کچھ نہیں ہوتی۔ ہمیں لامحالہ اسی جگہ چھپے رہنا

ہو گا۔"

اس طرح ساری رات گزر گئی۔ رات کے چار بج گئے۔ اس دوران کبھی تھوڑی دیر کے لیے میں آنکھ جھپک لیتا اور کبھی کمانڈو خالد آنکھ جھپک لیتا تھا۔ جب دن کے پانچ بج گئے تو خالد نے کہا۔

"باہر سے کوئی آواز نہیں آ رہی۔ میرا خیال ہے فوجی چلے گئے ہیں۔ آؤ چل کر دیکھتے ہیں۔"

غار میں اندھیرا تھا مگر رات والی تاریکی نہیں تھی۔ غار کے دہانے کی جانب سے دن کی بہت ہی کمزور سی پھیکی پھیکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ہم نے سرکنڈوں کو ہٹا کر دیکھا کہ دن نکل آیا تھا مگر سارے علاقے میں فوجی گاڑیاں اسی طرح کھڑی تھیں۔ ایک طرف دو چار فوجی کیمپ بھی لگے ہوئے تھے اور دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہاں فوج نے کیمپ لگا رکھا ہے۔ لنگر پر چائے ناشتہ تیار ہو رہا ہے۔"

رات والا فوجی ٹرک بدستور غار سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا۔ ہم واپس غار کے اندر آ گئے۔ خالد کہنے لگا۔

"یہاں سے نکلنا تو خطرے والی بات ہے۔ یہ سارا علاقہ فوج کی زد میں ہے۔ ہم فوراً" پکڑ لیے جائیں گے۔"

اتنے میں ٹیلے کے اوپر ایک بار پھر فوجیوں کے چلنے پھرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ خالد غار کی چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں سوچتا ہوں شیر خان رات کو آنے والا ہے، کہیں وہ پکڑا نہ جائے۔"

خالد کی یہ تشویش حق بجانب تھی۔ کیونکہ اگر فوج نے واقعی اس سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا تو پھر ادھر سے کوئی بھی سویلین گزرتا ہوا پکڑا جا سکتا تھا۔ یہ میں اور خالد ہی جانتے ہیں کہ ہم نے سارا دن اس غار میں کیسے گزارا۔ ہر وقت دھڑکا لگا تھا کہ ابھی کوئی فوجی دستہ اندر آ کر ہمیں پکڑ لے گا۔ حیرانی کی اور خوش قسمتی کی

بات تھی کہ ابھی تک انہیں اس غار کا پتہ نہیں چل سکا تھا۔ میں نے خالد سے کہا۔

"اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ گورکھا اور جاٹ فوجی یونٹیں ہیں۔ ان پہاڑی علاقوں کے نشیب و فراز سے ناواقف ہیں۔"

جب ہماری گھڑیوں پر شام کے سات بج گئے تو ہماری تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ کیونکہ شیر خان کے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ شاید اس طرف روشنی میں فوجی ٹرکوں اور فوجی یونٹ کی نقل و حرکت کو دیکھ کر وہ واپس چلا جائے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ ہم نے رات کا بچا ہوا کھانا کھا کر اور تھوڑا پانی پی کر گزارا کر لیا تھا۔ ہم نے پتھروں کے ڈھیر کے پیچھے چھپ کر ہی سارا دن نکال دیا تھا۔ جب رات کے دس بج کر پانچ منٹ ہوئے تو ہمیں غار میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اندھیرا تھا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم نے اپنے اپنے پستول سیدھے کر کے پوزیشن لے لی۔ یہی سوچا کہ اگر بھارتی فوجی ہوں گے تو آخری گولی تک مقابلہ کریں گے پھر مجھے خیال آیا کہ اگر یہ بھارتی سپاہی ہوتے تو ضرور ٹارچ روشن کرتے۔ اتنے میں کسی نے آہستہ سے میرا نام لے کر آواز دی۔

یہ آواز شیر خان کی تھی۔ کمانڈو خالد نے دھیمی آواز میں کہا۔

"شیر خان ہو؟"

"ہاں۔ تم لوگ کدھر ہو؟"

"دیوار کے ساتھ بالکل سیدھ میں آ جاؤ۔"

شیر خان ٹٹول ٹٹول کر ہمارے پاس آگیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"خدا کا شکر ہے تم مل گئے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم کو فوج نے گرفتار کر لیا ہوگا۔ باہر تو ہر طرف فوج ہی فوج ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ بتاؤ کہ یہاں سے نکلنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔"

شیر خان بولا۔

"میں تمہیں یہاں سے نکالنے ہی آیا ہوں۔ کھانا ساتھ لایا تھا مگر فوجی گاڑیوں کو دیکھ کر میں نے تھیلا ایک جگہ چھپا دیا اور خود خفیہ راستے سے رینگتا ہوا غار تک پہنچا ہوں۔"

خالد نے پوچھا۔

"کیا یہاں سے نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ بھی ہے؟"

شیر خان نے آہستہ سے کہا۔

"ایک راستہ ہے۔ میرے پیچھے چلے آؤ۔ جلدی کرو۔"

ہم اس کے پیچھے پیچھے چلتے غار کے دہانے سے باہر نکل گئے۔ باہر نکلتے ہی ہم زمین پر شیر خان کی ہدایت کے مطابق اوندھے لیٹ گئے اور ٹیلے کے پہلو والی دیوار کے ساتھ ساتھ رینگنے لگے۔ خدا جانے ہم کہاں تک رینگتے چلے گئے تھے۔ شیر خان آگے آگے رینگ رہا تھا۔ ہماری کہنیاں پتھروں پر رینگنے کی وجہ سے چھل گئی تھیں۔ کوئی گہرائی آ جاتی تو ہم بیٹھ کر آگے بڑھنے لگتے۔ زمین اونچی ہو جاتی تو پھر رینگنا شروع کر دیتے۔ اسی طرح سے ہم نے کافی فاصلہ طے کر لیا۔ تب شیر خان نے کہا۔

"اب ہم خطرے سے باہر ہوگئے ہیں۔ اٹھ کر چل سکتے ہیں۔"

ہم کھڑے ہو کر چلنے لگے۔ شیر خان ہمیں پہاڑیوں کا ایک لمبا چکر کاٹ کر لایا تھا۔ ہم ویران علاقے سے گزر رہے تھے جہاں سوائے بکھرے ہوئے پتھروں اور سوکھی جھاڑیوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ دور سے رات کے اندھیرے میں روشنیاں نظر آنے لگیں۔ شیر خان نے کہا۔

"ہم مکان کے قریب آ گئے ہیں۔"

خالد نے کہا۔

"تمہارے مکان میں بھی خطرہ ہوگا۔ شیر خان ہمیں وہاں نہیں جانا چاہیے۔"

تب شیر خان نے بتایا کہ آج صبح اس کے مکان پر فوجی آئے تھے اور اس کے مکان کی اور علاقے کے دوسرے مکانوں کی تلاشی لے کر چلے گئے تھے۔

"اب وہ ہمارے علاقے میں نہیں آئیں گے۔ تم لوگ اطمینان سے وہاں چھپ سکتے ہو۔ جب فوج شہر سے نکل جائے گی تو یہاں سے بھوپال کی طرف چلے جانا۔"

شیر خان کی یہ دلیل وزنی تھی کیونکہ فوج جس علاقے کی ایک بار تلاشی لے لیتی ہے دوبارہ اس طرف نہیں جاتی۔ شیر خان ہمیں اپنے مکان میں لے آیا۔ اندھیرے میں اس کا مکان بھوت کی طرح لگ رہا تھا۔ اس نے ڈر کے مارے باہر کا بلب بھی روشن نہیں کیا تھا۔ بیٹھک میں آ کر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ شیر خان نے بیٹھک کی بتی روشن کرنے کی بجائے صرف موم بتی روشن کر دی اور کہا۔

"اونچی آواز میں بات بھی نہ کرنا۔ احتیاط لازمی ہے۔ میں تمہارے لیے کھانے کو لاتا ہوں۔ وہ کھانے کا تھیلا تو ان پہاڑیوں میں ہی رہ گیا ہے۔"

وہ ہمارے لیے تھوڑے سے بچے ہوئے چاول اور چائے لے آیا۔ ہم نے چاولوں پر چینی ڈال کر انہیں کھایا۔ پھر چائے پی تو جسم کو کچھ سکون نصیب ہوا۔ ہم وہیں چٹائی پر لیٹ گئے۔ اپنے اپنے پستول اور کمانڈو چاقو ہم نے چٹائی کے نیچے چھپا دیے تھے۔ کافی دیر تک ہم آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے پھر موم بتی بجھا کر سو گئے۔ میں گہری نیند میں تھا کہ کسی نے میرے بازو کو زور زور سے ہلایا۔

"جلدی اٹھو۔"

یہ شیر خان تھا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے کمانڈو خالد کو بھی جگا دیا۔ وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "کیا ہوا شیر خان؟"

شیر خان بند کھڑکی کی درز میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ خوف سے خشک آواز میں بولا۔

"مارے گئے خالد بھائی۔ فوجی ہمارے مکان کی طرف آ رہے ہیں۔"

ہم اٹھ کر جلدی سے کھڑکی کے پاس آ گئے۔ کھڑکی کی درز میں سے میں نے باہر دیکھا دن کی روشنی میں شیر خان کے مکان کے بالکل سامنے ایک فوجی ٹرک کھڑا تھا اور چھ سات گورکھا فوجی سٹین گنیں سیدھی کیے بالکل اٹیک کرنے کی پوزیشن میں شیر خان

کے مکان کی طرف دوڑتے چلے آ رہے تھے۔

اس کے بعد کیا ہوا اس کے سنسنی خیز واقعات آپ "بت شکن مجاہد"

کے حصہ چہارم



میں پڑھیے



اے حمید



سری نگر کے شیرِ دل کمانڈو



اے حمید



گورکھا فوجی دروازہ توڑ کر بیٹھک میں داخل ہو گئے۔

انہوں نے اندر آتے ہی ہمیں قابو کر لیا اور کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ چٹائی کے نیچے ہمارے دونوں آٹومیٹک پستول اور کمانڈو چاقو برآمد ہو گئے۔ ہمارے کمانڈو ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا۔ گورکھا فوجی ہمیں لاتیں اور گھونسے مارتے باہر لے آئے اور فوجی ٹرک میں ڈال کر ہمارے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے۔ فوجی دستے کا کمانڈر ہاتھ میں پستول لیے چیخ چیخ کر آڈر دے رہا تھا۔ ٹرک میں جو فوجی ہمیں دبوچ کر بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے ہمارے سر نیچے دبائے ہوئے تھے۔ میں' کمانڈو خالد اور شیر خان اس وقت ایسی حالت میں تھے کہ سوائے مار کھانے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ٹرک کسی نامعلوم فوجی کیمپ کی طرف چل پڑا۔ خدا جانے کسی نے مخبری کر دی تھی یا فوج کو کسی وجہ سے شک پڑ گیا تھا کہ کمانڈو اسی مکان میں چھپے ہوئے ہیں۔ بہر حال ہم پر مصیبت نازل ہو گئی تھی۔ ہم پھنس گئے تھے اور خدا کی ذات ہی ہمیں اس مشکل سے نکال سکتی تھی۔ ٹرک دوارکا کی نیم پہاڑی اونچی نیچی سڑکوں پر اچھلتا ہوا دوڑتا چلا گیا۔ ہمارے سر نیچے تھے ہمیں سر اٹھا کر دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔

فوجی ٹرک ایک طرف گھوما اور پھر آہستہ ہوتے ہوئے رک گیا۔ ہم تینوں کو یعنی مجھے' کمانڈو خالد اور شیر خان کو گورکھا فوجیوں نے گھسیٹ کر ٹرک سے باہر نکالا۔ میں نے نظر بچا کر دیکھا یہ کوئی فوجی کیمپ نہیں لگتا تھا۔ ایک دو منزلہ پرانی عمارت تھی جس

کی دیواریں بارشوں کی وجہ سے کالی ہو رہی تھیں۔ کھپریل کی ڈھلواں چھت پر صرف ایک ڈنڈا لگا تھا۔ کوئی جھنڈا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ چار گورکھے ہمیں گھسیٹتے ہوئے عمارت کی دوسری منزل میں لے آئے۔ لمبی راہ داری تھی جس میں ساتھ ساتھ کوٹھڑیوں کے دروازے تھے۔ گورکھے ایک ایک کوٹھڑی کھول کر ہم میں سے ایک کو اندر دھکیلتے جاتے تھے۔ ایک گورکھا کوٹھڑی کو باہر سے تالا لگا دیتا تھا۔ مجھے بھی ایک کوٹھڑی میں زور سے دھکا دیا گیا۔ میں فرش پر گر پڑا۔ میری کوٹھڑی کے باہر بھی تالا لگا دیا گیا۔ میں اٹھ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ میرے دونوں ہاتھ رسی سے پیچھے بندھے تھے۔ میں نے کوٹھڑی کا جائزہ لیا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ کال کوٹھڑی لگتی تھی۔ فرش کی اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ صرف ایک روشندان تھا' جس میں سے ابر آلود دن کی پھیکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ظاہر ہے اس وقت میرے دل میں صرف ایک ہی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش مجھ پر دورہ پڑ جائے اور انسان سے سانپ کی شکل اختیار کر کے روشندان میں سے باہر نکل جاؤں۔

میں روشندان کو غور سے دیکھنے لگا۔

عجیب بات تھی۔ روشندان کا آدھا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس میں لوہے کی سلاخیں نہیں لگی تھیں۔ میری ساتھ والی کوٹھڑی میں کمانڈو خالد تھا۔ اسے میں نے کوٹھڑی میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلی کوٹھڑی میں شیر خان بند تھا۔ روشندان نے میری توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی تھی۔ یہ مستطیل روشندان تھا۔ روشندان کا لکڑی کا چوکھٹا ایک طرف سے جھکا ہوا تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی اتنی ضرور تھی کہ ایک آدمی اس میں سے نکل سکتا تھا لیکن روشندان فرش سے دس گیارہ فٹ بلند تھا اور اس تک پہنچنے کا وہاں کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میرا یہاں کیا حشر ہونے والا تھا بلکہ ہم تینوں کا کیا حشر ہونے والا تھا اور ہمارے ساتھ جو وحشیانہ سلوک ہونے والا تھا اس کا مجھے پورا احساس تھا۔ پستول اور چاقو فوج نے برآمد کر لیے تھے۔ ہم لاکھ اپنی بے گناہی کے بیان دیتے کسی نے ان پر اعتبار نہیں کرنا تھا۔ کافی وقت گزر گیا۔ باہر فوجی بوٹوں کی ٹھک ٹھک

سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور ایک فوجی افسر دو گورکھا سپاہیوں کے ہمراہ اندر آیا اور میرے سر پر کھڑا ہو کر انگریزی میں اس نے مجھے گالی دی۔ پھر زور سے مجھے ٹھڈ مارا اور کہا۔

"تمہارے باقی ساتھی دوارکا میں کہاں چھپے ہوئے ہیں؟"

میں نے کہا:

"میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں کاٹھیاواڑ میں پرانی کتابوں کا دھندا کرتا ہوں۔ دوارکا میں اپنے واقف بھائی بند کے ہاں کاروباری سلسلے میں آیا ہوا تھا۔"

"کیا تم ہندو ہو؟"

میرا مسلمان ہونا ایک سیکنڈ میں ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے کہہ دیا۔

"ہاں میں مسلمان ہوں مگر میں بھارتی شہری ہوں۔ آپ لوگوں کو غلطی لگی ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔"

یہ بھارتی فوجی افسر کیپٹن رینک کا تھا۔ اس کے کندھے پر تین تین پھول لگے ہوئے تھے۔ وہ انڈین آرمی کی کمانڈو فورس کی وردی میں تھا۔ ان لوگوں سے میرا زندہ بچ نکلنا ناممکن لگتا تھا۔ اب مجھے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا تھا۔ بھارتی کیپٹن نے مجھے ایک اور ٹھڈا مارا اور گالی دے کر پوچھا۔

"پاکستان سے تمہارے ساتھ اور کون کون لوگ آئے تھے؟"

میں نے کہا۔

"جناب! میں بے گناہ ہوں۔ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ میں بھارتی ناگرک ہوں۔"

فوجی کیپٹن نے گورکھوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے مجھے برین گنوں کے بٹوں سے بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔ میں کہاں تک برداشت کرتا۔ درد کی شدت سے بلبلا اٹھا اور مجھ پر جب غش کی حالت طاری ہونے لگی تو فوجی کیپٹن پنجوں کے بل میرے قریب ہو کر بیٹھ گیا اور میرے سر کے بالوں کو پکڑ کر میرے سر کو دو تین جھٹکے دیئے۔ گالیاں دیں اور کہا۔

"دیکھو۔ ہمیں تم لوگوں کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ ہمیں یہ بھی

معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ چار اور پاکستانی دہشت گرد تھے۔ اگر تم ہمیں ان کے بارے میں بتا دو تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

میں نے ایک ہی رٹ لگائے رکھی کہ مجھے کچھ معلوم نہیں' میں کچھ نہیں جانتا۔ ان گورکھوں نے مجھے اس قدر زد و کوب کیا کہ واقعی میں نیم بے ہوش ہو کر ایک طرف کو لڑھک گیا۔ بھارتی کیپٹن اپنے سپاہیوں کے ساتھ کوٹھڑی سے چلا گیا۔ مجھے کوٹھڑی کے دروازے پر باہر سے تالا لگانے کی آواز آئی۔ درد کی شدت سے میرا پورا جسم اس طرح دکھ رہا تھا جیسے کسی نے مجھے روئی کی طرح دھنک ڈالا ہو۔ میں اسی طرح فرش پر ایک طرف کو پڑا رہا۔ میرے ہاتھ پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے۔ نہ جانے میں کب تک نیم بے ہوشی کے عالم میں آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔

جب ذرا ہوش آیا اور بدن کا درد ذرا کم ہونے لگا تو میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میری نظریں سیدھی روشندان پر پڑیں۔ میری نجات کا صرف یہی ایک ذریعہ نظر آ رہا تھا مگر میرے اور روشندان کے درمیان ناممکنات کی ایک گہری خلیج حائل تھی۔ میری پسلیاں سخت درد کر رہی تھیں اور ان میں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ایک بار اتنی شدید ٹیس اٹھی کہ میرے منہ سے بے اختیار یا اللہ نکل گیا اور میں نے اپنے گھٹنے پیٹ کے ساتھ لگا دیئے۔ شدید درد کی دوسری ٹیس اٹھی تو میں واقعی بے ہوش ہو گیا۔ مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ ان گورکھے فوجیوں نے مجھے بڑی بے دردی سے پیٹا تھا۔ یہ ابھی ابتدا تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ملٹری انٹیلی جینس کے قصائی آگے چل کر میرا کیا حال کرنے والے ہیں۔ میں بڑی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔ کیونکہ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو مجھے روشندان دکھائی نہ دیا۔ کوٹھڑی میں بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا اور روشندان میں بھی اندھیرا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر رات پڑ چکی تھی۔ میری پسلیاں اب اتنی درد نہیں کر رہی تھیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے باہر کی طرف کان لگا دیئے۔ باہر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ دیواریں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد سامنے والی دیوار کے اوپر روشندان کے چوکھٹے کی پھیکی سی روشنی ابھرتی

نظر آئی۔ میں ٹکٹکی باندھے روشندان کو دیکھ رہا تھا۔

باہر فوجی بوٹوں کی آواز گونجی۔ پھر دروازہ کھلا۔ کسی نے دیوار پر لگے بٹن کو دبا دیا۔ کوٹھڑی میں بلب کی روشنی پھیل گئی۔ دو گورکھے فوجی نظر آئے۔ ایک برین گن لیے دروازے میں ہی کھڑا ہو گیا۔ دوسرے فوجی نے آگے بڑھ کر میرے آگے ایک مگ رکھا اور میرے ہاتھوں کی رسیاں کھول دیں۔ اس کے بعد دونوں چلے گئے۔ ہاتھوں کی رسیاں کھل جانے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے مگ کو اٹھا کر دیکھا۔ پتلے سرخ رنگ کے شوربے میں روٹی بھگوئی ہوئی تھی۔ میں نے ایک لقمہ منہ میں ڈالا۔ روٹی جلی ہوئی تھی۔ شوربہ بھی پھیکا تھا۔ مگر اس وقت مجھے بھوک لگی ہوئی تھی' میں سب کچھ کھا گیا۔ کھانے سے میرے اندر تھوڑی طاقت آ گئی۔ میں روشندان سے فرار کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ ہمیں کمانڈو ٹریننگ کے دوران اس قسم کے حالات میں پھنس جانے کے بعد کئی ترکیبوں کی مشق کرائی جاتی تھی۔ ان میں ایک طریقہ ہمارا انسٹرکٹر بتایا کرتا تھا کہ اگر تم دشمن کی قید میں پھنس جاؤ اور دشمن تمہیں ایسی جیل میں قید کر دے جس میں ایک ہی روشندان ہو اور باقی کچھ نہ ہو تو تمہیں یہ کرنا چاہیے' ایسا کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت ساری ترکیبیں مجھے بے کار لگ رہی تھیں۔

یہی بڑی غنیمت تھی کہ میرے ہاتھ کھل گئے تھے۔ ساری رات گزر گئی۔ دوسرا دن آ گیا۔ وہی بھارتی کیپٹن دوبارہ کوٹھڑی میں آیا۔ اس نے مجھ سے سرسری سی پوچھ گچھ کی۔ میں نے اپنی بے گناہی کا بیان دہرایا۔ بھارتی کیپٹن نے مجھے گالیاں دیں۔ گھونسے اور ٹھڈے مارے اور اپنے سپاہیوں کے ساتھ واپس چلا گیا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان لوگوں نے اصل میں مجھے کسی اور ٹارچر سیل میں لے جانا ہے جہاں مجھ پر اصل تشدد شروع ہو گا اور جہاں فوجی انٹیلی جینس کے بڑے بڑے بے رحم قصاب بھی موجود ہوں گے۔ کسی وجہ سے مجھے ابھی اس پرانی عمارت میں ٹرانزٹ کی پوزیشن میں رکھا ہوا تھا۔ میں اس مہلت سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور میرا ذہن بڑی تیزی سے وہاں

سے فرار کی ترکیبوں پر غور کرنے لگا تھا۔ کوٹھڑی کا بلب دن کے وقت بھی جلتا رہتا تھا۔ اس کی روشنی زیادہ نہیں تھی۔ میں بڑے غور سے روشندان والی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایک جگہ سے دیوار کچھ ابھری ہوئی دکھائی دی۔ میں آہستہ سے چل کر دیوار کے قریب آ گیا۔ دیوار میں ایک جگہ سے اینٹ کا کونا ذرا سا باہر نکلا ہوا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

کوٹھڑی چونکہ باقاعدہ کسی جیل کی کوٹھڑی نہیں تھی' اس لیے اس میں قیدی کو دیکھتے رہنے کے لیے سلاخ دار چوکھٹا نہیں تھا۔ دروازہ بند تھا۔ نہ میں باہر پہرہ دیتے گورکھے کو نظر آتا تھا' نہ میں ہی اسے دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اینٹ کے کونے کو ذرا ہلایا۔ اینٹ اپنی جگہ پر قائم رہی۔ میں نے ذرا زور سے ایک طرف دبایا تو اس میں سے سیمنٹ اکھڑ کر نیچے گر پڑا۔ میں جلدی سے واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ میرا دل جذبات کی شدت سے زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ کسی غیبی طاقت نے میرے کان میں سرگوشی کر دی تھی کہ کرم داد تم یہاں سے فرار ہو سکتے ہو۔ کچھ دیر میں اسی جگہ پر بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا اور دیوار کے پاس جا کر اس کو ہاتھ سے ٹٹولا۔ اوپر بھی ایک جگہ سے دیوار تھوڑی سی اندر کو ہو گئی تھی۔ لگتا تھا کہ کبھی یہاں سے کوئی اینٹ پتھر اکھڑا ہو گا جس کو گارے سے بھر دیا گیا تھا۔ میں نے اسے ناخنوں سے کریدا تو وہاں سے بھی مٹی جھڑنے لگی۔

مجھ پر ایک عجیب سی ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی اور میں جلدی سے دیوار سے ہٹ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ میری حالت اس پرندے کی تھی جس نے پنجرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا دیکھ لیا ہو۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا اور میری کوشش بار آور ہوئی تو میں روشندان تک پہنچ سکتا تھا۔ میری نگاہیں روشندان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کے ٹوٹے ہوئے شیشے والی جگہ سے میں باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ اگر کسی طرح میں روشندان کا چوکھٹا اکھاڑنے میں کامیاب ہو جاؤں تو روشندان میں سے نکل سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ دیوار کی دوسری طرف کیا ہے۔ دوسری طرف فوج کا کیمپ بھی ہو

سکتا تھا۔ دوسری طرف کیمپ کا احاطہ بھی ہو سکتا تھا' جہاں رات کو گورکھا سپاہی پہرے پر موجود ہوں اور دوسری طرف کوئی ویرانہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن میں نے ان باتوں کو نظر انداز کر دیا تھا اور صرف روشندان تک پہنچ کر چوکھٹے کو اکھاڑنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ دوسری طرف چاہے موت منہ کھولے کیوں نہ بیٹھی ہو۔ مجھے ہر حالت میں دوسری طرف چھلانگ لگانی تھی۔ لیکن اس کے لیے روشندان تک پہنچنا اور پھر بغیر آواز پیدا کیے اس کے چوکھٹے کو اکھاڑ کر دوسری طرف گرانا شرط اول تھی۔ میں باہر رات کا اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے لگا' کیونکہ یہ سارا کام رات کے وقت ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے گزشتہ رات کو جب میری کوٹھڑی میں بلب روشن نہیں تھا' یہ دیکھ لیا تھا کہ روشندان کی دوسری طرف سے کسی جلتے ہوئے بلب وغیرہ کی روشنی نہیں آ رہی تھی۔ اگر دیوار کی دوسری جانب قریب قریب کوئی بلب رات کو روشن ہوتا تو روشندان میں سے اس کی روشنی ضرور نظر آ جاتی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دیوار کی دوسری جانب رات کو اندھیرا ہوتا ہے اور وہاں دیوار کے ساتھ کوئی بلب نہیں جلتا۔

رات ہو گئی۔ کل والے دونوں گورکھا سپاہی میرے لیے پتلے بد ذائقہ شوربے میں بھگوائی ہوئی روٹی والا مگ لے کر آئے اور میرے آگے اس طرح رکھا جس طرح کتے کے آگے اس کا راتب رکھا جاتا ہے۔ دونوں نے گورکھالی زبان میں آپس میں کوئی بات کی پھر ایک گورکھے سپاہی نے میری گردن پر گن کی نالی لگا کر کہا۔

"کھا لے راشن آج کا دن۔ کل تیرا آپریشن ہوگا سالے۔

دونوں ہنستے ہوئے کوٹھڑی سے نکل گئے۔ میں سمجھ گیا کہ کل یہ لوگ مجھے یہاں سے کسی فوجی یونٹ کے اصلی ٹارچر سیل میں لے جانے والے ہیں۔ اس کوٹھڑی کے اندھیرے میں مجھے امید کی ایک کرن دکھائی دے چکی تھی۔ میں فرار کی ایک کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد مجھے امید نہیں تھی کہ میں فوجی کیمپ کے کسی ٹارچر سیل سے فرار ہو سکوں گا۔ میں نے پتلے شوربے میں بھگوئی ہوئی روٹی کھا لی اور گھٹنے

چھاتی سے لگا کر فرش پر اس پوزیشن میں بیٹھ گیا کہ میری آنکھیں روشندان کی طرف لگی ہوئی تھیں جس میں سے دن کی روشنی دھندلے غبار کی شکل میں اندر آ رہی تھی۔ مجھے اس روشنی کے غائب ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ میں نے کان باہر کی طرف لگا لیے۔ باہر کچھ دیر تک گورکھے فوجیوں کے باتیں کرنے کی آواز آتی رہی۔ پھر ایک فوجی کے بھاری بوٹوں کی آواز کچھ دور جا کر گم ہو گئی۔ کوٹھڑی کے باہر اب صرف ایک ہی سپاہی گارڈ ڈیوٹی پر تھا۔

رات۔ رات۔ کاش رات جلدی آ جائے' اندھیرا چھا جائے اور میں فرار کی کوشش شروع کر سکوں۔ ایک پلان پورے کا پورا میرے دماغ میں آ چکا تھا۔ وہ قابل عمل بھی تھا اور ناقابل عمل بھی تھا۔ میری کامیابی کے چانس صرف پانچ فیصد تھے۔ لیکن میرے اندر بھارتی فوج کی ذلت آمیز قید سے فرار کا جذبہ سو فیصد سے بھی بڑھ کر بیدار ہو چکا تھا۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اگر دیوار چین بھی میرے راستے میں آ جائے تو میں اسے پھلانگ سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ دن گزرتا چلا گیا۔ روشندان پر دن کی روشنی کا غبار پھیکا ہوتے ہوئے غائب ہو گیا۔ باہر ایک اور فوجی آ کر باتیں کرنے لگا۔ پھر دروازہ کھلا' باہر روشنی تھی۔ میں نے دو فوجی دیکھے۔ ایک نے اندر جھانک کر مجھے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد بھاری فوجی بوٹوں کی آواز گیلری میں بلند ہوئی اور دور جا کر غائب ہو گئی۔ شاید گارڈ کی بدلی ہوئی تھی۔ دن والے گورکھے فوجی کی جگہ کوئی دوسرا فوجی ڈیوٹی پر آ گیا تھا۔

میں نے روشندان کی طرف دیکھا۔ روشندان کے باہر اندھیرا تھا۔ کوٹھڑی میں جو بلب جل رہا تھا اس کی مدھم روشنی میں روشندان کا چوکھٹا ایک طرف کو جھکا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے کچھ وقت اور گزار دیا۔ جب باہر گہری خاموشی چھا گئی تو میں آہستہ سے اٹھ کر دیوار کے پاس آ گیا جس جگہ سے اینٹ کا کونا باہر کو نکلا ہوا تھا اس کو ذرا سا کھرچا۔ سیمنٹ یہاں بھربھرا تھا اور اس کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ وہ میرے ہاتھ

میں گرنے لگا۔ میں نے دو گز اوپر اسی سیدھ میں دیوار پر اس جگہ کو کریدا جہاں سوراخ کو مٹی سے لیپا ہوا تھا۔ وہاں سے بھی مٹی جھڑنے لگی۔ اس سوراخ سے روشندان تین گز کے فاصلے پر تھا۔ اگر کسی طرح میرا پاؤں اینٹ کے کونے پر جم جائے اور سوراخ والی مٹی کھرچنے کے بعد وہاں میرا ہاتھ جم جائے تو میں دوسرے پاؤں کو اوپر کرکے تھوڑا سا اچھل کر روشندان کے دہانے کو پکڑ سکتا تھا۔ یہی میرا پلان تھا اور اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنا کام شروع کردیا۔ نیچے والی اینٹ کا کونا اتنا باہر نکل آیا کہ میں اس پر ایک پیر جما سکتا تھا۔ اب میں نے دونوں ہاتھوں سے اوپر والی مٹی کو کھرچنا شروع کر دیا۔ میرے اندر وحشی جانوروں والی طاقت پیدا ہوگئی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہاں بھی تھوڑا سا شگاف دیوار میں نمودار ہوگیا۔ اب میں نے ایسا کیا کہ اپنا بایاں پاؤں اینٹ پر جمایا۔ بائیں ہاتھ سے ہی دیوار کے شگاف کو پکڑا اور دائیں پاؤں کو فرش پر پوری طرح جما کر جتنی میرے اندر طاقت تھی اس کو پوری طرح عمل میں لاتے ہوئے اپنے آپ کو اتنی زور سے اچھالا کہ میرا دایاں ہاتھ حیرت انگیز معجزے کے ساتھ روشندان کے چوکھٹے پر پڑ چکا تھا۔ میں نے اپنا بایاں ہاتھ چھوڑا اور چھوڑنے کے ساتھ ہی بایاں ہاتھ بھی روشندان کے کنارے پر ڈالا اور اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اب میرے دونوں ہاتھ روشندان کے کناروں پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے اور ایک پاؤں اینٹ کے کونے پر تھا۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ لیکن یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ ایک طرف زندگی تھی دوسری طرف موت تھی۔ مجھے ہر حالت میں زندگی کی طرف جانا تھا۔ میرے اندر زندہ رہنے اور فرار ہونے کی خواہش ایک زبردست طاقت کا روپ اختیار کرچکی تھی۔ میں نے دوسری بار اپنے جسم کو پوری طاقت کے ساتھ اوپر کو اچھالا اور میرا گھٹنا روشندان میں پڑ گیا اور میں نے اس کے ساتھ ہی اپنی ٹانگ روشندان کی دوسری طرف نکال دی۔ روشندان کا چوکھٹا چرچرایا اور درمیان میں سے اس کی لکڑی ٹوٹ کر دوسری طرف گر گئی۔ میں وہیں ساکت ہوگیا۔

دوسری طرف لکڑی کے گرنے کی آواز نہیں آئی تھی۔ شاید دوسری طرف نیچے گھاس یا جھاڑیاں وغیرہ تھیں۔ اس سے مجھے حوصلہ ہوگیا۔ روشندان کے درمیان میں سے لکڑی کے ٹوٹ کر گرنے سے وہاں کافی جگہ بن گئی۔ مجھے اب روشندان کا چوکھٹا اکھاڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اپنے دونوں کندھے اور سر روشندان سے باہر دوسری طرف نکال لیے۔

دوسری طرف اندھیرا تھا۔ میں نے ٹانگوں کو اندر سے کھسکا کر باہر نکالا اور یا مولیٰ تیرا آسرا کہہ کر روشندان کی چوکھٹ سے اپنے آپ کو نیچے گرا دیا۔ میں نے کمانڈو تربیت کے مطابق اپنے آپ کو اس طرح گرایا تھا کہ میں نیچے پہنچنے سے پہلے ایک قلا بازی لگا لوں۔ اس کی ہمیں خاص تربیت دی جاتی تھی کہ اگر دوسری منزل سے نیچے رڑے میدان میں بھی چھلانگ لگانی ہو تو جسم کو پورا پھیلا کر نیچے نہ کودو۔ اس طرح سے تمہاری رفتار بھی تمہارے جسم کے بوجھ کے ساتھ شامل ہو جائے گی اور جب تم نیچے گرو گے تو تمہارا وزن چار گنا بڑھ چکا ہوگا۔ اگر راستے میں ایک قلا بازی لگاؤ گے تو نیچے گرتے وقت جسم کا وزن نیچے گرنے کی رفتار سے مل کر صرف دوگنا ہی ہوگا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ نیچے گرتے وقت میں نے اپنا سر پیچھے کر لیا اور زیادہ سے زیادہ کوشش کی کہ میں پنجوں کے بل گروں۔ مگر میں ایک بہت گھنی جھاڑی میں گرا۔ میں نے اپنے گھٹنے اوپر اٹھا رکھے تھے اور اس طرح زمین پر گرا جس طرح خرگوش جست لگانے کے بعد پہلے اپنے اگلے پنجوں پر گرتا ہے۔

گنجان جھاڑیوں نے مجھے دو فائدے دیے۔ ایک تو میرے گرنے کی آواز پیدا نہ ہوئی۔ دوسرے میرے جسم کو کوئی چوٹ نہ لگی۔ تربیت کے مطابق میں نے گرتے ہی اپنے آپ کو لڑھکا دیا تھا۔ جھاڑیوں کی نوکیلی شاخوں نے میری گردن اور کہنیوں کو جگہ جگہ سے معمولی زخمی کر دیا تھا۔ مگر افراتفری میں مجھے کوئی ہوش نہیں تھا۔ جھاڑیوں میں گرتے ہی میں وہیں دبکا رہا اور شاخوں میں سے سر نکال کر ماحول کا جائزہ لیا کہ میں کہاں پر ہوں۔ یہ چونکہ کوئی فوجی کیمپ وغیرہ نہیں تھا جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا

ہوں۔ ایک پرانی عمارت تھی جسے عارضی طور پر یعنی دوارکا میں ہنگامی صورت حال پیدا ہونے کی وجہ سے فوج نے فوجی کوارٹر گارڈ میں بدل دیا تھا۔ اس لیے اس عمارت کا پچھواڑا بالکل ویران تھا اور کوئی چاردیواری وغیرہ بھی نہیں تھی۔ اندھیرے میں درختوں کے سیاہ جھاڑ سے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جھاڑیوں سے نکل کر درختوں کی طرف بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا۔ راستے میں کئی جگہ میرا پاؤں پتوں اور پتھروں پر سے پھسلا مگر میں رکے بغیر دوڑتا چلا گیا۔ دوڑ لگانے کی مجھے بڑی مشق تھی۔ آرمی سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی میں ڈھاکے میں کبھی کبھی دوڑ لگانے یا جوگنگ کرنے نکل جایا کرتا تھا۔ مگر اس وقت میں جاگنگ نہیں کر رہا تھا بلکہ اس طرح دیوانہ وار دوڑ رہا تھا جیسے میرے پیچھے شکاری کتے لگے ہوئے ہوں۔

اندھیرے میں جس طرف سے ذرا دھندلی سی روشنی اور کھلی جگہ دکھائی دیتی میں اپنا رخ اسی طرف کر لیتا۔ ایک کھائی آ گئی جس میں پتھر بہت تھے۔ میں اس میں اتر گیا اور پتھروں پر سے اچھل اچھل کر جتنی تیز دوڑ سکتا تھا دوڑ کر کھائی سے باہر نکل گیا۔ صرف سمت کا مجھے اندازہ تھا کہ میں جنوب مشرق کی طرف جا رہا تھا۔ کاٹھیاواڑ بھی دوارکا کے جنوب مشرق کی جانب ہی تھا۔ یہ علاقہ میرے لیے بالکل انجانا تھا۔ دوڑتے دوڑتے جب میں زیادہ ہانپنے لگا تو ایک جگہ بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے کی کوشش کرنے لگا۔ آدمی کا سانس پھول رہا ہو تو اس کے لیے لمبے سانس لینا مشکل ہوتا ہے لیکن ہمیں کمانڈو ٹریننگ میں یہی بتایا گیا تھا کہ سانس زیادہ پھول جائے تو دس بار سانس لینے کے درمیان کم از کم ایک سانس ضرور گہرا اور رک کر لو تاکہ آکسیجن کو کچھ دیر پھیپھڑوں میں رہنے اور پھیپھڑوں کے ذریعے خون میں جذب ہونے کا موقع مل سکے۔ میں نے چھ سات بار لمبے لمبے سانس لیے اور بیچ میں تین چار سیکنڈ کے لیے سانس کو پھیپھڑوں میں ہی رکھا تو میرا سانس درست ہونے لگا۔ میں زیادہ دیر وہاں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اٹھا اور دوڑنے کی بجائے تیز تیز چلنے لگا۔ میں ایک پگڈنڈی پر آ گیا جس کی جانب اونچے اونچے ستونوں والے تاڑ کے درخت نیم روشن رات کے آسمان کے پس

منظر میں نظر آ رہے تھے اور دوسری طرف کھلا میدان تھا۔ میدان میں گھاس تھی یا نہیں تھی مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں پگڈنڈی پر جلدی جلدی چلتا چلا گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو سوائے اندھیرے کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ کسی جگہ کوئی روشنی نہیں ٹمٹما رہی تھی۔

مجھے ہوا میں پانی کی نمی محسوس ہوئی۔ یہ نمی دریا کے پانی کی تھی۔ سانپ بننے کی وجہ سے میری سونگھنے کی حس بے حد تیز ہو گئی تھی اور یہ حس انسانی روپ میں آ جانے کے بعد بھی بہت حد تک برقرار رہتی تھی۔ یہ نمی سمندر کے پانی کی نمی نہیں تھی۔ سمندر کے پانی کی نمی میں کھارے پن کی اور کہیں کہیں مچھلیوں کی بو ملی ہوئی ہوتی ہے۔ دریا کے پانی کی نمی میں ایک نکھار اور مہک سی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ آگے کوئی دریا تھا۔ میں پگڈنڈی پر سے گزر گیا۔ پگڈنڈی ختم ہوئی تو ویرانہ شروع ہوگیا۔ وہاں کوئی درخت نہیں تھا۔ جھاڑیاں بھی بہت دور دور تھیں اور اندھیرے میں اس طرح لگ رہی تھیں جیسے فقیر سیاہ کمبل اوڑھ کر بیٹھے ہوئے ہوں۔ مجھے اس کی فکر نہیں تھی کہ میں کہاں جا کر نکلوں گا۔ میں صرف اس علاقے سے جتنی دور نکل سکوں نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ میری بھرپور جوانی کا ٹائم نہیں تھا۔ میری کمانڈو ٹریننگ اپنی جگہ پر ضرور قائم تھی مگر جسم میں وہ طاقت نہیں رہی تھی جو میرے آرمی سروس کے زمانے میں تھی۔ چنانچہ مجھے تھکن کا احساس ہونے لگا۔ میں پھر بھی نہ رکا اور چلتا گیا۔

آسمان اسی طرح بادلوں میں چھپا ہوا تھا جیسے دن کے وقت تھا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ بارش نہیں ہو رہی تھی۔ اصل میں قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ قسمت بھی عجیب چیز ہے۔ مصیبت میں آدمی کا ساتھ بھی دیتی ہے اور اچانک ساتھ چھوڑ بھی دیتی ہے۔ اسی لیے بزرگ لوگ کہتے ہیں کہ آدمی کو قسمت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے اور اپنے آپ کو قسمت پر نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ سب سے پہلے اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور پھر اپنی ہمت اور کوشش سے کام لے کر مصیبت سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں بھی یہی کچھ کر رہا تھا۔ لیکن ایک مقام پر پہنچ کر میری ٹانگیں جواب دے

گئیں۔ میں زمین پر بیٹھ گیا۔ مجھے سانپ سنپولوں کا تو کوئی ڈر ہی نہیں تھا۔ زہریلے سے زہریلا سانپ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ دوسرے میں فوجی کوارٹر گارڈ سے کافی دور نکل آیا تھا۔ اگرچہ اس بات کا دھڑکا ضرور لگا تھا کہ یہ میدانی علاقہ ہے۔ میرے فرار کی خبر ہوگئی تو فوجی ٹرک میری تلاش میں آناً فاناً یہاں پہنچ جائے گا۔ میں زیادہ دیر نہ بیٹھا۔ بمشکل تین منٹ بیٹھ کر تھوڑا آرام کیا اور پھر چلنا شروع کر دیا۔ اب مجھے دریا کی طرف سے پریشانی لگ گئی تھی کہ آگے دریا آگیا اس پر کوئی پل نہ ہوا تو مجھے تیر کر دریا پار کرنا پڑے گا۔ گرمیوں کا موسم تھا دریا ضرور چڑھا ہوا ہوگا۔ اس کی لہریں مجھے بہا کر کہیں کی کہیں لے جاسکتی تھیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دریا آگے جا کر سمندر میں گرتا ہو جس کا غالب امکان تھا کیونکہ سمندر میری دائیں جانب تھا۔ دریا کی طرف سے آنے والی نمی اور ٹھنڈک میں اضافہ ہوگیا تھا۔ میں ایک گہرائی میں سے ہو کر دوسری طرف اوپر آیا تو کچھ فاصلے پر مجھے درختوں کی سیاہ دیوار اوپر تک اٹھی ہوئی دکھائی دی۔

وہاں سے ضرور دریا کا کنارہ شروع ہوتا ہوگا۔ میں چلتا گیا۔ جب درختوں کی سیاہ دیوار کے نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ ایک چھوٹا کچا اور پتھریلا راستہ درختوں کے پہلو سے ہو کر دوسری طرف جاتا ہے۔ درختوں کے درمیان سے مجھے دریا کا حد نگاہ تک پھیلا ہوا پاٹ دکھائی دیا تو مجھ پر ہیبت سی طاری ہوگئی۔ دریا کو رات کے وقت دیکھ کر انسان پر ایک بار ہیبت ضرور طاری ہو جاتی ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے۔ وہاں کوئی پل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں کچے راستے پر دریا کے بہاؤ کے رخ پر چلنے لگا۔ سڑک سو ڈیڑھ سو گز آگے جا کر اونچی ہوگئی۔ اس کے بعد جب سڑک ہموار یعنی زمین کی سطح کے برابر ہوئی تو میں نے دیکھا کہ میری دائیں جانب کچھ فاصلے پر کسی بہت بڑی عمارت کا خاکہ سا ابھرا ہوا ہے۔ مجھے یہی خیال آیا کہ ضرور یہ کسی پرانے قلعے یا پرانی تاریخی عمارت کا کھنڈر ہے کیونکہ اس میں کہیں بھی روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کوئی بھوت محل لگ رہا تھا۔ کچا راستہ آگے جا کر دو اونچی اونچی چٹانوں جیسے ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا گیا۔

میں جب ٹیلوں کے درمیان سے گزرنے لگا تو مجھے کسی عورت کے کراہنے کی آواز آئی۔ ضرور یہ کوئی چڑیل ہوگی۔ میں نے سوچا' مگر میں بالکل نہ ڈرا۔ موت میرا پیچھا کر رہی تھی۔ اس وقت میں چڑیل سے خوف زدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی مجھے چڑیلوں سے کبھی اتنا زیادہ ڈر نہیں لگتا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ میں آگے نکل جاؤں لیکن جب عورت نے کراہتی ہوئی آواز میں بڑی صاف اردو زبان میں کہا۔

"پلیز میری مدد کرو۔ بھگوان کے لیے میری مدد کرو۔"

تو میں رک گیا۔ آواز ٹیلے کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ میں نے وہیں سے آواز دی۔

"اگر تم کوئی انسان ہو تو سامنے آؤ۔ اگر چڑیل ہو تو دفع ہو جاؤ۔"

عورت کی آواز آئی۔

"میں انسان ہوں۔ میرے پاؤں میں سخت درد ہے۔ میری مدد کرو۔ میں اٹھ نہیں سکتی۔"

اس خیال سے کہ عورت ذات ہے۔ خدا جانے کس تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس کی مدد کرنی چاہیے۔ ویسے بھی میں خطرے کے مقام سے کافی آگے نکل آیا تھا۔ میں ٹیلے کے عقب میں آ گیا۔ مجھے اندھیرے میں ایک سفید ساڑھی والی عورت کا ہیولا دکھائی دیا جو زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دور ہی سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟ تم رات کے وقت یہاں کیسے آ گئی ہو؟"

عورت نے کراہتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! میرا نام قنوج کماری ہے۔ میں اس علاقے کی جاگیردارنی ہوں۔ بائیں طرف دور سے جو عمارت نظر آ رہی ہے وہ میرے پرکھوں اور باپ داداؤں کی حویلی ہے۔ میں وہاں اپنی بہو اور اس کے بچوں کے ساتھ رہتی ہوں۔ شہر گئی ہوئی تھی۔ وہاں بم کے دھماکے ہوئے تو لوگوں نے کہا۔ پاکستان نے حملہ کر دیا ہے۔ میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر حویلی کی طرف چل پڑی کہ اگر جنگ لگ گئی تو کم از کم اپنے پوتوں کے پاس تو

ہوں گی۔ یہاں آ کر گھوڑا بدک گیا۔ میں گر پڑی۔ گھوڑا بھگوان جانے کدھر چلا گیا۔ میرے پاؤں میں سخت موچ آ گئی۔ تب سے میں یہاں پڑی ہوں۔ کسی کے قدموں کی آہٹ سنتی ہوں تو آواز دے کر مدد کے لیے پکارتی ہوں۔ دو آدمی مجھے چڑیل سمجھ کر ڈر کر بھاگ گئے۔ تم بڑے بہادر آدمی ہو کہ میری مدد کو آ گئے ہو۔"

میں نے کہا۔

"بہن جی! میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں؟"

عورت کی آواز سے لگتا تھا کہ اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہو گی۔ میں ابھی تک اس سے پانچ چھ قدم دور ہی کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔

"بیٹا! بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ ہماری حویلی یہاں سے تھوڑی دور ہی ہے۔ مجھے کسی طرح سہارا دے کر حویلی کے دروازے تک پہنچا دے' آگے میں خود دیواروں کو پکڑ پکڑ کر اندر چلی جاؤں گی' بھگوان تمہارا بھلا کرے گا۔ مجھ سے درد برداشت نہیں ہو رہا۔"

میں انسانی ہمدردی کے خیال سے اس کی طرف بڑھا۔ جس عمارت کو یہ عورت اپنی حویلی بتا رہی تھی اس کو میں نے دور سے دیکھ ہی لیا تھا۔ وہاں سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ قریب جا کر میں نے دیکھا کہ عورت زمین پر ایک گھٹنا اوپر اٹھا کر بیٹھی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنے ٹخنے کو پکڑ رکھا تھا۔ رات کی دھندلی پھیکی روشنی میں اس کا سفید چہرہ اور سر کے سفید بال صاف نظر آ رہے تھے۔ مجھے وہ عورت واقعی کوئی مدبر جاگیردارنی لگی۔ میں نے کہا۔

"بہن جی! اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر اٹھیں' میں آپ کو آپ کی حویلی کے دروازے تک چھوڑ آتا ہوں۔"

"بھگوان تمہیں سکھی رکھے بیٹا۔ بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔"

میں نے اسے سہارا دے کر اٹھا لیا۔ وہ بڑی مشکل سے ایک پاؤں پر کھڑی ہو سکی۔ میں نے کہا۔

”بہن جی! اپنا بازور میرے کندھے پر رکھ لیں اور آہستہ آہستہ چلیں۔“
اس نے ایسا ہی کیا۔ میں اسے بڑی آہستہ آہستہ چلاتا ٹیلے کی اوٹ سے نکل آیا۔
میں نے اس سے پوچھا کہ حویلی کو جانے والا راستہ کس طرف ہے۔ اس نے کہا۔
”بیٹا! ذرا آگے جاؤ گے تو ایک چھوٹی سی سڑک نکلے گی۔ وہ سڑک ہماری حویلی کو ہی جاتی ہے۔“
جیسے جیسے وہ کہتی گئی میں اسے سہارا دے کر چلاتا رہا۔ چھ سات قدموں کے بعد واقعی ایک چھوٹی سی سڑک نیچے اترتی تھی اور اندھیرے میں حویلی کی طرف جاتی لگتی تھی۔ جاگیردارنی نے مجھے اسی راستے پر چلنے کے لیے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ پہلے وہ پاؤں کو بالکل زمین پر نہیں رکھی تھی مگر حویلی والی سڑک پر آ کر اس نے پاؤں زمین پر ٹکا کر چلنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔
”زیادہ تکلیف تو نہیں ہو رہی؟“
وہ بولی۔
”نہیں بیٹا! تمہارے سہارا دینے سے تو مجھے بڑا آرام ملا ہے۔ اب میں پاؤں تھوڑا دبا کر چل رہی ہوں۔“
جب ہم پرانی عمارت کے قریب پہنچے جو رات کے اندھیرے میں عجیب ڈراؤنی اور ہیبت ناک لگ رہی تھی تو مجھے روشنی ٹمٹماتی نظر آئی۔ یہ روشنی حویلی کے دروازے کے اوپر لگے ہوئے کسی بلب یا لیمپ سے آ رہی تھی۔ لیمپ کے اوپر شیڈ لگا ہوا تھا شاید' کیونکہ روشنی صرف بلب کے نیچے ہی پڑ رہی تھی۔ جاگیردارنی قنوج کماری نے مجھ سے بڑی شفقت بھری باتیں شروع کر دی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔
”میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ وہ گاؤں چھوڑ کر امریکہ چلا گیا ہے۔ دو سال سے وہیں پر ہے۔ بھگوان کی بڑی کرپا ہے کہ بہو اور اس کے بچے میرے پاس ہیں' میرا جی لگا رہتا ہے۔“
میں نے کہا۔

"بہن جی! آپ کی اردو اس علاقے کی نہیں لگتی۔"

"بیٹا میں پیدا تو اسی صوبے میں ہوئی تھی۔ ہمارے باپ دادا یہیں کے رہنے والے تھے۔ مگر میں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ایک سال آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی لگایا تھا۔ مگر بیٹا یہ جوانی کے دنوں کی باتیں ہیں۔ اب تو میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔"

ہم حویلی کے دروازے پر پہنچ گئے۔ میں نے کہا۔

"بہن جی! میرا خیال ہے اب آپ خود اندر جا سکتی ہیں' مجھے اجازت دیں۔"

جاگیردارنی تو میری منتیں کرنے لگ گئی کہ بیٹا میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گی۔ تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اندر چل کر میرے ہاتھ سے پرشاو کا لڈو اور میری بہو کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پی کر میری آتما کو شانتی دو۔

"اگر تم یہیں سے واپس چلے گئے تو میں وشنو بھگوان کو پوجا کے وقت کیا منہ دکھاؤں گی! بیٹا تم میرے لیے اس وقت وشنو بھگوان کا روپ ہو۔"

بوڑھی جاگیردارنی تو آنسو بہانے لگی۔ میں نے کہا۔

"بہن جی! آپ دکھی نہ ہوں۔ اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو میں آپ کو اندر تک چھوڑ آتا ہوں مگر میں کھاؤں پیئوں گا کچھ نہیں۔"

جاگیردارنی خوش ہو کر بولی۔

"بھگوان تمہارا بھلا کرے بیٹا۔ تم نے میرا دل رکھ لیا۔ آ جاؤ' آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ۔"

میں نے بھی سوچا کہ آگے دریا ہے۔ کچھ پتہ نہیں کہ یہ علاقہ آگے کس طرف جا نکلتا ہے۔ اس عورت سے کم از کم آگے کے علاقے کے بارے میں کافی معلومات مل جائیں گی۔ ممکن ہے یہ مجھے اپنا کوئی گھوڑا ہی دے دے۔ میں نے اس کے آگے اپنے بارے میں اور رات کے وقت اس طرف سفر کرنے کی وجہ بیان کرنی تھی۔ اس کی ایک جھوٹی کہانی میں نے دماغ میں سوچ لی تھی۔

حویلی کی ڈیوڑھی میں کوئی چوکیدار وغیرہ نہیں تھا۔ ڈیوڑھی کے آگے ایک کشادہ

صحن تھا جہاں رات کے وقت الو بول رہے تھے۔ میں نے اوپر عمارت کی صحن کی جانب کھلنے والی کھڑکیوں پر نگاہ ڈالی' وہاں بھی کوئی روشنی نہیں تھی۔ جاگیردارنی میرا سہارا لیے صحن میں چل رہی تھی۔ سامنے برآمدہ تھا۔ برآمدے کے پیچھے ایک اور برآمدہ تھا۔ یہاں بھی گھپ اندھیرا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ عجیب حویلی ہے کہ جہاں کسی طرف سے نہ کوئی آواز آ رہی ہے' نہ کہیں کوئی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ برآمدے کے آخر میں بائیں جانب ایک دروازے کے پاس جا کر بوڑھی جاگیردارنی رک گئی۔ کہنے لگی۔

"بیٹا! دروازے کو ذرا دھکیلو۔ اندر سے چٹخنی نہیں لگی ہوئی۔ مجھے معلوم ہے' یہ میرا ڈرائینگ روم ہے۔ جب میں باہر کہیں جاتی ہوں تو رات کو میری بہو دروازے کی چٹخنی نہیں لگاتی کہ میں نہ جانے کس وقت آ جاؤں اور کسی کو جگانا نہ پڑے۔"

میں نے ایک ہاتھ سے دروازے کو تھوڑا سا دھکیلا' دروازہ کھل گیا۔ اندر بھی گھپ اندھیرا تھا۔ اندر سے ایسی ناگوار بو آنے لگی جیسے اندر الوؤں اور چمگادڑوں نے بسیرا کر رکھا ہو۔ جاگیردارنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو میں بتی جلاتی ہوں۔"

اس نے میرا سہارا لیے لیے ہاتھ بڑھا کر دیوار میں لگا ہوا سوئچ دبا دیا۔ میرا خیال تھا بٹن دبانے سے کمرہ روشن ہو جائے گا۔ مگر ایک بڑا کمزور سا بلب روشن ہو گیا جس کی پھیکی پر اسرار روشنی میں مجھے دیواروں پر لٹکے ہوئے لمبے لمبے سرخ پردے اور درمیان میں لگا ہوا بھاری صوفہ دکھائی دیا۔ صوفے پر بھی سرخ کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ کمرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے یہ بات بڑی عجیب اور ڈراؤنی سی لگی۔ جاگیردارنی میرے سہارے آگے چل کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں بھی اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ کرم داد یہاں سے جتنی جلدی نکل سکتے ہو نکل جاؤ۔ مگر اس عورت سے یہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا کہ دریا پر آگے کوئی پل ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ علاقہ آگے کاٹھیاواڑ کی طرف نکل جائے گا کیا؟ میں نے دماغ میں پیدا ہونے والے

تو ہمات کو نکال دیا اور جاگیردارنی سے پوچھا۔

"بہن جی! آگے دریا پر ایک پل ہوتا تھا' وہ کس طرف ہے؟"

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں اس طرف سے پہلے بھی گزرتا رہا ہوں۔ اپنے بارے میں میں نے اسے یہی بتایا کہ ہم کچھ دوست شکار کھیلنے نکلے تھے کہ میں ان سے بچھڑ کر راستہ بھول گیا۔ جاگیردارنی نے کہا۔

"وہ پل بہت آگے جا کر ہے بیٹا۔ مگر فکر نہ کرو ہماری اپنی کشتی ہے۔ اپنا ملاح ہے۔ وہ اسی حویلی میں ہوتا ہے۔ میں اس کو تمہارے ساتھ کر دوں گی۔ وہ خود تمہیں دریا پار چھوڑ آئے گا۔ دریا پار ایک گاؤں ہے جہاں سے کاٹھیاواڑ کو لاریاں آتی جاتی ہیں۔ تم کاٹھیاواڑ چلے جانا کیونکہ دوارکا میں تو فوج نے کرفیو لگا دیا ہوا ہے۔ بھگوان جانے پاکستان بھارت کے جھگڑے کب ختم ہوں گے۔ اچھا تم بیٹھو میں بہو کو لے کر آتی ہوں۔ وہ تمہارے لیے چائے بھی لائے گی۔ بھگوان کے لیے چلے نہ جانا۔"

اس بوڑھی عورت کے شفقت بھرے رویے نے میرے دل سے مزید توہمات کو ختم کر دیا۔ اور پھر مجھے یہ لالچ بھی تھا کہ میں اس کی کشتی میں دریا پار کر سکوں گا۔ وہ صوفے کا سہارا لے کر کمرے سے نکل گئی۔ کمرے کی ہر شے سرخ دیکھ کر میں نے یہی خیال کیا کہ یہ پرانے زمانے کے وضع دار جاگیردار لوگ ہیں۔ ان کے ہاں اس زمانے کے صوفے اور پردے پڑے ہیں' جب زمیندار وغیرہ بڑے شوق سے سرخ رنگ کے پردے حویلیوں میں لٹکایا کرتے تھے۔ کچھ دیر اندر بیٹھے رہنے کی وجہ سے اب مجھے فضا میں پھیلی ہوئی منحوس سی ناگوار بو محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

مجھے ایسے لگا جیسے جاگیردارنی نے باہر نکلنے کے بعد دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی ہے۔ میں ذرا چونکا۔ میں نے اٹھ کر دروازے کو ذرا دھکیلا۔ واقعی دروازے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے وسوسے میرے دل میں پیدا ہونے لگے کہ اس عورت نے باہر سے کنڈی کیوں لگائی ہے۔ پھر میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ بے چاری وہم پرست عورت ہے اور وشنو کی پجارن ہے' وہ نہیں چاہتی

کہ میرے احسان کا بدلہ چکائے بغیر مجھے وہاں سے جانے دے۔ اس نے کہا بھی تھا کہ اگر میں نے اس کی چائے وغیرہ قبول نہ کی تو اس کا وشنو بھگوان اس سے ناراض ہو جائے گا۔ میں واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں صوفے پر واپس آ کر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے کی کنڈی باہر سے کھلی اور جاگیردارنی چاندی کی مٹھ والی چھڑی کے سہارے چلتی اندر آ گئی۔ آتے ہی بولی۔

"شما کرنا بیٹے۔ تم ضرور سوچتے ہو گے کہ میں نے باہر سے کنڈی کیوں لگا دی تھی۔ بیٹا! میں بڑے پرانے خیال کی عورت ہوں۔ میرا یہ اعتقاد ہے کہ مجھ پر اگر کوئی احسان کرتا ہے اور میں اسے بھگوان وشنو کے نام کے لڈو اور چائے نہیں پیش کرتی تو بھگوان وشنو مجھ سے ناراض ہو جائیں گے اور میرا اگلا جنم جانوروں میں ہو گا۔ اس واسطے میں باہر سے کنڈی لگا گئی تھی کہ تم کہیں چلے نہ جاؤ۔"

وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں بہن جی! اب میں آپ کے ساتھ حویلی میں آ ہی گیا ہوں تو چائے پی کر ہی جاؤں گا۔ لیکن مجھ پر ایک کرپا ضرور کرنی ہو گی آپ کو۔"

"تم حکم کرو بیٹا۔" جاگیردارنی نے بڑے شوق کے ساتھ کہا۔

میں نے کہا۔

"بس اپنے ملاح کو جگا کر کہہ دیں کہ کشتی نکال لے اور مجھے دریا پار کرا دے۔"

جاگیردارنی نے بڑی شفقت سے کہا۔

"بیٹا! میں نے ملاح سرجن کو جگا بھی دیا ہے۔ وہ دریا پر کشتی نکالنے چلا بھی گیا ہے۔ بس تم ایک پیالی چائے پی کر میرے نوکر کے ساتھ دریا پر چلے جانا۔ وہ تمہیں خود کشتی میں سوار کروا کر آئے گا۔ یہ تو میرے بڑے سوبھاگ ہیں کہ میں تمہارے کسی کام آ سکوں گی۔"

پھر وہ خود ہی کہنے لگی۔

"بیٹا تم ضرور سوچ رہے ہو گے کہ اس کمرے کی ہر شے سرخ کیوں ہے۔ اصل

میں میں نے یہ سب کچھ اپنی بہو کا شوق پورا کرنے کے لیے کیا ہے۔ اسے سرخ رنگ بڑا پسند ہے۔ اب میں بھی اس رنگ کو پسند کرنے لگی ہوں۔ کیا کروں مجھے اپنی بہو سے بڑی محبت ہے۔"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"آپ کی بہو تو اس وقت سو رہی ہوگی۔ اسے تکلیف نہ ہی دیتیں تو اچھا تھا۔"

"بیٹا! کیا کروں میری بہو کو جو دوسری چیز اچھی لگتی ہے وہ صرف رات کو دیر تک سونا ہے۔ نیند کی تو وہ دیوانی ہے۔ میں نے اسے جگایا بھی مگر وہ اٹھی ہی نہیں۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر میں چلتا ہوں۔ نوکر سے کہیں کہ مجھے دریا تک لے جائے۔"

جاگیردارنی نے میرے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! کچھ کھائے پیئے بغیر تو میں تمہیں کبھی نہیں جانے دوں گی۔ کم از کم ایک پیالی چائے تو تمہیں ضرور پینی ہوگی۔ تمہارے چائے پینے سے میرا جنم سپھل ہو جائے گا۔"

وہ یہ کہہ رہی تھی کہ دروازے میں ایک عورت نمودار ہوئی جس نے ہاتھوں میں چاندی کا طشت تھام رکھا تھا۔ اس نے سیاہ بالوں کا جوڑا بنایا ہوا تھا۔ جس میں گیندے کے پھول سجے ہوئے تھے۔ ساڑھی اس طرح پہنی تھی کہ اس کا ایک بازو شانے تک ننگا تھا۔ رنگ سانولا تھا جو کمرے کی سرخی مائل فضا میں تانبے کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ صحت مند، جوان اور خوش شکل عورت تھی۔ وہ مجھے کسی ہندو مندر کی رقاصہ لگی جو رقص کرتے کرتے ہمارے لیے چائے لے کر آ گئی ہو۔ جاگیردارنی نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ وشالی ہے۔ یہ میرا بہت خیال رکھتی ہے اور چائے بڑی عمدہ بناتی ہے۔"

وشالی نے چائے کا طشت میرے آگے میز پر رکھتے ہوئے گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں اس کی نظریں مجھے کچھ کہہ رہی تھیں جو میں نہ سمجھ سکا۔ وشالی

صوفے کے درمیان والی نیچی میز کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور چائے پیالیوں میں ڈالنے لگی۔ یہ عورت وشالی اپنے ساتھ ایک عجیب پر اسرار اور گہری خوشبو لائی تھی جو اس آسیبی کمرے میں پھیلی ہوئی ناگوار بو میں مجھے بڑی خوشگوار لگی۔ جاگیردارنی اسے چائے بناتے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ایک تھالی میں لڈو بھی پڑے تھے۔ جاگیردارنی نے کہا۔

"بیٹا! یہ لڈو وشنو بھگوان کے مندر کا پرشاد ہے۔ اسے ضرور چکھو۔"

میں نے کہا۔

"نہیں بہن جی! میں صرف چائے پیوں گا۔"

وشالی نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔ جب میں چائے کی پیالی پکڑنے لگا تو وشالی نے ایک بار پھر مجھے گہری معنی خیز نظروں سے دیکھا اور اپنے سر کو نفی کے انداز میں اس طرح ہلایا جیسے کہہ رہی ہو چائے مت پینا۔ مگر میں نے اس کے اشارے کو زیادہ اہمیت اس لیے نہ دی کہ جو کچھ میرے ساتھ وہاں ہونے والا تھا اس کا مجھے وہم و گمان تک نہیں تھا۔ جاگیردارنی میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"چائے پی کر بتاؤ بیٹا کہ چائے کیسی ہے؟"

میں نے چائے کا ایک گھونٹ پیا۔ چائے میں الائچی کی خوشبو بھی تھی۔ چائے واقعی بڑی مزے دار تھی۔ میں نے کہا۔

"بہت اچھی چائے ہے بہن جی۔"

عورت وشالی میز کے قریب ہی گھٹنوں کے بل ادب سے بیٹھی تھی۔ جاگیردارنی نے اس سے کہا۔

"وشالی! اب تم جاؤ۔ تمہارا اب کوئی کام نہیں ہے۔"

وشالی نے اٹھتے ہوئے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا اور پھر کمرے سے نکل گئی۔ اب کمرے میں میں اور جاگیردارنی رہ گئے تھے۔ مجھے جانے کی جلدی تھی۔ میں نے چائے کے مزید دو ایک گھونٹ پیئے اور پیالی میز پر رکھتے ہوئے

کہا۔

"بہن جی اب اجازت دیں۔ میں چلتا ہوں۔ مجھے جلدی دریا پار کر جانا ہے۔"
جاگیردارنی نے کہا۔

"بیٹا! یہ چائے تو ختم کر لو۔ یہ وشنو بھگوان کے نام کی ہے۔ بچی ہوئی رہ گئی تو بدشگونی ہو گی۔ جانے کی تم فکر نہ کرو۔ میرا آدمی گھاٹ پر کشتی لیے موجود ہو گا۔"

میں نے جلدی جلدی پیالی میں بچی ہوئی چائے حلق میں انڈیلی اور جاگیردارنی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اٹھنے لگا تو مجھے چکر سا آ گیا۔ میں نے ہاتھ سے اپنے ماتھے کو سہلایا۔ دوبارہ اٹھنے لگا تو پہلے سے زیادہ شدید چکر محسوس ہوا اور میری آنکھوں کے آگے کمرے کی چیزیں دائرے میں گردش کرنے لگیں۔ جاگیردارنی نے اپنا چہرہ میرے قریب کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے بیٹے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

میں نے جاگیردارنی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی مجھے گھومتا نظر آیا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں کب تک صوفے پر بے ہوش پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو میں صوفے پر نہیں ہوں کسی سخت جگہ پر لیٹا ہوا ہوں۔ میری آنکھیں کھلی تھیں۔ چکر ختم ہو گئے تھے۔ چھت کے ساتھ ایک بلب روشن تھا۔ میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے چاہے تو مجھ پر اس بھیانک حقیقت کا احساس ہوا کہ میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں۔ میں نے گھبرا کر سر اٹھا کر دیکھا۔ میں لوہے کے ایک سٹریچر پر لیٹا تھا۔ میرے دونوں بازو' کلائیاں اور دونوں ٹانگیں اور پاؤں چمڑے کے تسموں سے سٹریچر کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔

میں تو حیران پریشان رہ گیا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ یہ جاگیردارنی تو بڑی خطرناک عورت نکلی۔ اس نے مجھے بے ہوش کر دینے والی چائے پلائی اور پھر سٹریچر پر باندھ دیا۔ اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟ ظاہر ہے جاگیردارنی کے ارادے نیک نہیں تھے۔ میں نے بلند آواز سے وشالی کو آواز دی۔ کئی بار وشالی کو پکارا۔ ہر بار کمرے میں میری

آواز کی بازگشت گونج کر رہ گئی۔ یہ چھوٹا سا نیم روشن کمرہ تھا۔ دیوار کے ساتھ اسی منحوس سرخ رنگ کا صوفہ پڑا تھا۔ دیواروں پر سرخ پردے لٹکے ہوئے تھے۔ یا اللہ خیر! میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی اور میرے ذہن میں پریشان کر دینے والے خیالات آنے لگے۔ یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ عورت انڈین آرمی انٹیلی جینس کی عورت تو نہیں ہے۔ اس کو پتہ چل گیا ہو کہ میں کمانڈو ہوں اور اس نے مجھے آرمی کے حوالے کرنے کے لیے بے ہوش کر کے سٹریچر پر جکڑ دیا ہو۔ اس خطرے کا مجھے زیادہ امکان محسوس ہوا۔ اس کا مطب تھا کہ کچھ دیر بعد حویلی میں بھارتی فوجی آئیں گے اور مجھے پکڑ کر لے جائیں گے۔

میں نے دو تین بار اپنی کلائیوں کو تسموں میں سے نکالنے کی کوشش کی مگر تسمے چمڑے کے تھے اور اس بری طرح سے انہوں نے میرے بازوؤں' کلائیوں اور ٹانگوں اور ٹخنوں کو جکڑ رکھا تھا کہ میں صرف اپنے ہاتھوں کی انگلیوں اور پاؤں کے پنجوں کو ہی ہلا سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ دن کا وقت ہے یا رات کا وقت ہے۔ کمرے میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی روشندان تھا۔ سامنے ایک چھوٹا سا پرانی طرز کا دروازہ تھا جو بند تھا۔ باہر سے کسی قسم کی کوئی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ ہر طرف موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں دل ہی دل میں اللہ پاک سے دعا مانگنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے باہر سے آدمیوں کے بولنے اور ہلکے ہلکے قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں دور سے آ رہی تھیں۔ پھر یہ آوازیں قریب سے ہوتے ہوئے آگے نکل گئیں۔ اس کے بعد پھر آدمیوں کے بولنے اور قہقہے لگا کر باتیں کرنے کی آوازیں آئیں اور یہ آوازیں بھی کمرے کے قریب سے ہو کر آگے نکل گئیں۔ ان میں عورتوں کی آوازیں بھی تھیں۔ لگتا تھا کہ کمرے کے باہر کوئی راہ داری ہے جہاں سے لوگوں کی ٹولیاں گزر رہی ہیں۔ چار پانچ ٹولیاں گزر گئیں تو میں سوچنے لگا کہ یہ لوگ کدھر سے آ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ پہلی دفعہ آدمیوں کی آوازیں آئیں

تو میں یہی سمجھا کہ بھارتی سپاہی مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔ لیکن جب آدمیوں اور عورتوں کے ہلکے ہلکے قہقہے بھی سنائی دیے تو معلوم ہوا کہ یہ فوجی نہیں ہیں۔ اس کے بعد وہی موت ایسی خاموشی طاری ہوگئی۔ میں نے خدا سے یہ دعا بھی مانگی کہ یا اللہ پاک مجھ پر دورہ ہی پڑ جائے اور میں انسان سے سانپ بن جاؤں۔ کم از کم میں سانپ کے روپ میں آکر وہاں سے بھاگ تو سکتا تھا۔ لیکن میری یہ دعا بھی قبول نہ ہوئی۔

وقت اس طرح گزر رہا تھا جس طرح بہت زیادہ زخمی سانپ رینگنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جن لوگوں کی آوازیں کچھ دیر پہلے آئی تھیں وہ آگے جا کر کسی اندھے کنوئیں میں گر گئے ہیں۔ ایک سناٹا تھا جس میں اس منحوس کمرے کے در و دیوار سنسنا رہے تھے۔ پھر اچانک کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں بند دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ دو آدمی لگ رہے تھے۔ وہ دروازے کے پاس آکر رک گئے تھے۔ اس کے بعد تالا کھلنے کی آواز آئی۔ مجھے اس آسیبی کوٹھڑی میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا گیا تھا۔ دروازہ کھلا اور میں یہ دیکھ کر حیران سا رہ گیا کہ دو کالے سیاہ حبشی اندر آ گئے ہیں۔ وہ بالکل افریقہ کے حبشی تھے۔ سر کے بال چھلے دار تھے۔ جیسے افریقہ کے حبشیوں کے ہوتے ہیں۔ کندھوں پر انہوں نے سٹین گنیں لٹکا رکھی تھیں۔ اوپر کے دھڑ ننگے تھے۔ کمر کے نیچے سرخ رنگ کی ساٹن کی شلواریں پہنی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے الف لیلیٰ کے زمانے کے حبشی لگ رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس آسیبی حویلی میں یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ دونوں حبشیوں نے اندر آتے ہی سٹریچر کو پکڑا اور اسے کمرے سے باہر لے جانے لگے۔ میں نے غصیلی آواز میں کہا۔

"تم کون ہو؟ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

حبشیوں پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا۔ جیسے وہ میری زبان ہی نہیں سمجھ رہے تھے۔ وہ میرا سٹریچر چلاتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے۔ باہر ایک نیم روشن راہ داری تھی۔ میں نے چیخ کر کہا۔

"میں فوج کا کرنل ہوں۔ میں تم سب کو کوارٹر گارڈ میں بند کر دوں گا۔"

حبشی بڑے سکون کے ساتھ سٹریچر کو راہ داری میں لیے جا رہے تھے۔ راہ داری ادھر ادھر سے گھوم کر آگے بڑھی تو مجھے انسانوں کی ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کسی بڑے کمرے میں بہت سے لوگ بیٹھے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہوں۔ یقیناً" یہ وہی لوگ تھے جن کی ٹولیاں کمرے کے باہر سے گزری تھیں۔ یہ آوازیں آہستہ آہستہ قریب ہو رہی تھیں۔ پھر ایک اونچا دروازہ آ گیا۔ دروازے کے باہر بھی دو سیاہ فام حبشی برین گنیں لیے کھڑے تھے۔ انہوں نے سٹریچر کو دیکھتے ہی دروازے کا ایک کیواڑ کھول دیا۔ کیواڑ کے کھلتے ہی انسانوں کی آواز صاف سنائی دینے لگیں اور اندر سے روشنی بھی باہر آنے لگی۔ یا خدا! یہ کیا تماشہ ہے! جیسے ہی حبشی میرا سٹریچر لے کر دروازے میں داخل ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک ہال کمرہ ہے۔ میری دائیں جانب ہال کمرے میں اوپر سے نیچے تک لال رنگ کے صوفے بچھے ہوئے ہیں۔ صوفوں پر رنگ برنگ لباسوں میں عورتیں اور مرد بیٹھے ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ سامنے ایک سٹیج بنی ہوئی ہے۔ میرا سٹریچر اسی سٹیج پر لایا گیا تھا۔ حبشی میرے سٹریچر کو سٹیج کی ایک طرف دیوار پر گرے ہوئے سرخ پردے کے پاس لے گئے اور اسے میرے سر کی جانب سے ذرا سا اوپر اٹھا کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ شاید یہ اس لیے کیا گیا تھا کہ میں ہال کمرے اور سٹیج کا منظر دیکھ سکوں۔

میں نے بلند آواز میں چیخ کر کہا۔

"تم لوگ کون ہو؟ مجھے کس لیے جکڑا ہوا ہے؟"

میرے بار بار شور مچانے پر پردے کے پیچھے سے ایک سفید لمبے کوٹ والا ڈاکٹر نما آدمی نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ٹیکہ لگانے والی سرنج تھی۔ میرے قریب آ کر اس نے بغیر کچھ کہے سنے میری گردن میں انجکشن لگا دیا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔

"ڈاکٹر! یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

اس کے بعد میرے گلے کی رگیں جیسے خشک ہو گئیں۔ میں نے بولنا چاہا تو میری آواز نہیں نکلتی تھی۔ ان لوگوں نے میری آواز بند کرنے کے لیے کوئی خاص ٹیکہ لگا دیا

تھا۔ اب میں صرف دیکھ سکتا تھا، سن سکتا تھا، بول نہیں سکتا تھا۔ میں بے بسی کے عالم میں سٹریچر پر جکڑا ہال میں بیٹھے ہوئے رنگ برنگ کپڑوں والی عورتوں اور مردوں کو دیکھتا اور کبھی سٹیج کو دیکھتا جہاں چار پانچ حبشیوں نے پتھر کی ایک لمبوتری میز لا کر بچھا دی تھی۔ میں یہ دیکھ کر مزید حیران ہوا کہ اس میز کی دونوں جانب چمڑے کے چوڑے تسمے لٹک رہے تھے۔ جیسے اس میز پر کسی کو لٹا کر باندھا جانے والا ہو۔ حبشی میز بچھا کر چلے گئے۔

ہال کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ لوگوں نے ایک دوسرے سے باتیں کرنی بند کر دیں۔ کچھ ہونے والا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اگلے صوفوں پر سرخ اور کاسنی رنگ کی ساڑھیوں میں ملبوس زیادہ تر بوڑھی عورتیں بیٹھی تھیں۔ ہال میں کافی روشنی تھی۔ اتنے میں سٹیج پر ایک جانب سے پردہ ہٹا اور وہی منحوس جاگیردارنی نمودار ہوئی جس نے مجھے عیاری سے حویلی میں لے جا کر بے ہوش کر دینے والی چائے پلائی تھی۔ میں نے چیخ کر اس کو گالیاں دینی چاہیں مگر میری آواز نہیں نکل رہی تھی۔ جاگیردارنی بڑی شاندار سرخ ریشمی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ سفید بالوں کا جوڑا بنا کر اس نے جوڑے میں سرخ پھول سجائے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والی لمبی چھڑی تھی۔ اس نے میرے سٹریچر کی طرف ایک لمحے کے لیے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سٹیج پر نمودار ہوتے ہی ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ جاگیردارنی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ جب ہال میں سناٹا طاری ہو گیا تو جاگیردارنی نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بجنو! مترو! میرے دوستو! ہماری کلا سوترا کلب کے ممبرو! اور عشق و محبت کے دیوتا کام دیوتا کے پجاریو! یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے۔ بڑے سوبھاگ ہیں کہ آج کی رات ہم ایک بار پھر عشق و محبت کے دیوتا کے آگے عورت مرد کے اصل پیار کا تحفہ پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ آپ لوگوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس دفعہ بھی ہم پریم دیوتا کے چرنوں میں دو بار پریم کا تحفہ پیش کریں گے۔ عورت مرد کے پیار کی

یہ سبھا جو آج جمی ہے کل رات کو بھی جمے گی۔"

اس پر سارا ہال تالیوں اور لوگوں کے خوشی کے نعروں سے گونج اٹھا۔ جب لوگ خاموش ہو گئے تو جاگیر دارنی نے کہا۔

"اس کے ساتھ ہی میں کاما سوترا کی کاروائی شروع کرنے کا اعلان کرتی ہوں۔ سب سے پہلے ہماری سبھا کی پرانی رسم کے مطابق سب ممبروں کی خدمت میں سوم رس پیش کیا جائے گا اور سوم رس انگلینڈ سے خاص طور پر منگوائی گئی سکاچ وسکی یعنی اعلیٰ ترین شراب کی شکل میں آپ کو پیش کیا جائے گا۔"

سارا ہال نعروں' سیٹیوں اور تالیوں سے ایک بار پھر گونج اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ اگلی قطار کے صوفوں پر بیٹھی ہوئی بوڑھی عورتیں زیادہ جوش و خروش سے تالیاں بجا رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کاما سوترا سبھا کس قسم کی ہیں اور یہ لوگ یہاں کس انداز میں عشق و محبت کا ڈرامہ کھیلنے والے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ میں یہی سمجھ سکا کہ یہاں کھلے بندوں عورت مرد کے پیار محبت کے منظر دکھائے جائیں گے۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں دل میں ان شیطان صفت لوگوں کو گالیاں دے رہا تھا جو عورت مرد کے جنسی مناظر کو اس طرح کھلے بندوں دکھانے والے تھے۔ جس قسم کا بھیانک کھیل وہاں کھیلا جانے والا تھا اس کا مجھے بالکل علم نہیں تھا بلکہ میں اس کے متعلق تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جاگیر دارنی نے جیسے ہی اپنی تقریر ختم کی۔ ہال کے مختلف دروازوں میں سے نیم عریاں لڑکیاں شراب کی بوتلوں سے بھرے ہوئے ٹرے لے کر ہال میں داخل ہو گئیں اور حاضرین کو شیشے کے گلاسوں میں شراب ڈال ڈال کر دینے لگیں۔ لوگ بڑے مزے سے شراب کی چسکیاں لگانے اور ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگے۔ اگلی قطار میں بیٹھی ہوئی بوڑھی عورتیں بھی خوب مزے لے لے کر شراب کی چسکیاں لگا رہی تھیں۔ میں یہ سارا شیطانی منظر ساکت نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

جاگیر دارنی بھی سٹیج سے اتر کر اگلی قطار والی عورتوں کے پاس جا کر بیٹھ گئی تھی۔

اس کے ہاتھ میں بھی شراب سے بھرا ہوا گلاس تھا اور وہ چسکیاں لگا رہی تھی۔ اس دوران دو کالے حبشیوں نے سٹیج کے درمیان میں بچھی ہوئی سنگ مرمر کی لمبوتری میز کی ایک طرف چھوٹی میز لا کر رکھ دی تھی۔ حبشی سٹیج کی ایک طرف سٹین گنیں لے کر کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں ایک سفید کوٹ والا آدمی آیا جس نے مجھے انجکشن دیا تھا اور میری آواز بند ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سفید ٹرے تھا۔ ٹرے میں آپریشن کرنے والی چھریاں چاقو دیکھ کر میرا دل ایک دم زور سے دھڑکا۔ کہیں یہ لوگ مجھے اذیتیں دے دے کر ہلاک تو نہیں کرنے لگے؟ میں تو اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ خوف سے میرے ہونٹ خشک ہو گئے۔ وہ آدمی چھریوں' چاقوؤں والا ٹرے چھوٹی میز پر رکھ کر چلا گیا۔ ہال کی روشنیاں تھوڑی مدھم کر دی گئیں۔ ہال کمرے میں سنسکرت کے اشلوک پڑھنے کا میوزک بلند ہوا۔ عورتیں اور مرد اس کے ساتھ ساتھ گانے لگے۔ جاگیردارنی بھی جھوم جھوم کر گا رہی تھی۔ پھر میوزک ایک دم تھم گیا۔ سٹیج پر روشنی زیادہ کر دی گئی۔ جاگیردارنی نے کھڑے ہو کر اعلان کیا۔

"کالا سوتر سبھا کے بھگتو! دیوتا کی پوجا شروع ہوتی ہے۔"

سپیکروں پر گھنگھروؤں کی چھن چھن سے سارا ہال گونج اٹھا۔ اچانک ایک جانب سے پردہ ہٹا اور ایک عورت نیم عریاں لباس میں گھنگھرو چھنکاتی رقص کرتی سٹیج پر نمودار ہو گئی۔ اس نے سٹیج کے کنارے پر جا کر ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو جھک کر پرنام کیا اور سٹیج کے وسط میں آ کر رقص شروع کر دیا۔ سٹیج پر کافی روشنی تھی۔ میں نے اس رقاصہ کو فوراً پہچان لیا۔ یہ وشالی تھی۔ وہی عورت جس نے مجھے جاگیردارنی کے دیوان خانے میں چائے لا کر دی تھی اور دو تین بار اشاروں کے ساتھ چائے پینے سے منع کیا تھا وشالی کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھے چائے پینے سے کیوں منع کیا تھا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ اگر میں اس وقت اس کی ہدایت پر عمل کرتا اور چائے نہ پیتا تو اس عذاب سے بچ سکتا تھا جس میں میں اب پھنس چکا تھا۔ وشالی رقص کرتے کرتے میرے قریب سے بھی گزری۔ میرے سٹریچر کے قریب سے گزرتے ہوئے اس

نے اپنی چال اور مدھم کرلی۔ میری طرف دیکھ کر ایک بار آنکھیں بند کرلیں۔ دوبارہ آنکھیں کھولیں اور سر کو ذرا سی جنبش دے کر آگے نکل گئی۔ ایسا اس نے کئی بار کیا۔ ہر بار وہ رقص کرتی ہوئی میرے قریب آکر رک سی جاتی۔ آنکھیں تین چار بار جھپکتی اور آگے نکل جاتی۔ شاید وہ اس وقت بھی مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر میں سمجھ نہیں رہا تھا۔ میں سمجھ سکتا ہی نہیں تھا۔ میرے ذہن کی حالت بے حد الٹ پلٹ ہوچکی تھی۔ وحشت کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ یہ ساری تیاریاں مجھے ہلاک کرنے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ کسی نے بلند آواز میں کہا۔

"کلا سوترا شروع کیا جائے۔"

جاگیردارنی نے یہ سنتے ہی اپنا چھڑی والا ہاتھ اونچا اٹھا کر اعلان کیا۔

"کلا سوترا شروع کیا جاتا ہے۔"

یہ سنتے ہی وشالی رقص کرتی سٹیج سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد سٹیج کی دونوں جانب سے مرد اور عورتوں کے دو جوڑے نکل کر سامنے آ گئے۔ ایک مرد عورت ایک جانب سے ایک مرد اور عورت دوسری جانب سے آئے تھے۔ دونوں مرد گیروے رنگ کی سادھوؤں والے لباس میں تھے۔ عورتوں نے سرخ ریشمی ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کو دیکھ کر لوگ بے تحاشا تالیاں بجانے اور آواز نکالنے لگے۔ دونوں مرد عورت کے جوڑے سٹیج پر بچھی ہوئی لمبی میز کے اردگرد دائرے کی شکل میں رقص کر رہے تھے۔ ان چاروں کے پاؤں میں گھنگھرو تھے۔ مرد بھی عورتوں کی طرح ڈانس کر رہے تھے۔ ناچتے ناچتے کبھی وہ بالکل ایک دوسرے کے ساتھ لگ جاتے۔ مرد عورت کا اور عورت مرد کا ہاتھ تھام لیتی اور اسی طرح چکر لگا کر ناچنا شروع کر دیتے۔ ناچتے ناچتے عورتوں نے اپنا لباس اتارنا شروع کر دیا۔ مردوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد سٹیج کی روشنی ایک دم سرخ ہوگئی اور پھر سٹیج پر جو شیطانی ڈرامہ شروع ہوا۔ اس نے اخلاق و تہذیب کی دھجیاں بکھیر دیں۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور مجھے

خیال آیا کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے؟

ہال میں سے بھی کچھ عورتیں اور مرد سٹیج پر آ گئے اور وہ بھی سٹیج پر کھیلے جانے والے شیطانی کھیل میں شریک ہو گئے۔ یہ ڈرامہ دیر تک ہوتا رہا۔ پھر سب عورتیں اور مرد سٹیج پر سے چلے گئے۔ سٹیج کی روشنی تیز کر دی گئی۔ جاگیردارنی نے اعلان کیا۔

"کلا سوترا کے پجاریو! اب کلم دیوتا کے چرنوں میں خاص تحفہ بھینٹ کیا جاتا ہے۔"

ہال میں ایک دم موت ایسا سناٹا طاری ہو گیا۔ میں یہی سمجھا کہ اب میرے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ لیکن سٹیج کا پردہ اٹھا اور دو حبشی ایک آدمی کو اس حالت میں سٹیج پر لائے کہ حبشیوں نے اس کو بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ آدمی نیم جان تھا۔ اس سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ حبشی اسے گھسیٹ کر لا رہے تھے۔ اس کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ بدنصیب بالکل ننگا تھا۔ اس کے آتے ہی ہال ایک بار پھر تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ حبشیوں نے اس آدمی کو سنگ مرمر کی لمبی میز پر لٹا کر اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کو تسموں سے جکڑ دیا اور جلدی سے پیچھے ہٹ کر سٹیج سے اتر گئے۔ اب سٹیج پر صرف وہی ایک بدنصیب میز پر جکڑا ہوا رہ گیا تھا جس کے ساتھ نہ جانے کس قسم کا وحشیانہ سلوک ہونے والا تھا۔

جاگیردارنی نے چھڑی بلند کر کے ایک اشلوک پڑھا اور بلند آواز میں کہا۔

"کلم دیوتا کو ہماری بھینٹ سویکار ہو۔"

سارے ہال نے اونچی آواز میں کہا۔

"سویکار ہو! سویکار ہو!"

جاگیردارنی نے حکم دیا۔

"کلم دیوتا کی پوجا شروع ہو۔"

سٹیج کی روشنی ایک دم زیادہ تیز ہو گئی۔

ایک جانب سے وہی آدمی جس نے مجھے انجکشن لگایا تھا نمودار ہوا۔ مگر اب اس

نے سفید کی بجائے کالا کوٹ پہنا ہوا تھا اور سر پر سرخ رومال بندھا ہوا تھا۔ وہ اس میز کے سرہانے کی طرف آ کر کھڑا ہو گیا جس میں خوف زدہ بدنصیب انسان کو لٹا کر جکڑا ہوا تھا۔ اس آدمی کی دہشت کے مارے پوری آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ عجیب قسم کی خشک اور بیٹھی ہوئی آواز میں وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

"مجھ پر رحم کرو' مجھ پر رحم کر' مجھ پر رحم کرو۔"

لیکن شیطانی طوفان کے نقار خانے میں اس بے چارے کی آواز کوئی نہیں سن رہا تھا۔ سیاہ کپڑوں والے جلاد نے' میں اسے جلاد ہی کہوں گا' ٹرے میں سے ایک قینچی اٹھائی اور بدنصیب انسان کی طرف بڑھا۔ وہ میز کے عقب میں آ گیا تاکہ سامنے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ درندگی اور بربریت کا مظاہرہ دیکھ سکیں۔ اس نے قینچی سے اس آدمی کے سر کے بال تیزی سے کاٹنے شروع کر دیئے۔ جب وہ کافی بال کاٹ چکا تو قینچی میز پر رکھ دی اور ٹرے میں سے ایک نشتر اٹھایا اور بدنصیب انسان کے پیٹ کو ایک ہاتھ سے دبانے لگا۔

بدنصیب آدمی روتے ہوئے خشک آواز میں چلا رہا تھا۔

"مجھ پر رحم کرو' مجھ پر رحم کرو۔"

کالے کپڑوں والے جلاد نے میرے دیکھتے دیکھتے آدمی کے پیٹ میں نشتر زور سے گھونپ دیا۔ آدمی کی چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ ایسی تھی جیسے بکرے کو ذبح کرتے وقت اس کے حلق سے نکلتی ہے۔ اس چیخ کی آواز پر لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں اور نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ جاگیردارنی نے چھڑی والا ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"بچو! کام دیوتا کی بھینٹ پر شور نہ کرو۔"

آدمی کے پیٹ سے خون ابل ابل کر سٹیج پر گر رہا تھا۔ جلاد نے نشتر کو بدنصیب کے پیٹ میں ہی آدھا دھنسا ہوا رہنے دیا اور اٹھ کر ٹرے میں سے ایک لمبی اور تیز دھار والی چھری اٹھا لی۔ چھری کو لہرا لہرا کر لوگوں کو دکھایا۔ میز پر لیٹے دائیں بائیں شدت درد کے عالم میں سر مارتے اور بلبلاتے ہوئے بدنصیب آدمی کے پاؤں کی طرف

آ گیا اور اس کے پاؤں کی ٹخنوں کے قریب سے رگیں کاٹ ڈالیں۔ بدنصیب آدمی کے حلق سے ایک اور بھیانک چیخ بلند ہوئی اور خون کے فوارے نکلنے لگے۔ پھر اس کی رانوں پر سے چھری کی مدد سے گوشت کے لوتھڑے اتارنے جانے لگے۔ مجھے اس بدنصیب کی سفید ہڈیاں نظر آئیں تو دہشت کے مارے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی چیخوں سے ہال گونج رہا تھا۔ لوگ سنگ دلانہ محویت سے یہ خونیں منظر دیکھ رہے تھے۔

جلاد ڈاکٹر جب زندہ انسان کی دونوں ٹانگوں کا گوشت کھرچ کھرچ کر اتار چکا تو پھر اس کے پیٹ میں دھنسے ہوئے نشتر کو نکال کر ٹرے میں رکھ دیا اور چھری سے اس کے پیٹ کو اوپر سے نیچے تک کاٹ کر کھول دیا اور ساری انتڑیاں نکال کر سٹیج پر اچھال دیں اور "جے کام دیوتا کی" کا نعرہ لگایا۔ ہال میں سارے تماش بین نعرے لگانے لگے۔

"جے ہو کام دیوتا کی' جے ہو کام دیوتا کی۔"

خوف کے مارے میرا اپنا برا حال ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے بعد میری باری آنے والی ہے۔ سیاہ پوش جلاد نے اس کے بعد چاقو سے ایک ایک کر کے اس کی دونوں آنکھیں نکال دیں۔ اس وقت وہ بدنصیب شاید مر چکا تھا کیونکہ پھر اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔ موت نے آخر اسے اس بھیانک اذیت سے نجات دلا دی۔ جلاد نے مرے ہوئے آدمی کی گردن آری سے کاٹ کر الگ کر دی اور اس کے سر کو لوگوں کی طرف اچھال کر نعرہ لگایا۔

"جے بجرنگ بلی! جے بجرنگ بلی۔"

لوگ بدنصیب انسان کے سر کو ایک دوسرے کی طرف اچھالنے اور نعرے لگانے لگے۔ جاگیردارنی نے اس وقت اٹھ کر اعلان کیا۔

"کاما سوترا سبھا کے ممبرو! میں بڑی خوشی کے ساتھ یہ اعلان کرتی ہوں کہ کل اسی وقت اسی جگہ ایک بار پھر کام دیوتا کے چرنوں میں قربانی پیش کی جائے گی اور کل جس آدمی کو کام دیوتا پر قربان کیا جائے گا وہ آپ لوگوں کے سامنے سٹریچر پر موجود ہے۔"

جاگیردارنی نے چھڑی سے میری طرف اشارہ کیا۔ ہال میں سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔ "اس کو بھی آج ہی قربان کیا جائے۔"

جاگیردارنی نے کہا۔

"نہیں دوستو! یہ قربانی کل آدھی رات کے بعد ادا کی جائے گی۔ کل آپ سب لوگ آج ہی کی طرح یہاں پہنچ جائیں۔ اب قربانی کی رسم ختم ہوتی ہے۔ جے ہو کام دیوتا کی۔"

سب لوگوں نے جواب میں زور سے نعرہ لگایا۔

"جے ہو کام دیوتا کی۔"

میری جان بچ گئی تھی مگر صرف ایک رات کے لیے۔ یہ سن کر میری جان آدھی نکل گئی تھی کہ کل مجھے قربان کیا جائے گا۔ یعنی کل اسی طرح میری ٹانگوں کا گوشت بھی کرچا جانے والا تھا اور میری بھی آنکھیں نکالی جانے والی تھیں اور میرا سر بھی کاٹ کر لوگوں کی طرف اچھالا جانے والا تھا۔ کیا میرا یہی ہولناک انجام ہونا تھا؟ میں نے دل میں غور کیا۔ پھر جیسے کسی نے مجھے غیبی آواز میں کہا۔ نہیں کرم داو! تمہارا یہ انجام نہیں ہوگا' خدا تمہاری مدد کرے گا۔ لیکن خدا میری کس طرح مدد کرے گا۔ اس کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

دونوں حبشی میری طرف بڑھے۔ انہوں نے میرے سٹریچر کو سیدھا کیا اور اسے چلاتے ہوئے واپس اسی کمرے میں لے آئے جہاں پہلے میرا سٹریچر پڑا تھا۔ سٹریچر دیوار کے ساتھ لگا کر دونوں حبشی باہر نکل گئے۔ باہر سے مجھے تالا لگانے کی آواز آئی تو میرا دل ڈوب سا گیا۔ میرا حسرت ناک انجام میرے سامنے تھا۔ اب مجھے سوائے خدا کی ذات کے اور کوئی اس درندہ صفت' لذیت ناک موت سے نہیں بچا سکتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے کھانسی آنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میرا گلا جیسے کھل گیا۔ میں نے آواز نکالی تو میں بول سکتا تھا۔ انجکشن کا اثر ختم ہو چکا تھا۔ لیکن اب میرا بولنا' میرا سننا صرف اس رات اور اگلے دن تک ہی تھا۔ دوسرے روز رات کو مجھے جلاد کے

سپرد کیا جاتا تھا۔

میں سٹریچر پر جکڑا بے بسی کی حالت میں پڑا خدا کو یاد کر رہا تھا اور دعائیں مانگ رہا تھا کہ وہ مجھے اس عذاب سے بچا لے۔ کمرے کے اندر اور باہر ہولناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس خون سرد کر دینے والی آسیبی خاموشی میں مجھے کسی چیز کے چرچرانے کی ہلکی سی آواز آئی۔ میں نے سانس روک کر اس آواز پر کان لگا دیے۔ آواز رک گئی۔ دو تین سیکنڈ کے بعد پھر وہی آواز سنائی دی۔ شاید کوئی چوہا کسی کونے کھدرے میں ہڈی وغیرہ چچھوڑ رہا تھا۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے کوئی تختہ آہستہ سے ایک طرف کر دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں آہٹ اور لباس کی سرسراہٹ سنائی دی۔ یہ ساری آوازیں جدھر سٹریچر کا سر تھا اس طرف سے آ رہی تھیں۔ میں اس طرف دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اچانک کمرے کی نمدار فضا ایک خاص قسم کی گہری خوشبو سے بھر گئی۔ یہ خوشبو مجھے پہلی بار اس وقت محسوس ہوئی تھی جب جاگیردارنی کے دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے خادمہ وشالی نے جھک کر میرے ہاتھ میں چائے کی پیالی دی تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"وشالی! کیا یہ تم ہو؟"

کسی نے جلدی سے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ ان ہاتھوں سے حنا اور عطر کی تیز خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔"

"خاموش رہو۔"

"وہ میرے سامنے آ گئی۔ وہ وشالی ہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی میرے سٹریچر کے تسمے کھولنے شروع کر دیے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وشالی نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر ہاتھ سے مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ میں سٹریچر سے اتر آیا تھا۔ وشالی کمرے کے کونے میں بیٹھ گئی تھی۔ مگر وہ بیٹھی نہیں تھی، کونے میں ایک جگہ سے فرش کی چوکور سل اٹھی ہوئی تھی۔ وہاں نیچے کسی تہہ خانے کو زینہ جاتا تھا۔ وشالی زینے میں اتری ہوئی تھی اور اشارے سے کہہ رہی تھی کہ میرے پیچھے

آ جاؤ۔ وہ سیڑھیاں اتر گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے سیڑھیاں اتر گیا۔ وہ سیڑھیوں میں کھڑی تھی۔ سیڑھیوں میں اندھیرا تھا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"پتھر کی سل فرش میں واپس اپنی جگہ پر رکھ دو۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے سل کو آہستہ سے اٹھایا اور سیڑھیوں میں بیٹھ کر سل کو چوکور سوراخ کے اوپر جما کر رکھ دیا۔ وشالی نے کہا۔

"جلدی سے آؤ۔"

میں ٹٹولتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا۔ دس گیارہ سیڑھیاں تھیں۔ گھپ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ وشالی نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے کندھے پر رکھا اور آہستہ سے کہا۔

"خاموش رہنا۔"

اور وہ مجھے لے کر چلنے لگی۔ اسے راستے کی شناخت تھی۔ وہ بغیر رکے چل رہی تھی۔ ہم کچھ قدم چلنے کے بعد ایک طرف مڑ گئے۔ یہ کوئی سرنگ تھی کہ راہ داری تھی کہ غار تھا۔ خدا جانے کیا جگہ تھی۔ وہاں سیلن کی بو تھی اور سخت حبس تھا۔ وشالی اگرچہ قدم قدم چل رہی تھی مگر بغیر رکے چل رہی تھی۔ زمین نیچے ہوتی گئی۔ آگے نشیب تھا۔ پندرہ بیس قدم گہرائی میں اترنے کے بعد آگے پھر زمین کی چڑھائی آ گئی۔ اس کو عبور کیا تو زمین ہموار ہو گئی۔ اس دوران وہاں اس قدر گہری تاریکی تھی کہ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وشالی ایک جگہ پہنچ کر رک گئی۔ وہ بالکل میرے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ مجھے اس کے سانس چلنے کی آواز بڑی صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"کیا بات ہوئی ہے وشالی۔"

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ اس کے بعد میں نے کچھ نہ پوچھا۔ خاموش ہو گیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کچھ فاصلے پر کوئی جانور خرخر کر رہا ہے۔ تھوڑے توقف کے بعد یہ خرخر غراہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ پھر ہلکی سی گرج سنائی دی۔ میں نے

پہچان لیا۔ یہ شیر کی آواز تھی۔ تو کیا آگے کوئی شیر بیٹھا تھا' اس خیال نے مجھے مایوس کر دیا۔ اب ہمارا آگے جانا محال تھا۔ پیچھے بھی موت تھی' آگے بھی موت تھی۔ شیر کی گرج آہستہ آہستہ غراہٹ میں بدلتی گئی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ وشالی نے میرے کان میں کہا۔

"آ جاؤ' کوئی آواز نہ نکالنا۔ بس اسی طرح میرے ساتھ لگ کر قدم قدم چلتے چلو۔"

میں بالکل اس کے ساتھ لگ کر نابینا آدمی کی طرح چلنے لگا۔ یہ غار تھا یا جو کچھ بھی تھا وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مجھے ایسی بو آنے لگی جیسی بو چڑیا گھروں میں جانوروں خاص طور پر شیر کے پنجرے سے آیا کرتی ہے۔ یہ شیر کی بو تھی۔ ہم شیر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ وشالی مجھے اپنے ساتھ آگے چلاتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگ گئی تھی اور دیوار پر ہاتھ رکھ کر بڑی آہستگی اور احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ شیر کی بو تیز ہو گئی تھی۔ کچھ قدم اٹھانے کے بعد شیر کے ہانپنے کی آواز آنے لگی۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میں شیر کے پنجرے میں سے گزر رہا ہوں۔ شیر ایک بار پھر غرایا۔ میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ خوف سے ہاتھ سرد ہو گئے۔ وشالی ایک سیکنڈ کے لیے بھی رکی نہیں تھی۔ وہ اسی طرح دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ ایک بار پھر ڈھلان آ گئی۔ دس بارہ قدم چلنے کے بعد پھر زمین اونچی ہو گئی۔ جیسے ہی زمین اونچی ہوئی باہر کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہمارے جسموں کو چھو کر گزر گیا۔ وشالی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہم باہر نکل رہے ہیں کوئی بات نہ کرنا باہر پہرے دار ہو سکتے ہیں۔"

چلتے چلتے وشالی ٹھہر گئی۔ سرگوشی میں بولی۔

"تم اسی جگہ ٹھہرو' میں دیکھتی ہوں باہر کوئی پہرے دار تو نہیں۔"

مجھے اندھیرے میں دیوار کے ساتھ کھڑے کر کے وہ چلی گئی۔ میں بت بنا اندھیرے میں کھڑا رہا۔ باہر کی طرف سے تازہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے جن کی وجہ

سے حبس اور گرمی ختم ہو گئی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وشالی مجھے موت کے منہ سے نکال کر لے آئی ہے۔ یہ ایک معجزہ ہی ہو گیا تھا۔ ورنہ میرا بچنا ناممکن تھا۔ خدا نے مجھے بچا لیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وشالی کے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی' وہ آ گئی تھی۔ اس نے میرے منہ کے قریب اپنا منہ لا کر کہا۔

"باہر ایک پہرے دار بیٹھا ہے۔"

یہ ایک نئی مصیبت تھی۔ مگر یہ مصیبت میرے لیے اتنی مشکل نہیں تھی۔ میں نے وشالی سے کہا۔

"مجھے وہاں تک لے چلو۔ میں اس کو ایک سیکنڈ میں ٹھکانے لگاتا ہوں۔"

اس نے آہستہ سے کہا۔

"اس کے پاس بندوق ہے۔"

میں نے کہا۔

"تم مجھے لے چلو۔"

ہم غار میں آگے چل پڑے۔ اب ہم پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے تاکہ ہمارے قدموں کی چاپ سنائی نہ دے اور پہرے دار ہوشیار ہو کر ہم پر فائر نہ کر دے۔ ہم اس زمین دوز غار کے دہانے کے قریب آ گئے تھے۔ باہر سے رات کے کھلے آسمان کی دھندلی دھندلی روشنی سفید کہرے کی مانند نظر آنے لگی تھی۔ غار کے منہ پر ایک جانب مجھے ایک آدمی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ رات کی پھیکی دھند میں مجھے اس کا خاکہ ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ کسی سٹول یا پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بندوق مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے وشالی کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود مسلح پہرے دار کی طرف بڑھا۔ مجھے اسے اس طرح دبوچنا تھا کہ نہ وہ آواز نکال سکے نہ گھبراہٹ میں بندوق کا فائر کر سکے۔ یہ مجھے علم تھا کہ یہ کوئی تربیت یافتہ فوجی نہیں ہے۔ صرف اتنی احتیاط کی ضرورت تھی کہ میرے پاؤں کی چاپ سن کر وہ ہوشیار نہ ہو جائے اور فائر نہ کر دے۔

میں اندھیرے میں جھک کر چل رہا تھا۔ مجھے صرف خالی ہاتھوں اور اپنے بازوؤں

کے شکنجے سے کام لیتا تھا۔ جیسے ہی میں اس کے قریب آیا اس نے میری آہٹ سن لی اور پلٹ کر دیکھا۔ میں اندھیرے میں اسے نظر آگیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بندوق سنبھالتا اس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں تھی۔ میں نے اس کی ٹھوڑی اپنی کلائی کے نیچے رکھ کر زور سے اوپر کو جھٹکا دیا۔ اس کی گردن کا منکا ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے اسے اپنے سے الگ کر دیا۔ وہ گر پڑا۔

وشالی میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ حالانکہ میں نے اسے ایک جگہ رکنے کو کہا تھا۔ یہ راز بھی بعد میں کھلا کہ وشالی مجھے اپنی نظروں سے کیوں اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ میں آپ کو آگے چل کر بتاؤں گا۔ وشالی میرے پاس آکر زمین پر گرے ہوئے پہرے دار کو دیکھنے لگی۔

"تم نے اسے کیسے مارا؟"

میں نے کہا۔

"یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی یہاں سے نکلو۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم تھوڑی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد ایک کھلی جگہ پر آ گئے جہاں دریا کی طرف سے ٹھنڈے جھونکے آ رہے تھے۔ میں نے وشالی سے کہا۔

"آگے دریا ہے شاید۔ کیا وہاں ہمیں کوئی کشتی وغیرہ مل جائے گی؟"

اس نے کہا۔

"فکر نہ کرو' مجھے معلوم ہے جاگیردارنی کی کشتی کس جگہ پر ہوتی ہے۔"

دریا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک طرف دریا کا گھاٹ تھا جہاں لکڑی کا ایک پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک کشتی رسی سے بندھی ہوئی تھی۔ ہم اس کشتی میں بیٹھ گئے۔ میں نے چپو سنبھال لیے۔ وشالی نے مجھ سے پوچھا۔

"تم کس طرف جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"یہ میں تمہیں دریا پار کرنے کے بعد بتاؤں گا۔"

وشالی نے کہا۔

"دریا پار جاگیردارنی کے حبشی غلاموں کا گاؤں ہے۔ وہ لوگ رات کو بھی جاگ کر گشت لگاتے رہتے ہیں کہ کہیں جاگیردارنی کا کوئی ملازم فرار ہو کر دریا پار نہ کر لے۔"

میں یہ سن کر فکر مند ضرور ہوا لیکن دریا مجھے ہر حالت میں پار کرنا تھا۔ وشالی نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر تمہاری جان بچائی ہے تو تمہیں تمہاری منزل تک پہنچا کر اپنے گاؤں جاؤں گی۔"

میں نے اسے کہا کہ وہ یہاں سے واپس کیوں نہیں چلی جاتی۔ وہ بولی۔

"اب میرے لیے جاگیردارنی کی حویلی میں سوائے اذیت ناک موت کے اور کچھ نہیں ہے۔ میں کیسے وہاں جا سکتی ہوں۔ اس کو تو صبح ہوتے ہی پتہ چل جائے گا کہ تم فرار ہو چکے ہو اور میں تمہیں فرار کروا کر اپنے ساتھ لے گئی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"اگر دریا پار جاگیردارنی کے حبشی سپاہیوں کی گشتی پارٹیاں پہرے پر ہوتی ہیں تو ہمیں آگے جا کر دریا پار کرنا چاہیے۔"

وہ بولی۔

"ہم ایسا ہی کریں گے۔ ہم دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چھ سات میل آگے نکل جائیں گے۔ وہاں سے ہم دریا پار کر لیں گے۔ پھر کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔"

ہماری کشتی دریا کے بہاؤ کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے مجھے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

"کشتی کو اپنے قابو میں رکھنا۔ جس وقت میں کہوں فوراً کشتی کا رخ دوسرے کنارے کی طرف موڑ دینا۔ اگر کشتی پر قابو نہ رہا تو آگے سمندر ہے۔ یہ دریا سمندر میں جا کر گرتا ہے۔ وہاں دلدلیں بھی ہیں۔ ایک بار ہماری کشتی ان میں پھنس گئی تو زندہ نہ بچ سکیں گے۔"

میں نے کہا۔

"انشاء اللہ ایسی بات نہیں ہوگی۔"

میرے منہ سے بے اختیار انشاء اللہ نکل گیا تھا۔ کہنے لگی۔

"ہمیں معلوم ہوگیا تھا کہ تم مسلمان ہو۔ یہ بات جاگیردارنی کو بھی معلوم ہوگئی تھی۔ اب تمہارے منہ سے اللہ کا لفظ سن کر یقین ہوگیا کہ تم واقعی مسلمان ہو۔"

میں نے کہا۔

"الحمد للہ! میں مسلمان ہوں وشالی۔"

اس نے پوچھا۔

"تم آدھی رات کے وقت شہر سے نکل کر اس طرف کیا کرنے آ گئے تھے؟ تمہارا نام کیا ہے؟ تم دوارکا سے کہاں جا رہے تھے؟"

میں نے اسے اپنا مسلمانوں والا فرضی نام بتا دیا اور رات کے وقت دوارکا شہر سے نکلنے کی ایک جھوٹی کہانی بھی گھڑ کر سنا دی۔ وشالی نے یقین کر لیا۔ کہنے لگی۔

"کشتی بائیں طرف جا رہی ہے۔ اس کو سیدھ میں رکھو۔ ابھی دوسرے کنارے پر ہمارے پکڑے جانے کا خطرہ موجود ہے۔"

میں نے چپو ہلاتے ہوئے کشتی کو دریا کے رخ پر سیدھ میں کر لیا۔ کشتی دریا کی تیز لہروں کے ساتھ تیزی سے بہتی چلی جا رہی تھی۔ رات کے دھندلے اندھیرے میں دریا کا پاٹ دور تک خالی تھا۔ جب کافی دیر تک کشتی دریا میں بہاؤ کے ساتھ بہتی چلی گئی تو وشالی نے کہا۔

"یہاں سے کشتی کنارے کی طرف لے چلو۔"

میں نے کشتی کا رخ کنارے کی طرف کر دیا اور چپو چلانے لگا۔ کشتی دوسرے کنارے تک پہنچتے پہنچتے کافی آگے نکل آئی تھی۔ دریا کا دوسرا کنارہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی گھاٹ وغیرہ وہاں نہیں تھا۔ آسمان پر بادل تھے۔ ایک بھی ستارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے وشالی سے کہا۔

"وشالی! تم نے میری جان بچائی ہے۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ اب مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہاں سے کاٹھیاواڑ کی طرف کون سا راستہ جائے گا۔ کاٹھیاواڑ میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ میں کچھ دن اس کے پاس رہوں گا۔ اس کے بعد دلی کی طرف چلا جاؤں گا۔ دلی میں میری چھوٹی سی دکان ہے۔"

وشالی نے کہا۔

"یہاں سے کوئی راستہ کاٹھیاواڑ کی طرف نہیں جاتا۔ یہ سارا علاقہ جاگیردارنی کی جاگیر کا علاقہ ہے۔ یہاں کے گاؤں میں اس کے حبشی غلاموں کی آبادی زیادہ ہے۔ جاگیردارنی ہمیں ہر قیمت پر ہلاک کرنا چاہے گی۔ کیونکہ ہم دونوں اس کی حویلی کا ایک ایسا خونی راز لے کر فرار ہوئے ہیں جو جاگیردارنی کو پھانسی کے تختے تک لے جا سکتا ہے۔ تم اکیلے اس علاقے میں نکلے تو جاگیردارنی کے خونخوار کتے اور آدمی تمہیں کسی نہ کسی جگہ ضرور دبوچ لیں گے۔"

میں نے سوچا وشالی ٹھیک ہی کہہ رہی ہے میں تو جاگیردارنی کے ایک انتہائی گھناؤنے خونی راز کا چشم دید گواہ ہوں۔ میں چاہے پولیس کو خبر کر دوں یا نہ کروں لیکن جاگیردارنی تو یہی سوچے گی کہ میں پولیس کو جا کر رپورٹ کر سکتا ہوں کہ جاگیردارنی کی حویلی میں ہر ماہ خونی ڈرامہ کھیلا جاتا ہے۔ وشالی اپنی جگہ پر سچی تھی۔ میری خاطر اس نے بھی جاگیردارنی کی حویلی سے دیس نکالا لے لیا تھا۔ اب وہ بھی واپس نہیں جا سکتی تھی اور اس کی زندگی بھی خطرے میں تھی۔ جاگیردارنی اسے ہر قیمت پر ہلاک کرنے کی کوشش کرے گی۔ میں وشالی کی اس قربانی سے بہت متاثر ہوا تھا۔ میں یہی سمجھ سکا تھا کہ اس نے محض انسانی ہمدردی کی خاطر ایسا کیا ہے اور مجھے ایک اذیت ناک موت سے بچایا ہے۔ آخر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"وشالی! تم نے میری خاطر اپنی زندگی اتنے بڑے خطرے میں کیوں ڈالی ہے۔"

ہم دریا کے کنارے آ گئے تھے۔ میں نے کشتی کو چھوڑ دیا تھا اور ہم دونوں دریا کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف جا رہے تھے۔ وشالی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگی۔

"اس لیے کہ تم مجھے بڑے اچھے لگے تھے۔ جب پہلی بار میں نے تمہیں جاگیردارنی کے دیوان خانے میں دیکھا تو میں تم پر عاشق ہو گئی تھی۔ میں کسی زمانے میں ایک مندر کی دیوداسی ہوا کرتی تھی۔ جاگیردارنی وہاں سے مجھے خرید کر اپنی حویلی میں لے آئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ جاگیردارنی تمہیں وہاں کس لیے لائی ہے۔ میں نے تمہیں بچانے کا اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے دو ایک بار اشاروں سے تمہیں چائے پینے سے منع کیا مگر تم سمجھ نہ سکے۔ لیکن میں نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ تمہیں مرنے نہیں دوں گی اور اس خونی حویلی سے نکال کر لے جاؤں گی۔"

میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"تمہیں میری کون سی شے اچھی لگی تھی؟"

اس نے میرا ہاتھ تھوڑا سا دبایا اور کہنے لگی۔

"تم ایسا بھرپور جوان مرد اس سے پہلے میں نے حویلی میں نہیں دیکھا تھا۔ تم خوبصورت بھی تھے اور تمہارا رنگ بھی کالا نہیں تھا۔ مجھے تمہارے نین نقش اور رنگ بھا گیا تھا، بس ـــــ اس کے بعد جو کچھ ہوا تمہارے سامنے ہے۔"

میرے مردانہ احساسات کو قدرتی طور پر وشالی کی ان باتوں سے بڑی تسکین مل رہی تھی۔ لیکن میرا ذہن کسی اور ہی مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے کاٹھیاواڑ کے شہر میں پہنچنا تھا جہاں سے میں آسانی کے ساتھ بھوپال جا سکتا تھا۔ میں نے وشالی سے کہا۔

"ہم کس طرف جا رہے ہیں؟ کیا آگے کوئی ایسا گاؤں وغیرہ ہے جہاں سے مجھے کسی شہر تک کوئی لاری وغیرہ مل جائے؟ اور تم کہاں جانا چاہو گی؟ کیا واپس اپنے پرانے مندر میں جاؤ گی؟"

وشالی نے آہ بھر کر کہا۔

"میں اپنے پرانے مندر میں گئی تو جاگیردارنی کے آدمی بڑی آسانی سے وہاں آ کر مجھے قتل کر جائیں گے۔"

"تو پھر تم کہاں جاؤ گی؟"

وہ بولی۔

"یہاں سے آگے ایک جنگل ہے۔ اس جنگل میں میری ایک سہیلی کا گاؤں ہے۔ یہ گاؤں پہاڑیوں میں چھپا ہوا ہے۔ وہاں باہر سے کوئی نہیں آ سکتا۔ تم بھی میرے ساتھ وہاں چلے چلو۔ کچھ دن وہاں رہنا۔ وہاں سے ہر ہفتے گاؤں کی عورتیں بیل گاڑی میں بیٹھ کر اگلے گاؤں جاتی ہیں۔ تم اس بیل گاڑی میں سوار ہو کر اگلے گاؤں چلے جانا وہاں سے تمہیں کاٹھیاواڑ جانے والی کوئی لاری ضرور مل جائے گی۔ وہاں شہر سے لاریاں آتی جاتی رہتی ہیں۔"

مجھے امید کی کوئی صورت نظر آئی۔ مگر میں وشالی کی سہیلی کے گاؤں میں اتنے دن قیام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تمہاری سہیلی کے گاؤں میں ایک آدھ دن رہ کر خود بیل گاڑی لے کر اگلے گاؤں چلا جاؤں؟"

وشالی نے جواب دیا۔

"بیل گاڑی ہفتے میں صرف ایک دن ہی جاتی ہے اور اسے میری سہیلی دکھشا کا خاوند ہی چلاتا ہے۔ آگے راستہ پہاڑی جنگلوں میں سے ہو کر جاتا ہے اور بڑا خطرناک راستہ ہے۔ وہاں جنگلی درندے حملہ کر دیتے ہیں۔ میری سہیلی دکھشا کا مالک جنگل کے خفیہ راستوں سے واقف ہے۔ وہ بیل گاڑی خفیہ راستوں سے لے کر جاتا ہے۔ تم اکیلے جاؤ گے تو کسی شیر باگھ کا شکار ہو جاؤ گے۔"

میں نے دل میں سوچا کہ چلو ایک ہفتہ کوئی زیادہ مدت نہیں ہے۔ اتنی دیر وشالی کی سہیلی کے گاؤں میں رہ لوں گا۔ کم از کم میں کاٹھیاواڑ تو بحفاظت پہنچ سکوں گا۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے وشالی! تم جیسے کہتی ہو میں ویسے ہی کروں گا۔"

وشالی چلتے چلتے بالکل میرے ساتھ لگ گئی اور بڑے محبت بھرے لہجے میں بولی۔

"تم کتنے اچھے ہو۔ کاش میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہ سکتی۔ لیکن کیا کروں، میں

مجبور ہوں ایسا نہیں کر سکتی۔"

اسی طرح باتیں کرتے اور دریا سے ہٹ کر چلتے ہم ایک چھوٹے سے میدان میں آ گئے جہاں بانس اور ناریل کے بہت درخت تھے۔ بانس اور ناریل کے درختوں سے میری نگاہیں اتنی مانوس ہو گئی تھیں کہ میں انہیں رات کے اندھیرے میں بھی پہچان لیتا تھا۔ یہ درخت وسطی اور جنوبی ہندوستان کے جنگلوں میں بہت پائے جاتے ہیں۔ درختوں کا ذخیرہ کافی پھیلا ہوا تھا۔ وہ ختم ہوا تو پتھریلا راستہ شروع ہو گیا جس کی دونوں جانب رات کے اندھیرے میں سیاہ چٹانیں ستونوں کی طرح کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ وشالی نے کہا۔

"ان ٹیلوں کے پیچھے ایک ندی بہتی ہے۔ ہم وہاں منہ ہاتھ دھو کر پانی پئیں گے۔ اس ندی کا پانی بڑا میٹھا ہے۔ مجھے پیاس بھی لگی ہے۔"

میں نے کسی قدر بیزار ہو کر پوچھا۔

"لیکن تمہاری سہیلی کا گاؤں ابھی کتنی دور ہے؟"

وشالی نے کہا۔

"فکر کیوں کرتے ہو؟ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہم دن نکلنے سے پہلے پہلے دکھشا کے گاؤں میں ہوں گے۔"

رات ڈھلنا شروع ہو گئی تھی۔ چٹانوں والا پتھریلا راستہ ختم ہو گیا۔ آگے اترائی تھی۔ وہاں ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ وشالی اور میں ندی کے کنارے بیٹھ گئے۔ ہم کافی تھک گئے تھے۔ ہم نے منہ ہاتھ دھویا ندی کا ٹھنڈا پانی پیا۔ وشالی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی۔

"یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہیے۔ آگے چلتے ہیں۔"

ایک جگہ سے ہم نے ندی پار کی۔ ندی کی دوسری طرف جنگل تھا۔ یہ زیادہ گھنا نہیں تھا۔ اس جنگل سے بھی ہم گزر گئے۔ سامنے پہاڑی ٹیلے نظر آنے لگے۔ وشالی نے ان ٹیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ان پہاڑیوں کے درمیان میری سہیلی دکھشنا کا گاؤں ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کم از کم وہ گاؤں تو آیا جہاں سے مجھے کسی اگلے گاؤں یا شہر تک پہنچنے کے لیے کوئی بیل گاڑی مل سکتی تھی۔ پہاڑیوں تک پہنچتے پہنچتے بھی کافی وقت لگ گیا۔ ہم پہاڑیوں کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ پہاڑیوں پر کہیں کہیں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ آخر ہم پہاڑی کی چوٹی پر آ گئے۔ ہم دونوں کا سانس پھول گیا تھا۔ وشالی پہاڑی کی دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اس طرف دیکھنے لگا۔ نیچے چاروں طرف اونچی اونچی پہاڑیوں میں گھری ہوئی ایک پیالہ نما چھوٹی سی وادی تھی۔ وادی میں اندھیرا تھا اور کہیں کہیں روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ وشالی بولی۔

"یہ میری سہیلی کا گاؤں ہے۔"

پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ رات کے پچھلے پہر کے دھندلے اندھیرے میں اس کی سیاہ آنکھیں سیاہ موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ کہنے لگی۔

"میری سہیلی کے گاؤں میں تمہیں ہر طرح کا آرام ملے گا۔ تم کھانے کو جو چاہو گے تمہیں ملے گا۔ یہ گاؤں نہیں ایک سورگ ہے جس کو تم مسلمان جنت کہتے ہو۔"

وہ بڑے پر اسرار انداز میں مسکرائی اور اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا دبایا اور کہا۔

"آ جاؤ، سورگ میں چلتے ہیں۔"

میں کچھ سمجھ نہ سکا کہ وہ اس قسم کی پراسرار اور بہکی بہکی باتیں کیوں کرنے لگی تھی۔ ہم پہاڑی کی دوسری جانب ڈھلان اترنے لگے۔ آخر ہم وادی میں آ گئے۔ یہاں تک آتے آتے آسمان پر جو بادل چھائے ہوئے تھے ان کے عقب میں صبح کاذب کی یعنی سورج نکلنے سے کچھ دیر پہلے کی پھیکی پھیکی سفید جھلکنے لگی تھی اور اس دھندلی پھیکی روشنی میں مجھے پہاڑی کے دامن میں دونوں جانب فاصلے فاصلے پر گول گول لمبوتری جھونپڑیاں دکھائی دیں۔ کسی کسی جھونپڑی کے باہر روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ شاید یہ مٹی کے تیل کی لالٹین تھی۔ وشالی میرے آگے آگے چلنے لگی تھی۔ وہ ایک جھونپڑی کے

باہر آکر رک گئی۔ اس نے میرے منہ کے قریب اپنا منہ لا کر کہا۔

"یہ میری سہیلی دکھشا کی جھونپڑی ہے۔ سب گاؤں والے جھونپڑیوں میں ہی رہتے ہیں۔"

عجیب بات تھی کہ وہاں مجھے کوئی بیل گاڑی، کوئی مال مویشی وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا جو گاؤں کی خاص نشانی ہوتے ہیں۔ جھونپڑی کے دروازے پر پردہ گرا ہوا تھا۔ وشالی پردہ اٹھا کر جھونپڑی میں داخل ہوگئی۔ میں باہر ہی کھڑا رہا۔ کبھی اردگرد کی جھونپڑیوں کو دیکھتا اور کبھی آس پاس کی بلند پہاڑیوں کو تکنے لگتا جنہوں نے اس چھوٹے سے گاؤں کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ وشالی نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ گاؤں لوگوں کی نظروں سے چھپا ہوا تھا۔ جھونپڑی کے اندر سے کسی عورت کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ یہ وشالی کے ہنسنے کی آواز نہیں تھی۔ اتنے میں جھونپڑی کا پردہ ہٹا اور ایک اونچی لمبی جوان عورت نمودار ہوئی۔ صبح کاذب کے پھیکے اجالے میں اس کی آنکھیں میری طرف دیکھتے ہوئے چمک رہی تھیں۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ جسم پر صرف ایک ساڑھی تھی جو اس کے جسم کو پوری طرح سے نہیں ڈھانپ رہی تھی۔ اس کے پیچھے سے نکل کر وشالی نے کہا۔

"یہ میری سہیلی دکھشا ہے۔"

وہ جوان اور دراز قد نیم عریاں عورت جس کا نام دکھشا تھا اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے میری طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے اس نے پہلی بار کسی مرد کی شکل دیکھی ہو۔ وشالی نے سرسری طور پر میرا اس سے تعارف کرایا۔ دکھشا نے کہا۔

"اندر آ جاؤ۔ باہر کیوں کھڑے ہو۔"

اس عورت کی آواز بھی بڑی مترنم تھی۔ وہ کسی طرح بھی گاؤں کی عورت نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی زبان بھی اس علاقے کے دیہاتیوں والی ٹوٹی پھوٹی گجراتی اور مراٹھی آمیز ہندی نہیں تھی۔ اس نے بڑی صاف اردو میں بات کی تھی۔ میں جھجکتے ہوئے جھونپڑی میں داخل ہوگیا۔ جھونپڑی میں سب سے پہلے جس چیز نے مجھے متاثر کیا

وہ ایک خوشبو تھی۔ یہ خوشبو پہلی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کے دور دراز گاؤں کی جھونپڑی سے کبھی نہیں آسکتی تھی۔ دوسرے جس بات نے مجھے چونکایا وہ یہ تھی کہ یہ خوشبو کسی ولایتی ملک کے پرفیوم کی خوشبو تھی۔ جھونپڑی میں ایک دیا جل رہا تھا۔ دیے کی روشنی میں مجھے زمین پر چار پانچ ہرن کی کھالیں ساتھ ساتھ بچھی ہوئی نظر آئیں۔ ہرن کی کھالوں کے فرش پر سرخ رنگ کے گلاب جامنوں کی شکل کے بڑے تکیے ادھر ادھر پڑے تھے۔ میں حیرانی کے تاثر کے ساتھ بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ عورت دیہاتی نہیں ہے تو پھر یہ کون ہے؟ ذہن نے کہا ہو سکتا ہے اس کا خاوند شکاری ہو اور یہ ہرن وہی مار کر لایا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی انگریز شکاری کو شکار کھلاتا ہو اور یہ ولایتی پرفیوم وہ انگریز شکاری سے اپنی بیوی کے لیے لے آیا ہو۔ وشالی اور دکھشا بھی میرے پاس بیٹھ گئیں۔ وشالی کہنے لگی۔

”دکھشا کا خاوند اس گاؤں کا مالک ہے۔ یہ ساری زمین اسی کی ہے۔ وہ یہاں کبھی کبھی ہی آتا ہے۔ شہر میں کام کرتا ہے۔ کیوں دکھشا؟“

دکھشا میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مسکرا کر بولی۔

”ہاں ہاں۔ وہ کبھی کبھی ہی یہاں آتا ہے مگر مجھے اس سے پریم نہیں ہے۔“

اور دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ وشالی نے میرے سامنے دکھشا سے پوچھا۔

”گاؤں سے بیل گاڑی کس روز شہر جائے گی؟“

دکھشا نے ہنس کر کہا۔

”کیوں؟ کیا تم اتنی جلدی واپس چلی جاؤ گی؟“

وشالی نے کہا۔

”اری نہیں مجھے نہیں ہمارے دوست کو کاٹھیاواڑ جانے کی جلدی ہے۔“

دکھشا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

”ہاں، مجھے جانا ہے۔ وہاں لوگ میری راہ دیکھ رہے ہیں۔“

اس عورت نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"ہم بھی تو تمہاری راہ دیکھ رہے تھے۔"

اور ایک بار دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ اس عورت کا یہ جملہ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ اس نے کیوں کہا تھا۔ بس میں بھی کھسیانی سی ہنسی ہنس کر رہ گیا اور صرف اتنا ہی کہا۔

"آپ کا شکریہ لیکن مجھے جلدی جانا ہے۔"

دکھشا گردن کو ایک طرف بڑی خاص ادا سے جھکا کر بولی۔

"چنتا نہ کرو۔ کل کا دن چھوڑ کر پرسوں بڑے کاکا خود گاڑی لے کر شہر جا رہے ہیں۔ وہاں سے تمہیں کاٹھیاواڑ کی لاری مل جائے گی۔"

میں نے دل میں سوچا کہ یہ دو دن کسی نہ کسی طرح یہاں گزارنے ہی پڑیں گے۔ دکھشا نے ہرن کی کھال کے بستر پر میرا تکیہ ایک طرف لگا دیا اور مجھ سے کہا۔

"تم آرام کرو۔"

پھر وشالی کی طرف دیکھا۔ مسکرائی اور پوچھا۔

"تم بھی یہیں ساتھ ہی سو جاؤ۔"

دونوں ہنسنے لگیں۔ وشالی بولی۔

"نہیں دکھشا۔ یہ میرا دوست ہے۔ یہ اکیلا ہی سوئے گا۔ ہم دونوں ذرا پرے ہو کر سو جائیں گی۔"

میں وہیں لیٹ گیا۔ دکھشا اور وشالی کچھ فاصلے پر تکیے لے کر لیٹ گئیں تھوڑی دیر بعد ہی مجھے نیند آ گئی کیونکہ میں بے حد تھکا ہوا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو دیا بجھ چکا تھا۔ جھونپڑی کے پردے کے نیچے سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اتنے میں وشالی جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ کہنے لگی۔

"اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو۔ پھر کھانا کھائیں گے۔"

میں جھونپڑی سے باہر آ گیا۔ باہر دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان پر اسی طرح بادل چھائے ہوئے تھے۔ دوسری جھونپڑیوں کے باہر کوئی عورت مرد

یا بچہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے وشالی سے پوچھا۔
"گاؤں کے لوگ کہاں ہیں؟ کیا سب ابھی تک سو رہے ہیں؟"
وہ بولی۔
"دوسرے گاؤں میں کوئی میلہ ہے۔ وہاں گئے ہوئے ہیں۔ شام تک واپس آ جائیں گے۔ آؤ ندی پر چلتے ہیں۔"
گاؤں کی فضا مجھے بڑی پر اسرار سی لگی۔ جھونپڑیوں کے پیچھے کچھ پھل دار درخت تھے۔ ان کے درمیان سبزیوں کے دو تین کھیت تھے۔ ان کے درمیان ایک چھوٹی سی پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ وشالی ساڑھی اتار کر میرے سامنے ہی ندی میں اتر گئی۔ میں ذرا اوٹ میں ہو کر نہانے لگا تو اس نے کہا۔
"میرے سامنے کیوں نہیں اشنان کرتے؟ مجھ سے کیوں پردہ کرتے ہو؟"
میں نے وشالی کے ان سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ ندی کا پانی گہرا نہیں تھا۔ میں نے اچھی طرح سے اپنے جسم اور سر کو دھویا۔ ٹھنڈے پانی نے جسم کو تر و تازہ کر دیا۔ میں ندی سے باہر نکلنے لگا تو وشالی اس وقت ندی سے نکل کر ساڑھی پہن رہی تھی۔ ذرا اس کا رخ دوسری طرف ہوا تو میں جلدی سے ندی سے باہر آ گیا اور جلدی جلدی پتلون پہن لی۔ پتلون جیکٹ میرا ابھی تک وہی پرانا لباس تھا جو کافی خراب ہو چکا تھا۔ لیکن میرے پاس دوسرے کپڑے نہیں تھے۔
ہم دکھشا کی جھونپڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک نوجوان لڑکی جس کے بال کھلے تھے اور کھلے بالوں میں گیندے کا بڑا سا سنہری پھول لگا تھا' ہاتھوں میں طشت پکڑے اندر داخل ہوئی۔ یہ لڑکی بھی شکل صورت سے دیہاتی لڑکی نہیں لگ رہی تھی۔ طشت میں تانبے اور چینی کے برتنوں میں کھانا لگا ہوا تھا۔ بھنا ہوا گوشت اور مچھلی تھی۔ چاول تھے' چائے کی چینک اور چھوٹی نیلے پھولوں والی پیالیاں تھیں۔ ایک تھالی میں پھل رکھے تھے۔ شیشے کا جگ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ میری حیرانی اور تجسس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ سارے برتن اور کھانا شہر کے کسی اونچے طبقے کی معاشرت کی

نمائندگی کرتے تھے۔ میں حیران تھا کہ اتنے قیمتی برتن یہاں کہاں سے آ گئے ہیں اور اتنا عمدہ کھانا پکانے والا یہاں کون ہوگا۔ پھر خیال آیا کہ دکھشنا کا خاوند شہر میں ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ شہر سے یہ برتن لے آیا ہوا اور اس نے دکھشنا کی خدمت گاری کے لیے کوئی شہر کا بوڑھا باورچی لا کر رکھ دیا ہو۔ دکھشنا بھی آ گئی۔ اس نے گولڈن رنگ کی دوسری ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں میں اسی رنگ کے پتھر چمک رہے تھے۔ ناک میں موتی پڑا تھا۔ بالوں کا جوڑا کیا ہوا تھا جس میں موتیے کے سفید پھول سجے تھے۔ اس کے لباس سے وہی ولائتی پرفیوم کی خوشبو کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھ ہی لیا کہ وہ یہ پرفیوم کہاں سے لائی ہے۔ دکھشنا نے مسکرا کر کہا۔

"میرے خاوند نے مجھے شہر سے لا کر دیا تھا۔ تمہیں پسند ہے تو تم لے لو میں اور منگوا لوں گی۔"

میں نے فوراً" کہا۔

"نہیں نہیں دکھشنا جی۔ یہ آپ کو ہی اچھا لگتا ہے۔"

وہ بولی۔

"ہاں! یہ لیڈیز پرفیوم ہے۔"

اس کے انگریزی میں لیڈیز پرفیوم کہنے پر میں اور بھی حیران ہوا۔ لیکن اس کو اپنے خاوند کی نوکری کی وجہ سے شہر کی ہوا لگ چکی تھی اس لیے اس میں زیادہ تعجب کرنے والی بات نہیں تھی۔ ہم تینوں نے جھونپڑی میں ہی کھانا کھایا۔ کھانا واقعی بڑا لذیذ تھا۔ کھانے کے بعد دکھشنا نے مجھ سے پوچھا۔

"برانڈی وسکی کا شوق ہو تو لاؤں؟"

میں نے کہا۔

"نہیں شکریہ' شکریہ ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کا مطلب تھا کہ اس دراز قد حسین عورت کو شہر کی کچھ زیادہ ہی ہوا لگ چکی تھی۔ اس کے بعد میں وہیں سوگیا۔ جب اٹھا تو شام ہو چکی تھی۔ سورج پہاڑیوں کے

پیچھے غروب ہوگیا ہوا تھا اور جھونپڑی کے باہر لالٹین روشن کر دی گئی تھی۔ جھونپڑی کے اندر تیل کا دیا روشن تھا۔ دکھشا نے مجھے بتایا تھا کہ لالٹین جلانے سے جھونپڑی میں مٹی کے تیل کی بو پھیل جاتی ہے' اس لیے میں اندر ناریل کے تیل کا دیا روشن کرتی ہوں۔ اس وقت تک میں نے ان تین عورتوں یعنی وشالی' دکھشا اور ان کی نوجوان نوکرانی کے سوا کوئی چوتھا آدمی یا عورت اس چار پانچ جھونپڑیوں والے گاؤں میں نہیں دیکھی تھی۔ باقی جھونپڑوں پر بھی سارا دن ویرانی چھائی رہتی تھی اور شام کے وقت تو ان کے باہر لالٹین بھی روشن نہیں کی گئی تھی۔ ہم دکھشا کے جھونپڑے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں نے وشالی سے پوچھا۔

"صبح بیل گاڑی شہر کس وقت جائے گی؟"

اس نے دکھشا کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔

"بڑے کاکا بیل گاڑی لے کر دوسرے گاؤں میلے پر گئے ہوئے ہیں۔ گاؤں کی عورتیں اور بچے اور مرد بھی ساتھ ہی گئے ہیں۔ صبح صبح شاید آ جائیں گے۔ دوپہر کو تمہیں لے کر شہر چلے جائیں گے۔ کیوں تم بور ہوگئے ہو؟"

یہ بور کا لفظ بھی شہری معاشرت کا لفظ تھا۔ لیکن میری ساری حیرانی یہ معلوم کر کے تقریباً ختم ہوگئی تھی کہ دکھشا کا خاوند یہ سارا کلچر شہر سے لایا ہے اور دکھشا چونکہ رنگین مزاج عورت ہے اس لیے اس پر شہر کا رنگ زیادہ چڑھ گیا ہوا ہے۔"

میں نے کہا۔

"نہیں نہیں' میں بالکل بور نہیں ہوا۔ پیچھے میرے دوست میری گم شدگی سے پریشان ہو رہے ہوں گے اس لیے میں جلدی پہنچنا چاہتا ہوں۔"

دکھشا بولی۔

"کوئی بات نہیں جہاں کل کی رات گزاری ہے وہاں ایک رات اور گزار لو۔ کل شام تک تو تم شہر پہنچ ہی جاؤ گے۔"

وشالی کہنے لگی۔

"چائے پئیو میرے پریمی! کل تو چلے ہی جاؤ گے۔"

وشالی نے میرے لیے پہلی بار پریمی کا لفظ استعمال کیا تھا۔ میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"یہ پریمی تم نے مجھے بھلا کیوں کہا؟"

دکھشا ہنستے ہوئے بولی۔

"جب کہ میں تمہیں اپنا پریمی سمجھتی ہوں۔"

دونوں ہنسنے لگیں۔ وشالی نے کہا۔

"ہم سب ایک دوسرے کے پریمی ہی ہیں۔ یہاں ہمارے گاؤں میں پریم کا راج ہے۔ ہم سب آپس میں پریم کرتے ہیں۔ ہمارا ایک سورگ بھی ہے یعنی ایک اپنی بنائی ہوئی جنت ہے۔ تم اگلی بار آؤ گے تو تمہیں اپنی جنت کی سیر کرائیں گے۔"

میں نے دل میں کہا خدا نہ کرے کہ میں پھر اس طرف آؤں۔ وشالی نے مجھے چائے کی ایک اور پیالی بنا کر دی۔ اس وقت باہر بادلوں کے گرجنے کی ہلکی ہلکی آواز آنے لگی۔ دکھشا نے جھونپڑی کے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ورشا آ رہی ہے۔"

پھر اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"پریمی! ورشا کا مطلب تو تم ضرور جانتے ہو گے؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ ورشا کا مطلب ہے بارش۔"

دونوں بہت خوش ہوئیں۔ اب ان دونوں عورتوں نے نہ جانے کیوں مجھے پریمی کہہ کر بلانا شروع کر دیا تھا۔ باہر سے بارش کی بوندیں گرنے کی آواز آنے لگی۔ دکھشا نے بڑی جذباتی آواز میں کہا۔

"ورشا ہونے لگی ہے۔ اس وقت آکاش پر دیوتا اپنی دیوداسیوں کے ساتھ بیٹھ کر سوم رس پیتے ہیں۔"

میں نے دل میں کہا جہنم میں جائیں تمہارے دیوتا اور دیوداسیاں۔ ان لوگوں کی وجہ سے میں نے بڑی سخت مصیبتیں اٹھائی تھیں۔ وشالی بولی۔

"میں سوم رس لاتی ہوں ہم دیوتاؤں کا نیک شگون منائیں گی۔"

وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ دکھشا میرے ساتھ ہی بیٹھی رہی۔ وہ بار بار بازو اوپر اٹھا کر اپنے جوڑے کو ٹھیک کر رہی تھی اور میری طرف بڑی ترچھی اور معنی خیز نگاہوں سے دیکھتی جاتی تھی۔ میں اس کی نگاہوں کے معنی خوب سمجھتا تھا۔ لیکن اپنی جگہ پر قائم تھا اور پہلے بھی مشکل سے مشکل حالات میں بھی خدا کے فضل سے قائم رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر مجھے اپنی بیوی جمیلہ کا خیال آ جاتا تھا۔ اس وقت بھی مجھے جمیلہ کا خیال آ گیا اور میرا دل اس کو یاد کر کے واقعی اداس ہو گیا۔ وشالی تیز تیز قدم اٹھاتی جھونپڑی میں آئی تو اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ یہ ولایتی شراب کی بوتل تھی۔ کہنے لگی۔

"باہر بارش ہو رہی ہے دکھشا۔"

دکھشا نے تیز تیز سانس لے کر کہا۔

"سچ کہہ رہی ہو میری جان؟"

"ہاں خود جا کر دیکھ لو۔ میری جان۔"

دکھشا نے کہا۔

"میں تمہارے جسم پر ہاتھ پھیر کر دیکھوں گی کہ باہر بارش ہو رہی ہے یا نہیں۔ میرے پاس آؤ۔"

وشالی نے بوتل رکھ دی اور دکھشا کے پاس چلی گئی۔ دکھشا اس کے جسم پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ وشالی نے بھی دکھشا کے جسم پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ میں نے دل میں لاحول ولا قوۃ پڑھی اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ دکھشا نے ہلکا سا قہقہ لگا کر کہا۔

"تمہارا پریمی ناراض ہو گیا ہے وشالی۔"

وشالی کہنے لگی۔

"میرے پریمی ناراض نہ ہونا۔ ہم دونوں سہیلیاں بارش کو بہت پسند کرتی ہیں۔ ورشا رات کے وقت ہو تو ہم جذباتی ہو جاتی ہیں اور کوئی بات نہیں ہے۔"

وشالی نے سوم رس کی بوتل میں سے تھوڑی تھوڑی شراب چینی کی پیالیوں میں ڈالی اور اس کی چسکیاں لگانے لگیں۔ انہوں نے مجھے بھی تھوڑی سی پی لینے پر بہت مجبو رکیا جب میں نے ہر بار سختی سے انکار کیا تو انہوں نے پھر مجھے مجبور نہ کیا۔ اس دوران وشالی نے مجھے چائے کی ایک اور پیالی بنا کر دی۔ میں چائے پیتا رہا اور وہ دونوں عورتیں سوم رس پیتی رہیں۔ باہر بارش تیز ہوگئی تھی۔ اگر بارش نہ ہو رہی ہوتی تو میں اٹھ کر باہر چلا جاتا کیونکہ میں وہاں بیٹھے بیٹھے سخت بور ہوگیا تھا۔ پھر میں ایک طرف سرہانے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا۔

دکھشا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"پریمی جی! نیند آ رہی ہے تو تھوڑا آرام کر لو۔ کھانے کے وقت ہم تمہیں اٹھا دیں گی۔"

مجھ پر واقعی کچھ غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ایک تو میں وہاں بور ہوگیا تھا۔ دوسرے پچھلی رات بھی نہیں سویا تھا۔ دن کو بھی اچھی طرح نہ سو سکا تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ نیند آ رہی ہے تو تھوڑی دیر آرام کر لینا چاہیے۔ میں نے کہا۔

"میں کچھ دیر کے لیے سو جاتا ہوں۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے ہی میں نے آنکھیں بند کیں مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ جب آنکھ کھلی تو میں یہی سمجھا کہ میں کافی دیر تک سویا رہا ہوں۔ سر تھوڑا تھوڑا بھاری ضرور تھا۔ میری چاروں طرف اندھیرا تھا۔ شاید جھونپڑی میں جلتا ہوا دیا بجھ گیا تھا یا کسی نے اسے بجھا دیا تھا۔ جھونپڑی میں کسی طرف سے کوئی روشنی نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی رات ہی کا وقت ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں ہرن کی کھال کے سخت بستر کی بجائے کسی نرم ریشمی بستر پر ہوں۔

میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا میرا ہاتھ بستر کی ریشمی چادر پر پھسلتا چلا گیا۔ فضا میں دکھشا کے خاص پرفیوم کی خوشبو بسی ہوئی تھی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ میں دکھشا کے جھونپڑے میں ہی ہوں لیکن وہاں ریشمی بستر کہاں سے آ گیا تھا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے وشالی کو آواز دی۔

"وشالی! وشالی!"

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے بستر کو ٹٹولا۔ بہت جلد مجھ پر ایک اور حیران کر دینے والا انکشاف ہوا کہ میں ایک نرم و نازک گدے والے پلنگ پر بیٹھا ہوں۔ میں نے پلنگ کے نیچے پاؤں رکھے تو محسوس ہوا کہ فرش پر قالین بچھا ہوا ہے۔ اندھیرا اتنا تھا کہ کوئی شے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اتنے میں کسی جانب سے ہلکی ہلکی موسیقی کی لہریں ابھرنے لگیں۔ میں نے غور سے سنیں۔ یہ اس زمانے کے مقبول عام انگریزی گانے کی دھن تھی جسے ایک مشہور انگریز لڑکی نے گایا تھا۔

کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے بازو پر چٹکی بھری۔ لیکن نہیں یہ خواب نہیں تھا۔ میں جاگ رہا تھا یہ سب کچھ میں زندہ حالت میں سن رہا تھا۔ پھر میں کہاں آ گیا ہوں؟ وشالی اور دکھشا مجھے کہاں لے آئی ہیں۔ چونکہ اس قسم کا خطرناک حادثہ یا واقعی میرے ساتھ پہلے ہو چکا تھا اس لیے میں اندر سے خوف زدہ ضرور ہوا کہ کہیں اس قسم کا بھیانک حادثہ میرے ساتھ ایک بار پھر پیش تو نہیں ہو رہا۔

انگریزی میوزک آہستہ آہستہ غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ اب ستار کی دھن ابھرنے لگی۔ یہ ہندوستانی دھن تھی۔ اب مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں بے اختیار پکار اٹھا۔

"وشالی! دکھشا!۔"

اس بار بھی کسی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ یا خدایا! میں کس دنیا میں آ گیا ہوں۔ کہیں میں کسی خلائی مخلوق کی قید میں تو نہیں ہوں۔ اتنے میں ایک دم روشنی ہو گئی۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے آنکھوں کے آگے بازو کر لیا۔ بازو ہٹایا تو کیا دیکھتا ہوں۔ میں ایک شاندار اور امیرانہ ماحول کے بیڈ روم میں ہوں۔ دیواروں پر

ریشمی پردے گرے ہوئے ہیں۔ فرش پر قیمتی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ جس پلنگ پر میں بیٹھا ہوا تھا وہ ڈبل بیڈ تھا اور زرد ریشمی چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ پلنگ کی دونوں جانب آبنوسی سائیڈ ٹیبل تھے جن پر دونوں جانب ایک ایک سنہری ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ سامنے آتش دان کے پاس گولڈن کناروں والے صوفے پڑے تھے۔ کارنس پر کیوپڈ اور سائیکی دیوی کا مجسمہ رکھا تھا۔ دیوار پر ایک عریاں عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی جو جنگل میں ایک طرف دوڑتی جا رہی تھی اور اس کے پیچھے ایک شیر لگا ہوا تھا۔ چھت منقش تھی۔ درمیان میں چاندی کا فانوس لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر دونوں جانب قد آدم تصویریں لگی تھیں۔ ان تمام تصویروں میں ایک جنگل دکھایا گیا تھا جس میں عریاں اور نیم عریاں عورتیں درختوں کے نیچے بیٹھی اور لیٹی ہوئی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ میں کہاں آگیا ہوں۔ میں تو دکھشنا کے جھونپڑے میں سوگیا تھا۔ پھر وہاں سے مجھے کون اٹھا کر یہاں لے آیا۔ یہ بالکل الف لیلیٰ کے کسی شہزادے کی طرح ہوا تھا جس کو سوتے میں کوئی جن اٹھا کر کسی بادشاہ زادی کے محل میں پہنچا دیا کرتا تھا۔ بیڈ روم جدید وضع کا تھا مگر وہاں دیوار پر کوئی کلاک نہیں لگا تھا جس سے مجھے یہ اندازہ ہوتا ٹائم کیا ہوا ہے۔ وہاں رات اور دن کا بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کیونکہ بیڈ روم کی کوئی کھڑکی یا روشندان بھی نہیں تھا۔ صرف ایک دروازہ تھا۔ میں دروازے کی طرف گیا۔

اسے باہر کو ذرا سا دھکیلا' دروازہ باہر سے بند تھا۔ بیڈ روم کی فضا میں ستار کی ہلکی ہلکی جھنکار ابھر رہی تھی۔ یہ آواز دیوار کے اندر لگے کسی سپیکر سے آ رہی تھی۔ میں اپنے اسی جیکٹ اور پتلون والے لباس میں تھا۔ میرا لباس تبدیل نہیں ہوا تھا۔ میں پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور میں کسی جادونگری میں تو نہیں آگیا۔ کہیں میرے ساتھ پھر کوئی بھیانک واردات تو نہیں ہونے والی۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور خدشات پیدا ہونا شروع ہوگئے تھے۔ میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور دکھشنا بڑی بنی سنوری سنہری زرتار ساڑھی پہنے بالوں میں گیندے کے پھولوں کا گجرا سجائے مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔ میں نے اپنے لہجے

کی تلخی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔
"میں جانتا ہوں تم لوگ مجھے بے ہوش کر کے یہاں لائے ہو۔ تمہیں کیا حق پہنچتا تھا؟"
دکھشا بڑی دلربائی کے ساتھ چلتی میرے پاس آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور شیریں لہجے میں بولی۔
"پریمی جی! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمیں اپنے سورگ کی سیر کراؤں گی۔ میں تو تمہیں سورگ کی سیر کرانے لائی ہوں۔ آج کا دن ہمارے سورگ میں گزار لو ساری زندگی یاد کرو گے۔ کل چلے جانا۔ میں نے تمہیں جانے سے تو نہیں روکا۔"
میں نے کہا۔
"میں تمہارے سورگ کی سیر نہیں کرنا چاہتا۔ میں ابھی واپس جانا چاہتا ہوں۔"
دکھشا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔ میں نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔
"پریمی! مجھ سے ناراض ہو گئے؟"
میں نے سرد لہجے میں کہا۔
"مجھے پریمی شریمی مت کہو۔ میں کسی کا پریمی نہیں ہوں۔ میں جا رہا ہوں۔"
میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تو وہ پلنگ پر ہی بیٹھی رہی۔ وہیں سے بولی۔
"تم اس وقت ہمارے سورگ میں ہو جو زمین سے بہت اوپر بادلوں سے بھی اوپر پرلوگ میں ہے۔ یہاں تو دیوتا اور دیوداسیاں ہی رہتی ہیں۔ تم بڑے خوش قسمت ہو میرے ساتھ یہاں آئے ہو۔ اب تم میرے ساتھ ہی واپس جا سکتے ہو۔ اکیلے جاؤ گے تو بادلوں میں لڑھک کر ہزاروں فٹ کی بلندی سے زمین پر گر پڑو گے۔"
میں نے اس کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا اور کھلے دروازے میں سے باہر نکل گیا۔ جیسے ہی باہر نکلا سامنے سفید اور سنہری رنگ کے بادل ہی بادل دکھائی دیئے۔ میں خوف زدہ ہو کر وہیں رک گیا۔ بادل آہستہ آہستہ ایک طرف چلے جا رہے تھے۔ میں نے نیچے جھک کر دیکھا۔ مجھے بادلوں کے درمیان میں سے نیچے چھوٹے چھوٹے پہاڑ اور

سیاہ دھبوں کی طرح درختوں کے جھنڈ نظر آئے۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ یہ کیا کرشمہ ہے؟ یہ کیا طلسم ہے؟ ضرور یہ دکھشا کوئی جادوگرنی ہے جس نے جادو کے زور سے زمین سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر بادلوں میں خواب کا محل بنایا ہوا ہے۔ مجھے دکھشا کی آواز آئی۔

"پریمی! میرے پاس واپس آ جاؤ۔ پاؤں پھسل گیا تو نیچے گر پڑو گے اور تمہاری ہڈیاں چور ہو جائیں گی۔"

میں واپس بیڈ روم میں آگیا۔

"دکھشا! یہ سب کچھ کیا ہے؟ اگر تم اپنے دیوی دیوتاؤں کی قسم کھا کر مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھے کل یہاں سے نکال کر دھرتی پر واپس لے جاؤ گی تو میں تمہارے سورگ میں ایک دن بڑے شوق سے گزار لوں گا۔"

دکھشا نے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے بازو اٹھا کر مجھے اپنی طرف بلایا اور بولی۔

"میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔ تمہیں وچن دیتی ہوں کہ کل تمہیں اپنے ساتھ یہاں سے لے جاؤں گی اور خود کاٹھیاواڑ پہنچا کر آؤں گی۔ اب تم خوش ہو جاؤ کیونکہ یہاں سورگ میں کوئی پریشان نہیں ہوتا۔ ہر کوئی خوش رہتا ہے۔ میرے پاس آ جاؤ۔"

مجھے اب بھی اس عیش پرست جادوگرنی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرے ساتھ کچھ ہونے والا تھا۔ یہ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی۔ لیکن میں مجبور تھا۔ اگر یہ کوئی طلسمی محل تھا یا جادو کی فضا تھی تو میں وہاں سے دکھشا کی مدد کے بغیر نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے دل میں یہی فیصلہ کیا کہ دکھشا جس طرح کہتی ہے اسی طرح کرتے جاؤ۔ ہو سکتا ہے یہ خوش ہو کر واقعی مجھے یہاں سے نکال کر کاٹھیاواڑ پہنچا دے۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔

"پریمی! آؤ میں تمہیں اپنے سورگ کی سیر کراتی ہوں۔"

وہ مجھے ساتھ لے کر کمرے کے کونے والے پردے کو اٹھا کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ سیڑھیاں اترے تو ہم ایک روشن روشن راہ داری میں آ گئے۔ جہاں نیم عریاں

نوجوان عورتیں دیوار کے ساتھ ادب سے کھڑی تھیں۔ دکھشا نے کہا۔

"یہ ہماری سورگ کی دیوداسیاں ہیں۔ پورن ماشی کی رات کو جب دیوتا لوگ یہاں آتے ہیں تو یہ دیوداسیاں ان کے سامنے رقص پیش کرتی ہیں اور دیوتاؤں کا جی بہلاتی ہیں۔"

راہ داری سے نکلتے ہوئے ہم ایک بہت بڑے دالان میں آ گئے۔ جہاں سنگ مرمر کے ستونوں کے ساتھ سفید اور سرخ پھولدار بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ درمیان میں حوض تھا جس میں فوارہ چل رہا تھا۔ حوض کے کنارے نیم عریاں لڑکیاں نیم دراز تھیں۔ کوئی ستار بجا رہی تھی، کوئی سوم رس کی چسکیاں لے رہی تھی۔ کوئی اپنے بال سنوار رہی تھی۔ کوئی حوض میں اشنان کر رہی تھی۔ ان کے سامنے چاندی کے طشت رکھے تھے جن میں طرح طرح کے پھل پڑے تھے۔ تین لڑکیاں گلاب پاش لیے ان پر چل پھر کر خوشبوئیں چھڑک رہی تھیں۔ دکھشا مجھے لے کر سنگ مرمر کے ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ دالان کی چھت نیلی تھی جس میں ستارے بنے ہوئے تھے۔ دکھشا کہنے لگی۔

"یہ ہمارے سورگ کا ایک باغ ہے۔ ہمارے سورگ میں اسی طرح کے کتنے ہی باغ ہیں۔"

میں نے کہا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے سورگ میں صرف دیوداسیاں ہی ہیں۔ مرد دیوتا کہیں بھی نظر نہیں آ رہے۔"

دکھشا نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ کہنے لگی۔

"تم ہی اس سورگ کے مرد دیوتا ہو۔ کیا تم نہیں ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں تو عام دنیا دار انسان ہوں، سنا ہے تمہارے دیوتا آدھے آدمی اور آدھے جن بھوت ہوتے ہیں۔"

دکھشا نے کہا۔

"آہستہ آہستہ ساری باتیں تمہاری سمجھ میں آ جائیں گی۔"

میں نے کہا۔

"میں پھر تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ تم نے مجھے بچن دیا ہوا ہے کہ تم مجھے کل یہاں سے زمین پر لے جاؤ گی۔"

وہ بولی۔

"مجھے یاد ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں سورگ کا دوسرا باغ دکھاتی ہوں۔"

ہم وہاں سے نکل کر ایک دوسرے دالان میں آ گئے۔ یہاں بھی پہلے دالان کی طرح عورتیں حوض کے گرد بیٹھی تھیں۔ کچھ نہا رہی تھیں فرق صرف اتنا تھا کہ ان عورتوں کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ میں نے دکھشا سے کہا۔

"انہوں نے کپڑے کیوں نہیں پہنے ہوئے؟"

وہ بولی۔

"یہ سورگ کا وہ باغ ہے جہاں عورتوں کے جسموں سے ان کے پاپ جھڑ جاتے ہیں۔"

مجھے یہ سب خرافات لگ رہی تھی۔ لیکن میں اندر سے حیران ضرور تھا کہ اگر یہ سب کچھ طلسم ہے یا نظر بندی کا کرشمہ ہے تو یہ عورت دکھشا بڑی زبردست جادوگر ہے۔ یقین کریں مجھے اس سے کچھ کچھ خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ میں اس وقت اس کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اس عورت کی تھوڑی تھوڑی خوشامد کرتے رہنا چاہیے۔ یہ اگر ناراض ہوگئی تو مجھے بے ہوش کر کے یہاں طلسمی دنیا میں لائی ہے تو یہاں سے کسی دوسری دنیا میں بھی پہنچا سکتی ہے۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"وشالی کہاں ہے؟ وہ یہاں کہیں نظر نہیں آتی۔"

دکھشا نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"تم اس کو کیوں یاد کرتے ہو؟ کیا تم اس سے پریم کرتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ میں وشالی سے بالکل پریم نہیں کرتا۔"

دکھشا نے میری گردن میں بازو ڈال دیا اور پوچھا۔

"تو پھر کس سے پریم کرتے ہو؟"

میں نے اس کو خوش کرنے کے خیال سے کہہ دیا۔

"میں تم سے پریم کرتا ہوں۔"

دکھشا نے جیسے بے اختیار ہو کر میرا منہ چوم لیا۔ کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آؤ' میں تمہیں ناگ دیوتا کے سورگ کی سیر کراتی ہوں۔"

وہ مجھے ایک نیم روشن راہ داری میں سے لیتی ہوئی ایک اور دالان میں لے گئی۔ وہاں جو منظر میں نے دیکھا اسے دیکھ کر ایک بار تو میرے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہاں بھی ایک حوض تھا جس کے کنارے کی روشوں پر قالین بچھے تھے۔ قالینوں پر عریاں' نیم عریاں عورتیں بال کھولے سانپوں کو ہاتھوں میں لیے انہیں پیار کر رہی تھیں۔ وہ سب نیم دراز تھیں اور کچھ سانپ ان کے جسموں پر بھی رینگ رہے تھے۔ دکھشا نے کہا۔

"یہ ناگ دیوتا کی دیوداسیاں ہیں۔ یہ ناگ دیوتا کی پوجا کر رہی ہیں۔"

دکھشا قالین پر بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ پھر اس نے ایک عورت کو اشارہ کیا۔ وہ عورت سانپ لیے دکھشا کے پاس آ گئی۔ ایک سانپ اس کی گردن میں لپٹا ہوا تھا۔ ایک سانپ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے دکھشا کو جھک کر پرنام کیا۔ دکھشا نے کہا۔

"ناگ دیوتا' مجھے دے دو۔"

عورت نے سانپ دکھشا کو دے دیا۔ سانپ دکھشا کی کلائی سے لپٹ گیا۔ پھر اچانک سانپ پھن اٹھا کر اپنی لال لال آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اس سانپ نے میرے جسم سے نکلنے والی سانپ کی بو کو محسوس کر لیا ہے اور

ہو سکتا ہے کہ اس نے پہچان بھی لیا ہو کہ میں کبھی کبھی سانپ کا روپ اختیار کر لیتا ہوں۔ دکھشا بھی سانپ کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔

"پریمی! تم ناگ دیوتا کو پسند آ گئے ہو۔ دیکھو ناگ دیوتا کتنی محبت سے تمہاری طرف دیکھ رہا ہے۔ لو۔ تم بھی ناگ دیوتا کو پیار کرو۔"

اس نے سانپ کو میری طرف بڑھایا تو سانپ نے زور سے پھنکار ماری اور اپنا پھن پیچھے کر لیا۔ جیسے میرے پاس آتے ہوئے گھبرا رہا ہو۔ میں سمجھ گیا تھا کہ سانپ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ مگر یہ بات دکھشا کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ وہ کچھ حیران ضرور ہوئی۔ کہنے لگی۔

"تم مسلمان ہو۔ شاید اس لیے ناگ دیوتا تمہارے قریب نہیں جانا چاہتا۔"

اس نے سانپ کو اپنے منہ کے پاس لا کر کہا۔

"ناگ دیوتا! مجھے اپنا سوم رس چکھاؤ۔ میں تمہاری دیوداسی دکھشا ہوں۔"

سانپ بار بار اپنی زبان باہر نکال رہا تھا۔ یہ سانپ کی عادت ہوتی ہے۔ دکھشا نے اب اپنی زبان باہر نکال لی تھی۔ پھر اس نے سانپ کی زبان اپنی زبان کے ساتھ لگا دی۔ سانپ نے پھنکارتے ہوئے جیسے دکھشا کی زبان پر ڈس دیا تھا مگر دکھشا نے کسی قسم کی تکلیف کا اظہار نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کی زبان سے سرخ خون کے تین چار قطرے نکل کر اس کے ہونٹوں سے بہتے دیکھے۔ خوف کی سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ دکھشا اپنی زبان ہونٹوں پر پھیر کر خون کے قطرے پی گئی۔ اس نے سانپ قریب کھڑی عورت کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"ناگ دیوتا کی جے ہو۔ اس کو لے جا کر اپنا دودھ پلاؤ۔"

عورت نے سانپ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور جھک کر پرنام کرتی واپس چلی گئی۔ دکھشا پر کچھ نشہ سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ سر کو آہستہ آہستہ دائیں بائیں ہلا رہی تھی۔ میں اسے ششدر سا ہو کر دیکھ رہا تھا۔ دکھشا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ بہت گرم تھا۔ میں نے کہا۔

"دکھشا! تمہیں تو بخار ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔

"یہ پریم کا بخار ہے میری پریمی۔ آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں ناگ دیوتا کا رقص دکھاؤں گی۔"

وہ مجھے دالان سے گزارتی ایک کمرے میں لے آئی۔ اس کمرے میں ناگ دیوتا کی مورتی دیوار میں لگی تھی۔ مورتی سانپ کی تھی جس کا پھن اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ مورتی کے آگے تھالی میں دیے روشن تھے۔ تھالی میں پھول بھی رکھے ہوئے تھے۔ فرش پر قالین بچھے تھے۔ میں حیران تھا کہ اتنے سارے قالین یہاں کہاں سے آگئے ہیں۔ دیوار کے ساتھ تخت بچھا تھا جس پر گاؤ تکیے لگے تھے۔

"تم تخت پر بیٹھ جاؤ۔ میں ناگ دیوتا کا رقص کروں گی۔ ناگ دیوتا کی پوجا کروں گی۔"

میں بے دام غلام کی طرح اس کے حکم پر عمل کرتے ہوئے تخت پر آکر بیٹھ گیا۔ یہاں دیوار میں سے باہر نکلے ہوئے چھوٹے سے تختے پر تین دیے روشن تھے۔ اس کے سوا وہاں اور کوئی روشنی نہیں تھی۔ فضا بڑی خواب آلود تھی۔ فضا میں عجیب قسم کی سر کو بوجھل کر دینے والی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ دکھشا ناگ کی مورتی کے آگے جا کر دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ وہ کچھ منہ میں پڑھتی رہی۔ پھر اس نے مورتی کے آگے ماتھا ٹیکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا لباس اتار کر ناگ مورتی کے آگے رکھ دیا اور جوڑا کھول کر بالوں کو ایک جھٹکے سے بکھرا دیا۔

یا اللہ خیر! یہ میرے ساتھ تقدیر کیا مذاق کر رہی ہے۔

دکھشا نے ناگ رقص شروع کر دیا۔ وہ عجیب و غریب انداز میں رقص کر رہی تھی۔ کبھی ناگن کی طرح اس کے منہ سے پھنکار کی آواز نکلتی اور وہ مورتی کو ڈسنے کے لیے آگے بڑھتی۔ کبھی اپنے سر کو پیچھے کی طرف ڈھلکا لیتی۔ کبھی قالین پر لیٹ کر

سانپ کی طرح رینگنے لگتی۔ کبھی ایک دم سے دونوں بازو اوپر اٹھا کر ہاتھوں کو سانپ کے پھن کی طرح کھول لیتی۔ میں بت بنا اسے تک رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ عورت مجھے جس طلسمی دنیا میں لے آئی ہے۔ شاید یہ مجھے یہاں سے کبھی واپس نہیں جانے دے گی۔ مجھے وہاں ابھی تک کوئی دوسرا مرد نظر نہیں آیا تھا۔

اب دکھشا نے ناگن کی طرح رقص کرتے کرتے میری طرف پلٹ کر دیکھا مجھے دور ہی سے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی سرخ آنکھوں میں سے چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں۔ میں اس عورت کی گردن توڑ کر اسے ہلاک بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں جہاں آگیا ہوں یا پہنچا دیا گیا ہوں وہاں سے واپسی کا راستہ کون سا ہے۔ مجھے تو وہم ہونے لگا تھا کہ مجھ پر طلسم کر دیا گیا ہے اور میں واقعی بادلوں میں تیر رہا ہوں۔ خدا جانے یہ وہاں کی فضا کا اثر تھا یا کیا تھا۔ دکھشا اٹھ کر سانپ کی طرح بل کھاتی میرے پاس تخت پر آگئی اور اس نے وحشیانہ انداز میں مجھے بالوں سے پکڑ کر زور سے نیچے کھینچا اور تخت پر گرا دیا۔ میں نے فوراً اس کے ہاتھوں کو زور سے جھٹکا دیا اور اس کی گردن کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ دکھشا مسکرا رہی تھی۔ اس پر میرے تشدد کا الٹا اثر ہوا تھا۔





اس منحوس کمرے میں بڑی ناگوار بو پھیل گئی تھی۔

اس ناگوار بو میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے میرا سر چکرانے لگا تھا۔ میری طاقت جیسے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ میں بازو اوپر اٹھاتا تو وہ تھوڑی دیر کے بعد اپنے آپ نیچے گر پڑتا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ وشالی بھی کمرے میں آ گئی۔ وہ بھی دکھشنا کے ساتھ مل گئی۔ اب ان دونوں عورتوں نے مجھ پر تشدد کرنا شروع کر دیا۔ میں نے تخت سے اٹھ کر باہر کو بھاگنے کی کئی بار کوشش کی لیکن میرے جسم نے جواب دے دیا۔ دونوں عورتیں مجھ پر اس طرح ٹوٹ پڑی تھیں جیسے بھوکی لومڑیاں اپنے شکار پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ آخر میری ہمت جواب دے گئی اور مجھ پر غشی طاری ہونے لگی اور اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

ہوش اس وقت آیا جب ایک منحوس دیوداسی مجھے بازو سے ہلا کر جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اس عورت کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا۔ اس نے کہا۔

"پریمی جی! یہ پی لو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے گلاس لے کر منہ سے لگایا اور پی گیا۔ وہ دودھ تھا جس میں خدا جانے کیا کچھ ملایا گیا تھا۔ دودھ پینے سے میرے ہوش و حواس کچھ بحال ہو گئے۔ میں نے دیوداسی کو بازو سے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور کہا۔

"یہاں سے باہر جانے کا راستہ بتاؤ نہیں تو میں ابھی تمہارا گلا دبا دوں گا۔"
وہ عورت رونے لگی۔ بولی۔
"پریمی جی! یہاں سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے ہم آکاش پر ہیں۔"
وہ زارو قطار ہو رہی تھی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور اٹھ کر دروازے کے پاس جا کر دیکھا کہ وہی عالم تھا۔ دروازے کے آگے بادل ہی بادل تھے اور بادلوں کے درمیان سے نیچے دور زمین کے درخت اور کھیت اور پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں خوف کے مارے جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے لگا کہ میں کسی جیٹ ہوائی جہاز میں سفر کر رہا ہوں اور کسی نے جہاز کا دروازہ کھول دیا ہے۔ میں جلدی سے واپس ہوا اور دیو داسی کو بالوں سے پکڑ لیا۔
"تم یہاں سے باہر کیسے جاؤ گی؟"
اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
"پریمی جی! ہم بادلوں میں چل کر آتے جاتے ہیں۔"
مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے اسے کہا۔
"میرے سامنے کمرے سے باہر نکل کر دکھاؤ۔"
اس نے خالی گلاس ہاتھ میں لیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ دروازے کے پاس آئی اور یوں اطمینان سے دہلیز پار کر کے بادلوں میں چلتی ہوئی ایک طرف جا کر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے باہر قدم رکھا تو میرا پاؤں نیچے لٹک گیا۔ میں نے جلدی سے پاؤں اوپر کر لیا۔ یا خدا! یہ کیا جادو ہے؟ صاف ظاہر تھا کہ اگر میں نے باہر قدم رکھا تو میں بادلوں میں لڑھکتا ہوا نیچے زمین سے جا کر ٹکراؤں گا اور میری ہڈیاں بھی چورا بن جائیں گی۔ مگر وہ دیوداسی کیسے بادلوں میں چل پڑی تھی؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں انتہائی مایوسی کے عالم میں تخت پر آ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کبھی میں اس جہنم سے نکل سکوں گا؟
امید کی ایک ہی صورت نظر آتی تھی کہ مجھ پر اچانک دورہ پڑ جائے اور میں

انسان سے سانپ بن جاؤں اور ایسا ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ کیونکہ میرے اس دورے کو میری مصیبت یا خوشی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ دورہ اندھا اور اتفاقیہ تھا۔ کبھی ہفتے میں دو دو بار پڑ جاتا تھا اور کبھی مہینوں گزر جاتے تھے اور نہیں پڑتا تھا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ یہ دن کا وقت ہے یا رات کا وقت ہے۔ میں زمین پر ہوں یا آسمان پر ہوں' یا زمین اور آسمان کے درمیان لٹک رہا ہوں۔ کسی وقت لگتا یہ سب کچھ جاگتے میں میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ کسی وقت لگتا کہ میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ ناگ کی منحوس مورتی کے پاس آکر میں نے اسے غور سے دیکھا' یہ سیاہ پتھر کی بنی ہوئی مورتی تھی۔ سانپ کی آنکھوں میں سرخ موتی جڑے ہوئی تھے۔ تھالی میں دیے جل رہے تھے۔ میں نے دیواروں پر نگاہ ڈالی۔ پھر مایوس ہو کر تخت پر جا کر لیٹ گیا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد وہی دیوداسی ایک بار پھر غیب سے نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ اس نے گلاس میری طرف بڑھایا' تو میں نے بڑی محبت کے ساتھ اس سے اس کا نام پوچھا۔

کہنے لگی۔

"مجھے اپنا نام یاد نہیں۔ یہاں کسی بھی دیوداسی کو اپنا نام یاد نہیں ہے۔ ہمیں صرف دیوداسی کہہ کر بلایا جاتا ہے۔ یہی ہمارا نام ہے۔"

یہ سانولے رنگ کی بڑی تیکھی آنکھوں اور تیکھے نقش والی لڑکی تھی۔ ساڑھی اس نے بھی اس طرح سے باندھ رکھی تھی کہ اس کا ایک بازو اوپر تک ننگا تھا۔ میں دودھ پینے لگا اور اس سے کہا۔

"تم مجھے یہاں کی سب دیوداسیوں سے زیادہ سندر لگتی ہو تم کہاں کی رہنے والی ہو؟"

اس نے کہا۔

"ہمیں یہ بتانے کی اجازت نہیں ہے۔ ویسے میں اسی سورگ میں پیدا ہوئی تھی۔"

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ وہ سمٹ گئی۔ میں نے کہا۔

"دیوی! میں تجھے دیوداسی نہیں دیوی کہوں گا۔ تم مجھے دیوی ہی لگتی ہو بلکہ تم اصل میں دیوی ہی ہو۔ سرسوتی دیوی۔"

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"نہیں، نہیں یہ پاپ ہے میں سرسوتی دیوی کے چرنوں کی پجارن ہوں۔ میں سرسوتی دیوی نہیں ہوں۔"

میں آہستہ آہستہ اس کے بازو پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ وہ سمٹتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"تم دیوی ہو۔ تم سرسوتی دیوی کی اوتار ہو۔ مجھے تم سے پریم ہوگیا ہے۔ میں تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ تم میری پریمکا ہو۔"

دیوداسی پر میری محبت بھری جھوٹی باتوں کا بالکل سچا اثر ہو رہا تھا۔ میں محبت کے نقلی ڈرامے میں اور زیادہ اصلیت کا رنگ بھرنے لگا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور کہا۔

دیوی! کیا تم مجھ سے بیاہ کرو گی؟"

وہ جذباتی آواز میں بولی۔

"مگر تم تو دیوی دکھشا سے پیار کرتے ہو۔"

میں نے کہا۔

"کہاں دکھشا اور کہاں تم! کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی! تم سندرتا میں شکنتلا کو مات کرتی ہو۔ تم ہیما مالینی اور مدھو بالا سے بھی زیادہ حسین ہو۔"

اس زمانے میں ان دونوں اداکاراؤں کا بڑا عروج تھا۔ وہ بولی۔

"دکھشا دیوی تو سب کے سامنے کہہ رہی تھی کہ تم سوائے اس کے اور کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔"

میں نے کہا۔

"وہ غلط کہتی تھی۔ میں تو صرف تمہارا دیوانہ ہوں، صرف تم سے پریم کرتا

ہوں۔ میں تم سے بیاہ کر کے تمہیں اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔ دیوی! بتاؤ تم مجھ سے بیاہ کرو گی ناں؟"

وہ میرے ڈرامے کی تیز لہر میں بہہ گئی تھی یا شاید وہ پہلے ہی سے کسی محبت کرنے والے کی تلاش میں تھی۔ کہنے لگی۔

"مگر یہاں کوئی دیوداسی کسی سے بیاہ نہیں کر سکتی۔"

میں نے کہا۔

"کیوں؟ یہاں بیاہ کرنا منع ہے؟"

وہ بولی۔ "نہیں اس لیے کہ یہاں کوئی مرد ہے ہی نہیں۔ اس سورگ میں صرف استریوں کا راج ہے۔ صرف عورتوں کی حکومت ہے۔ یہاں کسی مرد کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن آکاش کے دیوتا تو آتے ہیں۔"

اس نے کہا۔

"دیوتا دیوتا ہوتے ہیں۔ وہ جب اور جس وقت چاہیں آ سکتے ہیں اور دیوداسیوں سے دل بہلا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر چلو ہم یہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔ ہم زمین پر' دھرتی پر جا کر بیاہ کر کے سکھ چین کی زندگی بسر کریں گے۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ وہ کچھ غور کر رہی تھی' کچھ سوچ رہی تھی۔ شاید اسے میری تجویز پسند آ گئی تھی۔ میں نے گرم لوہے پر ایک اور ضرب لگاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں اچھی اچھی ساڑھیاں لا کر دوں گا۔ ہم دوسرے شہروں کی سیر کریں گے۔ میں تمہیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گا۔"

دیوداسی پر میرے نقلی مکالمے اثر کر چکے تھے۔ اس نے میری آغوش سے نکلتے

ہوئے کہا۔

"میں رات کو آکر تمہیں بتاؤں گی۔"

میں نے کہا۔

"تو کیا یہ دن کا وقت ہے؟ یہاں تو دن کے وقت بھی رات ہی لگتی ہے۔"

اس کے بعد وہ گلاس طشت میں رکھ کر دوڑ کر دروازے میں سے نکل گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے اس نے دروازے میں سے باہر بادلوں میں چھلانگ لگا دی ہو۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا یہ لڑکی اپنے فیصلے کو تبدیل تو نہیں کر دے گی؟ کہیں یہ دکھشا یا وشالی کو تو نہیں بتا دے گی کہ میں وہاں سے فرار ہونے کا پلان بنا رہا ہوں؟ اگر اس نے ان دونوں میں سے کوئی حرکت نہ کی تو کیا اس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ مجھے یہاں سے باہر نکال سکے۔ وہ تو خود کہہ رہی تھی کہ ہم یہاں سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ وہ تو خود مجھے اپنی طرح بے بس لگ رہی تھی۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔

وہ یہ کہہ گئی تھی کہ وہ رات کو آئے گی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ دن کا وقت تھا۔ میں اٹھ کر دروازے پر گیا۔ اسے کھول کر نیچے دیکھا۔ باہر اسی طرح بادل ہی بادل چھائے ہوئے تھے اور بادلوں کے شگاف میں سے کہیں کہیں نیچے بہت دور زمین پر کھیتوں اور پہاڑیوں پر دھوپ چمکتی دکھائی دے رہی تھی۔ ایسا منظر ہوائی جہاز میں سے نظر آیا کرتا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ میری نظر کا دھوکہ نہ ہو۔ کہیں ان لوگوں نے یہاں میری نظر بندی نہ کر دی ہو۔ میں دروازے کی دہلیز کے پاس ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ نیچے ڈال کر ہلایا۔ باہر واقعی خلا تھا کوئی فرش یا راہ داری وغیرہ نہیں تھی۔ مجھے ایک خیال آ گیا۔ میں نے تخت پر سے ایک تکیہ اٹھایا اور اسے دروازے کے باہر گرا دیا۔ تکیہ نیچے زمین کی طرف جانے کی بجائے باہر اس طرح پڑا رہا جیسے فرش پر گرا ہو۔ میں نے ہاتھ آگے کر کے تکیئے کو پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

یا خدا! یہ کیا ماجرا ہے۔ تکیئے کو کیسے فرش میسر آ گیا۔ میں نے ایک پاؤں باہر نکل کر فرش پر لگانا چاہا لیکن میرا پاؤں فرش پر لگنے کی بجائے نیچے خلا میں لٹک گیا۔ میں نے

جلدی سے اپنا پاؤں اوپر کھینچ لیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اگر کوئی نظر بندی یا طلسم ہے تو صرف انسانی حواس کے لیے ہے۔ غیر محسوس مادی چیزوں پر اس طلسم کا اثر نہیں ہوتا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اور تخت پر آکر پڑ گیا۔ مجھے گلاس میں جو کچھ پلایا گیا تھا اس سے میرے جسم میں کافی ترو تازگی اور توانائی آگئی تھی۔ میں نے تکیئے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر مجھے نیند آگئی۔ جانے میں کتنی دیر تک سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو چار دیوداسیاں مجھے بڑی محبت سے جگا رہی تھیں۔ کوئی میرے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھی، کوئی میرے بازو دبا رہی تھی، کوئی میری ہتھیلیوں پر اپنے ہاتھ سے مالش کر رہی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "کیا بات ہے؟ تم کس لیے آئی ہو؟"

ان میں سے ایک موٹی آنکھوں والی دیوداسی نے مسکرا کر کہا۔

"پریم جی! ہم تمہیں لینے آئی ہیں۔"

"کہاں؟ کہاں لے جا رہی ہو مجھے؟ میں نہیں جاؤں گا۔"

میں پہلے ہی سے ان عورتوں کے تشدد سے ڈرا ہوا تھا۔ چاروں دیوداسیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ تیکھی ناک والی دیوداسی نے کہا۔

"مہاراج! آپ کو اشنان کروا کر نئے ریشمی کپڑے پہنا کر آکاش کی سیر کرائی جائے گی۔ چلیئے اٹھیئے۔ آجائیں ہمارے ساتھ آپ کو آکاش کی سیر سے بڑی خوشی ہوگی۔"

اور وہ مجھے کھینچتی ہوئی دروازے کی طرف لے گئیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دروازے کے باہر بادلوں کی طرف دوڑتی ہوئی جا رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ دروازے سے باہر کھینچ لیا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ میرے حلق سے خوف کے مارے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے پاؤں زمین سے ٹکرا گئے اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ میں ایک نیم روشن راہ داری میں سے گزر رہا تھا۔ دیوداسیاں مجھے کھینچتی ہوئی ایک کشادہ ہال کمرے میں لے گئیں جہاں دیواروں پر کیسری رنگ کے ریشمی پردے گرے ہوئے تھے۔ فرش پر قالین بچھے تھے۔ ان پر گلاب اور گیندے کے پھولوں کے ہار بکھرے ہوئے تھے اور

پہلے ہی سے دس بارہ دیوداسیاں جیسے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے قالین پر گرا دیا اور آن کی آن میں مجھ پر بھوکی لومڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑیں۔

اس کے بعد میرا کیا حال ہوا میں بیان نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ مجھ پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ میں بالکل ادموا ہو کر نیم بے ہوش ہوگیا۔ اس کے بعد بھی ان لومڑیوں نے مجھے معاف نہ کیا اور مجھ پر اپنا تشدد جاری رکھا۔ وہاں بھی ناگ مورتی والے کمرے کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میرا سر چکرانے لگا تھا اور میرے حواس جواب دینے لگے تھے۔ آخر مجھ سے برداشت نہ ہوسکا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ نہ جانے کب تک بے ہوش پڑا رہا ہوں گا کہ کسی نے مجھے کندھے سے ہلایا۔

"پریمی اٹھو۔ میرے پریمی اٹھو۔"

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہی تیکھے نین نقش والی دیوداسی مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھا تو میرا سر چکرا گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دیوداسی میرے سر کو دبانے لگی۔ پھر اس نے قریب رکھا ہوا گلاس والا دودھ میری طرف بڑھا کر کہا۔

"اس کو پی لو۔ پھر ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔"

یہ سن کر میرے تن ناتواں میں جیسے جان پڑ گئی۔ میں جلدی سے دودھ والا گلاس چڑھا گیا اور دیوداسی سے کہا۔

"جلدی چلو۔"

وہ اٹھ کر دروازے پر گئی۔ باہر جھانک کر راہ داری میں دیکھا۔ واپس آکر کہنے لگی۔

"آجاؤ۔ اس وقت سب سو رہے ہیں۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم نیم روشن راہ داری میں سے تیز تیز قدموں سے چلنے لگے۔ راہ داری ایک جگہ گھومی تو سامنے دیوار آگئی۔ دیوداسی نے آگے بڑھ کر فرش سے ایک تختہ اوپر اٹھا دیا۔ نیچے سیڑھیاں تھیں۔ میں اس کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ یہ

کوئی تہہ خانے کا غار تھا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ دیوداسی میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنے ساتھ چلا رہی تھی۔ ایک جگہ روشنی دکھائی دی۔ ہم ایک اور راہ داری میں آ گئے۔ یہاں دیوار پر کہیں کہیں لالٹین روشن تھیں۔ دیوداسی نے آہستہ سے کہا۔

"خبردار! پاؤں کی آہٹ پیدا نہ ہو۔"

میں پاؤں دبا دبا کر چلنے لگا۔ راہ داری ایک دالان کے دروازے پر جا کر ختم ہو گئی۔ آگے دالان میں قالینوں پر جگہ جگہ عریاں اور نیم عریاں دیوداسیاں گہری نیند سو رہی تھیں۔ ہم دبے پاؤں ستونوں کے قریب سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہمارے پیچھے کسی مرد کی آواز بلند ہوئی۔

"ان کو پکڑ لو۔"

اس کے ساتھ ہی سامنے سے چھ سات ہٹے کٹے حبشی ہاتھوں میں سٹین گنیں لیے نمودار ہوئے اور انہوں نے ہمیں اپنی حراست میں لے لیا۔ دیوداسی خوف کے مارے کانپنے لگی۔ یہ حبشی اسی قسم کے حبشی تھے جیسے میں نے شیطان صفت جاگیردارنی کی حویلی میں دیکھے تھے۔ پیچھے سے جس آدمی نے آواز دی تھی وہ بھی آ گیا۔ ہٹا کٹا حبشی تھا۔ سر پر طوطے کے پروں والی ٹوپی تھی۔ ایک برین گن کاندھے سے لٹکی ہوئی تھی۔ ایک سٹین گن اس کے ہاتھ میں تھی جس کا رخ ہماری طرف تھا۔

اسی وقت میرے اور دیوداسی کے ہاتھ رسی سے پیچھے باندھ دیے گئے اور حبشی سپاہی ہمیں کھینچتے ہوئے ایک کوٹھڑی میں لے آئے۔ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ انہوں نے ہمیں اندر دھکیل کر کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے باہر تالا لگا دیا۔ ہم اندھیرے میں حیران پریشان اٹھ کر بیٹھ گئے۔ مجھے دیوداسی کے ہولے ہولے سسکیاں لینے کی آواز آئی۔ میں نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دیوی! گھبراؤ نہیں۔ ہم یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ خدا ضرور ہماری مدد کرے گا۔"

میں نے یونہی اسے اور کچھ اپنے آپ کو تسلی دینے کے خیال سے یہ جملہ کہہ دیا

تھا' ورنہ وہاں سے فرار ناممکن تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہمارا کیا حشر ہونے والا تھا۔ یہ ہٹے کٹے حبشی سپاہی دکھشا نے شاید اسی لیے وہاں رکھے ہوئے تھے کہ کوئی فرار نہ ہونے پائے۔ ہم اندھیرے میں بے بسی کی حالت میں بیٹھے رہے۔ خدا جانے کتنا وقت گزر گیا ہو گا کہ باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ کھلا۔ راہداری کی ہلکی سی روشنی اندر آئی۔ یہ چار حبشی تھے۔ انہوں نے سٹین گنیں ہاتھوں میں لے رکھی تھیں۔ ہمیں کوٹھڑی میں سے گھسیٹ کر نکالا گیا اور گھسیٹتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئے۔ اس کمرے میں دکھشا ایک شاندار بڑی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے دو دیوداسیاں کھڑی مور کے پروں کے مورچھل ہلا رہی تھیں۔ اس نے مجھے اور دیوداسی کو قہر بھری نظروں سے دیکھا اور حبشی سپاہیوں سے کہا۔

"ان دونوں نے سورگ کے اصولوں کو توڑا ہے۔ انہوں نے مہا پاپ کیا ہے۔ انہیں اس کی سزا مل کر رہے گی۔"

دیوداسی سجدے میں گر پڑی اور گڑگڑا کر کہنے لگی۔

"مہا میا! مجھ پر رحم کرو۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے بھول ہو گئی' مجھ پر دیا کرو۔ میں معافی مانگتی ہوں۔"

دکھشا کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ وہ مجھے بھی نہیں پہچان رہی تھی۔ دکھشا نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر ہماری موت کا حکم صادر کر دیا۔ کہنے لگی۔

"ان دونوں کو مہا ناگ کی غار میں پھینک دو۔ لے جاؤ ان کو۔"

دیوداسی کا تو برا حال ہو رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ گڑگڑا' گڑگڑا کر دکھشا سے رحم کی اپیل کر رہی تھی مگر دکھشا نے جیسے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لی تھیں۔ وہ اٹھ کر جا چکی تھی۔ مسلح حبشی ہم دونوں کو کھینچتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ ایک نیم تاریک راہداری میں سے گزرنے کے بعد سیڑھیاں آ گئیں۔ سیڑھیوں کے آگے ایک بند دروازہ تھا۔ یہاں آتے ہی دیوداسی نے چیخ ماری اور گڑگڑا کر حبشیوں سے کہا۔

"مجھے مہا ناگ کے غار میں نہ ڈالو۔ مجھے مہا ناگ کے غار میں نہ پھینکو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

ایک حبشی نے ہمارے ہاتھ کھول دیئے۔ دوسرے حبشی نے غار کے دروازے کی چھوٹی کھڑکی ذرا سی کھولی اور ہم دونوں کو باری باری دھکا دے کر اندر گرا دیا اور کھڑکی فوراً بند کر دی۔ اندر اندھیرے میں گرتے ہی دیوداسی کی گھگی بندھ گئی۔ اس پر موت کا خوف پوری طرح حاوی ہوچکا تھا۔ اتنے میں اندھیرے میں پھنکار کی آواز آئی۔ دیوداسی نے چیخ ماری اور میرے ساتھ لپٹ گئی۔ یہ پھنکار کسی بڑے سانپ کی تھی' میں نے پھنکار سے پہچان لیا تھا۔ غار میں اس بڑے سانپ کی ایک خاص قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ غار میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں اگر سانپ کے روپ میں ہوتا تو اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا' لیکن میں انسانی روپ میں تھا اس لیے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک اس گھپ اندھیرے میں ایک طرف سے ہلکی سی روشنی نمودار ہوئی۔ دیوداسی میرے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ خوف کے مارے اس کا دل مجھے دھک دھک کرتا صاف محسوس ہو رہا تھا۔

میری نگاہیں اس دھندلی سی روشنی کو دیکھ رہی تھیں جو غار میں ایک طرف نمودار ہوئی تھی اور پھیلتی جا رہی تھی۔ اندھیرا کم ہو رہا تھا۔ میں نے غار کے آخری سرے پر سے ایک بڑے سانپ کو دیکھا جس کا کافی بڑا پھن کھلا تھا۔ یہ روشنی اس کی آنکھوں میں سے نکل رہی تھی۔ میں نے ایسا سانپ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ سانپ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ مجھ سے پانچ چھ قدموں کے فاصلے پر آ کر رک گیا۔ وہ کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کا پھن زمین سے کچھ نہیں تو چار فٹ ضرور بلند تھا۔ کافی بڑا سانپ تھا۔ میں نے اپنے آپ کو تقدیر یا حالات کے حوالے کرنے کی بجائے سانپ کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سانپ کے منہ سے اب پھنکاریں نہیں نکل رہی تھیں۔ دیوداسی کی دہشت کے مارے آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ وہ میرے پیچھے سمٹی سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں نے سانپ کی گردن دبوچنے کے لیے ایک

خاص پوزیشن بنائی اور آگے بڑھا ہی تھا کہ سانپ نے اپنا پھن سمیٹ لیا اور پیچھے ہٹنے لگا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ اپنے بچاؤ کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اچانک سانپ نے اپنے منہ کو کھولا اور آگے کو جھٹک دیا۔ اس کے منہ سے سیاہ رنگ کا ایک موتی نکل کر میری طرف لڑھکتا ہوا آیا تو دیوداسی نے فرط مسرت سے گھبرا کر کہا۔

”مہا ناگ نے تمہیں اپنا دوست بنا لیا ہے۔ اس نے اپنا قیمتی مہرہ تمہیں بخش دیا ہے۔ یہ مہرہ مہا ناگ نے آج تک رات دن پوجا کرنے والے اپنے پجاریوں کو بھی نہیں دیا۔“

میں نے سیاہ موتی جس کو دیوداسی نے مہرہ کہا تھا اٹھا کر غور سے دیکھا۔ وہ ایک عام قسم کا سیاہ پتھر تھا مگر اس کے اندر سے جیسے ہلکی ہلکی کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے سانپ کی طرف دیکھا۔ سانپ نے اب اپنا پھن کھول لیا تھا۔ سانپ نے اپنے پھن کو یوں آگے پیچھے لہرایا جیسے کہہ رہا ہو۔

”ہاں۔ یہ مہرہ تمہارے لیے ہے اسے رکھ لو۔“

میں نے سانپ کا مہرہ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ دیوداسی کا خوف اب دور ہو گیا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑے بار بار سانپ کے آگے سر جھکا کر کوئی اشلوک پڑھ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس مہا ناگ کا یا جو کوئی سانپ بھی وہ تھا اس نے میرے جسم سے نکلنے والی سانپ کی مخصوص بو کو محسوس کر لیا ہے اور وہ سمجھ گیا ہے کہ میں وہ انسان ہوں جو سانپ بھی بن سکتا ہوں یا بن جاتا ہوں۔ اس مہا ناگ نے میری عزت افزائی کی تھی۔ اس نے مجھے نہ صرف اپنی نسل کا سانپ سمجھا تھا بلکہ اپنے سے برتر سانپ بھی سمجھا تھا کیونکہ میں سانپ سے انسان کی شکل اختیار کر سکتا تھا۔

مہا ناگ نے اپنا پھن سمیٹا اور جدھر سے آیا تھا اسی طرف کو چلا گیا۔ میں نے دیوداسی سے کہا۔

”تمہارے مہا ناگ نے تو ہمیں کچھ نہیں کہا۔ اب یہ بتاؤ کہ یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ تمہیں معلوم ہے؟؟“

دیوداسی نے میرے پاؤں چھو لیے اور کہنے لگی۔

"مہاراج آپ مہا ناگ کے اوتار ہیں۔ مہا ناگ نے آپ کو اپنا مہرہ ارپن کیا ہے۔ آپ کے صدقے میری جان بھی بچ گئی۔"

میں نے اسے کہا۔

"ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ یہاں سے نکلیں کیسے؟"

سانپ کے چلے جانے کے بعد غار میں اندھیرا ہوگیا تھا۔ دیوداسی کہنے لگی۔

"مہاراج! جدھر مہا ناگ جی گئے ہیں اسی طرف چلیں۔ شاید ادھر کوئی باہر جانے کا راستہ ہو۔"

میں اندھیرے میں دیوار کا سہارا لیے جس طرف سانپ گیا تھا اسی طرف چل پڑا۔ دیوداسی نے میرے کندھے کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ غار آگے جا کر ایک طرف کو مڑ گئی تھی۔ سانپ کے بارے میں مجھے اطمینان تھا کہ وہ ہمیں کچھ نہیں کہے گا۔ تھوڑا اور آگے گئے تو مجھے ایسی آواز آنے لگی جیسے پانی گر رہا ہو۔ دیوداسی بولی۔

"مہاراج! میں نے سنا ہے کہ اس کے نیچے ایک ندی بہتی ہے۔ شاید یہ وہی ندی ہے۔"

میرے کان پانی کے گرنے کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ پھر دھندلی روشنی کا غبار سا پھیلا ہوا دکھائی دینے لگا۔ پانی کی آواز زیادہ قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ پھیکی روشنی کے غبار میں ہم غار میں ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں ایک تنگ سی ندی پتھروں کے درمیان بہہ رہی تھی۔ ندی آگے جا کر ایک طرف کو گھوم گئی تھی۔ ندی کی ایک جانب دیوار تھی۔ دوسری جانب پتھروں پر چلنے کا فٹ پاتھ سا بنا ہوا تھا۔ یہاں اندھیرا زیادہ نہیں تھا۔ روشنی کا غبار اس طرف سے آ رہا تھا جس طرف ندی گھوم جاتی تھی۔ ہم ندی کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ مجھے تازہ ہوا کا بھی احساس ہوا۔ یہ ندی ضرور کسی

کھلی جگہ پر جا کر نکلتی تھی۔ ندی کے ساتھ ہم بھی مڑ گئے۔

سامنے ایک بہت بڑا گول سوراخ دکھائی دیا جس میں دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم اس سوراخ کی طرف بڑھے جو اس غار کا دہانہ تھا۔ وہاں سے ندی ایک جانب نشیب میں اتر گئی تھی۔ میں نے کھلی فضا میں آتے ہی خدا کا شکر ادا کیا اور اوپر آسمان پر نگاہ ڈالی۔ آسمان پر کوئی ستارا نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید بادل چھائے ہوئے تھے۔ ان بادلوں میں سے ستاروں کی روشنی دھندلے اجالے کی شکل میں باہر آ رہی تھی۔

دیوداسی اپنے بھگوان کا شکر ادا کرنے لگی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"تم لوگوں نے جو خیالی سورگ بنا رکھا تھا وہ محض ایک دھوکا تھا۔ ورنہ یہ ندی زمین پر کیسے آ سکتی تھی۔"

دیوداسی کہنے لگی۔

"مہاراج! ہمیں تو کچھ معلوم نہیں ہے۔ دکھشتا جی نے ہمیں یہی کہا تھا کہ یہ سورگ دیوتاؤں نے اپنے بسرام کے لیے آکاش کے بادلوں میں بنایا ہوا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ان فضول باتوں کو بھول جاؤ اور غور سے دیکھ کر بتاؤ کہ کیا تم اس جگہ کو پہچانتی ہو؟"

میرا خیال تھا کہ یہ عورتیں اسی علاقے کی رہنے والی ہوں گی اور ہو سکتا ہے دیوداسی کو معلوم ہو کہ یہاں سے کسی دوسرے شہر کو کون سا راستہ جاتا ہے۔ دیوداسی چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس نے کہا۔

"مہاراج! میں یہ جگہ پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"تو پھر میرے ساتھ آ جاؤ۔"

میں اسے لے کر جنوب کی سمت چل پڑا۔ وہاں نہ کوئی کھیت تھا' نہ کسی دیہات کی روشنی ہی نظر آ رہی تھی۔ اونچی نیچی زمین چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بھری ہوئی

تھی۔ میں نے صرف اتنی عقلمندی کی کہ ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ آگے جا کر اس ندی کے کنارے کوئی نہ کوئی گاؤں وغیرہ ضرور ہو گا۔ میں نے دیوداسی سے پوچھا۔

"تم اب کہاں جانا چاہتی ہو؟"

وہ بولی۔

"مہاراج! میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں نے دکھشا جی کے سورگ میں ہی آنکھ کھولی تھی۔"

تو پھر تم کہاں جاؤ گی؟ میں تمہیں اپنے ساتھ تو بالکل نہیں لے جا سکتا۔"

دیوداسی نے آہ بھر کر کہا۔

"راستے میں کوئی مندر آئے تو مجھے وہاں چھوڑ دیں' میں وہیں پوجا پاٹھ کر کے جیون گزار لوں گی۔"

ندی کے ساتھ ساتھ چلتے ہم کافی دور نکل آئے تھے۔ رات کے دھندلکے میں مجھے کھیت نظر آنے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہاں کوئی نہ کوئی گاؤں وغیرہ ضرور ہو گا۔ گاؤں تو نہ آیا لیکن چلتے چلتے ایک جگہ اچانک ریلوے لائن آ گئی۔ ریلوے لائن کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ میں نے دیوداسی سے کہا۔

"ریلوے لائن آئی ہے تو کوئی نہ کوئی سٹیشن بھی یہاں کہیں ضرور ہو گا۔"

اور ہم ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہماری دونوں جانب کھیت تھے جن میں فصل اگی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں تاڑ اور ناریل کے درختوں کے خاکے بھی نظر آ رہے تھے۔ آخر دور سے مجھے ریلوے لائن کی ایک جانب روشنیاں چمکتی نظر آ گئیں۔ یہ ریلوے سٹیشن کی روشنیاں ہی ہو سکتی تھیں۔ کیونکہ ان میں ایک سرخ رنگ کی روشنی بھی تھی جو ریلوے سگنل کی روشنی تھی۔

میں نے لڑکی سے کہا۔

"یہاں سے ہم کسی گاڑی میں بیٹھ جائیں گے۔ گاڑی کسی نہ کسی شہر میں تو ضرور

جائے گی۔ وہاں میں تمہیں کسی مندر میں پہنچا کر آگے نکل جاؤں گا۔"

مجھے یہ پریشانی بھی لگی تھی کہ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ ٹرین پر کسی طرف بھی سفر کرنے کے لیے ٹکٹ ضرور خریدنا تھا۔ میں اکیلا ہوتا تو بغیر ٹکٹ بھی سفر کر سکتا تھا لیکن میرے ساتھ ایک عورت تھی۔ اس کا بغیر ٹکٹ ریل میں سفر کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے یونہی اس دیوداسی سے پوچھا کہ اس کے پاس کچھ پیسے ہوں گے۔ اس نے کہا۔

"ہاں مہاراج! میں ہر وقت اپنے پاس کچھ پیسے چھپا کر رکھتی ہوں۔"

اس نے ساڑھی کے اندر ہاتھ ڈال کر چھوٹا سا رومال نکالا۔ اسے کھول کر تین مڑے تڑے نوٹ میرے حوالے کر دیے۔ میں نے رات کے دھندلکے میں انہیں آنکھوں کے قریب لا کر غور سے دیکھا تو وہ پچاس پچاس کے تین نوٹ تھے۔ میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ میں نے ایک نوٹ لے کر رکھ لیا۔ باقی اسے واپس کر دیے۔

"یہ تم اپنے پاس ہی رکھو۔"

ہم ریلوے لائن پر چلتے چلتے ایک چھوٹے سے سٹیشن پر آ گئے۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ یہ ناگ پور اور جبل پور کے درمیان کوئی سٹیشن ہے۔ اس سٹیشن کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ میں نے بھوپال جانے والی گاڑی کے بارے میں دریافت کیا تو پتہ چلا کہ بھوپال جانے کے لیے مجھے وہاں سے ناگ پور جانا ہوگا۔ ناگ پور سے بھوپال جانے والی گاڑی مل جائے گی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنی منزل پر پہنچ گیا ہوں۔ جسے میں جادو کی نگری سے نکل کر عہد حاضر کی جدید دنیا میں واپس آ گیا ہوں۔ میں نے دیوداسی سے کہا۔

"تم ایسا کرو کہ ناگ پور تک میرے ساتھ چلو۔ ناگ پور بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں ناگ مندر بھی ہیں تم ناگ پور اتر جانا۔"

دیوداسی خوش ہو کر بولی۔

"مہاراج میں ناگ پور ہی جاؤں گی۔ وہاں مہا ناگ کا ایک مندر ہے۔ میں وہیں

رہ کر ناگ دیوتا کی پوجا کیا کروں گی۔"

میں نے ناگ پور کے دو ٹکٹ خرید لیے۔ باقی میرے پاس صرف پندرہ روپے بچے۔ میں نے دیوداسی سے کہا۔

"مجھے ناگ پور سے آگے بھوپال جانا ہے۔ اس واسطے میں نے ریل کے کرائے کے لیے یہ پیسے رکھ لیے ہیں۔"

وہ بولی۔

"مہاراج! آپ اور پیسے لے لیں۔ مجھے ناگ دیوتا کے مندر میں پیسوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

میں اس سے زیادہ اس عورت کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ناگ پور سے بھوپال کا کتنا کرایہ لگتا ہے۔ اتنا ضرور اندازہ تھا کہ ناگ پور سے بھوپال کافی دور ہے۔ دن چڑھے ایک پینجر ٹرین آ کر رکی۔ ہم اس میں سوار ہوگئے۔ ٹرین ناگ پور کی طرف چل پڑی۔ دو تین گھنٹے ٹرین کا سفر جاری رہا۔ آخر ناگ پور کے مضافات شروع ہوگئے۔ ناگ پور وسطی بھارت کے بڑے شہروں میں سے ہے۔ یہاں بے شمار فیکٹریاں اور کارخانے ہیں۔ ایک دریا بھی شہر کے قریب بہتا ہے۔ جب ٹرین ناگ پور سٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ کر ٹھہر گئی تو دیوداسی نے ہاتھ جوڑ کر میری طرف دیکھا۔ پھر میرے پاؤں کو چھوا اور بولی۔

"مہاراج! مجھ سے کوئی بھول ہوگئی ہو تو شما کر دیجئے گا۔ کوئی پتہ نہیں اب کب آپ کے درشن ہوں۔"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ قسمت میں لکھا ہوگا تو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی جگہ ضرور ملاقات ہو جائے گی۔ تم ناگ مندر اکیلی پہنچ جاؤ گی نا؟"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں مہاراج! ناگ مندر تو یہاں کا بہت بڑا مندر ہے۔"

دیوداسی نے ایک بار پھر میرے چرن چھوئے اور ٹرین سے اتر کر چلی گئی۔ میں ڈبے میں ہی بیٹھا رہا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے تو یہاں سے بھوپال جانے والی گاڑی پکڑنی ہے۔ میں جلدی سے اتر گیا۔ ایک قلی سے دریافت کیا کہ بھوپال کی گاڑی کس وقت جاتی ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک گاڑی ابھی ابھی گئی ہے۔ اب دو گھنٹے بعد ایک پسنجر ٹرین جائے گی۔ میں پلیٹ فارم سے نکل کر سٹیشن کی لابی میں اس جگہ آیا جہاں ساتھ ساتھ چار پانچ ٹکٹ گھروں کی کھڑکیاں تھیں۔ ایک ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے اوپر انگریزی میں اپ ٹرین لکھا تھا۔ وہاں مختلف سٹیشنوں کے نام بھی انگریزی اور ہندی میں درج تھے۔ ان میں بھوپال کا نام بھی تھا۔ معلوم ہوا کہ بھوپال تک کا کرایہ پندرہ روپے سے زیادہ ہے۔ میرے پاس صرف پندرہ روپے ہی تھے۔ سوچنے لگا کیا کروں۔ آخر گاڑی میں بغیر ٹکٹ بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔

ریل گاڑیوں میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا مجھے کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ میرا بھوپال پہنچنا بھی ضروری تھا۔ میں ادھر ادھر سے چکر لگا کر پلیٹ فارم پر واپس آگیا۔ بھوپال جانے والی گاڑی آخری پلیٹ فارم سے چلنی تھی۔ میں وہاں آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ کونے میں ایک ٹی سٹال نظر پڑا۔ وہاں میں نے تھوڑا بہت جو کچھ ملا کھایا اور چائے بھی پی۔ جسم میں نئی تازگی آگئی۔ بنچ پر بیٹھ گیا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ ٹرین جبل پور سے آ رہی تھی۔ وہ لیٹ تھی۔ بہرحال آگئی۔ کافی رش تھا ٹرین میں۔ بغیر ٹکٹ سفر کے لیے رش والی ریل گاڑی بڑی محفوظ ہوتی ہے اور پسنجر ٹرینوں میں ویسے بھی کم ٹکٹ چیکر آتے ہیں۔ میں بھی ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ ناگ پور بڑا جنکشن تھا۔ وہاں ٹرین کافی دیر تک رکی رہی۔ پھر کہیں جا کر انجن نے وسل دیا اور ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر کھسکنے لگی۔

میں نے سر کھڑکی کے ساتھ لگا دیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ اس نے مجھے جنہم سے بخیریت نکال دیا تھا۔ میری منزل میرے سامنے تھی۔ مجھے کمانڈو خالد اور جمیلہ کا خیال آنے لگا۔ اس وقت کے تصور سے میری آنکھوں میں

خوشی کے آنسو آ گئے جب میں جمیلہ کے سامنے انسانی روپ میں موجود ہوں گا۔ وہ مجھے میری اصلی شکل میں دیکھ کر کس قدر خوش ہوگی۔ مجھے ناگن درگا کا بھی خیال آیا۔ میں نے سوچ لیا کہ بھوپال پہنچتے ہی میں بھیروں جی کے مندر میں جاؤں گا اور ناگن درگا کو تلاش کر کے اس کا منہ چوم کر اسے سانپ سے عورت کی شکل میں واپس لے آؤں گا۔ وہ بے چاری نہ جانے مجھے کہاں کہاں تلاش کرتی پھرتی ہوگی۔

ٹرین آہستہ آہستہ ناگ پور کے بہت بڑے ریلوے یارڈ میں سے گزری تھی۔ ناگ پور کے مضافات سے نکلتے ہی ٹرین نے رفتار پکڑ لی۔ وہ کوئی میل یا ایکسپریس ٹرین نہیں تھی۔ ایک خاص لگی بندھی رفتار سے جا رہی تھی۔ مجھے بھوپال پہنچنا تھا اور گاڑی مجھے بھوپال ہی کی طرف لیے جا رہی تھی۔ دوپہر کے تین بجے کے قریب گاڑی ناگ پور سے چلی تھی۔ پسنجر گاڑی تھی۔ ہر دوسرے سٹیشن پر کچھ دیر کے لیے رکتی۔ شام ہوگئی۔ اس دوران ڈبے میں کوئی ٹکٹ چیکر نہیں آیا تھا اور ڈبے کے رش کو دیکھ کر یقین بھی نہیں تھا کہ کوئی چیکر ٹکٹ چیک کرنے آئے گا۔ جیسے ہی رات پڑی بارش شروع ہوگئی۔ معلوم نہیں آپ کبھی ان علاقوں کی طرف گئے ہیں یا نہیں۔ یہ بھارت کے وسطی جنگلوں کا علاقہ تھا جسے ست پڑا رینج کہتے ہیں۔ یہ جنگل انتہائی گھنے' دشوار گزار اور دلدلوں' جوہڑوں' خونخوار درندوں' زہریلے سانپ بچھوؤں اور طرح طرح کے انسان دشمن حشرات الارض سے بھرے ہوئے ہیں۔ بھوپال سے ناگ پور کی طرف ہوشنگ آباد کے قریب تو یہ جنگل اتنے گھنے ہو جاتے ہیں کہ دن کے وقت بھی وہاں اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ یہ بارانی جنگل ہیں اور تقریباً" سارا سال ہی یہاں بارشیں ہوتی رہتی ہیں۔

ٹرین اپنی نپی تلی رفتار سے جگہ جگہ رکتی چلتی رہی۔ یہ علاقہ کہیں پہاڑی تھا اور بڑے نشیب و فراز تھے۔ کہیں ہموار زمین شروع ہو جاتی۔ ٹرین دریاؤں' ندی نالوں' گھنے تاریک جنگلوں میں سے رات کے اندھیرے اور بارش کے شور میں گزرتی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ رات گزر گئی۔ دن نکل آیا۔ بارش ختم چکی تھی مگر آسمان

گہرے بادلوں میں چھپا ہوا تھا جس کی وجہ سے دن کی روشنی بہت مدھم تھی۔ ٹرین ست پڑا رینج کے جنگلوں میں رات کو ہی داخل ہو چکی تھی۔ میں اپنی دوسری مصیبتوں میں اس حقیقت کو تقریباً بھول ہی چکا تھا کہ میں جہاد کشمیر کا ایک کمانڈو بھی ہوں اور بھارت میں مقبوضہ کشمیر کی فوجی جارحیت کے جواب میں کئی دھماکے کرا چکا ہوں اور دلی بھوپال اور مشرقی پنجاب کی پولیس میری تلاش میں ہے۔ میں اس بات پر بڑا خوش تھا کہ جاگیردارنی کی قاتل حویلی اور دکھشنا کے منحوس سورگ سے جان بچا کر بھاگ آیا ہوں۔ لیکن جب ایک سٹیشن پر گاڑی رکی اور پلیٹ فارم پر تین پولیس والوں کو ایک جگہ کھڑے دیکھا تو ایک دم چوکس ہو گیا اور یاد آ گیا کہ میں بھوپال پولیس کو بھی مطلوب ہوں اور آگے بڑا شہر بھوپال ہی آ رہا ہے لیکن میرا حلیہ اتنا بگڑ چکا تھا کہ پولیس کے پاس اگر میرا فوٹو بھی ہوتا تو وہ مجھے مشکل ہی سے پہچان سکتی تھی۔

میری ڈاڑھی مونچھیں کافی بڑھ چکی تھیں۔ سر کے بال بھی لمبے ہو گئے تھے۔ لباس وہی جیکٹ اور پتلون تھی جو کافی پرانا ہو گیا ہوا تھا۔ رنگ بھی تھوڑا سانولا ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود میں ڈبے میں ہی بیٹھا رہا۔ حالانکہ میرا چائے کو بہت جی للچا رہا تھا۔ مگر میں ڈبے سے باہر نہ نکلا۔ ٹرین وہاں کچھ دیر کے لیے رک کر آگے چل پڑی۔ پولیس کے آدمیوں کی شکلیں دیکھ کر میں خبردار ضرور ہو گیا تھا۔ دن کے ایک بجے کے قریب ٹرین ایک سٹیشن پر رکی تو معلوم ہوا کہ یہاں انجن بدلی کیا جائے گا۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ یہ کوئی اچھا خاصا شہر لگتا تھا۔ تین چار پلیٹ فارم تھے سٹیشن کے۔ یہاں ایک سٹال پر کھڑے ہو کر میں نے کھانا کھایا' چائے پی اور پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ یہاں بھی پولیس کے کچھ سپاہی نظر آ رہے تھے مگر وہ مجھ سے دور تھے۔ میں محتاط ہو چکا تھا۔ چنانچہ پلیٹ فارم پر ٹہلتے رہنے کی بجائے ڈبے میں آ کر بیٹھ گیا۔ ٹرین کافی دیر وہاں رکی پھر آگے روانہ ہو گئی۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد ایک سٹیشن آیا جس کا نام چھندواڑہ تھا۔ یہ بھی کافی بارونق اور بڑا ریلوے سٹیشن تھا۔ معلوم ہوا کہ ناگ پور اور بھوپال کے درمیان یہی ایک بڑا

شہر اور ریلوے کا جنکشن ہے۔ وہاں سے آگے بھوپال ہی بڑا شہر تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بڑا خوش ہوا کہ اپنی انسانی وضع قطع اور انسانی روپ کو برقرار رکھتے ہوئے میں بھوپال کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ خدا نے چاہا تو میں اپنی انسانی شکل میں ہی جمیلہ سے جا کر ملوں گا۔ جمیلہ سے ملنے کے خیال سے میرا دل بے حد مسرور تھا۔ چھندواڑہ کے سٹیشن پر ٹرین نے کافی دیر لگا دی۔ میں نے پلیٹ فارم پر دو بار چائے پی۔ وہاں مسافروں کا اس قدر ہجوم تھا اور ان کی نقل و حرکت اتنی زیادہ تھی کہ مجھے پولیس کا کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ چھندواڑہ سے ٹرین چلی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے اپنے ساتھ والے مسافر سے پوچھا کہ بھوپال گاڑی کس وقت پہنچے گی۔ اس نے کہا۔

"بھائی صاحب پہنچنے کو تو یہ اپنے ٹائم پر ہی پہنچے گی مگر ریلوے کا ایک آدمی کہہ رہا تھا کہ آگے بارشوں کی وجہ سے ایک پل ٹوٹا ہوا ہے۔ وہاں دیر لگ جائے گی۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔

"اگر پل ٹوٹا ہوا ہے تو گاڑی آگے کیسے جائے گی؟"

وہ بولا۔

"ارے بھائی صاحب پل کے ایک طرف گاڑی کھڑی ہو جائے گی۔ ٹرین کے سارے مسافر اتر کر پل کی دوسری طرف جائیں گے۔ پل کی دوسری طرف مسافروں کو لینے ایک دوسری گاڑی آئے گی اور ہم لوگ اس گاڑی میں بیٹھ کر بھوپال جائیں گے۔ کیا سمجھے؟"

میں نے پوچھا۔

یہ کسی دریا کا پل ہے کیا؟"

"نہیں بھائی صاحب یہ دریا کا پل نہیں ہے کسی برساتی نالے کا پل ہے۔ کہتے ہیں کہ کافی لمبا پل ہے۔ پچھلے دنوں ادھر بڑی بارشیں ہوئی تھیں' ان بارشوں کی وجہ سے پل کے دو ستون بیٹھ گئے ہیں۔"

مجھ پر مایوسی سی چھا گئی۔ پھر سوچا کہ چلو جہاں سارے مسافر ٹرین سے اتر کر پیدل چلتے ہوئے پل کی دوسری طرف جائیں گے میں بھی ان کے ساتھ چلا جاؤں گا اور دوسری طرف جو ٹرین آئے گی اس میں سوار ہو جاؤں گا۔ آخر ریلوے والے مسافروں کو بیچ جنگل میں تو نہیں چھوڑ دیں گے۔ دوسری ٹرین تو ضرور آئے گی۔ گھنٹہ دو گھنٹے اور لگ جائیں گے پھر کیا ہوا۔

چھندواڑہ بہت پیچھے رہ گیا تھا اور ٹرین ست پڑا رینج کے گھنے جنگلوں میں سے گزر رہی تھی۔ آخر وہ پل آگیا جو بارشوں کی وجہ سے بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی کی رفتار بہت پہلے ہی ہلکی ہوگئی۔ ڈبے میں مسافر کھڑکیوں میں سے باہر جھانکنے لگے۔ میرے ساتھ جو مسافر بیٹھا تھا اس نے بھی باہر جھانک کر دیکھا اور کہنے لگا۔

"لیجئے بھائی صاحب وہ کم بخت ٹوٹا ہوا پل آگیا ہے۔ اب چھندواڑہ کے جنگل میں سے پیدل گزرنے کی تیاری شروع کر دیں۔"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"سنا ہے ان جنگلوں میں شیر چیتے اور سانپ بہت ہوتے ہیں۔"

اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"اجی صاحب ایسے ایسے آدم خور درندے ہوتے ہیں کہ سوئے ہوئے آدمی کو جھونپڑوں کے اندر سے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"ہمیں ٹرین سے اتر کر پل کی دوسری طرف ریلوے لائن تک تو جنگل میں پیدل ہی چلنا ہوگا۔"

وہ بولا۔

"بس آپ دوسرے مسافروں کے ساتھ ہی رہیں ادھر ادھر نہ ہو جائیں۔ آدمیوں کے ہجوم کو دیکھ کر شیر چیتے قریب نہیں آتے۔ ہاں سانپوں کا خطرہ ضرور ہوگا۔"

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"سانپوں کی مجھے پروا نہیں ہے۔"

وہ آدمی جو پڑھا لکھا نوجوان تھا میری طرف حیرت سے تکنے لگا۔

"کیوں بھائی صاحب! کیا آپ سپیرے ہیں؟"

میں نے فوراً سنبھل کر کہا۔

"ارے نہیں بھائی جان۔ میرا مطلب تھا کہ آدمی سانپ کو دیکھ کر ذرا ادھر ادھر ہو جائے تو بچ سکتا ہے مگر شیر چیتے سے تو نہیں بچ سکتا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "لیکن جناب ہم نے سنا ہے کہ سِت پڑا کے جنگلوں میں ایسے ایسے سانپ ہوتے ہیں کہ جو دور سے آدمی پر زہر کی پچکاری پھینکتے ہیں اور آدمی وہیں تڑپ کر مر جاتا ہے۔"

سانپوں کے معاملے یہ آدمی بھی عام آدمیوں کی طرح اناڑی تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ دنیا کا کوئی بھی سانپ کیوں نہ ہو اگر وہ آدمی کو ڈس لے تو آدمی کبھی نہیں تڑپتا۔ سانپ کا زہر سرد ہوتا ہے اوار اس کا اثر سیدھا اعصاب پر جا کر ہوتا ہے۔ سانپ کے ڈسنے سے آدمی کے اعصاب مفلوج ہونے لگتے ہیں اور اس پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ زیادہ زہریلا سانپ ہو تو آدمی کے منہ' ناک' کان سے خون جاری ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ زہریلا سانپ ہو تو آدمی کا جسم ٹرختا شروع ہو جاتا ہے مگر آدمی تڑپتا بالکل نہیں۔ میں سانپوں کے خیال سے اس لیے پریشان نہیں تھا کہ سانپ کا زہر مجھ پر کوئی اثر نہیں کرتا تھا۔ اس کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ مجھے یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ میرے بدن سے بار بار سانپ کا روپ بدلتے رہنے کی وجہ سے ایک خاص قسم کی سانپ کی بو خارج ہوتی رہتی ہے۔ جس کو آدمی محسوس نہیں کر سکتا مگر سانپ فوراً محسوس کر لیتا ہے اور اس بو کی وجہ سے وہ مجھے اپنی نسل کا سمجھ کر مجھ پر حملہ نہیں کرتا یا اگر کرتا بھی ہے تو اس کا زہر مجھے کچھ نہیں کہتا۔

ٹرین اب آہستہ آہستہ ہو گئی تھی۔

یہاں تک کہ وہ ایک جگہ رک گئی۔ ٹرین کی دونوں جانب جنگل ہی جنگل تھا۔

اونچے اونچے چھتریوں والے درخت تھے۔ جھاڑیاں تھیں' اونچی اونچی گھاس تھی۔ بانس کے گھن دار درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔ ایک آدمی باہر سے آواز لگاتا گزر گیا کہ یہاں سب مسافر اتر جائیں۔ آگے پل کے پار دوسری ٹرین کھڑی ہے۔ وہ ٹرین آگے جائے گی۔ یہ ٹرین یہیں سے واپس چلی جائے گی۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میرے ساتھی نے کہا۔

"لیجئے بھائی صاحب آ گیا وہ منحوس پل۔ اب آ جایئے نیچے۔ خدا کرے کہ پل کی دوسری طرف ٹرین پہلے سے موجود ہو۔"

ٹرین کے مسافر اپنا اپنا سامان لیے نیچے اتر رہے تھے اور ریلوے کو گالیاں دے رہے تھے۔ میں بھی نیچے اتر آیا۔ میرا ساتھی مسافر بھی میری طرح اکیلا تھا اور اس کے پاس بھی کوئی سامان نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

"بھائی صاحب بغیر سامان کے سفر کرنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے۔ جہاں جی چاہا اتر بیٹھو۔"

یہ بھی غنیمت تھی کہ بارش نہیں ہو رہی تھی۔ آسمان پر بادل ضرور جھکے ہوئے تھے۔ دن کا وقت تھا۔ ابھی سورج غروب ہونے میں بھی کافی دیر تھی۔ مسافر ریلوے لائن سے اتر کر پگڈنڈی پر ٹریک کی دونوں جانب آگے کو چلے جا رہے تھے۔ جنہوں نے سامان اٹھا رکھا تھا۔ ان کی بری حالت ہو رہی تھی۔ میرا مسافر ساتھی میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے ان مسافروں پر فقرے چست کر رہا تھا تو اتنا سامان لے کر گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔ ریلوے لائن کی دونوں طرف جنگل دن کے وقت بھی سنسان تھا اور ایک عجیب قسم کا آسیبی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میرا ساتھی کہنے لگا۔

"آدمی ان جنگلوں میں آ جائے تو پھر زندہ باہر نہیں نکل سکتا۔"
میں نے کہا۔
"لیکن ان جنگلوں میں شکاری بھی تو شیر کا شکار کرنے آتے ہیں۔ میں نے ان کے

بڑے قصے کتابوں میں پڑھے ہیں۔"

وہ بولا۔

"اجی ان جنگلوں میں شکاری بھی پھونک پھونک کر چلتے ہیں۔ یہاں کے شیروں نے بڑے بڑے نامور شکاریوں کو پھاڑ کھایا ہے۔ خدا ان جنگلون میں کسی دشمن کو بھی نہ لائے۔"

کچھ دور چلنے کے بعد ہم ریلوے لائن کو چھوڑ کر نیچے خشک برساتی نالے میں اتر گئے۔ یہاں سے گزر کر مسافروں کو دوسری طرف اوپر ریلوے لائن پر جانا تھا۔ یہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ جھاڑیاں، گھاس اور درختوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ آگے جانے والے مسافروں نے ایک سمت کا راستہ بنا دیا تھا باقی سارے مسافر اسی راستے پر چلے جا رہے تھے۔ یہاں جگہ جگہ زنگ آلود بڑے بڑے پتھر اور زنگ آلود چٹانیں زمین سے نکلی ہوئی تھیں۔ میرا ساتھی چلتے ہوئے کبھی کبھی زور سے زمین پر پاؤں مارتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ کہنے لگا۔

"پاؤں کی دھمک سن کر اگر آس پاس کہیں سانپ ہو تو وہ بھاگ جاتا ہے۔ بھائی صاحب سانپ آدمیوں سے گھبراتا ہے۔"

یہ بات اس شخص نے سولہ آنے سچ کہی تھی۔ مسافروں کو برساتی نالے میں گزرتے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ جب ہم چڑھائی چڑھ کر دوسری طرف ریلوے لائن پر پہنچے تو یہ دیکھ کر سب مسافروں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی کہ وہاں کوئی ٹرین نہیں کھڑی تھی۔

میرے ساتھی نے کہا۔

"بھارت کی ریلوے کا حال بھی یہاں کی حکومت جیسا ہی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں بھائی صاحب۔ پل کی دوسری طرف تو آ گئے ہیں ٹرین بھی آ ہی جائے گی۔"

مسافروں نے ریلوے ٹریک کی دونوں جانب اپنے اپنے سامان کی ڈھیریاں لگا دیں اور ڈیرے ڈال کر بیٹھ گئے۔ میں بھی اپنے ریل گاڑی کے ساتھی کے پاس بیٹھ گیا۔ یہ بڑا باتونی آدمی تھا اور بڑی طرح دار اردو بولتا تھا۔ اتنے میں بھوپال کی طرف سے

ریلوے لائن پر چلتی ہوئی ایک ٹرالی آئی جس کو دو مزدور ٹریک پر دھکیل رہے تھے۔ ٹرالی میں دو ریلوے کے کرم چاری بیٹھے تھے۔ ٹرالی ہمارے قریب آ کر لائن پر رک گئی۔ انہوں نے مسافروں کو یہ روح فرسا خبر سنائی کہ پیچھے ہوشنگ آباد کے قریب ہی ریلوے ٹریک اکھڑ گئی ہے جس کی وجہ سے اب ٹرین کل دوپہر کے وقت ہی یہاں آ کر مسافروں کو بھوپال کی جانب لے جا سکے گی۔ مسافروں میں مردنی سی چھا گئی۔ کئی مسافروں نے بھارتی ریلوے کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ریلوے کے افسروں نے معذرت کے انداز میں کہا کہ ابھی ایک بڑی ٹرالی آپ کے لیے کھانے پینے کا سامان لے کر آ رہی ہے۔ یہ کھانا پینا آپ کو ریلوے کی طرف سے مفت دیا جائے گا۔ ہمیں آپ کی تکلیف کا احساس ہے لیکن یہ سب کچھ بارشوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ ہم معافی چاہتے ہیں۔ میرے ساتھی نے کہا۔

"بھائی صاحب رات بسر کرنے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔

"بندوبست کیا کرنا ہے۔ یہیں زمین پر پڑ رہیں گے۔"

وہ بولا۔

"آگ ضرور جلانی ہوگی۔ آگ کو دیکھ کر درندے ادھر نہیں آئیں گے۔"

رات کا اندھیرا چھانے لگا۔ مسافروں نے ریلوے لائن کی دونوں جانب آگ کے الاؤ روشن کر لیے۔ اس دوران کھانے پینے کا سامان لے کر ریلوے کی ایک بڑی ٹرالی پہنچ چکی تھی۔ مسافروں نے دیکھتے دیکھتے سارا سامان لوٹ لیا۔ ہمارے حصے میں کیلے کے پتوں میں بندھے ہوئے بریانی کے دو پیکٹ آئے تھے۔ ہم نے وہی کھائے اور خدا کا شکر ادا کیا۔ رات گزر گئی۔ ساری رات ریلوے لائن کی دونوں جانب جنگل میں سے کسی شیر کے بولنے کی آواز آتی رہی۔ میرا ساتھی بار بار مجھے تسلی دیتا۔

"بھائی صاحب! فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ شیر آدم خور نہیں لگتا۔ میں آدم خور شیر کی آواز پہچان لیتا ہوں۔ ویسے بھی ہم نے الاؤ روشن کر رکھا ہے۔ شیر ادھر

نہیں آئے گا۔"

رات گزر گئی۔ خوش قسمتی سے رات کو بارش نہ ہوئی۔ دن کے وقت آسمان صاف ہوگیا اور دھوپ نکل آئی۔ ریلوے لائن کے آس پاس میلہ سا لگ گیا تھا۔ عورتیں آگ جلا کر ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ بچے لائن کے ساتھ ساتھ پتھروں سے کھیل رہے تھے۔ اتنے میں کوئی سپیرا بین بجاتا تماشہ دکھانے ادھر آگیا۔ اس نے پٹاری میں سے سانپ نکالا اور بین بجاتے ہوئے تماشہ دکھانے لگا۔ بچے اور کچھ بڑے بھی سپیرے کے اردگرد دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ میں بھی یونہی دل بہلانے کے خیال سے وہاں چلا آیا۔ سپیرے کا رنگ سیاہ تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ داڑھی اور سر کے بال سفید تھے۔ وہ گال پھلائے بین بجا رہا تھا۔ سامنے ایک سانپ کنڈل مار کر بیٹھا اپنے پھن کو دائیں بائیں لہرا رہا تھا۔

جیسے ہی میں مجمع میں پہنچا سانپ نے اپنے پھن کا رخ میری طرف کر دیا اور مجھے ٹکٹکی باندھ کر تکنے لگا۔ پہلے تو میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ لیکن جب سپیرے نے بھی بین بجاتے ہوئے میری طرف گھوم کر دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ سانپ نے میرے جسم سے خارج ہونے والی سانپ کی بو کو محسوس کر لیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ گذشتہ دنوں اس قسم کے واقعات میرے ساتھ ہو چکے تھے۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ میرے دونوں جانب کچھ دوسرے مسافر بھی کھڑے سانپ کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ سپیرے نے سانپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن سانپ برابر ٹکٹکی باندھے مجھے گھورتا رہا۔ سپیرے نے بین بجانی بند کر دی اور سانپ کو پکڑ کر پٹاری میں بند کرنے کی کوشش کی مگر سانپ اس کے ساتھ سے نکل گیا اور تیزی سے میری طرف آیا۔ سانپ کو آتے دیکھ کر لوگ خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگ گئے۔ میں بھی دوڑ کر دوسری طرف چلا گیا۔ سپیرے نے لپک کر سانپ کو دم سے پکڑ کر اٹھا لیا اور اسے زبردستی پٹاری میں بند کر دیا۔

اب سپیرا اس طرف بار بار دیکھنے لگا جدھر دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی

موجود تھا۔ سپیرے نے پٹاری میں سے دوسرا سانپ نکال کر تماشہ دکھانے کی کوشش کی مگر وہ سانپ بھی پھنکارتا ہوا میری طرف بڑھا۔ سپیرے نے اسے بھی پٹاری میں بند کر دیا اور مجمع کو مخاطب کر کے کہا آج کا تماشہ ختم۔ سب لوگ واپس ریلوے لائن کے پاس اپنے اپنے ٹھکانوں پر آ گئے۔ میں بھی اپنے ساتھی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ بولا۔

"کیوں بھائی صاحب! دیکھ آئے سانپ کا تماشہ؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں۔"

وہاں جو کچھ ہوا تھا اس کے بارے میں میں نے اسے کچھ نہ بتایا۔ بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ باتونی نوجوان سانپوں اور سپیروں کے بارے میں کچھ اظہار خیال نہ کرتا۔ کہنے لگا۔

"بھائی صاحب اس علاقے کے سپیرے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ لوگوں کے گھروں میں جا کر عورتوں کے پرانے کپڑے مانگ کر لے جاتے ہیں۔ پھر اپنے کسی سانپ کو عورت کا بلاؤز سنگھا کر اسے عورت کی طرف روانہ کر دیتے ہیں۔ وہ ایسے سانپ کا انتخاب کرتے ہیں جس کے ڈسنے سے عورت کم از کم اڑتالیس گھنٹوں کے لیے بے ہوش ہو جائے' مرے نہیں۔ بس پھر وہ اس عورت کے گھر پہنچ جاتے ہیں اور علاج کرنے کے بہانے چار پانچ سو روپے ہتھیا کر عورت کو ہوش میں لاتے ہیں اور چل دیتے ہیں۔"

میرے کان اس باتونی مسافر کی طرف تھے اور آنکھیں جنگل کی طرف جانے والی ایک پگڈنڈی پر لگی تھیں۔ پگڈنڈی پر درختوں کے نیچے وہی سیاہ فام سپیرا بیٹھا بیڑی پی رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ شاید اسے میری پر اسرار شخصیت کا تھوڑا سا علم ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور اپنے ساتھی سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے جنگل والی پگڈنڈی پر نگاہ ڈالی۔ سپیرا غائب ہو چکا

تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ کافی دن نکل آیا تھا۔ جب مسافروں میں شور مچ گیا کہ گاڑی آ گئی' گاڑی آ گئی۔ دور سے انجن کا دھواں نظر آ رہا تھا۔ پھر گاڑی کے وسل کی چیخیں بار بار سنائی دینے لگیں۔ مسافروں میں ہل چل مچ گئی۔ لوگ اپنا اپنا سامان سنبھالنے لگے۔ ٹرین بار بار وسل دے رہی تھی کہ ریلوے لائن پر کوئی نہ آئے۔ مسافروں نے لائن خالی کر دی تھی۔

ٹرین آ کر رک گئی اور مسافر اس میں سوار ہونے لگے۔ میں اور میرا ساتھی بھی ایک ڈبے میں چڑھ گئے۔ ریلوے ٹریک کے آس پاس ایک بھی مسافر نہ رہا۔ اس کے باوجود انجن ایک منٹ تک کھڑے کھڑے وسل دیتا رہا کہ اگر کوئی مسافر رہ گیا ہو تو وہ بھی آ جائے۔ اس کے بعد ٹرین چل پڑی۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"ہم بھوپال کتنی دیر میں پہنچیں گے؟"

وہ بولا۔

"بھائی صاحب۔ چار پانچ گھنٹوں میں تو گاڑی ہوشنگ آباد پہنچے گی۔ اس کے آگے بھوپال مزید تین گھنٹوں کا سفر ہے۔"

اس کا مطلب تھا یہ ٹرین رات کے وقت بھوپال پہنچنے والی تھی۔ لیکن چونکہ اب سفر بغیر کسی رکاوٹ کے شروع ہو گیا تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ میں بھوپال پہنچ جاؤں گا۔ راستے میں کئی ندی نالے' دریا اور جنگل آئے اور گزرتے چلے گئے۔ شام ہو چکی تھی جب ٹرین ہوشنگ آباد کے سٹیشن پر رکی۔ میں اور میرا ساتھی ہم دونوں پلیٹ فارم پر اتر آئے اور ایک ٹی سٹال پر جا کر چائے پینے لگے۔ دو پولیس والے پلیٹ فارم پر آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے۔ وہ ہماری طرف ہی آ رہے تھے۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا تا کہ وہ مجھے شناخت نہ کر سکیں۔ دوسری طرف پلیٹ فارم پر کچھ مسافر بنچ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اچانک بنچ کے قریب ہی زمین پر بیٹھا ہوا مجھے وہی جنگل والا سیاہ فام سپیرا نظر آیا۔ اس نے سانپوں کی پٹاری والا جھولا اپنے آگے رکھا ہوا تھا اور بیڑی پی رہا تھا۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں یہ شخص میرا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ آخر اس کو میری پر اسرار شخصیت کی نشان دہی اس کے سانپ نے کر دی تھی۔ میں نے اسے زیادہ اہمیت نہ دی۔ اس لیے کہ میرے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے کئی بار سپیرے میرا تعاقب کر چکے تھے۔ صرف اتنا خیال ضرور تھا کہ کہیں اس سپیرے کے پاس کوئی خطرناک منتر نہ ہو اور وہ یہ منتر مجھ پر پھونکنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن میں اسے اپنے قریب آنے کا موقع ہی نہیں دوں گا۔ بس مجھے اس سپیرے سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ میں ان خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دونوں پولیس کے سپاہی میرے سامنے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو' کہاں جا رہے ہو؟"

میرا ساتھی میرے پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ چونکہ باتونی نوجوان تھا۔ کہنے لگا۔

"تھانیدار صاحب ہم ناگ پور سے آ رہے ہیں۔ بھوپال جائیں گے۔ کیوں کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟"

پولیس کے سپاہی نے اس کی طرف دیکھ کر سخت لہجے میں کہا۔

"تم سے میں نے کچھ نہیں پوچھا۔ تم خاموش رہو۔"

سپاہی دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا۔

"کیوں بھئی کہاں سے آ رہے ہو؟"

میں نے اپنے حواس کو قطعی منتشر نہ ہونے دیا۔ بڑے اعتماد سے کہا۔

"ناگ پور اپنے بڑے بھائی سے ملنے گیا تھا۔ اب بھوپال واپس جا رہا ہوں۔"

"بھوپال میں کیا کرتے ہو؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"گورنمنٹ کالج کی لائبریری میں کام کرتا ہوں۔"

"بھوپال میں کہاں رہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"وہیں کالج کے کوارٹروں میں رہتا ہوں۔"

میں نے دیکھا کہ ان سپاہیوں میں سے ایک حوالدار تھا۔ مجھ سے پوچھ گچھ وہی کر رہا تھا۔ اس نے دوسرے سپاہی سے کہا۔

"اس کی تلاشی لو۔"

تب میرا باتونی ساتھی بیچ میں بول پڑا۔

"جناب آپ کے پاس تلاشی کے وارنٹ ہیں؟ ہم بھارت کے ناگرک ہیں۔ آپ بغیر وارنٹ کے کسی کی تلاشی نہیں لے سکتے۔"

اس پر حوالدار نے میرے ساتھی کو گریبان سے پکڑ کر ایک طرف دھکیل دیا۔

"تم چپ رہو گے یا نہیں؟"

میرا باتونی دوست وہیں دبک گیا۔ سپاہی میرے تلاشی لینے لگا۔ میرے پاس کچھ نقدی تھی اور کچھ نہیں تھا۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ میری جیکٹ کی جیب میں غار والے سانپ کا دیا ہوا سیاہ مہرہ بھی ہے۔ سپاہی نے مہرے کو نکال کر غور سے دیکھا۔ پھر حوالدر کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

"یہ کالا پتھر اس کی جیب سے نکلا ہے۔"

حوالدار نے مہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"پتھر ہے۔ ریلوے لائن پر سے اٹھایا تھا۔ مجھے اچھا لگا۔ آپ کو اچھا لگتا ہے تو لے لیں۔"

حوالدار نے مہرے کو دوسرے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"یہ گرم کیوں ہے؟"

میں نے کہا۔

"یہ پتھر ہے ہی ایسا۔"

اس نے مہرہ میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد دونوں پولیس والے آگے بڑھ گئے۔ میرا باتونی ساتھی بڑا غصے میں تھا۔ اس نے دبی زبان میں پولیس کے سپاہیوں کو گالی دی اور کہنے لگا۔

"یہ سالے محض پیسے بٹورنے کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ تمہاری جیب میں صرف چار پانچ روپے تھے اس لیے تمہیں چھوڑ دیا۔"

لیکن میں چوکس ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پولیس کو مجھ پر شک پڑ سکتا ہے' ورنہ یہ سپاہی کبھی میرے پاس نہ آتے۔ اگر انہیں محض پیسے ہی بٹورنے تھے تو میرے ساتھی سے پوچھ گچھ کرتے۔ کیونکہ اس کی وضع قطع مجھ سے زیادہ بہتر تھی۔ لیکن پولیس نے مجھے مشتبہ سمجھ کر مجھ سے ہی پوچھ گچھ کی تھی۔ ٹرین ہوشنگ آباد سے چل پڑی۔ رات ہو گئی تھی۔ ٹرین تاریک جنگلوں میں سفر طے کرتی رہی۔ رات کے ساڑھے دس بجے بھوپال شہر کی روشنیاں دکھائی دینا شروع ہو گئیں۔ ٹرین میں ہوا کے تیز جھونکے آ رہے تھے جس کی وجہ سے کوشش کے باوجود مجھے جمیلہ اور کمانڈو خالد کی بو محسوس نہ ہوئی۔ ویسے بھی جب انسانی شکل میں ہوتا تھا تو ان لوگوں کی خوشبو مدھم پڑ جاتی تھی اور سانپ کے روپ میں مجھے کافی فاصلے سے ان کی خوشبو آ جاتی تھی۔ ٹرین پلیٹ فارم پر رکی تو میں نے اپنے باتونی ساتھی سے ہاتھ ملایا اور کہا۔

"اچھا بھائی صاحب! خدا حافظ!"





اس نے کہا۔

"ارے بھائی صاحب میں بھی یہیں اتر رہا ہوں۔ چلئے باہر تک تو چلئے۔ سٹیشن سے باہر خدا حافظ کہیں گے۔"

پلیٹ فارم پر اتنا رش تھا کہ میرا باتونی ساتھی مسافروں میں کہیں گم ہوگیا۔ میں نے بھی اسے تلاش کرنے کی کوشش نہ کی۔ سٹیشن سے باہر آکر میں نے ہوا کر سونگھا۔ مجھے فضا میں رچی ہوئی جمیلہ اور کمانڈو خالد کی ہلکی ہلکی خوشبو محسوس ہوئی۔ میں بڑا خوش ہوا کہ رات کو نہیں تو صبح اپنی پیاری بیوی جمیلہ سے انسانی شکل میں ملاقات کر سکوں گا۔ اس وقت میں نے سوچ لیا تھا کہ اب میں کلکتے کی طرف نہیں جاؤں گا اور کمانڈو خالد سے کہوں گا کہ وہ مجھے اور جمیلہ کو پاکستان پہنچا دے۔ ارادہ یہی تھا کہ جمیلہ کو پاکستان چھوڑ کر خود بارڈر کراس کر کے کمانڈو خالد کے پاس واپس آ جاؤں گا اور جہاد کشمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لوں گا اور کشمیری مجاہدین کے شانہ بشانہ بھارتی جارحیت کے خلاف لڑوں گا۔

سٹیشن کے باہر آکر میں نے رکشا لے لیا اور اسے ایک خاص جگہ چلنے کو کہا۔ میں رکشے کو کمانڈو خالد کی کمین گاہ کے آس پاس بھی نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں کمین گاہ والے ٹیلے سے کافی پیچھے ایک سڑک پر اتر گیا۔ رات کا وقت تھا سڑک پر اندھیرا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ دور کسی سڑک پر سے کسی وقت کسی ٹرک وغیرہ کے

گزرنے کی آواز آ جاتی تھی۔ یہ جگہ شہر سے باہر تھی۔ میری دائیں جانب کافی فاصلے پر بھوپال شہر کی اونچی نیچی روشنیاں جھلملاتی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے فضا میں جمیلہ اور کمانڈو خالد کی خوشبوئیں سونگھنے کی کوشش کی مگر مجھے ان کی ہلکی سی خوشبو بھی محسوس نہ ہوئی۔ جب میں سانپ سے انسانی روپ میں آ جاتا تھا تو میرے ساتھ اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا کہ کبھی دور سے اپنے کسی خاص ساتھی کی ہلکی سی خوشبو آتی تھی اور کبھی بالکل نہیں آتی تھی۔ جبکہ سانپ کے روپ میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے کوئی خیال نہ کیا اور کمانڈو خالد اور دوسرے مجاہدوں کی خفیہ کمین گاہ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ایک جگہ آ کر میں رک گیا اور ایک درخت کی اوٹ میں چھپ کر پیچھے دیکھا کہ اندھیرے میں کوئی میرا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں درخت کی آڑ سے نکل کر کمین گاہ کی طرف چلنے لگا۔ مجھے رات کے اندھیرے میں کمین گاہ کے ٹیلے کا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ میں ایک جگہ سے ٹیلے کی دیوار کے قریب نشیب میں اتر گیا۔ فوراً ہی مجھے دو مجاہدوں نے ایک جانب سے نکل کر دبوچ لیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے آدمی ہیں اور اب وہ یہ تسلی کرنا چاہتے ہیں کہ میں بھی ان کا ہی آدمی ہوں یا کوئی اور ہوں۔ بہت جلد انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے ان سے خالد کے بارے میں پوچھا تو ایک مجاہد نے کہا۔

"کمانڈر اندر ہی ہے۔"

اور وہ دونوں اندھیرے میں روپوش ہو گئے۔

کمانڈر خالد کمین گاہ میں ہی تھا مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ گلے لگ کر ملا اور بولا۔

"کرم داد! خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ سلامت ہمارے پاس آ گئے۔ میں تو بالکل نا امید ہو چکا تھا۔"

میں نے دری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ بھی میرے پاس بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"یہ اور بھی خوشی کی بات ہے کہ تم اپنی اصلی شکل میں میرے سامنے بیٹھے ہو۔ یہ بتاؤ اتنے دن کہاں رہے؟ تم پر کیا گزری؟"

میں نے کمانڈو خالد کو اپنی ساری داستان سنا ڈالی۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ مجھ سے بچھڑنے کے بعد اس پر کیا گزری۔ میں نے جمیلہ کا پوچھا تو کہنے لگا۔

"بھابی تو اس بار تمہارے لیے سخت پریشان رہی ہے۔ میری بہن نے مجھے بتایا ہے کہ وہ تمہاری جدائی میں آنسو بھی بہاتی رہی ہے۔"

میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"کمانڈر! اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں جمیلہ کو پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ اس کا یہاں رہنا ہمارے لیے کسی مصیبت کا باعث بن سکتا ہے۔ جبکہ اس پر بھی کوئی مصیبت نازل ہو سکتی ہے۔"

خالد بولا۔

"اگر تم فیصلہ کر چکے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ بھابی کے واپس جانے سے تم زیادہ آزادی اور یکسوائی سے کام کر سکو گے۔"

میں نے کہا۔

"پہلے میں نے سوچا تھا کہ میں بھی جمیلہ کے ساتھ ہی پاکستان جاؤں اور اسے خود اس کے والدین کے حوالے کر کے آؤں۔ لیکن اگر تمہارا کوئی مجاہد اس کی ذمے داری لے لے کہ وہ جمیلہ کو اس کے ماں باپ کے پاس چھوڑ آئے گا تو مجھے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

خالد کہنے لگا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ ہمارا جو مجاہد بھابی کو لے کر پاکستان جائے گا وہ اسے اس کے گھر چھوڑ کر ہی آئے گا بلکہ جمیلہ بھابی سے پرچہ لکھوا کر ساتھ لائے گا کہ میں خیریت سے گھر پہنچ گئی ہوں۔"

میں بالکل مطمئن ہوگیا۔ میں نے کہا۔

"صبح جمیلہ سے مل کر اسے یہ خوشخبری سناؤں گا۔"

خالد نے کہا۔

"کیا بھابی تمہارے بغیر پاکستان جانے پر راضی ہو جائے گی؟"

میں نے اعتماد سے کہا۔

"وہ ضرور راضی ہو جائے گی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ میں یہاں انڈین فلمیں دیکھنے کے لیے نہیں بیٹھا ہوں۔ میں جہاد کشمیر کا ایک اہم سپاہی ہوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ان حقوق کی خاطر جدوجہد کر رہا ہوں جن سے بھارتی حکومت نے انہیں محروم کر رکھا ہے۔ وہ کبھی اعتراض نہیں کرے گی۔"

دوسرے روز جمیلہ مجھ سے ملنے کمین گاہ میں آئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی صحت خراب تھی اور وہ پہلے سے کمزور ہو چکی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور کہا۔

"جمیلہ! تمہاری مصیبت کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ اب تم بہت جلد پاکستان اپنے ماں باپ کے پاس واپس چلی جاؤ گی۔"

اس نے میرے سینے پر سے سر اٹھا کر کہا۔

"میں تمہارے بغیر نہیں جاؤں گی۔ تمہیں بھی میرے ساتھ پاکستان جانا ہوگا۔"

میں نے کہا۔

"جمیلہ! یہاں میرے کچھ فرائض ہیں' یہاں کے مسلمانوں کے' خاص طور پر کشمیری مسلمانوں کے مجھ پر کچھ حقوق ہیں جو مجھے یہاں رہ کر ادا کرنے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ لیکن تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ اپنا مشن مکمل کرنے کے بعد فوراً تمہارے پاس پاکستان واپس آ جاؤں گا۔"

مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہی اور یہی کہتی رہی کہ وہ میرے بغیر پاکستان نہیں جائے

گی۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور بڑے آرام سے سمجھانا شروع کیا کہ میرا ہندوستان میں رہنا اور کشمیریوں کی جنگ آزادی میں حصہ لینا کس قدر ضروری ہے۔ وہ میری باتیں نم آلود آنکھوں سے سنتی رہی۔ آخر میں نے اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنے مجاہدوں کے ساتھ اکیلی ہی پاکستان جائے گی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑے پیار سے کہا۔

"جان من! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

وہ کہنے لگی۔ "مجھے تمہارے بارے میں بڑا فکر لگا رہے گا جو مصیبت تمہارے ساتھ لگ گئی ہے کہ تم کسی بھی وقت انسان سے سانپ بن سکتے ہو اس نے تو میری جان نکال کر رکھ دی۔ پاکستان میں مجھے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہے گا کہ خدا جانے تم کس حالت میں ہو اور تم پر کیا گزری ہے۔"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں ہو گا جمیلہ۔ خدا پر بھروسہ رکھو' وہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے لیے بہت دیر تک زندہ سلامت رکھے گا۔"

جمیلہ رات تک کمین گاہ میں میرے پاس رہی۔ ہم نے اکٹھے مل کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔ کمانڈو خالد نے دوسرے ہی روز اپنے خاص آدمیوں کو بلوا کر ان سے کشمیر میں جنگ بندی لائن کی صورت حال کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل کیں۔ اپنے خاص دو مجاہدوں نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ جمیلہ بھابی کو پاکستان پہنچا دیں گے۔ انہیں خاص خفیہ راستوں کا علم تھا۔

کمانڈر خالد نے ان میں سے ایک مجاہد سے کہا۔

"شاہباز خان! میں یہ تمہاری ڈیوٹی لگاتا ہوں کہ تم جمیلہ بھابی کو اس کے والدین کے پاس خود چھوڑ کر آؤ گے۔ کیا تم یہ ذمے داری قبول کرتے ہو؟"

مجاہد شہباز خان نے کہا۔

"کمانڈر! میں یہ ڈیوٹی بڑی ذمے داری اور خوشی کے ساتھ ادا کروں گا۔ حکم کریں

ہمیں بھالی کو لے کر یہاں سے کب جانا ہو گا۔"

دیر کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسی دن شام کے وقت جمیلہ روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مجھ سے رخصت ہوگئی۔ اس نے جاتے وقت مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اپنا خیال رکھوں گا اور جتنی جلدی ہوسکے گا میں پاکستان اس کے پاس واپس آ جاؤں گا۔

جمیلہ کو مجاہدوں کے ساتھ مقبوضہ کشمیر کی طرف روانہ کرنے کے بعد کمانڈو خالد اور میں بیٹھ گئے اور چائے گرم کروا کر پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"کشمیر کے محاذ پر بھارتی ہائی کمان نے تازہ دم یونٹیں بھیجنی شروع کر دی ہیں کیونکہ وہاں گورکھے' مرہٹے' ڈوگرے اور مدراسی فوجی اپنے حریت پسند مجاہدوں کے ہاتھوں بری طرح مرر رہے ہیں۔ لیکن ہمارے مجاہدوں کے پاس وسائل کی کمی ہے۔ بلکہ اب جو انڈین آرمی کی یونٹیں کشمیر بھیجی جا رہی ہیں ہماری اطلاع کے مطابق انہیں جدید ترین اسلحہ دیا جا رہا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ یونٹیں اور ان کا اسلحہ کس روٹ سے بھیجا جا رہا ہے؟"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"جموں سے کشمیر کی وادی میں پہنچنے کا ایک ہی روٹ ہے۔ اسی روٹ سے یہ سب کچھ جا رہا ہے۔"

میں نے اپنی پیالی میں گرم چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ بھارت کے کس سپلائی سنٹر سے یہ جدید ترین اسلحہ مقبوضہ کشمیر کو سپلائی ہوتا ہے۔"

خالد کہنے لگا۔

"یہ معلوم کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ لیکن یہ سپلائی انتہائی سخت سیکورٹی میں کی جا

رہی ہوگی۔ اس لیے یہ انتہائی حساس اور اہم سپلائی لائین ہے۔"

میں نے کہا۔

"کمانڈر! ہم تو اللہ اور اس کے نبیؐ پاک کے نام پر جانیں قربان کرنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر نکلے ہوئے ہیں۔ اگر سپلائی لائن پر انڈین آرمی نے ایٹم بم بھی لگا رکھے ہوں گے تو ہمیں اس سے کیا؟"

خالد بولا۔ "وہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا بھی یہی ایمان ہے۔ لیکن صرف اپنی جان پر کھیل جانے سے مقصد حل نہیں ہو جاتا۔ اپنے مشن میں کامیاب ہونا بھی بہت ضروری ہے۔"

میں نے چائے کی پیالی کا آخری گھونٹ حلق میں اتارنے کے بعد کہا۔

"خالد بھائی! تم یہ تو معلوم کرو کہ مقبوضہ کشمیر کے محاذ پر بھارتی یونٹوں کو جدید ترین اسلحہ کی سپلائی کس روٹ سے ہوتی ہے۔ ان کا سپلائی سنٹر بھارت میں کس جگہ پر ہے اور وہاں سیکورٹی کی کیا صورت حال ہے۔"

خالد کہنے لگا۔

"یہ کل ہی معلوم ہو جائے گا۔ اب تم بھی آرام کرو۔ رات کافی ہوگئی ہے۔"

کمانڈو خالد دوسری کوٹھڑی میں چلا گیا۔ میں وہیں دری پر سوگیا۔ اگلے روز صبح صبح خالد نے اپنے دو خاص آدمیوں کو مقبوضہ کشمیر میں تعینات بھارتی یونٹوں کی سپلائی لائین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ اس دوران میں خفیہ کمین گاہ کے اندر ہی رہا۔ میں نے خالد سے ناگن درگا کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"بھائی! وہ تو سانپ کی شکل میں ہوگی اور جب سے تم گئے ہو یہاں ہم نے کسی سانپ کو نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری یہ ناگن درگا بھوپال شہر میں نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو تمہاری بو پا کر اب تک یہاں پہنچ چکی ہوتی۔"

یہ کمانڈو خالد نے بالکل صحیح کہا تھا۔ کیونکہ میں انسانی روپ میں ناگن درگا کی بو محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وہ سانپ کی شکل میں تھی۔ اسے میری بو دور سے آ

سکتی تھی اور وہ کسی نہ کسی طرح خفیہ کمین گاہ میں پہنچ سکتی تھی۔ اگر وہ اب تک میرے پاس نہیں پہنچی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ واقعی بھوپال میں نہیں ہے۔ اب بھیروں جی کے مندر میں بھی اسے دیکھنا فضول تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آگیا ہو۔ آخر وہ سانپ کی شکل میں ہے۔ کہیں کسی نے اسے دیکھ لیا تو لوگ تو اس کو ہلاک کرنے کے لیے دوڑ پڑیں گے۔

ناگن درگا کے بارے میں میرے ذہن میں طرح طرح کے خدشے پیدا ہو رہے تھے۔ مگر میں اس کی تلاش میں نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک اہم ترین مشن میرے سامنے آنے والا تھا اور یہ مشن مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوجی یونٹوں کی اسلحہ کی سپلائی کو تباہ کرنے کا مشن تھا۔ جو اپنے کم ترین اور محدود وسائل کو دیکھتے ہوئے بڑا نازک مشن تھا۔ اپنے جس مجاہد کو اسلحہ کی سپلائی لائن معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا اس نے دو دن لگا دیے۔ تیسرے دن وہ خفیہ کمین گاہ میں آیا تو فقیر کے بھیس میں تھا۔ کہنے لگا۔

"مقبوضہ کشمیر کی انڈین یونٹوں کو جھانسی کے سپلائی سنٹر سے اسلحہ سپلائی ہوتا ہے۔ یہ اسلحہ بھارتی فوجی ٹرکوں میں لوڈ کر کے وایا گوالیار' آگرہ' دلی' انبالہ' پٹھان کوٹ جموں کشمیر پہنچایا جاتا ہے۔"

"سیکورٹی کا کیا انتظام ہوتا ہے؟" کمانڈو خالد نے پوچھا۔

مجاہد شہباز نے کہا۔

"ان ٹرکوں کے آگے پیچھے آرمرڈ گاڑیاں ہوتی ہیں جن پر مشین گنیں لگی ہوتی ہیں۔ درمیان میں بھی اس قسم کی بکتر بند گاڑیوں کو حفاظت کے لیے رکھا جاتا ہے۔ پٹھان کوٹ سے آگے اوپر ہیلی کاپٹر بھی ان ٹرکوں کی دیکھ بھال کے لیے آ جاتے ہیں۔"

کمانڈو خالد خاموش ہو گیا۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ میں نے مجاہد سے پوچھا۔

"اندازاً" یہ کتنے فوجی ٹرک ہوتے ہیں؟"

مجاہد نے کہا۔

"میری اطلاع کے مطابق ہفتے میں تین بار جھانسی کے اسلحہ سپلائی سینٹر سے بارہ

ٹرک مقبوضہ کشمیر کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"کرم داد! ان فوجی ٹرکوں کو ہم کہاں تک تباہ کرتے رہیں گے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اصل مدعا ختم کیا جائے۔ یعنی جھانسی کا اسلحہ ڈپو ہی اڑا دیا جائے۔"

میں نے کہا۔

"کہتے تو تم بالکل ٹھیک ہو۔ میری بھی یہی رائے ہے لیکن اس کے لیے بڑے وسائل کی ضرورت ہوگی۔"

کمانڈو خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وسائل کیا ہوتے ہیں کرم داد! تم خود کہا کرتے ہو کہ مسلمان کم سے کم وسائل کے ساتھ بھی پوری دلیری سے لڑتا ہے اور فتح حاصل کرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ہماری جانیں چلی جائیں گی' ہم مر جائیں گے۔ ہم تین چار مجاہدوں کے مرنے سے کشمیری حریت پرستوں کو کس قدر فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ سوچو' ہماری جانوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ تحریک آزادیٔ کشمیر کو تقویت پہنچائی جائے اور اس کے دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ تباہ و برباد کیا جائے۔"

پھر کمانڈو خالد نے مجاہد شہباز سے پوچھا۔

"جھانسی کا اسلحہ سپلائی سینٹر شہر کے کون سے حصے میں واقع ہے؟ کیا تم یہ معلوم کر سکتے ہو؟"

مجاہد نے کہا۔

"کیوں نہیں سر۔ مجھے کل کا دن دے دیجئے میں اس اسلحہ سپلائی سینٹر کے بارے میں آپ کو پوری معلومات فراہم کر دوں گا۔"

"تم بے شک دو دن لے لو مگر پوری تفصیل معلوم کرنے کی کوشش کرنا۔"

مجاہد شہباز نے کہا۔

"ایسا ہی ہوگا کمانڈر! انشاء اللہ! میں منہ اندھیرے کی گاڑی پکڑ کر جھانسی کی طرف

روانہ ہو جاؤں گا۔"

اگلے دن صبح صبح مجاہد شہباز فقیر کے بھیس میں ہی بھوپال سے جھانسی کی طرف روانہ ہوگیا۔ کمانڈو خالد کسی کام سے اپنی کزن سسٹر کے ہاں چلا گیا۔ میں ناشتہ کر کے کمین گاہ میں لیٹ گیا۔ کچھ دیر سو کر آرام کیا۔ پھر بور ہونے لگا تو سوچا باہر نکل کر تھوڑی سیر کرنی چاہیے۔ میں نے گارڈ ڈیوٹی پر متعین مجاہد سے کہا کہ میں ذرا باہر ٹہلنے جا رہا ہوں' تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گا' اور میں کمین گاہ کے خفیہ دروازے سے باہر نکل آیا۔ باہر دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ رات کو ہلکی بارش بھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے باہر بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ خفیہ کمین گاہ کی پہاڑی شہر سے باہر ویران جگہ پر تھی۔ پیچھے ایک اجاڑ سا میدان تھا جہاں ایک طرف کوئی خانقاہ تھی جہاں سے کبھی کسی وقت قوالی کی آواز آیا کرتی تھی۔ میں ٹہلتے ٹہلتے خانقاہ کے قریب چلا آیا۔ پتھریلی چار دیواری کے اندر ایک پرانا گنبد ابھرا ہوا تھا۔ گنبد پر سبز جھنڈا لہرا رہا تھا۔ خانقاہ کے دروازے کے باہر دو فقیر بیٹھے ہوئے تھے۔ اندر شاید کسی بزرگ کا مزار تھا۔ ان دو فقیروں کے سوا وہاں اور کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے خانقاہ میں جانا مناسب نہ سمجھا اور پیچھے سے ہو کر ٹہلتا ٹہلتا آگے جا کر ایک درخت کے نیچے پتھر کے چھوٹے سے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ موسم بے حد خوشگوار ہوگیا تھا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ میں جمیلہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے یقین تھا اور تسلی بھی تھی کہ کمانڈو خالد کے مجاہد اسے اپنی حفاظت میں جنگ بندی لائن عبور کروا کر پاکستان پہنچا دیں گے۔ جمیلہ کی طرف سے میرا ذہن بڑا مطمئن ہوگیا تھا۔ اب میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اپنی توجہ پوری طرح کشمیر کی طرف لگا دوں گا اور محاذ پر جا کر خود بھی مقبوضہ کشمیر میں انڈین آرمی کے خلاف لڑوں گا۔

اتنے میں مجھے کسی سپیرے کی بین کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میدان کی طرف سے ایک سپیرا بین بجاتا خانقاہ کی طرف چلا آ رہا تھا۔ میں خانقاہ سے کافی ہٹ کر درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ سپیرا مزے مزے سے چلتا خانقاہ کے باہر آ کر بیٹھ گیا۔

دور سے مجھے ایسے لگا جیسے یہ وہی سپیرا ہے جو مجھے چھندواڑہ اور ہوشنگ آباد کے جنگل میں ملا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو یہ وہی سیاہ فام سپیرا تھا مگر اس نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی حالانکہ اس نے خانقاہ کی طرف آتے ہوئے مجھے دور سے دیکھا تھا۔

میں نے بھی یہ سوچ کر اسے کوئی اہمیت نہ دی کہ ہو سکتا ہے اسے بھی اسی گاڑی میں بھوپال آنا ہو اور وہ بھوپال آ گیا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ میرے تعاقب میں وہاں آیا ہو۔ غار والے سانپ کا دیا ہوا سیاہ مہرہ میری جیب میں ہی تھا۔ میں نے کمانڈو خالد سے اس مہرے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ محض اس خیال سے کہ کہیں وہ میرا مذاق نہ اڑائے۔ کمانڈو خالد بنیادی طور پر حقیقت پسند انسان تھا اور اس قسم کی باتوں کو دل سے کبھی نہیں مانتا تھا اور ان کا تمسخر اڑایا کرتا تھا۔ یہ مہرہ بظاہر میرے بھی کسی کام کا نہیں تھا۔ لیکن میں نے اس خیال سے اسے اپنے پاس رکھ لیا تھا کہ شاید اس کی کبھی کسی جگہ ضرورت پڑ جائے۔

سیاہ فام سپیرا اپنی دھن میں بین بجا رہا تھا۔ اس نے پٹاری اپنے سامنے رکھ لی تھی اور ابھی تک پٹاری میں سے سانپ نہیں نکالا تھا۔ اس بات پر مجھے ضرور حیرانی ہو رہی تھی کہ وہاں سانپوں کا تماشہ دیکھنے والا کوئی نہیں ہے پھر یہ سپیرا کس لیے بیٹھ کر بین بجا رہا ہے۔ وہاں دو فقیر ضرور بیٹھے تھے مگر ان سے سپیرے کو کیا مل سکتا تھا۔ سپیرا مجھ سے کوئی سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھا۔ بین بجاتے بجاتے اس نے پٹاری کا منہ کھول دیا۔ اندر سے ایک سانپ پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر سانپ پٹاری سے باہر آ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ سانپ نے پھن میری طرف گھما کر مجھے دور سے دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ رینگتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

سانپ کو میری طرف آتے دیکھ کر سپیرے نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور پٹاری میں بند کر دیا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پٹاری جھولے میں ڈال کر اٹھا۔ جھولے کو کندھے سے لٹکایا اور بین بجاتا ہوا مجھ سے کوئی سات قدم کے فاصلے پر سے گزر گیا۔ قریب

سے گزرتے ہوئے اس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ میں بھی اسے دیکھتا رہا۔ سپیرا میدان کی پرلی جانب والے درختوں کی طرف نکل گیا۔ یہ سپیرا میرے لیے بڑا پر اسرار بنتا جا رہا تھا۔ کبھی مجھے احساس ہوتا کہ اسے کس طرح پتہ چل گیا ہے کہ میرے پاس مہا ناگ کا مہرہ ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ کبھی محسوس ہوتا کہ یہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے اور میری نگرانی کر رہا ہے۔ سپیرا میری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا مگر میں کچھ دیر وہیں درخت کے نیچے بیٹھا رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اگر وہ کسی جگہ چھپ کر مجھے دیکھ رہا ہے تو میرا پیچھا کرتے خفیہ کمین گاہ تک پہنچ جائے۔

جب مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی تو میں اٹھ کر خانقاہ کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ میں سپیرے کو یہ تاثر ضرور دینا چاہتا تھا کہ میں خانقاہ پر فاتحہ خوانی کے لیے آیا ہوں۔ خانقاہ میں بیٹھے بیٹھے جب مجھے آدھا پون گھنٹہ گزر گیا تو میں اٹھا اور واپس کمین گاہ کی طرف جانے کی بجائے شہر کو جانے والی سڑک پر آ گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ابھی کمین گاہ کی طرف نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ مجھے شک تھا کہ سپیرا کہیں نہ کہیں چھپ کر میری نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا ہے۔ سڑک پر سے کبھی کبھی کوئی گاڑی' یکہ اور رکشا گزر جاتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ بھیروں جی کے مندر چلا جاؤں۔ شاید وہاں سے ناگن درگا کا کوئی سراغ مل جائے۔ یہ مندر میں نے دیکھا ہوا تھا۔ جس سڑک پر میں جا رہا تھا وہاں سے ایک کچا راستہ لال پہاڑی کی طرف نکلتا تھا۔ بھیروں جی کا مندر اسی لال پہاڑی کے پیچھے واقع تھا۔

میں نے کچے راستے پر آتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا' مجھے سپیرا کہیں دکھائی نہ دیا۔ لیکن مجھے شک تھا کہ اگر وہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے تو چھپ کر ضرور میرا تعاقب کر رہا ہو گا۔ سی آئی ڈی والوں کو بھی زمین سانپ کی طرح اپنے اندر چھپا لیتی ہے اور وہ پلک جھپکنے میں غائب ہو جاتے ہیں۔ بھیروں جی کا مندر لال پہاڑی کے پیچھے ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ پتھر کی دیوار کے اندر ایک چوکور چبوترے پر بنا ہوا تھا۔ صحن میں کچھ سادھو بیٹھے سلفے کے دم لگا رہے تھے۔ مندر کے دروازے پر ایک پجاری دہلیز کے اندر مورتی

کے پاس بیٹھا بھجن کیرتن کر رہا تھا۔ میں نے گہرے گہرے سانس لے کر فضا میں ناگن درگا کی بو سونگھنے کی کوشش کی مگر مجھے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ یا تو ناگن درگا وہاں موجود نہیں تھی اور یا پھر اگر موجود تھی تو مجھے اس کی بو نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

مندر کے پیچھے کئی چھوٹی چھوٹی مورتیاں پرانی دیواروں میں لگی ہوئی تھیں۔ ان دیواروں میں خشک گھاس اگی ہوتی تھی۔ اچانک مجھے کسی سانپ کی پھنکار سنائی دی۔ آواز میرے عقب سے آئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ ایک مٹیالے رنگ کا چھوٹا سا سانپ پھن اوپر اٹھائے مجھے گھور رہا ہے۔ یہ ناگن درگا نہیں تھی۔ وہ سیاہ رنگ کے سانپ کے روپ میں تھی۔ میں نے اسے دیکھا ہوا تھا۔ اپنی طرف سے میں مطمئن تھا کہ سانپ نے اگر مجھے ڈس بھی دیا تو مجھ پر اس کے زہر کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ میں نے مسکرا کر سانپ سے کہا۔

"یار! تو کیا میری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا ہے اگر تجھے معلوم ہوگیا ہے کہ میں کبھی کبھی انسان سے سانپ بن جاتا ہوں تو بھائی اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں اصل میں انسان ہی ہوں۔ ہاں اگر تو مجھے ناگن درگا کے پاس لے چلے تو میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں گا۔"

اچانک سانپ نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔

وہ سیدھا میری گردن پر آیا اور اس نے مجھے ڈس دیا۔ میں نے اسے پکڑ کر پرے پھینک دیا اور گالی دے کر کہا۔

"آخر تو بھی میرا دشمن ہی نکلا۔ دفع ہو جا یہاں سے' نہیں تو میں تجھے مار ڈالوں گا۔"

سانپ مجھ سے پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ میں نے وہاں سے واپس چلنے کے لیے پاؤں اٹھایا تو مجھے اپنا پاؤں بھاری محسوس ہوا۔ میں نے دوسرا پاؤں اٹھانے کی کوشش کی تو وہ پہلے پاؤں سے زیادہ بھاری تھا۔ اس کے بعد مجھے اپنا سارا جسم پتھر کی طرح بھاری لگنے لگا۔ پھر میرا حلق

خشک ہوگیا۔ کیا میں سانپ ہوگیا تھا؟ مجھے خیال آیا۔ اس کے ساتھ ہی میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ میں نے کسی کو آواز دینے کی کوشش کی لیکن میری آواز بند ہوگئی تھی۔ جسم بالکل سن ہوچکا تھا۔ یا خدا ایسا کیوں ہوا؟ ضرور یہ کوئی خطرناک سانپ تھا جس کے زہر نے مجھ پر مہلک اثر کیا تھا۔

مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ نہ ہاتھ ہلا سکتا تھا نہ پاؤں ہلا سکتا تھا۔ قدموں کی چاپ میرے قریب آ کر رک گئی۔ ایک آدمی مجھ پر جھکا۔ یہ وہی سیاہ فام سپیرا تھا۔ اس نے سانپ کو اٹھا کر اپنی پٹاری میں بند کر کے پٹاری کو جھولے میں ڈالا اور میرے کپڑوں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس چیز کی تلاش میں تھا۔

آخر اسے میری جیکٹ کی جیب میں سے مہا ناگ کا مہرہ مل گیا۔ مہرے کو غور سے دیکھنے کے بعد سپیرے نے اسے چوم لیا۔ میری طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ مہرہ اپنی صدری کی جیب میں ڈالا اور تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے چلا گیا۔ میں بے بسی کی حالت میں وہیں زمین پر پڑا تھا۔ مندر کی جانب سے اب کسی پجاری کے بھجن گنگنانے کی آواز آنے لگی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ تقدیر کیا کھیل کھیلنے والی تھی۔ نہ میں اٹھ سکتا تھا' نہ جسم ہلا سکتا تھا' نہ بول سکتا تھا۔ صرف سن سکتا تھا۔ ایک دم سے مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں سمجھ گیا کہ میرے ساتھ کیا گزرنے والی ہے۔ مجھے دوسرا اور پھر تیسرا جھٹکا لگا اور میرا بدن ہلکا ہونا شروع ہوگیا۔ میرے جسم کا احساس غائب ہوگیا تھا۔ میں جیسے اپنے جسم سے الگ ہو کر اپنے جسم کو زمین پر پڑے دیکھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میرا انسانی جسم غائب ہوگیا اور اس کی جگہ ایک سانپ لیٹا ہوا تھا۔ میرا شعور واپس آ چکا تھا۔ میں انسان سے سانپ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

میں نے ساپ کے روپ میں آتے ہی انسانی آواز میں بولنے کی کوشش کی تو میری قوت گویائی واپس آ چکی تھی۔ میں انسانی آواز میں بول سکتا تھا۔ میں نے اتنی بات بھی بہت غنیمت جانی کہ میں سانپ بن گیا ہوں تو کیا ہوا۔ یہ تو میرے ساتھ نہ جانے

کب تک ہوتا ہی رہے گا لیکن کم از کم میں انسانی آواز میں بول تو سکتا ہوں۔ آخر میں انسان سے سانپ میں تبدیل ہو کر ہی رہا۔ خدا جانے یہ دورہ پڑنا کب میری جان چھوڑے گا۔ میرا ذہن ناامیدی اور مایوسی کے احساس سے بوجھل ہو رہا تھا مگر میں مجبور تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں سانپ ہوں اور کھلی جگہ پر پڑا ہوں۔ کسی انسان کی نگاہ پڑ گئی تو وہ مجھے ہرگز زندہ نہیں چھوڑے گا۔ دن کا وقت تھا۔ میں دور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ جان بچانے کی خاطر میں مندر کی دیوار کے پاس پتھروں کے نیچے چھپ گیا۔ سانپ کے روپ میں آ جانے کی وجہ سے مجھے کمانڈو خالد کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔ کمانڈو خالد مجھ سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے کمین گاہ میں چھوڑ کر کسی کام سے اپنی کزن کے گھر گیا تھا۔ خفیہ کمین گاہ بھی مجھ سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھی۔ جمیلہ کی خوشبو مجھے نہیں آ رہی تھی۔ وہ جموں کشمیر کی طرف سے مجھ سے کافی دور جا چکی تھی۔ میں نے زبان باہر نکال کر چاروں طرف فضا کو سونگھا کہ شاید کسی طرف سے ناگن درگا کی بو بھی آ جائے مگر اس کی بو فضا میں موجود نہیں تھی۔

ناگن درگا اس علاقے میں شاید نہیں تھی۔

میں وہاں سے خفیہ کمین گاہ میں جانا چاہتا تھا۔ مگر دن کی روشنی میں اتنا سا فاصلہ طے کرنا بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ مجھے بھیروں جی کے مندر سے نکل کر ایک آبادی والے علاقے سے گزرنا تھا۔ ویسے بھی دن کے وقت سانپ کھلی جگہ پر نکلے تو اس کا زندہ بچنا مشکل ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی کی اس پر نظر ضرور پڑ جاتی ہے اور پھر لوگ اسے ہلاک کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔ میں نے یہی سوچا کہ ذرا شام کا اندھیرا ہو جائے تو خفیہ کمین گاہ کی طرف چل پڑوں گا۔ میں پتھروں کے نیچے سر ڈال کر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ دن گزرتا چلا گیا۔ یہ تو اب آپ بھی جان گئے ہوں گے کہ سانپ کو انتظار کی کوفت نہیں ہوتی۔ وہ کئی کئی دن چھپ کر بیٹھا انتظار کر سکتا ہے۔ آسمان ابر آلود ہونے کی وجہ سے دھوپ نہیں نکلی ہوئی تھی۔ دن کی روشنی آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگی۔ پھر شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا اترنا شروع ہو گیا۔ میں پتھروں میں سے باہر آ گیا اور

دیور کے ساتھ ساتھ رینگنے لگا۔ مجھے بھیروں جی کے مندر کے سامنے سے ہو کر دوسری طرف کچے راستے پر جانا تھا۔ وہاں سے سڑک پار کرنی تھی جہاں سے موٹریں وغیرہ گزر رہی تھیں۔ سڑک کی بتیاں روشن ہوگئی تھیں۔

بھیروں جی کے مندر کے دروازے کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک مجھے ناگن درگا کی خاص بو محسوس ہوئی۔ میں دیوار کے بالکل ساتھ لگ کر رینگ رہا تھا۔ میں وہیں رک گیا۔ منہ اٹھا کر زبان باہر نکال کر چاروں طرف لہرائی۔ ناگن درگا کی بو بہت ہلکی تھی اور اس طرف سے آ رہی تھی جس طرف بھوپال کے جنگل شروع ہوتے تھے۔ ناگن درگا کی بو برابر آ رہی تھی۔ میں سب کچھ بھول بھلا کر ناگن درگا کی بو کے تعاقب میں چل پڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر مجھے ناگن درگا کی بو آئی ہے تو اسے بھی میری بو ضرور محسوس ہوگئی ہوگی۔ ممکن تھا کہ وہ بھی میری تلاش میں اسی طرف آ رہی ہو۔ شام کا اندھیرا بادلوں کی وجہ سے جلدی گہرا ہوگیا تھا۔ میں مندر کی چار دیواری کو چھوڑ کر اجاڑ میدان میں سے گزرنے لگا۔ میں ٹھیک اس سمت کو جا رہا تھا جس سمت سے مجھے ناگن درگا کی بو آ رہی تھی۔ میں اس حقیقت سے باخبر تھا کہ میں ناگن درگا کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا اور اسے سانپ کی شکل سے عورت کی شکل میں واپس نہیں لا سکوں گا۔ کیونکہ میں خود سانپ کے روپ میں تھا۔ ناگن درگا کو عورت کی شکل میں واپس لانے کے لیے ضروری تھا کہ میں انسان کی شکل میں آکر اس کے منہ کو چوم لوں۔ اس کے بعد ہی ناگن درگا عورت کی شکل میں واپس آ سکتی تھی لیکن میں ناگن درگا کے پاس جا کر اس سے ملنا بھی چاہتا تھا اور اسے اپنے ساتھ خفیہ کمین گاہ میں لے آنا چاہتا تھا اور اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا تاکہ جس وقت بھی میں سانپ سے انسان کی شکل میں واپس آؤں تو اس کا منہ چوم کر اسے سانپ کے روپ سے نجات دلا دوں۔ میں میدان میں سے نکل گیا۔

آگے کھیت شروع ہوگئے۔ میں کھیتوں میں سے بھی نکل گیا۔ شام کا اندھیرا اور زیادہ گہرا ہوگیا تھا اور تقریباً" رات ہوگئی تھی۔ مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے

میں بڑی بے فکری کے ساتھ تیزی سے ناگن درگا کی بو کے تعاقب میں چلا جا رہا تھا۔ کھیت بھی ختم ہوگئے۔ پھر ایک سوکھی جھاڑیوں والا میدان سا آگیا۔ وہاں سے بھی گزر گیا۔ آگے ریلوے لائن آگئی۔ میں ریلوے لائن کی طرف بڑھا تو دور سے انجن کی سیٹی کی آواز آئی۔ پھر ریل کی پٹڑی پر انجن کی روشنی پڑنے لگی۔ میں ریلوے لائن کے قریب آکر رک گیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین گزرنے لگی۔ ٹرین کے ڈبوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ زمین ریل کے دوڑتے ہوئے پہیوں کی دھمک سے ہل رہی تھی۔ ریل کے گزر جانے کے بعد میں ریلوے لائن پر سے ہوتا ہوا دوسری طرف آگیا۔ ریلوے لائین کے پار بھوپال کے جنگلات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ شہر کے قریب جنگل اتنے گھنے نہیں تھے۔ میں نے کچھ فاصلے پر درختوں کے سیاہ جھنڈ دیکھے۔ اندھیرے میں اب مجھے ہر شے صاف دکھائی دے رہی تھی۔

دور درختوں کے سیاہ جھنڈ جنگل کے شروع کے درخت تھے۔ ناگن درگا کی بو ان درختوں کی طرف سے ہی آ رہی تھی اور اب زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ناگن درگا ان درختوں میں کسی جگہ موجود ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ بھی میری طرف بڑھی چلی آ رہی ہو اور راستے میں ہی ہماری ملاقات ہو جائے۔ میں رینگتا چلا جا رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ قریب آگئے۔ ناگن درگا کی بو زیادہ گہری ہوگئی۔ وہ ضرور ان درختوں میں کسی جگہ چھپی ہوئی تھی۔ میں درختوں کے درمیان آکر رک گیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ درختوں کے عقب میں گھنا جنگل تھا۔ اچانک ناگن درگا کی بو آنا بند ہوگئی۔ میں نے پھن کھول کر اٹھا لیا اور اسے چاروں طرف گھمایا۔ بالکل ریڈار کی طرح میں ناگن درگا کی بو کے سگنل پکڑنا چاہتا تھا لیکن اس کی بو کسی طرف سے نہیں آ رہی تھی۔ اچانک اس طرح سے بند ہوگئی تھی جیسے کسی نے اسے اٹھا کر لوہے کے صندوق میں بند کر دیا ہو۔ جب سانپ کو لوہے یا شیشے کے صندوق یا بوتل میں بند کر دیا جاتا ہے تو اس کی بو شیشے اور لوہے کی دیواروں کو توڑ کر باہر نہیں نکل سکتی۔ پتھروں کی دیوار میں سے بو پھر بھی باہر نکلتی رہتی ہے۔

تو کیا ناگن درگا کسی سپیرے کی قید میں ہے؟
میں نے بہت کوشش کی لیکن ناگن درگا کی بو ایسے غائب ہوگئی تھی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ میں پریشان ہوگیا۔ میری پریشانی قدرتی تھی۔ حیران بھی تھا کہ اچانک ناگن درگا کی بو کہاں چلی گئی۔ لیکن میں واپس بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ اگر ایک بار ناگن درگا کی بو قریب سے مجھے آئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ اس جنگل میں کہیں نزدیک ہی موجود ہے۔ اب مجھے اسے تلاش کرنا تھا کہ وہ کسی مشکل میں تو گرفتار نہیں ہے۔ میں نے اس طرف رینگنا شروع کر دیا جس طرف سے اس کی بو آتی ہوئی مجھے محسوس ہوئی تھی۔ درختوں کے جھنڈ پیچھے رہ گئے۔ ایک چھوٹی سی کچی سڑک دکھائی دی۔ یہ فائر لائن تھی۔ جنگل میں محکمہ جنگلات کی طرف سے اس قسم کی چھوٹی چھوٹی سڑکیں بنا دی جاتی ہیں تاکہ اگر جنگل میں آگ لگ جائے تو وہ زیادہ نہ پھیلے اور ایک یا دو بلاکوں تک ہی محدود رہے۔ ان سڑکوں کو محکمہ جنگلات کی اصطلاح میں سانپ لائن بھی کہا جاتا ہے۔

میں ایک سانپ لائن سے گزر کر جنگل کے دوسرے بلاک میں آگیا۔ یہاں رک کر ناگن درگا کی بو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ بو بالکل نہیں آ رہی تھی۔ جنگل کی فضا میں اور بہت سی بوئیں تھیں۔ مگر جس بو کی مجھے تلاش تھی وہ نہیں تھی۔ سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آخر میں جنگل میں کہاں تک اسے تلاش کرتا چلا جاؤں گا۔ جنگل تو بے حد وسیع تھا۔ واپس جانے کو دل بھی نہیں مانتا تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ناگن درگا ضرور کسی مصیبت میں مبتلا ہے' اس کی مدد کرنی چاہیے۔ میں کچھ دیر وہیں گرے پڑے سوکھے پتوں کے درمیان کنڈلی مار کر بیٹھا رہا۔ مجھے ٹپ ٹپ کی آواز سنائی دی۔ پھر میرے اوپر پانی کی بوند گری۔ آسمان پر گھرے ہوئے بادلوں نے ہلکی بوندا باندی شروع کر دی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ واپس چلا جاتا ہوں۔ ان جنگلوں کی بارش بڑی موسلادھار ہوتی ہے۔ کبھی خیال آتا کہ اب اتنی دور تک آگیا ہوں تو تھوڑا اور آگے جا کر دیکھ لینا چاہیے' شاید ناگن درگا کا کوئی سراغ مل جائے۔ ایک

طرف سے ہوا کا جھونکا آیا تو میں چونک پڑا۔ ہوا کے جھونکے میں ناگن درگا کی بو آ رہی تھی۔ میں نے اپنے حواس کو پوری طرح سے بیدار کرتے ہوئے بو کی سمت معلوم کی اور اس کی طرف تیزی سے رینگنا شروع کر دیا۔ ناگن درگا کی بو نہ گہری ہو رہی تھی کہ مجھے یہ احساس ہوتا کہ میں اس کے قریب پہنچ گیا ہوں اور نہ دور ہی ہو رہی تھی۔ ایک خاص سطح پر بو اسی طرح برقرار تھی۔ میں الجھن میں پڑ گیا کہ یہ کیا معمہ ہے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں چلتا چلا گیا۔ جنگل کا اصل اور انتہائی گھنا اور خطرناک علاقہ شروع ہو گیا تھا جہاں سانپ لائن کی بھی کوئی سڑک نہیں تھی۔ مجھے بندروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پھر کوئی بھاری بھرکم جانور تیزی سے پاؤں زمین پر مارتا قریب سے نکل گیا۔ شاید یہ کوئی لگڑ بگڑ تھا۔ بونداباندی باقاعدہ شروع ہو گئی تھی۔ میرے اوپر چونکہ گھنے درختوں کی چھت تھی اس لیے مجھ پر کسی کسی وقت بارش کی کوئی بوند گرتی تھی۔ سامنے ایک ندی بہہ رہی تھی۔ چھوٹی سی ندی تھی۔ میں اس کی سطح پر تیزی سے تیرتے ہوئے دوسرے کنارے پر آ گیا۔ یہ بڑا گنجان جنگل تھا۔ جگہ جگہ گرے پڑے درختوں کے تنے پڑے تھے۔ اونچی اونچی گھاس تھی۔ جھاڑیاں تھیں اور درختوں پر جنگلی بیلیں لٹک رہی تھیں۔ ناگن درگا کی بو ایک خاص سطح پر اسی طرح برابر مجھے آ رہی تھی۔ جنگل میں ایک کھلی جگہ آئی تو بو اچانک ایک بار پھر رک گئی۔ میں بھی وہیں رک گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔

چاروں جانب سے درختوں میں گھری ہوئی یہ ایک چھوٹی سی کھلی جگہ تھی جہاں چھوٹی چھوٹی چٹانیں اور پتھر زمین سے ابھرے ہوئے تھے۔ میں اپنے انسانی ذہن سے غور کرنے لگا کہ یہاں آ کر بو کیوں غائب ہوئی ہے۔ یہ معمہ میری انسانی سمجھ سے بھی باہر تھا۔ بونداباندی نے بارش کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مجھے سامنے والے اونچے درختوں کے تنوں میں سے ایک عمارت سی دکھائی دی۔ میں بارش میں بھیگ رہا تھا۔ سوچا بارش سے بچنے کے لیے اس عمارت میں چلا جائے۔ ہو سکتا ہے وہاں ناگن درگا کے معمے کا

کوئی حل بھی مل جائے۔ میں جلدی جلدی رینگتا سامنے والے درختوں کے نیچے ، جھاڑیوں میں سے نکلتا عمارت کے پاس آ گیا۔ یہ کوئی ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا۔ اونچے چبوترے پر ایک کوٹھڑی سی بنی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ چبوترے پر چڑھنے کے لیے پتھر کی سیڑھیاں تھیں جو مٹی میں دب چکی تھیں اور ان پر گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں ان پر سے رینگ کر چبوترے کے اوپر پہنچ گیا اور دیکھا کہ ایک اندھیری کوٹھڑی ہے جس کا کوئی دروازہ وغیرہ نہیں ہے۔ بارش تیز ہوگئی تھی۔ میں جلدی سے کوٹھڑی میں گھس گیا۔ کوٹھڑی میں اتنا گہرا اندھیرا تھا کہ مجھے سانپ ہوتے ہوئے بھی زیادہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کوٹھڑی خالی تھی۔ کونے میں اینٹوں کا ڈھیر لگا تھا۔ میں نے اوپر نگاہ دوڑائی۔ ایک طرف سے سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ غور سے دیکھا تو اوپر ایک چھوٹا سا طاق تھا جو کھلا تھا۔ طاقچے کا بھی کوئی دروازہ نہیں تھا۔

مجھے تجسس ہوا کہ دیکھنا چاہیے اس طاق میں کیا ہے۔ میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیوں پر مٹی اور گرد جمی ہوئی تھی۔ طاقچے کے پاس آ کر اندر سر ڈال کر دیکھا تو وہاں بھی ایک کوٹھڑی نظر آئی۔ میں اس میں داخل ہوگیا۔ یہ کوٹھڑی بھی خالی تھی۔ اس کی دیوار کے اوپر بھی ایک چھوٹا سا طاق تھا۔ وہاں تک جانے کے لیے کوئی سیڑھی نہیں بنائی گئی تھی۔ میں دیوار پر سے رینگتا ہوا طاق میں آ گیا۔ یہ طاق شاید کسی زمانے میں چراغ وغیرہ رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ میں نیچے اتر آیا۔ پھر سیڑھیاں اتر کر نیچے والی کوٹھڑی میں آ کر دہلیز کے پاس کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور باہر جنگل کی طرف دیکھنے لگا۔ میں بار بار فضا کو سونگھ لیتا کہ شاید ناگن درگا کی بو کسی طرف سے آ جائے۔ لیکن اس کی بو بالکل نہیں آ رہی تھی۔ باہر بارش اب موسلادھار ہونے لگی تھی۔ جنگل میں رات کے وقت بارش کا شور گونج رہا تھا۔ ایک طرف سے پانی کی آبشار گرنے کی آواز آنے لگی تھی۔ بارش کی پھوار کوٹھڑی کے اندر تک آ رہی تھی۔ میں نے اچھا کیا تھا کہ یہاں کھنڈر میں آ گیا تھا۔ اگر واپس چلا جاتا تو راستے میں یہ بارش مجھے کافی پریشان کر سکتی تھی۔

میں خاموش بیٹھا باہر جنگل میں موسلادھار بارش کو دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر تک بارش زور شور سے ہوتی رہی۔ آہستہ آہستہ بارش کا زور ٹوٹنا شروع ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد بارش بالکل رک گئی۔ اب درختوں سے بارش کے رکے ہوئے پانی کے ٹپکنے کی آواز ہی آ رہی تھی۔ جنگل پر گہرا سناٹا چھا گیا۔ درختوں سے پانی کے ٹپکنے کی آواز پیدا ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی ایسی خاموشی اور سکوت طاری ہوگیا کہ شاید قبر کے اندر بھی ایسی خاموشی اور سکوت نہیں ہوگا۔ میں اب یہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ وہیں بیٹھا رہوں اور ناگن درگا کی بو کا انتظار کروں یا وہاں سے واپس خفیہ کمین گاہ کی طرف چلا جاؤں۔ میں زیادہ دیر رک بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر مجھے واپس ہی جانا تھا تو ابھی رات کا وقت تھا۔ مجھے اس لیے وہاں سے نکل پڑنا چاہیے تھا تاکہ دن کی روشنی ہونے سے پہلے پہلے میں خفیہ کمین گاہ تک پہنچ سکوں۔ ناگن درگا کی بو فضا میں بالکل نہیں تھی۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے واپس ہی چل دینا چاہیے تاکہ صبح ہونے سے پہلے خفیہ کمین گاہ میں پہنچ جاؤں۔ راستہ لمبا تھا' اور بارش کی وجہ سے جنگل میں پانی بھی جگہ جگہ بھرا ہوا ہوگا۔ مجھے کئی چکر کاٹ کر جانا پڑے گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں رینگتا ہوا کھنڈر کی دہلیز پر آیا ہی تھا کہ اچانک مجھے ناگن درگا کی بو محسوس ہوئی۔ میں وہیں رک گیا۔

اس کی بو سامنے کی طرف سے آئی تھی اور اسی کوٹھڑی کی طرف قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اپنا سر کوٹھڑی کے اندر کر لیا اور غور سے جنگل کی تاریکی میں دیکھنے لگا۔ بو قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ ناگن درگا اسی کوٹھڑی کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ ضرور اس نے میری بو بھی محسوس کر لی ہوگی اور وہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ناگن درگا سانپ کے روپ میں بھی عورت کی آواز میں بات کر لیتی تھی۔ میں نے اسے اپنی انسانی آواز دینی چاہی لیکن فوراً" رک گیا۔ اندھیرے میں میں نے دو انسانوں کو کوٹھڑی کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ دونوں ذرا قریب آئے تو معلوم ہوا کہ ان میں ایک عورت ہے اور دوسرا مرد ہے۔ دونوں آپس میں باتیں کرتے آ رہے تھے۔ میں تیزی سے

سیڑھیاں چڑھ کر دیوار کے طاق میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ دونوں مرد عورت کوٹھڑی میں آ کر فرش پر بیٹھ گئے۔ مرد نے ایک تھیلا کندھے سے لٹکا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بین بھی تھی۔ دونوں سپیرن اور سپیرا لگتے تھے۔ مرد نے تھیلا اتار کر اپنے سامنے رکھ دیا۔ تھیلے میں سے ایک موم بتی نکال کر جلائی۔ موم بتی کو ایک اینٹ پر جما دیا۔ موم بتی کی روشنی میں دونوں مجھے صاف نظر آنے لگے۔

دونوں ادھیڑ عمر تھے۔ سپیرے کے سر کے گھنگریالے بال سفید ہو رہے تھے۔ ناگن درگا کی بو بڑی تیز ہوگئی تھی۔ عورت سپیرن نے سپیرے سے کہا۔

"نکال کر مجھے دکھاؤ تو سہی مجھ سے کیوں چھپاتے ہو؟"

سپیرے نے بین اپنے پاس ہی رکھ دی اور تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"اری مری کیوں جاتی ہے۔ ابھی نکال کر دکھاتا ہوں مگر اسے ہاتھ مت لگانا۔"

سپیرن نے کہا۔

"میں کیوں ہاتھ لگانے لگی بھلا؟ پر تم جو کچھ کہہ رہے ہو تو مجھے یقین نہیں آتا۔"

سپیرا بولا۔

"جب تو خود اپنے کانوں سے اس کی آواز سنے گی تو پھر تو تمہیں وشواش آ جائے گا ناں؟"

سپیرن بولی۔

"پہلے میں اس کی آواز تو سنوں۔"

سپیرے نے تھیلے میں سے کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکالی۔ کپڑا کھولا۔ اس میں سے ایک چھوٹی سی مٹی کی ہنڈیا نکلی۔ اس نے سپیرن سے کہا۔

"خبردار ہو کر بیٹھ جا۔ میں اسے نکالنے لگا ہوں۔"

سپیرن بولی۔

"مجھے کیوں ڈراتا ہے۔ آخر میں بھی سپیرن ہوں۔ کوئی اناڑی عورت نہیں ہوں۔"

سپیرے نے ہنڈیا کا ڈھکن اٹھا کر دوسرے ہاتھ سے ایک سانپ پکڑ کر باہر نکال لیا۔ ناگن درگا کی بو ایک دم تیز ہوگئی۔ میں نے سانپ کو غور سے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ سانپ ناگن درگا تھی۔ خدا جانے وہ اس سپیرے کے قبضے میں کیسے آ گئی تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ ایک دم نیچے چھلانگ لگا کر ان دونوں کو ڈس کر ہلاک کر کے ناگن درگا کو اپنے ساتھ لے چلوں۔ پھر خیال آیا کہ یہ کوئی زبردست سپیرا ہے جس نے ناگن درگا کو اپنے قبضے میں کیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس پر میرے ڈسنے کا کوئی اثر نہ ہو۔ یا پھر اس کے پاس سانپ کا مہرہ ہو جس کی مدد سے میرے زہر کے اثر کو زائل کر دے اور الٹا مجھے بھی اپنے قبضے میں کر لے۔ میں وہیں طاق میں بیٹھا دونوں سپیرے سپیرن کو دیکھنے لگا کہ یہ یہاں ناگن درگا کو لے کر کیا کرنے آئے ہیں۔ ناگن درگا کو اس نے گردن سے اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ وہ اسے ڈس نہیں سکتی تھی۔ سپیرے نے اپنی سپیرن سے کہا۔

"یہ ہے وہ ناگ۔ اس کو منش ناگ کہتے ہیں مگر یہ ناگن ہے منش ناگن۔ یہ اصل میں عورت ہے مگر بھیس پلٹ کر ناگن کے روپ میں آ گئی ہے۔"

سپیرن بڑے غور سے ناگن درگا کو دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تو کہتا تھا کہ یہ عورت کی طرح بولتی ہے۔ اسے بلا کر دکھا۔"

سپیرے نے ناگن کو اپنے سامنے لا کر کہا۔

"منش ناگن۔ میں جانتا ہوں تو عورت ہے' ناگن بن گئی ہے۔ میری عورت سے بات کر۔ بتا تیرا نام کیا ہے اور تو کہاں کی رہنے والی ہے؟"

میرا خیال تھا کہ شاید ناگن درگا منہ سے کچھ بولے۔ مگر وہ خاموش رہی۔ اس نے اپنا جسم سپیرے کی کلائی سے لپیٹ لیا تھا اور لگتا تھا کہ وہ زور لگا کر اس کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرانا چاہتی ہے۔ لیکن سپیرے نے اس کی گردن کو سختی سے دبا رکھا تھا۔ سپیرن نے کہا۔

"یہ تو نہیں بولتی۔"

سپیرا بولا۔

"ابھی بولے گی۔"

اس نے ایک بار پھر ناگن درگا سے اس کا نام پوچھا اور کہا۔

'دیکھ ناری! میں جانتا ہوں کہ تو منش ناگن ہے۔ اگر تو مجھے اپنا نام پتہ بتا دے اور یہ بھی بتا دے کہ مہا ناگن کون سے جنگل میں رہتی ہے تو میں تجھے چھوڑ دوں گا۔"

اس کے جواب میں ناگن درگا خاموش رہی۔ تب سپیرے نے اسے دوبارہ ہنڈیا میں بند کر کے اوپر ڈھکن رکھ دیا اور بولا۔

"یہ جان بوجھ کر چپ ہو گئی ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ یہ منش ناگن ہے۔ اس میں وہ ساری نشانیاں موجود ہیں جو میرے گورو نے بتائی ہیں اور ایک عورت ناگن میں ہوتی ہے۔"

سپیرن نے پوچھا۔

"تو اب اس کو کہاں لے جائے گا؟"

سپیرے نے کہا۔

"میں اسے اپنے گورو کے پاس لے جاؤں گا وہ اس سے مہا ناگن کے جنگل کے خزانے کا راز معلوم کر لے گا۔ اسے ایسے منتر آتے ہیں جس کے پھونکنے سے یہ ناگن اپنے آپ خزانے کا راز بتا دے گی۔ اس کے بعد ہم اس کے دو ٹکڑے کریں گے۔ ایک ٹکڑا میر گورو کھا جائے گا۔ دوسرا ٹکڑا میں کھا جاؤں گا۔ جانتی ہو اس کا کیا اثر ہو گا؟"

"کیا اثر ہو گا؟" سپیرن نے پوچھا۔

سپیرے نے کہا۔

"اس کے اثر سے میں اور میرا گورو ہمیشہ کے لیے امیر ہو جائیں گے۔ ہم کبھی بوڑھے نہیں ہوں گے۔ اگر بوڑھے ہیں تو جوان ہو جائیں گے اور کم از کم ایک ہزار

سال تک زندہ رہیں گے۔"

سپیرن نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"اپنے ٹکڑے میں سے تھوڑا سا سانپ مجھے بھی کھلا دینا۔ میں بھی پھر سے جوان بننا چاہتی ہوں۔"

سپیرے نے ہنڈیا کو کپڑے میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

"پہلے اپنے گورو کے پاس تو پہنچ جانے دو پھر تمہیں بھی کھلا دیں گے۔"

اب میں طاق میں بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ ناگن درگا کی جان خطرے میں تھی۔ میں نے وہیں سے سپیرے پر چھلانگ لگا دی اور اس کی گود میں گرا۔ گرتے ہی میں نے اس کے بازو پر ڈس دیا۔ سپیرن جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ سپیرا بالکل نہیں گھبرایا تھا۔ اس نے فوراً" مجھے گردن سے دبوچ لیا اور سپیرن سے کہا۔

"جھولے میں سے مہرہ نکالو' جلدی کرو۔"

سپیرن نے جھولے میں سے مہرہ نکال کر سپیرے کو دیا۔ اس نے مہرہ اپنے بازو پر اس جگہ لگا لیا جہاں میں نے اسے ڈسا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے مہرے کو تھام رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے مجھے گردن سے اس بری طرح سے دبوچا ہوا تھا کہ مجھے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ سانپ کی سب سے بڑی کمزوری اس کی گردن ہوتی ہے۔ اگر آپ اس کی گردن کو دبوچ لیں اور گھبرائیں بالکل نہ تو سانپ آپ کو کبھی نہیں ڈسے گا اور دم گھٹنے سے مر بھی جائے گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ اپنا جسم آپ کی کلائی سے لپیٹ کر آپ کی کلائی کی ہڈی توڑنے کی کوشش کرے۔ لیکن ایک عام سائیز کے سانپ میں اتنی طاقت نہیں ہوتی۔ سانپ کے مہرے نے سپیرے کے جسم سے وہ سارا زہر چوس لیا تھا جو میں نے ڈس کر اس کے خون میں شامل کیا تھا۔ سپیرے نے مہرہ نچوڑا تو اس میں سے سیاہ زہر کے قطرے گرنے لگے۔

اس نے سپیرن سے کہا۔

"یہ کوئی زبردست شکتی والا سانپ ہے۔"

سپیرن نے کہا۔

"یہ موذی یہاں کہاں سے آ گیا تھا۔"

سپیرا بولا۔

"ایسے شکتی والے سانپ بھوپال کے ان خطرناک جنگلوں میں ہی مل سکتے ہیں۔"

"اس کو مار ڈالو۔" سپیرن نے کہا۔

سپیرے نے کہا۔

"یہ سانپ تو خوش نصیب سپیروں کو ہی ملتا ہے۔ میں اسے بھی اپنے گورو کے پاس لے جاؤں گا۔"

اور اس نے مجھے بھی اسی ہنڈیا میں ڈال کر جلدی سے اوپر ڈھکن دے دیا اور کپڑا لپیٹ کر ہنڈیا جھولے میں ڈال دی۔ ہنڈیا میں آتے ہی مجھے ناگن درگا کی خوشبو نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں ناگن درگا اور ناگن درگا میرے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ ناگن درگا نے مجھے اور میں نے ناگن درگا کو پہچان لیا تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

"بھگوان کی مجھ پر کتنی کرپا ہوئی ہے کہ اس نے تمہیں مجھ سے ملا دیا۔"

میں نے کہا۔

"لیکن ہم موت کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ سپیرا ہمیں اپنے گورو کے پاس لے جا رہا ہے جو ہم دونوں پر منتر پھونک کر ہم سے کچھ باتیں معلوم کر لے گا اور پھر یہ دونوں سپیرے گورو اور چیلا ہمارے ٹکڑے کر کے کھا جائیں گے۔"

اس دوران ہمیں سپیرے کی آواز آئی۔

"چلو بھاگ وان، گورو کے ڈیرے پر چلتے ہیں۔"

سپیرن نے پوچھا۔

"تمہارے گورو جی کا ڈیرا تو یہاں سے بہت دور ہے۔"

سپیرے نے جھولا کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہم لاری پر جائیں گے۔ پیدل تھوڑے جائیں گے۔"

دونوں کوٹھڑی سے نکل کر جنگل میں کسی طرف چل پڑے۔ میں اور درگا ناگن ہنڈیا کے اندر بند ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے تھے اور انسانی سرگوشیوں میں کسی کسی وقت کوئی بات کر لیتے تھے تاکہ سپیرا ہم دونوں میں سے کسی کی آواز نہ سن سکے۔

ناگن درگا نے کہا۔

"اس کم بخت ہنڈیا کا ڈھکن زور سے بند کیا ہوا ہے۔ ہم کوشش کر کے بھی اسے نہیں اٹھا سکتے۔"

میں نے کہا۔

"ڈھکن اٹھا بھی لیا تو ہنڈیا کے گرد کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ ہم کپڑے سے کیسے باہر نکلیں گے۔"

"پھر اب کیا کریں۔ یہ بتاؤ کہ تم کہاں اور کس طرف چلے گئے تھے۔ جب ہمارے پیچھے ہمیں مارنے کو آدمی دوڑے تھے تو میں تو ادھر ادھر سے چھپتی چھپاتی شام کو بھیروں جی کے مندر میں آگئی تھی اور کئی دن تمہارا وہیں انتظار کرتی رہی۔"

میں نے سرگوشی میں کہا۔

"درگا! یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ پہلے اس مصیبت سے جان چھوٹے تو پھر ایک دوسرے کو اپنی اپنی داستان غم بھی سنا دیں گے۔"

وہ بولی۔

"اس سے پہلے کہ یہ دہشت اپنے گورو کے پاس پہنچے' ہمیں کسی طرح بھاگنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ورنہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔"

میں نے کہا۔

"یہ کوئی بڑا کرنی والا' تجربے کار پرانا سپیرا ہے۔ اس سے جان بچانے کے واسطے کوئی انوکھی ترکیب سوچنی پڑے گی۔"

ہم باتیں کرتے کرتے چپ ہو گئے۔ ہمیں باہر سے کسی گاڑی کے گزرنے کی آواز آئی تھی۔ خدا جانے یہ سپیرا اور سپیرن جنگل کے کس شارٹ کٹ سے ہو کر سی

سڑک پر نکل آئے تھے۔ پھر ہمیں ایسے لگا جیسے کوئی لاری ہمارے پاس ہی آ کر رک گئی ہے۔ کسی نے آواز دی۔

"چلو چلو' بیٹھو جلدی کرو۔"

"بیٹھ گئے' بابو' بیٹھ گئے۔ آؤ بھاگوان۔"

یہ سپیرے کی آواز تھی۔ دونوں کسی لاری پر بیٹھ گئے تھے۔ لاری چل پڑی۔ کتنی دیر تک لاری چلتی رہی۔ ایک جگہ رکی پھر آگے روانہ ہوگئی۔ جھولے کے اندر ابھی تک اندھیرا تھا۔ کیونکہ سپیرا اور سپیرن ہمیں لے کر رات کے وقت جنگل سے چلے تھے۔ لاری کا سفر کافی لمبا تھا۔ آہستہ آہستہ ہنڈیا کے اندر صبح کی سفیدی جھلکنے لگی۔ میں نے درگا سے کہا۔

"درگا دن نکل آیا ہے۔"

ہنڈیا کے اندر اس کے ڈھکنے کے سوراخوں میں سے دن کی روشنی آ رہی تھی۔ وہ بولی۔

بھگوان جانے یہ ہمیں کہاں سے کہاں لے آیا ہے۔"

میں نے درگا سے پوچھا کہ وہ اس سپیرے کے قابو کیسے آ گئی؟ اس نے بتایا کہ وہ چھندواڑہ کے جنگل میں میری تلاش میں بھوپال کی طرف آ رہی تھی کہ ایک جگہ وہ جنگل سے نکل کر ایک نہر کے کنارے پر ہوگئی۔ بس وہیں کہیں سے اس سپیرے نے درگا کو دیکھ لیا اور اس کی بو سے پہچان گیا کہ یہ ناگن سانپ نہیں ہے' بلکہ عورت ہے اور وہیں سے وہ اس کے پیچھے لگ گیا اور آخر ایک جگہ اسے قابو کر لیا۔ لاری کسی جگہ رک گئی۔ باہر سے بہت سے لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ کوئی لاری اڈہ تھا۔ یہاں سے سپیرا اور سپیرن پیدل ہی کسی طرف روانہ ہوگئے۔ دیر تک دونوں پیدل چلتے رہے۔ پھر کسی جگہ بیٹھ گئے۔ سپیرن کہنے لگی۔

"ارے ہنڈیا کھول کر دیکھو تو سہی دونوں زندہ بھی ہیں کہ ایک دوسرے کو ڈس کر مرے پڑے ہیں۔"

سپیرے نے کہا۔

”اری مورکھ! کبھی ایسا ہوا ہے بھلا۔“

سپیرن نے کہا۔

”پھر بھی ایک دفعہ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گورد جی کے پاس جا کر تم ہنڈیا کھولو تو دونوں مرے پڑے ہوں اور گورد جی کے آگے تمہیں شرمندہ ہونا پڑے۔“

سپیرا بولا۔

”اگر تو کہتی ہے تو کھول کر دیکھ لیتا ہوں۔“

یہ مکالمے ہم دونوں نے سنے تھے۔ میں نے ناگن درگا سے سرگوشی میں کہا۔

”درگا! بس یہی موقع ہے‘ جیسے ہی سپیرا ہنڈیا کا ڈھکن اٹھائے اسے فوراً“ ڈس دینا اور پھر اپنی پوری طاقت کے ساتھ باہر کو اچھل کر نکل جانا اور جس طرف منہ اٹھے بھاگ جانا۔ میں بھی ایسا ہی کروں گا اور تمہارے پیچھے پیچھے آؤں گا۔“

سپیرا جھولے میں سے کپڑے میں لپٹی ہوئی ہنڈیا نکال رہا تھا۔ اس نے کپڑے کو کھولا۔ پھر ہنڈیا کو کسی جگہ رکھ دیا۔ وہ اس کا ڈھکن اٹھانے لگا تھا کہ ناگن درگا سے غلطی ہوگئی۔ بجائے اس کے کہ سپیرا ڈھکن اٹھا کر اندر ہاتھ ڈالتا اور درگا اسے ڈستی اس نے اسی وقت پوری طاقت سے اپنا سر اوپر کو اچھالا۔ اس کا سر زور سے ہنڈیا کے ڈھکن سے ٹکرایا۔ ہنڈیا کا ڈھکن تو نہ گرا لیکن سپیرا اپنے ہاتھ کا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ہنڈیا اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑی۔ ہم دونوں ابھی تک ہنڈیا کے اندر تھے۔ ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

ہمارا خیال تھا کہ جیسے ہی ہندیا زمین پر گر کر ٹوٹے گی سپیرا وہیں ہم دونوں کو دبوچ لے گا‘ مگر نہ ہنڈیا زمین پر گری اور نہ کسی نے ہمیں دبوچا۔ ہمیں ایسی آواز آئی جیسے ہنڈیا اوپر سے نیچے کو لڑھکتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا ڈھکن علیحدہ ہوگیا تھا اور پھر وہ پانی میں گر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ ہم دونوں ایک بہت بڑے دریا میں گرے ہیں۔ ہنڈیا

اوپر دریا کے پل سے گری تھی جہاں مجھے سپیرا اور سپیرن گھبرائے ہوئے ادھر ادھر دوڑتے نظر آئے۔ میں نے ناگن درگا کو آواز دی۔ ہم ہنڈیا سے باہر نکل کر دریا میں الگ الگ گرے تھے' اور دریا کی تیز رفتار موجیں ہمیں بہا کر آگے ہی آگے لیے جا رہی تھیں۔ سانپ دریا میں ڈوبتا نہیں' وہ دریا میں تیرتا ہے۔ مگر دریا چوڑا ہو اور لہریں تیز رفتار ہوں تو پھر اس کے ڈوب کر مرنے کا خطرہ ضرور ہوتا ہے۔ میں نے ناگن درگا کو دو تین بار زور زور سے پکارا۔ مگر نہ مجھے درگا کی آواز ہی آئی نہ وہ خود مجھے دریا کی لہروں پر کہیں دکھائی دی۔ دریا کی لہریں بالکل سمندر کی طرح اوپر کو اچھل رہی تھیں۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور دریا کی روانی بھی تیز تھی اور وہ نشیب میں تیزی سے لہروں کو اچھال اچھال کر بہتا چلا جا رہا تھا۔ دریا کا بہاؤ مجھے بالکل سیدھا لیے جا رہا تھا۔ کنارے کافی دور نظر آ رہے تھے۔ اتنے تیز بہاؤ میں دریا کے کناروں کی طرف جانا تقریباً" ناممکن تھا۔ میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ آخر مجھے ناگن درگا کی آواز آئی۔ اس نے میرا نام لے کر مجھے پکارا تھا۔ میں نے فوراً" جواب میں اسے آواز دی۔ دریا کی لہروں کا شور آگے جا کر کم ہو گیا تھا۔ میں نے ناگن کو دیکھ لیا۔

میں نے اپنے جسم کی پوری طاقت سے اس کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ میں بڑی جدوجہد کے بعد اس کے پاس پہنچ گیا۔ درگا نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔

"کرم داد! کنارے کی طرف جانے کی کوشش کرو۔"

ہم دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر تھے اور دونوں کنارے کی طرف جانے کی جدوجہد کرنے لگے۔ انتہائی ہمت شکن جدوجہد کے بعد ہم دریا کے کنارے پانی میں گرے ہوئے ایک درخت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم درخت کے ایک بڑے ٹہن پر چڑھ کر اس سے لپٹ گئے۔ ناگن درگا میری طرف اور میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"کنارے پر آ جاؤ' کنارہ زیادہ دور نہیں ہے۔"

ہم درخت کے تنے پر سے ہو کر دریا میں اتر گئے۔ یہاں دریا کی روانی بہت دھیمی تھی۔ ہم بڑی جلدی تیرتے ہوئے کنارے پر آ گئے۔ کنارے پر جھاڑیاں' سرکنڈے اور گھنے درخت ساتھ ساتھ کھڑے دور تک چلے گئے تھے۔

ہم جھاڑیوں میں سے نکل کر درختوں کے درمیان آ گئے۔ یہاں ایک راستہ تھا جس پر بیل گاڑیوں کے چلنے کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ اردگرد کوئی آبادی نظر نہیں آتی تھی۔ ناگن درگا نے پوچھا۔

"یہ کون سی جگہ ہے کرم داد؟"

میں نے کہا۔

"تم ادھر کی رہنے والی ہو۔ تمہیں زیادہ معلوم ہونا چاہیے۔"

وہ بولی۔

"میرا خیال ہے کہ یہ تاپتی دریا ہے اور ہم ہوشنگ آباد کے علاقے میں کہیں ہیں۔"

میں نے کہا۔

"پھر تو ہم بھوپال سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ہم یہاں سے بھوپال واپس جا سکتے ہیں۔"

درگا نے کہا۔

"تم تو بھوپال ضرور جاؤ گے۔ وہاں تمہاری بیوی جو ہے مگر میرا تو اب تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔ میں تو صرف اس امید پر زندہ ہوں کہ کب تم انسانی شکل میں آ کر میرا منہ چومو اور میں عورت کی شکل میں واپس آ جاؤں۔"

میں نے درگا سے کہا۔

"درگا! میں جب انسانی شکل میں تھا تو تمہاری تلاش میں دربدر مارا پھرتا رہا۔ مگر تم مجھے کہیں نظر نہ آئیں۔ قسمت میں یہی لکھا تھا کہ تم مجھے اس وقت ملو گی جب میں بھی انسان سے سانپ بن چکا ہوں۔ لیکن ایک بات میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب

بھوپال میں میری بیوی نہیں ہے۔ میں نے اسے پاکستان واپس بھجوا دیا ہے۔ اب میں بھوپال میں اپنے ساتھی خالد کے پاس ہی جاؤں گا۔"

درگا نے گہرا سانس بھرا اور بولی۔

"کرم داد! میں نے یہ سوچا تھا کہ ہم دونوں عورت اور مرد کے روپ میں زندگی کے کچھ خوبصورت سال ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر بسر کریں گے لیکن ایسا لگتا ہے کہ بھگوان کو یہ منظور نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"ان باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ یہاں سے کس طرف چلیں؟"

درگا نے درختوں میں جاتے کچے راستے کو دیکھا اور بولی۔

"اس راستے پر چل پڑتے ہیں کوئی گاؤں یا شہر آئے گا تو معلوم کریں گے کہ ہم کہاں پر ہیں اور بھوپال یہاں سے کتنی دور ہے۔"

ہم دریا کے کنارے سے اتر کر کچے راستے سے ایک طرف ہو کر روانہ ہو گئے۔





ایک بات نہ میری سمجھ میں آ رہی تھی نہ ناگن درگا کی۔

اور وہ بات یہ تھی کہ ہم دونوں ہی سانپوں کے روپ میں تھے۔ ہم یہ کس طرح اور کیسے معلوم کریں گے کہ آگے جو شہر آئے گا وہاں سے بھوپال کی طرف گاڑی کب اور کس پلیٹ فارم سے جائے گی۔ یہ بڑا وقت طلب مسئلہ تھا اور یہ مشکل مجھے کئی بار پڑ چکی تھی۔ ناگن درگا بھی یہی سوچ رہی تھی۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی بلکہ رینگ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"میرا اندازہ یہی تھا کہ ہم چھندواڑہ اور ہوشنگ آباد کے درمیان کسی شہر کے آس پاس ہیں۔ دن کا وقت ہے۔ اگر کوئی شہر آگیا تو ہمیں کسی جگہ چھپ کر رات کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی ہم سٹیشن پر پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ پھر یہ معلوم کرنا ہوگا کہ یہ کون سا شہر ہے۔ بھوپال کی گاڑی کون سے پلیٹ فارم سے روانہ ہوگی۔ اس کے بعد ہمیں اس گاڑی کی چھت پر کسی طرح پہنچنا ہوگا۔"

میں نے کہا۔

"یہ پریشانی تو ضرور پیش آئے گی لیکن پہلے کوئی شہر تو آئے اور یہ معلوم ہو کہ یہ کون سا شہر ہے۔"

ہم کچے راستے پر کنارے کی طرف ہو کر گھاس اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ہماری دونوں جانب اب کھیت شروع ہوگئے تھے۔ کھیتوں میں کہیں

کہیں اس علاقے کے کسان کام کرتے نظر آنے لگے تھے۔ پھر دور سے مجھے کسی کارخانے کی چمنی نظر پڑی۔

میں نے ناگن درگا سے کہا۔

"آگے کوئی شہر ہے۔ وہ دیکھو کارخانے کی چمنی۔"

اس نے چمنی کو دیکھا اور بولی۔

"اب ہمیں بڑی احتیاط برتنی ہوگی۔ کسی انسان کی ہم پر نظر پڑ گئی تو ہم دونوں مارے جائیں گے یا پھر دونوں ایک دوسرے سے ایک بار پھر بچھڑ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"ہم شہر سے باہر رہیں گے اور ریلوے لائن ڈھونڈ کر وہیں کسی جگہ چھپ جائیں گے۔ جب رات کا اندھیرا پھیل جائے گا تو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے سٹیشن پر پہنچ کر بھوپال جانے والی گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش کریں گے۔"

شہر کی آبادی شروع ہوگئی۔ ہم ایک ماڈرن کالونی کے مکانوں سے کچھ فاصلے پر رہ کر آگے گزر گئے۔ یہ کوئی بہت بڑا شہر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی کافی آبادی والا شہر تھا۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیلوں پر بھی مکان بنے ہوئے تھے۔ ہم شہری آبادی سے دور رہ کر کھیتوں اور میدانوں میں سے گزر رہے تھے۔ ایک جگہ مجھے ریلوے کا سگنل دکھائی دیا۔ میں نے درگا کو سگنل کا کھمبا دکھایا اور کہا۔

"خدا کا شکر ہے ہمیں ریلوے لائن کا سراغ مل گیا ہے۔ اس طرف چلتے ہیں۔"

ہم کھیتوں' میدانوں اور تالابوں کے قریب سے ہوتے ہوئے ریلوے لائن کے اونچے بند پر چڑھ گئے۔ ریلوے لائن زمین سے اونچی تھی۔ درگا نے کہا۔

"جس طرف سگنل کا کھمبا ہے' سٹیشن اسی طرف ہوگا۔"

ہم سگنل کے کھمبے کی جانب ریلوے لائن کے پہلو میں چلنے لگے۔ جب دور سے ہمیں سٹیشن کی ڈھلانی چھتیں اور سگنل کے دوسرے کھمبے بھی نظر آنے لگے تو ہم ریلوے ٹریک سے اتر کر ایک درخت کے پیچھے گھاس میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ ناگن

درگا بالکل میرے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ عورت کی انسانی آواز میں اور میں مرد کی انسانی آواز میں بات کر رہا تھا۔ درخت کی وجہ سے ہم ریلوے لائن کی اوٹ میں تھے اور ریلوے لائن ہمیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہاں ہمیں اس وقت تک چھپے رہنا تھا جب تک کہ رات کا اندھیرا نہیں پھیل جاتا۔ ناگن درگا نے میرا نام لے کر کہا۔

"کرم داد! کیا تم بھی اپنی بیوی کے پاس پاکستان چلے جاؤ گے؟"

ناگن درگا ہندو عورت تھی اور بھارتی شہری تھی۔ وہ کسی بھی وقت عورت کی شکل میں واپس آ سکتی تھی یا میں انسانی روپ میں آ کر اسے عورت کے روپ میں واپس لا سکتا تھا۔ اس وجہ سے میں اسے بھارت میں اپنے عزائم کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا' ہو سکتا ہے ابھی کچھ دیر بھارت میں ہی رہنا پڑ جائے۔"

وہ بولی۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ہمیشہ کے لیے بھارت میں ہی رہ جاؤ۔"

"درگا! اس سے تمہیں کیا ملے گا؟"

اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

"مجھے تم مل جاؤ گے' مجھے اور کیا چاہیے۔"

ناگن درگا جذباتی ہو رہی تھی۔ یہ مجھے بہت پہلے احساس ہو چکا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ لیکن چونکہ میرا مشن اس قسم کی انسانی جذباتی کمزوریوں سے بہت بلند تھا اس لیے میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ جہاں تک محبت کے جذبات کا تعلق تھا تو میں ان جذبات سے محروم نہیں تھا۔ لیکن مجھے صرف اپنی بیوی جمیلہ سے ہی محبت تھی۔ میں ایک سیدھا سادا فوجی ٹائپ کا شریف اور سادا مسلمان تھا۔ بیوی ملی تو اس سے محبت کرنے لگا۔ اس سے پہلے میری زندگی میں کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ آتی بھی تو میں اپنی بیوی سے ہی محبت کر سکتا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو لوگ

ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے کی بجائے صرف اور صرف اپنی بیوی سے ہی محبت کرتے ہیں وہ دنیا میں بڑے سکھی رہتے ہیں۔

ناگن درگا مجھ سے محبت کی باتیں کرنے لگی تھی۔ میں ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا۔ کہنے لگی۔

"کرم داد! جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو تم اسی وقت میرے دل میں اتر گئے تھے اور مجھے تم سے پریم ہو گیا تھا۔ مجھے بتاؤ کیا تم بھی مجھ سے پریم کرتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"درگا! مجھے پریم کی باتیں بالکل نہیں سوجھ رہیں۔ اس وقت تو ہمیں اپنی پڑی ہے۔"

وہ بولی۔

"لیکن میں تو اس وقت بھی تم سے پریم کی باتیں کر رہی ہوں۔ بتاؤ کیا تم بھی مجھ سے پریم کرتے ہو کرم داد؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"اگر تم مجھ سے پریم کرتی ہو تو پھر میں تم سے پریم کیسے نہیں کر سکتا۔"

ناگن درگا نے اپنا سانپ کا جسم میرے سانپ کے جسم کے بالکل ساتھ لگا دیا اور ہلکی سے آہ بھر کر بولی۔

"کرم داد! تم نے میری آتما کو بڑی شانتی دی ہے۔ مجھ سے اسی طرح پریم کرتے رہنا۔ یاد رکھنا اگر کبھی ایسا وقت آگیا تو میں تمہارے لیے اپنی جان بھی قربان کر دوں گی۔"

ہمیں درخت کے پیچھے ریلوے لائن کی جانب کسی آدمی کی آواز سنائی دی۔

"ارے لڑکی لڑکا ہیں' ضرور گھر سے بھاگے ہوئے ہیں۔"

ہم دونوں جھاڑیوں میں سمٹ گئے۔ دوسرے آدمی نے کہا۔

"مجھے تو دونوں بدمعاش معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں پکڑ کر پولیس کے حوالے کرتے

ہیں۔"

اور دو آدمی اچانک درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گئے۔ دونوں نوجوان تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ جس لڑکی اور لڑکے کی وہ آوازیں سن رہے تھے ان میں سے کوئی بھی وہاں نہیں ہے تو ان کے چہروں پر دہشت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ میں ان کو جھاڑیوں کے اندر سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے رنگ اڑ گئے تھے۔ ایک لڑکے نے بڑی مشکل سے کہا۔

"وہ' وہ کہاں چلے گئے؟"

دوسرے نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"رامو! بھاگو یہاں بھوت رہتے ہیں۔"

اور دونوں تیزی سے کھیتوں کی طرف بھاگے کہ ان میں سے ایک لڑکا ایک جانب اور دوسرا دوسری جانب دوڑ پڑا اور دیکھتے دیکھتے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ناگن درگا نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"اگر ہم عورت مرد کی شکل میں ہوتے تو مشکل پڑ سکتی تھی۔"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ دونوں تو اتنے ڈر گئے تھے کہ ان سے بات نہیں ہو رہی تھی۔"

ناگن درگا میرے بالکل ساتھ لگی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

"کرم دا! مجھے بتاؤ' تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے؟"

میں اسے کیا جواب دیتا۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

"درگا! تم خوامخواہ پریشان کر رہی ہو' حوصلہ رکھو میں ابھی کہیں نہیں جاؤں گا۔"

دور سے ریل کے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ پھر کچھ دیر بعد ایک ریل گاڑی دھڑدھڑاتی ہوئی گزر گئی۔ ناگن درگا جھاڑی میں سے نکل کر گاڑی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ جب گاڑی گزر گئی تو بولی۔

"یہ کوئی ایکسپریس ٹرین تھی۔ بھوپال کی طرف سے آئی ہوگی۔ بھوپال جانے والی

گاڑی دوسری طرف سے آئے گی۔"

میں نے کہا۔

"کیوں نہ ہم چھپ چھپا کر اس وقت سٹیشن پر پہنچنے کی کوشش کریں؟"

ناگن درگا واپس میرے پاس جھاڑی میں آگئی تھی۔ کہنے لگی۔

"دن کی روشنی میں باہر نکلنا خطرناک ہوگا۔ ہمیں کم از کم شام کا اندھیرا ہونے تک اسی جگہ چھپے رہنا ہوگا۔"

چنانچہ ہم شام ہونے تک اسی جگہ جھاڑی میں چھپ کر بیٹھے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد شام کا دھندلکا رات کے پہلے اندھیروں میں تبدیل ہوگیا تو ہم جھاڑی میں سے نکل کر ریلوے لائن پر آگئے اور سٹیشن کی طرف رینگنا شروع کر دیا جس کی روشنیاں ہمیں کچھ فاصلے پر صاف نظر آ رہی تھیں۔ ہم بڑے اطمینان سے سٹیشن کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ اسی طرح ہم سٹیشن کے قریب آگئے۔ جو ٹرین بھوپال کی طرف سے آئی تھی وہ پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ مسافروں کا رش بھی تھا۔ میں نے درگا سے کہا۔

"ہمیں دوسری طرف سے ہو کر پلیٹ فارم پر کسی جگہ چھپنا ہوگا۔ پھر جب دوسری طرف سے کوئی گاڑی آئے گی تو اس کی چھت پر چڑھنے کی کوشش کریں گے۔"

درگا نے کہا۔

"بھگوان کرے کہ وہ گاڑی بھوپال کی طرف ہی جا رہی ہو۔"

ہم ریلوے لائینوں کو عبور کر کے آگے کی طرف رینگتے ہوئے پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پر پہنچ کر پلیٹ فارم کے عقب کی جانب ہوگئے۔ یہاں پلیٹ فارم پر سامان پڑا ہوا تھا۔ زیادہ روشنی بھی نہیں تھی۔ ہم سامان کے کریٹوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ اس طرف کوئی مسافر یا کوئی دوسرا شخص نہیں آتا تھا۔ ہم بڑے اطمینان سے بیٹھے تھے۔ اتنے میں ٹرین کے گارڈ نے سیٹی بجائی۔ انجن نے وسل دیا اور ٹرین چل پڑی۔ جب ٹرین گزر گئی تو میں نے ناگن درگا سے کہا۔

"پلیٹ فارم جہاں ختم ہوتا ہے وہاں سٹیشن کا نام لکھا ہوگا۔ تم یہیں بیٹھو۔ میں

گے جا کر معلوم کرتا ہوں کہ اس سٹیشن کا نام کیا ہے۔"

درگا نے کہا۔

"اپنا خیال رکھنا کرم داد۔"

میں سامان کے ڈھیر میں سے نکل کر پلیٹ فارم کے آخری کنارے کی طرف رینگنے لگا۔ زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ میں بورڈ کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں اوپر کھمبے کے ساتھ تو بلب روشن تھا۔ میں نے سٹیشن کا نام پڑھا جو ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہی لکھا ہوا تھا۔ میں اسی طرح رینگتا ہوا درگا کے پاس واپس آ گیا اور اسے کہا۔

"وسٹیشن کا نام دھرمی واڑہ ہے۔"

ناگن درگا نے فوراً کہا۔

"میرا اندازہ بالکل ٹھیک تھا کرم داد۔ ہم چھندواڑہ اور ہوشنگ آباد کے درمیان ہی ہیں۔ جو ٹرین ابھی ابھی گئی ہے وہ ناگ پور ہی کی طرف جا رہی تھی۔ ادھر سے اب جو ٹرین آئے گی وہ ہوشنگ آباد سے ہوتی ہوئی بھوپال جائے گی۔"

مجھے بھی تسلی ہو گئی تھی کہ ہم بھوپال پہنچ جائیں گے۔ اب ہمیں ناگ پور کی طرف سے آنے والی ٹرین کا انتظار تھا۔ آخر کافی دیر انتظار کرنے کے بعد ایک ٹرین ناگ پور کی طرف سے آ کر پلیٹ فارم پر رک گئی۔ ہم دونوں سامان کے پیچھے سے نکلے اور پلیٹ فارم کی ڈھلان اتر گئے۔ پھر ریلوے لائینوں کو عبور کیا اور جس پلیٹ فارم پر ٹرین کھڑی تھی اس کی دوسری طرف سے آ کر ایک ڈبے کے پہیوں پر سے رینگتے ہوئے ڈبے کی چھت پر چڑھ گئے۔ یہ بہت بڑا مرحلہ تھا جس کو ہم نے طے کر لیا تھا۔

میں نے درگا سے کہا۔

"درگا اب یہ سمجھ لو کہ ہم بھوپال پہنچ گئے۔"

درگا کہنے لگی۔

"یہ گاڑی آدھی رات کے بعد بھوپال پہنچے گی۔ اس وقت ہم کہاں جائیں گے؟"

میں نے کہا۔

"بھوپال میں میرا جو دوست ہے میں اس کے گھر جانے کی کوشش کروں گا۔"

وہ بولی۔

"میں بھی تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی۔"

میں درگا کو کسی حالت میں بھی بھوپال کے سرفروش مجاہدوں کی خفیہ کمین گاہ میں نہیں لے جا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

"درگا! مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میرا دوست اپنے گھر پر ہوگا یا نہیں ہوگا۔ تم میرے ساتھ اپنی جان کا خطرہ کیوں مول لیتی ہو۔ میں بھی یہ نہیں چاہتا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم بھیروں جی کے مندر میں جا کر کسی جگہ چھپ جانا۔ رات گزر جائے گی تو میں صبح تمہارے پاس آ جاؤں گا۔ اس کے بعد سوچ لیں گے کہ ہمیں کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔"

درگا راضی نہیں ہوتی تھی مگر میں نے اسے راضی کر لیا۔ اتنی دیر میں ٹرین چل پڑی۔ ہم دونوں پہلے تو کنڈلی مار کر ڈبے کی چھت کے بالکل درمیان بیٹھے تھے۔ جب ٹرین کی رفتار تیز ہوگئی اور ہوا بھی تیز تھپیڑوں کی شکل میں تبدیل ہوگئی تو ہم چھت پر بالکل ساتھ ساتھ لیٹ گئے۔ ٹرین رات کے اندھیرے میں تاریک جنگلوں میں سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ گاڑی دیر تک چلتی گئی۔ پھر کوئی سٹیشن آیا۔ ٹرین وہاں تھوڑی دیر کے لیے رکی اور آگے روانہ ہوگئی۔ اسی طرح کئی سٹیشن آئے اور گزر گئے۔ ایک سٹیشن پر ٹرین رکی تو درگا کہنے لگی۔

"میرا خیال ہے آگے ہوشنگ آباد کا سٹیشن آئے گا۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ ناگن درگا کا اندازہ درست نکلا۔ اگلا سٹیشن ہوشنگ آباد کا سٹیشن تھا۔ یہ بڑا شہر تھا۔ سٹیشن بھی کافی کشادہ تھا اور روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ ٹرین ایک بارونق پلیٹ فارم پر جا کر کھڑی ہوگئی۔ میں اور ناگن درگا ڈبے کی چھت سے چمٹے ہوئے تھے۔ ہم نیچے نہیں اتر سکتے تھے۔ ہمارا ڈبہ پچھلے ڈبے سے ایک دو ڈبے آگے تھا۔ پلیٹ فارم پر پولیس کے سپاہی بھی نظر آ رہے تھے اور ایک ٹکٹ چیکر بھی

ایک طرف کھڑا مسافروں کو ڈبے میں سوار ہوتے اور ڈبے سے اترتے دیکھ رہا تھا۔

ہم ڈبے کی چھت سے لگے ہوئے تھے۔ میں نے درگا سے پوچھا۔

"کسی کی ہم پر نظر نہ پڑ جائے۔ یہ بتاؤ کہ گاڑی یہاں کتنی دیر ٹھہرتی ہے؟"

میں نے بڑی دھیمی آواز میں درگا سے پوچھا تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

"کچھ معلوم نہیں، ہوشنگ آباد بڑا سٹیشن ہے۔ یہاں گاڑی دیر تک رکتی ہے۔ خاموشی سے لیٹے رہو۔ ہمیں کوئی نہیں دیکھے گا۔"

اچانک مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ ٹرین چل پڑی ہے مگر ٹرین اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ یہ جھٹکا صرف مجھے ہی لگا تھا۔ میں ایک دم سے ہوشیار ہوگیا۔ میرے ساتھ کچھ ہونے والا تھا۔ مجھے دوسرا جھٹکا لگا۔ دوسرے جھٹکے کے ساتھ ہی مجھے اپنا جسم بوجھل اور بھاری محسوس ہونے لگا۔ میری کایا پلٹ ہو رہی تھی۔ میں سانپ سے واپس انسانی شکل میں آ رہا تھا۔ میں نے درگا سے کہا۔

"درگا! میں اپنی شکل میں واپس آ رہا ہوں۔"

درگا نے خوش ہو کر کہا۔

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو کرم داد؟"

میں نے کہا۔

"ہاں، مگر انسانی شکل میں آتے ہی مجھے چھت پر لیٹا لوگ دیکھ لیں گے۔"

درگا نے جلدی سے کہا۔

"تم نیچے اتر جاؤ کرم داد! ڈبے کی دوسری طرف سے نیچے اتر جاؤ۔"

لیکن قسمت نے مجھے اتنی مہلت نہ دی۔ مجھے دو تین اور جھٹکے لگے اور پھر میں ایک دم سانپ سے انسانی شکل میں واپس آگیا۔ میں چھت پر لیٹا ہوا تھا۔ یہاں کافی روشنی تھی۔ لوگوں نے ایک آدمی کو چھت پر لیٹے دیکھا تو وہاں جمع ہوگئے۔ کسی نے کہا۔

"یہ کوئی پاگل آدمی ہے، پولیس کو بلاؤ۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہاں شور مچ گیا۔ پولیس کے سپاہی اور ٹکٹ چیکر دوڑ کر ڈبے کے پاس آ گئے۔ پولیس کے سپاہی نے کرخت آواز میں کہا۔

"کون ہو تم؟ اوپر کیوں بیٹھے ہو؟ نیچے اترو۔"

ناگن درگا میرے پاس ہی ڈبے کی چھت پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

"کرم داد! بھگوان کے لیے میرا منہ چوم لو' میرا منہ چوم لو۔"

لیکن دونوں پولیس کے سپاہی ڈبے کے اوپر چڑھ آئے۔ ان کی نظر میرے پاس ہی ڈبے کی چھت پر ایک سانپ پر پڑی تو شور مچا دیا۔

"ارے سانپ ہے سانپ۔"

اور ایک سپاہی ڈنڈا مارتا ہوا ناگن درگا کی طرف بڑھا۔ میں نے جلدی سے ناگن درگا کو اٹھا لیا اور کہا۔

"یہ میرا سانپ ہے۔ میں نے اسے پال رکھا ہے۔ ڈبے کے اندر رش تھا اس لیے چھت پر چڑھ گیا۔"

سپاہی کچھ خوف زدہ سے ہو کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ایک سپاہی نے چیخ کر کہا۔

"ابے اس سالے سانپ کو پھینک دو۔"

میں نے ناگن درگا کو اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا اور کہا۔

"سنتری جی! یہ میرا پالتو سانپ ہے۔ کسی کو کچھ نہیں کہے گا۔ میں نے اس کا زہر نکال دیا ہے۔"

پولیس نے مجھے ڈبے کی چھت سے نیچے اتار لیا۔ مسافر جمع ہو گئے تھے اور مجھے بڑی دلچسپی اور حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ یہ آدمی ڈبے کی چھت پر سفر کر رہا تھا۔ ٹکٹ چیکر بھی آ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ٹکٹ دکھاؤ' کہاں سے ٹرین پر چڑھے تھے؟"

میرے پاس ٹکٹ کہاں تھا۔ میں نے کہا۔

"مہاراج! بات یہ ہے کہ میں غریب آدمی ہوں۔ یہ میرا پالتو سانپ ہے اور میں

اسے بھیروں جی کے مندر کی یاترا کرانے بھوپال لے جا رہا ہوں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی مجھے بھوپال چلے جانے دیں۔"

ٹکٹ چیکر بڑا سخت مزاج ہندو تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ کتھا کہانی کسی اور کو سنانا۔ ٹکٹ کے پیسے نکالو۔ تمہیں ناگ پور سے ہوشنگ آباد کا کرایہ بھی ادا کرنا ہوگا اور جرمانہ بھی بھرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔

"مہاراج! میرے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں ہے' پیسے کہاں سے نکالوں۔"

ٹکٹ چیکر نے پولیس کے سپاہیوں سے کہا۔

"اسے میرے دفتر میں لے آؤ۔ اسے بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی سزا بھگتنی ہوگی۔ ان لوگوں نے انڈین ریلوے کو اپنے باپ کا مال سمجھ رکھا ہے۔ چلو۔"

دونوں سپاہیوں نے مجھے بازوؤں سے دبوچ لیا اور کھینچتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئے جہاں دو تین کلرک بیٹھے کام کر رہے تھے۔ ٹکٹ چیکر نے سپاہیوں سے کہا۔

"اسے اندر بند کر دو۔"

اسی کمرے میں ایک حوالات سی بنی ہوئی تھی۔ جس پر سلاخوں والا دروازہ لگا تھا۔ سپاہیوں نے مجھے حوالات کے اندر دھکیل دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ ٹکٹ چیکر نے میز کی دراز میں سے ایک تالا نکالا اور دروازے پر لگاتے ہوئے بولا۔

"تم لوگوں کو میں اچھی طرح جانتا ہوں' یاترا کا بہانہ بنا کر ریل گاڑیوں میں مفت سفر کرتے رہتے ہو۔ آج کی رات تو حوالات میں گزارو صبح تمہیں ریلوے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔"

میں واقعی پریشان ہوگیا۔ اس لیے میں بھوپال سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں پولیس میری تلاش میں تھی۔ میں کئی وارداوں میں پولیس کو مطلوب تھا۔ اگر میرا راز کھل جاتا ہے اور پولیس کو علم ہوگیا کہ میں ہی وہ کمانڈو ہوں جس نے علاقے میں کئی دھماکے کئے تھے تو پھر میرا بچنا محال تھا اور میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتا

تھا۔ ناگن درگا سانپ کی شکل میں میری جیب میں تھی۔ میرے ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہندو خواہ کتنا ہی ماڈرن اور پڑھا لکھا کیوں نہ ہو وہ بنیادی طور پر توہم پرست ہوتا ہے اور دیوی دیوتاؤں کے شراپ یعنی بد دعاؤں سے بے حد ڈرتا ہے۔ میں نے دل میں طے کر لیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ٹکٹ چیکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور اپنے ساتھی کلرکوں سے بغیر ٹکٹ سفر کرنے والوں کی سرزنش کے بارے میں باتیں کرنے لگا تھا۔ اتنے میں بھوپال کی طرف جانے والی ٹرین روانہ ہوگئی۔ میں بڑی حسرت بھری نظروں سے اسے دفتر کے دروازے کے باہر پلیٹ فارم پر سے گزرتے دیکھتا رہا۔

جب ٹرین چلی گئی اور پولیس کے سپاہی بھی چلے گئے اور پلیٹ فارم پر کسی حد تک خاموشی چھا گئی تو میں نے اپنے پلان پر عمل کرتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں نعرہ لگایا۔

"جے شو شنکر۔"

ٹکٹ چیکر اور دوسرے دونوں کلرکوں نے میری طرف دیکھا۔ ٹکٹ چیکر نے سخت لہجے میں کہا۔

"دیکھو آرام سے بیٹھے رہو۔ یہ تمہارے باپ کا مندر نہیں ہے۔ ریلوے کی حوالات ہے۔ تمہاری ان باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔"

میں نے دوسری بار جے شو شنکر کا نعرہ بلند کیا تو بد دماغ ٹکٹ چیکر نے غصیلی آواز میں کہا۔

"سالے! اب تیری ایسی مرمت کراؤں گا کہ نانی یاد آ جائے گی۔"

میں نے اپنی آواز میں سادھو سنیاسیوں والا اعتماد پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"مورکھ! تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں اور جس ناگ کو میں بھیروں جی کے مندر کی یاترا کرانے لے جا رہا ہوں وہ دیوتا شیو شنکر کی دیوداسی ہے۔"

ٹکٹ چیکر اٹھ کر سلاخوں کے پاس آ گیا اور انتہائی غصے میں اس نے سلاخوں میں

ہاتھ ڈال کر مجھے پیچھے دھکیلا اور بولا۔

"میں تم فراڈ لوگوں کے سب چرتر جانتا ہوں۔ ارے میں گوالیار کا برہمن ہوں۔ تمہاری ان مکاری کی باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ چپکے سے بیٹھ جا۔"

اور وہ بڑبڑاتا ہوا واپس اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے سوچی سمجھی سکیم کے مطابق جیب میں ہاتھ ڈال کر ناگن درگا کو نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور بلند آواز میں کہا۔

"اے مہا پربھو شیو شنکر کی دیوداسی درگا وتی، یہ مورکھ بھیروں جی کی یاترا سے روک رہے ہیں۔ ان کو بتا کہ تو کون ہے؟"

اور میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ناگن درگا کو باہر نکال لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہاں جو باتیں ہوئی ہیں وہ ناگن درگا نے باقاعدہ سن لی ہیں اور وہ اس ڈرامے میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جیسے ہی میں نے ناگن درگا کو اپنے ہاتھ میں لے کر بلند کیا۔ ناگن درگا نے عورت کی آواز میں کہا۔

"ان مورکھوں کو بتا دو کہ میں شیو جی مہاراج کی دیوداسی درگا ہوں۔ اگر انہوں نے مجھے بھیروں جی کی یاترا نہ کرنے دی تو میں انہیں ایسا شراپ دوں گی کہ ان کی ساری سنتان اگلے ایک لاکھ جنموں میں کتوں کی شکل میں پیدا ہوگی۔"

میں نے جو ڈرامہ کھیلا تھا یہ اس کا کلائمیکس تھا۔ میں نے دیکھا کہ ٹکٹ چیکر اور دونوں کلرک اپنی سیٹوں سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ ان کے رنگ اڑ گئے تھے اور ان کے جسم جیسے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ بات ہی ایسی تھی۔ ان کے سامنے ایک سانپ عورت کی آواز میں بول رہا تھا۔ یہ دیکھ کر تو ایک عام آدمی یہاں تک کہ کوئی انگریز سائنسدان بھی ایک بار تو ضرور حیران پریشان ہو جاتا اور وہ لوگ تو ہندو تھے اور آواگون ان کا جنم جنم کا عقیدہ تھا۔ میں نے جب دیکھا کہ تیر بالکل ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے تو میں نے ٹکٹ چیکر سے کہا۔

"کیا اب بھی تم ہمیں حوالات میں قید رکھو گے؟"

ٹکٹ چیکر نے جلدی سے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"شما کر دیں مہاراج! شما کر دیں۔"

دوسرے ہندو کلرک بھی ہاتھ جوڑ کر کھڑے تھے۔ ٹکٹ چیکر نے جلدی سے میز کی دراز میں سے چابی نکالی اور سلاخوں کے پاس آ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تالا کھول دیا اور ادب سے ایک طرف ہٹ کر بولا۔

"مہاراج! مجھے معاف کر دیں۔ شما کر دیں۔ مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔ میں آپ کا داس ہوں۔"

میں بڑی شان سے ناگن درگا کو اپنی کلائی کے ساتھ لپیٹتے ہوئے حوالات سے باہر آ گیا۔ ٹکٹ چیکر نے لپک کر کرسی آگے کر دی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹکٹ چیکر نے ایک کلرک سے کہا۔

"بھولا رام جلدی سے مہاراج کے لیے جل پان لے آ۔"

بھولا رام کلرک جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ ہندو کلرک باہر جا کر سب کو بتا دے گا کہ اس نے بھگوان شیو کی دیوداسی کے درشن کیے ہیں۔ وہ ناگ کی شکل میں عورت کی طرح بات کرتی ہے اور وہاں ایک ہجوم اکٹھا ہو جائے گا جو میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بھولا رام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بھولا رام! خبردار باہر کسی سے نہ کہنا کہ اندر بھگوان شیو کی دیوداسی اور اس کا اوتار موجود ہیں۔ اگر تم نے کسی سے بات کی تو وہیں جل کر بھسم ہو جاؤ گے۔"

بھولا رام کلرک نے وہیں ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا۔

"ہرگز نہیں کہوں گا مہاراج! ہرگز نہیں کہوں گا۔"

اور وہ باہر نکل گیا۔ ٹکٹ چیکر اور دوسرا کلرک میرے سامنے فرش پر بیٹھ گئے۔ میں یہ تماشہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں کرسی پر بیٹھا رہوں اور ریلوے کا ایک ٹکٹ چیکر جو اپنی وردی میں تھا میرے سامنے فرش پر بیٹھا رہے۔ یہ منظر دیکھ کر بھی لوگ متوجہ ہو سکتے تھے۔ میں نے ٹکٹ چیکر اور دوسرے کلرک سے کہا۔

"زمین سے اٹھ کر کرسیوں پر بیٹھ جاؤ۔"

انہوں نے اس طرح میرا حکم مانا جیسے میرے غلام ہوں۔ فوراً" اٹھے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ناگن درگا میری کلائی کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کیوں نہ میں ناگن درگا کا منہ چوم کر اسے عورت کی شکل میں واپس لے آؤں۔ خدا جانے پھر یہ موقع کب ملے۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی آگیا کہ اگر میں درگا کو عورت کی شکل میں واپس لے آیا تو کہیں معاملہ خراب نہ ہو جائے۔ پھر یہ لوگ ہو سکتا ہے مجھے جادوگر سمجھنے لگیں اور ڈرامے کا جو ہندووانہ دیو مالائی پر اسرار سماں بندھا ہوا ہے وہ نہ بگڑ جائے۔ اس بات کا مجھے یقین تھا کہ اب جبکہ میں انسانی شکل میں واپس آ چکا ہوں تو کم از کم دو چار گھنٹے تو ضرور اسی شکل میں رہوں گا۔ یہاں سے دوسری گاڑی میں بھوپال کی طرف روانہ ہو جاؤں گا اور پھر کسی بھی جگہ ناگن درگا کا منہ چوم کر اسے عورت کی شکل میں واپس لے آؤں گا۔ مجھے اس حقیقت کا بھی احساس تھا کہ ناگن درگا بھی بے چین ہوگی کہ میں جلدی سے اس کا منہ چوم کر اسے انسانی شکل میں واپس لاؤں۔ چنانچہ میں نے اس کو تسلی دینے کی خاطر ذو معنی انداز میں کہا۔

"اے مہا دیوی درگا وتی۔ میں جانتا ہوں تو کیا سوچ رہی ہے۔ بڑی جلدی تیری خواہش پوری ہو جائے گی اور تو پھر سے وہی بن جائے گی جو تو پہلے تھی۔"

میری ان باتوں کو وہ لوگ بھی دیوی دیوتاؤں اور اوتاروں کی زبان کے پر اسرار اشارے ہی سمجھے اور ادب سے ہاتھ جوڑ کر بیٹھے رہے۔ ناگن درگا نے میری تسلی کی خاطر کہا۔

"مہاراج! جیسی آپ کی اچھیا ہوگی ویسے ہی ہوگا۔ میں تو آپ کی بھی داسی ہوں۔"

دوسری بار اتنے قریب سے ایک سانپ کو عورت کی آواز میں بولتے سن کر دونوں ہندوؤں کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"جے شیو شنکر' جے شیو شنکر۔"

سانپ کی شکل میں آنے کے بعد مجھے بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے ٹکٹ چیکر سے کہا۔

"بالکے! ہمارے بھوجن پانی کے لیے کچھ لایا جائے۔ تاکہ تیرا پن ہو۔"

اسی وقت ہمارے لیے ہوشنگ آباد کے فرسٹ کلاس ریفرشمنٹ روم سے مرغ بریانی اور کھیر آ گئی جسے میں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ میں نے ان لوگوں پر مزید رعب جمانے کے لیے ناگن درگا سے پوچھا۔

"مہا ناگ کی دیوداسی! کیا تجھے بھی جل پان کرنا ہے؟"

مجھے معلوم تھا کہ ناگن درگا چونکہ سانپ کے روپ میں ہے۔ اسے بھوک پیاس اتنی نہیں لگی ہوگی۔ ناگن درگا نے عورت کی آواز میں کہا۔

"نہیں گورو دیو! مجھے بھوک نہیں ہے' ہاں پیاس ضرور لگی ہے۔"

تینوں ریلوے کرم چاری پھٹی پھٹی آنکھوں سے ناگن درگا کو عورت کی آواز میں باتیں کرتے سن رہے تھے۔ میں نے ٹکٹ چیکر سے کہا۔

"بالک! دیوداسی درگا میا کے لیے دودھ کا کٹورا لایا جائے۔"

اسی وقت پیالے میں دودھ آ گیا جسے ناگن درگا نے بھی سیر ہو کر پیا۔ اس کے بعد میں نے ٹکٹ چیکر سے کہا۔

"ہمارے بھوپال جانے کا بندوبست کیا جائے۔"

ٹکٹ چیکر نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔

"مہاراج! ایک گھنٹے بعد ناگ پور سے مدھیہ پردیش ایکسپریس آ رہی ہے۔ آپ کو میں خود اس میں بٹھاؤں گا۔ وہ آپ کو بھوپال پہنچا دے گی۔"

میں نے ٹکٹ چیکر سے کہا۔

"سنو بچہ! ایک بات کا دھیان رکھنا۔ تم بڑے بھاگ وان ہو کہ تمہیں مہا میا کے درشن ہوئے ہیں مگر یہ بات اپنے تک ہی رکھنا۔"

پھر میں نے دوسرے کلرکوں سے بھی مخاطب ہو کر کہا۔

"تم بھی دھیان سے سنو۔ اگر تم میں سے کسی نے کسی دوسرے کو یہ راز بتا دیا تو تمہیں مہا مایا کی بد دعا لگے گی اور تمہارا سارا خاندان' مال مریادہ تباہ ہو جائے گی۔"

تینوں یک زبان ہو کر بولے۔

"ہرگز نہیں مہاراج! ہم کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔"

انہوں نے میرے لیے چائے بھی ریفرشمنٹ روم سے منگوائی۔ ایک گھنٹے تک وہ میری ٹہل سیوا کرتے رہے۔ اس کے بعد بھوپال جانے والی گاڑی آگئی۔ انہوں نے خود مجھے ٹرین کے گارڈ سے کہہ کر فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بٹھا دیا۔ جب تک ٹرین نہیں چلی تینوں ریلوے کے کرم چاری پلیٹ فارم پر ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ ناگن درگا کو میں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ ٹرین ہوشنگ آباد سٹیشن سے چلی تو میں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ٹرین کے روانہ ہونے کے بعد میں نے ناگن درگا کو جیب سے نکالا تو وہ بولی۔

"کرم داد! مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے اچھے ایکٹر بھی ہو۔ تمہیں تو بمبئی کی فلموں میں ہیرو کا کام مل سکتا ہے۔"

میں نے اس سے کہا۔

"درگا! اگر میں یہ ایکٹنگ نہ کرتا تو ہم اس وقت جیل کی ہوا کھا رہے ہوتے۔ یہ اداکاری مجھے کرنی ہی پڑی۔"

ناگن درگا نے بے چینی سے کہا۔

"کرم داد! اب جلدی سے میرا منہ چوم کر مجھے انسانی شکل میں واپس لے آؤ۔ میں اسی وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ ڈبے میں کوئی مسافر نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"درگا! خدا کرے کہ میرے منہ چومنے سے تمہاری انسانی شکل واپس آ جائے۔ ویسے مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

ناگن درگا بولی۔

"تم ہمارے خفیہ منتروں کی طاقت کو نہیں جانتے۔ تم میرا منہ چومو۔"

ناگن سانپ کے روپ میں تھی۔ میرا دل اس کا منہ چومنے کو بالکل نہیں چاہتا تھا ، لیکن میں مجبور تھا۔ میں نے ناگن درگا کو ہاتھ میں لے لیا اور اس کا منہ اپنے ہونٹوں کے قریب لا کر سب سے پہلے اپنا سانس روکا۔ پھر بڑی ہی بے دلی کے ساتھ اس کے منہ کو چوم لیا۔ مگر ناگن درگا ابھی تک سانپ کے روپ میں تھی۔ میں نے کہا۔

"دیکھا درگا! میں نے کہا تھا ناں کہ مجھے شک ہے۔ میرے منہ چومنے پر بھی تم ویسی سانپ کی سانپ ہی رہی ہو۔"

ناگن درگا نے کہا۔

"مجھے سامنے والی سیٹ پر رکھ دو۔ میں اپنے اندر کچھ تبدیلی محسوس کر رہی ہوں۔"

میں نے جلدی سے اسے سامنے والی سیٹ پر رکھ دیا۔ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ ٹرین پوری رفتار سے بھوپال کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ناگن درگا سیٹ پر بیٹھے بیٹھے بل کھانے لگی تھی۔ کبھی وہ اپنا پھن کھول کر لہراتی، کبھی پھن سکیڑ کر سیٹ کے گدیلے پر لوٹ پوٹ ہونے لگتی۔ میں نے پوچھا۔

"درگا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

اس نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا۔

"میں ٹھیک ہوں کرم داد! تم خاموش رہو، خاموش رہو۔"

پھر وہ ایک دم جیسے پر سکون ہو گئی اور سیٹ پر لیٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک سسکار کی آواز نکلی اور دوسرے لمحے سیٹ پر سے سانپ غائب ہو گیا اور اس کی جگہ درگا عورت کے روپ میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خمار سا تھا۔ کہنے لگی۔

"کرم داد! ایک بار پھر میرا منہ چومو۔ تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے۔ وہ بھی پوری ہو

جانے دو۔"

میں نے جھک کر درگا کے ہونٹوں پر آہستہ سے اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ درگا تو مجھ سے وحشیانہ انداز میں لپٹ گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو چھڑایا اور کہا۔

"تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو درگا۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"پریم کرنا پاگل پن تو نہیں ہے کرم داد! میں نے تم سے پریم کیا ہے۔ کوئی پاپ نہیں کیا۔ میں ہمیشہ تم سے پریم کرتی رہوں گی۔"

اور وہ اٹھ کر میری سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی اور مجھ سے پریم کرنے لگی۔ میں اس سے پریم نہیں کرنا کرتا تھا اور پریم کرنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر وہ مجھے چھوڑ نہیں رہی تھی۔ میری قسمت اچھی تھی کہ کوئی سٹیشن آ رہا تھا۔ ٹرین کی رفتار آہستہ ہوگئی اور درگا مجھ سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"درگا! میں اپنی بیوی جمیلہ سے پریم کرتا ہوں۔ میں اس کی محبت کو دھوکا نہیں دے سکتا۔"

درگا نے میرے ہاتھ کو چوم کر کہا۔

"میں تمہیں کب کہتی ہوں کہ اپنی بیوی سے پریم نہ کرو۔ تم اپنی بیوی سے ضرور پریم کرو۔ مگر مجھے پریم کرنے سے تو نہ روکو۔ میں تم سے پریم کرتی ہوں اور ہمیشہ پریم کرتی رہوں گی۔ تم ضرور میرے پچھلے جنم میں میرے پتی دیو رہے ہو۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ الگ کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے جنم ونم کو بالکل نہیں مانتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم مجھ سے پریم کا اظہار نہ کرو۔ مجھے یہ باتیں کسی دوسری عورت کی زبان سے اچھی نہیں لگتیں۔"

ناگن درگا خاموش ہوگئی۔ اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ گاڑی ایک سٹیشن پر رک گئی۔ وہ مجھ سے ذرا الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاؤں؟ تمہیں ضرور بھوک لگی ہوگی۔"

خلاف توقع درگا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارے پجاریوں نے مجھے دودھ پلا دیا تھا اب بالکل بھوک نہیں ہے۔"

میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔

"یہ کونسا سٹیشن ہے۔ خدا جانے بھوپال ابھی کتنی دور ہے۔"

درگا بھی اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ معمولی سا سٹیشن تھا۔ کہنے لگی۔

"بھوپال زیادہ دور نہیں ہے۔"

درگا بھی اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ معمولی سا سٹیشن تھا۔ کہنے لگی۔

"بھوپال زیادہ دور نہیں ہے۔"

بھوپال ہم رات گئے پہنچے۔ سٹیشن سے باہر نکل کر میں نے درگا سے کہا۔

"اب تم ناگن کے روپ میں نہیں ہو' عورت بن چکی ہو۔ میرا خیال ہے تمہارا اکیلے بھیروں جی کے مندر میں جانا ٹھیک نہیں۔"

وہ میری طرف عجیب انداز سے دیکھ کر بولی۔

"تو کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"یہ چاہنے یا نہ چاہنے کی بات نہیں ہے۔ صورت حال ایسی پیدا ہوگئی ہے کہ تمہارا اتنی رات گئے بھیروں جی کے مندر میں جانا مناسب نہیں لگتا۔"

"تو پھر مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔"

لیکن میں ناگن درگا کو کسی حالت میں بھی بھوپال کے سرفروش مجاہدوں کی خفیہ کمین گاہ کا راستہ نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہیے۔ ناگن درگا نے مجھے الجھن میں مبتلا دیکھا تو کہنے لگی۔

"تم میری فکر نہ کرو۔ بھیروں جی کے مندر میں دوسری عورتیں بھی رہتی ہیں۔ میں ان کے پاس رہ لوں گی۔ تم مجھے بھیروں جی کے مندر میں چھوڑ آؤ۔"

میں نے کہا۔

"اگر وہاں دوسری عورتیں بھی رہتی ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔"

اس نے میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ میں نے ایک خالی رکشے کو ہاتھ دے کر روکا۔ ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ میں نے رکشے والے کو بھروں جی کے مندر جانے کو کہا اور رکشا روانہ ہوگیا۔ رات کافی بھیگ چکی تھی۔ بھوپال کے بازار تقریباً" خالی پڑے تھے۔ بھیروں جی کا مندر شہر کے مشرقی حصے میں واقع تھا۔ ہم وہاں پہنچ گئے۔ ناگن درگا نیچے اتری تو میں نے اسے کہا۔

"میں کل رات کو ہی آسکوں گا۔"

وہ بولی۔

"تم چاہے جس وقت آ جانا۔ میں تمہیں مندر کے میلا آشرم میں ہی ملوں گی۔"

وہ مندر کے دروازے کی طرف چلی گئی۔ میں نے رکشے والے کو ایک خاص چوک کی طرف چلنے کو کہا۔ یہ چوک مجاہدوں کی خفیہ کمین گاہ والے ٹیلے سے کافی پیچھے تھا۔ میں وہاں جا کر اتر گیا۔ میرے پاس اتنے ہی پیسے رہ گئے تھے جتنا رکشے کا کرایہ تھا۔ وہاں سے میں رات کے اندھیرے میں ٹیلے کی جانب پیدل چل پڑا۔ ٹیلے پر اندھیرا اور خاموشی طاری تھی۔ میں خفیہ راستے سے ہوتا ہوا کمین گاہ میں آگیا۔ کمانڈو خالد سو رہا تھا۔ ہمارے ایک مجاہد نے اسے جگا دیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمہاری انسانی صورت نظر آئی۔ کرم داد! اس طرح ہمارا مشن کبھی مکمل نہیں ہو سکے گا۔ تم اچانک غائب ہو جاتے ہو اور پھر اچانک ظاہر ہو جاتے ہو۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"خالد بھائی! لگتا ہے میرے اختیار میں کچھ نہیں رہا۔ یہ جو مجھ پر انسان سے سانپ اور سانپ سے انسان بن جانے کا دورہ پڑتا ہے اس پر میرا کوئی اختیار نہیں۔ خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے اس عذاب سے نجات دلائے۔"

اس کے بعد ہم نے جھانسی والے آرمی ایمونیشن ڈپو کی باتیں شروع کر دیں۔
کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"ہمارا مجاہد اس ایمونیشن ڈپو کی ایک ایک تفصیل معلوم کر کے لے آیا ہے۔ گولہ بارود کا یہ ڈپو ایک ٹیلے کے اوپر ہے۔ وہاں سیکورٹی بہت سخت ہے۔ پہاڑی کی چاروں جانب ڈھلان پر مشین گنوں کے چار مورچے ہیں۔"

"کیا رات کو سنتری گشت بھی لگاتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

خالد نے کہا۔

"یہ بات میں نے اپنے مجاہد سے خاص طور پر معلوم کی تھی۔ چونکہ کوئی ایمرجنسی والی بات نہیں ہے' اس لیے رات کو یا دن کے وقت وہاں کوئی پٹرول پارٹی گشت نہیں لگاتی۔"

ایمونیشن ڈپو میں اندر جانے کا گیٹ کس طرف ہے؟"

کمانڈو خالد نے مجھے کاپی کے ایک صفحے پر اس کا پورا نقشہ بنا کر دکھایا۔ کہنے لگا۔

"ہفتے میں دو بار یہاں سے فوجی ٹرکوں میں گولہ بارود اور جدید ترین اسلحہ بھر کر مقبوضہ کشمیر میں تعینات بھارتی یونٹوں کو سپلائی کیا جاتا ہے۔"

میں نے خالد سے کہا۔

"اس جگہ سویلین مزدور بھی ضرور کام کرتے ہوں گے۔ تم صرف یہ معلوم کرو کہ اگر وہاں سویلین مزدور بھی کام کرتے ہیں تو وہ کون ہیں اور جھانسی میں کہاں کہاں پر رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ چونکہ یہ ذخیرہ شہر کے اندر ہے اس لیے روز یہاں سے اسلحہ وغیرہ ٹرکوں میں لادا جاتا ہے کم از کم اس روز چار پانچ سویلین مزدور فوجیوں کا ہاتھ بٹانے ضرور آتے ہوں گے۔"

خالد نے کہا۔

"میں کل ہی معلوم کر کے تمہیں بتا دوں گا۔ تم اب تو کہیں نہیں جاؤ گے نا؟"

میں نے کہا۔

"اب نہیں جاؤں گا۔ اگر میری کایا پلٹ بھی ہو گئی تب بھی میں اپنے اس اہم ترین مشن کو مکمل کیے بغیر یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گا۔"

کمانڈو خالد نے اسی وقت اپنا ایک آدمی شہر کی طرف دوڑا دیا کہ وہ اپنے خاص سراغرساں کو بلا کر لے آئے۔ کیونکہ جھانسی کی طرف ایک گاڑی بھوپال سٹیشن سے منہ اندھیرے چھوٹتی ہے۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد اپنا سراغرساں بھی آ گیا۔ خالد نے اسے خاص ہدایات دے کر سٹیشن کی طرف روانہ کر دیا۔ دوسرے دن شام کے وقت میں اور خالد کمین گاہ کی کوٹھڑی میں بیٹھے اپنے مشن کی تفصیلات کا جائزہ لے رہے تھے کہ ایک مجاہد آ گیا۔ وہ سادھو سنیاسی کے بھیس میں تھا۔ اس کی ڈیوٹی کمین گاہ کے ٹیلے سے کچھ فاصلے پر رہ کر نگرانی کرنے کی تھی۔ اس نے آ کر بتایا کہ باہر معاملہ کچھ مشکوک نظر آتا ہے۔

خالد نے پوچھا۔

"کیا بات ہوئی ہے؟"

مجاہد ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"دوپہر کے وقت سے لے کر ایک گھنٹہ پہلے تک پولیس کی ایک جیپ ٹیلے کے پیچھے جو سڑک ہے اس کے چار پانچ چکر لگا چکی ہے۔"

"کیا یہ جیپ ٹیلے کی طرف بھی آئی تھی؟"

"ٹیلے کی طرف جیپ تو نہیں آئی لیکن دو سپاہی جیپ سے اتر کر ٹیلے کے قریب گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی کی تلاش میں ہیں۔"

میں نے خالد سے کہا۔

"کسی نے مخبری تو نہیں کر دی۔ میرا خیال ہے ہمیں یہ جگہ کچھ دنوں کے لیے خالی کر دینی چاہیے۔"

کمانڈو خالد نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"مخبری ہو نہیں سکتی۔"

پھر خود ہی کہنے لگا۔

"ہو سکتا ہے' پولیس کسی مفرور مجرم کی تلاش میں ہو۔"

جو مجاہد یہ خبر لے کر آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"سر! مجھے دال میں کچھ کالا لگتا ہے۔ کرم داد صاحب کی تجویز مجھے مناسب لگتی ہے۔ ہمیں کچھ دنوں کے لیے یہاں سے کسی دوسری جگہ چلے جانا چاہیے۔"

مگر کمانڈو خالد نے اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

"ہماری خفیہ جگہ جس مقام پر ہے وہاں کوئی نہیں آ سکتا۔ آج تک کسی کو کان کان اس کی خبر نہیں ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ بھوپال پولیس میں ہمارے دو چار آدمی ایسے موجود ہیں جو ہمیں ہنگامی حالات پیدا ہو جانے کی صورت میں فوراً" اطلاع کر سکتے ہیں۔ اس لیے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اپنے ٹھکانے پر جا کر بیٹھ جاؤ اور نگرانی کرتے ہو۔ اگر حالات زیادہ تشویش ناک نظر آئیں تو ہمیں فوراً" خبر کر دینا۔ پھر ہم یہاں سے پرانے قلعے والی جگہ پر چلے جائیں گے۔"

مجاہد چلا گیا۔ میں نے خالد سے کہا۔

"خالد بھائی! میرا خیال ہے تم نے دور اندیشی سے کام نہیں لیا۔ میں ابھی بھی یہی کہوں گا کہ ہم سب کو فوراً" یہ جگہ خالی کر کے پرانے قلعے والی کمین گاہ میں چلے جانا چاہیے۔"

مگر خدا جانے کمانڈو خالد کے دل میں کیا تھا اور وہ کیا سوچ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"کرم داد! پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر پولیس نے یہاں چھاپہ بھی مارا تو یقین کرو ہمیں ہمارے آدمی دو گھنٹے پہلے اس کی خبر کر دیں گے۔"

میں نے کہا۔

"میں اس معاملے میں تم سے متفق نہیں ہوں۔"

وہ فوراً بولا۔

"[illegible] باتوں کو ابھی رہنے دو۔ یہ بتاؤ کہ ہمیں اپنے مشن کے لیے اور کس

کس چیز کی ضرورت ہوگی۔"

میں نے کہا۔

"سب سے پہلے تو کسی طرح ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ جب ایمونیشن ڈپو سے ٹرکوں میں گولہ بارود لادا جاتا ہے تو کیا اس وقت شہری مزدور بھی فوجیوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں یا نہیں۔ اگر سویلین مزدور اس روز وہاں آ جاتے ہیں تو ان مزدوروں کی تعداد کتنی ہے اور وہ شہر میں کہاں کہاں رہتے ہیں۔"

خالد بولا۔

"یہ ہمیں اسی ہفتے معلوم ہو جائے گا۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔"

جب شام کا اندھیرا رات کے اندھیرے میں گھل مل گیا اور خالد کی گھڑی نے شام کے سات بجائے تو میں نے اسے کہا کہ میں ناگن کی خیر خیریت معلوم کرنے بھیروں مندر جا رہا ہوں۔ ناگن درگا کے بارے میں میں نے خالد کو سارا قصہ سنا دیا تھا۔ اس نے میرے جانے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ صرف اتنا کہا۔

"اب تو بھابھی بی یہاں نہیں ہے۔ درگا بھی سانپ کے روپ میں نہیں ہے اور وہ تم سے پریم بھی کرنے لگی ہے' اس لیے ذرا محتاط ہو کر رہنا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"خالد بھائی! میں اتنا کچا اور کمزور نہیں ہوں اور پھر مجھے اپنے خدا پر پورا بھروسہ ہے۔"

خالد بولا۔

"پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔ مگر تم کھانا تو کھاتے جاؤ۔ تمہارے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔"

خالد نے مجھے دو سو روپے دیئے اور کہا۔

"یہ اپنے پاس رکھو' تمہارے کام آئیں گے۔"

میں خفیہ کمین گاہ سے بڑی احتیاط کے ساتھ اور چاروں طرف سے خبردار رہ کر

باہر نکلا۔ رات کا اندھیرا گہرا ہوگیا تھا۔ پھر بھی میں ایک طرف ہو کر پتھر کی دیوار کی اوٹ میں بیٹھ گیا اور اندھیرے میں ان درختوں کو دیکھنے لگا جن کے درمیان شہر بھوپال کو جانے والی چھوٹی سی سڑک گزرتی تھی۔ اپنے مجاہد نے اسی سڑک کے بارے میں بتایا تھا کہ وہاں دوپہر کے وقت پولیس کی جیپ دو تین بار آئی تھی۔ مجھے درختوں کی طرف کوئی خاص نقل و حرکت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ چونکہ مجھے اسی سڑک کو عبور کر کے بھیروں کے مندر جانا تھا اس لیے میں پوری تسلی کر لینا چاہتا تھا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ بھی نہیں تھا اور میں سانپ کے روپ میں بھی نہیں تھا کہ دشمن حملہ کرے تو جھاڑیوں وغیرہ میں گھس کر چھپ جاؤں۔

جب مجھے یقین ہوگیا کہ راستہ صاف ہے اور محاذ خالی پڑا ہے تو میں اوٹ میں سے نکل کر سڑک کی طرف چل پڑا۔ چھوٹی سی سڑک خالی پڑی تھی۔ میں جلدی سے اسے پار کر کے دوسری طرف کھیتوں میں چلا گیا۔ کھیتوں کھیت چلتا میں بھیروں کے مندر پہنچ گیا۔ وہاں کچھ پجاری اور پجارنیں نظر آئیں۔ میں ان کی نظر بچا کر مندر میں داخل ہوگیا۔ ایک چھوٹے لڑکے سے میلا آشرم کا پوچھا۔ وہاں مجھے ناگن درگا کونے والے نلکے کے پاس بیٹھی مل گئی۔ وہ کوئی کپڑا دھو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی۔

"میری کوٹھڑی میں آ جاؤ۔"

کوٹھڑی میں آ کر اس نے کپڑے کو نچوڑ کر جھاڑا تو وہ اس کا بلاؤز تھا۔ شرماتے ہوئے بولی۔

"منہ دوسری طرف کر لو۔"

میں نے کہا۔

"ان باتوں کو چھوڑو' یہ بتاؤ کہ یہاں کوئی خاص واقعہ تو نہیں ہوا؟"

وہ میرے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"ایک عجیب بات ضرور ہوئی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے تجسّس کے لہجے میں پوچھا۔

کہنے لگی۔

"آج شام میں بھیروں جی کی مورتی کے آگے پوجا پاٹھ کر رہی تھی۔ جب میں نے ماتھا ٹیکا تو مجھے بھیروں جی کے درشن ہو گئے۔"

"کیا مطلب؟"

"بھیروں جی کی شکل میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔"

میں نے پوچھا۔

"یہ بھیروں جی کون ہیں؟ کیا کوئی مرد ہے یا عورت ہے؟"

درگا نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"بھگوان کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ تم مسلمان ہو کہیں بھیروں جی کی تمہیں بددعا نہ لگ جائے۔"

میں نے کہا۔

"اچھا بتاؤ درشن ہوئے تو پھر کیا ہوا؟ وہ کونسی عجیب بات ہے جو تم مجھے بتانے والی تھیں؟"

درگا نے سانس بھر کر کہا۔

بھروں جی ہمارے دیوتا ہیں۔ شیو جی کے اوتار ہیں اور بڑی غصیلی مزاج والے ہیں۔ مجھے درشن دیئے اور میری طرف اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھ کر کہنے لگے۔ درگا! تم توایک مسلمان سے پریم کرنے لگی ہو۔ وہ مسلمان ہماری مورتیوں کو پاش پاش کرنے والے محمود غزنوی کا بھائی بند ہے۔ اس کو چھوڑ دو' میں نے کہا، مہاراج! میں تواس کو دل سے پریم کرتی ہوں' بھیروں جی غصے میں آ گئے کہنے لگے' اگر تو نے اس مسلمان کو نہ چھوڑا تو میں تمہیں شراپ دے دوں گا اور تم ایسی مصیبت میں پھنسو گی کہ زندگی بھر اس سے چھٹکارا نہیں ملے گا' یہ کہہ کر بھیروں جی غائب ہو گئے۔"

میں درگا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا

تھا۔ یہ محض اس کی نفسیات کا کرشمہ تھا۔ چونکہ یہ بات اس کے تحت الشعور میں تھی کہ وہ برہمن زادی ہو کر ایک مسلمان سے محبت کرنے لگی ہے اس کی وجہ سے اس کے مجرمانہ احساس نے یہ سارا کھیل کھیلا تھا۔ میں نے اسے یہ باتیں بالکل نہ بتائیں۔ ایک طرح سے یہ سب کچھ میرے حق میں جاتا تھا۔ ناگن درگا سے میرا پیچھا چھوٹ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے کہا۔

"درگا! تمہارے بھیروں جی نے تمہیں بالکل ٹھیک مشورہ دیا ہے۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ مجھے بھول جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔ تم یہاں سے لکشمن پور اپنے گاؤں چلی جاؤ اور اگر واقعی تم مجھ سے پریم کرتی ہو تو مجھے بھول جاؤ۔"

ناگن درگا کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے بڑے عزم کے ساتھ کہا۔

"کرم داد! میں ستی ساوتری ہوں۔ برہمن کی بیٹی ہوں۔ مجھے تم سے پریم ہے۔ پریم کرنا کوئی پاپ نہیں ہے۔ دیوتا لوگ بھی پرلوک میں دیویوں سے پریم کرتے ہیں۔"

میں نے اس کے خطرناک ارادے دیکھے تو کہا۔

"مگر درگا! بھیروں جی نے تمہیں بد دعا دے دی تو تمہاری زندگی برباد ہو جائے گی۔ تمہیں سوچ سمجھ سے کام لینا چاہیے۔ اپنی خاطر نہ سہی' میری خاطر ہی تم اپنا خیال کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچے۔"

میری ہمدردانہ باتیں سن کر ناگن درگا کے چہرے پر ایک رونق سی آ گئی۔ کہنے لگی۔

"اگر تمہیں میرا اتنا خیال ہے تو مجھے پریم کرنے سے کیوں روکتے ہو؟ میں تمہیں اب اپنا دل کھول کر بتاتی ہوں کہ تم میرے لیے میرے پریمی' میری پتی دیو' میرے سب کچھ ہو۔ میں تمہاری خاطر' تمہارے پریم کی خاطر اپنی زندگی ایک بار نہیں ہزار بار قربان کر سکتی ہوں۔"

معاملہ خطرناک صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میں اسے لکشمن پور بھیجنا چاہتا تھا

اور وہ مجھ سے الگ ہونے پر تیار نہیں تھی۔ میں نے ایک اور طریقے سے اسے راضی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"درگا! تم ایک بار لکشمن پور چلی جاؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور آکر تمہیں مل جایا کروں گا۔"

ناگن درگا نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"کرم داد جی! میں اب تمہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب میرے ساتھ کیا ہو جائے۔ اب تو دیوتا بھیروں جی بھی میرے خلاف ہوگئے ہیں۔ جب تک جیتی رہوں گی تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے رکھوں گی۔"

اس وقت معاملے کو زیادہ طول دینا مناسب نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"لیکن تم اس مندر میں بھی تو اب نہیں رہ سکتیں۔ اس مندر کا دیوتا تمہارا دشمن بن گیا ہے۔"

درگا نے سر کو باغیانہ انداز میں جھٹک کر کہا۔

"بھیروں جی میرے پریم کرنے کی وجہ سے میرے دشمن ہوگئے ہیں تو میں شیو جی مہاراج کے آگے فریاد کروں گی۔ شیو جی بھی تو اپنی پتنی پاروتی سے بہت پریم کرتے ہیں۔ وہ ضرور میری مدد کریں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم یہاں رہ سکتی ہو تو بے شک یہیں رہ جاؤ' میں بھی اسی شہر بھوپال میں ہوں۔ جب تک یہاں ہوں تمہیں دوسرے تیسرے روز آکر مل جایا کروں گا۔ یہ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔"

ناگن درگا نے کہا۔

"تم مجھے اپنے پاس کیوں نہیں لے جاتے؟ میں بھیرون جی سے دور ہو جانا چاہتی ہوں۔ یہاں رہی تو میں ان کی بد دعا سے نہیں بچ سکوں گی۔"

یہ میرے لیے ناممکن تھا۔ میں نے درگا سے بھی یہی کہا کہ میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا کیونکہ خود میں کسی اور کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔

درگا نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ایک جگہ ہے جہاں ہم دونوں دشمن دیوتا کی نظروں سے بچ کر رہ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"تم دیوتا کی نظروں سے تو دور ہو جاؤ گی لیکن اس کی بد دعا سے کیسے بچ سکو گی؟ تم خود کہا کرتی ہو کہ دیوتا لوگ جس کو بد دعا دے دیں پھر اس کو کوئی نہیں بچا سکتا۔"

ناگن درگا نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"ایک جگہ ہے جہاں دیوتاؤں کی بد دعاؤں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

"وہ کون سی ایسی جگہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

ناگن درگا نے بڑی دلبری کے ساتھ میرا منہ چوم لیا اور ہنس کر بولی۔

"یہ میں تمہیں کل بتاؤں گی' کل شام کو مجھ سے ملنے آؤ گے نا؟"

میں نے کہا۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

"کیوں؟" وہ ناراضگی سے بولی۔ "تمہیں یہاں ایسے کون سے کام کرنے ہیں۔ تم اکیلے ہی تو ہو' تمہاری پتنی بھی پاکستان چلی گئی ہے۔ پھر تم کیوں نہیں کل مجھ سے ملنے آؤ گے؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"اچھا میں کوشش کروں گا۔"

میں جانے لگا تو ناگن درگا مجھ سے بغلگیر ہو گئی۔

"وعدہ کرو کہ تم کل ضرور آؤ گے۔"

میں نے کہا۔

"وعدہ کرتا ہوں۔"

وہ خوش ہو گئی۔ اس نے مجھے پکڑ کر زبردستی بٹھا لیا۔ کہنے لگی۔

"اب میرے ساتھ کھانا کھا کر جاؤ' میں ابھی کھانا لے کر آتی ہوں۔"

میں نے اسے بہت کہا کہ مجھے بھوک نہیں ہے مگر وہ نہ مانی اور مجھے کوٹھڑی میں بٹھا کر کھانا لینے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میرے دل میں خیال آیا کہ اٹھ کر چلا جاؤں اور بھوپال شہر کے کسی مسلم ہوٹل میں بیٹھ کر بریانی کھاؤں۔ میرے پاس پیسے بھی تھے پھر یہ سوچ کر بیٹھا رہا کہ درگا کھانا لے کر آئے گی' میں نہ ہوا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ وہ کھانا لے کر آ گئی۔ مندر کے بھنڈار کا کھانا تھا۔ چاول' بھاجی' دہی اور ساتھ چھ سات لڈو پیڑے تھے۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ بھارت میں لوگ مٹھائیاں بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ ہم دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے دوران درگا مجھ سے پیار محبت کی باتیں کرتی رہی۔ کہنے لگی۔

"کرم داد! میرا اس سنسار میں اب تمہارے سوا اور کون ہے۔ کوئی بھی نہیں۔ اگر تم بھی مجھے چھوڑ گئے تو میں مر جاؤں گی۔ دیوتا بھروں ویسے بھی میرے خلاف ہو گیا ہے۔ وعدہ کرو کہ تم مجھے اپنے ساتھ رکھو گے۔ میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں کہ تم میرے ساتھ ہو گے تو دیوتا بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے....."

وہ اسی طرح باتیں کرتی رہی اور میں موقع کی مناسبت کے مطابق ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ پھر میں کل آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔ خفیہ کمین گاہ کی طرف جاتے ہوئے سارا راستہ درگا کے بارے میں ہی سوچتا رہا کہ میرے چھوڑ دینے سے کہیں سچ مچ یہ عورت کوئی ایسی ویسی حرکت تو نہیں کر بیٹھے گی۔ ناگن درگا کے مزاج کو میں کافی سمجھنے لگا تھا۔ وہ بڑی جذباتی اور انتہا پسند عورت تھی۔ لیکن مجھے اس سے کوئی محبت وغیرہ نہیں تھی' ویسے دوستی تھی اور یہ دوستی میں کسی وقت بھی ختم کر سکتا تھا۔ اب جبکہ ایک بہت اہم مشن میرے سامنے تھا تو میں قدرتی طور پر اپنے ذہن سے درگا کو نکال چکا تھا۔

میں خفیہ کمین گاہ والے ٹیلے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہاں کافی اندھیرا تھا۔ جب

میں درختوں والی چھوٹی سڑک کو پار کر کے دوسری طرف ویران میدان کی طرف بڑھا تو اچانک ایک طرف سے ایک انسانی سایہ میری طرف بڑھا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کرم داد! یہیں رک جاؤ۔"

میں رک گیا۔ سایہ قریب آ گیا۔ یہ ہمارا وہی مجاہد تھا جو سادھو کے بھیس میں خفیہ کمین گاہ کی نگرانی کی ڈیوٹی پر مامور تھا۔ وہ مجھے کھینچ کر درختوں کے نیچے اندھیرے میں لے گیا اور کہنے لگا۔

"آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ پولیس کو کمین گاہ کی مخبری ہو گئی تھی۔ تمہارے جانے کے فوراً بعد اپنے ایک آدمی نے مجھے آ کر اطلاع دی کہ پولیس کی پوری گارد مسلح ہو کر چھاپہ مارنے آ رہی ہے۔ اگر میں عین اس وقت بھاگتا ہوا جا کر کمانڈر خالد کو خبر نہ کرتا تو ان میں سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا تھا۔ پولیس کے دو ٹرک آئے تھے۔ پولیس آتے ہی کمین گاہ میں گھس گئی اور مشین گنوں کی فائرنگ شروع کر دی۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا ہمارے ساتھی فرار ہو چکے تھے؟"

"یہی تو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ میں نے عین وقت پر انہیں خبردار کر دیا اور تمام مجاہد اپنا تمام ضروری سامان اور کاغذات اور اسلحہ وغیرہ لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پولیس کو خالی کمین گاہ ملی ہو گی۔ میں صرف تمہارے لیے یہاں بیٹھا تھا۔ میں نے تمہیں جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور کمانڈو خالد نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر پرانے قلعے والی کمین گاہ میں آ جاؤں۔"

میں نے اندھیرے میں چاروں طرف مشکوک نظروں سے دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس ناکام چھاپے کے بعد وہاں اپنے خفیہ آدمی ضرور چھوڑ گئی ہو گی۔ میں نے مجاہد سے کہا۔

"تم نے اس طرف کسی آدمی کو تو آتے جاتے نہیں دیکھا؟"

"ابھی تک تو مجھے صرف تم ہی نظر آئے ہو۔"

میں نے اسے کہا۔

"یہاں سے جلدی نکل چلو۔ یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔ پرانا قلعہ کس طرف ہے؟"

"میرے ساتھ آ جاؤ۔"

مجاہد مجھے لے کر اس طرف چل پڑا جدھر بھیروں جی کا مندر تھا۔ ہم تیز تیز قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں رات کے اندھیرے میں پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تھا کہ کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ ہم بھروں جی کے مندر کو بائیں ہاتھ کافی فاصلے پر چھوڑ کر آگے نکل گئے۔ آگے کا علاقہ میرا دیکھا ہوا نہیں تھا۔ شہر کی روشنیاں ہمارے دائیں جانب بہت دور دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے مجاہد سے کہا۔

"اگر دور جانا ہے تو کوئی ٹیکسی رکشا کہیں سے لے لیتے ہیں۔ یہ خطرے کا علاقہ ہے یہاں پیدل چلنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

مجاہد نے کہا۔

"یہاں کوئی رکشا ٹیکسی نہیں ملے گی۔ چلتے چلو۔ پرانا قلعہ زیادہ دور نہیں ہے۔"

اور ہم اندھیرے میں چلتے گئے۔





آگے ریلوے لائن آ گئی۔

پھر ایک چھوٹی ندی کے پل پر سے گزرے۔ اس کے آگے ویران علاقہ شروع ہو گیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد دور سے اندھیرے میں کسی عمارت کا سیاہ ہیولا نظر آنے لگا۔ مجاہد نے کہا۔

"وہ پرانا قلعہ ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا یہ قلعہ آثار قدیمہ کے محکمے والوں کے پاس نہیں ہے؟"

مجاہد نے کہا۔

"یہ قلعہ کھنڈر بن چکا ہے۔ اب اسے محکمے والے لے کر کیا کریں گے۔ اس کے بارے میں تو مشہور ہے کہ اس میں کسی مہارانی کا بھوت رہتا ہے۔ لوگ تو اس طرف آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے یہاں اپنا ایک خفیہ ٹھکانہ بنایا ہوا ہے۔"

قلعے کے آس پاس کا ماحول بھی بڑا آسیبی تھا۔ عجیب ڈراؤنے درخت تھے جن کی شاخیں اس طرح زمین پر جھکی ہوئی تھیں جیسے کسی کو اپنے شکنجے میں لینے کے لیے جھکی ہوئی ہوں۔ انہیں دیکھ کر آدم خور درختوں کا خیال آتا تھا۔ قلعے کی دیوار آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ اندھیرے میں کسی عفریت کی طرح کھڑی تھی۔ جگہ جگہ اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ جھاڑیاں سوکھی ہوئی تھیں۔ مجاہد میرے آگے آگے تھا۔

ایک جگہ کھائی تھی' ہم اس میں اتر گئے۔ کھائی میں درختوں کی خشک ٹہنیاں اور پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک جگہ پر کھائی کی دیوار کو خود رو جنگلی جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ مجاہد ان جھاڑیوں میں گھس گیا۔

جھاڑیوں کے اندر غار کا دہانہ تھا۔ یہاں مجاہد نے جیب سے ماچس نکال کر جلائی تو اس کی روشنی میں مجھے ایک غار دکھائی دیا جس کی چھت سے جالے لٹک رہے تھے۔ چند قدم چلنے کے بعد ہم ایک سیڑھی اتر کر نیچے ایک کشادہ دالان میں پہنچ گئے۔ یہاں اپنے دو مجاہد پہرے پر موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں پہچان لیا اور بتایا کہ کمانڈو خالد دوسرے دالان کے حجرے میں ہے۔ ہم اس حجرے میں آ گئے۔ کمانڈو مجاہد لالٹین کی روشنی میں دری کے فرش پر بیٹھا کاپی پر بنا ہوا مختصر سا نقشہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"تمہارا خدشہ درست تھا کرم داد! اگر ہمیں بر وقت اطلاع نہ مل جاتی تو ہم سب ایک بار تو گرفتار ہو گئے تھے۔"

میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم تھا کہ پولیس یونہی ٹیلے کے قریب چکر نہیں لگا رہی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ بچ گئے۔"

خالد نے درگا کے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے کہا۔

"وہ بھیروں کے مندر میں ہی رہ رہی ہے۔ کہہ رہی تھی کچھ روز بعد اپنے گاؤں لکشمن پور چلی جاؤں گی۔"

پھر میں نے اس سے جھانسی ایمونیشن سپلائی سنٹر کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا۔

"اپنا جاسوس کل یا پرسوں آ کر بتائے گا کہ وہاں ایمونیشن سپلائی کی کیا صورت حال ہے۔"

پھر اس نے نقشے والی کاپی بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور کھانے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا۔

"کھانا مجھے درگا نے ہی کھلا دیا تھا۔"

وہ ہنسنے لگا۔

"مندر کے پجاریوں کا پرشاد کھا کر آ رہے ہو۔"

میں نے کہا۔

"خالد بھائی! درگا نے بہت اصرار کیا تھا۔ رک گیا ورنہ میں تو شہر کے کسی مسلمان ہوٹل سے مرغ بریانی کھانا چاہتا تھا۔"

اتنے میں چائے آ گئی اور ہم چائے پینے لگے۔

دوسرے روز جموں کشمیر سے اپنے آدمی آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ میری بیوی جمیلہ کو پاکستان میں اس کے ماں باپ کے حوالے کر کے واپس آ رہے ہیں۔ میں نے ان سے جمیلہ کے ماں باپ کی خیریت وغیرہ معلوم کی۔ یہ بھی پوچھا کہ جمیلہ بی بی تو اپنے ماں باپ سے مل کر بڑی خوش ہوئی ہوگی۔

مجاہد کہنے لگا۔

"سر! وہ سب آپ کا بہت پوچھ رہے تھے۔ آپ کے بارے میں سب بڑے پریشان تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ آپ بالکل محفوظ ہیں اور بڑی جلد واپس پاکستان آ جائیں گے۔ بھابی نے آتی دفعہ آپ کے نام ایک پیغام دیا تھا۔"

"جلدی بتاؤ بھائی۔" میں نے بے تابی سے کہا۔

مجاہد کہنے لگا۔

"سر! بھابی صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ آپ اپنا خیال رکھیں اور کبھی بیمار ہوں تو گھر سے باہر نہ نکلیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ کسی بزرگ کے مزار پر جا کر آپ کے لیے دعا بھی مانگیں گی۔"

مجھ پر سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔

تیسرے روز ہمارا جھانسی والا مجاہد بھی آ گیا جو فقیر کے بھیس میں سراغرسانی کے خاص مشن پر گیا تھا۔ میں اور خالد اسے لے کر حجرے میں بیٹھ گئے۔ وہ کہنے لگا۔

"سر! جھانسی کے آرمی ایمونیشن سپلائی سینٹر سے ہفتے میں دو بار ٹرکوں پر گولہ بارود اور جدید ترین اسلحہ لوڈ کر کے مقبوضہ کشمیر روانہ کیا جاتا ہے۔ یہ چھ ٹرک ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ سیکورٹی کے چار آرمرڈ ٹرک آگے پیچھے اور درمیان میں ہوتے ہیں۔ جالندھر سے آگے ایک ہیلی کاپٹر بھی ان فوجی ٹرکوں کی حفاظت کے لیے اوپر آ جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ بتاؤ کہ کیا ایمونیشن صرف فوجی یونٹ کے جوان ہی لوڈ کرتے ہیں یا ان میں سویلین مزدور بھی ہوتے ہیں؟"

وہ بولا۔

"سر! میں یہی بتانے والا تھا۔ میری معلومات کے مطابق شہر سے چھ سویلین مزدور سپلائی سنٹر پر اس روز جاتے ہیں اور وہ اسلحہ ٹرکوں میں لوڈ کرانے میں فوجی جوانوں کی مدد کرتے ہیں۔"

خالد نے پوچھا۔

"کیا یہ سویلین مزدور ہندو ہیں یا مسلمان؟"

سراغرساں مجاہد نے کہا۔

"ان میں چار ہندو ہیں، دو مسلمان ہیں۔ ان دونوں مسلمانوں کے بارے میں بھی میں نے سارا پتہ کر لیا ہے۔ میں ان کے مکان بھی دیکھ آیا ہوں۔ وہ جھانسی شہر کے ایک گنجان محلے میں رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام فیروز شاہ ہے۔ دوسرے کا نام عبدالجبار ہے۔ دونوں جوان ہیں اور دو تین سال سے فوجی چھاؤنی میں کام کر رہے ہیں۔"

کمانڈو خالد نے میری طرف دیکھا۔

"کرم داد! کیا خیال ہے تمہارا؟"

میں نے کہا۔

"کمانڈر ہمیں جھانسی جانا ہوگا۔"

خالد نے اپنے سراغرساں مجاہد کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا جھانسی میں کوئی ایسی خفیہ جگہ ہے جہاں ہمارا کسی کو پتہ نہ چل سکے۔ ہمیں کم از کم وہاں دس پندرہ دن تک قیام کرنا پڑے گا۔"

سراغرساں مجاہد غور کرنے لگا' پھر بولا۔

"سر! فکر نہ کریں۔ یہ انتظام بھی ہو جائے گا۔ آپ یہ بتائیں کہ کس روز جھانسی جانا پسند کریں گے۔ مجھے کم از کم ایک روز پہلے معلوم ہو جانا چاہیے۔"

خالد نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

"میری طرف سے کل ہی چلے چلیں۔"

سراغرساں مجاہد بولا۔

"سر! آپ پرسوں رات کو چلیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس طرح مجھے وہاں جا کر ضروری انتظام کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اگر آپ پرسوں ضرور روانہ ہوں گے تو میں آج رات جھانسی کی گاڑی پکڑ لوں گا اور کل یا پھر پرسوں صبح صبح آپ کے پاس واپس پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد آپ میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے دوست! تم آج رات دوبارہ جھانسی کی طرف روانہ ہو جاؤ اور جو انتظام تم کر سکتے ہو کر کے واپس آ جاؤ۔ تمہارے واپس آنے کے بعد ہم اپنے مشن کا آغاز کر دیں گے۔"

سراغرساں مجاہد کمانڈر خالد سے اجازت لے کر حجرے سے نکل گیا۔ جھانسی میں بھوپال کے مجاہدوں کی ابھی کوئی باقاعدہ خفیہ تنظیم نہیں تھی۔ کچھ نوجوان تیار ضرور کر لیے گئے تھے۔ چنانچہ ہمارے سراغرساں نے ایسے ہی ایک نوجوان کے مکان پر ہماری رہائش کا اہتمام کیا تھا۔ دو دن بعد ہمیں رات کی گاڑی سے جھانسی روانہ ہونا تھا۔ میں ابھی تک ناگن درگا کے ہاں بھیروں جی مندر نہیں گیا تھا۔ شام کا اندھیرا ہوتے ہی

میں کمانڈو خالد کو بتا کر ناگن درگا سے ملنے چل دیا۔ بھیرو ں کے مندر میں پوجا پاٹھ ہو رہی تھی۔ میں مندر کے احاطے میں ٹہلتا ہوا اس کوٹھڑی کی طرف گیا' جہاں وہ ٹھہری ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ میں آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ سب سے پہلی چیز جس نے مجھے تھوڑا چونکا دیا وہ یہ تھی کہ کوٹھڑی میں سانپ کی خاص بو تھی۔ سانپ کی یہ بو بڑی تیز تھی۔ اس خاص بو کو یا تو کوئی سانپ محسوس کر سکتا تھا یا میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔

کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔

میں نے جیب سے ماچس نکال کر تیلی جلائی۔ طاق میں موم بتی رکھی تھی' میں نے اسے روشن کر دیا۔ دروازے کو بند کر دیا تھا۔ اب میں بڑے غور سے کوٹھڑی کا جائزہ لینے لگا۔ سانپ کی بو ایک کونے سے آ رہی تھی۔ میں نے کونے میں جھک کر دیکھا' وہاں ایک کپڑا پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا۔ یہ ناگن درگا کا بلاؤز تھا۔ میں نے اسے سونگھا۔ سانپ کی تیز بو اسی بلاؤز میں سے آ رہی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور ناگن درگا کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ بھیروں دیوتا کی بد دعا نے اسے پھر سے سانپ میں تبدیل کر دیا ہو۔ میں نے بلاؤز کو وہیں رکھ دیا اور موم بتی بجھا کر کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔ باہر نکلنے کے پاس ایک سادھو کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی میں کوٹھڑی سے نکلا' اس نے کہا۔

"تو جس کی تلاش میں آیا ہے وہ اب تمہیں کبھی نہیں ملے گی۔ تو مسلمان ہے۔ اس مندر میں کسی مسلمان کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں بھگتی دھرم کا سادھو ہوں۔ میری جگہ کوئی ورن آشرم کا برہمن سادھو ہوتا تو وہ تمہیں زندہ نہ چھوڑتا۔ اپنی جان بچا کر یہاں سے بھاگ جا۔"

میں نے سادھو کا شکریہ ادا کیا اور اس سے صرف اتنا پوچھا۔

"مہاراج! کیا آپ کو معلوم ہے کہ جس کی مجھے تلاش ہے وہ کہاں ہوگی؟"

سادھو نے بازو بلند کیا اور کہا۔

"مورکھ ہو۔ تمہیں جان کی پروا نہیں ہے تو جا پھر جو چاہے کر۔"

اتنا کہہ کر سادھو چلا گیا۔

میں نے سوچا کہ حالات ٹھیک نہیں لگتے۔ بہتر یہی ہے کہ میں جتنی جلدی نکل سکوں اس مندر سے نکل جاؤں۔ میں نے کوٹھڑی کی طرف پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا مندر سے باہر نکل گیا۔ دل میں بار بار یہ خیال آتا کہ ناگن درگا بے چاری کس مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ خدا جانے وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوگی سانپ ہی کے روپ میں ہوگی۔ میں دوسرے راستے سے مندر آیا تھا۔ واپس بھی اسی راستے سے پرانے قلعے کی کمین گاہ میں آ گیا۔ کمانڈو خالد جھانسی جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس نے مجھ سے درگا کے بارے میں سرسری طور پر پوچھا اور کہنے لگا۔

"اس وقت تمہیں وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔ لیکن خیر تم آ گئے ہو یہ خوشی کی بات ہے۔ تمہاری ناگن کس حال میں ہے؟"

میں نے کہا۔

"وہ مندر میں نہیں تھی۔ میرا خیال ہے لکشمن پور واپس چلی گئی ہے۔"

کمانڈو خالد نے اپنے آٹومیٹک پستول کی نالی پر سلینسر چڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی اچھا ہوا ہے۔ تمہارا پستول اس تھیلے میں رکھا ہے۔ چیک کر لو۔ ہم ایک گھنٹے بعد یہاں سے نکل رہے ہیں۔"

میں نے تھیلے میں سے پستول نکال کر اس کے میگزین کو چیک کرتے ہوئے پوچھا۔

"کمانڈر! یہاں سے ہمارے ساتھ کوئی اور مجاہد بھی جھانسی جائے گا؟"

اس نے کہا۔

"نہیں، صرف ہم دونوں ہی جائیں گے۔ ضرورت پڑی تو جھانسی سے ہمیں مجاہد مل جائیں گے۔"

چونکہ ہماری پرانی کمین گاہ پر چھاپہ پڑنے کے بعد بھوپال کی پولیس ہماری تلاش

میں تھی' اس لیے ہم پرانے قلعے میں سے الگ الگ ہو کر نکلے۔ کمانڈو خالد اکیلا ہی سٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ ہمارا سراغرساں جس کے ساتھ ہمیں جھانسی جانا تھا وہ پہلے نکل چکا تھا۔ وہ فقیرانہ بھیس میں تھا۔ ہم نے معمول کے مطابق کپڑے پہن رکھے تھے۔ یعنی ٹھنڈی جیکٹ اور پتلون' میں کمانڈو خالد کے نکلنے کے دو منٹ بعد نکلا۔ ہمیں بھوپال ریلوے سٹیشن کے تھرڈ کلاس کے مسافر خانے میں ملنا تھا۔

جھانسی جانے والی ٹرین کے متعلق تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ جس وقت ہم مسافر خانے میں اکٹھے ہوئے اس کے آدھ گھنٹے بعد بمبئی کی جانب سے ٹرین نے آنا تھا۔ یہ ٹرین دلی جا رہی تھی۔ آدھ گھنٹہ ہم تھرڈ کلاس کے مسافر خانے میں ایک دوسرے سے الگ الگ ہو کر بیٹھے رہے۔ سراغرساں مجاہد ہمارے لیے تھرڈ کلاس کے جھانسی تک کے تین ٹکٹ لے آیا تھا۔ جس وقت ٹرین سٹیشن میں داخل ہوئی تو ہم اس کے پانچ سات منٹ بعد پلیٹ فارم پر پہنچے۔ ٹرین بھوپال سٹیشن پر دس بارہ منٹ ضرور رکتی تھی۔ ٹرین میں بھی ہم الگ الگ ڈبوں میں سوار ہوئے۔ ابھی تک سب ٹھیک تھا۔ سٹیشن پر پولیس ضرور تھی مگر ہماری طرف کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ ٹرین چل پڑی تو مجھے اطمینان ہوا۔ ٹرین آدھی رات کے بعد جھانسی پہنچی۔ وہاں بھی ہم تہہ شدہ پروگرام کے مطابق تھرڈ کلاس کے مسافر خانے میں ہی اکٹھے ہوئے۔ ہمارا سراغرساں مجاہد اب ہمارا گائیڈ تھا۔ ہم نے ایک ٹیکسی لی اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہماری منزل جھانسی میں مقیم ہماری اسلامی تنظیم کے ایک جانباز کا مکان تھا۔ میں اس جانباز کا نام اور اس کے گھر کا پتہ نہیں بتاؤں گا۔ یوں سمجھ لیں کہ ہم اس کے مکان پر پہنچ گئے۔ اس جانباز کا فرضی نام ہاشم رکھ لیتے ہیں۔ ہاشم کا مکان شہر کی گنجان آبادی سے باہر ایک پرانی بستی میں تھا۔ یہاں ہم پر کسی کو شک شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ باقی رات ہم نے سو کر بسر کی۔ اگلے دن ہم سب ناشتہ کر کے مکان کے چوبارے میں بیٹھ گئے۔ ہاشم کو سراغرساں مجاہد نے ہمارے مشن کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ کمانڈو

خالد نے ہاشم سے پوچھا۔

”جو دو مسلمان سویلین آدمی ایمونیشن سپلائی سینٹر سے اسلحہ وغیرہ فوجی ٹرکوں میں لوڈ کرتے ہیں۔ ان میں سے تمہارے خیال میں قابل اعتماد آدمی کون ہے؟“

ہاشم نے جیسے پہلے ہی سے ان میں سے ایک آدمی کا انتخاب کر رکھا تھا۔ کہنے لگا۔

”ان میں فیروز شاہ بھروسے کا آدمی ہے۔ وہ ہماری مدد کے لیے فوراً تیار ہو جائے گا۔“

میں نے اپنے پلان کے مطابق ہاشم سے پوچھا۔

”ہماری اطلاع کے مطابق چھ سویلین مزدور ٹرکوں میں اسلحہ لوڈ کرتے ہیں۔ جن میں سے چار ہندو ہیں، دو مسلمان ہیں۔ کیا ان لوگوں کو سپلائی سینٹر کے یونٹ کمانڈر کی طرف سے کوئی شناختی کارڈ بھی ایشوع کیے گئے ہیں؟“

ہاشم کی بجائے ہمارے سراغرساں جاسوس نے جواب میں کہا۔

”ان چھ سویلین لوڈروں کو کوئی شناختی کارڈ ایشوع نہیں کیا گیا۔ جس روز فوجی ٹرک آتے ہیں یہ وقت پر وہاں پہنچ جاتے ہیں اور ٹرکوں میں ایمونیشن کے بکس وغیرہ لوڈ کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ صرف اسلحہ سپلائی سینٹر کے داخلہ گیٹ پر ان کی آتے جاتے وقت معمولی سی چیکنگ ہوتی ہے۔“

کمانڈر خالد نے مجھ سے کہا۔

”کرم داد! ایک بہت بڑی رکاوٹ ہمارے راستے سے خود بخود ہٹ گئی ہے۔ شناختی کارڈ کا معاملہ ہمیں پریشان بھی اور مشکل میں بھی پھنسا سکتا تھا۔“

اس کے بعد کمانڈو خالد نے ہاشم کو اپنے قریب بٹھا لیا اور اسے کہا۔

”ہاشم بھائی! بات یہ ہے کہ تمہیں فیروز شاہ لوڈر کو آج رات اس مکان پر لانا ہے۔ لیکن ایک بار پھر غور کر کے بتاؤ کہ کیا اس آدمی فیروز شاہ پر ہم پورا بھروسہ کر سکتے ہیں؟ کیونکہ فیروز شاہ نے ہمارے مشن میں بڑا اہم رول ادا کرنا ہے۔“

ہاشم کہنے لگا۔

"فیروز شاہ کی آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے بڑی اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ وہ ہماری تنظیم کا ہمدرد ہے اور سرفروش مجاہد ہے۔ وہ ہماری ہر طرح سے مدد کرے گا۔ میں اسے رات کو یہاں لے آؤں گا۔ میں ابھی اس سے جا کر ملتا ہوں۔ اس وقت وہ اپنی دکان پر ہی ہوگا۔ شہر میں اس کی بیکری کی دکان ہے۔ ویسے وہ پہلوان ٹائپ آدمی ہے اور فوجی سپلائی سینٹر کے ٹرکوں کی لوڈنگ سے جو مزدوری ملتی ہے اس کے وہ بادام خرید کر گھر ڈال لیتا ہے۔"

کمانڈو خالد میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ کہنے لگا۔

"ہم اسے فیروز پہلوان کہہ کر پکاریں گے۔"

ہاشم فیروز شاہ کی دکان کی طرف چل دیا۔ اس کے بعد کمانڈو خالد نے سراغرساں جاسوس سے کہا۔

"دوست! اب تمہیں ایک کام کرنا ہے۔"

"میں حاضر ہوں کمانڈر۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"ہم جھانسی کے اس ایمونیشن سپلائی سینٹر کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

سراغرساں مجاہد ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔ پھر بولا۔

"یہ کام آپ کس وقت کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔

"دن کی روشنی میں ہی ہونا چاہیے۔ رات کے وقت تو ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔"

سراغرساں جاسوس نے کہا۔

"سپلائی سینٹر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر ہے۔ اس طرف جانے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ آپ جوگی سادھوؤں کا بھیس بدل کر بھی گئے تو فوجی گارڈ آپ کو ٹیلے پر

جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ آپ سویلین کپڑوں میں بھی دن کے وقت ادھر نہیں جا سکیں گے۔"

میں نے سراغرساں مجاہد سے پوچھا۔ "کیا ٹیلے کے آس پاس کوئی اونچی جگہ ہے؟"

اس نے کہا۔

"اس کی بائیں جانب ایک پرانے مینار کا کھنڈر ہے۔"

"مینار کے اوپر جانے کی سیڑھیاں ضرور ہوں گی؟" میں نے پوچھا۔

"سراغرساں نے جواب دیا۔

"ہیں مگر بہت بوسیدہ ہیں۔"

میں نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ کیا تم ہمیں کوئی دور بین لا کر دے سکتے ہو؟"

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔" سراغرساں نے اطمینان دلایا۔

میں نے کمانڈو خالد سے کہا۔

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم مینار کے کھنڈر پر سے دور بین سے سپلائی سینٹر کا جائزہ لیں۔"

وہ کہنے لگا۔

"یہ کام ہمیں آج ہی کرنا ہوگا اور شام کا اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے کرنا ہوگا۔"

سراغرساں جاسوس بولا۔

"دور بین کا انتظام ہاشم کر دے گا۔ اگر آپ کہیں تو میں ابھی اس کے پاس جاتا ہوں۔"

"ابھی جاؤ۔" میں نے اسے کہا۔

سراغرساں مجاہد کے جانے کے بعد ہم اپنے مشن کے پلان پر مزید غور کرنے لگے۔ نصف گھنٹے بعد سراغرساں مجاہد واپس آ گیا۔ اب وہ فقیرانہ لباس میں نہیں تھا۔ اس نے ہمیں دور بین لا کر دی۔ یہ کوئی اعلیٰ کوالٹی کی دور بین نہیں تھی۔ مگر اس سے ہمارا کام

چل سکتا تھا۔ ہم نے سراغرساں مجاہد کو ساتھ لیا۔ مکان کو تالا لگایا اور پرانے مینار کی طرف چل پڑے۔ سراغرساں مجاہد اپنے ساتھی ہاشم کو اس کی دکان پر کہہ آیا تھا کہ وہ دو گھنٹے بعد مکان پر آئے۔

جھانسی شہر بھارت کے بڑے پرانے اور گنجان آباد شہروں میں سے ہے۔ یہاں جھانسی کی رانی کا قلعہ' محل اور باغات بھی ہیں۔ شہر دروازوں کی چاردیواری کے اندر بھی ہے اور باہر بھی اس کی کالونیاں آباد ہوگئی ہیں۔ شہر کی عمارتیں پرانی حویلیوں کی طرح ہیں۔ ہم شہر کی چاردیوری سے دور رہ کر ایک پرانے باغ میں ایک تاریخی تالاب کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک غیر آباد جگہ پر آ گئے۔ سامنے بائیں جانب ایک چھوٹا سا ٹیلہ نظر آیا۔ سراغرساں نے اس طرف اشارہ کرکے کہا۔

"اس ٹیلے پر آرمی سپلائی سینٹر ہے۔"

ہم پرے پرے رہ کر چلتے ہوئے ٹیلے سے کوئی چھ سات سو گز کی دوری سے گزر گئے۔ ٹیلہ ایک ٹبے کی طرح تھا جس کے اوپر دو چار درخت نظر آ رہے تھے۔ جس طرف اس کا داخلہ گیٹ تھا اس طرف کچھ فاصلے پر مینار کا کھنڈر تھا۔ ہم اوپر سے ہو کر مینار کے عقب میں آئے۔ مینار کے اوپر جانے کی سیڑھیاں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ سراغرساں مجاہد کو ہم نے نیچے ایک طرف نگرانی کرنے کے لیے روک دیا اور خود سیڑھیاں چڑھتے کسی نہ کسی طرح مینار کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔ میں نے دوربین لگا کر ایمونیشن سپلائی سینٹر پر نگاہ ڈالی۔

ایمونیشن ڈپو بہت بڑے گودام کی طرح تھا۔ چھت ڈھلواں تھی۔ دیواریں اونچی اونچی تھیں۔ اردگرد کافی کھلی جگہ تھی جہاں ایک طرف فوجی ٹرک کھڑے تھے۔ دو سنتری ڈپو کے دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔ کونے میں فوجی بارک تھی جس کے آگے گول دائرے میں پھولدار پودے تھے اور ان کے درمیان رجمنٹ کے نشان کا جھنڈا بانس پر لہرا رہا تھا۔ دو چار فوجی بھی چلتے پھرتے نظر آئے۔ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ ایمونیشن ڈپو کے اردگرد خاردار تاروں والی دیوار نہیں تھی بلکہ ایک مرد

اونچی پتھروں کی چاردیواری بنی ہوئی تھی۔ میں نے یہ ساری تفصیل خالد کو زبانی بتاتے ہوئے دوربین اس کے حوالے کی اور کہا۔

"چار دیواری کو خاص طور پر دیکھو۔ مجھے تو وہاں کانٹے دار تار دکھائی نہیں دی۔"

کمانڈو خالد دوربین لگائے دیر تک سپلائی سینٹر کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"چاردیواری پتھروں کی ہے۔ حیرانی ہے کہ یہاں خاردار تار نہیں لگائی گئی لیکن سیکورٹی کا انتظام کافی ہے۔ اس طرف مجھے دو مشین گن پوسٹیں نظر آ رہی ہیں۔ ضرور ایسی ہی دو پوسٹیں ٹیلے کی دوسری جانب بھی ہوں گی۔"

اس نے دوربین مجھے دے دی۔ میں مشین گن پوسٹیں نہیں دیکھ سکا تھا۔ دوربین لگا کر غور سے دیکھا تو سپلائی سینٹر کی دیوار کے قریب ہی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مورچے بنے ہوئے تھے جن پر جھاڑیاں کاٹ کر ڈال دی گئی تھیں۔ ان میں سے مشین گنوں کی نالیاں دوربین میں صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ دو مشین گن پوسٹیں ہیں۔ گارڈ سنتری صرف دو ہی ہیں۔ مگر ذرا آگے گیٹ کے اندر دونوں جانب اونچے چبوترے ہیں جن میں مجھے چوکور سوراخ نظر آ رہے ہیں۔ تم بھی دیکھو۔"

میں نے دوربین خالد کو دی۔ اس نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ کہنے لگا۔

"یہ دونوں بھی مشین گنوں کے مورچے ہیں کرم داد۔"

میں نے بھی دوربین لگا کر ان مورچوں کو پھر سے دیکھا اور دوربین آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ اس ایمونیشن ڈپو میں یقینی طور پر انتہائی اہم اور جدید ترین فوجی اسلحہ موجود ہے۔ ورنہ اس قسم کے شہروں کے قریب بنے ہوئے ایمونیشن سینٹروں میں سیکورٹی اتنی سخت نہیں ہوا کرتی اور شہر کے قریب اس ایمونیشن ڈپو کو بھی اسی لیے بنایا گیا ہے کہ لوگ یہی سمجھیں کہ یہاں عام قسم کا اسلحہ وغیرہ رکھا گیا ہے۔ کسی کو ذرا سا شک بھی نہ پڑ سکے کہ یہاں جدید ترین فوجی اسلحے

کا ذخیرہ جمع ہے۔"

کمانڈو خالد نے دوربین لگا کر ایک بار پھر ٹارگٹ کا جائزہ لیا۔

کہنے لگا۔ "ہمیں اپنے پلان میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑے گی۔ ہم آٹومیٹک پستول یا کمانڈو چاقو چھپا کر ساتھ لے جانے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔"

میں غور کرنے لگا۔ خالد دوربین آنکھوں سے ہٹا کر مینار کی منڈیر کے نیچے ہو گیا۔ ہم دونوں سروں کو نیچے کیے باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا۔

"ایک بات واضح ہو گئی ہے کہ ہم اگر چاہیں کہ بارود لگا کر یا ٹائم بموں کے بٹن دبا کر وہاں سے فرار ہو جائیں گے تو ایسا ناممکن نظر آتا ہے۔ ہمیں نارمل طریقے سے سپلائی سینٹر کے اندر جانا ہو گا اور نارمل طریقے سے ہی وہاں سے باہر نکلنا پڑے گا۔"

کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"یعنی ہمیں اس سکیم پر عمل کرنا ہو گا جو ہم نے سب سے پہلے سوچی تھی۔"

"بالکل وہی پلان ہمیں اس مشن میں کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے' آؤ واپس چلیں۔"

ہم مینار کے کھنڈر کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے۔ ہمارا سراغرساں ساتھی ایک طرف چھپ کر ہمارا انتظار کر رہا تھا ہم جس راستے سے آئے تھے۔ اسی راستے سے الگ الگ ہو کر واپس روانہ ہوئے۔ مکان پر آئے' ہاشم ابھی نہیں پہنچا تھا۔ ہم تالا کھول کر اوپر والے چوبارے میں جا کر بیٹھ گئے۔ سراغرساں مجاہد ہاشم کو لینے چل دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ ہاشم کو لے کر آ گیا۔ ہاشم نے بتایا کہ اس نے فیروز شاہ سے ساری بات کر لی ہے۔ وہ ہماری ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہو گیا ہے۔ بلکہ کہنے لگا کہ کشمیر کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے میں اپنی جان قربان کرنے کو بھی تیار ہوں۔

خالد نے پوچھا۔

"وہ کس وقت یہاں آ رہا ہے؟"

"رات کو دکان بند کر کے آ جائے گا"

ہم مکان میں ہی بیٹھے رہے۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ رات کا کھانا کھا کر ہم چائے پی رہے تھے کہ باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ ہاشم بولا۔

"فیروز شاہ آ گیا ہے۔"

وہ نیچے گیا اور جب اوپر آیا تو اس کے ساتھ گٹھے ہوئے بدن کا ایک باڈی بلڈر قسم کا نوجوان تھا جس نے کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں چاندی کا تعویذ تھا۔ اس نے السلام و علیکم کہا اور ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ہاشم نے اس کا تعارف کروایا۔ میں نے کہا۔

"پہلوان جی چائے تو آپ شاید نہیں پئیں گے۔"

فیروز شاہ مسکرانے لگا۔

"شکریہ بھائی صاحب۔ ہم پہلوان لوگ چائے نہیں پیتے' چائے ہمیں گرمی کرتی ہے۔"

چند ایک باتیں کرنے کے بعد کمانڈو خالد نے مطلب کی بات شروع کر دی۔

"فیروز شاہ یہ بتاؤ کہ ٹیلے والے سپلائی سینٹر سے کس کس دن اسلحہ ٹرکوں میں لوڈ کیا جاتا ہے۔"

اس نے کہا۔

"بھائی جان۔ سات ٹرک لوڈ ہو کر دو روز پہلے جموں کشمیر کی طرف گئے ہیں۔ اب تین دن بعد پھر سات ٹرک لوڈ ہو کر جائیں گے۔"

خالد نے پوچھا۔

"تم کتنے سویلین وہاں اسلحہ لوڈ کرتے ہو؟"

"ہم کل چھ سویلین ہیں۔ چار ہندو مہاشے ہیں' دو ہم مسلمان ہیں۔ ایک میں دوسرا جبار ہے۔"

خالد نے سوال کیا۔

"یہ جبار کس قسم کا آدمی ہے۔"

فیروز شاہ گردن گھماتے ہوئے بولا۔

"بھائی جان! وہ دنیادار قسم کا آدمی ہے۔ پہلے ریلوے گودام پر مزدوری کرتا تھا۔ وہاں ایک آدمی سے جھگڑا کر بیٹھا۔ آج کل اس کا کوئلوں کا ٹال ہے۔ محنت مزدوری کے لیے ٹرکوں پر مال لوڈ کرنے کے لیے بھی آ جاتا ہے۔"

خالد نے میری طرف دیکھا۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔"

خالد کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے فیروز شاہ سے کہا۔

"فیروز شاہ! یہ تو تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہم کس مقصد کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ بھارت نے اپنی فوج کے ذریعے کشمیر پر زبردستی قبضہ کر رکھا ہے اور وہاں بھارتی فوج کشمیری مسلمانوں پر بے پناہ ظلم کر رہی ہے۔ مسجدوں' خانقاہوں اور کشمیریوں کے گھروں کو نذر آتش کیا جا رہا ہے۔ انہیں وحشیانہ انداز میں اذیتیں دے کر ہلاک کیا جا رہا ہے۔ کشمیری حریت پرست اپنے وطن کی آزادی کے لیے جانوں کے نذرانے دے رہے ہیں۔ بھارتی فوجی جدید ترین اسلحے سے لیس ہوتے ہیں جبکہ کشمیری حریت پرستوں کے پاس سوائے رائفلوں کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ بھارتی فوجی یونٹوں کو جھانسی کے سپلائی سینٹر سے اس وقت انتہائی ہلاکت خیز فوجی اسلحہ سپلائی کیا جا رہا ہے۔ جس سے بھارتی فوجی مقبوضہ کشمیر میں مظلوم کشمیریوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔"

فیروز شاہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بھائی جان! کشمیری مسلمانوں کی آزادی اور اسلام کی خاطر فیروز شاہ کی ایک جان تو کیا ہزار جانیں حاضر ہیں۔ آپ حکم کریں' مجھے کیا کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"پہلا کام تو تمہیں یہ کرنا ہو گا کہ جب ہم تمہیں کہیں تمہیں اپنے دوسرے مسلمان ساتھی جبار کو کم از کم چار دنوں کے لیے کہیں غائب کر دینا ہو گا۔ کیا تم ایسا کر

سکتے ہو؟ کیونکہ ہم جبار پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔"

فیروز شاہ نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ ہاشم کہنے لگا۔

"اس کو غائب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسا انتظام بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود کچھ دنوں کے لیے جھانسی سے باہر چلا جائے۔ کیوں فیروز شاہ؟ جبار کی چھوٹی بہن دوبئی میں اپنے خاوند بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ ہم جبار کے نام وہاں سے ایک تار بھجوا دیں گے کہ تمہاری بہن کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ ہسپتال میں بے ہوش پڑی ہے۔ جلدی پہنچو۔ جبار تار ملنے کے بعد ہر حالت میں دوبئی روانہ ہو جائے گا کیونکہ اس کی ایک ہی بہن ہے اور وہ اس سے بڑی محبت کرتا ہے۔ ہمیں اکثر کہا کرتا ہے کہ میری یہ بہن میرا بھائی بھی ہے اور میری ماں بھی ہے۔ اس کے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

خالد نے پوچھا۔

"کیا تم لوگ دوبئی سے اس قسم کا تار بھجوا سکو گے؟"

"کیوں نہیں۔" ہاشم بولا۔ "وہاں میرا ایک جگری دوست دس برس سے رہ رہا ہے۔ میں جس وقت اسے فون پر کہوں گا کہ اس مضمون کا تار جبار کے پتے پر بھجوا دو۔ وہ فوراً بھجوا دے گا۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"ٹھیک ہے یہ مسئلہ تقریباً طے ہی سمجھو۔ اب فیروز شاہ باقی کا کام تمہیں کرنا ہوگا۔"

"آپ حکم کریں بھائی جان۔ میری جان بھی حاضر ہے۔"

فیروز شاہ نے بڑے جذبے کے ساتھ کہا۔ کمانڈو خالد نے پوچھا۔

"یہ بتاؤ کہ تم لوگ ایمونیشن ڈپو کے باہر سے اسلحہ کے کریٹ اور بکسے اٹھا کر ٹرکوں میں لوڈ کرتے ہو یا تمہیں یہ چیزیں اٹھانے کے لیے اسلحہ کے گودام کے اندر بھی جانا پڑتا ہے؟"

فیروز شاہ نے کہا۔

"باہر کوئی بکسے نہیں ہوتے جناب۔ ہم سویلین بھی فوجی جوانوں کے ساتھ گودام کے اندر جاتے ہیں اور وہاں سے اسلحہ کے چھوٹے بڑے کریٹ اٹھا کر لاتے ہیں اور فوجی ٹرکوں میں لوڈ کرتے ہیں۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"تم نے یہ بتا کر ہمار بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ گودام میں پٹرول وغیرہ کے ڈرم بھی رکھے ہوتے ہیں یا نہیں؟"

فیروز شاہ بولا۔

"بھائی جان! مجھے یہ کام کرتے ہوئے چار سال ہو گئے ہیں۔ مجھے تو سب کچھ معلوم ہو گیا ہوا ہے۔ میں تو بکسے کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ اس میں مشین گن کا میگزین ہے یا ہینڈ گرنیڈ ہیں۔ پٹرول کے ڈرم نہیں ہوتے' بڑے بڑے کین ہوتے ہیں۔"

کمانڈو خالد ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

"یہ مجھے معلوم تھا مگر میں نے ڈرموں کا نام اس لیے لیا تھا کہ شاید کین تم نہ سمجھ سکو۔ مگر یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ تمہیں فوجی اسلحے کی پوری پوری پہچان ہے۔ اب بات یہ ہے کہ جس روز تمہارا ساتھی جبار دوبئی چلا جائے گا اس کے بعد جب تم اپنے ہندو ساتھیوں کے ہمراہ ٹرکوں میں اسلحہ لوڈ کرنے سپلائی سینٹر جاؤ گے تو ہم تمہیں کالے رنگ کا ایک تعویذ دیں گے۔ یہ تعویذ چوکور ہو گا۔ زیادہ بڑا نہیں ہو گا۔ اس پر چمڑا منڈھا ہوا ہو گا۔ فیتہ لگا ہو گا۔ تم اس تعویذ کو اپنے بازو پر باندھ کر ایمونیشن سپلائی سینٹر میں جاؤ گے۔ تمہارا کام صرف اتنا ہو گا کہ جب تم اسلحہ کے کریٹ اٹھانے اندر جاؤ تو آنکھ بچا کر یہ تعویذ اتار کر کسی بھی پڑول کین کے پاس رکھ دو گے اور رکھنے سے پہلے اس کو انگوٹھے سے ذرا سا دبا دو گے۔ کیا یہ کام اتنی احتیاط کے ساتھ کر سکو گے کہ تمہارے کسی سویلین ساتھی یا کسی فوجی جوان کو پتہ نہ چل سکے؟"

فیروز شاہ بولا۔

"یہ تو کوئی مشکل کام ہی نہیں ہے بھائی جان۔ مجھے کوئی مشکل کام بتائیں۔"

کمانڈو خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست! اس کام کو چاہے مشکل سمجھو چاہے آسان لیکن تمہیں صرف اتنا کام ہی کرنا ہوگا۔"

فیروز شاہ نے سوال کیا۔

"بھائی جان! یہ تو مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ جو تعویذ آپ مجھے دیں گے وہ کوئی ٹائم بم ہوگا اور بڑا ہی طاقت ور ٹائم بم ہوگا۔ لیکن یہ ضرور بتا دیں کہ بم رکھنے کے کتنی دیر بعد پھٹے گا؟"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"ڈیڑھ گھنٹے بعد پھٹے گا۔ اس وقت تک میرا خیال ہے تم اپنے گھر پہنچ گئے ہوگے۔"

فیروز شاہ نے کوئی اندازہ لگا کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں آخری پھیرا لگاتے ہوئے یہ تعویذ پٹرول کینوں کے درمیان رکھ دوں گا۔ اس کے بعد تو مجھے چھٹی کر کے گھر ہی جانا ہوگا۔ لیکن بھائی صاحب دھماکہ کتنا ہوگا؟ ہمارے محلے کے مکان تو نہیں گریں گے نا؟"

اس پر میں نے فیروز شاہ کو تسلی دی۔

"فکر نہ کرو ہمارے پہلوان مجاہد! تمہارے گھر محفوظ رہیں گے۔ صرف وہ پہاڑی غائب ہو جائے گی جس پر ایمونیشن کا گودام ہے۔"

فیروز شاہ کو ہم نے اپنے پلان کی ساری تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا۔ چنانچہ اسے رخصت کر دیا۔ ہاشم نے کہا کہ وہ دوبئی ٹیلی فون پر اپنے دوست کو خبر کر دے گا کہ وہ جبار کو اس کی بہن کے حادثے کے بارے میں ٹیلی گرام دے دے۔ تین دن کے بعد جھانسی کے آرمی ایمونیشن سپلائی سینٹر سے گولہ بارود ٹرکوں میں لوڈ کیا جانا تھا۔ دو دن پہلے ہاشم نے دوبئی اپنے دوست کو فون کر دیا۔ دوسرے روز صبح صبح جبار کو ٹیلی گرام موصول ہوا کہ اس کی بہن کا کار میں حادثہ ہوگیا ہے اور وہ ہسپتال میں ہے۔ جبار دوپہر

کی فلائیٹ سے دوبئی چلا گیا۔

اب ہمارا میدان صاف تھا۔ دوسرے روز دن کے دس بجے ایمونیشن سپلائی سینٹر سے اسلحہ کے ٹرک لوڈ ہونے تھے۔ کمانڈو خالد نے اس دوران جھانسی کے ایک ماہر اور تجربہ کار ایکسپلوزیو تیار کرنے والے مجاہد کی مدد سے ایک ایسا تعویذ بم تیار کر لیا تھا جس کی طاقت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ یہ تعویذ رات کے وقت فیروز شاہ کے حوالے کر دیا گیا جس نے اسے اپنے بازو پر باندھ لیا۔ فیروز شاہ کی گھڑی سے ہم نے اپنی گھڑیاں [illegible] لیں۔ اس نے بتایا کہ وہ عام طور پر دوپہر کے ایک بجے ٹرک لوڈنگ سے [illegible] جاتا ہے۔ کمانڈو خالد نے کہا۔

"تم ٹھیک ایک بجے تعویذ بم کو اسلحہ کے گودام کے اندر پٹرول کے ڈرموں کے [illegible] رکھ کر اس کو اوپر سے دبا دینا۔"

[illegible]روز شاہ نے کہا۔

"انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔"

دوسرا دن ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

اس روز ہمارا مشن کامیاب بھی ہو سکتا تھا اور ناکام بھی۔ اس روز جھانسی کے شہری ایک قیامت خیز دھماکہ سننے والے تھے اور سارا شہر لرزنے والا تھا اور اگر کسی وجہ سے تعویذ بم بلاسٹ نہیں ہوتا تو ہمارا مشن ناکام بھی ہو سکتا تھا۔ ہم اپنی کامیابی کے لیے خدا سے دعا مانگ رہے تھے۔ ٹھیک دن کے ساڑھے نو بجے فیروز شاہ نے ہاشم کے ہاتھ ہمیں یہ پیغام بھیجا کہ وہ سپلائی سینٹر جا رہا ہے اور ہر چیز اپنے وقت کے مطابق عمل میں آئے گی۔

ہمیں کیا کرنا تھا؟ یہ بھی ہم نے طے کر لیا ہوا تھا۔

اپنے سراغرساں جاسوس نے ہمیں وہ راستہ بتا دیا تھا جہاں سے اسلحہ سے لدی ہوئی فوجی گاڑیوں کو گزرنا تھا۔ ہم ان چھ سات اسلحہ سے بھری ہوئی گاڑیوں کو بھی راستے میں اڑا دینا چاہتے تھے تاکہ یہ اسلحہ بھی کشمیر میں تعینات مقبوضہ انڈین یونٹوں

تک نہ پہنچ سکے۔ ہم نے ٹارگٹ رجسٹر کر رکھا تھا کہ ہمیں کہاں گھات لگا کر بیٹھنا ہے۔ چنانچہ ہم ٹھیک دس بجے ہاشم کے مکان سے نکل کھڑے ہوئے۔ سراغرساں مجاہد ہمارے ساتھ تھا۔ ہم شہر سے کافی دور آ گئے۔ یہاں ہمیں چھوٹے ٹیلوں کے درمیان ایک سڑک بل کھاتی گزر رہی تھی۔ گولہ بارود اور جدید ہتھیاروں سے بھرے ہوئے فوجی ٹرکوں کو اسی سڑک پر سے گزرنا تھا۔ فیروز شاہ نے ہمیں بتا دیا تھا کہ فوجی گاڑیاں اسلحہ لے کر بارہ ساڑھے بارہ بجے تک جموں کشمیر کی طرف روانہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن سویلین مزدور ایک بجے تک اسلحہ کے گودام میں بکس اور کریٹ وغیرہ کو اپنی اپنی جگہوں پر رکھنے کے لیے وہیں رہتے ہیں۔

ہمارے پاس چھ چھ ہینڈ گرنیڈ تھے۔ آٹومیٹک پستول تھے اور ایک ایک کمانڈو چاقو تھا۔ سٹین گنیں وغیرہ ہمیں نہیں مل سکی تھیں۔ ہینڈ گرنیڈ ہمارے سراغرساں مجاہد [redacted] اپنے ایک خاص آدمی کے ذریعے حاصل کیے تھے۔ میں اور کمانڈ [redacted] سویلین پٹرول میں تھے۔ ہم نے سراغرساں مجاہد کو واپس بھیج دیا اور خود ٹیلے کی ڈھلان پر جھاڑیوں کے پیچھے گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ ابھی فوجی گاڑیوں کے آنے میں کافی وقت تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہمیں کیا کچھ کرنا ہے۔ اگر تعویذ بم میں عین وقت پر کوئی فنی خرابی پیدا نہیں ہوتی اور فیروز شاہ دن کے ایک بجے اسے پٹرول ڈرموں کے درمیان رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر ڈیڑھ گھنٹے بعد یعنی ٹھیک ڈھائی بجے جھانسی میں ایک ایسا دھماکہ ہونے والا تھا جس کو جھانسی کے شہریوں نے کبھی نہیں سنا ہو گا۔

ٹیلے کی ڈھلان سے ہمیں سڑک ذرا نیچے صاف نظر آ رہی تھی۔ جہاں ہم گھات لگا کر بیٹھے تھے وہاں پیچھے تھوڑے فاصلے پر سڑک ٹیلے کے پہلو سے ہو کر سڑک کا موڑ گھومتی ہوئی سامنے آتی تھی۔ سڑک خالی پڑی تھی۔ جب سے ہم وہاں گھات لگائے بیٹھے تھے سڑک پر سے کوئی سویلین گاڑی، رکشا یا سکوٹر وغیرہ نہیں گزرا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جس روز یہاں سے فوجی گاڑیاں گزرنی ہوتی تھیں اس روز چند گھنٹوں کے لیے سڑک سویلین ٹریفک کے لیے بند کر دی جاتی تھی۔ ہم نے سڑک کے پہاڑی موڑ پر

اس لیے پوزیشن لی تھی کہ موڑ گھومنے کی وجہ سے فوجی گاڑیوں کی رفتار کم ہو جانا یقینی تھا۔ عین اس وقت ہمیں حملہ کرنا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہم اپنی گھڑیوں پر وقت دیکھ لیتے تھے۔ جب ہمیں محسوس ہوا کہ فیروزشاہ کے بیان کے مطابق اس وقت اسلحہ اور جدید ہتھیاروں سے لدی ہوئی فوجی گاڑیاں جھانسی آرمی سپلائی سینٹر سے روانہ ہوچکی ہوں گی تو خالد نے اپنے پلان کے مطابق مجھے اشارہ کیا۔ میں اپنی پوزیشن سے اٹھ کر دس گز پرے ہو کر ایک درخت کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔

ہم ایک دوسرے سے اب صرف اشاروں میں بات کرتے تھے۔ میں نے گھڑی پروقت دیکھا۔ ٹائم شیڈول کے مطابق فوجی گاڑیوں کو پانچ منٹ بعد پہاڑی کا موڑ کاٹ کر نمودار ہونا تھا۔ عین اس وقت مجھے کمانڈو خالد نے خاص اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ وہ بھی اپنی پوزیشن سے اٹھ کر پندرہ گز اوپر چلا گیا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ٹیلے پر جھاڑیاں بہت تھیں۔ ہم ان کی اوٹ میں اچھی طرح سے چھپ کر بیٹھے تھے۔ ہماری آنکھیں اپنی دائیں جانب اس جگہ لگی ہوئی تھیں جہاں پہاڑی سڑک موڑ مڑتی تھی۔ پانچ منٹ گزر گئے۔ پھر دس منٹ اور پندرہ منٹ بھی گزر گئے۔ فوجی گاڑیوں کا کنوائے نمودار ہوا۔ اس کے بعد دور سے بھاری ٹرک کے انجن کی آواز آئی۔ کمانڈو خالد نے مجھے سٹینڈ بائی کا سگنل ہاتھ کے اشارے سے دیا۔ میں پوری طرح سٹینڈ ٹو تھا۔ دو گرنیڈ میرے ہاتھ میں تھے۔ دو گرنیڈ میں نے اپنے پاس رکھے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس یہی معمولی دھماکہ خیز اسلحہ تھا۔ لیکن چونکہ گاڑیوں میں گولہ بارود لدا ہوا تھا اس لیے یقین تھا کہ یہ گرنیڈ ٹرکوں میں پھٹ کر ایٹم بم کا کام کریں گے اور ان کے ساتھ ہی ٹرکوں میں لدا ہوا گولہ بارود قیامت خیز دھماکوں سے پھٹ پڑے گا۔ میرے کان فوجی ٹرک کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ اب اس آواز میں دوسری فوجی گاڑیوں کی آواز بھی شامل ہوگئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں پہاڑی کے موڑ پر ایک فوجی جیپ نمودار ہوئی جس پر مشین گن لگی ہوئی تھی۔

اس کے پیچھے فوجی ٹرک آنے شروع ہوگئے۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ یہ کل چھ فوجی ٹرک تھے۔ ان میں سے آگے کے ایک ٹرک پر ترپال پڑی ہوئی تھی۔ پچھلے تین ٹرک ترپال سے ڈھکے ہوئے نہیں تھے۔ اگلے تین ٹرک کمانڈو خالد کا ٹارگٹ تھے۔ پچھلے تین ٹرکوں پر میں نے یکے بعد دیگرے ہینڈ گرنیڈ پھینکنے تھے۔ تین ٹرکوں کے درمیان ایک بکتر بند گاڑی بھی نظر آئی لیکن اس وقت ہمیں اس کی پروا نہیں تھی۔ ہماری نگاہیں صرف اپنے اپنے ٹارگٹ پر تھیں۔ مجھے اونچائی سے ٹھیک ٹارگٹ پر گرنیڈ پھینکنے کی باقاعدہ ٹریننگ ملی ہوئی تھی۔ کمانڈو خالد کے بارے میں مجھے تھوڑا سا شک تھا۔ ہر ٹرک کے درمیان تھوڑا فاصلہ رکھا گیا تھا۔ پہاڑی سڑک ہونے کی وجہ سے فوجی ٹرکوں کی رفتار ہلکی تھی۔ میں نے اگلے تین ٹرک گزر جانے دیے۔ ایک گرنیڈ میرے ایک ہاتھ میں تھا۔ دوسرا گرنیڈ میرے دوسرے ہاتھ میں تھا۔ جیسے ہی چوتھا ٹرک میری بالکل سیدھ میں نیچے سے گزرنے لگا تو میں نے بسم اللہ پڑھ کر گرنیڈ کا سیفٹی پن کھینچا اور اسے خاص انداز اور خاص زاویے سے ٹرک پر پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دوسرا گرنیڈ دوسرے ٹرک پر پھینک دیا مگر اس سے پہلے کمانڈو خالد اگلے تینوں ٹرکوں میں گرنیڈ پھینک چکا تھا۔ اچانک دو دھماکے ہوئے۔ پہاڑیاں اپنی جگہ سے اوپر نیچے ہوگئیں۔ پھر تین اور دھماکے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے باقی گرنیڈ بھی پیٹ کے بل لیٹ کر نیچے پھینک دئے۔ اب سڑک پر ایک بہت قیامت خیز دھماکہ ہوا' جیسے ایٹم بم پھٹ پڑا ہو۔ اس فوجی کنوائے کے کسی ایک ٹرک میں انتہائی دھماکہ خیز اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ اس دھماکے نے قیامت کا منظر پیش کر دیا۔ سڑک پر ہر طرف آگ کے شعلے اور دھواں ہی دھواں تھا۔ آدمیوں کی چیخ و پکار تھی اور ٹرکوں کا اسلحہ ایک دو دو سیکنڈ کے بعد پھٹ رہا تھا اور لوہے کے سرخ ٹکڑے ہمارے اوپر سے زناٹوں کے ساتھ نکل رہے تھے۔

ہم پلان کے مطابق ٹیلے کی ڈھلان پر ایک طرف کو آگے پیچھے دوڑ پڑے۔ خدا جانے اگلی جیپ یا پچھلی جیپ بچ گئی تھی۔ ڈھلان پر مشین گن کا فائر آنے لگا۔ ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے ٹیلے کے اوپر جانے کی بجائے دوسری جانب بھاگ رہے تھے۔

گولیاں ہمارے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اسلحہ اور گولہ بارود کے پھٹنے سے وہاں قیامت کا شور تھا جس میں مشین گن فائرنگ کے دھماکے الگ گونج رہے تھے لیکن ہم ان کی پہنچ سے دور نکل آئے تھے۔ پروگرام کے مطابق سراغرساں مجاہد موٹر سائیکل لیے ٹیلے کی دوسری جانب ایک جگہ درختوں میں کھڑا تھا۔ ہمیں دوڑتے ہوئے آتا دیکھ کر اس نے موٹر سائیکل سٹارٹ کر دیا۔ کمانڈو خالد نے موٹر سائیکل سنبھالا۔ میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا اور موٹر سائیکل اونچے نیچے راستوں پر اچھلتا ہوا ایک طرف دوڑنے لگا۔

پروگرام کے مطابق سراغرساں مجاہد کو وہاں سے اپنے طور پر ایک جگہ پہنچنا تھا۔ ہم موٹر سائیکل کو تیزی سے بھگائے لیے جا رہے تھے۔ کمانڈو خالد نے ایک جگہ موٹر سائیکل کھیت میں کھڑی کر دی۔ یہاں سے سراغرساں مجاہد نے آکر موٹر سائیکل لے جانی تھی۔ آگے شہر کے مضافات تھے۔ دھماکوں کی آواز برابر آ رہی تھی مگر اب چھوٹا اسلحہ پھٹ رہا تھا۔ ہم بڑے سکون کے ساتھ نارمل انداز میں چل رہے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھ کر خالد سے کہا۔

"سپلائی سینٹر والے دھماکے میں ابھی ایک گھنٹہ بیس منٹ رہتے ہیں۔"

اس نے آہستہ سے کہا۔

"اللہ کو جو منظور ہے وہی ہوگا۔"

ہم ایک لمبا چکر کاٹ کر ہاشم کے مکان میں آ گئے۔ ہاشم بیٹھک میں ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ فوجی کنوائے کی تباہی کے دھماکے اس نے بھی سنے تھے۔ کہنے لگا۔

"آپ لوگوں نے تو کمال کر دیا۔ آپ واقعی بڑے ماہر کمانڈو ہیں۔"

ہم نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اوپر والے چوبارے میں چلے آئے۔ ہاشم ہمارے پیچھے پیچھے آیا۔ ہمارے پاس دو دو ہینڈ گرنیڈ بچ گئے تھے۔ ہم نے چاروں گرنیڈ نکال کر ہاشم کو دے دیے۔ کمانڈو خالد نے اسے کہا۔

"انہیں کسی ایسی جگہ چھپا کر رکھ دو کہ ضرورت پڑنے پر ہمیں مل بھی جائیں اور اگر پولیس یہاں تلاشی بھی لے تو اسے نہ ملیں۔"

ہاشم نے چاروں گرنیڈ لے کر رومال میں باندھ کر رکھ لیے اور کہنے لگا۔
"پہاڑی والا دھماکہ ابھی تک نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے فیروز پہلوان نے اپنا کام کر دیا ہوگا۔"
خالد نے کہا۔
"اگر اس نے اپنی ڈیوٹی ٹھیک طرح سے پوری کر دی ہے تو پھر سوا گھنٹہ ہمیں دھماکے کا مزید انتظار کرنا پڑے گا۔"
ہاشم بولا۔
"میں آپ کے لیے چائے لاتا ہوں۔"
میں نے اسے کہا۔
"کہاں سے چائے لاؤ گے؟"
وہ بولا۔
"بازار کی نکڑ پر ایک ہوٹل ہے۔ وہاں سے لاؤں گا۔"
کمانڈو خالد نے کہا۔
"اس وقت تمہارا باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہے' ہمیں چائے نہیں چاہیے۔"
ہاشم کہنے لگا۔
"تو پھر میں یہیں چائے بناتا ہوں۔ چائے کی تو مجھے بھی سخت طلب محسوس ہو رہی ہے۔ آپ کو بھی چائے کی سخت ضرورت ہے۔"
مکان کی پہلی منزل پر باورچی خانہ تھا۔ ہاشم نیچے چلا گیا۔ ہم نے اپنی اپنی گھڑیوں پر نگاہ ڈالی۔ ہم پر ایک عجیب ہیجان خیز کیفیت طاری تھی۔ خالد مجھ سے کہنے لگا۔
"کرم داد! تمہارا کیا خیال ہے' فیروز شاہ نے بم بھی ٹھیک جگہ پر رکھ دیا ہوگا؟"
میں نے کہا۔
"آدمی اگرچہ اناڑی ہے مگر اسے کوئی خاص ٹیکنیکل کام بھی نہیں کرنا تھا۔ ایک تعویذ تھا جو اس نے اپنے بازو کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ بس اس تعویذ کو پیڑول کے

ڈرموں کے درمیان رکھ دینا ہے۔"

اچانک مجھے خیال آیا کہ ایک تو ہم نے گولہ بارود والے فوجی کنوائے کو اڑا دیا ہے۔ اب تھوڑی دیر بعد ایمونیشن سینٹر دھماکے سے اڑ گیا تو فوج ہماری تلاش میں سارے جھانسی شہر کو گھیرے میں لے لے گی اور عین ممکن ہے کہ ہم پکڑے جائیں۔ جب میں نے خالد کے آگے اس خدشے کا اظہار کیا تو وہ بھی تھوڑا سا پریشان ہوگیا۔ کہنے لگا۔

"یہ تو میں نے بھی سوچا تھا' بھوپال ہوتا تو اور بات تھی۔ یہ دوسرا شہر ہے' ہم اس شہر کے گلی محلوں سے بھی ناواقف ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے نکل کر شہر سے دور کسی جگہ چھپ جانا چاہیے۔"

کمانڈو خالد جلدی سے اٹھا۔ اس نے سیڑھیوں میں جا کر ہاشم کو آواز دی۔ وہ اوپر آگیا۔ خالد نے اسے ممکنہ خطرے سے آگاہ کیا اور کہا کہ اس طرح اس کے پکڑے جانے کا بھی ڈر ہے۔ ہاشم بولا۔

"مجھے اپنی فکر نہیں ہے لیکن آپ کا سلامت رہنا بہت ضروری ہے۔ اگر آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میرے ساتھ آئیے۔"

ہم نے اپنے آٹومیٹک پستول اور کمانڈو چاقو جیبوں میں سنبھالے اور ہاشم کے ساتھ اس کے مکان سے نکل آئے۔ اس کا مکان جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں شہر سے باہر ایک معمولی سی غریبانہ بستی میں تھا۔ وہاں سے ہم پیدال ہی گزر کر جب شہر سے باہر جانے والی سڑک پر آئے تو وہاں تین فوجی گاڑیاں بڑی تیزی سے گزر گئیں۔ کمانڈو خالد کہنے لگا۔

"کرم داد لگتا ہے تم نے عین وقت پر ہم سب کو بچا لیا ہے۔"

ہاشم نے کہا۔

"سڑک سے اتر کر کھیتوں میں آ جائیں۔"

ہم سڑک سے اتر کر کھیتوں میں سے گزرنے لگے۔ کھیتوں میں اونچی فصل کھڑی

تھی۔ ہاشم ہمیں لے کر فصل کی اوٹ میں ہوگیا۔ ہم اس کے پیچھے تیز تیز چل رہے تھے۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ابھی دھماکے ہونے میں کافی وقت تھا۔ کمانڈو خالد نے ہاشم سے کہا۔

"شہر سے باہر اگر ہم کسی جنگل میں چلے جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا؟ کسی مکان وغیرہ میں چھپنا ٹھیک نہیں رہے گا۔"

ہاشم بولا۔

"میں آپ کو جنگل میں ہی لیے جا رہا ہوں۔"

وسطی بھارت کے گھنے جنگلوں کا سلسلہ ایک طرح سے بمبئی کی طرف جاتے ہوئے گوالیار ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن مغربی کوہ ست پڑا کے جنگل جھانسی کے بعد زیادہ گھنے ہونا شروع ہو جاتے ہیں جو آگے بھوپال سے لے کر جنوب میں ہوشنگ آباد اور ناگ پور تک چلے گئے ہیں۔ ایک مقام پر مندر کی بڑی عمارت سڑک کنارے آ گئی۔ ہاشم نے وہاں سے موٹر رکشا لے لیا۔ ہم تینوں گھسڑ مسڑ کر ایک ہی رکشے میں بیٹھ گئے۔ رکشا ایک طرف کو روانہ ہوگیا۔ ہاشم اسے گائیڈ کر رہا تھا۔ جب ہم شہر سے کئی میل آگے بھوپال کی جانب آ گئے تو ہاشم نے ایک ندی کے پل پر پہنچ کر رکشے کو فارغ کر دیا۔ ہم ندی کا پل عبور کر کے دوسری طرف درختوں، جھاڑیوں کے درمیان چلنے لگے۔ آگے ایک جنگلاتی ٹیلہ تھا۔ ہاشم رک گیا۔ ٹیلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

"یہاں اوپر کسی زمانے میں ایک ہندو ٹھیکیدار نے اپنی والدہ کی سمادھ بنائی تھی اور ساتھ ہی اپنے رہنے کے لیے ایک کوٹھڑی بھی بنوائی تھی۔ وہ مہینے میں چار دن یہاں اپنی ماں کی سمادھ پر آ کر بھجن کیرتن کیا کرتا تھا۔ اس ہندو ٹھیکیدار کے مرنے کے بعد یہ سمادھ ویران ہوگئی۔ اب یہاں کئی برس سے کوئی نہیں آیا۔ آپ لوگ اس کوٹھڑی میں جتنی دیر چاہیں چھپ کر رہ سکتے ہیں۔ اس طرف کوئی نہیں آئے گا، کیا خیال ہے؟"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

ٹیلہ چھوٹا سا تھا۔ چڑھائی چڑھنے کے لیے ڈھلان پر ایک طرف اس مال دار ہندو نے پتھر کی سیڑھیاں بنائی ہوئی تھیں جو اب اونچی گھاس میں چھپ گئی تھیں۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر ٹیلے کے اوپر آ گئے۔ ٹیلے کے اوپر ایک تھوڑی سی کھلی جگہ تھی جہاں درمیان میں ایک سادھ تھی۔ سادھ اب آپ بھی جان گئے ہوں گے کہ کیا ہوتی ہے۔ بعض ہندو لوگ اپنے مردوں کی کچھ ہڈیاں یا راکھ چتا سے لا کر دفن کر دیتے ہیں۔ اس کے اوپر بہت چھوٹی سی بارہ دری یا سہ دری بنا دیتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی کیا گیا تھا۔ وہیں ایک طرف کھپریل کی ڈھلانی چھت والی ایک کوٹھڑی تھی۔ چھت ایک طرف سے دیوار کے ساتھ ہی نیچے بیٹھ گئی تھی۔ کوٹھڑی کا دروازہ بھی غائب تھا۔

یہاں سے مغرب کی جانب جھانسی شہر کی آبادی دور سے نظر آ رہی تھی۔ میں اور کمانڈو خالد اس آبادی کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کہنے لگا۔

"یہاں سے ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم نے ٹارگٹ مار لیا ہے یا ہم اپنے مشن میں ناکام ہو گئے ہیں۔"

ہاشم کہنے لگا۔

"میں شام کو آ کر آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ آپ کے لیے کھانا اور چائے بھی لیتا آؤں گا۔ یہ جگہ بڑی محفوظ ہے' اس طرف کوئی آتا جاتا بھی نہیں ہے۔"

ہاشم ہمیں وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم ایک ایک منٹ بڑی بے چینی اور تجسّس کے عالم میں گزار رہے تھے۔ کوٹھڑی کے باہر سادھ کے چھوٹے سے چبوترے پر بیٹھے شہر کی طرف مسلسل دیکھ رہے تھے۔ اگر فیروز شاہ نے پلان کے مطابق سب کام کیا تھا تو ابھی کچھ دیر میں وہاں زبردست دھماکہ ہونے والا تھا۔ ہم بار بار اپنی گھڑیوں کو دیکھتے۔ میں نے خالد سے پوچھا۔

"خالد بھائی فیروز شاہ نے یہی کہا تھا ناں کہ وہ ٹھیک ایک بجے بم گودام میں رکھ دے گا۔"

"کہا تو یہی تھا۔"

خالد نے شہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے کہا۔

"اس حساب سے تو دھماکہ ہونے میں پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔"

خالد نے اپنی گھڑی دیکھی اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ پھر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اس ہیجانی کیفیت سے نکل آنا چاہیے۔ ہم جو کچھ کر سکتے تھے ہم نے کر دیا ہے۔ اب آگے قسمت کا کھیل ہے۔ دھماکہ ہونا ہوگا تو ہو جائے گا' نہیں ہونا ہوگا تو ایک بار پھر کسی دوسری حکمت عملی پر عمل کر کے کوشش کریں گے۔"

اتنے میں مجھے ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ یہ جھٹکا خالد نے بھی محسوس کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایسی آواز آئی جیسے دور کہیں کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا ہو۔ ہماری نگاہیں بے اختیار شہر کی طرف اٹھ گئیں۔ دن کا وقت تھا۔ شہر کی طرف ایک جانب دھوئیں کے بادل اٹھ کر آسمان کی طرف جا رہے تھے۔ کمانڈو خالد نے بے اختیار مجھے گلے لگا لیا۔

"کرم داد! ہم نے ٹارگٹ مار لیا ہے۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔"

اور کمانڈو خالد وہیں خدا کے حضور سجدہ ریز ہوگیا۔ شہر کی طرف سے پرندوں کے غول کے غول شور مچاتے جنگل کی طرف اڑتے چلے آ رہے تھے۔ دھماکے کی لرزش سے جنگل میں درختوں کے پرندے بھی شور مچاتے اڑ گئے تھے۔

کمانڈو خالد اور میں مسلسل شہر کی آبادی کے اوپر دھوئیں کے بادلوں کو دیکھ رہے تھے۔ کسی کسی وقت سیاہ دھوئیں میں بجلی سی چمک جاتی تھی۔ یہ پھٹنے والے مختلف اسلحے کی چمک تھی۔ دھوئیں کے بادل شہر کے اوپر کافی بلندی پر جا کر معلق ہوگئے تھے۔

کمانڈو خالد نے دھوئیں کے بادلوں کو دیکھ کر کہا۔

"کرم داد! کہیں اس ایمونیشن سینٹر میں انڈین آرمی نے کوئی نیوکلائی مہترائیل وغیرہ تو نہیں رکھے تھے۔ دھوئیں کی یہ چھتری مجھے بالکل ایٹم بم کے دھماکے کے بعد کی

چھتری لگتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"نہیں خالد بھائی۔ ایسی بات ہوتی تو اس وقت سارا شہر آگ کی لپیٹ میں ہوتا اور ہم بھی یہاں زندہ سلامت نہ ہوتے۔ یہ انتہائی طاقتور بارود کے پھٹنے کی وجہ سے ہے۔"

میں نے خالد سے کہا۔

"تم اسی جگہ ٹھہرو۔ میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں کہ اس طرف کوئی فوجی یا پولیس کی گاڑی تو نہیں آئی۔"

میں ٹیلے سے اتر کر درختوں میں سے گزرتا اس جگہ آ گیا جہاں دور سے کھیت اور کھیتوں کے پار شہر کو جاتی سڑک نظر آ رہی تھی۔ سڑک پر ٹریفک چل رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے لوگوں میں کچھ افراتفری سی ہے۔ گاڑیوں کے ہارن کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ کھیت خالی پڑے تھے۔ ابھی تک اس طرف کوئی نہیں آیا تھا۔ فوج نے ضرور شہر کو محاصرے میں لے لیا ہوگا۔ میں واپس خالد کے پاس آ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات؟"

میں نے کہا۔

"ابھی تک تو سب ٹھیک ہے۔ لیکن ہمیں یہاں اب رکنا نہیں چاہیے۔ دیکھا جائے تو ہمارا مشن مکمل ہو گیا ہے۔ اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ فوج کے ایمونیشن سپلائی سینٹر میں اتنی زبردست تباہی ہوئی ہے۔ فوجی کنوائے اڑ گیا ہے۔ فوج اور پولیس آرام سے تو نہیں بیٹھے گی۔"

کمانڈو خالد نے ذرا سوچ کر کہا۔

"اگر ہم اس وقت نکل جاتے جس وقت ہاشم ہمیں لے کر اس طرف آیا تھا تو ٹھیک ہوتا۔ اب خطرہ ہے کہ جھانسی بھوپال روڈ پر ملٹری پولیس آ گئی ہوگی۔"

"تو پھر اس جگہ کب تک بیٹھے رہیں گے؟"

میرے سوال کے جواب میں کمانڈو خالد نے کہا۔

"ہمیں اب حالات کے معمول پر آنے تک اس جگہ رہنا چاہیے' دانشمندی کا یہی تقاضا ہے۔ اس وقت نکلنے میں پکڑے جانے کا خدشہ زیادہ ہے۔"

میں نے کہا۔

"خالد! میرا تجربہ کہتا ہے کہ ہمارا یہاں زیادہ دیر تک بیٹھے رہنا ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ میری رائے یہی ہے کہ ہم آج ہی رات کے اندھیرے میں یہاں سے بھوپال کی طرف چل پڑتے ہیں۔ ہم جھانسی بھوپال روڈ کو چھوڑ کر کھیتوں' میدانوں اور جنگل میں سے ہوتے ہوئے خطرے کے علاقے سے نکل سکتے ہیں۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"ہم بھٹک بھی سکتے ہیں۔ مجھے راستے کا علم نہیں ہے۔ یہی ہو سکتا ہے کہ ہاشم رات کو آئے تو اس سے حالات معلوم کیے جائیں' اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے۔"

سورج غروب ہونے لگا۔ ہم ٹیلے پر کوٹھڑی کے باہر ہی بیٹھے کبھی باتیں کرتے' کبھی ٹہلتے اور کبھی شہر کی آبادی کی طرف دیکھتے رہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو ہاشم کا انتظار شروع ہو گیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اندھیرا ہوتے ہی آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ جلدی آ جائے۔ وہ بھی ہمیں دھماکے کے رد عمل اور پولیس اور فوج کی سرگرمیوں کے بارے میں تازہ ترین صورت حال بتانے کو بے تاب ہو گا۔

ابھی سورج غروب ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہاشم آگیا۔ وہ ہمارے لیے کھانے پینے کا کچھ سامان بھی لایا تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ ٹیلے کا سپلائی سینٹر سارا اڑ گیا ہے۔ ٹیلے کے اردگرد کی پہاڑیوں میں بھی آگ لگی ہے۔ شہر میں پولیس اور فوج آ گئی ہے۔ سپلائی سینٹر کے علاقے میں فوج نے کرفیو لگا دیا ہے۔ جب ہم نے اسے بتایا کہ ہم رات کو وہاں سے بھوپال کی طرف نکل جانا چاہتے ہیں تو اس نے کہا۔

"بھوپال جھانسی روڈ پر تو فوج جگہ جگہ موجود ہے۔"

خالد نے کہا کہ ہم جنگل میں سے گزر کر جاسکتے ہیں۔ ہاشم سوچنے لگا۔

"جنگل رات کے وقت انسان کا جانی دشمن بن جاتا ہے اور پھر جنگل میں راستے کی سمت کو برقرار رکھنا ناممکن ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ دو ایک روز یہیں ٹھہرے رہیں۔ اس کے بعد بے شک نکل جائیں۔"

میں نے خالد کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا۔

"میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔"

"لیکن"۔ میں نے کہا۔ "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہم یہاں محفوظ ہوں گے۔ اور اس طرف ملٹری انٹیلی جینس کا دھیان نہیں جائے گا۔ انٹیلی جینس کے آدمی اس سارے علاقے میں پھیل گئے ہوں گے۔"

خالد نے کہا۔

"کرم داد! یہاں سے نکلنے میں بھی تو خطرہ ہے۔ یہاں سے نکلنا بھی تو اب محفوظ نہیں رہا۔"

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ ہم لوگ اسی ٹیلے والی کوٹھڑی میں ہی اس وقت تک روپوش رہیں گے جب تک کہ ہاشم ہمیں آکر حالات کے معمول پر آنے یا کشیدگی ذرا کم ہو جانے کی اطلاع نہیں دیتا۔ ہم نے تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ ہاشم کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ جب رات گہری ہونے لگی تو وہ دوسرے روز دوپہر کو آنے کا کہہ کر چلا گیا۔





دوسرے روز ہاشم نے آ کر بتایا کہ شہر میں فوج گشت کر رہی ہے۔

میں نے فیروز شاہ کے بارے میں پوچھا کہ اس پر تو کسی نے شک نہیں کیا۔ ہاشم نے بتایا کہ وہ بالکل خیریت سے ہے۔

"مگر آپ لوگ ابھی یہاں سے نہ ہی باہر نکلیں تو بہتر ہے کیونکہ یہ علاقہ بھی فوج کی نگرانی میں ہے۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"تمہارے خیال میں یہ ہنگامی حالات کب تک رہیں گے؟"

ہاشم بولا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ فوج جگہ جگہ موجود ہے۔ سپلائی سینٹر کے آس پاس کے علاقے میں کئی گرفتاریاں ہوئی ہیں۔"

ہاشم اپنے ساتھ کھانا بھی لایا تھا۔ خالد نے اسے خبردار کیا کہ وہ ہر طرح سے چوکس ہو کر آیا کرے۔ وہ کہنے لگا۔

"میں ایک خفیہ راستے سے یہاں آتا ہوں۔ پھر بھی اس بات کی تسلی کر لیتا ہوں کہ میرا پیچھا نہیں کیا جا رہا۔"

ہم اس ٹیلے پر چار دن تک روپوش رہے۔ پانچویں روز ہاشم آیا تو اس نے یہ خوش خبری سنائی کہ فوج شہر سے چلی گئی ہے۔ ہم نے بھوپال جانے کی تیاریاں شروع کر

دیں۔ حالات کے معمول پر آنے کے باوجود ہم جھانسی سٹیشن سے ریل پر سوار ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ فوج ضرور شہر سے چلی گئی تھی لیکن ہمیں یقین تھا کہ ملٹری اور سول پولیس انٹیلی جینس سٹیشن پر ضرور آنے جانے والوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہوگی۔

ہاشم نے تجویز پیش کی کہ ہم وہاں سے بھوپال کی طرف ایک سٹیشن تک چلے جائیں۔ وہاں پسنجر ٹرین ضرور ٹھہرتی ہے۔ ہم وہاں سے گاڑی میں سوار ہو جائیں۔ خالد کو بھی یہ تجویز پسند آئی۔ چنانچہ ہم اسی روز شام کے وقت ٹیلے سے اتر کر جھانسی سے بھوپال کی جانب جو پہلا سٹیشن آتا تھا اس طرف روانہ ہوگئے۔ ہاشم ہمیں گائیڈ کر رہا تھا۔ ہم نے اپنے اپنے پستول اسے دے دیئے تھے کہ وہ انہیں اپنے پاس سنبھال کر رکھے۔ صرف کمانڈو چاقو ہمارے پاس تھے۔ ہاشم ہمیں جنگل کے ایک راستے سے لے جا رہا تھا۔ جنگل سے نکلے تو ریلوے لائن آگئی۔ یہاں سے ہم ریلوے ٹریک کے ساتھ چل پڑے۔ دو تین گھنٹے تک چلتے رہے۔ پھر دور سے سٹیشن کی روشنی دکھائی دی۔ وہاں ہم نے ہاشم کے ذریعے بھوپال تک کے دو ریل کے ٹکٹ منگوائے۔ ہاشم کو رخصت کر دیا اور خود خالی پلیٹ فارم پر ایک طرف بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔

کافی دیر انتظار کرنے کے بعد ٹرین آئی۔ یہ پہلے سے طے تھا کہ ہم تھرڈ کلاس کے الگ الگ ڈبوں میں سوار ہوں گے۔ ٹرین مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ کچھ سو رہے تھے، کچھ جاگ رہے تھے۔ خالد ایک ڈبے میں اور میں دوسرے ڈبے میں جا کر بیٹھ گیا۔ ٹرین بھوپال کی طرف روانہ ہوگئی۔ میں سوچنے لگا کہ میرے سامنے سوائے اس کے اور کوئی مشن نہیں ہے کہ کشمیر کے جہاد میں شریک ہو کر مقبوضہ بھارتی فوج کے خلاف حریت پرست کشمیریوں کے شانہ بشانہ جنگ کروں۔ جمیلہ کی طرف سے میرا بوجھ ہلکا ہوچکا تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ وہ پاکستان میں اپنے ماں باپ کے گھر پہنچ چکی ہے۔ میں نے یہی سوچا کہ بھوپال پہنچ کر کمانڈو خالد سے مشورہ کروں گا کہ اگر اس علاقے میں کوئی مزید اہم مشن اس کے زیر غور نہیں تو میں مقبوضہ کشمیر چلا جاؤں۔ ٹرین رات کی

تاریکی میں رواں تھی۔ ڈبے کے اکثر مسافر سو رہے تھے۔ میں نے سر کھڑکی کے ساتھ لگا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں اونگھنے لگا۔ پھر مجھے نیند آ گئی اور میں بھی سو گیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک سویا رہوں گا کہ ایک دھچکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ ٹرین کسی سٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ کافی بڑا پلیٹ فارم تھا۔ لوگ اچھے کپڑوں میں نظر آ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ کوئی بڑا شہر ہے۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ بھوپال آ گیا ہے۔ مگر یہ بھوپال اور جھانسی کے درمیان کوئی اہم شہر تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔

میں ڈبے سے اتر کر خالد کے پاس گیا۔ وہ مجھ سے تین چار ڈبے چھوڑ کر تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بھوپال ابھی کتنی دور ہو گا۔ اس نے بتایا کہ دو اڑھائی گھنٹے میں ہم بھوپال پہنچ جائیں گے۔ پھر اس نے مجھے ہدایت کی کہ میں پلیٹ فارم پر اس طرح نہ پھروں اور اپنے ڈبے میں جا کر بیٹھوں۔ میں اپنے ڈبے کی طرف آ گیا۔ ٹرین کے ایک ڈبے میں ریلوے کا مال لادا جا رہا تھا۔ جس سے لگتا تھا کہ ٹرین وہاں کچھ دیر رکے گی۔ میرا چائے پینے کو دل چاہتا تھا مگر وہاں مجھے چائے کا کوئی سٹال نظر نہیں آ رہا تھا۔ سامنے سیکنڈ کلاس ریفرشمنٹ روم تھا۔ میں نے سوچا کہ وہاں چل کر جلدی سے ایک کپ چائے پیا جائے۔ میں نے احتیاطاً ایک قلی سے پوچھ لیا کہ گاڑی ابھی کتنی دیر تک رکے گی۔ اس نے بتایا کہ گاڑی ابھی کافی دیر ٹھہرے گی۔ میں ریفرشمنٹ روم میں آ کر ایک میز کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دے دیا۔ ابھی چائے نہیں آئی تھی کہ باہر سے ایک سوٹ بوٹ والا آدمی اندر آ گیا۔ جوان مگر دبلا آدمی تھا۔ وہ سیدھا میری میز کے پاس آ کر مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

میرے ذہن نے کہا کہ یہ انٹیلی جینس کا آدمی ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن میں بظاہر بے نیازی سے بیٹھا رہا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بھائی صاحب۔ آپ اس طرح مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں۔"

وہ میری ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

میرے منہ سے سے جھانسی نکل گیا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی ریفرشمنٹ روم کے دروازے میں سے دو پولیس والے داخل ہوئے اور سیدھے میری میز کی طرف آ کر ایک میری دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے حواس برقرار رکھے اور سختی سے پوچھا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ سوٹ بوٹ والے آدمی نے ایک سپاہی سے کہا۔

"اس کی تلاشی لو۔"

میرے پاس کمانڈو چاقو موجود تھا۔ میں اسے کہیں پھینک نہیں سکتا تھا۔ میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں کو میری تلاشی لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں ایک ذمے دار بھارتی شہری ہوں۔ میں تمہارے خلاف رپورٹ کروں گا۔"

سوٹ بوٹ والے آدمی پر میری اس دھمکی کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ پولیس کے سپاہی پر بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے میری تلاشی لینی شروع کر دی۔ کمانڈو چاقو میری جیب سے نکل آیا۔ اسے دیکھ کر سوٹ بوٹ والے آدمی کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے سپاہیوں سے کہا۔

"تم سامنے والی میز پر جا کر بیٹھ جاؤ۔"

دونوں سپاہی ایک میز چھوڑ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہاں کچھ دوسرے مسافر بھی چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ سوٹ بوٹ والے آدمی نے کمانڈو چاقو کو کھولا۔ پھر بند کیا اور میز پر رکھتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔

"یہ کمانڈو نائف ہے اور تم کشمیری یا پاکستانی کمانڈو ہے۔ اس میں اب شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ تم انکار نہیں کر سکتے۔ تم اپنے کمانڈو ہونے کا ثبوت اپنی جیب میں لے کر پھر رہے ہو۔ میں نے سپاہیوں کو اس لیے پرے بٹھا دیا ہے کہ میں تم سے

ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مجھے اپنے ساتھی کمانڈوز کے بارے میں بتا دو کہ وہ کہاں کہاں روپوش ہیں تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

سی آئی ڈی والوں کے پاس یہی ایک ہتھکنڈہ ہوتا ہے۔ وہ ہر کمانڈو سے اس قسم کی بات ضرور کرتے ہیں۔ میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

"میرا کسی کمانڈو پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں بھوپال میں ہوزری کا کاروبار کرتا ہوں۔ ایک شریف شہری ہوں۔ بھوپال کا ڈپٹی مئیر مجھے جانتا ہے۔ آپ اسے بے شک فون کر کے معلوم کر لیں۔

یہ میں نے یونہی بلف چال چلی تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"اس کمانڈو چاقو کا ہوزری کے کاروبار سے کیا تعلق ہے؟"

میں نے کہا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں کہ یہ کہاں سے آگیا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری پولیس کے کسی آدمی نے مجھے پھنسانے کے لیے میری جیب میں ڈال دیا ہو۔"

اس نے کہا۔

"میں تمہیں تھانے لے جا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہاں تم اپنے آپ سب کچھ بتا دو گے۔"

اس دوران ایک عجیب بات ہوگئی تھی۔ سی آئی ڈی والے اس آدمی سے باتیں کرتے ہوئے مجھے ہلکے ہلکے دو تین جھٹکے لگے تھے جس سے میں سمجھ گیا تھا کہ میری کایا پلٹ ہونے والی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی کایا پلٹ کی بے حد ضرورت تھی۔ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ یا خدا کسی طرح میں جلدی سے سانپ کا روپ اختیار کر لوں۔

میرے بچنے کی صرف یہی ایک صورت تھی۔ جب اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے تھانے لے جا رہا ہے تو مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔ میں سمجھ گیا کہ میں اپنا روپ بدلنے والا ہوں۔ اس جگہ میرا انسان سے سانپ کی شکل بدلنا خطرناک تھا۔ وہاں مجھے فوراً ہلاک کر دیا جاتا۔ میں نے سی آئی ڈی والے سے کہا۔

"میں باتھ روم جانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد آپ مجھے بے شک پولیس سٹیشن لے چلیں۔"

اس نے دو سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ دونوں سپاہی مجھے لے کر باتھ روم کی طرف چلے۔ باتھ روم سامنے ہی تھا۔ ایک سپاہی باتھ رُوم کے باہر کھڑا ہوگیا۔ دوسرا گن لے کر میرے ساتھ اندر آگیا۔ مجھے برابر جھٹکے لگ رہے تھے۔ میں نے سپاہی سے کہا۔

"تم بھی باہر چلے جاؤ۔ میں یہاں سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہوں۔"

وہ بولا۔

"میں اسی جگہ رہوں گا۔"

مجھے صرف یہ خطرہ تھا کہ اس کے پاس رائفل تھی۔ اگر میں وہاں سانپ کے روپ میں ظاہر ہوگیا اور ایک آدمی کو سانپ میں تبدیل ہوتے دیکھ کر اگر اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا تو مجھ پر ضرور فائرنگ شروع کر دے گا اور بند باتھ روم میں میرے بچنے کے امکانات بہت کم تھے۔ مگر وہ باہر نہ گیا اور میرا جسم ہلکا ہونا شروع ہوگیا۔ پھر اچانک میں جیسے اپنے جسم سے الگ ہوگیا۔

جس جگہ میں کھڑا تھا وہاں میری بجائے ایک سانپ فرش پر بیٹھا تھا۔ پہلے تو سپاہی سمجھا کہ میں غائب ہوگیا ہوں۔ جب اس نے وہاں ایک سانپ کو دیکھا تو ڈر کر الٹے پاؤں دروازے کی طرف دو چار قدم ہٹا اور وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس نے رائفل سیدھی کر لی اور مجھ پر فائر کر دیا۔ لیکن اتنی دیر میں میں اس کے پیچھے آ چکا تھا۔ میں نے فوراً اچھل کر اس کی ران پر ڈس دیا اور اس کی وردی کے ساتھ ہی چمٹا رہا۔ سپاہی نے گھبرا کر چیخ ماری اور گر پڑا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی مجھے باتھ روم کی طرف لوگوں کے دوڑنے کی آواز آئی تھی۔ سپاہی گرا تو میں چھلانگ لگا کر کموڈ کے پیچھے چھپ گیا۔ باتھ روم کا دروازہ دھڑک سے کھل گیا۔

"کیا ہوا بھولا رام؟"

یہ وہی سوٹ بوٹ والا آدمی تھا۔ اس کے ساتھ دوسرا سپاہی بھی تھا۔ انہوں نے

سپاہی کو فرش پر بے حس پڑے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ ان کا ملزم بھی غائب ہے تو وہ ششدر سے ہو کر رہ گئے۔ سوٹ بوٹ والے نے چیخ کر کہا۔

"کیا ہوا؟ اس کو باہر لے چلو' جلدی کرو۔ کمانڈو کہاں غائب ہو گیا۔ باہر دیکھو۔"

اور وہ لوگ افراتفری کے عالم میں سپاہی کی لاش کو گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ جب باتھ روم خالی رہ گیا تو میں نے کموڈ کے پیچھے سے نکل کر ماحول کا جائزہ لیا۔ باتھ روم کی دیوار پر صرف ایک ہی روشندان تھا جس کا شیشے والا چوکھٹا بند تھا۔ میں تیزی سے دیوار پر رینگتا ہوا روشندان تک گیا۔ دیکھا کہ وہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ چوکھٹا مضبوطی سے بند تھا۔ میں نیچے اتر آیا۔ باتھ روم کے باہر شور سا مچا ہوا تھا۔ دروازہ کھلا اور تین چار سپاہی اندر آ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ میں واپس کموڈ کے پیچھے جا کر چھپ گیا تھا۔ جس سپاہی کو میں نے ڈسا تھا اس کو اتنی مہلت ہی نہیں ملی تھی کہ وہ کسی کو یہ بتا سکتا کہ مجھے سانپ نے کاٹا ہے اور سانپ ابھی تک باتھ روم میں ہی ہے۔ چنانچہ سپاہی سانپ کو نہیں بلکہ کمانڈو کو یعنی مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔

ان میں ایک پولیس افسر ہوگا۔ اس کی آواز آئی۔

"ایشر سنگھ ہیڈ کوارٹر فوراً" اطلاع کرو۔ دو آدمی یہاں باہر پہرے پر رہو۔ بلرام! تم میرے ساتھ آؤ۔ جلدی۔"

باتھ روم کے باہر پہرہ لگ گیا۔ سب لوگ باہر چلے گئے تھے۔ ایک طرح سے میں اندر بند ہو گیا تھا۔ میں نے بند دروازے کے نیچے سے باہر دیکھا۔ دو سپاہی رائفلیں لیے کھڑے تھے۔ ریفرشمنٹ روم میں بھی کافی لوگ بیٹھے تھے۔ ٹرین اس دوران وہاں سے بھوپال کی طرف روانہ ہو گئی ہوئی تھی۔ مجھے کمانڈو خالد کا خیال آ رہا تھا کہ جب بھوپال پہنچنے کے بعد میں اسے کہیں نظر نہیں آؤں گا تو وہ کیا سوچے گا کہ میں کہاں غائب ہو گیا ہوں۔ لیکن اس وقت مجھے اپنی جان کی فکر پڑی تھی۔ مجھے سب سے پہلے اپنی جان بچانی تھی۔ باتھ روم کے نیچے اتنی جگہ تھی کہ میں باہر نکل سکتا تھا لیکن ریفرشمنٹ روم میں ایک تو روشنی تھی' دوسرے وہاں کافی لوگ بیٹھے تھے اور پولیس کے سپاہی بھی

رائفلیں لیے کھڑے تھے۔ میں باہر نکل کر اگر تیز سے تیز بھی بھاگوں تو اتنی تیز نہیں رینگ سکتا تھا۔ ریفرشمنٹ روم کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے پہلے میرا ہلاک ہو جانا یقینی تھا۔ فرض کر لیا جائے کہ میں کسی طرح ریفرشمنٹ روم سے نکل کر پلیٹ فارم پر پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہوں تب بھی لوگوں نے مجھے زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔ وہاں تو سانپ سانپ کا شور مچ جاتا اور پلیٹ فارم پر کافی روشنی تھی۔ کوئی جھاڑی بھی نہیں تھی کہ میں جہاں چھپ کر جان بچا سکتا۔ میں نے ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ ابھی مجھے باتھ روم میں ہی چھپے رہنا چاہیے۔ جب پولیس واپس چلی جائے اور ریفرشمنٹ روم بھی خالی ہو جائے تو میں باہر نکلنے کی کوشش کروں گا۔

باتھ روم میں مجھے کموڈ کے پیچھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چھپنے کے لیے یہ بڑی محفوظ جگہ تھی۔ چنانچہ میں وہیں دبک کر بیٹھا رہا۔ کچھ وقت گزر گیا۔ میں کموڈ کے پیچھے چھپ کر بیٹھا رہا۔ پھر دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ کوئی دروازے کی چٹخنی لگا رہا تھا۔ میں نے سر ذرا سا آگے کر کے دیکھا کہ ایک آدمی اندر آیا ہے جس کے ہاتھ میں چمڑے کا بیگ ہے۔ بھاری بھرکم ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ صحت بڑی اچھی تھی' سلک کی قمیض اور سفید دھوتی میں ملبوس تھا۔ انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ وہ پان بھی کھا رہا تھا۔ اس نے بیگ منہ ہاتھ دھونے والے سنک کے قریب فرش پر رکھ دیا۔ کموڈ میں پان کی پیک تھوکی اور جیب سے چھوٹی سی کنگھی نکال کر آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں پھیرنے لگا۔ وہ کوئی فلمی گیت بھی گنگنا رہا تھا اور تھوڑا تھوڑا آگے پیچھے ہل بھی رہا تھا جیسے ہلکے ہلکے سرور میں ہو۔ میں کموڈ کے پیچھے سے اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر میں اسی آدمی کے بیگ کے ساتھ نیچے چمٹ جاؤں تو اس کے ساتھ باتھ روم کی قید سے نکل سکتا ہوں۔

اتنے میں اس آدمی نے بیگ کو کھول کر اس میں سے شراب کی بوتل نکالی اور منہ کے ساتھ لگا کر ہلکے ہلکے گھونٹ بھرنے لگا۔ بیگ کا منہ کھلا دیکھ کر فوراً" ایک ترکیب میرے ذہن میں آگئی۔ میں آہستہ سے رینگتا ہوا چمڑے کے بیگ کے قریب آگیا۔ وہ

آدمی بڑے مزے سے شراب کی چسکیاں لگا رہا تھا اور گنگنا بھی رہا تھا اور ساتھ سگریٹ کے کش بھی لگاتا جا رہا تھا۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں اس کے پاؤں میں بیگ کے پاس تھا۔ میں بغیر کچھ سوچے سمجھے جلدی سے بیگ پر چڑھ گیا اور پھر بیگ کے اندر گھس گیا۔ بیگ میں طرح طرح کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ میں ان کے نیچے گھس کر چھپ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس آدمی نے بوتل بند کی اور اسے اپنے چمڑے کے بیگ میں ڈال کر بیگ کا زپ کھینچ کر اسے بند کر دیا۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ بیگ کو زپ لگی ہوئی ہے۔ اب میں اس شخص کی صوابدید پر تھا کہ جب وہ دوبارہ زپ کو کھولے گا تو میں باہر نکل سکتا تھا۔ اگر بیگ کو زپ نہ لگی ہوتی تو جب وہ باتھ روم سے باہر جاتا میں کسی بھی جگہ مناسب موقع دیکھ کر بیگ میں سے رینگ کر باہر چھلانگ لگا سکتا تھا۔ مگر زپ کے بند ہو جانے سے میں باتھ روم کی قید سے نکل کر چمڑے کے بیگ کی حوالات میں پھنس گیا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ اس آدمی نے بیگ اٹھا لیا ہے اور باتھ روم سے باہر نکل آیا ہے۔ باہر آ کر اس نے بیگ کو دوبارہ ایک جگہ پر رکھ دیا۔ مجھے ریفرشمنٹ روم میں لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ باہر پلیٹ فارم پر سے بھی آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی انجن شنٹ کرتا اور سیٹی بجاتا تیزی سے پلیٹ فارم کی لائن پر سے گزر گیا۔ اس کے بعد بھاری بوٹوں کی آواز آئی جو تیز تیز میرے قریب سے گزر گئی۔ لگتا تھا پولیس کے سپاہی ہیں۔ وہ شاید باتھ روم میں گئے تھے۔ واپس تیز تیز قدموں سے میرے قریب سے ہو کر باہر چلے گئے' میں بیگ کے اندر مختلف چیزوں کے درمیان سمٹ کر بیٹھا رہا۔ سوچ رہا تھا کہ پولیس سے تو بچ گیا ہوں اب خدا جانے قسمت مجھے کہاں لے جا رہی ہے۔ جس آدمی کا بیگ تھا اس کے فلمی گیت گنگنانے کی آواز مجھے آ رہی تھی۔ اخبار کا صفحہ پلٹنے کی آواز بھی آئی۔ شاید وہ اخبار بھی پڑھ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر شور ہونے لگا۔ پھر ایک گاڑی آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس آدمی نے بیگ کو اٹھا لیا اور باہر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ کچھ دیر وہ بیگ اٹھائے ادھر ادھر چلتا رہا۔ جیسے ڈبے میں بیٹھنے کے

لیے جگہ ڈھونڈ رہا ہو۔ آخر ایک جگہ اس نے بیگ رکھ دیا۔ شاید وہ ڈبے میں بیٹھ گیا تھا۔ دوسرے مسافروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ٹرین دیر تک کھڑی رہی۔ پھر انجن نے وسل بجایا۔ گارڈ نے سیٹی دی اور چھک چھک کرتی گاڑی چل پڑی۔ یہ گاڑی شمال کی طرف جا رہی تھی یا جنوب کی طرف؟ مغرب کی طرف جا رہی تھی یا مشرق کی طرف؟ جھانسی کی طرف جا رہی تھی یا بھوپال کی طرف؟ مجھے اس کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ میں چمڑے کے بیگ میں بند تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ ٹرین سٹیشن سے باہر نکل گئی اور اب یارڈ کی مختلف پٹڑیوں پر سے گڑگڑاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اس کے بعد ٹرین کی رفتار تیز ہوگئی۔ میں زمان و مکان' وقت اور خلا کے درمیان معلق ہوگیا تھا۔ کچھ دیر تک مجھے احساس رہا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے اس کے بعد سارے اندازے اور قیاس ختم ہوگئے۔ ٹرین کی آواز تھی اور اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کبھی ٹرین کے پہیوں کا شور دیر تک سنائی دیتا۔ کبھی ٹرین کسی جگہ رک جاتی۔ اس کے بعد پھر چل پڑتی۔ خدا جانے رات تھی کہ دن تھا' شام تھی کہ دوپہر تھی۔ ٹرین چلتی رہی' رکتی رہی اور پھر چلتی رہی۔ بیگ کا مالک خدا جانے بھارت کے کس دور دراز شہر کی طرف جا رہا تھا کہ اس نے ابھی تک وہ بیگ نہیں اٹھایا تھا جس میں میں بند تھا۔ یہاں تک کہ اس نے شراب کی چسکی لگانے کے لیے بھی بیگ کھول کر بوتل نہیں نکالی تھی۔ آخر خدا نے مجھے ٹرین کے مسلسل شور سے نجات دلانے کی میری دعا قبول فرمالی۔ ایک جگہ ٹرین رکی تو میرا بیگ اس آدمی نے اٹھالیا اور ڈبے سے اتر پڑا۔

مجھے اس کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ شاید سٹیشن سے باہر آ گیا تھا۔ یہاں مختلف کاروں' رکشوں اور تانگوں اور لوگوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ کسی نے قریب سے کہا۔

"چونی رام جی! ادھر آ جاؤ۔ میں گاڑی لے آیا ہوں۔"

بیگ کے مالک کا نام چونی رام تھا۔ اس نے کہا۔

"ابے بھوانی کہو کیا حال ہے بے تیرا؟"

"ٹھیک ہوں مالک۔"

پھر موٹر گاڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور بیگ اندر سیٹ پر رکھ دیا گیا۔ دروازہ بند ہوگیا۔ بیگ کا مالک چونی رام مجھے محسوس ہوا میرے پاس ہی سیٹ پر بیٹھ گیا ہے۔ موٹر سٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ میں عجیب تجسّس میں پھنس چکا تھا۔ نہ یہ پتہ تھا کہ یہ کون لوگ ہیں' نہ یہ پتہ تھا کہ یہ کون سا شہر ہے' نہ یہ معلوم تھا کہ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔

میں چونکہ سانپ کے روپ میں تھا اس لیے قدرتی طور پر میری سونگھنے اور سننے کی حس بہت تیز ہوگئی تھی۔ آپ کو تو معلوم ہوگیا ہوگا کہ سانپ بڑی دور سے آواز بھی سن لیتا ہے اور بو بھی سونگھ لیتا ہے۔ چمڑے کے بیگ کے اندر شراب' ڈیٹول' پرفیوم' پان کے خوشبودار تمباکو اور کپڑوں میں رکھے ہوئے فنائل کی گولیوں' ٹوتھ پیسٹ اور شیونگ کریم کی بوئیں ملی جلی تھیں۔ مگر ان میں اب ایک اور خوشبو بھی شامل ہوگئی تھی۔ اس خوشبو نے مجھے چونکا دیا تھا۔ یہ خوشبو ناگن درگا کی تھی۔ پہلے تو میں نے یہی خیال کیا کہ یہ میرا وہم ہے۔ بھلا ناگن درگا یہاں کہاں ہوگی۔ مگر جب یہ خوشبو جو ہلکی ہلکی تھی مسلسل بڑھتی چلی گئی تو مجھے یقین ہوگیا یہ ناگن درگا ہی کی خوشبو ہے۔ یہ ناگن درگا سانپ کی خوشبو نہیں تھی بلکہ ناگن درگا کے عورت کے جسم کی خوشبو تھی۔

مجھے یاد آگیا کہ جب میں بھوپال کے بھیروں کے مندر میں ناگن درگا کی کوٹھڑی میں اس سے ملنے گیا تھا تو کوٹھڑی خالی تھی مگر کوٹھڑی کے ایک کونے میں سے سانپ کی بڑی تیز بو آ رہی تھی۔ حالانکہ میں ناگن درگا کو عورت کی شکل میں وہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ ٹرین کے مسلسل سفر سے صاف ظاہر تھا کہ میں جھانسی اور بھوپال کے شمال یا ...ب یا مشرق یا مغرب کی سمت کسی دور دراز شہر میں آگیا ہوں۔ حیران تھا کہ ناگن ...رگا یہاں کیسے پہنچ گئی ہے۔ ضرور اسے کوئی بھیروں مندر سے اغوا کر کے لے آیا

ہے۔ کیونکہ وہ مجھ سے ملے بغیر وہاں سے نہیں جا سکتی تھی۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ یہ بھیروں دیوتا کی بددعا کا اثر ہوگا۔ ناگن درگا پر ضرور کوئی بھاری مشکل آن پڑی ہے۔

اب جیسے ناگن درگا کے جسم کی خوشبو تیز ہو رہی تھی۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ میں اس کے قریب سے قریب تر ہو رہا ہوں۔ موٹر کار جن سڑکوں پر سے گزر رہی تھی ان پر ٹریفک کا کافی شور تھا۔ آہستہ آہستہ گاڑی ایسے علاقے میں داخل ہوگئی جہاں ٹریفک کا شور بالکل ختم ہوگیا۔ صرف اس گاڑی کے انجن کی آواز آ رہی تھی جس میں چونی رام سوار تھا اور اس کا چمڑے کا بیگ تھا اور جس بیگ میں میں بند تھا۔ دیر کے بعد کوئی گاڑی قریب سے گزر جاتی۔ اب ایسا لگا کہ موٹر کار پکی سڑک سے اتر کر کسی خراب سڑک پر چلنے لگی ہے۔ گاڑی بار بار تھوڑا تھوڑا اچھل رہی تھی۔ ڈرائیور بڑی دیر بعد بولا۔

"چونی رام جی! کچھ کام بنا؟"

چونی رام یعنی میرے بیگ کے مالک نے نیند بھری آواز میں کہا۔

"مجھے سونے دے بھوانی۔"

معلوم ہوا کہ چونی رام سو رہا تھا۔ بھوانی یعنی ڈرائیور نے کہا۔

"مہاراج! اپنا راج بھون آ رہا ہے۔"

چونی رام نے جھنجھلا کر کہا۔

"ابے آتا ہے تو آنے دے۔"

اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ گاڑی کچے ناہموار رستے پر سے اچھل اچھل کر گزرتی ایک طرف کو گھوم گئی۔ وہ ایک بار اور گھومی اور اس کا انجن بند ہوگیا۔ چونی رام نے میرے والا بیگ اٹھاتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔

"چندر رانی سے کہہ دینا میں واپس آگیا ہوں۔"

"کہہ دوں گا۔"

یہاں ناگن درگا کی خوشبو بڑی تیز ہوگئی تھی۔ میرا بیگ اٹھا لیا گیا۔ چونی رام یعنی

بیگ کا مالک چل رہا تھا۔ پھر جیسے وہ تین چار سیڑھیاں چڑھ کر کسی برآمدے میں داخل ہوگیا۔ اس نے گھنٹی کا بٹن دبا دیا تھا۔ مجھے کسی کمرے کے اندر سے گھنٹی کی مدھم آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ چونی رام کسی کمرے میں داخل ہوگیا۔ ناگن درگا کے انسانی یعنی عورت کے جسم کی خوشبو کے تیز جھونکے محسوس ہونے لگے تھے۔ کسی عورت نے جے رام جی کی کہا۔ چونی رام نے پوچھا۔

"رانی جی کہاں ہیں؟"

عورت کی آواز آئی۔

"اپنے کمرے میں ہیں۔ ابھی انہیں چائے دے کر آ رہی ہوں۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ یا تو یہ صبح کا وقت ہے اور یہاں ناشتہ کیا جا رہا ہے یا شام کا وقت ہے اور یہ رانی جی جو کوئی بھی ہے شام کی چائے پی رہی ہے۔ مگر میں اس بات پر سخت حیران تھا کہ ناگن درگا یہاں کہاں سے آ گئی ہے۔ پھر خیال آتا کہ ہو سکتا ہے یہ ناگن درگا کے کوئی رشتے دار ہوں۔ وہ مجھ سے مایوس ہو کر بھیروں کے مندر سے یہاں آ گئی ہو۔ مگر وہ مجھ سے کیسے مایوس ہو سکتی تھی۔ وہ تو میرے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ اس نے تو مجھے جاتے وقت کہا تھا کہ کرم داد جلدی واپس آ جانا میں تمہارا انتظار کروں گی۔

عجیب معمہ بن گیا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ چونی رام کمرے میں سے گزر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی بہت بڑا بنگلہ ہے۔ پھر وہ لکڑی کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیوں کے کسی وقت چرچرانے کی آواز آ رہی تھی۔ سیڑھیاں ختم ہوئیں تو مجھے محسوس ہوا کہ چونی رام کسی گیلری میں سے گزر رہا ہے۔ اس کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ گیلری کے فرش پر قالین بچھے ہوئے ہیں۔ وہ ایک جگہ رک گیا۔ یہاں اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دے کر کہا۔

"رانی جی! میں ہوں چونی رام۔"

کمرے کے اندر سے تان پورے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ یہ آواز رک گئی۔

کسی نے دروازہ کھولا اور کہا۔

"رانی جی چائے کی میز پر بیٹھی ہیں' آ جائیں۔"

چونی رام کمرے میں داخل ہوگیا۔ فضا ناگن درگا کے جسم کی خوشبو سے لبریز تھی۔ جس بیگ میں میں بند تھا ایک طرف رکھ دیا گیا۔ پھر ایک عورت کی بڑی دلکش مگر باوقار آواز سنائی دی۔

"چونی رام! تم نے اتنی دیر کیوں لگائی؟"

چونی رام نے کہا۔

"رانی جی! موہن بابو تھائی لینڈ گیا ہوا تھا۔ مجھے اس کا انتظار کرنا پڑا۔ وہ آیا تو مال اس کے حوالے کیا۔"

"چیک لائے ہو؟" رانی جی نے پوچھا۔

چونی رام نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"پوری رقم دی ہے ناں اس حرامی نے؟"

چونی رام نے کہا۔

"جی ہاں رانی جی! اس بار میں پوری رقم لایا ہوں۔ یہ لیجئے' ڈھائی لاکھ روپے کا چیک ہے۔"

"ہوں۔" رانی جی کی آواز سنائی دی۔ "تم بڑے وقت پر آئے ہو۔ دھام پور کا جاگیردار کل نئی لڑکی کا مجرا سننے آ رہا ہے۔ اس کو تھوڑا تیار کر دو۔"

چونی رام بولا۔

"مگر رانی جی اس نئی لڑکی کو تو گانا بالکل ہی نہیں آتا۔ بڑی مشکل سے اسے دو چار دنوں میں مجرے کے دو تین توڑے سکھائے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس کا گانا رہنے دیں۔ جاگیردار کو دو چار مجرے کے توڑے دکھا دیں۔ یہ میں پکے کرا دوں گا۔ جاگیردار اسی میں خوش ہو جائے گا۔ ویسے لڑکی جوان ہے' خوبصورت ہے۔ جاگیردار کو

اس کے گانے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"
رانی جی کی آواز آئی۔
"مگر میں اتنی جلدی یہ نئی لڑکی اس حرامی جاگیردار کے حوالے نہیں کرنا چاہتی۔
میں تو ایک رات کے لیے بھی لڑکی اس کے کمرے میں نہیں بھیجوں گی۔"
چونی رام نے کہا۔
"رانی جی! اگر وہ موٹی رقم دیتا ہے تو ایک رات میں لڑکی کا کیا بگڑ جائے گا؟"
رانی جی نے کہا۔
"لڑکی کا تو کچھ نہیں جائے گا مگر ہمارا بھرم جاتا رہے گا۔ رانی بائی نے کبھی پہلی بار کوئی لڑکی اتنی جلدی کسی جاگیردار یا سیٹھ کے حوالے نہیں کی۔ بھگوان نے بیٹھے بٹھائے بڑی خوش شکل جوان لڑکی بھیج دی ہے۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات تو یہ ہے کہ جس روز تم لوگ اسے بھیروں جی کے مندر سے اٹھا کر لائے ہو اس کے دوسرے روز ہی وہ ہم سے اس طرح راضی خوش ہو گئی جیسے پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی کہ کوئی اسے اٹھا کر یہاں لے آئے۔"
چونی رام کہنے لگا۔
"رانی بائی! بات یہ ہے کہ لڑکی کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ ویسے بھی لڑکی آزاد طبیعت کی ہے اور گانے بجانے اور ڈانس مجرے کو بہت پسند کرتی ہے۔"
رانی بائی بولی۔
"میں تو اس لڑکی کو اپنی رانی بنا کر رکھوں گی۔ کسی کے آگے ہرگز نہیں بیچوں گی چاہے مجھے کوئی دس لاکھ روپے ہی کیوں نہ دے۔ یہاں اسے رکھ کر دولت کماؤں گی۔
بس تم اسے ڈھنگ کا مجرا اور ٹھمری انگ کی دو چار چیزیں پکی کرا دو۔"
"وہ میں کرا دوں گا۔" چونی رام نے کہا۔
تان پورے کی آواز آنے لگی پھر رک گئی۔ رانی بائی نے کہا۔
"چونی رام! اسے لے جا کر سر کر دو' بے سرا ہو رہا ہے اور سنو! لڑکی اپنے کمرے

میں ہی ہے۔ اس کے پاس جاؤ اور ابھی سے ٹھمری کی استھائی سکھانی شروع کر دو۔ کل دھام پور کا جاگیردار آ رہا ہے۔ مجرا تو وہ تھوڑا بہت کر لے گی۔ ایک آدھ استھائی ٹھمری کی بھی سکھا دو۔ لڑکی کو خود بھی یہ سب کچھ سیکھنے کا بڑا شوق ہے۔"

چونی رام نے کہا۔

"رانی بائی! آپ اسے بار بار لڑکی کہہ کر کیوں بلاتی ہیں۔ آپ نے خود ہی تو اس کا نام پیار سے چندا رکھا ہے۔ چندا کہہ کر بلائیں۔"

رانی بائی کی آواز آئی۔

"چندا تو اس نے خود ہی اپنی پسند کا نام رکھا تھا۔ میں اسے چندا ہی کہوں گی' اب تم اس کے پاس جاؤ اور تھوڑا بہت ریاض کراؤ۔"

"جاتا ہوں۔"

جس بیگ میں میں بند تھا جب اسے اٹھایا گیا تو میں سمجھ گیا کہ چونی رام ناگن درگا کے کمرے میں جا رہا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو باتیں ہوئی تھیں وہ میں نے سب کی سب سن لی تھیں۔ اب اس میں کوئی شک شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ جس لڑکی کو یہ لوگ بھیروں جی کے مندر سے اٹھا کر لائے ہیں اور جس کا نام چندا رکھا گیا ہے وہ ناگن درگا کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ مجھے صرف اس بات کی حیرانی تھی کہ ناگن درگا نے اس ماحول کو اتنی جلدی اور خوشی کے ساتھ کس طرح قبول کر لیا ہے۔ کہیں یہ بھیروں دیوتا کی بد دعا کا اثر تو نہیں تھا؟ ہو سکتا ہے اس منحوس دیوتا کی بد دعا سے ناگن درگا کا ذہن ہی بدل گیا ہو۔ چونکہ ناگن درگا ایک کٹر برہم ہندو لڑکی تھی اور اس قسم کے توہمات پر اس کا گہرا یقین تھا اس لیے اس پر دیوتاؤں کی بد دعا کا اثر ہو سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود ناگن درگا کی نفسیات نے بد دعا کے اثر کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔ اگر وہ مسلمان ہوتی اور اس کا صرف ایک خدا پر ایمان ہوتا تو بھیروں دیوتا کی بد دعا کا اس پر کبھی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔

چونی رام کسی کمرے میں داخل ہو چکا تھا جہاں سے ناگن درگا کی خوشبو بہت

قریب سے آنے لگی تھی۔ اس کمرے میں کسی اعلیٰ انگریزی پرفیوم کی خوشبو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ چونی رام نے بیگ ایک جگہ رکھ دیا اور کہا۔

"چندا رانی! کیسی ہو؟ آج تو تم بڑی پیاری لگ رہی ہو۔ بھگوان نے تمہیں بڑا روپ دیا ہے۔"

تب مجھے ناگن درگا کی آواز آئی۔

"آپ نے اتنی دیر کہاں لگا دی انکل جی؟"

چونی رام نے کہا۔

"بس کیا بتاؤں چندا۔ بڑے ضروری کام سے گیا تھا۔ تم بتاؤ میں نے تمہیں ڈانس کا جو توڑا سکھایا تھا اس کی مشق کی ہے؟"

ناگن درگا نے کہا۔

"کی ہے انکل۔ گھنگھرو منگوا کر ابھی ڈانس کر کے دکھاتی ہوں۔"

چونی رام نے کہا۔

"یہ بعد میں دیکھ لیں گے۔ ابھی تم ایسا کرو کہ ٹھمری کی ایک استھائی میرے ساتھ گاؤ' یہ بہت ضروری ہے۔ ارے میں تو یہ بھول ہی گیا۔ تمہارے لیے میں حنا کا عطر لایا ہوں۔ لکھنؤ گیا تھا وہاں سے خریدا ہے۔"

چونی رام نے بیگ کا زپ کھول دیا۔ میں بیگ کے کونے میں کپڑوں کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ چونی رام نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر عطر کی ڈبی نکالی اور بیگ کا زپ بند کیے بغیر چلا گیا۔ مجھے زپ بند کرنے کی آواز نہ آئی تو میں آہستہ آہستہ رینگ کر اوپر آ گیا اور کھلے بیگ کی ایک جانب سے سر نکال کر دیکھا۔ کمرہ بڑے شاندر طریقے سے قالینوں اور ریشمی پردوں سے سجا ہوا تھا۔ تخت پر بھی قالین بچھے تھے۔ سفید گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ تخت پر ناگن درگا سبز ریشمی ساڑھی میں ملبوس' سونے کے زیورات پہنے بڑی شان سے بیٹھی تھی۔ اس کی ایک جانب تانپورہ اور ہارمونیم پڑا تھا۔ تخت کے پیچھے کمرے کا دروازہ تھا جو باہر ایک ٹیرس میں کھلتا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ٹیریس میں

آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ پس منظر میں درختوں کا منظر تھا۔ آسمان پر غروب ہوتے سورج کی لالی پھیلی ہوئی تھی۔ چونی رام نے عطر کا پیکٹ ناگن درگا کو دیا۔ اس نے پَیکٹ لے لیا اور کہا۔

"شکریہ انکل جی۔ اب مجھے استھائی سکھانی شروع کر دیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میں بھی وجنتی مالا کی طرح ڈانس کروں اور اختری بائی فیض آبادی کی طرح ٹھمری گاؤں۔"

چونی رام مسکراتے ہوئے ہارمونیم لے کر ناگن درگا کے پاس تخت پر بیٹھ گیا اور ہارمونیم کھول کر اس کے سروں پر آہستہ آہستہ انگلیاں چلاتے ہوئے بولا۔

"چندا رانی! بھگوان نے چاہا اور تم نے پورا پورا ریاض کیا تو دیکھ لینا ایک دن تم وجنتی مالا اور اختری بائی سے آگے نکل جاؤ گی۔ اب میرے ساتھ استھائی گاؤ۔"

کمرے کی فضا ہارمونیم کی دھیمی دھیمی آواز سے بھر گئی۔ چونی رام نے کسی ٹھمری کی استھائی گانی شروع کر دی۔ ناگن درگا اس کے ساتھ ساتھ گانے لگی۔ میں حیرت زدہ سا ہو کر ناگن درگا کو دیکھ رہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی ناگن درگا ہے جس کو میں بھیروں جی کے مندر میں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ بالکل ہی بدل گئی تھی۔ سبز ریشمی ساڑھی اور سونے کے زیورات کے ساتھ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ کچھ دیر تک یہ گانا ہوتا رہا۔ چونی رام نے ہارمونیم بند کرتے ہوئے کہا۔

"چندا جی! مجھے پورا وشواس ہے کہ اگر اسی طرح تم نے دو چار دن ریاض کیا تو تم بہت اچھی ٹھمری گانے لگو گی۔"

ناگن درگا بڑی خوش تھی۔ کہنے لگی۔

"انکل جی! اب میرے ڈانس کے بھی دو ایک توڑے دیکھ لیں۔ میں روز دو گھنٹے ریاض کرتی تھی۔"

اس نے کسی عورت کا نام لے کر آواز دی۔

"شانتی! میرے گھنگھرو لانا۔

چونی رام ہارمونیم بند کر چکا تھا۔ کہنے لگا۔

"ہاں۔ یہ کام بھی اسی وقت ہو جانا چاہیے۔ کل دھام پور کا جاگیردار تمہارا ڈانس دیکھنے آ رہا ہے۔ مجھے پورا وشواس ہے کہ جو دو تین مجرے کے توڑے میں نے تمہیں سکھائے ہیں انہیں دیکھ کر وہ تمہارا دیوانہ ہو جائے گا۔"

"انکل جی! آپ کوئی چنتا نہ کریں' مجھے جتنا بھی ڈانس آپ نے سکھایا ہے اس کو اس طرح سے ادا کروں گی کہ جاگیردار اچھل اچھل پڑے گا۔"

چونی رام نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

"جیتی رہو چندا رانی! جیتی رہو۔"

ملازمہ لڑکی شانتی گھنگھرو لے کر آ گئی۔ چونی رام نے ہارمونیم کو دوبارہ کھولا اور اس کے سر چھیڑنے شروع کر دیے۔ ناگن درگا پاؤں میں گھنگھرو باندھنے لگی۔ میں حیران ہو کر اسے دیکھ رہا تھا کہ یہ اس کی کیسی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ گھنگھرو باندھنے کے بعد وہ تخت سے اتر کر قالین پر آ گئی۔ اس نے ساڑھی کا پلو اپنی کمر کے ساتھ کس کر باندھا اور رقص کا پوز بنایا۔ چونی رام نے ڈانس کی دھن چھیڑ دی اور ساتھ ہی منہ سے ڈانس کے بول بولنے لگا۔

ناگن درگا نے رقص شروع کر دیا۔ وہ اس طرح رقص کر رہی تھی جیسے پیدائشی ڈانسر ہو۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کبھی رقص کرتے کرتے گھوم جاتی' کبھی آگے کو جھکتی' کبھی ایک دم سر کو پیچھے لے جاتی اور آنکھوں سے اشارے کرنے لگتی۔ وہ کوئی دس پندرہ منٹ تک رقص کرتی رہی۔ پھر ایک توڑا پورا کر کے ہنس کر بولی۔

"انکل جی! میں نے سب ٹھیک کیا ہے ناں؟ بے تال تو نہیں ہوئی؟"

چونی رام نے ہارمونیم کی پیٹی بند کرتے ہوئے کہا۔

"جیئو چندا رانی جیئو! تم نے دنوں میں ہی بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ اگر اس طرح ریاض جاری رہا تو تم ایک مہینے میں وجنیتی مالا کو پیچھے چھوڑ جاؤ گی۔ اب تم آرام کرو' میں چلتا ہوں۔ ابھی میں گھر بھی نہیں گیا۔ رات کو آؤں گا۔ ٹھمری کی دو ایک

رہرسلیس کرا دوں گا۔"

میں نے اس دوران دیکھ لیا تھا کہ جس بیگ میں میں چھپا ہوا تھا وہ گولڈن کاؤچ کی جانب رکھا ہوا تھا۔ میں جلدی سے بیگ میں سے نکل کر کاؤچ کے نیچے چھپ گیا۔ چونی رام اٹھ کر آیا۔ اس نے بیگ اٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔ اب کمرے میں میں اور ناگن درگا دونوں اکیلے تھے۔ میں انسانی آواز میں بات کر سکتا تھا۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ ناگن درگا کا ذہن بالکل بدل چکا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے نہ پہچانے۔ ہو سکتا ہے ایک سانپ کو انسان کی آواز میں بات کرتے دیکھ کر وہ شور مچا دے اور نوکر چاکر وہاں آ جائیں اور میرے پیچھے ڈانگ سوٹے لے کر مجھے مارنے کو دوڑ پڑیں۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

ناگن درگا نے پاؤں سے گھنگھرو کھول کر ایک طرف رکھ دیے تھے اور ریشمی رومال سے اپنے چہرے پر آیا ہوا پسینہ بڑی احتیاط کے ساتھ پونچھ رہی تھی کہ اس کا میک اپ خراب نہ ہو۔ اس نے شانتی کو آواز دی۔ ملازمہ شانتی آ گئی۔

"جی بی بی جی۔"

ناگن درگا نے کہا۔

"میرے لیے مسمی جوس لے آؤ۔"

ملازمہ شانتی چلی گئی۔ ناگن بڑے آرام سے تخت پر بیٹھ گئی اور ہارمونیم کھول کر اس کے سروں پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرتے ہوئے ٹھمری کی استھائی گنگنانے لگی۔ اس دوران میں یہی سوچتا رہا کہ ناگن درگا پر اپنا آپ ظاہر کروں یا نہ کروں۔ یہ بات طے شدہ تھی کہ اسے منحوس دیوتا بھیروں کی بد دعا لگ چکی ہے اور اگر حالات میں کسی قسم کی تبدیلی واقعہ نہ ہوئی تو دو تین مہینوں میں ناگن درگا ایک پیشہ ور طوائف بن جائے گی اور نائیکہ رانی بائی کی چاندی ہی چاندی ہوگی۔ وہ اسے علاقے کے بڑے بڑے جاگیرداروں، سیٹھوں اور اعلیٰ سرکاری افسروں کو پیش کر کے ان سے ہزاروں روپے کمانے لگے گی اور یوں ناگن درگا کی زندگی بربادی اور تباہی کے راستے پر پڑ جائے گی۔

اگر کسی وقت جا کر اس پر بد دعا کا اثر ختم ہوگیا تو اسے اپنی بربادی اور تباہ حال زندگی کا احساس ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ ناگن درگا اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے اور خود کشی کر لے۔ ناگن درگا کے مجھ پر ایک دو بڑے اہم احسان تھے۔ اس نے میری ایسے وقت میں مدد کی تھی جب موت کا ہاتھ میری شہ رگ تک پہنچ چکا تھا۔ اس اعتبار سے بھی میرا فرض بنتا تھا کہ میں ناگن درگا کی زندگی کو برباد ہونے سے بچا لوں۔ کیونکہ وہ جو کچھ کر رہی تھی ایک طرح سے گم شدہ یاد داشت کے تحت کر رہی تھی۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ ناگن درگا ہے اور یہاں اسے پیشہ ور طوائف بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب بد دعا کا اثر تھا۔

ملازمہ شانتی جوس کا بلوریں گلاس ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ ناگن درگا نے جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"رانی بائی! کیا کر رہی ہیں؟"

شانتی نے کہا۔

"بائی جی نے کہا ہے کہ وہ چائے آپ کے ساتھ ہی آ کر پئیں گی۔"

ناگن درگا نے کہا۔

"رانی بائی سے کہنا کہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہوگی۔ میں ان کا انتظار کروں گی۔"

شانتی چلی گئی۔ ناگن درگا جوس کا گلاس لے کر تخت سے اٹھی اور باہر ٹیرس میں چلی گئی۔ وہ ٹیرس میں کھڑی ہوگئی۔ باہر درختوں پر رات کا اندھیرا اتر رہا تھا۔ ٹیرس کی بتی جل رہی تھی۔ شاید وہ شام کی ٹھنڈی ہوا کا لطف لے رہی تھی۔ باہر کھڑے ہو کر ہی اس نے جوس پیا۔ وہیں میز پر گلاس رکھا اور اپنے بالوں کو سنوارتے ہوئے کمرے میں آکر سامنے کاؤچ پر بیٹھ گئی اور ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لے کر ٹی وی اون کر دیا۔ ٹی وی پر فلمی گانے اور ڈانس ہو رہے تھے۔ تپائی پر سگریٹ کیس پڑا تھا۔ ناگن درگا نے اس میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور مزے سے پینے لگی۔ میں اور بھی حیران ہوا۔ اس نے کبھی سگریٹ کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اب وہ ایک پیشہ ور طوائف کی

طرح سگریٹ پی رہی تھی۔ مجھے بھیروں دیوتا پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ اس نے ناگن درگا سے بڑا خوفناک انتقام لیا تھا۔

رانی بائی ساڑھی کو سنبھالتی سگریٹ پیتی کمرے میں داخل ہوئی تو ناگن درگا نے اٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ رانی بائی نے آگے بڑھ کر ناگن درگا کا ہاتھ چوم لیا اور بلائیں لے کر بولی۔

"جیئو چندا رانی! ہزار برس تک جیئو۔ تم سبز ساڑھی میں بالکل آکاش کی اپسرا لگ رہی ہو۔ بیٹھ جاؤ' بیٹھ جاؤ۔"

"یہ سب آپ کی دیا ہے رانی بائی۔"

ناگن درگا کو نائیکہ رانی بائی نے اپنے پاس صوفے پر بٹھا لیا اور پوچھا۔

"چونی رام نے ٹھمری کی استھائی کا ریاض کرا دیا تھا۔"

ناگن درگا بولی۔

"جی ہاں' میں نے ٹھمری پوری طرح سے یاد کر لی ہے' سناؤں۔"

"اس کی ضرورت نہیں بیٹی۔ کل بھی ریاض کرنا۔ کل رات کو جاگیردار آ رہا ہے۔ بس اسے کسی طرح خوش کر دینا۔ مجرے کا بھی ریاض کر لینا تھا نا؟"

"ہاں رانی بائی' چونی جی تو میرا مجرا دیکھ کر اور ٹھمری سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے۔" رانی بائی نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے کہا۔ اتنے میں ملازمہ شانتی چائے لے کر آ گئی۔ اس نے چائے بنا کر رانی بائی اور ناگن درگا کو دی۔ جب ملازمہ چلی گئی تو رانی بائی نے ناگن درگا کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"چندا! دھام پور کا جاگیردار نیا آدمی ہے' دولت مند بہت ہے۔ رات کو میں اسے تمہارے پاس کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ جاؤں گی۔ ہو سکتا ہے وہ تھوڑی بہت شراب بھی پیئے اور ایک حد سے آگے بڑھنے کی بھی کوشش کرے۔ تم اسے وہیں روک لینا اور ہرگز ہرگز حد سے آگے نہ بڑھنے دینا۔"

ناگن درگا نے بڑی تجربہ کار طوائف کے انداز میں کہا۔

"رانی بائی! آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے سنبھال لوں گی اور حد سے آگے نہیں بڑھنے دوں گی۔"

"شاباش۔" رانی بائی نے کہا۔ "لیکن اس کے ساتھ سختی سے بھی پیش نہ آنا۔ بہت موٹا شکار ہے۔ میں اسے ہاتھ سے جانے بھی نہیں دینا چاہتی۔ بس ادھر ادھر کی باتوں اور چوما چاٹی سے اس کو اپنے قابو میں رکھنا۔"

ناگن درگا ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔

"آپ کیوں چنتا کرتی ہیں رانی بائی۔ جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی کروں گی۔"

رانی بائی نے اپنے پرس میں سے سو سو کے دس نوٹ نکال کر ناگن درگا کو دیے اور کہا۔

"چندا رانی یہ تم اپنے پاس رکھو تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مارکیٹ سے منگوا لینا۔ اب تم تھوڑی دیر آرام کرو۔ آج میں نے خاص طور پر تمہارے لیے رام پور کی بریانی پکوائی ہے' ساتھ بنگالی رس گلے بھی بنوائے ہیں۔ رات کو چونی رام بھی یہیں کھانا کھائے گا۔"

یہ کہہ کر رانی بائی چلی گئی۔ ناگن درگا صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی۔ میں سامنے والے کاؤچ کے نیچے ایک طرف چھپ کر بیٹھا یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ یہ کونسا شہر ہے۔ میرے دل میں کئی بار خیال آیا کہ ناگن درگا کے سامنے آ جاؤں اور اس پر اپنا آپ ظاہر کر دوں لیکن اس ڈر کے مارے باہر نہ نکلا کہ ناگن درگا نے اگر مجھے نہ پہچانا تو وہ سانپ کو دیکھ کر شور مچا دے گی اور مجھے وہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ جبکہ میں وہاں رہ کر ناگن درگا کی نگرانی بلکہ خبر گیری بھی کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ ایک طرح سے اس کا حال کسی ایسی عورت کا تھا جس کو ہپناٹائز کیا گیا ہو۔ اس پر جادو کر دیا گیا ہو۔ اس کی ساتھ بد سے بد تر سلوک بھی اگر ہوا تو اسے احساس نہیں ہو گا۔

رانی بائی حقیقت میں اس کی عزت اور عصمت کا سودا کرنے والی تھی۔ اگر بے خبری کے عالم میں ناگن درگا کی عزت لٹ گئی اور بعد میں جب وہ اپنے ہوش و حواس میں آئی تو اسے حقیقت حال جاننے کے بعد کس قدر صدمہ نہیں ہوگا۔ عورت کی عزت اگر ایک بار لٹ جائے تو پھر اسے دنیا کی کوئی طاقت واپس نہیں لا سکتی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے وہاں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ کوٹھی اتنی بڑی تھی کہ میں کسی بھی جگہ چھپ سکتا تھا۔ چنانچہ مجھے وہاں کچھ دیر رہ کر ایک تو ناگن درگا کی عزت کی حفاظت کرنی چاہیے دوسرے انتظار کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اتنی دیر میں اس پر بد دعا کا اثر ختم ہو جائے اور وہ اپنی اصلی حیثیت میں واپس آ جائے۔

ناگن، درگا نے ٹی وی بند کر دیا اور اسی کمرے کا ایک دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ اندر پانی گرنے کی آواز آئی۔ شاید یہ غسل خانہ تھا۔ میں کاؤچ کے نیچے سے نکل آیا۔میں کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں میں اطمینان سے رات بھی گزار سکوں۔ کمرے میں کافی فرنیچر بھرا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک الماری لگی تھی۔ میں اس کے پیچھے آ گیا۔ یہاں چھپنے کے لیے بڑی اچھی جگہ تھی۔ اس الماری کو کوئی اپنی جگہ سے ہٹا بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اسی جگہ چھپے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں سے میں سارے کمرے کو اچھی طرح سے دیکھ بھی سکتا تھا۔ ناگن درگا نے باتھ روم میں کافی دیر لگا دی۔ شاید وہ غسل کر رہی تھی۔ جب وہ باہر آئی تو اس نے سر پر چھوٹے تولیے سے بالوں کو لپیٹ رکھا تھا۔ سارے جسم کے گرد بھی بڑا تولیہ لپیٹا ہوا تھا۔ وہ اسی ٹھمری کے بول گنگنا رہی تھی جو چونی رام نے آج اسے یاد کرائی تھی۔

سامنے والی دیوار کے ساتھ بہت بڑا سنگھار میز تھا۔ دیوار پر سنہری حاشیے والا بیضوی آئینہ لگتا تھا۔ اس کے برابر میں ایک قد آدم الماری تھی۔ ناگن درگا الماری کھول کر اس میں سے ہینگروں میں لگی ہوئی ساڑھیاں نکال نکال کر دیکھنے لگی۔ آخر اسے ایک گلابی رنگ کی کام دار ساڑھی پسند آ گئی۔ اس نے ساڑھی نکال کر سنگھار میز کی کرسی پر رکھی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے بالوں کو تولیے سے جھاڑنے

لگی۔ پھر اس نے بالوں میں کنگھی کر کے انہیں ڈھیلے ڈھالے انداز میں سر پر جوڑے کی طرح بنایا اور اپنے جسم کے گرد لپیٹا ہوا تولیہ اتار دیا۔ اس نے اندر کچھ بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ میں اگرچہ سانپ کے روپ میں تھا لیکن میرے احساسات سارے انسانی تھے۔ مجھے ناگن درگا سے شرم سی آنے لگی۔ مگر سانپ نے اپنا چہرہ دوسری طرف نہ کیا۔ شاید اس لیے کہ سانپ ان باتوں کو محسوس نہیں کرتے۔ میں سانپ کی آنکھوں سے ناگن درگا کو دیکھنے پر مجبور ہوگیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ناگن درگا کا جسم یونانی دیویوں ایسا تھا۔ ایسا خوبصورت جسم میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑے پیار سے اپنے سارے جسم پر کسی پرفیوم کا سپرے کر رہی تھی اور گنگنا بھی رہی تھی۔ کمرہ پرفیوم کی خوشبو سے بھر گیا تھا۔ اس نے الماری میں سے سیاہ رنگ کا بلاؤز نکال کر پہنا۔ پھر پیٹی کوٹ پہنا' اس کے بعد ساڑھی پہن کر تیار ہونے لگی۔

وہ دیر تک سنگھار میز کے سامنے بیٹھی بناؤ سنگھار میں لگی رہی۔ میں اسے پہلی بار اس ذوق و شوق سے بناؤ سنگھار کرتے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ملازمہ شانتی نے اندر آکر کہا۔

"رانی جی! بلا رہی ہیں۔"

ناگن درگا نے کہا۔

"انہیں کہو میں آ رہی ہوں۔"

ناگن درگا اب کوئی فلمی گیت گنگنا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھی اور بڑی شان کے ساتھ ریشمی ساڑھی سنبھالتی مہارانیوں کی طرح قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی الماری کے نیچے سے نکل کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ مجھے یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کہاں اور کس کمرے میں جاتی ہے اس کے جسم کی خوشبو مجھے گائیڈ کر رہی تھی۔

وہ اس کمرے میں تھی جہاں پہلے رانی بائی کو میں نے دیکھا تھا۔ رانی بائی اس سے پہلے اس کی بلائیں لے چکی تھی' اب اس کے حسن اور بناؤ سنگھار کی تعریف کر رہی

تھی۔ اس کے تعریف کرنے کا انداز خرانٹ نائیکاؤں والا تھا۔ میں دروازے میں داخل ہوتے ہی دیوار کے ساتھ ایک طرف گلدان والی تپائی کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ رانی بائی نے اب ٹیلی فون بھی اپنے پاس رکھا ہوا تھا جس کی تار عقبی کمرے کی طرف جاتی تھی جو رانی بائی کا بیڈ روم تھا شاید۔ وہ ناگن درگا سے کہنے لگی۔

"جاگیردار کا دھام پور سے فون آیا ہے کہ وہ کل کی بجائے آج رات کو ہی پہنچ رہا ہے۔ کہہ رہا تھا کل اسے کسی منتری سے ملنے جانا ہے جس نے اسے ڈنر پر بلایا ہے۔"

ناگن درگا بولی۔

"پھر کیا ہوا رانی ماں۔ اسے آج ہی آ جانے دیں۔ کل کیا اور آج کیا۔ میں تو بالکل تیار ہوں۔"

رانی بائی نے ناگن درگا کا ماتھا چوم لیا۔

"میں واری جاؤں' میری چندا۔ تم نے تو مجھے نہال کر دیا ہے۔ بس آج رات کوئی ایسا کرتب دکھاؤ کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

ناگن درگا نے عیار طوائفوں کی طرح کہا۔

"رانی جی! ایسا ہی کرتب دکھاؤں گی۔ یہ بتائیں کہ کمرہ کون سا دیں گی ہمیں؟ میرے بیڈ روم کے تو پردے پرانے ہو گئے ہیں۔"

رانی بائی نے کہا۔

"اس کام کے لیے میں نے ایک الگ اور خاص بیڈ روم بنایا ہوا ہے جو میں نے تمہیں ابھی تک نہیں دکھایا تھا۔ وہ میں تمہیں دکھا دوں گی۔ وہاں ضرورت کی اور موقع کے لحاظ سے ہر شے موجود ہے۔ میں چونی رام کو فون کرتی ہوں کہ ابھی آ جائے اور تمہیں تھوڑا سا مجرے کا ریاض کرا دے۔"

ناگن درگا نے فوراً کہا۔

"نہیں نہیں رانی ماں۔ اب ریاض کیا تو سارا میک اپ خراب ہو جائے گا۔ اب تو میں جاگیردار کے سامنے ہی مجرا کروں گی۔"

اور دونوں ہنسنے لگیں۔ اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی رانی بائی بولی۔

"چونی رام آگیا ہوگا۔"

تھوڑی دیر بعد چونی رام بھی آگیا۔ خوب بنا سنورا تھا۔ بوسکی کا کرتہ سفید چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں کولہا پوری چپل تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ منہ میں پان تھا۔ رانی بائی کو پرنام کر کے جھک کر اس کے پاؤں چھوئے اور بولا۔

"رانی بائی! میں نے دیر کر دی۔ آپ کی بہو نے کھیر پکا لی تھی کہنے لگی کھا کر جانا۔"

رانی بائی نے کہا۔

"وہ دھام پور والا جاگیردار آج رات ہی آ رہا ہے' اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں تمہیں فون کرنے والی تھی۔"

چونی رام صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اچھا" پھر ناگن درگا کی طرف دیکھ کر بولا۔ "کوئی بات نہیں چندا رانی کو میں نے کافی ریاض کرا دیا ہے۔ کیوں چندا؟"

چندا نے طوائفوں کی طرح گردن ایک طرف ڈھلکا کر کہا۔

"کیوں نہیں' کیوں نہیں۔ میں تو اب جنتی مالا اور اختری بائی کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔"

"میں واری جاؤں۔" رانی بائی نے بے اختیار کہا۔ پھر چونی رام سے کہنے لگیں۔

"ارے کوئی ولائتی دارو کا بھی انتظام کر لینا۔ میں نے ایک ٹیز والے شرما جی سے کل کے واسطے چار ولائتی بوتلیں لانے کو کہا تھا۔"

چونی رام بولا۔

"اس کی فکر نہ کریں رانی ماں۔ گھر میں اس وقت دو بلیک اینڈ وائیٹ کی بوتلیں نیچے والی الماری میں بند پڑی ہیں۔ مجھے معلوم ہے باقی ابھی کچھ مرغ لے آتا ہوں۔ اسے روسٹ کر لیں گے' بریانی شانتی روز ہی پکاتی ہے۔ ساتھ پڈنگ بھی تیار کر لے

گی۔ باقی اور کیا چاہیے۔"

"جب تو ٹھیک ہے' چندا ٹھیک لگ رہی ہے نا؟"

چونی رام نے ناگن درگا پر ایک نگاہ ڈالی۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ ساڑھی کا رنگ بھی صحیح ہے۔ بس موقع پر اسے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لینا ہوگا۔"

رانی بائی نے کہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو' وہ میں نے سب کچھ اپنی بٹیا کو سمجھا دیا ہے۔ تم فوراً مارکیٹ میں جاکر مرغے اور دوسرا ضروری سامان لاکر خانساماں ہریا کو دے دو' جاؤ۔"

"ابھی جاتا ہوں' کچھ رقم دے دیجیے۔"

رانی بائی نے سوسو کے پانچ نوٹ اپنے پرس سے نکال کر اسے دے دیے۔ وہ چلا گیا۔ رانی بائی نے ناگن درگا کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"رات کو بلاؤز اتار کر بیڈ روم میں آنا' مگر اسے زیادہ ہاتھ مت لگانے دینا۔"

ناگن درگا شرما کر سمٹ سی گئی۔ اس وقت مجھے وہ بالکل پہلے والی باحیا ناگن درگا لگی۔ مگر فوراً ہی گردن اٹھا کر بولی۔

"بس جتنا ضروری ہوگا اتنا ہی اسے قریب آنے دوں گی رانی ماں۔ تم شانت رہو۔"

رانی بائی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آؤ میں تمہیں نیا بیڈ روم دکھاتی ہوں۔" دونوں کمرے سے نکل کر گئیں تو میں بھی دیوار کے ساتھ رینگتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ یہ دوسری منزل تھی۔ نیا بیڈ روم بھی اسی منزل پر تھا۔ وہ لکڑی کی شاندار سیڑھیاں اترنے کی بجائے گیلری میں ہی ذرا آگے جاکر ایک کمرے میں داخل ہوگئیں۔ میں کچھ دیر کے لیے گیلری میں ہی قالین کے کنارے پر دیوار کے ساتھ لگا رہا۔ بیڈ روم کا دروازہ انہوں نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ کمرے میں روشنی ہوگئی' مگر یہ روشنی زیادہ تیز نہیں تھی۔ رانی بائی نے خاص قسم کا ماحول بنانے کے لیے وہاں روشنی کا انتظام بھی خاص طور پر

رومانوی کر رکھا تھا۔ میں رینگتا رینگتا بیڈ روم کے دروازے کی دہلیز کے ساتھ ہی اندر جا کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ بیڈ روم زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک بڑا پلنگ تھا جس پر ریشمی بستر بچھا تھا۔ سرخ رنگ کے تکیے پڑے تھے۔ پلنگ کی ایک جانب سٹینڈ والا ٹیبل لیمپ تھا۔ کارنس پر نیم عریاں عورتوں کی بڑی پینٹنگ لگی تھی۔ کارنس کے اوپر خوبصورت سنہری گلوب والی بتی روشن تھی۔ بیڈ روم میں اس وقت صرف وہی ایک بتی روشن تھی۔ پلنگ کی ایک جانب گولڈن فریم والا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ درمیان میں شیشے کی کالی ٹیبل تھی۔ ٹیبل پر گلدان رکھا تھا جس میں پلاسٹک کے پھول سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بہت بڑی بڑی دو پینٹنگز لگی تھیں جن میں عورتیں بالکل عریاں حالت میں ایک چشمے پر نہا رہی تھیں۔ صاف لگتا تھا کہ یہ بیڈ روم صرف عیاشی کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ ناگن درگا ان تصویروں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ رانی بائی کہہ رہی تھی۔

"رات کو یہ کارنس کے اوپر والی بتی بجھا کر ٹیبل لیمپ روشن کر دینا۔"

اس نے گلوب والی بتی بجھا کر ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ ٹیبل لیمپ میں سرخ بلب لگا تھا۔ بیڈ روم میں سرخ روشنی پھیل گئی۔ ناگن درگا پلنگ پر بیٹھ کر بولی۔

"رانی ماں! یہ تو بڑا نرم بستر ہے۔"

رانی بائی نے دیوار پر لگا ہوا ایک سوئچ دبایا اور چھت سے لگا پنکھا ایک خاص رفتار سے چل پڑا۔ وہ بولی۔

"یہاں رات کو ویسے بھی زیادہ گرمی نہیں ہوتی۔ اس پنکھے کی ہوا بڑی ٹھیک رہے گی۔ آ جاؤ۔ اب کھانا کھا کر تھوڑا اور تیار ہو جاؤ' کوئی پتہ نہیں وہ جاگیردار کب آ جائے۔"

ان سے پہلے میں بیڈ روم سے کھسک کر گیلری میں قالین کے کنارے کے نیچے چھپ گیا۔ دونوں ایک اور کمرے میں چلی گئیں۔ اس کمرے کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ بڑی میز پر کھانا لگا ہوا تھا اور ایک سفید وردی والا خانساماں ملازمہ شانتی کے ساتھ مل کر ضروری چیزیں ادھر ادھر رکھ رہا تھا۔ وہاں چونی رام بھی آ

گیا۔ میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ میں ابھی جا کر بیڈ روم میں کسی مناسب جگہ پر چھپ جاؤں۔ بیڈ روم میں میں اس لیے جانا چاہتا تھا کہ اگر رات کو جاگیردار ناگن درگا کے ساتھ کوئی نازیبا سلوک کرنے کی کوشش کرے یا اس سے زیادتی کرے تو میں ناگن درگا کی عزت بچا سکوں' کیونکہ ایک طوائف کی قیمت ادا کر کے جب ایک عیاش مرد اس کے بیڈ روم میں جاتا ہے تو پھر وہ اس کی عزت وغیرہ کی کوئی پروا نہیں کرتا۔

بہت ممکن تھا کہ وہ ناگن درگا کو کوئی چیز پلا کر بے ہوش کر دے اور پھر اس کی عزت لوٹ لے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ رانی بائی نے جاگیردار کے ساتھ ناگن درگا کی عزت کا سودا طے کر کے لاکھ سوا لاکھ روپیہ وصول کر لیا ہو اور ناگن درگا کو اپنی جگہ پر پکی کر رہی ہو کہ جاگیردار کو ایک حد سے آگے نہ جانے دینا۔ اس کو اپنے بدن پر زیادہ ہاتھ نہ پھیرنے دینا تاکہ ناگن کو یہی تاثر ملے کہ رانی بائی کو اس کی عزت و حرمت کا بے حد خیال ہے اور اس نے اس کی عزت کی کوئی قیمت وصول نہیں کی ہے۔ یعنی یہ عیار نائیکہ رانی بائی ایک تیر سے دو نشانے لگانے کی کوشش کر رہی ہو۔

بیڈ روم کا دروازہ پوری طرح سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ بند کرنے کی انہیں ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ ان کا اپنا بنگلہ تھا اور تھوڑی دیر بعد وہاں جشن عیش منعقد ہونے والا تھا۔ میں ادھ کھلے دروازے سے اندر چلا گیا۔ ایک طرف کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور جائزہ لینے لگا۔ آخر ایک جگہ مجھے موزوں لگی۔ وہاں سے میں ہنگامی صورت حال میں تیزی سے پلنگ پر آ کر جاگیردار پر حملہ کر سکتا تھا اور اس کو ڈس کر اس کے جسم میں صرف اتنا زہر داخل کر سکتا تھا کہ جس سے وہ کم از کم چوبیس گھنٹے بے ہوش رہے۔ یہ جگہ پلنگ کے بالکل سامنے والی دیوار کے ساتھ لکڑی کے ایک لمبے کیبنٹ کے نیچے تھی۔ میں وہاں جا کر کیبنٹ کے نیچے گھس گیا۔ میں نے اپنی تھوڑی سی گردن باہر نکال کر دیکھا۔ مجھے بیڈ روم کا سارا منظر واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ میں ناگن درگا اور اس کے عیاش گاہک جاگیردار کا انتظار کرنے لگا۔





گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ بنگلے کے باہر کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی رانی بائی کی آواز آئی۔

"شانتی! نیچے جا کر دروازہ کھولو' جلدی کرو۔"

قدموں کے ادھر ادھر دوڑنے بھاگنے اور سیڑھیاں اترنے کی آوازیں آئیں۔ اس کے ساتھ ہی بیڈ روم کے باہر جو گیلری تھی وہاں رانی بائی کی آواز سنائی دی' وہ چونی رام سے کہہ رہی تھی۔

"تم نیچے جا کر اسے اوپر لے آؤ۔ میں اپنے کمرے میں ہی رہوں گی' جاؤ۔"

میں بیڈ روم میں کیبنٹ کے نیچے چھپا یہ ساری آوازیں سن رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی نیچے ہال کمرے میں سے دو مردوں کے قہقہوں کی آواز آئی' ان میں سے ایک چونی رام اور دوسرا دھام پور کا جاگیردار ہی ہو سکتا تھا۔ وہ قہقہے لگاتے باتیں کرتے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے اور گیلری میں سے گزر گئے۔ پھر رانی بائی کی آواز بھی آئی۔ وہ جاگیردار کا استقبال کرتے ہوئے خوشامدانہ جملے کہہ رہی تھی جو پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ اس کے بعد شاید وہاں ناگن درگا کو بھی بلا لیا گیا تھا۔ پہلے تانورہ چھڑا' پھر ہارمونیم کے سر گونج اٹھے' اس کے بعد ناگن درگا کے ٹھمری گانے کی ہلکی ہلکی آواز بیڈ روم میں آنے لگی' کچھ دیر بعد ڈانس شروع ہو گیا۔ طبلے کی تھاپ پر گھنگھرو چھنک رہے تھے۔ کافی دیر تک یہ محفل رقص و سرور جمی رہی۔ اس کے بعد صرف

باتوں اور قہقہوں کی آوازیں آتی رہیں۔ شاید جاگیردار کو ڈنر کرایا جا رہا تھا۔ سب لوگ کھانے کی میز پر ہی تھے۔ ان کی آوازیں ذرا دور سے آ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ یہ آوازیں غائب ہونے لگیں۔

پھر سرگوشیوں کی آواز آئی۔ یہ آواز گیلری میں سے آئی تھی۔ یہ ناگن درگا کی سرگوشی تھی۔ میں اسے پہچانتا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"کیا کرتے ہیں، صبر سے کام لیں۔"

جاگیردا کی آواز آئی۔ "میری جان! صبر ہی تو نہیں ہوتا۔"

ناگن درگا نے کہا۔

"اندر آ جائیں۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے ناگن درگا کو ایک ناٹے قد کے سانولے آدمی کے ساتھ دیکھا جس نے بال خضاب سے خوب کالے کیے ہوئے تھے۔ سفید چمکیلی شیروانی کے ساتھ کھلے پائنچوں والا سفید ریشمی پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ گلے میں سفید موتیوں کی مالا تھی۔ ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والی چھوٹی سی چھڑی تھی۔ بیڈ روم میں کارنس والے گلوب کی دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ اندر آتے ہی جاگیردار دیوار پر لگی تصویروں کو دیکھنے لگا۔

"ونڈر فل! بہت خوبصورت تصویریں ہیں۔ بس ہم تو چاہتے ہیں کہ عورتیں ہوں تو ایسی ہوں تم بھی ایسی ہی عورت بن جاؤ۔ ہم تمہیں مالا مال کر دیں گے......"

ناگن درگا نے ایک الماری میں سے شراب کی بوتل اور گلاس نکال کر میز پر سجا دیے۔ دوسری شیشے کی الماری میں سے بڑی دو تھرمسیں نکالیں۔ کہنے لگی۔

"رانا جی یہاں تشریف رکھیں، باقی ساری باتیں ہوتی رہیں گی۔"

جاگیردار جس کو ناگن درگا نے رانا کہہ کر پکارا تھا صوفے پر بیٹھ گیا اور وسکی کی بوتل کو اٹھا کر بولا۔

"معمولی سکاچ ہے، مگر کوئی بات نہیں۔ چلے گی۔"

ناگن درگا نے بوتل کھول کر رانا کے گلاس میں اور پھر اپنے گلاس میں شراب

ڈالی۔ ایک تھرمس میں سے برف کی ڈلیاں نکال کر دونوں گلاسوں میں ڈالیں۔ دوسرے تھرمس میں سے پانی نکال کر دونوں گلاسوں میں ڈالا اور صوفے پر جاگیردار کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ایک گلاس اسے دیا' ایک گلاس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جاگیردار نے گلاس سے گلاس ٹکراتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"چیئرز۔"

ناگن درگا نے بھی وہی لفظ دہرایا اور دونوں نے گلاس ہونٹوں کے ساتھ لگا لیے۔ میں غور سے دیکھ رہا تھا کہ جاگیردار تو غٹاغٹ شراب چڑھا گیا مگر ناگن درگا بہت آہستہ آہستہ پی رہی تھی جیسے پیتے ہوئے مزاحمت کر رہی تھی۔ جب اس نے گلاس میز پر رکھا تو جاگیردار اس کے گلاس کو دیکھ کر بولا۔

"اری میری چندا رانی! تو نے تو صرف ایک ہی گھونٹ پیا ہے۔ اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔"

ناگن درگا نے جاگیردار کی گردن میں اپنی بانہیں حمائل کر دیں اور کہا۔

"رانا جی! میں آہستہ آہستہ ہی پیتی ہوں۔ فکر نہ کریں آپ کا پورا ساتھ دوں گی۔"

جاگیردار نے بے اختیار ہو کر ناگن درگا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ ناگن درگا نے اسے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"رانا جی! تھوڑا صبر کریں پوری رات پڑی ہے۔"

رانا الگ ہو گیا' سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہاں' یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ ہم پوری رات کے لیے یہاں آئے ہیں۔"

جاگیردار نے شیروانی اتار کر سامنے والے صوفے پر رکھ دی۔ چھڑی بھی وہیں رکھ دی اور چاندی کا سگریٹ کیس کھول کر اس میں سے ایک سگریٹ ناگن درگا کو دیا' دوسرا سگریٹ خود سلگایا اور کہنے لگا۔

"چندا رانی! تمہیں پہلے بائی جی کے ہاں نہیں دیکھا تم کہاں رہتی تھیں؟ بائی جی تو

کہہ رہی تھیں کہ تم رام پور سے آئی ہو۔"

ناگن درگا نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

"یہی سمجھ لیں۔"

جاگیردار نے گلاس اٹھالیا اور ناگن درگا سے کہا۔

"چیئرز۔"

ناگن درگا بولی۔ "آپ پی جائیں میں دوسرے گلاس میں آپ کا ساتھ دوں گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی' پوری رات پڑی ہے۔"

یہ کہہ کر جاگیردار نے زور دار قہقہہ لگایا اور سارا گلاس چڑھا گیا۔ ناگن درگا نے اس کے خالی گلاس میں مزید شراب' برف اور پانی ڈال کر دوسرا پیگ بھی بنا دیا۔ دوسرے پیگ کو اٹھاتے ہوئے جاگیردار نے ناگن درگا سے کہا۔

"اب تم بھی گلاس خالی کرو گی۔"

درگا نے مسکراتے ہوئے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا اور میرے دیکھتے دیکھتے وہ تین چار گھونٹ پی گئی۔ جاگیردار اس دوران آدھا گلاس خالی کر چکا تھا۔ اس نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ پہلا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل ڈالا اور دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔ اب اس نے ناگن درگا کی گردن میں بازو ڈال دیا اور کہنے لگا۔

"میری جان! ہم دھام پور کے سب سے بڑے جاگیردار ہیں۔ کبھی ہماری حویلی میں آؤ تمہاری اتنی خاطر کریں گے کہ ساری عمر یاد رکھو گی۔ تمہیں شیر کا شکار کھلائیں گے۔"

ناگن درگا نے کانوں سے ہاتھ لگا کر کہا۔

"توبہ' توبہ۔ مجھے تو شیر سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

جاگیردار نے ناگن درگا کا منہ چوم لیا اور بولا۔

"اری میری رانی! ہم جو تمہارے ساتھ ہوں گے پھر تمہیں شیر سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میری جان تمہارے لیے تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔" اور وہ ناگن درگا

سے لپٹ گیا۔

درگا نے بڑی مشکل سے اپنا آپ چھڑایا اور اٹھ کر بولی۔

"میں آپ کو ٹھمری سناتی ہوں۔"

جاگیردار نے دوسرا گلاس بھی خالی کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ٹھمری نہیں۔ ہم تمہارا مجرا دیکھیں گے' ہاں مجرا دیکھیں گے۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ ناگن درگا وقت گزار رہی تھی۔ مگر میں حیران تھا کہ اتنی رات' اتنا وقت پڑا تھا وہ کیسے گزارے گی۔ اس نے الماری میں سے تانپورہ نکال لیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"پہلے میں آپ کو ایک بالکل نئی ٹھمری سناؤں گی' اس کے بعد مجرا بھی کروں گی۔"

اس نے تانپورہ چھیڑ دیا اور کوئی ٹھمری گانے لگی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زیادہ گانا نہیں جانتی مگر کوشش کر رہی تھی کہ پیشہ ور طوائفوں کی طرح نرت کے ساتھ گائے۔ وہ ایسا ہی کر رہی تھی۔ ناگن درگا شراب کا ایک گلاس پی چکی تھی۔ اگرچہ اس نے اپنے گلاس میں تھوڑی ڈالی تھی پھر بھی اس پر نشے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ نرت کرتے ہوئے وہ لڑکھڑائی تو جاگیردار نے لپک کر اسے بازوؤں میں تھام لیا اور اس سے لپٹ گیا۔ ناگن درگا اپنے آپ کو چھڑا کر کاؤچ پر بیٹھ گئی اور بالوں کو ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔"

جاگیردار پورے نشے میں تھا۔ اس نے کاؤچ پر بیٹھی ناگن درگا کو اپنی طرف کھینچا اور کہا۔

"تو پھر کونسی بات اچھی لگتی ہے میری جان۔"

جاگیردار نے درگا کی ساڑھی اتارنی چاہی تو اس نے سخت مزاحمت کی۔ جب جاگیردار نے اس کے بلاؤز پر ہاتھ ڈالا تو درگا نے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مار دیا۔

جاگیردار کو تو جیسے آگ لگ گئی۔ اس نے بھی درگا کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا اور غصیلی آواز میں کہا۔

"حرام زادی! تو اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے؟ تمہاری پوری رقم میں نے بائی جی کو ادا کی ہے' چل ساڑھی اتار کر پلنگ پر لیٹ جا۔"

ناگن درگا نے بھی گرج دار آواز میں کہا۔

"بائی جی کو پیسے دیے ہیں تو بائی جی کے پاس جا' میرے پاس کیا لینے آیا ہے۔ میں تجھ سے نفرت کرتی ہوں۔"

جاگیردار نے اونچی آواز میں بائی جی' چونی رام اور ناگن درگا کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہاں شور مچ گیا۔ میں کیبنٹ کے نیچے سے نکل کر جاگیردار کو ڈسنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بائی جی اور چونی رام بیڈ روم میں آ گئے۔ رانی بائی نے آتے ہی واویلا شروع کر دیا۔

"ہائے ہائے۔ میری بچی کے ساتھ کیوں ظلم کر رہے ہو' چھوڑ دو۔"

جاگیردار یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ چونی رام نے کسی کو آواز دی کمرے میں دو ہٹے کٹے آدمی ہاتھوں میں سٹین گنیں لیے داخل ہو گئے اور آتے ہی انہوں نے جاگیردار کو پکڑ لیا۔ یہ رانی بائی کے باڈی گارڈ ہی ہو سکتے تھے۔ میں نے پہلے انہیں وہاں نہیں دیکھا تھا۔ جاگیردار نے مسلح باڈی گارڈ کو دیکھا تو ٹھنڈا پڑ گیا۔ کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے میں اسے کچھ نہیں کہوں گا۔ تم لوگوں نے مجھ سے جو بھاری رقم وصول کی ہے وہ میں تم سے واپس لے کر ہی رہوں گا' چھوڑ دو مجھے۔"

رانی بائی کے اشارے پر باڈی گارڈ نے جاگیردار کو چھوڑ دیا۔ جاگیردار نے شیروانی پہنی' ہاتھ میں چھڑی پکڑی اور بولا۔

"میں اس بے عزتی کا بدلہ لے کر رہوں گا۔"

رانی بائی درگا کو ساتھ لگا کر پیار کر رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"ہم نے کسی کی کوئی بے عزتی نہیں کی۔ ہم نے اپنی بچی کی جان بچائی ہے۔ ہم

نہ آتے تو تم نے اسے مار ڈالا ہوتا۔"

جاگیردار سخت غصے کی حالت میں بیڈ روم سے نکل گیا۔ رانی بائی نے باڈی گارڈز سے کہا۔

"تم کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ جاؤ جا کر دیکھو جاگیردار کا بچہ چلا گیا ہے کہ نہیں؟"

باڈی گارڈز فوراً چلے گئے۔ رانی بائی نے درگا سے کہا۔

"جا بیٹی تو اپنے کمرے میں جا کر سو جا فکر نہ کر۔ وہ تیرا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ جا۔"

ناگن درگا ساڑھی سنبھالتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد چونی رام کہنے لگا۔

"رانی بائی! یہ حرامی ہمیں دھمکی دے گیا ہے۔ ہمیں اس سے ہوشیار رہنا ہوگا۔"

رانی بائی کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ اس نے سگریٹ سلگانے کے بعد کہا۔

"ارے وہ کیا کر لے گا؟ ہم بھی اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے بھی کچھ جاننے والے یہاں ہیں۔ میں صبح ہی کمشنر بنڈھاری صاحب کو فون کرتی ہوں۔ جاگیردار ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چلو تم بھی جا کر آرام کرو۔"

رانی بائی اور چونی رام بھی وہاں سے نکل گئے۔ بیڈ روم کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ صرف میں وہاں رہ گیا تھا۔ سوچنے لگا کہ جاگیردار اپنے آدمیوں کے ذریعے ناگن درگا کو نقصان پہنچانے کی ضرور کوشش کرے گا۔ اس قسم کے عیاش جاگیرداروں نے غنڈے ضرور پالے ہوتے ہیں۔ بہرحال اب مجھے بھی چوکس رہنے کی ضرورت تھی۔ دل میں یہ خیال بھی آتا کہ میں ناگن درگا پر اپنا آپ ظاہر کر دوں اور اسے کہوں کہ یہاں اس کی جان اور عزت خطرے میں ہے۔ وہ یہاں سے میرے ساتھ فرار ہو جائے۔ پھر خیال آتا کہ ناگن درگا کا تو بھیروں دیوتا کی بد دعا کے اثر سے ذہن ہی بدل چکا ہے۔ وہ مجھے کہاں پہچانے گی۔ الٹا شور مچا دے گی اور خود میری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہی

ہو سکتا تھا کہ میں رانی بائی کے بنگلے پر رہ کر ہی ناگن درگا کی نگرانی کروں اور اسے کسی آنے والے خطرے سے محفوظ رکھ سکوں۔

وہ رات گزر گئی' دوسرے دن نیچے ایک گاڑی آ کر رکی۔ دو چار آدمیوں کی آوازیں آئیں۔ یہ لوگ باتیں کرتے گیلری میں سے گزر گئے۔ شاید وہ رانی بائی کے کمرے کی طرف گئے تھے۔ پھر چونی رام اور رانی بائی کی بھی آواز آنے لگی۔ میں بیڈ روم میں ہی چھپا ہوا تھا۔ دن کا وقت تھا۔ باہر دن کی روشنی تھی' باہر کے لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ میں اگر باہر نکلتا ہوں تو مجھے دیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ معلوم کرنا بھی ضروری تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے اور ناگن درگا کس حال میں ہے۔ میں کیبنٹ کے نیچے سے رینگ کر دروازے کے پاس آیا۔ اس دروازے کے نیچے گزرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں نے اپنا سر دروازے کے ساتھ لگا کر آگے کو دھکیلا۔ مگر دروازہ نہ کھلا۔ لگتا تھا کہ باہر سے تالا لگا دیا گیا ہے کیونکہ یہ بیڈ روم عام استعمال میں نہیں آتا تھا۔ اسے رانی بائی نے خاص خاص موقعوں کے لیے رکھا ہوا تھا۔ میں بیڈ روم میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ وہاں کوئی کھڑکی' روشندان بھی نہیں تھا۔ رانی بائی کا کمرہ وہاں سے ایک کمرہ چھوڑ کر تھا۔ اس طرف سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ کوئی پولیس افسر آیا ہوا ہے۔ کسی کسی وقت ناگن درگا کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ اس کے جسم کی خوشبو مجھے برابر آ رہی تھی۔ کچھ دیر تک یہ کانفرنس جاری رہی پھر پولیس والے جانے لگے۔ رانی اور چونی رام پولیس افسر کے ساتھ باہر گیلری میں سے گزرے' دونوں پولیس افسر سے باتیں کرتے جا رہے تھے۔ چونی رام کہہ رہا تھا۔

"ہمیں تو آپ کی پولیس پر اور آپ پر بڑا بھروسہ ہے۔"

پولیس افسر کی آواز آئی۔

"آپ لوگ بالکل بے فکر رہیں۔ آپ کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پولیس آپ کی پوری پوری حفاظت کرے گی۔"

سب لوگ سیڑھیاں اتر کر نچلی منزل والے ہال کمرے میں سے ہوتے ہوئے باہر

چلے گئے۔ ان کی آوازیں دور ہوتے ہوتے غائب ہوگئیں۔ پھر جیپ سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ چونی رام اور رانی بائی پہلی منزل کے ہی کسی کمرے میں بیٹھ گئے تھے شاید۔ میں بھی کیبنٹ کے نیچے اپنی خفیہ جگہ پر واپس آگیا۔ ابھی مجھے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت پڑنے پر میں باہر جانے کا کوئی طریقہ تلاش کر سکتا تھا۔ دن گزرتا گیا مجھے وقت کا کوئی اندازہ نہیں رہا تھا۔ بیڈ روم میں کوئی کلاک وغیرہ بھی لگا ہوا نہیں تھا۔ مجھے انتظار کی کوفت تو ہوتی نہیں تھی۔ خاموشی سے بیٹھا رہا۔ کسی کسی وقت دور سے ملازمہ شانتی کی کسی کو بلانے کی آواز آ جاتی۔ ان آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ رات ہوگئی ہے۔ بیڈ روم میں باہر سے کھانے کی خوشبو بھی ایک بار محسوس ہوئی۔ مگر میں ایک لمحے کے لیے بھی ناگن درگا کے جسم کی خوشبو سے غافل نہیں ہوا تھا جو مجھے برابر ایک ہی مقدار سے محسوس ہو رہی تھی۔

ماحول ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد وقفے سے بھی کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں سمجھ گیا کہ رات گہری ہوگئی ہے۔ میں بھی اپنے خیالوں اور سوچوں میں گم ہوگیا۔ جمیلہ کی طرف سے مجھے بڑا اطمینان تھا کہ وہ پاکستان اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ چکی ہے۔ اپنی کایا پلٹ کا خیال آتا تو میں کچھ گھبرا بھی جاتا کہ یہاں اچانک انسانی شکل میں واپس آگیا تو ناگن درگا تو شاید مجھے بالکل ہی نہ پہچانے۔ یہاں کے لوگ مجھے چور ڈاکو ہی سمجھیں گے لیکن میری ذہنی کیفیت بتا رہی تھی کہ ابھی کافی مدت تک میرے سانپ سے انسانی روپ میں واپس آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ میں آپ لوگوں کی طرح آنکھیں بند کر کے سو نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ سانپ آنکھیں بند نہیں کر سکتا البتہ جب میں سانپ کی شکل میں ہوتا تھا اور مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہوتا تھا تو میں عالم بے خودی میں چلا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسی حالت ہوتی تھی کہ اردگرد کا احساس تقریباً" ختم ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی میں اسی عالم بے خودی میں جا چکا تھا۔ یہ وہ کیفیت ہوتی ہے کہ سانپ اس حالت میں کئی کئی دن بے حس و حرکت بل کے اندر پڑا رہتا ہے۔

اچانک شور سا بلند ہوا' جس نے مجھے چونکا دیا۔

بڑی تیزی سے میری تمام حسیات واپس آ گئیں۔ میں نے سر اٹھا لیا۔ آوازیں نیچے سے آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں گھبرائی ہوئی تھیں۔ کوئی تیز قدموں سے دوڑتا' کوئی کسی کو آواز دے کر بلاتا۔ ان میں سے رانی بائی' چونی رام اور باڈی گارڈز کی آوازیں بھی تھیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ میں زیادہ پریشان اس لیے تھا کہ ان آوازوں میں مجھے ناگن درگا کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے بعد قدموں کی چاپ کے ساتھ مجھے رانی بائی اور چونی رام کی باتیں کرنے کی آواز آئی۔ وہ دونوں گھبرائے ہوئے تھے اور بیڈ روم کی طرف آ رہے تھے۔ رانی بائی کی آواز آئی۔

"چونی رام! یہ سارا کام اسی حرام زادے کا ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ ارے جلدی سے دروازہ کھول۔"

چونی رام کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"بائی جی! تالا نہیں کھل رہا۔"

پھر تالا کھل گیا' دروازہ بھی کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ رانی بائی اور چونی رام تیز تیز قدموں سے اندر آئے۔ رانی بائی نے ایک سوئچ دبا دیا جس سے کمرے میں روشنی ہو گئی۔ دونوں کچھ تلاش کرنے لگے۔ رانی بائی نے کہا۔

"یہ سگریٹ کیس کس کا ہے؟"

چونی رام نے تپائی پر سے سگریٹ اٹھا لیا۔ کہنے لگا۔

"یہ اسی حرامی جاگیردار کا ہے۔"

"اس کو غائب کر دو' یہاں کوئی ایسی چیز نہیں رہنی چاہیے جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ یہاں رات گزارنے آیا تھا۔ میں اس کے خلاف ڈاکے اور اغوا کا مقدمہ درج کراؤں گی۔"

اغوا کے لفظ سے میں چونک پڑا۔ چونی رام میز پر سے شراب کی بوتل' گلاس اور ایش ٹرے اٹھا کر ایک لفافے میں ڈالتا جاتا تھا۔ کہنے لگا۔

"رانی بائی! میں نے کمشنر صاحب کو فون کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ لڑکی شام تک برآمد ہو جائے گی اور جاگیردار بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔ ہم نے پولیس پارٹی دھام پور روانہ کر دی ہے۔"

رانی بائی سر پکڑ کر کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

"میری تو قسمت پھوٹ گئی جب میں نے اس حرام زادے جاگیردار کو یہاں آنے کی دعوت دی۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ ہمارے ساتھ یہ حرکت بھی کرے گا۔ چونی رام! تمہارا کیا خیال ہے' چندا رانی کو اس کے آدمی کہاں لے گئے ہوں گے۔"

یہ سننا تھا کہ میرے نیچے سے جیسے زمین کھسک گئی۔ میرے انسانی ذہن میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ جاگیردار نے آخر انتقام لے لیا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے ناگن درگا کو دوسری رات ہی اغوا کر لیا تھا۔ غصے سے میرا سانپ والا جسم پیچ و تاب کھانے لگا۔ میں اسی وقت درگا ناگن کی تلاش میں نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے فضا کو سونگھا۔ یہ میں اس افراتفری کے ماحول میں بھول ہی گیا تھا۔ فضا میں ناگن درگا کی بو موجود نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ جاگیردار کے آدمی اسے راتوں رات اغوا کر کے وہاں سے بہت دور کہیں لے گئے ہیں۔ چونی رام کہہ رہا تھا۔

"رانی بائی! ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ یہ کام سوائے جاگیردار رانا کے اور کسی نے نہیں کیا۔ دوسری یہ بات بھی یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ جاگیردار کے آدمی چندا کو لے کر دھام پور نہیں گئے ہوں گے۔"

"تو پھر وہ کہاں لے گئے ہوں گے میری چندا کو؟"

رانی بائی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ اسے تو غم لگنا ہی تھا' اس کے ہاتھ سے سونے کی چڑیا اڑ گئی تھی۔ چونی رام بولا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا رانی بائی۔ دھام پور کے آس پاس بڑا شہر کلکتہ ہی ہے یا پھر ہماری طرف آ جائیں تو آگے بمبئی ہے۔"

رانی بائی نے بے اختیار کہا۔

"وہ کتے کا بچہ چندا کو ضرور بمبئی لے گیا ہے۔ بمبئی بہت بڑا شہر ہے وہاں پولیس بھی اسے تلاش نہ کر سکے گی۔"

چونی رام پلنگ کی چادر ہٹا کر نیچے کچھ ڈھونڈنے لگا تھا۔ بولا۔

"رانی بائی! میں نے بھی اپنے آدمیوں کو فون کر کے دوڑا دیا ہے۔ کل تک ضرور کچھ نہ کچھ سراغ مل جائے گا۔"

رانی بائی نے ایک بار پھر ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"اگر اس حرام زادے کے غنڈے میری چندا کو بمبئی سے دوبئی لے گئے تو سمجھو وہ ہمارے ہاتھ سے گئی۔"

چونی رام بولا۔

"رانی بائی! اگر تو چندا بھارت کے کسی شہر میں ہے تو میں تمہیں پورا وشواش دلاتا ہوں کہ میرے آدمی اسے نکال کر لے آئیں گے۔ میرے بھی بازو بڑے لمبے ہیں' ہاں۔"

"یہ تم اتنی دیر سے کیا ڈھونڈ رہے ہو۔" رانی بائی نے کاؤچ سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

چونی رام بولا۔

"میں یہاں کوئی ایسا ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتا جس سے یہ معلوم ہو کہ جاگیردار سالا یہاں رات کو آیا تھا۔"

مجھے معلوم تھا کہ اب یہ لوگ باہر گئے تو بیڈ روم کو باہر سے تالا لگا جائیں گے اور میں نہ جانے کتنی مدت کے لیے یہاں بند ہو کر رہ جاؤں گا۔ میں باہر نکلنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ انہوں نے جو بتی جلائی تھی اس کی روشنی میں بیڈ روم کی ایک ایک شے نظر آ رہی تھی۔ اگر میں کیبنٹ کے نیچے سے نکل کر دروازے کی طرف کھسکتا ہوں تو رانی بائی کی نگاہ مجھ پر پڑ سکتی تھی لیکن رانی بائی نے مجھے موقع دے دیا۔ وہ خود بھی پلنگ کی طرف جا کر جھک کر نیچے دیکھنے لگی۔

"یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے چونی رام۔ یہاں سے چلو اب ـــــ کمشنر صاحب کا فون بھی آ رہا ہوگا۔"

جیسے ہی رانی بائی کی پیٹھ میری طرف ہوئی۔ میں کیبنٹ کے نیچے سے کھسک کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ باہر بھی دن کی روشنی تھی۔ گیلری کے فرش پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ میں جتنی تیز رینگ سکتا تھا رینگتا ہوا قالین کے کنارے کنارے سے ہوتا رانی بائی کے بڑے کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہاں میرے چھپنے کے واسطے بہت سی جگہیں تھیں کیونکہ یہاں کافی فرنیچر وغیرہ تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ہی گھوم گیا اور دیوار کے ساتھ لگے ایک بھاری بھرکم صوفے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں چونی رام اور رانی بائی بھی اندر آ گئے۔ چونی رام کے ہاتھ میں سیاہ پلاسٹک کا بڑا لفافہ تھا جس میں شراب کی خالی بوتل' گلاس اور ایش ٹرے وغیرہ تھے۔ رانی بائی بڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ چونی رام بھی سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

رانی بائی ٹیلی فون کا رسیور اٹھا کر نمبر گھمانے لگی۔

"میں خود کمشنر صاحب کو فون کر کے پوچھ لیتی ہوں کہ کچھ پتہ چلا یا نہیں۔"

نمبر ڈائیل کرنے کے بعد رانی بائی نے دو تین بار ہیلو ہیلو کہا اور بولی۔

"پولیس کمشنر بھنڈاری صاحب ہیں کیا؟ اگر ہوں تو انہیں کہو کہ رانی بائی بات کرے گی۔"

رانی بائی نے رسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر چونی رام سے کہا۔

"بھنڈاری صاحب کا پی اے تھا۔ کہتا ہے دیکھتا ہوں کہیں میٹنگ میں نہ بیٹھے ہوں۔"

چونی رام نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"ارے رانی بائی! مشکل پڑتی ہے تو کوئی کام نہیں آتا۔ یہ لوگ تو خود رات کے اندھیرے میں چھپ چھپا کر یہاں آتے ہیں یہ کسی سے چندا کے بارے میں کیا پوچھیں گے۔"

"ہیلو! جی۔ میٹنگ میں ہیں؟ ٹھیک ہے میں پھر فون کر لوں گی۔"

رانی بائی نے مایوسی کے ساتھ رسیور رکھ دیا۔ چونی رام کہنے لگا۔

"رانی بائی! تم دیکھ لینا اب چونی رام ہی تمہارے کام آئے گا۔ چندا ہمارے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی لیکن تم شانت رہو میرے آدمی آج کل میں ہی اس کا کھوج لگا لیں گے۔"

اس کے بعد چونی رام کچھ دیر بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ رانی بائی نے دو تین فون کیے اور پھر وہ بھی اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔

مجھے اگر فضا میں کسی طرف سے ناگن درگا کی خوشبو آ رہی ہوتی تو میں وہاں سے ضرور نکل پڑتا۔ لیکن اس کی خوشبو بالکل ہی غائب ہو گئی تھی۔ میں مجبور تھا کہ اس وقت تک رانی بائی کے بنگلے پر ہی چھپا رہوں جب تک کہ چونی رام کے آدمی چندا کے بارے میں کوئی خبر نہیں لے کر آتے کہ وہ بمبئی میں ہے یا کلکتے میں۔ اس روز پہلی بار مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ میں کلکتے کے قریب کسی بڑے شہر میں ہوں۔ وہ دن گزر گیا' رات بھی گزر گئی۔ دوسرا دن بھی گزر گیا' دوسری رات بھی گزر گئی۔ اس دوران پولیس کا ایک انسپکٹر اور دو سپاہی وہاں آئے۔ رانی بائی سے اپنی خاطر مدارات کروائی۔ یونہی ایک بیان لیا اور یہ تسلی دے کر چلے گئے کہ لڑکی کو بہت جلد پولیس برآمد کر لے گی۔ تیسرے دن دوپہر کے وقت رانی بائی اپنے بڑے کمرے یعنی دوسری منزل والے ڈرائینگ روم میں صوفے پر بیٹھی کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی کہ چونی رام کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بڑا مسرور نظر آ رہا تھا۔ آتے ہی بولا۔

"رانی بائی! آخر میرے آدمیوں نے چندا رانی کو تلاش کر ہی لیا۔"

رانی بائی نے رسالہ پرے پھینک دیا اور بے تاب ہو کر پوچھا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو چونی رام؟ کہاں ہے میری چندا رانی؟"

چونی رام سامنے والے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے بھی کان کھڑے کر لیے تاکہ مجھے بھی معلوم ہو کہ ناگن درگا کو جاگیردار کے غنڈے اغوا کر کے کہاں لے گئے

ہیں۔ چونی رام نے صوفے پر آگے کو جھک کر کہا۔

"رانی بائی! ہماری سونے کا انڈا دینے والی مرغی اس وقت بمبئی میں ہے۔"

رانی بائی نے کسی قدر حیرانی سے پوچھا۔

"اتنی جلدی وہ اسے بمبئی بھی لے گئے؟"

چونی رام بولا۔

"یہاں سے وہ لوگ اسے کلکتے لے گئے تھے وہاں سے ہوائی جہاز میں بٹھا کر بمبئی لے گئے۔"

"بمبئی میں وہ کس جگہ پر ہے؟"

چونی رام نے سر ہلا کر کہا۔

"رانی بائی! اب اس کا خیال چھوڑ ہی دو تو اچھا ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ پہنچا دی گئی ہے جہاں سے زندہ یا مردہ حالت میں اسے کوئی بھی باہر نہیں نکال سکتا۔ جاگیردار کے غنڈوں نے اسے ممبا دیوی کے مندر میں پہنچا دیا ہے اور کون نہیں جانتا کہ ممبا دیوی کے پجاریوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی عورت کو یم دوت بھی چاہئے تو نہیں چھڑا سکتا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم کسی دوسری لڑکی کو لے آتے ہیں۔ بھارت میں خوبصورت بے سہارا لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔"

مجھے ناگن کا سراغ مل گیا تھا۔ میرے لیے اتنا سراغ ہی کافی تھا۔ بمبئی میں اگر ناگن درگا موجود تھی تو وہاں پہنچ کر اس کی خوشبو مجھے آسانی سے اس تک پہنچا سکتی تھی۔ میرے سامنے اب دو کام تھے۔ جن میں ایک کام تو بمبئی پہنچنا تھا جو بے حد مشکل تھا کیونکہ میں سانپ کے روپ میں تھا۔ دوسرا کام اس چونی رام کو ٹھکانے لگانے کا تھا تاکہ یہ کسی دوسری بے سہارا لڑکی کی زندگی برباد نہ کر سکے۔ دوسرا کام بڑا آسان تھا۔

رانی بائی بھی نا امید ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"ممبا دیوی کے مندر کے پجاریوں کا ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تم ایسا کرو کہ کل ہی کلکتہ روانہ ہو جاؤ۔ وہاں تمہیں مشرقی پاکستان سے اغوا کی ہوئی کوئی نہ کوئی لڑکی مل

جائے گی۔ اسے اونے پونے خرید کر لے آؤ۔ بس لڑکی خوش شکل اور جوان ہونی چاہیے' باقی ہم اسے سب سکھا پڑھا لیں گے۔"

چونی رام بولا۔

"کل کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میل ایکسپریس شام کو رانچی پہنچتی ہے۔ میں اس میں بیٹھ کر کلکتے روانہ ہو جاتا ہوں۔ سامان کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ صرف ایک بیگ گھر سے لانا ہے۔"

رانی بائی نے کہا۔

"اچھا خیال ہے تم ابھی گھر جا کر اپنا بیگ لے آؤ۔ جاؤ۔"

چونی رام چلا گیا۔ میں نے اسے اس لیے زندہ جانے دیا کیونکہ اسے بیگ لے کر واپس آنا تھا اور اس کے بیگ کے اندر یا بیگ کے نیچے چمٹ کر مجھے رانچی ریلوے سٹیشن پہنچنا تھا۔ مجھے اس وقت پتہ چلا کہ اس شہر کا نام رانچی ہے جو کلکتے سے ناگ پور اور جمشید پور کی طرف جاتے ہوئے ایک مشہور شہر ہے۔ چونی رام کے جانے کے بعد رانی بائی نے شانتی کو آواز دے کر اپنے لیے چائے منگوائی اور پاندان میں سے ایک پان نکال کر منہ میں رکھا اور بے دلی سے اخبار کھول کر پڑھنے لگی۔ چونی رام کو اسی کمرے میں واپس آنا اور اسی کمرے سے واپس سٹیشن جانا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس کے بیگ کے اندر نہیں گھس سکوں گا۔ مجھے اس کے بیگ کے باہر نیچے کی جانب چمٹنا ہو گا اور یہ کام مجھے بڑی ہوشیاری سے کرنا پڑے گا۔ اس وقت صرف چونی رام ہی مجھے ریلوے سٹیشن تک پہنچا سکتا تھا۔ اگر یہ موقع نکل جاتا ہے تو مجھے بہت خجل خواری کر کے سٹیشن تلاش کرنا ہو گا۔

آخر چونی رام آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا وہی بیگ تھا جس کے اندر گھس کر میں رانی بائی کے بنگلے تک آیا تھا اور اتفاق سے ناگن درگا مجھے مل گئی ۔ اس دوران میں اپنی جگہ سے کھسک کر دیوار کے ساتھ ساتھ قالین کے کنارے سے ہوتا ہوا دروازے کے پاس دہلیز کے اندر چھپ کر بیٹھ گیا تھا اور چونی رام کے باہر نکلنے کا انتظار

کر رہا تھا۔ میں چھوٹے سائز کا سانپ تھا جس کی وجہ سے مجھے چھپنے کے لیے تھوڑی سی جگہ ہی درکار ہوتی تھی۔ چونی رام رانی بائی کے پاس بیٹھا اس سے ہدایات لیتا رہا۔ بیگ اس کے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ پھر وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ بیگ اس کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ بیگ فرش سے زیادہ سے زیادہ فٹ اونچا تھا۔ میں نے پورا زاویہ بنا لیا ہوا تھا۔ جیسے ہی چونی رام دروازے میں سے باہر نکلا میں اچھل کر اس کے بیگ کے نیچے چمٹ گیا۔ یہ کام میں نے اتنی پھرتی اور احتیاط کے ساتھ کیا تھا کہ چونی رام کے بیگ کو ہلکا سا دھچکا ہی لگا۔ چلتے ہوئے چونکہ بیگ اس کے ہاتھ میں ہل رہا تھا اس لیے اس نے یہ جھٹکا محسوس نہ کیا۔ نیچے رانی بائی کی گاڑی کھڑی تھی۔ چونی رام نے ڈرائیور سے کہا۔

"لکھی رام چلو بھائی سٹیشن پر لے چلو۔"

"جو حکم سرکار۔"

چونی رام نے بیگ پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ میں نیچے سے کھسک کر گاڑی کی سیٹ کی ایک طرف چھپ گیا۔ کار چل پڑی۔ چونی رام ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ سارا راستہ ڈرائیور سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ گاڑی ریلوے سٹیشن کے باہر کھڑی ہوئی تو میں دوبارہ بیگ کی ایک جانب چپک گیا۔ یہ رانچی شہر کا ریلوے سٹیشن تھا۔ میں سٹیشن پر پہنچ چکا تھا۔ یہاں سے مجھے صرف بمبئی جانے والی گاڑی معلوم کر کے اس کی چھت پر سوار ہونا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ایک ضروری کام کرنا تھا اور وہ کام چونی رام دلال کو ہمیشہ کی نیند سلانا تھا تاکہ آئندہ وہ کسی کی ماں' بہن کی عزت اور زندگی برباد نہ کر سکے۔ رانچی سٹیشن پر اتنی زیادہ روشنیاں نہیں تھیں جتنا میرا خیال تھا کہ ہوں گی۔ یہ میرے لیے اچھی بات تھی۔ چونی رام بیگ اٹھائے بکنگ ونڈو کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ بیگ اس نے نیچے رکھ دیا۔ میں بیگ کی دوسری طرف ہو گیا تھا یہاں دوسرے مسافر بھی کھڑے تھے۔ میرے لیے چونی رام کو گرا کر باہر نکلنے کا موقع کم تھا۔ لوگ مجھے دیکھ سکتے تھے۔

چونی رام ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر آگیا۔

پلیٹ فارم پر بھی کافی لوگ تھے۔ وہ ایک طرف رکھے ہوئے بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں ابھی تک بیگ کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ بنچ کے پیچھے تھوڑا اندھیرا تھا۔ میں نے موقع کا جائزہ لیا۔ یہاں سے میں فرار ہو سکتا تھا۔ چونی رام بنچ پر دوسرے مسافروں کے ساتھ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ بیگ اس کی ٹانگوں میں رکھا تھا۔ اس نے دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ اس کی ایک پنڈلی میرے سامنے تھی۔ میں ذرا سا کھسک کر آگے ہوا اور پلک جھپکنے میں اس کی پنڈلی پر ڈس دیا اور اس کے ساتھ ہی بنچ کے پیچھے دیوار کی آڑ میں ہو گیا جہاں ہلکا اندھیرا تھا۔ میں چونی رام کا انجام دیکھ کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ میرے زہر کی تاثیر بڑی ہلاکت خیز تھی اور کوئی بھی انسان اسے ایک سیکنڈ کے سوویں حصے سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چونی رام کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جیسے ہی میں اسے ڈس کر دیوار کی اوٹ میں آیا اتنی دیر میں وہ آگے کو گر پڑا تھا اور دوسرے مسافروں میں شور مچ گیا تھا اور وہ لوگ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سب کو بعد میں پتہ چلا ہو گا کہ اسے سانپ نے ڈسا تھا۔ اتنی دیر میں' میں وہاں سے نکل کر پلیٹ فارم کے بہت آگے اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں کوئی مسافر نہیں تھا صرف ریلوے مال گودام کا سامان پڑا تھا۔ میں سامان کے پیچھے اطمینان سے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب یہ کس طرح سے معلوم ہو کہ رانچی سے بمبئی جانے والی گاڑی کس وقت اور کون سے پلیٹ فارم سے جاتی ہے۔ یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ سمت کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مشرق کی طرف جس گاڑی کا رخ ہو گا وہ کلکتے کی طرف جا رہی ہو گی اور مغرب کی طرف جس کا رخ ہو گا وہ ناگ پور' بمبئی یا زیادہ سے زیادہ پٹنہ' بنارس' دلی کی طرف جا رہی ہو گی۔ اگر میں بنارس' پٹنہ یا لکھنؤ بھی پہنچ جاتا ہوں تو وہاں سے بمبئی جانے والی گاڑی پکڑنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ لیکن یہ مجھے علم تھا کہ رانچی سے براستہ بلاس پور' رائے پور' ناگ پور' دھولائی اور ناسک بھی گاڑیاں بمبئی جاتی ہیں اور یہ راستہ لمبا نہیں ہے' اور رانچی اور بمبئی کے متوازی ہی ہے اور ٹرین بھارت کی مشرقی

گھاٹ سے مغربی گھاٹ کی طرف جاتی ہے۔

مگر یہ معلوم کرنا ایک سانپ کے لیے تقریباً ناممکن تھا کہ رانچی سے براستہ پٹنہ' بنارس کون سی گاڑی جاتی ہے اور براستہ ناگ پور' امراوتی' ناسک کون سی گاڑی جاتی ہے۔ میں اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ رانچی کے پلیٹ فارم پر زیادہ دیر تک پڑا رہوں۔ ایک تو مجھے جلدی بمبئی پہنچ کر ناگن درگا کو تلاش کرنا تھا۔ دوسرے دن کی روشنی میں میرا نظر آجانا یقینی تھا اور جب ایک سانپ نظر آجاتا ہے تو پھر انسانوں سے اس کا بچ کر نکلنا اتنا آسان کام نہیں ہوتا۔ میں نے یہی سوچا کہ جو گاڑی بھی مغرب کی طرف جاتی ہوگی اللہ کا نام لے کر اس کی چھت پر بیٹھ جاؤں گا۔ اگر پٹنہ وغیرہ پہنچ گیا تو وہاں سے بمبئی جانے والی گاڑی کی چھت پر سوار ہونے کی کوشش کروں گا اور اگر یہ گاڑی بمبئی جا رہی ہوگی تو اسی گاڑی کی چھت سے چپکا رہوں گا۔

میں بنگال کے علاقے میں کافی پھر چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رانچی کے بعد بڑا شہر رائے پور ہی آتا ہے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہوگی کہ جس پلیٹ فارم پر میں چھپا ہوا تھا وہاں ایک گاڑی آکر رکی۔ اس گاڑی کا رخ مغرب کی طرف تھا اور یہ کلکتے سے آرہی تھی۔ اس میں بہت مسافر تھے۔ کچھ اتر گئے۔ زیادہ مسافر وہاں سے سوار ہوگئے۔ میں نے بہت کان لگا کر لوگوں کی باتیں سنیں کہ شاید پتہ چل جائے کہ یہ گاڑی دلی جا رہی ہے یا بمبئی مگر معلوم نہ ہوسکا۔ میں اللہ کا نام لے کر دوسری طرف سے آکر ٹرین کے پہیوں پر سے گزر کر ٹرین کے ایک ڈبے کی چھت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد ٹرین چل پڑی۔ ٹرین باقی ساری رات چلتی رہی۔ دوسرے دن دوپہر کے بعد ایک ایسے بڑے سٹیشن پر پہنچی جو صوبہ بہار کا شہر نہیں لگتا تھا۔ وہاں اردو نہیں بولی جا رہی تھی۔ لوگ تامل یا تیلگو یا مراٹھی میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے اطمینان ہوگیا کہ ٹرین بمبئی کی طرف ہی جا رہی ہے۔ پٹنہ' بنارس کی طرف سے ہو کر دلی نہیں جا رہی۔

ٹرین آگے چل پڑی۔ پھر جب رائے پور کا شہر آیا تو مجھے یقین ہوا کہ میں اتفاق

سے یا خوش قسمتی سے اس گاڑی میں سوار ہوگیا ہوں جو رائے پور' بلاس پور' ناگ پور' امراوتی اور ناسک سے ہوتی ہوئی بمبئی جا رہی ہے۔ قصہ مختصر اس ٹرین نے مجھے بمبئی کے بوری بندر سٹیشن پر پہنچا دیا۔ بمبئی کا دوسرا بڑا سٹیشن بمبئی سنٹرل تھا۔ مگر یہ ٹرین بمبئی کے پہلے بڑے سٹیشن بوری بندر آ کر رکی تھی۔ یہ بہت وسیع اور کشادہ ریلوے سٹیشن ہے۔ ٹرمینل سٹیشن ہے' یعنی یہاں سے آگے کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ جس وقت ٹرین بمبئی پہنچی اس وقت وہاں بارش ہو رہی تھی۔ میں ٹرین کی چھت سے رینگ کر ریلوے ٹریک کی دوسری جانب اترا اور پلیٹ فارم کی دیوار سے لگ کر رینگ رینگ کر اس جگہ پہنچ کر چھپ گیا جہاں بڑے بڑے دو بفر Buffer لگے ہوئے تھے یعنی یہاں لائین بند ہو جاتی تھی۔

میں نے سب سے پہلے فضا کو سونگھا' مجھے فضا میں ناگن درگا کی خوشبو محسوس ہوئی ضرور مگر یہ خوشبو بہت کمزور اور لطیف تھی۔ اگر ناگن درگا سانپ کی شکل میں ہوتی تو یہ خوشبو بہت تیز ہوتی مگر وہ انسان یعنی عورت کی شکل میں تھی جس کی وجہ سے اس کی سانپ کی بو ہلکی پڑ گئی تھی اور صرف عورت کی خوشبو ہی اس کے جسم سے خارج ہو رہی تھی۔ جو بہت ہلکی تھی اور باہر چونکہ شہر میں بارش ہو رہی تھی۔ اس لیے یہ خوشبو اور بھی لطیف ہو گئی تھی۔ لیکن یہ کمزور خوشبو بھی ناگن درگا تک میری راہ نمائی کر سکتی تھی۔ ٹرین بمبئی دن کے وقت پہنچی تھی۔ مجھے رات کا اندھیرا ہو جانے کا ہر حال میں انتظار کرنا تھا۔ میں بڑی محفوظ جگہ پر چھپا ہوا تھا۔ چنانچہ وہیں چھپا رہا۔

جب سورج ڈوب گیا۔ پلیٹ فارم پر روشنیاں ہوگئیں تو میں وہاں سے نکل کر چل پڑا۔ میں اندھیرے کونوں اور دیواروں وغیرہ کی آڑ لیتا سٹیشن سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بارش نہیں ہو رہی تھی۔ بمبئی بہت بڑا شہر تھا۔ یہاں قدم قدم پر خطرہ تھا۔ سڑکیں اتنی چوڑی تھیں کہ میں اسے عبور کرتے ہوئے کسی گاڑی کے نیچے آ کر کچلا جاسکتا تھا۔ روشنی اتنی تھی کہ مجھے کسی بھی سڑک کو پار کرتے ہوئے لوگ دیکھ کر میرے پیچھے پڑ سکتے تھے۔ میں سٹیشن سے باہر نکل آیا تھا لیکن جس طرف سے باہر نکلا

تھا اگرچہ وہ مل گودام ٹائپ کا علاقہ تھا پھر بھی وہاں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ روشنی میری دشمن تھی۔ میں نے فضا کو سونگھا۔ ناگن درگا کی ہلکی ہلکی خوشبو کی لہریں ایک سمت سے آ رہی تھیں۔ میں اسی سمت کی طرف بے حد احتیاط سے کام لیتے ہوئے رینگنے لگا۔ سڑک پار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سڑک پر بسیں بھی چل رہی تھیں' وکٹوریہ گاڑیاں بھی چل رہی تھیں' موٹر سائیکلیں اور موٹر کاریں بھی آ جا رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے ایک گرین بیلٹ بنی ہوئی تھی۔ میں اس میں چھپ کر آہستہ آہستہ اس طرف بڑھ رہا تھا جس طرف سے مجھے ناگن درگا کی خوشبو آ رہی تھی۔ سڑک شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھی۔

آخر سڑک ایک طرف کو مڑی تو سامنے ایک بہت بڑا گول چوک آ گیا۔ درمیان میں گول دائرے کی شکل میں گھاس کا پلاٹ تھا۔ گاڑیاں اس کا چکر لگا کر گزر رہی تھیں۔ جس گرین بیلٹ پر میں جا رہا تھا وہ سڑک وہاں آ کر ختم ہو جاتی تھی۔ گرین بیلٹ کے آخر میں ناریل کے درخت تھے۔ میں ایک درخت کے تنے میں چھپ کر سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ یہ اتنا بڑا چوک جہاں روشنیوں نے دن چڑھا رکھا ہے میں کیسے پار کروں گا کیونکہ ناگن درگا کی خوشبو چوک کے پار سے آ رہی تھی۔ شاید ممبا دیوی کا مندر اسی طرف تھا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر بس کا شیڈ بنا ہوا ہے۔ وہاں دو منزلہ بسیں آ کر کھڑی ہوتی ہیں اور آگے چل پڑتی ہیں۔ میں نے سوچا کہ وہاں جانا چاہیے شاید ممبا دیوی کے مندر کو جانے والی کوئی بس مل جائے۔ ممبا دیوی کا مندر بمبئی کی مشہور جگہ تھی۔ کسی نہ کسی بس کی پیشانی پر اس کا نام ضرور لکھا ہوا ہو گا۔ میں درخت کی آڑ سے نکل آیا اور چھپتا چھپاتا بس سٹینڈ پر آ گیا۔ اس وقت وہاں کوئی بس نہیں تھی۔ ایک مسافر عورت بچے کو لیے شیڈ کے اندر بیٹھی تھی۔ میں تیزی سے شیڈ کی چھت پر آ گیا۔ اتنے میں ایک بس آ کر رکی۔ کنڈکٹر بولنے لگا۔ اس نے بمبئی کی تین چار جگہوں کے نام لے کر مسافروں کو سوار ہونے کی دعوت دی مگر اس میں ممبا دیوی کے مندر کا نام نہیں تھا۔ وہ بس نکل گئی۔ دوسری دو منزلہ بس آئی تو کنڈکٹر نے

باہر نکل کر کہا۔

"پارسی بت' اوپیرا ہاؤس' ممبا میا کا مندر۔"

میرا مقصد حل ہوگیا تھا۔ میں شیڈ کی چھت پر سے ہی چھلانگ لگا کر دو منزلہ بس کی چھت پر آگیا اور وہیں چمٹ گیا۔ بس آگے چل پڑی۔ بس بمبئی کی روشن' کشادہ اور بارونق سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی دو تین جگہوں پر رکی۔ ہر جگہ کنڈکٹر اس مقام کا نام لیتا اور مسافر اتر جاتے۔ آخر ایک جگہ بس رکنے لگی تو کنڈکٹر نے آواز دی۔

"ممبامیا جی کا مندر۔"

وہاں اتنی روشنی تھی اور آس پاس اتنے لوگ تھے کہ میں بس کی چھت سے ہی چمٹا رہا۔ جب بس آگے چل پڑی تو میں نیچے چھلانگ لگانے کے لیے موقع تلاش کرنے لگا۔ ایک چوک پر آکر بس دائیں طرف گھومی تو اس کی رفتار ہلکی ہوگئی۔ فٹ پاتھ کا ایک درخت نیچے کو جھکا ہوا تھا۔ میں اچھل کر درخت کی شاخوں سے لپٹ گیا۔ بس آگے نکل گئی تھی۔ بس سٹاپ خالی ہوگیا تھا۔ سڑک پر بھی کسی کسی وقت کوئی گاڑی گزرتی تھی۔ میں درخت سے نیچے اتر آیا۔ مجھے کچھ فاصلے پر ایک بڑے مندر کی عمارت دکھائی دی جس کے دروازے پر خوب روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ادھر سے کسی وقت مندر کے ٹل بجنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ یہ ممبا دیوی کا مندر ہی ہو سکتا تھا۔ ناگن درگا کی ہلکی ہلکی خوشبو بھی اسی طرف سے آ رہی تھی۔

میں فٹ پاتھ اور سڑک کے کنارے کے درمیان رینگتا ہوا مندر کی طرف بڑھا۔ میں کافی تیزی سے جا رہا تھا۔ مندر کے عقب کی طرف آیا تو رک گیا۔ مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ناگن درگا کی خوشبو مندر کے اندر سے نہیں بلکہ مندر کے عقب میں کچھ فاصلے پر جو اونچی اونچی عمارتیں جگمگا رہی تھیں اس طرف سے آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ناگن درگا مندر میں نہیں تھی۔ ان بلند عمارتوں میں کسی جگہ تھی۔

میں نے مندر کی پچھلی دیوار کے ساتھ دو تین چکر لگائے۔ درگا کی خوشبو مندر سے نہیں بلکہ عقبی عمارتوں کی جانب ہی سے آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے

غور کیا اور پھر بلند عمارتوں کی طرف رینگنے لگا۔ مندر اور عمارتوں کے درمیان ایک بے آباد خالی جگہ تھی جہاں کھدائی کا کام ہو چکا تھا اور مٹی کے ڈھیر پڑے تھے۔ شاید یہاں کوئی نئی عمارت بن رہی تھی۔ میں مٹی کے ڈھیروں کے درمیان سے ہو کر نکل گیا۔ بلند عمارتوں کے آگے سے ایک سڑک گزرتی تھی جس کی درمیانی گرین بیلٹ میں درخت اور پھولدار پودے اگے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے دوسری جانب سے موٹر کاریں تیزی سے گزر جاتی تھیں۔ میں سڑک پار کر گیا۔ شروع رات کا وقت تھا۔ بلڈنگوں کے فلیٹوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ ٹی وی اور کیسٹ پلیئرز پر لگے ہوئے انڈین فلمی اور انگریزی گانوں کی ہلکی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ تین تین چار چار بلڈنگوں کے درمیان پیچھے جانے کو راستہ بنا ہوا تھا جہاں گاڑیاں کھڑی تھیں۔

ایک جگہ بچے کھیل رہے تھے۔ ایک بلڈنگ کے باہر تین چار نوجوان لڑکے بیٹھے سگریٹ پیتے ہوئے آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ یہاں کہیں روشنی تھی اور کہیں اندھیرا تھا۔ میں اندھیرے میں سے ہو کر ناگن درگا کی خوشبو کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ بلڈنگوں کے ایک بلاک کے پیچھے ایک پرانی ٹائپ کی کوٹھی نما عمارت تھی جہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ صرف برآمدے میں ایک بتی جل رہی تھی۔ گیٹ کوئی نہیں تھا لگتا تھا یہ انگریزوں کے زمانے کی کوئی کوٹھی ہوگی جہاں اب شاید کوئی نہیں رہتا تھا۔ کیونکہ باہر نہ کوئی گاڑی کھڑی تھی' نہ کوئی آدمی نظر آتا تھا اور نہ ہی کوٹھی کے کسی کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ مگر ناگن درگا کی خوشبو اسی کوٹھی سے آ رہی تھی اور خوشبو پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ کوٹھی کے لان میں جنگلی جھاڑیاں اگ رہی تھیں۔ یہ کوئی آسیبی کوٹھی لگتی تھی۔ میں جھاڑیوں میں سے ہو کر کوٹھی کے برآمدے میں آ گیا۔ ناگن درگا کی خوشبو کو بڑی توجہ کے ساتھ ایک جگہ رک کر محسوس کیا۔ یہ خوشبو کوٹھی کے عقب کی جانب زیادہ تھی۔ میں کوٹھی کے عقب میں آ گیا۔ اس طرف کوٹھی کی پرانی دیوار ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ اندھیرا تھا مگر سانپ ہونے کی وجہ سے مجھے اندھیرے میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔

کوٹھی کے پیچھے بھی ایک برآمدہ تھا۔ اس طرف ایک نئے ماڈل کی گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ میں نے کھڑکی کے شیشے میں سے جھانک کر دیکھا۔ گاڑی کے اندر کوئی نہیں تھا۔ میں برآمدے کی طرف بڑھا۔ درگا کی خوشبو ایک دروازے میں سے نکل رہی تھی۔ یہاں خوشبو کافی تیز اور گہری تھی۔ میں اندر جانے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ پرانی کوٹھی تھی اوپر روشندان پر نگاہ ڈالی تو اس کا شیشہ ایک طرف سے ٹوٹا ہوا تھا۔ میں تیزی سے دیوار پر رینگتا ہوا روشندان پر پہنچ گیا۔ دوسری طرف کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ کمرے کی ساری بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ اندر سے درگا کی خوشبو کے ساتھ مجھے شراب کی بو بھی محسوس ہوئی۔ شراب کی بو کی مجھے کافی شناخت ہو گئی ہوئی تھی۔ ضرور کوٹھی کے کسی کمرے میں شراب پی جا رہی تھی مگر کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں ٹوٹے ہوئے روشندان میں سے نیچے کمرے میں اتر گیا۔ کمرے میں ڈرم اور چھوٹے بڑے لکڑی کے کھوکھے پڑے تھے۔ وہاں بھی ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ پرانا دروازہ تھا۔ دہلیز کے اوپر کافی جگہ تھی۔ مجھے دوسری طرف سے دو آدمیوں کے دھیمی آواز میں باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے دہلیز کے اوپر چڑھ کر دروازے کے پٹ کے نیچے سے سر نکال کر دیکھا۔

دوسری طرف ایک مختصر سا کمرہ تھا جہاں ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کے بھاری بھرکم صوفے پر دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ چھت پر پنکھا چل رہا تھا۔ دیوار پر بتی جل رہی تھی، درمیان میں چھوٹی میز پر شراب کی بوتل گلاس وغیرہ پڑے تھے۔ دونوں آدمی شراب کی چسکیاں لیتے اور باتیں کر رہے تھے۔ ناگن درگا کی خوشبو برابر آ رہی تھی۔ دونوں میں سے ایک آدمی پختہ عمر کا تھا۔ اس کے گھنگھریالے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ دوسرا گٹھے ہوئے بدن کا نوجوان تھا۔ اس نے ٹی شرٹ پتلون پہنی ہوئی تھی۔ نوجوان نے پختہ عمر کے آدمی کو مخاطب کر کے کہا۔

"گورو کا دل اس لڑکی پر آ گیا ہے۔ وہ اسے اپنے پاس ہی رکھ لے گا، ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا ویرد چاچا۔"

ادھیڑ عمر کے آدمی کا نام ویرو چاچا تھا۔ ویرو چاچا بولا۔

"جیکی! کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ آخر ہم جو لڑکی کو اتنی مصیبت سے پولیس کا خطرہ مول لے کر اٹھا کر لائے ہیں تو ہمیں کیا ملا؟ کچھ بھی نہیں' لڑکی کو گورو نے سنبھال لیا ہے۔"

جیکی نے کہا۔

"میں تو کہتا ہوں کہ ہم لڑکی کو کسی بہانے یہاں سے دوبئی لے جاتے ہیں۔ وہاں اپنا ایک ایجنٹ ہے۔ کچھ نہیں تو پچاس ساٹھ ہزار میں لڑکی کو ضرور خرید لے گا۔"

ویرو چاچا نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"نہیں جیکی' یہ کام خطرناک ہے۔ گورو کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ اس کے گینگ کے آدمی دوبئی' شارجہ وغیرہ میں ہر جگہ موجود ہیں۔ اسے خبر ہو گئی تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا اور پھر لڑکی بھی تو گورو کے ساتھ بڑی چہک چہک کر باتیں کرتی ہے۔ ابھی اسے یہاں آئے دو دن ہی ہوئے ہیں اور گورو کی دیوانی ہو رہی ہے۔"

جیکی نے کہا۔

"چاچا! یہ لڑکی۔ کیا نام بتایا تھا اس نے؟"

"چندا رانی۔ یہی نام بتایا تھا۔" ویرو نے کہا۔

اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ یہ لوگ ناگن درگا کے بارے میں ہی گفتگو کر رہے ہیں۔ ان کی گفتگو سے یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ چندا یعنی درگا ناگن ابھی تک منحوس دیوتا کی بد دعا کے زیر اثر ہے اور اس کی یاد داشت واپس نہیں آئی اور وہ ابھی تک اپنے آپ کو ایک طوائف زادی یا عیاش قسم کی سوسائیٹی گرل ہی سمجھ رہی ہے اور اسی طرح رہ کر زندگی کا بھرپور لطف اٹھانا چاہتی ہے اور نہیں جانتی کہ اس طرح اس کی زندگی تباہی کے دہانے پر پہنچ رہی ہے۔ منحوس دیوتا نے اسی لیے اس کو بد دعا دی تھی اور اس کی یاد داشت سلب کر کے اس کے دل و دماغ کو اپنی مرضی کے مطابق بنا دیا تھا۔

جیکی کہہ رہا تھا۔

"یا تو یہ کوئی بڑی ہی بھولی بھالی لڑکی ہے اور یا پھر بے حد چالاک اور خرانٹ قسم کی لڑکی ہے جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکی ہے۔"

ویرو چاچا نے چسکی لگائی' سگریٹ کا کش لگایا اور بولا۔

"جیکی بیٹا! میرا مشورہ تو یہی ہے کہ ہمیں ابھی خاموش رہ کر دیکھنا چاہیے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

سامنے والی دیوار کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکی اندر آئی جس نے صرف بلاؤز اور پتلون پہنی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

"چاچا! تمہیں اور جیکی کو گورو دیو نے یاد کیا ہے۔"

دونوں جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور لڑکی کے پیچھے پیچھے دوسری طرف نکل گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ادھ کھلے دروازے کی دوسری طرف ایک مختصر سا کوریڈور تھا۔ آگے ایک دروازہ تھا جس میں سے درگا کی خوشبو کے تیز جھونکے نکل رہے تھے۔ ناگن درگا اسی کمرے میں تھی۔ دونوں آدمی لڑکی کے ساتھ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوگئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ میں کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔ میں بھی دروازے کی دوسری طرف آ گیا اور جلدی سے دیوار کی طرف مڑ کر ایک جگہ چھپ گیا۔ جہاں میں چھپا تھا وہاں ایک لکڑی کی پیٹی پڑی تھی۔ میں اس پیٹی کے پیچھے ہوگیا تھا۔ اس کمرے میں بھی شراب کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سر ذرا سا باہر نکال کر کمرے کا جائزہ لیا۔

میں نے دیکھا کہ یہاں بڑا قیمتی فرنیچر بچھا ہوا تھا۔ چھت کا فانوس جگمگا رہا تھا۔ اے سی بھی لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے کمرے کی فضا میں گرمی اور حبس بالکل نہیں تھا۔ سامنے صوفے پر ایک گول مٹول پھولی ہوئی توند والا آدمی پتلون کی پیٹی ڈھیلی کیے ہاتھ میں شراب کا گلاس پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ناگن درگا بڑی قیمتی ساڑھی پہنے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ جیکی اور ویرو چاچا نے اندر آ کر ہاتھ جوڑ کر صوفے پر بیٹھے

ہوئے بھاری بھرکم آدمی کو پرنام کیا۔ ویرو چاچا نے کہا۔

"گورو دیو نے ہمیں یاد کیا' ہم حاضر ہو گئے۔"

یہ وہی گورو دیو تھا جس کے بارے میں یہ دونوں آدمی تھوڑی دیر پہلے گفتگو کر رہے تھے۔ گورو دیو نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

دونوں ایک طرف ہو کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ گورو دیو نے ناگن درگا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"رانی جی! تم بیڈ روم میں چلو ہم ابھی آتے ہیں۔"

ناگن درگا نے بڑی خاص ادا سے گردن ایک طرف ڈھلکائی اور بولی۔

"جلدی آ جانا گورو دیو۔"

گورو نے ناگن درگا کا گال چوم لیا۔

"جلدی آ جاؤں گا۔ ان لوگوں کے ساتھ کچھ بزنس کی باتیں کرنی ہیں۔"

ناگن درگا اٹھ کر بڑے بانکپن سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد گورو نے ویرو چاچا سے مخاطب ہو کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"ویرو! رامیشورم کے بڑے پجاری کا ایجنٹ آیا تھا۔ اس نے چندا کو پسند کر لیا ہے۔ ایک لاکھ بیس ہزار میں سودا طے ہو گیا ہے۔ ایک لاکھ روپیہ وہ مجھے دے گیا ہے۔ کل شام سات بجے تم دونوں چندا کو لے کر جوہو والے بنگلے پر جاؤ گے۔ وہاں وہ تمہیں باقی کی رقم بیس ہزار روپے ادا کر دے گا۔ تم چندا کو اس کے حوالے کر دو گے اور ہاں یہ بیس ہزار روپے تم دونوں کا انعام ہو گا۔ کہو سالو! اب تو خوش ہو ناں؟"

ویرو چاچا اور جیکی ہنسنے لگے۔ ہاتھ جوڑ کر بولے۔

"گورو دیو! یہ سب آپ کی کرپا ہے۔"

ویرو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن گورو دیو! آپ کو تو چندا پسند آ گئی تھی۔"

گورو نے سگریٹ کا کش لگایا اور دھواں اڑاتے ہوئے بولا۔

"ارے ویرو چاچا پسند تو ضرور آ گئی تھی لیکن تم جانو ایک لاکھ کی رقم بھی بہت ہوتی ہے۔ لڑکیاں تو بمبئی میں اور بھی مل جائیں گی۔"

جیکی نے کہا۔

"گورو دیو! یہ رامیشورم والا بڑا پجاری کوئی بہت بڑا سیٹھ معلوم ہوتا ہے۔"

گورو نے کہا۔

"ارے وہ تو اس لڑکی کو سارے تامل ناڈو کے افسروں' منتریوں اور سیٹھوں میں چلائے گا اور لاکھوں کمائے گا۔ اس کا تو دھندا ہی یہی ہے۔ مندروں کی دکھشا سے انہیں کیا ملتا ہے۔"

میرا جسم غصے سے پھڑکنے لگا۔ اس کا مطلب تھا کہ ناگن درگا گڑھے میں سے نکل کر اندھے کنوئیں میں گرنے والی تھی جسے میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ویرو اور جیکی اٹھ کر جانے لگے تو گورو نے کہا۔

"چندا کل اس بنگلے سے باہر نہیں جائے گی۔ وہ شاپنگ وغیرہ کرنے کو کہے بھی تو تم لوگوں نے کوئی بہانہ بنا کر اسے ٹال دینا ہوگا۔ تم لوگ کل شام ٹھیک سات بجے چندا کو ایک پارٹی میں جانے کا بہانہ بنا کر اسے اپنے ساتھ گاڑی میں سیدھا جوہو والے بنگلے پر لے جاؤ گے۔ وہاں بڑے پجاری کا ایجنٹ موجود ہوگا۔ اس کا نام کرشنا پٹی ہے۔ میں نے اسے تمہارے فوٹو دکھا دیئے ہیں۔ تمہیں بھی اس کا فوٹو دکھا دوں گا۔ تم میرا خط بھی ساتھ لے جاؤ گے' جاؤ اب۔"

دونوں بدمعاش کمرے سے نکل گئے۔ اس کے ساتھ ہی گورو بھی اٹھ کر اس دروازے کی طرف بڑھا جس دروازے میں سے ناگن درگا باہر گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بیڈ روم میں جا رہا ہے جہاں ناگن درگا انتہائی بے خبری کی کیفیت میں خود کو ایک عیاش طوائف سمجھتے ہوئے اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ منحوس دیوتا کی بد دعا نے ناگن

درگا کی یاد داشت ہی گم نہیں کی تھی بلکہ اس کی عقل پر بھی پردہ ڈال دیا تھا۔ مجھے ہر حالت میں اس کی عزت آبرو کی حفاظت کرنی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یاد داشت واپس آ جانے کی صورت میں جو کہ ایک نہ ایک دن ضرور واپس آنی تھی' جب ناگن درگا پر یہ بھیانک انکشاف ہوگا کہ اس کے ساتھ کیسی کیسی ہولناک زیادتیاں ہوئی ہیں اور اس کی عزت و حرمت کی دھجیاں اڑ چکی ہیں تو وہ ضرور خودکشی کر لے گی۔ اس کے علاوہ مجھ پر ناگن درگا کے بڑے احسان تھے۔ اس نے بڑے موقعوں پر اپنی جان پر کھیل کر میری زندگی بچائی تھی۔ میرا انسانی فرض بھی بنتا تھا کہ میں اس لڑکی کو جو انتہائی بے خبری کے عالم میں تھی' جسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے' اس کی مدد کروں اور اسے تباہی اور بربادی کے گڑھے میں گرنے سے بچا لوں۔

چنانچہ میں بھی گورو جس طرف گیا تھا اس طرف چل پڑا۔

پرانے بنگلے میں میرے لیے چھپنے کے کافی امکانات تھے۔ میں دوسرے دروازے کی دہلیز کے اوپر سے رینگ کر دوسری طرف آگیا جہاں ایک اور چھوٹی سی راہ داری تھی۔ گورو دیو ایک کمرے میں داخل ہوگیا تھا۔ میں نے اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بیڈ روم ہے اور گورو اندر جانے کے بعد اس کا دروازہ ضرور بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دے گا۔ اس لیے میں نے ایک لمحے کی بھی دیر نہ کی اور راہ داری میں تیزی سے رینگ کر ابھی بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہی تھا کہ میں اندر گھس گیا اور ادھر ادھر دیکھے بغیر کمرے کی دیوار کے ساتھ ہی مڑ کر اپنے آپ کو قالین کے کنارے کے نیچے چھپا دیا۔ پتلا دبلا اور مختصر سا سانپ ہونے کی وجہ سے مجھے چھپنے میں آسانی ہوتی تھی۔

یہ واقعی بیڈ روم تھا اور خوب سجا سجایا تھا۔ روشنی مدھم اور خواب انگیز تھی۔ درگا ناگن پلنگ پر ٹیک لگائے بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ گورو نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی اور پلنگ پر چڑھ کر ناگن درگا کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنا شراب کا گلاس ہاتھ میں پکڑ کر اپنے ساتھ ہی لایا تھا۔ درگا کا گال چوم کر بولا۔

"رانی تم نے تو مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ تمہارے بغیر ایک پل گزارنا مشکل ہو گیا ہے۔"

ناگن درگا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گورو جی! میں تو دو دن میں ہی آپ کی دیوانی ہو گئی ہوں۔"

گورو دیو اس کا منہ چومنے لگا تو ناگن درگا نے ہاتھ سے اسے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"پہلے یہ گلاس تو ختم کر لیں۔"

گورو غٹاغٹ گلاس والا دارو چڑھا گیا۔ گلاس کو پلنگ کے پاس رکھی تپائی پر رکھ دیا اور ناگن درگا سے دست درازیاں شروع کر دیں۔ ناگن درگا کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ منحوس دیوتا کی بد دعا کے زیر اثر وہ خود اپنے آپ کو بدمعاش گورو کو پیش کر رہی ہے۔ گورو بھی چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ اسے معلوم تھا کہ لڑکی اس کے پاس صرف ایک رات کے لیے ہی ہے۔ چنانچہ وہ اس رات کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ گورو حد سے آگے بڑھ رہا ہے تو میں تیزی سے ایک طرف سے رینگتا ہوا پلنگ کی بائیں پٹی کی طرف آ گیا۔ گورو اس طرف لیٹا ہوا تھا اور ناگن درگا کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

میں گورو کو ہمیشہ کی نیند سلا دینا چاہتا تھا مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرح اس کی موت کا الزام ناگن درگا پر لگ سکتا تھا۔ کسی نے یقین نہیں کرنا تھا کہ گورو کو سانپ نے کاٹا ہے۔ میں نے سب کچھ سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے اور گورو کے جسم میں کتنا زہر داخل کرنا ہے۔ میں صرف اتنا ہی زہر اس کے خون میں شامل کرنا چاہتا تھا کہ جس سے وہ ساری رات بے ہوش پڑا رہے اور دوسرے دن بھی اس قابل نہ رہے کہ ناگن درگا کی عزت برباد کر سکے۔ یہ بات سانپ کا جسم اور انسان کا ذہن ہونے کے ناطے میرے اختیار میں تھی۔ میں پلنگ کی پٹی پر چڑھ گیا۔ بیڈ روم میں روشنی بڑی مدھم تھی۔ ویسے بھی اس وقت گورو پر جذباتی ہیجان کی کیفیت طاری تھی۔ میں

پلنگ کی پائنتی کی جانب آ گیا اور گورو دیو کی ننگی پنڈلی پر تیزی سے اس طرح ڈس دیا جس طرح کوئی آدمی کس کے بدن پر ذرا سی سوئی چبھو کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اتنے مختصر سے وقفے میں ہی میں نے جتنا زہر گورو کے خون میں شامل کرنا تھا وہ میں نے کر دیا تھا۔

میں اپنا کام کرنے کے بعد دیوار کے ساتھ لگ کر چھپ گیا۔

زہر نے فوراً اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ گورو ناگن درگا کا بازو پکڑ کر کسی بات پر ہنس رہا تھا کہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ ناگن درگا نے پوچھا۔

"کیا ہوا گورو دیو؟"

بدمعاش گورو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر سر پر ہاتھ رکھ کر ماتھے کو دبانے لگا۔

"چکر سا آ گیا ہے۔"

ناگن درگا نے کہا۔

"زیادہ تو نہیں پی لی گورو جی؟"

گورو ناگن درگا کے اس سوال کا جواب نہ دے سکا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ناگن درگا اسے جگانے کی کوشش کرنے لگی۔ گورو نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔ سونے دو' سونے دو۔"

اور اس کے بعد اس کی کوئی آواز نہ آئی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا اور اب اسے دوسرے دن دوپہر تک بے ہوش ہی رہنا تھا۔ ناگن درگا یہی سمجھی کہ گورو نے زیادہ شراب پی رکھی ہے۔ وہ پلنگ پر دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔ ساری رات میں دیوار کے پاس قالین میں سے سر باہر نکالے لیٹا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں ان دونوں کو دیکھ لیتا تھا۔ ناگن درگا نے دو تین بار پہلو بدلا مگر گورو کے جسم نے کوئی حرکت نہ کی۔ اس کا جسم حرکت کر بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ میں نے اسے صرف بے ہوش کیا تھا۔ ورنہ میں اسے ہلاک بھی کر سکتا تھا۔

دن نکلا تو وہی خالی بلاؤز اور پتلون والی لڑکی نے آ کر ناگن درگا کو جگایا اور کہا۔

"چائے پی لو چندا۔ گورو جی کو بھی جگا دو۔"

گورو جی کو جگانا ممکن نہ تھا۔ دونوں اسے جگا رہی تھیں اور وہ ہر بار پہلو بدل کر کہتا۔

"مجھے سونے دو۔ مجھے سونے دو' دفع ہو جاؤ۔"

اس بدمعاش کے تھوڑا تھوڑا بولنے کا یہ فائدہ ہوا تھا کہ کسی کو شک نہیں ہوا تھا کہ گورو بے ہوش ہے' ورنہ وہاں ضرور کوئی ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور ڈاکٹر بلا لیا جاتا اور حالات کوئی دوسری شکل اختیار کر جاتے۔ ناگن درگا بلاؤز والی لڑکی کے ساتھ یہ کہہ کر چل دی کہ گورو جی نے رات زیادہ پی لی تھی انہیں آرام کرنے دو۔ گورو کو دوپہر کے بعد ہوش آیا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت کمرے میں کوئی دوسرا نہیں تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ گورو اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے سر اور بازوؤں کو ہاتھوں سے دبانے لگا۔ اتنے میں ویرو چاچا اور جیکی اندر آ گئے۔

گورو دیو! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

گورو نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"بھگوان جانے یہ شراب کیسی تھی ایسا بے سدھ ہو کر پڑا کہ اب آنکھ کھلی ہے۔ اب بھی جسم درد کر رہا ہے۔ ارے جیکی! سالے یہ شراب تم کہاں سے لائے تھے؟"

اس نے کہا۔

"گورو دیو! مائیکل کی دکان سے لایا تھا۔ روز ہی وہاں سے لاتا ہوں۔"

"کل اس نے تمہیں کچی شراب دے دی تھی آج اس کی طبیعت درست کرتا ہوں۔"

گورو نے چلا کر کہا۔

"ارے میرے لیے کافی بنا کر لاؤ سوسی؟"

پھر وہ پلنگ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ویرو چاچا نے پوچھا۔

"سب معاملہ تیار ہے گورو دیو۔"

گورو بولا۔

"بس شام کو لڑکی کو لے کر جوہو پہنچ جاؤ۔ آج رات وہ میرے ساتھ ہی سوئی تھی ابھی اٹھ کر گئی ہے۔"

ادھیڑ عمر گورو شاید ان دونوں پر اپنی مردانگی کا رعب جمانا چاہتا تھا۔ ویرو چاچا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گورو دیو! وہ تو آپ پر جان چھڑکتی ہے۔"

گورو نے بڑی شان سے سر اٹھا کر کہا۔

"ہم بھی تو اپنے مرد ہونے کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ رات کو میرے چرنوں میں بچھی جا رہی تھی۔ سالی جہاں بھی ہوگی یاد کرے گی میرے ایسا مرد اسے کہیں نہیں ملے گا۔"

"کیوں نہیں' کیوں نہیں۔" جیکی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

بلاؤز پتلون والی لڑکی کافی کی پیالی لے کر آگئی۔ گورو جی نے پیالی لے لی اور کہا۔

"وہ چندا کہاں ہے؟"

لڑکی نے کہا۔

"وہ باتھ روم میں تیار ہو رہی ہے۔"

گورو دیو نے کہا۔

"اسے کہو کہ اچھی سی ساڑھی پہنے' آج شام اسے جوہو کی پارٹی میں جانا ہے۔"

"او کے۔ باس۔"

بلاؤز والی لڑکی چلی گئی۔ گورو نے ویرو سے کہا۔

"مدراسی ایجنٹ کرشنا پٹی سے سو سو کے نوٹوں میں بیس ہزار لینا۔"

پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"اس سالے کے پاس سو سو کے نوٹ کہاں ہوں گے۔ چلو' جو بھی نوٹ دے لے لینا۔ مگر خاص خاص نشان دیکھ لینا۔ کہیں نقلی نوٹ نہ ہوں۔"

"گورو دیو! وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتا کہ آپ کو دھوکہ دے۔ جعلی نوٹ دے کر وہ جائے گا کہاں؟"

"ہاں یہ تو ہے۔"

یہ کہہ کر گورو کافی پینے لگا۔ پھر اپنی ایک ٹانگ کو اوپر نیچے کرتے ہوئے بولا۔

"سالا ٹانگوں میں جیسے جان نہیں ہے۔"

جیکی نے کہا۔

"گورو دیو! دبا دوں؟"

"نہیں نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

پھر ان دونوں کو سمجھانے لگا۔

"تم دونوں لڑکی کو لے کر یہاں سے نکل کر داور کی طرف سے ہو کر جوہو جاؤ گے۔ میں تمہیں ایجنٹ کی فوٹو دکھائے دیتا ہوں۔"

اس نے سرہانے کے نیچے سے ایک بٹوہ نکالا۔ بٹوہ کھول کر اس میں سے ایک تصویر نکال کر دونوں کو دے دی۔

"یہ کرشن پٹی ایجنٹ ہے۔ یہ تمہیں جوہو والے بنگلے میں ملے گا۔ لڑکی اس کے حوالے کر کے اس سے بیس ہزار روپے لے لینا۔ مگر لڑکی وہاں موجود نہیں ہونی چاہیے۔ اسے اندر بھجوا دینا سمجھ گئے؟"

"جی ہاں۔" دونوں بیک زبان بولے۔

"ایجنٹ کو میں نے تمہاری فوٹو بھی دکھادی ہے اور اس نے تم دونوں کو پہلے بھی دیکھا ہوا ہے۔ کہہ رہا تھا میں جیکی اور ویرو چاچا کو پہچانتا ہوں۔"

دروازے کا پردہ ہٹا اور ناگن درگا اندر داخل ہوئی' اس نے نیلے رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ وہ واقعی بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ میں نے اس سے پہلے اسے اتنا خوبصورت کبھی نہیں دیکھا تھا۔ گورو نے اس کی طرف دیکھ کر کافی کی پیالی تپائی پر رکھ دی اور جیکی سے کہا۔

"اچھا تم لوگ جاؤ' ٹھیک سات بجے یہاں آ جانا۔ آؤ چندا رانی آ جاؤ۔"

ناگن درگا نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"گورو دیو! سات بجے کوئی خاص کام ہے کیا؟"

گورو نے کہا۔

"تم بیٹھو تو سہی میری جان' ابھی بتاتا ہوں۔"

گورو نے ناگن درگا کے گلے میں بازو ڈال کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ ناگن درگا مسکرا رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ناگن درگا میں اس قدر انقلاب بھی آ سکتا ہے۔





ناگن درگا نے کہا۔

"گورو جی! رات آپ کو کیا ہو گیا تھا؟ معلوم ہوتا تھا زیادہ پی گئے تھے۔"

گورو نے فوراً کہا۔

"لیکن تمہیں تو خوش کر دیا تھا ناں؟"

ناگن درگا نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

"ہاں، میں بہت خوش ہوں۔"

بدمعاش گورو کو کچھ یاد نہیں تھا کہ رات اس نے کیا کیا تھا اور اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"کچھ زیادہ ہی پی گیا تھا۔ بس اس کے بعد ایسی گہری نیند سویا کہ اب جاگا ہوں۔"

پھر سگریٹ سلگا کر کہنے لگا۔

"ہاں چندا رانی۔ آج شام تمہیں ڈیرو اور جیکی کے ساتھ جوہو والے بنگلے پر جانا ہے، وہاں ایک خاص ڈانس پارٹی ہے۔"

ناگن درگا نے خوش ہو کر کہا۔

"میں ضرور جاؤں گی گورو جی۔ کیا یہ ساڑھی ٹھیک رہے گی یا کوئی دوسری پہن لوں؟"

گورو نے کہا۔

"نہیں یہی ٹھیک رہے گی۔"

وہ ناگن درگا سے دست درازی کرنے لگا۔ ناگن درگا نے پہلے کی طرح کوئی مزاحمت نہ کی۔ گورو رات کا غصہ دن کے وقت شاید اتارنا چاہتا تھا۔ میں اسے دوسرا انجکشن دینے کی تیاریاں کرنے لگا۔ لیکن میرے پہلے انجکشن کا ابھی اثر باقی تھا۔ ادھر ادھر ہاتھ چلانے کے بعد گورو کو احساس ہوگیا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ فوراً" ہاتھ کھینچ لیا اور بولا۔

"اچھا اب تم جاکر اپنے اور میرے لیے کھانا تیار کراؤ۔ ہم دونوں ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔"

ناگن درگا اوکے کہہ کر چلی گئی۔ گورو نے اس کے جانے کے بعد اپنے ماتھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔

"سالے گورو دیو کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

اس کے بعد پلنگ پر سے اٹھ کر وہ بھی کمرے سے نکل گیا۔ دوسرے کمرے سے مجھے ناگن درگا کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کسی کو کھانے کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے یہیں رہ کر شام ہو جانے کا انتظار کرنا چاہیے یا بنگلے کے باہر کسی جگہ چھپ جانا چاہیے تاکہ جب ویرو چاچا اور جیکی ناگن درگا کو لے کر باہر نکلیں تو میں بھی ان کے ساتھ ہو جاؤں۔ مجھے کیا کرنا تھا میں نے سوچ لیا ہوا تھا۔

آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کوئی پتہ نہیں یہ لوگ بیڈ روم میں واپس نہ آئیں اور باہر کے باہر ہی نکل جائیں۔ چنانچہ میں وہاں سے کھسک کر پچھلے کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے کی راہ داری سے ہوتا ہوا دوسرے کمرے میں گھس گیا اور اس کے روشندان میں سے ہو کر بنگلے کے عقبی برآمدے میں اتر آیا۔ یہ ایک ویران سا پرانا بنگلہ تھا۔ وہاں چھپنے کی بہت جگہیں تھیں۔ میں برآمدے کے بالکل سامنے ایک جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ دن گزرتا چلا گیا۔ جب سورج مغرب کی طرف ڈوب گیا تو بنگلے میں ایک نئی کار داخل ہوئی۔ یہ وہی نئے ماڈل کی گاڑی تھی جو میں نے یہاں آتے وقت

دیکھی تھی۔ گاڑی برآمدے کے بالکل سامنے آ کر رک گئی۔ اس میں سے ویرو چاچا اور جیکی اترے۔ جیکی نے کہا۔

"چاچا تم گاڑی میں ہی رہو' میں چندا کو لے کر آتا ہوں۔"

ویرو چاچا بولا۔

"کوئی پتہ نہیں گورو دیو نے کوئی خاص پیغام نہ دیا ہو۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔

دونوں برآمدے میں سے ہو کر کوٹھی کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ لوگ اسی گاڑی میں ناگن درگا کو لے کر جوہو جا رہے تھے۔ جوہو بمبئی شہر کے ایک پرانے مگر فیشن ایبل علاقے کا نام تھا۔ وہاں اس بدمعاش گورو کا کوئی بنگلہ تھا جہاں اس قسم کے مذموم دھندلے ہوتے تھے۔ میں نے سوچا کہ ابھی سے گاڑی میں چھپ کر بیٹھ جانا چاہیے۔ چنانچہ میں جھاڑیوں میں سے نکلا اور گاڑی کی طرف بڑھا۔ گاڑی کے سارے دروازے بند تھے۔ کسی طرف سے اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس خیال سے کہ جب دونوں آدمی ناگن درگا کو لے کر آئیں تو ممکن ہے میں گاڑی میں داخل نہ ہو سکوں' میں گاڑی کے پچھلے حصے میں جہاں گاڑی کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی اس پر چڑھ کر اس کے پیچھے چمٹ گیا۔ ان لوگوں نے اندر کافی دیر لگا دی تھی۔ شاید وہ لوگ سات بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔

آخر ان کی آوازیں سنائی دیں۔ برآمدے کی بتی روشن کر دی گئی تھی۔ کیونکہ شام کا جھٹ پٹا پھیل گیا تھا۔ ویرو چاچا اور جیکی ناگن درگا کو لے کر باہر آ گئے۔ ناگن درگا اسی نیلی ریشمی ساڑھی میں تھی اور دونوں بدمعاشوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ ویرو چاچا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور جیکی ناگن درگا کو لے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پچھلی سیٹ کا دروازہ ابھی آدھا کھلا تھا۔ اچانک مجھے خیال آ گیا کہ اگر راستے میں جیکی کی نیت خراب ہو گئی اور اس نے ناگن درگا سے زیادتی کی کوشش کی تو میں اس کی عزت بچانے کے لیے کچھ نہ کر سکوں گا۔ کیونکہ دروازہ بند ہو گا اور میں گاڑی

کے اندر نہیں جا سکوں گا۔ اندھیرا تھا' میں جلدی سے نمبر پلیٹ سے نیچے اتر آیا اور تیزی سے رینگتا ہوا پچھلے ادھ کھلے دروازے میں سے کھسک کر سیٹ کے نیچے گھس گیا۔ اس وقت جیکی سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگا رہا تھا۔

ویرو چاچا نے اگلی سیٹ سے آواز لگائی۔

"ارے جیکی کی اولاد دروازہ بند کر۔"

جیکی نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور بولا۔

"ہاں چاچا پارٹی میں وقت پر پہنچنا چاہیے۔"

ناگن درگا نے پوچھا۔

"یہ کس کی پارٹی ہے؟"

جیکی نے کہا۔

"ولایت سے گورو جی کا ایک دوست آیا ہوا ہے۔ اس نے ڈانس پارٹی کا انتظام کیا ہے۔ بڑی فیشن ایبل لڑکیاں آئیں گی فلم ایکٹرسیں بھی ہوں گی۔"

"اچھا؟" ناگن درگا نے خوش ہو کر کہا۔ "پھر تو بڑا مزا آئے گا۔"

جیکی نے کہا۔

"ہمیں تو صرف تم سے باتیں کر کے ہی مزا آتا ہے میری جان۔"

اگلی سیٹ پر ویرو چاچا نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے جیکی! چپکے سے بیٹھے رہو۔"

"ٹھیک ہے چاچا' ٹھیک ہے۔ اوکے اوکے۔"

ناگن کی ہلکی سی ہنسی کی آواز مجھے سنائی دی۔ گاڑی کسی بڑی سڑک پر آ کر پوری رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔ گاڑی جوہو کے علاقے والے بنگلے کے پورچ میں جا کر رک گئی۔ سب لوگ گاڑی سے باہر نکل گئے۔ میں بھی موقع دیکھ کر سیٹ کے نیچے سے نکل کر باہر آ گیا۔ جیکی اور ویرو چاچا بنگلے کے برآمدے کی طرف بڑھے تو اندر سے ایک کالے رنگ کا منحنی سا آدمی مسکراتا ہوا نمودار ہوا۔ اس نے سوٹ پہن رکھا تھا۔

ویرو چاچا کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔

میرا نام کرشنا پٹی ہے۔ تم لوگ جیکی اور ویرو چاچا ہو؟"

"لیس میں جیکی ہوں' یہ ویرو چاچا ہے۔" جیکی نے کہا۔

کرشنا پٹی نے ناگن درگا کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

"ویری بیوٹی فل۔ اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

ناگن درگا ان لوگوں کے ساتھ اندر کمرے میں چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا صرف پردہ گرا ہوا تھا۔ میں بھی ایک طرف سے رینگ کر کمرے میں داخل ہو کر ایک طرف چھپ گیا۔ ناگن درگا نے جیکی سے پوچھا۔

"پارٹی کب شروع ہوگی؟ دوسری عورتیں کہاں ہیں جیکی؟"

جیکی بولا۔

"ابھی آ جائیں گی۔"

مدراسی دلال نے جیکی اور ویرو سے کہا۔

"تم لوگ ذرا میرے ساتھ آؤ۔"

جیکی اور ویرو چاچا اٹھ کر مدراسی دلال کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ناگن درگا کمرے میں اکیلی رہ گئی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر مدراسی دلال ناگن درگا کو ساتھ لے کر رامیشورم کی طرف چل دیا تو میرے لیے کئی مسئلے پیدا ہو سکتے ہیں۔ خدا جانے یہ دلال ناگن درگا کو لے کر ریل گاڑی میں سفر کرے گا یا ہوائی جہاز میں سوار ہو کر رامیشورم جائے گا۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ رامیشورم بھارت کے جنوب میں واقع ہے اور بمبئی سے بڑے طویل فاصلے پر ہے۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا اسی وقت کر گزرنا چاہیے تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ میں کیا کر سکتا تھا۔ میں ناگن درگا کے سامنے ظاہر ہونے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی یاد داشت ختم ہو چکی تھی۔ وہ تو مجھے بالکل نہیں پہچانے گی اور سانپ کو سامنے دیکھ کر شور مچا دے گی اور بنگلے کے آدمی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر میں ناگن کو ذرا سا ڈس دوں تو یہ تو یقینی بات تھی کہ سانپ کا زہر اسے ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے مجھے اگر کوئی سانپ کاٹتا تو میں بھی ہلاک نہیں ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے میرے زہر کے اثر سے ناگن درگا کی یاد داشت واپس آ جائے۔ یہ اندھیرے میں تیر چلانے والی بات تھی۔ ہو سکتا تھا کہ تیر ٹھیک نشانے پر جا کر لگے۔ اس کے امکانات سو میں سے ایک فیصد تھے۔ لیکن میں ایک فیصد کو آزمانا چاہتا تھا۔

ناگن درگا سامنے والے صوفے پر بڑے انداز دلربائی سے ساڑھی سنبھال کر بیٹھی دیوار پر لگی تصویروں کو اور کبھی چھت کو دیکھ رہی تھی۔ میں وقت ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں رینگتا ہوا صوفے کے پیچھے آ گیا۔ ناگن درگا صوفے پر بازو پھیلائے ہوئے تھی۔ اس کا بازو آستین سے نیچے تک عریاں تھا۔ یہی میرا ٹارگٹ تھا۔ میں صوفے کی پشت پر چڑھ گیا اور مزید کچھ سوچے سمجھے بغیر ناگن درگا کے بازو پر ڈس دیا۔ ناگن درگا نے جلدی سے اپنا بازو جھٹک کر اٹھا لیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ پیچھے دیکھنے لگی۔ میں اتنے میں صوفے کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔

ناگن درگا اپنے بازو کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

پھر ایک عجیب بات ہو گئی۔ اچانک ناگن درگا میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔ میں اچھل کر صوفے کے اوپر آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ناگن درگا کی جگہ ایک چھوٹا سانپ صوفے کے قریب قالین پر بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے ناگن درگا کے سانپ کے جسم کی تیز بو آنے لگی۔ ناگن درگا سانپ کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ میں نے انسانی آواز میں کہا۔

”درگا! درگا! میں کرم داد ہوں۔“

ناگن درگا تیزی سے رینگ کر میرے پاس آ گئی اور عورت کی آواز میں بولی۔

”ہے بھگوان۔ کرم داد! میں کہاں ہوں؟“

میں نے کہا۔

"یہ لمبی کہانی ہے' پھر بتاؤں گا۔ ابھی تم میرے ساتھ ایک طرف چھپ جاؤ۔ جلدی کرو' وہ لوگ آ رہے ہیں۔"

مجھے مدراسی دلال' جیکی اور ویرو چاچا کی آوازیں سنائی دی تھیں جو کمرے میں واپس آ رہے تھے۔ ناگن درگا جلدی سے میرے ساتھ رینگ کر بڑی الماری کی اوٹ میں ہوگئی۔ تینوں آدمی اندر آ کر حیرانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ مدراسی دلال نے پوچھا۔

"وہ چندا کہاں چلی گئی ہے جی؟"

ویرو اور جیکی گھبرا سے گئے تھے۔ ویرو نے کہا۔

"یہیں کہیں ہوگی' کہاں جا سکتی ہے۔"

پھر انہوں نے ناگن درگا کو چندا رانی' چندا رانی کہہ کر آوازیں دینی شروع کر دیں۔ مگر ناگن درگا وہاں عورت کے روپ میں ہوتی تو انہیں دکھائی دیتی۔ وہ تو سانپ کی شکل میں میرے ساتھ چھپی ہوئی تھی۔ میرا چلایا ہوا تیر اندھیرے میں ٹھیک نشانے پر جا کر لگا تھا اور ناگن درگا کی یاد داشت واپس آگئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو پہچان لیا تھا۔ مجھ سے سرگوشی میں پوچھا۔

"کرم داد! یہ کون لوگ ہیں؟"

میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔

"اس وقت خاموش رہو' تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔"

مدراسی دلال نے جھنجھلا کر کہا۔

"اوپر جا کر دیکھو جی' باہر جا کر دیکھو جی۔ عورت بھاگ گئی تو بڑی گڑ بڑ ہو جائے گی جی۔"

ویرو بولا۔

"گھبراؤ نہیں سیٹھ' چندا کہیں نہیں جائے گی۔ آؤ جیکی باہر چل کر دیکھتے ہیں۔"

وہ دونوں باہر گئے تو مدراسی دلال بھی بڑبڑاتا ہوا ان کے پیچھے باہر نکل گیا۔ ناگن

درگا نے سرگوشی میں پوچھا۔

"کرم داد! یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے اسے کہا۔

"میرے ساتھ آ جاؤ' ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

میں ناگن درگا کو لے کر بنگلے کے ڈرائینگ روم سے نکل کر برآمدے کی دیوار کے ساتھ ساتھ رینگتا اسے بنگلے کے پیچھے لے آیا جہاں اندھیرا تھا اور چھوٹا سا ویران باغیچہ تھا۔ ناگن درگا مجھ سے بار بار پوچھ رہی تھی کہ ہم لوگ کہاں ہیں' یہ کون سی جگہ ہے؟ میں اسے یہی کہہ رہا تھا کہ وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلی آئے۔

"پہلے یہاں سے نکلنا ضروری ہے۔"

بمبئ شہر کے اس علاقے میں میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ اس طرف کھلی جگہ تھی۔ دور سمندر تھا اور ہر طرف ریت ہی ریت تھی۔ کہیں کہیں ناریل کے جھنڈ تھے ہم ان درختوں میں آ گئے۔ یہاں میں نے ناگن درگا کو شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی' سارے واقعات بیان کر دیے۔ وہ حیران ہو کر سنتی رہی۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ کہنے لگی۔

"کرم داد! یہ بھیروں دیوتا کے سراپ (بد دعا) کا اثر تھا۔ تمہارے ڈسنے سے اس بددعا کا اثر ختم ہوگیا ہے۔ مگر کچھ پتہ نہیں کہ میری یہ حالات کب تک برقرار رہ سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے' مجھے یقین ہے کہ اب تم بالکل ٹھیک ہوگئی ہو اور تم پر بد دعا کا اثر باقی نہیں رہا۔"

ناگن درگا نے اداس ہو کر کہا۔

"لیکن میں انسانی روپ سے ایک بار پھر سانپ میں تبدیل ہوگئی ہوں۔ بڑی مشکل سے مجھے اس سے نجات ملی تھی۔"

میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا درگا!"

وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔

"کرم داد! تم نے میری خاطر جو کچھ کیا ہے میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ مگر ہم دونوں اس وقت سانپوں کے روپ میں ہیں اور بمبئی میں ہیں۔ یہاں سے ہم جہاں بھی گئے راستے میں ہمارے لیے بے شمار خطرے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔

"ہم یہاں سے بھوپال جائیں گے' میں وہاں اپنے دوستوں کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ ہی چلو۔"

ناگن درگا کہنے لگی۔

"مجھے معلوم ہے میں جہاں بھی گئی بھیروں دیوتا کی بد دعا میرا پیچھا کرے گی۔ کچھ پتہ نہیں میرا انجام کیا ہونے والا ہے۔ میں تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ میں تمہیں بھوپال چھوڑ کر آگے اپنے گاؤں لکشمن پور چلی جاؤں گی۔ میرا جو بھی انجام ہو گا میں اسے جھیل لوں گی۔ ہاں ایک بات میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔ اگر راستے میں میرے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا اور دیوتاؤں کی بد دعا کے اثر سے میں زخمی ہو گئی یا میرا جسم کٹ گیا تو تم میری محبت کی خاطر صرف اتنا کرنا کہ میرا زخمی یا کٹا ہوا جسم لے کر سیدھا متھرا شہر چلے جانا۔ وہاں شہر سے باہر ایک ویران شمشان بھومی ہے۔ اس کو راجہ کی شمشان بھومی کہتے ہیں۔ وہاں جس جگہ ہندو لوگ اپنے مردے جلاتے ہیں اس کی راکھ میں مجھے دبا دینا۔ دو دن کے بعد رات کے وقت آکر مجھے وہاں سے نکال لینا' میں بالکل ٹھیک ہو چکی ہوں گی۔"

میں نے کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر راستے میں ایسا کوئی حادثہ پیش آگیا تو میں تمہاری ہدایت پر عمل کروں گا۔"

میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور ساتھ ہی مجھے اپنے جسم کا بوجھ محسوس ہونا شروع ہوگیا۔ میں نے ناگن درگا سے کہا۔

"درگا! میری کایا پلٹ ہونے والی ہے۔ میرا جسم بھاری ہونے لگا ہے۔ مجھے جھٹکا بھی لگا ہے۔"

ناگن درگا نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے' اس طرح نہ صرف تم انسانی روپ میں آ جاؤ گے بلکہ میرا منہ چوم کر مجھے بھی عورت کی شکل میں واپس لا سکو گے۔"

میں نے اسے کہا۔

"یہاں سے باہر چلے چلتے ہیں۔"

ہم درختوں کے جھنڈ سے نکل کر ایک طرف رینگنے لگے۔ مجھے بار بار جھٹکے لگ رہے تھے۔ میں رک گیا۔

"درگا!یہاں رک جاؤ۔"

ناگن درگا بالکل میرے سامنے آ کر کنڈل مار کر بیٹھ گئی۔ اس کے فوراً" بعد میں سانپ کی بجائے انسانی شکل اور انسانی جسم کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ناگن درگا نے خوش ہو کر کہا۔

"کرم داد! جلدی سے میرا منہ چوم لو تا کہ میں بھی عورت کی شکل میں واپس آ جاؤ۔"

میں نے کہا۔

"کہیں کچھ اور نہ ہو جائے درگا۔ پہلے بھی اس طرح تمہارا منہ چومنے سے کچھ نہیں ہوا تھا۔"

اس نے کہا۔

"تم جلدی سے میرا منہ چومو۔"

میں نے ناگن درگا کو اٹھا لیا اور پھر اس کے سانپ والے منہ کو سخت بیزاری کے

ساتھ اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگا کر چوم لیا۔ مگر جیسی کہ مجھے توقع تھی اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ناگن درگا سانپ ہی کی شکل میں رہی۔ اس نے کہا۔

"کرم داد! ایک بار پھر میرا منہ چومو۔"

میں نے ایک بار پھر ایسا ہی کیا مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور ناگن درگا ویسے سانپ کی شکل میں ہی رہی۔ اس نے بڑی آزردگی سے کہا۔

"کرم داد! میں دیوتا کی بد دعاؤں کے اثر میں ہوں' مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو۔ تم بھوپال چلے جاؤ مجھے قسمت جہاں لے جائے گی' چلی جاؤں گی۔"

لیکن میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ اپنی ایک مخلص دوست کو جو مجھ سے بے پناہ محبت بھی کرتی تھی یوں کمپرسی کے عالم میں بے یارومددگار نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے ناگن درگا کا منہ پھر چوم لیا۔ لیکن اس بار صرف محبت کی وجہ سے چوما اور کہا۔

"درگا! میں تمہیں اکیلی نہیں چھوڑوں گا۔ ایک طرف تمہارے دیوتا تمہارے دشمن ہیں' دوسری طرف دنیا والے تمہیں مارنے کو دوڑیں گے۔ تم میرے ساتھ چلو گی۔ جہاں میں رہوں گا تم بھی اس وقت تک میرے ساتھ رہو گی جب تک تم اپنی اصلی شکل میں واپس نہیں آ جاتی۔ پھر میں تمہیں خود تمہار"ے گاؤں چھوڑ آؤں گا۔"

میں نے ناگن درگا کو اپنی جیکٹ کی باہر والی جیب میں ڈالا اور جس طرف بمبئی شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں اس طرف چل پڑا۔ میدان پار کر کے میں بڑی سڑک پر آیا تو وہاں میں نے جیکی اور ویرو چاچا کو دیکھا جو ناگن درگا یعنی چندا کی تلاش میں ناکام ہو کر ایک طرف کھڑے تھے۔ میں ان کے قریب سے گزر گیا۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ جس عورت کی تلاش میں وہ پاگلوں کی طرح بھٹکتے پھر رہے ہیں وہ اس وقت میری جیب میں ہے۔ اس وقت اگر میں سانپ کے روپ میں ہوتا تو ان بدمعاشوں کو کبھی زندہ نہ چھوڑتا۔

میں نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ میری جیب میں کوئی پیسہ نہیں تھا۔ ناگن درگا میری جیب میں سے سر تھوڑا سا باہر نکالے ہوئے تھی۔ اس نے

جیکی اور ویرو چاچا کے قریب سے گزرتے ہوئے انہیں بالکل نہیں پہچانا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"ابھی جو دو آدمی پیچھے فٹ پاتھ پر کھڑے تھے جانتی ہو وہ کون لوگ ہیں؟"

ناگن درگا نے کہا۔

"معلوم نہیں' کون تھے وہ؟"

میں نے کہا۔

"بس کوئی تھے' اب ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا۔"

وہ ضد کرنے لگی آخر میں نے اسے بتا دیا کہ وہ ویرو چاچا اور جیکی تھے۔ درگا ناگن نے کہا۔

"کرم داد! تمہیں خدا کی قسم ہے' یہیں ٹھہر جاؤ۔"

میں ذرا ٹھہرا تو ناگن درگا بجلی کی طرح میری جیب میں سے اچھل کر سڑک پر گری اور فٹ پاتھ کی روشنی میں میں نے اسے ویرو چاچا اور جیکی کی طرف دوڑتے دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔ جیکی اور ویرو فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ واپس جا رہے تھے۔ میں ان پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اچانک پہلے ویرو چاچا گرا۔ اس کو سنبھالتے ہوئے جیکی بھی فٹ پاتھ پر اس کے اوپر ہی گر پڑا۔ گرنے کے بعد دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی حرکت نہ کی۔ اتنے میں ناگن درگا فٹ پاتھ پر ایک طرف لہرا لہرا کر تیزی سے رینگتی میری طرف آتی دکھائی دی۔ قریب آئی تو میں نے اسے جھک کر اٹھایا۔ وہ بولی۔

"میں نے ان سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لیا ہے۔ ان لوگوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

میں نے اسے جیب میں ڈال لیا اور کہا۔

"تم نے ٹھیک کیا ہے۔ اب ہمیں بمبئی کے ریلوے سٹیشن پر پہنچنا ہے اور میرے پاس بس کا بھی کرایہ نہیں ہے۔ بھوپال کے کرائے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ناگن درگا نے کہا۔

"کرم داد! تم نے کہانیوں میں ضرور پڑھا ہو گا کہ زمین کے اندر جو خزانے دفن ہوتے ہیں ان پر ایک سانپ بیٹھا ہوتا ہے جو ان خزانوں کی حفاظت کرتا ہے۔"

"ہاں۔ پڑھا بھی ہے اور سنا بھی ہے۔" میں نے چلتے ہوئے کہا۔

ناگن درگا بولی۔

"یہاں زمین کے نیچے کسی خزانے کا تو مجھے علم نہیں ہے مگر میں کسی کوٹھی کے اندر سے تمہیں کچھ نوٹ لا کر دے سکتی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"میں تمہیں ہرگز ہرگز اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ کوٹھی میں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا؟ کسی کی نظر بھی پڑ گئی تو سب ڈانگ سوٹے لے کر تمہارے پیچھے دوڑ پڑیں گے۔"

"تو پھر تم کیا کرو گے؟ ریل گاڑی میں تو تم بغیر ٹکٹ کے سفر کر سکتے ہو مگر بس میں تو کنڈکٹر تمہیں ٹکٹ کے بغیر داخل نہیں ہونے دے گا۔"

میں نے کہا۔

"میں سٹیشن تک پیدل بھی جا سکتا ہوں۔"

درگا خاموش رہی۔ میں نے راہ گیر سے سٹیشن کا راستہ پوچھا اور اس طرف چل پڑا۔ سڑکیں بڑی طویل تھیں۔ بڑا شہر تھا۔ ایک سڑک شروع ہوتی تو ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ ویسے بھی میں شہر کے باہر کے علاقے میں تھا۔ چلتے چلتے لوگوں سے پوچھتے پوچھتے میں بمبئی شہر کی بارونق سڑکوں پر آ گیا۔ ان سڑکوں کی دونوں جانب روشن عمارتیں اور ان کے فلیٹ تھے۔ گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ میں ایک بازار میں سے گزر رہا تھا اس بازار میں ایرانی ہوٹل بھی تھے۔ ناگن درگا میری جیب میں سے سر ذرا سا نکالے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک ایرانی ہوٹل کے مالک کو کرنسی نوٹ کاؤنٹر پر ایک طرف رکھتے دیکھا تو بولی۔

"تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

مگر وہ میری جیب سے سڑک پر چھلانگ لگا چکی تھی۔ یہ اس نے مجھے بعد میں بتایا کہ وہ میرے لیے بمبئی سے بھوپال تک کے کرائے اور کھانے پینے کے لیے ایرانی ہوٹل کے کاؤنٹر پر سے کچھ کرنسی نوٹ چرانے کے لیے گئی تھی۔ میں ہکا بکا سا ہو کر اسے سڑک پر ہوٹل کی طرف دوڑتے دیکھتا رہ گیا۔ سڑک پر کافی روشنی تھی۔ ایک لڑکے کی اس پر نظر پڑ گئی۔ اس نے شور مچا دیا۔

"سانپ! سانپ!"

یہ سنتے ہی میں ناگن کو بچانے کے لیے اس کی طرف دوڑ پڑا۔ مگر اتنے میں کچھ لوگ ناگن درگا کو مارنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ پڑے تھے۔ کوئی زمین پر سے پتھر اٹھا کر مار رہا تھا' کوئی اس پر جوتا پھینک رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ناگن کے پاس پہنچوں ایک آدمی نے ناگن درگا پر زور سے ایک پتھر پھینکا جو اس کو جا کر لگا اور اس کا جسم دم سے ذرا اوپر کٹ کر الگ ہو گیا۔ اس کی دم الگ تڑپنے لگی اور باقی کا دھڑ الگ تڑپنے لگا۔ میں نے فوراً ناگن درگا کے جسم کے دونوں ٹکڑوں کو اٹھایا اور جتنی تیز بھاگ سکتا تھا بھاگتا چلا گیا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں۔ کوئی بھی میرے پیچھے نہ آیا۔ میں ایک چھوٹی سڑک میں مڑ گیا۔ ایک جگہ کھڑے ہو کر ناگن درگا کے جسم کے ٹکڑوں کو دیکھا۔ دونوں خون آلود تھے۔ میں نے غم آلود آواز میں کہا۔

"درگا! یہ تم نے کیا کر دیا۔ تمہیں باہر نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔"

تب ناگن درگا نے کمزور آواز میں کہا۔

"کرم داد! تم بغیر ٹکٹ تو بھوپال تک سفر کر سکتے تھے مگر تمہارے پاس کھانے پینے کے لیے کوئی پیسہ نہیں تھا۔ میں ایرانی ہوٹل سے تمہارے لیے کچھ رقم چرانے کے

لیے گئی تھی۔"

یقین کریں اس وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے ناگن درگا کے دونوں ٹکڑوں کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

"درگا! تم نے ایسا کیوں کیا؟"

ناگن کی آواز آہستہ آہستہ ڈوبنے لگی تھی۔ اس نے کہا۔

"کرم داد! مجھے جتنی جلدی ہو سکے متھرا شہر کے راجاؤں کے پرانے شمشان میں لے چلو اور جیسا میں نے تمہیں کہا تھا ویسے ہی کرو۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گی' میرا جسم جڑ جائے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"تمہیں تازہ مردے کی راکھ میں تین دن تک ہی دفن رکھنا ہے ناں؟"

اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ ناگن درگا بے ہوش ہو چکی تھی۔ اب مجھے بھوپال نہیں جانا تھا' مجھے ناگن درگا کے جسم کے ٹکڑوں کو لے کر متھرا جانا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح ریلوے سٹیشن پر پہنچ گیا۔ میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ متھرا شہر بمبئی سے دلی کی طرف جاتے ہوئے آتا تھا اور بمبئی سے کافی دور تھا۔ ایک ٹرین اندور سے ہوتی ہوئی اجمیر شریف کی طرف جا رہی تھی۔ ایک آدمی نے مجھے بتایا اس ٹرین میں بیٹھ جاؤ۔ اندور سے دلی کے لیے گاڑی بدل لینا۔ میں بغیر ٹکٹ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ناگن درگا کے ٹکڑے میں نے رومال میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لیے تھے۔ اندور سے میں دلی جانے والی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ میں گاڑی بھوپال' جھانسی' آگرہ' متھرا سے ہوتی ہوئی دلی کی طرف جا رہی تھی' یہ سفر بھی بڑا لمبا تھا۔ رات گزر گئی' دوسرا دن بھی گزر گیا۔ رات ہو چکی تھی جب گاڑی متھرا پہنچی۔ راستے میں ناگن درگا کو میں دیکھ لیتا تھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ میں نے اسے بلانے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

سفر کے دوران ایک مسافر سے دوستی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ کھانا

وغیرہ کھلا دیا تھا۔ متھرا میرے لیے بالکل نیا شہر تھا۔ یہ ہندوؤں کا پوتر شہر ہے اور یہاں بے شمار مندر ہیں۔ اسے مندروں کا شہر بھی کہتے ہیں۔ میں نے ایک آدمی سے راجا کی شمشان بھومی کا پتہ پوچھا اور پیدل ہی اس طرف چل پڑا۔ شہر بڑا گنجان آباد تھا۔ تنگ گلیاں بازار تھے۔ ہر قسم کی سواری دیکھنے میں آ رہی تھی۔ کوئی بازار ایسا نہ تھا جہاں ایک آدھ مندر نہ ہو۔ راجا کی شمشان بھومی شہر سے باہر ایک پرانے کھنڈر کے پاس تھی۔ ٹوٹی پھوٹی چاردیواری کے اندر ایک طرف بوسیدہ سی کوٹھڑی تھی۔ صحن میں مٹی اڑ رہی تھی۔ کونے میں چتا کا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اس چبوترے پر ہندو اپنے مردے رکھ کر جلاتے تھے۔ جس طرح مسلمانوں کے قبرستانوں میں گورکن ہوتے ہیں اسی طرح ہندوؤں کی شمشان بھومی میں بھی مردے جلانے والے ہوتے ہیں، انہیں شمشان کے باوے کہتے ہیں۔ یہ مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ میں شمشان گھاٹ کے دروازے کے سامنے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ناگن درگا نے کہا تھا کہ میرے زخمی جسم کو کسی تازہ مردے کی ٹھنڈی راکھ میں دبانا اور پھر تین دن بعد آ کر نکالنا۔

میں کسی نئے مردے کی ارتھی کے انتظار میں تھا۔

اتنے بڑے شہر میں مردے آتے ہی رہتے ہوں گے۔ میں کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ کوٹھڑی میں بھی اندھیرا تھا۔ ناگن درگا نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اس شمشان گھاٹ پر کبھی کبھار ہی کوئی مردہ لایا جاتا ہے۔ اتفاق سے ایک ارتھی آ گئی۔ مردے کو بانس کے بنے ہوئے بھوپان پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے رشتے دار، دوست احباب رام رام کرتے ساتھ چل رہے تھے۔ مردے کو چتا پر رکھ دیا گیا۔ دیر تک مختلف رسمیں ادا کی جاتی رہیں۔ ایک باوا بھی کہیں سے آ گیا تھا۔ مردے کی چتا تیار کی گئی۔ پھر اسے نذر آتش کر دیا گیا۔ میں نے سوچا کہ مردے کی راکھ صبح سے پہلے ٹھنڈی نہیں ہوگی۔ چنانچہ میں وہاں سے واپس آ گیا۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ میں شہر کی گنجان آبادی والے ایک مندر میں آ گیا۔ وہاں یاتریوں کو بھوجن پانی کرایا جا رہا تھا۔ میں نے بھی یاتریوں کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑا سا کھانا کھایا اور یاتریوں کے آشرم

میں جا کر دری پر لیٹ گیا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس جیب میں ڈال رکھا تھا جس میں ناگن درگا کے جسم کے ٹکڑے رومال میں لپٹے ہوئے رکھے تھے۔

میں نے ہاتھ جیب کے اندر اس لیے رکھا ہوا تھا کہ اگر مجھے نیند آ جائے تو کوئی میری جیب میں سے رومال میں لپٹی ہوئی ناگن درگا کو کوئی قیمتی چیز سمجھ کر چرا نہ لے جائے۔ نیند نے آنا ہی تھا۔ مجھ پر بھی رات گہری ہو جانے کے بعد نیند کا غلبہ ہوگیا اور میں سوگیا۔ صبح اس وقت آنکھ کھلی جب دن کافی نکل آیا تھا۔ مندر کے سداورت سے ہی ناشتہ کیا اور شمشان گھاٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ شمشان گھاٹ کا چبوترہ [redacted] تھا۔ مردے کے لواحقین اس کی ہڈیاں جن کو پھول کہتے ہیں اکٹھی کر کے لے جا چکے تھے۔ چبوترے پر صرف راکھ ہی بکھری ہوئی تھیں۔ کوئی آدمی ادھر ادھر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں چتا کے چبوترے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ راکھ کو کرید کر دیکھا۔ راکھ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکالا۔ اس میں سے ناگن درگا کے کٹے ہوئے سانپ کے دونوں ٹکڑوں کو غور سے دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ناگن درگا مر چکی ہے۔ کیونکہ اس کا جسم آہستہ آہستہ نیلا پڑنے لگا تھا۔ مجھے وہم سا ہونے لگا کہ ناگن درگا کہیں مر تو نہیں گئی۔ میں نے ویسے ہی کیا جیسا ناگن درگا نے مجھے ہدایت کی تھی۔

میں نے ایک طرف سے کافی راکھ کرید کر ہٹائی اور درگا سانپ کے جسم کے دونوں ٹکڑے رکھ کر اوپر اچھی طرح سے راکھ ڈال کر انہیں ڈھانپ دیا۔ اب مجھے اس کی خبر گیری بھی کرنی تھی۔ مجھے صرف ایک ہی ڈر لگا تھا کہ اگر اس دوران کسی دوسرے مردے کی ارتھی آگئی اور اسے چتا پر رکھ کر نذر آتش کیا گیا تو ناگن درگا کے جسم کے ٹکڑے اس کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ اگرچہ درگا نے مجھے کہا تھا کہ اس مرگھٹ میں کبھی کبھار ہی کوئی مردہ لایا جاتا ہے جس کا تعلق قدیم راجاؤں کے خاندان سے ہوتا ہے۔ پھر بھی کوئی ارتھی مردے کو لے کر آسکتی تھی۔ راجاؤں کے قدیم خاندان والوں میں بھی کوئی نہ کوئی مرتا ہی ہوگا۔ میں دیر تک شمشان گھاٹ

یعنی مرگھٹ کی چار دیواری کے اندر ایک طرف ہو کر بیٹھا رہا۔

دوپہر کے وقت تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر مندر میں گیا۔ لنگر پر کھانا کھایا اور پھر واپس آکر شمشان گھاٹ میں بیٹھ گیا۔ اسی طرح رات کو بھی مندر سے کھانا کھا کر واپس آگیا۔ رات مرگھٹ میں گزارنی مشکل تھی۔ یہ خیال بھی تھا کہ میں اگر واپس چلا گیا تو پیچھے کسی مردے کی ارتھی نہ آجائے۔ رات کافی دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد جانے لگا تو کسی طرف سے نکل کر ایک کالا بھجنگ دبلا پتلا آدمی میرے سامنے آگیا۔ پہلے تو [illegible] کوئی بد روح لگا۔ کہنے لگا۔

"بابو میں دیکھ رہا ہوں تم صبح سے یہاں بیٹھے ہو۔ تم کس کی راہ دیکھ رہے ہو؟ یہاں تو مردوں کے بھوپان بھی کبھی کبھی ہی آتے ہیں۔"

اس نے مجھے وہ بات بتا دی تھی جو میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"بھیا! میری ماتا جی کو یہاں جلایا گیا تھا۔ کسی نے مجھے کہا ہے کہ اگر میں تین راتیں یہاں آکر بیٹھوں تو ماتا جی کی آتما مجھے درشن دیں گی۔"

وہ آدمی ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

"بھیا! میں یہاں کا باوا ہوں۔ بیس برس سے یہاں مردے جلا رہا ہوں۔ مجھے تو آج تک کسی کی آتما یہاں دکھائی نہیں دی۔ جاؤ اپنے گھر جاکر آرام کرو۔"

میں نے کہا۔

"نہیں بھیا! میں تین دن پورے کر کے ہی جاؤں گا۔ مجھے اپنی ماتا جی سے بڑی محبت تھی۔ میرا وشواش ہے کہ ان کی آتما مجھے درشن دینے ضرور آئیں گی۔"

باوا میرے پاس ہی بیٹھ کر بیڑی پینے لگا۔ بولا۔

"اپنی ماتا سے سبھی کو پیار ہوتا ہے۔ تم نے وشواش کی بات کی ہے تو میں تمہیں یہاں بیٹھنے سے منع نہیں کروں گا۔"

میں نے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ اس سے مزید وضاحت کی خاطر پوچھا۔

"ہم لوگ سورج ہنسی گوت کے ہیں۔ ہم دلی سے متھرا آئے تھے کہ ماتا جی بیمار

ہو کر سورگباش ہو گئیں۔ یہاں معلوم ہوا کہ ایک شمشان گھاٹ ہے جہاں پرانے سورج ہنسی راجا مہاراجوں کے رشتے داروں کی ارتھیاں جلائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہم نے ماتا جی کے بھوپان کو یہاں لا کر جلایا۔ یہ بتاؤ بھیا! کہ یہاں دن میں دو ایک ارتھیاں تو ضرور آتی ہوں گی؟"

باوا کہنے لگا۔

"یہاں صرف سورج ہنسی راجاؤں کی گوت کے مردوں کو جلایا جاتا ہے اور مہینے میں ایک آدھ ارتھی ہی آتی ہے۔"

مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھیا میں گھر چلتا ہوں۔ کل رات پھر آؤں گا۔ شاید ماتا جی کی آتما درشن دینے آ جائے؟"

وہ ہنسنے لگا۔ پھر سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"بھگوان کی لیلا نیاری ہے بھیا۔ میں بھی چلتا ہوں' یہاں سے کچھ دور میری کوٹھڑی ہے کسی چیز کی ضرورت ہو تو میرے پاس آ جانا۔"

میں نے کہا۔

"شکریہ بھیا!"

شمشان کا باوا دوسری طرف چل دیا۔ میں شمشان کے پرانے دروازے میں سے گزر کر شہر کی طرف چل پڑا۔ وہ رات بھی میں نے مندر میں گزار دی۔ دو راتیں گزر گئیں' تیسرے دن میں شمشان گھاٹ آیا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہاں کوئی تازہ مردہ نہیں جلایا گیا تھا۔ چبوترے پر چتا کی راکھ اسی طرح ٹھنڈی تھی۔ یہ وہاں میری تیسری اور آخری رات تھی۔ اگلے دن صبح صبح مجھے ناگن درگا کے جسم کے ٹکڑوں کو باہر نکالنا تھا۔ میں نے وہ رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔

مندر کے سدا ورت لنگر سے میں تھوڑی سی کچوریاں لے آیا تھا۔ وہی کھا کر بیٹھا رہا۔ وقت مشکل سے گزر رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ پچھلی راتوں کی طرح وہ رات بھی

مجھے آسیبی رات لگ رہی تھی۔ لیکن مجھے ہر حالت میں وہ رات وہیں گزارنی تھی۔ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ بیٹھے بیٹھے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں وہیں لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند ہوتے ہی میں نیند میں کھو گیا۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے کندھے سے پکڑ کر زور سے ہلایا ہو۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر صبح کاذب کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ ناگن درگا نے اپنے جسم کو راکھ سے نکالنے کا یہی وقت بتایا تھا۔ ابھی دن کی روشنی نہیں ہوئی تھی اور رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیلا تھا۔ صرف آسمان کے مشرقی افق پر نیلی نیلی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔

میں اٹھ کر چتا کے چبوترے پر آ گیا۔

جہاں میں نے ناگن درگا کے جسم کے ٹکڑوں کو دبایا تھا وہاں سے راکھ کو کریدنا شروع کر دیا۔ راکھ کی یہاں موٹی تہہ تھی۔ میں راکھ کریدتا چلا گیا مگر ناگن درگا کے جسم کے ٹکڑے مجھے کہیں نہ ملے۔ میں نے ساری چتا کی راکھ ادھیڑ ڈالی مگر ناگن درگا کے جسم کے ٹکڑے جیسے بالکل غائب ہو گئے تھے۔ میں پریشان ہو گیا۔ یہ خیال بھی آیا کہ کہیں میری عدم موجودگی میں کوئی کتا آ کر سانپ کے ٹکڑوں کو نکال کر نہ کھا گیا ہو۔ اسی تذبذب اور ذہنی انتشار کے عالم میں چتا کے کنارے بیٹھا تھا کہ مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی کراہ رہا ہو۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

میرے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ وہاں کسی جانب بھی کوئی نہیں تھا۔ ماحول پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف شہر کی جانب سے مندروں کی گھنٹیوں کی آوازیں کسی کسی وقت آ جاتی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر چتا کی ساری راکھ کو کھنگال ڈالا۔ ناگن درگا کے جسم کے ٹکڑے اب بھی نہ ملے۔ اتنے میں وہی درد ناک کراہ کی آواز پھر سنائی دی۔ میں غور سے آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ آواز دو تین بار سنائی دے کر خاموش ہو گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے یہ ناگن درگا کی آواز تھی۔ میں نے آہستہ سے اسے پکارا۔

"درگا! درگا! کیا یہ تم ہو؟"

درگا کی نحیف اور بہت مدھم آواز آئی۔

"کرم داد! یہاں سے چلے جاؤ' چلے جاؤ' چلے جاؤ۔"

اور وہ پھر یوں آہستہ آہستہ کراہنے لگی جیسے انتہائی تکلیف کی حالت میں ہو۔ میں نے فوراً کہا۔

"درگا! میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ مجھے بتاؤ کہ تم کہاں ہو اور اس طرح کیوں کراہ رہی ہو؟"

اب ناگن درگا کی آواز بڑی دور سے آئی۔

"کرم داد! چلے جاؤ بھگوان کے لیے چلے جاؤ۔"

اور آہستہ آہستہ اس کی آواز ڈوب کر غائب ہو گئی۔ تب مجھے وہاں خوف سا محسوس ہونے لگا۔ میں چبوترے سے اتر آیا اور شمشان گھاٹ کے شکستہ دروازے کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی میں دروازے سے باہر نکلا میرے سامنے وہی کالا بھجنگ باوا کھڑا تھا۔ اندھیرے میں اس کا رنگ اور زیادہ سیاہ ہو رہا تھا۔ وہ ہنسا تو مجھے اس کے ٹیڑھے دانت نظر آئے۔ کہنے لگا۔

"ماتا جی کی آتما کے درشن ہو گئے؟"

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں۔ درشن ہو گئے ماتا جی کے۔"

اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا کہا تمہاری ماتا جی نے؟"

میں نے اس سے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہہ دیا۔

"ماتا جی نے کہا ہے کہ اب یہاں مت آنا' میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

باوا بولا۔

"تم پر بھگوان نے خاص کرپا کی ہے مورکھ! تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک

مرچکا ہوتا۔"

میں نے کہا۔

"ہاں بھیا! بھگوان کی بڑی کرپا ہے۔ اچھا رام رام۔"

اور میں تیز تیز قدم اٹھاتا شہر کی طرف چل پڑا۔

سورج نکلنے سے پہلے میں اس مندر میں پہنچ گیا جہاں میں رات کو آکر سو جایا کرتا تھا اور جس کے لنگر سے میں پوریاں' کچوریاں وغیرہ بھی کھایا کرتا تھا۔ مندر میں خوب پوجا پاٹھ ہو رہی تھی۔ گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ میں وہاں ہندو بن کر رہ رہا تھا۔ چنانچہ مندر کے دروازے میں سے گزرتے ہوئے میں بھی دوسرے پجاریوں کی طرح چھت کے ساتھ لٹکتی گھنٹیوں کو ہاتھ مار کر بجا دیتا تھا۔ یہاں یاتریوں کے لیے ایک لمبی بیرک سی بنی ہوئی تھی۔ دوسرے یاتری بھی رات کو یہیں سوتے تھے۔ میں اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ ناگن درگا ضرور کسی عذاب میں مبتلا ہوگئی ہے۔ میں دل میں اس منحوس دیوتا کو برا بھلا کہنے لگا جس کی بد دعا ناگن درگا کو لگ گئی تھی۔

میرا اب وہاں ٹھہرنے کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ خود درگا نے مجھے وہاں سے چلے جانے کی ہدایت کی تھی۔ میں نے بھوپال واپس جانے کا پروگرام بنا لیا۔ ایک یاتری سے پوچھا۔

"بھیا! میں بھوپال واپس جاؤں گا کیا تمہیں معلوم ہے' متھرا سے بھوپال کی طرف کون سی گاڑی جاتی ہے۔"

یاتری بولا۔

"بھیا! تم تو اپنے شہر کے آدمی نکلے۔ میں بھی بھوپال سے آیا ہوں۔ یہ بتاؤ تم بھوپال میں کہاں رہتے ہو بھیا؟"

مجھے اس محلے کا نام معلوم تھا جس محلے میں کمانڈو خالد کی کزن سسٹر کا گھر تھا۔ میں نے اسی محلے کا نام لے لیا۔ وہ بولا۔

"ہاں ہاں وہ محلہ ہمارے گھر سے کافی دور ہے۔"

میں نے مزید گفتگو سے بچنے کی خاطر اس سے کہا۔

بھیا! دن کے وقت تو کوئی نہ کوئی گاڑی بھوپال کی طرف ضرور جاتی ہوگی۔"

وہ بولا۔

"صرف ایک ٹرین متھرا سے سیدھی بھوپال جاتی ہے جو شام کو سات پچاس پر دلی سے آتی ہے۔ وہ میل ٹرین بھی ہے' راستے میں کسی چھوٹے سٹیشن پر نہیں رکتی۔ باقی گاڑیاں ہر سٹیشن پر رکتی ہیں۔"

میں نے دل میں سوچا کہ سٹیشن پر چل کر بیٹھ جاتا ہوں۔ بھوپال کی طرف جاتی جو گاڑی بھی ملی اس میں بیٹھ جاؤں گا۔ میں نے دوپہر کا کھانا یا بھوجن مندر میں ہی دوسرے یاتریوں کے ساتھ کھایا اور مندر سے نکل کر سٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس وقت آسمان پر ادھر ادھر سے بادل جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ سورج کبھی بادلوں میں چھپ جاتا تھا' کبھی دھوپ نکل آتی تھی۔ میں پیدل ہی سٹیشن پر آگیا۔ ٹکٹ چیکر کی آنکھ بچا کر بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک دن کافی چڑھ آیا تھا۔ مگر دھوپ غائب ہوگئی تھی۔ بادلوں نے سارے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ تیز ٹھنڈی ہوائیں بھی چلنے لگی تھیں۔ ویسے بھی شمالی ہندوستان میں سردیوں کا موسم تقریباً گزر گیا تھا اور بہار کی رت ڈیرے ڈال رہی تھی۔

ایک مسافر نے جو میرے قریب ہی بنچ پر بیٹھا تھا اپنے ساتھی سے کہا۔

"بھیا! اس رت میں برکھا کا ہونا ٹھیک نہیں پر بھگوان کی لیلا نیاری ہے۔"

بارش کے خیال سے مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ریلوے سٹیشن پر بارش سے محفوظ تھا۔ ٹرین کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ رہتا تھا۔ اچانک مجھے ناگن درگا کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک سا پڑا۔ آواز میں نے صاف پہچان لی تھی۔ میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے مسافروں کی طرف اس خیال سے دیکھا کہ کہیں انہوں نے تو آواز نہیں سنی۔ کیونکہ آواز خاصی قریب سے آئی تھی۔ مگر ان میں سے کسی نے آواز نہیں سنی تھی۔ وہ بڑی دلچسپی سے موسم کے بارے میں' فصلوں کے

بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

آواز ایک بار پھر آئی۔ ناگن درگا اسی طرح کراہ رہی تھی جیسے اسے شدید اذیت دی جا رہی ہو۔ میں بنچ سے اٹھ کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ تیسری بار آواز سنائی دی تو میں نے آہستہ سے کہا۔

"درگا! کیا یہ تم ہو؟"

ناگن درگا نے کراہتے ہوئے کہا۔

"کرم داد! میری مدد کرو' میری مدد کرو۔"

میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا کہ کوئی مجھے دیکھ یا سن تو نہیں رہا۔ میں ٹہلتے ٹہلتے پلیٹ فارم کے خالی حصے کی طرف آ گیا تھا۔ درگا کی کرب ناک آواز پھر آئی۔

"کرم داد! کرم داد! مجھے بچا لو' مجھے بچا لو۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"درگا! میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

ناگن درگا نے رک رک کر کہا۔

"کرم داد! میں پرانے راج محل کے اندھے کنوئیں میں ہوں۔ مجھے آ کر یہاں سے باہر نکالو' میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے اس اندھے کنوئیں سے نکالو۔ چھپکلیاں میرا گوشت نوچ رہی ہیں۔"

میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"یہ پرانا راج محل کہاں ہے درگا؟"

اس نے بین کرنے کے انداز میں کہا۔

"کرم داد! مجھے اس عذاب سے نجات دلاؤ۔ میں پرانے محل کے تہہ خانے کے اندھے کنوئیں میں پڑی ہوں' ہائے ماتا جی' ہائے ماتا جی۔"

اور درگا کے رونے اور بین کرنے کی آواز آہستہ آہستہ خاموش ہو گئی۔ میں بے چین ہو گیا۔ میں نے بھوپال جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور پلیٹ فارم پر ہی ایک شخص

سے پوچھا کہ متھرا میں کوئی پرانا راج محل بھی ہے؟ اس نے کہا۔

"شہر سے دو میل پچھم میں آگرہ جانے والی ریلوے لائن کے پار ہے۔مگر تم وہاں کیا لینے جاؤ گے؟ وہاں تو کوئی انسان نہیں جاتا۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور ریلوے سٹیشن سے نکل کر پرانے راج محل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ میں پیدل ہی جا سکتا تھا۔ چلتے چلتے میں متھرا شہر کی گنجان آبادی سے پچھم کی طرف دور نکل آیا۔ مجھے ریلوے لائن دکھائی دی جو زمین سے اونچی جگہ پر تھی۔ یہاں پھاٹک تھا۔ ایک بوڑھا آدمی پھاٹک بند کر رہا تھا۔ میں وہیں رک گیا، جب بوڑھا پھاٹک بند کر کے ہاتھ میں سبز جھنڈی لیے میری طرف آیا تو میں نے اس سے پرانے راج محل کا پتہ پوچھا۔ اس نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا اور بولا۔

"وہاں کیوں جا رہے ہو بابو؟ پردیسی معلوم ہوتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"بابا!میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں اندور سے آیا ہوں۔" ؟

بوڑھے نے کہا۔

"گاڑی آ رہی ہے' گاڑی گزر جانے دو۔"

دور سے انجن نے وسل کی سیٹی بجائی۔ بوڑھا سبز جھنڈی کھڑی کر کے کھڑا ہوگیا۔ ٹرین نے وہاں سے رن تھرو گزر جانا تھا۔ ٹرین آئی اور شور مچاتی' زمین ہلاتی' گرد اڑاتی گزر گئی۔ بوڑھے نے جھنڈی لپیٹ کر بغل میں دبائی۔ ایک طرف کا پھاٹک کھولا' مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ دوری طرف کا پھوٹک کھولا اور ایک طرف اشارہ کیا۔

"وہ سامنے ہے تمہارا راج محل۔"

"یہ کہہ کر وہ اپنی کوٹھڑی کی طرف چل دیا۔

جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ اس طرف مجھے درختوں کے جھنڈوں میں ایک قلعہ نما عمارت کی اوپر والی منزل نظر آئی' میں اس طرف چل پڑا۔ یہ جگہ بالکل ویران پڑی تھی۔ سوائے درختوں اور جنگلی خشک جھاڑیوں اور ادھر ادھر بکھری ہوئی اینٹوں اور

روڑوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ درخت کیکر کے تھے جن کی شاخیں نوکیلے کانٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مجھے آتا دیکھ کر ایک درخت کے نیچے لیٹا ایک کتا ہڑبڑا کر اٹھا اور روتا ہوا راج محل کے کھنڈر کی طرف بھاگ گیا۔ اس سے پہلے میں نے کسی کتے کو اس طرح روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں پرانے راج محل کے کھنڈر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے بوسیدہ دروازے کو دیکھ کر ہی بھوتوں اور بدروحوں کا خیال آ جاتا تھا۔ میں نے سوچا میں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو اور مجھے درگا کی آواز نہ آئی ہو۔

میں نے درگا کا نام لے کر اسے آواز دی۔ جواب میں درگا نے ہولے ہولے روتے ہوئے کہا۔

"کرم داد! مجھے آ کر اندھے کنوئیں سے نکالو' میری مدد کرو۔ کیڑے مکوڑے میرا جسم نوچ رہے ہیں۔"

میں فوراً" اندر جانے کو تیار ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

"درگا وہ تہہ خانہ کہاں ہے جہاں اندھا کنواں ہے؟"

درگا کی آواز آئی۔

"راج محل کے بائیں جانب سیڑھیاں اوپر جاتی ہیں اوپر گیلری ہے۔ گیلری کی دوسری طرف سے ایک سیڑھی نیچے اتر کر تہہ خانے میں جاتی ہے۔ دیر نہ کرو کرم داد! نہیں تو میں زندہ نہیں رہوں گی-------ہائے-------"

درگا کی آواز پہلے کی طرح دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔ اب مجھے اس بھوت محل میں داخل ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میں بے دھڑک ہو کر کھنڈر محل کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی میں ہلکا ہلکا اندھیرا اور ٹھنڈک تھی۔ راج محل کے کھنڈر میں داخل ہوتے ہی کچھ اس قسم کی خاموشی نے مجھے گھیر لیا تھا جس میں سے سنسناہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ ڈیوڑھی کے آگے بائیں جانب ایک دیوار کے ساتھ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو گھس چکی تھیں اور گرد میں ڈھکی ہوئی

تھیں۔ اوپر ایک تنگ سا دروازہ نظر آ رہا تھا' دروازے کے پٹ غائب تھے۔

میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر دروازے میں آ کر رک گیا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں روشنی بہت کم تھی اور ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایک گیلری سی دکھائی دی۔ میں گیلری میں آگیا۔ گیلری کا فرش میرے پاؤں تلے اس طرح چرچرایا جیسے ابھی گر پڑے گا۔ میں سنبھل کر دیوار کے ساتھ ہوگیا۔ چھت اندھیرے میں پوری طرح نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے الو کے بولنے کی آواز آئی۔ میرے جسم میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ الو کبھی دن کے وقت نہیں بولا کرتے۔ عام طور پر وہ رات کو بولتے ہیں اور ان کی آواز بدشگونی کی علامت ہوتی ہے۔ مگر مجھ پر ناگن درگا کی مدد کرنے کا بھوت سوار تھا۔ حالانکہ اس وقت عقل سلیم سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ اب میں آپ کو اپنے دل کی بات بتاتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ خود مجھے بھی ناگن درگا سے محبت ہوگئی تھی۔ لیکن اس جذبے کو میں نے اپنے دل میں چھپایا ہوا تھا۔ میں خود اس حقیقت کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔

گیلری کی دوسری طرف جیسا کہ ناگن درگا کی آواز نے مجھے بتایا تھا کہ ایک تنگ سیڑھی نیچے جاتی تھی۔ سیڑھیوں میں اندھیرا تھا۔ میں بڑی احتیاط سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ جیسے جیسے میں نیچے اتر رہا تھا سیڑھیوں میں پھیکی پھیکی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ خدا جانے یہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی۔ کیونکہ وہاں کوئی موم بتی یا چراغ بھی نہیں جل رہا تھا۔ آخری سیڑھی کے آگے مجھے ہلکی روشنی میں ایک تابوت پڑا ہوا نظر آیا۔ میں بڑا حیران ہوا۔ ہندوؤں کے محلوں اور قلعوں میں اس قسم کے تابوت دیکھنے میں نہیں آتے۔ یہ تابوت عام طور پر عیسائیوں کے قلعوں کے کھنڈروں میں ہوتے ہیں۔ تابوت پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس تابوت کے بارے میں ناگن درگا نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ چھوٹا سا تہہ خانہ تھا جس میں آدھی سے زیادہ جگہ تابوت نے گھیر رکھی تھی۔ وہاں کوئی اندھا کنواں بھی نہیں تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں میں غلط تہہ خانے میں تو نہیں آگیا۔ میں واپس مڑنے ہی والا تھا کہ ناگن درگا کی آواز پھر سنائی دی۔ وہ

کہہ رہی تھی۔

"کرم داد! اندھا کنواں اس صندوق کے اندر ہے۔ اس کے اندر آ کر مجھے باہر نکالو۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں کرم داد! میری مدد کرو۔"

ناگن درگا کی آواز میں رحم کی التجا تھی۔ میں نے کہا۔

"درگا! گھبراؤ نہیں میں تمہاری مدد کرنے آ رہا ہوں۔"

ناگن درگا کی آواز آہستہ آہستہ تحلیل ہو گئی۔ میں نے جھک کر تابوت کو غور سے دیکھا کہ اس کا کوئی کنڈا نظر آ جائے جس کو اٹھا کر میں تابوت کے اندر داخل ہو سکوں۔ مجھے یقین تھا کہ تابوت کے اندر ضرور کوئی سیڑھیاں ہیں جو نیچے اندھے کنوئیں میں اترتی ہیں۔ میں تابوت پر جمی ہوئی گرد کی تہہ کو ہاتھ سے ادھر ادھر ہٹانے لگا۔ تابوت پر سنسکرت یا ہندی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا جسے میں نہ پڑھ سکا۔ ایک جگہ مجھے تابوت کا کنڈا مل گیا۔ میں نے اسے اٹھانا چاہا تو معلوم ہوا کہ تابوت کا ڈھکنا بڑی مضبوطی سے بند ہے۔ میں نے زور لگانا شروع کیا۔ تین چار مرتبہ کی کوشش سے تابوت کا ڈھکنا کھل گیا۔ ڈھکن کے کھلتے ہی میرے اردگرد بھیانک چیخوں اور رونے کی آواز گونجنے لگیں اور پیچھے سے کسی نے مجھے دھکا دے دیا۔ میں منہ کے بل تابوت میں گر پڑا۔ میں ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ کسی نے تابوت کا ڈھکنا زور سے بند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھیانک مردانہ آواز بلند ہوئی۔

"تم درگا کے پریمی ہو۔ میں تمہیں بھی سراپ دیتا ہوں۔ اب تم ساری عمر اس تابوت کے اندر رہو گے۔ تمہاری ہڈیاں بھی گل سڑ جائیں گی۔"

ایک ہولناک قسم کے قہقہے کی آواز آئی اور تابوت والی کوٹھڑی میں موت کا سناٹا چھا گیا۔ میں گھپ اندھیرے میں پڑا تھا۔ میں نے ہاتھ پاؤں مارے۔ میرا خیال تھا کہ تابوت میں اتنی ہی جگہ ہو گی کہ میں سمٹ کر لیٹ سکوں گا لیکن تابوت میں کافی جگہ تھی۔ میرا ہاتھ کسی گول ٹھنڈی چیز سے ٹکرایا۔ میں نے اسے ٹٹولا۔ یقین کریں دہشت سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ یہ ایک انسانی کھوپڑی تھی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ

پیچھے کر لیا۔ پھر تابوت یوں اپنے آپ ہلنے لگا جیسے باہر بھونچال آ گیا ہو۔ میں تابوت کے فرش سے چمٹ گیا۔ تابوت اوپر کو اٹھا' پھر نیچے ہو گیا' پھر اوپر کو اٹھا اور جیسے وہ ایک طرف کو چلنے لگا۔ میں خوف زدہ بھی تھا اور سخت گھبرایا ہوا بھی تھا کہ یہ اچانک سب کچھ کیسے ہو گیا۔ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ مجھے بھیروں کے منحوس دیوتا نے دھوکے سے ناگن درگا کی آواز دے کر وہاں لا کر بند کر دیا ہے۔ میں نے تابوت کے اندر اوپر کو زور زور سے مکے مارے کہ شاید تابوت کھل جائے مگر وہ تو جیسے لوہے کا بنا ہوا تھا۔ ڈھکن اس طرح بند ہو گیا تھا کہ جیسے اب قیامت تک نہیں کھلے گا۔ مجھے آدمیوں کے قدموں کی بھاری چاپ سنائی دے رہی تھی۔ میں نے پوری طاقت سے چیخ کر کہا۔

"تم لوگ کون ہو؟ مجھے باہر نکالو۔"

میں نے دو تین بار آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہ آیا۔ قدموں کی چاپ ایک جگہ رک گئی۔ تابوت کو زمین پر رکھ دیا گیا۔ اس کے ساتھ قدموں کی چاپ دور ہوتی گئی اور پھر قبر ایسا سکوت چھا گیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ تابوت کن لوگوں نے اٹھایا اور اسے کہاں رکھ کر چلے گئے ہیں۔ میں نے پاؤں پھیلائے تو وہ تابوت کی پائینتی کی دیوار کے ساتھ لگ گئے۔ میں نے تابوت کے اندر اندھیرے میں ہاتھوں سے ٹٹولا۔ ایک بار پھر میرا ہاتھ انسانی کھوپڑی سے ٹکرایا۔ میں نے کھوپڑی کو اٹھا لیا۔ کھوپڑی کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہاں دو انچ لمبا شگاف تھا۔ لگتا تھا کہ یہ کسی ایسے آدمی کی کھوپڑی ہے جس کو سر پر تلوار یا کلہاڑے کی ضرب لگا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اس مرد کے بازوؤں اور ٹانگوں کی ہڈیاں بھی تابوت کے اندر ہی پڑی تھیں۔ میں نے بے اختیار ہو کر درگا کو آواز دے کر پکارا۔ مگر درگا وہاں ہوتی تو مجھے جواب دیتی۔ یہ سارا آسیبی کھیل تو اس منحوس دیوتا نے کھیلا تھا اور وہ درگا نہیں تھی بلکہ کوئی بد روح تھی جس نے مجھے رونے رلانے کے جال میں پھنسا کر یہاں لا پھنسایا تھا۔

مجھے آیت الکرسی یاد تھی۔ میں نے دل میں آیت الکرسی پڑھ کر اپنے جسم پر پھونک ماری اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اندر سوچنے سمجھنے اور بھاری سے

بھاری مشکل کا مقابلہ کرنے کی طاقت آ گئی ہے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے تابوت کی چھت کو تھام کر پورا زور لگا دیا مگر تابوت نہ کھلا مگر تابوت میں تازہ ہوا ضرور کسی طرف سے آ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے اس میں ہوا کے لیے چھوٹے سوراخ کیے گئے ہوں۔ لیکن گرمی، حبس اور پسینے نے میرا برا حال کر دیا تھا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے تابوت میں لیٹے لیٹے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ انسانی قدموں کی چاپ ایک بار پھر آنے لگی۔ اسی طرح میرے تابوت کو اوپر اٹھا لیا گیا اور جیسے اسے لے کر پر اسرار لوگ ایک طرف کو چل پڑے۔ وہ ایک جگہ زینہ اترے۔ پھر ایک زینہ اوپر چڑھنے لگے اور ایسی جگہ سے گزرے جہاں مجھے تابوت کے اندر باہر کی تازہ ہوا کا احساس ہوا۔ میں نے تابوت کی چھت اور دیواروں پر اندر سے بہت مکے مارے، چیخا چلایا مگر باہر کسی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پر اسرار آدمی میرے تابوت کو اٹھائے چلتے رہے۔ پھر پر اسرار آدمی ایک جگہ رک گئے۔ یہاں میرے تابوت کو کسی جگہ لٹکایا جانے لگا۔ تابوت نیچے ہی نیچے جا رہا تھا۔ پھر وہ زمین کے ساتھ لگ گیا۔ تابوت کے اوپر کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ شاید یہ وہ رسہ تھا جس کی مدد سے تابوت کو کسی کنوئیں یا گہری کھڈ میں اتارا گیا تھا۔ ایک بار پھر موت کی خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے سانپوں کی پھنکار کی آوازیں سنائی دیں۔ سانپوں سے مجھے کوئی ڈر خوف نہیں تھا بلکہ مجھے ایک طرح سے خوشی ہوئی تھی۔ کیونکہ ایسا ہو سکتا تھا کہ تابوت کے اندر آ کر کوئی سانپ مجھے ڈس دے اور میں انسان سے سانپ کے روپ میں تبدیل ہو جاؤں۔ سانپ کے روپ میں بدل جانے سے میں تابوت کے علاوہ اس منحوس جگہ سے بھی فرار ہو سکتا تھا۔





سانپوں کی پھنکار بڑے قریب سے تابوت کے چاروں سے آنے لگی تھیں۔ سانپ تابوت کے کے اوپر بھی رینگتے محسوس ہو رہے تھے۔ اچانک تابوت نے اسی طرح ہلنا شروع کر دیا جس طرح وہ پہلے بھی ہلا تھا مگر اس دفعہ وہ دائیں بائیں ہلنے کے علاوہ اوپر نیچے بھی ہو رہا تھا۔ تابوت کی حرکت میں شدت آنے لگی۔ پھر وہ اوپر کو اٹھا اور زور سے فرش پر آن گرا' گرتے ہی وہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک گہری کھائی میں ہوں جس کی دیواروں میں چھوٹے چھوٹے دیے جل رہے ہیں۔ ان کی روشنی میں مجھے بے شمار سانپ ادھر ادھر حرکت کرتے نظر آئے۔ مجھے دیکھ کر سانپوں نے اپنا پھن اٹھا کر اپنے چہرے میری طرف کر لیے۔ ان میں سے کچھ سانپ مجھے ڈسنے کے لیے لپکے مگر کسی نا معلوم طاقت کے زیر اثر وہیں رک گئے اور پیچھے کھسکنے لگے۔ سارے سانپ کھائی کی دیوار کے ساتھ پھن کھولے بیٹھے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ انہیں میرے جسم میں سے کسی ایسے سانپ کی بو آ رہی تھی جو ان کے لیے بڑا مقدس سانپ ہوگا۔ ویسے بھی مجھے ان کے ڈسنے کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ کیونکہ مجھ پر کسی بھی سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ میں وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے اوپر کی جانب دیکھا۔ یہ کھائی ایک کشادہ کنوئیں کی طرح تھی۔ اوپر رات کی تاریکی میں بادلوں میں چھپا ہوا آسمان پھیکا پھیکا سا نظر آ رہا تھا۔ دئیوں کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ کھائی یا کنوئیں کی گول دیوار اوپر تک گئی ہوئی ہے۔ وہاں پاؤں

رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔

سانپ اسی طرح مجھے مسلسل دیکھ رہے تھے۔

کھائی کی دیوار جہاں زمین کے ساتھ ملتی تھی وہاں ایک جگہ مجھے گول پتھر لگا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے غور سے دیکھا یہ پتھر تھوڑا باہر کو نکلا ہوا تھا۔ میں نے اسے زور لگا کر اپنی طرف کھینچا تو وہ اپنی جگہ سے ہل گیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے پتھر ہٹا دیا۔ اس کے پیچھے مجھے غار سا نظر آیا۔ میں نے جلتا ہوا دیا ہاتھ میں لے کر غار میں روشنی ڈالی۔ اندر پتھریلا راستہ تھا جو اوپر کو جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس راستے کے ذریعے باہر سے بارش وغیرہ کا پانی کھائی میں جمع کیا جاتا ہوگا۔ میں پتھریلے راستے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ اس غار نے مجھے ایک ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں دیواروں پر بڑی ڈراؤنی مورتیاں لگی ہوئی تھیں۔ کوئی مورتی ایسی نہیں تھی جس کے دانت اور زبان باہر نہ نکلی ہوئی ہو۔ وہاں باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا میں وہیں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

میں منحوس مورتیوں کو دیکھنے لگا کہ شاید ان کے پیچھے یا درمیان میں کوئی راستہ وہاں سے باہر نکلتا ہو۔ ان مورتیوں میں جو سب سے بڑی اور ڈراؤنی موتی تھی اس کی زبان سب سے زیادہ لمبی تھی اور اس کے پیٹ تک نیچے آئی ہوئی تھی۔ اچانک زبان نے ہلنا شروع کیا۔ وہ میری طرف بڑھنے لگی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ سرخ رنگ کی زبان کسی سانپ کے پھن کی طرح میری طرف لہرا لہرا کر چلی آ رہی تھی جیسے مجھے اپنی لپیٹ میں لے کر نگل جانا چاہتی ہو۔ میں جس طرف بچ کر جاتا تھا زبان اسی طرف آ جاتی تھی۔ اس دوران دوسری مورتیوں نے بھی اپنی اپنی سرخ زبانیں ہلانا شروع کر دی تھیں۔ ان کے منہ سے ڈراؤنی آوازیں بھی نکلنے لگی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اس طرح ڈرتا رہا تو یہ مورتیاں جو ضرور کسی جادو ٹونے کے زیر اثر ہیں مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی، مجھے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ جیسے ہی بڑی مورتی کی سب سے لمبی زبان میری طرف بڑھی میں نے اسے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ مجھے زور دار جھٹکا لگا اور میں دیوار

سے جا ٹکرایا۔ موریوں کی آوازیں زیادہ ڈراؤنی ہوگئیں۔ بڑی مورتی کی زبان میری گردن کے گرد لپٹ گئی۔ خدا جانے یہ کوئی کالا جادو تھا یا کیا تھا میرا سارا جسم سن ہونے لگا۔ میں نے زبان کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے کھینچنے کی کوشش کی مگر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ یہ سب کچھ اپنے آپ ہو رہا تھا۔

مورتی کی سرخ زبان میری گردن کے گرد لپٹنے لگی' مورتی کے منہ سے زبان نکلتی چلی آ رہی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے خدا کو یاد کیا اور مورتی کی زبان کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ایک بار پھر جھٹکا دینا چاہا لیکن میرے ہاتھ پھسل گئے۔ زبان میں سے تیل سا نکلنے لگا تھا۔ میرا سانس رکنے لگا۔ عین اس وقت وہاں کسی سانپ کی اتنی زور دار پھنکار کی آواز آئی کہ میری گردن کے گرد لپٹتی ہوئی زبان وہیں رک گئی۔ میری آنکھیں سامنے والی دیوار کی طرف تھیں۔ دیوار پر ناگن درگا کی دھندلی سی شکل ابھر آئی۔ اس نے اپنے حلق سے ایسی آواز نکالی جیسے بجلی کڑک رہی ہو۔ مورتی کی زبان میری گردن پر ڈھیلی پڑ گئی اور وہ تیزی سے واپس مورتی کے حلق میں چلی گئی۔ اسی طرح دوسری مورتیوں کی زبانیں بھی بے حس و حرکت ہوگئیں۔ میں نے ورگا کی ابھری ہوئی شکل کی طرف دیکھ کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"درگا! درگا! تم میرے پاس کیوں نہیں آتیں؟ درگا! میں آج تمہارے سامنے اپنا دل کھول رہا ہوں میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔"

ناگن درگا کی دیوار میں سے ابھری ہوئی اداس شکل نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا۔

"کرم داد! تم نے اس وقت میری طرف ہاتھ بڑھایا ہے جب میں تمہاری پہنچ سے بہت دور جا چکی ہوں۔ کاش یہ بات تم پہلے کہہ دیتے پھر شاید تمہاری محبت کی طاقت مجھے دیوتاؤں سے بھی زیادہ طاقتور بنا دیتی۔"

میں نے کہا۔

"درگا! اب مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔"
میں بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ اظہار محبت نے مجھے عشق میں بے باک کر دیا تھا اور مجھے سوائے درگا کی محبت کے اور کسی چیز کا خیال نہیں رہا تھا۔ درگا کا چہرہ اداس اور ساکت تھا۔ وہ اداس اور خشک آواز میں کہنے لگی۔
"اب یہ بات میرے اختیار میں نہیں رہی' میں جا رہی ہوں۔ میرے جانے کے بعد یہاں دیوار میں تمہیں ایک راستہ ملے گا وہ تمہیں اس منحوس جگہ سے باہر نکال دے گا۔"
ناگن درگا کی شکل زیادہ دھندلی ہونے لگی تو میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔
"درگا! پھر کب درشن ہوں گے' پھر کب ملاقات ہو گی۔"
محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ محبت ایک حیرت انگیز جذبہ ہے۔ ناگن درگا کی شکل غائب ہوتے ہوئے ایک بار پورے آب و تاب سے چمک اٹھی۔ درگا کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی پر سکون روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔ کہنے لگی۔
"یہ میرے بس میں نہیں ہے لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ مرنے سے پہلے تمہیں ایک بار ملنے ضرور آؤں گی۔"
اور ناگن درگا کی شکل غائب ہو گئی۔ میں دیوار کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی ویرانے میں کھڑا ہوں اور میرے چاروں طرف تند و تیز آندھیاں چل رہی ہیں اور شور مچا رہی ہیں۔ میں فوراً سنبھل گیا۔ جہاں ناگن درگا کی شکل غائب ہوئی تھی وہاں ایک راستہ بن گیا تھا۔ میں اس میں داخل ہوا تو کچھ فاصلے پر روشنی دکھائی دی۔ میں آگے چلتا گیا۔ یہ روشنی ایک مٹی کے دیئے کی تھی جو غار کے دہانے پر جل رہا تھا۔ میں غار سے نکل کر باہر آیا تو دیکھا کہ میں کھلے آسمان کے نیچے تھا۔ آسمان پر اسی طرح بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور جس طرف شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں اس طرف چل پڑا۔ رات کتنی گزر گئی تھی مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔ میں ایک سڑک پر آیا تو سامنے متھرا

شہر کے پرانے دروازے پر روشنی ہو رہی تھی۔ یہ دروازہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ مجھے یہاں سے گزر کر ریلوے سٹیشن کی طرف جانا تھا۔ میں متھرا شہر کے گنجان محلوں کی خالی اور سنسان گلیوں میں سے گزرتا ہوا ایک بازار سے باہر نکلنے لگا تو اچانک سامنے سے ایک عورت میری طرف آئی۔

وہ سیدھی میری طرف آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کی ایک گڑوی تھی۔ رات کے سناٹے میں وہ عورت مجھے کوئی بد روح لگی لیکن عورت خوش شکل اور نوجوان تھی۔ میرے پاس آکر اس نے کہا۔

"یہ گڑوی لے جاؤ۔ تمہارے کام آئے گی۔"

اس نے گڑوی میری طرف بڑھائی۔ میں نے گڑوی پکڑ لی اور پوچھا۔

"تم کون ہو؟ اس گڑوی میں کیا ہے؟"

عورت نے کوئی جواب نہ دیا اور گلی میں آگے بڑھ گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ چند قدم چلنے کے بعد غائب ہو گئی ہو۔ پیتل کی گڑوی پر ڈھکن چڑھا ہوا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا بازار سے نکل کر اس میدان میں آگیا جس کی دوسری جانب ریلوے سٹیشن کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ میدان میں اندھیرا تھا۔ میدان پار کرنے کے بعد میں بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر دیکھا' وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے گڑوی کا ڈھکن کھول کر اندر ہاتھ ڈالا تو ایک پوٹلی میرے ہاتھ میں آگئی۔ پوٹلی کو نکال کر کھولا تو اس میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا بنڈل تھا۔ بنڈل کو کھولا تو اس میں سے سو سو روپے کے نہ جانے کتنے نوٹ تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میری آنکھوں میں ناگن درگا کا اداس چہرہ آگیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"درگا! میرے پاس تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ درگا! میں تم سے پریم کرتا ہوں۔"

یہ میں زبان سے نہیں دل سے کہہ رہا تھا۔ میں نے نوٹوں کو گنا وہ چار ہزار روپے تھے۔ یہ بہت بڑی رقم تھی۔ میری حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ لباس گندا

اور بوسیدہ ہوگیا تھا۔ شیو اور سر کے بال کافی بڑھ آئے تھے۔ میں نے سٹیشن پر جا کر بھوپال جانے والی گاڑی پکڑنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور سٹیشن کے باہر آ کر ایک رکشے والے سے پوچھا کہ یہاں سب سے اچھا ہوٹل کون سا ہے۔ اس نے کہا۔

"بابو ہوٹل تو بہت سے ہیں پر کرشنا ہوٹل سب سے اچھا ہے۔ انگریزی فیشن کا ہوٹل ہے۔"

میں نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے کرشنا ہوٹل لے چلو۔"

کرشنا ہوٹل لاہور' اسلام آباد کے اعلیٰ ہوٹلوں کی طرح کا کوئی تھری سٹار ہوٹل تو نہیں تھا لیکن متھرا ایسے پرانے شہر میں شاید اس سے بہتر ہوٹل ملنا مشکل تھا۔ سنگل بیڈ روم کا چوبیس گھنٹوں کا کرایہ دو سو روپے تھا۔ کاؤنٹر پر ایک آدمی سوٹ بوٹ پہنے موجود تھا۔ میں نے دو سو روپے ادا کر دیئے تو اس نے ایک ملازم کو چابی دے کر کہا۔

"صاحب کو روم نمبر پندرہ میں لے جاؤ۔"

ملازم لڑکے نے مجھے ساتھ لیا اور ہوٹل کی دوسری منزل پر ایک کمرے میں لے آیا۔ سنگل بیڈ روم تھا۔ صاف ستھرا بستر لگا تھا۔ باتھ روم بھی ساتھ ہی تھا۔ میں نے باقی رات نرم آرام دہ بستر پر سو کر گزاری۔ دن کے دس گیارہ بجے آنکھ کھلی۔ ملازم لڑکا آ گیا۔ اس نے ناشتے کا پوچھا۔ میں نے کہا لے آؤ۔ وہیں کمرے میں بیٹھ کر میں نے چائے' مکھن' جام' ٹوسٹ کا ناشتہ کیا۔ نوٹ میں نے اپنی بوسیدہ جیکٹ کی اندر والی جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ ملازم لڑکے سے میں نے شہر میں کسی ایسی دکان کا پتہ پوچھا جہاں ریڈی میڈ کپڑے ملتے ہوں۔ اس نے ایک مارکیٹ کا پتہ بتایا۔ میں رکشا پکڑ کر مارکیٹ میں پہنچ گیا۔ چھوٹی سی مارکیٹ تھی۔ ایک دکان پر ریڈی میڈ کلاتھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس دکان میں سے اپنے لیے نئی پتلون' نئی ٹھنڈی جیکٹ' قمیض اور جرابیں خریدیں۔ دوسری دکان سے نئے جوتے خریدے اور ہوٹل واپس آ گیا۔ کمرے میں آ کر میں نے غسل کیا۔ نئے کپڑے پہنے اور بازار میں آ کر بال بنوائے۔ شیو بنوائی اور وہیں

سے ریلوے سٹیشن کی طرف چل دیا۔ دوپہر کے بعد ایک گاڑی بھوپال جانے والی تھی۔ میں نے ریلوے سٹیشن کی ریفرشمنٹ روم میں کھانا کھایا۔ گاڑی آئی تو اس میں بیٹھ کر بھوپال کی طرف روانہ ہوگیا۔ بھوپال گاڑی رات کے پچھلے پہر پہنچی۔ سٹیشن سے نکلتے ہی میں نے فضا کو سونگھا۔ فضا میں کمانڈو خالد کی خوشبو نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بھوپال میں نہیں ہے۔ میں نئی خفیہ کمین گاہ کے آس پاس ہی تھا کہ دو مجاہد اندھیرے میں سے نکل آئے۔"

"کون ہو؟"

میں نے خفیہ کوڈ کے الفاظ بھی بولے اور ساتھ ہی کہا۔

"میں کمانڈو کرم داد ہوں۔"

ان میں سے ایک مجاہد نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے کمانڈو خالد کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ کمانڈو کو کشمیر کے محاذ پر جانا پڑ گیا تھا۔ وہاں بھارتی فوجیوں نے ایک درگاہ شریف کو نذر آتش کر دیا ہے۔ کشمیری مسلمانوں نے احتجاج کرتے ہوئے جلوس نکالا تو ڈوگرہ فوج نے اندھا دھند فائرنگ کر کے کتنے ہی کشمیریوں کو شہید کر دیا۔

"حریت پسند کشمیریوں نے ایک بھارتی فوجی کیمپ پر شب خون مار کر سولہ بھارتی فوجی ہلاک کر ڈالے ہیں جن میں دو افسر بھی تھے۔ اسی لیے کمانڈو خالد کل ہی کشمیر کے محاذ کی طرف چلا گیا۔"

میں نے رات خفیہ کمین گاہ میں گزاری۔ میرا وہاں رہنا بیکار تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں کمانڈو خالد سے ملاقات کرنے کے بعد پاکستان اپنی بیوی جمیلہ کے پاس جاؤں گا۔ لیکن جب مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کی ظالمانہ کاروائیوں کے بارے میں سنا اور خاص طور پر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ بھارتی فوج نے مسلمانوں کی ایک مشہور درگاہ شریف کو نذر آتش کر دیا ہے تو میرا خون کھول اٹھا اور میں اپنے کشمیری بھائیوں کے شانہ بشانہ جہاد کرنے کے لیے بے چین ہوگیا۔

کمانڈو منظر خالد جاتے ہوئے ان مجاہدوں کو کہہ گیا تھا کہ اگر کمانڈو کرم داد آئے تو

اسے کشمیر کے محاذ پر بھیج دینا۔ وہاں جا کر مجھے جس سے ملنا تھا اس کا نام اور خفیہ کوڈ ورڈ اور حریت پرستوں کی کمین گاہ کے بارے میں بھی بتا گیا تھا۔ بھوپال کے مجاہد نے مجھے دوسرے روز جب میں کشمیر کی طرف جانے لگا تو کہا۔

"حریت پسندوں کی کمین گاہ سے کچھ فاصلے پر ایک دکان ہے....."

میں اس دکان کا محل وقوع آپ کو نہیں بتاؤں گا اور نہ ہی ان حریت پسند کشمیری مجاہدوں کے اصلی نام بتاؤں گا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ بھوپال کے مجاہد نے مجھے بتایا کہ اس خاص دکان پر مجھے ایک آدمی ملے گا جو مجھے کمانڈو اکبر (یہ نام بھی فرضی ہے) کے پاس پہنچا دے گا۔ مجھے کشمیری حریت پرست کمانڈو اکبر کے پاس ہی جانا تھا۔ اسی روز میں بھوپال سے دلی جانے والی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دلی پہنچ کر میں نے مشرقی پنجاب جانے والی گاڑی پکڑی۔ یہاں میں محتاط ہو گیا تھا کیونکہ دلی اور مشرقی پنجاب کی پولیس اور ملٹری پولیس کو میں مطلوب تھا اور انٹیلی جینس میری تلاش میں تھی۔ جالندھر کے سٹیشن پر گاڑی رکی تو میں پوری طرح سے چوکس تھا۔ یہاں سے مجھے جموں توی کی طرف جانے والی گاڑی پکڑنی تھی جس کے چلنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں جالندھر سٹیشن پر انتظار کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں سٹیشن سے نکل آیا۔ قریب ہی لاریوں کے دو اڈے تھے جہاں سے ہوشیار پور، گورداسپور اور جموں کی طرف لاریاں چلتی تھیں۔

میں جموں جانے والی ایک لاری میں دوسرے مسافروں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں چاروں طرف ماحول کا برابر جائزہ لے رہی تھیں۔ وہاں مجھے کوئی مشتبہ آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ جس طرح انٹیلی جینس والے مفرور ملزم کو ایک نظر میں پہچان لیتے ہیں اسی طرح میں بھی ایک نظر میں انٹیلی جینس کے آدمی کو پہچان لیتا تھا۔ لاری میں ہندو سکھ سواریاں ہی تھیں۔ کچھ عورتیں بھی بچوں کو لیے بیٹھی تھیں۔ ڈرائیور سکھ تھا، جو بار بار شور مچاتا اور مسافروں سے کہتا۔

"چلو اوئے بیٹھ جاؤ ہن، گھمنیاں نہ پاؤ۔"

لاری جالندھر سے جموں کی طرف چل پڑی۔ لاری سارا رستہ جگہ جگہ رک کر مسافر اٹھاتی رہی۔ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ میں خیریت سے جموں پہنچ گیا۔ جموں سے بے حد حساس علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں جگہ جگہ فوجی بازاروں میں کھڑے نظر آئے۔ بھارت کی حکومت کشمیر پر ناجائز قبضہ جمانے کے لیے اپنی فوج کو اندھا دھند موت کے منہ میں دھکیل رہی تھی۔ جموں سے مجھے سری نگر جانے والی لاری میں سوار ہونا تھا۔ یہاں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ اپنے صاف ستھرے لباس سے میں کوئی سرکاری ملازم لگتا تھا۔ میرے پاس کافی روپے تھے مگر ہتھیار کوئی نہیں تھا۔ کمانڈو چاقو تک نہیں تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی اور موقع بھی نہیں تھا۔ میں ایک لاری میں بیٹھ گیا جو سری نگر جا رہی تھی۔ لاری جموں شہر سے نکلنے اور دریائے توی کا پل عبور کرنے کے بعد جموں بانہال روڈ پر تو ایک جگہ فوجی چیک پوسٹ لگی تھی۔ مسلح فوجی سپاہیوں نے لاری کو رکوا لیا اور مسافروں کو گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ ایک آدھ مسافر سے اس کا نام وغیرہ پوچھ لیا۔ میں پچھلی سیٹ پر بڑا معصوم اور بولا بھالا بن کر بیٹھا تھا۔ فوجی سپاہی نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے کہا۔

"ہری کرشن۔"

"کہاں جا رہے ہو؟" دوسرے فوجی نے پوچھا۔

میں نے کہا۔

"سری نگر میں اپنے چیچا جی کے پاس جا رہا ہوں وہاں ان کی کپڑے کی دکان ہے، ہنومان کلاتھ ہاؤس۔"

دکان کا نام اسی وقت میرے ذہن میں آیا اور میں نے بول دیا۔ فوجی پیچھے ہٹ گیا اور ڈرائیور کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اوکے، جاؤ۔"

میں نے سکھ کا سانس لیا اور لاری سری نگر کی طرف روانہ ہو گئی۔ سری نگر پہنچتے ہی میں شہر سے باہر اس دکان پر پہنچا جہاں بھوپال کے مجاہد نے مجھے پہنچنے کی ہدایت کی

تھی۔ وہاں ایک گورا چٹا کشمیری بیٹھا کام کر رہا تھا۔ دکان میں دو اور آدمی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے کوڈ ورڈ میں بات کی تو اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"مال دکان کے اندر ہے' چل کر پسند کر لیں۔"

وہ مجھے دکان کے اندر ایک کوٹھڑی میں لے گیا۔ کہنے لگا۔

"کس سے ملنا ہے؟"

میں نے کمانڈو اکبر کا نام لیا تو کہنے لگا۔

"بھوپال سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں۔"

وہ بولا۔

"تمہاری اطلاع ہمیں پہنچ چکی تھی۔"

پھر اس نے مجھے کمانڈو اکبر کی خفیہ پناہ گاہ کی جگہ بتائی اور کہا۔

"سیدھا وہاں نہ جانا شہر کی دو تین مارکیٹوں میں گھومتے پھرتے رہنا۔ فوج نے یہاں بڑی سی آئی ڈی چھوڑ رکھی ہے۔"

میں سلام دعا لے کر دکان سے باہر آگیا اور اس آدمی کی ہدایت کے مطابق سیدھا کشمیری مجاہدوں کی خفیہ پناہ گاہ کی طرف جانے کی بجائے سری نگری شہر کے با رونق بازار میں آکر مختلف مارکیٹوں کی دکانوں میں اس طرح گھومتا پھرتا رہا جیسے مجھے کسی چیز کی تلاش ہے۔ ایک چائے کے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ چائے پی اور جب شام ہوگئی تو کمانڈو اکبر سے ملنے کشمیری مجاہدوں کے ہائیڈ آؤٹ کی طرف چل پڑا۔ مشرقی پنجاب میں بہار کا موسم شروع ہو رہا تھا مگر کشمیر میں ابھی سردی تھی اور شام کو سردی زیادہ ہو جاتی تھی۔ میں نے جیکٹ کا کالر چڑھا لیا اور جو راستہ کشمیری دکاندار نے بتایا تھا اس پر چلتے ہوئے مجاہدین کی خفیہ پناہ گاہ کے علاقے میں پہنچ گیا۔ یہ علاقہ چھوٹی بڑی پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ یہاں چنار کے بڑے درخت تھے۔ ایک

درخت کے قریب سے گزر رہا تھا کہ تین آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ ان کے چہرے سبز نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔ میں نے وہاں بھی کوڈ ورڈ دہرایا اور کہا۔

"مجھے کمانڈو اکبر سے ملنا ہے۔ میں بھوپال سے آیا ہوں۔ میرا نام کرم واد ہے۔"

انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور مجھے ادھر ادھر سے گھماتے پھراتے ایک جگہ لے گئے اور میری آنکھوں سے پٹی اتار دی۔ میں ایک کوٹھڑی میں کھڑا تھا میرے سامنے ایک سرخ و سفید کشمیری جوان گھٹنوں پر سٹین گن رکھے چارپائی پر بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم انڈین آرمی کے جاسوس ہو۔ بتاؤ تمہارا اصل نام اور رینک کیا ہے؟"

میں نے کہا۔

"اگر تمہارا نام کمانڈو اکبر ہے تو یقین کرو' میں کمانڈو کرم داد ہوں اور مجھے بھوپال کے مجاہد کمانڈو منظر خالد سے ملنا ہے۔ میں کشمیر کی جنگ آزادی میں آپ لوگوں کے شانہ بشانہ لڑنے آیا ہوں۔"

اس کشمیری مجاہد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور کہنے لگا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم کرم داد ہی ہو سکتے ہو۔ کمانڈو خالد نے مجھے تمہارا حلیہ وغیرہ سب کچھ بتا دیا تھا۔ پھر بھی تم سے اس قسم کی بات کرنی ضروری تھی۔ میرے ساتھ آؤ۔"

وہ مجھے وہاں سے ایک اور پناہ گاہ میں لے گیا جو ٹیلوں کے درمیان جنگلی درختوں اور جنگلی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھی۔ وہاں بھی مسلح کشمیری مجاہدوں کی مسلح ڈیوٹی گارڈ موجود تھی۔ کمانڈو منظر خالد کو پتہ چلا تو وہ پناہ گاہ سے نکل کر باہر آگیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر ملے۔ وہ مجھے اندر لے گیا۔ کمانڈو اکبر بھی ہمارے ساتھ تھا۔ کمانڈو خالد نے مجھ سے میرے سفر کی بابت پوچھا کہ راستے میں کوئی پیچھے تو نہیں لگا۔

میں نے کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔"

چونکہ وہاں کشمیری مجاہد کمانڈو اکبر موجود تھا۔ اس لیے خالد نے مجھ سے ناگن درگا کے بارے میں دریافت نہ کیا۔ کہنے لگا۔

"یہاں بھارتی فوج نے نہتے کشمیری عوام پر ظلم و بربریت کی انتہا کر دی ہے۔ درگاہ شریف کو نذر آتش کر دیا گیا ہے۔ کشمیری شہری بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں شہید ہو رہے ہیں۔"

یہاں کمانڈو اکبر نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہمارے مجاہدوں نے بھی کئی بھارتی فوجی مار ڈالے ہیں۔ گھات لگا کر ان کے کئی ٹرک اڑا دیے ہیں۔ مگر بھارتی فوج کو برابر کمک مل رہی ہے۔ دو دن میں کئی نئی انڈین رجمنٹیں مقبوضہ کشمیر میں آ چکی ہیں۔"

کمانڈو خالد بولا۔

"ان میں ایک ٹینک رجمنٹ بھی ہے۔ انڈین آرمی اس ٹینک رجمنٹ کی مدد سے کشمیر میں مسلمانوں کے تمام مقدس مقامات کو تباہ کر دینے کا ناپاک منصوبہ بنا چکی ہے۔ کیونکہ انڈین آرمی کے خیال میں یہی وہ جگہیں ہیں جو کشمیری حریت پسندوں کی پناہ گاہیں ہیں۔"

کمانڈو اکبر نے کہا۔

"ہم اپنی تباہ کن جوابی کاروائی سے انڈین آرمی ہائی کمانڈ کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم ان کا ایسا کوئی ناپاک منصوبہ کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔"

کمانڈو منظر خالد نے کہا۔

"اس ٹینک رجمنٹ کا کیمپ شوپیاں کے جنگل میں ہے۔ ہماری ایک پارٹی اس کا جائزہ لے چکی ہے۔ میں اور کمانڈو اکبر چرواہوں کے بھیس میں اس پارٹی کے ساتھ گئے تھے۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا ساری ٹینک رجمنٹ اسی ایک کیمپ میں مقیم ہے؟"
کمانڈو اکبر نے جواب دیا۔
"یہ صرف اس رجمنٹ کے ایک بریگیڈ کا کیمپ ہے اور یہاں پچاس کے قریب ٹینک ہیں۔ اگر ہم کسی طرح ان ٹینکوں کو برباد کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بھارتی ہائی کمان دوبارہ یہاں ٹینک رجمنٹ کبھی نہیں لائے گی اور باقی ٹینکوں کو بھی یہاں سے نکال کر جموں کی طرف لے جائے گی۔ ہم انڈین آرمی ہائی کمان کی ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ایک بزدل قوم ہے اور اپنی جان بچانے کی خاطر لڑتی ہے۔ ہماری طرح اللہ اور اس کے رسول پاکؐ کے نام پر شہید ہونے کے لیے نہیں لڑتی۔"
میں بڑے غور سے کمانڈو اکبر کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے ہندو قوم کی ذہنیت کی بالکل صحیح عکاسی کی تھی۔ میں نے پوچھا۔
"اس ٹینک بریگیڈ کی حفاظت کے لیے انفنٹری ضرور ساتھ ہوگی۔ کیونکہ ٹینک رجمنٹ کو سپورٹ کے لیے انفنٹری رجمنٹ ساتھ رکھی جاتی ہے۔ اس کیمپ میں میرے اندازے کے مطابق مارٹر پلاٹون بھی ضرور ہوگی۔"
کمانڈو اکبر کہنے لگا۔
"اس کے متعلق معلومات فراہم کی جا سکتی ہیں۔"
میں نے کہا۔
"ان معلومات کا حاصل کرنا ہمارے کمانڈو اٹیک کی کامیابی کے لیے بہت ضروری ہے۔"
کمانڈو خالد نے کمانڈو اکبر سے کہا۔
"کیا کل شام تک ہمیں یہ معلومات مل سکتی ہیں کمانڈو اکبر؟"
"کیوں نہیں۔" کمانڈو اکبر نے کہا۔ "صبح ہوتے ہی میں دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگا دوں گا۔جو شام تک ہمیں ساری معلومات فراہم کر دیں گے۔"

میں نے کہا۔

"اس کے بعد مجھے خود ایک بار اس بھارتی کیمپ کا جائزہ لینا ہوگا۔"

کمانڈو خالد نے کہا۔

"تم کل شام ہی یہ کام کر سکتے ہو۔ کمانڈو اکبر تمہارے ساتھ ہوگا۔ یہ اس سارے علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے۔"

وہاں سبز چائے کا سماوار آ گیا۔ ہم چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ رات کو کھانا کھا کر ہم سو گئے۔ دوسرے دن کمانڈو اکبر نے دو مجاہدوں کو مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کی خاطر بھارتی کیمپ کی طرف بھیج دیا۔ دونوں مجاہد دوپہر کے بعد واپس آئے۔ انہوں نے واپس آ کر جو کچھ بتایا اس سے پتہ چلا کہ فوجی کیمپ پر حریت پسند مجاہدوں کے متوقع حملے کے ڈر سے بھارتی بریگیڈ کمانڈر کے حکم سے سولہ کے سولہ ٹینک کیمپ سے نکال کر چھرپال کے نیم پہاڑی جنگل میں ایک جگہ چھپا دیئے گئے ہیں۔ یہ جگہ کیمپ کے جنوب میں ایک ٹیلے کے دامن میں دو میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں انفنٹری کی پوری ایک کمپنی ٹینکوں کی حفاظت کے لیے تعینات ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ مارٹر گنوں کی ایک پلاٹون بھی کیمپ میں موجود ہے۔ میں نے کہا۔

"اگر وہ کیمپ میں ہے تو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ کیونکہ اب ٹینک کیمپ کے اندر نہیں ہیں۔"

فیصلہ یہ ہوا کہ میں کمانڈو اکبر کے ساتھ چرواہوں کے بھیس میں دن کی روشنی میں چھرپال کے ٹیلوں میں انڈین رجمنٹ کے ٹینکوں کے ہائیڈ آؤٹ دیکھنے جائیں گے۔ یہاں میں یہ بات بتاتا چلوں کہ ہم میں سے اکثر حضرات کو یہ علم ہوگا کہ پہاڑی علاقوں میں کوئی بھی فوج اپنے ٹینک نہیں لے جاتی۔ ٹینک صرف میدانی علاقوں میں ہی اپنی بھرپور کارکردگی کے ساتھ لڑ سکتے ہیں۔ لیکن کشمیر کے محاذ پر مقبوضہ بھارتی فوجیوں کا حریت پسند کشمیری مجاہدوں کے ہاتھوں اس قدر بھاری جانی نقصان ہو رہا تھا اور اتنے فوجی مارے جا رہے تھے کہ بھارتی فوجی ہائی کمان وہاں اپنی ٹینک رجمنٹ لے آیا تھا۔

اس خیال سے بھی کہ ٹینکوں کی توپوں کو توپ خانے کی توپوں کے طور پر استعمال کیا جائے۔ دوسرے کشمیر کی وادی میں ٹینکوں کی نقل و حرکت نسبتاً آسان تھی اور ان ٹینکوں کی مدد سے مظلوم نہتے کشمیری مسلمانوں کے گھروں اور مقدس مقامات کو بلڈوز کر کے بغیر دھماکہ کیے تباہ کیا جا سکتا تھا۔ حال ہی میں مقدس کشمیری خانقاہ کو ٹینکوں نے ہی شہید کیا تھا۔ اگلے روز میں اور کمانڈو اکبر کشمیری چرواہوں کے بھیس میں انڈین ٹینک رجمنٹ کی ٹینک بریگیڈ کے خفیہ ہیڈ آوٹ دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ کمانڈو اکبر خفیہ نیم پہاڑی علاقوں سے گزر رہا تھا۔ ہمارے راستے میں کئی کھڈ نالے اور کھائیاں آئیں۔ آخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ہم بلندی پر سے نیچے پھیلی ہوئی چھوٹی سی وادی دیکھ سکتے تھے۔ ہم جھاڑی کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ کمانڈو اکبر نے مجھے درختوں کا ایک جھنڈ دکھایا۔ کہنے لگا۔

"میری اطلاع کے مطابق انڈین آرمی کے ٹینک ان درختوں میں چھپائے گئے ہیں۔ درختوں کے اس جھنڈ کے پیچھے ایک خشک نالہ ہے۔ میں تمہیں دوربین دیتا ہوں۔ اس نالے کو غور سے دیکھو۔"

اس نے اپنے لمبے کرتے کے اندر سے چھوٹی دوربین نکال کر مجھے دی۔ میں نے دوربین آنکھوں پر لگا کر درختوں کی جانب دیکھا۔ درختوں کے جھنڈ کے قریب مجھے دو فوجی نظر آئے جنہوں نے سروں پر بکس اٹھا رکھے تھے۔ وہ درختوں کے جھنڈ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے وہ فوجی کمانڈو اکبر کو بھی دکھائے اور کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ یہاں مارٹر گنوں کے مورچے بھی ہیں۔"

کمانڈو اکبر نے دوربین مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم درختوں کے پیچھے جو خشک نالہ ہے اس کو بھی غور سے دیکھ لو۔ کیونکہ میرے پلان کے مطابق ہماری کمانڈو پارٹی رات کے وقت اسی طرف سے اٹیک کرے گی۔"

میں نے دوربین لگا کر درختوں کے عقب پر نگاہ ڈالی۔ وہاں مجھے اونچی جگہ نظر آئی

جس کے پیچھے ایک خشک نالہ تھا۔ نالہ درختوں کے پہلو سے ہو کر آگے چلا گیا تھا۔ یہ زیادہ چوڑا نہیں تھا مگر اس کے کنارے اونچے تھے۔ کمانڈو اکبر کہہ رہا تھا۔

"یہ برساتی نالہ ہے۔ اس میں بارش کے دنوں میں ہی پانی آتا ہے۔ باقی سارا موسم یہ خشک رہتا ہے۔ آج کل بھی یہ خشک ہی ہے۔ ہمیں اس نالے کے اندر سے ہو کر اپنے ٹارگٹ تک آنا ہوگا۔ نالے کے پیچھے ناشپاتیوں کا باغ ہے۔ ہماری پارٹی شام کے وقت وہاں آکر چھپ جائے گی۔ آج کل یہ باغ ویران پڑا ہے۔ ناشپاتیوں کا موسم ابھی شروع نہیں ہوا۔"

میرے حساب سے جتنی معلومات ہمیں وہاں حاصل ہو سکتی تھیں وہ ہم نے حاصل کر لی تھیں۔ ہم وہاں سے واپس آ گئے۔ میں نے کمانڈو خالد کو پوری رپورٹ دی اور اس سے پوچھا۔

"ہماری کمانڈو پارٹی میں زیادہ آدمی نہیں ہونے چاہئیں۔"

کمانڈو اکبر کہنے لگا۔

"تمہارے خیال میں کتنے آدمی ہونے چاہئیں؟"

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ہم تینوں کے علاوہ ایک چوتھا مجاہد ٹھیک رہے گا۔ اس سے زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں لیکن آپ کے پاس اسلحے کا کیا انتظام ہے؟"

کمانڈو اکبر بولا۔

"ہمارے پاس ہر قسم کا اسلحہ موجود ہے۔ ہم یہ اسلحہ بھارتی فوجی کیمپوں پر شب خون مار کر لاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"ہمیں سب سے زیادہ راکٹ لانچروں کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ ٹینک کو صرف راکٹ لانچر سے نکلا ہوا گولہ ہی تباہ کر سکتا ہے۔ ہینڈ گرنیڈ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

کمانڈو اکبر نے کہا۔

"ہمارے پاس راکٹ لانچر بھی ہیں اور اس کے گولے بھی ہیں' ہمیں کتنے چاہئیں؟"

شام ہونے تک چار راکٹ لانچر کے علاوہ پچاس ساٹھ گولوں کا انتظام ہوگیا۔ ہم نے چار چار ہینڈ گرنیڈ بھی ساتھ رکھ لیے۔ رات جب آدھی سے زیادہ گزر گئی تو ہماری کمانڈو پارٹی بھارتی ٹینکوں کو برباد کرنے اپنے ہائیڈ آؤٹ سے چل پڑی۔ میں تھا' میرے ساتھ کمانڈو خالد تھا' کمانڈو اکبر تھا اور ایک کشمیری مجاہد تھا۔ اسے راکٹ لانچر فائر کرنے کی تربیت مل چکی تھی۔

آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ ہم ستاروں کی پھیکی روشنی میں اپنے ٹارگٹ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ کمانڈو اکبر ہمیں گائیڈ کر رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے راستے سے لے کر جا رہا تھا۔ ہم پیچھے سے ہو کر خشک نالے میں داخل ہوگئے۔ اب ہم پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ کیونکہ دشمن کا حساس علاقہ شروع ہوگیا تھا۔ نالہ جہاں سے ایک طرف گھوم جاتا تھا وہاں پہنچ کر ہم رک گئے۔ میں نے اپنے تینوں ساتھیوں کو ٹارگٹ دکھایا اور سرگوشی میں کہا۔

"یہاں سے بکھر جاؤ۔ درختوں کے نیچے ٹینک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہیں۔ اب ہر کمانڈو کا ٹارگٹ اپنا اپنا ہوگا اور وہ اپنی عقل سے کام لے کر راکٹ لانچر فائر کرے گا۔ ٹارگٹ کا فاصلہ پندرہ بیس قدم سے زیادہ ہوا تو راکٹ ٹارگٹ پر نہیں لگے گا۔ ہر جوان کو کم از کم تین ٹینک ضرور تباہ کرنے ہوں گے۔ خدا حافظ! زندہ رہے تو پھر ملیں گے شہید ہوگئے تو اللہ کے دربار میں ملیں گے۔"

ہم چاروں بکھر گئے۔ میں نالے کے اونچے کنارے کے ساتھ ساتھ جھک کر چل رہا تھا۔ جب مجھے درختوں کے نیچے دو ٹینک بڑے بڑے سیاہ جھنڈوں کی طرح نظر آئے تو میں پیٹ کے بل لیٹ گیا' راکٹ لانچر میری پشت پر تھا۔ راکٹ ایک تھیلے میں تھے۔ میں آہستہ آہستہ رینگ کر ٹینکوں کو نظر میں رکھ کر بڑھ رہا تھا۔ میں فاصلہ کم کرنا

چاہتا تھا۔ میں اس بات سے غافل نہیں تھا کہ یہاں ٹینکوں کی حفاظت کے لیے انفنٹری کے جوان موجود ہیں اور جاگ کر پہرہ دے رہے ہوں گے۔ لیکن مجھے اپنی ڈیوٹی ادا کرنی تھی' اپنا فرض ادا کرنا تھا۔ ہم لوگ موت کے منہ میں صرف اس لیے آ گئے تھے کہ کشمیریوں کے گھروں' خانقاہوں' مسجدوں کو شہید کرنے والے دشمن کو جتنا ختم کر سکتے ہیں ختم کر دیں اور آزادی کشمیر کی جدوجہد جاری رکھی جائے۔ زندہ واپس جانے کی امید نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہم میں سے کوئی مجاہد بھی اس خیال سے اس آگ میں نہیں کودا تھا کہ وہ زندہ واپس آ جائے گا۔ ہمارے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا کہ کشمیر پر زبردستی قبضہ کرنے والے اور مظلوم کشمیریوں پر وحشیانہ ظلم توڑنے والے دشمن کو تباہ و برباد کیا جائے۔

مجھے یہ فکر ضرور تھی کہ میرے ساتھیوں میں سے اگر کسی سے ذرا سی بھی بھول چوک ہوگئی تو دشمن بیدار ہو جائے گا اور روشنی راؤنڈ فائر کر کے وہاں دن کی روشنی کر دے گا اور پھر مشین گنوں کی بوچھاڑیں فائر کرنی شروع کر دے گا۔ میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ میرے ساتھی عقل اور ہوش مندی سے کام لیں۔ میں تربیت یافتہ سابق فوجی کمانڈو تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کتنے فاصلے پر رہ کر مجھے راکٹ لانچر فائر کرنا ہے اور یکے بعد دیگرے تین چار ٹینکوں کا نشانہ لے کر گولے فائر کرنے تھے۔ یہ کام کوئی تربیت یافتہ کمانڈو یا ٹرینڈ فوجی ہی کر سکتا تھا۔ میں کہنیوں کے بل رینگ رہا تھا۔ ستاروں کی روشنی میں مجھے تین ٹینک نظر آئے۔ تینوں ٹینک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درختوں کے نیچے اس طرح کھڑے تھے کہ ان کے پہلو میری طرف تھے۔ یہ فوجی نقطۂ نگاہ سے بڑا اچھا نشانہ تھا۔

ابھی تک میرے کسی ساتھی نے کوئی راکٹ فائر نہیں کیا تھا۔

میرے راکٹ لانچر میں گولہ موجود تھا۔ میں گھٹنوں کے بل کھڑا ہوگیا۔ راکٹ لانچر کندھے پر رکھا۔ دو گولے تھیلے میں سے نکال کر میں نے اپنے سامنے رکھ لیے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ٹینک میدان جنگ کی پوزیشن میں نہیں ہے اور پہلا ٹینک ہٹ

ہونے کے بعد دوسرے ٹینک کا گولہ مجھ پر فائر نہیں ہوگا۔ مشین گنوں کا فائر آ سکتا تھا۔ میں نے پہلے ٹینک کا نشانہ لیا اور بسم اللہ پڑھ کر فائر کر دیا۔ گولہ شوں کر کے لانچر سے نکلا اور تھوڑا سا خم کھا کر سیدھا ٹینک کے پہلو میں جا کر لگا۔

گولہ ٹینک کی موٹی آہنی چادر کو چیر کر اس کے اندر جا کر دھماکے سے پھٹا اور ساتھ ہی ٹینک بھی ایک خوفناک دھماکے سے پھٹ گیا۔ میں دوسرا راکٹ لوڈ کر چکا تھا ٹینک کے شعلوں نے مجھے دوسرے ٹینک کو دکھا دیا۔ میں نے دوسرے ٹینک پر بھی گولہ فائر کر دیا۔ دوسرا ٹینک بھی پھٹ کر شعلوں میں بدل گیا۔ میں تیسرا ٹینک ہٹ کرنے والا تھا کہ فضا مشین گنوں کے فائر کے دھماکوں سے لرزنے لگی۔ ہر طرف سے مشین گنیں فائر ہو رہی تھیں۔ میں پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ میں راکٹ لانچر لیٹ کر فائر نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے گھٹنوں کے بل کھڑے ہونا ضروری تھا۔ اتنے میں دوسری جانب یکے بعد دیگرے تین زبردست دھماکے ہوئے اور تین جگہوں سے شعلے بلند ہونے لگے۔ رات دن کی طرح روشن ہوگئی۔ میرے ساتھیوں میں سے کسی نے یا تینوں نے دشمن کے تین ٹینک تباہ کر دیے تھے۔ فوجی جوانوں میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ دو اور زبردست دھماکے ہوئے۔ دشمن کے دو اور ٹینک پھٹ کر شعلے اگل رہے تھے۔ اس کے بعد دھماکوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں نے پیچھے رینگنا شروع کر دیا۔ میرا مشن ختم ہوگیا تھا۔ اب مجھے واپس اپنے ہائیڈ آؤٹ میں پہنچنا تھا۔ مشین گنوں کی گولیاں چیختی ہوئی میرے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ میں نے خشک نالے کی دیوار پر سے اندر چھلانگ لگا دی اور پیچھے کی طرف دوڑ پڑا۔

مجھے پیچھے ہینڈ گرنیڈوں کے دھماکے سنائی دیئے۔ شاید یہ ہمارے ساتھیوں کے گرنیڈوں کے دھماکے تھے۔ میں نالے کی دیوار کی آڑ لے کر پیچھے کو دوڑتا جا رہا تھا کہ اچانک مارٹر گنوں کا فائر آنے لگا۔ مارٹر گنوں کے گولے اولوں کی طرح جگہ جگہ گر کر پھٹ رہے تھے۔ اڑتے پتھروں اور لوہے کے ٹکڑوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ دشمن پوری طرح بیدار ہوچکا تھا اور اب وہ ہماری کمانڈو پارٹی کو ہلاک کرنے یا ہمیں گھیرے

میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مارٹر گنوں کے گولے نالے میں بھی آنے لگے۔ میں زمین پر پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ راکٹ لانچر ابھی تک میرے پاس ہی تھا۔ اس میں گولہ لوڈ تھا۔ مارٹر توپوں کے گولے مجھ سے تھوڑے فاصلے پر پھٹ رہے تھے۔ میں نے سر اپنے بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔ جب مارٹر گنوں کی رینج ذرا دور ہوئی تو میں اٹھ کر آگے کو دوڑ پڑا۔ یہاں نالے کا کنارہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ میں نالے سے باہر نکل کر ایک طرف دوڑا تو اچانک سامنے سے مشین گن فائر ہوئی۔ میں فوراً لیٹ گیا۔ گولیاں میرے اوپر سے نکل رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ چاروں طرف روشنی ہو گئی۔ کچھ فاصلے پر ایک فوجی گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے راکٹ لانچر سیدھا کیا اور گولہ فائر کر دیا۔ مگر فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے گولہ نشانے پر نہ لگا۔ اچانک میری دائیں اور بائیں جانب سے فوجی دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے مجھے قابو کر لیا۔

میرا راکٹ لانچر پکڑ کر انہوں نے دور پھینک دیا اور مجھے گالیاں دیتے گھسیٹتے ہوئے فوجی گاڑی کے پاس لے آئے۔ یہاں بھی بھارتی فوجی پوزیشنیں لیے بیٹھے تھے۔ ایک فوجی نے کہا۔

"میجر صاحب ایک کشمیری کمانڈو پکڑ لیا ہے۔"

بھارتی میجر نے چیخ کر کہا۔

"دوسروں کو بھی پکڑو جا نگلی۔"

بھارتی میجر نے میری پسلیوں میں زور سے ٹھڈا مارا اور گالی دے کر کہا۔

"کہاں ہیں تمہارے دوسرے ساتھی؟"

میں خاموش رہا۔ انہوں نے مجھے بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب میرے ساتھ اس وقت تک یہی وحشیانہ سلوک ہوتا رہے گا جب تک میں مر نہیں جاتا یا فرار نہیں ہو جاتا۔ یہ جان کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے باقی ساتھی نہیں پکڑے گئے۔ مجھے فوجی گاڑی میں ڈال کر میرے ہاتھ باندھ دیے گئے۔ فوجی گاڑی تیزی سے کسی طرف روانہ ہو گئی۔ میری ایک آنکھ بری طرح درد کر رہی تھی۔ وہ سوج بھی گئی

تھی۔ پسلیوں میں بھی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ گاڑی میں چھ سات ڈوگرے فوجی بیٹھے تھے جنہوں نے مجھے اپنے پاؤں میں ڈال رکھا تھا۔

مجھے کسی دوسرے فوجی کیمپ کے کوارٹر گارڈ میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔ کوارٹر گارڈ میں بتی جل رہی تھی۔ میرے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے۔ ایک ڈوگرہ فوجی افسر آ گیا۔ اس نے پہلے تو مجھے خوب مارا پیٹا' پھر گالیاں دے کر پوچھا۔

"تم کشمیری نہیں لگتے۔ تم پاکستانی کمانڈو ہو۔ بتاؤ تمہارا ہائیڈ آؤٹ کہاں ہے۔ تمہارے باقی ساتھی کہاں روپوش ہیں؟"

میں نے کہا۔

"میں سویلین رضاکار ہوں۔ پاکستانی کمانڈو نہیں ہوں۔"

مجھے کوارٹر گارڈ میں الٹا لٹکا دیا گیا۔ میرے سارے کپڑے اتروا دیئے۔ دو فوجی بید کی چھڑیوں سے مجھے بے دردی سے پیٹنے لگے۔ جب مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی تو مجھے اتار دیا گیا۔ ایک فوجی نے میرے اوپر میرے کپڑے پھینک کر کہا۔

"چلو انہیں پہن لو۔"

میں ٹھنڈے فرش پر پڑے پڑے آہستہ آہستہ کپڑے پہننے لگا۔ بھارتی فوجی افسر نے ایک فوجی سے کہا۔

"اس کو فوراً جالندھر کینٹ کے سپیشل سیل میں پہنچاؤ۔ وہاں اس کا باپ بھی سب کچھ بتا دے گا' اٹھاؤ اسے۔"

مجھے گھسیٹ کر کوارٹر گارڈ سے نکالا گیا۔ باہر ایک فوجی گاڑی کھڑی تھی جو چاروں طرف سے بند تھی۔ مجھے اس میں پھینک کر دروازہ بند کر کے لاک کر دیا گیا۔ دو مسلح فوجی میرے ساتھ ہو گئے۔ انہوں نے فوراً میرے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیئے اور فوجی گاڑی چل پڑی۔ جالندھر کینٹ کا سپیشل سیل ضرور کوئی خطرناک ٹارچر سیل تھا جہاں یہ لوگ مجھے لے جا رہے تھے۔ میں اپنی کایا پلٹ کی دعا مانگنے لگا۔ کاش میں انسان سے سانپ بن سکتا۔ صرف یہی ایک صورت میرے بچنے کی تھی۔ مگر میری دعا قبول نہ ہوئی

اور میں اپنے انسانی وجود میں ہی رہا۔ فوجی گاڑی ساری رات چلتی رہی۔ راستے میں کسی جگہ گاڑی تھوڑی دیر کے لیے رکی اور پھر آگے روانہ ہو گئی۔ گاڑی پہاڑی راستوں سے گزر رہی تھی۔ گاڑی کے اندر دن کی سپیدی پھیلنے لگی تو میں سمجھ گیا کہ صبح ہو گئی ہے۔ دوپہر کے وقت فوجی گاڑی میدانی علاقے میں داخل ہو گئی تھی۔ ایک جگہ رک کر فوجیوں نے ناشتہ وغیرہ کیا۔ مجھے پانی بھی نہ پوچھا گیا۔ گاڑی آگے چل پڑی۔ سارا دن اسی طرح گزر گیا۔ رات کے وقت فوجی گاڑی کسی بڑے شہر میں داخل ہو گئی تھی۔ باہر سے دوسری گاڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جو فوجی میری نگرانی کے لیے اندر بیٹھے تھے ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ جالندھر شہر آ گیا ہے۔

فوجی گاڑی شہر کے مختلف بازاروں اور سڑکوں پر سے گزرتی ایک علاقے میں آ گئی جہاں ٹریفک کا شور نہیں تھا۔ میں باہر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ مجھے کھینچ کر باہر نکال گیا۔ یہ کوئی فوجی چھاؤنی لگتی تھی۔ مجھے ایک چاردیواری میں بند کر دیا گیا۔ ایک گھنٹے بعد کھانے کو باسی روٹی اور پانی دیا گیا۔ خدا کا شکر ادا کر کے کھا گیا۔ دن چڑھا تو وہی سری نگر والا فوجی میجر آ گیا۔ یہ ڈوگرہ تھا۔ اس کا پنجابی بولنے کا انداز ڈوگروں والا تھا۔ تشدد اور پوچھ گچھ کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ تین دن اور تین راتیں مجھ پر تشدد کے نئے نئے اوزار آزمائے گئے۔ بجلی کی کرسی پر بٹھا کر اس وقت تک جھٹکے دیئے گئے جب تک کہ میں بے ہوش نہیں ہو گیا۔ تین دن کے بعد مجھے کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا۔ دن میں ایک بار کھانے کو تھوڑا بہت دے دیا جاتا۔ میری حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ دو روز تک مجھ پر کوئی تشدد نہ کیا گیا۔ میرے جسم کی اندرونی چوٹیں کچھ کچھ ٹھیک ہونے لگی تھیں کہ مجھے کوٹھڑی سے نکال کر ایک اور ٹارچر سیل میں لے گئے۔ بھارتی میجر وہاں پہلے سے موجود تھا۔ سٹریچر پر اپریشن کی مختلف چھریاں اور قینچیاں پڑی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ آج شاید میری زندگی کی آخری رات ہو۔ بھارتی میجر کے ساتھ دو حوالدار بھی تھے۔ مجھے زمین پر بٹھا دیا گیا۔ بھارتی میجر کہنے لگا۔

"میں تمہیں ایک آخری موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم نے میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب نہ دیئے تو تمہیں اسی کوٹھڑی میں شوٹ کر کے تمہاری لاش باہر گندے نالے میں پھینک دی جائے گی۔"

پھر اس نے گھڑی دیکھی اور بولا۔

"اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ میں پورے پندرہ منٹ بعد دوبارہ آؤں گا۔ اتنی دیر میں تم سوچ سمجھ لو۔"

اتنا کہہ کر بھارتی میجر دونوں فوجیوں کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ کوٹھڑی کے دروازے کو باہر سے تالا لگانے کی آواز آئی۔ اس کے بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ میں سمجھ گیا کہ میری زندگی صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئی ہے۔ کیونکہ مجھ سے میجر نے جو پوچھنا تھا وہ میں نے اسے کبھی نہیں بتانا تھا اور اس ڈوگرہ میجر کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس سے پہلے کئی ایک واقعے ہوئے تھے کہ بھارتی فوجی کشمیری مجاہدوں کو پکڑ کر لے گئے ان سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ جب انہوں نے زبان نہ کھولی اور اپنے ساتھی حریت پسندوں کے بارے میں کچھ نہ بتایا تو انہیں وحشیانہ اذیتیں دے کر شہید کر دیا۔

میں نے اسی حالت میں اندازے سے قبلہ رو ہو کر اپنا سر خدا کے حضور سجدے میں ڈال دیا اور خداوند کریم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا اور جمیلہ کی شکل سامنے آ گئی۔ میں نے اس سے بھی کہا کہ میری وجہ سے اسے جو تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں اور میری موت کے بعد آگے اٹھانی پڑیں گی اس کے لیے وہ مجھے معاف کر دے۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھا خدا کو یاد کر رہا تھا۔ کوٹھڑی میں بلب روشن تھا۔ اچانک مجھے سرسراہٹ کی آواز آئی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ کیونکہ آواز اسی طرف سے آئی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کالے سیاہ رنگ کا ایک بچھو دروازے کے سوراخ میں سے داخل ہو کر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک طرف کو جا رہا ہے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا خدا نے میری دعا قبول فرمالی ہو۔

سانپ کے زہر سے میری کلیا پلٹ جاتی تھی اور میں انسان سے سانپ کے روپ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ بچھو کے زہر کا مجھے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا لیکن بچھو اور سانپ کے زہر میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ ہو سکتا تھا اس کا زہر بھی میری کلیا پلٹ دے اور مجھے آنے والے عذاب سے نجات مل جائے۔ اس وقت دوسرا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ یہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھا۔ میں نے لپک کر بچھو کو پکڑ لیا۔ بچھو نے فوراً" میرے ہاتھ پر ڈس دیا۔ میرے جسم میں درد کی شدید ٹیس اٹھی۔ بچھو میرے ہاتھ سے گر گیا۔ میں درد کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔

مجھے جھٹکا سا لگا۔ میں درد کی تکلیف کو بھول گیا۔ دل میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ کبھی میں ان جھٹکوں سے گھبرا جاتا تھا۔ اب یہ جھٹکا جیسے میرے لیے نئی زندگی کا پیام لایا تھا' مجھے دوسرا جھٹکا لگا۔ تیسرے جھٹکے کے ساتھ ہی میرا جسم ہلکا ہونا شروع ہو گیا۔ زمین کی کشش میرے لیے ختم ہو رہی تھی۔ پھر میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمکی اور دوسرے لمحے میں نے اپنے آپ کو مٹیالے رنگ کے چھوٹے سے سانپ کے روپ میں فرش پر کنڈلی مارے بیٹھے دیکھا۔ مجھ پر اس وقت مسرت و انبساط کی جو کیفیت طاری تھی میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ میرے پاس اسے بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ میں سانپ کے جسم میں تبدیل ہو گیا تھا لیکن انسانی ذہن کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ مجھے باہر فوجی بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے کونے میں جا کر چھپ گیا۔ دروازہ کھلا اور وہی ڈوگرہ بھارتی میجر دونوں فوجیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ جب مجھے نہ پایا تو ششدر سا ہو کر رہ گیا۔

"وہ کہاں گیا؟"

دونوں فوجی بھی حیران ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے کوٹھڑی میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ بھارتی میجر نے چیخ کر کہا۔

"وہ فرار ہو گیا ہے اسے پکڑو۔"

دونوں فوجی دوڑ کر کوٹھڑی سے نکل گئے۔ لیکن میں بھارتی میجر کو باہر نکلنے کا موقع

نہیں دینا چاہتا تھا اور میں نے اسے بالکل موقع نہ دیا۔ جیسے ہی وہ مجھے دبی زبان میں گالیاں دیتا دروازے کی طرف بڑھا۔ میں پیچھے سے اچھل کر اس کی گردن پر آگیا اور اس کی شہ رگ پر ڈس دیا۔ اس کی شہ رگ کو میں نے پہلے ہی سے اپنا ٹارگٹ بنا لیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میرا زہر کسی کی شہ رگ میں داخل ہو جائے اور پھر وہ زندہ حالت میں کھڑا رہے۔ بھارتی میجر جس نے درندہ بن کر مجھے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا تھا دھڑام سے گر پڑا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب کبھی نہ اٹھنے کے لیے گرا ہے۔ میں کھلے دروازے میں سے رینگ کر باہر نکل گیا۔ باہر شور مچ گیا تھا۔ فوجی ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ دو فوجی جیپیں ایک دوسری کے پیچھے تیزی سے گیٹ کی طرف جا رہی تھیں۔ میں اس فوجی چھاؤنی یا کیمپ سے نکل کر سڑک پر آگیا۔

رات کے سوا گیارہ بجے تھے۔ بھارتی میجر نے کہا تھا کہ وہ ٹھیک سوا گیارہ بجے واپس آئے گا اور وہ اتنے بجے ہی واپس آیا ہوگا۔ مگر اب مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ مجھے کسی بھارتی فوجی یا بھارتی پولیس یا انٹیلی جینس کی پروا نہیں تھی۔ بس خدا سے ایک ہی دعا مانگ رہا تھا کہ وہ مجھے ابھی سانپ کے روپ میں ہی رکھے۔ میں فٹ پاتھ کی دوسری طرف درختوں کے نیچے سے ہو کر رینگتا ہوا جا رہا تھا۔ جالندھر چھاؤنی کے سپیشل ٹارچر سیل سے نکلتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ایک بار جمیلہ' اپنی پیاری بیوی سے ملنے پاکستان ضرور جاؤں گا۔ آخر میں اس کا خاوند تھا اور اس کے مجھ پر بھی کچھ حقوق تھے جن کو میں نے ایک طویل مدت سے نظر انداز کیا ہوا تھا۔ ویسے بھی اس وقت مجھے اپنی بیوی جمیلہ کی محبت اور خبر گیری کی ضرورت تھی تاکہ میں کچھ وقت اس کے پاس گزار کر تازہ دم اور پوری طرح سے صحت مند ہو کر واپس کشمیر کے محاذ پر پہنچ جاؤں۔ انسانی شکل میں ہوتا تو مجھے کئی طرح کے خوف لاحق ہوتے۔ قدم قدم پر پکڑے جانے کا ڈر ہوتا۔ خاص طور پر جبکہ میں جالندھر چھاؤنی کی فوجی جیل سے فرار ہوا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ نہ جانے وہاں کتنے بھارتی فوجی افسروں کا کورٹ مارشل ہونے والا تھا۔ ملٹری اور پولیس کی انٹیلی جینس اور ملٹری پولیس نے سارے

علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہوگا۔ مگر میں سانپ کے روپ میں تھا۔ اس روپ میں سوائے اس کے اور کوئی خطرہ نہیں تھا کہ کہیں میں کسی گاڑی کے نیچے آ کر نہ کچلا جاؤں یا مجھے دیکھ کر لوگ لاٹھیاں اور پتھر مار کر ہلاک نہ کر دیں۔ اس کا میرے پاس ایک ہی علاج تھا کہ میں امرتسر کے بارڈر تک صرف رات کو سفر کروں۔ دن کی روشنی میں کسی کھیت میں چھپ کر بیٹھا رہوں۔

جالندھر امرتسر کے ایریا میں میں دو تین بار آ چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جالندھر شہر امرتسر سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے اور امرتسر سے آگے واہگہ بارڈر زیادہ دور نہیں ہے۔ جالندھر سے امرتسر تک کے چالیس میل ایک سانپ کے لیے رینگ کر طے کرنا بہت مشکل کام تھا۔ میں نے اس کا ایک حل ذہن میں سوچ لیا تھا۔ سب سے پہلے مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ میرا رخ امرتسر کی طرف ہے یا دلی کی طرف ہے۔ رات کے وقت شمال جنوب کا مجھے کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ دن کا وقت ہوتا تو سورج کو دیکھ کر میں مشرق اور مغرب کی سمتوں کا تعین کر سکتا تھا۔ جالندھر چھاؤنی کے ٹارچر سیل سے نکلنے کے بعد جس طرف میرا منہ اٹھا میں اسی طرف چلا جا رہا تھا۔ سڑک پر زیادہ گاڑیاں وغیرہ نہیں گزر رہی تھیں۔ آس پاس کوٹھیوں میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ویسے میں سانپ ہونے کی وجہ سے اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ میں رینگتے رینگتے کافی دور نکل آیا۔ میں تیزی سے رینگ رہا تھا۔ صرف اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انڈیا کی سرحد کے اندر ہی انسانی شکل میں واپس آ جاؤں۔ یہ بات میرے لیے قیامت سے کم نہیں تھی۔ میں اپنے سانپ ہونے کی حیثیت کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہوئے جتنی جلدی ہو سکے انڈیا کا بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہو جانا چاہتا تھا۔ سڑک ایک بارونق علاقے میں داخل ہو گئی۔

یہاں سڑک کشادہ تھی۔ درمیان میں گرین بیلٹ تھی جس کے اوپر مرکزی لائٹس کے کھمبے لگے ہوئے تھے۔ لائٹیں روشن تھیں۔ میں کنارے کنارے چھپ کر رینگ رہا تھا۔ ایک جگہ سینما ہاؤس کی شاندار عمارت کے باہر کسی انڈین فلم کے بڑے بڑے

رنگین بورڈ لگے تھے۔ اندر رات کا آخری شو چل رہا تھا۔ اس وقت مجھے امرتسر جانے والی کوئی بس یا لاری بھی نہیں مل سکتی تھی۔ ہو سکتا تھا اس وقت دلی یا کلکتے سے کوئی ٹرین آ رہی ہو جو امرتسر جاتی ہو۔ میں اس کی چھت پر بیٹھ کر امرتسر پہنچ سکتا تھا۔ کیونکہ ریل گاڑیاں رات کو بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔ اب مجھے ریلوے سٹیشن کی تلاش تھی۔ کسی سے میں یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ ریلوے سٹیشن کس طرف ہے۔ مجھے خود ہی اندازے سے معلوم کرنا تھا اور ریلوے سٹیشن کی سب سے بڑی نشانی سگنل کی لال سبز بتی ہی ہو سکتی تھی۔ اتنی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا رخ دلی کی طرف نہیں ہے اور میں امرتسر کی طرف ہی جا رہا ہوں۔

میں کشادہ سڑک پر سے گزر کر ایک گنجان سڑک پر آ گیا یہاں آتے ہی مجھے ریلوے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ میرے تن مردہ میں جیسے جان پڑ گئی۔ میں اس آواز کی سمت ہو گیا۔ ریلوے انجن کی آواز دو تین بار آئی تھی۔ اس نے مجھے سٹیشن کا راستہ دکھا دیا۔ سڑک چھوڑ کر میں کھیتوں میں گھس گیا۔ ان کھیتوں میں آتے ہی مجھے کچھ فاصلے پر سگنل کی کئی ہری اور لال لال بتیاں دکھائی دیں۔ میں ان کی طرف جتنی تیز رینگ سکتا تھا رینگنے لگا۔ آخر میں ریلوے یارڈ کی پٹڑیوں میں سے ہوتا ہوا پلیٹ فارم کی جہاں ڈھلان شروع ہوتی تھی وہاں آ کر ایک طرف چھپ گیا۔ دو تین آدمی قلی کے سر پر سامان رکھواتے آ رہے تھے۔ جب وہ چلے گئے اور پلیٹ فارم خالی ہو گیا تو میں پلیٹ فارم کی ڈھلان چڑھ گیا۔ یہاں ایک بورڈ لگا تھا جس پر انگریزی اور ہندی میں جالندھر کینٹ لکھا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم پر آگے جا کر کچھ مسافر اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے تھے۔ قلی بھی چل پھر رہے تھے۔ دو چار پولیس کے سکھ سپاہی بھی نظر آئے مگر مجھے ان سے محتاط رہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ امرتسر جانے والی گاڑی کب اور کس پلیٹ فارم پر آ رہی ہے۔

یہ مسئلہ ایک قلی نے حل کر دیا۔ میں پلیٹ فارم میں ایک طرف چھپ کر بیٹھا تھا کہ کسی نے قلی سے امرتسر جانے والی ٹرین کے بارے میں پوچھا۔ سکھ قلی نے اسے

بتایا کہ جنتا ایکسپریس تھوڑی دیر میں آنے والی ہے وہ امرتسر جائے گی۔ جس مسافر نے قلی سے ٹرین کے بارے میں پوچھا تھا میں نے اس پر نظریں جما دیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ اس پلیٹ فارم پر جائے گا جہاں امرتسر جانے والی جنتا ایکسپریس آ رہی ہے۔ مسافر وہیں پلیٹ فارم پر اپنے سامان کے پاس بیٹھا رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ امرتسر جانے والی ٹرین اسی پلیٹ فارم پر آ رہی تھی۔

ٹرین کوئی ایک گھنٹے کے بعد آئی۔ میں ٹرین کی دوسری طرف ریلوے لائن میں اتر گیا۔ جب ٹرین پوری طرح سے رک گئی تو اس کے پہیئوں پر رینگتا ہوا آخری ڈبے کی چھت پر جا کر لیٹ گیا۔ میں ڈبے کی چھت سے بالکل چمٹ گیا تھا تاکہ پلیٹ فارم کی روشنی میں مجھ پر کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ ٹرین جالندھر چھاؤنی میں تھوڑی دیر ہی ٹھہری اور چل پڑی۔ اس کے بعد جالندھر شہر کے سٹیشن پر کچھ دیر کے لیے رکی اور امرتسر کی طرف فرّاٹے بھرنے لگی۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے کا وقت ہوگا جب ٹرین جالندھر شہر سے روانہ ہوئی۔ راستے میں وہ کسی جگہ بھی نہ رکی اور کوئی گھنٹے سوا گھنٹے کے سفر کے بعد امرتسر پہنچ گئی۔

یہ ٹرین اس کے آگے نہیں جاتی تھی۔

میں مسافروں کی آنکھ بچا کر ٹرین سے اتر گیا اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ واہگہ بارڈر کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ رات کا وقت تھا' چاروں طرف اندھیرا تھا۔ مجھے علم تھا کہ یہ ریلوے لائن واہگہ تک جاتی ہے جو پاکستان میں ہے۔ میں کچھ دور جا کر ریلوے ٹریک سے اتر کر کھیتوں میں آ گیا۔ یہاں کافی دور تک رینگتا چلا گیا۔ پھر خیال آیا کہ کیوں نہ بارڈر کی طرف جانے والی سڑک پر چلا جاؤں۔ وہاں کسی نہ کسی ٹرک یا گاڑی پر موقع دیکھ کر چڑھ جاؤں گا اور بارڈر پر پہنچ جاؤں گا۔ واہگہ جانیوالی سڑک کی روشنیاں میری بائیں جانب نظر آ رہی تھیں۔ میں کھیتوں میں سے ہوتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ سڑک پر سے وقفے وقفے کے بعد ٹرک گزر رہے تھے۔ ان میں فوجی ٹرک زیادہ تھے۔ ایک جگہ سڑک کے کنارے میں نے ایک جیپ کو رکتے دیکھا۔ وہاں

ایک کھوکھا تھا۔ جیپ کا رخ واہگہ بارڈر کی طرف تھا۔ میں تیزی سے جیپ کے پاس آ گیا۔ جیپ کا ڈرائیور کھوکھے پر سے سگریٹ خرید رہا تھا۔ میں دوسری طرف سے ہو کر جیپ کی چھت پر چڑھ کر اس سے چمٹ گیا۔ ڈرائیور نے سگریٹ کا پیکٹ لے کر جیب میں ڈالا اور جیپ میں آ کر بیٹھ گیا۔ جیپ سٹارٹ کی اور وہ بارڈر کی طرف چل پڑی۔ جیپ سڑک پر دیر تک چلتی رہی۔ راستے میں بائیں جانب ایک بہت بڑا سکھوں کا گوردوارہ بھی آیا۔ کچھ کارخانوں کی روشنیاں بھی نظر آئیں۔ ایک جگہ سڑک کی دونوں جانب دِکانیں تھیں جو بند تھیں۔ شاید یہ اٹاری کا قصبہ تھا۔ اس کے بعد بارڈر کی انڈین کسٹم چیک پوسٹ آ گئی۔ جیپ یہاں ایک طرف رک گئی۔ میں نے جیپ کی چھت پر سے جائزہ لیا۔ کچھ فاصلے پر بارڈر کا گیٹ تھا جہاں انڈیا کا جھنڈا لگا تھا اور گارڈ کھڑے تھے۔

کسٹم آفس میں روشنی ہو رہی تھی۔ ایک سکھ باہر نکل کر سامنے کسی کو آواز دے کر بلا رہا تھا۔ دوسری طرف کچھ فاصلے پر تیز روشنیوں میں مجھے پاکستان کا پرچم لہراتا نظر آیا تو میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ یہ میرے پیارے وطن پاکستان کا پرچم تھا جس کے سائے میں ہم لوگ امن اور خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جہاں پہنچنے کے بعد مجھے کسی سی آئی ڈی، کسی ملٹری انٹیلی جینس کا ڈر خوف نہیں تھا۔ میں جیپ کی چھت سے اتر آیا اور کسٹم آفس کی پچھلی دیوار کی طرف سے نکل کر پاکستان کی سمت چل پڑا۔ وہاں کانٹے دار تاروں والی دیوار بنی ہوئی تھی۔ میں اس کے نیچے سے گزر کر پاکستان کی سر زمین پر پہنچ گیا۔ یہاں آتے ہی مجھے جمیلہ کے جسم کی خوشبو محسوس ہوئی۔ یہ میرے وطن، میری عزت، میری آبرو کی خوشبو تھی۔ میں نے بے اختیار ہو کر پاکستان کی مٹی کو چوم لیا اور دیر تک پاکستان کی مٹی میں اپنا سر ڈالے رکھا۔ اس کے بعد لاہور جانے والی سڑک سے ذرا ہٹ کر کھیتوں میں سے لاہور کی طرف چل پڑا۔

میری زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے پیارے وطن میں انسانی روپ میں داخل ہونے کی بجائے ایک سانپ کی شکل میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ بات مجھے کسی حالت

میں بھی گوارا نہیں تھی۔ میں اس منحوس قصے اور قضیئے کو توہمات اور دیوی دیوتاؤں کے جھوٹے بتوں کے دیس بھارت کی سر زمین پر ہی چھوڑ آنا چاہتا تھا لیکن یہ بات میرے اختیار میں نہیں تھی۔ میں جمیلہ کے گھر سانپ کی شکل میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں اس عذاب سے نجات حاصل کر کے رہوں گا۔ اپنے وطن کی ہوا اور مٹی نے میرے اندر ایک نئی طاقت' ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں کفر کی بڑی سے بڑی طاقت کو پاش پاش کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے خدا اور رسول پاکؐ کو یاد کیا۔ دل میں کلمہ شریف پڑھا اور میرا رخ اپنے آپ ایک طرف ہو گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ رخ شہر کی طرف کروں لیکن کوئی طاقت مجھے سڑک سے ہٹا کر ایک طرف لیے جا رہی تھی۔

کچھ دور رینگتے رہنے کے بعد مجھے ایک مسجد دکھائی دی جس کے گنبد اور مینار سبز روشنی کے نور میں جگمگا رہے تھے۔ میں بے اختیار ہو کر مسجد کی طرف بڑھا۔ مسجد خالی تھی۔ ابھی صبح کی اذان میں کچھ دیر تھی۔ میں مسجد کی سیڑھیاں چڑھ کر اس جگہ آ گیا جہاں نمازی اپنی جوتیاں اتار کر رکھتے تھے۔ آگے مسجد کا اونچا صحن شروع ہوتا تھا۔ میں جوتیوں والی جگہ پر ہی بیٹھ گیا اور میں نے اپنا سر مسجد کی محراب کی طرف جھکا دیا۔ میرے دل میں کلمہ پاک جاری ہو گیا۔ میں کلمہ شریف کا ورد کر رہا تھا اور میرا انسانی احساس مجھے محسوس کرا رہا تھا کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنا سر غازیوں کی جوتیوں والی جگہ پر لگا دیا اور خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ اے اللہ پاک! میرے گناہ معاف فرما دے اور مجھے اس عذاب سے نجات دلا۔ اس کے بعد مجھ پر غنودگی کی حالت طاری ہو گئی۔ خدا جانے میں جاگ رہا تھا کہ سو گیا تھا جس عالم میں تھا اس عالم کی مجھے خبر کوئی نہیں تھی۔ اچانک مجھے ایک جھٹکے نے جگا دیا۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا تو میں سانپ نہیں تھا بلکہ کرم داد تھا۔ اپنی اصلی انسانی شکل میں واپس آ گیا تھا۔

یقین کریں اس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہو گئی کہ میں مسجد کے صحن میں سر

رکھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ میں دیر تک روتا رہا۔ آنسو رکنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ جب ذرا آنسو تھمے تو میں جوتے اتار کر مسجد میں داخل ہوا۔ وضو کیا اور قبلہ رو ہو کر دو نفل شکرانے کے ادا کیے۔ ہر بار جب میرا سر سجدے میں جاتا تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور میں بلک بلک کر رونے لگتا۔ اللہ تعالیٰ سے بار بار اپنے گناہوں کی معافی مانگتا۔ رونے سے میرے نفل صحیح طرح سے ادا نہیں ہوئے تھے۔ میں نے دوبارہ وضو کیا اور اپنے آپ پر پورا ضبط کر کے ایک بار پھر شکرانے کے نوافل ادا کیے اور الٹے پاؤں مسجد سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پاکستان کے نورانی آسمان پر ستاروں کے سفید اور نیلے پھول ہیرے جواہرات کی طرح جگمگا رہے تھے۔ پچھلے پہر کی خوشگوار ہوا چل رہی تھی جس میں میرے وطن پاک کی مٹی اور اس کے کھیتوں' پھلوں اور پھولوں کی خوشبو تھی۔ میں نے بے اختیار ہو کر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور واہگہ سے لاہور شہر کی طرف جانے والی سڑک پر آگیا۔ میں نے جیکٹ کی جیبوں کو ٹٹولا۔ میری جیب میں کچھ نوٹ پڑے تھے۔ میں نے باہر نکال کر کھمبے کی روشنی میں دیکھا۔ وہ پچاس پچاس کے پاکستانی کرنسی کے دو نوٹ تھے۔ یا خدا! یہ نوٹ کہاں سے آ گئے؟"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

مجھے اتنے ہی پیسوں کی ضرورت تھی۔ اتنے پیسوں میں میں جمیلہ کے پاس جہلم پہنچ سکتا تھا اور اس کے لیے اور اس کے گھر والوں کے لیے تھوڑی سی مٹھائی بھی لے جا سکتا تھا۔ واہگہ کے ایک بس سٹاپ پر میں نے ایک بس کھڑی دیکھی۔ بس میں روشنی نہیں تھی۔ اس کا ڈرائیور چھت پر سے سگریٹ پیتا اتر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ بس لاہور جائے گی؟ اس نے نیند بھری آواز میں جواب دیا۔

"ایک گھنٹے بعد جائے گی۔"

میں ڈرائیور کی اجازت سے بس کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی میں اونگھنے لگا اور پھر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو باہر میرے پیارے وطن کے کھیتوں میں طلوع ہوتے ہوئے

سورج کی سنہری روشنی کا نور پھیل رہا تھا اور کنڈکٹر مجھ سے ٹکٹ کے پیسے طلب کر رہا تھا۔ میں نے ٹکٹ لے لیا۔ لاہور شہر کے مکانوں' بازاروں' کھیتوں اور مسجدوں اور لوگوں کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ہسپتال سے صحت یاب ہو کر اپنے گھر' اپنے بھائی بہنوں کے پاس آگیا ہوں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ ہر ایک کو سلام کر کے اس کے گلے لگ کر ملوں۔ بس نے مجھے سٹیشن کے پاس اتار دیا۔ لاہور سٹیشن سے میں ایک گاڑی میں سوار ہو کر جہلم پہنچ گیا۔ ایک دکان سے کچھ پھل خریدے اور اپنی بیوی جمیلہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ میرا دل خوشی سے جیسے اچھل رہا تھا۔ جمیلہ کے گھر والے مجھے دیکھ کر پہلے تو حیران رہ گئے۔ پھر مجھ سے لپٹ گئے۔ جمیلہ دوسرے کمرے سے دوڑ کر آئی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور ہم دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

یہ خوشی کے آنسو تھے۔

